خطباتِ حکیم الاسلام

جلد ۳

افادات

حکیم الاسلام
حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی
نوّر اللہ مرقدہ

مرتّبہ
قاری محمد ادریس ہوشیارپوری

اضافہ و ترتیب جدید :- مولانا محمد شفیق فاضل جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

دارالاشاعت
اردو بازار - کراچی - فون ۲۶۳۱۸۶۱

حقوق طباعت بحق ناشر محفوظ ھیں ۔

مرتّب مدّظلہٗ کے اصل مکتوب گرامی کا عکس

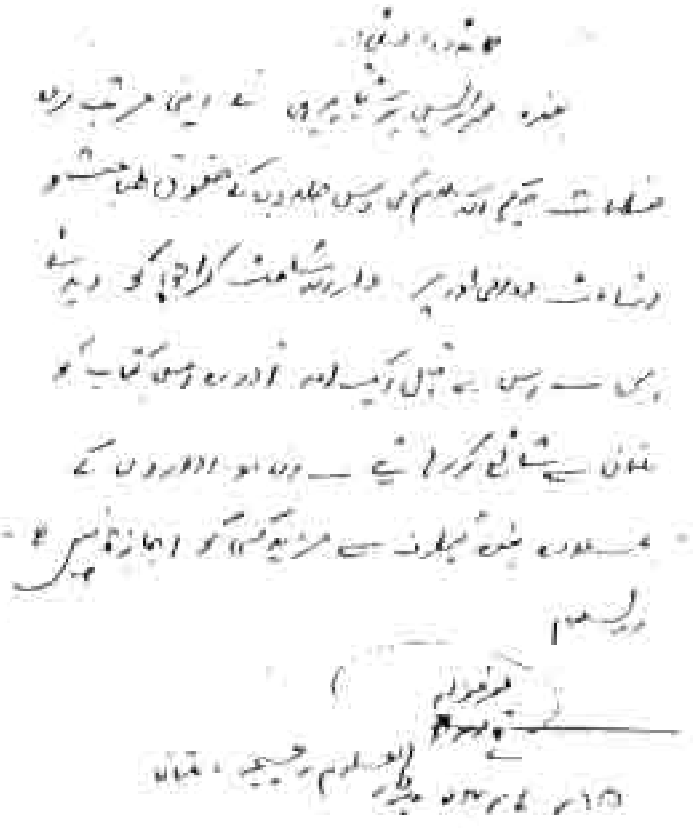

طبع اوّل کمپیوٹر : ۱۹۹۷ء

طبع دوم کمپیوٹر جدید ایڈیشن نومبر ۲۰۰۰ء

باھتمام : خلیل اشرف عثمانی

مرتب : قاری محمد ادریس ہوشیارپوری :- اضافہ و ترتیب جدید، مولانا محمد شفیق صاحب

مصححین : مولانا محمد عمیر صاحب ۔ مولانا عبدالبصیر صاحب ۔ مولانا محمد ہارون صاحب

طباعت : حسان پرنٹنگ پریس

فون: 6642832

ملنے کے پتے :

بیت القرآن اردو بازار، کراچی ۱

ادارۃ المعارف دارالعلوم، کراچی ۱۴

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی۔ لاہور

ادارۃ القرآن ڈی۔۴۳۷۔ ویب روڈ گارڈن ایسٹ۔ کراچی۔

اجمالی فہرست

نام خطبات	صفحہ	نام خطبات	صفحہ
◆ پیش لفظ	۵	◆ آدابِ دعاء	۴۸۱
◆ انتساب	۸	◆ اہمیت تزکیہ	۵۰۳
◆ کلمات تبریک	۹	◆ فضیلت تقوی	۵۲۷
◆ حرفِ سپاس	۱۰	◆ طریق اصلاح	۵۴۱
◆ انسانی زندگی کا نصب العین	۴۹	◆ صحبت صالح	۵۶۹
◆ اساس توحید	۷۹	◆ اخلاص فی الدین	۵۷۹
◆ عبادت وخلافت	۹۹	◆ رضائے الٰہی	۵۹۱
◆ مقصدِ حیات	۱۱۷	◆ تسکین فطرت	۶۱۱
◆ اساسی عبادات	۱۴۵	◆ تعارف اہل حق	۶۳۱
◆ اہمیت نماز	۱۵۹	◆ یاد حق	۶۵۹
◆ رمضان اور اس کے مقاصد و برکات	۱۶۵	◆ محبت ومعیت	۶۷۷
◆ حج بین الاقوامی عبادت	۱۸۷	◆ مقصد نعمت ومصیبت	۷۰۱
◆ بیت اللہ الکریم	۱۹۵	◆ آدابِ معاشرت	۷۱۹
◆ سنت خلیل علیہ السلام	۲۱۱	◆ تصویر سازی کی مذہبی وتمدنی حیثیت	۷۴۳
◆ شعب الایمان	۲۲۵	◆ الواعظ	۷۵۱
◆ ذکر اللہ	۲۵۵		
◆ فضیلت یوم الجمعۃ	۲۷۹		
◆ اسلام میں عید کا تصور	۲۹۹		
◆ جواہر انسانیت	۳۰۵		
◆ حیوۃ طیبہ	۳۵۱		
◆ تاثیر الاعمال	۳۶۷		
◆ عمل صالح	۳۹۳		
◆ دنیا و آخرت	۴۱۵		
◆ حقیقت نکاح	۴۳۷		
◆ اظہار تعزیت	۴۷۳		

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

پیش لفظ

حامداً للّٰہ العظیم ومصلیاً علٰی رسولہ الکریم وعلٰی اٰلہٖ واصحابہٖ واتباعہٖ اجمعین

اما بعد :-

اس کارخانہ کون ومکان کی تمام تر زینت و آرائش اور اس میں رکھے گئے بے شمار خزائن اس انسان کے لئے بنائے گئے ہیں اور اے انسان تو اپنے خالق کے لئے بنایا گیا ہے۔

انّ الدّنیا خلقت لکم وانّکم خلقتم للاٰخرۃ۔ (الحدیث)

یہ اس حقیقت کا اظہار ہے جو مقصود بعثتِ انبیاء علیہم السلام ہے ___ مگر انسان اس کو فراموش کر چکا اور جن کا وہ مخدوم تھا' ان کو مخدوم بنا کر راہ راست سے بھٹک گیا۔ انبیاء علیہم السلام نے اسے فکر و نظر اور قلب ودماغ کے لحاظ سے اس کائنات سے اتنا اونچا بنایا تھا کہ اس ساری دنیا کی حقیقت کو یہ فرمایا کہ ایک مچھر کے برابر اس کی وقعت نہیں اور خالق انسان کی یہ صدا اس کو سنائی "تو میرے لئے ہے" اور اس دنیا کی کوئی چیز تیرا بدل نہیں"۔ ___ بلکہ فرمایا گیا کہ تیرے اعضاء سے صادر ہونے والے اعمال وافعال کا صلہ ایسا تیار کیا گیا ہے کہ کسی انسان نے دیکھا سنا تو کیا ہوگا' اس کا ادنیٰ تصور بھی قلبِ بشر پر نہیں گزرا۔ الغرض ترغیب و ترہیب' انذار و تبشیر اور تبلیغ و تذکیر کے ذریعے اسے متوجہ کیا گیا کہ دنیا کی یہ چند روزہ زندگی لہو ولعب اور اس کی زیب و زینت متاعُ الغرور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور متاعِ زندگی صرف کرنے کے بعد بھی تیرے بنائے ہوئے منصوبے تارِ عنکبوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

اس کائنات سے مقصود خالقِ کائنات کا تعارف تھا۔ مگر انسان اس کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں کھو کر رہ گیا ___ بلکہ خود انسان کا وجود اس کے لئے دعوتِ فکر ہے۔ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿ذاریات پ۲۶﴾ حصولِ معرفت کے بجائے یہ خدا فراموشی سے زیادہ خود فراموش بن گیا۔ نہ اس کے سامنے اس زندگی کا کوئی نصبُ العین ہے اور نہ زندگی کے بعد آنے والے دور کا کوئی خاکہ ہے، نہ اس کا ثواب وعقاب اور جزا و سزا مدّ نظر ہے۔

انسانیت کے سب سے بڑے محسن حضرات انبیاء علیہم السّلام کا مقدّس و برگزیدہ طبقہ ہے۔ جس نے انسان کو اَبدی راحتوں اور حقیقی نعمتوں کی راہ پر گامزن کیا اور اسے اس کا نصبُ العین یاد دلایا اور کس شان سے یاد دلایا۔ لَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا ط ___ نیز حیات مابعد الموت سے روشناس کرایا۔ جس سے نہ صرف اس کی یہ زندگی بھی صبر و شکر' عفو و درگزر' ورع و تقوٰی' زُہد و قناعت اور سجدہ و عبادت جیسے اعمالِ صالحہ واخلاقِ حمیدہ میں ڈھل گئی۔ بلکہ اس زندگی کو اپنانے والے دنیا سے جاتے ہوئے اہلِ دنیا سے بطور شہادت کہہ گئے :

فُزۡتُ بِرَبِّ الۡکعبۃ۔

بہرحال اَمن و آشتی' سکونُ اطمینان اور راحت و چین کے الفاظ نہیں۔ ان کے حقائق و معارف اور ان کی سچی کیفیات و مصادیق انبیاء علیہم السلام کے دامنِ رحمت اور ان کی تعلیمات میں پوشیدہ و مضمر ہیں۔

انبیاء علیہم السّلام کے بعد آنے والے دور کے لئے فرمایا گیا ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ

عِبَادِنَا اور العلماء ورثة الانبياء ___ وراثت علوم و کمالاتِ نبوّت بعد از ثبوت نسبت ملتی ہے جیسا کہ وراثت دنیا بعد از ثبوتِ نسب حاصل ہوتی ہے۔ علماء ربّانی اور مشائخ حقّانی نے اس ورثۂ نبوّت کو خوب سے خوب پھیلایا۔ نہ اس میں حصولِ منفعت کو پیش نظر رکھا' نہ مضرت کے اندیشوں کو خاطر میں لائے' نہ حبِّ مال وجاہ انہیں زیر کر سکی' نہ بادشاہوں کی پیش کشیں ان کی استقامت میں لرزہ پیدا کر سکیں۔ ان کا مسلک یہ رہا ؎

ما آبروئے فقرو قناعت نمی بریم
بامیر خاں بگوئے کہ روزی مقدّر است

بلکہ اس دنیا کی بے حقیقتی اور اپنی حقیقی دولت کا اس طرح برملا اظہار کیا ؎

زانگہ کہ یافتم خبراز ملکِ نیم شب
من ملکِ نیم روز رابیک جو نمی خرم

قلب انسانی کا اس معراج پر پہنچنا۔ یہ بلا تعلیم انبیاء علیہم السّلام کے ممکن نہیں۔ اور باطن کی بادشاہی اس دنیا کی محبت کو دل سے نکالے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی ہے ؎

ہم خُدا خواہی وہم دنیائے دوں
ایں خیال ست محال است جنوں

اور قلب کی جب اصلاح ہو جاتی ہے۔ پھر قالب سے نکلنے والے اعمال بھی اعمالِ صالحہ کہلاتے ہیں اور دربارِ خُداوندی میں وہ باقیمت ہو جاتے ہیں۔

آج کے سائنسی دور میں جب کہ اعمال کی قیمت دل سے نکل چکی ہے۔ انسان میں شرافت و دیانت عنقاء ہو گئی اور اخلاقی اَقدار پامال ہو گئیں۔ جہاں اس کے اور اسباب ہوں گے۔ وہاں ایک بڑا سبب خود سائنس کے اسباب وسامان ہیں ؎

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کچل دیتے ہیں آلات

لیکن یہ بھی ناانصافی ہوگی کہ ساری ذمّہ داری اسباب وسامان پر ڈال دی جائے اور ان کو مصرَف میں لانے والے انسان سے چشم پوشی کرلی جائے۔ ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے آدمی خدا تک پہنچ سکتا۔ لیکن بات وہی ہے کہ ان کے استعمال کا طریقِ کار بھی تعلیمات نبویہ سے معلوم ہو سکے گا۔ پھر ساری دنیا دین بَن جائے گی۔ ورنہ دین بھی دنیا ہو کر رہ جائے گا۔ جو بغیر روح محض ایک لاش ہے۔ جس کی کسی معاشرے میں کوئی قیمت نہیں۔ چہ جائیکہ آخرت یا دربارِ خداوندی میں اس کی قیمت ہو؟ اور اس پر اجر وثواب کی امید رکھی جائے ___؟

حضرات اہلُ اللہ انہی تعلیمات کے حامل ہیں اور انہی تعلیمات کے ذریعہ الحمدُ للہ ایک زمانہ روشن ہے ___ آپ کے ہاتھوں میں موجود کتاب "خطباتِ حکیمُ الاسلام" کی تیسری جلد ہے اور اس میں چشمۂ فیض کے مدیر و مہتمم کے خطبات ومواعظ جمع ہیں۔ جس ادارے کے نورِ علم سے پورا عالَم جگمگا رہا ہے۔ جہاں اہلُ اللہ بھی پیدا ہوتے ہیں اور مدرّس و معلّم بھی۔ قومی راہنما اور مبلّغ و مصلح بھی ___

ان مواعظ و خطبات میں کیا کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے لئے زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں

ع تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

الحمدللہ ناظرین کرام پہلی دو جلدیں دیکھ چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ اس جلد کو بھی شرفِ قبولیت بخش کر اس کے منافع کو عام و تام فرمادیں گے اور جہاں حکیم الاسلام حضرت العلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی دامت برکاتہم کے لئے ذخیرۂ آخرت اور باعثِ اجر ثواب ہوگی۔ وہاں خود قارئینِ کرام کے دینی فوائد بھی اس سے پورے ہوں گے۔ نیز خطباء و ائمہ کے لئے یہ تحفہ گراں مایہ ثابت ہوگی۔

اس جلد کے تمام مسودے پر گرامی قدر حضرت والد ماجد صاحب دامت برکاتہم نے بھی نہایت محنت عرق ریزی سے نظر ڈالی اور پورا مسودہ بنظرِ عمیق دیکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس جلد میں خطبۂ طیبہ کے علاوہ جتنی تقاریر آئی ہیں وہ سب ٹیپ ریکارڈ سے سن کر لکھی گئی ہیں۔ خطبۂ طیبہ انڈیا کا مطبوعہ رسالہ ہے جس میں وہ اہم خطبۂ صدارت ہے جو حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ نے جامعہ عربیہ اشرفیہ دیا بھوجپور ضلع شاہ آباد آرہ و بہار 'انڈیا' کے سترہویں جلسہ سالانہ منعقدہ ۱۲-۱۳-۱۴' صفر المظفر سن ۱۳۸۸ھ کو ارشاد فرمایا تھا۔ برائے افادہ من وعن ساتھ لگا دیا گیا ہے۔ ٹیپ ریکارڈ سے سننے میں غلطی ہو سکتی ہے۔ تصحیح میں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ کتاب میں کم از کم علمی غلطی نہ رہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر کسی غلطی پر نظر پڑے۔ تو حضرات اہل علم سے درخواست ہے کہ وہ اسے حضرت حکیم السلام مدظلہٗ العالی کی ذات والا ستودہ صفات کی طرف منسوب نہ فرمادیں۔ بلکہ اسے مرتب کی نااہلیت پر محمول فرمایا جائے اور اس سے مطلع فرمایا جائے۔ بندہ اس پر شکر گزار اور ممنون ہوگا۔

اس کتاب کی تدوین میں اپنے ان قابلِ احترام بزرگوں کا ذکرِ خیر اور ان کا اظہارِ تشکر ضروری خیال کرتا ہوں۔ جنہوں نے مجھے تقاریر کی کیسٹیں مہیا فرمائیں یعنی برادر محترم حضرت مولانا قاری سیف الدین صاحب اور حضرت مولانا قاری محمد رفیق صاحب مدظلہما ___ ان حضرات کی بدولت کیسٹوں میں محفوظ مواد کتابی شکل میں منظرِ عام پر آسکا۔ اللہ تعالیٰ ان ہر دو حضرات کو بہت بہت جزائے خیر نصیب فرمادے اور اپنے دربار عالی سے اپنی اور ان کی شایانِ شان اجر جزیل عطا فرمادے اور تادم آخر اپنی رضا کے ساتھ خدمتِ کلام اللہ کی توفیق نصیب فرمادے اور شرفِ قبولیت بخشے۔

آمین ثم آمین بجاہ سیدالمرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم

بندہ ناچیز
محمد ادریس ہوشیارپوری غفرلہٗ
۲۹ر رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ
یوم العرفہ۔ جمعرات ۹ر ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

خطباتِ حکیم الاسلام جلد سوم کی ترتیب و تدوین کے
بعد یہ ذرۂ بے مقدار اپنے اُس صاحبِ عزیمت و عظیم المرتبت
استاذ، مستقیم الاحوال بزرگ عارفِ ربّانی کے نامِ نامی منسوب
کرتا ہوں جو زندگی بھر خدمتِ قرآنِ حکیم میں مصروفِ عمل رہے۔
اور طالبانِ قرآن کریم کو رنگِ دنیا اور ان سے [illegible] کرادیا
بالآخر چالیس برس کی عظیم جد و جہد کے بعد ـــــ
اُسی مسند پر جان جانِ آفریں کے سپرد کردی،
جہاں روزِ اوّل درسِ قرآن کریم کیلئے تشریف فرما ہوئے تھے ـــــ
میری مراد مجدد القراءت، استاذ الاساتذہ
شیخ العرب والعجم، عارف باللہ سیدی و مرشدی حضرت الحاج
المقری القاری رحیم بخش صاحب قدس اللہ سرہٗ (خلیفۂ ارشد
حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی
نور اللہ مرقدہٗ) سے ہے جن کے فیضِ صحبت، بے پایاں
عنایات اور خصوصی ادعیہ سے بندۂ ناچیز بہرہ ور ہوا ـــــ

فقیر از تلامذۂ حضرت استاذنا المکرم

[illegible] غفر لہٗ

۲۸ صفر المظفر ۱۴۰۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

کلماتِ تبرک

الحمد لولیہٖ والصلوٰۃ والسلام علیٰ نبیہٖ

اما بعد!

برکۃ السلف، حجۃ الخلف، حکیم الاسلام حضرت العلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ العالی کی علمی وروحانی شخصیت کا نامِ نامی آجانا مواعظ وخطبات کی اہمیت وافادیت کے لئے کافی ووافی ہے ــــ علوم ومعارف پر مشتمل یہ گرانقدر مجموعہ اہلِ علم، خطباء، آئمہ مساجد اور مقررین و مبلغین کے لئے علم وحکمت کا عظیم سرمایہ ہے۔ عنوانات کے اضافے سے مضامین کا استحضار نہایت سہل ہو گیا۔

الحمد للہ! بندہ نے شروع سے آخر تک تمام مسودہ بنظرِ عمیق دیکھا، اور متعدد مقامات پر برائے اصلاح نشاندہی کی۔ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ (یوسف پ۱۳ آیت ۷۶)

عزیزم مولوی حافظ قاری محمد ادریس سلمہٗ، (فاضل خیر المدارس، ملتان) نے شبانہ روز محنت وکاوش سے اسے مرتب کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بالآخر کتاب، موجودہ شکل میں منظرِ عام پر آگئی۔ دل سے دعا ہے اللہ تعالیٰ میرے پیارے عزیز سلمہٗ کی اس محنت وجان فشانی کو اپنی رضا کا ذریعہ بنائے اور اپنی جنابِ خاص سے اس کا اجر بے پایاں عنایت فرمائے۔ نیز علم وعمل صحت وعمر میں برکت نصیب فرما کر خلوص وللہیت کے ساتھ مزید بر مزید خدمتِ دینِ متین کے مواقع فراہم فرمائے۔ اور ہم سب کا ایمان پر خاتمہ نصیب فرمائے۔

آمین

وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ

بندہ محمد شفیع عفی اللہ عنہٗ

۱۰ر ۱۲ر ۱۴۰۱ھ

(والد محترم مرتب مدظلہٗ)

✤✤✤✤✤✤✤✤✤✤✤

حرفِ سپاس

ناسپاسی ہوگی اگر اس مجموعہ صد رنگ کا سرفقطۂ آغاز اس بزرگ اور مہربان شخصیت کو قرار نہ دوں جس نے اس کتاب کی ترتیب وتدوین میں مجھے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود بھرپور تعاون سے نوازا اور اس مشکل کام کو میرے لئے آسان کر دیا۔

تشکر وامتنان کے جذبات کا اظہار یوں بھی ایک دشوار گزار مرحلہ ہے مگر جب یہ تعاون ایک شخصیت کی جانب سے ہو جو بو قلموں فضائل کے ساتھ ساتھ والد گرامی کی نسبت وعظمت بھی رکھتی ہو تو ان جذبات کا اظہار جس نزاکتِ اُسلوب کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کی استعداد کہاں سے لائی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ والد گرامی قبلہ محترم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم ___ کی علمی رہ نمائی اور عملی شفقت وعنایت ہی سے میں اس قابل ہوا کہ اس گلدستہ پند وحکمت کو مرتّب کر سکوں۔

دست بدعا ہوں کہ حق تعالیٰ بتصدّق حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ظِلّ عاطفت کو ہمارے سروں پر تادیر سایہ فگن رکھے اور اپنی جنابِ خاص سے انہیں اپنی اور ان کی شایانِ شان اجر وثواب سے خوش وقت وشاد کام فرمائے اور اس کوششِ ناکام کو سعیِ مشکور سے مبدل فرمائے۔ آمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

انسانی زندگی کا نصب العین

تو نصب العین طاعت و عبادت خداوندی نکلا دولتمند ہو گا تب بھی اطاعت کر سکتا ہے، مفلسی میں ہو گا تب بھی یہ نصب العین اپنا سکتا ہے، بادشاہی تخت پر ہے تب بھی یہ نصب العین قائم ہے، غربت میں ہے تب بھی، تندرستی میں ہو تب بھی یہ نصب العین قائم ہے...... اور انتہائی بیماری میں ہو تب بھی...... زندگی ہو تو یہ نصب العین قائم ہے موت آجائے تو بھی...... یہ عجیب ترین نصب العین ہے جو اس لمبی عمر کے ساتھ ساتھ اخیر تک چلتا ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- عظیم ترین نعمت ۴۹
- ابدی زندگی ۵۰
- اختیاری نصب العین کی ضرورت ۵۱
- ابدی مقصد ۵۱
- دولت اور روٹی مقصد نہیں ۵۱
- عزت و جاہ بھی مقصد نہیں ۵۲
- حقیقی عزت ۵۳
- عزت کے بارے میں سنہری اصول ۵۴
- انسان کا علم ۵۴
- خالق انسان کا تجویز کردہ نصب العین ۵۵
- دولت سے بھی خدا ملتا ہے ۵۵
- غربت سے بھی خدا ملتا ہے ۵۶
- صحت و مرض میں بھی خدا ملتا ہے ۵۷
- صبر کا پھل ۵۸
- زندگی اور موت میں بھی خدا ملتا ہے ۵۹
- دولت اپنی ذات سے بری نہیں ۶۲
- دولت کی مثال ۶۳
- طبعی محبت کی رعایت ۶۳
- انسان ہر حال میں خدا تک پہنچ سکتا ہے ۶۴
- آج کا جنید و شبلی ۶۴
- ہماری ملکیت کی حیثیت ۶۵
- ترغیب انفاق ۶۶
- بادشاہت کے ساتھ عبادت ۶۶
- قبر میں عبادت ۶۷
- میدان حشر میں جذبہ عبادت ۶۹
- جنت میں عبادت ۶۹
- ایمان کی وجہ سے ہر چیز پاکیزہ بن جائیگی ۷۰
- زندگی کی قدر کی صورت ۷۱
- حسن نیت ۷۲
- عبادت کے معنی ۷۳
- پر سکون زندگی کی ایک اہم مکتوب ۷۵

اساس توحید

شریعت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ عبادت کی بنیاد نفع و ضرر پر ہے...... مگر وہ نفع و ضرر جو مالک کے قبضے میں ہو... تو دنیا میں جتنے بھی اسباب ہیں نفع و نقصان ان کے قبضے میں نہیں ہے۔ یہ مالک کے ارادے سے نفع و نقصان پہنچتا ہے...... خود ہتھوڑا نفع و نقصان نہیں پہنچاتا، خود ہوا نفع نہیں پہنچاتی، مشیت خداوندی نفع پہنچاتی ہے...... اصل میں نفع کی باگ ڈور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے...... جو مسبب الاسباب ہے، اسباب کے ہاتھ میں نفع و نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ اس لئے عبادت اس کی، کی جائے گی جس کے قبضے میں نفع و نقصان ہے، نہ اس کی جو نفع و نقصان کا صرف سبب ہے...... نفع و نقصان کا موجد نہیں ہے، نفع و نقصان کا خالق نہیں ہے محض سبب بنتا ہے۔ تو سبب بن جانے سے موجد یا خالق بننا لازم نہیں ہوتا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

◆ مدار حیات انسانی	۷۹
◆ کائنات کی انسان سے بے تعلقی	۸۰
◆ تخلیق کائنات وانسان میں باہمی ارتباط	۸۰
◆ کائنات میں انسان کا مرتبہ	۸۱
◆ خالق کائنات کا انسان سے خصوصی معاملہ	۸۲
◆ کائناتی خدام	۸۳
◆ مخدوم کائنات کی بے عقلی	۸۳
◆ کائنات کا افادی پہلو اور اس کا مقصد	۸۴
◆ معیار عبادت	۸۵
◆ معطی حیات	۸۵
◆ معطی صحت	۸۵
◆ مبالغہ فی الاسباب کی ممانعت	۸۵
◆ تاثیرات اسباب کی حقیقت	۸۶
◆ موہم شرک عنوان سے احتراز کی تاکید	۸۶
◆ معرفت توحید و تصرف	۸۶
◆ بارگاہ حق میں سوال کا طریق کار	۸۷
◆ کسب حلال کے آثار	۸۹
◆ حرام کی نحوست	۹۰
◆ لقمۂ حلال کی علمی و عملی برکات	۹۱
◆ نمائش علم	۹۳
◆ کثرۃ علم کے باوجود قلت عمل	۹۳
◆ آثار علم	۹۴
◆ ابتلاء معصیت کے اسباب	۹۴
◆ رزق حلال میں قلت و برکت	۹۴
◆ بناء عبادت	۹۴
◆ اہل شرک کا دھوکہ	۹۵
◆ آلات صنعت کی پرستش	۹۵
◆ اسلام کا دعویٰ توحید	۹۶
◆ استحقاق عبادت	۹۶

عبادت و خلافت

صحیح معنوں میں انسان وہ ہے جو اپنی ذات کو اپنے پروردگار کے سامنے جھکا دے اور عبادت میں آگے بڑھے، اس کی ناک، پیشانی، ہاتھ، پیر، اس کی روح اور اس کا خیال بھی اللہ کے سامنے ذلیل بن کر جھک جائے یہ کام اپنی ذات کے لئے ہوگا، یہ عبادت ہے۔ دوسرا فریضہ یہ ہے کہ وہ تختِ خلافت پر بیٹھ کر دنیا سے برائیوں کا خاتمہ کرے۔ اس لئے نہ فقط عبادت اور نہ فقط خلافت مقصد زندگی بلکہ دونوں مقصود ہیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

◆ تمہید ۱۰۰
◆ انسان میں مخلوقات کے نمونے ۱۰۰
◆ انسان میں خالقِ کائنات کے نمونے ۱۰۲
◆ نمونۂ کائنات ہونے کی نسبت سے انسان کا فریضہ ۱۰۵
◆ نمونۂ کمالاتِ خداوندی ہونے کی نسبت سے انسان کا فریضہ ۱۰۸
◆ تکمیلِ ایمان کے لئے عبادت وخلافت دونوں ضروری ہیں ۱۰۹
◆ اخلاقی قوت سے ہی انسان اونچا ہو سکتا ہے ۱۱۲
◆ مسلمان کا دنیا میں مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے ۱۱۳
◆ قربانی سے نصب العین دنیا میں پھیلنا ہے ۱۱۴

مقصدِ حیات

عبادتِ خداوندی دنیا سے چلی، قبر میں پہنچی میدانِ محشر میں پہنچی، اور جنت تک پہنچ گئی ...... یہ چیز ایسی ہے جو زندگی کا مقصد بن سکتی ہے ...... اگر زندگی ابدی ہے تو عبادت بھی ابدی ہے۔ کھانا پینا ابدی نہیں۔ یہ قبر تک ختم ہو گیا۔ قبر میں کوئی کھانا پینا نہیں ہو گا۔ اور اگر کچھ کھانا پینا ہو گا بھی تو بھی ذکر اللہ ہی ہو گا۔ جنت میں کھانا پینا ہو گا۔ مگر محتاجگی نہیں ہو گی ...... اصل محتاجگی "ذکر اللہ" کی ہو گی۔ اور وہ زبان پر جاری ہو گا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- تمہید ۱۱۷
- سفرِ انسانی کی ابتدا و انتہا ۱۱۸
- احوالِ برزخ ۱۲۰
- زندگی کی حقیقت ۱۲۲
- کیا مقصدِ زندگی خورد و نوش ہے؟ ۱۲۳
- روحانی قوت کی کرشمہ سازیاں ۱۲۶
- کیا مقصدِ زندگی عزت و اقتدار ہے؟ ۱۲۸
- مقصدِ زندگی قرآن کریم کی روشنی میں ۱۳۰
- ابدی زندگی کا ابدی مقصد ۱۳۰
- دنیوی زندگی کی روح ۱۳۳
- شبہ کا جواب ۱۳۴
- دوسرے شبہ کا جواب ۱۳۶
- طاعتِ خداوندی مقصدِ زندگی کیوں ہے؟ ۱۳۷
- انسان صرف اللہ کے کام کا ہے ۱۳۸
- عقلی اعتبار سے عبادتِ خداوندی کی ضرورت ۱۳۹
- عبادت و طاعت کا عام مفہوم ۱۴۰
- اسلام دنیوی معاملات سے روکنے کے لئے نہیں آیا ۱۴۱
- اللہ اور بندہ میں معاہدہ ۱۴۲

اساسی عبادات

پہلا مظاہرہ عجز و نیاز کا ہے جس کی صورت نماز ہے۔ اور دوسرا مظاہرہ عشق و محبت کا ہے جس کی صورت حج ہے...... اس لئے یہ دو ہی عبادتیں اسلام کی اساس و بنیاد بنائی گئیں جب کہ تمام صفات خداوندی بھی دو ہی نوعوں (جلال و جمال) میں سمٹی ہوئی ہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی انہی دو نوع صفات کے حقوق ادا کرنے سے ممکن تھی، جن کی تشکیل کے لئے نماز اور حج کے افعال رکھے گئے۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہ

فہرست مضامین

◆ بنیادی عبادات	۱۴۵
◆ منشاء عبادات	۱۴۵
◆ منشاء جلال و جمال	۱۴۶
◆ جلال و جمال کے آثار ولوازم	۱۴۷
◆ نماز، شانِ کبریائی کا مظہر	۱۴۷
◆ حج، ذاتی محبوبیت کا مظہر	۱۴۸
◆ حسنِ تعبیر	۱۴۹
◆ عجز و عشق کے مظاہر	۱۴۹
◆ زکوٰۃ و روزہ کی حیثیت	۱۴۹
◆ موانع نماز اور ان کا تدارک	۱۴۹
◆ نماز کی تمہید	۱۵۱
◆ موانع حج اور ان کا تدارک	۱۵۱
◆ حکمت اعتکاف	۱۵۲
◆ خطابِ حج	۱۵۲
◆ حکمت احرام	۱۵۲
◆ عاشقانہ بول	۱۵۳
◆ حکمت طواف	۱۵۳
◆ حکمت وقوفِ عرفات	۱۵۳
◆ فدیۂ جان	۱۵۴
◆ مقدمۂ حج	۱۵۴
◆ زکوٰۃ و روزہ "عبادت لغیرہ" ہیں	۱۵۴
◆ نماز و حج میں باہم نسبت تضاد	۱۵۵
◆ علمی حج	۱۵۷
◆ آئینۂ حج اور آئینۂ نمائی	۱۵۷

اہمیت نماز

دین کے دوسرے کاموں کی بقا بھی در حقیقت نماز سے ہی ہے۔ اسی سے اوقات کی پابندی ہوتی ہے اسی سے عظمتِ حق دل میں جاگزیں ہوتی ہے اسی سے دین کے اوامر کی عظمت ہوتی ہے اور پھر ان کی تعمیل پر دل مجبور کرتا ہے۔

غرض نماز ہے تو کل دین ہے۔ اور وہ نہیں تو دین بھی نہیں۔ اور مسلمان کا دین ہے تو دنیا بھی ہے۔ ورنہ دنیا بھی نہیں۔ پس نماز ہے تو جہاں ہے ورنہ حرمان و خسران ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہٗ

فہرست مضامین

- پس منظر ۱۵۸
- کائنات کا انتہائی مقصد ۱۵۹
- عبادت کا فردِ کامل ۱۶۰
- نماز ہے تو کل دین ہے ۱۶۱
- نماز تعلق مع اللہ کا مظہرِ اتم ہے ۱۶۱
- قیام نماز سے ایک خاص فضا پیدا کرنا مقصود ہے ۱۶۲
- سلطنت اسلامی کا مقصد ۱۶۳
- نمازی یا نماز کے ثمرات ۱۶۳

رمضان اور اس کے مقاصد و برکات

وہ مردِ مؤمن کیسے ہلاک ہو سکتا ہے جس کے عباداتی سال کا اوّل رمضانُ المبارک ہو، اور جس کا اوسط اشہرِ حج اور محرم الحرام ہو۔ اور جس کا آخر شعبان معظم ہو۔ پس جس مؤمن کی عمر پر اس طرح کے سال گزرتے رہے تا آنکہ اس کی عمر پوری ہو جائے، تو یقیناً اس کے دل کی زمین اس اول و آخر اور وسط کے ساتھ جاہ و باہ کے تُروک کے ذریعے نفسانی خس و خاشاک سے پاک ہو گی اور وہ افعال طاعت و عبودیت اور بر کے ذریعے نور و برکت سے چمک اٹھے گی۔ اور اس کے رذائل زائل ہوں گے اور اس میں فضائل داخل ہوں گے وہ نار سے بچ جائے گا۔ اور نور سے سرفراز ہو گا۔ جو حقیقی فوز و فلاح ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

فہرست مضامین

- اصلاحِ طینت ۱۶۵
- سعادت کی بنیاد ۱۶۶
- تخلیہ و تحلیہ ۱۶۶
- نظامِ سعادت ۱۶۷
- ایمان وامانت ۱۶۷
- حیاداری اور فحش کاری ۱۶۹
- خلاصۂ کلام ۱۷۰
- بر و تقویٰ سے انقلابِ باطن ۱۷۰
- نفسانیت کا شر دور کئے بغیر ملکیت کی خیر قرار نہیں پکڑ سکتی ۱۷۱
- عباداتی سال کا آغاز واختتام ۱۷۱
- ماہِ رمضان، نیکیوں کا مرکزِ اتصال ۱۷۲
- بندہ وخدا میں ربطِ باطنی ۱۷۳
- کامل ترین ملاپ ۱۷۳
- اعترافِ قبولیت ۱۷۳
- بشری عروج کا نقطہ کمال ۱۷۴
- روزہ اور ماہِ روزہ کا ثمر ۱۷۴
- صیام وقیام کا باہمی تناسب ۱۷۵
- ہلالِ عید ۱۷۶
- تتمۂ رمضان ۱۷۶
- عبادت کا ہمہ گیر نقطہ آغاز ۱۷۷
- رمضان اور اشہرِ حج کا باہمی ارتباط ۱۷۸
- عاشقی، درویشی اور سرشاری ۱۷۹
- صورتِ وقار کی بھی ممانعت ۱۸۰
- خانہ بدوشی ۱۸۱
- فدیۂ جان ۱۸۱
- ایامِ حج میں یادِ رمضان ۱۸۲
- حکمت عیدِ قربان ۱۸۲
- شانِ جلال وجمال کا شکریہ ۱۸۲
- اصل عبادت صرف نماز اور حج ہے ۱۸۳
- اجتماعی دین ۱۸۴
- عباداتی سال کے درمیانی روزوں کی اہمیت ۱۸۴
- ماہ وسال کا توازن ۱۸۵

حج بین الاقوامی عبادت

حج ایک بین الاقوامی عبادت، بین الاقوامی مساوات، بین الاقوامی اخوت اور بین الاقوامی تعاون کا ایک بے مثال عظیم المرتبت نمونہ ہے، جس میں مرکز بھی ایک، عمل بھی ایک، فکر بھی ایک، لباس بھی ایک، وضع وہیئت بھی ایک، رخ بھی ایک، محبت بھی ایک ...... اور سب کی انسانیت بھی ایک ہو کر سامنے آتی ہے ...... اور اونچ نیچ، چھوت چھات نفرت وحقارت باہمی کا بیج تک مارا جاتا ہے ...... پس جو قومیں آج مساوات اور بھائی چارگی کی لفظی رٹ لگا رہی ہیں۔ وہ قرآن حکیم کے دیئے ہوئے اس نمونہ مساوات کو سامنے رکھ کر عبرت پکڑیں ...... ورنہ مساوات اور بھائی چارہ کے نمائشی دعوے زبان پر مت لائیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- اسوۂ مساوات ۱۸۷
- عالمی ہدایت کا قبلہ ۱۸۸
- امام ناس اور مرکز ناس ۱۸۸
- عالمی مساوات ۱۸۹
- بندگی میں یکسانی ۱۸۹
- قلوب و قوالب کی یکسانی ۱۸۹
- مساوات و عبادت کی یکسانی ۱۹۰
- عالمی اخوت ۱۹۰
- حج میں روحانی ترقی کے درجات ۱۹۱
- عالمی حسن سلوک ۱۹۱
- حج میں عالمی تجارت ۱۹۱
- عالمگیر امداد باہمی ۱۹۲
- جوہر تخلیق میں مساوات کا تقاضا ۱۹۲
- عالمی اخوت کے مرکزی نقاط ۱۹۲
- طلب صادق ۱۹۳

بیتُ اللّٰہِ الکریم

بیت اللہ محض کوئی کوٹھا نہیں ہے، کوئی عمارت نہیں ہے، بلکہ وہ تجلّی گاہِ ربانی ہے اس میں حق تعالیٰ کی وہ تجلّی جو اقرب الی الذات ہے، وہ موجود ہے۔ اسی تجلّی کو ہم سجدہ کرتے ہیں۔ اسی تجلّی کو سجدہ کرنا عینِ ذات کو سجدہ کرنا ہے...... تجلّی کے معنی فی الحقیقت عکس کے ہیں۔ تو بیت اللہ ''آئینہ جمالِ خداوندی'' ہے۔ جس میں حق تعالیٰ نے اپنا عکس ڈالا ہے۔ اور عکس اور اصل میں عینیت ہوتی ہے......۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- اولِ عالم ۱۹۵
- ہم سب کی اصل بیت اللہ ہے ۱۹۶
- بیت اللہ کو مرکزِ عبادت بنانے کی حکمت ۱۹۷
- بیت اللہ کی حدود ۱۹۷
- بیت اللہ میں اقرب الی الذات تجلّی کا عکس ۱۹۸
- مادیت، روحانیت اور نورانیت سب کی اصل بیت اللہ ہے ۱۹۹
- بیت اللہ کے وسطِ عالم ہونے کی حکمت ۲۰۰
- مرکزیت کی منتقلی ۲۰۰
- برکت و ہدایت کا گھر ۲۰۱
- آیاتِ بینات ۲۰۱
- قالبی امن کے ساتھ قلبی امن بھی ۲۰۲
- وسطِ عالم میں ولادتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حکمت ۲۰۳
- اسلامی اصول کی عالمگیر صداقت ۲۰۳
- صحابہ کرامؓ اور غیر مسلم اقوام ۲۰۴
- فیضانِ نبوت کا پورے عالم میں پھیل جانا ۲۰۵
- بین الاقوامی تبلیغ گاہ مرکزِ عالم میں ہونی چاہئے ۲۰۶
- شام مرکزِ سیاست ہے ۲۰۷
- مصر مرکزِ عسکریت ہے ۲۰۸
- اسلام کی بقاء تبلیغ میں ہے ۲۰۸

سنتِ حضرت خلیل علیہ السلام

جس طرح کائنات کی ہر چیز میں ایک صورت ہے، اور ایک روح ہے۔ اسی طرح اعمالِ شرعیہ میں بھی ایک روح ہے، اور جیسے وہاں ہر صورت کی ایک خاص روح ہے جو دوسری صورت میں نہیں آسکتی۔ اسی طرح یہاں ایک روح دوسرے میں نہیں آسکتی۔

اب سمجھئے کہ سارے اعمالِ شرعیہ کا مقصود تقویٰ ہے۔ مثلاً نماز سے عاجزی وانکساری کی صورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ روزے میں تزکیۂ نفس کی صورت میں۔ جہاد میں شجاعت کی صورت میں، صدقہ میں انفاقِ مال کی صورت میں اور قربانی سے جاں نثاری کی صورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ اگر آپ نے قربانی کے بجائے نماز پڑھ لی، تو نماز سے عاجزی اور بندگی کا تقویٰ تو ملا۔ مگر قربانی (کی صورت میں حاصل ہونے والا تقویٰ) کا تو نہ ملا۔ پس اگر کوئی شخص قربانی نہ کرے اور صدقہ دے دے تو قیامت کے دن اُس صدقہ کا ثواب مل جائے گا۔ مگر قربانی کا مطالبہ باقی رہے گا۔ اور یہ سوال ہوگا کہ قربانی کیوں نہیں کی؟

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- تمہید ۲۱۲
- اصولِ ثلاثہ تکوینیہ ۲۱۲
- اصولِ ثلاثہ تشریعیہ ۲۱۳
- محبوباتِ نفس کی قربانی ۲۱۴
- روحِ قربانی اور شبہ کا جواب ۲۱۵
- قربانی کی حقیقت ۲۱۷
- قربانی اور صدقہ میں فرق ۲۱۸
- منکرین قربانی پر طریق رد نمبر ۱ .... ۲۱۸
- طریق رد نمبر ۲ .... ۲۱۹
- متعلقاتِ قربانی کی وضاحت ۲۲۳

شعب الایمان

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاالایمان بضع و سبعون شعبة ستر سے کچھ اوپر ایمان کی شاخیں اور شعبے ہیں،اوپر کی شاخ لا الہ الا اللہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔یہ دلیل ہے کہ دل میں اللہ کی اتنی عظمت بیٹھ چکی ہے کہ اس کے سوا کسی کو معبود بنانے کو تیار نہیں اور ایمان کا ادنیٰ درجہ اماطة الاذی عن الطریق ہے، یعنی راستے سے ایذاء دہ چیزوں کو اٹھا کر پھینک دینا تاکہ مخلوق کو تکلیف نہ پہنچے۔ تو ایک ایمان کا اوپر کا سرا بتلایا گیا ہے جو اللہ سے ملا ہوا ہے اور ایک نیچے کا سرا بتلایا گیا ہے جو مخلوق سے ملا ہوا ہے اور دونوں کا منشاء بتلادیا والحیاء شعبة من الایمان یہ دونوں شعبے وہ برتے گا جس میں حیاء اور انکسار نفس موجود ہو۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

◆ احوالِ واقعی	۲۲۵
◆ حدیث کا ترجمہ	۲۲۶
◆ ایمان کی دو بنیادیں	۲۲۶
◆ اللہ نے اپنے قانون کو حجت و برہان اور بصیرت سے منوایا ہے	۲۲۷
◆ عقل و بصیرت سے کئے ہوئے عمل سے ہی درجات بلند ہوتے ہیں	۲۲۸
◆ شریعت اسلامی کی نظر میں عقلمند کون ہے؟	۲۲۸
◆ مدار نجات اللہ کا فضل ہے	۲۲۹
◆ اسلام میں اعتراف عجز، عبادت کی روح ہے	۲۳۰
◆ عظمت و محبت خداوندی ہی ایمان کی بنیاد ہے	۲۳۲
◆ ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ	۲۳۳
◆ کمال ایمان کیسے نصیب ہو سکتا ہے	۲۳۵
◆ مومن کا کوئی لمحہ ذکر اللہ سے خالی نہیں ہونا چاہئے	۲۳۸
◆ مومن کا قلب بھی ذاکر ہونا چاہئے	۲۴۰
◆ معاشرے کے تمام گوشوں میں ذکر اللہ موجود ہے	۲۴۱
◆ اولیاء اللہ میں بزرگی کی دو شانیں	۲۴۱
◆ حضرات صحابہؓ میں بزرگی کی دو شانیں	۲۴۴
◆ انبیاء علیہم السلام میں بزرگی کی دو شانیں	۲۴۶
◆ تواضع بزرگی کی سب سے بڑی علامت ہے	۲۴۷
◆ عظمت و کبریائی صرف اللہ کی شان ہے	۲۴۸
◆ تواضع علامت آدمیت ہے	۲۵۰
◆ حیادار آدمی ہی عبادت و خدمت کر سکتا ہے	۲۵۳

ذکر اللہ

سارے جہان ایک طرف، عرش و کرسی، لوح و قلم ایک طرف اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک ایک طرف جو عظمت اس قلب مبارک کی ہوگی، وہ عرش و کرسی، لوح و قلم اور تمام جہانوں کی نہ ہوگی۔ اس لیے کہ آپ کا قلب مبارک اللہ کے ذکر کا خزانہ ہے۔ اور وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ، اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔ جب یہ آتا ہے تو ساری چیزیں ہلکی پڑ جاتی ہیں۔ کسی چیز میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- اعمالِ شرعیہ کی روح ۲۵۵
- دنیا کے ایک ایک جز میں ذکر اللہ سے زندگی ہے ۲۵۷
- زراعت، تجارت سے نہیں، دنیا دیانت سے قائم ہے ۲۵۸
- نظام حکومت سیاست سے نہیں، دیانت سے چلتا ہے ۲۵۹
- سلاطینِ دنیا بدنوں پر اور اہل اللہ قلوب پر حکومت کرتے ہیں ۲۶۳
- اہل اللہ کی بادشاہت دنیا میں ان کی عدم موجودگی میں بھی قائم رہتی ہے ۲۶۴
- اہل اللہ دنیا پر کیوں لات مارتے ہیں؟ ۲۶۵
- اہل اللہ کی سلطنت کی وسعت ۲۶۷
- اللہ کے نام کے بغیر بڑی سے بڑی مخلوق کوئی حقیقت نہیں رکھتی ۲۶۸
- قلبِ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) ذکر اللہ کا خزانہ ہے ۲۶۹
- اللہ کے اسم مبارک کا وزن ۲۶۹
- حضورِ قلب سے ذکر میں وزن پیدا ہوتا ہے ۲۷۱
- الفاظ میں جذباتِ قلب سے تاثیر پیدا ہوتی ہے ۲۷۱
- یادِ حق دل میں آجائے تو بندہ عرشی بن جاتا ہے ۲۷۳
- ذکر اللہ کا مظہر اتم ۲۷۴
- روح نہ ہونے کے شبہ سے محض صورت عمل کو ترک نہ کیا جائے ۲۷۶
- ذکرِ کثیر کے حصول کی سہل صورت ۲۷۷

فضیلتِ یوم الجمعۃ

جمعہ ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ایک جگہ جمع ہوں، اور جمع ہونے کی صورت یہ ہے کہ منہ اللہ کی طرف ہو۔ قبلہ کا استقبال کرو۔ جب ایک رُخ ہوگا، مجتمع ہو جاؤ گے۔ جب آمنے سامنے ہوں گے، تب ٹکر پیدا ہوگی۔ جب سب کا رُخ ایک طرف ہوگا، ٹکراؤ کی کوئی وجہ نہیں۔ جیسے یہاں ظاہری طور پر ہے اگر باطنی طور پر خدا کی طرف منہ کر لیا جائے تو وہاں بھی وہی شکل پیدا ہو جائے گی...... تو جمعہ کا دن بتلاتا ہے کہ جیسے تم ظاہر میں جمع ہو گئے ہو، باطن میں بھی ہم نے تمہیں جمع کیا ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- تمہید ۲۷۹
- ایک حدیث ۲۸۰
- میدانِ مزید ۲۸۰
- میدانِ مزید میں اہل جنت کی حاضری ۲۸۱
- میدانِ مزید میں اہل علم کی احتیاج ۲۸۲
- دنیا میں میدانِ مزید کی مثال ۲۸۳
- خطبہ جمعہ کے آداب عام خطبات سے زیادہ ہیں ۲۸۳
- حق تعالیٰ کا انتخاب ۲۸۴
- جنت کا موسم ۲۸۵
- سید الایام ۲۸۶
- ہر انسان اس وقت جہنم میں ہے اس سے نکلنے کی تدبیر ۲۸۸
- جمعہ یوم امتحان ۲۸۸
- حق فاروقِ اعظمؓ کے ساتھ گھومتا ہے ۲۸۹
- مجموعہ امت میں ذوقِ نبوت ۲۸۹
- امتِ محمدیہ کی مثال ۲۹۰
- علمائے امت محمدیہ کی خدمات ۲۹۰
- آفتابِ عالم تابؐ کی آمد آمد ۲۹۱
- مختلف صورتوں میں ایک ہی نور ۲۹۲
- امت محمدیہ سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا ۲۹۲
- حضرت شیخ الہند کا زریں مقولہ ۲۹۳
- حسنِ ظن اختیار کرنے کی ضرورت ۲۹۳
- ہر جگہ سے آدمی حصولِ خیر کرتا رہے ۲۹۴
- پوری امت میں خیر کیسے نمایاں ہو سکتی ہے؟ ۲۹۵
- بحیثیت مجموعی امت بھی معصوم ہے ۲۹۶
- ہمہ وقت اللہ کا دھیان رہے ۲۹۶
- اسلام میں ترکِ دنیا کا مفہوم ۲۹۷
- جمعہ کی تعلیم ۲۹۸

اسلام میں عید کا تصور

عید کا حاصل ذکرِ الٰہی، عبادتِ ربانی، خدمتِ خلق اللہ، روح اجتماعیات، دنیا میں رہ کر آخرت کو نہ بھولنا اور زندوں کے ساتھ ہی اموات سے بھی رشتہ جوڑے رکھنا اور ان میں سے ہر چیز کی روح اور معیار ایمان کو قرار دینا...... نہ کہ ظاہر داری اور دنیا سازی...... تاکہ خلق اللہ کے ساتھ اللہ سے وابستگی اصلِ اصول ثابت ہوتی رہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہ

فہرست مضامین

◆ اجتماعیتِ عامہ ۲۹۹
◆ حکمتِ دوگانہ ۳۰۰
◆ حکمتِ فطرانہ و قربانی ۳۰۰
◆ روحِ عید ۳۰۰
◆ عظیم اجتماعیت ۳۰۱
◆ عوالم گیر اجتماعیت ۳۰۱
◆ خوش قسمت قوم ۳۰۲
◆ عید کا اصلِ اصول ۳۰۲
◆ سال بھر کے لئے نورانی اثرات ۳۰۲
◆ اجتماعیاتی صلاحیت کا شکرانہ ۳۰۳
◆ حقیقت رمضان ۳۰۳
◆ فردِ مسلم کا درجہ امت ۳۰۳

جواہر انسانیت

انسانی سیرت کے اجزائے ترکیبی چار نکل آئے، ایک علم صحیح اور علم نافع، اور عمل صحیح اور عمل صالح، اور اخلاص کامل اور ایک فکر سلیم۔

یہ چار چیزیں انسان میں جمع ہوں گی تو کہا جائے گا کہ یہ انسان صحیح قسم کا انسان ہے۔ جس میں علم کے بجائے جہالت ہو، کہیں گے یہ حیوان ہے، علم ہو مگر عمل نہ ہو تو کہیں گے عالم بے عمل ہے، گردن زدنی ہے۔ عمل ہے مگر منافق ہے، مخلص نہیں ہے تو کہیں گے نامعقول ہے مخلص بھی ہے مگر بے فکرا ہے تو کہیں گے کہ نہایت غلط قسم کا انسان ہے۔ جس میں علم بھی ہو، عمل بھی ہو، اخلاص بھی ہو، اور آخرت کا فکر صحیح بھی ہو، کہا جائے گا یہ قابل اعتماد انسان ہے۔ ہے جس کی انسانیت کی داد دی جاسکے۔ اور کہا جاسکے کہ یہ انسان ہے۔

حضرت حکیم الاسلام مد ظلہٗ

فہرست مضامین

- سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت ۳۰۵
- سیرت انسانیت ۳۰۶
- مادۂ انسان کے تخلیقی مراحل ۳۰۶
- تخلیق انسان کا پہلا مرحلہ ۳۰۷
- تخلیق انسان کا دوسرا مرحلہ ۳۰۷
- تخلیق انسان کا تیسرا مرحلہ ۳۰۸
- تخلیق انسان کا چوتھا مرحلہ ۳۰۸
- تخلیق انسان کا پہلا ظلمانی مکان ۳۰۸
- تخلیق انسان کا دوسرا ظلمانی مکان ۳۰۹
- تخلیق انسان کا تیسرا ظلمانی مکان ۳۰۹
- فضیلت یا ندامت ۳۰۹
- انسان کی خود فریبی ۳۰۹
- انسان کا حقیقی تعارف ۳۱۰
- ستار العیوب کا احسان ۳۱۱
- ظاہری خوشنمائی کی حقیقت ۳۱۱
- عقل کی گمراہی ۳۱
- نجاست کا عشق ۳۱۲
- عشق سیرت ۳۱۳
- سیرت کی سرداری ۳۱۳
- صورت سبب فتنہ اور سیرت ذریعہ نجات ہے ۳۱۴
- معیار شرافت ۳۱۴
- معیار کمال ۳۱۵
- مرکز محنت ۳۱۶
- مدار علوم ۳۱۸
- معیت اہل حق سے انکشاف حقائق ۳۱۹
- مرکز تجلیات ربانی ۳۲۱
- سیرت انسانی کا جوہر اول ۳۲۱
- علم ضروری کی مقدار ۳۲۲
- قلب کا امتیازی ادراک ۳۲۳
- حقیقت علم ۳۲۳

فہرست مضامین

◆ علم الفرقان	۳۲۳
◆ ترتیب استفتاء	۳۲۴
◆ سیرت انسانی کا دوسرا جوہر	۳۲۴
◆ تحمل علم کا فتنہ	۳۲۵
◆ سیرت انسانی کا تیسرا جوہر	۳۲۶
◆ رضائے خلق کا طریق	۳۲۶
◆ مالک کی نگاہ کی عظمت	۳۲۶
◆ تسخیر خلائق	۳۲۷
◆ قلب مشرک کا تذبذب	۳۲۸
◆ قلب موحد کا یقین	۳۲۸
◆ روح عمل	۳۲۹
◆ سیرت انسانی کا چوتھا جوہر	۳۲۹
◆ مقربین بارگاہ الٰہی کی گرفت کا انداز	۳۳۰
◆ مدار نجات فضل ہے عمل نہیں	۳۳۲
◆ توفیق عمل، علامت فضل ہے	۳۳۳
◆ روح شکر	۳۳۳
◆ سند شکر	۳۳۴
◆ نفی عمل سے اثبات عمل	۳۳۴
◆ طریق عزت	۳۳۵
◆ سلسلۂ عمل پر نگاہ کا ثمرہ	۳۳۶
◆ دولت تفکر	۳۳۶
◆ روحانیت کے اربعہ عناصر	۳۳۶
◆ کمال علم نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)	۳۳۷
◆ کمال عمل نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)	۳۳۸
◆ معیار اعمال	۳۳۹
◆ امر حقیقت	۳۳۹
◆ کمال اخلاص نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)	۳۴۱
◆ کمال فکر نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)	۳۴۱
◆ روح ایمان	۳۴۲
◆ فکر عظیم	۳۴۲
◆ دستور زندگی	۳۴۳
◆ کتاب وسنت کی چٹان	۳۴۴
◆ اسوۂ صحابہ	۳۴۵
◆ معیار صحابہ	۳۴۵
◆ طبقہ صحابہؓ کی تقدیس	۳۴۶
◆ اعلان رضا	۳۴۶
◆ اعمال صحابہؓ کی تقدیس	۳۴۷
◆ کمال معرفت صحابہؓ	۳۴۷
◆ قلوب صحابہؓ کی تقدیس	۳۴۸
◆ فرقہ ناجیہ	۳۴۸
◆ خطاء اجتہادی	۳۴۹
◆ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تقدس	۳۴۹
◆ اکمل السیر	۳۴۹

حیوۃ طیبہ

ایمانی زندگی نہ ہو محض عقل ہو تو عقل میں زنا بھی حلال ہے اور نکاح بھی، اس میں اس کا کوئی امتیاز نہیں کہ یہ نکاح ہے اور وہ سفاح۔ طبعِ بشری میں محض نفس کی رضا پیشِ نظر ہوتی ہے۔ عقل آجائے تو مفادِ عامہ سامنے آتا ہے جسے ہم جمہوریت کہیں گے اور جمہوریت میں یہی ہوتا ہے کہ سب کی رائے لے لے اور سب کی خوشی حاصل ہو جائے۔ اور جب ایمانی زندگی آتی ہے تو جمہور سے بالا تر ہو کر خدا کی رضا کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو...... جمہور راضی ہوں یا نہ ہوں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- زندگی ایک مقدس امانت ۳۵۱
- زندگی کا مادہ ۳۵۲
- انسانی زندگی کا دورِ اول "حیوانیت" جاہل بادشاہ ۳۵۲
- انسانی زندگی کا دورِ ثانی عقل و شعور ۳۵۳
- انسانی زندگی کا باشعور حکمران ۳۵۵
- انسانی زندگی کا تیسرا دور ایمان کی حکومت ۳۵۶
- عرفانی زندگی، منشاء خداوندی کی حکومت ۳۶۱
- وحدانی زندگی۔ مقام فنائیت ۳۶۴
- اہل اللہ کی زندگی کی جھلک ۳۶۵

تاثیر الاعمال

ایک زکوۃ کی خاصیت تھی کہ حسن معاشرت پیدا ہو...... ایک روزے کی خاصیت تھی کہ نفس کے اندر سے شہوانی جذبات گھٹ جائیں ...... ایک زکوۃ کی خاصیت یہ تھی کہ نفس کے اندر سے بخل کارذیلہ مٹ جائے۔ اسی طرح ایک نماز کی خاصیت ہے کہ اس سے دیدار خداوندی کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے...... اور تڑپ بھی پیدا ہو جائے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

◆ تمہید	۳۶۷	◆ دربار خداوندی میں شراب طہور کا دور	۳۷۹
◆ خواص اعیان	۳۶۸	◆ حضرت داؤد علیہ السلام کی تلاوت مناجات	۳۷۹
◆ خواص افعال	۳۶۸	◆ جمال خداوندی کے دیدار کا سوال	۳۷۹
◆ روزے کی خصوصیت	۳۶۸	◆ نعمت مزید	۳۸۰
◆ زکوۃ کی خصوصیت	۳۶۹	◆ یوم المزید اور اس کے آداب	۳۸۱
◆ ظہور خواص کی شرط	۳۶۹	◆ رؤیت باری کے بارے میں معتزلہ کا مسلک	۳۸۲
◆ ماہرینِ خواص کی اطاعت	۳۶۹	◆ مسلک اہل حق	۳۸۲
◆ نماز کی خصوصیت	۳۷۰	◆ مناظرے میں معتزلہ کی شکست	۳۸۲
◆ دیدار خداوندی کے مراتب	۳۷۰	◆ دیدار خداوندی میں درجہ بدرجہ ترقی	۳۸۳
◆ فجر و عصر کی خصوصیت	۳۷۱	◆ روح کا عروج اور عرش کے سامنے سجدہ	۳۸۴
◆ فجر و عصر میں نزول ملائکہ کی حکمت	۳۷۱	◆ دینوی جذبات کا برزخ میں ظہور	۳۸۴
◆ خلافت آدم پر شبہ کا حکیمانہ جواب	۳۷۲	◆ دنیوی جذبات کا آخرت میں ظہور	۳۸۵
◆ خلافت آدم پر شبہ کا حکیمانہ جواب	۳۷۲	◆ سایۂ عرش میں اشتیاق نماز	۳۸۶
◆ ملائکہ پر اتمام حجت	۳۷۵	◆ لطف نماز	۳۸۶
◆ ذکر انسانی پر نظام دنیا قائم ہے	۳۷۶	◆ حقیقی عبادت	۳۸۶
◆ جلوۂ خداوندی روح عبادت ہے	۳۷۷	◆ جذبۂ عبادت کی تسکین	۳۸۷
◆ دنیا میں تجلیات ربانی کا ظہور	۳۷۷	◆ مجموعۂ شریعت پر عمل کی تاثیر	۳۸۸
◆ تجلی اخروی	۳۷۷	◆ علم و عمل کی بنیادیں	۳۸۹
◆ دربار خداوندی کا انعقاد	۳۷۷	◆ صدق طلب	۳۸۹
◆ آخرت میں رؤیت خداوندی کا مقام	۳۷۸	◆ حکیمانہ بات	۳۹۱
◆ دربار خداوندی میں اہل جنت کی شرکت	۳۷۸	◆ اختتام جلسہ	۳۹۱

عمل صالح

نیکی کرنے سے امید اور بدی کرنے سے مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ جو ہمیشہ نالائقیاں کرتا ہے، اسے مایوسی ہوتی ہے کہ مجھے کچھ نہیں ملنا ملانا۔ بس آقا کی طرف سے جوتیاں پڑیں گی اور جو کام عمدہ کرتا ہے، اسے تمنا رہتی ہے، کاش! میرے سے کوئی پوچھے تو نے کیا کام کیا؟ تاکہ میں بتاسکوں میں نے یہ کیا، یہ کیا۔ مجھے انعام ملے گا اور مالک کے دل میں میری قدر بڑھے گی۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہ

فہرست مضامین

◆ تمہید ۳۹۳
◆ مثال ایک کھلی دلیل ہوتی ہے ۳۹۴
◆ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے تین بھائیوں کی مثال ۳۹۸
◆ بڑے بھائی کا سلوک ۳۹۹
◆ قلب فقط آخرت کا عضو ہے ۴۰۱
◆ منجھلے بھائی کا سلوک ۴۰۳
◆ چھوٹے بھائی کا حسن سلوک ۴۰۴
◆ نیکی ہر عالم میں کار آمد ہوتی ہے ۴۰۶
◆ عمل صالح کی ضرورت ۴۰۸
◆ روز کے روز محاسبۂ اعمال کرتے رہنا چاہئے ۴۰۸
◆ نیکی سے امید اور بدی سے مایوسی پیدا ہوتی ہے ۴۰۹
◆ نیکی اور بدی دنیا میں بھی نمایاں ہو کر رہتی ہے ۴۱۲
◆ عملی زندگی اختیار کرنے کی ضرورت ۴۱۴

دنیاو آخرت

اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ دنیا بھی ایک برابر کا عالم ہے، آخرت بھی ایک برابر کا عالم ہے محض راہ گزر نہیں ہے کہ دنیا تو ایک راستہ ہے یہاں سے چل پڑو اور آخرت میں پہنچ جاؤ بلکہ فرمایا: الدنیا مزرعة الاخرة "دنیا آخرت کی کھیتی ہے" جیسا بیج یہاں ڈال دو گے، ویسا ہی پھل آخرت میں پاؤ گے۔ تو دنیا گویا کھیتی کی جگہ ہے۔ انسان کا کام بیج ڈالنا ہے۔ اچھا بیج ڈالے گا، اچھا پھل نکل آئے گا، برا بیج ڈالے گا، برا پھل

گندم از گندم بروید جو از جو
از مکافات عمل غافل شو

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

فہرست مضامین

◆ احوال واقعی	۴۱۵
◆ تذکرۂ دنیا کا مقصد	۴۱۶
◆ تذکرۂ آخرت کا مقصد	۴۱۶
◆ آخرت کو عقل سے سمجھنے کا نقصان	۴۱۶
◆ منکرینِ آخرت کا نظریہ	۴۱۷
◆ دنیا کو فقط راہ گزر ماننے کا نظریہ	۴۱۷
◆ پہلے نظریے کے دنیوی آثار	۴۱۷
◆ دوسرے نظریئے کے دنیوی آثار	۴۱۸
◆ عیسائیت اور دنیا	۴۱۸
◆ اسلامی نقطۂ نگاہ	۴۱۹
◆ دنیا میں رہنے کا انداز	۴۱۹
◆ دولت و عبادت کا باہمی ارتباط	۴۲۰
◆ وسائل عبادتُ کا حکم	۴۲۱
◆ دنیا وسیلۂ آخرت	۴۲۱
◆ کروڑ پتی امام	۴۲۲
◆ تجارت میں امام ابی حنیفہؒ کی احتیاط	۴۲۲
◆ مصارف سے مداخل کا اندازہ	۴۲۳
◆ امام ابی حنیفہؒ کی طرف سے علماء کرام کی تنخواہیں	۴۲۳
◆ امام ابی حنیفہؒ کا غرباء پر خرچ	۴۲۳
◆ ایک مقروض سے امام صاحبؒ کا معاملہ	۴۲۴
◆ عبادت مالیہ کی توفیق کا معیار	۴۲۴
◆ اظہار نعمت کا موقع	۴۲۵
◆ شخصی احوال قابل اتباع نہیں	۴۲۵
◆ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کی ایک جھلک	۴۲۶
◆ توسعات شریعت	۴۲۷
◆ اتباع بلا حال	۴۲۷
◆ تعظیم صاحب حال	۴۲۷
◆ توسعات شرعیہ کا دائرہ	۴۲۸
◆ دولت دنیا کی مدح و ذم کا معیار	۴۲۸
◆ استعمال دنیا	۴۲۸
◆ محبت طبعی	۴۲۹

فہرست مضامین

◆ دولت دین و دنیا ۴۲۹
◆ اللہ میاں کے بنگلے ۴۳۰
◆ حضرت جابرؓ کا تمول اور قلبی کیفیت ۴۳۰
◆ حضرات صحابہؓ کا مال کے بارے میں انوکھا جھگڑا ۴۳۱
◆ دنیا آخرت کی کھیتی ہے ۴۳۱
◆ کاشتکار کا فریضہ ۴۳۲
◆ مقام آخرت ۴۳۲
◆ تجارت میں مخفی آخرت ۴۳۳
◆ موت میں مخفی آخرت ۴۳۴
◆ دوسرے کی نیکی ذریعہ ترقی ۴۳۵
◆ دوسرے کی برائی ذریعہ عبرت ۴۳۵
◆ حضرات کا احترام ۴۳۵
◆ دعاء ۴۳۵

حقیقتِ نکاح

سب سے بڑا سلسلہ دنیا میں انسانوں کو ملانے والا نکاح کا سلسلہ ہے جس سے دو اجنبی جُڑ جاتے ہیں، جن میں پہلے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور اچانک ان میں ایسا جوڑ لگتا ہے کہ منافع مشترک، اتحادِ باہمی اور خاندانی اشتراک سے ایسی محبت و مودت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس سے پہلے اتنی محبت اور مودت نہیں دیکھی گئی۔ نکاح جوڑ لگانے کا سلسلہ ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام اس سلسلے کے حامل ہیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہ

فہرست مضامین

◆ احوالِ واقعی	۴۳۷	◆ کم خرچ نکاح میں برکت دی جاتی ہے	۴۵۳
◆ دنیا جنت اور جہنم سے مرکب ہے (تمہید)	۴۳۸	◆ معاملات میں سب سے زیادہ آسان نکاح ہے	۴۵۴
◆ عالم غیب میں خیر و شر کا سلسلہ	۴۴۱	◆ نکاح میں معمولی دو خرچ ہیں	۴۵۵
◆ شیطان کے کہنے سے نیکی بھی درست نہیں	۴۴۰	◆ نکاح میں زیادہ خرچ کا نتیجہ	۴۵۵
◆ دنیا میں خیر و شر کا سلسلہ	۴۴۱	◆ نکاح میں پاک ثمرات کب ظاہر ہوتے ہیں	۴۵۶
◆ خیر و شر کے سلسلوں کا کام	۴۴۲	◆ نکاح کے احکام	۴۵۷
◆ انسانوں کو ملانے والا سب سے بڑا سلسلہ	۴۴۳	◆ خاوند کی ناقدری کا انجام	۴۵۷
◆ عورت کے ذریعہ خاندانوں میں محبت قائم ہوتی ہے	۴۴۴	◆ عورت مرد کو اپنی ہدایت پر نہ چلائے	۴۵۹
◆ نکاح کی غرض و غایت	۴۴۵	◆ عورت پر خاوند کیسے مہربان ہو سکتا ہے	۴۶۰
◆ نکاح اللہ کی قدرت کی نشانی بھی ہے	۴۴۵	◆ عورت کی طرف سے نافرمانی پر تنبیہ کے درجات	۴۶۱
◆ خانگی زندگی میں سکون کا راز	۴۴۷	◆ عند الضرورت آدابِ طلاق	۴۶۳
◆ نیک بیوی آدمی کی سعادت کی علامت ہے	۴۴۸	◆ اللہ کے جوڑ کو باقی رکھنے والے ہی نیک نہاد ہیں	۴۶۳
◆ بیوی کے انتخاب کا معیار	۴۴۹	◆ تبریک	۴۶۴
◆ زوجین میں لڑائی بڑے فتنے کا پیش خیمہ بنتی ہے	۴۵۰	◆ پیغام ہدایت دو مکتوب۔ اول	۴۶۵
◆ بیوی پر خاوند کی انتہائی اطاعت واجب ہے	۴۵۲	◆ دوم	۴۶۹

اظہار تعزیت

اذکروا محاسن موتا کم اپنی میت کی خوبیاں بیان کیا کرو۔ تا کہ ان خوبیوں کے تذکرہ سے ایک طرف تو میت کی طرف سے قلوب میں محبت پیدا ہو، اور محبت کے داعیہ سے لوگ اسے ثواب و دعا سے یاد رکھیں۔ اور دوسرے یہ کہ اس کی خوبیوں کے تذکرے سے خود ہم میں ان خوبیوں کے حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو اور ہم بھی اس کے نقشِ قدم پر چل کر وہی مقام حاصل کریں جو مرنے والے نے حاصل کیا تھا۔

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ

فہرست مضامین

- موت کا جام ۴۷۳
- فرقِ مراتب ۴۷۴
- احسانات کا غم ۴۷۴
- سلامتی فطرت ۴۷۵
- ضمیر کی سچائی ۴۷۵
- دینی مقبولیت ۴۷۶
- اعتمادِ اکابر ۴۷۶
- انفرادی اعتماد ۴۷۷
- رسمی نوحہ و بکاء ۴۷۸
- میت کی راحت رسانی ۴۷۸
- ایصالِ ثواب کی آسانی ۴۷۸
- محاسنِ مرحوم ۴۷۹
- مرحوم کی یادگار ۴۷۹

آدابِ دعاء

دعاء عبادت کا مغز ہے...... اس لئے کہ عبادت کے معنی غایت تذلل کے ہیں۔ انتہائی ذلت اختیار کرنا۔ یہ عبادت کی حقیقت ہے۔ آدمی غایت درجہ ذلیل ہو جائے اور اتنی ذلت اختیار کرے کہ اس ذلت کے بعد کوئی درجہ ذلت کا باقی نہ رہے۔ یہ حقیقت عبادت ہے تو ہاتھ پھیلا کر مانگنے سے زیادہ کسی چیز میں ذلت نہیں۔ یہ انتہائی طور پر ذلیل چیز ہے کہ آدمی بھیک مانگے۔ اللہ کے آگے جب بھیک مانگے گا تو بندے کا حق ہے کہ وہ انتہائی طور پر ذلیل بن جائے۔ اس لئے کہ انتہائی ذلت اس ذات کے سامنے اختیار کی جاسکتی ہے جس کی عزت انتہائی ہو۔ جس کے بعد کوئی درجہ عزت کا باقی نہ ہو...... تو اللہ کی ذات انتہائی عزت میں ہے۔ اس کے سامنے ذلت بھی انتہائی پیش کی جائے گی جس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ تو دعاء مانگنے میں انتہائی ذلت ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

فہرست مضامین

◆ سید الایام	۴۸۱	◆ سوال ممانعت	۴۹۰
◆ شان جامعیت	۴۸۲	◆ سوال محبت	۴۹۰
◆ اجزائے انسان کی جامعیت	۴۸۲	◆ خود فرمائش	۴۹۱
◆ جمع شرائع	۴۸۲	◆ ترک تکلف	۴۹۲
◆ اجتماع قیامت	۴۸۳	◆ اسلامی بے تکلفی	۴۹۲
◆ تعیین جمعہ میں اقوام کا امتحان	۴۸۳	◆ ذلت سوال	۴۹۳
◆ جمعہ میں قبولیت دعاء کی گھڑی	۴۸۴	◆ بندہ کے سوال سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی	۴۹۳
◆ قلبی دعاء قابل قبول ہے	۴۸۴	◆ تعلیم دعاء	۴۹۴
◆ مال حرام قبولیت دعاء میں مانع ہے	۴۸۵	◆ علامت قبولیت	۴۹۴
◆ دعاء بالقیود	۴۸۵	◆ اہل قبولیت سے مشابہت کا اثر	۴۹۵
◆ وسعت رحمت کے منافی قید سے بھی دعاء رد ہو جاتی ہے	۴۸۶	◆ اسلامی صورت	۴۹۵
◆ مانگنے کا ڈھنگ	۴۸۶	◆ تشبہ باسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ثمرہ	۴۹۶
◆ فوری قبولیت	۴۸۷	◆ مشابہت کا تمدنی فائدہ	۴۹۶
◆ ازدیاد قبولیت	۴۸۷	◆ سنت نبوی ﷺ سے کمال عشق ومحبت	۴۹۷
◆ تاخیر قبولیت	۴۸۷	◆ عطیۂ خداوندی کی قدر ومنزلت	۴۹۸
◆ مصلحت تاخیر	۴۸۷	◆ احترام رزق	۴۹۸
◆ تاخیر قبولیت پر تشکر	۴۸۸	◆ احترام لباس	۴۹۹
◆ دعاء کا اخروی ذخیرہ	۴۸۹	◆ ہیئت احترام	۴۹۹
◆ دعاء میں تفویض	۴۸۹	◆ احکام شریعت میں فوائد اخروی ودنیوی	۵۰۰
◆ دعاء کا مقام عبادت	۴۸۹	◆ آثار لباس	۵۰۰
		◆ حرف آخر	۵۰۱

اہمیت تزکیہ

اصل میں جرائم سے بچانے والا خدا کا خوف ہے، پولیس نہیں بچا سکتی، اگر پولیس سے، ہتھیاروں سے اور فوجی قوت سے گناہوں کو روکا جاسکتا تو آج کی دنیا سب سے زیادہ متقی ہوتی، اس لئے کہ آج نہ فوج کی کمی، نہ پولیس کی کمی، نہ ہتھیاروں کی کمی...... زمانے میں کبھی ایسے نئے نئے ہتھیار نہیں دیکھے گئے جتنے آج کے زمانے میں ہیں۔ فوج کی اتنی تعداد دنیا میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی جتنی آج ہے، پولیس اتنی کبھی نہیں بنی جتنی آج ہے۔ حتیٰ کہ راستے راستے پر پولیس ہے۔ لیکن جتنی یہ چیزیں بڑھتی جارہی ہیں، جرائم بھی بڑھتے جارہے ہیں، بناوہی ہے کہ جرائم کا روک لینا پولیس کا کام نہیں ہے جب تک انسان کی اخلاقی حالت اندر سے صحیح نہ ہو۔ اور جب تک اللہ کا خوف سامنے نہ ہو۔ آدمی جرائم سے نہیں بچ سکتا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

حرف آغاز	۵۰۳	قوانین کی کثرت سے جرائم کم نہیں ہو سکتے	۵۱۳
خیر وشر سے مرکب مخلوق	۵۰۴	تقویٰ شعار ہی جرم سے بچتا ہے	۵۱۳
انسان کی ترقی کا راز	۵۰۴	انسداد جرائم میں پارلیمنٹ کی ناکامی	۵۱۴
جذبات خیر وشر کا محرک	۵۰۴	انسداد جرائم میں اسلام کا طریق کار	۵۱۵
محرکات خیر وشر کی جنگ اور ان کی مدد	۵۰۵	قانون حکومت اور قانون الٰہی کا فرق	۵۱۶
اوامر ونواہی کی حکمت	۵۰۶	حقیقت معصیت	۵۱۷
تقدیم نواہی	۵۰۶	تربیت کا مرکزی نقطہ	۵۱۷
وسائل منہیات سے احتراز	۵۰۷	تطہیر قلب	۵۱۸
حکمت حجاب	۵۰۸	درجات معصیت	۵۱۹
ممانعت اختلاط	۵۰۸	درجات توبہ	۵۱۹
مسجد نبوی میں صحابیہؓ کی شرکت جماعت کے لئے درخواست	۵۰۸	قانونی سزا	۵۱۹
طریق تربیت	۵۱۰	نسخہ تطہیر	۵۲۰
آج کی عورت کا تمدن	۵۱۰	ذکر معاشرت	۵۲۰
لباس کی عریانی	۵۱۱	ذکر دائمی	۵۲۱
اجتناب منکرات کی تاکید	۵۱۲	تمرین ذکر	۵۲۲
سوسائٹی کی تباہی کے عوامل	۵۱۲	دوام ذکر کا ثمرہ	۵۲۲
اخلاقی جرات کے بغیر استیصال جرائم ممکن نہیں	۵۱۳	قبر وحشر میں ذکر کا محافظتی کردار	۵۲۳
		مدار محافظت	۵۲۳
		ذکر اللہ کے دو اجزاء	۵۲۴
		دعاء	۵۲۴
		تنبیہ	۵۲۵

فضیلتِ تقویٰ

عام طور سے دنیا میں فسق و فجور، مار دھاڑ، بدامنی، بدنیتی اور فسادات عام ہوتے جا رہے ہیں۔ ارتکابِ جرائم کی وجہ یہ نہیں کہ اس دور میں پولیس اور فوج کی کمی ہے...... بلکہ دلوں میں اللہ کا ڈر اور خوف باقی نہیں ہے اگر یہ ہو تو آدمی میں ارتکابِ جرائم کی ہمت ہی نہیں ہوگی۔ خواہ وہاں پولیس اور فوج ہو یا نہ ہو۔ پھر چاہے تنہائی میں بھی ہو وہاں بھی گناہ سے بچے گا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- احوالِ واقعی ۵۲۷
- طریقِ سلف اور وصیتِ تقویٰ ۵۲۸
- نتائجِ تقویٰ ۵۲۸
- تقویٰ امنِ عالم کا ضامن ہے ۵۲۹
- تقویٰ کے بغیر قیامِ امن ناممکن ہے ۵۲۹
- باطنی فساد بھی تقویٰ سے رفع ہوتا ہے ۵۲۹
- تقویٰ محاسبۂ آخرت سے نجات کا ذریعہ ہے ۵۳۰
- تقویٰ میں احتیاط کا پہلو ۵۳۱
- درجاتِ تقویٰ ۵۳۲
- حصولِ تقویٰ ۵۳۲
- جاہل، مقامِ تقویٰ سے ناآشنا ہے ۵۳۳
- قدر، تقویٰ بقدرِ عظمت ۵۳۴
- تقویٰ کا اعلیٰ ترین ذریعہ ۵۳۵
- فقر و غنا میں تقویٰ کی ضرورت ۵۳۵
- تقسیم دولت احوالِ قلوب کے مطابق ہے ۵۳۵
- باطنی دولت ۵۳۶
- دولت معرفت کا تفوق ۵۳۷
- صبر و شکر کے ذریعہ ترقی درجات ۵۳۸

طریقِ اصلاح

اگر آپ اپنے اخلاق کو درست کرنا چاہیں تو راستہ بند نہیں ہے۔ ہاں اپنے اخلاق کی آپ ہی اصلاح نہ چاہیں تو پیغمبر کے زمانے میں لوگ موجود ہوتے ہیں۔ اپنی اصلاح نہیں کرتے جب کرنا چاہیں تو اللہ کے رسول نے راستے بتلادئے، کرسکتے ہیں۔ نہ چاہیں تو خود پیغمبر بھی نصیحت کرے، آدمی درست نہیں ہو سکتا، جنہیں اپنی اصلاح منظور تھی، اللہ کے رسول کے قول پر عمل کیا۔ کوئی صدیقؓ بنا، کوئی فاروقؓ بنا، کوئی ذوالنورینؓ بنا، کوئی علی المرتضیٰؓ بنا۔

اور جنہیں اصلاح مقصود نہیں تھی۔ کوئی ابوجہل بن گیا، کوئی ابولہب بن گیا، کوئی مسیلمہ کذاب بن گیا، غرض بگڑے ہی رہے اور نبیٔ وقت سے بھی ان کی اصلاح نہ ہوسکی اس لئے کہ انہیں خود اپنی اصلاح منظور نہیں تھیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

◆ دنیا کی ایک عام حالت (تمہید) ۵۴۱
◆ برائی انسان کی ذات میں موجود ہے ۵۴۳
◆ انسان میں کمال منجانب اللہ ہے ۵۴۶
◆ اہلِ کمال میں تواضع بھی بدرجہ کمال ہوتی ہے ۵۴۷
◆ رسالت و بشریت ۵۴۸
◆ علم واخلاق کے حصول کا طریق اول، فیضِ صحبت ۵۵۰
◆ فیضِ صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے ۵۵۳
◆ بے شعور اشیاء کی صحبت کا اثر ۵۵۴
◆ دین اہل اللہ کی صحبت سے پیدا ہوتا ہے ۵۵۵
◆ علم واخلاق کے حصول کا دوسرا طریق، مواٰخات فی اللہ ۵۵۸
◆ علم واخلاق کے حصول کا تیسرا طریق، اتعاظ بالغیر ۵۵۹
◆ علم و اخلاق کے حصول کا چوتھا طریق، محاسبہ نفس ۵۶۰
◆ اپنے عزم کے بغیر اصلاح ممکن نہیں ۵۶۱
◆ دنیا کا ہر ذرہ واعظ ہے ۵۶۳
◆ شیطانی دھوکہ ۵۶۵
◆ عمل کا زمانہ جوانی ہے ۵۶۶
◆ نیک کام کے لئے مشورے کی ضرورت نہیں ۵۶۷

صحبتِ صالح

حکومتوں کے قوانین جرائم کے افعال تو روک سکتے ہیں۔ لیکن جرائم کی نفرت دل میں نہیں بٹھا سکتے۔ زانی زنا سے اور چور چوری سے قانون کی وجہ سے رُک سکتا ہے۔ لیکن زنا اور چوری کی نفرت اس کے دل میں قوانین سے نہیں بیٹھ سکتی، جرائم کی نفرت اور معصیت سے بیزاری اہل اللہ کی صحبت و معیت سے نصیب ہوتی ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہ

فہرست مضامین

- کثرتِ علم کے باوجود بے عملی کثرت سے ہے ۵۶۹
- ماحول کا اثر ۵۷۰
- ظاہر کا اثر باطن پر ۵۷۱
- تربیت میں ماحول کا اثر ۵۷۲
- قول و فعل میں مطابقت کا اثر ۵۷۳
- ماحول، قوانینِ حکومت سے بھی بڑھ کر ہے ۵۷۴
- محاسبۂ آخرت کی دنیا میں صورتِ مثالی ۵۷۵
- ترتیبِ اصلاح ۵۷۷
- اصلاح کا عزم ۵۷۸

اخلاص فی الدین

دین و دنیا کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر اخلاصِ کامل اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباعِ کامل پیدا کرے، یہی دو چیزیں کلیدِ نجات ہیں اور کامیابی کی ضمانت ہیں۔ جو بھی کامیاب ہوا، وہ اسی طریق پر چل کر ہوا، اور جو راستہ سے ہٹ گیا، وہ منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکا، اور زندگی کا مایہ یوں ہی گم کر بیٹھا۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہ

فہرست مضامین

- طریقِ سنت پر عمل سے عادت بھی عبادت بن جاتی ہے ۵۷۹
- اسلام کا ہر عمل دو حیثیت کا حامل ہے ۵۸۰
- اتباعِ حکم ہی عبادت ہے ۵۸۱
- انسان کی ذات میں کوئی کمال نہیں ۵۸۲
- اسلام کا سہل راستہ ۵۸۳
- عمل کے لِوَجْهِ اللهِ ہونے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں ۵۸۳
- اللہ کی عبادت کیوں کی جائے؟ ۵۸۴
- غیر اللہ میں سے کس کی تعظیم ضروری ہے ۵۸۶
- قبولیتِ اعمال کے لئے اخلاص کے ساتھ اتباعِ نبوی بھی ضروری ہے ۵۸۶
- سیر حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے صرف اسوۂ محمدی موجود ہے ۵۸۷
- توحید کی قوت اور شرک کی بے بسی ۵۸۸
- اقوامِ عالم کی اصلاح کا ذمہ دار مسلمان ہے ۵۸۸
- بندہ کو اپنی مرضی ختم کر دینی چاہئے ۵۸۹
- آیت متعلقہ بیان ۵۸۹
- نام کے اور کام کے مسلمان ۵۸۹

رضائے الٰہی

جو ایسا بندہ ہو کہ وہ اللہ اس سے راضی اور اللہ سے راضی، بندے کا اطلاق اسی پر آئے گا۔ حقیقی بندہ وہی ہے اس لئے فرمایا کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ میرے ان بندوں میں داخل ہو جا جو میرے بندگانِ خاص ہیں۔ انہوں نے بندگی کا انکار کر دیا، جنہوں نے میرا دین نہیں مانا۔ تو میں بھی انہیں بندہ نہیں کہتا۔ جب وہ بندے بننا نہیں چاہتے۔ ہم بھی انہیں بندہ بنانا نہیں چاہتے۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہٗ

فہرست مضامین

- تمہید ۵۹۱
- وقتِ نزع کا خطاب ۵۹۲
- ملائکہ مومن کو ترغیب دے کر آخرت کے لئے آمادہ کرتے ہیں ۵۹۳
- مومن کو عند الموت حق تعالیٰ براہ راست بھی خطاب فرماتے ہیں ۵۹۴
- مومن کے لئے اعلانِ رضا کی بشارت ۵۹۶
- اللہ کی ذات سے ہی نہیں اس کے افعال پر بھی راضی رہنا چاہئے ۵۹۸
- آدمی صاحبِ نسبت کب ہوتا ہے؟ ۶۰۰
- مقام صاحبِ نسبت ۶۰۱
- اللہ کے ہر فعل پر راضی ہونے کا دنیا میں انعام ۶۰۲
- بشاشت کے ساتھ رضا کا اعتبار ہے مجبوری کے ساتھ نہیں ۶۰۳
- رضائے الٰہی پر اُخروی و اَبدی انعام ۶۰۴
- تفویض میں راحت اور تجویز میں مصیبت ہے ۶۰۴
- دنیا میں قانونِ مکافات کا عمل جاری ہے ۶۰۵
- اپنے بارے میں اللہ کی رضا معلوم کرنے کی کسوٹی ۶۰۶
- مومن کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے، کافر کو نہیں ۶۰۷
- علتِ رجوع ۶۰۸
- جو بندہ نہیں بننا چاہتا، حق تعالیٰ اسے بندہ بنانا نہیں چاہتے ۶۰۸

تسکین فطرت

جہاں سے ہم آئے، وہ اللہ رب العزت کی ذاتِ بابرکات ہے جس کے امر سے آئے، اس کے وجود سے ہمیں پر تو ملا ہمارا وجود ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ ہو جاؤ ہم ہو گئے۔ تو اصل اللہ کا حکم اور امر ہے اور کہاں جائیں گے؟ یہ معاد ہے کہ اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ وہیں جا کر راحت مل سکتی ہے اور بیچ میں ہم اس کے کہنے کے مطابق زندگی گزاریں اور اس کا کہا ہوا کیسے سامنے آئے؟ اس کے رسولؐ اس کا فرمایا ہوا لے کر آتے ہیں جس کو صراطِ مستقیم کہا جاتا ہے۔ جس پر ہم کو چلنا ہے۔ جب ان تینوں چیزوں پر آجائیں، جبھی فطرت کو تسلی ہوتی ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

◆ تین فطری سوال ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۱۱
◆ انسان کا مبداء کیا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۱۲
◆ رحمٰن کے بندوں کی چال ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۱۳
◆ رحمٰن کے بندوں کا قال ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۱۴
◆ سلام کی برکات اور آداب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۱۵
◆ رحمٰن کے بندوں کی تنہائی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۱۷
◆ رحمٰن کے بندوں کی زبان سے عبادت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۱۹
◆ مالیات کے سلسلہ میں رحمٰن کے بندوں کی شان ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۱۹
◆ رحمٰن کے بندوں کی قلبی عبادت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۲۱
◆ حقوق العباد کے بارے میں رحمٰن کے بندوں کا طرز عمل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۲۵
◆ توبہ کرنے والوں سے حق تعالیٰ کا معاملہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۲۶
◆ رحمٰن کے بندوں کی معاد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۲۸

تعارف اہلِ حق

انبیاء علیہم السلام کا روحانی ترکہ علم اور کمال ہے۔ وہ جب ملے گا، جب روحانی نسب نامہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہوا ہو کہ میرا شیخ یہ، اس کا شیخ یہ، اس کا آگے شیخ وہ...... سلسلے سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد ثابت ہو تو ترکہ ملے گا۔ اور اگر بیچ میں کوئی کڑی کٹ گئی اور سلسلہ متصل نہ پہنچا، تو وہ ایسا ہے کہ جیسے بے باپ کی اولاد ہو۔ کہ بیچ میں باپ ہی ندارد ہے۔ پھر ترکہ کہاں سے مل جائے گا؟ یہ اس لئے کہ علمی وراثت نسبت سے ملتی ہے۔ جیسا کہ مال و دولت کی وراثت نسب سے ملتی ہے۔ یہ نسب مادی ہے وہ روحانی نسب ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

◆ کچھ اپنے بارے میں ۶۳۱
◆ معیار تعارف اہل حق ۶۳۲
◆ دین نقلی ہے، عقلی اور اختراعی نہیں ہے ۶۳۳
◆ دین ایک غیبی حقیقت ہے عقل اس کی موجد نہیں ہو سکتی ۶۳۴
◆ عقل کو مغیبات میں وحی کا اتباع ضروری ہے ۶۳۵
◆ قرآن کریم کو حق تعالیٰ نے علیٰ وجہ البصیرت ماننے کی دعوت دی ہے ۶۳۵
◆ خاتم الدیانت والامانت کی روایت کی تکذیب ممکن نہیں ۶۳۹
◆ امتیازی حفاظت ۶۴۱
◆ مرد خداوندی اپنی رائے اور عقل سے متعین نہیں کی جا سکتی ۶۴۲
◆ مسائل دینیہ میں مطالبہ سند اس امت کا ذوق ہے ۶۴۵
◆ سند صحیح کسی مسئلہ کے ثبوت کے بعد اتباع فرض ہے ۶۴۶
◆ ادب و عظمت دین کی بنیاد ہے ۶۴۸
◆ ادب میں قانون میں آگے بڑھ کر عمل کرنا، یہ خود قانون نہیں ۶۵۰
◆ مشائخ طریقت کے ذاتی احوال کو قانون عام بنانے سے نزاع ہوتا ہے ۶۵۰
◆ شریعت و طریقت کو محقق ہی ایک ساتھ لے کر چل سکتا ہے ۶۵۱
◆ بلا تربیت و صحبت محقق نہیں ہو سکتا ۶۵۳
◆ باطن کے بادشاہ ۶۵۴
◆ اہل اللہ کے قدموں میں دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی آتی ہے ۶۵۴
◆ اہل اللہ تارک الدنیا ہیں ۶۵۵
◆ ادب و عظمت کے حامل کتاب اللہ کے سچے وارث ہیں ۶۵۶

یادِ حق

زندگی فی الحقیقت ذکر اللہ اور اللہ کا نام ہے۔ جب کائنات، نباتات اور جمادات کی زندگی اس سے ہے تو انسان کی زندگی اس سے کیوں نہیں ہوگی؟ اس لئے انسان کو سب سے زیادہ ذاکر ہونا چاہئے...... تبھی وہ زندہ ہوگا...... بلکہ زندہ جاوید بن جائے گا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- ◆ احوالِ واقعی ۶۵۹
- ◆ تمہید ۶۵۹
- ◆ روحِ کائنات ۶۶۰
- ◆ کائنات کا ذرہ ذرہ یادِ حق میں مصروف ہے ۶۶۱
- ◆ مخلوقات کی تسبیح کے بارے میں اہلِ باطن کا ادراک ۶۶۳
- ◆ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جانوروں کی گفتگو ۶۶۴
- ◆ نوعِ انسان کے سوادنیا کی ہر نوع کی ایک زبان ہے ۶۶۴
- ◆ انسان کی غفلت ۶۶۵
- ◆ ساری کائنات انسان کی غذا ہے ۶۶۵
- ◆ ساری کائنات انسان کی سواری ہے ۶۶۶
- ◆ ساری کائنات انسان کا لباس ہے ۶۶۶
- ◆ انعامات کا تقاضا کیا ہے؟ ۶۶۶
- ◆ حقیقتِ زندگی ۶۶۷
- ◆ ذاکر انسان کا مقام ۶۶۷
- ◆ زندگی کی حقیقی غذا ۶۶۷
- ◆ محبوب کے فراق ووصال کے آثار ۶۶۸
- ◆ ذکر اللہ کا عجیب اور عظیم ثمرہ ۶۶۹
- ◆ یادِ حق کا احساس ۶۷۰
- ◆ یادِ حق کا اصل طریق ۶۷۱
- ◆ ذکر مؤقت ۶۷۱
- ◆ ذکر غیر مؤقت ۶۷۲
- ◆ ذکر غیر مؤقت کا ثمرہ ۶۷۳
- ◆ تسبیح مذکرہ ہے ۶۷۴
- ◆ جوابِ شبہ ۶۷۴
- ◆ عشق کامل ہو تو ملامت کارگر نہیں ہوتی ۶۷۴

محبت و معیّت

جو مجھ سے محبت کرے گا، وہ میری اطاعت بھی کرے گا، اور میری سنتوں کی پیروی بھی کرے گا۔ ..... اور جو میری سنتوں پر چلے گا وہ میرے ساتھ بھی ہوگا جنت میں ..... وہ میرے سے الگ نہیں رہے گا ..... آپؐ نے بنیاد قرار دیا ہے محبت کو کہ مجھ سے محبت کرنا علامت ہے اس بات کی کہ وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل تو محبت ہے۔ مگر محبت پہچاننے کی علامت اطاعت اور اتباعِ سنت ہے۔ جب یہ ہوگی تو معلوم ہوگا کہ محبت میں سچا ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

فہرست مضامین

◆ حقیقت ہر شئ ۶۷۷
◆ تائید و نکتہ چینی ۶۷۸
◆ اقلیم بدن کا بادشاہ ۶۷۸
◆ قلب اصل ہے یا دماغ؟ ۶۷۹
◆ مدارِ اعمال قلب ہے ۶۷۹
◆ مدارِ حیات قلب ہے ۶۷۹
◆ دماغ قلب کے تابع ہے ۶۸۰
◆ مدرکِ حقیقی قلب ہے ۶۸۱
◆ قلب مرکزِ اصلاح ہے ۶۸۲
◆ افتائے قلب ۶۸۲
◆ ایمان کا موردِ اول قلب ہے ۶۸۳
◆ محل اسلام ۶۸۴
◆ حقیقت ایمانیہ ۶۸۴
◆ آثارِ محبت ۶۸۵
◆ مقامِ صدیقیت ۶۸۵
◆ غلبۂ محبت ۶۸۶
◆ آثارِ محبت ۶۸۷
◆ سونے کا طریق مسنون اور قوتِ ارادی ۶۸۷
◆ ابتداء بالتیمن ۶۸۹
◆ معیارِ عقل ۶۹۰
◆ راستہ کا رنج و راحت اور منزلِ مقصود ۶۹۱
◆ مدارِ نجات ۶۹۳
◆ محبت کی تلخیاں ۶۹۳
◆ غلبۂ ادب ۶۹۴
◆ استغراق محبت ۶۹۵
◆ ظرفِ محبت ۶۹۶
◆ دعوائے محبت کا ثبوت ۶۹۶
◆ بڑوں کی بڑی بات ۶۹۷
◆ محبت آمیز عمل ۶۹۷
◆ دوام معیت نبویؐ کی بشارت ۶۹۸
◆ محبت و خواہش کا ٹکراؤ ۶۹۸
◆ صدورِ معصیت اور تقاضائے محبت ۶۹۹

مقصدِ نعمت و مصیبت

"جب ہماری روح میں معصیتوں اور گناہوں کے پھوڑے پھنسی اور بری حرکات کے دُنبل نکل آتے ہیں۔ حق تعالیٰ آپریشن کرتے ہیں اور نشتر لگاتے ہیں۔ یہ مصیبتیں در حقیقت آپریشن ہیں کہ ان سے مادۂ فاسد نکالنا ہوتا ہے...... یہی وجہ ہے کہ جب مصیبت پڑتی ہے تو آدمی کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں۔ جب عیش و طرب کی کثرت ہوتی ہے تو آدمی میں غنا پیدا ہوتا ہے اور سرکشی بڑھ جاتی ہے۔"

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- دار الامتحان ۷۰۱
- مقصدِ امتحان ۷۰۲
- امتحان بطریقِ نعمت ۷۰۲
- امتحان بطریقِ مصیبت ۷۰۳
- مقامِ آدمیت ۷۰۳
- مقدارِ امتحان ۷۰۳
- امتحان کی عمومی روش ۷۰۴
- مقصدِ نعمت و مصیبت ۷۰۴
- موت وحیات کی کشمکش ۷۰۵
- ذرائع امتحان ۷۰۵
- پہلا ذریعہ "خوف" ۷۰۵
- دوسرا ذریعہ "فقر" ۷۰۶
- بندۂ تسلیم و رضا ۷۰۶
- جوہر قلب کا امتحان ۷۰۷
- طہارتِ روح ۷۰۷
- مصائب کفارہ سیئات ہیں ۷۰۸
- عمل جراحی ۷۱۰
- مصائب کے ذریعہ اصلاحِ اخلاق ۷۱۱
- مقصد موت ۷۱۱
- دعاءِ تسکین ۷۱۲
- تسکینِ عقل ۷۱۲
- تسکینِ طبع ۷۱۲
- تاثیر دعاءِ تسکین ۷۱۳
- اجر صبر ۷۱۴
- برزخ میں آثارِ نعمت ۷۱۵
- میت اور پس ماندگان کا باہمی نفع ۷۱۵
- وقتِ صبر ۷۱۵
- مشترکہ غم ۷۱۶
- خیر الناس ۷۱۶
- رونے کی حقیقت ۷۱۷
- اچانک موت ۷۱۷
- آدابِ زیارت ۷۱۸

آدابِ معاشرت

فہرست مضامین

- نجات کا تعلق عمل سے ہے، علم سے نہیں ۔۔۔ ۲۱۹
- مخلوق خدا رحمت سے مربوط ہے ۔۔۔ ۲۲۰
- صفت رحمت غالب ہے حق تعالیٰ کی تمام صفات پر ۔۔۔ ۲۲۰
- اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بہانوں سے مغفرت فرمائیں گے ۔۔۔ ۲۲۲
- رحمٰن کی شان ۔۔۔ ۲۲۳
- رحمٰن کے بندوں کی شان کیا ہونی چاہئے ۔۔۔ ۲۲۴
- مومن کی رفتار ۔۔۔ ۲۲۵
- سقراط کا واقعہ ۔۔۔ ۲۲۶
- حقیقت میں کمال اپنے اندر کا ہے اوراس پر بھی فخر کی اجازت نہیں ۔۔۔ ۲۲۷
- مومن کی گفتار ۔۔۔ ۲۲۷
- غیروں کے شر کو اپنی خیر سے دفع کرو ۔۔۔ ۲۲۸
- سلام اور اسکی قسمیں ۔۔۔ ۲۲۸
- مدح کرنے والے کے منہ میں مٹی ڈال دو ۔۔۔ ۲۳۰
- حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا معمول ۔۔۔ ۲۳۰
- مومن کا سجود و قیام ۔۔۔ ۲۳۰
- دفع مضرت مقدم ہے جلب منفعت سے ۔۔۔ ۲۳۰
- لین دین میں اعتدال اختیار کرنا چاہئے ۔۔۔ ۲۳۱
- مومن کا معاملہ خدا کے ساتھ ۔۔۔ ۲۳۱
- انبیاء نے شرک کی تعلیم نہیں دی بلکہ توحید کی تعلیم دی ہے ۔۔۔ ۲۳۲
- شرک کوئی مذہب نہیں ۔۔۔ ۲۳۲
- اصل مذہب توحید ہے اسی کی انبیاء نے تعلیم دی ۔۔۔ ۲۳۳
- مومن کی قتل و غارت گری ۔۔۔ ۲۳۴
- بندہ وہ ہے جو بندگی اختیار کرے ۔۔۔ ۲۳۴
- نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں ۔۔۔ ۲۳۵
- مومن کے مقدمات و خصومات ۔۔۔ ۲۳۶
- پر لطف واقعہ ۔۔۔ ۲۳۷
- بری مجلس میں نہ بیٹھو ۔۔۔ ۲۳۷
- قرآن پڑھو تدبیر کے ساتھ وہ زندگی کا دستور ہے ۔۔۔ ۲۳۸
- صرف الفاظ ہی پر قناعت نہ کرو ۔۔۔ ۲۳۸
- علماء ربانی وکلاء دین ہیں ۔۔۔ ۲۳۸
- اولاد صالح کی دعاء، اولاد طالح سے پناہ ۔۔۔ ۲۳۹
- خلاصہ کلام اور طریقہ عمل ۔۔۔ ۲۴۰

تصویر سازی کی مذہبی و تمدنی حیثیت

ہندوستان کے صنم پرست اور خدا کے فرضی مظاہر سے رشتہ نیاز جوڑنے والے ۳۳ کروڑ، دیوتاؤں کی رنگین تصویروں کے غلام بنے، مغرب کے تثلیث پرست کنواری کے بت اور ابن اللہ کے مجسمے کے سامنے اوندھے ہوئے، ایران کے مجوسی یزدان واہرمن کے پیکروں کے سامنے رغبت ورہبت کا اظہار کرنے لگے، آتش پرستوں نے آتشیں لپٹوں کے سامنے سر نیازِ خم کیا...... غرض اس راہ محسوس پسندی نے صورتوں میں الجھا کر سب ہی کو حقیقت سے بیگانہ بنادیا۔

از حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ

فہرست مضامین

◆ مہلک دستکاری ۴۴۳
◆ صورت محض وسیلہ تعارف ہے ۴۴۴
◆ شرک فی المقصود ۴۴۴
◆ تصویر پرستی ۴۴۵
◆ تصویر بازی ۴۴۶
◆ سطح پرستی کی انتہا ۴۴۶
◆ صورت پسندی کی آخری منزل ۴۴۷
◆ خزائن مخفیہ سے محرومی ۴۴۷
◆ شناسان حقیقت کا تصاویر سے معاملہ ۴۴۸
◆ تصویر سازی کا اخروی انجام ۴۴۸
◆ حقیقت الحقائق کی جستجو ۴۴۹
◆ توحید پسند کا تصاویر سے تنفر ۴۴۹
◆ حقیقت پسندانہ ذہنیت ۴۵۰

الواعظ

اگر انسان آفاق وانفس اور اس مادی عالم پر نظر ڈالے، اس کے حوادث وواقعات کو امعان کی نظر سے دیکھے۔ عقل وبصیرت، تدبر اور تفکر سے کام لے تو یہ چیز اس کے لئے بڑے سے بڑے واعظ اور مقرر کا کام دے گی اور انسان ہر وقت وعظ کہہ سکتا ہے اور اس سے پند ونصیحت حاصل کر سکتا ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

فہرست مضامین

◆ فائدہ صرف عمل سے ہوتا ہے ۷۵۱
◆ عقل، اور فکر ونظر کا واعظ ۷۵۲
◆ موت ایک خاموش واعظ ۷۵۳
◆ روز مرہ کے واعظ ۷۵۳

انسانی زندگی کا نصب العین

تو نصب العین طاعت و عبادت خداوندی نکلا دولتمند ہوگا تب بھی اطاعت کر سکتا ہے، مفلسی میں ہوگا تب بھی یہ نصب العین اپنا سکتا ہے، بادشاہی تخت پر ہے تب بھی یہ نصب العین قائم ہے، غربت میں ہے تب بھی، تندرستی میں ہو تب بھی یہ نصب العین قائم ہے ___ اور انتہائی بیماری میں ہو تب بھی ___ زندگی ہو تو یہ نصب العین قائم ہے، موت آجائے تو بھی ___ یہ عجیب ترین نصب العین ہے جو اس لمبی عمر کے ساتھ ساتھ اخیر تک چلتا ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّہْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ہَادِیَ لَہٗ وَنَشْہَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْہَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

عظیم ترین نعمت

بزرگانِ محترم!

حق تعالیٰ کے انعامات انسانوں کے اوپر بیشمار ہیں۔ جن کی کوئی گنتی نہیں کی جاسکتی۔ قدم قدم پر نعمتوں کی بارشیں ہیں اور لحہ بہ لحہ انسانوں کو عجیب عجیب انعامات دیئے جارہے ہیں۔ خود ہی ارشاد فرمایا :

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَاتُحْصُوْھَا (ابراہیم پ۱۳ آیت ۳۴)

اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے بیٹھ جاؤ تو تم شمار نہیں کر سکتے۔ ان کا احاطہ نہیں کر سکتے ___ غرض انسان کے اوپر بے شمار نعمتیں ہیں ___ لیکن ساری نعمتوں کی اصل اصول زندگی کی نعمت ہے جو ہمیں عطا کی گئی۔ اگر زندگی نہ ہو تو کوئی بھی نعمت نہ ہمارے لئے نافع بن سکتی ہے نہ مفید ہو سکتی ہے۔ تو اصل میں سب سے بڑی نعمت زندگی ہے۔ ایک زندہ انسان ہی نعمت سے مستفید ہو سکتا ہے ___ تو نعمتیں ساری ایک طرف اور زندگی ایک طرف۔

عظیم ترین یہ نعمت یا عمر جس کی کوئی قیمت نہیں ہے اللہ نے بے قیمت عطا کردی ہے

مانبودیم وتقاضائے مانبود!
لطف تو ناگفتۂ مامی شنود

نہ ہم تھے نہ ہماری طرف سے کوئی پکار تھی۔ نہ ہماری طرف سے کوئی تقاضا تھا۔ مگر تیرا لطف وکرم ہماری خاموش آواز کو سن رہا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ ہمیں زندگی ملے۔ اس خاموش پکار پر اتنی بڑی نعمت دیدی کہ سارے جہاں مل کر بھی اس کی قیمت نہیں بن سکتے۔ ایک انسان چاہتا ہے کہ میرے ہاں اولاد ہو' اگر نہیں ہوتی تو دنیا کے خزانے خرچ کردے' نہیں ہوتی اور دینے پہ آتے ہیں تو غریب انسان کو اتنی دے دیتے ہیں کہ بظاہر وہ تنگ آجاتا ہے۔ تو نہ مانگنے سے ملتی ہے نہ قیمت سے ملتی ہے ___ محض فضل سے ملتی ہے۔

سب سے بڑی نعمت یہ عمر ہے پھر یہ عمر بھی کوئی چھوٹی موٹی عمر نہیں ہے۔ آپ اسے عمر سمجھتے ہیں کہ دنیا میں کسی کی زندگی پچاس برس ہوگی؟ کسی کی ساٹھ ہوگی؟ بہت لمبی عمر ہوئی تو اسی نوے برس کی ہوگی؟ یہ زندگی ہے؟ ___ یہ زندگی کا ایک معمولی حصہ اور زندگی کا ایک چھوٹا سا جز ہے۔

ابدی زندگی

انسان کے بارے میں امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ:

"انسان ازلی تو نہیں ہے مگر ابدی ہے"۔

ہمیشہ سے نہیں تھا لیکن پیدا ہونے کے بعد اب ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ اب انسان کے لئے مٹنا نہیں ہے۔ وطن کا انتقال ایک وطن سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کی طرف ہوتا رہتا ہے۔ نقلِ مکانی ہوتی رہتی ہے ___ لیکن زندگی انسان سے چھنتی نہیں ہے۔

یہ پہلے عالمِ اَلَسْتُ میں تھا جبکہ اللہ نے آدم علیہ السلام کی پشت سے سب بنی آدم کو نکالا حدیث میں ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کی پشت پر داہنا ہاتھ مارا تو ساری نیک اولاد نکل پڑی اور بایاں ہاتھ مارا تو ساری بد اولاد نکل پڑی۔ یہ بنی آدم کا پہلا ظہور ہے۔ تو عہدِ اَلَسْتُ میں ابتدائی ظہور ہے۔ وہاں سے انسان کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد منتقل ہو کر ماں کے پیٹ میں آگیا۔ پھر ماں کے پیٹ کی عمر نو مہینے کی ہے۔ پہلے بھی فنا نہیں ہوا تھا' ماں کے پیٹ میں بھی آکر فنا نہیں ہوا۔ عہدِ اَلَسْتُ سے انتقال ہوا رحم مادر میں آیا۔ رحم مادر سے انتقال ہوا تو دنیا میں آگیا۔ ہر ایک عالم سے گزرتے ہوئے انتقال ہوتا ہے اور دوسرے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ دنیا میں انتقال ہوگا تو برزخ کے اندر پہنچ جائے گا۔ برزخ سے انتقال ہوگا تو عالم حشر کے اندر پہنچ جائے گا۔ وہاں پچاس ہزار برس کا ایک دن ہوگا۔ عالم حشر سے انتقال ہوگا تو عالم جنت میں پہنچ جائے گا ___ پھر جنت میں ابدالاباد تک روزانہ انتقالات ہیں۔ بڑے بڑے جہاں اور روز نئی نئی نعمتوں کی تجدید ہوگی۔ وہاں بھی درجہ بدرجہ عروج حاصل کرتا رہے گا۔ تو جب سے انسان کا ظہور ہوا اب تک برابر سفر میں ہے اور سفر کرتا رہے گا۔ اس لئے انسان ازلی نہیں ہے مگر ابدی ہے کہ مٹنے والا نہیں ہے تو آپ کی عمر تھوڑی نہیں ہے۔ جس کو بیس پچاس اور سو برس سمجھ لیں۔ یہ انسان کی عمر کا ایک معمولی حصہ ہے' انسان ابدی طور پر زندہ ہے اس ابدی اور لامحدود عمر کا ایک معمولی حصہ ہے۔ جس کو ہم زندگی کہتے ہیں۔ یہ زندگی کا کروڑواں حصہ بھی نہیں ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ انسان کی زندگی بڑی طویل اور لمبی ہے۔

اختیاری نصب العین کی ضرورت

اس دنیوی زندگی کو گزارنا' اس کے لئے اللہ نے ایک تو غیر اختیاری حصہ رکھا ہے۔ وہ آپ چاہیں نہ چاہیں گزر جائے گا اور جب انسان پیدا ہو گیا تو اب مٹنے والا نہیں ہے۔ لیکن کچھ چیزیں اختیار میں دی ہیں کہ اپنے ارادے اور اختیار سے زندگی کا نصب العین بناؤ۔ اس کے تحت زندگی کو گزارو ــــ اس لئے کہ جو وقت یا جو زندگی بلا نصب العین کے گزرتی ہے۔ وہی مجنونانہ حرکت کہلاتی ہے۔ ایک دیوانے کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ زندگی اس کی بھی گزر رہی ہے۔ تو دیوانگی کے ساتھ عمر کو گزارنا' یہ دانش مند کا کام نہیں ہے۔ یہ دیوانوں کا کام ہے۔ زندگی کا کوئی نصب العین بنانا پڑے گا جس کے تحت زندگی گزاری جائے کہ ہم کیوں زندہ ہیں؟ کیا مجھے کرنا ہے؟ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ اور یہ جو روز میرے انتقال ہوتے رہتے ہیں اس جہاں سے اس جہاں کی طرف اور وہاں سے وہاں کی طرف۔ آخر یہ کیا کوئی افسانہ ہے؟ یا کوئی قصہ ہے کہ خواہ مخواہ انسان چل رہا ہے۔

ہم کراچی سے حیدر آباد دکن کا سفر کرتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی مقصد دینی یا دنیوی سوچ لیتے ہیں کہ اس لئے جا رہے ہیں۔ بلا مقصد ریل میں بیٹھ جائیں اور کوئی پوچھے کہ کیوں جا رہے؟ کہ یوں ہی ــــ کہا جائے گا کہ تم دیوانے ہو؟ ــــ تو دیوانہ اسے کہتے ہیں جو بلا نصب العین اور بلا مقصد کے زندگی گزارے' دانشمند وہ ہے کہ اس کی ہر نقل و حرکت کا کوئی نصب العین ضرور ہو ــــ تو اتنی بڑی حرکت جو ہزاروں برس سے چل رہی ہے' اور ابدالآباد تک چلتی رہے گی اور بلا مقصد ہو؟ یعنی دیوانگی بھی اور اتنی لمبی دیوانگی کہ اس کی کوئی حد و نہایت نہ ہو۔ کم سے کم انسان کے لئے زیبا نہیں جو مدعی ہے کہ میں سب سے بڑا دانشمند ہوں مجھے عقل کامل دی گئی ہے۔ یہ مدعی ہے کہ میں ساری کائنات پر فوقیت رکھتا ہوں اور افضل ہوں حتیٰ کہ ملائکہ کی جنس سے بھی افضل ہونے کا دعوے دار ہے۔ تو یہ انسان جو اتنا بڑا دعویٰ رکھتا ہے' اس کی اتنی بڑی زندگی بلا کسی مقصد کے؟ تو ایک طرف یہ عقل کا دعویٰ کہ سب سے بالاتر اور ایک طرف یہ مجنونانہ حرکت کہ کوئی نصب العین زندگی کا نہیں۔ یہ کوئی جوڑ نہیں لگتا۔ اس لے انسان وہی کہلائے گا جو اپنی زندگی کا کوئی نصب العین متعین کرے۔

ابدی مقصد

اور نصب العین بھی معمولی نہیں ہونا چاہئے۔ اس واسطے کہ جب عمر لمبی اور ابدالآباد تک کی ہے تو مقصد ایسا ہو جو ابدالآباد تک چلے' چند دن میں ختم ہو جائے وہ بھی دیوانگی ہوگی کہ عمر تو لاکھوں برس کی لے کر آیا اور مقصد وہ سوچ لیا جو دس بیس برس میں ختم ہو جائے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ پھر بلا مقصد کے عمر گزرے' پھر اس کے اوپر دیوانگی آجائے تو مقصد اور نصب العین زندگی کا ہونا چاہئے اور ایسا ہونا چاہئے جیسی خدا نے عمر دی ہے کہ عمر لمبی ہے تو مقصد بھی لمبا ہو۔ اگر وہ دس جہاں طے کرے تو وہ مقصد بھی دس جہاں طے کرے' اس لئے یہ غور کرنے کی بات ہے کہ زندگی جیسی نعمت اور دولت جو انمول موتی کی طرح سے ہے' ساری دنیا مل کر بھی اس کی قیمت نہیں بن سکتی' اس کے لئے کوئی ایسا پاکیزہ اور اعلیٰ مقصد ہونا چاہئے کہ ہماری دانش کے بھی سب قائل ہو جائیں اور خود انسان بھی ایک دوسرے کا قائل ہو کہ واقعی صحیح مقصد ہے۔

وقتی دولت اور روٹی مقصد نہیں

مقاصد دنیا میں بہت ہیں' مثلاً عمر کا ایک مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی لمبی چوڑی عمر کا مقصد روٹی فرض کرلیں کہ

ہمیں کھانے کو ملے' یہ مقصد اور نصب العین تو ہے لیکن یہ کیا نصب العین ہے. جس کے لئے نہ فضیلت کی ضرورت نہ کمال کی ضرورت نہ علم کی ضرورت یہ مقصد بے پڑھے لکھے کو بھی حاصل ہے۔ روٹی ہی تو ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے تعلیم کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ تعلیم کی انتہائی توہین ہے اگر اس کا مقصد روٹی بنایا جائے' اس لئے کہ روٹی جانور کا بھی مقصد ہے۔ ہر جاندار اپنے اپنے مناسب روٹی کھاتا ہے' شیر اور بھیڑیا جو کھاتے ہیں' کیا انہیں کوئی ڈگریاں حاصل ہوتی ہیں' جن سے یہ کماتے ہیں؟ ___ تو روٹی اور کھانا ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے کسی تعلیم کی ضرورت نہیں۔ عالم کو بھی ملتا ہی' جاہل کو بھی۔ غرض ایسی چیز کو مقصد زندگی قرار دینا جس کے لئے قطعاً علم و شعور کی ضرورت نہیں۔ یہ زندگی کی توہین ہوگی۔

پھر یہ کہ زندگی ابد الآباد کی مل رہی ہے اور مقصد وہ ٹھہرایا ہے جو دس بیس برس میں ختم ہو جائے۔ جب آدمی کا سانس ختم ہوا تو روٹی بھی ختم' روٹی اسے چھوڑ گئی یہ روٹی کو چھوڑ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ پھر بلا نصب العین کے زندگی رہ گئی' اس لئے لمبی زندگی کا نصب العین لمبا ہونا چاہئے اس لئے روٹی مقصد نہیں بن سکتی۔

دولت بھی اسی میں شامل ہے۔ آپ دولت کمانے کو نصب العین رکھیں گے تو یہ کوئی اونچا مقصد نہیں' یہ ایک وسیلہ ہے اور ضرورت کی چیز ہے' انسان جب تک دنیا میں زندہ رہے گا۔ کمائے گا بھی اور اسے حکم بھی ہے کہ کمائے' یہ بھی نہیں کہ معطل ہو کے بیٹھ جائے' لیکن مقصد زندگی نہیں' کمانا خود کسی مقصد کے لئے ہوتا ہے' کمانا خود مقصد نہیں اگر وہ مقصد جو کمانے سے پورا ہوتا ہے کسی اور طریق سے پورا ہو جائے تو اس کمانے کو یقیناً چھوڑ دیا جائے گا مثلاً پیٹ بھرنا ہے' کپڑے پہننا یا رہنا سہنا یعنی مکان بنانا' یہ بڑا مقصد ہے۔ اگر اللہ میاں کسی ایسے جہان میں بھیج دیں جہاں ہمیں اس طرح کے مکان کی ضروت پڑے نہ پیٹ بھرنے کی ضرورت پڑے' تو کمانے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی' غرض یہ زندگی کا نصب العین نہیں بن سکتا ایک وقتی چیز ہے۔

پھر یہ کہ اس جہان کی کوئی کتنی بھی بڑی چیز ہے' یہ بھی اس میں داخل ہے کہ جب آدمی اس جہان کو چھوڑے گا وہ چیز اسے چھوڑ دے گی' یہ اس کو چھوڑ دے گا' پھر وہ نصب العین ہی کیا ہوا ___ ؟ ہمیں ایسا نصب العین چاہئے جو ہماری عمر کے ساتھ ساتھ چلے' کروڑوں برس کی عمر ہو جب بھی وہ چلتا رہے' جبھی عمر کی توقیر ہوگی اور اللہ کے انعام کی قدر ہوگی۔ ورنہ انتہائی بے قدری ہوگی کہ اتنی بڑی نعمت اور اس کے لئے کوئی مقصد ہی نہ ہو اور اگر ہو تو پانچ برس کا ہو۔

عزت و جاہ بھی مقصد نہیں

یا مثلاً ایک مقصد یہ ہے کہ روٹی بھی نہیں' دولت بھی نہیں' کرسی مقصد ہے یعنی عزت اور جاہ ہمارا مقصد ہے کہ آدمی عزت کے ساتھ زندگی گزارے۔

یہ مقصد برا نہیں ہے۔ مگر انتہائی بے بنیاد مقصد ہے اس کی کوئی بنیاد ہی نہیں' اس واسطے کہ جس کو ہم عزت سمجھتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگ ہمیں بڑا سمجھیں اس کا مطلب یہ نکلا کہ لوگوں کا خیال ہماری طرف سے صحیح ہو تو عزت ہماری ہے اور ہاتھ میں لوگوں کے ہے؟ اور وہ بھی خیالی ___ ذرا وہ خیال بدل دیں' بس ہماری عزت ختم ہوگئی ___ آج اگر لوگوں نے ہمارے گلے میں ہار ڈال دیا' ہم عزت والے اور کل کو پبلک خفا ہو کر جوتیوں کا ہار ڈال دے' بس ذلیل ہو گئے ___ یہ کیا مقصد ہوا؟ اول تو خیالی اور خیال بھی دوسرے کا؟

اگر ہمارے ہی خیال سے عزت قائم ہوتی' تو ہم تخیل باندھے بیٹھے رہتے کہ ہم بڑے باعزت ہیں اور عمر
ر اس تخیل کو نہ چھوڑتے' تو عمر بھر عزت والے تو رہتے' عزت ہماری' قبضے میں دوسرے کے وہ بھی خیالی
___ اور وہ خیال اس کے بھی ہاتھ میں نہیں۔ آج خیال بدل گیا تو کل ہماری بے عزتی ہو گئی تو لمبی چوڑی عمر
تی بڑی نعمت کا نصب العین ایک بے بنیاد اور خیالی چیز؟

حقیقی عزت

حقیقی عزت یہ ہے کہ اللہ کے ہاں کوئی مقبول ہو' اسے عزت کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کسی کو مقبولیت دے ور اپنی مخلوق کے دلوں میں اس کی عزت ڈالدے' وہ عزت ہے وہ خیال کی نہیں واقعی عزت ہوتی ہے۔

حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا حق تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتے ہیں و حضرت جبرئیلؑ کو فرماتے ہیں' میں نے فلاں بندے سے محبت کی' تو بھی اس سے محبت کر ___ حضرت جبرئیلؑ ے دل میں محبت آجاتی ہے' جبرئیل علیہ السلام آسمان اول کے ملائکہ میں اعلان کرتے ہیں کہ ہم سب نے بت کی تم بھی محبت کرو' آسمان دوم میں اس کی محبت ہوتی ہے' وہ تیسرے کو' وہ چوتھے کو' یہاں تک کہ اس سمان دنیا تک محبت آجاتی ہے ___ تمام ملائکہ میں وہ محبوب بن جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ ملائکہ علوی ملائکہ سفلی کو الہام کرتے ہیں کہ ہم نے فلاں سے محبت کی' تم بھی محبت کرو' ان کے دلوں میں محبت آجاتی ہے وہ لائکہ سفلی اولیائے کرام جو دنیا میں محبوبانِ الٰہی ہیں' کے قلوب میں الہام کرتے ہیں کہ ہم سب محبت کرتے یں تم بھی محبت کرو' تو خواص اہل اللہ کے قلب میں محبت آجاتی ہے۔ پھر ان کے آس پاس کے حلقوں کے ندر محبت پہنچتی ہے' **فیوضع لہ قبولہ فی الارض** اس کی مقبولیت پوری زمین میں پھیل جاتی ہے اسے کچھ کرنا دھرنا نہیں پڑا اور محبت آسمانوں دنیا کے اندر پھیل جاتی ہے۔ تو حقیقی عزت و عظمت یہ ہے کہ من جانب اللہ کسی کی مقبولیت دنیا میں پھیل جائے' یہ اصل عزت ہے' اسی لئے نہ اپنے تخیل سے اپنے کو عزت ار سمجھے نہ چند افراد کے دماغ پر روغن قاز ملکر کوشش کرے کہ تم تخیل میں مجھے بڑا سمجھو' یہ خیالی چیز ہوگی' ب خیال بدل جائے گا' عزت ختم ہو جائے گی لیکن جس کی عزت ملأ اعلیٰ میں قائم ہوگی' ملائکہ علوی و سفلی کے دلوں میں جس کی محبت قائم ہوگی' وہ محبت بنیادوں پر قائم ہے تخیلات پر نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کے باطن یں اگر کسی کی محبت قائم ہے وہ اٹل ہے اور اتنی قوی بنیاد پر کہ اسے کوئی مٹانیوالا نہیں ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی محبت یہی ہوتی ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں ان کی محبت ہوتی ہے پھر عالم میں ان کی حبوبیت پھیلادی جاتی ہے۔ اولیائے کرام' صوفیائے عظام اور ائمہ مجتہدین کی محبت اٹل بنیادوں پر ہوتی ہے۔ وہ دنیا سے گزر جائیں مگر ان کی محبت نہیں گزرتی ___ انبیاء علیہم السلام میں سے آج اگر کسی پیغمبر کا نام ی آئے گا گردنیں عظمت سے جھک جائیں گی ہم درود شریف پڑھنا شروع کردیں گے۔

یہ کیا چیز ہے ___؟ آج یہ ہستیاں اس عالم میں نہیں ہیں مگر دلوں کے اندر محبت موجود ہے' نسلاً بعد سل چلی جارہی ہے۔ صدیاں گزر گئیں مگر محبت اٹل ہے۔ اس لئے کہ اس محبت کی بنیادوں میں حق تعالیٰ کے طن سے چلنے والی محبت ہے جو مٹنے والی نہیں ہے ___ آج دنیا میں حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ موجود یں ہیں۔ آج حضرت صابر کلیریؒ موجود نہیں ہیں۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ موجود نہیں ہیں۔ لیکن لوب میں محبت قائم ہے' ان لوگوں کے نام آتے ہیں تو ہماری زبانوں سے رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نکلتا ہے۔ ظمت سے ہم گردنیں جھکادیتے ہیں ___ وہ ہستیاں موجود نہیں' مگر محبوبیت موجود ہے' اس لئے کہ یہ

محبوبیت اللہ سے چلی اور بندوں تک پہنچی' خواص سے شروع ہوئی عوام تک پہنچی۔

عزت کے بارے میں سنہری اصول

اس سے ایک اصول معلوم ہوتا ہے کہ جو مقبولیت عوام سے اوپر کی طرف چلتی ہے وہ بے بنیاد ہو
ہے۔ عوام میں پھیل گئی آگے خواص میں اس کا کوئی وجود نہیں' وہ عزت فرضی ہوتی ہے' چند دن کے بعد
زائل ہو جاتی ہے اور جو خواص سے چلے' عوام کی طرف آئے وہ حقیقی عزت ہوتی ہے' تو میں نے عرض کیا
انبیاء علیہم السلام' اولیائے کرام' علمائے ربّانی اور صالح بندوں کی محبت' کوئی کارنامہ کرجانے والوں کی محبت
رہتی دنیا تک قلوب میں باقی رہتی ہے وہ حقیقی عزت ہے۔ اس کی بنیاد فرضی نہیں ہوتی۔ آدمی کا خیال نہیں
ہوتا قلب کی گہرائی ہوتی ہے۔ اگر آدمی یہ بھی چاہے کہ میں اپنے خیال سے یہ محبت نکال دوں' اسے قدرت
نہیں ہوتی ___ اس کا دل ملامت کرے گا کہ نہیں تجھے محبت رکھنی پڑے گی' اس لئے کہ وہ بنیادوں پر قائم
ہے۔

حاصل یہ ہے کہ عزت وہ ہے جو اللہ کی طرف سے چلے، مقبولیت عنداللہ ہو۔ وہ عزت نہیں ہے کہ
لوگوں کے **تخیلات** کے اوپر اس کی بنا ہو ___ کیونکہ خیال رات دن بدلنے والی چیز ہے۔ تو ایسی محبت و عزت
جو کہ خیالی ہو' اس کو ہم اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں، یہ زندگی کی توہین ہے' زندگی امرواقعی اور نصب
العین فرضی اور خیالی بنا رہے ہیں۔ زندگی کی بنیادیں اٹل کہ انسان ابدی ہے اور عزت جو نصب العین ٹھہرا
اس کی کوئی بنیاد نہیں کہ کل کو ہے' پرسوں کو نہیں' یہ زندگی کی توہین کرنا ہے۔ اس لئے یہ بھی نصب العین
نہیں بن سکتی۔ تو نہ دولت اور رسمی عزت مقصد زندگی بن سکتی ہے نہ روٹی بن سکتی ہے۔ اگر دنیا ہی تک زندگی
محدود ہوتی تو چلو ہم یہی نصب العین قرار دے لیتے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ زندگی آگے جانیوالی ہے۔ یہ زندگی
کروڑواں معمولی حصہ ہے دائمی اور ابدی زندگی تو آگے ہے اس واسطے کوئی اور نصب العین ہونا چاہئے۔

انسان کا علم

وہ نصب العین کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ انسان تجویز نہیں کر سکتا' انسان بے چارہ محدود ہے وہ اپنے حال کی
بات دیکھے گا۔ اس کا ماحول ایک محدود ماحول ہے۔ اس کے اندر وہ گھرا ہوا ہے' وہیں کی سوچے گا۔ تو انسان
بے چارے کا تخیل ہی کیا؟ اس کی عقل ہی کیا؟ کہ وہ ایک لامحدود نصب العین سوچ لے ___ اپنے تخیل کے
دائرے میں سوچے گا وہ محدود چیز ہوگی' کارآمد نہیں ہوگی۔ اس لئے انسانی زندگی کا نصب العین وہ بتلا سکتا ہے
جو خود بھی لامحدود ہو' اس کا علم بھی ازلی ابدی ہو ازل سے ہے اور ابد تک جانے والا ہے۔ وہ خود انسان کا خالق
ہے' اس کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو جانتا ہے۔ اس کے داؤ گھات سے واقف ہے فرمایا گیا :

أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ۔ (ملک پ ۲۹ آیت ۱۴)

جس نے پیدا کیا ___ کیا وہ نہیں جانے گا مخلوق کو؟ ___ وہی ہے اصل میں جاننے والا ___ ہم تم اپنے
سے اتنے واقف نہیں ہیں جتنا ہمارا خالق ہم سے واقف ہے' ہمیں آج یہ پتہ ہے ہی نہیں کہ ہمارے پیٹ میں
کیا ہو رہا ہے' یعنی پیٹ ہمارا' نفس ہمارا' خود ہمیں ہی پتہ نہیں اندر کیا ہو رہا ہے۔ حالانکہ عظیم الشان مشین
ہے جو چل رہی ہے۔ غذا پہنچ رہی ہے۔ معدہ اپنا کام کر رہا ہے' جگر' دل اور دماغ اپنا کام کر رہا ہے ___ جس
آپ لقمہ کھاتے ہیں وہ معدے میں پہنچتا ہے معدہ اسے لے کر سفید حریرہ بنا دیتا ہے اور کچھ فضلات ہیں جن کو

انتڑیوں کی طرف پھینک دیتا ہے اور اس کا جو ہر جگر کی طرف پھینک دیتا ہے جگر کو کہتے ہیں کہ یہ طباخ بدن ہے (بدن کا باورچی ہے) جگر اس حریرے کو پکاتا ہے۔ جب ہنڈیا پکتی ہے تو ایک حصہ اوپر جھاگ کی طرح ہوتا ہے۔ ایک حصہ تلچھٹ کی طرح ہوتا ہے' ایک حصہ بیچ بیچ میں ہوتا ہے اور ایک حصہ وہ ہے جو جوہر بنتا ہے' وہ جو اوپر کا جھاگ کا حصہ ہے وہ بلغم ہے جو نیچے تلچھٹ کا حصہ ہے وہ سودا ہے' جو بین بین ہے وہ صفرا ہے اور ان تینوں چیزوں سے مل کر جو جوہر بنتا ہے۔ اسے خون کہتے ہیں۔ یہ چار خلطیں تیار ہوئیں۔ جگر باریک رگوں کے ذریعہ سے خون کو قلب کے اندر بھیجتا ہے' قلب کے بارے میں اطباء لکھتے ہیں یہ ایسا ہے جیسے چوگزی ہوتی ہے کہ بیچ میں سے دبا ہو' دونوں کنارے پھیلے ہوئے جیسے اگالدان ہوتا ہے تو بیچ میں سے پتلا اور دونوں کنارے چوڑے' یہ قلب کی صورت ہے۔ اس کا ایک حصہ بطن عالی اور ایک بطن سافل کہلاتا ہے۔ یہ خون بطن سافل کے اندر پہنچتا ہے قلب اس کو پھر اپنی حرارت سے پکاتا ہے۔ اس کے پکانے سے ایک لطیف بھاپ پیدا ہوتی ہے۔ وہ روح حیوانی کہلاتی ہے' اس روح کے اوپر پھر اوپر سے روح آتی ہے جس کو روح ربانی کہتے ہیں' اس سے انسان کے علم اور ادراک کا تعلق ہے ___ تو بدن کا حصہ نیچے ایک سواری ہے اس پر روح حیوانی سوار ہے پھر روح حیوانی ایک سواری ہے اس پر روح ربانی سوار ہے اس طرح سے یہ تین چیزیں ہیں جو مل کر سفر طے کر رہی ہیں ___ تو آپ نے اندازہ کیا کہ کس طرح غذائیں پہنچ رہی ہیں اور ہضم ہو رہی ہیں اور اس سے طرح طرح کی چیز بن رہی ہیں لیکن انسان کو خود کو اس وقت پتہ نہیں کہ معدہ کیا کر رہا ہے جگر کیا کر رہا ہے اور قلب کیا کر رہا ہے۔ جب ہمارے اندر سب کچھ ہو رہا ہے اور ہمیں کچھ پتہ نہیں تو اس کا محدود علم ہے۔ تو لامحدود زندگی کا نصب العین کیسے تجویز کرے گا؟ یہ اگر تجویز کرے گا تو چند روزہ ہو گا جیسے خود اس بیچارے کا علم چند روزہ ہے۔ اس واسطے ضروری ہے کہ زندگی کا نصب العین تجویز کرنے والا وہ ہو جو زندگی کا خالق ہے۔ وہی اس کے اول و آخر سے واقف ہے۔ وہی نصب العین متعین بھی فرما سکتا ہے۔

خالقِ انسان کا تجویز کردہ نصب العین

اس خالق نے ایک نصب العین تجویز فرمایا اور اپنے فرمان کے ذریعے ہم تک بھیج دیا جس کو قرآن کریم کہتے ہیں' فرمایا :

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ٥ (ذٰریات پ۲۷ ایت ۵۶)

میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ وہ میری اطاعت کریں' تو مقصدِ زندگی درحقیقت اپنے خالق و مالک کی اطاعت و عبادت نکلی' عبادت کا لفظ سن کر ممکن ہے کہ آپ کو یہ تخیل پیدا ہوا ہو کہ بس اب کہا جائے گا کہ جا کے مسجد میں بیٹھو' کوٹھی بھی چھوڑ دو اور بنگلہ بھی اور مسجد کا رستہ لو' عبادت تو وہاں ہوگی ___ اور ممکن ہے یہ کہا جائے کہ بھائی! یہ دولت جو ہے اسے خیرباد کہو' یہ سب کچھ صدقہ کر کے جاؤ اللہ کے راستہ میں' اپنا گھربار چھوڑو۔

دولت سے بھی خدا ملتا ہے

تو میں عرض کئے دیتا ہوں کہ یہ غلط تخیّل ہے اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ انسان جس دائرے میں رہے اسے مایوس نہیں کرتا' خدا تک پہنچنے کا لازمی راستہ بتلاتا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ انسان آج جس دائرے میں ہے' اس دائرے کو چھوڑ کر فلاں دائرے میں جائے جب تو مجھ تک آئے گا اور اگر نہیں چھوڑے گا تو مجھ تک نہیں

آئے گا' ایسا نہیں ہے۔

اگر ایک آدمی دولت مند ہے۔ اسے اسلام یہ کبھی نہیں کہے گا کہ تو اپنی ساری دولت کو ختم کردے بلکہ اسی دولت کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ بنائے گا۔ اس کے صرف اور آمد کا طریقہ بتلائے گا' اس کے قوانین بتلائے گا کہ میری اطاعت کے تحت اس کو خرچ کر ___ اور میری اطاعت کے تحت اس کو حاصل کر یہ سب تیرے لئے عبادت ہے' تو اس کرنے سے مجھ تک پہنچ جائے گا' تو دولت مند کو کہے گا کہ تو دولت کے راستے سے مجھ تک پہنچ۔

اس واسطے کہ ہزاروں عبادتیں ہیں جن کا تعلق ہی مال سے ہے۔ اگر دولت نہیں ہوگی تو آدمی زکوٰۃ کیسے دے گا؟ صدقۂ فطر کیسے دے گا؟ خیرات کیسے کرے گا؟ صلہ رحمی کیسے کرے گا؟ حج کیسے کرے گا؟ اجتماعی امور کیسے انجام دے گا؟ غرض خیرات وصدقات اور چندے' یہ سارے اعمال انجام نہیں دے سکتا جب تک دولت نہ ہو اور یہ سارے کام اسلام کے ہیں۔ اسلام کیسے کہہ دے گا ___ کہ دولت کو ضائع کردو یا حاصل نہ کرو یا آگئی ہے تو اسے کھودو' بلکہ اسی کو رکھ کر اسی دائرے میں سے راستہ نکال دے گا کہ اس کے اوپر چلو۔

غربت سے بھی خدا ملتا ہے

لیکن اگر دولت مندوں کو اسلام نے راستہ بتلایا کہ تم اپنی دولت کو اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ بناؤ۔ تو ممکن تھا کہ ایک غریب آدمی کا دل ٹوٹتا کہ بس دولت مند دنیا اور آخرت دونوں کما لے گیا۔ میں یہاں بھی محروم وہاں بھی محروم' نہ صدقہ دے سکتا ہوں نہ خیرات نہ صلہ رحمی کے قابل ہوں تو میں دنیا میں بھی ایسے ہی بے چارہ وبے کس رہا اور آخرت میں پہنچا تو بھی عبادتیں کم ہوئیں اس کا دل ٹوٹتا ___ اسلام نے فوراً ڈھارس دی کہ تو بھی مایوس مت ہو۔ حدیث میں فرمایا کہ :

> "اے غریب! تو اپنی غربت پر پریشان مت ہو' اس وقت کو یاد کر کہ قیامت کے دن امراء اپنے اپنے حساب کتاب میں لگے ہوئے ہوں گے اور غرباء پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل بھی ہو چکے ہوں گے"۔

تو غریب نے کہا کہ مجھے میری غربت مبارک' مجھے تموّل کی ضرورت نہیں ہے' یہ پانچ سو برس کی مدت خدا جانے کیسے گزرے گی؟ ___ حساب دے سکیں نہ دے سکیں؟ ___ کوئی عتاب نہ ہو' مصیبت نہ کہیں بھگتنی پڑے۔ دنیا کی ساٹھ ستر برس کی عمر تو گزر ہی جائے گی۔ میں سچے دل سے اپنی غربت پر خوش ہوں' تو اسے دولت کی نعمت دی اور اسے استغناء کی نعمت دی' دولت نہیں ہے مگر اس کا دل غنی ہے ___ ہمارے حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بعض دفعہ ایک شعر پڑھا کرتے تھے' فرماتے تھے ۔

لنگئے زیر و لنگئے بالا
نے غم دزد نے غم کالا!

ایک لنگی اوپر سے اوڑھ لی' ایک باندھ لی' نہ چور کا ڈر نہ چکار کا ڈر' بس غنی بنے بیٹھے ہیں۔ دولت مند کو دولت کی وجہ سے ہزار مصیبتیں ہیں' اس کی حفاظت کرنی پڑتی ہے' کہیں چور' ڈاکو نہ آجائے' حاکم حسد کرے تو اس سے بھی کسی طرح بچوں اور دولت کو بچاؤں کہیں ٹیکسوں کا اور محصول کا قصہ' غرض صبح سے شام تک ایک مصیبت ہے مگر غریب کہتا ہے کہ میں مصیبت زدہ نہیں ہوں ۔

لنگکے زیر و لنگکے بالا
نے غم دزد نے غم کالا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؂

ما ہیچ نداریم و غم ہیچ نداریم
دستار نداریم و غم پیچ نداریم

ہم کچھ نہیں رکھتے' اس لئے غم بھی کچھ نہیں رکھتے' ہم دستار ہی نہیں رکھتے' اس لئے پیچ و خم کا بھی ہمیں غم نہیں پیچ و خم کے غم میں تو وہ پڑے جو دستار رکھتا ہو۔

غرض ایک دولت مند کو اگر مادی دولت دی گئی' تو غریب آدمی کو جو صابر اور محتسب ہے اس کو استغناء کی دولت دی گئی یہ کمالِ غناء سے بادشاہوں سے زیادہ مزے میں اور مطمئن ہے ___ فرمایا گیا اور آخرت میں تجھے یہ نعمت ملی کہ تجھے غنی بنا دیا گیا سینکڑوں مصیبتوں سے چھوٹ گیا اور آخرت کی یہ نعمت ہے کہ پانچ سو برس پہلے تو جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اور امراء ابھی حساب و کتاب میں ہوں گے' تو دولت مندیوں خوش ہے کہ میں اپنی دولت سے جنت کما رہا ہوں' غریب آدمی یوں خوش ہے کہ میں اپنے غناء سے جنت کما رہا ہوں' تو اسلام نے کسی حالت میں مایوس نہ کیا' نہ دولت مند کو یہ کہا کہ تو فقیر بن ___ نہ فقیر کو یہ کہا کہ تو دولت مند بن ہر ایک حالت و کیفیت میں اس کو تسلی دی اور اسے راستہ بتلا دیا' یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ کسی حالت کے بدلے بغیر اسی حالت میں اسلام راستہ نکالتا ہے' مایوس نہیں ہونے دیتا۔

صحت و مرض میں بھی خدا ملتا ہے

حدیث میں فرمایا گیا سب سے بڑی نعمت جس پر رشک کیا جائے' وہ صحت و تندرستی ہے۔ صحت نہ ہو تو عبادت کیسے کرے؟ حج کو کیسے جائے؟ نماز کیسے پڑھے؟ روزہ کیسے رکھے؟ گویا ساری عبادتیں صحت سے وابستہ ہیں' اس لئے اس کی فضیلتیں بیان کی گئیں۔ صحت مند اور تندرست آدمی خوش ہے کہ مجھے اللہ نے صحت دی ہے' خدا کا شکر ہے جانی عبادت بھی کر رہا ہوں' محنت بھی اٹھا رہا ہوں' حج کو بھی جا رہا ہوں لیکن بیمار کا دل ٹوٹا کہ افسوس میں کچھ عمل نہ کر سکا' نہ میں مسجد تک جا سکتا ہوں نہ میں حج کرنے جا سکتا ہوں نہ میں جہاد کے لئے جا سکتا ہوں' کوئی کام بھی میں نہیں کر سکتا' افسوس میں محروم رہا۔ اسلام نے آکر فوراً تسلی دی کہ پریشان مت ہو ___ حدیث میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ بعضے بندوں سے پوچھیں گے کہ ___

اے بندے! میں بیمار ہوا تو مجھے پوچھنے نہ آیا ___ ؟ میں مریض ہوا تو میری مزاج پرسی کو نہ حاضر ہوا؟

بندہ کہے گا' اے اللہ! آپ تو رب ہیں آپ کو بیماری سے کیا تعلق؟ بیماری تو عیب اور نقص کی چیز ہے۔ آپ ہر نقص اور برائی سے بری ہیں۔

فرمائیں گے :

فلاں بندہ بیمار ہوا تھا۔ اگر تو بیمار پرسی کے لئے جاتا' مجھے اس کی چارپائی کی پٹی پر موجود پاتا ___ بیمار کا دل بڑھ گیا کہ میری وہ خصوصیت ہے کہ بیماری میں حق تعالیٰ کا قرب نصیب ہوتا ہے' کسی تندرست کی چارپائی پر حق تعالیٰ نہیں ہیں اور بیمار کی چارپائی پر موجود ہیں ___ یعنی خاص تجلی' لطف و کرم اور عنایت موجود ہے۔ کسی تندرست کے بارے میں حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تندرستی اپنے اوپر لے کر کہا ہو کہ میں تندرست تھا۔ تو

میرے پاس کیوں نہیں آیا۔ بیمار کے بارے میں اپنے اوپر لیکر فرمایا کہ میں بیمار ہوا' تو مجھے پوچھنے نہ آیا۔ گویا بیمار اتنا عزیز ہے کہ اس کی بیماری کو اپنی بیماری فرمایا کہ میں بیمار ہوا ___ تو بیمار کا دل بڑھ گیا کہ ایسی تندرستی کو سلام ہے جسے اتنا قرب نہ ہو' مجھے یہ بیماری عزیز اور مبارک ہے میں اس بیماری کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ یہ توجہ الی اللہ کا ذریعہ بن رہی ہے اور درجات و مراتب طے ہو رہے ہیں۔

صبر کا پھل

حضرت عمران بن الحصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں' ایک ناسور پھوڑے کے اندر بتیس برس مبتلا رہے ہیں' جو پہلے تھا اور چت لیٹے رہتے تھے' کروٹ نہیں لے سکتے تھے۔ یعنی بتیس برس تک چت ہی لیٹے لیٹے کھانا بھی' پینا بھی' عبادت کرنا بھی' قضائے حاجت کرنا بھی ___ آپ اندازہ کیجئے بتیس برس ایک شخص ایک پہلو پر پڑا رہے' اس پر کتنی عظیم تکلیف ہوگی؟ کتنی بڑی بیماری ہے؟

یہ تو بیماری کی کیفیت تھی۔ لیکن چہرہ اتنا ہشاش بشاش کسی تندرست کو وہ چہرہ میسر نہیں' لوگوں کو حیرت تھی کہ بیماری اتنی شدید کہ برس گزر گئے کروٹ نہیں بدل سکتے اور چہرہ دیکھو تو ایسا کھلا ہوا کہ تندرستوں کو بھی نصیب نہیں ___ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! ___ یہ کیا بات ہے کہ بیماری تو اتنی شدید اور اتنی ممتد اور لمبی چوڑی اور آپ کے چہرے پر اتنی بشاشت اور تازگی کہ کسی تندرست کو بھی نصیب نہیں؟ فرمایا'

جب بیماری میرے اوپر آئی' میں نے صبر کیا' میں نے یہ کہا کہ اللہ کی طرف سے میرے لئے عطیہ ہے۔ اللہ نے میرے لئے یہی مصلحت سمجھی۔ میں بھی اس پر راضی ہوں۔ اس صبر کا اللہ نے مجھے یہ پھل دیا کہ میں اپنے بستر پر روزانہ ملائکہ علیہم السلام سے مصافحے کرتا ہوں۔ مجھے عالم غیب کی زیارت نصیب ہوتی ہے ___ عالم غیب میرے اوپر کھلا ہوا ہے۔

تو جس بیمار کے اوپر عالم غیب کا انکشاف ہو جائے۔ ملائکہ کی آمد و رفت محسوس ہونے لگے اسے کیا مصیبت ہے کہ وہ تندرستی چاہے؟ اس کے لئے تو بیماری ہزار درجے کی نعمت ہے ___ حاصل یہ کہ اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے تندرست کو تندرستی میں تسلی دی' بیمار کو کہا کہ تیری بیماری اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے تو اگر اس میں صبر اور احتساب کرے گا حسبةً للہ اس حالت پر صابر اور راضی رہے گا تیرے لئے درجات ہی درجات ہیں۔

پھر یہ بھی فرمایا کہ تو علاج مت کر علاج بھی کر' دوا دارو بھی کر مگر نتیجہ جو بھی نکلے' اس پر راضی رہ' اپنی جدوجہد کئے جا باقی افعالِ خداوندی میں مداخلت مت کر تیرا کام دوا کرنا ہے۔ تیرا یہ کام نہیں ہے کہ دوا کے اوپر نتیجہ بھی مرتب کردے کہ صحت ہونی چاہئے۔ یہ اللہ کا کام ہے' تو اپنا کام کر' اللہ کے کام میں دخل مت دے' دوا دارو کر' مگر اللہ کی طرف سے جو کچھ ہو جائے اس پر راضی رہ کہ جو کچھ ہو رہا ہے میرے لئے خیر ہو رہا ہے' اس پر صبر کرو گے' وہی بیماری ترقیِ درجات اور اخلاق کی بلندی کا ذریعہ بنتی جائے گی۔ اس سے آدمی کے روحانی مقامات طے ہوں گے' تندرست کو روحانیت کے وہ مقامات نہیں ملتے جو بیمار کو ملتے ہیں۔ تو بیماریوں کہے گا مجھے میری بیماری مبارک' مجھے تندرستی کی ضرورت نہیں۔ تندرستی میں مجھے یہ مقامات مل نہیں سکتے تھے' جو بیماری میں ملے۔

تو اسلام نے تندرست کو تندرستی میں تسلی دی کہ تو اس کو مجھ تک پہنچنے کا ذریعہ بنا' بیمار کو بیماری میں تسلی دی کہ تو بیماری کو مجھ تک پہنچنے کا ذریعہ بنا' تو بیماری کی وجہ سے محروم نہیں رہ سکتا' یہ خیال مت کر کہ جو کچھ ملنا

تھا، تندرست کو مل گیا، میرے واسطے کچھ نہیں رہا۔ تیری بیماری میں تیرے لئے سب کچھ ہے۔
بہر حال ہر ایک کو اپنے دائرے اور اپنے مقام پر تسلی دینا یہ اسلام کا کام ہے۔

زندگی اور موت میں بھی خدا ملتا ہے

زندگی ہے، یہ بڑی نعمت ہے، زندگی نہ ہو تو آدمی طاعت و عبادت کیسے کرے؟ ترقی کے مدارج کیسے طے ہوں؟ سارے کام زندگی سے متعلق، موت جب آئے، مرنے والے کا دل ٹوٹا کہ یہ تو اپنی زندگی میں سب کچھ کما رہا ہے، میں تو ختم ہو چکا، میرے لئے اب کچھ نہ رہا، فوراً اسلام نے تسلی دی کہ بے صبر مت بن، پریشان مت ہو ___ تحفۃ المؤمن الموت

مومن کا سب سے بڑا تحفہ موت ہے جو اس کو اللہ کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے فرمایا : ان الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب۔

موت ایک پل ہے جس سے گزر کر حبیب اپنے محبوب حقیقی سے جا ملتا ہے، اگر موت بیچ میں نہ ہو تو اللہ سے ملنے کی کوئی صورت نہیں ہے، اگر یہ زندگی ختم ہو کر اگلی زندگی نہ آئے تو جمال خداوندی کے دیکھنے کی کوئی صورت نہیں ہے ___ تو اس سے مرنے والے کو تسلی ہو گئی کہ میں تو بڑے درجات کی طرف جا رہا ہوں مجھے زندگی نہیں چاہئے ___ بلکہ ایسے میں موت کی تمنا پیدا ہو جاتی ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

اللّٰھم حبّب الموت الی من یعلم انی رسولک۔

اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے جو میرے رسول ہونے کا قائل ہو۔ جو مجھے رسول مانتا ہے، اس کے دل میں موت کی محبت ڈال دے اس لئے کہ اگر اسے اللہ سے محبت ہے۔ اللہ تک پہنچانے والی چیز موت ہے تو اس سے بھی محبت ہو گی، کیونکہ منزل اگر محبوب ہے تو راستہ بھی عزیز اور محبوب ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا کہ یہود نے دعویٰ کیا تھا کہ اولیاء اللہ تو ہم ہیں۔ فوراً قرآن کریم نے مطالبہ کیا،

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (جمعہ (پ۲۸) ایت ۶)

اے یہود! اگر تمہیں یہ دعویٰ ہے کہ تم اولیاء اللہ ہو، تو ذرا موت کی تمنا تو کر کے دکھاؤ۔

ولی اللہ وہ ہوتا ہے جس کے دل میں اس زندگی سے زیادہ موت کی محبت ہوتی ہے ان کی زبانوں پر یہ شعر رہتا ہے کہ ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروئم
تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروئم

وہ کون سا مبارک دن ہو گا کہ اس اجڑے ہوئے دیار کو چھوڑ کر ہم اس شہر مطلوب تک پہنچیں گے اور غزلخواں، شاداں اور فرحاں جائیں گے، وہ کون سا دن ہو گا کہ اس گندے جہان کو چھوڑ کر پاک جہان میں جائیں گے۔

ابن الفارض رحمہ اللہ، جب ان کی وفات کا وقت آیا تو ترجمہ نگار لکھتے ہیں کہ آٹھوں جنتیں ان کے سامنے کھول دی گئیں اور منکشف ہوئیں، تو ابن الفارضؒ نے منہ پھیرلیا اور آنکھیں بند کرلیں اور یہ شعر پڑھا ۔

ان کان منزلتی فی الحب عندکم
ماقد رأیت فقد ضیّعت ایامی

اگر میری عمر بھر کی محنت کا ثمرہ یہ آٹھ کھلونے ہیں جو آپ نے رکھ دیئے، تو افسوس میری عمر ضائع ہوگئی، مجھے کچھ نہ ملا ــــ مؤرخین لکھتے ہیں کہ آٹھوں جنتیں چھپادی گئیں، تجلّیاتِ خداوندی سامنے آئیں اور ان کی روح غرغراکر پرواز کرگئی، تو ایک مرنے والا جب یہ دیکھتا ہے کہ تجلّیاتِ خداوندی میرے استقبال کو آرہی ہیں، اسے کیسے زندگی کی تمنا باقی رہ سکتی ہے؟

حدیث میں ہے کہ جب مؤمن کے مرنے کا وقت آتا ہے تو ملک الموت کے اَعوان وَانصار دو قسم کے ہیں ایک وہ جو دائیں ہاتھ پر ہیں۔ لاکھوں کروڑوں فرشتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو بائیں ہاتھ پر ہیں۔ دائیں ہاتھ والے مؤمنوں کی اَرواح قبض کرتے ہیں اور بائیں ہاتھ والے کفّار کی ارواح قبض کرتے ہیں۔ دائیں ہاتھ والے روشن چہرے کے ملائکہ ہیں، سورج اور چاند کی طرح ان کے چہرے چمکتے ہیں اور بائیں ہاتھ والے ملائکہ سُودالوجوہ ہیں، سیاہ اور بھیانک چہرے ہیبت ناک ان کی شکلیں ہیں۔

مؤمن پر جب موت کا وقت آتا ہے تو وہ دور سے کچھ ستارے اور روشنی دیکھتا ہے وہ تحیّر میں مبتلا ہوتا ہے کہ یہ روشنی کیسی ہے؟ یہ چاند سورج کیسے ہیں؟

یہ جو وقت ہوتا ہے اِدھر سے غفلت کا اور اُدھر متوجّہ ہونے کا ہوتا ہے۔ ابھی نزع نہیں شروع ہوا ابھی غفلت طاری ہوئی، نزع تب شروع ہوگا جب سانس چلنے لگے لیکن ابتداءً یہ خوشی طاری ہے اور یہ غفلت ہے کہ ادھر کا جہان چھپ جاتا ہے اور اُدھر کا جہان روشن ہوجاتا ہے اور یہ نظر پڑتا ہے کہ لاکھوں چاند اور سورج ہیں جو آہستہ آہستہ میری طرف بڑھے چلے آرہے ہیں۔ تو یہ تحیّر میں دیکھتا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیسا کارخانہ ہے؟ ــــ اور ملائکہ علیہم السلام یہ آہستہ آہستہ اس لئے بڑھتے ہیں کہ مقصد شفقت ہے، اگر ایک دم آپڑیں تو یہ گھبرانہ جائے کہ یہ کیابات ہوگئی، اس لئے آہستہ آہستہ اس کے دل میں گنجائش کرتے ہوئے آتے ہیں کہ وہ سہتا جائے اور یہ سمجھتا جائے۔ پھر اخیر میں قریب آجاتے ہیں پھر اسے کوئی اوپری بات معلوم نہیں ہوتی ــــ اور یہ نہیں کہ آتے ہی روح قبض کرنی شروع کردی۔ حدیث میں ہے کہ اس میت کو عالم آخرت کی ترغیب دلاتے ہیں اور دنیا سے نفرت دلاتے ہیں کہتے ہیں کہ :

اُخرجی ایتھا النفس الطیبۃ کانت فی الجسد الطیب اُخرجی الی روح وریحان ورب غیر غضبان۔

اے پاک روح! اے پاک نفس! تو نے اپنے بدن کو نیک اعمال سے پاک کیا۔ اپنی روح کو بھی ذکر سے نیک کیا یا نیک کلمات سے پاک رکھا، تو اے پاک روح! اپنے پاک بدن سے چلی آ ــــ اور کہاں جا؟

اخرجی الی روح وریحان ــــ بہاروں کی طرف اور نعمتوں کی طرف چل اور اس پروردگار کی طرف چل جو تجھ پر نامہربان نہیں، بلکہ شفیق، مہربان اور رحمت والا ہے، تیرا منتظر ہے ــــ یہ گویا ترغیب دیتے ہیں تاکہ بندہ راضی ہو اور اس کی رضا کے بعد روح قبض کرنا شروع کریں۔

انبیاء علیہم السلام کی ارواح قبض کرنے کے لئے ملک الموت آتے ہیں تو باقاعدہ اجازت مانگتے ہیں جب

انبیاء علیہم السلام اجازت دے دیتے ہیں تب قبض روح شروع ہوتا ہے۔ مؤمن سے اجازت نہیں لی جاتی مگر ترغیب دی جاتی ہے تاکہ وہ موت کے اوپر مطمئن ہو جائے۔ اس کی رضا حاصل ہو جائے تب قبض روح شروع ہو' تو یوں ترغیب دیتے ہیں کہ اس گندے جہان کو چھوڑ اور اس پاک جہان کی طرف چل' اِدھر نفس کی حکومت تھی' اُدھر اس رب کی حکومت ہے جو تجھ پر کبھی نامہربان نہیں ہے' ہمیشہ تجھ پر مہربان رہے گا' روح وریحان اور نعمتوں کی طرف چل۔

سب جانتے ہیں کہ موت سے انسان کو طبعاً کراہت ہے' کتنی نعمتیں ہوں مگر موت قبول کرنے کے لئے آدمی تیار نہیں ہوتا' تو جب وہ اس ترغیب سے راضی نہیں ہوتا' حدیث میں ہے کہ پھر ملائکہ اس کو جنت کے تحفے دکھلاتے ہیں' کچھ پھل' کچھ لباس' اس کو دیکھ کر ایک دم روح پرواز کرنی شروع کر دیتی ہے اور تشبیہ دی گئی کہ اس طرح سے نکل جاتی ہے جسے مشک میں پانی بھر کر پانی الٹ دو' اس کا منہ کھول کر نیچے کر دو اور سارا پانی غرغرا کر نکل جائے گا' ایک قطرہ باقی نہیں رہے گا' اس طرح روح شوق وذوق میں پرواز کر جاتی ہے' تو ملائکہ علیہم السلام آتے ہیں' ترغیب دیتے ہیں' بندے کی رضا حاصل کرتے ہیں وہ راضی ہوتا ہے تب اس کی روح قبض کرتے ہیں' یہ ملائکہ علیہم السلام کی شفقت ہے' ملک الموت اس سے بات بھی کرتے ہیں۔

جب نزع شروع ہوا۔ یہ ملک الموت کے اعوان وانصار کا کام ہے' نزع ہونے کے بعد روح کا قبض کرنا اور قبضے میں لینا' یہ ملک الموت کا کام ہے' گویا ابتدائی مبادی یہ ملائکہ طے کرتے ہیں اور آخری نتیجہ ملک الموت علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے' میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ زندگی جیسے نعمت ہے موت بھی ایک نعمت ہے۔ اسلام نے اگر زندگی کی تعریف کی اور ترغیب دی اور کہا کہ تم دعائیں مانگو کہ ہماری عمر صالحات وحسنات کے ساتھ دراز ہو' اب ایک شخص زندہ ہے تو ممکن ہے مرنے والے کے دل میں مایوسی پیدا ہو کہ اسے تو سب کچھ مل گیا' میری عمر ختم ہو گئی' تو اسے اس حالت میں تسلی دی کہ تیری موت تیرے لئے تحفہ اور روح وریحان کا پیغام ہے حق تعالیٰ کی رضا اور خوشی کا پیغام ہے' غرض یہ اس پر راضی کہ مجھے موت آرہی ہے' وہ اس پر راضی کہ مجھے زندگی مل رہی ہے' نہ یہ مایوس نہ وہ مایوس ___ اسلام نے ہر ایک کو تسلی دی ہے کسی حالت میں اپنے پیروؤں کو مایوس نہیں کرتا' ہزار مصیبتیں آجائیں اسلام مایوس نہیں ہونے دے گا۔ ہزار نعمتیں آجائیں اس میں راستے دکھلائے گا' مصائب کے بارے فرمایا :

لَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۔

کتنی مصیبت آجائے' کبھی مایوس مت ہونا' مؤمن کا کام نہیں ہے اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا۔

تو مصائب میں اسلام تسلی دیتا ہے کہ مصیبت سے مت گھبراؤ' مصیبت بھیجنے والے پر نظر رکھو' نعمت میں آدمی راضی کہ نعمت مل گئی' مصیبت آگئی تو صابر اس کے اندر بھی راضی کہ مجھے بھی نعمت مل گئی' میرے اخلاق میں وہ بلندی پیدا ہوئی کہ نعمتوں میں وہ بلندی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ تو اس مصیبت نے میرے اخلاق اونچے کر دیئے ___ غرض کوئی حالت ایسی نہیں ہے کہ انسان کو مایوس بنا دیا گیا ہو۔

یہ میں نے اس پر عرض کیا کہ جب میں نے عبادت کا نام لیا تو ممکن ہے اس طرف تصور گیا ہو کہ بس اب کہا جائے گا کہ کوٹھی بنگلے چھوڑو اور جاؤ مسجد کی طرف ___ یہ نہیں کہا جا رہا' بلکہ کوئی حالت ایسی نہیں جس میں خدا نہ ملتا ہو' اگر آپ کوٹھی بنگلوں میں رہ کر چاہیں' وہاں بھی اللہ کو یاد کر سکتے ہیں۔ آپ کی نیت صحیح ہونی چاہئے۔ آپ کا نصب العین درست ہونا چاہئے' مال کماؤ تو جائز طریق پر' خرچ کرو جائز طریق پر تو کمانا بھی عبادت' خرچ کرنا بھی عبادت ہے' دونوں پر سچی نیت سے اس طرح اجر ملے گا جس طرح نماز پڑھنے پر ملتا ہے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی مفلس بنے جب خدا کو پائے گا۔

دولت اپنی ذات سے بُری نہیں

صحابہ کرامؓ سب کے سب مقبول ہیں، لیکن ان میں مالدار بھی ہیں اور نادار بھی، لکھ پتی بھی ہیں اور کروڑ پتی بھی اور ابوذر غفاریؓ جیسے بھی جن کا مذہب یہ تھا کہ اگر ایک وقت کا کھانا ہے، تو یہ جائز نہیں ہے کہ دوسرے وقت کے لئے آدمی جمع کرے تو جہاں ابوذر غفاریؓ جیسے صحابہؓ ہیں وہاں عبدالرحمن ابن عوفؓ جیسے بھی ہیں جو لکھ پتی اور کروڑ پتی لوگوں میں ہیں جن کی تجارت تھی۔

ان کی تجارت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا دی تھی اور حال یہ تھا کہ ان کی تجارت کی کوٹھیاں روم، مصر اور شام میں جگہ جگہ بنی ہوئی تھیں اور نفع کا مال جب آتا تھا، تو یہ نہیں تھا کہ دس پانچ آدمی لے کر آجائیں بلکہ اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور فرماتے تھے کہ گھر میں ڈال دو، وہ اس قدر ہوتا تھا کہ غلے کی طرح ڈھیر لگ جاتا تھا۔ دولت کی یہ کیفیت تھی۔

مگر اس کے ساتھ قلب کی کیا کیفیت تھی؟ ___ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مہمانداری کا یہ عالم تھا کہ تین تین سو، چار چار سو مہمان، دسترخوان پر جمع ہوتے تھے، جب نعمتیں چنی جاتیں، دسترخوان سج جاتا اور کھانے کے لئے بیٹھتے تو عبدالرحمن ابن عوفؓ رونا شروع کرتے۔ بے اختیار دل بھر آتا اور فرماتے:

> "اے اللہ! تیرے نبی کے دسترخوان پر کبھی ایک سے دوسرا کھانا جمع نہ ہوا اور میرے دسترخوان پر اتنی نعمتیں ___؟ کہیں میری جنت کی نعمتیں دنیا ہی میں تو نہیں ختم کی جارہی ہیں"۔

یہ کہہ کر روتے اتنا روتے کہ بے خود ہو جاتے، سارے حاضرین اور مہمان بھی روتے اور بے کھائے پیے دسترخوان اٹھ جاتا۔

رات کو پھر دسترخوان بچھایا جاتا۔ پھر اللہ کی نعمتیں چنی جاتیں، پھر عبدالرحمن ابن عوفؓ پر گریہ طاری ہوتا اور کہتے کہ:

> "اے اللہ مہاجرین اوّلین اتنی غربت اور بے کسی سے دنیا سے گئے کہ فاقے پر فاقے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس غربت میں وفات پائی کہ کفن بھی پورا میسر نہیں تھا۔ اگر سر ڈھانپا جاتا تو پیر کھل جاتے تھے۔ پیر ڈھانپے جاتے تو سر کھل جاتا تھا۔ آخر میں سر ڈھانپ دیا گیا اور پاؤں پر اذخر گھاس ڈال کر دفن کر دیا گیا ___ تو حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تو یہ حالت اور عبدالرحمن ابن عوفؓ کا گھر پیسوں اور اشرفیوں سے بھرا پڑا ہے کہیں دنیا ہی میں میری جنت کی نعمتیں تو ختم نہیں کی جارہی ہیں؟"۔

پھر روتے، سارے حاضرین روتے اور بے کھائے پیے دسترخوان اٹھ جاتا، تین تین وقت کے فاقے اس طرح سے آتے تھے۔ تو دولت کا یہ حال اور قلب کا یہ حال؟ غرض اسلام دولت کا مخالف نہیں ہے، تموّل کو برا نہیں کہتا لیکن تموّل سے اگر دل بگڑ جائے اس دل کو اسلام برا کہتا ہے، دولت اس لئے نہیں ہے کہ دل کو بگاڑا جائے، بلکہ اس لئے ہے کہ صحیح دل رکھ کر اس کو صحیح مصرف میں لگایا جائے تو آدمی کی دولت بری نہیں ہے

آدمی برا ہوتا ہے، آدمی برا ہے تو دولت بری ہو جائے گی، آدمی اچھا ہے تو دولت اچھی ہو جائے گی سامان اپنی ذات سے اچھا یا برا نہیں، سامان والے کو دیکھو کہ وہ اچھا ہے یا برا ___ ؟ وہ اچھا ہے تو سارا سامان اچھا۔ وہ برا ہے تو سارا سامان برا۔ لوگ خواہ مخواہ دولت کو برا کہتے ہیں۔ دولت بیچاری نے کیا قصور کیا ہے؟ آدمی اپنے کو دیکھے۔

دولت کی مثال

عارف رومیؒ نے ایک بڑی عجیب مثال دی ہے فرمایا :

دولت کی مثال ایک سمندر کی ہے اور انسان کا دل کشتی جیسا ہے۔ پانی اگر کشتی سے باہر رہے تو منزلیں طے کرے گی اور اگر کشتی کے اندر آگیا تو کشتی بھی گئی اور کشتی والا بھی گیا، تو فرمایا : دولت ایک سمندر کی مانند ہے اور ہمارے دل کشتیوں کی مانند ہیں۔ اگر دولت دل سے باہر یا باہر ہے تو پار لگا کے آخرت کے کنارے پر پہنچادے گی۔ لیکن اگر دل کے اندر آگئی تو دل بھی ڈوبا اور دل والا بھی ڈوبا، غرض دولت کی برائی نہیں کی، دولت کا محل بتایا کہ دل سے باہر ہاتھ پاؤں میں رکھو کماؤ، کھاؤ پیو اور خرچ کرو، لیکن رہنی چاہئے ہاتھ پیر کے اندر ___ دل کے اندر فقط محبتِ خداوندی ہونی چاہئے ___ دولت کی محبت نہیں ہونی چاہئے۔

طبعی محبت کی رعایت

اور اگر تھوڑی بہت طبعی طور محبت ہو بھی، آخر بالکل محبت کو کیسے دل سے نکال دے، کچھ نہ کچھ محبت ہوتی ہے۔ تو اسلام نے بھی یہ نہیں کہا کہ بالکل محبت نکال دو تمہیں طبعی طور پر محبت و تعلق ہے 'لہٰذا رکھو، مگر وہ محبت اتنی نہ ہو کہ جب محبت خداوندی کا مقابلہ پڑے تو یہ محبت غالب آجائے۔ مقابلہ پڑے تو وہ محبت غالب رہنی چاہئے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے :

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ۔ (التوبہ پ۱۰ آیت ۲۴)

حق تعالیٰ فرماتے ہیں،

اگر تمہارے ماں باپ اور اولاد اور تمہارے بھائی بند اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ، تمہارے اموال اور تمہاری تجارتیں جن میں کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو کہ بازار کھوٹا نہ ہونا چاہئے اور تمہاری وہ بلڈنگیں، اعلیٰ اعلیٰ مکانات و محلات جن سے تم راضی ہو اور تمہارے قلوب میں کشش موجود ہے، احب الیکم اگر یہ اللہ کی محبت کے مقابلہ میں زیادہ محبوب بن گئے تو مصائب اور فتنوں کا انتظار کرو۔

اس میں بتلا دیا گیا کہ "احبیت" کی ممانعت ہے کہ بمقابلۂ خدا زیادہ محبوب نہیں ہونا چاہئے۔ معلوم ہوا تھوڑی بہت محبت ہو تو اجازت دی ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ اسے اپنے مال اور اپنی چیزوں سے محبت ہوتی ہے۔ ہر انسان ولی کامل نہیں ہوتا۔ یہ پیغمبروں کے مقامات ہیں کہ ذرہ برابر قلب میں لگاؤ نہیں ہے، اولیاء کے مقامات ہیں کہ دولت یا مال سے ذرہ برابر لگاؤ نہیں، اب ہم اور آپ اس مقام تک کہاں پہنچ سکتے ہیں؟ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ محبت رکھو ہم نکالنا نہیں چاہتے، مگر مقابلہ پڑ جائے تو یہ دیکھو کہ محبت خداوندی کے مقابلے

میں یہ مغلوب ہے یا غالب ہے؟ اگر غالب ہو تو پھر مصیبتوں کا انتظار کرو۔ اگر مغلوب ہے تو کوئی مضائقہ نہیں، بہرحال اس کی گنجائش دی ہے ___ معلوم ہوا دولت کے اندر رہ کر بلکہ دولت کی کچھ نہ کچھ محبت رکھ کر پھر بھی آدمی اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ دولت اس سے چھینی جائے تب اللہ تک پہنچے۔ یہ اسی دولت کو اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ بنائے ___ حاصل یہ نکلا کہ عبادت لفظ سن کر یہ دھیان نہ جانا چاہئے کہ گھر یار چھوڑ کر مسجد میں جاؤ۔ مسجد میں بھی خدا ملتا ہے گھر میں بھی ملتا ہے۔

انسان ہر حال میں خدا تک پہنچ سکتا ہے

کھانا کھاتے ہوئے دستر خوان پر بھی ملتا ہے حتیٰ کہ استنجاء تک جاتے ہوئے بھی آدمی اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ایک آدمی کھانا کھا رہا ہے اور اس نیت سے کھا رہا ہے کہ اگر میرے پیٹ میں کچھ قوت پڑ جائے تو اللہ کے راستہ میں عبادت وطاعت میں صَرف کروں گا۔ وہ پورا کھانا عبادت میں داخل ہے اور اس شان سے داخل ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ جس نے بسم اللہ سے کھانا شروع کیا اور الحمد للّٰہ کثیرًا پر ختم کیا یعنی کھا کر یہ کہا، فرماتے ہیں :

غفرلہ ماتقدم من ذنب۔

پچھلے گناہ سب بخش دیئے جاتے ہیں اب کھائی روٹی اور معاصی کی بخشش ہو رہی ہے، جو نماز پر ثمرہ مرتب ہوتا ہے، وہ دستر خوان پر مرتب ہوا۔ معلوم ہوا آدمی دستر خوان پر بیٹھ کر بھی اللہ تک پہنچ سکتا ہے، روزہ سے بھی پہنچتا ہے، افطار سے بھی پہنچتا ہے۔ روزہ رکھے گا اس کے لئے فرماتے ہیں :

الصوم لی وانا اجزی بہ۔

روزہ میرا ہے میں اس کا بدلہ دوں گا اور افطار کرنے بیٹھا تو فرمایا افطار کرنے والے کے لئے دو فرحتیں ہیں، ایک فرحت یہ ہے کہ پانی پی کر پورے بدن میں سیرابی آگئی اور دوسری فرحت یہ ہے کہ اللہ کی ملاقات نصیب ہوگی، رضائے خداوندی نصیب ہوگی۔ غرض روزے میں آدمی فاقہ کرکے اللہ تک پہنچا اور کھا کر بھی اللہ تک پہنچا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جب فاقہ کرے جبھی پہنچے اسی طرح یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی مفلس ہو جبھی اللہ تک پہنچے، سرمایہ دار ہو تب بھی پہنچ سکتا ہے، بشرطیکہ سرمایہ کا اول و آخر درست ہو، حرام اور ناجائز کمائی نہ ہو، خرچ میں بھی ناجائز طریقہ نہ ہو۔

آج کا جُنید و شبلی

اور آج تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ایک انسان حرام سے بچ جائے اور فرائض ادا کرتا رہے تو وہ ولی کامل ہے۔ یہ اِس زمانے میں جنید بغدادی جیسا ہے اُس زمانے میں جنید بننے کے لئے بے شک یہ ضروری تھا کہ کسی مکروہ کا بھی ارتکاب نہ کرے اور کوئی مستحب بھی نہ چھوٹنے پائے۔ لیکن آج کا جنید اگر فرائض سرانجام دے اور حرام سے بچ جائے تو انشاء اللہ اسے جنید و شبلی جیسا اجر ملے گا۔

اس لئے کہ آج کا زمانہ انتہائی فتنوں اور رکاوٹوں کا زمانہ ہے۔ ان رکاوٹوں میں رہ کر آدمی اپنے دین پر قائم رہ جائے تو وہ مجاہد ہے ___ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے ارشاد فرماتے ہیں کہ :

''آج تم ایسے دور میں ہو کہ اگر دین کے دس حصوں سے نو حصے انجام دو۔ ایک حصہ

چھوٹ جائے، تم سے قیامت کے دن مؤاخذہ ہوگا کہ تم نے ایک حصہ کیوں چھوڑا؟

اور فرمایا :

تمہارے بعد میں ضعفاء آنے والے ہیں کہ اگر دین کے دس حصوں میں سے ایک حصے پر عمل کریں اور نو حصے چھوٹ جائیں تو انہیں اجر وہ دیا جائے گا جو تمہیں دیا جارہا ہے"۔

یہ اس لئے کہ تمہارے سامنے رکاوٹیں نہیں خدا کا رسول موجود ہے، معجزے موجود، خیر القرون کے اندر تم موجود ہو، سارے دواعی اور اسباب دین موجود ہیں۔ اس لئے دین پر عمل کرنا تمہارے لئے دشوار نہیں۔ بعد والے وہ ہوں گے کہ نہ ان کی آنکھوں کے سامنے اللہ کا رسول موجود، نہ معجزے ہوں گے، نہ ان کے سامنے خیر القرون ہوگا نہ وہ حالات و کیفیات ہوں گی، بلکہ شک ڈالنے والے اور شبہات پیدا کرنے والے زیادہ ہوں گے، فتنوں کا ایک ہجوم ہوگا۔ جو ان سب کے اندر رہ کر دین پر قائم ہوگا۔ وہ تھوڑا بھی کرے گا تو اجر وہ ملے گا جو آج تمہیں دیا جارہا ہے۔

غرض رکاوٹوں اور موانع کی کثرت میں جو چیز آتی ہے وہ قابل قدر ہوتی ہے، اس واسطے دولت دنیا ہو، تمول ہو، بلڈنگیں ہوں، باغات ہوں۔ اگر حلال طریق پر کمائی جائیں حق تعالیٰ نے عطا کیا، تو اسکا عطیہ ہے، ضائع نہ کیا جائے لیکن اسی سے پوچھ کر خرچ کیا جائے۔

ہماری ملکیت کی حیثیت

اس واسطے کہ اپنی جان کے بھی ہم مالک نہیں ہیں تو اپنے مالوں کے مالک بھی ہم نہیں ہیں۔ جان کا مالک وہ ہے جس نے جان بنائی، ہمارے مالوں کا مالک وہ ہے جس نے مال بنا کر ہمارے سپرد کیا ہے۔ درحقیقت مالک حق تعالیٰ شانہ ہیں ہم امین و خزانچی ہیں، خزانچی کا کام یہ نہیں ہوتا کہ اپنی مرضی سے جسے چاہے دیدے، مالک سے پوچھنا پڑے گا کہ کتنا کس کو دوں؟ وہاں سے آرڈر ہوگا جتنا حکم ہوگا، اتنا خرچ کرنا پڑے گا، فرمایا گیا :

إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ۔ (اعراف پ۹ آیت ۱۲۸)

زمین کا مالک اللہ ہے جسے چاہے بخش دے، ہم مالک نہیں ہیں، اور جب بخش دیتے ہیں تو بخشنے کے بعد بھی مالک وہی رہتے ہیں۔ فرماتے ہیں :

وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ۔

سارے انسان دولتوں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے، اصل وارث ہم ہیں۔ پھر وراثت ہمارے ہی پاس آجائے گی، ہم ہی اول میں مالک تھے، ہم ہی اخیر میں ہیں اور درمیان کے حصہ میں بھی مالک ہم ہی ہیں، ہمارا ہی آرڈر چلے گا، ہمارے ہی کہنے کے مطابق وہ خرچ کی جائے گی۔ اسی لئے فرماتے ہیں :

وَأَنْفِقُوا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ۔

اس دولت میں سے خرچ کرو جو ہماری بخشی ہوئی ہے۔ یہ لفظ اس لئے کہہ دیا کہ کہیں تم یہ نہ سمجھ لینا کہ تم مالک ہو یا تم اس دولت کے بنانے والے ہو، پیدا کرنے والے بھی ہم ہیں مالک بھی ہم ہیں تو فرما دیا کہ :

مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ۔

وہ جو ہم نے تمہیں دولت دی ہے اس میں سے کرچ کرو۔

ترغیب انفاق

اس عنوان سے خرچ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ انسان کو اپنی چیز دوسرے کو دینے میں طبعاً رکاوٹ ہوتی ہے اور اگر یوں کہا جائے کہ بھائی یہ چیز تمہاری کب ہے تو دینا آسان ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ :

"مالِ مفت دلِ بے رحم"

جب مال مفت کا ملے گا، آدمی بے تکلف خرچ کرے گا۔ ایک چیز دوسرے کی ہے، میں کیوں بخل کروں اس لئے فرمایا کہ تم اسے اپنی چیز سمجھتے کیوں ہو؟ یہ تو ہماری چیز ہے۔ جب ہم اجازت دے رہے ہیں تو ہماری سمجھ کے خرچ کرو تاکہ سخاوت کر سکو۔ اطمینان سے دے سکو۔

یہ تموّل اور دولت خود دین کے کمانے کا ذریعہ ہے جیسے میں نے عرض کیا صحابہؓ میں ابوذر غفاریؓ جیسے بھی ہیں اور صدّیق اکبرؓ و (عبدالرحمن ابن عوفؓ) جیسے بھی ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرے اوپر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے، ابوبکرؓ کا احسان ہے کہ چالیس ہزار روپیہ میری ذات کے اوپر خرچ کیا ہے۔ اس زمانے کا چالیس ہزار روپیہ ایسا ہے جیسا آج کا چالیس لاکھ روپیہ۔

ظاہر بات ہے کہ اللہ کے رسولؐ کو بھی ضرورت پیش آئی اور خدّام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر خرچ کیا۔ یہ خرچ کرنا عین طاعت و عبادت بنا۔ وہی ترقی کا باعث بنا کہ صدّیقیت کا مقام ملا۔

بادشاہت کے ساتھ عبادت

حاصل یہ نکلا کہ انسان کسی بھی حالت میں ہو عبادت سے محروم نہیں رہ سکتا، ہر مقام کی عبادت دولت مند کی عبادت دولت کے ساتھ، غریب کی عبادت غربت کے ساتھ ہوتی ہے، بادشاہ کی عبادت بادشاہت کے ساتھ ہوتی ہے اور فقیر بے نوا کی عبادت فقر و فاقہ کے ساتھ ہوتی ہے۔

امیر کے بارے میں فرمایا کہ :

سبعة یظلهم الله فی ظله یوم لاظل الا ظله۔

سات قسم کے لوگ ہوں گے جن کو قیامت میں عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی جس دن بجز اس کے سائے کے کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ اس میں پہلی نوع فرمایا :

امام عادل ___ وہ بادشاہ جو عدل و انصاف والا ہو۔ اسے عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی ایک فقیر یہ سمجھتا تھا کہ اسے اتنے اونچے مراتب مل رہے ہیں۔ یہ تخت پہ بیٹھا ہوا بادشاہ ہے۔ اس کے سا وسائلِ زندگی کھلے ہوئے ہیں، عیش کے سارے سامان اس کے قبضے میں ہیں۔ یہ کیا دیندار ہوتا؟ لیکن اسل نے آکر اسے تسلی دی کہ تو تخت پر بیٹھ کر بھی اللہ کو پا سکے گا۔ اگر تو عدل و انصاف کرے تو تجھے وہ مقام ملے کہ تجھے عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی۔ غرض ایک فقیر بے نوا کو بھی یہ مقام دیا گیا اور ایک بادشاہ وق کو جو تخت و تاج کا مالک تھا، اسے بھی یہ مقام دیا گیا۔ تو اسلام کسی کے ساتھ بخل نہیں کرتا۔ نہ کہتا ہے کہ مقام بدل جب جا کے تجھے خدا ملے گا، بلکہ اپنے مقام پر رہ۔ مگر ضرورت کس چیز کی ہے؟ فکر کی ضرورت بے فکرا انسان کوئی انسان نہیں ہے۔ جس انسان کا نصب العین نہیں ہے، وہ انسان نہیں ہے، عقلمند انسان ہے کہ اپنا نصب العین ٹھہرا دے۔ تو نصب العین طاعت و عبادت خداوندی نکلا۔ دولت مند ہوگا اطاعت کر سکتا ہے۔ مفلسی میں ہوگا تب بھی یہ نصب العین اپنا سکتا ہے۔ بادشاہی تخت پر ہے تب بھی

نصب العین قائم ہے۔ غربت میں ہے تب بھی' تندرستی میں ہو تب بھی یہ نصب العین قائم اور انتہائی بیماری میں ہو تب بھی۔ زندگی ہو تو یہ نصب العین قائم' موت آجائے تو بھی' یہ عجیب ترین نصب العین ہے جو اس لمبی عمر کے ساتھ اخیر تک چلتا ہے۔

قبر میں عبادت

قبر میں بھی جا کر عبادت ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے لئے صاف حدیث موجود ہے کہ :

الانبیاء احیاء فی قبورهم یصلّون (او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام)

انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور عبادتوں میں مشغول ہیں نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

کانّی انظرالی موسٰی یلبّی

گویا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں موسیٰ علیہ السلام تلبیہ پڑھتے ہوئے' لبیک لبیک کہتے ہوئے میدان عرفات میں جا رہے ہیں گویا حج بھی کرتے ہیں تلبیہ بھی پڑھتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ مطاف میں ایک شخص چوڑے سینے والا' چہرہ اتنا حسین اور تروتازہ کہ ایسا معلوم ہوا ابھی حمام سے غسل کر کے نکلا ہے۔ بال اتنے خوبصورت اور اتنے شاداب جیسے معلوم ہو کہ ان سے پانی ابھی ٹپک پڑے گا۔ تو میں نے جبرئیلؑ سے پوچھا کہ مطاف میں یہ کون شخص ہے؟ کہا مسیح ابن مریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام طواف میں بھی ہیں' غرض انبیاء علیہم السلام کی عبادت ثابت ہوئی۔

اولیائے کرام' کیا عجب ہے کہ حق تعالیٰ اولیائے کرام کو بھی ذکر کا الہام فرماتے ہوں وہ بھی تسبیح و تہلیل میں لگے رہتے ہوں۔ اسی طرح ممکن ہے کہ صلحائے مؤمنین بھی ذکر اللہ میں لگے رہتے ہوں۔ حدیث میں ہے کہ :

تحشرون کما تموتون وتموتون کما تحیون۔

تمہارا حشر اس حالت پر ہو گا جس حالت پر موت آئے گی اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزاری ہے۔ اگر ذکر اللہ پر زندگی گزاری ہے' موت بھی ذکر اللہ پر آئے گی' قبر سے جب اٹھے گا وہی ذکر کرتا ہوا اٹھے گا اگر حج میں لبّیک کہتا ہوا انتقال کر گیا تو حدیث میں ہے کہ جب قبر سے اٹھے گا تو لبّیک لبّیک زبان پر جاری ہو گا ___ اور یہ سمجھتا ہوا ہو گا گویا میں حج کر رہا ہوں۔ بعد میں یہ پتہ چلے گا کہ یہ میدانِ عرفات نہیں ہے بلکہ میدانِ محشر ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ جب انسان قبر میں لٹا دیا جاتا ہے اور ملائکہ علیہم السلام سوال وجواب کے لئے آتے ہیں جن میں سے ایک کا نام منکر اور ایک کا نام نکیر ہے' اور منکر نکیر اس لئے کہا کہ ان کی صورتیں اوپری ہوتی ہیں جو کبھی نہیں دیکھی ہوتیں۔ وحشت ناک' ہیبت ناک اور ڈراؤنی شکلیں ہوتی ہیں۔ وہ آتے ہیں اور تین سوال کرتے ہیں کہ **من ربک** ؟ تیرا پروردگار کون ___ ؟ **وما دینک** ___ ؟ اور تیرا طریق کار کیا تھا ___ ؟ **ومن هذا الرجل** ___ ؟ اور یہ ذات بابرکات جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہوتا ہے کون ہیں؟

حدیث میں فرمایا گیا کہ جب یہ دونوں سوال کرنے کے لئے آتے ہیں تو ہر مؤمن کو جو وہاں قبر میں وقت دکھلایا جاتا ہے' وہ ایسا ہوتا ہے کہ سورج ڈوبنے والا ہے اور عنقریب دن ختم ہونیوالا ہے۔ **یتمثّل لہ**

الشمس سورج کی صورت مثالی سامنے آتی ہے کہ سورج ڈھلنے والا ہے۔ اس وقت فرشتہ پوچھتا ہے کہ من ربک ؟کون ہے تیرا پروردگار؟ یہ میت جواب دیتا ہے کہ دعونی اصلّی میاں پرے ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے دو۔ وقت تنگ ہو رہا ہے کہیں وقت نہ نکل جائے' میری نماز مکروہ نہ ہو جائے۔

دوسرا فرشتہ کہتا ہے کہ اس سے کیا جواب مانگتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ یہ تو رب میں اتنا منہمک ہے کہ یہاں نماز پڑھنے کو اور اس کی عبادت کرنے کو تیار ہے؟ اس سے رب کا کیا پوچھنا؟ اس نے عملاً جواب دیدیا کہ یہ اس کا بندہ ہے جس کی نماز پڑھنے کو تیار ہے۔

دوسرا کہتا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ یہ جواب سچا دے گا' مگر ہمارا فرض ہے ہمیں ڈیوٹی انجام دینی ہے۔ یہ ہمیں یقین ہے کہ تینوں سوالات کا جواب حق ملے گا ___ تو قبر میں اس مؤمن کا یہ کہنا کہ دعونی اصلّی (مجھے چھوڑ دو نماز کا وقت جا رہا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبر میں نماز کا جذبہ رہے گا۔

اب یہ کہ پڑھوائی جائے نہ پڑھوائی جائے یہ اللہ جانتا ہے کہ لیکن جذبہ ہے : نیۃ المرء خیر من عملہ اگر انسان نیت کرے تو نیت عمل سے بہتر ہے۔ اس پر وہی اجر مرتب ہوتا ہے جو عمل پر ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ بعض لوگ میدانِ محشر میں حاضر ہوں گے حق تعالیٰ ملائکہ سے فرمائیں گے کہ ان کے نامۂ اعمال میں لکھ دو کہ ساری عمر تہجد پڑھا ___ ملائکہ عرض کریں گے یا اللہ! انہوں نے تو ایک دن بھی نہیں پڑھا۔

حق تعالیٰ ملائکہ سے فرمائیں گے ان میں سے ایک جب رات کو سوتا تھا تو یہ جذبہ لے کر سوتا تھا کہ آج رات کو ضرور اُٹھ کے تہجد پڑھوں گا۔ مگر غریب کی آنکھ نہیں کھلتی تھی۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں' جب اس نے ساری عمر یہ نیت رکھی تو لکھ دو کہ اس نے ساری عمر تہجد پڑھا۔ غرض مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے' وہاں جو یہ کہے گا کہ دعونی اصلّی مجھے چھوڑو' میں نماز پڑھتا ہوں' معلوم ہوتا ہے ہر مؤمن کے اندر یہ جذبہ ہے۔

مگر یہ جذبہ کس مؤمن کے لئے ہوگا؟ جو دنیا میں بھی وقت مکروہ سے بچنے کے لئے چاہتا تھا کہ وقت پہ نماز ادا کرلوں' وہی وہاں بھی کہے گا کہ دعونی اصلّی اور جو یہاں پڑا ہوا دندناتا سوتا تھا' اس کی زبان سے نہیں نکلے گا کہ دعونی اصلّی مجھے چھوڑ دو ___ میں نماز پڑھتا ہوں۔

اور شاید عصر کی نماز اس لئے رکھی کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عصر کی نماز کے وقت کے دو حصے ہیں۔ ایک وقت کامل ہے' ایک وقت مکروہ۔ دھوپ میں جب تک زردی نہ آئے وہ وقت کامل ہے اور جب زردی آجائے وہ وقت مکروہ ہے اور عین جب سورج غروب ہونے لگے وہ وقت مکروہ تحریمی ہے۔

امام صاحبؒ کا مسلک یہ ہے کہ جب عصر کی نماز اس کے اوپر کامل فرض ہوئی تھی تو کامل ہی ادا کرنی چاہئے ناقص واجب ہوگی تو ناقص ادا کرے گا۔ اس واسطے اگر غروب کے وقت بھی ادا کردی تو ادا ہو جائے گی۔ اس لئے کہ جیسی واجب ہوئی تھی ویسی ادا کردی' اس لئے کہ عصر کے دو وقت ہیں' ایک وقت کامل ایک وقت مکروہ ___ قبر میں مؤمن کے واسطے ڈرنے کی وجہ یہ ہوگی کہ کہیں وقت مکروہ نہ آجائے' میں پہلے ہی کیوں نہ ادا کرلوں ___ ؟ صبح کی نماز میں دو قسم کے وقت نہیں ہیں۔ سورج نکلنے سے پہلے پڑھ لے' جتنا وقت ہے سارا کامل ہے' جب سورج نکل آیا' وقت ختم ہو گیا۔ بخلاف عصر کے اس کے دو وقت ہیں۔ تو شاید اس لئے عصر کی نماز کا وقت دکھایا جاتا ہے کہ اس میں ناقص اور کامل دو حصے ہیں۔ تو مؤمن سوچتا ہے کہ کامل نماز ادا کیا کرتا تھا۔ اب یہ وقت ناقص آرہا ہے میری نماز کہیں ناقص نہ ہو جائے۔ اس لئے ملائکہ سے کہے گا

دعونی اصلی۔

بہرحال اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤمن قبر میں ایک جذبہ لے کر جائے گا اور جذبہ یہ ہوگا کہ میں نماز پڑھوں۔ تو انبیاء علیہم السلام عملاً نماز میں مشغول ہیں۔ مؤمن اس جذبے میں مشغول ہے اگرچہ عمل کی اجازت نہ دی جائے یا اس میں سکت نہ ہو ___ تو دعونی اصلی ___ اس کا جذبہ ہی عمل کے قائم مقام ہوگا۔ گویا وہ بھی نماز پڑھ رہا ہے۔

میدانِ حشر میں جذبۂ عبادت

تو عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کا نصب العین وہ ہونا چاہئے کہ انسان اسے اس دنیا میں بھی نصبُ العین بنا سکے اور جب قبر میں پہنچے تب بھی اس کا نصب العین اس کے ساتھ ہو اور وہ عبادت ہے۔ عبادت کا جذبہ جیسے یہاں ہے ویسے وہاں ہوگا۔ میدان حشر میں جب آدمی اٹھے گا اسی حالت پر اٹھے گا جس حالت پر موت آئی ہے اگر نماز پڑھتے ہوئے' ذکر کرتے ہوئے' حج کرتے ہوئے موت آئے' اسی حالت میں قبر سے اللہ یا لبّیک لبیک کہتے ہوئے اٹھے گا اور دل میں تمنّا ہوگی کہ میدان محشر میں نماز پڑھوں۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدّس اللہ سرّہ جو دارالعلوم کے شیخ' مربّی اور اکابر اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ میں نے اپنے بزرگوں سے ان کا مقولہ سنا' فرمایا:

> "قیامت کے دن اگر حق تعالیٰ نے مجھ سے پوچھا کہ اے امداد اللہ! مانگ کیا مانگتا ہے؟ عرض کروں گا' نہ مجھے جنت چاہئے نہ حوریں اور نہ محلّات چاہئیں' مجھے تو اپنے عرش کے نیچے دو گز جگہ دے دیجئے۔ میں وہاں پر نماز پڑھتا رہوں"۔

گویا اس درجہ نماز کی تڑپ کہ اگر وہاں بھی طلب ہوگی تو نماز کی ہوگی۔ تو یہ ایک ایسا عمدہ نصب العین ہے کہ دنیا' قبر اور میدان محشر میں بھی ساتھ ہے۔

جنت میں عبادت

اور جنت میں بھی ساتھ ہوگا۔ جنت کے بارے میں فرمایا گیا **یلھمون التسبیح** جتنے جنتی ہوں گے' ان کی زبان پر اللہ کا ذکر جاری ہوگا۔ یہ ارادۃً نہیں ہوگا' ارادے کی محنت دنیا میں انہوں نے اللہ اللہ کر کے اٹھالی تھی۔ اب اللہ کا ذکر نفس میں رچ گیا ہوگا اس لئے بِلا ارادہ ذکر جاری ہوگا۔ سانس کے ساتھ اللہ نام نکلے گا' جیسے پاس انفاس ہوتا ہے کہ آنے والے سانس کے ساتھ اللہ اور جانے والے کے ساتھ ہو' اللہ ھو اللہ ھو ___ غرض اہل جنت کی زبانوں پر بِلا ارادہ تسبیح و تہلیل اور اللہ کا نام جاری ہوگا۔ یہ اس کا اثر ہوگا کہ دنیا میں انہوں نے محنت کر کے ذکر اللہ کو اپنا نصب العین بنا لیا تھا ___ اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا کہ حافظ قرآن سے کہا جائے گا **رتّل وارتق** تلاوت کرتا جا اور ترقی کرتا جا' جتنی تیری ہمت ہے درجات کماتا جا' معلوم ہوتا ہے جنت میں روزانہ ترقی ہوگی۔ تلاوت کے ذریعے سے روزانہ عروج ہوگا۔ نیا سے نیا مقام' نئی سے نئی حالت' نئی سے نئی کیفیت اور نئی سے نئی نعمت ملتی رہے گی ___ تو عبادت کا نصب العین وہ ہے کہ دنیا سے چلا قبر تک پہنچا پھر حشر تک پھر جنت تک پہنچا اور جنت میں پھر نئے سے نئے جہان' نئے سے نئے مقامات ابدالآباد تک آتے رہیں گے اور عبادت کا یہ نصب العین ساتھ رہے گا۔

ایمان کی وجہ سے ہر چیز پاکیزہ بن جائے گی

اس لئے میں نے عرض کیا کہ اس لمبی زندگی کے لئے نصب العین بھی لمبا ہونا چاہئے معمولی نصب العین جو چند دن کے بعد ختم ہو جائے۔ وہ زندگی کے حسبِ حال اور لائق نہیں ہے۔ یہ زندگی کی توہین ہے' آپ زندگی کا نصب العین روٹی کو بنائیں، یہ اس کی توہین ہے اسلئے کہ روٹی انسانوں کو بھی ملتی ہے جانوروں کو بھی ملتی ہے' یا دولت کمانے کو نصب العین بنائیں تو دولت خود ایک ذریعہ اور واسطہ ہے خود مقصد نہیں ہے' آدمی کی جب جان پر آنے لگتی ہے تو دولت کو خرچ کر دیتا ہے۔ معلوم ہوا دولت خود مقصود نہیں' جان مقصود ہے اور جب ایمان پر آنے لگتی ہے تو جان گنوا دیتا ہے کہ ایمان محفوظ رہنا چاہئے' معلوم ہوتا ہے ایمان مقصود ہے' تو سب سے بڑا نصب العین ایمان ہوا کہ نہ جان کی پرواہ کی نہ مال کی' تو ان چیزوں کو نصب العین بنانا عارضی چیزوں کو نصب العین بنانا ہے۔ اس واسطے لمبی زندگی کا نصب العین وہ ہونا چاہئے جو زندگی کے آخری گوشے تک پہنچ جائے' وہ طاعت و عبادتِ خداوندی ہے' وہ دولتِ ایمان ہے' وہ دولتِ عرفان ہے' وہ اللہ کی معرفت اور پہچان ہے۔

اس کو سامنے رکھ کر آدمی مال کو بھی کھاتا رہے' جان اور آبرو کو بھی کھاتا رہے' اس وقت اس کی جان بھی قیمتی جان بن جائے گی کیونکہ ایمان کے لئے ذریعہ بنی' مال بھی اس کا پاک مال بن جائے گا کیونکہ ایمان کے لئے وسیلہ بنا۔ اس کی اولاد بھی پاک بنا دی جائے گی کیونکہ ایمان اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ذریعہ بنے گی۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ :

نعم المال الصالح للرجل الصالح۔

نیک آدمی کا مال بھی نیک ہوتا ہے' نیک مال نیکی کا ذریعہ بنتا ہے' تو انسان پاک رہے گا تو مال بھی پاک بنے گا۔ اگر انسان نے اپنے قلب اور روح کو معصیتوں سے ناپاک بنا دیا' اس کا مال بھی ناپاک بنے گا۔ اس لئے مال کی مذمت نہ کی جائے' مذمت اپنی کی جائے' غلطی ہماری ہوتی ہے' ڈال دیتے ہیں مال کے اوپر' آدمی پاک بن جائے ساری چیز پاک بن جائیں گی۔ بلڈنگ بھی پاک' مکان بھی پاک' ہر چیز اچھی ہو جائے گی' یہ جبھی ہو گا جب اپنی پوری زندگی کی نقل و حرکت کا اصل نصب العین اطاعتِ خداوندی بنایا جائے اکبر الٰہ آبادی نے ایک قطعہ کہا تھا کہ اس قطعے میں اس زمانے کی ایک حالت ظاہر کی ہے' مگر مقصد رہ گیا تھا تو ایک شعر میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ اس میں مقصد کی تکمیل ہو گئی۔ اکبر الٰہ آبادی کہتا ہے کہ ؂

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے
یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

اب رہی بحث رنج و راحت کی
یہ فقط وقت کا گزرنا ہے

نہ راحت ابدی نہ مصیبت ابدی' اگر مصیبت میں آدمی وقت ٹلا دے مصیبت ختم ہو جاتی ہے۔ نعمت میں وقت ٹلا دے' نعمت ختم ہو گئی' پائیداری اور قرار کسی چیز کو نہیں ہے' نہ یہاں کی عیش کے لئے پائیداری ہے نہ مصیبت کے لئے' عیش والا بھی سب کچھ چھوڑ کر چل دے گا' مصیبت والا بھی چل دے گا۔ اکبر نے کہا کہ ؂

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے
یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

اب رہی بحث رنج و راحت کی
وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

مگر ابھی شعر تشنہ رہ جاتا ہے' وقت تو گزر جائے گا مگر آخر انسان کرے کیا؟ مصیبت و راحت ایک حالت ہی آئی اور گئی کہنا آپ کیا چاہتے ہیں؟ اس کا میں نے جوڑ لگا دیا۔ گویہ جوڑ ایسا ہی ہے جیسے کوئی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگادے اس لئے کہ اکبر تو لسان العصر ہے' بڑے اونچے درجے کا شاعر ہے ہماری کیا شاعری اس کے مقابلے میں بس تک بندی ہے' مگر بہرحال خواہ وہ تک بندی ہی ہو' مگر پیوند تو لگا ہی دیا' چاہے وہ مخمل میں ٹاٹ ہی کا ہو' اس لئے کہ اگر مخمل پھٹی رہ جائے تو بدن کھلا رہ جائے گا۔ تو ٹاٹ سے بدن تو چھپ جائے گا لباس کا مقصد پورا ہو جائے گا' اس واسطے ہم نے بھی پیوند لگا دیا ___ وہ پیوند کیا ہے؟ تو اکبر نے کہا کہ ؎

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے
یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

اب رہی بحث رنج وراحت کی
وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

آگے میں کہتا ہوں کہ ؎

مقصدِ زندگی ہے طاعتِ حق
نہ کہ فکرِ جہاں میں پڑنا ہے

رہ گیا عزوجاہ کا جھگڑا
یہ تخیّل کا پیٹ بھرنا ہے

اور قابلِ ذکر بھی نہیں خورد ونوش
یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے

(از مجالس حکیم الاسلام صفحہ ۳۹)

اصل مقصد یہ ہے کہ طاعت حق ہو' یہ ہوگی تو ہر چیز پائیدار اور کار آمد بن گئی اور اگر اطاعت حق باقی نہ رہی تو مال بھی وبال' جان بھی وبال' صحت بھی وبال' ساری ہیئتیں' حقیقتیں' حرکتیں سب وبال جان بن جائیں گی' اندر ایمان نہیں رہے گا اور اگر ایمان آگیا پھر اس کے لئے ہر چیز نعمت و راحت کا ذریعہ بنے گی۔

زندگی کی قدر کی صورت

اس ساری تقریر کا حاصل یہ نکلا کہ ہمیں اس زندگی کی قدر کرنی چاہئے' یہ اللہ کی ایک نعمت ہے اور قدر کی صورت یہ ہے کہ اس کو کسی نصب العین کے تحت خرچ کیا جائے' بلا موضوع اور بلا مقصد نہ خرچ کیا جائے' اور یہ مقاصد نہیں ہے کہ مجھے عیش مل جائے یا میری زندگی آرام سے گزر جائے یا میرے پاس دولت زیادہ ہو جائے یا میرے پاس کوٹھی ہو یہ کوئی مقصد نہیں ہے' اللہ تعالیٰ دے آدمی بنالے مگر اس کو بھی کسی

مقصد کے تابع کیا گیا ہے' کوٹھی میں نیت کرے کہ میں اس لئے بناتا ہوں کہ دوست احباب جمع ہوں گے خدا کا نام لیں گے' موقع ہوگا تو جماعت ہوگی۔ اب کوٹھی نہ ہوئی عبادت گاہ بن گئی۔ اس کوٹھی میں آپ کو وہ اجر مل گیا جو مسجد میں ملتا۔

حسنِ نیّت

کسی بزرگ کے ایک خادم نے مکان بنوایا' جب مکان مکمل ہو گیا تو اس نے اس میں اپنے شیخ کو دعوت دی کہ آپ تبرکاً مکان کا افتتاح کردیں۔ شیخ آئے تو بڑے خوش ہوئے کہ بڑا عمدہ مکان ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ بھئی! یہ اتنے بڑے بڑے روشندان' دروازے اور کھڑکیاں کیوں رکھیں؟

اس نے کہا حضرت اس لئے رکھیں کہ ہوا آئے' فضا صاف رہے۔ دھوپ بھی آئے' فرمایا جابندۂ خدا! اس میں اس کی نیت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ دھوپ تو ویسے بھی آجاتی۔ نیت نہ کرتا ہوا بھی آتی' ان روشندانوں میں تو نے کوئی ایسی نیت کیوں نہ کرلی کہ تجھے اجر مل جاتا۔ یہ چیزیں تو خود بخود آنی تھیں فرمایا' تو نے یہ نیت کیوں نہ کرلی کہ میں اس لئے لمبے لمبے روشندان رکھ رہا ہوں کہ ان میں مؤذن کی اذان کی آواز جلدی سے آجایا کرے گی' میں دراس لئے رکھ رہا ہوں کہ ذکر اللہ کرنے والوں کی صدا جلدی میرے کانوں تک پہنچ جایا کرے اگر یہ نیت کرتا' اجر بھی ملتا' ثواب بھی ملتا ، اور دھوپ ہوا بلانیت کے بھی آجاتی تو مکان کی خوشنمائی میں آدمی اگر یہ نیت کرلے کہ یہ میں گویا اپنا گھر نہیں بنوا رہا یہ اللہ کا گھر ہے اس میں ذکر بھی ہوگا' نمازیں بھی پڑھی جائیں گی' وعظ بھی ہوں گے' بس یہ مکان باعث اجر بن گیا۔ اس نے وہ کام دیا جو مسجد اور خانقاہ کام دیتی ــــــ تو ذرا سی نیت کے پھیر سے انسان عادت کو عبادت بنالیتا ہے اور ذرا سی نیت کی خرابی سے عبادت بھی عادت بن کے رہ جاتی' سارا اجر ختم ہو جاتا ہے۔ نماز کو اس نیت سے پڑھ لو کہ لوگ ہمیں اچھا سمجھیں' یہ ریاکاری ہوگئی ، نماز ختم ہوگئی۔ یہ منہ پر ماردینے کے قابل ہے اور روٹی کھانے میں اس کی نیت کر لو کہ اس لئے کھا رہا ہوں کہ قوت پیدا ہو تو عبادت کروں گا تو آپ کی روٹی عبادت بن گئی۔ نیت اللہ نے ایسی پاکیزہ چیز بنائی ہے کہ عادت کو چاہو تو عبادت بنالو اور بُری نیت ہو تو عبادت عادت بن کر رہ جاتی ہے' وہ بالکل قابل اجر ہی نہیں باقی رہتی۔

اس واسطے نصب العین اور نیت صحیح ہو تو انسان کی پوری زندگی کارآمد بن جاتی ہے ــــــ یہ چند باتیں میں نے اس لئے گزارش کیں کہ مجمع میں وہ حضرات بھی ہیں جن کو اللہ نے نعمتوں سے نوازا ہے اور حق تعالیٰ نے دولتیں دی ہیں اور یہ شکر کی بات ہے کہ اللہ اپنے بندے کو نعمت عطا کرے' فقط اُسی کے خوش ہونے کی بات نہیں ہے بلکہ اُس کے ہر بھائی کو خوش ہونا چاہئے کہ ہمارے بھائی کو حق تعالیٰ نے نعمت دی اور سرفراز کیا ــــــ اور ایسے لوگ بھی ہیں جن کو یہ دولت تو نہیں ملی مگر علم اور ایمان کامل کی دولت ملی ہوئی ہے تو اس درجے کی دولت ان کے پاس نہیں ہے اور بہت سے بیچارے ایسے بھی ہیں کہ نہ یہ دولت ہے نہ وہ دولت' مگر ساتھ میں حسرت اور صبر کی دولت ہے کہ ہائے ہمیں کچھ نہ ملا۔ اور ہم محروم رہ گئے۔ طاعت و عبادت مالی نہ کرسکے۔ ان کی حسرت اس دولت کے قائم مقام ہے' اس حسرت سے ان کو اجر و ترقی دی جائے گی ــــــ ایسے مختلف لوگ موجود ہیں' اس واسطے نصب العین مشترک ہونا چاہئے جو سب کے لئے کارآمد ہو' وہ اطاعت حق اور عبادتِ خداوندی ہے کہ وہ دولت میں بھی قائم رہ سکتا ہے اور ناداری میں بھی' حسرت میں بھی قائم رہ سکتا ہے' فرحت میں بھی اور ایسی چیز کے لئے زیبا ہے کہ اس کو ہم اس لمبی عمر کا نصب العین اور مقصد بنا سکیں تو اس

مقصد کو پیش نظر رکھا جائے، اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں،

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ۝

عبادت کے معنی

اور عبادت کے معنی حقیقت میں نہ نماز پڑھنے کے ہیں نہ روزہ رکھنے کے ہیں نہ زکوٰۃ دینے کے ہیں، عبادت کے معنی تعمیل حکم کے ہیں کہ جو ہم کہیں اس کی اطاعت کی جائے، اگر ہم کہیں نماز پڑھو تو نماز پڑھنا عبادت ہے۔ اگر ہم کہیں ہرگز نماز مت پڑھو، تو چھوڑنا عبادت بن جاتا ہے۔ اگر ہم کہیں روزہ رکھو تو روزہ رکھنا عبادت ہے، پانچ وقت میں نماز پڑھو تو نماز عبادت اور تین وقتوں میں حکم ہے کہ ہرگز مت پڑھو سورج ڈوبنے اور نکلنے کے وقت اور زوال کے وقت ان اوقات میں آدمی نماز پڑھے گا تو گنہگار ہوگا ___ معلوم ہوا نہ نماز پڑھنا عبادت نہ چھوڑنا عبادت، کہنا ماننا عبادت ہے، رمضان میں روزہ رکھنے کا حکم ہے، عید کا چاند دکھائی دیا، تو عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔ اگر کوئی رکھے گا تو گنہگار ہوگا، معلوم ہوا نہ روزہ عبادت نہ اس کا چھوڑنا عبادت، کہنا ماننا عبادت ہے جب ہم کہیں رکھو، تو رکھنا عبادت، جب ہم کہیں چھوڑ دو، تو چھوڑنا عبادت ہے۔

فرمایا گیا، خود کشی حرام ہے، اپنے آپ کو قتل مت کرو، لیکن اگر نفیر عام ہو اور یوں فرمادیا جائے کہ میدان جہاد میں ذبح ہو جاؤ، گھوڑوں کو بھی ختم کردو، یہ عبادت ہو جائے گی۔ معلوم ہوا نہ جان کی حفاظت عبادت، نہ جان گنوانا عبادت، کہنا ماننا عبادت ہے جب ہم یوں کہیں جان کی حفاظت کرو، حفاظت کرنا عبادت ہے جب ہم یوں کہیں کہ اس جان کی پرواہ مت کرو، جان دیدو، پھر جان دیدینا عبادت ہے۔

غرض عبادت کا حاصل یہ ہے کہ اپنی پوری زندگی کو قانون خداوندی کے تحت میں گزارنا، ہر حالت میں اسی کی رضا کو سامنے رکھنا اور اپنی منشاء کو ختم کرنا، یہ عبادت ہے۔

بہرحال اسلام کسی حالت میں کسی کو مایوس نہیں کرتا جس حالت میں بھی انسان ہو، اسی حال میں رہتے ہوئے خدا تک پہنچنے کے لئے اسے راہ بتلاتا ہے اور انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے۔

یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی راہ درست فرمائے اور اس نصب العین پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، اپنی رضا نصیب فرمائے اور اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر چلنا آسان فرمائے۔

اللّٰھم ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

واخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

پُرسکون زندگی

مشاہیرِ عالم کے نام لکھے گئے خط کا جواب، (از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ)

الحمد للّٰہ وکفٰی وسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی اما بعد!

(کراچی کے ایک صاحب اے. جی یودوجکی نے مشاہیرِ عالم کے نام ایک مطبوعہ خط میں درخواست کی کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں کہ انسان اس ابتر اور پراگندہ دنیا میں پُرسکون زندگی کیسے بسر کر سکتا ہے ___ "حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کے نام بھی خط آیا اور اتفاق سے حضرت موصوف کے سامنے اس وقت آیا جب وہ پچھلے دنوں بمبئی سے کلکتے کا سفر ہوائی جہاز میں کر رہے تھے۔ اس فرصت میں موصوف نے ایک سوال کا جواب ایک خط کی شکل میں کراچی کے ان صاحب کو تحریر فرمایا ___ جسے ہم درج ذیل کرتے ہیں)۔ باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ

محترم المقام! زید مجدکم السامی،

ہدیہ مسنونہ کے بعد عرض ہے کہ آپ کا گرامی نامہ دفتر دارالعلوم دیوبند میں موصول ہوا۔ میں اس دوران سفر میں تھا، سفر طویل ہو گیا اور آپ کا والا نامہ دیوبند ہوتا ہوا مجھے بمبئی میں ملا۔ وہاں بھی مصروفیات کے سبب جواب لکھنے کا موقعہ نہ ملا اور کلکتہ روانگی ہو گئی۔ اس لئے آج کلکتے سے جواب عرض کر رہا ہوں ___ اور اس تاخیرِ جواب کی معافی چاہتا ہوں۔

آپ نے والا نامہ میں سوال فرمایا ہے کہ ___ "اس پریشان اور ابتر دنیا میں انسان کس طرح ایک خوش و خرم اور پُرسکون زندگی بسر کر سکتا ہے ___؟

جواباً عرض ہے کہ سوال اہم اور عموماً آج کے دکھی دلوں کی ایک عمومی پکار ہے اس لئے حقیقۃً توجہ طلب ہے، لیکن یہ سوال جس قدر اہم اور پیچیدہ دکھائی دیتا ہے اسی قدر اپنے جواب کے لحاظ سے واضح اور صاف بھی ہے ___ جواب سامنے لانے کے لئے پہلے پریشانی اور ابتری کے معنی متعین کر لینے چاہئیں تو اس سے بچنے کی صورت اور زندگی کے سکون کی راہ خود ہی متعین ہو جائے گی۔ لوگوں نے عموماً مصیبت پریشانی، دکھ درد، بیماری افلاس، تنگ دستی، جیل قید و بند، مار دھاڑ، قتل و غارت، قحط، وباء، بلا وغیرہ کو سمجھ رکھا ہے، حالانکہ ان میں سے ایک چیز بھی مصیبت نہیں، یہ صرف واقعات اور حوادث ہیں، پریشانی اور مصیبت درحقیقت ان سے دل کا اثر لینا، تشویش میں پڑنا، دل تنگ ہونا اور کرب و غم میں ڈوب جانا ہے۔

پس یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ اسبابِ مصیبت کہلائی جا سکتی ہیں، مصیبت نہیں کہی جا سکتیں، مصیبت قلب کی کیفیت احساس اور تاثر کا نام ہوگا، جیل کی قید و بند کا نام مصیبت نہیں بلکہ اس سے دل میں پراگندگی اور گھٹن کا اثر آنا مصیبت ہے۔ افلاس و تہی دستی خود کوئی پریشانی نہیں، بلکہ دل کا اس سے گھبرانا اور مضطرب ہونا پریشانی ہے، تپ و لرزہ یا ہیضہ و طاعون اور قحط و وباء مصیبت نہیں بلکہ دل کا ان سے کرب و بے چینی کا اثر لینا مصیبت ہے۔ پس مصیبت خود ہمارے دل کی کیفیت ہے ___ دنیا کے واقعات نہیں، اس لئے مصیبت کے خاتمہ کی یہ تدبیر کبھی معقول اور کارگر نہیں ہو سکتی کہ دنیا کے حوادث کو مٹانے کی کوشش کی جائے، جب کہ [illegible] خود مصیبت ہیں اور نہ ہمارے قبضے میں ہیں، بلکہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ان حوادث کے

پیش آنے پر قلبی تشویش و پراگندگی کا راستہ روک دیا جائے اور ان سے بجائے خلاف طبع ضیق و تشویش کا اثر لینے کے انہیں طبیعت کے موافق بنالیا جائے جس سے دل ان سے گھٹنے کے بجائے لذت لینے لگے تو ان میں سے نہ صرف مصیبت ہونے کی شان ہی نکل جائے گی بلکہ یہ امور قلبی راحتوں کا ذریعہ بن جائیں گے اور زندگی میں پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

آج کی دنیا زندگی کو پرسکون بنانے کے لئے ان حوادث زمانہ کو ختم کر دینے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔ لیکن یہ چونکہ ایک ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش ہے جو کبھی شرمندہ وقوع نہیں ہو سکتی اس لئے جتنا جتنا یہ اوندھی تدبیر بڑھتی جائے گی' اتنا ہی دنیا کی زندگی میں ابتری اور بے چینی کا اضافہ ہوتا رہے گا اور کبھی بھی پریشانیوں اور بے چینیوں کا خاتمہ نہ ہوگا' جیسا کہ مشاہدے میں آرہا ہے۔ پس عالم کو بدل ڈالنے کی کوشش کا نام چین نہیں بلکہ خود اپنے کو بدل دینے کا نام سکھ اور چین ہے۔

اس کی سہل صورت ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ نظر کو ان حوادث سے ہٹا کر اس سرچشمہ کی طرف پھیر دیا جائے جہاں سے بن بن کر یہ اسباب' مصائب و آفات عالم پر اتر رہے ہیں اور وہ اللہ رب العزت کی ذات بابرکات ہے جس نے اس عالم کو اپنی لامحدود حکمتوں سے عالم اضداد بنایا ہے اور اس میں راحت و کلفت' نعمت و مصیبت' حظ و کرب اور چین اور بے چینی دونوں کو سمو کر اس عالم کی تعمیر کی ہے۔ اگر اس سے رشتۂ محبت و عبودیت اور رابطہ رضا و تسلیم قائم کر لیا جائے جس کا نام ایمان ہے اور ریاضت و مشق سے اسے اپنا حال اور جوہر نفس بنا لیا جائے کہ اس کے ہر تصرف اور تقدیر پر اطمینان و اعتماد کلی متیسر آجائے تو یہ محبت ہی ہر تلخ کو شیریں اور ہر ناگوار کو خوش گوار بنا دے گی جس سے قلب ان حوادث سے تشویش کا اثر نہیں لے سکے گا جو مصیبت کی روح ہے کہ ع از محبت تلخہا شیریں بود

کیوں کہ عاشق کے لئے محبوب کی طرف سے آئی ہوئی ہر چیز محبوب اور لذیذ ہوتی ہے' وہ محبوب کی بھیجی ہوئی تکلیف کو بھی اپنے حق میں یہ سمجھ کر راحت جانتا ہے کہ محبوب نے مجھے یاد تو کیا' وہ میری طرف متوجہ تو ہے اور مجھے قابل معاملہ سمجھا' یہ تصور ہی اس مصیبت کو اس کے لئے لذت و راحت بنا دے گا اور مصیبت' مصیبت نہ رہے گی ___ خلاصہ یہ نکلا کہ مصیبت نام ہے خلاف طبع کا اور خلاف طبع کو موافق طبع بنانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ عالم کی طبیعت کو بدلنے کے بجائے' (جو بس کی بات نہیں) اپنی طبیعت کو بدل دیا جائے اور اس کا رخ مصیبت سے پھر کر مصیبت بھیجنے والے کی طرف کر دیا جائے کہ نظر مصیبت پر نہ رہے بلکہ خالق مصیبت کی توجہ و عنایت اور بے پایاں حکمت و تربیت پر ہو جائے اور ظاہر ہے کہ یہ یقین بجز خدا کی ذات کو مانے ہوئے اور اس کے ہر ہر تصرف پر کلی اعتماد و اطمینان کئے بغیر میسر نہیں آسکتا' اس لئے مصائب کا خاتمہ خدا کے نام سے بھاگنے میں نہیں ہے بلکہ اس کی طرف لوٹنے میں ہے یعنی آگے بڑھنے میں نہیں بلکہ پیچھے ہٹنے میں ہے۔

اندریں صورت انسان جتنا بھی استیصال حوادث کی مہم میں لگا رہے گا' مصائب سے کبھی نجات نہ پا سکے گا جس کا راز یہ ہے کہ وہ دفعیہ حوادث و آفات کی تدبیر کسی نہ کسی سبب ہی کے ذریعے کرے گا اور یہ سبب بھی جب کہ خود ایک حادثہ ہوگا جس میں منفعت کے ساتھ مضرت کا بھی کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوگا تو یہ دفع مصیبت بھی مصیبت سے خالی نہ ہوگا اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ استیصال مصائب کے بجائے کچھ نہ کچھ اضافہ مصائب ہی ہو جائے گا اور ایک مصیبت اگر کسی حد تک ٹل بھی جائے گی تو دوسری مصیبت اسی آن اس کی جگہ لے لے گی ۔

گر گریزی بر امید راحتے
هم ازاں جا پیشیت آید آفتے

لیکن اگر ان حوادث سے بالاتر ہو کر خالق حوادث سے قلب کا تعلق قائم کرلیا جائے تو ادھر سے علمی طور پر ان آفات و مصائب کی حکمتیں دل پر کھلیں گے جس سے یہ مصائب معقول اور برمحل محسوس ہونے لگیں گے اور ان سے اکتانے کی کوئی وجہ معقول نہ ہوگی کہ قلب عقلاً غمگین ہو اور پھر عشق الٰہی کی سرشاری میں جب کہ ان حوادث کا ورود منشاء محبوب محسوس ہوگا تو اسے توجہ محبوب سمجھ کر یہ عاشق قلب میں عملاً ان آفات سے لذت و سرشاری کا اثر بھی لینے لگے گا اور آخرکار اس روحانی لذت و سرشاری میں محو ہو کر اسے فرصت ہی نہیں ملے گی کہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان آفات و مصائب کی طرف دھیان بھی کر سکے ___ اس لئے اس کے حق میں نعمت تو نعمت ہوئی مصیبت اس سے بھی بڑھ کر نعمت ولذت بن جائے گی اور زندگی سے مصائب اور پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ پس راحت حقیقتہً اسباب راحت میں نہیں بلکہ مسبب الاسباب سے سچے تعلق میں پنہاں ہے ۔

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست
جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

خلاصہ یہ ہے کہ راستے دو ہی ہیں ' ایک مصائب سے دل تنگ ہو کر اسباب کے راستے سے ان کا مقابلہ اور استیصال کی فکر و سعی اور ایک مسبب الاسباب سے عشق کے ذریعہ مصائب کو توجہ محبوب سمجھ کر ان پر دل سے راضی ہو جانا اور شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کرنا ' پہلا راستہ بندگان عقل (فلاسفہ) نے اختیار کیا تو ایک لمحہ کے لئے بھی مصائب سے نجات نہ پا سکے ' نہ خود مطمئن ہوئے نہ کسی کو اطمینان دلا سکے ' بلکہ خود مبتلا ہو کر پوری دنیا کو مبتلائے مصائب و آفات کر دیا جس سے دنیا سے سکھ اور چین رخصت ہو گیا ' اسباب راحت بڑھ گئے اور راحت رخصت ہو گئی۔

دوسرا راستہ بندگان خدا (انبیاء و اولیاء) نے اختیار کیا کہ حوادث عالم سے تنگ دل ہونے کے بجائے انہیں توجہ حق منشاء الٰہی سمجھ کر ذریعہ راحت قلب بنایا تو تشویش و پریشانی ان کے قلب کے آس پاس بھی نہ پھٹک سکی ' خود بھی مطمئن اور منشرح ہوئے اور عالم میں سکون و اطمینان کی لہریں دوڑا دیں اس لئے ان کی اور ان کے متبعین کی زندگیوں سے ہمیشہ کے لئے مصیبتوں کا خاتمہ ہوا اور خوشی و خرمی ان کی زندگیوں کا عنوان بن گئی۔

أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَكَانُوا۟ يَتَّقُونَ ۝ لَهُمُ ٱلْبُشْرَىٰ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا وَفِى ٱلْءَاخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَٰتِ ٱللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ ۝

بلاشبہ اولیاء الٰہی پر نہ خوف ہے نہ غم جو ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے ' ان کے لئے دنیا (زندگی) میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی ' اللہ کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں خوشی و خرمی کا یہی اٹل قانون ہمیشہ رہا ہے اور رہے گا۔

موسیٰ علیہ السلام سے افلاطون حکیم نے سوال کیا تھا کہ اگر آسمان کو کمان فرض کیا جائے اور مصائب و آفات کو اس کمان سے چلنے والے تیر شمار کیا جائے اور خدا کو تیر انداز مانا جائے تو ان مصائب سے بچاؤ کی کیا صورت ہے؟

عقل کا جواب تو مایوسی ہو تا کہ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں کیوں کہ آدمی نہ آسمان کے دائرے سے باہر جا سکتا ہے نہ خدا کے احاطے سے باہر نکل سکتا ہے ' اس لئے لامحالہ اسے مصائب کے تیر کھانے ہی پڑیں گے ' بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ' لیکن انبیاء فلاسفہ نہیں ہوتے کہ محسوسات میں گھری ہوئی محدود عقل کا سہارا پکڑ کر اپنے علم و عمل کے راستے محدود کرلیں ' ان کا تعلق خالق عقل سے ہوتا ہے جو اپنے کمالات و تصرفات میں لامحدود ہے اور تعلق بھی محبت و عشق کا ہوتا ہے جو شش جہت سے بھی اوپر کی بات لاتا ہے ۔

عقل گوید شش جہت راہست بدرے بیش نیست
عشق گوید ہست راہے بارہا من رفتہ ام

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مصائب کے تیروں سے بچاؤ کی بہت آسان صورت ہے اور وہ یہ کہ آدمی تیر انداز کے پہلو میں آ کھڑا ہو' نہ تیر لگے گا نہ اثر کرے گا اور پہلوئے خداوندی ذکر اللہ اور یاد حق ہے جس میں محو ہو کر آدمی اپنے کو کلیۃً خدا کے سپرد کر دیتا ہے اور یہ محبت و تفویض ہی عاشق کا وہ کام ہے جس سے ہر تلخ اس کے لئے شیریں بن جاتا ہے اور اس کی صدا یہ ہو جاتی ہے کہ ؎

ناخوش تو خوش بود برجان من دل فدائے یار دل رنجان من

اور پھر اس کی تفویض اور جان سپاری کا عالم یہ ہو جاتا ہے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو' ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو' ہر چہ کنی رضائے تو

ظاہر ہے کہ اس لذت جان سپاری کے ہوتے ہوئے مصائب و آفات کی مجال ہی کیا رہ جاتی ہے کہ وہ قلب عاشق کو بے چین کر سکیں یا اس میں ذرہ برابر پراگندگی اور تشویش پیدا کر سکیں۔ اس حالت میں قلب عاشق کی ہر تشویش و پراگندگی مبدل بہ سکون و طمانینت ہو جاتی ہے جو لذت و راحت کی جڑ اور بنیاد ہے اور اب اگر اسے بس کوئی تشویش و خلش ہو سکتی ہے تو اندیشہ فراق محبوب کی تو ہو سکتی ہے ورنہ زندگی کا کوئی لمحہ بھی تشویش و پریشانی سے آلودہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ بندۂ عقل کو کبھی قلبی راحت نہیں مل سکتی اور بندۂ خدا کو کبھی قلبی پریشانی نہیں ہو سکتی۔ **اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ**۔
"آگاہ رہو کہ اللہ کی یاد ہی سے دل چین پاتے ہیں"۔

مغروران عقل تجویز کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو ہمیشہ نامراد رہتے ہیں اور خاکساران حق تفویض کی راہ چلتے ہیں تو ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں۔

پس دنیا والوں کی انتہائی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اسباب راحت کو راحت اور اسباب مصیبت کو مصیبت سمجھ رکھا ہے اس لئے دنیا کو اسباب و وسائل سے بھرنے پر تلے ہوئے ہیں حالانکہ یہی راستہ زندگی کی تشویشات اور بے چینیوں کا ہے جس میں ایک لمحہ کے لئے راحت میسر نہیں آ سکتی' وہ اس راہ سے جتنا بھی حصول راحت اور دفعیہ مصائب کی جدوجہد کرتے رہیں گے اتنا ہی راحت سے دور اور قلبی سکون سے بعید تر ہوتے چلے جائیں گے۔

حصول راحت کا راستہ صرف ایک ہی ہے کہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے لوٹ کر خدا سے معاملہ صاف اور رابطہ قوی کیا جائے اور اسی سچے خدا کا سہارا پکڑا جائے جسے چھوڑ کر ہم بہت آگے نکل آئے ہیں' ورنہ زندگی کے پر سکون ہونے کا اور کوئی راستہ نہیں۔ نہ کبھی ہوا اور نہ ہو گا' اس لئے آج کی پریشان حال اور ابتر دنیا اگر فی الحقیقت ایک خوش خرم پر سکون زندگی چاہتی ہے تو اپنا رخ بدلے اور بم چلانے' ایٹم بم بنانے' چاند پر جانے اور سیارات چھوڑنے میں راحت و سکون تلاش کرنے کے بجائے خداوند کریم کی بارگاہ کی طرف توجہ کرے اور اس کے بھیجے ہوئے مستند قانون کو اپنا کر راہ عبودیت اختیار کرے کہ اس بارگاہ سے نہ کبھی کوئی مایوس لوٹا ہے نہ لوٹے گا اور اس سے کٹ کر نہ کبھی کوئی کامیاب ہوا ہے نہ ہو گا ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اساس توحید

شریعت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ عبادت کی بنیاد نفع و ضرر پر ہے ___ مگر وہ نفع وضرر جو مالک کے قبضے میں ہو ___ تو دنیا میں جتنے بھی اسباب ہیں نفع ونقصان ان کے قبضے میں نہیں ہے۔ یہ مالک کے ارادے سے نفع ونقصان پہنچاتا ہے ___ خود ہتھوڑا نفع ونقصان نہیں پہنچاتا' خود ہوا نفع نہیں پہنچاتی' مشیت خداوندی نفع پہنچاتی ہے ___ اصل میں نفع کی باگ ڈور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے ___ جو مسبب الاسباب ہے' اسباب کے ہاتھ میں نفع ونقصان پہنچانا نہیں ہے۔ اس لئے عبادت اس کی' کی جائے گی جس کے قبضے میں نفع ونقصان ہے' نہ اس کی جو نفع ونقصان کا صرف سبب ہے ___ نفع ونقصان کا موجد نہیں ہے' نفع ونقصان کا خالق نہیں ہے محض سبب بنتا ہے۔ تو سبب بن جانے سے موجد یا خالق بننا لازم نہیں ہوتا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ۝ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۝ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (الانبیاء، پ۱۷)
صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝۔

مدارِ حیاتِ انسانی

بزرگانِ محترم!

کائنات میں زمین سے لے کر جس قدر بھی مخلوقات ہیں اور جس قدر اللہ نے اشیاء پیدا فرمائی ہیں، وہ سب انسان کے لئے بنائی ہیں اور انسان کے کار آمد ہیں' کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے انسان کا نفع یا نقصان متعلق

انسانی زندگی کا دارومدار انہی کائناتی اشیاء کے اوپر ہے' اگر زمین نہ ہو تو انسان کس چیز کے اوپر رہے' گزر بسر کرے؟ اگر آسمان اور اس میں ستارے' چاند اور سورج نہ ہو تو روشنی کیسے ہو؟ سورج کی گرمی نہ ہو تو کھیتیاں کیسے پکیں' چاند کی ٹھنڈک نہ ہو تو پھلوں میں رس کیسے پیدا ہو؟ اور ہڈیوں میں گودا کیسے پیدا ہو؟ ستارے نہ ہوں تو راستوں کا تعین کیسے ہو۔؟ جہاز رانی کس طرح سے ہو؟ سمتیں کیسے معلوم ہوں؟ غرض زمین سے لے کر آسمان تک کوئی چیز ایسی نہیں جو انسان کے کار آمد نہ ہو۔

حیوانات ہیں تو وہ انسان کے کام آتے ہیں' کوئی انسان کو سواری دیتا ہے کوئی انسان کے کھانے کے کام میں آتا ہے' کسی جانور کی ہڈیاں انسان کو کام دیتی ہیں' کسی جانور کا چمڑہ کام آتا ہے' چمڑوں کے اوپر کا اون اور پشمینہ انسان کے کام میں آتا ہے غرض کوئی جانور ایسا نہیں جس سے انسان کا نفع متعلق نہ ہو۔

درختوں اور جڑی بوٹیوں میں کوئی درخت اور جڑی بوٹی ایسی نہیں ہے جو انسان کے نفع کے لئے نہ ہو ___ سب سے زیادہ وہ چیز جس کو انسان نفرت سے پھینک دیتا ہے وہ فضلات' گندگی اور نجاست ہے وہ بھی انسان کے کار آمد ہے' اگر کھاد نہ ہو انسان کی کھیتی نہ اگے' تو وہ بھی کام دیتی ہے اور اس کی بھی دنیا میں قدر وقیمت ہے۔ چنانچہ کھاد بھی ہزاروں روپے کے حساب سے بکتا ہے اور انسان کے کام میں آتا ہے ___ تو پاک چیز ہو یا ناپاک چیز ہو انسان کے لئے کار آمد ہے اور انسان کی زندگی ان چیزوں کے اوپر اٹکی ہوئی ہے۔ ان میں سے اگر ایک چیز بھی نہ ہو گی۔ انسان کی زندگی تلخ ہو جائے گی ___ سورج نہ ہو تب زندگی ختم' چاند نہ ہو تب ختم' ہوا نہ ہو تب ختم' زمین نہ ہو تب ختم' اس کی غذائیں نہ ہوں تب ختم' دوائیں نہ ہوں تب ختم' تو کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ انسان کی زندگی اس پر اٹکی ہوئی نہ ہو۔

کائنات کی انسان سے بے تعلقی

لیکن ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں کہ اس کی زندگی انسان پر اٹکی ہوئی ہو' اگر سارے انسان ختم ہو جائیں تو سورج کا کچھ نہیں بگڑتا' چاند کا کچھ نہیں بگڑے گا' ایک بھی انسان باقی نہ رہے تو زمین کا کچھ بھی نقصان نہیں' آسمان کا کوئی نقصان نہیں' پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہیں گے ___ درخت اور جڑی بوٹیاں اپنی جگہ قائم رہیں گی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ انسان کے کام کی نہ ہو' اور انسان ان میں سے کسی کے کام کا نہیں یسوال یہ ہے کہ کیا انسان بیکار پیدا کیا گیا ہے۔ جب یہ نہ زمین کے کام کا' نہ چاند کے کام کا' نہ آسمان کے کام کا' آخر یہ انسان کس کام کے لئے بنایا گیا ہے' ان میں سے تو کسی کے کام کا ہے نہیں۔ کسی کی زندگی انسان پر اٹکی ہوئی نہیں ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ انسان کو بیکار پیدا کیا گیا ہے تو اس سے اللہ کی حکمت پر حرف آتا ہے حالانکہ وہ اس سے بری ہے کہ اس کی حکمت پر کوئی عیب یا حرف آئے۔ جب کھاد جیسی گندی چیز بیکار نہیں پیدا کی گئی تو کیا انسان جیسی اشرف المخلوقات کو اللہ نے بیکار پیدا کیا ہے؟ یہ کس مرض کی دوا ہے' غرض جب کائنات میں کوئی چیز بے کار نہیں تو انسان بھی بیکار تو نہیں ہو سکتا جبکہ یہ سب سے اونچا اور افضل ہے۔

تخلیق کائنات وانسان میں باہمی ارتباط

مگر ان میں سے کسی چیز کے کام کا نہیں' پھر کس کام کا ہے۔ ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جب مخلوق میں سے

کسی کے کام کا نہیں تو پھر خالق کے کام کا ہو گا۔ اور کسی کے کام کا نہیں ہو سکتا۔

اب آگے یہ سوال رہ جاتا ہے کہ خالق کا کونسا کام انسان کے اوپر اٹکا ہوا ہے؟ اس کی مخلوق کا تو کوئی کام اٹکا ہوا نہیں۔ تو خالق جو غنی ہے اور ہر برائی اور محتاجگی سے بری ہے' اس کا کونسا کام اٹکا ہوا ہے۔ اس کے خزانے میں کسی چیز کی کمی ہے۔ جس کو انسان سے مانگا جارہا ہے اور طلب کیا جارہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے خزانے میں ہر چیز ہے' اس کے خزانے بھرپور ہیں مگر ایک چیز اس کے خزانے میں نہیں ہے' اس کو انسان سے مانگا جارہا ہے۔ اللہ کے خزانے میں علم ہے' کمال ہے' عروج ہے' رفعت اور بلندی ہے' غناء اور استغناء ہے' مگر اللہ کے یہاں محتاجگی نہیں ہے' ذلت نہیں ہے' جھکنا نہیں ہے پس ماندگی نہیں ہے' انسان کو اس لئے بنایا گیا کہ یہ اس کے سامنے جھکے' اپنی ذلت اس کے سامنے پیش کرے' اور اپنی محتاجگی نمایاں کرے تاکہ اس کی عزت و عظمت دنیا کے اوپر واضح ہو' اور اس کی رفعت و سربلندی دنیا کے اوپر نمایاں ہو جائے' تو انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ جھکے یعنی عبادت کرے' عبادت کے معنی انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں۔ انسان کو اللہ نے اس لئے بنایا کہ یہ اللہ کے آگے اپنی انتہائی ذلت پیش کرے تاکہ اللہ کی انتہائی عزت سب کے سامنے نمایاں ہو جائے۔ یہ یوں عرض کرے کہ :

"اے اللہ! جیسے تیری عزت کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے' تیرے سامنے میں وہ ذلت پیش کرتا ہوں کہ اس ذلت کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں ہے انتہائی طور پر تیرے آگے پست ہوتا ہوں"۔

انسان میں سب سے زیادہ عزت کی چیز اسکی ناک اور پیشانی ہے۔ اگر کوئی ذلیل بن جاتا ہے تو کہا کرتے ہیں کہ "فلاں کی ناک کٹ گئی" یعنی وہ ذلیل ہو گیا' فلاں کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا' یعنی اسے ذلت پہنچ گئی' تو ناک اور پیشانی سے زیادہ بلند اور باعزت چیز انسان میں اور کوئی نہیں' انہی کو اللہ کے سامنے زمین پر رگڑا جاتا ہے تاکہ انسان کی انتہائی ذلت ظاہر ہو جائے۔

غرض اللہ عزت مطلقہ رکھتا ہے اس کے سامنے جو مخلوق ذلت مطلقہ پیش کرے وہ انسان ہے' اس کے بنانے کی غرض و غایت یہ ہے کہ یہ اللہ کے آگے جھکے اور ساری کائنات اس کے آگے جھکے' ہر چیز اس کے آگے چاکر اور نوکر بن کر پیش ہو' اور یہ اللہ کا نوکر بن کر اس کے سامنے کھڑا ہو۔

ان الدنيا خلقت لكم وانكم خلقتم للأخرة۔ (الحدیث)

"ساری دنیا تمہارے لئے بنائی گئی اور تم آخرت کے لئے بنائے گئے"۔

تم دنیا کے لئے نہیں بنائے گئے' دنیا تو تمہارے لئے بنائی گئی ہے' تم درخت اور پتھروں کے لئے نہیں ہو' درخت اور پتھر تمہاری چاکری کے لئے بنائے گئے ہیں۔ تم چاند اور سورج کے لئے نہیں' چاند اور سورج تمہاری خدمت کے لئے بنائے گئے' تو

خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔

"جو کچھ زمین میں ہے وہ سب انسان کے لئے ہے اور انسان پروردگار کے لئے ہے"۔

کائنات میں انسان کا مرتبہ

اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسا کہ ایک شخص عظیم الشان بلڈنگ تیار کرے' کیوں ____؟ اس لئے کہ اس نے ایک عورت سے نکاح کرنا چاہا جس سے اس کو محبت پیدا ہوئی۔ نکاح کر کے اس نے

عورت کی ضرورت سے ایک بلڈنگ بنائی۔ تاکہ وہ راحت سے اس میں رہے اور گزر بسر کرے۔

بلڈنگ کے اندر اس نے ملازم رکھے' فراش رکھے' جھاڑو اور صفائی کرنے والے رکھے تاکہ مکان صاف ستھرا رہے' اس کی بیوی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے' اس نے باروچی رکھے تاکہ بیوی بھوکی نہ مرے' اس کے لئے کھانا پکائیں' اس نے مشعلچی رکھے تاکہ رات کو مکان میں روشنی کریں' تاکہ اندھیرے میں رات کو اسے تکلیف نہ پہنچے ___ غرض جتنی بھی خدمت کی اشیاء ہیں وہ سب مہیا کیں' اور ہر خدمت کے خادم مہیا کئے ___ یہ سب بیوی کے لئے' اور بیوی کاہے کے لئے ہے ___؟

بیوی ان خادموں کے لئے نہیں ہے۔ فراش اور باروچی کے لئے نہیں ہے' مالک نے بیوی اپنے لئے رکھی ہے تاکہ ساری ضرورتیں اور خدمتیں بیوی کی ہوں اور بیوی میرے کام آئے۔

اگر بیوی خاوند کی خدمت سے انکار کردے یا سرکشی دکھلانے لگے یا خاوند کو آنکھ دکھانے لگے۔ تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بیوی کو طلاق دے گا بلکہ گولی ماردے گا' اس مکان کو بھی ترک کرے گا' اسے بڑھادے گا' خادم بھی ختم کردے گا' اس کی ضرورت سے یہ رکھے تھے' جب یہ میری وفادار نہ ہوئی تو مجھے نہ بلڈنگ کی ضرورت ہے نہ خادموں کی ضرورت ہے' نہ فراش کی ضرورت ہے' اس پر تین طلاق' یہ اس قابل نہیں ہے کہ یہ یہاں رہے بلکہ گولی ماردینے کے قابل ہے۔

خالق کائنات کا انسان سے خصوصی معاملہ

یہی صورت بعینہٖ انسان کی ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنی محبوب ترین مخلوق بنایا' اس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کیا کہ کائنات کی کسی چیز کے ساتھ اسطرح محبت کا برتاؤ نہیں کیا' عزت اسے دی' کھانے پینے کی اشیاء اسے دیں' دریا اور پہاڑ اس کے لئے بنائے' آسمان وزمین کی بلڈنگ تیار کی' اس میں سورج اور چاند کے ھنڈے لٹکائے تاکہ روشنی ہو' اس میں بادل بنائے تاکہ پانی برسے' ہوائیں چلائیں تاکہ مکان صاف ستھرا رہے۔ یہ سب کچھ انسان کے لئے اور انسان مالک کے لئے اگر مالک کے کام نہیں آئے گا تو یہ انسان گولی ماردینے کے قابل ہوگا۔ اور اگر سارے انسان مل کر سرکش بن جائیں تو اس خیمے ہی کو بڑھا دیا جائے گا کہ نہ آسمان کی ضرورت ہے نہ زمین کی' جب یہ ہی گردن زدنی بن گیا تو اب اس کے خدام کی ضرورت باقی نہیں رہی' تو یہ انسان کا نقشہ ہے کہ انسان اللہ کے لئے بنایا گیا ہے' کائنات انسان کے لئے بنائی گئی۔

ان الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للاٰخرۃ۔

اب اگر وہی جس کے لئے بلڈنگ بنائی تھی اور خادم رکھے تھے ___ ایک تو یہ تھا کہ خاوند کی خدمت نہ کرے چھوڑے' تب بھی گردن زدنی تھی ___ اور اگر اس سے بڑھ کر بیوی یہ حرکت کرے کہ کہیں اس نے کسی خادم سے آنکھ ملانی شروع کردی' کہیں اس نے فراش سے آشنائی شروع کردی' کہیں باروچیوں سے اس نے دل لگی کی باتیں شروع کردیں تو اب زندہ رکھنے کی کوئی صورت نہیں رہے گی ___ خاوند اس کو گولی ماردے گا کہ یہ تو بدکار اور فاحشہ ہے' یہ تو اس قابل بھی نہیں ہے کہ اسے زندہ چھوڑا جائے ___ جہاں تک میری خدمت ترک کردی تھی' بری تو بنتی تھی مگر خیر ___ چھوڑ دینے کے قابل تھی' اسے چھوڑا جاسکتا تھا ___ جب مجھے چھوڑ کر اس نے دوسروں سے آشنائی شروع کی ___ اور وہ بھی اپنے باندی غلاموں سے' اب تو یہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ اسے باقی رکھا جائے۔

یہی حال انسان کا ہے ___ کہ اللہ نے یہ بلڈنگ بنائی اس میں خادم رکھے ___ کس طرح سے خادم

رکھے۔؟

کائناتی خدام

فراش رکھے تاکہ مکان صاف ہو۔ یہ ہوا جو ہے یہ اس کائنات کی فراش ہی تو ہے۔ اگر ہوائیں نہ چلیں تو کوڑا کرکٹ نہیں جاسکتا' تو اس بلڈنگ کے صاف کرنے کے لئے اللہ نے ہوائیں پیدا کیں تاکہ فراش کا کام دیں۔ اور مکان کو صاف ستھرا رکھیں۔

یہ سورج کیا ہے۔؟

یہ آپ کا باروچی ہے جو آپ کی کھیتیاں پکاتا ہے' اس کی گرمی سے آپ کے دانے پکتے ہیں اور پھل پکتے ہیں۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ سورج فی الحقیقت ایک باورچی ہے جو اللہ نے انسان کے لئے مقرر کیا ہے۔

یہ بادل کیا ہیں ___ ؟

یہ بہشتی ہیں جو پانی بھر بھر کے لاتے ہیں اور آپ کی کائنات کو سیراب کرتے ہیں ایک وقت مقرر کیا ہوا ہے کہ اس وقت آ کے آپ کے تالابوں کو بھریں۔ آپ کی نہروں کو چلائیں۔ اور آپ کے کنوؤں کو پانی دیں۔ تاکہ سال بھر تک یہ خزانہ پانی سے بھرپور رہے اور انسان کو تکلیف نہ ہو ___ تو کوئی بہشتی ہے کوئی باروچی ہے کوئی فراش ہے جو کام کر رہا ہے ___ اب اگر یہ انسان مالک کو چھوڑ کر کہیں باروچی سے آنکھ ملانا شروع کرے اور سورج کے آگے ڈنڈوز کرنے لگے اور باروچی کے آگے جھکنے لگے' کہیں فراش جو ہوا ہے اس کے سامنے سجدہ کرنے لگے اور ہوا پرستی کرے' کہیں آپ کے لئے پانی برسانے کا بادل سامنے آئے' اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا اور منتیں مانگنے لگے ___ تو یہ ایسا ہی ہے جیسے بیوی بہشتی سے آشنائی کرلے۔ یا فراش سے آشنائی کرلے۔ تو گولی مار دینے کے قابل ہو گی' اس قابل نہیں ہے کہ اسے بلڈنگ میں رکھا جائے۔

مخدوم کائنات کی بے عقلی

بلکہ جب وہ اس درجہ پر ہے تو یہ بلڈنگ بھی منحوس ہے۔ اسے بھی بڑھادو۔ تو انسان کا کام یہ ہے کہ ساری چیزیں اس کے لئے ہوں اور یہ اللہ کے لئے ہو۔ یہ غیر اللہ کے سامنے سجدہ نہ کرے۔ اس سے زیادہ انسان کی کم حوصلگی نہیں ہوگی۔ کہ وہ آگ کے آگے ہاتھ جوڑنے لگے' وہ پانی کے آگے ڈنڈوز کرنے لگے تھے' ان کے سامنے ہاتھ جوڑنا' کھڑا ہونا قلب موضوع ہے کہ جو مخدوم تھا وہ خادم بن گیا' جو خادم تھا اسے مخدوم بنالیا گیا۔ گویا عقل کو اس نے الٹ دیا کہ جس کو اپنے سامنے جھکانا چاہئے تھا۔ اس کے سامنے یہ خود جھک گیا یہ تو وہ ہیں کہ جب اللہ والوں کو ضرورت پیش آتی ہے تو یہ خدمت کرتے ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا تو چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے' اسے پھٹتے بن پڑی۔ حضرت یوشع ابن نون علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے جنگ کے موقع پر سورج روک دیا گیا تاکہ دن دن میں فتح ہو جائے' تو دن کو ٹھہرا دیا گیا تھا' سورج خادم تھا تو اسی روکا گیا ___ لیکن حضرت یوشع علیہ السلام کے کام کو نہیں روکا گیا۔ کہ وہ مقصود تھا اور سورج اس کا وسیلہ تھا۔ وسیلے پر پابندی عائد کی گئی' مقصود پر پابندی عائد نہیں کی گئی ___ غرض بادل ان کے ملنے آتے ہیں سورج ان کی خدمت کے لئے آتا ہے' چاند ان کے سامنے اطاعت کرتا ہے' ذرات کائنات اطاعت کرتے ہیں۔

کائنات کا افادی پہلو اور اس کا مقصد

انسان کو دیکھو سمندروں میں اس کا تصرف ہے' پہاڑوں میں اس کا تصرف ہے' زمین اس کی خدمت میں لگی ہوئی ہے چاہے زمین کو کھودے' چاہے سڑکیں بنائے۔ فرمایا گیا :

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَکُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ۔

''وہ' وہ ہے جس نے زمین کو تمہارے سامنے ذلیل بنا دیا' تاکہ اس میں کھیتی کرو' دانہ ڈالو' سڑکیں بناؤ' کنویں کھودو' ذلیل ہے زمین چوں نہیں کر سکتی انسان کے سامنے اُف نہیں کر سکتی''۔

مگر انسان کس لئے ہے ___ ؟

وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ۔

تاکہ یاد رکھے کہ اسے اپنے مالک کے آگے جانا ہے اور اس کے آگے جوابدہی کرنی ہے ___ تو انسان کا کام یہ ہے کہ حشر و نشر کو سوچے' قیامت کے دن کو سوچے' اور ان چیزوں کا کام یہ ہے کہ انسان کی چاکری میں لگی رہیں جو خدمت یہ لے' اُف نہ کریں' چپ چاپ اس کے کام میں لگی رہیں۔

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا :

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَکُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْکُلُوْنَ۔

یہ چوپائے اور مویشی خَلَقَهَا لَکُمْ تمہارے لئے پیدا کئے ہیں فِیْهَا دِفْءٌ بعضوں سے تم گرمی حاصل کرتے ہو' اونی کپڑے بنا کر ان سے گرمی حاصل کرتے ہو۔ وَمَنَافِعُ اور مختلف منافع ہیں' وَمِنْهَا تَاْکُلُوْنَ اور بعض جانوروں کے گوشت سے تمہارے کھانے پینے کا تعلق ہے۔

وَلَکُمْ فِیْهَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَحِیْنَ تَسْرَحُوْنَ۔

بعضوں سے تم کر و فر اور حشم و خدم حاصل کرتے ہو' جب ہاتھی اور گھوڑوں پر جھولیں ڈال کر جلوس نکالتے ہو اور اپنا کر و فر دکھلاتے ہو اور اپنے حشم و خدم کی نمائش کرتے ہو۔

اور فرمایا :

وَتَحْمِلُ اَثْقَالَکُمْ اِلٰی بَلَدٍ لَّمْ تَکُوْنُوْا بٰلِغِیْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ۔

بعضے جانور وہ ہیں کہ ان پر مال کو لاد کر ایک بستی سے دوسری بستی تک لے جاتے ہو۔ غرض مختلف منافع فرمائے گئے۔

وَیَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔

یہ چیز وہ ہیں کہ آج سورایاں بن گئی ہیں۔ فرماتے ہیں ___ اور تمہیں کیا خبر ہے کہ آئندہ ہم نئی نئی قسم کی سواریاں پیدا کر دیں جن پر چڑھ کر انسان منزلیں طے کریں۔ چنانچہ موٹر سائکلیں' ہوائی جہاز اور دخانی جہاز ___ غرض مختلف قسم کی سواریاں انسان کے لئے نکلیں تاکہ وہ احترام کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو۔ چوپائے اور جانور کو یہ عزت نہیں بخشی گئی' چوپایا جہاں بھی جائیگا اپنے پیروں سے چل کر جائے گا اور انسان سوار ہو کر جائے گا' کبھی چوپائے کے سر پر' کبھی جمادات کے سر پر اور کبھی نباتات کے سر پر۔ ہر چیز انسان کے لئے سواری بنا دی گئی۔ بہرحال حاصل یہ نکلا کہ انسان اللہ کے لئے ہے اور کائنات انسان کے لئے ہے۔

معیار عبادت

یہ اللہ کے لئے کیوں ہے۔؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت نفع اور نقصان کے معیار پر کی جاتی ہے جس کے قبضے میں انسان کا نفع اور نقصان ہے۔ اس کے سامنے جھکا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ' کے ہاتھ میں انسان کے نفع اور نقصان کی باگ ڈور ہے نفع دے جب بھی اس کے قبضے میں ہے' نقصان پہنچائے جب بھی اس کے قبضے میں ہے۔ خواہ نعمتیں دیدے' خواہ مصیبت ڈالدے' نعمت دیکر چھین لے' یا چھینی ہوئی نعمت پھر واپس کردے ہر صورت میں اس کی دست قدرت میں ہے۔

معطی حیات

مادی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت انسان کے لئے زندگی ہے' اس پر انسان کا کوئی بس نہیں ہے صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب چاہے زندگی دیدے اور جب چاہے زندگی چھین لے۔ جب تک زندگی نہیں آتی' ایک انسان چاہتا ہے کہ میرے اولاد ہو جائے ___ لیکن زندگی ہاتھ میں نہیں ہے تو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے کہ جب چاہے پیدا کرے۔ وہ دینا چاہے تو دیدے' نہ دینا چاہے تو انسان کو تمنائیں کرتے کرتے اور اسباب مہیا کرتے کرتے برس گزر جاتے ہیں مگر اولاد نہیں ہوتی' اس لئے کہ زندگی ہاتھ میں نہیں ہے' غرض زندگی کی نعمت اسی کے ید قدرت میں ہے ___ جب چھننے پر آتی ہے اور موت کا وقت آتا ہے تو آدمی ساری دنیا کے خزانے علاج پر صرف کردے لیکن ایک منٹ کے لئے بھی آدمی زندگی کو روک نہیں سکتا۔ جو اس کے جانے کا وقت ہے اس پر جاکر رہتی ہے غرض نہ زندگی کو لانا قبضے میں ہے' نہ روکنا قبضے میں اور نہ واپس لے آنا قبضے میں ہے۔ جس کے قبضہ قدرت میں ہے وہ سب سے بڑا نافع ہے۔ جس کے قبضے میں نفع کی باگ ڈور ہے۔

معطی صحت

آپ زندہ موجود ہیں ___ زندگی کے بعد سب سے بڑی نعمت تندرستی ہے۔ تندرستی آپ کے بس کی چیز نہیں ہے' جب تک مالک تندرست رکھنا چاہے آدمی تندرست رہتا ہے۔ چھیننا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا۔ لوگ اسباب مہیا کرتے ہیں اور صحت کا تحفظ کرتے ہیں لیکن قابو نہیں ہے کہ اس کو حاصل کرلیں' آج شہر کے اندر انفلوئنزا پھیلا ہوا ہے۔ گورنمنٹ بھی سعی کررہی ہے۔ میونسپلٹیاں بھی سعی کررہی ہیں۔ شخصی طور پر ڈاکٹر بھی مطب کھولے ہوئے ہیں۔ پبلک بھی ایک دوسرے کی خدمت پر کھڑی ہوئی ہے۔ اور یہ چاہتے ہیں کہ منٹ بھر میں مادہ رفع ہو جائے ___ لیکن قبضے میں نہیں ہے۔ جب مالک کا حکم ہوگا جب ہی یہ بیماری واپس جائے گی۔ خواہ کتناہی جتن کیا جائے اپنے وقت تک رہے گی۔

مبالغہ فی الاسباب کی ممانعت

جیسے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ' فرماتے ہیں کہ جب کوئی مصیبت آتی ہے وہ اپنی ایک عمر ساتھ لے کر آتی ہے' جب اس کا وقت ختم ہوگا' جبھی ٹلے گی۔ بندے کا کام یہ ہے کہ اسباب کے درجے میں کچھ نہ کچھ

اجمالی طور پر تحفظ کی فکر کی جائے۔ اسباب میں زیادہ مبالغہ نہ کرے ورنہ الجھ کر مصیبت کی عمر بڑھ جاتی ہے۔ فی الجملہ یہ سمجھ کر تحفظ کا سامان کرتا رہے کہ میں بندہ ہوں اور اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اسباب اختیار کروں تو **واجملوا فی الطلب وتوکلوا علیہ**

اجمال کے ساتھ اسباب کو طلب کرتے رہو' اللہ کے اوپر بھروسہ رکھو' اسباب پر بھروسہ مت کرو۔ اجمالی طور پر آدمی کچھ تحفظ کا سامان کرتا ہے' دوا پی لی۔ طبیب کو دکھلا دیا' لیکن طبیب کے اوپر توکل کر بیٹھے' یا دواؤں پر توکل کر بیٹھے یا ہمہ تن دل کو ڈالدے کہ یہی چیز شفاء دینے والی ہے۔ یہ غلط ہے' دواؤں میں شفاء نہیں ہے اور طبیب کے قبضے میں شفا نہیں ہے یہ تو وسائل اور اسباب ہیں۔ وسائل کے اندر تاثیر رکھنا مسبب الاسباب کے ہاتھ میں ہے۔

تاثیرات اسباب کی حقیقت

یہ آگ پانی' ہوا اور مٹی بھی اسباب ہیں ___ آگ کی تاثیر یہ ہے کہ وہ جلائے' لیکن یہ اس کی ذاتی تاثیر نہیں ہے۔ اللہ نے اس میں یہ تاثیر رکھ دی ہے۔ وہ یہ تاثیر دکھلاتی رہتی ہے لیکن قبضے میں مالک کے ہے ___ اگر وہ آگ کی تاثیر کھینچ لے تو آگ جلانے کا ارادہ بھی کرے تو اس کے قبضے میں جلانا نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالدیا گیا' جلانے کی تاثیر سلب کر لی گئی' آگ جھک مار کر بیٹھ گئی' آگ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی' غرض آگ نہیں جلاتی مشیت خداوندی جلاتی ہے۔ جب مشیت تقاضا کرتی ہے آگ جلانا شروع کر دیتی ہے۔

یہ پانی اصل میں ٹھنڈک بخشنے والا نہیں ہے' مشیت الٰہی ٹھنڈک بخشتی ہے۔ اگر پانی میں سے تبرید کا مادہ نکال لیں اور وہ خود بھی ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے تو قابو نہیں پا سکتا' جب تک مالک اس کی تاثیر کو نمایاں نہ کردے ہر چیز کے افعال اور خاصیتیں یہ مخلوق خداوندی ہیں۔ جب وہ چاہتے ہیں' نمایاں ہوتی ہیں جب وہ نہیں چاہتے نمایاں نہیں ہوتیں' اس لئے اصل موثر کو چھوڑ کر آدمی ان چیزوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ یہی مجھے شفا بخشنے والی ہیں۔ یہ غلط چیز ہے۔

موہم شرک عنوان سے احتراز کی تاکید

اسی واسطے شریعت نے بہت سے عنوانات کی اصلاح کی ہے ___ مثلاً یہ عنوان کہ انسانوں کو چاہئے کہ اولاد پیدا کیا کریں ___ شرعی اعتبار سے یہ عنوان غلط ہے' شرعی طور پر اس عنوان کو بے ادبی کہا گیا ہے ___ پیدا کرنا خالق کا کام ہے' ماں باپ کا کام نہیں ہے کہ اولاد پیدا کریں۔ ماں باپ کا کام یہ ہے کہ وہ اسباب کے درجے میں باہم مل جائیں اور اللہ سے دعاء کریں کہ اولاد پیدا کر دی جائے ___ اگر حق تعالیٰ شانہ' پیدا نہ کرنا چاہیں تو ہزار دفعہ خاوند بیوی ملا کریں' کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ مانگنا بھی اسی سے ہے۔ بھروسہ بھی اسی پر ہے' ملنا بھی اسی سے ہے ___ جب اسباب اور وسائل میں وہ اثر ڈالتے ہیں تو اثر آجاتا ہے۔ اور اگر آدمی مطلقاً اسباب کی طرف رجوع کرے تو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

معرفت توحید و تصرف

حضرات انبیاء علیہم السلام فی الحقیقت حق تعالیٰ شانہ' کی توحید اور تصرف کو پوری طرح سمجھتے ہیں' وہ

مانگتے بھی ہیں تو اللہ ہی سے مانگتے ہیں۔ فریاد بھی کرتے ہیں تو اللہ ہی سے کرتے ہیں، کسی مصیبت کی شکایت بھی کرتے ہیں تو اللہ ہی سے کرتے ہیں۔ ہر چیز میں اللہ ہی سے رجوع کرتے ہیں۔

بارگاہ حق میں سوال کا طریق کار

حضرت زکریا علیہ السلام کا واقعہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔ انہیں بیٹا مانگنے کی ضرورت پیش آئی تاکہ ان کی نبوت کا مشن آگے چلے اور بڑھے۔ تو بیٹا مانگا۔

اس مانگنے کو حق تعالیٰ نے نقل فرمایا کہ مانگنا بھی ہر کسی کا کام نہیں ہے۔ مانگنے کا ڈھنگ بھی حقیقتاً انبیاء علیہم السلام ہی کو آتا ہے۔ ان کے بتلانے ہی سے دوسروں کو آتا ہے ___ غرض زکریا علیہ السلام نے بیٹا مانگا۔؟ اس دعاء کو حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں نقل کیا ہے اور واقعی اس طرح سے مانگنے کا انہی کا حق تھا دوسرے کو اس طرح سے سوجھ بھی نہیں سکتی۔

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا۔

فرماتے ہیں اس وقت کو یاد کرو جبکہ حضرت زکریا علیہ السلام نے چپکے چپکے اپنے دل میں اللہ سے مانگنا شروع کیا اور چھپی ہوئی آواز سے اولاد کی طلب کی۔ جس کو وہ سنتے تھے اور ان کا اللہ سنتا تھا کسی دوسرے کو اس کی خبر نہیں تھی، اس طرح سے مانگنا شروع کیا۔

معلوم ہوا کہ مانگنے کا پہلا ادب تو یہ ہے کہ آدمی زیادہ چلا کر نہ مانگے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً۔

"اللہ کے سامنے دعائیں کرو چپکے چپکے اور آہستہ آہستہ"۔

غرض آہستہ آہستہ مانگنا شروع کیا۔

کس طرح سے مانگا ___ ؟ عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّىْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّىْ۔

"اے اللہ! میری ہڈیاں خشک ہو گئیں"۔

بڑھاپے کی انتہا یہ ہے کہ ہڈیاں بھی خشک ہو گئیں، ان میں گودا تک باقی نہیں رہا ___ ظاہریات ہے کہ جب گودا تک باقی نہیں رہے گا، تری اور روغن باقی نہیں رہے گا، ہڈیاں خشک ہو گئیں تو گوشت کہاں باقی رہے گا؟ حاصل یہ نکلا کہ ہڈی سے چمڑا الگ ہو چکا ہے کوئی طاقت میرے اندر باقی نہیں ہے ___ اور عرض کیا۔

وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا۔

"اور سر سفید ہو گیا ہے جیسے آگ جلا کرتی ہے"۔

تو اندر بھی بڑھاپا سرایت کر گیا کہ ہڈیوں میں روغن تک باقی نہیں۔ اور اوپر بھی بڑھاپا چھا گیا کہ بالوں میں سیاہی تک باقی نہیں ہے۔ غرض اوپر سے سفید ہو گیا ہوں اور اندر سے خشک ہو گیا ہوں ___ یہ میری حالت ہے۔

یعنی بیٹا مانگنا چاہتے ہیں اور حالت وہ پیش کر رہے ہیں کہ جس میں اسباب کے درجے میں بیٹا ہونا ناممکن ہے ___ جب بڑھاپے کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ اندر روغن تک باقی نہ رہے، ہڈیاں تک خشک ہو جائیں اور بڑھاپا چھا جائے تو اولاد کہاں سے ہوگی۔؟

مگر یہ مانگنے کا طریقہ ہے کہ وہ اسباب جن کے ذریعے سے اولاد ہوتی' وہ موجود نہیں' تو خود ہی ظاہر کررہے ہیں کہ یہ بھی سبب میرے اندر موجود نہیں' یہ بھی سبب میرے اندر موجود نہیں' تاکہ جواب یوں نہ آجائے ___ کہ اگر یوں مانگتے کہ یا اللہ! مجھے بیٹا دیدیجئے ___ تو یہ ہو سکتا تھا۔ کہ جواب یوں آجائے کہ نہیں تم بوڑھے ہوگئے ہو' عادت اللہ کے خلاف ہے۔ ایسے میں بیٹا نہیں دیا جاتا۔ لہٰذا خاموش ہو جاؤ۔ تو پہلے ہی ان چیزوں کو پیش کرکے دفع دخل مقدر کردیا' جو جواب آگے ممکن تھا میں وہ جواب خود ہی نہ دے دوں۔ تاکہ آئندہ کا مقصد بھی پورا ہو جائے۔ تو کہا کہ :

اے اللہ! میری ہڈیاں تو خشک ہوگئیں اور سر کے بال سفید ہوگئے' بڑھاپا چھا گیا۔

اور بیچ میں ایک لفظ یہ بھی کہہ دیا۔

وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا۔

اے اللہ! میں کبھی بھی آپ کے سامنے سے نامراد واپس نہیں گیا' جب گیا ہوں کچھ نہ کچھ لے کے گیا ہوں یہ کبھی نہیں ہوا کہ مایوس گیا ہوں ___ یہ بھی بیچ میں کہدیا ___ حاصل یہ کہ اسباب کے درجے میں کچھ موجود نہیں اور آپ کے پاس سے کبھی مایوس گیا نہیں ہوں۔ اس لئے مجھے یقین رکھنا چاہئے کہ منہ مانگی مراد ملے گی۔

جیسے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ دعاء اس طرح سے مانگو۔

اَلِحُّوا۔

الحاح کرو' اتنی زاری کرو کہ لیچڑ بن کے مانگو' کہ بے لئے ہم نہیں ٹلیں گے کلام بھی ایسا ہی عاجزانہ ہو' جھکنا بھی ایسا ہی ہو اور بیٹھنا بھی ایسا ہی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ کریم کے دروازے پر آئیں اور خالی ہاتھ واپس جائیں۔ ہم لے کے ہٹیں گے ___ اور آگے عرض کیا۔

وَاِنِّىْ خِفْتُ الْمَوَالِىَ مِنْ وَّرَآئِىْ۔

"مجھے اپنے بعد اپنے رشتہ داروں سے ڈر بھی ہے۔ اور کوئی توقع نہیں کہ وہ میرے مشن کو آگے بڑھائیں گے' بلکہ میرے مقصد کو ضائع کردیں گے"۔

اس کے بعد عرض کرتے ہیں :

وَكَانَتِ امْرَاَتِىْ عَاقِرًا۔

یا اللہ میاں! میں ہی بوڑھا نہیں میری بیوی بانجھ بھی ہے اور اس کے اولاد ہونے کی کوئی صورت نہیں ___ یہ بھی ساتھ میں عرض کردوں ___ تو میں بوڑھا ہوں' مجھ میں اولاد کی صلاحیت نہیں' بیوی بانجھ ہے اس میں اولاد ہونے کی قابلیت نہیں' رشتہ داروں سے کوئی توقع نہیں کہ وہ میرے مشن کو آگے بڑھائیں گے ___ تو ہوا کیا؟

فَهَبْ لِىْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا۔

پس اللہ میاں! ایک بیٹا مجھے عطاء کردیجئے جو میرے ان کمالات کا وارث بنے اور ان کو آگے بڑھائے ___ تو حقیقت میں مانگنے کا ڈھنگ بھی انبیاء علیہم السلام ہی کو آتا ہے۔ وہی جانتے ہیں کہ بارگاہ حق میں کس طرح سوال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء کے آداب ارشاد فرمائے ہیں کہ دعائیں مانگو مگر اس کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔

چنانچہ کسی شخص نے عرض کیا :

"یارسول اللہ! لوگ دعائیں مانگتے ہیں، قبول نہیں ہوتیں ہاتھ پھیلا پھیلا کر مانگتے ہیں مگر قبول نہیں ہوتیں اور قبولیت کا اثر ظاہر نہیں ہوتا ___ "۔

فرمایا ___

مطعمه حرام وملبسه حرام یقول یارب یارب انّی یستجاب له۔

کھانا دیکھو تو حرام کا، لباس دیکھو تو حرام کا، کمائی دیکھو تو وہ مشتبہ اور آدمی کہہ رہا ہے۔ یارب یارب۔ انّی یستجاب له دعا کہاں سے قبول ہو جائے گی؟ یہ تو دل لگی اور مذاق کرنا ہے۔ پاک بن کر اللہ کے آگے آئے تب دعا سنی جائے گی، ناپاک بن کر آئے تو دعا کیوں سنی جائے گی؟

بادشاہ کے دربار میں جب جاتے ہیں تو پاکیزہ کپڑے پہن کر جاتے ہیں۔ عطر لگا کر جاتے ہیں، معطر ہو کر جاتے ہیں۔ آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ دربار میں سیٹ دی جاتی ہے، اگر دربار میں عرض معروض کریں تو اس کی شنوائی ہوتی ہے ___ اور اگر کوئی میلے کپڑے پہن کر اور اوپر سے نجاست مل کر چلا گیا تو دربان دھکے دے کر نکال دیں گے کہ یہ پاس کھڑے ہونے کے قابل نہیں چہ جائیکہ اسے دربار میں سیٹ دی جائے۔ اور چہ جائیکہ اس کی بات مانی جائے ___ تو اسے نکال دیں گے کہ یہ آداب دربار کے خلاف ہے ___ تو حرام کی غذا کھا کے اور حرام کا لباس پہن کر جانا اور پھر یا اللہ، یا اللہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی نجاست لیپ کر دربار میں جائے اور بادشاہ کے سامنے عرض معروض کرے، تو شنوائی ہوگی یا دھکے دے جائیں گے؟ تو قبولیت ہوگی یا نامقبولیت ہوگی۔

کسب حلال کے آثار

غرض بتلایا گیا کہ دعاء کے آداب میں سے یہ ہے کہ آدمی پاک بن کر جائے پہلے اپنے ضمیر کو پاک کرے کہ میں آج سے حرام کی غذا سے تائب ہوتا ہوں اور مشتبہ کمائی سے تائب ہوتا ہوں کہ اگر کمائی مشتبہ ہوگی تو اس سے قلب کے اندر ظلمت پیدا ہوگی اور سے توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ حلال کی کمائی کا اثر قلب میں نورانیت پیدا ہونا اور توفیق کا پیدا ہونا ہے۔ حرام کی کمائی کا اثر سلب توفیق ہے۔ قلوب کے اندر سے توفیق نکل جاتی ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہمارے دیوبند میں ایک بزرگ "شاہ جی عبد اللہ" تھے۔ اور عوام میں شمار ہوتے تھے لیکن صاحب نسبت بزرگ اور درویش تھے، انہوں نے کمائی کا طریقہ یہ رکھا تھا کہ گھاس کھود کے لاتے تھے اور گھاس کی گٹھڑی بیچ کر اپنا گزر اوقات کرتے تھے، صاحب نسبت تھے، اوقات کے پابند تھے، ان کے ہاں گٹھڑی کی قیمت چھ پیسے مقرر تھی، تو دیوبند میں جتنے گھاس خریدنے والے لوگ تھے وہ قطار باندھ کر کھڑے رہتے تھے کہ شاہ جی کی گٹھڑی ہم خریدیں گے، ہر ایک آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا کہ اگر میں نے خرید لی تو میرے مویشی میں بھی برکت ہوگی، میرے گھر میں بھی برکت ہوگی۔

اس لئے جہاں شاہ جیؒ سامنے سے آئے۔ لوگ دوڑتے تھے، جس نے ہاتھ پہلے لگا دیا انہوں نے گٹھڑی وہیں ڈال دی اور چھ پیسے لے لئے۔ سردی ہو گرمی ہو، برسات ہو۔ نہ سات پیسے نہ پانچ پیسے۔ چھ پیسے متعین تھے۔

جب چھ پیسے لے لیتے تو ان کے خرچ کا ان کے ہاں کیا طریقہ تھا؟

دو پیسے تو اسی وقت فقیروں میں صدقہ کر دیتے تھے ___ اس زمانے میں کوڑیاں ہوتی تھیں۔ گنڈے ہوتے تھے۔ پانچ گنڈے ایک ایک پیسہ ہوتا تھا۔ تو دو پیسے کے گنڈے لے کر کسی یتیم کو، کسی غریب کو، کسی بیوہ کو تقسیم کر دیتے تھے۔

اور دو پیسے روز ان کے گھر کا خرچ تھا۔ اس میں کچھ نمک لے لیا اور کچھ تیل لے لیا کچھ ترکاری لے لی۔ سستے کا زمانہ تھا جو آج دو روپے میں کام چلتا ہے۔ وہ دو پیسے میں چل جاتا تھا' تو دو پیسے ان کے گھر کا خرچ تھا۔

اور دو پیسے روز جمع کیا کرتے تھے۔ سال بھر میں جب دو پیسے روز کے جمع کرتے کرتے سات آٹھ روپے ہو جاتے تو ان کا کھانا پکا کر ہمارے ان سب بزرگوں کی دعوت کیا کرتے تھے۔ جنہوں نے دار العلوم دیوبند قائم کیا۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دار العلوم دیوبند' مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ' حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ۔ ان تمام بزرگوں کو جمع کر کے دعوت کر دی۔ تو میں نے اپنے بزرگوں میں سے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ سنا جو دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں اور بڑے صاحب نسبت ولی کامل گزرے ہیں کہ :

> "سال بھر تک ہمیں انتظار رہتا تھا کہ کب وہ دن آئے کہ شاہ جیؒ کے گھر کا کھانا کھائیں"۔

اور فرمایا کہ :

> "جس دن کھانا کھاتے تھے تو چالیس چالیس دن تک قلب میں نور رہتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ نماز پڑھیں' جی چاہتا تھا کہ تلاوت کریں۔ دل میں طاعت و عبادت اور زہد و ریاضت کی امنگ پیدا ہوتی تھی"۔

یہ اس حلال کی کمائی کا اثر تھا ___ تو جتنی پاک کمائی ہوتی ہے قلب میں توفیق پیدا ہوتی ہے۔

حرام کی نحوست

جتنی ناپاک یا مشتبہ کمائی ہوتی ہے توفیق سلب ہوتی ہے۔ آدمی جانتا ہے کہ یہ کام نیکی کا ہے۔ مگر کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس کے کرنے کی امنگ نہیں ہوتی جیسے غالب نے کہا ہے کہ : ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام اچھا ہے' یہ برا ہے۔ اور اچھے کو کرنا چاہئے مگر کرنے کو جی نہیں چاہتا تو دل میں جب ناپاکی گھس جاتی ہے تو وہ اچھے کام کے لئے ابھرتا نہیں ___ آج جو ہم اور آپ معصیت میں مبتلا ہیں وہ لاعلمی کی وجہ سے نہیں' علم تو بڑا وسیع ہو چکا ہے حلال و حرام کا امتیاز' اچھے اور برے کی تمیز اتنی ہو چکی' ہر شخص شریعت میں رائے زنی کرنے کے لئے تیار ہے۔ جہاں کوئی تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہے' بس اس نے قرآن و حدیث میں رائے زنی شروع کر دی گویا مجتہد بن گیا ___ تو علم کی کمی کی وجہ سے گناہ میں مبتلا نہیں ہے۔ علم موجود ہے۔ پھر بھی مبتلا ہیں۔ توفیق کے سلب ہونے کی وجہ سے ہیں۔ اور توفیق اس لئے سلب ہو گئی کہ ہماری کمائی مشتبہ ہے' حلال کی غذا اندر نہیں پہنچتی۔ معدہ حوض بدن ہے جو اس میں بھر دیں گے' رگ و پے میں وہ

چیز پھیلے گی۔ پاک کمائی بھریں گے پاکی کے اثرات رگ و پے میں بھریں گے۔ ناپاک چیزیں بھریں گے ناپاکی کے اثرات پھیل جائیں گے تو حلال کی کمائی کا ایک اثر ہوتا ہے۔

لقمۂ حلال کی علمی و عملی برکات

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ ہے۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ امام شافعیؒ بھی جلیل القدر امام ہیں ___ چار ہی بڑے امام ہیں جن کی فقہ آج کل رائج ہے۔ امام ابو حنیفہ امام مالک امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ اور بھی صاحب فقہ آئمہ گزرے ہیں لیکن ان کی فقہ ختم ہو گئی۔ من جانب اللہ ان چار فقہوں کو مقبولیت حاصل ہوئی اور کروڑہا کروڑ انسان ان کی فقہوں پر چل رہے ہیں۔ ہندوستان پاکستان افغانستان اور ترکستان یہ سب حنفی المذہب ہیں اور سب میں فقہ حنفی رائج ہے۔ مصر قریب قریب کل کا کل شافعی فقہ پر چل رہا ہے۔ حجاز بھی قریب قریب شافعی فقہ کا پابند ہے۔ نجد وغیرہ کے ممالک یہ فقہ حنبلی کے پابند ہیں۔ مغربی ممالک جیسے الجزائر وغیرہ میں مالکی زیادہ ہیں تو دنیا کے اکثر حصوں میں یہی چار فقہ رائج ہیں۔ انہی چار اماموں کے مسلک پر لوگ عمل کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک امام احمد بن حنبلؒ ہیں جلیل القدر امام ہیں مگر امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں ___ امام شافعیؒ کا قیام مصر میں تھا۔ امام شافعیؒ نے انہیں لکھا کہ بہت عرصہ ہو گیا ملاقات کئے ہوئے۔ اگر کوئی ملاقات کا موقع ہو تو کوشش کر کے آجاؤ مصر میں ملاقات ہو اور علماء آپ کے منتظر ہیں۔

امام احمدؒ نے لکھا کہ میں حاضر ہو رہا ہوں اور تاریخ معین کر دی کہ فلاں تاریخ کو پہنچوں گا۔

مقررہ تاریخ پر امام احمدؒ پہنچے ___ تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ استقبال کے لئے شہر سے باہر نکلے بادشاہ وقت چونکہ امام شافعیؒ کا معتقد تھا وہ بھی ساتھ ہوئے۔ جب بادشاہ آئے تو وزراء امراء علماء اور زعماء غرض پورا مصر استقبال کے لئے نکل آیا ___ اور بڑے عزت و احترام سے امام احمدؒ کو لے کر آئے۔

امام شافعیؒ کے مکان میں عید کی سی خوشی تھی۔ امام شافعیؒ کی بچیاں کودتی پھرتی تھیں کہ امام وقت ہمارے ہاں مہمان ہو رہا ہے۔ ایک عجیب خوشی تھی۔

غرض ان خوشیوں کے ساتھ امام احمد بن حنبلؒ تشریف لائے۔

علماء و زعماء اور سب اکابر ملت ملنے کے لئے آئے۔

کھانے کا وقت آیا تو امام شافعیؒ نے دستر خوان بچھایا ___ امام احمدؒ کو بٹھلایا گیا۔ اور بھی لوگ بیٹھے ___ امام احمد حنبلؒ نے جو کھانا شروع کیا۔ تو اس طرح سے کھایا جیسے کوئی بہت حریص آدمی کھایا کرتا ہے۔ اور جیسے کوئی سات وقت کا بھوکا کھاتا ہے۔ تو بہت زیادہ کھایا اور جلدی جلدی کھایا۔ جیسے معلوم ہو کہ کھانے کو سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔

امام شافعیؒ جب کھانے کے بعد گھر پہنچے تو امام شافعیؒ کی بچیوں نے امام شافعیؒ پر اعتراض کیا کہ آپ تو کہتے تھے کہ یہ امام وقت ہے۔ یہ کیسا امام وقت ہے جو عوام الناس کی طرح پیٹ بھر کے کھانا کھاتا ہے۔ اتقیاء کی شان تو یہ ہے کہ وہ کم کھاتے ہیں طاعت زیادہ کرتے ہیں۔ یہ پیٹ بھر کے کھانا اور وہ بھی ناک تک کھا لینا یہ عوام کا کام ہے خواص کا نہیں۔ خواص میں بھی جو شخص امامت کے رتبہ کو پہنچا ہوا ہو اس کا کام یہ نہیں ہے کہ اس طرح سے انسٹھ کھالے جیسے اناڑی کی بندوق بھری جاتی ہے کہ اوپر سے لے کر نیچے تک یہ اونچے طبقے کے لوگوں کا کام نہیں جو دیانت میں اونچا مقام رکھتے ہوں ___ تو امام شافعیؒ سے جواب نہیں بن پڑا اور

یہ فرمایا کہ محسوس تو میں نے بھی اس کو کیا مگر یوں بول نہیں سکتا تھا کہ میں میزبان ہوں۔ اگر میں یوں کہتا کہ تم زیادہ کیوں کھاتے ہو' تو تہمت آتی کہ شاید میں مہمان سے اپنا کھانا بچانا چاہتا ہوں' اس لئے میرے بولنے کا موقع نہیں تھا مگر محسوس میں بھی کر رہا تھا کہ یہ احمد بن حنبل کو ہو کیا گیا۔ اس طرح سے پیٹ بھر کے کھانا ۔

اندروں از طعام خالی دار
تانور معرفت دروبینی

پیٹ کو کھانے سے خالی رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ نور معرفت پیدا ہو' نہ یہ کہ آدمی اتنا بھرلے ___ بہر حال امام شافعیؒ سے جواب نہیں بن پڑا بچیوں نے اعتراض کیا تو چپ ہو گئے ___ وہ وقت گزر گیا۔ اور امام احمدؒ عشاء کی نماز کے لئے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد چھوٹی چھوٹی بچیوں نے بستر بچھایا۔ اور پانی کا لوٹا بھر کے رکھا کہ امام جب تہجد کے لئے اٹھیں تو پانی لانے کی دشواری نہ ہو۔ اطمینان سے وضوء کرلیں۔

امام احمدؒ صبح کی نماز کے لئے جب اٹھ کر گئے تو بسر و غیر اٹھانے کے لئے بچیاں آئیں۔ دیکھا کہ لوٹا اسی طرح بھرا ہوا رکھا ہے۔ اب تو ان کے غصے کی کوئی حد نہ رہی کہ یہ کیسا امام ہے کہ پیٹ بھر کے یہ کھانا کھائے' رات کا کوئی وقت عبادت کا اسے نصیب نہ ہو۔ وضو یہ نہ کرے' تہجد یہ نہ پڑھے ___ یہ خواہ مخواہ ہی دنیا میں غلط شہرت ہو گی کہ اپنے وقت کا بڑا امام ہے۔

جب امام شافعیؒ پہنچے تو بچیوں نے دامن پکڑ لیا کہ آپ نے ہمیں غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا کہ احمد ابن حنبلؒ رأس الاتقیاء متقیوں کا سردار ہے۔ یہ کیسا امام ہے۔؟ ناک تک یہ کھانا کھاتا ہے اور تہجد کی توفیق اسے نہیں۔ رات بھر پڑ کر یہ سوئے۔

اب امام شافعیؒ سے بھی رہا نہ گیا اور باہر آکر امام احمدؒ سے کہا کہ :

"اے احمد بن حنبلؒ ! یہ تغیر تم میں کب سے پیدا ہوا۔؟ مجھے تو اس کی توقع نہیں تھی۔ یہ تمہاری حالت کب سے بدلی' پیٹ بھر کر تم کھانا کھاتے ہو۔ تہجد کی توفیق تمہیں نہ ہوئی ___ رات کو تم نہ اٹھے' وضو تم نے نہ کیا' آخر یہ تغیر تمہارے اندر کیسے پیدا ہوا؟"۔

امام احمدؒ مسکرائے۔ اور عرض کیا۔ حضرت واقعہ وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں فرمایا' واقعہ کیا ہے۔؟

"عرض کیا کہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے آج عشاء کے وضو سے تہجد اور صبح کی نماز کی نوبت آئی ہے۔ اور عرض کیا کہ قصہ یہ ہوا کہ جب دسترخوان پر کھانا چنا گیا تو میں نے دنیا میں اتنی حلال کی کمائی نہیں دیکھی۔ اس کھانے کے اوپر آسمانوں سے انوار و برکات کی اتنی بارش تھی کہ مکان منور تھا اور کھانے پر نظر ڈال کر قلب میں ذکر اللہ کی کیفیت پیدا ہوتی تھی' اتنی حلال اور پاک کمائی میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی' تو میں نے یہ ارادہ کیا کہ جتنا کھا سکوں کھاؤں' چاہے بعد میں مجھے سات دن فاقہ کرنا پڑے' پھر یہ نورانی کھانا مجھے کہاں نصیب ہوگا' اس واسطے میں نے زیادہ کھایا"۔

اور عرض کیا :

اس کھانے کی دو برکتیں نمایاں ہوئیں' ایک علمی برکت اور ایک عملی برکت۔ عملی برکت تو یہ ہوئی کہ عشاء کے وضوسے میں نے صبح کی نماز پڑھی' اور تہجد پڑھا۔ مجھے وضو کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

اور علمی برکت یہ ہوئی کہ چارپائی پر لیٹ کر قرآن کریم کی ایک آیت سے آج میں نے فقہ کے سو مسئلے نکالے' جواب تک مجھے سمجھ نہیں آئے تھے' علم کے دروازے میرے قلب کے اوپر کھل گئے۔ اور سو مسئلے ایک ہی آیت سے میں نے استنباط کئے' یہ علم کی برکت ہوئی۔

تب امام شافعیؒ کی ڈاڑھی کا بال بال خوشی سے کھل گیا۔ اور بچیوں سے کہا کہ دیکھا ہم نہیں کہتے تھے کہ امام وقت ہے۔

تب بچیوں کو تسلی ہوئی۔

تو عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ حلال کی کمائی کا اثر یہ ہے کہ معرفت بڑھتی ہے علم الہی کی برکت پیدا ہوتی ہے اور عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ آج ہمارے میں عمل کی کوتاہی اس وجہ سے نہیں ہے کہ آج ہمیں مسائل کا علم نہیں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے۔ علم کے وسائل اتنے عام ہو گئے کہ پہلے زمانے میں نہیں تھے' کتابیں چھپی ہوئی الگ' اخبار الگ' رسالے الگ' پیپر الگ اور ہر چیز میں شریعت پر ہی مشق کی جارہی ہے سب مسائل ہی کو موضوع بحث بنارہے ہیں۔ تو اختلافی مسائل ان کے علم میں نہ ہوں مگر اس کے باوجود کہ زبان' علم کے بارے میں کافی چلتی ہے۔ ہاتھ پیر عمل کے لئے نہیں چلتے۔

نمائش علم

علم کو بھی اگر لوگ استعمال کررہے ہیں تو اس انداز سے جیسے حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اخیر زمانے میں علم تجمّل کے لئے رہ جائے گا۔

جس طرح سے لوگ کپڑوں سے زینت حاصل کرتے ہیں' اچھی بلڈنگ سے تجمل حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح علم سے بھی اپنی زینت اور نمائش کریں گے کہ ہم بھی پڑھے لکھے ہیں' ہم بھی عالم ہیں اور ہم بھی مسائل پر عبور رکھتے ہیں۔ تو علم عمل کے لئے نہیں رہے گا نمائش کے لئے رہے گا کہ اپنا جمال دکھلایا جائے' اپنا کمال دکھلایا جائے۔

کثرۃ علم کے باوجود قلت عمل

غرض علم کی کمی نہیں' اگر کمی ہے تو عمل کی کمی ہے ___ اگر علم کی کثرت سے عمل نصیب ہو جایا کرتا تو آج کی دنیا سب سے زیادہ عمل کرنے والی ہوتی' کیونکہ علم کی کمی نہیں ہے۔ مگر جتنا علم بڑھتا جارہا ہے عمل گھٹتا جارہا ہے۔ اس واسطے کہ علم تجمل کے لئے ہے۔ اسباب علم بڑھتے جاتے ہیں علم کی حقیقت دلوں میں ختم ہوتی جاتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اخیر زمانے میں علم گھٹ جائے گا' اور ایک میں خبر دی گئی کہ قرب قیامت میں علم بڑھ جائے گا۔

علماء نے دونوں روایتوں میں تطبیق دی ہے وہ یہ کہ اسباب علم بڑھ جائیں گے اور علم کی حقیقت دلوں میں گھٹ جائے گی ___ اسباب اتنے کہ قدم قدم پر علم کے نقشے سامنے ہوں گے اور ظلمت اتنی کہ قلب کے اندر نورانیت کا نشان نہیں کہ آدمی حق و باطل کا پورا امتیاز کرسکے۔ اور اس کے اندر عمل کا جذبہ اور امنگ

پیدا ہو۔

آثارِ علم

علم کے آثار میں سے ہے ___

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا

اہل علم میں جو علم ہوتا ہے کہ ان میں خشیت الٰہی اور خوف خداوندی ضرور پیدا ہوتا ہے یہ علم کی تاثیر ہے اور جو خوف آخرت ہوگا اور اپنے مرنے کا ڈر ہوگا اور اللہ کے سامنے جوابدہی کا اندیشہ ہوگا تو عمل کا جذبہ انسان میں پیدا ہوگا ___ لیکن جب علم سے خشیت اور خوف پیدا نہ ہوتو معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم حقیقی نہیں ہے' رسمی علم ہے' لفظی علم ہے' لفظی علم کے لئے خشیت کا وعدہ نہیں ہے۔

ابتلاءِ معصیت کے اسباب

غرض آج کی معصیت اور گناہ قلت علم کے سبب سے نہیں ہے بلکہ قلت اخلاق کے سبب سے ہے۔ قلت نورانیت کے سبب سے ہے' اور قلت توفیق کے سبب سے ہے اور توفیق سلب ہونے کے اسباب میں سے مشتبہ کمائی حرام کمائی ہے کہ آدمی احتیاط سے نہ کمائے۔ حلال وحرام کا کوئی امتیاز نہ کرے' مشتبہ اور غیر مشتبہ کو نہ دیکھے۔ پیسہ مقصود ہو جائے۔ کہ جس طرح ہو پیسہ بٹورلو۔ ڈکیتی سے ہو' چوری سے ہو' رشوت سے ہو' کسی بھی انداز سے ہو پیسہ آنا چاہئے' ایسے پیسے کا اثر تو یہی ہو گا کہ توفیق جاتی رہتی ہے۔

بہرحال حاصل یہ نکلا کہ عبادت اور اور زہادت کی جب توفیق ہوتی ہے جب قلب میں نور ہو' اور نور قلب میں جب ہوتا ہے جب کمائی ٹھیک ہو۔ حلال کی ہو حلال کا لقمہ میسر ہو۔

رزقِ حلال میں قلت وبرکت

نیز حلال کی کمائی ہمیشہ تھوڑی ہوتی ہے زیادہ نہیں ہوا کرتی۔ حرام کمائی تو ہو سکتا کہ زیادہ ہو لیکن عادتاً حلال کی کمائی کم ہوتی ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ' اللہ تعالیٰ کسی کو بڑھادے' مگر عادتاً لازمی بات یہ ہے کہ ضرورت کے موافق ملتا ہے' مگر برکت اس میں زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی خیر زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔

بناءِ عبادت

غرض انسان عبادت کے لئے بنایا گیا ہے اور عبادت جب ہوگی جب اس کے وسائل اور اسباب درست ہوں ___ اس لئے فرمایا گیا :

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ۔

ساری چیزیں اس کے لئے بنائیں۔ اسے اپنے لئے بنایا تاکہ میری یاد میں لگے' سارے دنیا اس کے لئے مدد گار بنے۔ یہ دنیا سے نفع حاصل کرے مگر کہے کے مطابق جو حدود کے اندر میں جائز طریقے سے بتلاؤں اس طریق پر نفع حاصل کرے۔ تو نفع اور نقصان سب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے' عبادت کی بنیاد نفع اور نقصان

ہے جو میں عرض کر رہا تھا ـــــ اسی کو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا :

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَنْفَعُكُمْ شَيْأً وَّلَا يَضُرُّكُمْ.

اپنی قوم کو خطاب کیا' کیا تم ان بتوں کو پوجتے ہو جو تمہیں ادنیٰ درجے کا نفع نہیں پہنچا سکتے۔ ادنیٰ درجہ میں ضرر نہیں پہنچا سکتے؟ ان مورتیوں کو جو سامنے رکھی ہوئی ہیں' جن کو تم خود ہی اپنے ہاتھ سے بناتے ہو اور خود ہی تصور کر لیتے ہو کہ یہ ہمارے معبود ہیں۔ یہ بے جان چیزیں ہیں۔ تو مصنوع تمہاری اور تم اس کے صانع' اس کے باوجود تم نے اپنے لئے مالک تجویز کر لیا ـــــ یہ چیزیں تمہیں نفع بھی نہیں پہنچا سکتیں اور نقصان بھی نہیں پہنچا سکتیں۔

حاصل یہ نکلا کہ عبادت کی بنا نفع اور نقصان کا مالک بننا ہے۔

اہل شرک کا دھوکہ

اہل شرک کو یہیں سے دھوکہ لگا ہے کہ عبادت کی بنیاد نفع نقصان پر ہے تو دنیا کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں جس میں انسان کا کچھ نہ کچھ نفع نہ ہو' یا کچھ نہ کچھ نقصان نہ ہو' دنیا کی کوئی چیز نہ محض نفع ہی پہنچاتی ہے نہ محض نقصان ہی نقصان پہنچاتی ہے۔ ہر چیز سے کچھ نفع پہنچتا ہے کچھ ضرر پہنچتا ہے۔ غرض ہر چیز میں نفع ضرر موجود ہے۔

یہ روٹی جو آپ روز کھاتے ہیں نفع بھی دیتی ہے نقصان بھی پہنچا دیتی ہے اگر ذرا حدود سے زیادہ کھالی' بیماری پیدا ہوگی' حدود کے اندر کھائیں گے نفع دے گی۔ یہی پانی اگر اعتدال کے ساتھ پئیں گے نفع دے گا' اگر بے اعتدالی کے ساتھ پانی چڑھاتے چلے جائیں گے بارد امراض پیدا ہونا شروع ہو جائیں گے۔

یہی ہوا ہے نفع بھی دیتی ہے نقصان بھی دیتی ہے۔ بے اعتدالی کے ساتھ ایسی چیزیں کھائیں گے جس سے فاسد ہوا پیدا ہو' نفخ کی بیماری پیدا ہوگی' اعتدال کے ساتھ کھائیں گے تو ہوا نفع دے جائے گی۔ غرض ہر چیز میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے نباتات ہوں' جمادات ہوں' حیوانات ہوں' ہر ایک میں نفع و نقصان مشترک ہے جب عبادت کی بنیاد نفع و نقصان پر رہی اور دنیا کی ہر چیز میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے' تو مشرکین نے ہر چیز کو پوجنا شروع کیا کہ جب عبادت کی بنیاد نفع و ضرر پر ہے اور نفع و ضرر دنیا کی ہر چیز میں ہے تو کہیں پانی کو پوجنا شروع کیا اس میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے ـــــ اور کہیں آفتاب کو پوجنا شروع کیا اس میں نفع بھی ہے نقصان بھی ہے تو ضرر سے بچنے کے لئے ان کو پوجتے ہیں اور نفع حاصل کرنے کے لئے ان کو پوجتے ہیں۔

اسی طرح ستاروں کو' پتھروں کو' مورتیوں کو' سونے اور چاندی کو پوجنا شروع کیا ـــــ تو پوجنے والا ایک ہے اور تینتیس کروڑ اس کے خدا ہیں' جتنی دنیا کے اندر انواع ہیں کہ ان میں سے ہر چیز میں کچھ نہ کچھ نفع نقصان موجود ہے۔

آلات صنعت کی پرستش

حتیٰ کہ اگر بعض قومیں صنعت و حرفت بھی رکھتی ہیں تو جتنے ان کی صنعت و حرفت کے آلات ہیں وہ ان کو پوجتی ہیں کہ یہ ہمارے نفع کا ذریعہ ہیں اور یہی نقصان کا ذریعہ بن جاتے ہیں ـــــ مثلاً کاتب ہے تو وہ قلم کے آگے بیٹھ کر ڈنڈوز کرتا ہے۔ اگر کوئی تلوار کا دھنی ہے تو وہ تلوار کو پوجتا ہے۔ کوئی بڑھئی ہے تو وہ بسولی کو پوجتا ہے کہ میرا نفع و نقصان اس سے متعلق ہے ـــــ غرض دنیا کی ہر چیز کو معبود بنا لیا' کیونکہ عبادت کی بنیاد نفع

ونقصان ہر چیز میں پایا جاتا ہے۔
مشرکین نے یہ اصول تو صحیح اختیار کیا کہ عبادت کی بنیاد نفع وضرر پر ہے لیکن یہ غلط سمجھا کہ ہر چیز میں نفع وضرر ہے۔

اسلام کا دعویٰ توحید

شریعت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ عبادت کی بنیاد نفع وضرر پر ہے مگر وہ نفع وضرر جو مالک کے قبضے میں ہو' تو دنیا میں جتنے بھی اسباب ہیں نفع ونقصان ان کے قبضے میں نہیں ہے' یہ مالک کے ارادے سے نفع ونقصان پہنچاتا ہے۔ خود بتھوڑا نفع نہیں پہنچاتا خود ہوا نفع نہیں پہنچاتی' مشیت خداوندی نفع پہنچاتی ہے۔ اصل میں نفع کی باگ ڈور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جو مسبب الاسباب ہے۔ اسباب کے ہاتھ میں نفع ونقصان پہنچانا نہیں ــــ اس لئے عبادت اس کی' کی جائیگی جس کے قبضے میں نفع ونقصان ہے' نہ اس کے جو نفع ونقصان کا صرف سبب ہے۔ نفع ونقصان کا موجد نہیں ہے' نفع ونقصان کا خالق نہیں ہے محض سبب بنتا ہے۔ تو سبب بن جانے سے موجد یا خالق ہونا لازم نہیں آتا۔

استحقاق عبادت

انسان اولاد کے پیدا ہونے کا سبب ہے لیکن اولاد کے حق میں اس کو خالق تھوڑا ہی کہدیں گے؟ کاشتکار کھیتی اگ جانے کا سبب ہے لیکن کھیتی کو اگانے والا کاشت کار کو تھوڑا ہی کہدیں گے؟
اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا گیا :

أَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ۔

تم کاشتکاری کرتے ہو یا ہم کاشت کاری کرتے ہیں ــــ؟ تمہارا کام اتنا ہے کہ تم کھیتی کے اگ جانے کا سبب بن جاتے ہو' کھیتی کے اگانے والے نہیں ہو اگانے والے ہم ہیں' منوں مٹی میں جو بیج چھپادیا جاتا ہے۔ تو زمین کی تہہ میں سے کون کونپل نکالتا ہے' کیا تم نکالتے جاتے ہو یا ہماری قدرت نکالتی ہے۔؟ ماں کے پیٹ میں نطفہ پہنچتا ہے تو اس پانی کے اوپر صناعی کرکے نقشہ تم کھینچتے ہو یا ہم کھینچتے ہیں ــــ؟ ہم اسے مضغہ بناتے ہیں اور بڑھاتے ہیں یا تم بڑھاتے ہو ــــ؟ غرض تم سبب خلقت ہو خالق نہیں ہو' کاشت کار زراعت کا سبب ہے خود کاشت کار زراعت پیدا نہیں کرتا' تو دنیا میں جتنی بھی اشیاء ہیں یہ نفع ونقصان کا سبب بنتی ہیں نفع ونقصان کو پیدا کرنے والی اور ایجاد کرنیوالی نہیں ہیں۔ نفع ونقصان مسبب الاسباب کے ہاتھ میں ہے' جس کو چاہے زندگی دیدے جس کو چاہے اولاد کی نعمت دیدے اور جب چاہے چھین لے' ہاتھ میں اسی کے ہے اسباب میں نہیں ہے ــــ اگر تم اولاد کے خالق ہوتے تو جیسے تم پیدا کرنے پر قادر تھے تو روکنے پر بھی قادر ہوتے' کوئی بھی ماں باپ اولاد کو مرنے نہ دیتے ــــ لیکن بے بس ہیں۔ جب زندگی کے روکنے پر قادر نہیں ہو' تو زندگی ڈالنے پر انہیں قدرت کہاں آئی؟ تم زیادہ سے زیادہ سبب ہو۔ اس سے زیادہ نہیں ہو۔ موت کا بھی سبب بن جاتا ہے۔

آدمی کسی کو چھری مار دے تو وہ موت دینے والا نہیں ہے' سبب موت ہے' موت دینے والے حق تعالیٰ ہیں ــــ اگر کوئی چھری مار دے اور وہ چھری میں سے تاثیر نکالدیں اور موت نہ دیں' تو لاکھ ذبح کیا کرو' کبھی کوئی ذبح نہیں ہوگا ــــ آگ سے جل کر اگر کوئی مرجائے تو مارنے والی آگ نہیں ہے' مرنے کا سبب ہے

مارنے والی اللہ کی مشیت ہے' آگ کو اس نے سبب بنادیا اس لئے اسباب میں سے جو نفع و نقصان پیدا ہوتا ہے وہ مالک کے حکم سے پیدا ہوتا ہے۔ خود یہ اسباب نفع و نقصان پر قادر نہیں ہیں' اس واسطے ان اسباب کی عبادت بھی جائز نہیں ہوگی' عبادت اسی کی کی جائے گی جس کے قبضہ میں قدرت میں نفع و نقصان ہے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہے ـــ تو نفع و نقصان کا سبب ساری دنیا بن جائے وہ پوجا کے لائق نہیں ہے۔ جو نفع و نقصان کو بھیج رہا ہے۔ وہ عبادت کے لائق ہے۔ تو اس میں گویا اصول بتلادیا کہ

أَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَنْفَعُكُمْ شَيْأً وَّلَا يَضُرُّكُمْ أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔

"تم ان چیزوں کی عبادت کرتے ہو جو کہ تمہیں نہ نفع پہنچاسکیں' نہ تمہیں نقصان پہنچاسکیں"۔

أُفٍّ لَّكُمْ تمہارے اوپر اُف ہے' تمہارے بنائے ہوئے ان فرضی معبودوں کے اوپر جن میں نہ نافع ہونے کی صلاحیت ہے' نہ مضر ہونے کی صلاحیت ہے۔ جیسے ایک دوسری جگہ فرمایا گیا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ۔

"یہ اللہ کو چھوڑ کر جن چیزوں کو پکارتے ہیں جن مورتیوں کے آگے بیٹھ کر پوجا کرتے ہیں۔ یہ ایک مکھی بھی نہیں بناسکتے۔ اگر ساری مورتیاں جمع ہو کر یہ چاہیں کہ ایک مکھی کو پیدا کردیں' ان کے بس میں نہیں ہے"۔

عبادت وخلافت

صحیح معنوں میں انسان وہ ہے جو اپنی ذات کو اپنے پروردگار کے سامنے جُھکادے اور عبادت میں آگے بڑھے‘ اس کی ناک‘ پیشانی‘ ہاتھ‘ پیر‘ اس کی روح اور اس کا خیال بھی اللہ کے سامنے ذلیل بن کر جُھک جائے یہ کام اپنی ذات کے لئے ہوگا‘ یہ عبادت ہے۔ دوسرا فریضہ یہ ہے کہ وہ تختِ خلافت پر بیٹھ کر دنیا سے بُرائیوں کا خاتمہ کرے۔ اس لئے نہ فقط عبادت اور نہ فقط خلافت مقصد زندگی بلکہ دونوں مقصود ہیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّہْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ــــــ اَمَّا بَعْدُ ــــــ

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ۔ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ صدق اللہ العلی العظیم ــــــ (لقمٰن پ ۲۱ ع ۲)

بزرگانِ محترم!

یہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے جو اس وقت میں نے آپ حضرات کی سامنے تلاوت کی۔ یہ نصیحت ہے جو حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو کی۔ اور حق تعالٰی نے قرآن کریم میں اس کو نقل فرمایا۔ یہ پورا رکوع ہے جس میں حضرت لقمان علیہ السلام کی نصیحتوں ہی کا ذکر ہے‘ ان کی نصائح میں ایک نصیحت یہ ہے جو اس وقت میں نے تلاوت کی ــــ اس آیت کے سلسلہ میں کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کرنی‘ اور نہ ہی آیت کی تفسیر کرنی ہے کہ وہ بہت لمبی چیز ہے‘ وقت اتنا نہیں ہے‘ اسی آیت سے ایک مضمون اخذ و استنباط کرکے میں عرض کرنا چاہتا ہوں‘ اور وہ دو مقاصد پر مشتمل ہوگا‘ جس سے یہ معلوم ہوگا کہ انسان کو اللہ نے دنیا میں کیوں بھیجا؟ کیوں پیدا کیا؟ اس کی زندگی کے کیا مقاصد متعین ہیں؟ اور ہم ان مقاصد کو کس حد تک انجام دے رہے ہیں۔

تمہید

ان دو مقاصد کی تفصیل سے پہلے ایک مختصری تمہید سمجھ لیجئے' تاکہ اس مقصد کا سمجھنا آسان ہو جائے۔ وہ یہ کہ یہ جو لمبی چوڑی کائنات آپ کے سامنے پھیلی پڑی ہے' جس میں بے انتہا طویل و عریض آسمان کا خیمہ تنا ہوا ہے' زمین کا فرش بچھا ہوا ہے' زمین و آسمان کے بیچ میں ہزاروں قسم کی مخلوقات پھیلی پڑی ہیں' جمادات اور ان کی ہزاروں قسمیں' نباتات اور ان کی ہزاروں قسمیں' جانوروں کی ہزاروں قسمیں ہیں' دریا اور خشکی کے جانور' غرض جمادات' نباتات اور حیوانات یہ بہت سی انواع و اقسام ہیں' جو زمین و آسمان کے درمیان پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر آسمانوں کے اوپر ایک عظیم مخلوق ہے' جس کو ملائکہ کہتے ہیں وہ اتنے پھیلے ہوئے ہیں' جیسے حدیث میں ہے کہ آسمان میں چار انگلی جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروفِ عبادت نہ ہو۔ تو اَن گنت ملائکہ اوپر پھیلے ہوئے ہیں' اس ساری کائنات اور مخلوقات کی انتہا عرش پر جا کر ہوتی ہے۔ عرشِ عظیم کے اوپر شریعت کسی مخلوق کا پتہ نہیں دیتی' وہاں خالق کی تجلّیات اور کمالات ہیں۔ صرف ایک مخلوق کا پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے ایک تختی اور لوح رکھی ہوئی ہے' اور وہ تختی زمین و آسمان سے بھی زیادہ بڑی ہے' اس پر لکھا ہوا ہے کہ:

اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ

میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ رحمت آگے آگے چلتی ہے' غضب اس کے پیچھے پیچھے رہتا ہے' اصل رحمت ہے' غضب اس کے تابع ہے' یہ ایک دستاویز لکھی ہوئی ہے' اس مخلوق کا تو نشان ملتا ہے۔ باقی خالق کی تجلّیات و کمالات اور اس کی صفات عرش کے اوپر پھیلی ہوئی ہیں۔ تو زمینیں' آسمان و زمین کے درمیان فضا' آسمان' جنت' عرش اور کرسی پھر تجلّیاتِ ربّانی کا یہ سلسلہ ہے' تو بڑی لمبی چوڑی کائنات ہے۔

انسان میں مخلوقات کے نمونے

لیکن اللہ کی قدرت دیکھئے کہ اس ساری لمبی چوڑی کائنات کو جو کروڑوں میلوں پر پھیلی ہوئی ہے' ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں بند کر دیا۔ آجکل کے سائنس دانوں کے قول کے مطابق چاند زمین سے ستّر لاکھ میل دُور ہے' جس میں جانے کا ارادہ کیا جا رہا ہے' (اب تو ان کا دعویٰ ہے کہ وہ پہنچ بھی چکے ہیں) پھر اس سے کتنا اوپر آسمان ہے' پھر کتنے آسمان اور کتنی جنتیں ہیں' تو لاکھوں کروڑوں میل پر مشتمل ہے' لیکن جب اس کو سمیٹا تو ایک ڈیڑھ گز کی جگہ میں آگئی' اور وہ ڈیڑھ گز کی جگہ کیا ہے؟ وہ آپ ہیں۔ ساری کائنات کو اللہ نے انسان میں جمع کر دیا' جس میں زمین بھی ہے' آسمان بھی ہیں' پہاڑ بھی ہیں' جمادات' نباتات اور حیوانات بھی اس کے اندر جمع ہیں۔

انسان کو دیکھا جائے تو اس میں مٹی بھی ہے' پیدا ہی زمین سے ہوا' اسے مشتِ خاک ہی کہتے ہیں۔ کہ ایک مٹھی خاک سے ہمارا بدن پیدا کیا گیا۔ تو یہ ہمارا بدن زمین کا ایک تودہ ہے' روح نے اس مٹی کو سنبھال رکھا ہے روح نکلنے کے بعد پھر مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے تو اصل میں مٹی ہے' اور اس زندگی کی حالت میں بھی اس سے مٹی نکلتی رہتی ہے' اگر آپ روزانہ غسل نہ کریں' تو جب بدن پہ ہاتھ پھیریں گے' بدن سے سیاہ بتیاں اُتریں گی' وہ مٹی اور کوڑا کباڑ نہیں تو کیا ہے؟ تو بدن خاک کا ہے اور خاک ہی اس سے چھنتی ہے۔ اگر خارش ہو جائے' تو سارے بدن سے بھوسی سی جھڑتی ہے' جیسے مٹی جھڑ رہی ہو' تو آج بھی انسان مٹی کا تودہ ہے۔ مرنے کے بعد یہ مٹی بکھر جاتی ہے' گویا انسان کے اندر زمین موجود ہے' اور وہی خاصیت اس زمین کی ہے' جو عام زمین کی ہے۔ اگر آپ اس میں غور کریں' آپ کی اس زمین میں پہاڑوں کا سلسلہ بھی ہے۔

ہزاروں چھوٹے بڑے پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ جو انسان میں ہڈیوں کا سلسلہ ہے۔ یہ پہاڑوں کی مانند ہے' کوئی بڑی بڑی' کوئی چھوٹی' کوئی لانبی' کوئی چوڑی' جیسے پہاڑ مختلف ہوتے ہیں۔ تو یہ ایک سلسلہ ہے جو اس میں پھیلا ہوا ہے' اسی طرح اگر آپ غور کریں' جیسے دنیا کی زمین میں درخت' گھاس اور نباتات اُگتے ہیں' ہماری زمین میں بھی نباتات اُگے ہوئے ہیں' کہ بہت ہی قریب قریب درخت ہیں' تو سر ایسا ہے' جیسے گھنا جنگل' کہ سینکڑوں درخت اس میں قریب قریب اُگے ہوئے ہیں۔ کوئی زمین ایسی ہوتی ہے کہ اس میں درخت دُور دُور ہوتے ہیں۔ جیسے عام بدن کے اوپر رواں' یہاں بال دُور دُور ہیں' کوئی زمین کا حصہ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں کوئی درخت پیدا ہی نہیں ہوتا' ہتھیلیوں پر کچھ بھی نہیں اُگتا' ناک کے اوپر کوئی بال نہیں اُگتا۔ تو اور کچھ حصہ وہ ہے کہ اس میں سرے سے بال اُگے ہی نہیں ___ غرض ہمارے بدن کی زمین میں مٹی' پہاڑ' اور نباتات کا سلسلہ بھی ہے۔

اور اس میں حیوانات بھی ہیں۔ آجکل کے ڈاکٹروں کی تحقیقات تو یہ ہیں کہ خون میں جراثیم (چھوٹے چھوٹے حیوانات) ملے ہوئے ہیں' جو خوردبین سے دکھلائی دیتے ہیں' ویسے نہیں۔ بدن کے ہر حصے میں نئے نئے رنگ کے جانور ہیں' ان کے مجموعے سے خون بنا ہے' وہ مرجائیں تو انسان مرجاتا ہے' تو پورے بدن میں جراثیم پھیلے ہوئے ہیں۔ جیسے آپ کی زمین میں مختلف صوبے ہیں' کسی صوبے میں خاص قسم کے جانور' کہیں اور قسم کے جانور' کہیں کچھ ہوتا ہے کہیں کچھ۔ تو یہ ہاتھ اور پیر اس زمین کے صوبے ہیں' اس میں مختلف قسم کے جانور ہیں۔ وہ حیوانات مختلف شکلوں کے ہیں' ان سے امراض بھی پیدا ہوتی ہیں' اگر ان جراثیم کو مار ڈالا جائے تو ان سے بیماری ختم ہوجاتی ہے۔ انہی جراثیم سے زندگی بھی ہے' انسان کے مادے (خون) میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور سر میں بھی تو کبھی جوئیں پڑجاتی ہیں' آدمی اُن کو پکڑتا ہے اور ناخن پر رکھ کر مارتا ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے جنگل میں مختلف جانور پھرا کرتے ہیں۔ تو جیسے اسی زمین سے جانور پیدا ہوتے ہیں اور اسی میں کھپ بھی جاتے ہیں ___ بعض دفعہ معدے میں کیڑے پیدا ہوجاتے ہیں' ڈاکٹر علاج کرتے ہیں' وہ کیڑے ساری غذا کھاتے رہتے ہیں' انسان کمزور ہوتا رہتا ہے۔ بدن کو نہیں لگتی' تو سر میں جوئیں اور معدے میں کیچوے پیدا ہوجاتے ہیں' زخموں میں کیڑے پیدا ہوجاتے ہیں۔ بہرحال انسان کی زمین میں مختلف حیوانات ہیں' جو چل رہے ہیں۔ تو جیسی کائنات باہر کی ہے ویسی ہی ہمارے اندر کی کائنات بھی ہے' کہ زمین' پہاڑ' نباتات اور مختلف قسم کے حیوانات بھی' شکل وصورت سے بھی مختلف' پیدا بھی ہوتے اور مرتے بھی ہیں۔

پھر جیسے آپ کی اس دنیا میں وقت آنے پر بارشیں ہوتی ہیں' اس بدن میں بھی بارش ہوتی ہے۔ جب گرمی آتی ہے تو پسینہ نکل رہا ہے' ایسے ٹپک رہا ہے' جیسے بارش ہو رہی ہو۔ پھر جتنے قسم کے پانی زمین میں ہیں' اتنے ہی قسم کے انسان کے اندر ہیں' دنیا میں بعض جگہ پانی کے گرم چشمے نکلتے ہیں۔ ہندوستان میں منڈیل کے ضلع میں بعض جگہ کھولتے ہوئے پانی کے چشمے ہیں' لوگ اس پانی کو ٹھنڈا کرکے غسل کرتے ہیں' ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے مَنوں آگ میں اسے پکایا گیا ہو ___ بعضے چشمے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے ہیں۔ سمندر کا پانی کڑوا ہے۔ بعض جگہ پانی میں ترشی ہوتی ہے' ___ انسان کے بدن کے اندر بھی ایسے ہی ہے۔ منہ کے اندر اللہ نے میٹھا چشمہ جاری کررکھا ہے' اگر منہ میں کڑوا پانی ہوتا' آدمی کی زندگی تلخ ہوجاتی۔ تو نہایت شیریں قسم کے پانی کا چشمہ زبان سے بہہ رہا ہے۔ اسی پانی کی مدد سے غذا اندر پہنچتی اور اسی کی مدد سے ہضم بھی ہوتی ہے۔ آنکھوں سے جو آنسو ٹپکتے ہیں' وہ نمکین پانی ہے' کبھی زبان پر آنسو کا پانی لگ جائے' تو نمک کا سا مزا آتا ہے۔ تو آنکھوں کے اندر نمکین چشمہ جاری کردیا ہے۔ پتے میں دیکھو تو کڑوا پانی بھرا ہوا ہے' اس میں کڑوا چشمہ جاری ہے۔

معدے کے اندر ترش پانی بھرا ہوا ہے‘ جس سے غذا ہضم ہو رہی ہے ___ پھر کہیں پاک پانی اور کہیں ناپاک۔ مثانے میں ناپاک پانی بھرا ہوا ہے جسے پیشاب کہتے ہیں اور منہ میں پاک پانی بھرا ہوا ہے جسے لعاب کہتے ہیں‘ یہ نکلے کہ آدمی تھوکے‘ اس سے وضو نہیں ٹوٹتی۔ پیشاب کا ایک قطرہ نکل آئے۔ وضو ٹوٹ جاتی ہے۔ تو بدن میں پاک‘ ناپاک‘ ٹھنڈا‘ گرم‘ ترش اور میٹھا وکڑوا ہمہ قسم پانی موجود ہے۔ برسات اس میں کہ پسینہ ٹپ ٹپ ٹپک رہا ہے‘ تو جو اس کائنات میں ہے وہی انسان کے اندر ہے۔ ساری کائنات انسان میں جاری ہے۔

یہاں اگر ہوائیں چلتی ہیں تو انسان میں بھی ہوائیں چلتی ہیں جیسے یہاں ٹھنڈی اور گرم ہیں‘ آپ جب سانس اندر کو لیتے ہیں‘ تو ٹھنڈی اور جب باہر کو لیتے ہیں تو گرم ہوا نکلتی ہے۔ جیسے دنیا میں بعض اوقات ہوا بند ہو جاتی ہے‘ آدمی دوڑا دوڑا پھرتا ہے کہ بھئی پنکھے چلاؤ‘ طبیعت گھبرا گئی‘ انسان کے بدن میں بھی بوجھ ہو جاتا ہے‘ معدے میں ہوا پھنس جاتی ہے‘ ڈاکٹروں کے پاس دوڑے دوڑے پھرتے ہیں۔ کہ صاحب! کسی طرح سے ہوا نکال دو۔ اگر ہوائیں بند ہو جائیں تو اندر بھی گھٹن ہوتی ہے۔ تو انسان کے بدن میں پانی بھی ہے‘ اور ہوا بھی‘ اور چلنے کا ڈھنگ بھی وہی جو باہر کی زمین میں ہے۔

اسی طرح انسان کے بدن میں آگ بھی ہے۔ کبھی آپ بدن پر ہاتھ رکھیں گے تو گرمی محسوس ہوتی ہے۔ اگر بدن میں آگ نہیں تو یہ گرمی کاہے کی ہے؟ اور اگر آدمی زور سے ہاتھ کو ملے‘ تو چنگاریاں سی نکلنے لگتی ہیں۔ اور میل بھر دوڑلیں‘ تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بدن میں آگ بھر گئی۔ اگر اندر حرارت نہیں ہے‘ تو اندر کیا چیز اُبلتی ہے۔ تو آگ پانی‘ ہوا اندر موجود ہیں‘ اور ان کا عمل بھی جاری ہے۔

غرض یہ آپ کا بدن اس پوری کائنات کی طرح ایک دنیا ہے‘ جیسے اس میں اوپر آسمان ہے‘ اور نیچے زمین ہے۔ آپ کے اندر سر آسمان کی مانند ہے‘ اور نیچے پیر زمین کی مانند ہیں۔

جیسے آسمان میں چاند سورج ہیں‘ جن کی روشنی سے آپ اس کائنات کو دیکھتے ہیں‘ انسان کی پیشانی پر چاند اور سورج کی طرح سے دو آنکھیں ہیں‘ ان میں روشنی نہ ہو‘ کائنات نظر نہیں آتی ___ تو چاند‘ سورج اور روشنی بھی ہے۔

پھر حکومت کا ایک نظام بھی قائم ہے۔ ہاتھ اور پیر یہ قلب کے خادم ہیں‘ قلب کا ذرا اشارہ ہو‘ ہاتھ پیر چلنے لگتے ہیں۔ تو پوری کائنات جیسے باہر منظم ہے‘ اسی طرح اندر بھی ہے۔ قلب حاکم وبادشاہ اور ہاتھ پیر اس کے خُدّام ہیں ___ غرض تفصیل کہاں تک عرض کی جائے۔ انسان کے اندر ہوا‘ برسات‘ آگ‘ مٹی‘ پہاڑ‘ سبزہ‘ جانور‘ اور موت وحیات بھی ہے۔ سارا قصہ وہی ہے جو کائنات کے اندر ہو رہا ہے ___ انسان کی ایک صورت یہ ہے۔ جس کا آپ نے مشاہدہ کیا اور مثال دیکھی کہ آسمان سے زمین تک جتنے درجے کائنات کے ہیں‘ وہ سب اس کے اندر موجود ہیں۔ یہ اللہ کی صناعی ہے کہ جس کائنات کو لاکھوں‘ کروڑوں میل میں پھیلایا ہے‘ جب اس کو سمیٹا تو ایک ڈیڑھ گز کے انسان میں ساری کائنات کو جمع کر دیا۔

اسی واسطے علماء لکھتے ہیں کہ انسان حقیقتِ جامعہ ہے‘ یعنی اتنی جامع حقیقت ہے کہ وہ سارے کمالات اس کے اندر جمع ہیں جو پوری کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں۔

انسان میں خالقِ کائنات کے نمونے

پھر یہی نہیں کہ اس میں فقط کائنات ہی کے نمونے ہوں۔ غور کیا جائے تو خالق کائنات کے نمونے بھی انسان ہی میں جمع ہیں۔ ایسے نمونے جمع ہیں کہ اگر ہم انہیں سامنے رکھیں تو ان نمونوں سے خدا تعالیٰ کی

ذات، صفات اور کمالات سب عیاں ہو جائیں۔ ہمیں کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر ہم اپنے اندر غور کریں، تو خدائی کمالات بھی ہمارے اندر سے ابھریں گے۔

آپ غور کیجئے کہ آپ کے بدن کی یہ ساری کائنات کس چیز سے سنبھلی ہوئی ہے، یہ روح ہی سے سنبھلی ہوئی ہے، اگر روح نکل جائے، تو ساری کائنات بکھر جائے۔ مٹی بکھر کر مٹی میں جا ملے گی، پانی پانی میں، آگ، آگ میں، اور ہوا، ہوا میں رل جائے گی، ساری کائنات ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ روح ایک مُدبّرِ اعظم ہے، جس نے قیّومیت کر رکھی ہے۔ ساری کائنات کو سنبھال رکھا ہے ___ ہم اس کو سامنے رکھ کر دلیل پکڑ سکتے ہیں کہ جب ہماری کائنات بدن کو سنبھالے رکھنے کے لئے ایک قیوّم کی ضرورت ہے، اسی طرح اس پوری کائنات کا ایک مُدبّرِ اعظم ہے، جس نے پوری کائنات کو سنبھال رکھا ہے۔ تو خدا کے وجود پر دلیل ہمیں اپنے اندر سے مل جاتی ہے۔

آپ غور کیجئے آپ کا بدن سرخی مائل ہے۔ چہرے پر سرخی اور بالوں پر سیاھی ہے۔ تو بدن پر کہیں سفیدی، کہیں سرخی، کہیں سیاہی، غرض بدن پر مختلف رنگ ہیں۔ یہ سارے رنگ روح کی وجہ سے قائم ہیں، لیکن روح کا کوئی رنگ نہیں، وہ ہر رنگ سے بَری وبالا ہے ___ اسی طرح سے ہم کہیں گے کہ اس کائنات میں ہزاروں رنگ ہیں۔ انسان کے مختلف رنگ ہیں۔ درخت سبز، پھول سرخ ہیں۔ ان سارے رنگوں کو اس روحِ اعظم نے سنبھال رکھا ہے جس کو ذاتِ خداوندی کہتے ہیں، اور خود ہر رنگ سے بَری وبالا ہے، لیکن ہر رنگ کو جلوہ دے رکھا ہے۔ تو خدا کے وجود کی دلیل اپنے اندر سے ملتی ہے۔

نیز اس پر غور کریں کہ آپ کے اس بدن کے اندر کسی کو جانے کا موقع دیا جائے اور آپ کے اندر گھس کے وہ خوب سیر کرے۔ آپ اس سے پوچھیں کہ بھئی! روح کہاں کو بیٹھی ہوئی ہے، ہاتھ پیر، دماغ یا دل میں ؟ وہ یوں کہے گا کہ مجھے تو ہر ہر ذرّے میں روح کا جلوہ نظر آتا ہے۔ میں (کسی خاص عضو کی طرف) اشارہ نہیں کر سکتا کہ روح وہاں بیٹھی ہے۔ جب روح، ایک مخلوق کا، یہ عالم ہے کہ بدن کے ذرے ذرے میں اس کا جلوہ پھیلا ہوا ہے۔ تو اس پوری کائنات میں روحِ اعظم اور جلوۂ خداوندی ہر جگہ پھیلا ہوا ہو۔ اور اشارہ نہ کیا جا سکے کہ وہاں ہے، یا یہاں ہے، اس میں کون سے تعجب کی بات ہے؟ یہ اللہ کی شان ہے کہ وہ سمت اور جہت میں نہیں۔ انگلی سے اس کی طرف اشارہ نہیں کر سکتے۔ وہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی جہت اور سمت میں مقید ہے۔ وہ لامحدود ذات ہے، مگر اس نے اپنا نمونہ روح کو بنادیا...... کہ روح کو آپ کسی خاص عضو میں مقید نہیں بتا سکتے۔ ہاں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کو بدن کے بعض حصوں سے خاص تعلق ہے۔ جلوہ تو ہر جگہ ہے، مگر تعلقات الگ الگ ہیں۔ روح کو جو تعلق قلب سے ہے، وہ دماغ سے نہیں۔ جو دماغ سے ہے، وہ پیٹ سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر قلب میں سوئی بھی چبھو دی جائے، تو آدمی مرنے کو ہو جاتا ہے۔ روح دوڑنے لگتی ہے کہ میں نہیں ٹھہرتی۔ دماغ کو توڑ دیا جائے، روح باقی نہیں رہے گی۔ ہاتھ پیر کو کاٹ لیا جائے، روح باقی رہے گی۔ اگرچہ آدمی ناقص ہو جائے گا۔ ناخن اور بال کاٹ دو تو کوئی اذیت نہیں ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے روح کو جو تعلق قلب سے ہے، دوسرے اعضاء سے وہ تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح اس کائنات میں اللہ کا جلوہ ہر جگہ موجود ہے مگر جو تعلق بیت اللہ سے ہے وہ آپ کی مسجدوں سے نہیں ہے۔ جو آپ کی مسجدوں سے ہے وہ آپ کے گھرانوں سے نہیں ہے جو آپ کے گھرانوں سے ہے وہ ویران جنگلوں سے نہیں ہے۔ تو جلوہ ہر جگہ ہے مگر تعلقات الگ الگ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بیتُ اللہ کے بارے میں اگر کوئی گستاخی کا کلمہ بھی کہہ دے تو پورے عالَم میں شور مچ جاتا ہے، جیسے عالَم تباہ ہونے کے قریب آگیا۔ مسجد پر اگر کوئی حملہ کردے، تو اس مقام کے مسلمانوں میں بے

چھنی پھیل جاتی ہے‘ اگر آپ کے گھر پر کوئی حملہ کردے تو آپ اور آپ کے خاندان والے پریشان ہوں گے۔ یہ نہیں کہ سارا شہر بے چین ہو جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ سے اللہ کو جو تعلق ہے وہ اتنا بڑا ہے کہ پوری کائنات پر پھیلا ہوا ہے۔ سارے انسان بے چین ہو جائیں گے۔ مسجد اور عام گھروں سے وہ تعلق نہیں ـــــ تو تعلق درجہ بدرجہ ہے مگر جلوہ ہر جگہ موجود ہے۔ اس لئے اللہ کے جلوے اور اس کی تجلّیات کا ہر جگہ موجود ہونا‘ اور اس کے تعلقات میں فرقِ مراتب ہونا‘ آپ کو اپنے اندر سے اس کی دلیل مل جاتی ہے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں۔

نیز آپ غور کریں کہ آپ روح سے زندہ ہیں۔ تو ایک روح سے زندہ ہیں‘ یا دو روحیں کام کر رہی ہیں؟ ظاہر بات ہے کہ ایک ہی روح ہے۔ اگر دو روحیں ہو جائیں‘ بدن پھٹ کر خراب ہو جائے‘ ایک روح کہے گی میں بدن کو بھوک لگانا چاہتی ہوں‘ دوسری کہے گی میں ہرگز نہیں چاہتی۔ ایک روح کہے گی سردی لگنی چاہیے‘ دوسری روح کہے گی گرمی لگنی چاہئے۔ تو روحوں کو لڑائی سے فرصت نہیں ہوگی۔ بدن کی تربیت کون کرے گا؟ بدن خراب خستہ ہو کر تباہ ہو جائے گا۔ ایک ہی روح کام کر سکتی ہے۔ دو روحیں ہوں تو بدن کا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔

یہی صورت اس کائنات کی ہے کہ :

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا

اگر کائنات میں دو خُدا ہوں تو کائنات چل نہیں سکتی۔ ایک خدا کہے گا میں فلاں کو بیٹا دینا چاہتا ہوں‘ دوسرا خدا کہے گا میں اس کو بانجھ رکھنا چاہتا ہوں۔ ایک کہے گا میں فلاں قوم کو عزّت‘ اور دوسرا کہے گا کہ میں اس کو غلام بنانا چاہتا ہوں۔ دونوں خداؤں کو لڑائی سے فرصت نہیں ہوگی۔ کائنات کون چلائے گا؟ یہ بات الگ رہی کہ دو خدا ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن اگر معاذ اللہ مان لیا جائے تو کائنات برقرار نہیں رہ سکتی۔ جیسے بدن میں دو روح ہوں کائنات بدن باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ تو ایسا ہوگا جیسے ایک میان میں دو تلواریں ڈال دیں‘ اور ایک شیروانی میں دو آدمی گھس جائیں‘ شیروانی پھٹے گی نہیں تو اور کیا ہوگا؟ تو ایک کائنات یا پچاس مخلوقات ایک ہی خالق سے چلتی ہیں۔

اور اگر یوں مان لیا جائے کہ دونوں خدا آپس میں صلح کرلیں۔ معلوم ہوا ایک دوسرے سے دَب گیا‘ تو جو ذلیل ہو‘ وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ خدا وہ ہے جو سب چیزوں پر غالب اور قوی ہو‘ جو لڑائی سے بچنے کے لئے دوسرے سے کہے کہ صلح کرلو‘ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں دوسرے سے خوف موجود ہو‘ جس میں خوف ہو‘ وہ خدا تھوڑا ہی ہے۔ خدا وہ ہے کہ سارے اس سے ڈریں‘ وہ خود ڈر اور خوف سے بالاتر ہو ـــــ نہ صلح کے اصول کو سامنے رکھ کر‘ اور نہ ہی فساد کو سامنے رکھ کر دو خدا نہیں مانے جاسکتے‘ تو اللہ کی توحید اور یکتائی کی دلیل آپ کے اندر سے آپ کو مل رہی ہے۔ آپ کو باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ خود آپ کے اندر اللہ کی ذات‘ توحید‘ اس کی یکتائی‘ اس کی صفات کے سب نمونے آپ کے اندر سے نکل آتے ہیں‘ اور ثابت ہو جاتا ہے کہ بے شک کائنات میں کوئی مُدبّرِ اعظم ہے ـــــ اور یہ تخیّل کہ معاذ اللہ خدا نہیں ہے۔ اور کائنات خود ہی چل رہی ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص یوں کہے کہ میرے اندر روح نہیں ہے۔ یہ بدن ایسا ہی چل رہا ہے۔ اگر کوئی دہریہ اس کائنات کے اندر خدا کا منکر ہے‘ اسے اپنے اندر روح کا بھی انکار کرنا چاہئے۔

اور جس طرح سے آپ کی روح‘ بدن کے خطّے خطّے سے واقف ہے۔ آپ کے اندر شعور ہے کہ وہ جانتی

ہے کہ یہ میرا ناخن' بال' پیٹ ہے' نیز یہ کہ اس وقت پیٹ میں گڑبڑ ہو رہی ہے۔ یہ اسے علم ہوتا ہے۔ اس وقت پیٹ اچھا ہے' تو کائنات بدن کے ذرّے ذرّے سے روح واقف ہے' اگر واقف نہ ہو تو نظم کیسے چلائے' اگر روح کو پتہ ہی نہ چلے کہ بخار چڑھ رہا ہے' تو دُور کرنے کی اسے فرصت کہاں ہوگی؟ اسی طرح اس کائنات کے ذرّے ذرّے کا علم اللہ کی ذات کو ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ حق تعالیٰ نہ جانیں کہ کائنات میں کیا ہو رہا ہے۔ اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ۔ جو پیدا کر رہا ہے' کیا وہ معاذ اللہ لاعلم ہوگا ___ ؟ پیدا کرنے والا ہی مخلوق کے ذہن' صفات اور اَحوال کو جانتا ہے' تو اللہ کے لامحدود علم کی نظیر ہمارے اندر موجود ہے۔ تو اللہ نے انسان کو ایسا جامع بنایا کہ اگر وہ اپنے اندر خدائی کمالات دیکھنا چاہے تو اپنے آئینے کے اندر دیکھ لے۔ اس کو سارے خدائی نمونے نظر آجائیں گے۔

سَنُرِیۡهِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ

ہم عنقریب حق کی نشانیاں انسانوں کو باہر ان کی جانوں کے اندر بھی دکھلائیں گے' تاکہ واضح ہو جائے کہ اللہ ہی حق و ثابت ہے' اور وہی کائنات کا چلانے والا ہے ___ تو منطقی دلیلیں الگ رہیں' یہ مشاہدے کی دلیلیں ہیں کہ آدمی اپنے اندر غور و فکر کر کے خدائی کمالات کو پہچان لے۔

میرے عرض کرنے کا حاصل یہ نکلا کہ خالق اور مخلوق کے نمونے سارے ہمارے اندر موجود ہیں۔ تو انسان ایک عجیب چیز نکلی کہ اس میں دونوں نمونے جمع ہیں۔

نمونۂ کائنات ہونے کی نسبت سے انسان کا فریضہ

اس واسطے انسان پر دوہی فرائض عائد ہوں گے' ایک ایسا فریضہ جو مخلوق ہونے کے مناسب' اور ایک فریضہ ایسا جو خالق کے نمونوں کے مناسب ہے۔

نمونۂ مخلوق ہونے کا فریضہ کیا ہے؟ ___ جس مخلوق کو خدا وجود دے' وہ اپنی پیدائش میں خالق کی محتاج ہے اور بقا میں بھی۔ تو ہر قدم پر ہم خدا کے محتاج ہیں' محتاج کا کام غنی کے سامنے کیا ہوتا ہے؟ محتاج کا کام یہ ہے کہ وہ غنی کے سامنے جھکے' اور اس کے آگے سجدہ کرے۔ اس لیے کہ اگر ہمارے پاس سب کچھ ہو' تو ہمیں اس سے مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تبھی حاجت مندی اس کے سامنے لے جاتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ موجود نہیں۔

ایک فقیر آپ سے تبھی سوال کرے گا اس کے پاس دولت نہ ہو' اگر اس کے پاس دولت ہو' اسے سوال کرنے کی کیا ضرورت پڑی؟ تو محتاج ہاتھ پھیلاتا ہے' غنی نہیں ___ زندگی ہمارے قبضے میں نہیں تھی۔ ہم نے ہاتھ پھیلایا کہ اے اللہ! ہمیں زندگی عطا کر' اس نے دے دی۔

زندگی آنے کے بعد اس کا باقی رکھنا ہمارے قبضے میں نہیں' اگر ہمارے قبضے میں ہوتا' تو ہم کبھی نہ مرتے۔ مگر مرنا پڑتا ہے۔ معلوم ہوا ہمارے ہاتھ میں زندگی نہیں۔ ہم دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ ہماری زندگی طویل کردے۔ عملی دعا مانگتے ہیں۔ یعنی ان اسباب کو اختیار کرتے ہیں جن سے زندگی باقی رہے' کھاتے' پیتے' دوائیں استعمال کرتے ہیں۔ یہ عملی دعا ہے۔ اور زبان سے بھی کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں زندہ رکھ۔ یہ کیوں مانگتے ہیں؟ محتاجگی ظاہر کرنے کو' کہ وہ غنی ہے' ہم محتاج ہیں۔ محتاج کا کام جھکنا ہے۔ تو مخلوق خالق کی محتاج ہوتی ہے۔ اس کا فریضہ ہے کہ وہ جھکے۔

اور جھکنا بھی معمولی درجے کا نہیں' بلکہ انتہا درجے کا جھکنا ہے' یعنی ایسی ذلت ظاہر کرے' کہ ایسی

ذِلّت کسی کے آگے ظاہر نہ کر سکے۔ اس لئے کہ خالق وہ ہے کہ اس کی عزّت کی کوئی انتہاء نہیں۔ تو اس کے سامنے ذِلّت بھی ایسی پیش کرنی چاہئے کہ اس ذِلّت کی بھی کوئی انتہاء نہ ہو۔ اس انتہائی ذلّت کو پیش کرنے کا نام 'اسلام کی زبان میں عبادت ہے۔ عبادت غایتِ تذلّل کو کہتے ہیں ___ اور اگر آپ غور کریں تو یہ انتہائی ذلّت آدمی نماز میں ہی ظاہر کر سکتا ہے کسی اور عبادت سے ظاہر نہیں کر سکتا _____ اس لئے کہ انتہائی تذلّل کی جتنی شانیں ہیں' وہ ساری نماز کے اندر موجود ہیں۔ نوکروں کی طرح ہاتھ باندھ کر گردن جھکا کر کھڑے ہونا۔ پھر اتنی ذِلّت پر قناعت نہیں' رکوع کر کے گردن جھکا دی' اور زیادہ ذلّت کا اظہار کیا پھر اسی پر قناعت نہیں' سب سے زیادہ عزّت کی چیز انسان میں ناک اور پیشانی ہے' اسے سجدے میں جا کر زمین پر رگڑتا ہے کہ اے اللہ! تیری عزّت کے سامنے میں اپنی انتہائی ذلّت پیش کرتا ہوں۔ پھر اسی پر بس نہیں' اخیر میں بھیک مانگتا ہے کہ اے اللہ! مجھے نیکی دے' رزق دے' وغیرہ وغیرہ ___ بھیک مانگنے سے زیادہ کسی چیز میں ذلّت نہیں ہوتی۔ تو سجدے کے بعد آخیر میں دعائیں مانگی جاتی ہیں ___ تو مقصود یہ نکلا کہ مخلوق اپنے خالق کے آگے جھکے۔ انتہائی ذلّت کا اظہار کرے' اور وہ نماز کے اندر ہوتی ہے۔ تو نماز کا فریضہ عائد ہوا' جس سے آدمی عبادت کر سکتا ہے۔ نماز کے سوا حقیقۃً عبادت کی کوئی چیز نہیں ہے جس سے عبادت کی جا سکے۔ اس لیے کہ عبادت کے معنیٰ انتہائی ذلّت پیش کرنے کے ہیں' یہ نماز ہی میں ہے اور کسی عبادت میں نہیں ہے۔ مثلاً آپ زکوٰۃ' یا صدقہ دیں' یہ حقیقی طور پر عبادت نہیں' اس میں ذلّت کا اظہار تھوڑا ہی ہے' اس میں اللہ کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا ہے کہ جیسے اللہ مخلوق کو دیتا ہے' آپ بھی غریب کو دیتے ہیں۔ تو دینا اور احسان کرنا ذلّت نہیں' بلکہ انتہائی عزّت کی بات ہے' یہ خدائی کام ہے' تو زکوٰۃ وصدقہ دینا اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ چونکہ اللہ نے حکم دیا' ایسا کرو' تعمیل حکم کی وجہ سے اس میں عبادت کی شان پیدا ہو گئی۔ ورنہ اپنی ذات سے عبادت نہیں۔

اسی طرح آپ روزہ رکھیں۔ روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ اس لئے کہ روزے کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپ کھانے' پینے اور بیوی سے بے نیاز۔ سب سے مستغنی۔ تو یہ شان اللہ کی ہے کہ کھانے' پینے اور بیوی سے بَری وبالا ہے۔

اللہ سے مشابہت پیدا کرنا' یہ ذلّت کی بات تھوڑا ہی ہے۔ تو روزہ عینِ عزّت ہے' پھر بھی روزہ عبادت بنا' اس لیے کہ حکم ہے کہ روزہ رکھو' تعمیلِ حکم کی وجہ سے عبادت بن گیا ___ ہم سچ بولنے کو عبادت کہتے ہیں' لیکن سچ بولنا اپنی ذات سے عبادت نہیں' کیونکہ سچ بولنا اللہ کا کام ہے۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلاً اللہ سے زیادہ کس کا قول سچا ہے۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثاً اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی۔ جو سچ بولے' وہ ذلّت کا کام تھوڑا ہی کر رہا ہے۔ وہ تو انتہائی عزّت کے مقام پر ہے۔ عبادت اس لئے بنا کہ حکمِ خداوندی ہے کہ سچ بولو' جھوٹ مت بولو۔ تعمیلِ حکم کی وجہ سے اس میں شانِ عبادت پیدا ہو گئی۔ ان تمام چیزوں میں کوئی چیز اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ یہ نیّت اور مقاصد کی وجہ سے عبادت بن گئی ہیں۔ لیکن نماز میں جتنے افعال ہیں' ان میں اپنی ذات کی وجہ سے اظہارِ ذلّت ہے۔ کھڑے ہونا' جھک جانا' سجدہ کرنا' دعائیں کرنا' بھیک مانگنا سب ذلّت کا اظہار ہے' اس لیے اپنی ذات سے جو چیز عبادت ہے' وہ صرف نماز ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نماز اللہ نے فقط انسان پر نہیں' کائنات کے ذرّے ذرّے پر فرض کی ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا :

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ

ہر چیز نے اپنی نماز اور تسبیح پہچان لی ___ معلوم ہوا درخت' پہاڑ' جانور سبھی نماز پڑھتے ہیں۔ سب پر نماز واجب ہے ___ فرق اتنا ہے کہ انسان کو خطاب کیا گیا ہے' کیونکہ اس میں عقل ہے' اور مخلوقات کو خطاب نہیں کیا گیا۔ مگر بنایا ایسے کہ گویا وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ جیسے علماء لکھتے ہیں کہ جتنے درخت ہیں' ان کی نماز میں قیام ہے' رکوع وسجدہ نہیں۔ گویا ایک پیر پر کھڑے ہوئے نماز میں مصروف ہیں۔ رکوع سجدے کی اجازت نہیں ہے۔ چوپائے' جو چار پیروں سے چلتے ہیں' ان کی نماز میں رکوع ہے۔ ان کو ایسی ہیئت سے اللہ نے بنایا کہ وہ ہر وقت رکوع میں ہیں' سجدہ وقیام ان کی نماز میں نہیں ہے۔ پہاڑوں کو اس طرح بنایا' جیسے آدمی تشہد میں بیٹھتا ہے۔ گویا پہاڑ زمین پر گھٹنے ٹیکے ہوئے التحیات میں مصروف ہیں' ان کی نماز میں قعدہ ہے۔ قیام' رکوع' سجدہ نہیں ہے۔ حشرات الارض جیسے سانپ بچھو' ان کی نماز میں سجدہ ہے نہ رکوع ہے نہ قیام۔ یہ گویا ہر وقت اوندھے پڑے ہوئے اللہ کے سامنے سجدے میں مصروف ہیں۔ چاند' سورج یا آجکل کے قول کے مطابق زمین گردش میں ہے۔ یہ گردش سے اللہ کی عبادت کررہے ہیں۔ حرکت دَوری ان کی نماز ہے۔ اسی طرح سے جنت ودوزخ کی نماز دعا مانگنا ہے۔ حدیث میں ہے کہ جنت یہ سوال کررہا ہے اے اللہ! قیامت کے دن مجھے بھر دیجئے۔ میرے محلات خالی نہ رہیں۔ جہنم بھی کہہ رہا ہے کہ مجھے بھر دیجئے۔ اور اللہ کا وعدہ ہے' قیامت کے دن دونوں کو بھر دیا جائے گا۔ وعدہ پورا کیا جائے گا۔ جب تک نہیں بھریں گے' جہنم پکارتا رہے گا۔ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ، هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ___ چاند' سورج' پہاڑ' دریا' مٹی' سب جھونک دیئے جائیں گے۔ پھر بھی وہ کہے گا هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ___ جب ان سب چیزوں سے نہیں بھرے گا' تو حدیث میں ہے حق تعالیٰ جہنم کے منہ پر پیر رکھ دیں گے' جیسا پیر ان کی شان کے مناسب ہے۔ اس وقت کہے گا کہ بس! بس! اب میں بھر گیا' اور وعدہ پورا ہو گیا۔

جنت میں سارے جنتی داخل ہو جائیں گے۔ پھر بھی اس کے شہر اور بستیاں خالی رہ جائیں گی' تو ایک مستقل مخلوق پیدا کی جائے گی۔ جس سے جنت آباد کی جائے گی۔ تو جنت وجہنم کی نماز دعا مانگنا ہے ___ فرشتوں کی نماز صف بندی ہے کہ صفیں باندھ کر کھڑے رہیں ___ انسان اور بالخصوص مسلمان کی نماز ساری کائنات کی نمازیں اللہ نے جمع کردیں۔ درختوں کا سا قیام' چوپایوں جیسا رکوع' حشرات الارض جیسا سجدہ' جنت وجہنم جیسی دعا' پہاڑوں جیسا تشہد' فرشتوں کی سی صف بندی' اور چاند وسورج یا زمین کی گردش بھی نماز میں ہے ___ اس واسطے کہ کوئی نماز دو رکعت سے کم کی نہیں۔ دو' تین یا چار رکعت کی ہے۔ آپ ایک رکعت پڑھ کے کیا کام کرتے ہیں؟ جو کام پہلی رکعت میں کیا تھا' وہی کام دوسری' تیسری اور چوتھی میں کرتے ہیں ___ وہی الحمد' سورت' اور تسبیحات وغیرہ۔ اس لئے گردش اور دوران نماز کے اندر ہے۔

جیسے انسان کو اللہ نے ایک جامع حقیقت بنایا' عبادت بھی جامع دی۔ آپ کی عبادت میں ساری کائنات کی عبادتیں جمع ہو گئیں۔ اس سے دین کا کمال بھی واضح ہوتا ہے۔

پچھلے ادیان میں ایسی نمازیں نہیں تھیں۔ کسی قوم کو فقط سجدے' کسی کو فقط قیام' کسی کو فقط رکوع کی نماز دی گئی۔ لیکن اسلام کی نماز میں ساری قوموں کی نمازیں جمع ہیں۔ ساری اقوام اور ساری مخلوقات کی نمازیں جمع ہو گئیں' تو نماز ایک جامع ترین عبادت ہے' بلکہ نماز ہی عبادت ہے' اور چیزیں تعمیل حکم کی وجہ سے عبادت بن جاتی ہیں' تو انسان پر ایک فریضہ جو عائد ہوتا ہے' وہ نماز کا ہے۔ اس لئے کہ جب وہ مخلوقات کے سارے نمونے اپنے اندر رکھتا ہے' تو سارے نمونوں کی ذلت وعبادت اللہ کے سامنے پیش کردینا' اس کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے انسان کی زندگی کا ایک مقصد تو عبادت ہے۔

نمونۂ کمالاتِ خداوندی ہونے کی نسبت سے اِنسان کا فریضہ

اب یہی انسان جیسے مخلوق کے نمونے رکھتا ہے‘ خالق کے نمونے بھی رکھتا ہے۔ اس پر یہ فریضہ بھی عائد ہوا کہ جو کام خالق کرتا ہے‘ یہ بھی وہ کرے۔ خالق کا کام کیا ہے؟ اپنی مخلوق کو پالنا‘ اس کی تربیت کرنا‘ اس کو ہدایت کرنا‘ اس نے رزق پیدا کیا‘ تاکہ مخلوق پلے‘ اس نے مخلوق کو تعلیم دی‘ تاکہ اپنے بھائیوں پر رحم کرے‘ جیسے میں رحم کرتا ہوں۔ جیسے میں تمہیں راستہ دکھاتا ہوں تم اپنے بھائیوں کو دکھاؤ۔ جیسے میں تمہاری تربیت کررہاہوں تم بھی اپنے بچوں اور عیال کی تربیت کرو۔ یعنی میری طرف سے نائب بن کروہ کام کرو‘ جو میرے کام ہیں۔ میں مدبّر ہوں‘ تم بھی تدبیر کرو۔ میں موجد ہوں‘ تم بھی دنیا میں ایجادیں کرو‘ میرا کام ہدایت دینا ہے‘ تم بھی دنیا کے لئے ہادی بنو۔ میرا کام احکام جاری کرنا ہے‘ تم بھی میرے نائب بن کر احکام جاری کرو۔

حاصل یہ نکلا کہ ایک فریضہ انسان پر عبادت کا‘ اور ایک فریضہ خلافت کا عائد ہوتا ہے۔ ایک طرف جھک کر عبادت کرے گا‘ اور ایک طرف تختِ خلافت پر بیٹھ کر اللہ کا نائب بن کر اس کی کائنات میں تصرّفات کرے گا۔ ملکوں کو فتح کرے گا۔ دنیا میں ہدایت پھیلائے گا‘ اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے گا۔ یہ اللہ کا کام ہے‘ لیکن نائب بن کر یہ بھی کرے گا۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں اللہ کے نائب بن کر آتے ہیں‘ اور ہدایت کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ کائنات کے مربّی ہیں۔ تو انبیاءؑ بھی مخلوق کی روحوں کی تربیت کرتے ہیں۔ اللہ معلّم ہے جو انبیاءؑ کو تعلیم دیتا ہے‘ اس لئے انبیاءؑ بھی تعلیم دیتے ہیں‘ تاکہ دنیا میں علم پھیل جائے۔ اللہ کے احکام جاری کرتے ہیں۔ قصاص لیتے ہیں‘ شراب خوری پر درے لگاتے ہیں۔ تو انبیاءؑ اللہ کے اوّلین نائب ہیں۔ پھر انبیاءؑ کے نائب ان کے صحابہؓ ہوتے ہیں‘ پھر صحابہؓ کے نائب تابعینؒ ہوتے ہیں۔ تابعینؒ کے نائب تبع تابعینؒ ہوتے ہیں۔ آخر تک سلسلہ پہنچ جاتا ہے۔ علماءِ ربّانی‘ مشائخِ حقّانی‘ اور سچے درویش وصوفی‘ جو مخلوق کو سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔ یہ خلافت کا کام ہے۔ حضرات خلفائے راشدینؓ نے سلطنت بھی کرکے دکھائی‘ خلافت کی گدی پر بیٹھ کر ملکوں کو بھی فتح کیا‘ مگر ملکوں پر اس لئے قبضے نہیں کئے کہ ان سے کچھ کھانا پینا مقصود تھا‘ اس لئے فتح کیا تاکہ مخلوق کو سیدھے راستے پر چلائیں۔ ان کو خدا کے قانون پر چلائیں۔ انہوں نے اللہ ورسول کے نائب بن کروہ کام کئے جو اللہ کا منشاء تھے۔ دن بھر خلافت کے کام سرانجام دیتے‘ جب وقت آتا تو مسجد میں جاکے سجدے کرتے‘ اور عبادت کا کام سرانجام دیتے‘ تو ایک طرف عبادت اور ایک طرف خلافت کررہے ہیں۔

اس لئے صحیح معنوں میں انسان وہ ہے جو اپنی ذات کو اپنے پروردگار کے سامنے جھکادے‘ اور عبادت میں آگے بڑھے‘ کہ اس کی ناک‘ پیشانی‘ ہاتھ‘ پیر‘ اس کی روح اور خیال بھی اللہ کے سامنے ذلیل بن کر جھک جائے۔ یہ کام اپنی ذات کے لئے ہوگا‘ یہ عبادت ہے‘ دوسرا فریضہ یہ ہے کہ تختِ خلافت پر بیٹھ کردنیا سے برائیوں کا خاتمہ کرے۔ اس لئے نہ فقط عبادت اور نہ فقط خلافت مقصد زندگی ہے بلکہ دونوں مقصود ہیں۔

ہمارے سب کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے پیدا کیا‘ تو سب سے پہلے ملائکہ سے یہی بات فرمائی اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً میں زمین میں اپنا ایک نائب اُتارنے والا ہوں۔ آدم علیہ السلام نائب کس چیز میں تھے؟ عبادت میں تو نائب نہ تھے‘ عبادت اللہ کا کام تھوڑا ہی ہے‘ وہ تو معبود ہے۔ عبادت سے بری ہے‘ عابد نہیں ہے۔ لیکن عالَم کو درست رکھنے‘ اس کی تربیت اور اصلاح کے لیئے خلافت دی‘ مگر یہ خلافت وہ انجام دے گا‘ جو پہلے عبادت کرکے اپنے آپ کو درست کرے۔ پہلے اللہ کے سامنے جھک کر اپنے اخلاق درست کرے اپنے اندر نیاز مندی اور بندگی کی شان پیدا کرلے۔ اس میں تواضع وخاکساری و للّٰہیت بھی ہو‘

نہ غرور و تکبر رہے' نہ حرص ولالچ رہے' بلکہ اس میں غنا اور ایثار ہو۔ مخلوق کی خدمت کا جذبہ اس میں ہو۔ یہ جذباتِ عبادت کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ عبادت کرکے جب جذبات پیدا ہوگئے۔ اب وہ نائبِ خدا بن گیا' اب وہ دوسروں کی اصلاح کرے گا ___ تو مقصد زندگی دو چیزیں نکل آئیں۔ ایک عبادت دوسرے خلافت۔

تکمیلِ ایمان کے لئے عبادت وخلافت دونوں ضروری ہیں

اسی واسطے ایمان کے دو رکن فرمائے گئے التعظیم لِاَمر اللّٰہ والشفقۃ علٰی خلق اللّٰہ اللہ کے امر کی تعظیم کرنا' اس کے سامنے جھک جانا۔ دوسرے اس کی مخلوق پر شفقت اور اس کی خدمت کرنا۔ دونوں باتوں سے مِل کر ایمان بنتا ہے۔ ایک شخص چوبیں گھنٹے مسجد میں رہے' مخلوق چاہے جیئے یا مرے' اسے کوئی پرواہ نہیں۔ اس کا آدھا ایمان ہے۔ اور ایک شخص رات دن مخلوق کی خدمت میں انجمنوں کے ذریعے لگا ہوا ہے۔ مگر مسجد میں جانے کا نام نہیں لیتا' اس کا آدھے سے بھی کم ایمان ہے۔ اس لئے کہ خلافت کا کام تو انجام دیا مگر عبادت چھوڑ دی۔ انسان مکمل تب ہوگا' جب ایک طرف عابد وزاہد ہو' اور ایک طرف خلیفۂ خداوندی ہو۔ ایک طرف وہ کام کرے جو مخلوق کے کرنے کا ہے' وہ عبادت ہے۔ ایک طرف وہ کام کرے جو خالق کا ہے' وہ تربیت ہے ___ انبیاء علیہم السلام کی یہی زندگی ہے' راتوں کو دیکھو تو تہجد پڑھتے پڑھتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر وَرم آجاتا تھا۔ دنوں میں دیکھو تو مخلوق کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ہدایت و تبلیغ فرمارہے ہیں۔ دنیا کے بادشاہوں کے نام خطوط جاری فرمارہے ہیں' جن میں اسلام کی دعوت دی جارہی ہے۔ سفر فرمارہے ہیں' کبھی طائف میں ہیں' کبھی مدینہ میں ہیں' تاکہ خلقِ خدا نیک راستے پر آجائے۔ یہ خلافت کا کام ہے ___ مسجدِ نبوی میں جس طرح سے آپ نماز پڑھتے' اسی طرح سے آپ مقدمات کے فیصلے بھی فرماتے' مسجد میں جیسے عبادت ہوتی' ویسے ہی درس وتدریس کے ذریعے تعلیم بھی ہوتی' یہ خلافت کا کام تھا۔ نماز پڑھنا' تلاوت کرنا' سجدے کرنا' یہ عبادت کا کام تھا۔

یہی شان صحابہ کرامؓ کی ہے کہ ایک طرف تختِ خلافت پر بیٹھ کر مخلوق خدا کی اصلاح' ایک طرف بوریا اور چٹائی پر بیٹھ کر اللہ کے سامنے عجز ونیاز سے سر جھکا دینا۔

فارس میں جب جنگ ہوئی ہے تو صحابہ کرامؓ کی تعداد کل تیس یا تینتیس ہزار تھی۔ فارسیوں کا تین لاکھ کا لشکر تھا' پھر فارس کی فوجیں کیل کانٹے سے مسلح' وردیاں' غذائیں اور رسد ان باقاعدہ۔ یہ تو اہلِ فارس کی شان۔ اور ادھر صحابہ کرامؓ محض درویشوں کا ایک لشکر۔ وردی تو یہ ہے کہ کسی کے پاس کرتہ ندارد ہے' تو کوئی لنگی باندھے ہوئے ہے' کسی کے پاس لمبا کرتہ' کسی کے سر پر پگڑی نہیں تو رسی باندھ رکھی ہے' کسی کے ہاتھ میں نیزہ' کسی کے ہاتھ میں تلوار' کسی کے ہاتھ میں خنجر۔ ہتھیار' لباس نہ غذائیں کچھ بھی باقاعدہ نہیں۔ درویشوں کا لشکر ہے۔ مگر کیفیت یہ تھی۔ لاکھوں فارسی آتے تھے' اور یہ غالب تھے۔ پورے فارس میں ایک تہلکہ مچ گیا ___ فارس کا سب سے بڑا سپہ سالار رستم تھا۔ آپ نے رستم پہلوان کا نام سنا ہوگا' وہ کمانڈر انچیف تھا' اس نے تمام سرداروں اور لیفٹیننٹوں کو جمع کیا' اور کہا کہ یہ غضب کی بات ہے کہ ہمارا لشکر تین لاکھ' اور عرب کے بدّو' کل تیس ہزار' پھر ان کے پاس سامان باقاعدہ نہیں' ہمارے پاس سامان باقاعدہ' انہیں مدد نہیں پہنچ رہی' ہمارے پیچھے پورا ملک ہے۔ یہ ہمارے ملک میں حملہ کرنے آئے ہیں۔ ان کا ملک دور رہ گیا' یہ ہمارے ملک میں گھرے ہوئے ہیں' مگر اس کے باوجود وہ حملہ کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بھوکے شیر ہیں' اور تم فارسی اس طرح سے بھاگتے ہو جیسے لومڑیاں بھاگتی ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے؟ تمہارے پاس کس چیز کی

کمی ہے ــــــ سرداروں نے کہا اے رستم! اگر آپ سچی بات پوچھیں، ہم بتلادیں، مگر ہماری جان کی بخشش کردی جائے، امان دیا جائے کہ ہمیں قتل تو نہیں کیا جائے گا ــــــ اس نے کہا تمہاری جان کو امان دی جاتی ہے۔

اب سرداروں نے مل کر کہا، اے رستم! یہ مٹھی بھر عرب تیرے ملک پر غالب آکر رہیں گے، انہی کا قبضہ ہوگا، انہی کی حکومت ہوگی۔ پورا ایران ان کے تحت میں آئے گا۔ یہ نہیں ہاریں گے، تم ہاروگے ــــــ رستم نے کہا کیوں؟ انہوں نے کہا۔ اس وجہ سے کہ ان کی شان یہ ہے۔ **ھم باللیل رھبان وبالنھار فرسان** دن بھر یہ گھوڑے کی پشت پر سوار جہاد میں مصروف ہیں، اور رات میں مصلّے کی پشت پر سوار ہیں، اللہ کے آگے گڑگڑاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اے مالک! ہم میں کوئی طاقت نہیں، طاقت والا تو ہے، ہم تیرے سپاہی ہیں، تو اگر ہمیں فتح دے گا، تو ہم فتح یاب ہو جائیں گے۔ تو ہمیں شکست دے گا، شکست کھا جائیں گے۔ ہمارے اندر کوئی طاقت اور قوت نہیں۔ قوت و سلطنت تیری ہی ہے۔ تو رات بھر اللہ کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ عجز و نیاز سے سرزمین پر رگڑتے ہیں۔ اور دن کو گھوڑے کی پشت پر سوار ہوتے ہیں۔

اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ایسے بزرگ ہیں، جس گاؤں میں جاتے ہیں، اگر کھیتیاں جلی ہوئی ہوتی ہیں تو سرسبز ہو جاتی ہیں۔ یہ دوسروں کی بیٹیوں کی ایسے ہی حفاظت کرتے ہیں، جیسے اپنی بہو بیٹیوں کی کرتے ہیں۔ اور اے رستم! تیرا یہ لشکر ــــــ شرابیں یہ پیتے ہیں، جس گاؤں میں جا پڑتے ہیں، بہو بیٹیوں کی عزتیں برباد ہو جاتی ہیں۔ جس کھیتی اور باغ میں پہنچ جاتے ہیں۔ پھل اُجڑ جاتے ہیں۔ کھیتیاں سب برباد ہو جاتی ہیں، یہ آثرات تیری فوج کے ہیں۔ اور یہ انعال ان کی فوج کے ہیں۔ تو غلبہ تجھے ہوگا یا انہیں ہوگا۔؟ راتوں کو مصلّے کی پشت پر یہ عبادت میں مصروف، اور دنوں کو گھوڑے کی پشت پر سوار، اللہ کے نائب بن کر یہ دنیا کی اصلاح کے درپے۔ تو درحقیقت رستم اور اس کے سرداروں نے پہچانا کہ ان بزرگوں میں یہی دو چیزیں تھیں۔ ایک طرف یہ عبادت میں کامل اور ایک طرف خلافت میں کامل۔ ایک طرف سرنیاز اللہ کے سامنے جھکا ہوا ہے، ایک طرف اس کی مخلوق کی اصلاح کے لئے دنیا میں سفر کر رہے ہیں۔ جو مُفسِد سامنے آتا ہے، اسے راستے سے ہٹاتے ہیں، تاکہ دین پہنچ سکے، اور لوگ دین کے اوپر غور کر سکیں۔

بہرحال جب مقصد زندگی عبادت اور خلافت نکلا، سب سے بڑے عابد دنیا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور سب سے بڑے اللہ کے نائب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے، تو ان کی امت کو بھی سب بڑا عابد اور سب سے بڑا نائب خداوندی بننا چاہئے۔ یہ امت اس لیے آئی ہے کہ رات دن عبادت میں مصروف رہے، اور رات دن اللہ کی نائب بن کر اللہ کی مخلوق کی اصلاح کرے۔ یہ اِعلائے کلمۃ اللہ کے لئے اٹھے۔ اپنی زندگی اور موت کا یہ مقصد قرار دے میں چاہے جیوں یا مروں، مگر خدا کا نام اونچا ہو، تو اللہ اس قوم کو کبھی ذلیل نہیں کرے گا۔ ذلت و رسوائی جب ہوتی ہے جب کوئی خدا کے نام کو چھوڑ کر اپنی برتری چاہے، اپنے عیش کو آگے رکھے۔ خُدا کی طرف سے اس کی مدد نہیں ہوتی۔ اس پر دشمن اور اقوام مسلط کی جاتی ہیں، جو اس کو غلامی میں بھی جکڑ بند کرتی ہیں۔ لیکن جو کہے مجھے ملک و دولت مقصود نہیں، مجھے اللہ کا نام اونچا کرنا ہے۔ میری دولت، میری جان اور خاندان اس کے لئے وقف ہے، اس نصب العین کے تحت زندگی ہوگی، وہ بھی باعزت ہوگی، موت ہوگی، وہ بھی باعزت ہوگی۔ انسان کو اصل میں عزت کی زندگی کے لئے اللہ کا نائب بنا کر بھیجا گیا ہے۔ دنیا میں ذلیل ہونے کے لئے نہیں بھیجا گیا ــــــ تو سب سے بڑے خلیفۂ خداوندی اور عابدِ خداوندی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جیسے وہ سردارِ انبیاءؑ ہیں، یہ امت امتوں کی سردار بنائی گئی۔ اس کو خیرِ امت اور افضل الاُمم

کہا گیا، مگر افضلیت کیوں؟ کھانے پینے اور دولت کی وجہ سے نہیں۔ اس وجہ سے کہ اس کا نام یہ ہے کہ یہ دنیا کی قوموں کی اصلاح کرے۔ دنیا کی قوموں میں جو کھوٹ ہے اس کو رفع کرے، اور اگر یہ دنیا کی قوموں کی نقالی کرنے لگے کہ جو کھوٹ اُن کے اندر ہے، وہ اپنے اندر لے لے، تو پھر یہ اصلاح کیا کرے گی؟ اس کا حاصل تو یہ نکلا کہ دوسری قومیں اس پر غالب آئیں گی، یہ غالب نہیں آسکتی۔ یہ ایک چیز سے غالب آسکتی ہے، وہ یہ کہ یہ کلمۂ خداوندی کو اونچا کرنے کا نصب العین لے کر چلے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

تم دنیا کی قوموں پر دولت سے غالب نہیں آسکتے، دولت دوسروں کے پاس زیادہ ہے، تعداد میں تم دنیا پر غالب نہیں آسکتے۔ اہلِ باطل کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے، اور رہے گی۔ تم اگر دنیا کی قوموں پر غالب آؤ گے تو اخلاقِ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے غالب آؤ گے۔ کردار سے غالب آؤ گے، دین کو لے کر اٹھو گے تو غالب آؤ گے۔ اس لیے سب سے بڑھ کر تمہارے پاس حجّت دین ہے، اس سے بڑھ کر کوئی حجت نہیں۔

اگر آپ کسی سے بحث کریں، اور یوں کہیں کہ میری عقل یوں کہتی ہے، دوسرا کہے گا میری عقل تم سے زیادہ ہے، میری عقل یوں کہتی ہے۔ لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے، ہم خادم ہیں، ہمیں یہ حکم پورا کرنا ہے، دنیا کی ہر قوم چپ ہو جائے گی، اس سے آگے اب حجت نہیں ہے۔ آگے پھر زور اور طاقت ہے، تو جس قوم کے ہاتھ میں خدا کا نام ہو، اور خدا کی نائب بن کر آئے۔ وہ حجت میں بھی اور انجام میں بھی غالب ہوتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوّت کے بعد خلافتِ ربّانی کا کام شروع کیا، اور اسلام کی دعوت دی، تو پورا مکّہ، حجاز اور ساری قوم آپ کی دشمن تھی۔ عزیز واقرباء دشمن۔ صرف تین آدمی مسلمان ہوئے۔ بوڑھوں میں صدّیق اکبر رضی اللہ عنہ، عورتوں میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، اور لڑکوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، باقی سارا خاندان دشمن ___ لیکن آپؐ نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ پورے استقلال کے ساتھ اس کلمہ کو لے کر چلے۔ تو قوت مکّہ والوں کے ہاتھ میں تھی۔ تعداد ان کی زیادہ تھی۔ تیرہ آدمی جب مسلمان ہوئے، تو دارِ ارقم میں اندر سے زنجیر لگا کر نماز پڑھی جاتی تھی۔ خطرے کی وجہ سے مسلمان باہر نہیں نکل سکتے تھے ___ ناداری اور مفلسی کا یہ عالم تھا، کہ حضرت عمّار بن یاسر رضی اللہ عنہٗ کہتے ہیں، ہم دارِ ارقم میں بند تھے۔ رات کو بارہ بجے میں پیشاب کرنے کے لئے باہر نکلا، صفا کی پہاڑی پر بیٹھا، پیشاب کیا، دھار جو پڑی تو ایسی کھنکھناہٹ کی آواز آئی جیسے کاغذ کے اوپر دھار گرتی ہے۔ میں نے پیشاب کرنے کے بعد ٹٹولا۔ معلوم ہوا چمڑے کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا تھا، کئی وقتوں کے بھوکے تھے۔ اس چمڑے کو منہ میں ڈالا، جس سے تسلی ہوئی کہ میں بھی کچھ کھا پی رہا ہوں۔ یہ مفلسی اور ناداری کی کیفیت تھی ___ تو تعداد مسلمانوں کی تیرہ، اور مشرکینِ مکّہ کی تعداد کہیں زیادہ۔ افلاس کا یہ عالم کہ کھانے کو نہ ملے، خزانے سارے ان کے ہاتھ میں ہیں۔ مگر اس کے باوجود زندگی کا مقصد یہ تھا کہ اس کلمہ کو اونچا کرنا ہے۔ ہم خواہ مٹیں یا رہیں، ___ تیرہ برس کے بعد پورا مکّہ اور پورا حجاز اسلام میں داخل ہوا۔ یہی قوم جو اقلیت میں تھی، اکثریت میں آگئی، وہ قوم جو بے شوکت تھی، ساری شوکتیں اس کے ہاتھ آگئیں، اور جو قومیں شیر بنی ہوئی تھیں، وہ اس کے سامنے جھک گئیں۔ اللہ کا نام لے کر کھڑے ہونے میں جب استقلال وثبات دکھلائے، تو دنیا کی قومیں جھک جاتی ہیں۔ ہمیں دوسری قوموں کی دولت وعزّت نہیں چھیننی۔ ہمیں تو خدا کا نام پہنچانا ہے۔ چاہے ہم مرجائیں مگر یہ کلمہ قبول کرو۔ اگر اس شان سے چلیں گے، دنیا کی قومیں ممنون ہوں گی۔

حدیث میں فرمایا گیا ___ جب کوئی قوم میرے قانون کی خلاف ورزی کرتی اور گناہوں میں ملوث ہوتی ہے' میں دنیا کی اقوام کے دلوں میں ان کے لئے دشمنی اور عداوت ڈال دیتا ہوں۔ وہ سزائیں دیتی ہیں ___ یہ درحقیقت میری طرف سے وہ قومیں جلاد بن کے کھڑی ہوتی ہیں' تاکہ معصیت چھڑا دیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں' اگر یہ چیز تمہیں ناگوار ہو کہ دنیا کی قومیں تم پر غالب آئیں' اور تمہیں سزائیں دیں' ان بادشاہوں کو برا مت کہو' میرے سے معاملہ درست کرلو۔ میں عداوت کی بجائے ان کے دلوں میں محبت ڈال دوں گا۔ آج جو قومیں نفرت کرتی ہیں۔ کل کو وہ تمہاری طرف مائل ہو جائیں گی۔ دشمنی کرنے کی بجائے تمہاری خادم بن جائیں گی' قلوب تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ جب آدمی اللہ کا نائب بن کے اس کے کام کے لئے کھڑا ہو' تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اس کی عداوت پر ہی کمربستہ رہے؟ ایک نہ ایک دن عداوت ختم کردینی پڑے گی۔ مگر شرط یہی ہے کہ نہ ہمیں دوسروں کا اقتدار چھیننا ہے نہ دولت چھیننی ہے۔ نہ کسی قوم سے حسد ہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ بس نیک اور صالح بن جاؤ۔ ہم نمونہ بن کے سامنے آئیں۔ اگر ہم کہیں کچھ' اور نمونہ دوسرا پیش کریں' دنیا ہماری بات کو کبھی نہیں مانے گی۔ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کر کے دکھلانے کی ضرورت ہے۔ دنیا جھک جائے گی۔

اخلاقی قوت سے ہی انسان اونچا ہو سکتا ہے

حضراتِ صحابہؓ جب ہندوستان میں آئے ہیں' تو سب سے پہلے سندھ میں داخل ہوئے۔ مؤرخین لکھتے ہیں سندھ کے بازاروں سے جب صحابہؓ گذرے' تو ہزاروں لوگوں نے ان کے چہرے دیکھ کر اسلام قبول کیا' اور کہا کہ یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہوسکتے۔ ان کے چہروں پر سچائی برستی ہے۔ ان کا کردار اور چہرہ مہرہ سب اسلام کا مبلغ تھا۔ ہم اپنے کردار سے دنیا کی اقوام کو اسلام سے نفرت دلا رہے ہیں۔ دنیا کی اقوام ہمارے عمل کو دیکھ کر اسلام کو سمجھتی ہیں۔ جب وہ ہمارے اعمال کو دیکھتی ہیں' کہتی ہیں کہ ایسے اسلام کو سلام ہے' اسے قبول کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم اسلام کے مبلغ کیا ہوئے' ہم خود اسلام کی تبلیغ میں روڑا بنے ہوئے ہیں۔ تو اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی عملی زندگی درست کریں' ہمیں علم و تعلیم اور اسلامی اعمال سے واقفیت ہو۔ جہالت کے ساتھ دنیا کی کوئی قوم اونچی نہیں ہوسکتی۔ انسان کے لئے ترقی کا پہلا زینہ علم ہے۔ تو تعلیم بھی ہو' اور اخلاق درست ہوں۔ ہم میں صبر و تحمل' بردباری' حیاء' غیرت' حمیت' جذبۂ خدمت ایسے اخلاق ہوں۔ جب یہ اخلاق اور علم ہوگا تو ایسی قوم کبھی نیچے نہیں رہ سکتی۔ یہ علم اور اخلاق ایک قوت ہے جو انسان کو گرنے نہیں دیتی۔ یہ انسان کو اونچا بنا دیتی ہے۔ یہ جب نکل جاتی ہے تو کوئی چیز آدمی کو اونچا نہیں کر سکتی۔ جیسے ربڑ کی گیند میں ہوا بھری ہوئی ہے۔ اگر اسے آپ زمین پر زور سے پٹخ دیں تو اتنا ہی اوپر جائے گی۔ اس لئے کہ اس میں ہوا کی قوت بھری ہوئی ہے۔ وہ نیچا نہیں دیکھ سکتی۔ اگر ہوا نکال دیں' وہ پھس سے ہو کے وہیں رہ جائے گی ___ ایک مسلمان کو مثل گیند کے سمجھو۔ اس میں جب تک دین اور علم واخلاق کی ہوا بھری ہوئی ہے۔ اگر اس کو کوئی زمین پر پٹخے گا بھی' یہ اوپر ہی جائے گا۔ اور اگر یہ روح اس کے اندر سے نکل گئی پھر جس قوم کا جی چاہے' اسے تھپڑ مارے اور نیچے گرادے۔ ہوا کی طاقت تو اس میں ہے نہیں۔ اس لئے ہوا اندر وہی بھرنی چاہئے جس سے اندر طاقت آئے۔ اور طاقت روح سے آتی ہے' پھر روح کی طاقت علم واخلاق سے' اسی سے آدمی کو خلافت کا مقام ملتا ہے۔ اسی سے انسان کے اندر عبادت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ___ جب تک کسی چیز کا مقصد پورا نہ ہو۔ اس کی زندگی بے کار ہوتی ہے۔ مثلاً مدرسہ ہے' اس کا مقصد تعلیم ہے۔ اگر تعلیم نہ ہو'

مدرسہ بے کار ہے۔ گھر کا مقصد رہن سہن ہے، اگر اس میں رہن سہن نہ ہو گھر بنانے کا فائدہ کیا___؟ بازار کا مقصود یہ ہے کہ سامان ملے' اگر سامان نہ ملے تو بے کار ہے۔ اگر انسان کا مقصد عبادت وخلافت ہے۔ جب یہ مقصد نہ ہو' یہ انسان گولی ماردینے کے قابل ہے۔ اگر مقصد پورا کر رہا ہے تو وہ زندگی کا ثبوت دے رہا ہے۔

مسلمان کا دنیا میں مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے

دنیا کی اقوام کے مقاصد مختلف ہوتے ہیں۔ کسی کا مقصد دولت' کسی کا روٹی' کسی کا اقتدار___ اسلام کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے' کہ میں رہوں یا نہ رہوں خدا کا نام اونچا ہونا چاہئے۔ میں اللہ کا نائب بن کے آیا ہوں۔ میں تو اسی کے نام کا ڈھنڈورچی ہوں۔ جب تک آپ اللہ کے نام کا ڈھنڈورا پیٹیں گے۔ اللہ کی حکومت کی قوت آپ کی پشت پر رہے گی۔ جب اسے چھوڑیں گے' قوت ختم ہو جائے گی___ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بادشاہ جب کوئی قانون نافذ کرتا ہے' تو قانون کو گورنروں کے پاس بھیجتا ہے۔ گورنر کمشنر کے پاس' اور کمشنر کلکٹر کے پاس' اور کلکٹر تحصیل دار کے پاس بھیجتا ہے۔ اور تحصیل دار کیا کرتا ہے؟ وہ بھنگی بلاتا ہے' ڈھول اس کے گلے میں ہوتا ہے اسے کہتا ہے کہ اس قانون کی منادی کردے۔ تو بھنگی کی کیا قدر وقیمت ہے۔ معمولی اس کی تنخواہ ہوگی۔ لیکن جب سرکاری قانون کی منادی کرتا ہے' گورنمنٹ کی پوری قوت اس کی پشت پر ہوتی ہے۔ اگر اس وقت آپ اس کے گلے میں سے ڈھول نکال کر تھپڑ ماریں' پوری گورنمنٹ مدعی بن جائے گی۔ کیونکہ تم نے گورنمنٹ کے قانون کی منادی کرنے والے کی توہین کی' گویا گورنمنٹ کی توہین کی___ مقدمہ قائم ہو جائے گا۔ تو بھنگی کی کوئی قوت نہیں۔ اصل قوت گورنمنٹ کی ہے۔ جب ایک مسلمان منادی بنے گا' اور اللہ کا بھنگی بن کر اس کے قانون کو دنیا میں پکارتا پھرے گا' اس حالت میں اگر اس کی کوئی توہین وتذلیل کرے' وہ گویا خدا کی گورنمنٹ کی توہین کر رہا ہے۔ اللہ کی مدد شامل حال ہوگی۔ وہ کبھی نیچا نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں آپ اپنے کو اونچا بنائیں گے' تو ہماری قدر وقیمت نہیں۔ ہمیں جس کا جی چاہے نیچا دکھادے۔ مگر جب خدا کی روح بھری ہوئی ہو' اسے لے کر چلیں تو اسے کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا۔ تو بات وہ کرنی چاہئے جس سے ہم میں طاقت پیدا ہو۔ ہماری طاقت دین' اسلام' اور ایمان اور خلافت اور روحانیت سے ہے۔ ہتھیار' دولت اور بلڈنگوں میں ہماری طاقت نہیں ہے۔ ہماری طاقت تو اللہ کے نام اور کام میں ہے۔ جو آیت کریمہ میں نے پڑھی' اس میں زندگی کے دو مقصد بتلائے۔ ایک عبادت' اور دوسرے خلافت___ عبادت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ حضرت لقمان علیہ السلام فرماتے ہیں اے میرے بیٹے! نماز قائم کر' نماز ہی چونکہ اصل میں عبادت ہے۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ خدا کا عبادت گذار بندہ بن۔ اللہ کے آگے اپنی ذلّت پیش کر' اسی میں تیری عزّت اور رفعت وسربلندی ہے۔ تو یہ فریضہ عبادت کا ہے جو زیادہ سے زیادہ نماز کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

دوسری بات فرمائی وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ معروف کا امر کر' اور منکر سے ممانعت کر۔ یعنی دنیا میں نیکی پھیلاؤ' اور برائیاں مٹاؤ۔ دنیا کی قوموں کو اچھے کاموں کی عادت ڈالو' بُرے کاموں سے روکو۔ فحش وبے حیائی کو مٹاؤ' بے غیرتی وبے ہمّتی کا دنیا سے خاتمہ کرو۔ حیا' ایثار' سخاوت' مروّت اور شجاعت' ان اخلاق کو دنیا میں پھیلاؤ' تاکہ اللہ کی طاعت وعبادت دنیا میں پھیلے اور بغاوت ختم ہو۔ اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا گیا۔ امر بالمعروف یعنی نیکی کا آرڈر دینا۔ نہی عن المنکر' برائی سے روک دینا۔ اصل میں یہ کام اللہ کا ہے' وہ ہے سب سے بڑا امر فرمانے والا' اور برائیوں کو روکنے والا ہے۔ مگر اس نے انسان کو اپنا نائب

بنایا ہے کہ تم میری طرف سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو۔ ___ تو اس سے خلافت ونیابت ثابت ہوئی ہے۔ جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا :

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اگر ہم ان مسلمانوں کو طاقت واقتدار اور بادشاہت دے دیں۔ تو ان کا مقصد کیک پیسٹری کھانا نہیں ہوگا۔ ان کا مقصد اللہ کی ترجمانی ہوگا۔ یہ نمازوں کا نظام قائم کریں گے' صدقات پر دنیا کو مائل کریں گے۔ اچھی باتوں کا آرڈر جاری کریں گے۔ برائیوں کو دنیا سے روکیں گے' یہ ان کا کام ہوگا۔ معلوم ہوا سلطنت دینے کا بڑا مقصد امر بالمعروف کا نظام قائم کرنا' اور منکرات کو دنیا سے مٹانا ہے' اس کا نام خلافت ہے۔

قربانی سے نصبُ العین دنیا میں پھیلتا ہے

ظاہر بات ہے جب مسلمان امر بالمعروف اور نصیحت لے کر کھڑا ہوگا۔ ساری دنیا نہیں مانا کرتی' کچھ دوست بن جاتے ہیں' کچھ دشمن۔ مبلّغ کے سامنے مقابلہ بھی کرتے ہیں۔ بُرا بھلا بھی کہتے ہیں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کتنی گستاخیاں کی گئیں' اس میں صبر وتحمل' عالی ظرفی اور بڑے اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے ___ اس لئے آگے فرمایا گیا :

وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ۔ اور اس راستے میں جتنی مصیبتیں آئیں' ان کو جھیلنے کی عادت ڈالو' اور اپنے اندر صبر وتحمل پیدا کرو' جس قوم میں صبر وتحمل اور برداشت آگئی۔ وہ قوم کامیاب ہے۔ چاہے وہ ابتدا میں تکلیف اٹھائے گی۔ مگر چند دن کے بعد غلبہ اسی کا ہوگا۔ تو تین چیزیں فرمائی گئیں۔ عبادت وخلافت کا نظام اور اخلاق کا نظام ہے کہ صبر وتحمل اور اُولوالعزمی ہو جو آدمی ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جائے۔ کسی نے گالی دے دی' بس لڑنے مرنے کو تیار' کسی نے اشارہ ہی کیا تو مکّہ دکھانے کو تیار' وہ کبھی کام نہیں کر سکتا۔ کام وہ کرے گا کہ قتل کی بھی دھمکیاں ہوں' دولت بھی چھین لی جائے' غلامی کی بھی دھمکی دی جائے۔ مگر وہ پرواہ نہ کرے ہے کہ یہ چیزیں مجھے مقصود نہیں' مجھے تو اللہ کا نام بلند کرنا ہے۔ فاقہ کروں یا کچھ کروں مگر مجھے تو آگے بڑھنا ہے' وہ کبھی نیچا نہیں ہو سکتا۔

اس واسطے اس آیت کی روشنی میں میں نے یہ تین باتیں عرض کیں۔ ایک عبادت درست ہونی چاہئے۔ ایک خلافت کا جذبہ ہونا چاہئے' اور ایک اخلاق اور کردار درست ہونا چاہئے۔ تب جا کے قوم کی زندگی بن سکتی ہے' اگر عبادت اور خلافت کا جذبہ نہ ہو' اخلاقی قدریں بھی نہ ہوں آخر پنپنے اور زندہ رہنے کی صورت کیا ہے؟

روٹی زندگی نہیں' زندگی انسان کا کردار اور نصبُ العین ہے۔ وہ ہوگا تو قوم زندہ ہے۔ آج دنیا میں جتنی قومیں بڑھ رہی ہیں' وہ کھانے پینے سے نہیں' یہ تو آثار میں سے ہے' خود ہی آجاتا ہے۔ اصل نصب العین ہے' جو قوم کوئی مقصد لے کر کھڑی ہوئی' اور وہ اس مقصد کی خاطر قربانیاں دے رہی ہے' وہ بڑھے گی اور اقتدار پائے گی ___ ہم کوئی بھی مقصد نہ رکھیں۔ بس کھا پی لیا' اور سو گئے۔ یہ کوئی زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ اگر یہ مقصد ہے تو ہر جانور بھی یہ مقصد لیئے ہوئے ہے' تو پھر انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ انسان تو کوئی کمال لے کر آیا ہے ___ جامع تو اتنا کہ ساری مخلوقات اور خالق کے کمالات کے نمونے موجود' اور مقصد

صرف روٹی۔ اتنا اعلیٰ کردار لے کر آئے' اور مقصد اتنا پھُسپھسا' جو ہر جانور کو بھی میسّر؟۔ جیسا جامع ہے ویسا ہی مقصد بھی ہونا چاہیے۔ وہ مقصد یہی ہے کہ ایک طرف عبادت ہو' یعنی اللہ کا سچا بندہ' اس کے نام پر مَر مٹنے والا۔ اور ایک طرف اس کا نائب کہ اس کا خلیفہ بن کر پوری دنیا میں اصلاح کا پیغام پہنچانے والا۔ اور اس میں مضبوط اتنا کہ جو مصیبت آئے' اسے خوشدلی سے جھیلنے کو تیار' ایسے افراد اور ایسی قومیں ہمیشہ بلند وبالا ہوتی ہیں ___ غور کیا جائے جو تین چیزیں میں نے پیش کی ہیں یہ قوم کی برتری اور سربلندی کا پیغام ہیں۔ تفصیلات اس کی بہت ہیں۔ وہ تعلیم اور غور فکر سے معلوم ہونگی' مگر اصولاً یہی تین چیزیں ہیں جس سے قومیں بڑھتی ہیں۔ ایک صحیح نصبُ العین کہ سچا عابد اور ایک دوسرا نصبُ العین کہ سچا خلیفۂ ربّانی' اور تیسرا کہ سچا اخلاقی نمونہ رکھنے والا' اس سے اِن شاء اللہ برتری ہوگی۔

یہ آیت ہے تو دو تین لفظوں کی' مگر اس نے بڑا عظیم پروگرام پیش کردیا ہے' اور یہی اللہ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ میرا آپ کا کلام نہیں' خدا کا کلام ہے' کہ دو لفظ فرمائے جاتے ہیں۔ اور علوم کے دریا اس کے اندر بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ جتنا کھودے جاؤ' نکالے جاؤ۔ جتنا غرق ہوتے جاؤ موتی نکالتے جاؤ۔ اس لئے قرآن کریم کو معجزہ کہا گیا ___ جیسے سمندر میں موتی اور ہزاروں جواہرات بھرے ہوئے ہیں مگر کوئی غوطہ لگانے والا اور نکالنے والا ہونا چاہئے' جس میں دم اور سانس ہو کہ نیچے پہنچے' موتی نکال کے لائے' اور جو دم توڑ دے گا' وہ تو اپنی جان کھو کے آئے گا' موتی تو کیا نکال کے لائے گا؟ جو تیراکی کے فن سے واقف نہ ہو' وہ جائے گا جان کھو کر ہی آئے گا۔ تیراکی کا فن سیکھ کر پھر سمندر میں گھسا جائے' تو موتی نکالتا ہے۔ قرآن حکیم ایک سمندر ہے' اور اس میں تیرنے کا فن تعلیم ہے۔ علم سیکھ کر جب آدمی اس میں گھُسے گا تو ہزاروں موتی اور علم کے جواہرات نکلیں گے'

قرآن کا معجزہ ہونے کا یہی حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک لفظ ہوتا ہے اور کوزے کے اندر ہزاروں' دریا بھرے ہوئے ہوتے ہیں ___ اگر میں اس کی تفسیر کروں تو کتنے ہی دن چاہئیں' تفسیر پھر بھی پوری نہیں ہوگی۔ اس لئے بِالاِجمال ان مقاصد کو یاد رکھ کے اپنی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہئے کہ کس حد تک ہم ان مقاصد کو پورا کر رہے ہیں۔ اور اگر پورا نہیں کر رہے' تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ معلوم کرکے انہیں زائل کیا جائے۔ اس واسطے میں نے یہ تین چیزیں پیش کیں۔ امّید ہے کہ آپ حضرات ان تینوں پر وقتاً فوقتاً غور کریں گے' اور اپنی زندگی کو بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ کامیابی دے گا۔ ہزاروں مسائل کا اس میں علاج ہے۔ ہزاروں مصائب دینوی واُخروی کا حل اسی کے اندر ہے۔ حق تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمادے کہ ہم اپنے پروردگار کے کلام پر چلنے کی کوشش کریں' اور اپنی زندگی کو قرآن وحدیث میں ڈھالیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے' اور اپنے حبیبِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نصیب فرمادے۔ (آمین)

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ

صلّی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ محمّد واٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین

برحمتک یا ارحم الرّاحمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

مقصدِ حیات

عبادتِ خداوندی دنیا سے چلی، قبر میں پہنچی، میدانِ محشر میں پہنچی، اور جنت تک پہنچ گئی ـــــ یہ چیز ایسی ہے جو زندگی کا مقصد بن سکتی ہے ـــــ اگر زندگی اَبدی ہے تو عبادت بھی اَبدی ہے۔ کھانا پینا اَبدی نہیں۔ یہ قبر تک ختم ہو گیا۔ قبر میں کوئی کھانا پینا نہیں ہو گا۔ اور اگر کچھ کھانا پینا ہو گا بھی تو بھی ذکر اللہ ہی ہو گا۔ جنت میں کھانا پینا ہو گا۔ مگر محتاجگی نہیں ہو گی ـــــ اصل محتاجگی "ذکر اللہ" کی ہو گی۔ اور وہ زبان پر جاری ہو گا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ـــــ اَمَّا بَعْدُ ـــــ

فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم. بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم. ﴿وما امروا الا لیعبدوا اللّٰہ مخلصین لہ الدین. حنفآء ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ وذٰلک دین القیمۃ﴾ ـ صدق اللّٰہ العلی العظیم (بینۃ پ ۳۰)

تمہید

بزرگانِ محترم!

دنیا میں انسان جب بھی کوئی حرکت کرتا ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ کسی دانش منداور عقلمند انسان کی حرکت بلا مقصد نہیں ہوتی۔ آپ جب مسجد کی طرف آنے کے لئے حرکت کرتے ہیں تو نماز مقصد ہوتی ہے۔ اس کے لئے آپ اپنا گھر چھوڑتے ہیں اور محنت مشقت اُٹھا کر مسجد میں آتے ہیں۔ ایک طالب علم اسکول، مکتب یا مدرسہ کی طرف جاتا ہے تو محض حرکت مقصود نہیں ہوتی، بلکہ حرکت سے تعلیم مقصود ہوتی ہے، اسے پڑھنا اور علم حاصل کرنا ہے۔ اس لئے وہاں جاتا ہے ـــــ ایک شخص اگر اپنے شیخ کے پاس خانقاہ کی طرف جاتا ہے، تو اس حرکت کا مقصد اخلاقی تربیت ہوتی ہے کہ میرے نفس کی اصلاح ہو جائے۔ محض حرکت مقصود نہیں ہوتی ـــــ آپ ریل سے سفر کر کے کسی جگہ کے لئے حرکت کریں تو کوئی نہ کوئی

اسٹیشن ضرور ہوگا جہاں آپ کو اُترنا ہوگا جو آپ کی منزلِ مقصود ہوگی ___ بلا مقصد کے حرکت دیوانوں اور مجنون آدمی کا کام ہے۔ دانش مند جب بھی کوئی حرکت کرے گا' اس کا کوئی مقصد ضرور ہوگا۔ اور وہ مقصد اس کے عقلمند ہونے پر دلالت ہوگی ورنہ اس کو بے وقوف کہیں گے۔

غرض یہ عقلی اور حسی قاعدہ ہے کہ کوئی حرکت مقصود نہیں ہوتی۔ حرکت سے وہ منزلِ مقصود ہوتی ہے جس کی طرف آدمی جاتا ہے۔

سفرِ انسانی کی ابتدا وانتہا

اس اُصول کے پیشِ نظر آپ غور کریں تو زندگی بھی ایک حرکت ہے ایک طرف سے آپ چلے ہیں اور ایک طرف جارہے ہیں۔ اور یہ کوئی چھوٹی موٹی حرکت نہیں کہ دس بیس میل کا سفر کرلیا' بلکہ ایک لامحدود حرکت ہے۔ جو دور تک جانے والی ہے' اور بہت پہلے سے ہوئی ہے۔

آپ تو یہ سمجھے ہوئے ہوں گے کہ جب ہم ماں کے پیٹ سے نکلے تو حرکت شروع ہوئی۔ نہیں ایسا نہیں بلکہ ماں کا پیٹ تو ایک اسٹیشن ہے۔ حرکت اوپر سے آرہی ہے۔ اس جگہ جو انسان کی حرکت ہوتی ہے یہ "عالمِ اَلَستُ" سے چلی ہے۔ جس کو قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔ اور احادیث نے اس کی تفسیر بیان کی ___ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کی کمر پر داہنا ہاتھ مارا' جیسا ہاتھ اللہ تعالیٰ کی شان کے مناسب اور اس کی جناب کے لائق ہے ___ ہم جیسا ہاتھ تو نہیں ہے۔ ہمارا ہاتھ تو جسمانی ہے اور وہ جسم سے پاک ہے۔ تو جیسا ہاتھ اس کی جناب کے لائق اور شان کے مناسب ہے ویسا ہی ہاتھ مراد لینا چاہئے ___ تو داہنا ہاتھ مارا تو آدم علیہ السلام کی کمر میں ساری وہ اولاد نکل پڑی جو جنتی ہونے والی تھی اور قیامت تک آنے والی تھی ___ اس کے بعد بایاں ہاتھ مارا تو ساری وہ اولاد نکل پڑی جو جہنمی ہونے والی تھی ___ تو نیک اور بد سارے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکل آئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک وادی میں جمع کیا' اربوں' کھربوں انسان جو قیامت تک آنے والے تھے' کا ایک مجمع تھا۔ کوئی صف بندی نہیں تھی کہ ترتیب ہو۔ بلکہ کسی کا منہ کسی کی طرف' کسی کی پشت کسی کی طرف اور کسی کا مونڈھا کسی طرف' جیسے ہجوم میں ہوتا ہے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے جن کے منہ آمنے سامنے تھے ان میں تو محبت قائم ہوگئی' اور جن کی پشتیں ملی ہوئی تھیں ان میں عداوت قائم ہوگئی' اور جن کے پہلو ملے ہوئے تھے ان میں کچھ محبت اور کچھ عداوت ___ یہی وجہ ہے کہ ایک انسان مشرق کا اور ایک مغرب کا' ایک ایشیاء کا اور ایک افریقہ کا' کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن جب جمع ہوتے ہیں تو ان میں دیرینہ محبت معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ پہلے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ وہی عالمِ الستُ کا اثر ہے ___ تو فرمایا گیا **الارواح جنود مجندة**۔ روحیں جمع کردی گئیں۔ وہیں آپس میں محبتیں اور عداوتیں قائم ہوگئیں' جو دنیا میں آکر ظاہر ہوئیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ماں کے پیٹ میں دو بچے پاؤں پھیلاتے ہیں۔ دونوں حقیقی بھائی ہیں۔ لیکن آپس میں عداوت' کشمکش اور کسی وجہ سے مناسبت نہیں۔ وہ اس سے لڑتا ہے اور وہ اس سے لڑتا ہے ___ اور دو اجنبی اس طرح ملتے ہیں جیسے حقیقی بھائی ہیں۔ یہ ازل سے ہی کسی میں محبت اور کسی میں عداوت ڈال دی گئی ... اس طرح سے یہ روحیں وہاں جمع کی گئیں۔

یہ بھی حدیث میں فرمایا گیا کہ وہاں جوڑیاں بھی قائم کردی گئیں۔ جس کا جس سے نکاح ہونے والا تھا' وہ

عورت اس کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ گویا وہیں تقرر کردیا گیا کہ یہ زوج اور زوجہ بنیں گے۔ تو اس طرح سے لوگوں کی جوڑیاں بنا کر کھڑے کردیئے گئے۔ ان سب کو حق تعالیٰ نے مخاطب فرمایا اور بلاواسطہ حق تعالیٰ نے ان سب سے کلام فرمایا' اور سب کو اپنا جمال دکھلایا۔ جس سے ہر ایک کے دل میں اپنے مالک کی محبت قائم ہوگئی ___ اور یہ فرمایا کہ :

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ___ ؟

''کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟''۔

حدیث میں ہے کہ سب انسان ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ اس کا کیا جواب دیں' سب سے پہلے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

بَلٰی۔

''بے شک آپ ہمارے ربّ ہیں''۔

آپ کا فرمانا تھا کہ سارے انبیاء علیہم السلام کی زبان سے یہ کلمہ نکلا بلٰی' بلٰی بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے بول سے سب انسانوں کے دل میں ڈال دیا گیا۔ اور تمام انسان بولے کہ بلٰی' بلٰی' بلٰی بے شک آپ ہمارے پروردگار ہیں ___ گویا سب سے پہلے معلّم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے سب انبیاء علیہم السلام بولے۔ اور انبیاء السلام کے بولنے سے پورے انسانوں تک یہ تعلیم پہنچ گئی۔

تو سب نے اللہ کے مالک ہونے اور ربّ ہونے کا اقرار کیا' اور اس کی رُبوبیت کو مانا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اس عہد کو یاد رکھنا۔ دنیا میں جب جاؤ گے تو اس عہد کو بھولنا نہیں۔ ہم انبیاء علیہم السلام کو بھیجیں گے' جو آکر تمہیں یاد بھی دلائیں گے۔ پھر اپنی زندگی صحیح کرکے کل کو ہمارے سامنے آنا' اور عہد کو دل میں رکھ کر لانا۔ یہ مت کہنا کہ ہمیں تو کسی نے کچھ بتلایا ہی نہیں تھا' ہم کو کسی نے تعلیم ہی نہیں دی تھی۔

اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ۔

''قیامت کے دن یہ کہنے کا موقع نہیں ہوگا کہ ہم تو غافل تھے۔ نہ کسی کو رب جانتے تھے نہ کسی کو مالک وخالق۔ ہمیں یہ کسی نے بتلایا ہی نہیں تھا''۔

تو فرمایا کہ ہم اپنا ''ربّ ہونا'' بتلا رہے ہیں۔ اور ہم سب کے باپ آدم علیہ السلام کو اللہ نے گواہ بنایا اور فرمایا کہ آدم! میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ میں نے اپنی ربوبیت کا اقرار ان سب کے دل میں ڈال دیا۔ زمین کو گواہ کیا آسمان کو بھی گواہ کیا' کہ ہم نے تمہیں تعلیم دے دی' اور جمال دکھلا کر اپنی محبت بھی پیدا کردی' اور سوال کا جواب دلا کر اپنی رُبوبیت کا اقرار کرالیا کہ میں تم سب کا ربّ ہوں' اور یہ کہ تم غافل نہیں ہو۔

یہی وجہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی انسان اپنے دل میں ایک جمال محسوس کرتا ہے کہ میرا مالک اور خالق کوئی ضرور ہے۔ ''اور ہے بھی ایک'' ___ یہ انسان کو عقل سمجھاتی ہے۔ اسی وجہ سے ہر ایک کی فطرت میں اقرار موجود ہے۔ ہر ایک کے اندر عشق و محبتِ خداوندی ڈلی ہوئی ہے' جسے ہر انسان محسوس کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام آکر اسے دعوت دیتے ہیں۔ اس کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ محبت کو کس طرح ظاہر کیا جائے۔ اس رُبوبیت کے اقرار کو کس عمل سے نمایاں کرے۔ وہ تعلیم دے کر اس کی تفصیل کردیتے ہیں۔ اجمالاً ہر ایک انسان کے دل میں یہ جذبہ موجود ہے۔

احوالِ برزخ

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا یہ سفر وہاں سے شروع ہوا تھا' وہاں سے یہ حرکت ہوئی۔ آدم علیہ السلام کی کمر میں سے نکلے' اقرارِ توحید کے بعد پھر آدم علیہ السلام کی کمر میں لوٹا دئے گئے ___ اس کے بعد پھر آدم علیہ السلام کی اولاد ہوئی۔ پھر اولاد کی اولاد' اور آگے یہ سلسلہ چلتا رہا۔ انسان اپنے اپنے والد کی پشتوں میں منتقل ہوتے رہے۔ تو پہلی منزل جہاں سے انسان چلا ہے وہ آدم علیہ السلام کی پشت ہے' اور پھر اپنے باپ در باپ کی طرف منتقل ہوا ___ اس کے بعد پھر ہر انسان اپنی اپنی ماں کے پیٹ کی طرف منتقل ہوا۔ تو مہینے وہاں قیام کیا۔ یہاں اسے غذا ملی۔ کچھ اسے سمجھایا گیا' نو مہینے کی مدت گزار کر گاڑی آگے چلی' پھر دنیا کا اسٹیشن آگیا ___ پھر دنیا میں کسی کی عمر چالیس برس' کسی کی پچاس برس' کسی کی ساٹھ اور سو برس اور کسی کی دو سو برس ___ پہلی امتوں کی بارہ بارہ سو' اٹھارہ سو برس عمریں ہوئیں۔ اب عمریں کم ہو گئیں ___ تو انسان آتے رہے اور اپنی اپنی عمر کے مطابق قیام کرتے رہے۔ جب دنیا میں اس کی عمر ختم ہوئی تو عالمِ برزخ میں پہنچ گیا' جس کو قبر کہتے ہیں ___ اور قبر یہ نہیں ہے جس کو ڈیڑھ گز کا گڑھا بتلایا جاتا ہے۔ یہ تو اس کی علامت ہے۔ وہ ایک مستقل جہان ہے جس کو برزخ کہتے ہیں' جو دنیا اور آخرت کے بیچ میں ہے۔ اس کا تعلق کچھ دنیا سے ہے اور کچھ آخرت سے۔ مرنے والا بالکل دنیا میں بھی نہیں رہتا' اور بالکل آخرت میں بھی نہیں پہنچتا' بلکہ بیچ بیچ میں رہتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ قبر میں جنت کی کچھ کھڑکیاں کھول دی جاتی ہیں' اور آدمی جنت میں اپنے مقام کو دیکھ لیتا ہے' اور تمنا کرتا ہے کہ **یاربّ اقم الساعۃ**

اے اللہ جلدی قیامت کر دے تاکہ اس مقام کریم تک پہنچ جاؤں ___ وہاں سے خوشبوئیں آتی رہتی ہیں اس میں "یہ مست" رہتا ہے۔ تو آخرت بھی سامنے ہے اور دنیا بھی سامنے ہے کہ کوئی ثواب پہنچائے تو پہنچ جاتا ہے۔

قبر پر زیارت کے لئے کوئی جائے تو حدیث ہے کہ قبر کی زیارت کا ادب یہ ہے کہ قبلہ کی طرف پشت کر کے میت کی طرف منہ کرے۔ میت اسے دیکھتا ہے اور پہچانتا ہے ___ تو اُدھر اس کا رخ جنت کی طرف ہے اور ادھر اس کا رخ دنیا کی طرف ہے۔ وہاں سے ہوائیں آرہی ہیں' ادھر سے دعائیں اور ثواب پہنچ رہا ہے ___ خود اہلِ برزخ بھی دنیا والوں کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ مرنے والے کو جب نعمتیں ملتی ہیں اور قبولیت ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے اللہ جتنے میرے عزیز اور مسلمان بھائی ہیں اس وقت تک انتقال نہ کریں جب تک انہیں توبہ نصیب نہ ہو جائے۔ جب تک وہ اپنے گناہوں سے معافی نہ چاہ لیں۔ تاکہ پاک صاف ہو کر یہاں پہنچیں جیسے تو نے مجھے پہنچایا ہے ___ تو ہر ہر میت اہلِ دنیا کے لئے دعا کرتا ہے' اور دنیا والے میت کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ **اللّٰھم اغفرلھم وارحمھم** ___ اے اللہ ان کی مغفرت فرما کر ان پر رحم فرما **اعلِ درجاتھم فی الفردوس**۔ ان کے درجات فردوس میں بلند فرما ___ تو ہم ان کے لئے دعا گو ہیں۔ وہ ہمارے لئے دعا گو ہیں۔ ان کی دعاء کا ہدیہ ہم تک پہنچتا ہے' اور ہمارے ثواب کا ہدیہ ان تک پہنچتا ہے۔

اسی واسطے فرمایا گیا کہ میت پر رونے کی ضرورت نہیں۔ روئے دھوئے تو جب' جب ہمیشہ کے لئے جدائی ہو۔ یہ چند دن کی جدائی ہے۔ ہم بھی وہیں پہنچ جائیں' جہاں وہ پہنچتا ہے۔ تو زیادہ رونے دھونے کی کیا ضرورت

ہے۔ قبر پہ جاکے آپ ثواب پہنچائیں ان کو مل گیا۔ انہوں نے دعا کا ہدیہ بھیجا وہ آپ کو مل گیا۔ تو یہ کیا جدائی ہوئی؟

یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارا کوئی عزیز ہندوستان چلا جائے تو وہاں سے خط کی بھی آمدورفت ہے' ہدیہ بھی جاتا ہے۔ سلام وکلام بھی پہنچتا ہے۔ اس لئے آدمی روتا نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ جب جی چاہے گا مل لوں گا' اور آدھی ملاقات تو گویا ہوتی ہی رہتی ہے۔

اسی واسطے فرمایا گیا کہ میت پر اتنا رونا دھونا کہ آدمی نوحہ' بیان' بکاء کرے' ماتم کرنے لگے' گریباں پھاڑ ڈالے' رخسار نوچ ڈالے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ پر بے اعتمادی کا بھی اظہار ہے... اور بے وقوفی بھی ہے۔ اتنا تو تب روئے جب یہ بات ہو کہ اب کبھی ملنا نہ ہوگا۔ یہ چند دن کی جُدائی ہے پھر ملاقات ہوگی۔

حاصل یہ ہے کہ جس کو ہم قبر کہتے ہیں وہ ڈیڑھ گز کی جگہ نہیں ہے وہ دراصل عالمِ برزخ ہے' جو اتنا بڑا عالم ہے کہ دنیا جیسے لاکھوں عالم اس میں بن سکتے ہیں' تو انسان عالمِ برزخ کی طرف منتقل ہو گیا' اور جب بھی منتقل ہوتا ہے ترقی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

آدم علیہ السلام کی کمر سے جب نکلا تو حدیث میں ہے کہ تمام انسان چیونٹیوں کی طرح تھے۔ ماں کے پیٹ میں آیا تو قد وقامت بڑھ گیا' غذا بھی ملنے لگی۔ دنیا میں آیا تو قد وقامت اور بڑھ گیا۔ غذا بھی بڑھ گئی۔ وہاں حیض کا خون ملتا تھا یہاں صاف دودھ ملنے لگا۔ مٹھائیاں عمدہ غلے' ترکاریاں' پھل پھول اور فروٹ ملنے لگے۔ ماں کے پیٹ میں یہ نہ تھے وہ تنگ جہان تھا۔ جبکہ دنیا میں ماں کے رحم جیسے کروڑوں جہان بن سکتے ہیں۔

اب انبیاء علیہم السلام نے خبر دی کہ تم آہستہ آہستہ ترقی کے عالم میں پہنچ رہے ہو۔ اس کے بعد ایک اور عالم آنے والا ہے' اور وہ اتنا بڑا ہے' کہ دنیا جیسے کروڑوں عالم اس میں بن جائیں اور وہ عالمِ برزخ ہے۔ وہاں نعمتیں اور راحتیں بھی ہوں گی۔ دنیا میں اگر بے چین رہے گا مگر ایمان تھا تو قبر کے اندر راحت ملے گی۔

ہزار برس تک آرام سے پڑے سوتے رہنا۔ دنیا میں زیادہ سونے کی ضرورت نہیں' کچھ اللہ کا نام لو' عبادت کرلو۔ باقی تکلیف اگر ہوتی ہے تو اٹھالی جائے' کیونکہ دنیا تو تکلیف ہی کی جگہ ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب سوال وجواب قبر میں ہو چکے گا۔ اور منکر نکیر کو سب کا جواب دے دے کہ میرا رب اللہ ہے۔ میرا دین اسلام تھا۔ میرے پیغمبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ تو غیبی آواز پیدا ہوگی کہ ان صدق عبدی ___ میرے بندے نے سچ کہا۔ فافرشوہ من الجنۃ والبسوہ من الجنۃ وافتحوالہ باباً من الجنۃ ___ اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دو۔ جنت کے فرش بچھاؤ۔ جنت کا لباس بھی دو... اور ویوسع لہ قبرہٗ مبد بصرہ۔ قبر اتنی وسیع کردی جاتی ہے کہ جہاں تک نگاہ پہنچتی ہے میدان ہی میدان نظر آتا ہے ___ آسمان تک ہماری نگاہ پہنچتی ہے زمین سے آسمان تک پانچ سو برس کا راستہ ہے۔ قبر میں ہر انسان کو اتنا بڑا عالم ملے گا جتنا زمین سے لے کر آسمان تک کا مقام ہے۔ تو عالمِ برزخ میں دنیا جیسے لاکھوں عالم بن جائیں۔ معلوم ہوا کہ انسان ترقی کی طرف ہے۔

برزخ میں پہنچ کر پھر انبیاء علیہم السلام نے خبر دی کہ ایک اور عالم آنے والا ہے جو اس سے بھی بڑا ہوگا۔ اور وہ محشر ہے۔ اس عالم کی کل عمر تو چند صدیوں کی ہوگی۔ اس عالم کا پچاس ہزار برس کا ایک دن ہوگا۔ ایک دن میں سارے اوّلین و آخرین انسان جمع ہونگے۔ اس کے بعد پھر انبیاء علیہم السلام نے فرمایا کہ ایک اور عالم آنے والا ہے جس کا نام جنت ہے وہ اتنا بڑا عالم ہے کہ عالم برزخ جیسے کروڑوں عالم اس میں بن جائیں۔ اس لئے عالم برزخ میں ایک آدمی کو اتنا حصہ ملتا ہے جتنا زمین سے لے کر آسمان تک کا مقام ہے' اور جنت میں ادنیٰ

جنتی کو جو حصہ ملے گا وہ اس دنیا کے دس گناہ کے برابر ہوگا۔ تو اندازہ کیجئے جنت کتنا بڑا عالم ہے۔

تو انسان عالمِ اَلستُ سے چلا' عالمِ رحم میں آیا۔ عالمِ رحم سے چلا' عالمِ دنیا میں آیا' عالمِ دنیا سے چلا' عالمِ برزخ میں آیا۔ عالمِ برزخ سے منتقل ہوا' عالمِ محشر میں پہنچا۔ عالمِ حشر سے منتقل ہوا' جنت میں پہنچا۔ اور جنت میں روزانہ ترقی ہوگی' نئے نئے عالم انسان پر کھلیں گے' عجائبات ظاہر ہوں گے۔ طرح طرح کی نعمتیں نمایاں ہوں گی۔

اس لئے کہ انسان میں تجدد پسندی کا جذبہ ہے کہ نئی نئی چیزیں اس کے سامنے آنی چاہئیں۔ اگر ہمیشہ پرانی چیزیں رکھی رہیں' آدمی کا دل گھبرا جاتا ہے۔ اگر روز پلاؤ کھانے کو ملے تو دوسرے دن جی گھبرا جائے ___ کسی دن دال' کسی دن چاول' کسی دن پلاؤ' روز نئی چیز ہو تو انسان کی طبیعت بہلتی رہتی ہے۔ اور روز ایک ہی غذا ہو' چاہے وہ اعلیٰ ہو تو بھی آدمی کا دل گھبرا جاتا ہے۔

اسی واسطے دنیا میں موٹر کاریں ہیں' ہر سال ان کا نیا ماڈل تیار کیا جاتا ہے۔ مکانات کے نقشے بدلتے رہتے ہیں۔ کل کچھ اور رنگ کا مکان تھا۔ آج اور رنگ کا۔ آج کل امریکن اسٹائل مکان چلے ہیں۔ ان کا کچھ اور ہی نمونہ ہے۔ سو برس کے بعد دنیا میں معلوم نہیں کیا نمونہ بن جائے ___ تو یہ انسان کی فطرت ہے کہ نئی نئی چیز سامنے آئے۔ جنت کی نعمتیں کتنی ہی پُر لطف ہوں لیکن اگر ایک ہی قسم کی نعمتیں ہوتیں اور اَبدالآباد تک رہتیں' تو آدمی گھبرا جاتا۔ اس لئے روز نئے نئے سامان ہوں گے۔

حدیث میں ہے کہ جنت میں ایک عالیشان محل ہے۔ جس میں انسان مقیم ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر جو نگاہ اٹھاتا ہے اب تک معلوم تھا کہ سبز رنگ ہے۔ دوبارہ جو نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ اب سرخ ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد نگاہ کی معلوم ہوگا کہ زرد رنگ ہو گیا۔ تو محلات کے رنگ نئے نئے آتے رہیں گے۔ نئے نئے جہاں کھلتے رہیں گے۔ نئی نئی نعمتیں سامنے آتی رہیں گی۔ اور نشاط پہ نشاط پہنچتا رہے گا۔ معلوم ہوا کہ جنت میں بھی حرکت ہی رہے گی ___ اور ختم ہونے والی نہ ہوگی بلکہ ___ عُروج ہوتا رہے گا۔ گویا اصل ترقی وہاں ہوگی۔

بہرحال مجھے ان ترقّیات کی تفصیل بیان کرنا نہیں صرف یہ بتلانا ہے کہ انسان حرکت میں ہے۔ اب بھی آپ حرکت میں ہیں۔ قبرستان میں بھی حرکت میں رہیں گے۔ جنت میں جا کر عالم متعین ہو جائے گا۔ مگر نعمتوں اور لذائذ کی ترقی جاری رہے۔

تو اتنی لمبی حرکت کا کوئی مقصد ہونا چاہئے۔ تھوڑی سی حرکت' گھر سے مدرسہ اور خانقاہ تک کی جائے تو اس کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ چند گھنٹوں کی حرکت ہوتی ہے یہ تو ہزاروں برس کی حرکت ہے۔ تو اتنی طویل حرکت ہو اور بلا مقصد ہو۔ یہ عقلِ بالغ نہیں کہتی۔ عقلِ سلیم یہ قبول نہیں کرے گی کہ انسان ایسے ہی بے کار حرکت کر رہا ہے' اس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ عقل اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ اللہ نے اسے عبث و بے کار پیدا نہیں فرمایا۔

زندگی کی حقیقت

بلکہ یہ آپ کی زندگی' یہ خود ایک مستقل حرکت ہے' جو آدمی کے اندر بہت زور سے چل رہی ہے اور بہت دُور تک چلتی رہے گی۔ جب تک آدمی کا بدن حرکت کرتا رہے گا۔ کہتے ہیں کہ وہ زندہ ہے۔ جب حرکت ختم ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ آدمی مر چکا ہے۔ قلب حرکت کرتا رہے' کہتے ہیں کہ قلب زندہ ہے۔ اگر قلب کی حرکت ختم ہو جائے' تو کہتے ہیں کہ فلاں آدمی کا انتقال ہو گیا ہے ___ تو حرکت بند ہو جانے کا نام موت' اور

حرکت کے جاری رہنے کا نام زندگی ہے ___ انسان کی آنتیں جب تک حرکت کرتی رہتی ہیں فُضلات خارج ہوتے رہتے ہیں' آدمی تندرست رہتا ہے۔ اگر آنتیں حرکت نہ کریں' ان میں غذا پڑی رہے' قبض ہوجاتا ہے' وہی موت کا پیش خیمہ ہے ___ تو آنتیں' دل' جگر اور دماغ سب حرکت میں ہیں' حتیٰ کہ عقلِ انسانی بھی حرکت میں ہے۔ آدمی اس سے کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہے۔ کل کیا ہوگا؟ پرسوں کیا ہوگا ___ ؟ گویا ہر وقت دماغ حرکت میں ہے۔ اگر حرکت بند ہوجائے' کہا جائے گا کہ فلاں آدمی بے وقوف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں عقل نہیں۔ تو ایک ایک قوت اور عضو حرکت کرتا رہتا ہے۔ دیکھا جائے تو نہ صرف انسان بلکہ زندگی بھی حرکت میں ہے۔ اس لئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ انسان اَزلی تو نہیں کہ ہمیشہ سے تھا' مگر اَبدی ضرور ہے کہ پیدا ہو گیا تو اب مٹنے والا نہیں۔ اَبدالآباد تک زندہ رہے گا۔ جگہیں بدلتی رہیں گی ایک عالم سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے اور پھر چوتھے عالم میں۔ تو مکان اور جہان بدلتے رہیں گے اور انسان باقی رہے گا۔

کیا مقصدِ زندگی خورد و نوش ہے؟

تو اس قدر طویل زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ___ مقصد بھی اتنا طویل ہونا چاہئے جتنا لمبا سفر ہے۔ سفر تو ہزاروں برس کا ہو اور مقصد معمولی سا ہو' وہ اس کے اوپر چسپاں نہیں ہوگا۔ مقصد اتنا اونچا اور بلند ہونا چاہئے جو اس کی لمبی عمر کے مناسب ہو' جتنا ہی بڑا سفر اتنا ہی بڑا اور روشن ہونا چاہئے۔ تو وہ کیا مقصد ہے' جس کے لئے ہم پیدا کئے گئے' اور اتنا لمبا سفر اختیار کیا؟

فرض کیجئے یہ مقصد ہو کہ بس آپ روٹی کھا لیجئے۔ یہ بھی ایک مقصد ہے کہ کچھ پیسے جمع کیے' کچھ روٹیاں کھائیں کچھ مزے اڑائے۔ بس آدمی ختم ہو گیا ___ تو اتنا لمبا سفر' اور اس کے لئے مقصد صرف روٹی ___ ؟ (کلّا وحاشا) روٹی تو جانور بھی کھاتے ہیں۔ پھر انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ جو گائے' بھینس' بکری ہیں وہ سب اس مقصد کو ادا کر رہی ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات ___ اتنی بلند مخلوق اور اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ کہ روٹی کھالے اور ختم ہو جائے۔ (یا ایسے اسباب و وسائل میں زندگی گنوادے جن کا نتیجہ بہرصورت روٹی ہو۔ مثلاً تجارت اور صنعت و حرفت وغیرہ' یا باقی اسبابِ معاش جو روٹی کو نتیجہ کے طور پر میسّر کرتے ہوں) یہ کوئی اہم مقصد نہیں ہے۔ اگر یہ اہم مقصد ہوتا تو جو اس مقصد کو زیادہ عمدگی سے انجام دیتا' وہ اشرف المخلوقات ہونا چاہئے تھا۔ وہ انسان نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے ہاتھی بھینس اور گائے وغیرہ اشرف المخلوقات بنتے۔ انسان نہ بنتا۔ یہ اتنا نہیں کھا سکتا جتنا یہ جانور کھاتے ہیں۔ اگر کھانے کے لئے بیٹھ جائے تو ہاتھی کے برابر نہیں کھا سکتا۔ نہ پیٹ اتنا ہے نہ ہاضمہ اس جیسا ہے۔ اس لئے اس طویل زندگی کا مقصد ظاہر ہے کہ وہ روٹی تو نہیں ہو سکتی۔ اتنی لمبی چوڑی حرکت کی زندگی' کیا محض اللہ نے اس لئے دی کہ چند لقمے کھا لئے جائیں۔ یہ تو عارضی سی بات ہے۔

پھر یہ کہ کھانے کا مقصد درحقیقت یہ ہوتا ہے کہ بدن باقی رہے۔ اس کے باقی رہنے کا کیا مقصد ہے؟ پھر مقصد کی تلاش شروع ہو گئی۔ تو روٹی اگر مقصد بنتی' وہ مستقل چیز بنتی' حالانکہ وہ بدن کے پالنے کا ذریعہ ہے۔ پھر سوال اپنی جگہ قائم کہ روٹی بدن کے پلنے کا ذریعہ ہوتی۔ پھر بدن کے پلنے سے کیا مقصد؟

اور اگر فرض کیجئے روٹی مقصد ہو بھی تو اتنی لمبی چوڑی عمر اور یہ مقصد ___ ؟ یہ مقصد تو پھر جانوروں کو بھی حاصل ہے۔ جانور بھی آخر کھاتے پیتے ہیں۔ اگر آپ نے کھا پی لیا تو کونسا کمال کیا؟

آپ کہیں گے صاحب ہم تو پلاؤ ' زردہ اور مرغ کھاتے ہیں۔ جانور تو یہ نہیں کھاتے ___ میں کہتا ہوں کہ جانور کیوں مرغ نہیں کھاتے۔ کیا بلی مرغ نہیں کھاتی اور شیر 'گائے کو نہیں پھاڑ کھاتا؟ آپ نے گائے کا گوشت کھالیا تو کیا کمال کیا؟ بھینسا وہ بھی کھالیتا ہے آپ بھی کھالیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ مصالحہ نہیں ڈالتا۔ تو مصالحہ ڈالنا بھی کون سے کمال کی بات ہے؟ مصالحوں سے تو بلکہ گوشت کا اصل ذائقہ ختم ہوجاتا ہے۔ صحیح طور پر گوشت کو پکایا جائے۔ تھوڑا سا نمک مرچ ملا کے کھالیا گوشت کا اصل ذائقہ تو رہے گا ___ یہ مصالحوں کی بھرمار سے تو اصل ذائقہ بھی ختم ہوجاتا ہے۔

میں تو کہا کرتا ہوں کہ ہوائی جہاز کا کھانا بڑا اچھا ہوتا ہے۔ وہ گوشت کو خاص طریق سے پکاتے ہیں۔ نہ اس میں نمک ' نہ مرچ ' نہ مصالحہ ___ ترکاری سامنے رکھ دی۔ نمک مرچ ڈالو اور کھالو۔ اس طرح ترکاری کا اصل مٹھاس قائم رہتا ہے اور ہم اتنے مصالحے بھر دیتے ہیں کہ ترکاری کا اصل مٹھاس اور حلاوت ختم ہوجاتی ہے۔

تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے بھی مرغ کھایا اور بلی نے بھی مرغ کھالیا۔ اس نے اصل ذائقہ چکھا آپ نے بدلا ہوا۔ آپ تو گھاٹے میں رہے اور اس نے اصل گوشت کھایا.... یہ کون سا کمال ہے؟ اگر یہ کمال ہوتا ' پھر بلی بھی اشرف المخلوقات ہوتی۔ تو کھانا کوئی مستقل کمال نہیں۔ کھانا ضرورت کے لئے ہے تاکہ بدن باقی رہے اور کھانا کھاتے ہوئے ان کا جی گھبراتا ہے۔ لوگ کہا کرتے ہیں کہ کام زیادہ ہے کھانا وانا تو ہوتا ہی رہے گا۔ معلوم ہوا کہ کھانے کو اصل مقصد نہیں سمجھتے۔ کام کو اصل مقصد سمجھتے ہیں۔ تو کھانا کوئی اہم چیز نہیں۔ اگر ہمیں کوئی ایسا طریقہ ہاتھ لگ جائے کہ بلا کھائے پیئے ہم کام کرتے رہیں ' تو شاید کھانے کی طرف رُخ بھی نہ کریں۔ یہ تو مجبوری کی بات ہے کہ بلا کھائے پیئے زندگی باقی نہیں رہتی۔

مجھے اس پر اپنے بزرگوں کی ایک حکایت یاد آگئی ___ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانئ دارالعلوم دیوبند ' جو میرے دادا بھی ہیں ' ان کے زمانے میں آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی جنہوں نے آریہ سماج کی بنیاد رکھی۔ وہ یو۔پی میں سہارن پور کے ایک قصبے میں آئے اور آکر انہوں نے اعلان کیا کہ کوئی مسلمانوں کا عالم میرے مقابلے میں مناظرہ کرنے کے لئے آئے۔ اور یہ بھی اعلان کیا کہ کسی چھوٹے موٹے عالم سے میں مقابلہ نہیں کروں گا۔ مولبی کاسم (مولوی قاسم) کو بلاؤ۔ ان سے مقابلہ کروں گا ___ حضرت اس زمانے میں کچھ بیمار تھے مگر وہاں کے خدام نے لکھا کہ حضرت یہ صورت حال ہے اس لئے آپ ہی کو آنا ہوگا کیونکہ اس نے تو اعلان اور چیلنج کیا ہے کہ مولوی قاسم سے مناظرہ ہوگا.... اسی بیماری کی حالت میں حضرت تشریف لے گئے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ تو آئیں گے نہیں ___ جب حضرت پہنچ گئے تو جناب نے یہ سوچنا شروع کیا کہ جان کس طرح چھوٹے ' بھاگوں کس طرح؟

منشی نہال احمد صاحب ' حضرت کے خادم خاص تھے۔ یہ بڑے ذہین و ذکی تھے۔ حضرت نے ان کو پنڈت جی کے پاس بھیجا کہ آپ جا کے مناظرہ کی شرائط طے کرو کہ کن احوال اور شرائط پر مناظرہ ہوگا۔ کیا صورت اختیار کی جائے گی تاکہ پھر مناظرہ ہوسکے۔ منشی صاحب پہنچے تو پنڈت جی کچھ کھانے میں مصروف تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ جس کمرے میں پنڈت جی تشریف رکھتے ہیں۔ وہاں ایک بہت بڑی پرات (تھال) جس میں بہت سا حلوا پوری ' ترکاری اور بہت کچھ.... غرض دس پندرہ سیر وزن کا ملبہ اس کے اندر بھرا ہوا۔ وہ لے جایا گیا۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک آدمی کی خوراک تو نہ تھی ' انہیں خیال گذرا کہ کمرے میں ایک آدمی تو نہیں ہوگا۔ ایک آدمی آخر کتنا کھالے گا؟ پنڈت جی کے اعزاز میں بڑی دعوت کا اہتمام کیا گیا ہوگا۔ اس لئے یہ انتظار میں

کمرہ سے باہر بیٹھے رہے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد جب وہ پرات آئی' وہ بالکل خالی تھی' وہ یہی سمجھے کہ کئی آدمی ہوں گے ایک تھوڑا اتنا کھا سکتا ہے ___ اس کے بعد ان کو بلایا گیا' دیکھا کہ پنڈت جی اندر اکیلے بیٹھے ہیں۔ یہ حیران ہوئے کہ ایک آدمی پندرہ بیس سیر کا ملبہ کس طرح کھا سکتا ہے؟ دل میں خیال کیا کہ جس کمرہ میں پنڈت جی بیٹھے ہیں۔ ممکن ہے اس میں کوئی دروازہ دوسری طرف ہو۔ لوگ کھا کے ادھر سے نکل گئے ہوں' مگر وہاں تو کوئی دروازہ نہیں تھا۔ یہی ایک دروازہ تھا جس سے یہ خود داخل ہوئے تھے ___ پھر انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ پنڈت جی کے ساتھ کسی اور نے بھی کھانا کھایا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ نہیں' اور تو کوئی شریک نہیں تھا ___ اب یہ حیران ہوئے کہ یہ آدمی ہے یا آدمی سے باہر کوئی خاص قسم کا انسان یا جانور ہے جو اتنا کھا گیا (کہ خدا کی پناہ)۔

جب واپس آئے' انہوں نے حضرت کو شرائط بتلائیں۔ اس کا سنانا تو مقصود نہیں ہے ___ لیکن جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بات چیت کر چکے تو باہر آ کے اپنے ہمجولی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد حسن صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت کے شاگرد اور ان کے ساتھی تھے' سے بات کی کہ بھائی مجھے تو ایک فکر پیدا ہو گیا ہے' بڑی پریشانی ہو گئی اور اس کا حل بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ سب ساتھی متوجہ ہوئے کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ پریشانی یہ ہے کہ جب مناظرہ ہو گا' حضرت اِنشاء اللہ جیتے گیں' اس لئے کہ حق پر ہیں اور مناظرہ علم میں ہو گا تو علم میں ہمارے حضرت سے بڑا کوئی عالم ہم نہیں دیکھتے۔ اس لئے حضرت ہی غالب آئیں گے۔ لیکن اگر کھانے میں مناظرہ ہو گیا تو پھر کیا ہو گا؟ یہ ایک ہنسی کی بات تھی۔ لوگ ہنس کے چُپ ہو گئے۔ شدہ شدہ بات حضرت کے پاس پہنچ گئی۔

حضرت نے انہیں بلایا اور فرمایا۔ منشی جی! آپ نے کیا بات کی؟ ___ یہ بے چارے بہت گھبرائے۔ اس لئے کہ مذاق کی بات تھی۔ اپنے دوستوں میں کر دی۔ اب اپنے شیخ کے آگے خاموش ___! کہیں تو کیا کہیں؟

حضرت نے فرمایا کہ جو تم نے کہا ہے میں سُن چکا ہوں۔ ذرا تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں تاکہ تمہیں جواب بھی بتلا دوں۔ اس لئے کہ تم نے یہ ظاہر کیا کہ یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ اور حل طلب ہے۔ تو مجھے اس کا حل بھی بتلانا ہے۔ مگر اپنی زبان سے کہو۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ حضرت میری زبان سے یہ نکلا تھا کہ اگر علم میں مناظرہ ہوا تو اِنشاء اللہ ہمارے حضرت غالب آئیں گے۔ لیکن اگر کھانے میں مناظرہ ہو تو کیا ہو گا ___؟ اس لئے کہ پنڈت تو بیس سیر کا ملبہ کھا جائے گا اور آپ سے آدھی چپاتی بھی نہیں کھائی جائے گی۔

حضرت نے فرمایا کہ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک ہنسی کا جواب ہے اور ایک حقیقی اور تحقیقی جواب ہے۔ ہنسی کا الزامی جواب یہ ہے کہ کیا سارے مناظروں کے لئے میں ہی رہ گیا ہوں تم لوگ کس کام کے لئے ہو؟ اگر کھانے میں مناظرہ ہو گیا۔ میں تم کو آگے کر دوں گا۔

اس کے بعد فرمایا کہ تمہارے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا کہ کھانے میں مناظرہ ہو تو کون جیتے گا؟ ___ فرمایا کہ کھانا بہائم اور جانوروں کی علامت ہے' تو مناظرہ بہیمیت اور جہالت میں ہوتا ہے یا علم میں؟۔ فرمایا اگر بہیمیت میں مقابلہ ہوا تو ہم پنڈت جی کے مقابلے میں بھینسے' ہاتھی کو پیش کریں گے کہ کھاؤ ان کے مقابلہ میں جتنا کھاتے ہو؟

اور فرمایا کہ تمہارے دل میں یہ سوال کیوں نہ پیدا ہوا کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو پھر کیا ہو گا؟۔ فرمایا اس کے لئے بھی ہم تیار ہیں کہ کھانا کھلانے کے بعد پنڈت جی بھی ایک کمرے میں بند کر دیئے جائیں اور ہمیں بھی بند کر دیا جائے اور چھ مہینے کے بعد نکلیں جو زندہ ہو گا' وہ حق پر ہو گا۔ تو کھانا یہ بہائم کی عادت ہے جو جہالت

کا سرچشمہ ہیں۔ اور نہ کھانا' یہ فرشتوں کی عادت ہے' جو علم کا سرچشمہ ہیں ـــ اور مناظرہ علم میں ہوا کرتا ہے جہالت میں نہیں ہوا کرتا' جہالت میں مناظرہ ہوا تو جانوروں کو مقابلہ میں پیش کریں گے۔ علم میں مناظرہ ہو تو ہم مناظرہ کریں گے۔

یہ بات اس پر یاد آ گئی تھی کہ انسان جب اشرف المخلوقات ہے تو کھانا کھانا اس کی کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے کہ انسان ہی کھاتا ہو۔ انسان سے زیادہ بھینسا بھی کھا سکتا ہے۔

تو انسان کی زندگی کا یہ مقصد تو نہیں ہو سکتا کہ وہ روٹی کھا لے۔ اور مقصد حاصل ہو گیا۔ اور اس لئے اتنا لمبا سفر کہ آدم علیہ السلام کی کمر سے نکلے۔ ماں کے پیٹ میں آئے۔ دنیا میں آئے' اور مقصد یہ ہو کہ کچھ کھا پی لے۔ یہ کیا مقصد ہوا؟ یہ کوئی اہم چیز نہیں' یہ تو بہیمیت کی علامت ہے۔ گو انسان میں بہیمیت ہے اللہ نے اس کو اجازت دی ہے کہ وہ کچھ کھائے پیئے۔ وہ بھی اچھا کھاتا پیتا ہے۔ خوشنما بنا کے کھاتا پیتا ہے۔ مگر مقصد زندگی یہ نہیں ہو سکتا۔

روحانی قوت کی کرشمہ سازیاں

ملائکہ علیہم السلام زندہ ہیں۔ وہ کون سی گوشت روٹی کھاتے ہیں؟ ذکر اللہ ہی سے تو زندہ ہیں۔ اصل زندگی ذکر اللہ کا نام ہے۔ چونکہ ہم اس کوچے سے واقف نہیں' ذکر اللہ کی کوئی کیفیت ہمارے قلب میں نہیں۔ اس لئے ہم غلطی سے یہ سمجھ گئے کہ زندگی کھانے پینے کا نام ہے ورنہ اصل میں زندگی محبوب کا نام لینا ہے کہ آدمی محبوب کا نام لے۔

اگر دنیا میں کسی کو کسی سے محبت ہو جائے' اور محبوب چلا جائے۔ وہ فراق و ہجر میں رو رہا ہے' پریشان ہو رہا ہے۔ روتے روتے ضعیف ہو گیا ہے۔ بالآخر چارپائی کو لگ گیا۔ اچانک اس نے کہا' او تیرا محبوب آ گیا۔ ایک دم اٹھ کر بیٹھ جائے گا کہ کہاں ہے؟۔ یہ جو ایک دم جان آ گئی یہ کہاں سے آئی۔ کیا کوئی روٹی کھالی تھی کوئی پانی پیا تھا؟ محبوب کا نام ہی تو سامنے آیا ـــ معلوم ہوا کہ زندگی کی قوت در حقیقت محبوب کا وصال ہے' روٹی اور کپڑا یہ زندگی کی قوت نہیں ہے یہ تو عوارض میں سے ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ناکہ ؎

ہر چند کہ پیر وخستہ وناتواں شدم
ہر دم نگاہ بروئے تو کردم بس جواں شدم

میں بوڑھا بھی ہو گیا' خستہ و کمزور بھی ہو گیا' ناتواں بھی ہو گیا۔ مگر جب تیرے چہرے پر نگاہ ڈالتا ہوں تو ایک دم جوان ہو جاتا ہوں' قوت آ جاتی ہے اس لئے کہ محبوب کا جمال جب دل میں کھپ جاتا ہے تو قوت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

دنیا میں آدمی جب ان چھوٹے چھوٹے محبوبوں کی قوت سے زندہ ہوتا ہے' اگر کسی کے دل میں اللہ کی محبت سما جائے تو اس کی زندگی کا کیا ٹھکانہ؟ ـــ انبیاء علیہم السلام حق تعالیٰ کی محبت میں غرق ہوتے ہیں اس لئے ان کی زندگی کی قوت محبوب کا نام اور اس کا ذکر ہے۔ روٹی پانی سے انبیاء السلام زندہ نہیں ہیں۔ ذکر اللہ سے زندہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام اگر ایک حبہ (دانہ) بھی نہ کھائیں' تو بھی ان کی زندگی میں فرق نہیں پڑ سکتا۔ وہ اپنی عبدیت ظاہر کرنے کے لئے کھاتے پیتے ہیں' اور امت کے لئے سنت قائم کرنا مقصد ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ عمل کر کے نہ دکھائیں۔ ہم کس طرح سے کھائیں پیئیں؟ ہمارے لئے نمونہ کیا بنے؟۔ تو اسوۂ حسنہ کے طور پر کھاتے ہیں۔ زندگی کی بقاء کے لئے نہیں' وہ اللہ کے ذکر سے ہے۔

آج اگر ہمیں یہ مقام میسّر آجائے کہ ہم بھی ذکر اللہ سے زندہ رہ سکیں تو کبھی روٹی کی طرف رخ بھی نہ کریں۔ یہ تو مجبوری کی بات ہے۔ ذکر اللہ سے ہم ناواقف' غلط فہمی میں مبتلا کہ زندگی روٹی سے قائم ہے اس لئے روٹی کی طرف لپکتے ہیں۔

حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ میرے دادا' جنہوں نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔ اولیائے کاملین میں سے تھے' نے وفات سے دو مہینے پیشتر یہ فرمایا کہ :

"بحمد اللہ مجھے زندہ رہنے کے لئے کھانے پینے کی حاجت باقی نہیں رہی۔ محض اِتباعِ سنت کے لئے کھاتا اور پیتا ہوں' ورنہ حاجت نہیں"۔

یعنی ذکرِ خداوندی دل ودماغ کے اندر اتنا رچ چکا ہے کہ اب اسی سے زندہ ہوں۔ پھر بھی اِتباعِ سنت کے لئے کھاتے تھے' تاکہ اس پر بھی اجروثواب مِل جائے۔ ___ اگر ہمارے ہاتھ میں کوئی ایسا طریقہ آجائے کہ بلا کھائے پیئے ہم زندہ رہیں۔ کبھی کھانے پینے کی طرف دھیان نہ کریں۔ کون اس مصیبت میں پڑے کہ صبح سے شام تک چولھا جھونکو۔ اور کھیتی کرو' وہاں سے غلّہ آئے' وہ پسے' ایک مصیبت ہے۔ جب ہم اس کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں تو کیا ضرورت اس مصیبت میں پڑنے کی؟

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اول تو روٹی مقصد نہیں' جانور بھی کھاتے پیتے ہیں۔ اور اگر کسی درجہ میں ہوتا بھی تو یہ مقصد جانوروں کو بھی حاصل ہے۔ انسان کو آخر اتنی بڑی زندگی کیوں دی گئی ___؟ یہ حقیر چیز ہے اور زندگی بڑی عظیم چیز ہے۔ عظیم چیز کے اوپر ایسا تھوڑا سا مقصد مرتب ہو۔ یہ حکمتِ خداوندی کے خلاف ہے۔

اصل میں کھانے کو چھوڑنا یہ کمال کی علامت ہے۔ کھانا کمال کی علامت نہیں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی بقدرِ ضرورت کھاتے پیتے ہیں ___ صحابہ کرامؓ کی حالت یہ تھی کہ دن بھر گھوڑے کی پشت پر سوار رہتے' کھانے کی کچھ خبر نہ ہوتی تھی' ہر وقت جہاد میں مشغول ہیں۔ بعض کے پاس بغل میں چند ٹکڑے پڑے ہوتے' وہ کھالیتے تھے۔ اور بعض کے پاس وہ چند ٹکڑے بھی نہیں ہوتے تھے۔ کھجور کی چند گٹھلیاں ہی پڑی ہوتی تھیں۔ جب بھوک نے بہت ستایا' بس وہ منہ میں ڈال کے نفس کو بہلا دیا کہ ہم بھی کچھ کھالیں۔ ورنہ وہ کھانے کی کیا چیز ہوتی ہے۔ کھانا تو یہ تھا۔ اور محنت اور جدّوجہد یہ کہ چوبیس گھنٹے گھوڑے کی پشت پر سوار ہیں اور جہاد میں مصروف ہیں۔ اِعلائے کلمۃ اللہ کر رہے ہیں۔ تو کمال ان کا سمجھا جائے گا۔ جنہوں نے کھانا ترک کیا۔ کھانا کھانا کوئی کمال کی چیز نہیں۔ اہلِ کمال جتنے بھی ہیں' وہ کم ہی کھاتے تھے۔ اس لئے انبیاء نے کم کھایا اور صحابہ کرامؓ نے بھی کم کھایا۔ حتیٰ کہ اولیاءاللہ نے بھی کم کھایا۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوھی قدّس اللہ سرہ' جو چشتیہ سلسلہ کے مشائخ میں سے ہیں' وہ اپنے ملفوظات میں لکھتے ہیں کہ میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں' جو چالیس برس سے ایک بادام یومیہ پر افطار کرتا ہے' چالیس برس سے روزے رکھ رہا ہے' اور کوئی روزہ نہیں چھوڑتا۔

شرّاح لکھتے ہیں کہ یہ خود حضرت شیخ قطبِ عالم ہی ہیں ___ تو چالیس برس تک پوری غذا کُل یہ تھی کہ ایک بادام یومیہ کھاتے تھے۔ اور طاقت کا یہ عالم تھا کہ رات کو جب ذکرُاللہ میں مشغول ہوتے' تو شہر میں اس طرح آواز گونجتی تھی کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ ہمارے گھر کے دروازے پر ذکر کر رہے ہیں۔ یہ قوت کھانے کی نہ تھی یہ روحانی قوت تھی جو ذکرُاللہ سے پیدا ہوتی تھی۔

اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صومِ وصال رکھنا شروع کیا روزہ پر روزہ' بعض

صحابہ نے بھی آپ کو دیکھ کر صوم وصال شروع کر دیئے۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا :

ایکم مثلی یطعمنی ربی ویسقینی

تم میں مجھ جیسا اور میری مثل کون ہے؟ مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا پلاتا ہے۔ اس سے میرے اندر طاقت ہے۔ تو وہ کیا چیز کھلائی جاتی تھی؟ آسمان سے کوئی زردہ، پلاؤ اور بریانی کی رکابیاں نہیں اُترتی تھیں۔ وہ ذکر اللہ کی طاقت تھی جو رگ وپے میں رچ بس گیا تھا، اور سرایت کئے ہوئے تھا۔ وہ روحانی قوت تھی اس قوت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کام کرتے تھے۔ یہ مادی قوت نہ تھی۔ اگر ساری عمر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لقمہ بھی استعمال نہ فرماتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طاقت میں فرق نہیں آسکتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے کھایا پیا ہے، تاکہ امت کے لئے نمونہ بن سکے۔ امت کے لئے راستہ بنے، جائز وناجائز کا پتہ چلے، ورنہ کھانے کی محتاجگی نہیں تھی ___ حاصل یہ نکلا کہ کھانا پینا کمال نہیں ہے۔ کھانے کو ترک کرنا کمال ہے۔ دنیا بھی اسی کو کمال سمجھتی ہے۔ اگر ایک شخص بہت کھاتا ہے تو کوئی خیال بھی نہیں کرے گا۔ اگر آپ کسی سے کہیں میں بہت باکمال ہوں اس لئے کہ میں بہت کھاتا ہوں تو وہ کہے گا۔ یہ کون سے کمال کی بات ہے؟ سبھی کھاتے ہیں، جانور بھی کھاتے پیتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص نظر پڑے جو ہفتہ عشرہ تک کھانا نہیں کھاتا، مخلوق اس کے پیچھے ہولے گی کہ معلوم ہوتا ہے ولی اللہ ہیں۔ معلوم ہوا دنیا بھی نہ کھانے کو کمال سمجھتی ہے۔ دنیا کے نزدیک کمال بھی کھانے کو ترک کرنا ہے۔ کھالینا یہ کمال نہیں۔ اسی لئے روزے کو اصل عبادت فرمایا گیا۔ روزہ میں ترکِ طعام ہے کھانا تو نیت سے عبادت بنتا ہے، اپنی ذات سے عبادت نہیں، اور روزہ رکھنا یہ اپنی ذات سے عبادت ہے۔ اللہ کے ہاں بھی مقبولیت نہ کھانے سے پیدا ہوتی ہے، کھانے سے نہیں ہوتی۔

تو اللہ والوں نے بہت ترک فرمایا ہے۔ ہم تم اللہ والے تھوڑا ہی ہیں۔ ہم صبح سے شام تک کھاتے رہتے ہیں۔ صبح کا ناشتہ الگ، دوپہر کا کھانا الگ، شام کا الگ اور رات کا الگ ___ ا. دیہی اتفاق سے چار دفعہ کھانے کے بعد گنجائش نہیں ہوتی۔ ذرا بھی اور گنجائش ہوتی تو ایک دفعہ کا اور اضافہ کر لیتے ___ بہر حال یہ کوئی بڑا کمال نہیں ہے۔ کمال کھانے کو ترک کر دینا ہے ___ تو اتنی بڑی زندگی کا مقصد متعین کرنا ہو، اور وہ ہو کھانا، یہ تو آپ بھی کمال نہیں سمجھتے۔ اسی واسطے یہ اتنی لمبی حرکت کی منزلِ مقصود روٹی نہیں بن سکتی۔

کیا مقصدِ زندگی عزّت واقتدار ہے؟

پھر آخر کیا مقصد ہے؟ ہو سکتا ہے آپ کہیں دنیا میں اس سفر کا مقصد روٹی نہیں ہے، مگر کرسی، عزّت، آبرو، جاہ واقتدار اور منزلت ہو۔ یہ روٹی سے بہر حال اونچے درجے کی چیز ہے۔ آدمی اپنی عزّت بچانے کی خاطر پیسہ اور روٹی داؤ پہ لگا دیتا ہے، تاکہ آبرو پر حرف نہ آئے، تو آبرو روٹی سے زیادہ اُونچی چیز ہے۔

لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ زندگی کا مقصد یہ عزّت بھی نہیں ہو سکتا۔ اس واسطے کہ جس کو آپ عزّت کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ دوسرے آپ کو اچھا سمجھیں۔ بس یہی تو عزّت ہے۔ اس کے سوا تو کچھ نہیں کہ دوسرے یہ خیال کریں کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی عزّت خیالی چیز ہے۔ کسی نے خیال کر لیا کہ آپ بڑے ہیں تو بڑے بن گئے۔ کسی نے خیال نہ کیا، تو آپ چھوٹے کے چھوٹے رہ گئے۔ تو ایک بے بنیاد چیز ہے جس کا نام عزّت ہے، خیالی چیز ہے۔ اور پھر خیال بھی دوسرے کا، اپنا نہیں ___ اگر اپنا خیال ہوتا، چلو صبح سے شام تک یہ خیال کئے بیٹھے رہتے کہ ہم بہت بڑے آدمی ہیں۔ بڑے باعزّت ہیں یہ تو خیالی چیز ہے، اور خیال بھی دوسرے کا، جس پر ہمیں قبضہ حاصل نہیں ہے۔ کوئی دوسرا اگر خیال کئے

بیٹھا رہے تو بڑے ہوں گے۔ اور اگر اس نے خیال یہ کرلیا کہ آپ بڑے نہیں، بس آپ حقیر ہوگئے۔ تو عزّت ایک بے بنیاد چیز ہے، ایسی عزّت، محض خیالی پلاؤ ہے، اور کچھ نہیں۔

عزّت فی الحقیقت اللہ کے ہاں مقبول ہونے کا نام ہے۔ عزّت کسی کے خیال کرلینے کا نام نہیں ہے، اللہ جس کو قبول کرلے، وہ باعزّت ہے۔ جس کو رد کردے، وہ بے عزّت ہے۔ عزّت وذلّت خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ بندے کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اگر بندے سے عزّت کرائیں تو اس کی خوشامد کرتے پھریں۔ تو ذلیل تو پہلے ہی تھے۔ اب ہاتھ جوڑتے پھریں کہ حضور میری عزّت کی جائے۔ کیونکہ کہ عزّت سے پہلے ذلّت ہے، اب خوشامد کے بعد اور ذلیل ہوگئے، عزّت تو کیا ہونی تھی؟

اور اگر آپ ڈنڈا لے کر کہیں کہ میری عزّت.... وہ آپ کے ڈنڈا رسید کرے گا، کہ تو میری عزّت کر۔ یہ تو پہلے سے زیادہ تذلیل ہوجائے گی۔ تو عزّت نہ انسان کے دبانے سے ملتی ہے نہ خوشامد سے ملتی ہے۔ عزّت خُدا کی طرف سے ملتی ہے، جب کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے، یہ ان کا فرمانبردار بنے، وہ قبول کرلیں گے، ان کے قبول کرنے سے انسانوں میں مقبولیّت پیدا ہوگی۔ یہ اصل عزّت ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ، جب کسی سے راضی ہوتے ہیں تو جبرئیل علیہ السّلام کو فرماتے ہیں کہ میں فلاں بندے سے راضی ہوں، تو بھی اس سے راضی ہوجا۔ جبرئیل علیہ السلام راضی ہوجاتے ہیں تو آسمان میں اعلان کرتے ہیں کہ فلاں بندہ میرے ہاں مقبول بن گیا ہے (جو قبولیتِ خداوندی کی علامت ہے)۔ لہٰذا تم بھی اسے مقبول بناؤ، پھر سارے فرشتے اس سے محبّت کرتے ہیں۔ سب فرشتوں میں اس کی عزّت قائم ہوجاتی ہے۔ ان ملائکہ کے اثرات زمین کے ملائکہ کے اوپر پہنچتے ہیں، وہ بھی عزّت کرنے لگتے ہیں۔ زمین کے ملائکہ کے اثرات اولیاءاللہ کے قلوب پر پڑتے ہیں۔ تو اللہ والے بھی اس کو عزّت کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں، اور جتنے لوگ اہلُ اللہ سے وابستہ ہیں، نیک ہیں، پھر ان کی وجہ سے عوام میں بھی محبت آجاتی ہے، الغرض اس شخص کی مقبولیت پوری امّت میں پھیلا دی جاتی ہے۔ یہ مقبولیت کب ہے؟ کہ پہلے اس کو اللہ مقبول بنائے، پھر دوسروں کے اندر اس کی مقبولیت پیدا ہوگی۔ تو عزّت یہ ہے کہ اللہ کسی کو مقبول فرمالے، اس سے راضی ہوجائے۔ انسان خیال باندھے کہ فلاں عزّت والا ہے۔ یہ خیال ھی بے بنیاد ہے۔ تو عزّت بنیاد والی کیا ہوگی؟۔ ورنہ دنیا میں انسانوں کی عزّت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ ایک لیڈر کی ہے۔ پبلک میں اس کی مقبولیت ہوئی تو گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دیئے۔ اور کل جو پبلک خفا ہوئی اور بدلی تو گلے میں جوتیوں کے ہار ڈال دیئے۔ بے چارا بے عزّت پھر رہا ہے۔ اب اسے کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ یہ کوئی عزّت نہیں ہے ___ عزّت کی بنیاد ہی یہ ہے کہ اللہ کسی کو عزّت دے۔ حق تعالیٰ قبول فرمالیں تو ہی عزّت ہے۔ اور حق تعالیٰ تب ہی قبول فرماتے ہیں، جب کوئی نیکی اختیار کرے۔ مامورات کرے اور بدی سے بچے۔ بد عمل و بدکار کبھی باعزّت نہیں ہوسکتا۔ تو اصل عزّت نیکی ہے۔ حق تعالیٰ کے سامنے جھکنے میں اور اس کی اطاعت میں ہے۔ نہ یہ کہ لوگوں کے خیال میں آجائے کہ یہ باعزّت ہیں۔ یہ خیال ہی بے بنیاد ہے۔ اس لئے کہ کل ہے، پرسوں کو نہیں۔

حاصل یہ نکلا کہ زندگی کی اتنی لمبی چوڑی حرکت اس کا مقصد نہ تو روٹی بن سکتی ہے اور نہ کرسی اور عزّت بن سکتی ہے۔ اس لئے کہ روٹی بہائم کی علامت ہے، اور اقتدار پسندی یہ خیالی چیز ہے۔ تو زندگی تو حقیقی ہو اور اس کا مقصد محض خیالی ہو۔ یہ بے جوڑ بات ہے۔ سمجھ میں آنے والی نہیں ہے، حکمتِ خداوندی کے بھی خلاف ہے۔

مقصدِ زندگی قرآن کریم کی روشنی میں

تو یہ دونوں چیزیں مقصد نہیں بن سکتیں۔ تو آخر مقصد کیا ہونا چاہئے۔ لمبی زندگی کا مقصد بھی‘ خود اتنا لمبا ہونا چاہئے جو زندگی کے ساتھ آخر تک جائے۔ یہ دونوں باتیں‘ روٹی اور کرسی لمبا مقصد نہیں۔ اس لئے کہ روٹی آپ اس وقت تک کھائیں گے‘ جب تک دنیا میں موجود ہیں‘ اور جب قبر میں پہنچ گئے‘ تو روٹی تو رہ گئی اور زندگی آگے تک جارہی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی آگے تک جارہی ہے اور مقصد پہلے ہی ختم ہوگیا۔ تو یہ مقصد کیسے بنے گا؟

اسی طرح دنیا کا جاہ واقتدار جو تخیل اور خیال سے ہوتا ہے۔ وہ بھی کوئی پائیدار چیز نہیں ہے۔ جب انسان ختم ہوگیا اور یہاں سے منتقل ہوگیا‘ تو عزت بھی ختم ہوگئی۔ ایک بادشاہ جب انتقال کر جاتا ہے‘ وہ اپنا سارا اقتدار دنیا میں چھوڑ جاتا ہے۔ قبر میں اس کا اقتدار ساتھ نہیں جاتا۔ اب زندگی باقی ہے اور حکومت ختم ہوگئی۔ تو یہ اقتدار کیسے مقصدِ حیات بن سکتا ہے کہ زندگی تو آگے جارہی ہے اور مقصد پیچھے رہ گیا۔ اس لئے نہ روٹی‘ نہ عزت واقتدار اور حکومت مقصد بن سکتی ہے‘ بلکہ صرف ایک چیز مقصد بن سکتی ہے‘ اس مقصد کو قرآنِ کریم نے پیش کیا۔ فرمایا :

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

"میں نے جنّوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا وہ میری عبادت اور اطاعت کریں"۔

انسان کی خِلقت اور پیدائش کا اصل مقصد یہ ہے۔ اگر ایک انسان عبادت میں لگ گیا۔ اس نے زندگی کا مقصد پورا کرلیا۔ عبادت میں نہ لگا‘ زندگی رائیگاں چلی گئی۔ مقصد پورا نہ ہوا ___ تو قرآن حکیم نے مقصد بتلایا کہ زندگی کا مقصد فی الحقیقت اطاعتِ خداوندی اور عبادتِ خداوندی ہے۔ عبادتِ خداوندی ہوگی تو عزت بھی حاصل ہوگی۔ بھوکے نہیں رہوگے‘ روٹی بھی ملے گی۔ اصل مقصد یہ ہے۔

یہ مقصد کیوں ہے؟ اس لئے کہ روٹی اگر مقصد ہو تو عمر تو بہت آگے تک جارہی ہے اور روٹی قبر کے کنارے پر ختم ہوگئی۔ وہ مقصد کیا ہوا جو پوری عمر پر مرتّب نہ ہو۔ مقصد وہ ہے کہ جب تک عمر چلے‘ مقصد بھی چلتا رہے۔ وہ مقصد‘ مقصد نہیں بن سکتا کہ عمر تو آگے تک چلے اور وسیلہ قبل از وقت ختم ہوجائے۔

اسی طرح سے خیالی عزت بھی قبر سے آگے نہیں جاسکتی۔ جب قبر میں ہم پہنچ گئے‘ کوئی ہمارے لئے (بڑے ہونے کا) خیال باندھے نہ باندھے‘ ہمارے لئے برابر ہے ___ وہاں تو اپنے عمل کا امتیاز ہوگا۔ وہاں یہ تھوڑا ہی دیکھا جائے گا کہ پبلک ہمارے لئے کیا خیال لئے ہوئے ہے؟ ___ یہ نہیں دیکھا جائے گا۔

اَبدی زندگی کا اَبدی مقصد

اور اگر اطاعت وعبادت مقصد ہو تو یہ فی الحقیقت لمبا چوڑا مقصد ہے جو پوری عمر پر مرتّب ہوتا ہے کہ جب تک انسان دنیا میں موجود ہے عبادت اس کے ساتھ رہے گی۔ قبر میں جب پہنچے گا‘ جب بھی عبادت موجود ہوگی۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے تو فرمایا گیا کہ :

الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون

''انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں''۔

حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کانی انظر الی موسٰی یلبی ___ میں موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ لبیک لبیک کہتے ہوئے میدان عرفات کی طرف جارہے ہیں ___ معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام حج بھی کرتے ہیں اور نماز بھی پڑھتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے حضرت یونس علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ اونٹنی پر سوار ہیں، اور وہ حج کررہے ہیں۔ اس اونٹنی کا لگام اون اور صوف کا ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ علیہ السلام نے طواف فرمایا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی طواف میں ساتھ تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص ''مربوع القامۃ'' یعنی چوڑا سینہ اور بہت موزوں قد اور سرخ و سفید چہرہ جیسے گلاب کا پھول ہوتا ہے اور اتنا ترو تازہ گویا ابھی حمّام میں غسل کرکے نکلے ہیں کہ بالوں سے ابھی پانی ٹپک پڑے گا۔ اتنا شاداب اور ترو تازہ، اور نہایت حسین و جمیل چہرہ ___ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون طواف کررہے ہیں؟ ___ کہا یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسیح اللہ ہیں ___ معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام بھی طواف کرتے ہیں، لبیک لبیک کہتے ہوئے میدان عرفات میں بھی جاتے ہیں۔ نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ قبر میں ذکر اللہ بھی کرتے ہیں۔

تو انبیاء علیہم السلام کے لئے تو ذکر اللہ اور عبادت صراحۃً احادیث سے ثابت ہے۔ ہمارے آپ کے لئے اور عامۃ المؤمنین کے لئے تو یہ ثابت نہیں ہے کہ وہ ہاتھ پیر سے عبادت کرتے ہیں.... مگر ہاں ایک عبادت ہم بھی کرتے ہیں۔ وہ عبادت ہم قلب سے کرتے ہیں۔ بدن تو رہتا نہیں۔ انبیاء کا تو بدن بھی محفوظ ہے، وہ تو بدن سے عبادت کرتے ہیں۔ ہمارا بدن تو مِٹ جاتا ہے۔ اس لئے بدنی عبادت نہیں رہے گی مگر روحی عبادت ہم بھی کرتے ہیں۔ اور وہ قلب کے جذبے اور تخیّل کی عبادت ہے۔ اس لئے کہ بدنی عبادت تو جب کریں جب بدن ہو۔ یہ عمل کا آلہ ہے۔ جب بدن نہیں رہے گا۔ آگے صرف روح ہی رہ جائے گی، روح عمل نہیں کرسکتی، مگر جذبات کی عبادت کرسکتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب منکر نکیر سوال و جواب کے لئے آتے ہیں اور دو تین سوال کرتے ہیں کہ مَنْ رَّبُّکَ؟ تیرا پروردگار کون ہے؟ وما دینک؟ تیرا دین کیا تھا؟ ومن نبیک؟ تیرے نبی کون تھے؟ ___ توحید رسالت اور شریعت، ان تینوں کا سوال ہوتا ہے ___ حدیث میں فرمایا گیا جب ملائکہ علیہم السلام مؤمن سے کہیں گے کہ من ربک؟ تیرا پروردگار کون تھا؟ تو بموجب حدیث مؤمن کو جو اس وقت، وقت دکھلایا جائے گا۔ وہ ایسا ہوگا جیسے سورج غروب ہونے کو ہے، اور دھوپ میں زردی چھاچکی ہے، دن ختم ہوچکا اور مغرب آنے والی ہے۔ یتمثل لہ الشمس۔ قبر میں سورج کی صورتِ مثالی دکھلائی جائے گی ___ تو فرشتوں کے جواب میں یہ بندہ مؤمن کہے گا ''دعونی اصلی'' ___ میاں پرے ہٹو۔ وقت تنگ ہوگیا ہے۔ میری نماز قضا ہونے کو ہے مغرب آجائے گی ___ تو ایک فرشتہ دوسرے سے کہتا ہے کہ اس سے ''ربّ'' کے بارے میں کیا سوال کرتے ہیں یہ تو ربّ کی عبادت کرنے کو ہے ___ دوسرا کہتا ہے بہر حال ہماری ڈیوٹی ہے جو انجام دینی ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ یہ جواب حق دے گا۔ اس کا چہرہ اور عمل ہی بتلا رہا ہے۔

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے وہاں بدنی عبادت تو نہیں کرسکتے، مگر تخیّل کی عبادت تو کریں گے۔ جذبہ یہ ہوگا تبھی ''دعونی اصلی'' کہیں گے کہ میاں پرے کو ہٹو، نماز پڑھنے دو۔

اس پر فرشتے کہیں گے کہ اب نماز کا وقت نہیں یہ تو عالم برزخ ہے وہ جو نماز پڑھنے کی تکلیف دی گئی تھی، وہ دنیا میں دی گئی تھی۔ برزخ اور عالم آخرت میں یہ تکلیف نہیں دی گئی۔ اس وقت اسے پتہ چلے گا کہ یہ سورج کی صورت مثالی ہے۔ حقیقی دن نہیں ہے۔ میں تو قبر کے اندر ہوں۔

___ مگر "دعونی اصلی" کون کہے گا۔ جس نے دنیا میں نماز پڑھنے کی عادت ڈالی ہو۔

اگر دنیا میں نماز سے بے پرواہ رہے گا تو اس کی زبان سے "دعونی اصلی" نہیں نکل سکے گا کہ مغرب کا وقت آرہا ہے اور مجھے نماز پڑھنے دو ___ اس لئے کہ زندگی میں روزانہ اصلی مغرب کی نماز کا وقت آتا تھا اور اسے نماز کی پرواہ بھی نہیں ہوتی تھی۔ تو جو یہاں بے پرواہ تھا، وہاں بھی بے پرواہ رہے گا۔ جسے یہاں پرواہ تھی، وہاں جا کر بھی پرواہ دار بنے گا ___ حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے، تحشرون کما تموتون وتموتون کما تحیون ___ تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت میں موت آئی۔ اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزاری۔ اگر زندگی ذکر و عبادت میں گزاری ہے تو موت کے وقت بھی ذکر و عبادت کا ہی دھیان ہوگا۔ اور جب قبر سے اٹھے گا جب بھی ذکر کا دھیان ہوگا۔ ___ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی حاجی میدانِ عرفات میں یا منٰی میں لبیک لبیک کہتے ہوئے مرگیا۔ جب وہ میدانِ محشر میں قبر سے اُٹھے گا تو اس کی زبان پر لبیک لبیک جاری ہوگا۔

لبیک اللّٰھم لبیک لاشریک لک لبیک۔

وہ یہی سمجھے گا کہ میدانِ عرفات میں جارہا ہوں ___ آگے جا کے پتہ چلے گا کہ یہ تو میدان محشر ہے، میدانِ عرفات نہیں ہے ___ مگر زبان سے لبیک کیوں نکلا؟ اس لئے کہ لبیک کہتے ہوئے انتقال کر گیا تھا، اور لبیک کہتے ہوئے انتقال کیوں کیا؟ اس لئے کہ زندگی بھر یہ جذبہ تھا کہ کسی طرح حج کروں ___ تو جس حالت پر آدمی زندگی گزارتا ہے۔ اسی حالت پر موت آتی ہے، اور جس حالت پر موت آتی ہے، قبر سے اٹھتے ہوئے بھی وہی حالت ہوگی۔

معلوم ہوا ذکر اللہ اور عبادتِ خداوندی وہ چیز ہے کہ دنیا میں بھی ساتھ، قبر میں بھی ساتھ، اور میدانِ محشر میں بھی ساتھ۔

اور جنت میں بھی ساتھ رہے گی۔ حدیث میں ہے کہ یلھمون التسبیح اہل جنت کو تسبیح الہام کی جائے گی۔ بلا ارادہ سانس کے ساتھ اللہ اللہ جاری ہوگا۔ ارادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ جنت میں یہ تکلیف نہیں دی جائے گی کہ تم بیٹھ کے ذکر اللہ کرو، عبادت کرو، نمازیں پڑھو، وہ تو عیش کی جگہ ہے، ہر وقت راحت ہوگی مگر ان کے دلوں میں الہام کیا جائے گا "پاس انفاس" جیسے ہوتا ہے، جو صوفیائے کرام نے ذکر بتلایا ہے، ذکر اللہ کی وہ صورت ہوگی۔ ہر وقت سانس کے ساتھ اللہ اللہ جاری ہوگا، اصل غذا وہ ہوگی۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں بھی ہوں گی لیکن کھانے پینے کی محتاجگی نہیں ہوگی۔ تفریحِ طبع کے لئے کھائیں پئیں گے بھوک کی تکلیف نہیں ہوگی، کیونکہ جنت میں تکلیف کا کوئی نشان نہیں۔

تو عباداتِ خداوندی دنیا سے چلی، قبر میں پہنچی، میدانِ محشر میں پہنچی، اور جنت تک پہنچ گئی۔ یہ چیز ایسی ہے جو زندگی کا مقصد بن سکتی ہے۔ اگر زندگی ابدی ہے تو عبادت بھی ابدی ہے۔ کھانا پینا ابدی نہیں، یہ تو قبر تک ختم ہوگیا۔ قبر میں کوئی کھانا پینا نہیں ہوگا، اور اگر کچھ کھانا پینا ہوگا بھی وہ بھی ذکر اللہ ہی ہوگا۔ جنت میں کھانا پینا ہوگا، مگر محتاجگی نہیں ہوگی۔ اصل محتاجگی ذکر اللہ کی ہوگی، اور وہ زبان پر جاری رہے گا۔

دنیوی زندگی کی روح

زندگی کا مقصد بنانے کے اگر کوئی چیز لائق ہے تو وہ عباداتِ خداوندی ہے ذکر حق اور اطاعتِ خداوندی ہے۔ یہ چیز ہے جس سے انسان انسان بنتا ہے۔

اکبر الٰہ آبادی ایک بڑے شاعر گزرے ہیں۔ جن کا "لسان العصر" لقب تھا۔ انہوں نے دو شعر کہے ہیں ؎

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے
یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

اب رہی بحث رنج وراحت کی
وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

رنج بھی گزر جاتا ہے، راحت بھی گزر جاتی ہے۔ نہ یہ ابدی نہ وہ ابدی۔ تو اکبر نے کہا کہ مرنا جینا سب کے لئے ہے اور رنج وراحت وقتی چیز ہے۔ آتی ہے گزر جاتی ہے، لیکن ان اشعار میں مقصدِ زندگی نہیں آیا۔ یہ تو آگیا کہ ان چیزوں کی طرف توجہ نہ کرو۔ سوال یہ ہے کہ پھر کا ہے کی طرف توجہ کرو؟ مقصدِ زندگی پھر کیا ہے؟ تو میں نے تین اشعار بڑھا دیے ہیں، اور ان میں مقصد ظاہر کیا گیا ہے۔ اکبر کے تو یہ (مندرجہ بالا) دو شعر ہیں۔ میرے دو شعر اکبر ہی کے مطابق ہیں کہ جن کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے ؎

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے
یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

اب رہی بحث رنج وراحت کی
وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

آگے میں کہتا ہوں ؎

رہ گیا عزّ وجاہ کا جھگڑا
یہ تخیّل کا پیٹ بھرنا ہے

یہ خیالی چیز ہے، یہ لائق توجّہ نہیں ___ اور ؎

قابلِ ذکر ہی نہیں خورد ونوش
یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے

کھانا پینا یہ بہیمی کی علامت ہے۔ جانور بھی کھاتے ہیں۔ ہم بھی اسی کو کھا رہے ہیں۔ ایک مصیبت ہے جو گلے پڑی ہوئی ہے۔ تو یہ مقصد نہیں۔ آگے مقصد کا ذکر کرتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ ؎

مقصدِ زندگی ہے اطاعتِ حق
نہ کہ فکرِ جہاں میں پڑنا ہے

اصل مقصد یہ ہے اطاعتِ خداوندی نصیب ہو جائے ___ قرآن کریم میں اسی کو فرمایا گیا :

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ

میں نے جنّوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا، مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں ___ یہ نہیں فرمایا کہ :

وما خلقت الجنّ والانس الا لیأکلون

میں نے اس لئے پیدا کیا کہ خوب کھائیں، خوب مزے اڑائیں۔ یا یوں فرمایا ہو کہ الا لیعزّون یہ عزتوں کا خوب خیال باندھیں بلکہ فرمایا الا لیعبدون فقط میری عبادت کریں۔

آگے فرمایا :

مَا اُرِیْدُ مِنْھُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَا اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ

میں ان سے رزق نہیں مانگتا، یہ ہوں کہ وہ عبادت کریں ___ اور فرمایا اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُوالْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ ___ رزق دینے والے ہم ہیں۔ طاقتوں کے خزانے ہمارے ہاتھ میں ہیں۔

مطلب یہ کہ ایک کام ہم اپنے ذمّے لیتے ہیں۔ ایک تم اپنے ذمّے لو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم ہماری عبادت کرو۔ اور ہمارا کام یہ ہے کہ ہم تمہیں رزق دیں۔ تم عبادت کرنا ترک کروگے ہم روٹی دینا ترک کردیں گے۔ ہم تمہیں محتاج و مفلس کردیں گے گویا مقصدِ زندگی محض اور محض اطاعتِ حق ہے۔

شبہ کا جواب

یہاں ممکن ہے کوئی سوال کرے، اور سوال وہی کرسکتا ہے، جو قرآن شریف پڑھا ہوا اور قرآن شریف کے کچھ مقاصد اس کے سامنے ہوں کہ صاحب! قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقصد جانوروں کا بھی ہے۔ وہ بھی عبادت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ :

تُسَبِّحُ لَہُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْھِنَّ ط وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ ط

کوئی چیز عالم میں ایسی نہیں جو خدا کی تسبیح نہ کرتی ہو۔ درخت اور اس کی شاخیں، آسمان و زمین، چاند و سورج سب اللہ کی تسبیح میں مشغول ہیں۔ زبان سب کی الگ الگ ہے۔ تسبیحیں سب کی الگ الگ ہیں۔ مگر ہیں سب تسبیح میں مشغول ___ اب اگر کوئی فرانسیسی زبان میں اللہ کو یاد کرنے لگے، ہم نہیں سمجھیں گے۔ کوئی فارسی زبان میں مناجات کرنے لگے۔ غیر فارسی دان نہیں سمجھ پائے گا۔ کوئی عرب، عربی زبان میں دعا کرنے لگے۔ ہم نہیں سمجھ سکیں گے ___ جب ہم اپنے بھائی بندوں کی زبان نہیں سمجھتے تو جانوروں کی زبان نہ سمجھیں، اس میں کون سی تعجّب کی بات ہے؟ طوطا کس زبان میں بول رہا ہے، کبوتر کس زبان میں گویا ہے۔ اگر ہم نہیں سمجھتے تو کیا ہوا۔ ہم اپنے بھائی بندوں کی زبان بھی نہیں سمجھتے۔ جو انسان اپنے بھائی بندوں کی زبان نہ سمجھے، وہ اگر جانوروں کی زبان نہ سمجھے تو تعجب کی کیا بات ہے ___؟ قرآن میں یہی تو فرمایا گیا کہ ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں پاتے۔ ان کی زبان الگ ہے، تمہاری زبان الگ ہے۔ پرندہ بظاہر تو سیٹیاں بجا رہا ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں اللہ کی تسبیح کررہا ہے۔ شیر دھاڑ رہا ہے مگر حقیقت میں اللہ کا نام لے رہا ہے۔ ہاتھی چنگھاڑتا ہے مگر حقیقت میں اللہ کا نام لیتا ہے۔ شیر کی زبان دھاڑنا اور چنگھاڑنا ہے مگر وہ بھی تسبیح ___ اور پرندوں کی زبان سیٹیاں بجانا ہے۔ تم سیٹیاں سمجھتے ہو حقیقت میں تسبیح و تہلیل ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کی زبان سے ہمیں واقف کردے، تب ہمیں پتہ چلے گا کہ یہ تو وہی حمد و ثناء کررہے ہیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ آپ کبھی تار گھر میں ٹیلی گراف دینے کے لئے گئے ہوں گے۔ تو آپ نے تار لکھ کر آفیسر کو دے دیا، اس نے جو مشین پر ہاتھ رکھ کر پیتل کا جو کھٹکا ہوتا ہے اس کو حرکت دی تو وہ کھٹ

کھٹ کھٹاک شروع کی۔ آپ کہیں گے کہ یہ بڑا احمق آدمی ہے، میں نے تو اسے کہا تھا کہ بھائی تار دے دے، اور یہ کھٹ کھٹ کر رہا ہے ____ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس کھٹا کھٹ میں ہی سارے علوم اور معلومات دوسرے ملک پہنچ رہی ہیں۔ ظاہر میں کھٹا کھٹ معلوم ہوتی ہے اور حقیقت میں یہ اصطلاحات ہیں۔ ان کے ذریعے سے جو خبر یا پیغام دیا ہے، وہ دوسرے ملک پہنچ رہا ہے۔ دیکھنے میں کھٹا کھٹ کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اسی طرح سے پرندہ ظاہر میں تو سیٹی بجاتا ہے مگر حقیقت میں وہ تسبیح کرتا ہے۔ اللہ نے اسے شعور دیا ہے وہ عبادت کرتا ہے، جس طرح سے ہم تار کی اس آواز کو محض آواز ہی سمجھتے ہیں ____ لیکن ہم سمجھتے کہ اگر ہم اس فن کو جان لیں تو یہ کھٹا کھٹ نہیں، علوم ہیں ____ بالکل اسی طرح جانوروں کی بولی ہے اگر ہم کسی طرح سے سیکھ جائیں، تب ہمیں پتہ چلے کہ یہ حمد وثنا میں مصروف ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ نے پرندوں کی بولیوں کا علم دیا تھا ____ قرآن کریم میں فرمایا :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ

سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں۔ اے لوگو! ہمیں جانوروں کی بولیوں کی تعلیم اللہ کی طرف سے دی گئی ہے۔ کوئی جانور بولتا تھا۔ فرماتے تھے کہ اس کا یہ مطلب ہے حدیث میں جانوروں کی تصریحات بیان کی گئی ہیں کہ تیتر یہ تسبیح پڑھتا ہے ____ پندرہ مثالیں بیان کی گئیں ____ تیتر بولتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ **کما تدین تدان**۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے جیسی کرتوت ہوگی ویسے ہی نتیجہ سامنے آئے گا ____ یہ اس کی تسبیح ہے۔

حدیث میں ہے کہ بعض ملائکہ علیہم السلام کی یہ تسبیح ہے :

سبحان من زين الرجال باللحى وزين النساء بالذوائب۔

پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو ڈاڑھیوں سے زینت دی، اور عورتوں کو چوٹیوں اور مینڈھیوں سے زینت دی ____ عورتوں کے لئے چوٹی اور مینڈھی رکھنا حسن ہے۔ اور مرد کے لئے ڈاڑھی رکھنا حسن ہے۔ ہر ایک کا حسن الگ الگ ہے۔ مردانہ حسن ڈاڑھی سے اور زنانہ حسن چوٹی اور مینڈھیوں سے ہے ____ غرض بعض ملائکہ علیہم السلام کی تسبیح یہ ہے ____ تو مختلف طریقوں سے پرندے، چرندے اور درندے بلکہ ہر مخلوق کسی نہ کسی طرح کی تسبیح میں مشغول ہے ____ تو کوئی قرآن کریم پڑھنے والا ممکن ہے یہ سوال کرے کہ آپ نے انسان کو اشرف المخلوقات کہہ کر اس کی زندگی کا مقصد عبادت اور ذکر اللہ بتایا ہے۔ وہ جانور، کنکریاں اور پتھر بھی کرتے ہیں، پھر انسان نے کیا کمال کیا جو ذکر اللہ اور عبادت کرلی؟ جیسے آپ نے یوں کہا تھا کہ گدھا گائے اور جانور بھی کھانا کھاتے ہیں اگر انسان نے کھالیا تو کیا بڑی بات ہے؟ قرآن کریم کی رو سے ہم کہیں گے ذکر واطاعتِ خداوندی جانور بھی کرتے ہیں اگر انسان نے کرلی تو کون سا کمال کیا؟ یہ کون سا بڑا مقصد ہے؟ تو ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ پیدا ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ جانور بھی تسبیح وعبادت کرتے ہیں مگر وہ ارادی عبادت نہیں۔ وہ ارادہ سے عبادت نہیں کرتے۔ یہ ان کی طبیعتوں کی فطرت کا تقاضا ہے، جیسے مشین چلتی ہے تو مشین ارادہ کر کے نہیں چلتی۔ ارادہ چلانے والے کے ہاتھ میں ہے۔ یہ سمجھ کر کہ یہ عبادت ہے اور اس کا ثمرہ نکلے گا۔ یہ عقل وشعور جانوروں کو نہیں دیا گیا ____ ارادی عبادت صرف انسان کرتا ہے، تو غیر اختیاری عبادت پر اجر وثواب کچھ نہیں ملے گا۔ ارادہ واختیار سے کی ہوئی عبادت پر اجر وثواب ملتا ہے۔ اور انہیں افعال پر ترقیٔ مدارج ہوتی ہے، اور جو بلا ارادہ خود بخود ہو، اس پر نہ کوئی اجر وثواب، نہ ہی ترقیٔ مدارج کا وعدہ۔

حاصل یہ نکلا کہ جانور بھی عبادت کرتے ہیں مگر وہ غیر ارادی عبادت ہے، اس میں اختیار کا دخل نہیں۔ یہ

ایک طبعی تقاضا ہے۔ جیسے ہم طبیعت کے تقاضے سے کھاتے پیتے ہیں، عقل و شعور سے نہیں کھاتے۔ بھوک جو لگتی ہے تو دلائل سے تھوڑا ہی لگتی ہے کہ آپ بیٹھ کر عقل سے سمجھیں کہ اس وقت مجھے بھوک لگنی چاہئے۔ اس میں یہ برکات اور یہ فوائد وغیرہ ہیں۔ لیکن بھوک جب لگے گی تو آپ لاکھ دلیل سے اسے روکنا چاہیں وہ تب بھی لگ کر رہے گی۔

جیسے انسان بے ارادہ کھاتا اور پیتا ہے اور اس پر اجر وثواب نہیں ایسے ہی اگر کوئی بے ارادہ عبادت کرے اس پر بھی کوئی اجر وثواب نہیں۔

انسان ارادہ، عقل و شعور سے اور اپنے معبود کو پہچان کر عبادت کرتا ہے اور اس کی یہ شان ہے، اس کے یہ کمالات ہیں، اور یہ اس کی صفات ہیں، پھر حق عائد ہوتا ہے کہ اللہ کی عبادت کروں۔ مجھ پر واجب ہے کہ میں اپنے مالک کو یاد کروں۔ دلائل سے سوچ کر، سمجھ کر، ارادہ اور اختیار سے عبادت کرتا ہے ___ کبوتر، کتا، بلی اس شعور سے عبادت نہیں کرتے۔ سیٹی بجانا ان کی طبیعت کے تقاضے کی تسبیح ہے۔ اسی واسطے یہ فرق ہو گیا۔

دوسرے لفظوں میں حاصل یہ نکلا کہ اتنی لمبی چوڑی زندگی کا مقصد ارادی عبادت ہے، جو جانوروں کو میسر نہیں۔

دوسرے شبہ کا جواب

مگر ایک سوال پھر بھی شاید آپ کے ذہن میں پیدا ہو کہ اچھا صاحب!.... یہ ہم نے مان لیا کہ جانور ارادی عبادت نہیں کرتے، یا اختیاری عبادت صرف انسان کرتا ہے، مگر ملائکہ علیہم السلام تو ارادہ سے عبادت کرتے ہیں۔ وہ تو اپنے معبود کو پہچان کر شعور سے عبادت کرتے ہیں۔ پھر اگر انسان نے ارادہ اور شعور سے عبادت کرلی تو کیا کمال کیا ___ ؟ انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کام تو فرشتے بھی کر رہے ہیں۔ پھر سوال وہیں کا وہیں رہ گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ ملائکہ علیہم السلام ارادہ سے عبادت کرتے ہیں، اختیار سے عبادت کرتے ہیں۔ لیکن ارادے کی کی ہوئی عبادت ہی ان کے نفس کا تقاضا ہے۔ اس لئے ان میں گناہ کا مادہ نہیں، وہ برائی کر ہی نہیں سکتے، وہ جب کریں گے نیکی ہی کریں گے، جب کریں گے عبادت ہی کریں گے۔ تو وہ بھی ان کی طبیعت کا تقاضا ہوا فرق اتنا ہے کہ جانور طبیعت کے تقاضے سے بلا ارادہ عبادت کرتے ہیں۔ ملائکہ علیہم السلام طبیعت کے تقاضے سے ارادی عبادت کرتے ہیں۔ تو دونوں جگہ طبیعت کا تقاضا ہی ہے، فرشتوں کی طبیعت میں گناہ کا مادہ نہیں اور شر کا مادہ نہیں کہ وہ مقابلہ کرکے عبادت کریں۔ بس وہ عبادت ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور عبادت کرتے ہیں۔

انسان اپنے نفس کا مقابلہ کرکے عبادت کرتا ہے۔ نفس چاہتا ہے کہ میں آرام سے پڑ کے سوؤں۔ وہ کہتا نہیں لحاف اُتار کے جاکر اپنے رب کی عبادت کر۔ سردیوں کے زمانے میں نفس کا تقاضا یہ ہے کہ گرم گرم لحاف میں پڑا رہے۔ مگر انسان اس گرمی کو چھوڑ کی لحاف کو اُتار کر وضو کرتا ہے، اور اسے ٹھنڈے گرم کی خبر نہیں۔ ہوا میں چل کر مسجد کی طرف آتا ہے۔ مسجد میں آنے کے بعد بھی اونگھ آرہی ہے مگر پھر بھی وہ عبادت کرتا ہے۔ تو اس کی عبادت اپنے نفس کے مقابلے میں ہے۔ فرشتے نفس کا مقابلہ کرکے عبادت نہیں کرتے۔ فرشتوں کے نُفوس تو پاک ہیں۔ ان کا تقاضا ہی یہ ہے کہ عبادت کرو۔ فرق ہو گیا۔ تو یہ عبادت زیادہ قابلِ قدر

ہے جو اپنا مقابلہ کر کے کی جائے۔ اس لئے کہ طبعی تقاضوں کے مطابق کئے ہوئے کام زیادہ قابلِ توجّہ نہیں ہوتے۔

اگر آپ یوں کہیں گے کہ میں بڑے اعلیٰ درجہ کا انسان ہوں اس لئے کہ میں روٹی کھایا کرتا ہوں۔ لوگ کہیں گے کہ بھائی یہ کونسا کمال ہے؟ یہ تمہاری طبیعت کا تقاضا ہے' تم اسے پورا کرو گے ہی۔ کوئی ایسا کام بتاؤ کہ تم نے اپنے نفس کے خلاف کر کے کیا ہو؟ ___ اور اگر کسی کی نسبت یہ معلوم ہو کہ فلاں صاحب ایک ہفتہ تک کھاتے ہی نہیں۔ دنیا پیچھے دوڑ پڑے گی کہ صاحب کوئی ولیؒ اللہ معلوم ہوتے ہیں۔ دنیا ہے کہ جھکی جارہی ہے۔ کیوں ___؟ اس لئے کہ نفس کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ نفس کا تقاضا کھانا ہے' اور وہ ایک ایک ہفتہ کھانا نہیں کھاتے تو کھانا کمال نہیں' نہ کھانا کمال ہے۔

اس لئے فرشتہ اگر عبادت کرتا ہے تو نفس کے خلاف نہیں۔ وہ ایسا ہے' جیسے ہم نے روٹی کھالی۔ اگر طبیعت کے خلاف کر کے عبادت ہوتی تو کمال تھا' اور قابلِ قدر تھا۔ معلوم ہوا کہ انسان کی عبادت فرشتے کی عبادت سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔ وہ طبیعت کے تقاضے پورا کرتا ہے۔ یہ طبیعت کا مقابلہ کر کے عبادت کرتا ہے۔ اپنے کو پہلے ختم کرتا ہے پھر عبادت کرتا ہے۔ یہ زیادہ قابلِ قدر ہے۔

گویا اس لمبی چوڑی زندگی کا مقصد یہ نکلا کہ عبادت ہو۔ ارادی ہو' اور نفس کی مخالفت کے ساتھ ہو۔ یہ کام انسان ہی کر سکتا ہے' اور کوئی نہیں کر سکتا اس واسطے فرمایا کہ : وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر یہ کہ وہ میری عبادت کریں ___ ایسی عبادات جو ارادی ہو اور نفس کی مخالفت سے ہو۔ تو انسان کی عبادت ہی کو یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ وہ ملائکہ علیہم السلام اور دیگر مخلوقات سے بڑھی ہوئی ہے۔ اور افضل ہے۔ بہر حال مقصد زندگی اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے' وہ صرف عبادت اور طاعتِ خداوندی ہو سکتی ہے۔

طاعتِ خداوندی مقصدِ زندگی کیوں ہے؟

اس کی بنا اور حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی جتنی بھی چیزیں ہیں' یہ سب آپ کے کام کی ہیں۔ چنانچہ سب آپ کے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ زمین بھی آپ کے کام میں لگی ہوئی ہے۔ سورج بھی آپ کے کام میں لگا ہوا ہے۔ دریا بھی آپ کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ الغرض کائنات کا ہر ذرہ اس کا خادم ہے' اور حضرتِ انسان مخدُوم ہے۔

اس لئے کہ انسان کی زندگی کا دارومدار ان چیزوں پر ہے۔ ان میں سے ایک بھی نہ رہے ___ تو انسان باقی نہ رہے گا ___ اگر سورج بالکل ہٹا دیا جائے' زندگی ختم ہو جائے گی۔ نہ سورج نکلے گا' نہ چاند ہو گا' نہ حرارت اور گرمی باقی رہے گی۔ انسان باقی نہیں رہ سکتا۔ زندگی کا شیرازہ بکھر جائے گا ___ اسی طرح اگر دنیا میں سے ہوا کو کھینچ لیا جائے' ایک لمحے کے لئے بھی آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ سانس ہی نہیں چل سکتا۔ تو زندگی ختم ہو گئی ___ علیٰ ھٰذا القیاس دنیا میں پانی نہ رہے' اور ایک قطرہ و بوند بھی کسی کو نہ ملے' تو بھی انسان زندہ نہیں رہ سکتا ___ غرض آگ' پانی' مٹی' ہوا' زمین' سورج اور ستارے وغیرہ ذٰلک ان میں سے اگر ایک چیز بھی ختم کر دی جائے' انسانی زندگی ختم ہو جائے گی.... معلوم ہوا کہ ہر چیز انسان کے کام کی ہے۔ انسانوں کے لئے ہی بنائی گئی ہے۔ لیکن انسان خود ان میں سے کسی کے بھی کام کا نہیں ہے۔ اگر سارے انسان ختم ہو جائیں۔ سورج کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ اگر ایک بھی انسان باقی نہ رہے۔ زمین اسی طرح قائم رہے گی۔ آسمان اسی

طرح قائم رہے گا۔ تو آپ نے اندازہ کیا کہ ان میں سے ایک چیز بھی نہ رہے۔ انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور سارے انسان ختم ہو جائیں' ان چیزوں کا کچھ نہیں جاتا۔

معلوم ہوا کہ ساری چیزیں تو انسان کے کام کی ہیں۔ مگر انسان ان میں سے کسی کے کام کا نہیں ہے۔ آخر دنیا کے کروڑوں انسان ختم ہو گئے' اور یہ سب کچھ اسی طرح موجود ہے۔

انسان صرف اللہ کے کام کا ہے

انسان ان میں سے کسی کے کام کا بھی نہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ساری چیزیں انسان کے کام کی ہیں۔ آخر انسان کس کے کام کا ہے؟

جواب اس کا یہی ہے کہ جب انسان مخلوقات میں سے کسی کے کام کا نہیں ہے' خالق کے کام کا ہو گا۔ اور خالق کا کام یہ ہے کہ اس کے سامنے اس کے اطاعت کرے' اس کے سامنے نیاز مندی برتے' عبادت کرے اور جھکے۔ تو انسانی زندگی کا مقصدِ اصلی نکل آیا جو اطاعت اور عبادتِ خداوندی ہے۔ اسی لئے یہ سارا کارخانہ قائم کیا گیا۔ کھانے اور پینے کا نظام قائم کیا گیا ___ کیونکہ انسان اس وقت تک عبادت نہیں کر سکتا۔ اس لئے غذائیں' پانی اور ہوا کو پیدا کیا ___ اسی طرح جب تک چاندنا نہ ہو' عبادت نہیں کر سکتا' اللہ نے سورج چاند کو پیدا کر دیا۔ درخت' جانور' پہاڑ پیدا کر دئے۔ یہ سب کچھ اس لئے پیدا کیا کہ انسان یہ سب کچھ استعمال کر کے تیار ہو جائے' اور اپنے اللہ کی عبادت کرے ___ الغرض یہ سارے انتظامات انسان کے لئے' اور انسان اپنے مالک کے لئے۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص گھوڑا پالے۔ تو گھوڑے کے لئے اصطبل بنائے گا اور اصطبل کے لئے ایک سائیس رکھے گا' جو گھوڑے کی خدمت کرے گا۔ گھاس دانہ اس کے لئے مقرر کرے گا' اس کے لئے ملازم رکھے گا۔ یہ سارا گھوڑے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ اور گھوڑا کس کے لئے؟ صرف مالک کی سواری کے لئے ___.... اگر سواری کے وقت گھوڑا شرارت کرنے لگے' اور سواری کا کام نہ دے' وہ گھوڑا کس کام کا؟ وہ تو گولی مار دینے کے قابل ہے۔ مالک کہے میں نے سارے انتظامات اس کے لئے' اور اس کو اپنے لئے رکھا۔ اگر میرے ہی کام کا یہ نہیں' تو یہ رکھنے کے قابل کہاں؟ اس لئے جب گھوڑا ختم ہو جائے گا' مالک اصطبل کو' سائیس کو' ملازم وغیرہ کو از خود ختم کر دے گا۔ اس لئے کہ یہ سب چیزیں گھوڑے کے لئے تھیں' اور گھوڑے کا مقصد تھا کہ مالک کو سواری کا کام دے۔ جب وہ مقصد پورا نہیں ہو گا' گھوڑا بھی ختم' اصطبل بھی' سائیس بھی ختم۔

ہم اور آپ اس اصطبل میں موجود ہیں۔ دنیا کو اللہ تعالیٰ نے ایک اصطبل بنایا' جس میں غذائیں رکھیں۔ اصطبل کی چھت بھی بنائی' پھر اس میں آگ ہوا وغیرہ سب کچھ رکھا۔ یہ سب کچھ آپ کے لئے اور آپ کو اس لئے کہ مالک کی عبادت کریں۔ اگر انسان عبادت نہیں کرے گا' تو وہ گولی مار دینے کے قابل ہے۔ اور اگر سارے ہی رل کر عبادت چھوڑ دیں' تو سارے انسان ختم ہو جائیں گے۔ یہ اصطبل بھی ڈھا دیا جائے گا۔ اور اس میں جو سامان کھانے پینے کا ہے وہ بھی ختم کر دیا جائے گا۔ اور اسی کا نام قیامت ہے۔

فرمایا گیا کہ قیامت اشرار خلق پر قائم ہو گی۔ ان لوگوں پر جو بدترین خلائق ہوں گے۔ جنہیں اچھے بُرے کی تمیز نہیں ہو گی' بر سرِ بازار بُرائیاں کرتے پھریں گے جیسے جانور اور بہائم ہوتے ہیں۔ اللہ کی کوئی قدر قلوب میں باقی نہیں رہے گی۔ جب اس طرح کے انسان بن جائیں گے تو وہ بھی ختم کر دیئے جائیں گے۔ آسمان

بھی اُٹھا دیا جائے گا۔ زمین بھی ختم کر دی جائے گی۔ اس لئے کہ جب تخلیق انسانی سے مقصدِ خداوندی ہی پورا نہیں ہوتا، پھر یہ چیزیں بھی بیکار ہیں۔ ساری چیزیں انسان کے لئے ہیں۔ اگر وہ مالک کے کام کا ہے تو ساری چیزیں برقرار رہیں گی۔ اگر وہ اپنے مالک کے کام کا نہیں، یہ ساری چیزیں ختم کر دی جائیں گی۔

عقلی اعتبار سے عبادتِ خداوندی کی ضرورت

آپ اللہ سے لو لگائیں تو یہ ساری کائنات آپ کی خدمت کرے گی۔ لیکن اگر آپ اپنے مالک کو چھوڑ کر اس کائنات سے لو لگائیں تو مالک کا کیا بگڑے گا۔ وہ یہ چاہے گا کہ یہ انسان گولی مار دینے کے قابل ہے۔

بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کسی صاحبِ جمال عورت سے نکاح کرے۔ بڑی شائستہ، مہذب اور حسین و جمیل ہو۔ اس کے لئے ایک عمدہ بلڈنگ تیار کی، تاکہ یہ عورت آرام کر سکے۔ بلڈنگ میں کچھ فراش مقرر کئے تاکہ وہ اس کو جھاڑیں، اور صاف کریں۔ باورچی مقرر کئے تاکہ دو وقت کھانا پکائیں، تو اس نے یہ خیال کیا کہ اس کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اس لئے ایک لمبا چوڑا تاج محل قائم کیا۔ بڑی لمبی چوڑی اور عالیشان بلڈنگ قائم کی۔ یہ سب کچھ کاہے کے لئے؟ صرف بیوی کے لئے۔ اور بیوی کاہے کے لئے؟ صرف خاوند کے لئے۔

اگر یہ بیوی خاوند کی بجائے کسی نوکر سے ملاقات شروع کردے۔ یا اس محل میں باہر سے کوئی آدمی آنے لگے تو خاوند پر کیا گزرے گی؟ وہ کہے گا یہ بیوی طلاق دینے کے قابل ہے، بلکہ گولی مار دینے کے قابل ہے، اس نے تو میری آبرو ختم کر دی ___ تو وہ بیوی کو ختم کر دے گا۔ جب بیوی ختم ہو جائے گی، بلڈنگ کو کیا کرے گا؟ اسے بھی ختم کر دے گا، اور جب بلڈنگ ہی نہ رہی، فراش کو رکھ کر کیا کرے گا؟ باورچی وغیرہ کس کام آئیں گے؟ یہ تو ساری چیزیں بیوی کے لئے تھیں۔ جب بیوی کو طلاق دے کے نکال دیا، ان چیزوں کی کیا ضرورت باقی رہی؟ ___ یہ قصہ کب ہو گا؟ جب بیوی اپنے خاوند کی ہونے کی بجائے کسی دوسرے کی بننے لگے۔ فراشوں سے ہاتھ ملانے لگے، نوکروں سے آشنائی کرنے لگے۔ ایسے میں یہ بیوی نکال دینے ہی کے قابل ہو گی۔

ٹھیک اسی طرح سے سمجھ لیجئے کہ اللہ نے انسان کو بڑی مخلوق بنایا۔ اللہ کو انسان سے اس سے بھی زیادہ محبت ہے جتنی کہ ایک خاوند کو بیوی (بلکہ ماں کو بچے) سے ہو سکتی ہے۔ اس کی ضرورت سے حق تعالیٰ شانہٗ نے ایک بڑی بلڈنگ تیار کی، اور آسمان کا خیمہ قائم کیا۔ اور زمین کا فرش بچھایا۔ **جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا** ___ زمین کو ہم نے تمہارے لئے فرش بنایا۔ **وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا** آسمان کو تمہارے لئے محفوظ چھت بنا دیا۔ روشنی کی ضرورت تھی تو چاند سورج کے بلب لٹکا دیئے، تاکہ کائنات کے اندر روشنی ہو ___ کاروبار کے لئے تیز روشنی کی ضرورت تھی تو دن میں سورج نکال دیا۔ رات کو ہلکی روشنی کی ضرورت پڑتی ہے تو چاند ستارے نکال دیئے۔ ان میں روشنی بھی ہے مگر آنکھوں میں چمک نہیں پیدا کرتی ___ تو رات میں دھیمی اور دن میں تیز روشنی رکھی۔ دن کاروبار کے لئے اور رات آرام کے لئے ہے۔ فرمایا: **وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا** ___ رات کو سکون کے لئے بنایا گیا، تاکہ آرام کیا جا سکے۔ **وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا** ___ دن کو کام کاج کے لئے بنایا۔ تاکہ کارخانے لگا کر کام کریں، تو اس میں تیز روشنی رکھی۔ رات کو دھیمی روشنی رکھی۔ پانی کی ضرورت تھی۔ سو ہر طرف دریا بہا دیئے۔ بارش سسٹم الگ قائم کیا تاکہ پانی ہر وقت ملتا رہے۔ مخلوق کو تکلیف نہ ہو۔ زمین کو فرش بنایا۔ یہ فرش بھی ہے اور گودام بھی ہے اس لئے کہ غذائیں اسی میں سے نکلتی چلی آ رہی ہیں۔ گندم، چاول اور بے شمار نعمتیں بھی۔ تو یہ فرش اور بچھونا بھی اور ساتھ ہی گودام بھی کہ

اس میں سارے غلے رکھے ہوئے ہیں۔ ساری ترکاریاں رکھی ہوئی ہیں۔ بارش سسٹم بھی اسی میں ہے۔ دریا بھی اسی میں ہیں۔ پھر پانی آسمان میں نہیں ہے۔ زمین کے اندر ہے' اور زمین کے بھی اوپر نہیں ہے تاکہ انسان کو تکلیف نہ ہو ــــ سورج کی روشنی تھی۔ گویا وہ ایک لالٹین اور چراغ ہے جس سے انسانوں کو روشنی پہنچتی ہے۔ ایک گھڑی بھی جس سے صحیح اوقات معلوم ہوتے ہیں' جس روز سے اس کے مالک نے اس کو بنایا ہے۔ صحیح ٹائم دیتی چلی آرہی ہے۔ آج تک کبھی اس میں خرابی پیدا نہیں ہوئی' اور ایک ہیٹر بھی جس سے گرمی پہنچ رہی ہے تو سورج ایک ہے مگر منافع اس کے بے شمار ہیں۔ اسی طرح زمین ایک ہے مگر اس کے منافع بے شمار ہیں۔

یہ سارا قصہ اس لئے تاکہ انسان کو تکلیف نہ ہو' کھانے کو ملے' پینے کو ملے' ہوا ملے۔ تاکہ اس کے کام کاج میں کوئی خلل نہ پڑے۔ مگر یہ ساری چیزیں انسان کے لئے ہیں۔ اور انسان اپنے مالک کے لئے ہے' تاکہ اس کی اطاعت و عبادت کرے۔ اس لئے سب کچھ دینے والے وہ ہیں' اور محسن وہ ہیں۔ اس احسانِ عظیم کا بھی تقاضا ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

عبادت وطاعت کا عام مفہوم

اور پھر عبادت وطاعت کے مفہوم کو اتنا عام رکھا کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہو سکتی ہے' اور اسے ایک مخصوص انداز کے ساتھ متعین نہیں کیا بلکہ اس کو اتنا آسان کردیا کہ مسلمانوں کی خدمت کرنا' دوستوں کی خدمت کرنا یہ بھی اللہ اللہ کرنا ہے۔ جو طاعت و عبادت میں داخل ہے۔

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب ہم حج کو گئے تو اس سال وہاں ہیضہ بہت پھیلا' چونکہ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ سے بیعت تھے اور ان کے خلیفہ بھی تھے۔ فرماتے ہیں کہ اس حج کے موقع پر ہزاروں حجاج بے چارے اسی بیماری میں مبتلا تھے۔ اور میرا یہ کام تھا کہ ایک کو دوا پلا رہا ہوں' تو ایک کے لئے کھانا لے کے آرہا ہوں۔ بس خدمت میں لگا ہوا' نہ طواف کر سکتا تھا' نہ حرم میں حاضری ہو سکتی تھی۔ اتنا کام رہ گیا کہ کبھی کسی کو دوا پلا رہا ہوں تو کسی کو لوٹے میں پانی وغیرہ دے رہا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔

غرض اسی پریشانی میں تھا۔ میں نے اپنے شیخ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے حال کی شکایات کی کہ حضرت میرا آنا نہ آنا تو برابر ہو گیا۔ کہ میں نہ تو طواف کے قابل' نہ مدینہ منورہ جانے کے قابل۔ میرے ہاتھ میں تو بس دوا کا پیالہ ہے.... اور بیماروں کے پاس پڑا ہوں ــــ فرماتے تھے کہ حضرت حاجی صاحبؒ نے اس طرح.... سے انگلی دبائی اور فرمایا۔ بیٹا یہ کیا بات کہی آپ نے؟ حج اور طواف بھی عبادت ہے' مگر اس سے بڑھ کر مسلمانوں کی خدمت کرنا ہے' یہ عبادت ہے' تو اجر و ثواب اس سے کہیں زیادہ ملے گا جتنا حج اور طواف میں ملتا ہے

دل بدست آور کہ حجِ اکبر است

آدمی اپنے دل کو قابو میں لائے کہ یہ سب سے بڑا حج ہے۔ تو فرمایا کہ حج کا فریضہ ادا کر لیا ہے۔ اب ان بیماروں کی خدمت کرو' ہزار طواف سے بڑھ کر اجر و ثواب ملے گا۔ جو طواف میں نہیں ملے گا۔ گویا کہ عبادت فقط صدقہ اور نماز میں نہیں ہے۔ عبادت کی بہت سی شاخیں ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا حضرت محمد یعقوب صاحبؒ جو دارالعلوم کے

سب سے پہلے صدر مدرّس ہیں' اور مولانا رفیع الدّین صاحب جو سب سے پہلے مہتمم ہیں۔ نقشبندیہ خاندان کے بزرگ ہیں' اور صاحبِ کشف و کرامت بھی ہیں' اوّل الذکر دونوں حضرات بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ مولانا رفیع الدّین صاحبؒ بھی آئے' مولانا محمدؐ قاسم صاحبؒ نے تواضع کی' اور عرض کیا کہ حضرت آپ بھی کھائیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت میرا تو روزہ ہے۔ نفلی روزہ تھا۔ غروب آفتاب میں کوئی دس منٹ باقی تھے ___ انہوں نے فرمایا کہ حضرت کھائیے.... اللہ اس میں آپ کو زیادہ اجر دے گا۔ بس فوراً بیٹھ گئے۔ اور کھانا شروع کر دیا۔ روزہ توڑ دیا' حضرت فرماتے تھے کہ مجھے اس تعمیلِ حکم میں جو اجر ملا ہے اگر میں ہزار روزے بھی رکھتا تو وہ اجر و ثواب نہ ملتا' جو اس وقت روزہ توڑنے میں ملا۔

تو عبادت فقط نماز روزہ میں نہیں ہے۔ عبادت کھانے' پینے میں بھی ہے۔ سونے' جاگنے' چلنے پھرنے میں بھی ہے۔ گویا اللہ فقط مسجد میں نہیں ملتا۔ گھر میں بھی ملتا ہے۔ دسترخوان پر بھی ملتا ہے۔ ہر جگہ آدمی اللہ کا جمال دیکھ سکتا ہے' جبکہ سچی نیت سے چلے اور طریقِ شریعت کے مطابق چلے۔ اتباع کا جذبہ لے کر چلے۔ تو ہر چیز اس کے لئے طاعت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اسلام دُنیوی معاملات سے روکنے کے لئے نہیں آیا

حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا کہ یہ ساری دنیا تمہارے لئے ہے اور تم اپنے مالک کے لئے ہو۔ مملوک کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے مالک کے سامنے نیاز مندی سے جھکے' اور اطاعت کرے۔ جب آدمی اس میں مضبوط ہو جائے گا تو کوئی دنیا کا کام کرے۔ اس میں خیر و برکت ہو گی۔

اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم کاروبار نہ کرو۔ دنیوی معاملات ترک کر دو۔ اپنے تحفظ کی شکلیں اختیار نہ کرو ___ سب کچھ کرو مگر اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کرو۔ عابد اور بندے بن کے کرو۔ یہ سمجھ کر کہ اسباب میں کچھ نہیں رکھا۔ اس کے حکم کی تعمیل میں ہم نے یہ اسباب اختیار کئے ہیں۔ تو دین اسلام صرف درست کرنے کے لئے آیا ہے.... آپ کے کاموں میں روڑے اٹکانے کے لئے نہیں آیا۔ قلب کا رُخ اللہ کی طرف پھیر لو' اور کام ساری دنیا کے کرو۔ وہ خیر بنتے چلے جائیں گے۔ مسلمان کی شان یہ ہے "کہ دل بیار' دست بکار۔ دل مالک میں لگا ہوا ہے' اور ہاتھ پیر کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسے کاروبار میں بھی برکت ہے۔ یہ عبادت ہی شمار ہو گی۔

تو اسلام کاروبار' اور تجارت و زراعت کو روکنے کے لئے نہیں آیا۔ سب چیزوں کی اجازت دی مگر یہ کہ میرے ساتھ تعلق قائم کر کے میرے حکم کے مطابق چلو۔ اس لئے اسلام آیا ہے۔ اگر اپنے نفس کے حکم کے مطابق چلو گے تو نفس تو ہر ایک کا آزاد اور باغی ہے۔ ظاہر ہے اس سے نہ دنیا بنے گی نہ آخرت۔ اگر یہ ساری چیزیں حکم خداوندی کے تحت کریں تو اس میں خیر و برکت ہو گی۔ دنیا بھی بنی' اور آخرت بھی بنی۔

تو دین کا کام قلب کا رخ درست کرنا ہے جب وہ درست ہو جائے گا' سارا راستہ درست ہو تا چلا جائے گا' اور اگر خدانخواستہ وہ غلط ہو گا' سارے کام غلط ہوں گے۔ مثلاً آپ سفر میں جائیں' اور دو چار ہزار میل کا سفر کیا' لیکن رخ بدل گیا' تو جتنا سفر کرتے جاؤ گے منزلِ مقصود سے دور ہٹتے چلے جاؤ گے۔ تو سفر کی تیاری میں تو آپ نے کمی نہیں کی۔ روپیہ بھی خرچ کیا۔ سامان بھی لیا' لیکن بجائے ادھر کے ادھر چل پڑے۔ جانا تھا آپ کو نیروبی' اور راستہ فرانس کا اختیار کر لیا۔ اور اپنے دل میں یہ سمجھ رہے ہیں۔ کہ نیروبی جا رہا ہوں' جتنا چلو گے نیروبی سے دور ہوتے جاؤ گے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ راستہ بھی چلو' روپیہ بھی خرچ کرو۔ مگر منزل متعیّن کر لو کہ

اللہ تعالیٰ کی طرف جانا ہے۔ جنت کی طرف چلنا ہے۔ آخرت کی طرف چلنا ہے۔ رُخ صحیح کرلو ساری دنیا دین کا بنتی چلی جائے گی۔ اور رُخ اللہ تعالیٰ سے پھیرلو۔ ساری چیزیں وبال بنتی چلی جائیں گی۔ خیر و برکت تو اس میں کیا ہوگی؟ اسلام کا کام راستہ درست کرنا اور صراطِ مستقیم پر چلنا ہے اور یہی حاصل عبادت ہے جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ تو فرمایا : وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ ہماری عبادت کریں ___ اور عبادت کا مفہوم عام قرار دیا ___ اس لئے کھانا' پینا' سونا' جاگنا بھی عبادت ہے۔ جب کہ منزلِ مقصود ہماری ذات کو ٹھہرا دیا جائے۔ بس مقصود یہ ہے کہ مسلمان کی منزل اللہ ہو۔ وہ ہر کام کرتا جائے' خدا کی طرف چلتا جائے اس کا ہر کام باعثِ خیر و برکت ہوگا۔

اور فرمایا :

مَآ اُرِیْدُ مِنْھُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ ۝

"ہم یہ نہیں کہتے کہ تم ہمیں رزق پہنچاؤ۔ تم ہمیں روٹی کھلاؤ۔ ہم تو غنی ہیں۔ روزی کا ذمہ دار اللہ ہے وہ دینے والا ہے"۔

ہم روزی نہیں مانگتے۔ تمہاری نیازمندی چاہتے ہیں' روزی ہم دیں گے۔

اللہ اور بندہ میں مُعاہدہ

تو ایک کام اللہ نے اپنے ذمہ لیا' اور ایک کام بندہ کے ذمہ لگایا' اپنے ذمہ یہ کیا کہ ہم رزق دیں گے' عزت دیں گے ___ تمہارے ذمہ یہ کیا کہ تم عبادت کرو.... نیازمندی برتو۔ اب تم اپنا کام چھوڑ دوگے' وہ بھی اپنا کام چھوڑ دیں گے۔ اس لئے جو عبادت ترک کردے گا' تو روزی اور عزت' جو دیا جا رہا تھا' اس کو بھی بند کر دیا جائے گا۔

اگر اسی کام میں لگے رہے جو آپ کے سُپرد کیا گیا' پھر وہ اپنا کام انجام دیں گے۔ گویا معاہدہ ہے۔ لیکن جب یہ عہد شکنی کرے گا' تو دوسرے کے ذمہ عہد پورا کرنا نہیں رہ جاتا۔

آج جو مسلمان پریشان ہیں کہ ہمارا غلبہ ختم ہوگیا' اقتدار ختم ہوگیا۔ حاسدین ہم پر چھاگئے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ تم نے اپنا کام چھوڑ دیا۔ انہوں نے اپنا کام چھوڑ دیا۔

اور انہوں نے اس لئے نہیں چھوڑا کہ ان کے خزانے میں کوئی کمی تھی ___ معاہدہ تھا کہ یہ کام تمہیں کرنا ہوگا اور یہ ہم کریں گے۔ جب یہ عہد شکنی کرے گا' تو دوسرے کے ذمہ عہد باقی نہیں رہے گا ___ یہ اللہ کا قانون ہے۔ آپ نے اطاعت کا عہد چھوڑ دیا' انہوں نے رزق دینے کا عہد چھوڑ دیا۔ رزق فقط روٹی کو نہیں کہتے۔ رزق روٹی' عزت' اقتدار اور طمانیتِ قلب یہ سب کچھ اس میں آتا ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہم سب پریشان ہیں۔ روٹی ہمیں کھارہی ہے' اور ہم روٹی کو کھا رہے ہیں۔ یہ کیوں ہے؟۔ اس واسطے کہ وہ جو اطمینانِ قلب والی روزی تھی' وہ ملنا بند ہوگئی۔ وہ ہم سے چھین لی گئی۔ اس لئے چھین لی گئی کہ ہم نے عہد شکنی کی۔ تو یہ عہد یاد دلانے ہی کے لئے چند آیتیں پڑھی تھیں۔ اور یہ وہی آیتیں ہیں جو اس عہد سے متعلق ہیں۔ یہیں سے آپ نے زندگی شروع کی ہے۔ یعنی عہدِ اَلَسْتُ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ :

اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ

"کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟

میں تمہارا پالنے والا نہیں ہوں؟ ___ تمہیں روزی اور عزت دینے والا نہیں ہوں؟ ___ یہ ساری چیزیں رب میں داخل ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے سوال کیا اور سب نے کہا کہ :

قَالُوْا بَلٰی

"کیوں نہیں بے شک آپ ہی رب ہیں"۔

سب کچھ آپ ہی ہیں ___ تو فرمایا۔

شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ○

"فرمایا کہ تم بھی گواہ رہو۔ کہیں قیامت کے دن یوں کہہ دو کہ ہمیں تو یہ بات ہی نہیں بتلائی"۔

ہم کس کی عبادت کرتے؟ کس کو رب مانتے؟ ___ اس لئے ہم نے بتلادیا اور سمجھادیا۔

اَوْ تَقُوْلُوْا اِنَّمَا اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ○

"یہ بھی مت کہنا کہ جو ہمارے پچھلے تھے وہ بہت بُرائیاں کر گئے۔ ان کی وجہ سے ہمیں پتہ نہیں تھا"۔

کسی کی بُرائی سے کوئی نہیں پکڑا جائے گا' خود جو بُرائی کرے گا اس کی اس کو سزا ملے گی۔ تم یہ نہ کہنا کہ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا ۔ ہمارے ماں باپ نے شرک اور بُت پرستی کی تھی۔ ہم تو بعد میں تھے۔ ہمیں کیوں پکڑا جاتا ہے۔ جواب میں ہم بتلاتے ہیں کہ ماں باپ کی وجہ سے کوئی نہیں پکڑا جائے گا۔ جیسے ماں باپ سے عہد لیا تھا' تمہارے سے بھی عہد لیا تھا۔ ایک ایک فرد سے عہد لیا تھا۔ انہوں نے اگر عہد شکنی کی تھی تو تم نے کیوں کی؟ ___ قیامت کے دن یہ عذر نہیں چلے گا کہ پچھلوں کی بُرائی نے ہمیں اندھیرے میں رکھا۔ ہمیں تو کچھ پتہ نہیں تھا۔ ہم غفلت میں رہے۔

تو ہماری زندگی عہد اَلَسْتُ سے چلی ہے۔ جہاں اقرارِ ربوبیّت کیا تھا' اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ میں خالق اور مالک ہوں۔ مجھے یاد رکھنا اسی عہد کو یاد دلانے کے لئے انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام آئے۔ یہ روز کی تقریریں اور وعظ اسی عہد کو یاد دلانے کے لئے ہیں کہ یہ عہد بھول نہ جانا۔

اس لئے جب بندہ اس عہد پر پکا رہے گا۔ اور اس کے مطابق چلے گا' تو ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اپنے عہد کو پورا کریں۔

بس یہ چند باتیں آیت کے تحت میں مجھے گزارش کرنی تھیں۔ وقت زیادہ ہوگیا ہے۔ اور بقدرِ ضرورت آیات کی تشریح بھی ہوگئی ہے۔ اب دعا کیجئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حسن اخلاق' عبادت' ریاضت اور توجہ اِلیٰ اللہ کی توفیق عطا فرمائے' اور ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اساسی عبادات

پہلا مظاہرہ عجز ونیاز کا ہے جس کی صورت نماز ہے۔ اور دوسرا مظاہرہ عشق و محبت کا ہے جس کی صورت حج ہے ـــــ اس لئے یہ دو ہی عبادتیں اسلام کی اساس و بنیاد بنائی گئیں جب کہ تمام صفاتِ خداوندی بھی دو ہی نوعوں (جلال و جمال) میں سمٹی ہوئی ہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی انہی دو نوع صفات کے حقوق ادا کرنے سے ممکن تھی، جن کی تشکیل کے لئے نماز اور حج کے افعال رکھے گئے۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرّہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ـــــ اَمَّا بَعْدُ ـــــ

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

بنیادی عبادات

بزرگانِ محترم!

اسلام میں بنیادی طور پر عبادتیں، دو ہی ہیں۔ جن پر پورے اسلام کی عمارت کھڑی ہوئی ہے، ایک نماز، دوسرے حج۔ وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی لامحدود صفاتِ کمال کو اگر اصولی طور پر سمیٹا جائے تو دو ہی نوعوں میں سمٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک صفاتِ جمال اور دوسرے صفاتِ جلال۔

منشاء عبادات

صفاتِ جمال مہر و لُطف کی صفات ہیں جیسے رحمت و رأفت، عفو و کرم، علم و صبر، خلاقی و رزاقی، نگہداشت و حفاظت، راہنمائی و ہدایت، ستاری و مغفرت، جود و عطاء، انعام و احسان، نصرت و اعانت وغیرہ

اور صفاتِ جلال قہری صفتیں ہیں جیسے :

قہر و غضب، جبر و تشدد، مواخذہ و انتقام، غلبہ و استیلاء، عزت و جبروت، مالکیت و ملکیت، حکومت و حاکمیت، سلب و منع وغیرہ۔ قرآن حکیم نے حق تعالیٰ کی ان دونوں شانوں کی طرف جن کے نیچے یہ دو نوعیں

آئی ہوئی ہیں، ان جامع اور معجزانہ الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے :

تَبٰرَکَ اسْمُ رَبِّکَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ۔

جلال کے نیچے قہری صفتیں آجاتی ہیں اور اکرام کے نیچے مہری صفات رہتی ہیں۔
ایک جگہ صراحت کے ساتھ ان دونوں شانوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے :

نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ۔

ایک جگہ فرمایا :

غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ذِی الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔

ایک جگہ صفاتِ جمال کے افعال بیان فرمائے گئے کہ :

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا

اور اسی طرح آگے صفاتِ جلال کے افعال کا تذکرہ فرمایا گیا کہ :

وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ

اسی طرح ایک موقع پر صفاتِ مہر کے تحت امیدیں باندھتے رہنے کا حکم دیا اور مایوسی ختم فرمادی کہ :

اِنَّهٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ۔

"بلاشبہ کفار ہی اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں"۔

اور صفاتِ قہر کے تحت بے خوف ہوجانے سے روکا گیا کہ :

فَلَا یَاْمَنُ مَکْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ۔

"اور (آدمی) مطمئن نہ ہو بیٹھے اللہ کی مخفی تدبیر سے"۔

منشاء جلال وجمال

ایک جگہ صفاتِ جلال اور صفاتِ جمال دونوں کے منشاء پر مطلع فرمایا گیا کہ صفاتِ قہر کے ظہور کا منشاء جرائم ہیں اور صفاتِ مہر کے نزول کا منشاء ایمان ہے :

فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔

ایک جگہ اولاً شانِ رحمت کے تحت افعالِ خیر پر انعام کا ذکر فرمایا گیا اور آگے اسی کے ساتھ شانِ غضب کے تحت افعالِ شر پر سزا وانتقام کا ذکر کیا گیا :

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَکُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ۔

بہر حال صفاتِ کمال کی یہی دو بنیادی نوعیں ہیں جن کے نیچے تمام صفاتِ ربّانی آئی ہوئی ہیں۔
جلال وجمال اور مہر وقہر، صفاتِ جمال کا سرچشمہ رحمت ہے۔ اور صفاتِ جلال کا سرمنشاء غضب ہے۔ اسی لئے اس کی ذاتِ بابرکت رحمٰن بھی ہے اور غضبان بھی۔ رحمت کی شان سے کرم فرماتا ہے۔ اور غضب کی شان سے تنبیہہ ومؤاخذہ۔ ظاہر ہے کہ بندوں کو دونوں ہی کی ضرورت ہے کیونکہ مخلوق خیر وشر کے دو مادوں سے مرکب ہے، بندہ کی خیر رحمتِ خداوندی کو جذب کرتی ہے اور اس کا شر غضبِ الٰہی کو، اور سب جانتے ہیں کہ ان دونوں نوعوں کے جمع ہوئے بغیر ربوبیت اور پال پرورش کا کارخانہ نہیں چل سکتا۔ ماں ایک طرف بچے کو پیار بھی کرتی ہے اور دوسری طرف اسے گھور کر طمانچے بھی مارتی ہے کیونکہ نرم اور گرم دونوں کے جمع کرنے سے ہی تربیت ہوتی ہے

بَلْ یَدٰہُ مَبْسُوْطَتٰنِ یُنْفِقُ کَیْفَ یَشَآءُ

"(اس کے دونوں ہاتھ، مہر کے بھی اور قہر کے بھی) کھلے ہوئے ہیں جس طرح چاہے صَرف فرمائے"۔

جلال و جمال کے آثار و لوازم

یہ دونوں شانیں چونکہ ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ اس لئے ان کے آثار و لوازم اور تقاضوں میں بھی یہی تقابل اور تضاد کی شان پائی جاتی ہے۔ صفاتِ جمال یعنی مہر و لطف کا قدرتی اثر اُنس و محبت اور گرویدگی و شیفتگی ہے کہ بندہ رام ہو جائے، جھک جائے اور اُلفت میں سرشار ہو جائے، محو ہو مٹا ہوا ہو، نہ اپنا ارادہ ہو نہ خواہش، نہ اپنی خبر نہ اپنے نام لگے ہوؤں کی پروا، سوختہ جانی ہو اور سوختہ روائی۔ ربودگی میں نہ اپنا باہر کا ہوش ہو اور نہ اندر کا جوش۔ مطمحِ نظر اور مقصدِ دل ہمہ وقت محبوب ہو اور اس کی ادائیں، اس کی طرف دوڑنا اور اسی کی طرف بھاگنا، سوتے جاگتے اس کا دھیان اور اس کے تصور میں محویت و سرشاری ہو۔ کہ صفاتِ جمال کا یہی قدرتی تقاضا ہے اور صفاتِ جلال یعنی قہر و غضب کا قدرتی اثر رعب و ہیبت، فکر و مغلوبیت، سرنگونی اور سرافگنی ہے کہ بندہ خوفزدہ اور لرزاں و ترساں رہے، گردن جھکی ہوئی ہو، ناک نیچی ہو، اور دربارِ شاہی (مسجد) میں حاضر ہو تو نگاہ اعضاء کا ادب پیشِ نظر ہو، زبان خاموش ہو، چال میں سکون و مسکنت ہو، چہرے سے خوف و خشیت نمایاں ہو، ادب سے دایاں قدم پہلے ہو اور بایاں پیچھے، قیام دست بستہ ہو، ہاتھ بندھے ہوئے ہوں، نشست ہو تو دوزانوں ہو، کھڑا ہونا اور چلنا ہو تو سکون و تواضع سے ہو، نہ دوڑنا، بھاگنا، لپکنا، متھرکنا، سکینت و متانت میں ہمہ وقت غرق اور جوش کے ساتھ ہوش میں ہو، ہر آن محو و مستغرق، غرض ہر نقل و حرکت اور ہیئت و وضع میں ادب و خاکساری، ذلت و انکساری اور عجز و نیازمندی رچی ہوئی ہو۔

خلاصہ یہ کہ صفاتِ قہر جلال چاہتی ہیں کہ اللہ کے بندے اس کے سامنے خوف و خشیت اور مرعوبیت کے ساتھ نیازمندانہ حاضر ہوں جن کے روئیں روئیں سے بندگی و مسکنت، غلامی و محکومی اور تمام ضوابطِ حکومت کی عاقلانہ پابندی ٹپکتی ہو، اور صفاتِ مہر و جمال چاہتی ہیں کہ خدا کے بندے اس کے سامنے اُنس و محبت، فنائیت و محویت اور استغراق و استہلاک کے ساتھ حاضر ہوں، جن کی ہر ایک نقل و حرکت سے ربودگی، خود گزاری از خود رفتگی، ذوق و شوق اور تسلیم و رضا، عاشقانہ انداز سے نمایاں ہو، پہلی صورت مہذب اور باادب محکوم کی ہے۔ دوسری صورت ایک از خود رفتہ اور از خود گزشتہ عاشق کی ہے یعنی ایک شان کے نیچے آدمی عاشق فناپسند ہوتا ہے۔ ایک کے نیچے عاقل فکر مند اس لئے اللہ کی ان دونوں صفات (جلال و جمال) کے تقاضوں سے انسان پر دو ہی قسم کی عبادتیں فرض ہوئیں۔ صفاتِ جلال کے تحت اظہارِ عجز و نیاز اور مظاہرۂ ذلت، مسکنت کی عبادت رکھی گئی جس کی صورت نماز ہے ___ اور صفاتِ جمال کے تحت اظہارِ عشق و محبت اور مظاہرۂ محویت و فنائیت کی عبادت فرض ہوئی جس کی صورت حج ہے۔

نماز شانِ کبریائی کا مظہر

چنانچہ نماز کے ایک ایک عمل سے اپنی ہی فدویت و عبدیت، لجاجت و سماجت اور مرعوبیت و ہیبت زدگی نمایاں کی جاتی ہے جس میں فکر و عقل کے ساتھ ادب و شائستگی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ ابتدا نماز ہی سے

دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر دنیا ومافیہا سے بیزار ہونا اور اس کے ساتھ اپنے حاکم مطلق اور بادشاہ عالمین کی بڑائی کا اعلان کرنا ہے جس کا نام تکبیرِ تحریمہ ہے۔ پھر چاکروں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا جس کا نام قیام ہے۔ پھر ذلیلوں کی طرح سے جھکا دینا جس کا نام رکوع ہے پھر انتہائی پستی کے ساتھ ہاتھ ' ناک اور پیشانی زمین پر ٹیک دینا جس کا نام سجدہ ہے۔

پھر انتہائی ادب وتعظیم کے ساتھ اس کی یکتائی کی شہادت دینا جس کا نام تشہد ہے۔ پھر انتہائی بے بسی اور محتاجگی کے ساتھ اسے پکارنا جس کا نام استغاثہ وفریاد ہے۔ پھر کمالِ ضعف وبے زوری اور انتہائی خوشامد کے ساتھ بھیک مانگنا جس کا نام دعا ہے پھر انتہائی تعلق ونیاز مندی کے ساتھ اس کے نائبوں اور خلفاء (انبیاء و اولیاء) تک پر صلوٰۃ وسلام بھیجنا جس کا نام درود اور صلوٰۃ وسلام ہے۔ پھر انتہائی عقیدت ونیاز سے حاضرینِ دربار (شرکاءِ جماعت اور ملائکہ) کو دو طرفہ سلام دے کر رخصت ہونا' جس کا نام تحلیل وتسلیم ہے وغیرہ وغیرہ وہ عاجزانہ اور محکومانہ افعال ہیں جو بلحاظ حقیقت اللہ کی صفتِ حکومت و مالکیت اور حاکمیت وبادشاہت کا طبعی تقاضا ہیں۔ پس نماز اس کی شانِ کبریائی ___ اور شانِ جلال وحکمرانی کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور بندہ میں خوف وخشیت کی تخم ریزی کرتی ہے جس سے وہ قانونِ الٰہی کی نافرمانی اور فواحش ومنکرات سے بچ کر مقربِ بارگاہ بن جاتا ہے۔

حج ' ذاتی محبوبیت کا مظہر

ادھر حج کے ایک ایک رکن اور ایک ایک سنت وواجب سے عاشقی ' محبت واُنس اور محبوب پر مرمٹنے کا والہانہ اور شیدایانہ انداز سے ثبوت دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حج میں مشغول انسان کی عاشقانہ کیفیات اور ازخود رفتگی کا عالم یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے تن مَن دھن کی کچھ پروا نہیں رہتی نہ کپڑوں کی خبر' نہ آرائش وزیبائش کی پروا' نہ وضعدار لباس نہ قطع وبرید کی بوباس' بال بکھرے ہوئے' ناخن بڑھے ہوئے' لبیں پھیلی ہوئیں۔ رواں چکنا ہوا' ننگے سر' ننگے پاؤں' کپڑے گرد آلود' بدن پر میل کچیل کی نمود' درِ محبوب پر سر بسجود' گھر سے بے گھر' تارکِ مال وزر' نہ کھانے کی پروا' نہ پینے کی خبر' دل پر لذتِ نکاح کا اثر نہ تن پر آثارِ دولت وزر' نہ صفائی وستھرائی سے سروکار' نہ عطر وخوشبو کا روادار' نہ غسل کا دھیان نہ نظافت کا وہم وگمان' آثار محبت سے وارفتہ' گریہ وبُکا سے سوختہ۔ رسمی وقار سے دل گرفتہ' خانہ محبوب کے تصوّر میں ازخود رفتہ حضوری ہو تو حاضر حاضر کہہ کر چلنا۔ غیبت ہو تو دم بخود ہو جانا' اور محبوب سامنے آئے تو لپکنا' خانہ محبوب کے ارد گرد چکر لگانا' درو دیوار کو چھونا' پردہ ہائے دیوار سے لپٹنا اور رونا کہیں شوق میں لپکنا' کہیں خوف سے تھمنا' کہیں ذوق سے دوڑنا کہیں رعب جمال محبوب کا تصور آئے تو اکڑنا اور سینہ تان لینا' تجلّی محبوب نمایاں ہو تو سرنگوں ہو جانا' اور دشمن محبوب (شیطان) کا مقام سامنے آجائے تو کنکر پتھر لے کر لپکنا اور مارنا' ہر لذّت ہر زینت' اور ہر رسمی صورت سے بیزار رہنا' کسی ایک جگہ قرار نہ پکڑنا' کوچہ ہائے محبوب کے در در کی خاک چھاننا' کبھی مکہ تو کبھی منیٰ' کبھی عرفات' کبھی مزدلفہ نہ چال میں سکون' نہ انداز میں قرار یہاں اور کبھی وہاں۔ اپنے کو مٹا دینے کا جذبہ اور تن من دھن کو خاک میں ملا دینے کا داعیہ اور آخر فدائیت وجاں سپاری کی انتہا کہ اپنے نفس کو بھی باذنِ محبوب فدیۂ حیوان دے کر فدا کر دینا ذرا بھی کوتاہی ہو تو مال وزر دے کر خوشامد سے تلافی کرنا' وسیلۂ محبوب کا دھیان آئے جس کی بدولت رسائی ممکن ہو تو سو جان سے وہاں حاضر ہونا' سلام کرنا' لجانا اور شوق وذوق سے عرض ومعروض کر کے وسیلہ لینا وغیرہ وہ عاشقانہ افعال ہیں جو عشق ومحبت کے جذبہ میں فطرتاً عاشق سے سرزد ہوتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کی صفاتِ جمال اور ذاتی محبوبیت کا مقتضا ہیں۔

حسنِ تعبیر

ان میں سے ترکِ آسائش و آرائش اور ترکِ لذّت و زیبائش کے مجموعہ کا نام احرام ہے خانہ محبوب کے ارد گرد گھومنے کا نام طواف ہے۔ تصوّرِ اَعداء کے موقعہ پر سینہ تان کر اکڑنے کا نام رمل ہے۔ ذوق و شوق میں دوڑنے کا نام سعی ہے کوچہ ہائے محبوب کے دروں کی خاک چھاننے کے نام سیاحتِ حج ہے۔ خاک صحن پر ٹھہر کر گریہ وبکاء کرنے اور شوق وصال کے اظہار کا نام وقوف ہے۔ شیطان پر پتھر برسانے کا نام رمی ہے۔ اور فدیۂ حیوان کے ذریعہ خود فدا ہو جانے کا نام نحر ہے ان میں سے کسی بھی عاشقانہ فعل میں فروگزاشت کا نام جنایت ہے۔ اور اس کے تدارک و تلافی کا نام صدقہ و کفّارہ ہے۔ اور پھر افعال کے مجموعہ کا نام مناسک ہے۔ اور پھر وسیلۂ محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار (مدینہ) میں حاضر ہو کر زیارت کرنے اور صلوٰۃ وسلام کے بعد ہزار خوشامد سے وسیلہ لینے کا نام زیارت وتوسّل ہے۔

عجز و عشق کے مظاہر

بہرحال پہلا مظاہرہ عجز و نیاز کا ہے جس کی صورت نماز ہے۔ اور دوسرا مظاہرہ عشق و محبت کا ہے جس کی صورت حج ہے۔ اس لئے یہ دو ہی عبادتیں اسلام کی اساس و بنیاد بنائی گئی ہیں۔ جب کہ تمام صفاتِ خداوندی بھی دونوعوں (جلال و جمال) میں سمٹی ہوئی ہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ کے حقوق کے ادائیگی انہی دو نوع صفات کے حقوق ادا کرنے سے ممکن تھی جن کی تشکیل کے لئے نماز اور حج کے افعال رکھے گئے۔

اس لئے اصولاً اسلام میں یہ دو ہی عبادتیں اصل ٹھہراتی ہیں کہ بلحاظِ حقیقت ان کے سوا کوئی دوسری صورت عبادت کی ہے بھی نہیں کہ عبادت کی متقاضی صفات کی نوعیں ہی یہ دو ہیں دو سے زائد نہیں۔

زکوٰۃ و روزہ کی حیثیت

رہ گئی زکوٰۃ اور روزہ کہ عبادت انہیں بھی کہا گیا' بلکہ نماز و حج کی طرح مبانی اسلام میں شمار کرایا گیا ہے' سو بلاشبہ وہ عبادت ہیں اور اسلام کی اساسی عبادت ہیں لیکن پھر بھی ان کے اور نماز و حج کے عبادات ہونیکی نوعیت میں زمین آسمان کا فرق ہے غور کیا جائے تو زکوٰۃ اور روزہ خود اپنی ذات سے نہ عبادت ہیں نہ اپنی ذات سے براہ راست مطلوب ہیں بلکہ نماز و حج کی خاطر مطلوب اور انہی کی بدولت عبادت بنی ہیں زکوٰۃ تو نماز کے تابع ہو کر اس کے وسیلہ کی حیثیت سے عبادت بنتی ہے اور روزہ حج کے تابع ہو کر اس کے وسیلہ کی حیثیت سے عبادت ہوتا ہے بالفاظِ دیگر زکوٰۃ نماز کے مبادی اور وسائل میں سے ہے اور روزہ حج کے مبادی اور وسائل میں سے ہے اور وسیلہ چونکہ حکم میں مقصد ہی کے ہوتا ہے اس لئے یہ دونوں بھی نماز و حج کی وجہ سے عبادت بنادی گئیں خود اپنی ذات سے عبادت نہیں ہیں۔

موانع نماز اور ان کا تدارک

وجہ یہ ہے کہ اہم عبادت میں اگر کوئی چیز حارج اور سدِّ راہ ہے تو وہ سامانِ عیش اور وسائل عشرت ہیں جن کی لذتوں میں پڑ کر انسان میں نماز سے غفلت اور سُستی و کسل پیدا ہوتا ہے اور آدمی جماعت سے ہی نہیں

بلکہ نماز ہی سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نفس کی توجہ ایک آن میں دو طرف نہیں ہو سکتی ظاہر ہے کہ نفس کے مرغوبات جب نفس کو اپنی طرف کھینچ لیں گے تو مرغوبات روح کی طرف کیسے متوجہ ہو سکے گا؟ اسی لئے اکثر وبیشتر امراء ہی نماز سے غافل ہوتے ہیں ___ کیونکہ ان کے ارد گرد جب اسبابِ عیش ونشاط اور لذاتِ نفس کا ہجوم رہتا ہے تو ان کے نفس کو طبعاً مسجد کے طرف دوڑنے کی فرصت ہی نہیں مل سکتی کہ نماز کی طرف رخ کریں' البتہ غرباء چونکہ قلیلُ العیش اور محرومُ الوسائل ہوتے ہیں اس لئے عموماً وہ تعیش سے فارغ رہتے ہیں تو ان کا فارغ نفس بھی بے تکلف نماز کی طرف دوڑ سکتا ہے۔

امراء نشہ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملتِ بیضا غرباء کے دم سے

اس لئے شریعت نے مال وزر اور وسائلِ عیش وعشرت میں (جن میں لگ کر آدمی نماز اور مسجد سے غافل ہوتا ہے) توازن اور اعتدال پیدا کرنے اور انہیں کم کرنے اور دلوں سے ان کی محبت و شغف نکال دینے کے لئے زکوٰۃ وصدقات کی عبادت رکھی تاکہ مال ودولت کو راہِ خدا میں خرچ کرنے اور لُٹانے کے علاقے سے انسانی نفس میں سے زر پرستی اور اس سے پیدا شدہ تعیش پسندی کے غیر معتدل جذبات نکل جائیں اور مال لُٹانے کی سالانہ عبادت' پھر روز مرّہ کے صدقات کی خوبیوں سے خود نفس کو بھی راہِ خدا اور راہِ عبادات میں لُٹادینے کے جذبات پیدا ہو جائیں۔

پھر چونکہ وسائلِ عیش کا تعلق صرف نقد وزر ہی سے نہیں بلکہ زمینی پیداوار پالتو جانور' سواریوں کے حیوانات' زرتار لباسوں' زریں برتنوں حتیٰ کہ ہر تجارتی سامان سے ہے اس لئے شریعت نے زکوٰۃ کا دائرہ بھی صرف نقود (سونا' چاندی اور دولتِ زر تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ تمام وسائلِ عیش میں اپنی اپنی شرائط وحدود کے ساتھ زکوٰۃ رکھی' چنانچہ پالتو جانور' گھوڑے' اونٹ' گائے بھینس' بکری وغیرہ میں زکوٰۃ رکھی ___ کھیتوں کی پیداوار وغیرہ میں زکوٰۃ رکھی جس کا نام عُشر ہے۔ معدنیات اور کانوں میں زکوٰۃ رکھی۔ دفینہ اور ہاتھ آجانے والے خزانہ میں بھی زکوٰۃ رکھی جس کا نام خُمس ہے۔ پھر ہر ایک مالِ تجارت پر زکوٰۃ رکھی خواہ وہ مٹی ہی کیوں نہ ہو۔ جس سے زرومال بڑھنے اور اس کے بڑھنے ___ سے وسائلِ عیش اور سامانِ راحت بڑھنے کا قدرتی تعلق ہے اور وہی تعلق نفس کو عیش پرستی میں مبتلا کر کے عبادت سے غافل اور بے تعلق بنادیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب رکاوٹ کے اسباب ہٹ جاتے ہیں تو شئے وجود پذیر ہو جاتی ہے۔ پس جب راہِ عبادت کا حارج یعنی زرومال اور وسائل عیش وعشرت کو بصورتِ زکوٰۃ وصدقات راہِ خدا میں فنا کر دینے کی عادت پڑ گئی اور دل میں ان کی رغبت میں شدت اور ہوس قائم نہ رہی تو نماز سے رکاوٹ ڈالنے والے اسباب ختم ہو گئے۔ اس لئے نماز آسان ہو گئی پس زکوٰۃ وصدقات درحقیقت نماز کو بروئے کار لانے کے لئے فرض کی گئی ہے' اس لئے وہ وسائلِ نماز میں سے ہوئی جو آدمی کو کھینچ تان کر نماز تک پہنچادیتی ہے۔ اس لئے عبادت کی لائن میں نماز اصل ہوئی اور زکوٰۃ اس کے تابع ہو کر عبادت بنی جب کہ وسیلۂ مقصود حکم میں مقصود ہی کے ہوتا ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ زکوٰۃ مبادیٔ نماز میں ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں جگہ جگہ زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ لا کر ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ ۔ وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ

کے انداز کی بکثرت آیتیں اس کی شاہدِ عدل ہیں۔

نماز کی تمہید

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کے پاس مال وزر نہ ہو اور وہ خود ہی نان شبینہ کا محتاج ہو تو اس پر زکوٰۃ کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ علاوہ تکلیف مالا یُطاق کے یہاں زکوٰۃ کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ زکوٰۃ نماز کے موانع رفع کرنے کے لئے رکھی تھی، جب یہاں موانع صلوٰۃ ہی نہیں تو رافع موانع (زکوٰۃ) کی حاجت ہی کیا ہو سکتی ہے؟ چنانچہ اس قسم کے غریب مسکین انسان عام حالات میں نماز سے بھی بیگانہ نہیں ہوتے کیونکہ جب وسائلِ عیش ہی مفقود ہیں جو عبادات اور بالخصوص نماز میں حارج ہوتے تھے تو ایک بے زر اور بے پر آدمی طبعی طور پر خدا ہی کیطرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور نماز میں کبھی سُست نہیں ہوتا اسی لئے مسلم کو عام حالات میں زُہد اور قناعت کی ترغیب دی گئی ہے۔ کیونکہ وہ جس قدر قلیلُ العیش ہوگا۔ اسی قدر طاعت و عبادت کی طرف رُخ کئے ہوئے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنیٰ اسے زکوٰۃ سے بیگانہ بنانے کے ہوئے، اگر زکوٰۃ بذاتہٖ مقصود ہوتی تو بجائے زہد و قناعت کے تموّل اور تکاثُرِ مال کی ترغیب دی جاتی، بہر حال دولت ہو تو اس پر اندرون حدود زکوٰۃ و صدقات کے احکام عائد ہو کر اسے قلیلُ العیش بنا دیتے ہیں اور نہ ہو تو اس پر احکامِ زکوٰۃ و صدقات اس لئے لاگو نہیں ہوتے کہ وہ پہلے ہی سے قلیلُ العیش ہے، اس لئے ان دونوں ہی صورتوں میں آدمی اپنے مقصدِ تخلیق (عبادت) کی طرف توجّہ کئے ہوتا ہے جس سے واضح ہے کہ دولت و مال چونکہ راہِ عبادت میں حارج ہوتا ہے اور اس کے نہ ہونے یا کم ہونے کی صورت میں کارخانۂ عبادت میں خلل نہیں پڑتا۔

اس لئے زُہد و قناعت اور مال کو لُٹانے یا گھٹانے کی ترغیبیں دی گئیں جس سے زکوٰۃ کا وسیلۂ عبادت اور بالخصوص وسیلۂ نماز ہونا نمایاں ہے۔ اور ثابت ہو جاتا کہ حقیقی عبادت اگر ہے تو وہ نماز ہی ہے جس کے بغیر تعلق مع اللہ پیدا نہیں ہو سکتا اور زکوٰۃ اس کا وسیلہ اور اسے بروئے کار لانے کی ایک تمہید ہے خود اصل نہیں۔

موانع حج اور ان کا تدارک

ادھر حج کی عاشقانہ عبادت چونکہ مظاہر محبت ہے اور محبت میں سب سے پہلی چیز ماسوا اور غیر محبوب کا ترک ہے ورنہ اگر عاشق غیر محبوب کی طرف مائل ہو جائے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ محبوب کی طرف اس کا میلان یا سرے سے ہے ہی نہیں یا ہے تو کمزور ہے۔ تو اسے عاشق ہی کیوں کہیں گے۔

پس ایک حج کرنے والے عاشقِ خداوندی کا پہلا قدم خدا کے ماسویٰ کو ترک کر دینا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ماسویٰ اللہ مرغوباتِ نفس ہی ہو سکتے ہیں۔ جن میں بڑا مرغوب جس سے انسان کا دل اُٹکا ہوا رہتا ہے۔ وہ کھانا پینا اور عورت سے لذّت حاصل کرنا ہے کہ دنیا کے سارے جھگڑے انہی چند مرغوباتِ نفس کے لئے آدمی سر لیتا ہے ظاہر ہے کہ جب تک دل میں ان چیزوں سے شغف اور کمالِ رغبت باقی رہے گا۔ محبوب حقیقی (حق تعالیٰ شانہٗ) کا شغف و عشق اس دل میں کہاں سے جگہ پا سکے گا؟ اس لئے اس محبت و عشق کی عبادت یعنی حج کے ابتدائی مراحل میں ایک عاشقِ خداوندی کے لئے سب سے پہلے کھانے پینے اور بیوی کی لذّت اٹھانے کے شغف اور غیر معمولی لگاؤ سے الگ رہنا قدرتاً ضروری ہو جاتا ہے۔

ورنہ یہ عشقِ الٰہی کا مظاہرہ جسے حج کہتے ہیں شروع ہی نہ ہو سکے گا۔ اس لئے شریعت نے حج کے مہینوں سے قبل متصلاً ہی رمضان کا مہینہ رکھا تاکہ تیس دن تک نفس کے ان اوّلین مرغوبات کھانا پینا اور لذّتِ جماع کی غیر معمولی خواہش کو روزہ کے ذریعے کم سے کم کر دیا جائے۔ پس مہینہ کے تیس دنوں میں دن بھر تو یہ لذّتیں روزہ کے ذریعہ بالکل ہی چھڑا دی جاتی ہیں اور بھوک پیاس سے کمزوری لاحق ہو جانے سے رمضان کی راتوں

میں بھی آدمی ان لذتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں رہتا۔ ادھر راتوں میں تراویح اور تلاوت قرآن پاک کا شغل رکھ دیا گیا جس سے ان لذآت کے لئے کچھ وقت بھی پورا نہیں ملتا کہ آدمی کا دل ان میں پھنسے۔ اس لئے یوں کہنا چاہئے کہ پورے ایک ماہ تک ان لذتوں سے بیگانہ رکھ کر رمضان میں یہ بنیادی لذتیں چھڑادی جاتی ہیں تاکہ ان مرغوباتِ نفس کی خواہش اُبھری ہوئی نہ رہے بلکہ ان کی محبت ورغبت کا دھیان دَب جائے اور آدمی ان سے بیگانہ ہو کر محبتِ حق کے مظاہرہ کے قابل ہو جائے۔

حکمتِ اعتکاف

لیکن اس کے بعد بھی گھربار کی محبت بدستور باقی رہتی تھی، مکان کی آسائش اور گھریلو سامان کی محبت جوں کی توں قائم تھی۔ حالانکہ یہ بھی وہی ماسوی اللہ ہے جو محبتِ الٰہی میں خلل انداز ہوتی ہے۔ خواہ دوسرے ہی درجہ میں سہی۔ اس لئے رمضان کے بیس دن گزرنے کے بعد عشرۂ آخر میں اعتکاف کی سنت کے ذریعہ گھر بھی چھڑادیا جاتا ہے تاکہ آدمی گھریلو زندگی چھوڑ کر خانہ خدا میں پہنچے اور رات دن وہیں بسر کرے اور اس طرح کھانے پینے اور لذتِ جماع سے بیگانگی کے بعد وہ گھریلو سامانوں سے بھی دستبردار ہو جائے اور اس طرح نفس کے اور دوسرے محبوبات بھی ترک کرنے کی اس میں استعداد اور صلاحیت پیدا ہو جائے۔

خطابِ حج

پس! ماہ رمضان میں ان بنیادی لذات کے ترک کر دینے کی مشق سے جب آدمی کا دل محبوبِ حقیقی کی طرف بڑھ گیا اور اس کی طرف دوڑنے کی اس میں قریبی استعداد پیدا ہو گئی تو رمضان ختم ہوتے ہی اشہرِ حج (حج کے مہینے) شروع ہو جاتے ہیں اور افعالِ حج کے آغاز کا وقت آجاتا ہے کہ آدمی دیارِ محبوب کی طرف دوڑ پڑے گویا اس عاشقِ خداوندی کی طرف جس نے خدا کی خاطر کھانے پینے، بیوی بچوں اور گھربار سے دل ہٹالیا تھا۔ شرعی خطاب متوجہ ہوتا ہے کہ اس عشق کی راہ میں کھانا پینا، بیوی اور گھر چھوڑ دینا کافی نہیں ہے، اب وطن بھی ترک کر دو اور دیارِ محبوب کی طرف کوچ کرو کہ وطن بھی ایک بڑا بُت ہے جو راہِ خدا میں حارج ہوتا ہے۔

حکمتِ احرام

پھر یہ عاشقِ خداوندی جب وطن چھوڑ کر جنگلوں، بیابانوں اور پہاڑوں کی خاک چھانتا ہوا اور سمندروں کو عُبور کرتا ہوا دیارِ محبوب میں داخل ہو گیا، تو حرم الٰہی کی میقات آتے ہی محبوبِ حقیقی کا حکم یہ ملا کہ یہ کھانے پینے، زن وفرزند گھربار اور وطن وملک کا چھوڑ دینا بھی اس راہِ عشق میں کافی نہیں بلکہ لباسِ زینت بھی ترک کرو سلے ہوئے کپڑے بھی چھوڑو کہ اس لذّت کا شغل بھی محبوبِ حقیقی کے وصال میں حارج اور عشق کی غیرت کے خلاف ہے۔ صرف تن ڈھانکنے کی حد تک احرام کی کفنی پر قناعت کرو، ایک چادر بدن کا نصف بالا ڈھانکنے کے لئے اور ایک چادر بدن کا نصف زیریں ___ چھپانے کے لئے ہو، نہ سر پر ٹوپی اور عمامہ ہو جو سر کو ڈھانپ دے، نہ پیر میں کوئی گہرا جوتہ جو پورا پیر ڈھانپ لے تاکہ جیسے رمضان میں اس عشقِ الٰہی کا باطن گرویدۂ محبت ہو چکا تھا۔ اب اس کا ظاہر بھی آثارِ عشق سے سرشار ہو جائے اور اس عاشقِ الٰہی کو عشق میں تن من دھن کی کوئی خبر نہ رہے۔

عاشقانہ بول

لیکن اس ظاہر و باطن کے درمیان کی ایک چیز ابھی باقی تھی جو ابھی تک آثار عشق سے متاثر نہیں ہوئی تھی اور وہ زبان ہے جو کسی حد تک ظاہر ہے اور کسی حد تک باطن یعنی ظاہر و باطن کے درمیان ایک برزخ ہے جو باطن کی تو ترجمان ہے اور ظاہر کی نگہبان ہے' اس لئے ضرورت تھی کہ اسے بھی اس عشق سے حصہ ملے اور ظاہر ہے کہ زبان کا حصہ قول اور بول ہی کی شکل کا ہو سکتا تھا اس لئے اسے عاشقانہ بول دیا گیا کہ وہ قدم قدم پر خود اپنی ترجمانی کے بجائے محبوبِ حقیقی کی محبت کی ترجمانی کرے اس لئے احرام باندھتے ہی زبان کو لبیک لبیک کے کلمہ سے ذکرِ محبوب کا پابند بنایا جاتا ہے تاکہ زبان کے ذریعے نفس اور خواہشاتِ نفس کی ترجمانی نہ ہو بلکہ حضوریٔ حق کے جذبات کی ترجمانی ہو اور اس قینچی کی طرح چلنے والی زبان کے تقاضے آزاد نہ رہیں کہ وہ جتنا چاہے اور جو چاہے بولتی رہے' اس لئے عاشق کے ان ایامِ عشق میں ہر تغیّر اور ہر موڑ پر لبیک کا نعرہ لازم کر دیا گیا ہے کہ ہر نیچائی اور اونچائی ہر پہاڑ ہر غار' ہر قافلہ ہر جماعت کی مُڈ بھیڑ پر یہی عاشقانہ و والہانہ نعرہ زبان پہ چھایا ہوا رہے کہ لبیک اللّٰھمّ لبیک، لبیک لاشریک لک لبیک پس اس طرح زبان کی آزادلذت بھی اس عاشقِ حق سے ترک کرادی گئی اور یہ عاشق اپنی زبان اپنے دل اور اپنے تمام تر اعضاء و جوارح سے صرف اپنے محبوبِ حقیقی ہی میں مشغول و منہمک ہو گیا۔

حکمتِ طواف

اب جب کہ خانۂ محبوب تک رسائی ہو گئی۔ آدمی مکّہ محترم اور حرم محترم میں پہنچ گیا اور خانۂ خدا سامنے آگیا جس میں جمالاتِ حق تجلّی ریز ہیں تو پھر شرعی خطاب متوجہ ہوا کہ تم نے ابتک محبوباتِ نفس گھربار وسائل عیش اور اسبابِ راحت و عیش کی خاطر بہت چکر لگائے تھے اب یہ حال اور چکران سب چیزوں سے ختم کر کے خانۂ محبوب کے لئے مختص کردو' اور عشق کی وارفتگیوں میں غرق ہو کر محبوب کے گھر کے ارد گرد پروانوں کی طرح چکر لگاؤ' ایک دو پھیروں سے نہیں بلکہ سات پھیرے پھیرو جو فنِ حساب کی رو سے عدد زائد ہے اور کبھی گھٹنے والا نہیں' پھر یہ طواف بھی ایک دوبار نہیں بلکہ ان پاک ایام اور مکّہ کے قیام کی اعلیٰ ترین عبادت ہی یہ چکر لگانا اور خانہ محبوب کے ارد گرد گھومتے پھرتے رہنا ہے. جس کا نام طواف ہے۔

حکمتِ وُقوفِ عرفات

پھر مکّہ کے مقدّس شہر کا قیام گو وطن کا قیام نہیں مگر بہرحال شہر کا قیام ضرور ہے۔ اس میں وطن کی عمارتیں نہ سہی بلدِ الٰہی کی ہی سہی جو شہری زندگی کی ساری راحتیں لذّتیں اور زینتیں لئے ہوئے ہیں اور عاشق کی شان غیرت کے یہ بھی خلاف تھا کہ عاشق کا دل عمارتوں اور سامان عیش و تمدّن میں کسی بھی درجہ میں اٹکا رہے اس لئے اصل حج کے لئے جو حقیقی طور پر شانِ عشق کا مظاہرہ تھا ایامِ حج میں حکم یہ ملا کہ مکّہ کی شہری آبادی بھی ترک کرو اور عرفات کے ریگستان میں ننگے سر ننگے پاؤں کفنی پہنے ہوئے پہنچو کہ اصل حج یہی ہے کہ ایک چٹیل میدان میں گھربار' بیوی بچے' سامانِ تمدّن اور وسائلِ عیش کی متقاضی ہوتی ہے' بلکہ ایک کپڑے کا مسافر خانہ یعنی خیمہ ہو اور تم ہو۔ تاکہ اعلیٰ ترین ترکِ لذّات کا مقام حاصل ہو جائے جو ایک عاشق کے لئے

سزاوار اور واجباتِ عشق کے لئے درکار ہے۔

فدیۂ جان

ہاں مگر پھر بھی ان سب تروک کے بعد عاشق کا نفس ابھی عاشق کے پاس ہی تھا جس کی رو سے وہ اپنے کو "دآنا" اور "میں" کہہ سکتا تھا۔ درانحالیکہ کمالِ عشق کے لئے یہ بھی ایک چیلنج ہے کہ عاشق اپنی ہستی کو برقرار رکھ کر بمقابلۂ محبوب اس کا تصور بھی دل میں قائم رکھے۔ بلکہ اس کا آخری فریضہ یہ ہے کہ راہ محبوب میں اپنے نفس کو بھی ایثار کردے اور اس ظاہری ہستی سے بھی سبکدوش ہو جائے تو خطابِ شرعی متوجہ ہوا کہ عرفات سے لوٹ کر منیٰ پہنچو اور اس کے قطعۂ جاں سپاری میں پہنچ کر جسے منحر کہتے ہیں نثار ہونے کے لئے اپنی جان بھی پیش کردو' یعنی اسے بھی ترک کرنے کا عزم باندھ لو۔ اب یہ محبوبِ حقیقی کا لطف و کرم ہے کہ اس سچے عاشق کی طرف سے جس نے اپنی ساری زندگی کی تمام لذات اور آخر کار خود زندگی ہی کو پیش کردیا۔ قبول فرما کر اسکی جان کے عوض میں قربانی کے جانور کی جان بطور فدیہ قبول فرمالے اور اس کے بعد پھر گھر لوٹ جانے اور متروکہ وسائلِ عیش سے لذت اندوز ہونے کی اجازت عطا فرمائے

اس لئے منیٰ میں قربانی کا حکم ہوا کہ جان کا فدیہ یہ خود تمہارا اپنے نفس کا فدا ہونا ہی سمجھا جائے گا' پس محبوب کے لئے آخر میں جان بھی پیش کردی جاتی ہے جو عشق کا انتہائی مقام ہے۔

مقدّمۂ حج

بہرحال اس سے واضح ہے کہ حج تروک کا مجموعہ ہے۔ ترکِ لذت' ترکِ زینت' ترکِ راحت خانہ' ترکِ لباس' ترکِ وطن' ترکِ جاہ ___ اور ترکِ مال وغیرہ جس کی ابتدا کھانے پینے اور عورت اور گھر کے ترک کرنے سے ہوتی ہے۔ یہی دنیوی زندگی کی لذات کا اعظم ترین حصہ بلکہ دوسری لذات کا سرچشمہ ہے۔ جسے اشہرِ حج سے قبل کے مہینے (رمضان) میں حج کی خاطر چھڑا دیا جاتا ہے تاکہ آئندہ کے تروک کی استعداد پیدا ہو جائے۔ اگر کھانے پینے اور بیوی ___ سے کنارہ کشی کی استعداد پیدا نہ کی جائے تو اگلے کسی ترک پر بھی آدمی مستعد اور آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے روزہ کی عبادت درحقیقت حج کا مقدمہ ثابت ہوتی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی عبادت نماز کا مقدمہ ثابت ہوئی تھی جس سے پوری طرح کھل جاتا ہے کہ اسلام میں اصل عبادتیں دو ہی ہیں نماز اور حج۔ ایک صفاتِ جلال کا تقاضا ہے اور ایک صفاتِ جمال کا اور زکوٰۃ اور روزہ ان کے وسائل اور مبادی میں سے ہیں۔ جنہیں ان دو کی وجہ سے عبادت بنا دیا گیا ہے۔ خود بذاتہٖ عبادت کے بارہ میں اصل نہیں ہیں۔

زکوٰۃ و روزہ "عبادت لغیرہٖ" ہیں

یہی وجہ ہے کہ جہاں نماز اور حج میں وسائل دولت یا وسائل لذت کے حارج ہونے کا امکان نہ ہو وہاں نماز اور حج تو ہو گا مگر زکوٰۃ و روزہ کی عبادت نہ ہوگی جیسے ملائکہ کو نماز بھی دی گئی ہے وہ ہر وقت رکوع و سجود اور قیام میں ہیں اور حج بھی دیا گیا ہے۔ کہ وہ روزانہ ساتویں آسمان "بیتُ المعمور" کا حج اور طواف کرتے ہیں بلکہ ہر آسمان میں بیتُ المعمور کی سیدھ میں ایک ایک قبلہ ہے جس کا اس آسمان کے باشندے طواف کرتے ہیں مگر

ملائکہ میں چونکہ نہ مال و دولت کا قصہ ہے نہ شہوت و زینت اور غضب کا کہ وہ نماز اور حج سے روکیں اس لئے انہیں نہ زکوٰۃ کا پابند کیا گیا نہ روزہ کا' کہ وہ خود ہی پاک ہیں' پھر مال دلوا کر اور روزہ رکھوا کر انہیں پاک کرنے کی ضرورت نہیں۔ جس سے صاف نمایاں ہے زکوٰۃ اور روزہ درحقیقت نماز اور حج ہی کے لئے رکھا گیا ہے اور ان کے مبادی میں سے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ نفس کو پاک اور صالح بنا کر نماز حج کے لئے مستعد بنایا جائے جہاں پاکی اور صفائی پہلے سے حاصل ہے وہاں نماز اور حج تو قائم رہا زکوٰۃ اور روزہ درمیان میں سے نکال لیا گیا' اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ نماز اور حج تو صفاتِ الٰہیہ کا تقاضا ہیں' ایک صفاتِ جلال کا اور ایک صفاتِ جمال کا لیکن زکوٰۃ اور روزہ صفاتِ نفس کا تقاضا ہیں کہ جب تک زکوٰۃ اور روزہ کے ذریعے انسانی نفس کو پاک نہ کیا جائے وہ نماز اور حج کے قابل نہیں بنتا اور ظاہر ہے کہ حقیقی معنیٰ میں عبادت وہی ہوتی ہے جس کا تقاضا معبود کی صفات کریں نہ کہ وہ جن کا تقاضا خود عابد کی صفات کریں گو معبود ہی کے لئے کریں۔ اس لئے نماز اور حج تو بذاتہٖ یا خود عبادت ثابت ہوئیں اور زکوٰۃ اور روزہ بذاتہٖ عبادت نہیں بلکہ ان دو اصلی عبادتوں کا وسیلہ بن کر بغیرہٖ عبادت ثابت ہوئیں اور یہی مقصود تھا اس بیان کا۔

نماز و حج میں باہم نسبتِ تضاد

اب ان دو اصل عبادتوں نماز اور حج میں مزید غور کیا جائے تو جیسے ان میں بلحاظِ منشاء کے فرق ہے کہ ایک جلالی صفات سے پیدا شدہ ہے' اور ایک جمالی صفات سے' ایک میں گرمی ہے اور ایک میں نرمی' ویسے ہی ان کے آثار و لوازم میں بھی کافی فرق بلکہ تضاد کی نسبت ہے' جو چیزیں نماز میں مستحسن اور ضروری ہیں وہ حج میں نہ صرف غیر ضروری بلکہ ممنوع اور قبیح ہیں' اور جو باتیں حج میں مطلوب اور ضروری ہیں وہ نماز میں مکروہ اور ناپسندیدہ ہیں۔

نماز چونکہ احکم الحاکمین کے شاہی دربار کی حاضری ہے اس لئے اس میں تو آدابِ شاہی کی رعایت کی گئی ہے پنج وقتہ وضو جو غسل کے قائم مقام ہے' لباس کی صفائی اور ستھرائی اور اس پر خوشبویات کا استعمال و وقار اور متانت کے ساتھ مساجد کی حاضری کہ بھاگتے دوڑتے نہ آویں بلکہ متین چال سے چل کر پہنچیں' سنجیدگی سے نشست و برخاست ہو' بے ڈھنگا پن نہ ہو' سکوت و خاموشی یا ذکر خفی کے ساتھ بیٹھنا ہو' شور و شغب یا آواز کی بلندی نہ ہو' بخلاف حج کے کہ وہ محبوب کے در پر عُشّاق کی حاضری ہے اس لئے وہاں عشق و محبت کی وارفتگی' سوز و گداز افروختن و سوختن و جامہ گذیدن اور بیتابی و تڑپ کے ساتھ وجدی حرکتیں مطلوب ہیں تاکہ عقل و مصلحت بینی کی باتیں یا اپنی آرائش و زیبائش اور زیب و زینت جس سے عاشق کو اپنی دھن میں مٹے رہنے کے سبب کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس لئے اگر نماز میں صفائی ستھرائی اصل تھی تو یہاں بے زیب و زینت رہنا اصل ہے کہ الحج' العج' الثج۔

وہاں لباس کی عمدگی مطلوب تھی تو یہاں سرے سے سِلا ہو لباس ہی ممنوع ہے' وہاں لباس کی زینت مطلوب تھی تو یہاں ترکِ زینت مطلوب ہے وہاں خوشبو لگانا مستحسن تھا یہاں احرام کے بعد خوشبو حرام ہے' وہاں نمازوں اور بالخصوص جمعہ و عیدین کی نمازوں کے لئے بدن کی معتدل زینت ضروری تھی جو حجامت سے حاصل ہوتی ہے۔ یہاں محرم کے لئے سرے سے بدن کی آرائش۔ اصلاح خط اور حجامت ہی ناجائز ہے' وہاں سکوت اور سرو خفا ضروری تھا یہاں لبیک لبیک کا شور ہے وہاں سکون اعضاء و جوارح ضروری تھا کہ ایک جگہ جم کر کھڑے رہیں یا فکر میں مستغرق رہیں اور بیٹھیں تو گردن جھکا کر سکون سے بیٹھے رہیں۔ یہاں نقل و حرکت

بلکہ بھاگ دوڑ ضروری ہے۔ کہیں صفا مروہ پر دوڑنا کہیں طواف میں چکر کاٹنا' وہاں تواضع سے گردن جھکانا ضروری تھا اور یہاں سعی سے پہلے کے طواف میں تاننا اور اکڑ اکڑ کر اور مونڈھے ہلا ہلا کر چلنا واجبات میں سے ہے' وہاں نمازوں کا اکثر حصہ جیسے سنتیں اور نفلیں گھر میں پڑھنا مستحب تھا' یہاں سرے سے گھر چھوڑ کو دیارِ محبوب میں آنا ضروری ہے کہ حج فرض ہو یا نفل گھر بیٹھ کر ہو ہی نہیں سکتا۔

وہاں خون گرانے سے بچنا ضروری تھا اور یہاں اِہراق دم یعنی منیٰ میں خون بہانا ہی اصل عبادت ہے۔ وہاں شیطانی وسوسوں کا مقابلہ ناپسند بلکہ دفع الوقتی اور ادھر سے خیال ہٹا دینا ہی وسوسہ کا علاج ہے۔ یہاں خود شیطان کا مواقع و محل کے مدِمقابل آکر اسے کنکروں سے سنگسار کرنا ضروری ہے۔ غرض وہاں افعال ہی افعال ہیں اور یہاں تروک ہی تروک۔

وہاں بقا و شعور کی شان کا غلبہ ضروری ہے جو عقل کا تقاضا ہے اور یہاں فنا و محویت کی شان لازمی ہے جو عشق کا مقتضا ہے۔

غرض ان دونوں عبادتوں کے لوازم و آثار میں تضاد کی نسبت ہے۔ جیسا کہ عقل اور عشق کے تقاضوں میں تضاد کی نسبت ہے۔ بادشاہ کے دربار میں عقل و ہوش کے ساتھ آنا پڑتا ہے۔ اور محبوب کے در پر عقل و شعور سے بالا ہو کر محویت و ربودگی کے ساتھ حاضر ہونا ہوتا ہے غرض یہ واضح ہو گیا کہ ادھر حق تعالیٰ کی صفاتِ کمال کی دو شانیں تھیں۔ صفاتِ جلال اور صفاتِ جمال اور ادھر ہر بندہ میں بھی دو ہی جوہر رکھے گئے تھے ___ ایک عقل اور ایک عشق یعنی اگر اللہ کی شانوں کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حاکم بھی ہو اور محبوب بھی۔ تو بندہ کے ان دو جوہروں کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا محکوم بھی ہو اور عاشق بھی۔

ان دونوں تقاضوں سے یہ دونوں عبادتیں مقرر ہوئیں۔ ایک نماز جس میں حاکمِ حقیقی کے سامنے اپنی محکومیت وقدوسیت اور نیاز مندی و عبدیت پیش کی جاتی ہے اور ایک حج جس میں محبوبِ حقیقی کے سامنے اپنی محویت اور ربودگی اور جاں نثاری وجاں سپاری پیش کی جاتی ہے۔ اس لئے دونوں عبادتیں اسلام کا بنیادی موضوع ثابت ہوتی ہیں۔ اسی لئے جن میں اسلام سمجھانے کے لئے تحریری مواد فراہم کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے وہ اولاً عبادات اور خصوصاً نماز وحج کے لئے ہی سب سے پہلے مواد فراہم کرتے ہیں اور بلاشبہ یہ دونوں عبادتیں اسی کی مستحق بھی ہیں کہ ان پر مستقل کتابیں لکھی جائیں ___ چنانچہ نماز پر بھی سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں جن میں نماز کے مسائل' نماز کے افعال' نماز کی روح' نماز کے اسرار' نماز کے مصالح' نماز کی غرض وغایت' نماز کے ثمرات ونتائج وغیرہ جمع کئے گئے اور ایسی کتابوں کا ایک بڑا عدد تاریخ کے اوراق میں دستیاب ہوتا ہے۔

اسی طرح مناسکِ حج پر بھی کتابوں کا ایک ذخیرہ ملے گا جو اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے مرتّب ہوا ہے۔ فضائلِ حج' مسائلِ حج' دلائلِ حج' اسرارِ حج' آثارِ حج' شعائرِ حج' مقاماتِ حج' تاریخِ حج' جغرافیۂ حج' طریقِ حج وغیرہ پر ضخیم ضخیم جلدیں لکھی گئی ہیں۔ اور بلاشبہ یہ دونوں موضوع اسی کے مستحق بھی تھے کہ ان پر سفینے مرتّب ہوں اور ان کے حقائق محض سینوں کی امانت نہ بنے رہیں جب کہ یہی دو عبادتیں اسلام کی اساس اور حقیقی عبادتیں تھیں جن سے دوسری عبادتوں نے جنم لیا۔ پھر اس میں بھی خصوصیت سے حج کی عبادت چونکہ نقل وحرکت اور سیرو سیاحت کی عبادت تھی جس میں ایک حاجی کو اپنی نظر و فکر کی مستعدی کی حد تک مختلف رنگ کے تجربات بھی حاصل ہوتے ہیں اس لئے حج سے متعلقہ تصانیف میں سفرناموں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے جو اہلِ علم حجاج نے بوقتِ سفرِ حج قلمبند کیا اور اپنے تجربات سے مابعد کے حجاج کو مستفید ہونے کا موقع بخشا تاکہ ان کے تجربات سے بعد کے لوگ مختلف معلوماتی فوائد بھی حاصل کریں اور پچھلوں کے تجربات

اگلوں کے لئے راہِ حج میں مدد اور آسانیوں کا ذریعہ ثابت ہوں۔

علمی حج

خوشی کا مقام ہے کہ ہمارے بھائی مگر بزرگ بھائی دوست اور مخلص دوست متدین اور متقی عالم مولانا محمود حسن صاحب گیاوی دام مجدہٗ، فاضلِ دیوبند نے بھی اپنے سفرِ حج میں اپنے عملی حج کو علمی حج بنانے کی سعی مشکور فرمائی اور اپنے سفرِ حج کے کوائف و تجربات کو نہایت جامعیت کے ساتھ سفرنامہ کی صورت میں مرتّب فرمایا نہ صرف تاریخی حیثیت سے بلکہ شرعی اور فنّی طور پر بھی حج کے مختلف پہلوؤں کو اپنے علم و عمل اور تجربہ کی روشنی میں جمع فرمایا ہے، جس کے عنوانات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں حج کے تمام مالہٗ وماعلیہ سے بحث کرتے ہوئے مسائل، فضائل، دلائل، شمائل، شعائر آثار، وقائع حوادث و ضروریات وغیرہ کا ایک معتدبہ اور بڑا ذخیرہ جمع فرمادیا ہے جو ان کے علم و عمل اور اخلاص و ایثار کا شاہکار ہے اس لئے یہ سفرنامہ تاریخ، تحقیق، فقہ، کلام، روایت اور درایت ہر پہلو سے حج کو اپنے پہلو میں لئے ہوئے ہے۔ جس نے حج کو ''آئینہ'' بنا کر طالبوں کے سامنے رکھ دیا ہے اور خصوصیت سے یہ مصنّف ممدوح کا خاص احسان ہے کہ انہوں نے مسائل کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی تجربات سے بھی دنیا کو فائدہ پہنچانے کی سعی فرمائی ہے۔

فجزاهم الله عنا وعن جميع المسلمين خير الجزاء

آئینۂ حج اور آئینہ نمائی

محترم مصنّف کی خواہش تھی کہ میں اس رسالہ ''آئینۂ حج'' پر بطورِ مقدّمہ چند سطریں لکھ کر پیش کروں۔ میرے لئے سب سے بڑی مشکل وقت نکالنے کی تھی، پھر اپنی علمی بے بضاعتی کی وجہ سے ایسے اہم اسلامی موضوع پر قلم چلانے کی تھی اور اوپر سے کتاب اپنی جامعیت اور مکمل تفصیلات کا آئینہ ہونے کی وجہ سے بھی مقدّمہ و تمہید سے بے نیاز بھی تھی جب کہ اس میں حج کا پہلو خود ہی موجود ہے اس لئے تعمیل میں غیر معمولی تاخیر ہوئی پھر بھی یہ چند سطریں کسی نہ کسی طرح سفر و حضر میں تھوڑا تھوڑا وقت نکال کر پوری کیں اور محض ''آئینۂ حج'' کو پیش کر دینے کے لئے پیش کردی گئیں تاکہ اس میں اپنا چہرہ دیکھ کر لوگ خود ہی اس کا اور اپنا اندازہ لگا سکیں، ورنہ جہاں تک حج کے پہلوؤں کا تعلق ہے یہ ''آئینہ'' سارے حج کا خود ہی آئینہ دار ہے، جس کے جوہروں میں حج کے سارے ہی پہلو جلوہ گر ہیں، نہ اس میں کسی کمی بیشی کی گنجائش ہے نہ اضافہ کی، نہ تمہید کی، نہ مقدّمہ کی، بس یہ مقدّمہ آئینۂ حج میں خود اپنے کو دیکھنے کے لئے بطورِ آئینہ کے پیش کیا جارہا ہے نہ کہ حج کو دیکھنے کے لئے۔ کہ حج نمائی کا آئینہ بنانا۔

مصنّف محترم ہی جیسے عالم وفاضل کا کام تھا جنھوں نے یہ آئینہ حقیقتاً بنا کر دنیا کو دکھا دیا۔ میرا کام صرف آئینہ نمائی تھا جو بُرے بھلے انداز سے بنا کر کے پیش کیا جارہا ہے۔ حق تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور مصنّف ممدوح کو جزائے خیر عطا فرمائے اور سفرنامہ کی اس علمی سعی کو مشکور فرمائے۔ آمین۔

والحمد لله الذي بنعمته تتم الصالحات۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

پس منظر

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی سلور جوبلی کے موقع پر ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو نماز جمعہ کے بعد جامعہ کی مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اس موقعہ پر امیرِ جامعہ اور منتظمینِ جلسہ کے اصرار پر حضرت مہتمم صاحب (رحمۃ اللہ) نے ایک نہایت ہی مختصر مگر نہایت جامع خطبہ ارشاد فرمایا جو اس درجہ مؤثر و مقبول ہوا کہ اساتذہ کرام جامعہ ملیہ اور دیگر حضرات نے حضرت موصوف سے اس کے قلمبند کرنے کی فرمائش کی۔ تاکہ اشاعت کے ذریعہ اس کو غائبین تک بھی پہنچایا جائے اور وہ بھی اس سے اسی طرح مستفیض و محظوظ ہوں جس طرح حاضرین نے فیض حاصل کیا۔ چونکہ وہاں مصروفیت زیادہ رہی اور قیام گاہ پر زائرین اور ملاقاتیوں کا برابر ہجوم رہا۔ اس لئے اس خطبہ کو قلمبند کرنے کا موقع نہ ملا۔

دیوبند مراجعت فرمانے کے بعد احقر کے اصرار پر باوجود انتہائی عدیمُ الفرصتی کے حضرت موصوف نے یہ خطبہ قلمبند فرما کر مرحمت فرمایا ہے اگرچہ تقریر کا بعد از وقت بعینہٖ تحریر میں آجانا تو عادتاً ناممکن ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ چونکہ یہ تحریر حضرت موصوف کے قلم سے ہو کر شائع ہو رہی ہے اس لئے ایک حد تک اصل تقریر کی غمازی کر سکے گی۔

(احقر مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند)

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اہمیتِ نماز

دین کے دوسرے کاموں کی بقا بھی درحقیقت نماز سے ہی ہے۔ اسی سے اوقات کی پابندی ہوتی ہے اسی سے عظمتِ حق دل میں جاگزیں ہوتی ہے اسی سے دین کے اوامر کی عظمت ہوتی ہے اور پھران کی تعمیل پر دل مجبور کرتا ہے ___
غرض نماز ہے تو کُل دین ہے۔ اور وہ نہیں تو دین بھی نہیں۔ اور مسلمان کا دین ہے تو دنیا بھی ہے۔ ورنہ دنیا بھی نہیں۔ پس نماز ہے تو جہاں ہے ورنہ حرمان و خُسران ہے۔
حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ۔ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ۔

کائنات کا انتہائی مقصد

بزرگانِ محترم!
مجھے اس وقت کوئی تقریر کرنا منظور نہیں ہے اور نہ اس کا پروگرام ہی ہے۔ مجھے امر کیا گیا ہے کہ میں آپ حضرات سے مسجد کے سنگ بنیاد کے سلسلہ میں دعا کراؤں یہ ظاہر ہے کہ دعا کرانے کی چیز نہیں ہے۔ کرنے کی چیز ہے۔ آپ بھی خود ہی دعا کریں گے اور میں بھی دعا کرنے میں آپ کے ساتھ شامل ہوں گا۔ اس لئے دعا کرانے کے لئے بھی میں نہیں کھڑا ہوا ہوں۔ مقصد دعا سے پہلے دعا کے نقاط پر توجہ دلانا ہے کہ کن پہلوؤں پر دعا کریں گے۔ اور حق تعالیٰ سے کن مقاصد کا سوال کریں گے۔ کیونکہ اس وقت مطلقاً دعا مقصود نہیں ہے بلکہ دعا خاص مقصود ہے۔ سو اس دعا کے نقاط اور پہلوؤں پر اس طرح سے غور کیجئے کہ اس ساری کائنات کا پھل اور آخری مقصد انسان ہے جس کے لئے زمین و آسمان کا یہ سارا خیمہ تانا گیا ہے۔ اگر انسان کی تخلیق منظور نہ ہوتی تو کائنات کی تخلیق بھی عمل میں نہ آتی۔ پس ساری کائنات انسان کی خاطر بنائی گئی ہے۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے :

انّ الدّنیا خُلقت لکم۔

''ساری دنیا تمہارے لئے بنائی گئی ہے''۔

ارشادِ ربانی ہے :

خَلَقَ لَکُمْ مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔

''اور جو کچھ زمین میں ہے تمہارے ہی نفع کے لئے ہیں''۔

ایک جگہ فرماتے ہیں :

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ وَسَخَّرَلَکُمُ الْفُلْکَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِہٖ وَسَخَّرَلَکُمُ الْاَنْھٰرَ وَسَخَّرَلَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَسَخَّرَلَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ وَاٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَاسَئَلْتُمُوْہُ۔

''اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی کو اُتارا۔ اور اس سے پھل اگائے تمہارے رزق کے لئے اور جہازوں کو تمہارے کام میں لگایا تاکہ اس کے حکم سے وہ دریا میں چلیں اور دریا تمہارے کام میں لگائے اور آفتاب ماہتاب تمہارے کام میں لگائے جو چل رہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے کام میں لگادیا اور وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے اس سے مانگا (خواہ دعا قولی سے یا دعا عملی یعنی اختیار واسباب سے)''۔

پس زمین و آسمان، رات دن کا لوٹ پھیر، شجرو حجر اور بحروبر کا کارخانہ سب کچھ انسان ہی کے لئے تیار کیا گیا ہے جس سے واضح ہے کہ تخلیق کائنات کا انتہائی مقصد انسان ہے۔

پھر یہ انسان کس لئے ہے؟ ظاہر ہے کہ کائنات کے لئے نہیں۔ ورنہ وسیلہ ہونے کے بجائے مقصد ہوجائے گی اور یہ خلاف نقل و عقل اور خلاف مشاہدہ ہے جیسا کہ واضح ہوا۔ اس لئے ایک ہی نتیجہ ہے کہ انسان کائنات کے لئے نہیں بلکہ خالقِ کائنات کے لئے ہے یعنی اس کی عبادت کے لئے۔ اس کے سامنے جھکنے اور گڑگڑانے اور اس کے آگے سرِ عبودیت خم کرنے کے لئے پس انسان کا مقصدِ تخلیق عبادت نکلا اور اب منطقی اُصول پر نتیجہ یہ نکلا کہ کائنات انسان کے لئے اور انسان عبادت کے لئے تو ساری کائنات کی یہ تنظیم و تخلیق صرف عبادت کے لئے عمل میں آئی ہے۔

عبادت کا فردِ کامل

عبادت پر اگر آپ غور کریں گے تو اس کا فردِ کامل نماز ہے۔ گویا ساری دنیا نماز کے لئے بنائی گئی ہے کہ یہی عبادت کا فردِ کامل اور مظہرِ اتم ہے بلکہ میں ترقی کرکے یہ عرض کروں گا کہ سلسلۂ عبادت میں عبادت صرف نماز ہی ہے اور کوئی چیز بذاتہٖ عبادت نہیں۔ کیونکہ عبادت کے معنیٰ غایتِ تذلّل اور انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں جو انتہائی عزّت والے کے سامنے اختیار کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس معنیٰ کے لحاظ سے نماز کے سوا کوئی چیز بذاتہٖ عبادت ہی نہیں نکلتی۔ مثلاً روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں کیونکہ روزہ کے معنیٰ کھانے پینے اور تمام لذّاتِ نفسانیہ سے مستغنی ہوجانے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ غنا اور عدمِ احتیاج ذلّت نہیں۔ کیونکہ غنا

تو خود خالق کی شان ہے تو خالق کی شان اختیار کرنا العیاذ باللہ ذلّت تھوڑا ہی ہے۔ یا صدقہ وزکوٰۃ دینا عطا ہے اور عطا تو خود اللہ کی صفت ہے وہ معاذ اللہ ذلّت کیسے ہو سکتی ہے؟ یا سچ بولنا خدا کی شان ہے تو اسے عبادت اور غایتِ تذلل کیسے کہہ دیں گے۔ اسی طرح اور تمام اخلاق حسنہ اور اعمالِ فاضلہ بذاتہٖ ذلّت نہیں کہ انہیں عبادت کہا جائے پھر بھی جو انہیں عبادت کہا جاتا ہے محض امتثالِ امرِ خداوندی کی وجہ سے نہ کہ بالذّات۔ ہاں نماز بالذّات عبادت ہے۔ کیونکہ اس کی ہیئت کذائی قیام، قعود، رکوع اور آخر کار سجدہ میں ناک اور پیشانی زمین پر ٹیکنا انتہائی ذلّت اور عبودیت کا اظہار ہے۔ اس کے اذکار مشتمل ہیں یا اظہار فدویت نفس پر یا اعلانِ عزّت رب پر۔ اور یہ خود شانِ تذلل ہے۔ غرض نماز کی ہیئت اور حقیقت سب مظہر ہے شئونِ تذلل اور احوالِ عبودیت پر۔

حاصل یہ ہوا کہ کائنات کی تخلیق عبودیت یعنی نماز کے واسطے ہوئی ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے نماز ہی کا ساری کائنات کو پابند ظاہر فرمایا ہے نہ کہ زکوٰۃ وحج اور صوم وصدقہ کا۔ فرمایا :

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ

"ہر چیز نے (خلقۃً اور تکوینی ہدایت سے) اپنی نماز اور تسبیح (یعنی ہیئتِ نماز اور اذکارِ نماز) کو جان لیا ہے"۔

جس سے واضح ہے کہ ساری کائنات نمازی ہے۔ بھلا پھر انسان کو تو کیوں نہ نمازی بنایا جاتا۔ فرق اتنا ہے کہ اور مخلوق غیر عاقل ہے تو اس میں نماز کا داعیہ جبلّی اور تکوینی طور پر رکھ دیا گیا ہے اور انسان ذی عقل وہوش ہے۔ تو اس کی نماز اختیاری ہے۔ جس کے لئے ہدایت ورہنمائی اور وعظ وپند کی ضرورت پڑتی ہے۔ پس اگر انسان نمازی نہ ہو تو گویا اس نے اپنے مقصدِ تخلیق کو فوت اور ضائع کر دیا ___ اس لئے فاروق اعظمؓ نے اپنے دورِ خلافت میں تمام رعایائے اسلام کے نام فرمان جاری فرمایا تھا کہ :

نماز ہے تو کُل دین ہے

ان اهمّ امور دینکم عندی الصّلٰوة فمن ضیّعها فهولما سواها اضیع۔

"میرے نزدیک تمہارے دین میں سب سے زیادہ اہم چیز نماز ہے۔ جس نے اسے ضائع کر دیا تو وہ دوسرے دینی کاموں کو اس سے بھی زیادہ ضائع کرے گا"۔

اس سے واضح ہے کہ دین کے دوسرے کاموں کی بقا بھی درحقیقت نماز سے ہی ہے۔ اسی سے اوقات کی پابندی ہوتی ہے۔ اسی سے عظمتِ حق دل میں جاگزین ہوتی ہے۔ اسی سے دین کے اوامر کی عظمت ہوتی ہے اور پھر ان کی تعمیل پر دل مجبور کرتا ہے۔ غرض نماز ہے تو کُل دین ہے اور وہ نہیں تو دین بھی نہیں اور مسلمان کا دین ہے تو دنیا بھی ہے ورنہ دنیا بھی نہیں۔ پس نماز ہے تو جہان ہے ورنہ حرمان وخسران ہے۔

بس اسی مقصد نماز کی تکمیل کے لئے یہ سنگِ بنیاد رکھا جا رہا ہے۔ تاکہ نماز اپنے مشروع طریق سے اسی مقدس جگہ میں ادا کی جائے۔

نماز تعلق مع اللہ کی مظہرِ اتم ہے

اسی لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اب تک تو جامعہ نے اپنے پروگراموں میں رسوم ادا کی ہیں اور اب حقیقت

ادا کی ہے وہ سب چیزیں نمائشی تھیں۔ حقیقت اگر ہے تو صرف یہ' جسے اس وقت آپ انجام دے رہے ہیں کہ اس سے مقصد زندگی تکمیل پا رہا ہے۔ نماز مظہر اتم ہے تعلق مع اللہ کی۔ اگر نماز اور تعلق مع اللہ قائم ہے تو یہ ساری رسمیں جو ہم نے ادا کی ہیں باروح اور زندہ کہی جائیں گی' ورنہ یہ سب چیزیں جو رسوم کی شکل سے ادا کی گئی ہیں ایک بے جان لاش ثابت ہوں گی۔ اور لاش کا انجام یہ ہے کہ وہ چند ہی دن بعد گلے' سڑے پھولے اور پھٹے اور اس کی بدبو سے دماغ متعفن ہوں اور احساسات گندے ہو جائیں۔

نیز یہ تعلق مع اللہ ہے جو ان رسموں کی شکلوں کی بھی اصلاح کر سکتا ہے ورنہ بلا تعلق مع اللہ اور بلا واسطہ او امر الٰہیہ کے یہ رسمیں بھونڈیں اور بدشکل متصوّر ہوں گی پس اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھ کر اور نمازی بن کر درحقیقت ہم اس کا تہیہ کر رہے ہیں کہ اپنی رسوم کی صورتوں کی بھی اصلاح کریں اور اس میں حقیقت و روح بھی پیدا کریں۔ تاکہ ہمارا ہر عمل پائیدار اور عواقب کے لحاظ سے نتیجہ خیز ہو۔ اور بے جان لاش کی طرح ضائع اور بے جڑ درخت کی طرح بے ثمر نہ رہے۔

قیامِ نماز سے ایک خاص فضا پیدا کرنا مقصود ہے

اس لئے ہمیں دعا اسکی کرنی ہے کہ اے اللہ ہمیں نماز کی توفیق دے اور نماز کے لئے ہمارے اس مکان مقدس یعنی مسجد کی تکمیل کرادے اور اس مسجد کو بنانے والوں' اس کی تعمیر کرنے والوں' اس میں امداد دینے والوں' اور اس کے منتظموں کا یہ عمل قبول فرما۔

ہمیں اللہ سے یہ مانگنا ہے کہ وہ اس نماز کے ذریعے ہمارے ہاتھوں جامعہ میں ایسی فضا پیدا کردے کہ جس میں نیکیاں پھلیں پھولیں اور بدیاں اپنی موت مرجائیں۔ آج کا دور وہ ہے کہ نیک نیکی کر کے شرماتا اور منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ جیسے گویا اس نے کوئی بڑا بھاری جرم کیا ہے اور مجرم بدکاریاں کر کے فخر سے سر اونچا کرتا ہے کہ گویا اس نے دنیا کا کوئی محترم کام انجام دیا ہے۔ ہمیں اللہ سے واسطہ پیدا کر کے اور نماز کو قائم کر کے ایسی فضا پیدا کرنی ہے کہ نیکی کر کے سر ابھارے اور مجرم اور بدکار خلاف شریعت امور کر کے منہ چھپاتا رہے' اور اپنی بُرائی کو محسوس کرے۔

آج کے دور میں ایمان سے کورے آدمی کا لقب ہے دانا' عالی ظرف اور بہادر' اور ایماندار کا لقب ہے احمق بے وقوف مجنون اور دیوانہ۔ حدیث میں ارشاد فرمایا ہے :

> یقال للرّجل ما اعقلہ وما اظرفہ وما اجلدہ ولیس فی قلبہ مثقال ذرۃ من الایمان۔

> "آدمی کے لئے کہا جائے گا کہ کس قدر دانا ہے کس قدر عالی ظرف ہے اور کیسا بہادر ہے۔ درانحالیکہ اس کے دل میں ذرہ برابر ایمان کا نشان نہ ہوگا"۔

اور دوسری روایات میں فرمایا گیا ہے کہ امین کو خائن کہا جائے گا اور خائن کو امین۔ علم والے کی اتنی بھی عزت نہ رہے گی جتنی کہ ایک مردار گدھے کی لاش کی ہوتی ہے۔ یہ چیزیں آج مشاہدہ میں آرہی ہیں۔ اہل تقویٰ کا نام مذہبی دیوانے' احمق ملانے وغیرہ ہیں اور اہل فجور کے القاب اعقل' اظرف اور اجلا ہیں تو ہمیں تعلق مع اللہ والوں کی کثرت کر کے ایسی فضا پیدا کرنی ہے کہ ہر ایک کو اسی کے صحیح لقب سے یاد کیا جائے اور اسی کے مرتبہ کے مطابق اس سے معاملہ کیا جائے۔ پس دعا میں ایک نقطہ یہ بھی ہمیں لانا ہے کہ اے اللہ ہمیں اہل تقویٰ میں سے اور نمازی کر کے ہمیں اہلِ سعادت کر اور اہلِ سعادت کی عزت و توقیر اور شوکت دے

میں قائم فرما۔ ہماری مادی شوکت اگر ہمیں حاصل ہو اور جس کا ہم فوجی انداز میں مظاہرہ کرکے گویا اس کی تحصیل کی خواہش ظاہر کر رہے ہیں اس کا ثمرہ اور آخری غایت بھی نماز ہی ہے۔ یعنی خدا سے تعلق۔

سلطنتِ اسلامی کا مقصود

حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔

پس ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ مسلمانوں کا دنیوی عروج اور تمکین فی الارض یعنی سلطنت و امارت اس لئے نہیں کہ کیک، پیسٹری کی فکر میں مستغرق ہوں۔ کوٹھی بنگلوں کی تعمیر ان کا منتہائے نظر ہو اور انڈا مکھن ان کا آخری مطلب ہو۔ بلکہ ان کا عروج اس لئے ہوگا کہ وہ خدا کی چوکھٹ پر جھکیں اور اس کی مخلوق کو جھکا دیں۔ دنیا میں معروف اور اچھی باتیں پھیلائیں اور بُرائی سے دنیا کو پاک کریں، صدقہ و خیرات سے غریبوں کی غُربت مٹادیں سائلوں اور محتاجوں کے دلوں کو تھامیں۔ اُخوّۃ و ہمدردی سے عالم کو بھردیں۔ تفوّق اور عُلوو فساد کا قلع قمع کریں۔

نمازی یا نماز کے ثمرات

پس محض اس کی دعا کرنی ہے کہ خداوندا ہمیں عروج دے تاکہ ہم تیرے اس مقدس مکان میں جمع ہو کر تیری یاد کریں اور اس بھولی ہوئی اور غافل دنیا کو تیرے بارے میں ہوشیار بنادیں۔ پس یہ کام ہم اس مسجد مقدس میں جماعتی حیثیت سے انجام دینے کی توفیق اللہ سے مانگنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ہمیں اپنی دعا میں نماز کی، مکان نماز کی تکمیل کی توفیق، نماز کے شوکت کے وسائل قائم کرنے کی توفیق، نماز کے لئے مادی شوکت فراہم کرنیکی توفیق اور نماز کے ذریعے اپنی صورت و سیرت اور ہیئت و حقیقت کے پاکیزہ اور مطلوب انداز پر لانے کی توفیق مانگنا ہے۔ یعنی جو کچھ بھی مانگنا ہے وہ نمازی یا نماز کے ثمرات ہیں یا نماز کے مبادی اور وسائل ہیں۔ ہم صرف نماز ہی دنیا میں چاہتے ہیں اور نماز ہی کے لئے ہر کام بھی چاہتے ہیں۔

اگر حقیقتاً ہمیں یہ زندگی میسّر ہو جائے تو اسی زندگی کا نام قرآن کی زبان میں حیاتِ طیّبہ ہے۔ اسی کا نام اُسوۂ حسنہ اور پاک سیرت ہے۔ جس کے لئے اسلام آیا اور پیغمبروں کا سلسلہ قائم کیا گیا۔

پس دعا کے یہی چند نقاط تھے جن پر توجّہ دلانے کے لئے میں کھڑا ہوا تھا، مجھے کوئی تقریر یا نماز کے موضوع پر کوئی سیر حاصل بحث کرنا منظور نہیں تھا۔ نہ اس کا وقت ہے اور نہ کوئی پروگرام۔ اس لئے اب آپ سب حضرات ہاتھ اُٹھائیں اور اپنے ربِّ کریم کی بارگاہ میں ان مطلوبہ نقاط پر مخلصانہ دعا فرمائیں۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

رمضان اور اس کے مقاصد و برکات

وہ مردِ مؤمن کیسے ہلاک ہو سکتا ہے جس کے عباداتی سال کا اوّل رمضان المبارک ہو' اور جس کا وسط اشہُرِ حج اور محرم الحرام ہو۔ اور جس کا آخر شعبان معظم ہو۔ پس جس مؤمن کی عمر پر اس طرح کے سال گزرتے رہے تا آنکہ اس کی عمر پوری ہو جائے' تو یقیناً اس کے دل کی زمین اس اوّل و آخر اور وسط کے ساتھ جاہ و باہ کے ترک کے ذریعے نفسانی خس و خاشاک سے پاک ہو گی اور وہ افعال طاعت و عبودیت اور بر کے ذریعے نور و برکت سے چمک اُٹھے گی۔ اور اس کے رذائل زائل ہوں گے اور اس میں فضائل داخل ہوں گے وہ نار سے بچ جائے گا۔ اور نور سے سرفراز ہوگا۔ جو حقیقی فوز و فلاح ہے۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ـــــــ اَمَّا بَعْدُ ـــــــ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ (صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ٥)۔

اصلاحِ طینت

بزرگانِ محترم!

ایک اعلیٰ ترین باغ کا بہار آفریں نشوونما' اس کی دلکش اور نظر افروز سرسبزی شادابی' تازگی اور بار آوری اس وقت تک اپنے عروج کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اس کی زمین کو خود رو گھاس پھونس اور خس و خاشاک سے پاک نہ کر دیا جائے' اسی طرح ایک پاکیزہ برتن پر قلعی سے اس وقت تک چمک نہیں آئیگی جب تک اس کے جگری زنگ کو دور نہ کر دیا جائے اور اس پر چھائی ہوئی کدورتوں سے اسے صاف نہ کر دیا جائے ہو بہو اسی

طرح ایک قیمتی کپڑے پر کوئی نظر فریب رنگ اس وقت تک کھل نہیں سکتا جب تک کہ میل کچیل اور آئے ہوئے دھبوں سے اسے صاف نہ کر دیا جائے۔

اُصول یہ نکلا کہ کوئی شئی بھی تہذیب و تمدن اور اصلاحی عمل کے ذریعہ اعلیٰ جوہروں سے اس وقت تک شائستہ اور آراستہ نہیں کی جاسکتی جب تک کہ اس کے اندر سے اُبھرنے والی خرابیوں کے مادوں کو سُست، مغلوب اور مضمحل کر کے اس کی طینت کو صاف نہ کر دیا جائے۔

سعادت کی بنیاد

ٹھیک اسی فطری اُصول کے مطابق اس کائنات کے اشرف اُصول اور افضل ترین رُکن انسان کو بھی دیکھو کہ اسے بھی سعادت و شرافت، بزرگی اور برتری اور ظاہر و باطن کے فضل و کمال سے اس وقت آراستہ نہیں کیا جاسکتا، جب تک کہ اس کے اندرونی شر و فساد اور جبلّی عیبوں، اور اخلاقی خرابیوں کے ناپاک مادوں سے اسے صاف نہ کر لیا جائے۔ اس میں پاکیزہ اخلاق اور نیکوکارانہ افعال کے مادے اس وقت تک جڑ نہیں پکڑ سکتے جب تک اس کے ظاہر و باطن کو زنگ خودی اور زنگ ہوا و ہوس سے پاک نہ بنالیا جائے اور اس کے دل کی زمین میں ایمان و ہدایت کا شجرۂ طیبہ اس وقت تک نشوونما اور ثمر نہیں پاسکتا جب تک کہ اس میں سے خود رو وساوس و اوہام ہوائے نفس اور فانی لذتوں کی ہولناکیاں کھرچ کر باہر نہ پھینک دی جائیں۔

تخلیہ و تحلیہ

اس صورت میں قدرتی طور پر انسانی تہذیب و تربیت کے دو عمل قرار پائے جاتے ہیں، افعال اور تروک یعنی کچھ کرنے کی چیزیں جو اس سے کرائی جائیں گی گویا اس کے نفس میں بھری جائیں اور کچھ بچنے کے چیزیں جو اس سے چھڑائی جائیں گویا اس کے نفس میں سے نکالی جائیں۔ کرنے کی چیزوں سے اس کا نفس خیر و خوبی سے آراستہ ہوگا، اور بچنے کی چیزوں سے اس کا نفس شر اور شیطنت سے پاک ہوگا۔ اس طرح تربیت انسانی دو عملوں کا مجموعہ بنتی ہے ایک **تحلیہ** اور ایک تخلیہ (یعنی خالی کرنا اور بھرنا) تخلیہ کے ذریعے اسے رذائلِ نفس سے پاک کیا جاتا ہے اور **تحلیہ** کے ذریعے اسے فضائل سے آراستہ کیا جاتا ہے جب تک کہ دونوں مثبت اور منفی عمل اس میں جاری نہ کئے جائیں نہ ان کی تہذیب مکمل ہو سکتی ہے اور نہ وہ سعادت و رُشد کے نور سے روشن ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شریعتِ خداوندی جو انسان کی تہذیب و اصلاح کی کفیل بن کر آئی ہے، دو ہی اجزاء سے مرکب ہو کر نازل ہوئی ہے، ایک امر، اور ایک نہی یعنی ایک حصہ اس میں مامورات کا ہے جن کے کرنے کا امر کیا گیا ہے تاکہ نفس کو اس کی سعادت مل جائے، اور ایک حصّہ منہیات کا ہے جن سے بچنے کا اسے پابند کیا گیا ہے، تاکہ نفس کی شقاوت دور ہو۔ پس مامورات کو از قسم افعال سمجھو اور منہیات کو از قسم تروک، یہی مامورات نیکیاں ہیں جن کا نوعی اور اُصولی نام شریعت کی زبان میں معروف ہے اور یہی منہیات بدیاں ہیں۔ جن کا نوعی اور اُصولی نام اصطلاحِ شرع میں منکر ہے، اور یہیں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغی اصطلاح بنتی ہے۔ جسے سب پہنچانتے ہیں۔ اور قرآن نے جابجا اس کی تاکید کی ہے، کہیں اس کا امر کیا ہے۔

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔

"اچھی باتوں کا حکم کرو اور بُرائیوں کو روکو اور جو کچھ تکلیف پہنچے اس پر صبر کرو۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے"۔

کہیں اُمت کی خیریت اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر دائر کردی ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

"ان تمام اُمتوں میں تم بہترین اُمت ہو جو تمام انسانوں کے لئے پیدا کی گئی ہے بھلائیوں کا حکم کرتے ہو اور بُرائیوں سے روکتے ہو"۔

کہیں رفعت و برتری اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قرار دیا گیا ہے فرمایا گیا کہ :

اَلنَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

"نبی اُمّی کہ جس کی بات وہ تورات وانجیل میں لکھا پاتے ہیں جو ان کو اچھی باتوں کا حکم کرتا ہے اور بُرائیوں سے روکتا ہے"۔

نظامِ سعادت

شریعت کے یہ تمام مامورات یا معروفات جس کا شمار نیک افعال میں ہے، اصطلاحِ شریعت میں ان کے افعال کا نام بِر ہے اور وہ تمام منہیات یا منکرات جو از قسم تروک ہیں ان سے بچنے کا اصطلاحی نام تقویٰ ہے اس لئے گویا پوری شریعت کا خلاصہ بِر و تقویٰ نکل آتا ہے۔ جس پر انسانی سعادت کا نظام قائم ہے۔

اگر افعالِ بِر یا اُمورِ خیر کو معطل کردیا جائے تو حصولِ خیر کا نظام درہم برہم ہو جائے گا جس کو شرعی زبان میں اِثم کہتے ہیں اور یہ اِثم یا گناہ ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے اور اگر تقویٰ کو معطل کردیا جائے تو دفعِ شر کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ جس کا اصطلاحی نام "عُدوان" ہے (یعنی حدود سے تجاوز اور زیادتی) اور اللہ کی قائم کی ہوئی ان حدود سے تجاوز کرنا ہی تمام فساد انگیزیوں اور فتنہ سامانیوں کی جڑ ہے۔ پس کوئی انسان محض بِر سے یا نیک کاموں سے کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس میں تقویٰ کے تروک نہ ہوں اور کوئی فرد بشر محض تروکِ تقویٰ سے کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس میں بِر (نیکی) کے افعال اور تاثیرات نہ ہوں۔

اب چونکہ بِر و تقویٰ نیکی اختیار کرنے اور بُرائیوں سے بچنے کے اس مثبت و منفی عمل کے مجموعی نظم ہی سے دین اور تہذیب و تمدن کا نظام استوار ہوتا ہے، اس لئے شریعتِ اسلام نے ان دونوں میں باہمی تعاون کی اور انکی اضداد یعنی اِثم و عُدوان سے عدم تعاون کی دعوت دی ہے۔ قرآن حکیم نے یہ ساری بنیادی تفصیلات بلکہ پوری شریعت کے امر و نہی کے نظام کو ان دو جامع اور معجزانہ جملوں میں ادا کردیا ہے جن سے ان انواع کے یہ اصطلاحی نام بھی متعین ہو جاتے ہیں۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔

"تعاون کرو نیکی اور تقویٰ پر اور گناہوں اور سرکشی پر تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرو اللہ تعالیٰ زبردست انتقام لینے والے ہیں"۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ بِر و تقویٰ کے یہ افعال و تروک محض ان کے نظم (الفاظ) کی جوہری خوبی اور برتری

سے انسانوں میں قائم نہیں ہو سکتے' جب تک کہ خود انسانوں میں بھی بر و تقویٰ کو قبول کرنے اور ان سے اثر پذیر ہونے کا مادہ اور صلاحیت نہ ہو۔ اور اس میں ایسی قوتیں رکھی ہوئی نہ ہوں جو اس بر و تقویٰ کے جذب کرنے پر جھکی ہوئی ہوں اور اسے برداشت کریں جس سے نفسِ انسانی پر بر و تقویٰ کا رنگ چڑھ سکے' ورنہ اگر اندرونی قابلیت کے بغیر ہی بر و تقویٰ کا خطاب صحیح ہوتا یا محض بر و تقویٰ کے شرعی نظام کو خوبی اور برتری ہی نفوس میں اسے جاگزیں کردیا کرتی تو حیوانات آخر اس تکلیفِ شرعی سے الگ کیوں رکھے جاتے؟ ان کو بر و تقویٰ کا مکلف نہ بنائے جانے کی اس کے سوا وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے کہ ان میں بارّ اور متقی نیک اور پرہیز گار بننے کی یا بر و تقویٰ قبول کرنیکی کوئی استعداد' اور کوئی قوت موجود نہیں اس لئے محض بر و تقویٰ کے شرعی نظام کا اعلیٰ اور منضبط ہونا ان کے لئے کار آمد نہیں' اس سے یہ نتیجہ نکل آنا قدرتی ہے کہ اگر خدا نے انسان کو بر و تقویٰ کا مکلف ٹھہرایا ہے تو ضروری ہے کہ اس میں بھی بر و تقویٰ کے نظام کو قبول کرلینے کی قوتیں بھی ہوں جن پر یہ نظام بر و تقویٰ اپنا عمل کرے اور انسان بارّ و متقی۔ نیکوکار اور پرہیز گار بنے' اسی طرح انسان میں اثم وعدوان کے مادے بھی ہونے ضروری ہیں جن سے وہ اثم وعدوان کا مرتکب ہوتا ہے بلکہ ہوتا ہو اور شریعت اسے ان قبیح حرکات سے روکے' ورنہ اس میں ان گناہ کاریوں کے مادے ہی نہ ہوتے تو وہ کبھی بھی اثم وعدوان کا مرتکب نہ ہو سکتا اور ایسی صورت میں اسے اثم وعدوان سے باز رہنے کا حکم دیا جانا بالکل ایسا ہی حکم ہے جیسا کہ کسی جنگلی جانور شیر اور بھیڑیے کو کہا جائے کہ خبردار گناہ مت کرنا اور اثم وعدوان کا مرتکب نہ ہونا۔ ظاہر ہے کہ جیسے یہ حکم غیر حکیمانہ ہے ایسے ہی اثم وعدوان کے مادے کے بغیر انسان کو یہ حکم دیا جانا لغو اور لایعنی ہوتا ہے' جس سے اللہ کی شریعت بَری ہے اس لئے ضروری ہے کہ انسان میں اثم وعدوان کے مادے بھی ہوں اور وہ ان قبیح حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہو بلکہ ہوتا ہو اور پھر اسے روکا جائے جس سے وہ اپنے اختیار سے خود رکے' تاکہ یہ رُکنا شریعت کے لئے حکیمانہ فعل ثابت ہو' اور رکنے والے کے لئے امر حسن باعثِ اجر و کمال بنے۔

ایمان و امانت

اس اصول کے بعد سمجھئے کہ انسان میں جو قوت افعالِ بر کا تحمل کرتی ہے بلکہ افعالِ بر کا مصدر ہے۔ جس سے یہ افعال صادر ہوتے ہیں ان کا نام شریعت کی اصطلاح میں امانت ہے اور جو قوت تقویٰ کا بوجھ اٹھاتی ہے اور اس سے حقیقیانہ تروک کا ظہور ہوتا ہے اس کا نام شریعت کی زبان میں حیاء ہے۔ پس امانت امر حسن اور اچھے کام کی رغبت کے مادے کا نام ہے اور حیاء امر قبیح سے انقباض کے مادہ کا نام ہے۔

پس ایمان اور اس کے سارے عملی شعبے عبادۃ' اطاعۃ' تفویض وغیرہ درحقیقت امانت کے کندھوں پر سوار ہو کر آگے بڑھتے ہیں۔ اگر امانت نہ ہو یعنی دل میں ان اُمورِ حسنہ کی رغبت و قبول کا مادہ ہی نہ ہو تو آدمی نہ ایمان قبول کر سکتا ہے نہ عمل صالح نہ دین نہ دیانت۔

پس امانت کی وہی نوعیت ہے جو رنگریزوں میں پھٹکری کی ہوتی ہے کہ وہ ہر رنگ کے لئے زمین ہے اگر رنگ کو پھٹکری نہ دی جائے تو کوئی رنگ بھی نہ کپڑے پر چڑھ سکتا ہے نہ کھل سکتا ہے۔ یا جیسا کہ عطاروں میں دِل کے تیل کی ہوتی ہے کہ ہر خوشبو کے لئے یہ سادہ تیل زمین ہے جو گلاب' چمبیلی اور کیوڑہ ہر خوشبو کو قبول کرلیتی ہے' اور مختلف عطر بن جاتے ہیں۔ اگر یہ زمین (دِل کا تیل) نہ ہو' تو کوئی عطر تیار نہ ہو۔ ٹھیک اسی طرح امانت زمین ہے' ایمان اور ایمانیات کے لئے جس پر ایمان کا رنگ چڑھ جاتا ہے یا ایمان اور ایمانیات کی خوشبو

میں جم جاتی ہیں' اگر قلب میں یہ امانت کا مادہ نہ ہو تو نہ ایمان ہو نہ ایمانیات' اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

لاایمان لمن لاامانة له۔

"اس میں ایمان ہی نہیں جس میں امانت نہ ہو"۔

پس ایمان و ایمانیات کو امر حسن اور مرغوب سمجھوانے والی طاقت اور پھر اسے جذب کرنے والی قوۃ یہ امانت ہی کی قوۃ ہے۔

امانت کی ضد بددیانتی اور خیانت ہے جس کے معنیٰ ہیں امور خیر کی رغبت نہ کرنا انہیں مستحسن نہ سمجھنا اور قبول نہ کرنا اور نتیجہ کے طور پر لہو ولعب اور خرافات میں مبتلا رہنا اور زندگی کو برباد کر دینا۔

اس خیانت کی قوت کو جو امورِ خیر کو بالا دافع کر دیتی ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں فتنہ کہتے ہیں جو درحقیقت امانت کی ضد ہے۔ پس امانت 'ایمان اور عملِ صالح کو جذب کرتی ہے اور فتنہ اسے دفع کرتا ہے۔ فتنہ کا ماحصل بددیانتی' اور خیانت ہے اور خیانت امر خیر میں ہوتی ہے۔ امر شر کو دفع کرنے کا نام خیانت نہیں۔ ایمان کے نظام صالح اور حسن معاشرت میں رخنہ اندازی اور اس کے نظام میں افراتفری پھیلانا ہی خیانت ہے جسے فِتنہ کہتے ہیں۔ پس بر ہونے کی قوت کا مادہ امانت ہے اور ہر نیکی کو دفع کرنے کے اور توڑنے درہم برہم کرنے کے مادے کا نام فتنہ ہے اور دونوں مادے انسان میں موجود ہیں۔ شریعت' مادہ امانت کو اجاگر کرنے اور مادہ فتنہ کے استیصال کے لئے آئی ہے۔

جہاد و قتال انسانوں کے گلے کاٹنے کے لئے نہیں رکھا گیا بلکہ دفع فتنہ کے لئے رکھا گیا ہے۔ تاکہ کوئی فتنہ زدہ قوم نظامِ صالح کو برباد نہ کرپائے۔ یہ جُدا بات ہے کہ اس کی بربادی اور رخنہ اندازی انسانوں ہی کے ہاتھوں ہوا کرتی ہے تو وہ فتنوں کو مٹانے والی طاقت بالآخر ان ہی کی گردنوں پر مسلط ہوتی ہے ورنہ اصل مقصود دفع فتنہ ہے قتل انسان نہیں۔ چنانچہ یہی فتنہ زدہ انسان اگر فتنہ سے ہٹ کر امانت پر آجائیں تو قتال فوراً بند ہو جاتا ہے۔ بہرحال امانت اُمورِ حسنہ کے امتحان کی قوت ہے اور فتنہ امور حسنہ کے استہجان و تخریب کی قوت ہے۔

حیاداری اور فحش کاری

تروکِ تقویٰ کو بروئے کار لانے والی قوت جو انسان کے باطن میں رکھی گئی ہے حیاء ہے جس سے انسان امر قبیح کے اِرتکاب سے سکڑتا اور منقبض ہوتا ہے جس سے قبائح متروک ہو جاتے ہیں اگر حیاء کا مادہ نہ ہوتو امورِ قبیحہ سے رکنے بچنے کی صورت نہ ہو۔ پس منکرات کو بُرا ثابت کرنے والی اور بچانے والی طاقت حیاء ہے حیاء کی عدم موجودگی میں نہ آدمی قبیح کو قبیح کہتا ہے اور نہ اس سے رک سکتا ہے اس لئے فرمایا گیا:

اذا فاتک الحیاء فاصنع ماشئت۔

"جب تجھ سے حیاء جاتی رہے تو جو تیرا جی چاہے کر"۔

اسی لئے حدیث میں الحیاء خیر کلہٗ (حیاء کل کی کل خیر ہی خیر ہے) فرمایا گیا اور اسی لئے حیاء کو ایمان کا عظیم ترین شعبہ قرار دیا گیا ہے' کہ خلاف ایمان حرکات سے بچاؤ اس قوت کے بغیر میسر آنا ممکن نہ تھا۔

حیاء کی ضد فحش ہے جو ہر امر قبیح پر بے حیائی اور بے غیرتی کی بات کو بروئے کار لاتی ہے اور حیاء دارانہ

امور کا نظام گڑبڑ ہو جاتا ہے' زنا کاری' شراب خوری' جوئے بازی' نقب زنی' کذب بیانی اور بدگوئی وغیرہ سارے قبائح پر آمادگی اور ان کا ارتکاب اسی قوت فحش سے ہوتا ہے۔ پس حیاء منکرات سے دُور کرتی ہے اور فحش منکرات کے قریب لاتا ہے۔ پس منکراتِ شرعیّہ کا مصدر اور سرچشمہ فحش ہے اور ان سے بچاؤ کا سرچشمہ اور مصدر حیاء ہے۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ یہ نکلا کہ اُمور خیر یعنی معروفات کی رغبت و تعمیل کا سرچشمہ امانت ہے اور ان کی خلاف ورزی اور درہمی برہمی کا سرچشمہ فتنہ ہے اور تمام اُمورِ شر یعنی منکرات سے بچاؤ کا سرچشمہ حیاء ہے اور ان کے ارتکاب اور سیہ کاری کا سرچشمہ فحش ہے۔ پس امانت و فتنہ' حیاء و فحش کی یہی چار قوتیں ہیں جس سے معروف' منکر اور بر و تقویٰ کا تعلق ہے۔ اول دو طاقتوں کا تعلق افعالِ بر کے کرنے اور چھوڑنے سے ہے' اور آخر کی دو قوتوں کا تعلق متروکاتِ تقویٰ کے ترک اور ارتکاب سے ہے۔ اس لئے شریعتِ الٰہی کا کام جو بنی آدم کی تہذیب و اصلاح کی کفیل بن کر آئی ہے۔ یہی ہو سکتا تھا کہ وہ افعال بر کا امر کر کے امانت کی طاقت کو مضبوط بنائے اور اس کی ضد فتنہ کا استیصال کرے اور تروکِ تقویٰ سے نہی کر کے حیاء کی طاقت کو مستحکم بنائے اور اس کی ضد فحش کا استیصال کرے کہ یہی عین عدل و احسان ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ۔

''اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل اور احسان کا اور قرابت داروں کو دینے کا' اور روکتا ہے بُرے کاموں اور منکر سے' اور نصیحت کرتا ہے تم کو شاید کہ یاد کرو''۔

بر و تقویٰ سے انقلابِ باطن

پس یہ امر بالمعروف یا امر بالبر براہ راست قوتِ امانت پر اثر انداز ہوتا ہے جس سے آدمی امین بنتا ہے' اور امین بن کر ایماندار ہوتا ہے اور ایماندار ہو کر مأمون ہوتا ہے جس سے خیر کے عناصر اُبھر جاتے ہیں اور فتنے دَب جاتے ہیں اور نہی عن المنکر یا ہدایت و تقویٰ براہ راست قوتِ حیاء پر اثر انداز ہوتی ہے جس سے آدمی باحیاء بنتا ہے' اور حیاء دار بن کر بُرائیوں اور منکرات سے نفرت کرنے لگتا ہے جس سے شر کے عناصر دَب جاتے ہیں اور ایمانداری کے موانع دُور ہو کر ایمان اور عملِ صالح کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔

الحاصل بر و تقویٰ کے عملی سلسلے پیش کرنے سے پہلے انسان کے ان چار اندرونی مادوں اور قوتوں کی تشریح ضروری تھی تاکہ یہ معلوم رہے کہ شریعت کا نظام بر و تقویٰ اور لائحہ افعال و تروک انسان کی کن طاقتوں پر اثر انداز ہوتا ہے' کن قوتوں کو اُبھارتا ہے اور کن طاقتوں کو پست کرتا ہے اور اصلاح کے اس مثبت و منفی عمل سے انسان کے باطن میں کیا کیا انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ جس سے اس کا نفس اور بگڑتا ہے۔

اب افعال و تروک یا بر و تقویٰ (احکام اور امتناعی احکام نیکوکاری اور پرہیزگاری) کے اصولی نقشہ کے عملی پہلو پر نظر ڈالو۔ تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں ایمان باللہ۔ اخلاص للہ' ذکر اللہ تذکیر بایام اللہ' تلاوت کلام اللہ' تعظیم شعائر اللہ' جہاد فی سبیل اللہ اور حضور مع اللہ یا (نماز و دعا اور مجاہدہ و مراقبہ وغیرہ) ادھر تعلق مع

الخلق کے سلسلہ میں خدمت خلق اللہ' اِنفاق فی سبیل اللہ' احسان للہ' اطعام لوجہ اللہ' اخوۃ فی اللہ اور النصح لدین اللہ یعنی عام خیر خواہی بنی نوع انسان' عدل و انصاف' وفاءِ عہد اور ایفائے عہد وغیرہ سب کے سب اُمورِ بِر کے اجزاء ہیں جن کے کرنے سے انسانی نفس سربلند مقبول اور محبوبِ خدا و خلق بنتا ہے' عند اللہ اس کی وجاہت قائم ہوتی ہے' اور عند الناس اس کی بالادستی اور برتری مسلّم ہو جاتی ہے جس سے وہ دنیا و آخرت کے بلند مناصب و مقامات کا حق دار ہو کر ابرار و اخیار کے زُمرہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ لیکن بِر (نیکوکاری) کا یہ سارا لمبا چوڑا سلسلہ اس وقت تک کارگر اور مؤثر نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ نفسِ انسانی میں سے نفسانیت اور اس کے رذائل کا خاتمہ نہ ہو جو اس امورِ بر کے حق میں سمِ قاتل اور قوی مانع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور کسی طرح بھی انسان کو ان سربلندیوں پر نہیں پہنچنے دیتے مثلاً جب تک انسانی نفس سے باہ کے رذائل جیسے حرص وہوا' ہوس رانی اور بدمستی سے کھانے پینے کی لذتوں میں غرقابی جنسی خواہشات اور نفسانی عیش میں ہمہ وقت سرگردانی کے جراثیم خارج نہ کئے جائیں یا جاہ کے رذائل جیسے ہوس اقتدار' نمائشی وقار کی ہمہ وقت بھوک' جذبات اَنانیت وخودی اور ہوس ریاست و امارت زائل نہ ہونگے۔

نفسانیت کا شر دُور کئے بغیر ملکیت کی خیر قرار نہیں پکڑ سکتی

خلاصہ یہ نکلا کہ ایک طرف زَن' زَر' زمین کی جاہ پسندانہ بدمستیوں اور دوسری طرف نفس وہوائے نفس کی جاہ پسندانہ خودی' خودبینی اور خود آرائیوں کا سودا انسان کے سر سے نہ نکالا جائے یا کم از کم ان کے ترک کا خوگر نہ بنایا جائے اس وقت تک انسان پر اعمالِ بر کا رنگ نہیں چڑھ سکتا۔ اگر بتکلف چڑھ بھی گیا' تو وہ جڑ نہیں پکڑ سکتا اور اگر اتفاقاً کچھ جم بھی گیا تو پختہ نہیں رہ سکتا۔ ایک ہی شوب میں اُڑ جائیگا۔

بہرحال نفس میں روحانیت اور ملکیت کی خیر اس وقت تک جاگزیں نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں سے نفسانیت کا یہ جبلی شر کھُرچ کر یا ہر نہ پھینک دیا جائے' بالفاظِ دیگر افعال بر کی قلعی سے اسوقت تک نفس پر چمک دمک نہیں آسکتی جب تک کہ تروکِ تقویٰ سے اس کا زنگ خودی اور زنگ انانیت اُتارا نہ جائے اور اس وقت تک قلب کے آئینہ میں انوارِ الٰہیہ منعکس نہیں ہو سکتے جب تک کہ اسے صیقل کر کے شفاف نہ کر لیا جائے ؎

دِل را اگر تو صاف کنی ہمچو آئینہ
درد لے جمال دوست بہ بینی چو آئینہ

عباداتی سال کا آغاز و اختتام

اسی لئے شریعت نے اپنے آغاز کار سے لے کر انجام کار تک افعال و تروک اور (مثبت اور منفی احکام) کا رشتہ ملا جُلا رکھا ہے۔ اور افعالِ بر کو تروکِ تقویٰ سے کسی وقت بھی جُدا نہیں ہونے دیا چنانچہ شریعت کا آغاز نُزولِ قرآن سے ہوتا ہے اور نُزولِ قرآن ماہِ رمضان سے ہے۔ اس لئے ماہِ رمضان گویا شریعت اور اس کی عبادتوں کا سن آغاز ہے' بالکل اسی طرح جیسے اداروں و کارخانوں اور تعلیم گاہوں وغیرہ میں سال کا آغاز کسی خاص مہینہ سے مقرر کر لیا جاتا ہے' اور اسی ماہ سے اس کے کاروبار کا آغاز سمجھتے ہیں اور اسی سے رجسٹر دفتر اور بہی کھاتے شروع کرتے ہیں مثلاً اسلامی اداروں میں حسابی سال عموماً محرم سے شروع کر کے ذی الحجہ پر ختم کیا

جاتا ہے۔ تعلیم گاہوں میں تعلیمی سال عموماً شوال سے شروع کر کے رمضان میں ختم کیا جاتا ہے۔ انگریزی اداروں میں دفتر سال جنوری سے شروع کر کے دسمبر پر ختم کیا جاتا ہے‘ ایسے ہی اسلامی شریعت کا دینی اور عباداتی سال ماہ رمضان سے شروع ہو کر شعبان پر ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نزول قرآن جو اساسِ شریعت ہے‘ ماہ رمضان ہی میں ہوا :

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ۔

”رمضان کا مہینہ وہ ہے کہ اس میں قرآن اترا ہے“۔

اسی لئے رمضانِ گویا عباداتی سال کا نقطۂ آغاز نکلا جس سے انسان کا ایمانی نشو و نما متعلق ہے۔ اور شعبان نقطۂ اختتام ثابت ہوا۔ جو اس ایمانی شباب کے بُلوغ کی حد ہے۔ اسی لئے بنصِ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کے مہینے میں عمروں کے اختتام کا اعلان عالمِ غیب میں ہو جاتا ہے۔ جو درحقیقت اعمال کے انقطاع کا اعلان ہے کہ عمل کا تعلق عمر سے ہی ہے‘ بلکہ عمر دی ہی گئی ہے عمل کے لئے اس لئے جس آن یہ زندگی ختم ہوگی‘ اسی آن انسان کا عمل‘ رزق اور کسب وغیرہ سب منقطع ہو جائے گا۔

یوں بھی ہر سال پچھلے رزق کا حساب ختم کر کے نئے سال کے لئے روزی رزق کا اس ماہ میں تعین کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے۔ پس شعبان اعلانِ اختتام طاعات وانقطاعِ اعمال کا مہینہ نکلا‘ جسے عباداتی سال کا نقطۂ اختتام کہنا چاہیے۔ جس طرح کہ رمضان اس کا نقطۂ افتتاح و آغاز تھا۔

ماہِ رمضان نیکیوں کا مرکزِ اتصال

اب رمضان کو لیجئے تو اس میں افعال بر اور تروکِ تقویٰ کو باہم ایک دوسرے سے اس طرح گوندھ دیا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ہلال رمضان نظر آتے ہی اوّل شب ہی سے اس ماہ کا افتتاح دو چیزوں سے کیا گیا ہے جو اعمالِ بر کی جان ہیں یعنی تلاوت قرآن اور نماز تراویح‘ یہی دو چیزیں ہیں جس سے انسانی نفس کو قُربِ خداوندی اور لذّتِ وصال کی دولت میسّر آتی ہے۔ نمازِ تراویح سے تو انتہائی قُرب ہوتا ہے۔ کیونکہ بنص قرآن و بتصریحِ حدیث سجدہ ہی کمال قُرب کا ذریعہ ہے جو افعالِ صلوٰۃ کا اصلی مقصود ہے۔

ارشادِ قرآنی ہے :

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ۔

”سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ“۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے :

انّ اقرب مایکون العبد من ربّہٖ وھوساجد۔

”بے شک بندہ اپنے رب سے قریب تر اس وقت ہوتا ہے کہ وہ سجدے میں ہو“۔

اور قُرب بمعنیٰ اتصال ہی نہیں بلکہ بمعنیٰ الصاق بھی ہے۔ کیونکہ حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تصریح ہے کہ بحالتِ سجدہ انسان کا سر اللہ کے قدموں پر گرتا ہے۔ پس اقربیت یعنی کمالِ قُرب وبقا تو نماز سے ملا‘ اور پھر اس کمالِ قُرب کی بھی تکمیل اور باثمر ہو جانا روزانہ کے چالیس سجدوں سے ہو جائے گا۔ کیوں کہ بیس رکعت میں چالیس سجدے ہوتے ہیں اور چالیس کے عدد کو تکمیل شے میں خاص دخل ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کو توراۃ دینے کا وقت آیا تو چالیس دن کا چلّہ کرا کر مناسبۃ مع الغیب کی تکمیل و تقویہ کرائی گئی۔ اور بنصِ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قلب سے حکمت کے چشمے پھوٹ نکلے یعنی قلب کی ایک

خاص علمی تکمیل کے لئے چالیس دن کا مخلصانہ عمل تجویز فرمایا گیا جس سے حضراتِ صوفیاء کرام نے چلّہ کشی کا اصول اخذ کیا۔

غرض چالیس کے عدد کو تکمیلِ حال و خیال میں خاص دخل ہے۔ اس لئے رمضان کی تراویح میں روزانہ چالیس سجدے پیاپے کرائے گئے۔

بندہ و خدا میں ربطِ باطنی

پھر اس کمالِ قُرب کو بے ثمر نہیں چھوڑ دیا گیا، بلکہ اس کے ساتھ کمالِ وصال کی سبیل تلاوت قرآن سے کی گئی کیونکہ حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن کو اللہ کے باطن کی چیز فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

تبرّک بالقراٰن فانہٗ کلام اللّٰہ وخرج منہٗ۔

"قرآن سے برکت حاصل کرو، کیونکہ وہ اللہ کا کلام ہے جو اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے"۔

اس سے واضح ہوا کہ قرآن اللہ کے اندر سے نکلی ہوئی چیز ہے جو تلاوت کے ذریعے ہمارے اندر پہنچ جاتی ہے یعنی اس کے باطن سے چلتی ہے اور ہمارے باطن میں پہنچ جاتی ہے، جس سے اللہ اور اس کے بندے کے درمیان باطنی ربط پیدا ہوتا ہے۔

کامل ترین مِلاپ

ادھر ایک دوسری حدیث میں تلاوت قرآن کو محادثہ مع اللہ یعنی اللہ سے باتیں کرنا بتلایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ بات کرکے متکلم اور مخاطب اپنا اپنا مافی الضمیر دوسرے تک پہنچا دیتے ہیں، جسے علمی قرب کی انتہائی منزل کہنا چاہئے۔

پس! تلاوت کے ذریعے ہمارے اور اس کے باطن کا ریل میل کچھ اس شان سے ہو جاتا ہے کہ اس سے زیادہ توافق اور تواصل کی دوسری صورت نہیں ہو سکتی کیونکہ جسمانی میل میلاپ اور وصل صرف اطرافِ بدن کے مِل جانے کی حد تک ہوتا ہے ایک جسم دوسرے جسم میں سما نہیں سکتا، گویا جسمانی وصال بھی محض سطحی ہوتا ہے۔ اور اس میں لذّت بھی اگر ہوتی ہے تو سطحی اور عارضی، لیکن روحانی ملاپ اور اس سے بھی بڑھ کر علمی ملاپ جو روح کی بھی روح ہے ایک ایسا کامل ترین ملاپ ہے کہ جسمانی میل ملاپ تو بجائے خود ہے، روحانی میل ملاپ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پھر اس وصل و وصال اور میل ملاپ کو بھی اگر دیکھا جائے تو وہ بھی وسیلہ ہی ہے۔ اصل مقصد قبول ہے نہ کہ وصول۔ اگر وصول ہو اور قبول نہ ہو تو وہ وصول بے کار ہے۔ بادشاہ کے یہاں وصول تو شاگرد پیشہ اور کم مرتبہ ملازمین کو بھی ہو جاتا ہے مگر قبول نہیں ہوتا وزیرِ اعظم اور امراء شاہی اگر واصل ہوتے ہیں تو یہ محض وصول ہی نہیں بلکہ ان کا قبول بھی ہوتا ہے۔

اعترافِ قبولیت

سو اس تلاوت تراویح میں جبکہ فاتحہ کی تلاوت ضروری ہے، اور ہر رکعت میں ضروری ہے۔ خواہ بلاواسطہ ہو یا بواسطۂ امام، اور اس کی ایک ایک آیت پر ادھر سے قبولیت کا بروقت اعتراف و اعلان کیا بھی جاتا

ہے۔

بندہ جب اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہتا ہے تو فوراً جواب دیتے ہیں حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ (میرے بندے نے میری تعریف کی) وہ کہتا ہے اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ تو فرماتے ہیں اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ میرے بندہ نے میری ثناء وصفت بیان کی۔ جب یہ کہتا ہے مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ تو فوراً فرماتے ہیں مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ (میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی) جب یہ کہتا ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تو فرماتے ہیں ھٰذَا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ (یہ میرا اور بندہ کے درمیان کا معاملہ ہے) جب وہ سوال کرتا ہے اور اِھْدِنَا سے آخر تک پڑھ جاتا ہے تو فوراً فرماتے ہیں۔ وَلِعَبْدِیْ مَاسَأَلَ (میرے بندہ کے لئے وہ سب کچھ ہے جو اس نے مانگا ہے) تو یہ بروقت اقرار واعتراف اور بندہ کو اپنا کہہ کر اس کی بات کو سراہنا ہی قبول ہے جس کے لئے وصول کی تمنّا کرتے ہیں۔

بشری عروج کا نقطۂ کمال

پس تراویح و تلاوت میں ابتدائی مرتبہ قربِ اتصال کا ہے جو نماز سے حاصل ہوتا ہے۔ پھر قرب سے وُصول و وصال کا ہے جو تلاوت سے حاصل ہوتا ہے اور پھر وصول سے قبول و رضا کا ہے جو تلاوتِ خاص کے مکالمہ سے حاصل ہوتا ہے۔ غرض تراویح و تلاوت سے حضرت حق کی ہمنشینی، معانقہ اور مکالمہ، تراضی طرفین کی دولت حاصل ہو جاتی ہے جس سے آگے بشری عروج و کمال کا کوئی اور مقام نہیں۔

لیکن نظر اس پر کیجئے کہ جہاں رمضان کی راتوں میں نماز و تلاوت سے وصول و قبول کی لذتیں دی جاتیں ہیں۔ وہیں اس مبارک مہینہ کے دنوں میں نفس کی ہوسناکیوں اور نفسانی لذات کو بھی قوت سے ترک کرایا جاتا ہے۔ کھانا پینا بھی ترک، مقاربتِ نسواں بھی بند، حتی کہ ان چیزوں سے خالی لذت لینا بھی ناپسندیدہ۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ شب کی غیر معمولی لذۃِ وصول و قبول، جو افعال بر میں سے فعل تراویح و تلاوت سے ملتی تھی بغیر ان تقوائی تروک کے میسر آنی ناممکن تھی۔

پس رمضان کے مہینہ میں دن بھر روزہ کے ذریعہ جو مجموعہ تروک ہے نفس کو مانجھا اور صاف کیا جاتا ہے اور شب کو اس صاف شدہ ظرف پر تلاوت و تراویح سے جو مجموعہ افعالِ بر ہے قلعی کی جاتی ہے جس سے وہ چمک اٹھتا ہے اور اس میں قُرب واتصال اور قبول و وصال کی اس چمک دمک سے انوارِ خداوندی منعکس ہونے لگتے ہیں گویا نفسِ انسان ___ میں نفسِ رحمان نظر آنے لگتا ہے۔ پس ماہِ رمضان جیسے بر کا مہینہ ہے ویسے ہی تقویٰ کا بھی مہینہ ہے۔ اور جیسے اس میں اثم سے بچاؤ میسر آتا ہے ویسے ہی اس میں عدوان سے بچاؤ کی توفیق ملتی ہے۔

روزہ اور ماہِ روزہ کا ثمر

اس لئے قرآن حکیم نے جب رمضان کے روزوں کا ذکر کیا تو اس کا سب سے بڑا ثمرہ تقویٰ بتلایا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔

”اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسے تم سے پچھلوں پر فرض کئے گئے تھے

تاکہ تم متقی بن جاؤ“۔

اور جب خود ماہ رمضان کا ذکر کیا جس میں دنوں کے ساتھ راتیں بھی شامل ہیں تو نزولِ قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے اس کا سب سے بڑا ثمرہ نورِ ہدایت، نور دلائل اور نورِ معرفت ظاہر فرمایا جو درحقیقت انسانی نفس کی چمک دمک اور قلبی کا سب سے اعلیٰ سامان ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ

”مہینہ رمضان کا وہ ہے جس میں قرآن اُتارا گیا جو انسانوں کے لئے ہدایت اور ہدایت کے کھلے دلائل کا مجموعہ اور قوت تمیزی کا علم ہے“۔

گویا روزہ کا ثمرہ تقویٰ اور ماہ کا ثمرہ بر نکلا اور اس طرح قرآن کریم سے ماہِ رمضان برو تقویٰ کا مہینہ ثابت ہوا جس سے اِثم وعدوان کا خاطر خواہ دفعیہ ہو جاتا ہے۔ حتی کہ اِثم وعدوان کے چشمے سوکھ جاتے ہیں۔ چنانچہ نفس کا دانہ پانی بند ہو جاتا ہے۔ اور شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں جو اِثم وعدوان پر ابھارتے تھے۔ ایک دانا دشمن کی حیثیت سے اور ایک نادان دشمن کی حیثیت سے۔ ظاہر ہے کہ دونوں دشمنوں کے اسیر ہو جانے پر اثم وعدوان کا دفعیہ قدرتی تھا۔

صیام وقیام کا باہمی تناسب

اسی لئے روزہ تلاوت تراویح یعنی صیام وقیام کا تناسب اور ایک سے دوسرے کا رابطہ بھی واضح ہو گیا کہ ایک تخلیہ کا مقام ہے یعنی روزہ جو انسان کو رذائلِ نفس سے پاک کرتا ہے اور ایک **تحلیہ** کا مقام ہے یعنی قرآن اور تراویح جو نفسِ انسانی کو چمک دار اور نورانی بناتا ہے۔ اس لئے قیامت کے دن صیام و قرآن کی شفاعت کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں بطورِ قرین وعدیل کے ذکر فرمایا گیا ہے۔

خلاصۂ مضمونِ حدیث یہ ہے کہ قیامت کے دن صیام و قرآن دونوں مل کر بندہ کی شفاعت کریں گے۔ روزے کہیں گے کہ خداوند! ہم نے دن بھر اس بندہ کو کھانے پینے اور شہوانی لذتوں سے محروم رکھا تو اس کے حق میں ہماری شفاعت کو قبول فرما، قرآن کہے گا۔ خداوند! میں نے اس بندہ کو راتوں میں نیند اور آرام سے محروم رکھا تو اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی شفاعت کا انجام سوائے قبولیتِ شفاعت کے دوسرا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قرآن کلامِ الٰہی اور صفتِ خداوندی ہے۔ تو اس کی شفاعت ایک صفتِ الٰہی کی شفاعت ذات سے ہے، جو ذات سے جدا نہیں۔ اس لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ حق تعالیٰ خود ہی اپنی بارگاہ میں شفاعت فرمائیں گے۔ تو کون ہے کہ اس شفاعت کو رد کر سکے؟

اور وہ خود کیسے رد فرمائے گے ۔

چوں خدا از خود سوال وکد کند
پس دعائے خویشتن چوں رد کند

ادھر روزہ کو تمام عبادات میں حق تعالیٰ نے اپنا اور اپنی چیز فرمایا ہے۔ اور یہ کہ میں ہی خود اس کا بدلہ دوں گا اور ظاہر ہے کہ اپنی چیز کو اپنا کہہ کر کون بے آبرو کیا کرتا ہے کہ اسے رد کرے۔ اس لئے صیام و قرآن کی شفاعتیں رد ہونے کی کوئی وجہ نہیں ___ اس سے صاف واضح ہوا کہ شریعت نے اپنے عباداتی سال کا افتتاح

افعال و تروک دونوں سے کیا ہے جو تربیتِ انسانی کے دو بازو ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ دنوں میں ترک کو اصل رکھا اور افعال اس کے ضمن میں رکھے، اور راتوں میں افعال کو اصل قرار دیا، اور تروک اس کے ضمن میں بقدر ضرورت آجاتے ہیں جو بوقتِ تلاوت و صلوۃ قائم رہتے ہیں۔ اور اس طرح سے اس کی راتیں روشنی میں دنوں سے کم نہیں ہیں بلکہ لَیْلُہَا وَنَہَارُہَا سَوَاءٌ کی مصداق ہیں۔

ہلالِ عید

جب رمضان کے یہ معدودے چند ایام اس شان سے پورے ہو جاتے ہیں کہ اس کے دن تروک میں مصروف اور اس کی راتیں افعال میں مشغول تو ہلالِ عید تکمیل عبادت کا مسرت بخش پیغام لے کر فضاء آسمان میں نمودار ہو جاتا ہے۔ گویا منجانب اللہ آسمان سے اطلاع دیجاتی ہے کہ اے بندگانِ الٰہی! تم نے وہ فرض پورا کر دیا جو ہلال رمضان نے تمہارے ذمہ عائد کیا تھا۔ تم نے اپنے دنوں کو نفسانی لذتوں (طعام و شراب اور مقاربت) سے بے نیاز رکھ کر خداوندی قرب و وصال کی لذتوں کو ترجیح دی اور اپنی راتوں کو لہو الحدیث اور قصہ کہانیوں میں گنوانے کی بجائے خیرُ الحدیث اور احسنُ القصص کے کہنے اور سننے میں مشغول رکھا، اس لئے تمہیں ہلالِ عید کے نورانی حروف کے ذریعے مبارک باد دی جاتی ہے کہ تم کامیاب ہوئے اور منزل تک پہنچ گئے، اس پر بندوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے قدرداں اور مشکور پروردگار کا جان و مال سے شکریہ ادا کریں۔ چنانچہ عید کی صبح ہوتے ہی اولاً صدقہ فطر ادا کر کے مال سے اور پھر دوگانہ عید ادا کر کے جان و مال سے اپنے محسن رب اور منعم پروردگار کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس نے تمیں دن کی یہ حقیر اور ناچیز قربانی قبول فرمائی۔ اور دورانِ قربانی میں تو خصوصی طور پر لذاتِ قرب و وصال سے نوازا۔ اور بعد تکمیلِ ہلالی حروف سے اپنی خوشنودی کا اعلان عام فرمایا۔

تتمۂ رمضان

پس عید درحقیقت رمضان کے افعال و تروک کا ایک عملی شکریہ ہے جو بندوں کی جانب سے جنابِ خداوندی میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس شکریہ پر حسبِ وعدۂ الٰہی لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ (اگر تم شکر گزار ہوگے تو تمہاری نعمت میں اضافہ کروں گا) بسلسلہ اضافہ نعمت شش عید یعنی شوال کے ۶ روزوں کا مزید اضافہ کیا جاتا ہے جنہیں رمضان تو نہیں تتمۂ رمضان کہا جائے گا۔ کیونکہ رمضان کی مدّت ایک ماہ کی مدّت جو ایک منضبط اور معتدل مدّت ہے۔ جس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی۔

سال سے کم اور ہفتہ سے زیادہ ایک درمیانی مدّت ہے۔ اس میں اگر ایک دن کا بھی اضافہ ہو جاتا تو دوسرا ماہ لگ جانے سے رمضان کی مدّت دو ماہ ہی کہلاتی۔ اور روزے ایک ماہ کی بجائے دو ماہ کے کہلائے جاتے جو یقیناً طبائع پر بھی شاق گذرتے، مدّت بھی معتدل نہ رہتی اور اس میں کسر بڑھ جانے سے مدّت کا انضباط بھی فوت ہو جاتا۔ اس لئے روزوں کا ایک ماہ پورا کرا کر اور درمیان میں ایک دن خوشی اور کھانے پینے کا دے کر بطور تتمۂ رمضان ۶ روزے اور دیئے اور وہ بھی غایتِ رحمت سے اختیاری دیئے گئے جن میں کوئی جبر و اکراہ نہیں تاکہ بندوں پر بھاری بھی نہ ہوں اور خدا کی طرف سے اس شکر گذاری پر حسبِ قانونِ الٰہی زیادت نعمت کا وعدہ بھی پورا ہو جائے۔ گویا اس طرح اس عباداتی سال کا افتتاح ۳۶ روزوں اور ۳۰ دن کی تراویح سے کر دیا گیا۔ یعنی ۳۶ تروک ۳۰ افعال سے انسانی عبادت کا سال شروع ہوتا ہے۔

عبادت کا ہمہ گیر نقطۂ آغاز

غور کرو تو رمضان میں عبادت کا یہ جمع شدہ ذخیرہ رمضان ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ سال بھر تک یہی ذخیرہ توفیق و برکات کام دیتا ہے اگر یہ ذخیرہ اس ماہ میں جمع نہ ہوتا تو پورا سال عبادت سے بیگانگی اور برکاتِ باطن سے محرومی میں بسر ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اصولاً ہر شے کے نقطۂ آغاز ہی میں اس کا انجام اور وسط پنہاں ہوتا ہے۔ وہی نقطہ پھیل کر وسط سے گذرتا ہوا انجام تک جا پہنچتا ہے یعنی آخر تک اسی کا نقطۂ فیض کام کرتا رہتا ہے۔ مثلاً ہر کلمہ اور کلام کا نقطۂ آغاز حروفِ مقطعات (حروفِ تہجی) ہیں اس لئے ہر کلمہ و کلام اور لمبی سے لمبی عبارات میں فیض ان ہی حروف ہجا کا ہوتا ہے درخت کی ہر شاخ اور پھول پتی کا نقطہ آغاز اس کا تخم ہے' تو وہی تخمی مادہ پھیل پھیل کر پھول پتیاں اور برگ وبار بنتا رہتا ہے۔ وہ نہ ہو تو نہ شاخ ہو نہ برگ وبار' گویا سارے برگ وبار درحقیقت اس تخم کا فیض ہوتی ہیں۔

اعداد کا نقطۂ آغاز واحد ہے وہی (ایک) مکرّر سہ کرّر ہو کر دو اور تین اور سوا لاکھ بنتا رہتا ہے' وہ نہ ہو تو دو نہ ہوں' نہ سو اور نہ لاکھ گویا ارب ہا ارب اور کھرب در کھرب فیض صرف ایک ہی کا ہوتے ہیں۔ خود بذاتہ کچھ نہیں' اس اصول پر سمجھو کہ عباداتی سال کا نقطہ آغاز رمضان المبارک اور اس کے افعال و تروک ہیں۔ (جیسا کہ ابھی واضح ہوا) یہی ایک حصہ افعال و تروک کا ذخیرہ درحقیقت سال بھر کی عبادت کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس لئے یہی مادہ عبادت پورے سال کی عبادت کا مادہ ہے جو رنگ بدل بدل کر مختلف طاعات میں ظہور کرتا رہے گا۔ گویا سال بھر کی مختلف الانواع عبادتیں اور بِر و تقویٰ کے مختلف مظاہر اسی ماہ کے صبر و استقامت کا فیض ہوتے ہیں' یہ نہ ہو تو سال بھر کی توفیق و برکت درجہ صفر میں رہ جائے۔ جیسا کہ روایات حدیث میں اس کے اشارے ملتے ہیں۔

ماہِ رمضان کے اعداد کا اثر

شاید اس لئے اس ماہ مبارک کے افعال و تروک کے اعداد کچھ ایسی مناسب سے رکھے گئے ہیں کہ برکۃً ہی نہیں عدداً بھی پورے سال پر پھیل سکیں۔ بلکہ ان کی ایک ایک اکائی دوسرے مہینوں کی دہائیوں کے برابر ثابت ہو۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ آخرِ رمضان میں ارشاد ہے۔ اس خطبہ کا ایک حصہ یہ ہے :

> **یاایھا الناس قد اظلکم شھر عظیم شھر مبارک شھر فیہ لیلۃ خیر من الف شھر جعل اللہ صیامہ فریضۃ وقیام لیلہ تطوعا من تقرب فیہ بخصلۃ من الخیر کان کمن ادی فریضۃ فیما سواہ ومن ادی فریضۃ فیہ کان کمن ادی سبعین فریضۃ فیما سواہ۔** (مشکوٰۃ)
>
> ”اے لوگو! تم پر سایہ گستر ہوا ہے ایک عظمت والا مہینہ ایک برکت والا مہینہ' وہ مہینہ جس میں ایک رات' ہزار رات سے بہتر ہے اللہ نے اس میں روزے فرض کئے ہیں اور قیامِ لیل (تراویح) نفل رکھی ہے جس نے اس مہینے میں کوئی بھی بھلائی کی بات کی تو وہ ایسا ہے کہ کسی شخص نے ماسوا رمضان کے (بقیہ سال میں) کوئی فریضہ ادا کیا۔ اور جس

نے اس ماہ میں فریضہ ادا کیا مثلاً (روزے رکھے) تو وہ ایسا ہے جیسا کہ اس نے غیر رمضان میں (بقیہ سال) میں ستّر فریضے ادا کئے"۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ اس ماہ کی نفل بقیہ سال کے فرض کے برابر ہے اور اس کا فرض بقیہ سال میں ستر فرائض کی برابر ہے۔ گویا بلحاظِ برکت ہی نہیں بلکہ بلحاظ اجر اور عدد بھی اس مہینہ کی طاعت کی ایک اکائی دوسرے مہینوں کی طاعت کی دہائیوں کے برابر ہے۔

ماہ رمضان کے دنوں کو دیکھئے تو ان میں ۳۰ روزے رکھے گئے ہیں اور شریعت کی بخشیں بے کراں نے ایک نیکی کو دس نیکی کے برابر شمار کیا ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا۔ (القرآن)

اس اصول پر یہ ۳۰ روزے ۳۰۰ ہو جاتے ہیں۔ اور ادھر عید کے بعد شش عید جو بطورِ تتمہ و توابع رمضان کے ساتھ لاحق کئے گئے ہیں (گو بوجہ تسہیل و رحمت انہیں اختیاری رکھا گیا' اور جزو رمضان نہیں بنایا گیا) اصول مذکورہ پر ۶۰ ہو جاتے ہیں تو رمضان کے اصل اور ملحقہ روزوں کا مجموعہ بھی وہی ۳۶۰ روزے سال بھر کے تعداد ہے۔ اور اس کا حاصل بھی وہی نکلا کہ رمضان کے یہ انعامی ۳۶۰ روزے سال بھر کے اوپر ۳۶۰ دنوں کے مساوی ہیں اور رمضان کے یہ اصل اور توابع روزے پورے کر دینے والا سال کے تمام روزے رکھنے والا بن کر صائم الدہر بن جاتا ہے۔ اسی مضمون کو جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ ذیل میں ارشاد فرمایا ہے۔ جس کو حضرت انصاریؓ روایت فرما رہے ہیں :

من صام رمضان ثم اتبعہ ستا من شوال کان کصیام الدھر۔ (رواہ مسلم)

"جس نے رمضان کے روزے پورے رکھے۔ پھر شوال میں ۶ روزے ان کا ساتھ اور ملا لئے تو یہ عمر بھر روزے رکھنے کی مانند ہے"۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے :

رمضان الی رمضان کفارۃ لما بینھما۔ (الحدیث)

"رمضان سے رمضان تک درمیانی دنوں کے گناہوں کا کفّارہ یہ رمضان ہی ادا کر دیتا ہے"۔

اس سے واضح ہو گیا کہ رمضان ہی کی اطاعتوں اور مغفرتوں کا فیض سال بھر تک چلتا رہتا ہے۔ اور یہی فیض منتشر ہو کر سال بھر کے دنوں اور راتوں کی عبادت اور توفیق کی شکل اختیار کرتا رہتا ہے۔ نہ صرف برکۃً یا اثرًا بلکہ عدداً بھی رمضان سال عبادت کا نقطہ آغاز اور تخم توفیق تھا۔ اس لئے مادۂ توفیق و طاعت سال بھر کی عبادت کے برگ و بار کی آبیاری کرتا ہے اور پورے سال پر چھایا ہوا رہتا ہے۔

رمضان اور اشہرِ حج کا باہمی ارتباط

یہی وجہ ہے کہ رمضان کے ایام نے جن تروک سے (ترک طعام' ترک شرب اور ترک خواہشات) کا پرداز ڈالا وہ رمضان ہی پر ختم نہیں ہو جاتے بلکہ ان تروک سے دوسرے اور تروک نشو و نما پاتے ہیں اور تقویٰ کے آگے کی منزلیں سامنے چلی جاتی ہیں' جو اگرچہ رمضان میں نہیں ہوتیں مگر رمضان ہی کے تروک کا ثمرہ ہوتی ہیں۔

ماہِ رمضان میں طلب حق نے محبت حق کی خاطر اپنے نفس کی عظیم آرزوؤں یعنی کھانے پینے اور لذّتِ نفسانی کی چیز کو ترک کر کے ترک ہوائے نفس کی استعداد پیدا کرلی تو تروک کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ کھانے پینے اور قرب و وصال کی لذّتوں کے سوا اور بھی بہت سی لذّات ہیں جن کی خواہش نفس میں ہمہ وقت موجزن رہی ہے۔ یہ تو صرف باہ کے سلسلہ کی لذتیں تھیں۔ جنہیں رمضان نے ایک دم چھڑا کر فی الجملہ صبر کر لینے کی قوتِ انسان میں پیدا کر دی تھی۔ لیکن ان سے زیادہ سخت اور ہولناک جاہ کے سلسلہ کی لذّتیں ہیں۔ جو انسان کو مغرور و متکبر بنا کر مشاہدۂ حق ہی سے نہیں جادۂ حق سے بھی بھٹکا دیتی ہیں۔ اور قرب و وصال کے درجات میں سدِ راہ ہو جاتی ہے، کبھی مکان، اور بلڈنگ سے اپنے کو باوقار کہلانے کی کوشش کرتا ہے، کبھی اپنے قبیلے اور دوست احباب کے اجتماع اور جمگھٹوں سے اپنے لئے شیخی اور فکر کا سامان بہم پہنچاتا ہے، کبھی اپنی متانت اور سنجیدگی و بامعنیٰ خموشی کی نمائش سے اپنے سے وقار کی نمائش کرتا ہے، کبھی اپنی زینت و آرائش اور خوبصورتیوں پر گھمنڈ کر کے اپنے خیال میں بدمست ہو جاتا ہے اور پھر ان ہی جاہ پسندانہ اندازوں سے دوسروں پر ظلم و تعدّی وغیرہ کی بنیادیں کھڑی ہوتی ہیں جس سے دنیا میں فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے اور دنیا امن و سکھ سے محروم ہو جاتی ہے۔

غرض جاہ پسندی اور دوسروں پر بڑا بننے اور عوام میں امتیازی شان نمایاں کرنے کے مختلف ڈھنگ ہیں اور مختلف راستے ہیں جس سے گزر کر ایک مغرور انسان قربِ الٰہی اور وصالِ حق سے محروم ہو جاتا ہے، اس لئے ان کا ترک ان تروک سے بھی زیادہ ضروری ہے جن کی رمضان نے مشق کرائی تھی

اس لئے جونہی ان باہی اور شہوانی لذات کے افراط سے نجات پا جانے کی استعداد پیدا کر کے رمضان رخصت ہوتا ہے ویسے ہی حج کے مہینے شروع ہو جاتے ہیں، جو حج کا پیغام دیتے ہیں جس طرح ہلالِ رمضان نے اعلان کیا تھا کہ اگر دربارِ الٰہی میں حاضر ہو کر قرب و وصال شاہی منظور ہے تو شہوانی لذّات سے پاک وصاف ہو کر اور انہیں ترک کر کے دربارِ شاہی (مساجد) میں تراویح و تلاوت کے لئے حاضر ہو جاؤ۔ اسی طرح ہلالِ شوال اعلان کرتا ہے کہ محل سرائے شاہی (حرمِ کعبہ) یعنی سیّد المساجد میں حاضری اور خلوت محبوب مطلوب ہے تو ان جاہ پسندیوں کو ترک کر کے عاشقانہ وارفتگی پیدا کرو اور خدا کے گھر کی طرف پروانہ وار بڑھو مگر ع

شرطِ اوّل قدم آن ست کہ مجنون باشی

یہ سامانِ وقار چھوڑو، اسبابِ جاہ ترک کرو۔ وسائل غرور و گھمنڈ کو خیرباد کہو اور دیوانہ وار محبوبِ حقیقی کی طرف چلو، سب سے پہلے گھر بار اور وطن ترک کرو، اور اپنا گھر چھوڑ کر محبوب کے گھر کی طرف کوچ کرو، اپنا شہر چھوڑ کر خدا کے بلدِ امین کی طرف بڑھو، عزیز و اقرباء کی موانست مانع وصال الٰہی ہے تو اسے بھی چھوڑ دو مسافرت اور غربت اختیار کرو، جتھے اور قبیلے کی طاقتوں پر بھروسہ تھا تو اسے بھی خیرباد کہو، کسمپرسی اور بے کسی کی شان سے گھر سے نکل کھڑے ہو۔ پھر نکلو تو دیوانوں کی طرح عاشقوں کی طرح نکلو۔

عاشقی، درویشی اور سرشاری

سب سے پہلا سامان وقار لباس اور اس کا فیشن ہے اسے ترک کر کے احرام باندھو اور ایک لنگی کندھے پر اور ایک لنگی گھٹنوں میں یعنی شاہانہ، رئیسانہ اور منعمانہ ٹھاٹھ چھوڑ کر فقیروں کا بھیس بھرو اور مسکینوں کی سی وضع بناؤ، کپڑوں کی بو کا بھی دھیان نہ رہے۔ کہ خوشبو کی فکر ہو۔ عاشق کو ان نمائشی چیزوں سے کیا واسطہ اگر وہ

عشق سے مغلوب ہے۔ بدن کی صفائی ستھرائی کے دھیان کو ترک کرو' الحج' العج والثج' حج تو نام ہی ہے میلے کچیلے رہنے یعنی صفائی ستھرائی کے خیال کو غیر سمجھ کر ان سے بے نیاز ہو جانے کا' بدن کے بناؤ سنگار کی فکریں چھوڑو' نہ غسل کی پرواہ' نہ حجامت کی خبر نہ خط کی اصلاح نہ ناخنوں کے بڑھے ہوئے کی فکر حتی کہ میلے بدن میں جوئیں بھی پڑ جائیں تو انہیں بھی مت چھیڑو کہ تم محبوب کے عاشق بن کر چلے ہو' تمہیں جانداروں کے قتل و غارت سے کیا سروکار؟ چہرہ غبار آلود' پیر گرد آلود' نہ سر پر ٹوپی نہ پیر میں جوتہ' نہ کندھوں پر عباء و قباء نہ بال سنوارے ہوئے' نہ مانگ نہ پٹی' نہ ان میں تیل' پھر بولنے میں نہ آواز بنانے کی فکر' نہ الفاظ کے سنوارنے کی فکر' نہ کلمات کی سجاوٹ' نہ عبارات کی زینت' بلکہ سرے سے ہی فضول کلام ترک کردو' ورد زبان ہو لبیک کبھی پست آواز سے ہو تو کبھی بلند آواز سے کبھی آہستہ سے اور کبھی شور کے ساتھ یعنی آوازیں بھی عاشقانہ۔

مگر دیوانگی پیدا کرو۔ قافلے میں ہو تو لبیک لبیک کا شور ہو۔ زمین کی اونچ نیچ آجائے تو چلا پڑو تاکہ آواز کا وقار جس کی بناوٹ اور سجاوٹ کی فکر تھی مٹ کر رہ جائے غرض نہ بات اپنی نہ کلام اپنا۔ بات ہو تو محبوب کی اور کلام ہو تو شوق محبوب اور ذوق عشق کا' یعنی زبان اور گلا صرف اسی کے لئے وقف ہو۔ محبوب کا گھر آجائے تو آواز شوق بلند کرو' شوق و ذوق میں کبھی خانہ محبوب کے پتھروں کو چومو' کبھی پردۂ دیوار کو تھام کر روؤ اور چیخو' کبھی اس گھر کے ارد گرد پروانوں کی طرح گھومو' نثار ہو' کبھی یاد میں غرق ہو کر سرنگوں ہو اور کبھی بھکاری بن کر یا تنگ سے سرفراز ہو' کبھی فریاد اور کبھی یاد کرو' کبھی قرب کا شکریہ کبھی بعد کا شکوہ' پیر چکر میں ہوں اور زبان عشق کی حرکت میں' پھر ان چکروں میں چال بھی ایک انداز کی نہ ہو جس سے چال کی خوشنمائی کا وقار آگے آئے' اگر چند پھیروں میں سیدھے چلو تو چند پھیروں میں اکڑ کر مونڈھے ہلا ہلا کر سینہ تان کر چلو۔

یعنی کبھی در محبوب کے مسکین بن جاؤ۔ اور کبھی محبوب کے سپاہی ہو جاؤ' صورت و سیرت ہی نہیں مرضی بھی تمہاری کوئی اپنی نہ ہو۔

ایک مرضئ محبوب ہو اور تم ہو' مرضئ حق ہو اور اس کی پیروی تاکہ اندرون میں کوئی شیخی و غرور نہ رہ جائے اور نہ بیرون پر کوئی اتراہٹ اور ناز و انداز کی نمود آئے۔

صورتِ وقار کی بھی ممانعت

پھر یہ کفنی کا لباس بھی ان پھیروں میں کبھی ایک ہیئت و رنگ پر نہ ہو کہ صورتِ وقار پیدا ہو جائے اگر پہلے تین پھیروں میں وہ بر جائے خود نہ ہو۔ تو چار پھیروں میں اسے دائیں کندھے کے اوپر کو لیا جائے۔

تاکہ اس کفنی کے اوڑھنے اور پہننے میں بھی کوئی اتفاقی پن اور سجاوٹ پیدا نہ ہو جائے کہ وہ بھی عاشقی کے شایاں نہیں یعنی اگر غیر اختیاری پن بھی سجاوٹ بن جائے تو وہ بھی یکسر ہٹ کر رہ جائے۔ پھر ان گھومنے کے پھیروں میں گو دیوانگی تھی مگر چال ڈھال اور رفتار معمول کی مطابق تھی اس لئے اسے بھی ختم کرو۔

صفا و مروہ پہنچو تو چال کہیں آہستہ ہو تو کہیں دوڑ بھاگ بھی ہو تاکہ چال کا انداز بھی ایک انداز پر باقی نہ رہے جیسا کہ طواف میں ہیئتِ بدن کا اپنا انداز مٹا دیا گیا تھا۔ غرض اسی طرح اس عاشق حق کے لباس' بدن' زینت' چال ڈھال' سیرت و صورت' کلام' آواز' رفتار' گفتار وغیرہ میں کوئی شائبہ نمائشی وقار و متانت کا باقی نہ رہ جائے۔

خانہ بدوشی

پھر اگرچہ تم نے وطن اور وطن داروں کا اُنس چھوڑ دیا' بلدِ امین میں پہنچ گئے' مگر بلدِ امین بھی تو بہرحال آبادی ہے جس میں اپنا نہیں تو اس شہر والوں کا سامان زینت' لذت بخش' انکی آوازیں اُنس افزائے سمع و گوش ور ان کی ملاقاتیں' اُنس افزائے دیدہ و دل تو ہوتی ہیں جو وصالِ یار میں حائل ہو سکتی ہیں۔

اس لئے مکہ کی آبادی بھی ترک کرو کہ وہ پھر وطنِ اقامت اور محلِ موانست ہے جنگل بیابان میں بسر کرو ںاں نہ گھر ہو نہ در' نہ تمدن' نہ عمارت نہ سامان معاش' نہ اسبابِ رفاہیت' عرفات کے ریگستان میں جلتی دوپہر ں دھوپ کے سمندر میں گزارو' کسی کپڑے' خیمہ سے اگر دھوپ سے بچاؤ ہو جائے تو فبہا ورنہ سایہ کی لذت ھی ترک کر دو' طپش کو ترجیح دو اور خنکی کی راحت بھی چھوڑ دو' مسکن اور جائے سکون کی فکر میں مت رہو ___ ویرانہ نشین اور صحرانورد ہو جاؤ۔ خانہ بدوشوں کی طرح یہ دن منیٰ میں گزارو تو رات مزدلفہ میں بسر ہو۔ ر وہاں پورا دن' نہ یہاں پوری رات' پھر مزدلفہ کی رات بھی اس فکر کے ساتھ گزارو۔ کہ صبح ہی یہاں سے وچ ہے' مزدلفہ بھی طلوع آفتاب سے پہلے چھوڑ دو' گویا عرفات کے دن کی طرح یہاں کی رات بھی بے فکری سے نہ گزارے کہ عاشق کو چین اور لطف اندوزیوں سے کیا واسطہ؟ پھر مزدلفہ کی آدھی تہائی رات میں خدمت بوب پیش نظر رہے' علاوہ طاعت و عبادت کے اس میدان کی کنکریاں بھی چنو تاکہ اس میگزین سے دشمنِ الٰہی ر خود عشاق کے پشتینی دشمن شیطان رجیم کو سنگسار کر سکو جو راہ محبوب میں حائل اور ناصح نادان بن کر سامنے تا ہے۔ مزدلفہ سے منیٰ میں آؤ تو گویا وہاں دو تین شب قیام ہو' مگر اسے بھی سفر در انجمن کا مصداق رکھو' ایک لہ چین سے بسیرا نہ کرو۔ کبھی یہاں سے پھر درِ محبوب پر جاؤ۔ خانہ محبوب کے گرد پروانہ وار گھومو' واپس ہو تو وزانہ اس شیطان سے لڑائی مول لو جو راہ جاں سپاری میں حائل ہوتا ہے تاکہ صلح جوئی سے بیٹھے رہنے کا لون وقار بھی ختم ہو جائے' اور وہ بھی رمی جمار سے تاکہ سپاہیانہ وقار کا غرور بھی مٹ جائے اور دنیا دیکھ لے رو تفنگ چلانے والا سپاہی آج چھوٹی چھوٹی کنکریاں مارنے پر اُتر آیا ہے۔

پہلی سنگ باری سے فراغت پاتے ہی چہرہ مہرہ کی قدرتی زینت کو ہی مٹاؤ' جیسی سلے ہوئے کپڑے ترک رکے پورے بدن کی زینت کو خیرباد کہا تھا آج سر کے بال منڈوا کر چہرہ مہرہ کی زینت کو ختم کر دو۔ اور اب جبکہ ن کے ظاہر و باطن کے ساری لذتیں' ساری نمائشیں' متانتیں چھوٹ گئیں' گویا مرنے سے پہلے اس نفس کو ت کے گھاٹ اُتار دیا' اور اس کی اندرونی خواہشوں کو پامال کر دیا۔

فدیہ جان

تو اب وقت آگیا کہ سرے سے اس نفس ہی کو راہِ محبوب میں نثار کر دو اور خود اسی کے گلے پر چھری ادو' اگر سب کچھ کھو کر جان باقی رہ گئی تھی تو اس سے بھی دریغ نہ کرو' یہ الگ بات ہے کہ محبوبِ حقیقی محض ں شفقت بے پایاں سے ذبیحہ جان کا فدیہ ذبیحۂ حیوان سے قبول فرمالے' ورنہ اس راہ میں یہ جان' جانِ فریں کے سامنے کوئی قیمت نہیں رکھتی' اور وہ جب کہ اسی کی بخشی ہوئی ہو تو سودا بہت ہی ارزاں جاتا ہے۔

جان دی' دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

بہرحال شکر محبوب کے ساتھ اس کی مرضی کے مطابق منحر میں پہنچ کر اپنا فدیہ ایک جان کی قربانی سے دیدو

کہ یہ آخری ترک ہے تروک میں سے۔ جس کی ذریعے وصالِ محبوب کی آرزو کی جا سکتی ہے۔

بہر حال شہر رمضان نے اگر باہی لذات ترک کرائی تھیں تو اشہُرِ حج نے جاہی لذّات کے ترک کا پروگرام پیش کیا، جو ترکِ وطن، ترکِ مسکن اور ترکِ لباس، ترکِ زینت، ترکِ راحت، ترکِ فیشن، ترکِ نمائش، ترکِ وقار، ترکِ جاہ، ترکِ افتخار ترکِ نشاط اور ترکِ مال سے شروع ہو کر ترکِ جان پر ختم ہو جاتا ہے۔

ایامِ حج میں یادِ رمضان

مگر ساتھ ہی ساتھ باہ کی ان لذات کے ترک سے بھی چشم پوشی نہیں کی جو رمضان نے سکھلائی تھیں، بلکہ اشہُرِ حج میں خاص تروک کے ساتھ رمضانی تروک کو بروئے کار لانے کے لئے گویا نصف ماہِ رمضان کو پھر دُہرایا جاتا ہے۔ یعنی چھ روزے شوّال کے اور نو روزے عشرہ ذی الحجہ کے اشہُرِ حج میں رکھ کر پندرہ روزوں کا پروگرام اشہُرِ حج میں رکھ دیا گیا ہے، تاکہ ان مہینوں میں بھی آدمی رمضان کو فراموش نہ کر سکے، حتیٰ کہ بعض روایات میں عشرہ ذی الحجہ کے دنوں کو رمضان کے دنوں پر فوقیت اور فضیلت دی گئی ہے۔

دونوں کی لذّتوں کا سلسلہ منقطع کرایا جاتا ہے۔ تب آدمی خانۂ محبوب کی حاضرباشی اور مشاہدۂ حق کے قابل بنتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ رمضان ابتدائی تروک کا مہینہ ہے۔ اور اشہُرِ حج ان تروک کی تکمیل و انتہا کے مہینے ہیں۔

حکمتِ عید قُربان

ہاں پھر جس طرح رمضان کے تروک و افعال کی تکمیل پر یکم شوّال کو دوگانہ شکر ادا کیا گیا تھا اور مالی شکریہ میں صدقۂ فطر سے عیالِ محبوب (غرباء و احباب) کی خدمت کی گئی تھی، اسی طرح یہاں بھی حج کے تروک و افعال کی تکمیل پر جو نویں ذوالحجہ تک ہوتا ہے دسویں ذی الحجہ کو اسی انداز سے بجان و دل دوگانہ شکر ادا کیا جاتا ہے اور اس کے بعد صدقۂ اُضحیہ (قربانی) سے غربا و احباب کی خدمت کی جاتی ہے تاکہ مالی شکریہ بھی ادا ہو جائے۔

شانِ جلالؒ و جمالؒ کا شُکریہ

پس عیدین کے تہوار اسلام میں رنگ رلیاں منانے کے لئے نہیں رکھے گئے ہیں بلکہ رنگ رلیوں کو مٹانے اور اس قسم کے تمام مادی اور نفسانی لذّتوں اور خواہشوں کو ختم کر کے روحانی قُرب و وصال کے شکریہ کے طور پر قائم کئے گئے ہیں، فرق اتنا ہے کہ رمضان کے تروک کے ساتھ افعال بر کے سلسلہ میں نماز (تراویح) کا فعل رکھ لیا گیا جو حق تعالیٰ کے جلال و عظمت کے سامنے اظہارِ نیاز و عبودیت کے لئے ہے تاکہ اس کی علی الاطلاق آقائی اور حکمرانی کے ساتھ اپنی علی الاطلاق ذلّت و نیاز مندی اور محکومیت کا ثبوت پیش کیا جائے اور اشہُرِ حج کے تروک کے ساتھ افعالِ بِر کے سلسلہ میں مناسک حج رکھے گئے جو حق تعالیٰ کے جمال و محبوبیت کے سامنے اپنی شیفتگی اور گرویدگی اور اپنے عشق و محبت کے جذبات پیش کرنے کے لئے ہیں تاکہ اس کے علی الاطلاق جمال و خوبی کے سامنے اپنا علی الاطلاق عشق و محبت پیش کر دیا جائے۔

دوسرے رُخ سے دیکھئے تو ترک کے سلسلہ میں محکوم اور غلام کو بسلسلہ حاضری ملازمت نفس کی مرغوبات

اور خواہشات ترک کرنی پڑتی ہیں جس سے وہ کھانے کمانے اور اُڑانے کے کام کا نہیں رہتا۔ ورنہ اسے خدمت کا وقت کیسے ملتا' اور عاشق و محب کو محض خواہشاتِ نفس ہی نہیں سرے سے نفس ہی کو تج دینا پڑتا ہے' نفس کی شخصیت اور تشخص ہی کو عشق میں گم کر دینا پڑتا ہے اس کی حیثیت عرفی اور طبعی' غرور و قار تو دُور کی چیز ہے۔ جس کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی' دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ نماز تو شاہی خدمات بجالانے کے لئے سرکاری طور پر حاضریٔ دربارِ شاہی ہے۔ جس کے لئے وقت اور عیش کی قربانی کافی ہے مگر شاہی آداب بجالانے کے ساتھ' اور حج عاشقی کے جوش میں حرم سرائے شاہی میں شخصی حاضری ہے۔ جس کے لئے جان و مال دونوں کی قربانی ضروری ہے۔ مگر آدابِ عشق کے ساتھ جس کا حاصل خود گزاری اور خود فراموشی ہے۔

نماز میں سکون و متانت مطلوب ہے کہ دربار اور دفترِ معبودیت میں حاضری ہوتی ہے اور حج سے اسی سکون و متانت کو مٹایا جاتا ہے کہ عاشقانہ رنگ سے درِ محبوب کی حاضری ہے' پس تلاوت و تراویح رمضان کے لئے تو باہی تروک رکھے گئے جن کا تعلق عیش سے تھا سکون و متانت سے نہ تھا۔

اور ___ اس کے لئے وقت کی قربانی کافی تھی۔

لیکن حرم سرائے میں پہنچ کر قُرب و وصال کے لئے جاہی تروک بھی ضروری ہو گئے جن کا تعلق جاہ و باہ' عیش و وقار' متانت و ہیبت سب ہی سے تھا' تاکہ عاشقی کی مسکنت اور خود گزاری پیدا ہو جائے' تو اس کے لئے محض وقت کی قربانی کافی نہ تھی جب تک کہ عین نفس کی قربانی نہ کر دی جائے۔

پس عیدُ الفطر نے شئونِ جلال کے حقوق کی ادائیگی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ بندوں کو غلام بننا میسّر آگیا' اور عیدُ الاضحیٰ سے شئونِ جمال کے حقوق کی ادائیگی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ بندوں کو عاشق ہونا میسّر آگیا۔

اصل عبادت صرف نماز اور حج ہے

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح حق تعالیٰ علی الاطلاق مالکُ الملک اور آقا و حاکم ہیں ایسے ہی وہ علی الاطلاق محبوب و مطلوب اور جمیل و مرغوب بھی ہیں اور اس لئے جہاں ایک بندہ کو ان کی شاہی دربار (مساجد) میں حکمبردار اور نیاز مند بن کر حاضر ہونا ضروری ہے وہیں اس کے لئے ان کے شاہی حرم (مسجدِ حرام) میں عاشق و گرویدہ بن کر بھی پہنچنا ضروری ہے' یعنی اس کی بندگی تام و کامل نہیں ہوگی اگر ان میں سے ایک نوع بھی بندگی کی رہ جائے' اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اگر اسلام میں حج نہ ہوتا اسلام ناقص رہ جاتا' کہ شئونِ جمال کے تقاضے منعدم رہ جاتے' پس جہاں اسلام کی تکمیل و تتمیم نماز اور حج کے بغیر ممکن نہ تھی' وہیں مسلمان کی تکمیل بھی بغیر ادائیگی نماز و حج کے ممکن نہ تھی۔

اس لئے اسلام کی دو ہی بنیادی عبادتیں اصل نکلتی ہیں' نماز اور حج' ایک جلالی عبادت ہے اور ایک جمالی۔ بقیہ دو عبادتیں زکوٰۃ و صوم یہ خود اصل نہیں ہیں' بلکہ ان دونوں اصلی عبادتوں کے تابع اور ان کے مقدمہ و تمہید کے طور پر ہیں۔ زکوٰۃ مقدمہ نماز ہے۔ جس سے نماز قائم ہوتی ہے کیونکہ نماز اور حاضریٔ دربار میں اگر حارج ہے تو مال و منال اور اسی کی عیش کوشیاں بھی ہوتی ہیں اس لئے اسے زکوٰۃ و صدقات کے ذریعے ترک کرا کر دل سے اس کی محبت نکالی جاتی ہے' تاکہ موانع مرتفع ہو کر مقصود کا جمال سامنے آجائے۔

ادھر روزہ مقدمہ حج ہے سرائے شاہی میں حضوری اور قربِ خاص سے لذّت اندوزی میں اگر حارج ہے تو نفس اور نفسانیت کے تقاضے یعنی وہ جاہ و اقتدار اور کبر و غرور ہوتے ہیں۔ اسلئے روزہ سے تروک کی ابتدا کی جاتی ہے اور اشہرُ حج پر لا کر انہیں مختتم کر دیا جاتا ہے' تاکہ موانع ختم ہو کر مطلوب حاصل ہو جائے اس لئے اشہر

حج کو رمضان سے متصل رکھا گیا کہ ابتدائی تروک ختم ہوتے ہی انتہائی آ لگیں اور تروک کا سلسلہ متصل رہے۔

پس اسلام میں بنیادی عبادتیں دو ہیں' نماز اور حج اور دو عبادتیں ان کے مقدمات اور تمہید ہیں یعنی زکوٰۃ اور صوم۔ بنیادی عبادتوں میں اصل حصہ افعال کا ہے جو مقصود اصلی ہیں اور نفس ان سے آراستہ ہوتا ہے اور تمہیدی عبادتیں یعنی زکوٰۃ اور صیام میں اصل حصہ تروک کا ہے جو مبادی ہیں جن سے نفس کا رذائل سے صاف ہونا ہے۔

اجتماعی دینؒ

اسلام چونکہ اجتماعی دین ہے اس لئے اس کی یہ اصل عبادتیں نماز اور حج تو اجتماعی رکھی گئیں' چنانچہ دونوں میں اصل اجتماع ہے اور دونوں کے لئے امام و امیر ناگزیر ہے جو اجتماعی رنگ کا خاصۂ لازمہ ہے اور تمہیدی عبادتیں چوں کہ محض ان اجتماعی عبادتوں کے لئے نفس کو تیار کرنے کے لئے تھیں اور نفس ہر ایک کا الگ الگ ہے۔ اس لئے یہ دونوں عبادتیں (صوم و زکوٰۃ) بھی انفرادی رنگ کی رکھی گئیں' چنانچہ ہر ایک کا مال اور اس کی مقدار الگ الگ ہے۔ اس لئے ہر ایک کی زکوٰۃ بھی مقدار و مدت کے لحاظ سے الگ الگ ہے۔ اسی طرح ترکِ طعام و شہوات بھی ہر ایک کا الگ الگ ہے۔ اس لئے روزہ بھی ہر شخص کا اپنا اپنا الگ ہے۔ غرض اسلام کے اجتماعی دن ہونے کا مقتضیٰ بھی یہی تھا کہ اس کی بنیادی عبادتیں تو اجتماعی ہوں اور تمہیدی عبادتوں میں اجتماعیت کی شرط نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب و تربیت میں ایک مسلم کا عباداتی سال افعال و تروک اور بر و تقویٰ سے مخلوط اور ملا جلا رکھا گیا ہے۔ اگر اس کی بنیادی عبادتوں میں سے دو عبادتیں افعال کی قسم سے رکھی گئی ہیں۔ یعنی نماز اور حج تو دو تروک کی قسم سے رکھی گئی ہیں یعنی صوم و زکوٰۃ اور اگر اس عباداتی سال کے ابتدائی مہینے (رمضان) میں افعال بر' تلاوت و تراویح وغیرہ رکھے گئے ہیں تو اسی ماہ میں تروکِ تقویٰ (ترک طعام و شہوات) بھی رکھے گئے۔

عباداتی سال کے درمیانی روزوں کی اہمیت

اسی طرح اگر اس عباداتی سال کے درمیانی حصوں مثلاً اشہرِ حج میں بر' طواف و زیارت اور صلوٰۃ و تلاوت کا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے تو ان ہی مہینوں میں جا بجا و یا ہی دونوں قسم کے انتہائی تروک بھی جمع کئے گئے ہیں جن میں صیام عشرہ ذی الحجہ اور بالخصوص صوم یوم عرفہ خاص اہمیت رکھتے ہیں یا مثلاً اشہرِ حج کے بعد محرم میں جہاں افعال بر تلاوت و نماز اور اذکار وغیرہ معمولاً رکھے گئے ہیں۔ وہیں تروک کے سلسلہ میں یوم عاشورہ کا روزہ بھی اہمیت کے ساتھ رکھ دیا گیا ہے' جس سے سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر جیسے ان درمیانی مہینوں میں بسلسلۂ افعال بر خاص فرائض ہی پر نہیں قناعت کی گئی' بلکہ عام نوافل و تطوعات بھی رکھے گئے ہیں' ایسے ہی بسلسلۂ تروک تقویٰ محض خاص روزوں صوم یوم عرفہ اور صوم یوم عاشورہ وغیرہ ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ہر ماہ میں ایامِ بیض کے تین روزے اور ہر ہفتہ میں پیر اور جمعرات کے روزے بھی رکھے گئے ہیں تاکہ درمیان سال کا کوئی مہینہ بھی افعال بر اور تروک تقویٰ سے خالی نہ رہے اور رمضان کی یاد فعل و ترک دونوں حیثیتوں سے تازہ ہوتی رہے' اسی طرح اس عباداتی سال کے نقطۂ اختتام یعنی شعبان میں شبِ برات کے افعالِ

بر بصورتِ صلوٰۃ و تلاوت اور مجاہدہ و مراقبہ رکھے گئے ہیں جس سے اس رات کا احیاء ہوتا ہے۔

تو وہیں یوم برات کا روزہ بھی سنّت اسلام قرار دیا گیا اور پھر بطرزِ سابق اس خاص فعل و ترک ہی پر اکتفاء نہیں کیا گیا۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ کریمہ افعال بر کے ساتھ شعبان میں زیادہ روزے رکھنے کی تھی۔ گویا شعبان افعال و تروک سے بھرپور رہتا تھا۔ جس میں شب برات کے افعال اور یوم برات کے تروک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

ماہ و سال کا توازن

بہرحال سال جس کی ابتدا میں رمضان اور اس کے افعال و تروک ہوں اور جس کے درمیانی مہینوں میں اشہرِ حج اور محرم وغیرہ کے جامع ترین افعال و تروک ہوں اور جس کی انتہا میں شعبان اور اس کے مخصوص افعال و تروک ہوں تو ظاہر ہے کہ اس سال کی برکت وہدایت اور نورانیت کی کیا انتہا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جس چیز کا اوّل و آخر اور وسط درست و صحیح ہو وہ یقیناً محفوظ اور نجات یافتہ اور ہلاکت سے دُور ہوتی ہے۔

پس جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اُمّتِ مرحومہ کے اوّل و آخر اور وسط کا ذکر کر کے بحیثیتِ مجموعی اُمّت کی نجات اور عدم ہلاکت کا یقین دلایا اور فرمایا:

كيف تهلك امة انا اولها والمهدى وسطها والمسيح اٰخرها۔ (مشکوٰۃ)

”وہ اُمّت کیسے ہلاک ہو سکتی جس کا اوّل میں ہوں اور جس کا درمیان مہدی ہوں اور جس کا آخر حضرت مسیح علیہ السلام ہوں“۔

ایسے ہی بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ وہ مردِ مؤمن کیسے ہلاک ہو سکتا ہے۔ جس کے عباداتی سال کا اوّل رمضان المبارک ہو اور جس کا اوسط اشہرِ حج اور محرّم الحرام ہو اور جس کا آخر شعبان معظّم ہو۔ پس جس مؤمن کی عمر یہ اس طرح کے سال گزرتے رہے تا آنکہ اس کی عمر پوری ہو جائے' تو یقیناً اس کے دل کی زمین اس اوّل و آخر اور وسط کے ساتھ جاہ و باہ کے تروک کے ذریعہ نفسانی خس و خاشاک سے پاک ہو گی اور افعالِ طاعت و عبودیت اور بِر کے ذریعہ نُور و برکت سے چمک اُٹھے گی' اس کے رذائل زائل ہوں گے اور اس میں فضائل داخل ہوں گے۔ وہ نار سے بچ جائے گا اور نور سے سرفراز ہو گا جو حقیقی فوز و فلاح ہے۔

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔

”جو نار سے نکالا گیا اور جنت (نورِ محض) میں داخل کر دیا گیا تو وہ کامیاب ہوا۔ اور یہ دنیا کی زندگی سوائے دھوکہ کے سامان کے اور کچھ نہیں“۔

ان اوراق پریشان سے امید ہے کہ ناظرین پر رمضان' عید اور مناسک حج کی حقیقتیں اور حکمتیں اور ان کے آثار و نتائج ایک حد تک واضح ہو گئے ہوں گے جو ان سطور کا مقصد اور اس زیرِ نظر رسالہ کا نصب العین ہے۔ زیادہ تفصیلات کے یہ صفحات متحمل نہ تھے اس لئے اسی قدر قلیل پر قناعت کی گئی۔

فهل على الرسل الا البلاغ المبين وبالله التوفيق

حضرت عبادہ بن صامتؓ نے بیان کیا۔ جب رمضان آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو ان کلمات کی

تعلیم دیتے۔

اللّٰھم سلّمنی لرمضان وسلّم رمضان لی وسلّمہ لی متقبّلا۔

"اے میرے اللہ! مجھ کو رمضان کے لئے محفوظ کردے اور رمضان کو میرے لئے محفوظ کردے۔ اور اس رمضان کو بحفاظت میرے لئے قبول فرما"۔ (حیاۃ الصحابہ جلد ۳ صفحہ ۲۰۱ الحدیث)

اللّٰھم ربّنا لاتزغ قلوبنا بعد اذھدیتنا وھب لنا من لّدنک رحمۃ انّک انت الوھّاب ربّنا ھب لنا من ازواجنا وذرّیّاتنا قرۃ اعین وّاجعلنا للمتّقین اماماً۔

اللّٰھم وتوفّنا مسلمین والحقنا بالصّالحین اٰمین یارب العٰلمین۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

حج بین الاقوامی عبادت

حج ایک بین الاقوامی عبادت، بین الاقوامی مساوات، بین الاقوامی اخوت اور بین الاقوامی تعاون کا ایک بے مثال عظیم المرتبت نمونہ ہے، جس میں مرکز بھی ایک، عمل بھی ایک، فکر بھی ایک، لباس بھی ایک، وضع وہیئت بھی ایک، رخ بھی ایک، محبت بھی ایک ___ اور سب کی انسانیت بھی ایک ہو کر سامنے آتی ہے ___ اور اونچ نیچ، چھوت چھات، نفرت و حقارت باہمی کا بیج تک مارا جاتا ہے ___ پس جو قومیں آج مساوات اور بھائی چارگی کی لفظی رٹ لگا رہی ہیں۔ وہ قرآن حکیم کے دیئے ہوئے اس نمونۂ مساوات کو سامنے رکھ کر عبرت پکڑیں ___ ورنہ مساوات اور بھائی چارہ کے نمائشی دعوے زبان پر مت لائیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ٥
اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ۔

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ٥

اسوۂ مساوات

بزرگان محترم!

مساوات اور ایک رخی کو برنگ عبادت عملی صورت دینے کے لئے حق تعالیٰ نے حج کی عبادت مقرر فرمائی کہ اس قبلہ پر مشرق ومغرب کی قومیں یکساں انداز سے جمع ہوں تاکہ ان میں سے اونچ نیچ کے جراثیم ختم ہوں، بلکہ اس مساویانہ اجتماع سے پیدا شدہ عملی مساوات کے نمونہ کو سامنے رکھ کر اپنی پوری زندگی اسی مساوات اور باہمی برابری کے ساتھ گزار دیں۔

اسی بناء پر شریعت اسلام نے اس قبلہ کو اول تو سارے انسانوں کا قبلہ قرار دیا چنانچہ آثار وروایات حدیث سے ثابت ہے کہ کوئی نبی دنیا میں ایسے نہیں گزرے کہ انہوں نے اس قبلہ کا طواف نہ کیا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جب سارے انبیاءؑ اس بیت خداوندی کی عظمت اور اس سے عشق ومحبت کرتے آئے ہیں اور اسے اپنا قبلہ تسلیم کر چکے ہیں۔ تو قدرتی طور پر ان کے ماننے والی قوموں کا قبلہ بھی یہی بیت اللہ ثابت ہوتا ہے۔

عالمی ہدایت کا قبلہ

پھر قرآن نے بھی یہی بتلایا کہ قبلہ کی وضع دنیا کے سارے انسانوں کے لئے ہوتی ہے۔ ارشاد باری ہے کہ:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ۔

سب سے پہلا خدا کا گھر (کعبہ معظم) جو لوگوں کے لئے وضع کیا گیا وہ مکہ میں ہے۔ آیت کریم میں اول تو وضع للناس کا لفظ لایا گیا' یعنی سارے انسانوں کے لئے وضع للعرب یا للعجم نہیں فرمایا گیا جس سے عرب اور بقیہ ساری اقوام کا قبلہ یہی بیت کریم ثابت ہوا۔ پھر اسے ہدایت اور راہنما بتلانے کے لئے "عالمین" کا لفظ استعمال فرمایا کہ وہ جہانوں اور عالموں کے لئے ہدایت ہے جس سے اس قبلہ کا تمام جہانوں کے لئے عالمی ہدایت کا قبلہ ہونا ثابت ہوا جس کے معنی اس کے سوا دوسرے نہیں کہ اطراف واکناف عالم سے تمام اصناف بشر اور تمام قومیں اس عالمی رہنمائی کے تحت حج کرنے کے لئے اسی کی طرف بڑھیں اور اپنی اجتماعیت کبریٰ یا عالمی اجتماعیت کا ثبوت دیں۔

امام ناس (علیہ السلام) اور مرکز ناس

اسی لئے حضرت ابرہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو جنہیں قرآن نے امام الناس فرمایا ہے کہ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا اور فرمایا وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ لوگوں کے لئے حج بیت اللہ کا اعلان عام کردیں۔

تو یہاں بھی دونوں جگہ بلا تخصیص عرب وعجم "الناس" کا لفظ لایا گیا۔ یعنی موذن تو امام الناس بنائے گئے جنہیں بلا تخصیص تقریباً دنیا کی تمام بڑی قومیں امام تسلیم کرتی ہیں اور اس اعلان کا مخاطب بھی "الناس" ہی کو بنایا گیا جس میں کسی قوم یا ملک کی تخصیص نہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ سارے انسانو! حج کے لئے چلو' اس لئے امام العرب یا امام الشام یا امام العراق نہیں بلکہ "امام الناس" کہا گیا۔ جنہیں یہود ونصاریٰ بھی امام مانتے ہیں۔ اور مسلمان بھی انہیں اپنا امام تسلیم کرتے ہیں۔ مجوس اور فارسی قومیں بھی زرتشت کے نام سے انہیں امام تسلیم کرتی ہیں اور براہمہ بھی ابراہیم کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں۔ غالباً اسی لئے انہوں نے اپنا لقب براہمہ رکھا ہے۔ نیز بقیہ اقوام بھی تبعاً اسی ذیل میں آجاتی ہیں جو ممکن ہے کہ ناموں کے تفاوت سے بھی وہ ان کی امامت کو تسلیم کرتی ہوں' غرض اعلان حج کے لئے امام الناس کو منتخب فرمایا جانا اس کی کھلی علامت ہے کہ حج کا یہ اذان عام دنیا جہاں کے سارے انسانوں کے لئے تھا اور حج کے اس اعلان عام کا خطاب "الناس" کو بنایا جانا بھی جس میں کسی ایک یا قوم کی تخصیص نہیں' اس کی کھلی دلیل ہے کہ حج کا خطاب دنیا کے سارے انسانوں کے لئے ہے۔ جس سے صاف واضح ہے کہ حق تعالیٰ نے اس قبلہ مقدسہ کو مرکز ناس اور مرکز عالم بنا کر حج کے لئے اسکے اردگرد سارے ہی انسانوں کو جمع کرنے کا اذان عام دیا ہے۔ جس سے حج ایک بین الاقوامی عبادت ثابت ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر اور قومیں اس سے منحرف بھی ہوجائیں اور صرف مسلمان ہی اس کی طرف رجوع

کریں تب بھی وہ بین الاقوامی ہی قبلہ ثابت ہو گا‘ کیونکہ مسلمان دنیا کے ہر خطہ میں موجود ہیں اور وہ یورپ ‘ایشیاء‘ افریقہ اور امریکہ سے چل کر نوبت بہ نوبت حج کے لئے آئیں گے تو بین الاقوامیت پھر بھی نمایاں رہے گی۔ اور اس میں پہنچ کر حج بین الاقوامی ہی عبادت ثابت ہو گا۔

عالمی مساوات

خلاصہ یہ کہ حج بروئے قرآن اس دنیا میں ایک عالمی اجتماع ہے جس میں ساری قومیں یکسانی کے ساتھ حصہ لیتی ہیں۔ اس لئے ان میں قدرتی طور پر اخوت اسلامی‘عالمی مساوات‘ اور عالمی بھائی چارہ اور عالمی خدمت کا جذبہ ابھرنا چاہئے‘ پھر ساتھ ہی حج میں صورتوں میں بھی مساوات رکھی گئی ہے۔ پھر اسی پر قناعت نہیں کی گئی کہ اقوام ہی یکساں رہیں‘ بلکہ آنے والے افراد میں بھی باہم یکسانی رونما ہو‘ لباس بھی سب کا ایک ہو‘ وضع ایک اور افعال بھی سب کے ایک اور یکساں ہوں‘ امیر و غریب‘ بادشاہ و گدا‘ خواص و عوام‘ عالم و جاہل‘ نیک و بد‘ صالح وطالح‘ متقی اور فاسق‘ ایک ہی لباس میں‘ ایک ہی کفن میں‘ ننگے سر‘ ننگے پاؤں یکساں فقیرانہ انداز سے اس بیت کریم کے ارد گرد جمع ہوں‘ احرام بندھا ہوا ہو۔ اور ایک وضع اور ایک رخ ہو کر اس بیت کریم کے ارد گرد پروانوں کی طرح چکر کھائیں‘ طواف کریں‘ اور اس پر جاں نثاری کا ثبوت دیں۔

بندگی میں یکسانی

عرفات کے میدان میں بھی اسی ایک وضع میں خاک بر سر ہو کر اپنے رب کے سامنے گڑگڑائیں‘ فریاد کریں‘ مزدلفہ میں بھی ایک ہی انداز سے گریہ وزاری میں محو اور مست ہوں‘ صفا و مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان بھی اسی ایک انداز گرویدگی اور محویت سے عاشقانہ اور والہانہ دوڑ لگائیں‘ ایک قافلہ‘ دوسرے قافلے کو دیکھے تو بجائے کسی دنیوی یا معاشرتی نعرہ کے ”لبیک لبیک“ کا نعرہ بلند کرے تاکہ باہمی یکسانی کے ساتھ ان کی بندگی میں بھی یکسانی رہے اور ایک ہی متواضعانہ اور سرفروشانہ انداز سے ایک دوسرے کے سامنے آئیں خواہ وہ حکمران ملک اور سربراہان ریاست ہوں‘ یا عوام الناس اور پبلک مین ہوں‘ ظاہر ہے کہ جب اسی طرح لاکھوں انسانوں کی ایک ہی فقیرانہ وردی‘ ایک ہی سب کی نقل و حرکت‘ ایک ہی عمل یک ہی مرکز اور ایک ہی رخ ہو گا۔ کیسے ممکن ہے کہ اس مساویانہ انداز میں ہو کر ان میں اونچ نیچ کا کوئی تصور بھی باقی رہے گا‘ دنیا کی کوئی قوم اس عملی مساوات کا نمونہ دکھلائے تو سہی کہ ایسی بین الاقوامی مساوات کس میں ہے؟ اور ظاہر و باطن کی برابری اور ہمواری کا ایسا سچا مظاہرہ کس نے کر کے دکھلایا ہے۔ یا دکھلا سکتی ہے۔

قلوب و قوالب کی یکسانی

پھر اسی کے ساتھ سب کی پارسائی اور زہد و قناعت کا یہ عالم کہ گھر وبار چھوڑے زرومال بقدر ضرورت ہی لئے ہوئے‘ نہ رسمی عزت و جاہ کا تصور‘ نہ کسی پر کسی کو بڑائی کا زعم‘ نہ کسی میں اونچ نیچ کا وہم‘ نہ کسی کی زبان پر کوئی فحش و بے حیائی کا کلمہ نہ آپس میں جھگڑا اور نزاع‘ نہ جدال و قتال ___ بلکہ قلبی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ گرویدگی‘ خدمت باہمی کا جذبہ‘ ایثار و قربانی کا ہمہ وقت تصور اور ہر ایک میں بجائے نیچ ہونے کے غناء و توکل کا جذبہ‘ ___ رسمی کروفر اور ٹھاٹھ باٹھ سے کوسوں دور ___ سادگی اور بے تکلفی سے مخمور اسی

ایک کی محبت میں چور چوُر' اسی ایک سے مانگنا' اور اسی ایک کے آگے جھکنا' جو سب کا ایک ہی مرکز حقیقی اصل وجود اور خالق و مالک ہے۔ اور اسی کے اس بین الاقوامی گھر کے ارد گرد گھومنا جو سب کا مرکز ظہور سب کی مادی اصل اور سب کے لئے مرکز کشش ہے۔

دنیا کی کوئی قوم قلوب کی یہ یکسانی' قوالب کی یہ مساوات' افراد انسان کی یہ عالمی موانست اور اولاد آدم کی یہ عالمی اخوت دکھلائے تو سہی کہ کہاں ہے جو اسلام اور مسلم نے اپنے رب سے جُڑ کر دکھلائی اور نہ خود ہی دکھلائی بلکہ اسی نے دنیا کو یہ سبق دیا کہ اونچ نیچ کا مٹانا نعروں سے نہیں بلکہ عملاً یوں ہوتا ہے ___ اور کبر وغرور کا سر اس طرح توڑ دیا جاتا ہے۔

مساوات و عبادت کی یکسانی

اسی توجہ الی اللہ اور ایک رخی کا قدرتی اثر ہے کہ لاکھوں لاکھ کے مجمعے میں جس میں مرد اور عورت مساوات کے ساتھ ایک جگہ ایک مقام پر جمع ہوتے ہیں ___ نہ کہیں فحش کا نشان ہوتا ہے ___ نہ بے حیائی کا وہم و گمان نہ معصیت کاری کا کوئی داعیہ' نہ کسی کی حق تلفی کا کوئی جذبہ ___ نہ طبقہ وارانہ فسادات نہ نزاع وجدال ہے نہ قتل و قتال' نگاہوں میں پاکی اور دلوں میں حق شناسی' اور ساتھ ہی عبادت اور اللہ سے وابستگی ہے

یوں باہم کس نے کیے ساغر و سنداں دونوں

عملاً دکھایا جاتا ہے کہ معاصی اور گناہوں سے کیونکر بچا جا سکتا ہے اور انسانی ہمدردی اور مساوات کو عبادت کے ساتھ کس طرح بروئے کار لایا جاتا ہے۔

عالمی اخوّت

پھر حج میں عالمی اخوّت و مساوات محض لفظی یا اخلاقی حد تک محدود نہیں رکھی گئی بلکہ اس کے ساتھ تعاون باہمی ___ ضرورت مندوں کے لئے مالی اعانت و ہمدردی کا سلسلہ بھی قائم فرمایا گیا ہے تاکہ یہ اخوّت و مساوات ہر نہج سے مستحکم ہوتی رہے اور اس حسن سلوک اور احسان عام سے دنیا کے ہر خطہ کے مسلمان' دوسرے ملک کے مسلمانوں کے ساتھ منت پذیری اور احسان شناسی کے ساتھ مربوط ہوں' کیونکہ خصوصیت سے اس طویل و عریض سفر میں صرف امراء ہی نہیں آتے بلکہ غرباء بھی شامل ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثریت غرباء ہی کی ہوتی ہے جو اپنے ذوق و شوق سے کسی نہ کسی ضروری حد تک ہی سامان سفر مہیا کر کے پہنچ پاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس رقم کی قلت ہو جائے۔ اور وہ اپنی بعض واجبی ضروریات بھی پوری نہ کر سکیں۔ اور تکلیف میں مبتلا ہو جائیں یا ضرورت کی حد تک رقم ہو مگر اچانک کوئی غیر معمولی ضرورت پیش آ جائے جو ان کی برداشت سے باہر ہو جیسے بیماری اور دوا دارو وغیرہ کی پریشانی۔ یا یہ بھی نہ ہو۔ مال چوری ہو جائے اور وہ غنی ہوتے ہوئے بھی اس سفر غربت میں فقیر بن جائیں۔ اور مستحق امداد بن جائیں یا ان میں کوئی بھی صورت پیش نہ آئے' وقتی حالات کے لئے تالیف قلوب ہی ضروری ہو جائے' ان تمام احوال کے پیش نظر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر ان کی مالی اعانتوں کی ترغیب دی کہ حرم محترم میں جو بھی غریبوں پر خرچ کیا جائے گا' اس کا اجر ایک لاکھ گنا ہوگا۔ یعنی ایک روپیہ کا صدقہ ایک لاکھ روپے کے صدقے کے مساوی ہوگا۔

حج میں روحانی ترقی کے درجات

جس کا حاصل یہ ہے کہ غیر حرم میں تزکیۂ نفس یا رذیلۂ بخل سے پاکی اور غنائے نفس کا ملکہ ایک لاکھ روپیہ صدقہ دے کر پیدا ہوتا ہے وہ حرم محترم میں ایک روپیہ دے کر ہو جائے گا' اور روحانی ترقی کے درجات ایک سے ایک لاکھ تک پہنچ جائیں گے' سو کون ہوگا کہ اس ترغیب کے بعد اس بہتی ہوئی سبیل میں ہاتھ تر نہ کرے۔

عالمی حسن سلوک

پھر قرآن کریم نے حج کی قربانیوں تک میں جو مناسک حج میں سے ہیں' غرباء اور ضرورت مندوں کی رعایت فرمائی اور اس حسن سلوک کا سلسلہ بھی عالمی بنا دیا ارشاد حق ہے :

فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ

سو ان قربانیوں کے جانوروں میں سے خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو کھلاؤ ____

غرض حج میں جیسے عالمی اخوّۃ و مساوات رکھی گئی ہے۔ ویسے ہی مالی تعاون کو بھی بین الاقوامی بنا دیا ہے۔ کیونکہ مصیبت زدہ فقیر میں کسی ملک یا وطن کی تخصیص نہیں فرمائی گئی کہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے بلکہ دنیا کے کسی خطہ کے ہوں سب اسی میں داخل ہیں۔

حج میں عالمی تجارت

سوال یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص صدقہ و خیرات کا جذبہ بھی رکھتا ہے اور غریبوں کی امداد بھی کرنا چاہتا ہے لیکن نقد رقم اس کے پاس اتنی نہ ہو کہ وہ یہ جذبہ پورا کر سکے۔ تو قرآن حکیم نے اس صورت حال کو سامنے رکھ کر اس کی بھی اجازت دی ہے کہ اگر کوئی مالِ تجارت ساتھ لے جا کر فروخت کر سکے جس سے اپنی اور اپنے دوسرے بھائیوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہوں تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور نہ اس عبادت میں اس سے کوئی فرق پڑے گا۔ ارشاد فرمایا گیا :

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ۔

اگر حج میں کچھ اسباب تجارت ہمراہ لے جانا مصلحت سمجھو تو تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ حج میں معاش کی تلاش کرو (جو تمہاری قسمت میں) تمہارے پروردگار کی طرف سے (لکھا) ہے۔

دوسری جگہ ایک دوسرے عنوان سے اسی اجازت کو اس طرح دھرایا گیا ہے کہ اس میں ترغیب دینے کی شان بھی پیدا ہو گئی۔ جہاں ابراہیم علیہ السلام کو حج کا اعلان عام کر دینے کا امر فرمایا گیا وہیں یہ بھی ارشاد حق ہے۔ فرمایا :

لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ۔

(اس علان سے لوگ پیدل اور دبلی پتلی اونٹنیوں پر جو دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی چلے آئیں گے) تاکہ وہ اپنے فوائد کے لئے آموجود ہوں۔

یہاں منافع کا لفظ عام ہے جس میں اوّلیت کے ساتھ حج کے اخروی منافع جیسے رضاء خداوندی اجر و ثواب

اور آخرت کی ترقی ڈرجات بھی داخل ہیں اور ثانویت کے ساتھ دنیوی منافع جیسے قربانی کا گوشت کھانا اور کھلانا اور تجارت یا صنعت وحرفت یا علاج معالجہ وغیرہ سے مال کمانا بھی شامل ہیں۔

عالمگیر امداد باہمی

پس قرآن حکیم نے جیسے مناسک حج کے سلسلہ میں عالمی اخوت ومساوات کے رشتے قائم فرمائے، ویسے ہی عالمی تجارت اور بین الاقوامی انداز سے صنعت وحرفت کے منافع کا راستہ بھی ہموار فرمادیا۔ تاکہ اخوت ومساوات حسن سلوک کی مضبوط بنیادوں پر قائم رہے اور عالمگیر طریق پر امداد باہمی بقائے باہم کے سلسلے جاری رہیں تاکہ مسلمانوں کے روابط صرف اپنے ملک کے مسلمانوں تک محدود نہ ہو جائیں بلکہ دنیا کے آخری کناروں تک پہنچیں اور بین الاقوامی بنیں۔

بہرحال حج ایک بین الاقوامی عبادت، بین الاقوامی مساوات، بین الاقوامی اخوت، اور بین الاقوامی تعاون کا ایک بے مثال اور عظیم المرتبت نمونہ ہے جس میں مرکز بھی ایک، محبت بھی ایک، اور سب کی انسانیت بھی ایک ہو کر سامنے آتی ہے اور اونچ نیچ، چھوت چھات، نفرت وحقارت باہمی کا بیج تک مارا جاتا ہے۔ پس جو قومیں آج مساوات اور بھائی چارگی کی لفظی رٹ لگا رہی ہیں۔ وہ قرآن حکیم کے دیئے ہوئے اس نمونہ مساوات کو سامنے رکھ کر عبرت پکڑیں۔ ورنہ وہ بھائی چارہ کے نمائشی دعوے زبان پر نہ لائیں۔ وہ صرف مساوات، اخوت اور بھائی چارہ کے الفاظ رٹے ہوئے ہیں۔

جوہر تخلیق میں مساوات کا تقاضا

اور شاید وہ بھی اسلام ہی کی اس عام پکار اور دعوت کی بدولت کہ :

"کلکم بنوادم وادم من تراب"۔

"تم سب اولاد آدم ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے"۔

تم میں نہ کوئی سورج کی اولاد ہے نہ چاند کی نہ کوئی سونے سے بنا ہوا ہے نہ چاندی سے نہ کوئی خدا کے منہ سے نکلا ہوا ہے نہ اس کے پیروں سے بلکہ سب اس کی مشیت وتخلیق سے ایک ہی جوہر سے اور ایک ہی باپ کی اولاد سے پیدا شدہ ہیں اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اخوت ومحبت کے لئے بنائے گئے ہیں، وہ لوگ چاند اور سورج کی اولاد بن کر انسانوں کو اخوت ومساوات کا درس نہیں دے سکتے، بلکہ آدم خاکی کی اولاد ہو کر اور آدمیوں میں مل کر ہی سبق پڑھا سکتے ہیں۔ وہ بہت سے خداؤں کے بندے بن کر دنیا کو ایک مرکز پر جمع نہیں کر سکتے بلکہ ایک اور صرف ایک واحد قہار اور بے مثل ویکتا خدا کے بندے بن کے ہی اور مرکزیت کے نقطہ پر لا سکتے ہیں۔

عالمی اخوت کے مرکزی نقاط

کیونکہ اسی خدائے واحد وبے مثال نے عالمی اخوت اور محبت کے لئے دنیا میں تین مرکز کلام اللہ ___ بیت اللہ ___ اور رسول اللہ بھیجے ہیں جنہیں عالمی مرکزیت دی ہے۔

قرآن کو ذکریٰ للعالمین بتلایا ___ بیت اللہ کو ھدی للعالمین فرمایا اور حضرت خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ

وسلم) کو رحمت اللعالمین کہا۔ قرآن سے عالمگیر ہدایت بصورت قانون پھیلی' بیت اللہ سے عالمگیر اخوت ومساوات بصورت حج ابھری اور نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم سے عالمگیر رحمت ومحبت اور انسانیت بصورت عمل سامنے آئی۔

طلب صادق

اس لئے جو قومیں صحیح ہدایت' صحیح اخوت ومساوات اور صحیح انسانیت انسانوں میں دیکھنا چاہتی ہیں انہیں ان تین مرکزوں سے چارہ کار نہیں ہے اور یہ پاک پونجی انہیں ان ہی تین دروازوں سے مل سکتی ہے' اگر تعصبات کو چھوڑ کر طلب صادق کے ساتھ ان کے سامنے آئیں گی بلاشبہ کامیاب واپس ہوں گی' حاصل یہ کہ حج' جیسے بین الاقوامی اور اجتماعی رنگ کی عبادت ہے' ویسے ہی عالمی اخوت ومساوات اور عالمی امداد باہمی کا سر چشمہ بھی ہے۔

قرآن حکیم نے اخوّت ومساوات کا ایک مستقل قانون دیا ہے جس کا ایک اہم پہلو حج کی عبادت میں بھی مضمر تھا' اس لئے موضوع کی رعایت سے اسی پہلو کو مختصر خطاب اور اس قلیل وقت میں ظاہر کرنا مقصود تھا' ورنہ حج کے سلسلے میں دینی اور دنیوی فوائد اور منافع کی فہرست اس سے کہیں طویل ہے۔ اتنی نہیں کہ ان چند سطروں میں سما سکے' اس کے لئے دفتر درکار ہیں۔

وباللہ التوفیق

ماخوذ از ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک (پشاور)

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

بیتُ اللہِ الکریم

بیتُ اللہ محض کوئی کوٹھا نہیں ہے' کوئی عمارت نہیں ہے' بلکہ وہ تجلّی گاہِ ربّانی ہے اس میں حق تعالیٰ کی وہ تجلی جو اقرب الی الذّات ہے' وہ موجود ہے۔ اسی تجلّی کو ہم سجدہ کرتے ہیں۔ اسی تجلّی کو سجدہ کرنا عینِ ذات کو سجدہ کرنا ہے ___ تجلّی کے معنیٰ فی الحقیقت عکس کے ہیں۔ تو بیتُ اللہ "آئینۂ جمالِ خداوندی" ہے۔ جس میں حق تعالیٰ نے اپنا عکس ڈالا ہے۔ اور عکس اور اصل میں عینیت ہوتی ہے.....

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ــــــ اَمَّا بَعْدُ ــــــ

فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم، بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم۔ ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبٰرکا وھدی للعٰلمین۔ فیہ اٰیٰت بیّنٰت مقام ابراھیم ومن دخلہ کان اٰمنا۔ صدق اللّٰہ العلی العظیم۔ (اٰل عمران پ۴ ع۱۰)

اوّلِ عالَم

بزرگانِ محترم!

اس وقت ہم سب خدّامِ دین بحمد اللہ کہ اوّلِ عالَم میں موجود ہیں۔ جو مرکزِ عالَم بھی ہے' وسطِ عالَم بھی ہے اور اصلِ عالَم بھی ہے۔ میں نے یہ چار الفاظ مکّہ کے بارے میں استعمال کئے ہیں۔

اوّلِ عالَم' اصلِ عالَم' مرکزِ عالَم اور وسطِ عالَم۔ یعنی سب سے پہلا مقام دنیا میں یہی ہے اور ہم سب کی اصل یہی ہے۔ اور اس عالَمِ شاہد کے بیچوں بیچ بھی یہی ہے' اور مرکزِ عالَم بھی یہی ہے ___ یہ چار چیزیں ہیں۔ اس میں بعض اُمور تو نصِ قطعی سے ثابت ہیں۔ یعنی قرآن کریم نے خود تصریح فرمائی ہے' اور بعض آثارِ صحابہؓ سے ثابت ہیں۔ یعنی اس بارے میں یا تو حدیث مرفوع ہے نہیں یا ہمارے علم میں نہیں۔ لیکن آثارِ

صحابہؓ بکثرت ملتے ہیں۔ جن سے یہ چاروں دعوے ثابت ہوتے ہیں۔

قرآن حکیم نے تو ارشاد فرمایا اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ خدا کا سب سے پہلا گھر جس کو اللہ نے لوگوں کیلئے وضع کیا وہ بکّہ میں ہے ___ خواہ بکّہ کے معنی مکّہ کے ہوں یا بکّہ کے معنی اس موضع کے ہوں جس میں بیتُ اللہِ الکریم واقع ہے۔ اور اس کے اردگرد کو مکّہ کہتے ہوں۔ یہ اختلافِ اقوال ہے۔ مگر بہرحال حاصل یہ نکلا کہ خدا کا سب سے پہلا گھر جو عبادت کے لئے بنایا گیا' وہ مکّہ میں ہے۔ جس کا نام بیتُ اللہِ الکریم ہے ___ یعنی قدرت نے جب ارادہ کیا کہ اس عالم کو پیدا کیا جائے اور بنایا جائے تو اس میں سب سے پہلی وضع بیتُ اللہ کی واقع ہوئی۔ جیسا کہ آثارِ صحابہؓ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس پورے عالم میں پانی ہی پانی تھا۔ یعنی عناصرِ اربعہ میں سے سب سے پہلے اللہ نے پانی کو پیدا فرمایا۔ جب حق تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ اس پانی سے دوسرے عنصر تیار کئے جائیں۔ اور دوسری کائنات بنائی جائے۔ تو اس پانی میں ایک وضع واقع ہوئی۔ پانی میں اتنی جگہ' جہاں بیتُ اللہ واقع ہے' کا کچھ حصہ اُبھرا ہوا تھا۔ جیسے پہاڑی کا ایک چھوٹا سا مقام ہوتا ہے۔ وہ بھر گیا۔ وہ بیتُ اللہ تھا۔ اس کے بعد کچھ گہرائی واقع ہوئی۔ اس کے بعد پانی نے ٹکرانا شروع کیا ___ تو پانی اور بالخصوص سمندر کا پانی جب ٹکراتا ہے تو اس میں غلظت اور گاڑھاپن پیدا ہوتا ہے جیسا کہ اب بھی آپ دیکھتے ہیں۔ سمندر کے کناروں پر جب پانی ٹکریں کھاتا ہے تو جھاگ پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ سمندر جھاگ مثل پتھر کے ہوتی ہے۔ اسی طرح پانی نے ٹکرانا شروع کیا۔ اور ٹکریں کھا کر اس میں غلظت اور گاڑھاپن پیدا ہوا۔ گاڑھے پن نے سختی اختیار کی۔ اور وہ ایک اینٹ کے برابر سختی پیدا ہوئی ___ اس کا مطلب یہ ہے کہ اوّل زمین ایک اینٹ کے برابر بنی۔ تو زمین کی اصل یہی بیتُ اللہ ہے۔ اس کے بعد میں حق تعالیٰ نے اس کو بڑھایا اور پھیلانا شروع کیا۔ وہ پھیلتے پھیلتے زمین بنتی گئی اور اس حد پر آکر رک گئی۔ جس حد تک آج زمین ہے ___ کتنے دنوں میں؟ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ قرآن کریم میں بعض جگہ تصریحات بھی ہیں۔ لیکن اس وقت مُدّت سے بحث نہیں کہ کتنی مُدّت تک زمین پھیلی۔ بہرحال زمین پھیلی ___ اس کا حاصل یہ نکلا کہ بیت اللہ ساری زمین کی اصل ہے۔ یہیں سے ایک اینٹ کے برابر زمین پیدا ہوئی۔ وہیں سے پھیلی اور پھیلتے پھیلتے اس حد پر آکر رک گئی۔ جس کو آج ہم زمین کہتے ہیں۔

ہم سب کی اصل بیتُ اللہ ہے

گویا زمین کا اوّل حصہ وہ ہے جو بیتُ اللہ ہے۔ نیچے سے زمین شروع ہوئی' اور آپ سب جانتے ہیں کہ ہم سب زمینی مخلوق ہیں۔ ہمیں اللہ نے اسی مٹی سے پیدا کیا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا :

کلکم بنو آدم وآدم من تراب

تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو' اور آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا۔ آدم کی اصل بھی مٹی ہے۔ ہم سب کی اصل بھی مٹی ہے۔ اسی لئے انسان کو مشتِ خاک اور مشتِ غبار کہا جاتا ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے نا کہ ؎

قدرت خدا کی دیکھیں تو انسان کو دیکھئے
کیا کیا تکلفات میں مشتِ غبار میں

ایک مٹھی بھر مٹی ہے اور کیا کیا تکلفات دکھائے۔ کتنا دنیا کو سجایا۔ اور کہاں تک پہنچایا ___ تو حق تعالیٰ شانہٗ نے ہم سب کو مٹی سے بنایا۔ اور مٹی کی اصل بیتُ اللہ ہے اس کا حاصل یہ نکلا کہ ہم سب کی اصل بیتُ

اللہ ہے ایک عام اصول ہے۔ کل شیء یرجع الی اصلہ ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ اگر شاخیں ہیں تو وہ جڑ کی طرف رجوع کریں گی۔ پانی ہے تو وہ اپنے مرکز کی طرف رجوع کرے گا۔ زمین ہے تو وہ مرکزِ ثقل کی طرف رجوع کرے گی۔ ہر چیز اپنے مرکز کی طرف فطرۃً دوڑتی ہے۔ اسے کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اگر بیٹے کو باپ کی طرف کشش ہے تو آپ بیٹوں کو تلقین نہیں کرتے کہ بھئی باپ کی طرف رجوع کرو۔ کہیں نہ کہیں وہ تو رجوع ہو گا۔ اس لئے خلقۃً و طبعاً تمام انسانوں کو بیتُ اللہ کی طرف رجوع ہے۔

بیتُ اللہ کو مرکزِ عبادت بنانے کی حکمت

بعض کے علم میں ہے کہ یہ ہماری اصل ہے اور بعض کے علم میں نہیں ہے۔ علم میں آجائے تو پھر ان میں کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے مثلاً کسی شخص کے اولاد ہوئی، بچہ پیدا ہوتے ہی باپ چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ بچہ جوان ہوا، بڑی عمر کا ہوا۔ اب اگر باپ کہیں سامنے آئے گا تو طبعی کشش تو ہوگی۔ مگر یہ نہیں جانے گا کہ یہ باپ ہے جب تک کہ پہچنوایا نہ جائے۔ جب پہچان جائے گا کہ یہی ہے وہ باپ جس کی طرف طبعی کشش ہے۔ تو طبعی چھوڑ کر وہ کششِ عقلی بھی بن جائے گی۔ قدرتاً آدمی متوجہ ہو گا۔ تو فطرتاً ہر انسان جانتا ہے کہ یہ میری اصل ہے اس کی طرف کشش ہے ___ انبیاء علیہم السلام نے آکر تعارف کرا دیا کہ جس اصل کی طرف کشش ہے وہ یہی اصل ہے۔ علم میں نہیں مگر کشش موجود ہے۔ اور وہ تشخص کے ساتھ موجود ہے۔ جن کے علم میں آگیا۔ وہ ایمان لے آئے۔ انہیں کشش بھی ہے اور تشخص یعنی معرفت اور پہچان بھی ہے۔ غرض انسان کا بیتُ اللہ کی طرف خلقۃً رجوع ہے۔

چونکہ طبعی کشش تھی۔ حق تعالیٰ نے عقلی کشش بھی پیدا فرمادی کہ پھر عبادت میں بھی اسی کو مرکز سمجھو۔ اگر عبادت کا مرکز کوئی ایسا ہوتا کہ طبعاً اس کی طرف رجوع نہ ہوتا، تو لوگ زبردستی رجوع کرتے۔ فطری کشش نہ ہوتی مگر حق تعالیٰ نے اسی چیز کو مرکزِ عبادت بنایا، جس کی طرف کشش بھی تھی۔ وہ طبعی کشش انسانوں کو اس کی طرف کھینچ کرلاتی ہے۔

اب یہ لاکھوں انسان اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر اربوں کھربوں انسان جو "مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ" ہر گھاٹی سے نِکل نِکل کر آرہے ہیں۔ سفر کی سختیاں اٹھاتے ہیں، محنتیں اٹھاتے ہیں۔ خلافِ طبع باتیں برداشت کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی آتے ہیں۔ تو کوئی تو کشش ہے۔ وہ فطری کشش بھی ہے، اور شرعی کشش بھی ہے۔ عقلی کشش بھی ہے۔ کئی کششیں جمع ہو گئیں۔

فطری تو یوں ہے کہ وہ ہماری اصل ہے۔ اور عقلی یوں ہے کہ اصل کی طرف رجوع ہوتا ہی ہے۔ معقول بات ہے۔ اور شرعی یوں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعارف کرا دیا کہ یہی ہے وہ بیتُ اللہ جو تمہاری اصل ہے ___ یہی وجہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نبی ایسے نہیں گزرے جنھوں نے آکر بیتُ اللہ کا طواف نہ کیا ہوا۔ اور جب انبیاء علیہم السلام نے طواف کیا تو یقیناً ان کی اقوام کے دلوں میں بھی یہ چیز ہوگی کہ یہ ہماری اصل ہے ___ یہ اصل صرف آپ ہی کی نہیں، جو مسلمان کہلاتے ہیں۔ بلکہ آدم علیہ السلام کی ساری اولاد کی اصل ہے۔

بیتُ اللہ کی حُدود

حضرت آدم علیہ السّلام نے اس کی تعمیر کی ہے۔ ملائکہ علیہم السلام نے اس کی بنیادیں بھری ہیں۔ اور

بنیادیں بھی دس بیس سو پچاس گز نہیں بلکہ حدیث میں ہے کہ تحت الثریٰ تک بیتُ اللہ کی بنیادیں بھری گئی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیتُ اللہ فقط اس حصہ میں نہیں ہے جو چار دیواری آپ کے سامنے ہے' بلکہ تحت الثریٰ تک جتنا حصہ چلا گیا۔ وہ سب بیتُ اللہ ہے۔ اسی طرح سے اوپر کی طرف جائیے تو یہ عرش تک سب بیتُ اللہ ہی ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ہر آسمان میں ایک قبلہ ہے۔ وہ قبلہ ٹھیک اسی سیدھ میں ہے جہاں یہ بیتُ اللہ ہے' اور ساتویں آسمان پر بیتُ المعمور ہے۔ وہ ساتویں آسمان کا قبلہ ہے۔ تو ہر آسمان میں قبلہ ہے ___ یہ ایسا ہے جیسے ایک تار میں لٹو باندھ دیئے جائیں۔ اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے پرو دیئے جائیں' تو ہر لٹو دوسرے لٹو کا محاذی ہوگا۔ گویا بالکل سیدھ میں بیتُ اللہ ہے۔ جیسے حدیث میں ہے کہ اگر بیتُ المعمور سے کوئی پتھر گرایا جائے تو وہ سیدھا بیتُ اللہ کی چھت پر آکر گرے گا۔ تو بیتُ اللہ فقط اس چار دیواری کا نام نہیں ہے جو کعبہ مکرمہ کی شکل میں موجود ہے۔ وہ ایک علامتی نشان ہے ورنہ بیتُ اللہ عرش سے لے کر تحت الثریٰ تک ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر آپ آسمانوں میں پہنچ جائیں اور بیتُ اللہ کی طرف نماز پڑھیں' تو آپ کو الٹا نہیں لٹکنا پڑے گا۔ کہ بیت اللہ تو نیچے ہے۔ اسی طرح نماز پڑھیں گے جیسے زمین پر پڑھتے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں بھی بیتُ اللہ سامنے ہے' اور اگر آپ کشتیوں کے ذریعے سے زمین کی بڑی تہہ میں پہنچ جائیں تو وہاں آپ کو الٹ کے سجدہ نہیں کرنا پڑے گا کہ بیتُ اللہ تو اوپر ہے۔ آپ اسی طرح سجدہ کریں گے جیسے زمین پر۔ تو بیتُ اللہ نیچے سے لے کر اوپر تک ایک کیل کی مانند ہے ایک نورانی لاٹ ہے۔ جس کے اردگرد یہ سارے جہان چکی کے پاٹ کی طرح سے چکر کھا رہے ہیں۔ یہ بیچ میں ایک مرکز ہے۔

بیتُ اللہ میں اَقربُ اِلی الذّات تجلّی کا عکس

حق تعالیٰ نے اس کو مرکز بنا کر تاکا' تاکہ اس کو وجود دیا جا سکے' اور مرکز سے جو چیز چلتی ہے' وہ چہار طرف برابر چلتی ہے۔ اگر آپ پانی کے بیچ میں ڈھیلا ماریں تو دائرے بنتے بنتے کنارے تک پہنچیں گے' مگر مرکز سب کا ایک ہی رہے گا۔ اور برابر دائرے بنتے چلے جائیں گے۔ تو مرکز میں جو حرکت ہوتی ہے وہ پورے محیط میں ہوتی ہے۔ وجود کو جب حرکت دی گئی کہ زمین کو پیدا کیا جائے' تو اسی مرکز کو قدرت حق نے تاکا۔ اور وجودی تجلی یہیں نازل ہوئی۔ اس لئے بیتُ اللہ محض کوئی کوٹھا نہیں ہے' کوئی عمارت نہیں ہے' بلکہ وہ تجلّی گاہِ ربّانی ہے۔ اس میں حق تعالیٰ کی وہ تجلّی جو اَقربُ اِلی الذّات ہے وہ موجود ہے۔ اسی تجلّی کو ہم سجدہ کرتے ہیں۔ اسی تجلّی کو سجدہ کرنا' عینِ ذات کو سجدہ کرنا ہے۔ تجلّی کے معنٰی فی الحقیقت عکس کے ہیں تو بیتُ اللہ آئینۂ جمالِ خداوندی ہے جس میں حق تعالیٰ نے اپنا عکس ڈالا ہے اور عکس اور اصل میں عینیت ہوتی ہے۔ جو حرکت ذات کرتی ہے وہ عکس کرتا ہے' سایہ بھی کرتا ہے۔ اگر ذات ہنس رہی ہے تو سایہ بھی ہنسے گا۔ اگر ذات چل رہی ہے تو وہ بھی چلے گا۔ البتہ شدّت اور ضعف کا فرق ہوتا ہے۔ ورنہ حرکت اور سکون وہ بھی وہی کرتا ہے جو اصل ذات کرتی ہے۔ تو وہ تجلّی ربّانی بیتُ اللہ میں اُتری ہوئی ہے جسے ہم سجدہ کرتے ہیں اسے سجدہ کرنا عینِ ذات کو سجدہ کرنا ہے۔ اس لئے کہ عینِ ذات اتنی لطافت میں ہے کہ کوئی سیدھ اور محاذات بن نہیں سکتی۔ اگر محض ذات کو سجدہ کرایا جاتا تو تصوّر محض ہوتا' ظاہر میں اصلیت کچھ نہ ہوتی۔

لیکن ذات کا عکس جب اتار دیا گیا تو عکس کا قاعدہ ہے کہ بڑی سے بڑی چیز کا عکس بھی چھوٹی سے چھوٹی چیز میں آجاتا ہے۔ آفتاب کو آپ آئینے میں دیکھتے ہیں' تو آئینہ زمین کا ایک حصہ ہے۔ اس حصہ کی سورج (جیسے

کُرّہ) کے سامنے کوئی حیثیت نہیں لیکن پورا آفتاب مع اپنی شکل وصورت کے اس میں موجود ہو جاتا ہے۔ اور پھر جو کام اصل آفتاب کرتا ہے' وہی آئینہ کا آفتاب بھی کرتا ہے۔ آپ آئینے کو دوسرے آئینہ کے سامنے کریں اس میں بھی عکس پہنچ جائے گا۔ تیسرے کے مقابل رکھیں اس میں عکس پہنچ جائے گا ___ آفتاب کی روشنی پہنچتی رہے گی۔ چاہے آپ اندھیرے کوٹھے میں روشنی پہنچادیں ___ اسی طرح آفتاب کا کام حرارت پہنچانا ہے۔ آئینوں کے ذریعے سے بھی وہی حرارت پہنچتی ہے۔ شدّت اور ضُعف کا فرق ہوتا ہے۔ تو جو کام آفتاب کا ہے' وہی اس کا عکس بھی کرتا ہے۔

اس لئے عکس کو دیکھ کر کہا کرتے ہیں کہ ہم نے آفتاب کو دیکھا۔ آفتاب کی ذات کو ٹکٹکی باندھ کر کوئی نہیں دیکھ سکتا' ورنہ تو نگاہیں کھو دینی پڑیں گی۔ آئینے میں جب آفتاب کا عکس آتا ہے تو دیکھ بھی سکتے ہیں۔ اس کی ہر جانب اور سمت کو آپ دیکھ سکتے ہیں' معائنہ کرسکتے ہیں ___ تو عکس میں اور ذات میں کوئی فرق نہیں ہوتا عینِ ذات کو سجدہ کرنا' یہ ناممکن تھا۔ اس لئے کہ وہ غایتِ الطافت میں اور غیب در غیب میں ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم کھایا کہ اپنا عکس آئینۂ بیت میں اتار دیا تاکہ ایک حد تک محدود ہو جائے' اور بندوں کی نگاہ اس حد تک جاسکے' اور اس کی طرف جُھک سکیں' ورنہ جھکنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ یہ حق تعالیٰ کا فضل اور عنایت ہے کہ ذات اور تجلی کی نسبت سے اپنی وہ تجلی جو اقرب اِلی الذّات تھی' اتار کر بندوں کو سجدہ کا موقع دیا۔ ورنہ کہاں ذات باری تعالیٰ اور کہاں یہ بندے۔ وہ نورِ مطلق اور ہم ظلمتِ محض۔ بیچ میں ایک چیز تجلی کی اتار دی' تاکہ سجدہ بھی کرسکیں' طواف بھی کرسکیں' عبادت بھی کرسکیں۔ اور اس کی عبادت کو ذات کی عبادت قرار دیا۔

مادّیت' رُوحانیت اور نورانیت' سب کی اصل بیتُ اللہ ہے

بیتُ اللہ فی الحقیقت ہماری مادی اصل بھی ہے' رُوحانی اصل بھی ہے' مادی اصل تو یوں ہے کہ زمین اسی سے بنی' اور ہم سب زمینی مخلوق ہیں تو وہ ہماری مادی اصل ہوئی۔ اور روحانی یوں ہے کہ جب عبادت کریں گے تو انوارِ ربّانی اسی کے ذریعہ سے ہمارے قلب میں آئیں گے۔ تو روحانی اصل بھی ہوئی۔

اور جب یہ بیتُ اللہ تحت الثریٰ تک ہے اور اوپر عرش تک ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ جہاں جہاں بیتُ اللہ ہے۔ اس کے اِرد گرد جو جو مخلوق ہے۔ اس کی اصل یہی بیتُ اللہ ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ہر وطن کے مناسب اس کی صورت بن جاتی ہے' زمین میں بیتُ اللہ ہے تو اس کی صورت اینٹ پتھر کی ہے۔ آگے آسمانوں میں جائے گا' لطافت بڑھتی جائے گی۔ نورانیت بڑھتی جائے گی۔ عرش کے قریب پہنچ جائے گا تو نورانیتِ محضہ رہ جائے گی۔ اس لئے وہاں نوری مخلوق پیدا ہوئی۔ یہاں کثیف اور خاکی مخلوق پیدا ہوئی' مگر ہے سب کی اصل بیتُ اللہ ___ اس لئے سب کا رجوع اس کی طرف ہے۔ ملائکہ علیہم السلام بھی اس کا طواف کرتے ہیں۔ انسان بھی طواف کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض جانور بھی اس کا طواف کرتے ہیں۔ اس لئے کہ سب پہچانتے ہیں کہ یہ ہماری اصل ہے۔

تو میں نے ایک تو عرض کیا تھا کہ وہ اوّل عالَم ہے۔ تو واقعی وہ اوّلِ عالم ہے اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ ___ سب سے پہلے قدرت نے اسی کو تاکا۔ اور حدیث میں فرمایا گیا جب زمین پھیلنی شروع ہوئی' تو سب سے پہلے وہ پہاڑیاں پیدا ہوئیں جو مکہ کے اردگرد ہیں۔ پھیلتے پھیلتے اور پہاڑیاں بن گئیں ___ ظاہر بات ہے کہ

جب چاروں طرف زمین پھیلنا شروع ہوئی' تو جتنی جس چیز میں جو جو خصوصیت تھی وہ چمک اٹھی ___ تو مدینہ منورہ بھی تو اسی میں آتا ہے ___ وہ بھی اوّل عالم ہے اپنے ماسوا کے لحاظ سے۔ اس لئے کہ مدینہ کے دائرہ کے باہر جو ہے وہ مدینہ مقدّم ہے اور وہ اس سے مؤخّر ہے۔ تقدیم وتاخیر ہوتی چلی جائے گی۔ تو اصل جا کے سب کی بیتُ اللہ نکلتی ہے اس لئے میں نے کہا وہ اوّلِ عالم بھی ہے۔

بیتُ اللہ کے وسطِ عالم ہونے کی حکمت

اصلِ عالم بھی ہے اور وسطِ عالم بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی مرکزی جگہ ہے۔ جس میں قدرت نے تجلّی ڈالی تاکہ چہار طرف انوار وبرکات برابر پھیلیں ___ اسی واسطے ابن عبّاس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے۔ **یا اھل مکۃ انتم فی وسط من الارض** ___ اے اہل مکّہ! تم زمین کے بیچوں بیچ واقع ہوئے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ وسطِ عالم بھی ہے۔ اور مرکز ہوتا بھی وسط میں ہی ہے۔ دائرہ جبھی بنے گا' جب بیچ میں مرکز ہو ___ پرکار کی ایک ٹانگ کو آپ مرکز پر رکھیں گے اور ایک ٹانگ گھمائیں گے' تبھی تو دائرہ بنے گا۔ اگر مرکز سے ٹانگ ہٹ جائے دائرہ بن نہیں سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ اوّل بھی ہے' اصل بھی ہے' مرکز بھی ہے اور وسط ودرمیان بھی ہے۔

بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت مکّہ میں فرمائی۔ اور اللہ کی طرف سے اسلام اور جامع دین کی گویا پہلی دعوت مکّہ سے چلی۔ تاکہ مرکز سے دعوت چلے اور یکسانی کے ساتھ تمام عالم میں اس کی آواز پھیل سکے ___ اگر مثلاً بیت اللہ کو روس میں اور کاکیشیا کے پہاڑوں پر بنادیتے تو ساری دنیا کو مصیبت اٹھا کے وہاں جانا پڑتا۔ اور اگر کہیں مغرب میں امریکہ کی طرف بنادیتے تو روس سے جو لوگ چلتے وہ لاکھوں مصیبتیں اٹھا کے پہنچتے۔ بہت سے پہنچ بھی نہ سکتے۔ اللہ نے اسے بیچ میں رکھ دیا تاکہ نرم اور گرم ملک کا ہر انسان وہاں پہنچ سکے مشقّت سب پہ برابر پڑے۔ اور اپنے مرکز کو پہنچ جائیں۔ جیسا کہ وسط ہونے کی وجہ سے آسانی ہے۔ اسی طرح مرکز سے جو چیز چلے گی اسے پھیلنے میں بھی آسانی ہوگی۔ حق تعالیٰ نے دعوت الی اللہ اور جامع دین کا کارخانہ مکّہ سے شروع کیا۔ اور اسلام کی پہلی دعوت مکّہ سے شروع ہوئی۔

مرکزیّت کی منتقلی

وہیں سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی ___ اس کے بعد مدینہ مرکز بنا ___ یہ حق تعالیٰ کی مشیت اور شان ہے کہ اس نے کمالات ظاہر ہوں یا باطن کسی کی تخصیص نہیں رکھی۔ مثلاً یہ کہ علم ہوگا تو فلاں ہی خاندان میں ہوگا۔ اور کسی میں نہیں ہوگا۔ روحانیت ہوگی تو فلاں ہی خطّے میں ہوگا۔ بنی آدم کے ہر طبقہ کو علم اور روحانیت سے نوازا۔ اور تمام زمین کے خِطّوں کو اس میں سے حصہ دیا۔ تو اوّل مرکز مکّہ بنا۔ اس کے بعد وہ مرکزیت مدینہ کی طرف منتقل ہوئی۔ خلفائے راشدین کی حکومت وہاں قائم ہوئی۔ اور علم کے دریا اور نہریں وہاں سے جاری ہوئیں۔ اس کے بعد مرکزیت عراق کی طرف منتقل ہوئی۔ بغداد دار الخلافہ بن گیا۔ تو وہاں ہزاروں لاکھوں علماء تیار ہوئے۔ اس کے بعد خراسان کی طرف منتقل ہوئی۔ تو خراساں اور ماوراء النہر سے بڑے بڑے اَجلّہ علماء اور فضلاء تیار ہوئے کبھی اسپین کی طرف علم منتقل ہوگیا۔ فلسطین مرکز بنا۔ بڑے' اکابر علماء اسپین میں پیدا ہوئے۔

تو مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے کسی ایک خطّہ زمین کو خاص نہیں کیا کہ اسی میں اس کی برکت آئے۔ وہ مبداءِ فیاض ہے۔ اس کے لئے سب برابر ہیں حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کبھی یہاں کبھی وہاں ___ کبھی وہاں اسی طرح سے خاندان بدلتے رہتے ہیں۔ کتنے عرصے بنی اسرائیل میں نبوّت رہی' جب انہوں نے ناشکری وناقدری کی ___ خاندان کو محروم کر کے بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسمٰعیلؑ میں نبوّت آ گئی۔ اور ایک ہی نبوت ایسی آئی کہ ساری نبوتوں سے فائق تر ہو گئی ___ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پیدا فرمائے گئے۔ بنی اسمٰعیل کو نوازا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برکات وکمالات بھی کسی ایک خاندان کے ساتھ خاص نہیں ہیں۔ صِدّیق اکبر رضی اللہ عنہٗ خلیفۂ اوّل ہیں' تو صِدّیقیت کے ساتھ خلافت آئی۔ پھر فاروقیت کے ساتھ آئی۔ عثمانیت کے ساتھ آئی۔ اور پھر علویت کے ساتھ آئی۔ ہر خاندان کو حصہ ملتا رہا۔ اور ہر خطّۂ زمین مستفیض ہوتا رہا۔ کبھی مکہ مرکز ہے' کبھی مدینہ مرکز ہے' کبھی خراساں مرکز ہے' کبھی اسپین ہے اور کبھی ماوراء النّهر مرکز ہے' اور کبھی ہندوستان مرکز ہے کہ مرکزیت منتقل ہوئی تو دہلی پہنچ گئی۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا خاندان اور حضرت شیخ عبدالحق محدّثِ دہلویؒ' انہوں نے علمِ حدیث پھیلایا۔ پھر وہ دہلی سے ضلع سہارن پور کی طرف منتقل ہو گئے۔ بڑے بڑے اجلّے علماء اس میں پیدا ہوئے ___ تو کسی ایک خطے کے ساتھ خاص نہیں۔ مگر مرکز سب کا بہرحال ایک ہی رہے گا۔ مرکزیت حقیقی وہ صرف بیتُ اللہ کو حاصل ہے۔ وہیں سے علم اور کمالات کے چشمے پُھوٹ رہے ہیں۔

برکت وہدایت کا گھر

اس لئے فرمایا کہ :

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝

"تو یہ برکت والا بھی ہے' اور ہدایت والا گھر بھی ہے"۔

برکت کا لفظ عام طور سے مادیات میں استعمال ہوتا ہے۔ چاہے روحانیات میں بھی استعمال کریں مگر عام استعمال مادیات میں ہے۔ جیسے مثلاً کہ بھائی کھانے میں برکت ہو گئی۔ فلاں کی عمر میں برکت ہو گئی۔ فلاں کے کاموں میں برکت ہو گئی۔ تو برکت کا لفظ مادیات میں استعمال ہوتا ہے۔ اور ہدایت کا لفظ معنویات میں استعمال ہوتا ہے۔ علم ہے' معرفت ہے' اور کمالات معنویہ ہیں ___ حاصل یہ نکلا کہ برکت کا گھر بھی ہے اور ہدایت کا گھر بھی ہے۔ یعنی مادی برکتیں بھی اس میں موجود ہیں۔ روحانی برکتیں بھی اس میں موجود ہیں۔

آیاتِ بیّنات

فِیْہِ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰھِیْمَ ۚ آج یہاں لاکھوں انسان آئے ہوئے ہیں تو یہ کُھلی کُھلی نشانیاں ہیں کہ لاکھوں کو روٹی بھی مل رہی ہے' پھل بھی مل رہے ہیں ___ اس وادی غیرذی زرع میں ___ جہاں نہ سبزہ' نہ پانی' نہ نہریں' نہ باغات۔ لیکن ہر تازہ پھل میسّر۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی دعا ہے کہ :

وَارْزُقْ اَھْلَہٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْھُمْ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ

اے اللہ! اس گھر والوں کو رزق دے۔ اور رزق بھی کیا؟ فروٹ جو اعلیٰ ترین رزق ہے۔ یعنی تازہ پھل۔ اگر کہیں ملک شام میں دعا مانگتے تو اسبابِ طبعیّہ کے مطابق ہوتی کہ وہاں پر تو پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں دعا مانگی' جہاں نہ سبزہ نہ پانی۔ لیکن دنیا بھر کے تازہ پھل موجود' اور ہر ملک کے موجود۔ اور ہر شخص مستفید۔ دس بیس ہزار کا مجمع ہو گرانی الگ ہو جاتی ہے۔ جھگڑے اور نزاعات الگ ہوتے ہیں۔ فِيهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ کھلی کھلی نشانیاں ہیں۔ رزق بھی مل رہا ہے جھگڑے بھی نہیں ہوتے۔ اور لاکھوں آدمی جمع ہیں۔ عرفات میں تو ایک جگہ جمع ہوتے ہیں جو چودہ پندرہ لاکھ آدمی ہوتے ہیں (اور یہ تعداد روز افزوں بھی ہے)۔ لیکن سانس کی آواز نہیں ہوتی۔ ہر شخص اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔ ہر شخص اپنے مرکز کی طرف متوجہ ہے۔ کوئی آواز ہو' کوئی گفتگو ہو' کوئی جھگڑا ہو' بالکل بھی نہیں۔ ایک ایسا سکونِ محض ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کی مسجدوں میں بھی دیکھنے میں نہیں آتا جتنا میدانِ عرفات کے لاکھوں آدمیوں میں سکون ہوتا ہے ـــــ تو کیا یہ آیاتِ بیّنات میں شامل نہیں ہے؟

قالبی اَمن کے ساتھ قلبی اَمن بھی

انسان میں دو ہی قوتیں ہیں۔ ان سے ساری معصیتیں پھیلتی ہیں ـــــ ایک قوتِ شہوانی' اور دوسری قوت غضبیہ۔ ایک سے فواحش ومنکرات پھیلتے ہیں' اور دوسری سے مار دھاڑ جھگڑے اور فتنے پھیلتے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ مطاف کے اندر عورت مرد مخلوط ہو کر طواف کرتے ہیں۔ کندھے سے کندھا لگ رہا ہے صرف یہی نہیں مرد کو ادھر توجہ نہیں بلکہ بعض اوقات کراہت پیدا ہوتی ہے کہ عورت کیوں سامنے آگئی ـــــ تو میں کہتا ہوں کہ ایک جذبے کو سرد کر دینا' کیا یہ آیاتِ بیّنات میں داخل نہیں ہے؟ یہ اللہ کی کُھلی نشانی ہے ورنہ مرد کو عورت کی طرف طبعی کشش ہوتی ہے لیکن سینکڑوں عورتیں موجود' کندھے سے کندھا' کمر سے کمر لگتی ہے نہ صرف یہ کہ رغبت نہیں بلکہ بعض اوقات کراہت بھی ہوتی ہے کہ یہ کہاں بیچ میں آگئی؟ اور ہماری طاعت وعبادت کے درمیان خلل انداز ہو گئی۔ تو دلوں کا بدل ڈالنا بلاشبہ آیاتِ بیّنات میں داخل ہے۔

یہی قوتِ غضبیہ کا حال ہے ورنہ اتنے جھگڑے جھمیلے ہوتے کہ حکومت کو فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا۔ جگہ جگہ لڑائیاں ہوتیں۔ لیکن کہیں لڑائی نہیں۔ حتیٰ کہ کندھے سے کندھا ٹکراتا ہے۔ خلافِ طبع اُمور پیش آرہے ہیں۔ اور یہ لاکھوں آدمیوں میں متفقہ فی الدین علماء تو نام کو ہیں زیادہ تو جہلاء ہیں۔ لیکن جھگڑے کا نشان نہیں ـــــ اور یوں کبھی اتفاق سے ہو جائے تو بندہ بشر ہے۔ انسان ہے۔ کہیں ہو جائے' لیکن جتنا طبعاً ہونا چاہئے تھا' قطعاً اس کا نشان نہیں۔ تو قوتِ غضبی بھی ساکن ہے' اور قوتِ شہوانی بھی ساکن ہے (کیا یہ نہیں کہا جاسکتا باطنی طور پر بھی آمن کا گھر ہے۔ تو اندر بھی آمن ہے اور باہر بھی آمن ہے۔ اور قلوب کے اندر بھی آمن ہے ـــــ قلبی اور نفسانی قوتوں کو وہاں اتنا پامال کر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے کام میں نہیں لگتیں۔ اپنی ذاتِ بابرکات کی اطاعت وعبادت اور روحانیت کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے۔ تو "فِيهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ" میں رزق کا ملنا' جھگڑوں کا نہ ہونا بھی داخل ہے۔ شہوانی اُمور کا مٹنا اور نہ ہونا' یہ بھی داخل ہے۔ خالص قلبی اور قالبی آمن ہے' باطنی بھی اور ظاہری بھی ہے۔ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا جو اس میں داخل ہو گیا وہ آمن میں آگیا۔ تو آمن فقط اسی کو نہیں کہتے کہ جان بچ جائے۔ آمن اسے بھی کہتے ہیں کہ آدمی نفس سے بچ جائے۔ شیطان کے رذیلوں سے بچ جائے۔ نفس وشیطان کی مکاریوں سے بچ جائے۔ اور یہاں سبھی چیزوں سے بچاؤ ہو رہا ہے۔ تو "آیتِ بیّنات" ظاہر میں بھی نمایاں' باطن میں بھی نمایاں۔

تو مکہ مکرمہ اور بیتُ اللہ اوّلِ عالم بھی ہے۔ مرکزِ عالم بھی ہے اور وسطِ عالم بھی ہے اور ہم سب کی اصل

بھی ہے۔

وسطِ عالم میں ولادتِ نبوی (ﷺ) کی حکمت

اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکّہ میں پیدا فرمایا گیا کہ یہ دین عالمی ہے' مقامی نہیں ہے کہ کسی ایک خطّہ اور قوم کے لئے ہو۔ پوری دنیا کے لئے ہے۔ تو پھر ایسی جگہ سے آواز اٹھائی جائے کہ چاروں طرف اس کی آواز برابری کے ساتھ پھیلے۔ وہ مکّہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس لئے ولادت باسعادت مکّہ میں ہوئی۔ اور آپ نے جو دعوت الی اللہ شروع کی۔ وہ مکّہ سے شروع کی۔ ہر طرف اس کی آواز پھیلی۔ اگر کسی ایک جانب ہوتے تو وہاں دین کا غلبہ ہوتا' اور دوسری طرف اندھیرا ہوتا۔ لیکن جتنا بھی دین پھیلا ہے۔ بہرحال چہار طرف پھیلا ہے۔ کوئی ملک خالی نہیں جس میں اللہ کے نام لیوا موجود نہ ہوں۔

پھر اس کا وعدہ دیا گیا کہ ایک وقت آرہا ہے کہ پورے عالم میں یہی ایک دین ہو جائے گا ___ حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا :

لایبقٰی علٰی ظھر الارض بیت مدرٍ ولا وبرٍ الّا ادخلہ اللّٰہ کلمۃ الاسلام بعز عزیزٍ وبذلِ ذلیلٍ

روئے زمین پر کوئی کچا پکا گھر' نہ کوئی اینٹ پتھر کا گھرانہ اور کوئی کپڑے اور چمڑے کا خیمہ باقی نہیں رہے گا' جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہیں ہو جائے گا۔ رغبت سے ماننے یا مجبور ہو کر ماننے ___ جبر کے معنیٰ یہ نہیں کہ مسلمان گلے پر تلوار رکھیں گے کہ کلمہ قبول کرو۔ اس کی تو ممانعت ہے ___ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ دین میں کوئی اِکراہ (جبر) نہیں ___ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ اے پیغمبر! کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ وہ دین قبول کریں ___ ؟ تو دین جبری چیز نہیں۔ اس لئے اسلام میں اِکراہ جائز نہیں۔ پھر یہ بھی فرمایا گیا کہ بذلِ ذلیلٍ یعنی دنیا میں چہار طرف دھکے کھا کے اسلامی اصول مجبور کردیں گے کہ انہیں میں پناہ لی جائے۔ اس کے سوا پناہ گاہ کوئی نہیں۔ مجبور ہو کر اس کی طرف آئیں گے۔

اِسلامی اُصول کی عالمگیر صداقت

بادشاہوں میں عموماً گدی نشینی ہوتی۔ خاندانوں میں اس کی وراثت چلتی تھی۔ کئی کئی صدیوں تک ایک ہی خاندان حکومت کرتا تھا۔ آج بین الاقوامیت غالب آئی تو بادشاہتیں اور اس کی حکومتیں ختم ہونا شروع ہو گئیں۔ "اِنتخاب اصلح" کا اصول آیا کہ جو تم میں بہتر ہو اس کو امیر بناؤ۔ یہ الگ چیز ہے کہ بہتری کا معیار کیا تجویز کیا گیا۔

اسلام میں بہتری کا اصول یہ ہے کہ جو فاضل ہو' متقی ہو' متوجہ الی اللہ ہو۔ وہ اصلح ہے۔ جس کو خلیفہ کہتے ہیں ___ لوگوں نے کہا جو مالدار زیادہ ہو' یا کہا کہ جس کے ساتھ ووٹ زیادہ ہوں۔ یہ تو الگ چیز ہے' مگر "انتخاب اصلح" کا اصول رائج کرنا پڑا ___ جیسے کہ عُرفِ عام میں مشہور ہے کہ سب بادشاہتیں ختم ہو جائیں گی۔ بس دو بادشاہتیں باقی رہیں گی۔ ایک انگلستان کی اور ایک جو تاش میں بادشاہ ہوتا ہے۔ ___ انتخاب اصلح اسلامی اصول نہیں تو اور کیا ہے؟ انتخاب اصلح یعنی صالح ترین امیر مقرر کرو۔ اسلام نے یہ اصول دیا ہے۔ وہاں نہ خاندانیت تھی' نہ قبائلیت تھی۔ باقی چاہے وہ اتفاق سے خاندانی بھی ہو جائے تو اس کا مضائقہ نہیں'

خاندان کی بالکل نفی نہیں، کہ اچھے خاندان کی طرف جانا ہی نہیں۔ اگر خاندان میں ہی کوئی اصلح پیدا ہو جائے کوئی صالح ترین فرد ہو تو سبحان اللہ۔ دونوں باتیں حاصل ہو جائیں گی۔ مگر مقصودِ اصلی یہ ہے کہ امیر صالح اور مصلح ہو۔ بہرحال انتخاب ہوا۔ تو انتخاب اصلح کا اصول آیا۔ آج لوگ انتخاب کرنے پر مجبور ہیں۔ انہیں اس کے علاوہ کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ ایک سلسلہ چل پڑا۔

اسی طرح وراثت کا قصہ ہے۔ بہت سی اقوام میں بیٹیوں کو وراثت نہیں ملتی تھی اسلام نے بیٹے اور بیٹیوں کا حق رکھا۔ البتہ فرقِ مراتب ضرور قائم رکھے۔ مگر جس طرح بیٹا، باپ کا وارث ہے، بیٹی بھی وارث ہوگی ___ بعض اقوام میں بیٹیوں کی بالکل وراثت نہیں تھی۔ ہندوستان میں بعض قوموں کی عورتوں نے ایجی ٹیشن برپا کیا۔ اور اسمبلی کے اردگرد انہوں نے دھاوا بولا کہ جس باپ کی اولاد لڑکے ہیں اسی کی ہم ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہمیں میراث نہ ملے۔ بالکل مجبور ہو کر گورنمنٹ کو قانون بنانا پڑا، اور وراثت میں ان کو حصہ دار بنایا۔ اس قانون کے بنانے میں آکر اقوام نے کدھر رجوع کیا۔ ان کے ہاں تو کچھ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ انہوں نے اسلامی فقہ کو لے کر اپنے الفاظ میں ادا کر دیا۔ اور کیا کہا جائے گا ___ ؟ تو لوگ اسلام کا نام نہیں لیتے مگر اس کے اصول اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

کے ایم منشی جو یو۔ پی کا گورنر تھا۔ اس نے ایک جلسہ میں اپنا پیغام بھجوایا۔ میں بھی اس جلسہ میں لکھنؤ میں موجود تھا۔ اس کو جلسہ میں شرکت کی دعوت دی گئی تو اس نے معذرت کی کہ حکومت کے کام بہت پڑے ہوئے ہیں میں نہیں آسکتا۔ میں اپنے بجائے اپنا پیغام بھیجتا ہوں ___ سیرت کا جلسہ تھا۔ وہ پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔ اس کے دو جز تھے۔

پہلا جز یہ تھا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مناقب اور فضائل اس نے بیان کئے اور ایسے بیان کئے کہ شاید کوئی مسلمان بھی اتنا نہ بیان کرے۔ اس نے کہا، دنیا میں اگر کوئی ہستی ایسی ہے جس کی زندگی پر انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں، وہ سوائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسری نہیں۔ کامل اور مکمل ہستی ایک ہی پیدا ہوئی۔ یہ تو ابتدائی جز تھا۔

دوسرا جز یہ تھا کہ ہم نے ہندوستان کا قانون اسلامی اُصولوں پر بنایا ہے ہم نے عدل قائم رکھا۔ مساوات قائم رکھی۔ اقوام کے حقوق برابر رکھے ___ یہ الگ بات ہے کہ ان حقوق کو چور اور ڈاکو مارنے لگیں۔ اور نہ پہچانیں۔ مگر قانون میں حقوق برابر رکھے گئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے ہاں اس قسم کے اصول نہیں تھے، مجبور ہو کر اسلام کی طرف رجوع ہوئے اور وہاں سے اصول لئے۔

صحابہ کرامؓ ___ غیر مسلم اقوام

ہندوستان میں جب کانگریس کی عارضی حکومت قائم ہوئی تھی، تو گاندھی نے کہا تھا کہ :

"ہمارے وزراء اگر عالمی وقار چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ چھوت چھات کو ختم کریں، نسلی امتیازات کو ختم کریں، اونچ نیچ ختم کریں، اور صدیقؓ وفاروقؓ کا نمونہ اختیار کریں"۔

گاندھی کی قوم نے بُرا مانا اور کہا کہ آپ کو صدیقؓ وفاروقؓ ہی کا نمونہ ملتا ہے۔ اس نے کہا :

"بھئی! کسی قوم میں تم نمونہ بتا دو۔ جب نہیں ملا تو اب میں کس کا نام لوں یہ ساری

مثالیں انہوں نے ہی قائم کی ہیں کہ حکومت بھی قائم اور درویشی بھی قائم۔ دبدبہ بھی قائم اور ساتھ میں پیوندوں کی چادریں بھی قائم' اور زہد و قناعت بھی قائم۔ تم کوئی حکومتیں مثال میں بتلادو کہ نظامِ عالم بھی قائم ہے اور سارے درویش کے درویش ہیں"۔

خلفائے راشدینؓ نے کوئی سونے چاندی کے محل نہیں قائم کرائے۔ یہی سادہ زندگی جو عوام النّاس کی تھی۔ وہی زندگی ان کی تھی۔ مگر پورے عالم میں دین حق کا ایک دبدبہ پھیلا دیا۔ تو قوم نے بُرا مانا کہ تمہیں یہی نمونہ ملتا ہے۔ اس نے کہا جب نمونہ نہیں ہے تو میں کسے پیش کروں۔ تم بُرا مانو یا بھلا۔ بہرحال مطلب یہ ہے کہ لوگ اسلام کی طرف جھکیں گے۔ مسلمان ان کے گلے پر کوئی تلوار نہیں رکھیں گے کہ اسلام قبول کرو۔ اصول مجبور کریں گے کہ اسلام کی طرف آؤ۔ زمانہ مجبور کرے گا۔ دوسری طرف پناہ نہیں ملے گی۔ انہیں اصول میں پناہ ملے گی۔ اس لئے یہ فطری اصول ہیں' تو لامحالہ مجبور ہوں گے۔

فیضانِ نبوّت کا پورے عالم پھیل جانا

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ دیا۔ فرمایا :

لایبقٰی علی ظھر الارض بیت مدرٍ ولا وبرٍ الخ

روئے زمین پر کوئی کچا پکا گھرانہ نہیں رہے گا مگر اس میں اسلام کا کلمہ داخل ہو جائے گا۔ **فَیَکُوْنُ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ** ـــ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہٗ فرماتے ہیں کہ پھر پورے عالم میں ایک دین ہو جائے گا۔

بعض حضرات شُرّاح فرماتے ہیں کہ یہ کلمہ (فیکون الدین کلہٗ للّٰہ) حدیث کا جز ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہٗ کا مقولہ ہے مگر بہرحال مقولہ حق ہے کہ جب روئے زمین کے ہر گھر میں اسلام کا کلمہ داخل ہو جائے گا تو پورے عالم میں دین واحد ہو جائے گا۔

یہ مکّہ کی آواز تھی۔ سارے عالم میں پھیلنی چاہئے تھی۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرّر کر دیا ہے ـــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی وہ آواز مرکز سے چہار طرف پھیلی۔ اور اس کی تکمیل ہوئی تھی۔ مگر وہ تکمیل کیفیت کے لحاظ سے تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لاکھ چوبیس ہزار وہ افراد تیار فرمادیئے' جو نبی تو نہیں تھے' مگر آثارِ نبوّت سب کے اندر موجود تھے۔ **علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل** ـــ وہ انبیاء علیہم السلام تو نہیں تھے' مگر حضراتِ خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ نے کام وہ کئے جو انبیاء علیہم السلام کرتے ہیں۔ جو جس خطّے میں پہنچ گیا اس خطّے کو ایمان و علم اور نور سے رنگ دیا ـــ صحابہؓ کی شان تو بڑی ہے۔ ائمہ مجتہدین میں سے جو جہاں بیٹھ گیا۔ اس نے اس خطّے کو علم و معرفت اور ایمان سے رنگ دیا ـــ امام ابو حنیفہؒ خراسان میں تھے۔ ان کا مذہب پھیلا تو خراسان' ہندوستان' افغانستان میں حنفیت ہے' اس راستے سے کروڑوں آدمی جنت میں پہنچ گئے۔ امام شافعیؒ کا ابتدائی قیام حجاز میں تھا' اور وفات کے وقت مصر میں قیام تھا۔ تو مصر و حجاز میں اکثریت شوافع کی ہے۔ غرض جو امام جہاں بیٹھ گیا اس نے علم و تفقّہ اور کمالاتِ دینی سے اس خطّہ کو رنگ دیا۔ تو یہ حضرات انبیاء نہیں تھے' لیکن کام وہ کیا جو نبیوں کا کام تھا۔ ایک نبی آیا تو علاقہ کو ایمان سے بھر دیا۔ اس امّت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خُدّام میں ایسے افراد پیدا ہوئے کہ کارہائے نبوّت انجام دیئے۔ طاقت ایک ہی نبوّت کی تھی اور وہ ہے ختمِ نبوّت اس کے نیچے آکر علماء نے کام کیا۔ فیضان ایک نبوّت کا ہے۔ اس کے تحت میں علوم و کمالات دنیا میں پھیلے اور پھیلتے رہیں گے۔ تو عہدِ نبوّت

میں دین مکمل ہوا اور چہار طرف پھیلا۔ مگر کیفیت کے لحاظ سے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار وہ نمونے تیار ہو گئے کہ شاید ہر صحابی کسی ایک نبی کی نسبت کے اوپر ہے۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات جامع النسب ہے' اور آپ کی تربیت سے وہ آگے پھیلیں۔ تو کیفیت کے لحاظ سے دین مکمل ہو گیا۔ مگر آواز مرکز اور مکہ کی تھی' اسے سارے عالم میں پھیلنا تھا۔ تو دَورِ عیسوی میں اور دَورِ مہدوی میں جو کہ آخری مجدد ہوں گے۔ اس وقت فرمایا گیا کہ فیکون الدین کلہٗ للّٰہ پورے عالم میں دین واحد ہو جائے گا۔ اسلام واحد کے سوا کوئی دین باقی نہیں رہے گا اور اسلام سارے عالم میں پھیل جائے گا۔ تو کمیّت کے لحاظ سے اخیر میں تکمیل ہو گی۔ کیفیت کے لحاظ سے پہلے تکمیل ہو چکی ہے۔ تو مکہ کی آواز جو مرکز سے اٹھی تھی بے اثر نہیں جا سکتی تھی۔ کیفاً بھی پہنچ گئی' کمّاً بھی پہنچ گئی۔ اور جب کمیّت کے لحاظ سے پورے عالم میں دین واحد ہو گیا۔ تو مقصدِ دنیا پورا ہو گیا کہ عبادت کا کارخانہ مکمل ہو چکا' اس کے بعد پھر قیامت کا دَور ہے۔ تو یہ عالم ختم کر دیا جائے گا۔

میرے عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز مکہ سے اٹھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ خیر و برکت کے بعد پوری امّت آپؐ کی قائم مقام ہے تو اس امّت کا فرض بھی یہ ہے کہ اس آواز کو آگے بڑھائے' اور مرکز سے چلائے۔

بینُ الاقوامی تبلیغ گاہ مرکزِ عالَم میں ہونی چاہئے

تقریباً اُنچاس برس کا عرصہ ہوا ہے جب پہلی دفعہ یہاں (کعبہ مکرّم میں) میری حاضری ہوئی ہے۔ اس وقت مَلِک عبدالعزیز ابن سعود مرحوم' زندہ تھے۔ اور ان کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تھا کہ مطاف میں ان پر کسی نے حملہ کیا' اللہ نے ان کو بچالیا' تو ہندوستانی زعماء کی طرف سے مبارک بادی کا جلسہ منعقد کیا گیا کہ مَلِک کو مبارک بادیں کہ اللہ نے آپ کی حفاظت کی' اور آپ کو محفوظ رکھا۔ فندق مکہ میں یہ جلسہ ہوا۔ اور تقریباً تین چار سو کے قریب حضرات' جن میں علماء' زعماء' تُجّار اور اُمراء سب جمع تھے۔ اس حج کو لوگ حجّ العظماء کہا کرتے تھے۔ یعنی ہر ملک کے بڑے بڑے لوگ اس حج میں شریک ہوئے ___ خیر وہاں جلسہ ہوا' تقریریں ہوئیں' تجویز پاس ہوئی' اور ایک وفد گیارہ آدمی کا تیار کیا گیا' جس میں مفتی نعیم صاحب مرحوم لدھیانوی' حافظ ہدایت حسین صاحب کانپوری' مولانا آزاد سبحانی مرحوم گیارہ آدمی تھے اور مجھے رئیس الوفد بنا دیا۔ کہ یہ لے جا کر مَلِک کی خدمت میں تجاویز پیش کریں کہ کل جلسہ ہوا تھا' یہ اس کی کارروائی ہے۔ مَلِک نے اجازت مرحمت فرمائی' اور بہت ہی توقیر کی ___ انہوں نے یہ فرمایا کہ وہ جو گیسٹ ہاؤس' مہمانوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے' وہاں علماء کو نہ بٹھایا جائے' اس لئے کہ وہاں میں آؤں گا۔ تو علماء میری تعظیم کو کھڑے ہوں گے' میں چاہتا ہوں کہ خود ان کی تعظیم کروں' وہ میری تعظیم کو کھڑے نہ ہوں۔ محل میں جو ان کا اپنا کمرہ تھا' اس میں بلوایا' تاکہ جب علماء آئیں تو میں تخت سے اُتر کر ان کی تعظیم کروں' چنانچہ ہم اندر پہنچے اور مَلِک اپنے شہ نشین سے اُترے اور انہوں نے ہر ایک سے مصافحہ کیا' اپنا تعارف کرایا' خیر یہ کارروائی ہوتی رہی۔ اس کے بعد آخیر میں میں نے تجویز پیش کی کہ :

> "اس وقت کوئی عیسائی حکومت ایسی نہیں' جس کے ہاں تبلیغی مشن نہ ہو۔ امریکہ' انگلستان اور فرانس کی حکومتیں کروڑوں روپے اس پر خرچ کر رہی ہیں۔ اور جگہ جگہ ملکوں میں تبلیغی مشن کے افراد پہنچے ہوئے ہیں۔ اگر حکومت حجاز اس قسم کا اقدام کرے۔ اور اسلامی تبلیغ کے لئے یہاں سے وفود روانہ کرے' تو سارے مسلمانوں کے

لئے ایک عزت افزائی کا سامان ہوگا' حکومت کی محبت بھی دلوں میں قائم ہوگی ___ اور اس آواز میں بھی اثر ہوگا ___ اور ہندوستان ___ جب وفد آئے گا ___ میں نے عرض کیا ___ سارے علماء اس کی حمایت اور اس کے تعاون کے لئے کھڑے ہو جائیں گے' جہاں جہاں آپ وفد بھیجیں گے"۔

یہ ہم نے تجویز پیش کی۔ ملک نے اس کو بہت پسند فرمایا' اور فرمایا کہ بالکل مناسب تجویز ہے۔ مگر یہ کہا کہ بھی اس کا وقت نہیں۔ اس لئے کہ مثلاً برطانوی حکومت ہے' ہم اسلامی تبلیغ کے لئے وفد بھیجیں گے۔ وہ ہیں گے اس میں کوئی سیاسی چال ہے' تو تبلیغ تو ایک طرف رہ جائے گی' اور سیاسی قصے آجائیں گے۔ پھر اس ں کہیں شکوک و شبہات اور فتنے نہ کھڑے ہو جائیں۔ مگر تجویز معقول ہے' وقت آرہا ہے اس کے اوپر عمل ر آمد ہوگا۔ وقت کا انتظار کیا جائے گا۔

ممکن ہے یہ چیز عمل میں بھی آجائے۔ کچھ سننے میں آبھی رہا ہے کہ یہ تجویز عمل میں آرہی ہے۔ بہرحال ہ حکومت کا قصہ ہے' جس طرح حکومت نے حج کے سلسلے میں احسانات کئے ہیں۔ حرم شریف کی توسیع کی' حج کے انتظامات کئے۔ اس میں یہ بھی ایک چیز ہے کہ دین کی تبلیغ اور اشاعت کی طرف متوجہ ہو۔ مگر بہرحال جب نک حکومت متوجہ نہ ہو۔ اس وقت تک علماء کا کام ہے کہ وہ اپنے طور پر اس کو چلائیں' تو اگر اس کو مرکز بنایا بائے ___ اور الحمد للہ ہماری تبلیغی جماعتوں نے اس کو مرکز بنالیا ہے ___ بہت سے افراد ہیں' جو ہجرت کرکے یہاں آگئے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور کام جاری ہے۔ دیہات تک میں کام پھیلا دیا ہے۔ باقی وہ احق تھے اس کے کہ یہ کام پھیلاتے۔ یہ کام اس کا مستحق تھا کہ یہ کام یہیں سے جاری و۔ برکت اور وسعت کا اس میں اثر ہے۔ مکہ کے لوگ جب باہر ملکوں میں پہنچیں گے تو کہا جائے گا کہ یہ تبلیغ کے لئے آئے ہیں۔ تو قلوب پر کتنا اچھا اثر پڑے گا۔ جو جماعتیں پہنچتی ہیں اس میں عرب ہوتے ہیں۔ تو ندوستان والے اس سے اثر قبول کرتے ہیں۔ اور ان کے دلوں میں ایک نیت پیدا ہوتی ہے کہ بھئی جب رب تک تبلیغ کرنے آگئے تو ہم ہی بیٹھے ہیں' ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم بھی تبلیغ کریں۔ اس کا اثر پڑتا ہے۔

بہرحال تبلیغی جماعت نے یہاں بھی اور دنیا کے ہر ملک میں بحمد اللہ مرکز قائم کئے۔ حجاز میں بھی مرکز قائم ہے' مدینہ و مکہ میں بھی ہیں' اور یہاں سے مضافات میں بھی جماعتیں جاتی ہیں۔ اور بہت سے لوگوں کے اندر یہ سلسلہ پھیل گیا۔ تو واقعی مکہ ہی اس کا احق تھا کہ یہیں سے آواز اٹھتی۔

شام مرکزِ سیاست ہے

آج مکہ مکرمہ جیسے بین الاقوامی عبادت گاہ ہے' اور بین الاقوامی تجارت گاہ بھی بن گیا۔ دنیا کے ہر ملک کی چیز یہاں ملتی ہے اور کہیں ملے نہ ملے۔ تو بین الاقوامی تبلیغ گاہ بھی یہاں ہونی چاہیے۔ یہیں سے اللہ کے دین کا کلمہ بلند ہو اور چلے۔ اور آثار و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آخیر دور میں عرب بھی کھڑے ہوں گے۔

انہی کے ہاتھوں پر قوت و شوکت کے ساتھ یہ چیز آگے بڑھے گی۔ اور باطل قوتیں بھی انہی کے ہاتھوں ٹوٹیں گی۔ بہرحال مہدی ہیں وہ بھی عربی ہیں' اور حسنی ہوں گے۔ ان کے زمانے میں مغرب کی قوتیں ٹوٹیں گی۔ بیعت بھی انہی کے ہاتھ پر مکہ ہی میں ہوگی۔ اور شام کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنائیں گے۔ اس لئے کہ وہ مرکزِ سیاستِ اسلام ہے۔ حجاز مرکزِ عبادت بتایا گیا ___ عبادت کے لئے امن کی ضرورت ہے۔ فتنہ ہوتا ہے تو آدمی نہ تلاوت کر سکے نہ ذکر کر سکے۔ عبادت کے لئے سکون ضروری ہے۔ جب اللہ نے اس کو مرکزِ عبادت

بنایا تو آمن کا بھی مرکز بنایا۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ___ اور.... أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ۔

پھر اس کو آمن گاہ بھی عالمی بنایا۔ اس لئے کہ یہ عبادت گاہ تھی' اور عبادت فتنوں کے اندر نہیں ہو سکتی۔ یہاں جانوں اور درختوں تک کو پناہ ہے' بلکہ یہاں تک کہ گھاس بھی نہیں کاٹی جا سکتی ___ یہاں کے پتھر وغیرہ ہیں' ان کے بارے میں یہ پسندیدہ نہیں سمجھا گیا کہ آدمی لے جائے۔ کیونکہ یہاں آمن ہے۔ مُحرِم کے لئے شکار تک ممنوع ہے۔ تو جانوں کو بھی پناہ' مال کو بھی پناہ۔ یعنی آمنِ کامل جب اتنا آمن ہے' جبھی عبادت کا کارخانہ یہاں چل سکتا ہے۔

اور سیاست کے لئے تعلقات' روابط' جوڑ توڑ اور اونچ نیچ کی ضرورت ہے اگر وہ یہاں ہوتی تو عبادت کی خیر سَلّا ہو جاتی ___ اسلام نے شام کو مرکزِ سیاست قرار دیا ہے' حجاز مرکزِ عبادت ہے' اصلِ اُصول وہی ہے۔ لیکن جب جنگ کرنی' فوجیں بھیجنی ہوں تو وہ شام سے ہو ___ تو شام کو مرکزِ سیاست قرار دیا۔

مصر مرکزِ عسکریت ہے

اور مصر کو مرکزِ عسکریت قرار دیا' کہ وہاں فوجی قوت جمع رکھو۔ شام اور حجاز کو مہاجر بنایا۔ کوئی ہجرت کرے تو شام میں اور حجاز میں کرے۔ مصر کو ہجرت گاہ نہیں بنایا وہ فوجی چھاؤنی ہے۔ اس لئے کہ فوج میں جو لوگ بھرتی ہوتے ہیں وہ ہجرت کر کے وطن چھوڑ کے تھوڑا ہی جاتے ہیں۔ وہ تو طاقت کو فراہم کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ کہ مصر کو فوجی طاقت بناؤ اور لوگ مدد پہنچائیں' مگر ہجرتیں کر کے وہاں نہ جائیں۔ طاقت ان کے وہاں پہنچتی رہے۔

اس لئے کہ مصر در حقیقت ایشیا کا دھانہ ہے یورپ کے لئے۔ اور ایشیاء کے لئے یورپ کا دھانہ مصر ہے' تو اِدھر کے لے اُدھر دھانہ اور اُدھر کے لئے اِدھر دہانہ۔ اس دھانے پر جو غالب ہو گا' اسی کے آثرات غالب ہوں گے۔ اگر ایشیا مصر پر غالب ہے' تو یورپ تک آثرات پہنچیں گے۔ اور اگر یورپ نہر سویز اور مصر پر غالب ہو گیا' تو پورے ایشیا پر یورپ کے آثرات پہنچیں گے۔ اس لئے احادیث سے اشارے ملتے ہیں کہ مصر کو قوت گاہ بناؤ' مرکزِ عسکریت قرار دو۔ شام کو مرکزِ سیاست قرار دو۔ یہاں آمن رہنا چاہیے۔ وہاں جنگیں ہوں' تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیت المقدس جنگوں کے بیچ میں رہا ہے۔ کبھی ہم غالب' کبھی یہودی غالب' کبھی نصرانی غالب' كلما نصبت حربٌ نصبت اخرىٰ ایک جنگ ختم ہوئی ہے' دوسری چھڑ جاتی ہے۔ وہ مرکزِ عبادت بنتا' تو عبادت کا کارخانہ کبھی نہ جم سکتا' رات دن جنگیں' جوڑ توڑ رہتا۔ تو عبادت کا مرکز حجاز کو قرار دیا۔ اسے آمن بخشا۔ سیاست کا مرکز شام کو قرار دیا۔ کہ یہاں لڑتے مرتے رہو' جو بھی غالب آ جائے۔

اسلام کی بقاء تبلیغ میں ہے

بہر حال دین کی تبلیغ یہ بھی آمن کی چیز ہے۔ بدامنی میں تبلیغ بھی مشکل ہوتی ہے جیسے نماز پڑھنی مشکل ___ تو یہ ملک (حجاز) زیادہ آحق ہے کہ یہ مرکزِ تبلیغ بنے۔ یہیں سے اللہ کے دین کا آوازہ اٹھے' جیسا کہ یہاں سے اٹھا ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ تبلیغی حضرات نے اس کو سمجھا ہے' اور کام چل رہا ہے۔ دیہات تک

ان کے تعلقات اور روابط ہیں۔ یہیں سے جماعتیں ہندوستان اور دوسری جگہ بھی جانے لگی ہیں۔ تو ہم سب کا فرض ہے کہ اس کام میں شرکت کر کے قوت پہنچائیں۔ اس لئے کہ اس کی قوت سے ہماری قوت ہے۔ اسلام کی قوت جو ہے وہ پھیلنے میں ہے سُکڑنے میں نہیں ہے۔ اگر اسلام کو آپ کسی کوزے میں بند کر کے رکھ دیں وہ پھیل نہ سکے۔ اسلام کی اصلیت ختم ہو جائے گی۔ اسلام میں جامعیت اور پھیلاؤ ہی ہے۔ وہ جبھی اپنی اصلی صورت میں رہے گا۔ جب کہ وہ دنیا کے اندر پھلتا رہے۔

لا اسلام اِلّا بجماعۃ ___ اس کے اندر جماعتی رنگ رہنا چاہئے۔ ___ اگر یہ تبلیغی دین نہ ہوتا، تو حجاز سے باہر نہ نکلتا، لیکن ساری دنیا میں پھیلا ہے، یہ تبلیغ ہی کی برکت ہے۔ اس لئے کہ جب یہ دین کا مرکز ہے تو تبلیغ کا مرکز بھی ہے۔ اس کے لئے یہاں کے لوگوں کو زیادہ آمادہ کیا جائے کہ یہ دینی تعلیم و تبلیغ کے لئے اور دعوت اِلی اللہ کے لئے اٹھیں۔

اس واسطے میں نے یہ چند باتیں عرض کیں کہ مکّہ کا اوّلِ عالَم ہونا اس کا مقتضی ہے کہ دین کے کاموں کی یہیں سے اوّلیت ہو۔ اس کا مرکزِ عالم ہونا اس کا مقتضی ہے کہ یہاں دین کی مرکزیت ہو۔ اس کا اصلِ عالم ہونا اس کا مقتضی ہے کہ یہیں سے چہار طرف آواز پھیلے گی۔

اس واسطے میں نے یہ چند چیزیں عرض کیں، اور محض تعمیلِ حکم کے لئے عرض کیں، ورنہ میں کچھ بیمار بھی ہوں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ مدینہ اور مکّہ میں ہماری جرأت تو بولنے کی ہوتی نہیں، اب زبردستی بڑے بلوائیں، تو الگ چیز ہے ___ مثل مشہور ہے کہ بڑا مارے بھی اور مار کر رونے بھی نہیں دیتا ___ حکم دیا کہ کرو تقریر، عذر بھی نہیں سنا جائے گا ___ اس لئے تعمیلِ حکم کے طور پر یہ چند باتیں عرض کیں۔ ورنہ کچھ علالت اور مقام کی ہیبت و عظمت کی وجہ سے نہ جرأت پڑتی ہے نہ ہمّت ہوتی ہے۔ یہ چند الفاظ بھی خود اپنی ہمّت سے نہیں کہے کہ میری ہمّت کام کر رہی ہو۔ ممکن ہے آپ حضرات کی ہمّت کام کر رہی ہو۔ ورنہ میں نے عرض کر دیا تھا۔ میرے میں جرأت نہیں۔ بہت سے لوگوں نے کہا کہ حرم شریف میں تقریر ہو جائے۔ میں نے کہا کہ تقریر کے بہت سے مواقع ہیں۔ حرم شریف ہماری تقریروں کے لئے نہیں ___ جو باعزم لوگ ہیں، تقریر کریں ___ ہم جیسے طالب علموں کے لئے مناسب نہیں۔ بہرحال تعمیلِ حکم کے طور پر یہ چند چیزیں عرض کیں تاکہ ایک تو مقامات کی برکت معلوم ہو جائے اور جو مقصد ہے کہ تبلیغ کا کام پھیلے اس کی طرف بھی کچھ اشارہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو بڑھائیں۔ اور ہم سب کو اس کام میں لگنے کی توفیق عطاء فرمادیں۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا
وَتُبْ عَلَیْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

(محرّم الحرام ۹۵ھ مدینہ منوّرہ مدرسہ عُلوم شرعیہ کی چھت پر حضرت اَقدس شیخ الحدیث مولانا محمّد زکریّا صاحب مدّظلّہ، مہاجر مدنی (سہارن پوری) کی زیرِ صدارت حُجّاج کرام کی بڑی تعداد سے یہ خطابِ عام فرمایا گیا)

سنتِ حضرت خلیل علیہ السلام

جس طرح کائنات کی ہر چیز میں ایک صورت ہے' اور ایک رُوح ہے۔ اسی طرح اَعمالِ شرعیہ میں بھی ایک رُوح ہے' اور جیسے وہاں ہر صُورت کی ایک خاص رُوح ہے جو دوسری صُورت میں نہیں آسکتی۔ اسی طرح یہاں ایک رُوح دوسرے میں نہیں آسکتی۔

اب سمجھئے کہ سارے اَعمالِ شرعیہ کا مقصُود تقویٰ ہے۔ مثلاً نماز سے عاجزی وانکساری کی صُورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ روزے میں تزکیۂ نفس کی صُورت میں جہاد میں شجاعت کی صُورت میں' صدقہ میں اِنفاقِ مال کی صُورت میں اور قربانی سے جاں نثاری کی صُورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔

اگر آپ نے قربانی کی بجائے نماز پڑھ لی' تو نماز سے عاجزی اور بندگی کا تقویٰ تو ملا۔ مگر قربانی (کی صورت میں حاصل ہونے والا تقویٰ) کا تو نہ ملا۔ پس اگر کوئی شخص قربانی نہ کرے اور صدقہ دے دے تو قیامت کے دن اس صدقہ کا ثواب مِل جائے گا۔ مگر قربانی کا مطالبہ باقی رہے گا۔ اور یہ سوال ہوگا کہ قربانی کیوں نہیں کی؟

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۔ اَمَّا بَعْدُ ۔

قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما عمل ابن ادم من عمل یوم النحر احب الی اللّٰہ من اھراق الدم وانہ لیاتی یوم القیٰمۃ بقرونھا واشعارھا واظلافھا وان الدم لیقع من اللّٰہ بمکان قبل ان یقع بالارض فطیبوا بھا نفسًا (ترمذی ابن ماجہ) اوکما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بقرعید کے دن انسان کے تمام نیک اعمال میں سے سب سے زیادہ پسندیدہ اور محبُوب عمل قربانی کا ہے اور یہ قربانی قیامت کے دن اپنے سینگ' بال اور کُھر کے ساتھ (صحیح سالم) آئے گی اور یقیناً (قربانی کا) خون زمین پر گرنے سے پہلے حق تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کا مقام حاصل کرلیتا ہے۔ سو قربانی خوشدلی سے کیا کرو"۔

تمہید

بزرگانِ محترم!

یہ حدیث جو اس وقت آپ کے سامنے تلاوت کی (اور جس کا ترجمہ بھی آپ کے معلوم ہو چکا ہے) احکامِ قربانی پر مشتمل ہے۔ جو اس وقت تقریر و جلسہ کا موضوع ہے' تقریر تو مختصر ہوگی۔ اس لئے کہ اوّل تو یہ مسئلہ جزئی ہے' اور جزئیات میں تفصیل نہیں ہوتی۔ کیونکہ بسط و تفصیل تو اُصول میں ہُوا کرتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ ایک عام مسئلہ ہے اور اس سے کوئی مسلمان بھی ایسا نہیں جو واقف نہ ہو۔ قربانی کا عمل کوئی سال کا عمل نہیں بلکہ صدیوں سے یہ عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس لئے بھی اس میں تفصیل کی ضرورت نہیں۔ تو نہ نفسِ مسئلہ میں تفصیل کی گنجائش' اس کے عام ہونے کی بنا پر نہ تفصیل کی ضرورت۔

اُصولِ ثلاثہ تکوینیہ

اُصولِ اوّل

مسئلہ کی شرح سے پہلے ایک اُصول سمجھ لیجئے' اور یہ اُصول جس طرح تکوینی ہے اسی طرح تشریعی بھی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ دو چیزوں سے مِلا کر بنایا ہے۔ ایک رُوح ایک جسم۔ یعنی ہر چیز کی ایک صُورت ہے' ایک اس کی حقیقت۔ ایک اس کی ہیئت اور ایک ماہیت۔ یا یوں کہیئے کہ ایک اس کا ظاہری حصّہ ہے اور ایک باطنی ___ غرض تمام انسان' کل حیوانات' نباتات' جمادات کی جہاں ایک صُورت ہے وہاں اس کی ایک حقیقت بھی ہے' ایک اس کا بدن اور ایک اسکی رُوح ہے۔ اور ہر بدن میں خُدا تعالیٰ نے اس کے مناسب رُوح ڈالی ہے۔ جب حق تعالیٰ کی توجّہ کائنات کی طاقتوں اور بدن بنانے کی طرف متوجّہ ہوئی تو یہی اُصول مدِّ نظر تھا۔

سب سے پہلے انسان ہی کو لیجئے کہ اوّل انسان کا بدن تیار کیا جاتا ہے جس کی ابتدا نطفہ یعنی ایک گندے قطرہ سے ہوئی۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہے :

> وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (مؤمنون پارہ ۱۸ع ۱)
>
> "یعنی ہم نے انسان کو مٹی کے خُلاصہ (یعنی گندے قطرے) سے بنایا۔ پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنا دیا۔ پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ پھر ہم نے اس کو ایک دوسری مخلوق بنا دیا۔ سو کیسی شان ہے اللہ کی جو تمام صنّاعوں سے بڑھ کر ہے"۔

تو رُوح ڈالنے سے پہلے ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے جس کی تیاری میں زمین کی قوّتیں بھی متوجّہ ہوتی ہیں آسمان کی بھی۔ آفتاب کی طاقتیں بھی متوجّہ ہوتی ہیں اور ہَواوں کی بھی۔ غرض جب کائنات کی ساری قوّتیں مِل کر ڈھانچہ تیار کر لیتی ہیں تو پھر اس میں رُوح ڈال دی جاتی ہے۔ یہی صُورت سارے جمادات اور نباتات اور حیوانات کی ہے۔

دوسرا اُصول

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اس کائنات کی کوئی چیز باقی نہیں رہ سکتی

جب تک بدن اور رُوح ملے ہوئے نہ ہوں۔ گویا بدن کی بقا رُوح پر موقوف ہے اور رُوح کی بقا بدن پر۔ اگر آپ نے بدن کو پھوڑ کر خستہ و خراب کردیا یا وہ خود ہی قدرتی طور پر خراب ہو گیا' اور اس میں سکت باقی نہ رہی تو پھر اس میں رُوح نہیں ٹھہرتی' بلکہ پرواز کر جاتی ہے۔ اس لئے کہ بدن ہی رُوح کو سنبھالے رکھتا ہے۔

غرض انسان میں جب تک رُوح ہے تو انسان ہے ورنہ لاشہ ہے جو بے کار ہے۔ پھر جس طرح مجموعہ بدن کے لئے مجموعہ رُوح ہے اسی طرح بدن کے ہر جُزء کے لئے ایک ایک رُوح ہے جو اسی کے ساتھ رہ سکتی ہے اگر اس جُزءکو ختم کردیا جائے تو یہ روح بھی نہ رہے گی۔ یہ نہ ہوگا کہ اگر ایک جزء کو ختم کردیں تو اس کی روح کسی دوسرے جزء میں پہنچ جائے۔ مثلاً آنکھ پھوڑ دی جائے تو یہ نہیں ہوتا کہ دیکھنے کی قوت ناک میں آجائے بلکہ یہ قوت ہی باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح ناک ہے اس میں سونگھنے کی قوت ہے وغیرہ۔

حاصل یہ کہ خُداوند تعالیٰ نے جس قدر قوٰی پیدا کئے ہیں ان میں رُوح اور قوت بھی ساتھ ساتھ پیدا کردی ہے اور یہ دونوں مل کر کائنات کا حصّہ بنتے ہیں۔ اگر دونوں کو الگ کردیا جائے تو اسی حقیقت کو "موت" کہتے ہیں اور اس علیحدگی سے کائنات کی تمام اشیاء ختم ہو جاتی ہیں۔ ایک دوسرا اُصول اور سمجھ لیجئے جو اسی سے متعلق ہے کہ بدن کے اندر جو قوتیں چھُپی ہوئی ہیں ان کی پہچان ان آبدان ہی کے ذریعے سے کی جاتی ہے۔ مثلاً قوتِ بینائی کی شناخت آنکھ سے کی جاتی ہے اور قوتِ سماعت کی کان سے غرض یہ صُورتیں ان قوتوں کے تعارف کا ایک ذریعہ ہیں اگر یہ صورتیں نہ ہو تو یہ تعارف ختم ہو جائے۔ اس اُصول کا حاصل یہ ہوا کہ "بدن رُوح کی پہچان کا ذریعہ ہے"۔

تیسرا اُصول

اب تیسرا اُصول اور سمجھ لیجئے کہ اگر آپ رُوح تک کوئی اثر پہنچانا چاہیں تو وہ بدن ہی کے ذریعے پہنچا سکتے ہیں۔ اس عالم میں براہ راست روح کو متاثر کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

مثلاً آپ روح پر گرمی کا عمل کرنا چاہیں تو بدن کو آگ کے سامنے لے جائیں گے جب پہلے بدن گرم ہو جائے گا' اس کے بعد رُوح کو گرمی پہنچے گی۔ اور اگر ٹھنڈک پہنچانا چاہیں تو آپ بدن پر پانی ڈالیں گے' یا اس پر برف ملیں گے یا وضو کریں گے وغیرہ۔ غرض ہر تاثیر کے لئے بدن ذریعہ ہے۔ بغیر بدن کے رُوح پر اثرات نہیں پہنچ سکتے۔

اُصولِ ثلاثہ تشریعیہ

تو اَب تین اُصول معلوم ہوئے کہ بدن سے تین کام لئے جاتے ہیں۔ رُوح کے قرار اور قیام کا۔ دوسرے رُوح کے تعارف اور پہچان کا۔ اور تیسرے تاثیر کا۔ اور یہ تینوں باتیں اس قدر ظاہر ہیں کہ ان پر کسی دلیل کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

اور یہ تینوں اُصول جس طرح تکوینی ہیں' اسی طرح تشریعی بھی ہیں۔ یعنی اعمالِ شرعیّہ میں بھی ایک صورت ہے اور ایک رُوح۔ اور بغیر صورت کے روح کا باقی رہنا ناممکن ہے اسی طرح اگر روح تک کوئی اثر پہنچانا چاہیں تو وہ صورت ہی کے ذریعہ پہنچ سکتا ہے اس کی مثالوں سے شریعت بھری پڑی ہے ___ مثال کے طور پر وضو ہی کو لیجئے کہ اس کی ایک صورت ہے اور ایک روح۔ اس کی صورت تو وہ خاص ہیئت اور افعال ہیں جو انسان وضو کرنے کے وقت اختیار کرتا ہے یعنی ایک خاص طرح بیٹھ کر اعضاء کا دھونا وغیرہ۔ اور یہی ہیئت اس کے تعارف کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ آپ وضو کر رہے ہوں تو ہر شخص آپ کو دیکھ کر پہچان لے گا کہ

آپ وضو کر رہے ہیں۔ کھانا نہیں کھا رہے کیونکہ کھانا کھانے والے کی ہیئت اور ہے یہ تو اس کی صورت ہے' اور ایک اس کی روح ہے۔ یعنی طہارت حاصل کرنا تاکہ انسان دربارِ الٰہی میں حاضری کے قابل ہو سکے اور ایک اس کی تاثیر ہے یعنی وہ خاص قسم کا انشراح جو انسان کے قلب میں وضو کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ تو یہ طہارت اور انشراح بغیر وضو کی صورت اختیار کئے کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتا اسی طرح غسل کی بھی ایک صورت ہے یعنی تمام جسم کو دھونا' اور ایک اس کی روح ہے یعنی طہارت اور صفائی اور اس کی تاثیر فرح وانبساط ہے اب اگر کوئی شخص تمام عمر غسل نہ کرے تو اس کو فرح وانبساط کی وہ خاص کیفیت کبھی بھی نصیب نہ ہوگی الغرض ہر چیز کی روح حاصل کرنے کے لئے اس کی صورت کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح آپ نماز کو لیجئے کہ اس کی صورت نیت باندھ کر کھڑا ہونا اور رکوع و سجود وغیرہ ادا کرنا ہے' اور اس کی روح خدا تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا ہے اور اپنی عبدیت وبندگی کا اظہار کرنا ہے' اگر آپ نماز کی ہیئت اختیار نہ کریں تو بندگی کی یہ خاص صورت کبھی بھی حاصل نہ ہوگی اس طرح زکوٰۃ اور روزہ وغیرہ عبادات ہیں کہ ہر ایک کی ایک روح اور ایک صورت ہے۔

محبوباتِ نفس کی قربانی

تو یہ جو "قربانی" ہے۔ اس کی بھی ایک صورت ہے اور ایک روح صورت تو جانور کا ذبح کرنا ہے اور اس کی حقیقت ایثارِ نفس کا جذبہ پیدا کرنا ہے اور تقربِ الی اللہ ہے تو ظاہر ہے کہ یہ روح بغیر جانور ذبح کئے کیسے حاصل ہو سکتی ہے کیونکہ یہ بات پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ ہر صورت میں اس کے مطابق روح ڈالی جاتی ہے نماز میں نماز کی روح، زکوٰۃ میں زکوٰۃ کی روح اور قربانی میں قربانی کی روح ڈالی جاتی ہے غرض اللہ تعالیٰ نے اس کی جو صورت مقرر کر دی ہے وہی اختیار کرنا پڑے گی تب وہ روح اس میں ڈالی جائے گی اگر وہ کسی چیز کی قربانی طلب کریں تو قربانی دینی ہوگی۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ

"یعنی تم خیر کامل کبھی حاصل نہ کر سکو گے یعنی اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے"۔

اور مال محبوب چیز ہے۔ مال میں سے بھی جانور زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ کیونکہ جاندار ہونے کی وجہ سے اس سے زیادہ محبت ہوتی ہے اس لئے کہ اگر کوئی بے جان چیز ضائع ہو جائے تو آدمی دوسری گھڑ کر بنا سکتا ہے بخلاف جاندار کے اگر فنا ہو گیا تو دوسرا نہیں ملتا اور یہ مال تو ایسی چیز ہے کہ فنا ہو کر ہی نفع پہنچاتا ہے اگر کسی کے پاس ایک کروڑ روپیہ رکھا ہوا ہو تو وہ بے کار ہے' اس سے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس کو خرچ نہ کرے تو جب دنیوی منافع اس کو خرچ کئے بغیر نہیں مل سکتے تو "رضاءِ حق" جو اعلیٰ ترین نفع ہے وہ محبوبات قربان کئے بغیر کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟

اور محبوبات کیا ہیں؟ جان' مال' اولاد' عزت آبرو وغیرہ۔

چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

"یعنی بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی جانوں اور مال کو جنت کے بدلے میں خرید لیا"۔

غرض آپ کو ان میں سے ہر چیز لٹانی ہوگی۔ کیسی بندگی کا اظہار ہوگا۔ درحقیقت جنت تو ایمان کے بدلے

میں ملے گی اور اعمال تو ایمان کی شناخت کا ذریعہ ہیں۔ جیسے اگر سونا خریدا جائے تو اس کو کسوٹی پر گھسا کر دیکھا جاتا ہے اگر کھرا ہے تو اس کی قیمت ادا کرتے ہیں، ورنہ نہیں تو اس جگہ قیمت سونے کی ہوتی ہے، لکیروں کی نہیں جو کسوٹی پر پڑ جاتی ہیں۔

بس اس طرح آخرت کے بازار میں جنت کے عوض ایمان کی قیمت ادا کرنا ہوگی اور یہ ہمارے اعمال ان لکیروں کی طرح ہمارے ایمان کی پختگی کی علامت ہیں اس لئے جنت حاصل کرنے کی غرض سے ہمیں "محبوباتِ نفس" کو قربان کرنا لازمی ہے اگر مال خرچ کرنے کا حکم ہو تو مال خرچ کرو، جان دینے کا حکم ہو تو جان نثار کرو، عزت کی ضرورت ہو تو وہ بھی قربان کرو۔ یہی عشق کی پختگی کی علامت ہے۔

ایک صحابی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ___ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے آپ سے محبت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوچ کر کہو کیا کہتے ہو؟ انہوں نے پھر یہ ہی عرض کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی فرمایا کہ سوچ کر کہو کیا کہتے ہو؟ انہوں نے تیسری بار بھی یہی عرض کیا کہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مصیبتیں جھیلنے کو فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے کو، اور آفتیں جھیلنے کو تیار ہو جاؤ ___ اور ظاہر بات ہے کہ عاشق اپنی محبت کا ثبوت اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک مصیبتیں نہ جھیلے۔ اسی لئے ارشاد ہے:

الٓمّٓ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ۝

"یعنی کیا لوگوں کا خیال ہے کہ محض "اٰمَنَّا" کہنے سے ان کا چھٹکارا ہو جائے گا اور ان کی آزمائش نہ ہوگی ___ حالانکہ ہم نے آزمایا ان سے پہلے لوگوں کو پس ضرور معلوم کرلے گا اللہ تعالیٰ سچے لوگوں کو، اور ضرور معلوم کرلے گا جھوٹوں کو"۔

روحِ قربانی اور شبہ کا جواب

غرض اصل بیان یہ تھا کہ جس طرح اعمال کی روح ضروری ہے اسی طرح ان کی صورت بھی مطلوب ہے اس لئے کہ دنیا میں صورت اصل ہے اور روح اس کے تابع۔ اور آخرت میں معاملہ برعکس ہوگا، روح اصل ہوگی اور صورت تابع ___ تو اب یہ بات واضح ہوگئی کہ دنیا میں جس طرح ہر چیز کی روح کی بقا کے لئے صورت کی ضرورت ہے اسی طرح اعمال شرعیہ کی روح کی بقا کے لئے انکے جسم و صورت کی ضرورت ہے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ اعمال میں تو اصل روح ہے اس لئے روح کو لے لو اور صورت کو چھوڑ دو تو اس کو چاہئے کہ یہ عمل پہلے اپنے اوپر جاری کرے کہ اپنے بدن کو ختم کردے اور خودکشی کرے کہ بس میں تو روح کو باقی رکھوں گا لیکن اگر خود بغیر صورت کے نہیں رہ سکتے تو پھر اعمالِ شرعیہ میں یہ عملِ جراحی کیوں کیا جاتا ہے؟

جیسا کے شروع میں معلوم ہو چکا کہ کائنات میں جس طرح مجموعہ بدن کے لئے مجموعہ روح ہے اسی طرح ہر ہر چیز کی علیحدہ علیحدہ روح بھی ہے۔ جیسے آنکھ میں بینائی کی قوت ایک روح ہے وغیرہ ___ اسی طرح سارے اعمال کا نام "تقویٰ" ہے۔ چنانچہ قربانی کے متعلق ارشاد ہے:

لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (الحج پارہ ۱۷)

"یعنی اللہ تعالیٰ کو قربانی کا گوشت نہیں پہنچتا لیکن تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے"۔

تو قربانی کی روح بھی تقویٰ ہے سو اگر کوئی یہ کہے کہ جب قربانی سے تقویٰ مقصود ہے تو قربانی کرنے کی کیا ضرورت ہے بلکہ تقویٰ اختیار کرلو کافی ہو جائے گا اس کا مطلب یہ ہو گا کہ پھر سارے اسلام کو چھوڑ کر بس تقویٰ ہی اختیار کرلو کیونکہ روزہ کے متعلق ارشاد ہے :

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (بقرہ پارہ ۲ ع ۲۳)

"تم پر روزوں کا حکم ہوا جیسے تم سے اگلے لوگوں پر حکم ہوا تھا۔ شاید کے تم پرہیز گار ہو جاؤ"۔

تو روزہ کا حاصل بھی تقویٰ ہے ___ نماز کے متعلق ارشاد باری ہے کہ :

إِنَّ الصَّلَوٰةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ (عنکبوت پارہ ۲۱ ع ۵)

"نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے"۔

جس کا حاصل تقویٰ ہے۔ لہذا نماز اور روزہ بھی چھوڑیئے۔ پھر ارشاد ہے کہ :

لَيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (بقرہ پارہ ۲ ع ۲۲)

"مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرلینا نیکی نہیں ہاں نیکی یہ ہے کہ جو اللہ اور قیامت کے دن اور ملائکہ اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے۔ اس کی محبت پر مال دے رشتہ داروں کو' یتیموں' مسکینوں' مسافروں' سوالیوں کو' اور گردنیں چھڑانے میں۔ اور نماز قائم کرے' اور زکوٰۃ دے۔ اور جو لوگ اپنے عہد پورے کریں۔ یہی لوگ سچے ہیں۔ اور یہی متقی ہیں"۔

لیجئے سارے اسلام کا حاصل تقویٰ نکلا اس لئے سب کچھ چھوڑ کر بس تقویٰ اختیار کرلیجئے ___ لیکن یہ بالکل غلط ہے اس لئے کہ ہر ہر چیز کی روح علیحدہ ہے اسی طرح ہر عبادت کا تقویٰ جداگانہ ہے تو جو تقویٰ گوشت پوست کے ذریعہ پہنچتا ہے اور حاصل ہوتا ہے وہ کسی دوسری عبادت' صدقہ وغیرہ سے کیسے حاصل ہو سکتا ہے مثلاً زید کی روح کو گدھے کے قالب میں اگر منتقل کردیا جائے تب بھی وہ زید نہ بنے گا بلکہ گدھا ہی رہے گا اسی طرح صدقہ' صدقہ ہی رہے گا قربانی کا قائم مقام اسے کیسے کہا جاسکتا ہے تو دنیا میں چونکہ بغیر صورت چارہ نہیں اس لئے قربانی کرنی ہی پڑے گی ہاں آخرت میں پہنچ کر آپ قربانی نہ کریں کیونکہ وہاں صورتیں ضروری نہیں لیکن اگر آپ نے دنیا میں اعمال کی صورت کو ترک کردیا تو یقین رکھیئے کہ آپ نے اس کی روح کو بھی فنا کردیا۔ اسی لئے نبی کریم علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ :

الايمان سر والاسلام علانية۔

"ایمان پوشیدہ چیز ہے اور اسلام ظاہر"۔

اور چونکہ قربانی کا قائم مقام صدقہ یا کوئی عبادت نہیں ہو سکتی۔ اسلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

ہے :

ما عمل ابن ادم من عمل یوم النحر احب الی اللہ من اھراق الدم۔

"بقرعید کے روز سب سے زیادہ محبوب عمل قربانی ہی ہے"۔

تو اس روز سوائے اس عمل کے دوسرا عمل کیسے اس کا قائم مقام ہو سکتا ہے اور حدیث شریف میں ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا :

یا رسول اللہ ماھذہ الاضاحی۔

"یا رسول اللہ یہ قربانیاں کیا ہیں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

سنۃ ابیکم ابراھیم

"تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے"۔

صحابہؓ نے استفسار کیا کہ :

فما لنا فیھا یا رسول اللہ

"یا رسول اللہ اس میں ہمارا کیا نفع ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

کل شعرۃ حسنۃ

"قربانی کے ہر بال پر ایک نیکی ملے گی"۔

تو یہ اجر و ثواب صدقہ وغیرہ پر کیسے مرتّب ہو سکتا ہے؟ کیونکہ صدقہ میں بال کہاں ہیں تو بات دراصل وہی ہے کہ ہر صورت میں اس کے مطابق روح ڈالی جاتی ہے۔

قربانی کی حقیقت

اصل میں قربانی کی حقیقت تو یہ تھی کہ عاشق خود اپنی جان کو اللہ تعالٰی کے حضور میں پیش کرتا مگر اللہ تعالٰی کی رحمت دیکھئے ان کو یہ گوارہ نہ ہوا اس لئے حکم دیا تم جانور ذبح کردو ہم یہی سمجھیں گے کہ تم نے خود اپنے آپ کو قربان کردیا ___ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالٰی کی طرف سے خواب کے ذریعہ بشارت دی گئی کہ آپ اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیل (علیہ السلام) کی قربانی پیش کریں اب دیکھئے کہ یہ حکم اوّل تو اولاد کے بارہ میں دیا گیا اور اولاد بھی کیسی ' فرزند اور فرزند بھی ناخلف نہیں بلکہ نبی معصوم ___ ایسے بچے کو قربان کرنا بڑا مشکل کام ہے مگر حکم خداوندی کے سامنے سر جھکادیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے کر منٰی کے منحر میں تشریف لائے اور فرمایا بیٹا ___ مجھے اللہ تعالٰی نے حکم دیا ہے کہ میں تجھ کو ذبح کروں ___ تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فوراً فرمایا :

افعل ما تؤمر

"جو آپ کو حکم ہوا ہے ضرور کیجئے"۔

اگر میری جان کی ان کو ضرورت ہے تو ایک جان کیا؟ اگر ہزار جانیں بھی ہوں تو نثار ہیں۔ چنانچہ حضرت

ابراہیم علیہ السلام نے رسیوں سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھے چھری تیز کی۔ اب بیٹا خوش ہے کہ میں خدا کی راہ میں قربان ہو رہا ہوں ادھر باپ خوش ہے کہ میں اپنے بیٹے کی قربانی پیش کر رہا ہوں چنانچہ حکم خداوندی کی تعمیل میں اپنے بیٹے کی گردن پر چھری چلائی، تو چھری کند ہو گئی اور اس وقت حکم ہوا:

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ۔

"بے شک آپ نے اپنا خواب سچ کر دکھایا ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں"۔

اب ہم اس کے عوض جنت سے ایک مینڈھا بھیجتے ہیں، اور تمہارے بیٹے کی جان کے عوض ایک دوسری جان کی قربانی مقرر کرتے ہیں چنانچہ اسی دن سے گائے، مینڈھا یا بکری وغیرہ قربانی کے لئے فدیہ مقرر ہو گیا۔

قربانی اور صدقہ میں فرق

اس واقعہ سے یہ معلوم ہوا کہ ذبح کا اصل مقصد جان کو پیش کرنا ہے چنانچہ انسان میں جاں سپاری اور جاں نثاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہی اس کی روح ہے، تو یہ روح صدقہ سے کیسے حاصل ہوگی کیونکہ قربانی کی روح تو جان دینا ہے اور صدقہ کی روح مال ہے۔ پھر اس عبادت کا صدقہ سے مختلف ہونا اسطرح بھی معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ کا کوئی دن مقرر نہیں مگر اس کے لیے ایک خاص دن مقرر کیا گیا ہے اور اسکا نام بھی یوم النحر اور عیدالاضحیٰ یعنی قربانی کا دن رکھا گیا۔

جہاں تک قربانی کے مسئلہ کا تعلق ہے تو یہ سلفاً خلفاً ایسی ہی ہوتی چلی آئی ہیں حضرات انبیاء علیہم السلام کا بھی اور امت کا اس پر اجماع ہے انبیاء بنی اسرائیل میں سب کے یہاں قربانی تھی۔ آئمہ کرام کا اس پر اجماع ہے یہ اور بات ہے کہ امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ، اور امام ابو یوسفؒ کے یہاں قربانی سنت ہے، اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے۔ یہ اس کے حکم میں اختلاف ہے اور ائمہ کے دقائق ہیں مگر قربانی کی مشروعیت میں سب متفق ہیں اور اگر یہ کوئی غیر شرعی عمل ہوتا تو احادیث میں اس کی صفات وغیرہ کیوں بیان کی جاتیں؟

چنانچہ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ ہم کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی:

ان نستشرف العين والاذن وان لا نضحي بمقابلة ولا مدابرة ولا شرقاء ولا خرقاء۔

"ہم قربانی کی آنکھ اور کان کو خوب دیکھ بھال کر لیا کریں ہم ایسے جانور کی قربانی نہ کریں جس کا کان آگے سے کٹا ہوا ہو اور نہ جس کا کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو اور نہ جس کا کان چرا ہوا ہو، اور نہ جس کے کانوں میں سوراخ ہو"۔

اس کے علاوہ بھی بعض اوصاف مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے احکام صدقہ سے بالکل جدا ہیں اس لئے اس میں صدقہ کے احکام سے پرہیز کرنا ضروری ہے پھر ساری امت آج تک بلا اختلاف اس عمل کو کرتی چلی آرہی ہے، اور تعامل امت سب سے بڑی دلیل ہے۔

منکرین قربانی پر طریق رد

قربانی کے متعلق تو اب بیان ہو چکا لیکن اگر کہا جاوے کہ آپ تو حدیث سے استدلال کرتے ہیں حالانکہ

ہم حدیث کو حجت ہی نہیں مانتے تو ایسے لوگوں سے پھر قربانی کے مسئلہ میں جھگڑا نہیں بلکہ پھر تو حدیث کے حجت ہونے پر گفتگو ہے یہ ایک اُصولی اختلاف ہے ایسے لوگوں سے یہ سوال کیا جاوے گا کہ آپ قرآن مجید کو جو کلام اللہ تسلیم کرتے ہیں تو اس کا کلام اللہ ہونا کیسے معلوم ہوا؟

اگر یہ جواب ہے کہ خود قرآن سے معلوم ہوا تو یہ "مکابرہ" ہے یعنی جو دعویٰ ہے وہی دلیل ہے اور یہ صریح غلطی ہے ورنہ پھر یہ تسلیم کر لیجئے کہ حدیث کا کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونا حدیث سے ثابت ہے در حقیقت جو شخص احادیث کا انکار کر رہا ہے وہ قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کا بھی منکر ہے کیونکہ قرآن بغیر حدیث کے حجت نہیں بن سکتا جس طرح کوئی شخص بغیر رسول کے خُدا تک نہیں پہنچ سکتا اسی طرح کلام اللہ تک بغیر کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے رسائی ممکن نہیں کیونکہ لُغت کے زور سے اگر کلامُ اللہ کو حل کیا گیا تو وہ اللہ تعالیٰ کی مُراد نہ ہوگی بلکہ اس شخص کی اپنی مُراد ہوگی۔ جب تک پیغمبر یا پیغمبر کے نائبین کسی آیت کی مراد کو بیان نہ کریں وہ شریعت نہیں بن سکتی۔ کیونکہ کلام کی بعض خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو کاغذ پر نہیں آسکتیں بلکہ لب ولہجہ سے تعلق رکھتی ہیں میں اس کی مثال اُردو کے ایک جملے سے دیا کرتا ہوں۔ وہ جملہ ہے "کیا بات ہے" اس کے لَب ولہجہ بدلنے سے معنیٰ بدل جاتے ہیں چنانچہ کبھی اس کو استفسار حال کے واسطے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی تعجب کے لئے 'کبھی تعظیم شان کے لئے' اور کبھی تحقیر کے لئے اب اگر یہ جملہ کاغذ پر لکھ کر کسی کو بھیج دیں تو کیا وہ شخص اس کو پڑھ کر متکلم کی مراد کو سمجھ سکے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ جو کچھ وہ سمجھے گا وہ اس کی اپنی مراد ہوگی چنانچہ اگر یہ شخص اس وقت تعجب کی حالت میں ہوگا تو اس کو تعجب کے لئے سمجھے گا اور اگر استفسارِ حال کا اس پر غلبہ ہوگا تو اسی کے لئے سمجھے گا۔ تو یہ کیفیات کاغذ پر نہیں آسکتیں

گر مصوّر صورت آں دلستاں خواہد کشید
لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

یعنی مصور تو صرف محبوب کی صورت بنا سکتا ہے۔ اس کے ناز و انداز کو کیسے اس میں ڈھال سکتا ہے؟

طریقِ ردّ

اس کے علاوہ ایک چیز "عُرف" ہے یعنی کلام میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ اہلِ عُرف کے پاس رہ کر ہی سمجھ میں آسکتی ہیں چنانچہ دیوبند میں ایک صاحب تھے جو کلکٹر کے یہاں منشی تھے کلکٹر اگرچہ انگریز تھا مگر اس کو خیال تھا کہ میں اُردو بہت اچھی جانتا ہوں' چنانچہ اکثر وہ میر منشی صاحب سے بھی کہا کرتا تھا کہ:

وَلْ میر منشی! "ہم تم سے زیادہ اُردو جانتے ہیں"۔

اور یہ بے چارے منشی اس کا جملہ سُن کر خون کے سے گھونٹ پی کر رہ جاتے کیونکہ ملازمت کا سوال تھا آخر ایک روز اس نے کسی بات پر میز پر ہاتھ مار کر کہا "وَل منشی: ہم تم سے زیادہ اردو جانتے ہیں" اس مرتبہ ان کو بھی جوش آگیا انہوں نے سوچ لیا کہ ملازمت رہے یا نہ رہے مگر کم از کم ایک مرتبہ اس کو جواب تو دے ہی دوں۔ چنانچہ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے میز پر مکہ مار کر کہا کہ:

"صاحب بہادر! اُردو کی ابجد بھی نہیں جانتے"۔

یہ سن کر وہ انگریز بڑا حیران ہوا" اور کہا کہ ہمارا امتحان لو۔ انہوں نے کہا اگر میں امتحان لوں تو صاحب بہادر بغلیں جھانکنے لگیں۔ اب تو صاحب بہادر واقعی بغلیں جھانکنے لگے کہ اس کا کیا مطلب ہوا بہت غور کیا مگر خاک سمجھ میں نہ آیا آخر کہا کہ تین دن کی مہلت دو۔ انہوں نے کہا کہ سات دن کی مہلت ہے غرض اس نے بہت ...

لغت میں تلاش کیا مگر لغت میں تو بغل مل گیا اور جھانکنا مل گیا مگر یہ پورا جملہ کہاں ملتا ___ آخر کار اس نے سات دن کے بعد کہا کہ اس کا مطلب یہی ہے کہ اس طرف بغل کو اٹھا کر دیکھ لیا اور ادھر کی بغل کو اسی طرح دیکھ لیا۔ میر منشی یہ سن کر ہنس پڑے تب اس نے پوچھا کہ پھر اس کا کیا مطلب ہے؟ میر منشی نے کہا کہ اس شرط پر بتاؤں گا کہ پھر کبھی اردو دانی کا دعوے نہ کرو۔ چنانچہ اس نے اقرار کیا۔ اور انہوں نے اس کا مطلب بتایا کہ دراصل یہ جملہ تحیر سے کنایہ ہے یعنی اگر صاحب بہادر کا امتحان لیا جائے تو وہ حیرت میں پڑ جائیں ___ اور اس قسم کی غلطیاں ہونے کے متعدد واقعات ہیں غرض کلام کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جو "عرف" سے متعلق ہیں۔ غیر اہل عرف ان کو سمجھ ہی نہیں سکتے جب ہماری زبان اور کلام میں محاورات ہیں تو قرآن مجید میں بھی ایسی چیزیں ہیں کہ ان کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب تھی تو اب جو لوگ قرآن مجید کو سمجھنا چاہیں ان کو چاہئے کہ اہل عرف کی طرف رجوع کریں یعنی جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی طرف۔ اور جو معنی وہ بتائیں ان کو صحیح سمجھیں اس لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے :

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝

"اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان پڑھ لوگوں میں ایک رسولؐ بھیجا جو انہی میں سے ہے ان کو اللہ تعالیٰ آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کے قلوب کو صاف کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں تعلیم کرتا ہے حالانکہ وہ لوگ اس سے قبل صریح گمراہ تھے"۔

اب دیکھئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کے تین فرائض بیان فرمائے یعنی تلاوت 'تزکیہ و تعلیم اِس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کا کام صرف آیتیں پڑھ کر سنا دینا ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کے قلوب کو پاک کریں تاکہ وہ قرآن کے معانی سمجھنے اور اس کو محفوظ رکھنے کے قابل ہو سکیں یہی وجہ ہے کہ آیت میں "تزکیہ" کو تعلیم پر مقدم کیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ تزکیہ حاصل کئے بغیر انسان کو قرآن مجید کے معانی سمجھنے کی استعداد حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے قلوب کا ایسا تزکیہ کیا کہ وہ حضرات پھر قرآن کے معانی کو اسی طریقے سے سمجھنے لگے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی ___ پھر صحابہؓ نے تابعین کے قلوب کا تزکیہ کیا اور انہوں نے تبع تابعین کا۔ غرض اسی طرح سلسلہ وار آج تک یہ معانی و مطالب محفوظ ہیں ___ اس لئے ہمیں ادنیٰ سے ادنیٰ نکتہ بھی بغیر استاد کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے ___ قرآن مجید ہمارے پاس امانت ہے جس طرح ہم لفظوں کے امین ہیں اسی طرح ہم معانی کے بھی امین ہیں ___ اور ہم کیا؟ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی الفاظ و معانی دونوں کے امین تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ شروع شروع میں آیات کو رٹنے کی کوشش فرماتے تاکہ بھول نہ جائیں اس لئے وحی نازل ہوئی :

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝

"آپ قرآن پڑھنے کی خاطر وحی کے دوران میں زبان بھی نہ ہلایئے"۔

اور زبان کیوں نہ ہلایئے اس لئے کہ :

اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ

"ہمارے ذمّہ ہے اس کا جمع کرنا اور آپ سے پڑھوانا"۔

پھر آپ کو کیا کرنا چاہیے؟

فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ

"جب وحی نازل ہو رہی ہو اس وقت سنتے رہیے پھر ہم ہی اس کا مطلب بیان کریں گے"۔

اس آیت میں حق تعالیٰ صاف صاف فرما رہے ہیں کہ اس کا بیان بھی ہمارے ذمّہ ہے۔ اگر اس کے مطلب و معانی خود سمجھ میں آسکتے تو یہ کیوں فرمایا جاتا' اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھ میں نہ آسکتے تھے تو کسی اور کا کیا منہ ہے؟

یہی وجہ کہ بعض اوقات صحابہؓ کسی آیت کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر غور فرماتے رہتے۔ پھر کبھی تو من جانب اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں اس کا مطلب ڈال دیا جاتا ورنہ آپ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے استفسار فرماتے اگر ان کو معلوم ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کر دیتے ورنہ وہ فرماتے کہ میں حق تعالیٰ سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ تو قرآن مجید کے معانی اس طرح آپ کو من جانب اللہ بتائے گئے اور جب صحابہؓ اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معنی کے متعلق استفسار کی ضرورت پڑتی تھی حالانکہ آپ اہل زبان تھے نورِ نبوّت سے منوّر بھی تھے پھر کسی اور کو کیا حق ہے کہ وہ بغیر حدیث کے قرآن فہمی کا دعویٰ کرے ___؟ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کے موجد یا مخترع نہ تھے بلکہ الفاظ و معانی میں امین تھے جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو تعلیم فرما دیتے اس طرح آپ نے صحابہ کے قلوب کو مانجھا اور تزکیہ فرمایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ بھی مسائل پر اسی طرح غور فرمایا کرتے تھے ___ پھر انہوں نے تابعین کے دلوں کو اسی طرح مانجھا اور انہوں نے اپنے شاگردوں کو اسی طرح تزکیہ باطن سے آراستہ کیا اور یہ سلسلہ آج تک اسی طرح جاری ہے۔ ہم کو قرآن مجید کے جو مطالب پہنچے ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں سے پہنچے ہیں یہی وجہ ہے کہ پہلے زمانے میں ہر شخص قرآن مجید کا مفسّر نہ بن سکتا تھا۔ جب تک کسی ایسے ہی استاد کا شاگرد نہ ہو اور جو شخص قرآن مجید یا حدیث کی تفسیر وغیرہ بیان کرتا اس سے سند پوچھی جاتی تھی اگر وہ شخص مستند ہوا' اس کی بات قابل قبول سمجھی جاتی تھی ورنہ رد کر دی جاتی تھی۔ ___ مگر آجکل چونکہ ناواقفیت کا زمانہ ہے اور خدا کا خوف لوگوں کے دلوں میں کم ہے اس لئے ہر وہ شخص جو ذرا عربی جانتا ہو وہ مفسّر قرآن بننے کا مدّعی ہے اور لوگ بغیر کسی تحقیق کے اس کی پیروی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید کے مطالب صرف ان ہی لوگوں سے حاصل کرنے چاہئیں جو خود صحیح سمجھتے ہوں۔ یعنی بزرگوں کے صحبت یافتہ اور عالموں کے شاگرد ہوں تاکہ ان کے اندر بھی تزکیۂ نفس کا وہ وصف موجود ہو جس کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا۔

حقیقت میں صحابہؓ جو ساری امّت سے افضل ہیں وہ اسی صحبت کی برکت سے ہیں کہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی شخصیت کی صحبت نصیب ہوئی' جس سے ان کے دل صاف ہو گئے کہ اس میں صرف حق بات ہی سما سکتی تھی۔ پھر انہوں نے اپنے شاگردوں کو اس نہج پر ڈالا' اور ان کے قلوب کی صفائی و تزکیہ کیا۔

اولئک اصحاب محمد۔ واصحاب ابوبکر۔ واصحاب عمر۔

غرض یہ حضرات تھے کہ ان پر حق کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔

حاصل یہ کہ کتاب اللہ تک ہم بغیر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں پہنچ سکتے۔ اور ہم کو کتاب اللہ کے اندر غور وفکر کرنے کی بھی جبھی اجازت ہے جب کہ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا مطلب بیان فرماویں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ۔ (نحل پارہ ۱۴ ع ۶)

"اور ہم نے نازل کیا آپ کی طرف قرآن مجید کو تاکہ آپ بیان فرماویں لوگوں کے لئے جو ان کی طرف نازل ہوا' تاکہ وہ فکر کریں"۔

دیکھئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے "لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ" فرمایا کہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کا مطلب بیان کریں اس کے بعد "یَتَفَکَّرُوْنَ" ہے۔ یعنی اس کے بعد لوگوں کو غور وفکر کی اجازت ہے۔ تاکہ لوگ غور فکر کرنے میں شریعت کی حدود سے نہ نکل جائیں

درحقیقت اگر ہر شخص اپنی اپنی عقل اور فہم کے مطابق غور کرنا شروع کردیں تو قرآن مجید تو ایک کھیل تماشہ بن جائے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس کے لئے بھی حدود وقیود مقرر کی جائیں۔ چنانچہ کردی گئیں۔ اب کسی کو بغیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے "بیان" کے قرآن مجید کے تفسیر کی اجازت نہیں اور چونکہ کلام اللہ کا مطلب ہر شخص کا کام نہیں۔ اس لئے ہمیشہ اللہ تعالیٰ نے ہر کتاب کے ساتھ ایک نبی ضرور بھیجا چنانچہ اگر توریت آئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تشریف لائے۔ صُحُفِ آدم علیہ السلام اگر دنیا میں آئے تو آدم علیہ السلام بھی تشریف لائے۔ اور انجیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور زبور کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور سب سے آخر میں قرآن مجید کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا ورنہ اگر صرف عربی دانی اور لغت کے زور سے کلامِ الٰہی کو حاصل کیا جاسکتا تو حضرات انبیاء علیہم السلام کی تشریف آوری کی کیا ضرورت تھی ؟ بلکہ یہ ہوا کرتا کہ ایک کتاب کسی فرشتہ کے ذریعہ سے بیت اللہ کی چھت پر رکھوا دی جایا کرتی اور اعلان کردیا جاتا کہ لوگو! یہ خدا کی کتاب ہے اس پر عمل کرو۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ کیونکہ کتاب کے ساتھ اس کو سمجھانے اور پڑھانے کی بھی ضرورت تھی۔ ورنہ ہر شخص قرآن مجید سے اپنے نفس کے مطابق مطلب گھڑ کر استدلال کرلیا کرتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علیؓ نے حضرت عباسؓ کو خوارج سے مناظرہ کرنے کو بھیجا تو ان کو ہدایت فرمائی کہ ان کے سامنے قرآن سے استدلال مت کرنا بلکہ احادیث سے استدلال کرنا۔

حضرت ابن عباسؓ کو تعجب ہوا اور سوال فرمایا کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ حالانکہ قرآن مجید کو میں خاص طور پر سمجھتا ہوں۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے حق میں دعا فرمائی : **اللهم علمه القران** یا اللہ! ابن عباسؓ کو قرآن کا فہم عطا فرما۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ بے شک تم قرآن مجید کو صحیح سمجھتے ہو مگر **القران ذو وُجوه** (یعنی قرآن مجید کے الفاظ سے متعدد مطالب نکل سکتے ہیں) اس لئے تم صحیح مطلب بیان کروگے اور لوگ اس کا غلط مطلب بیان کردیں گے۔ اور الفاظ سے کسی ایک کی بات متعیّن نہ ہوگی۔ اس لئے تم حدیث سے استدلال پیش کرنا۔ کیونکہ حدیث نے قرآن کے معانی متعیّن کردیئے ہیں جس میں کسی تاویل اور کیدِ نفس کی گنجائش نہیں رہی۔

یہی وجہ ہے کہ زمانہ سابق میں بھی جب کوئی فرقہ ایسا ہوا کہ اس نے دین میں تحریف کا ارادہ کیا تو اس نے سب سے پہلے حدیث کا انکار کیا۔ کیونکہ حدیث کے ہوتے ہوئے کسی قسم کی تحریف کا احتمال ہی نہیں رہتا۔ اس لئے اس نے پہلے اس کانٹے کو راہ سے ہٹایا مگر ساری دنیا جانتی ہے کہ آج وہ لوگ ختم ہوگئے اور ان کے ساتھ

ان کی تحریفات بھی ختم ہوگئیں۔ اور حدیث پر عمل کرنے والے اب بھی باقی ہیں اور قیامت تک باقی رہیں گے۔ الغرض حدیث کے بغیر قرآن نہیں سمجھ میں آسکتا۔ اور عجیب بات ہے کہ علماء و صلحاء کا قول حجت ہو مگر نبی کا کلام حجت نہ ہو۔

تقریر کا اصل موضوع تو قربانی کا مسئلہ تھا جس میں تفصیل نہ تھی مگر درمیان میں چونکہ کچھ اصولی بحث آگئی اس لئے بات ذرا طویل ہوگئی اگرچہ اس اصولی بحث کو بہت مختصر بیان کیا گیا۔ تاہم بحمد اللہ ضروری باتیں آگئیں اور یہ معلوم ہوگیا کہ حدیث پر بھی ایمان ضروری ہے۔ اب اصل مسئلہ کی طرف رُجوع کرتا ہوں۔

متعلقاتِ قربانی کی وضاحت

اس جگہ یہ اشکال کہ قربانی کرنے سے جانور ختم ہو جائیں گے

سو اوّل تو یہ خیال غلط ہے کیونکہ روزانہ جو لاکھوں جانور بطور ذبیحہ کے کاٹے جاتے ہیں عید کے دن وہ ذبح نہیں ہوتے اس طرح کچھ معمولی سا فرق پڑتا ہے جو کسی بھی طرح قابلِ اعتناء نہیں۔ پھر اس روز بعض ایسے لوگوں کو بھی گوشت پہنچ جاتا ہے جو سال میں ایک آدھ دفعہ ہی کھا سکتے ہیں۔ پھر ان کی ساری کھالیں غرباء و مساکین میں تقسیم ہوتی ہیں ___ غرض بہت سے منافع اس سے حاصل ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جو روپیہ قربانی میں خرچ ہوتا ہے' اس کو مہاجرین وغیرہ کی امداد میں صرف کیا جائے۔ تو بے شک مہاجرین کی امداد ضروری ہے مگر ہر کام کے لئے اسلام کے گلے پر چھری کیوں چلتی ہے۔ کچھ اپنی خواہشاتِ نفس پر بھی تو چھری چلایئے اور غیر شرعی اخراجات کو بند کر کے مہاجرین کی امداد کیجئے۔ مثلاً سینما ہے شراب ہے' اور دوسرے فضول اخراجات ہیں۔

حاصل یہ کہ اب یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ جس طرح کائنات کی ہر چیز میں ایک صورت ہے اور ایک روح ہے اسی طرح اعمالِ شرعیہ میں بھی ایک روح ہے۔ اور جیسے وہاں صورت کی ایک خاص روح ہے جو دوسری صورت میں نہیں آسکتی۔ اسی طرح یہاں بھی ایک روح ہے جو دوسرے میں نہیں آسکتی۔

سو اب سمجھئے کہ سارے اعمالِ شرعیہ کا مقصود تقویٰ ہے۔ مثلاً نماز سے عاجزی و انکساری کی صورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ روزے میں تزکیۂ نفس کی صورت میں' جہاد میں شجاعت کی صورت میں' صدقہ میں اِنفاقِ مال کی صورت میں' اور قربانی سے جاں نثاری کی صورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے ___ اب اگر آپ نے قربانی کے بجائے نماز پڑھ لی' تو نماز سے عاجزی اور بندگی کا تقویٰ تو مِلا مگر قربانی (کی صورت میں حاصل ہونے والا تقویٰ) نہ ملا پس اگر کوئی شخص قربانی نہ کرے اور صدقہ دے دے تو قیامت کے دن اس کو ثواب مل جائے گا مگر قربانی کا مطالبہ باقی رہے گا۔ اور یہ سوال ہوگا کہ قربانی کیوں نہیں کی؟ بالکل اسی طرح جیسے کوئی نماز پڑھتا رہا اور روزہ نہ رکھا تو روزہ کا مطالبہ ہوگا ___ اس کو ایک مثال سے سمجھ لیجئے کہ آپ نے ایک نوکر رکھا' جس کے سپرد کھانا پکانے اور کھانا کھلانے کی خدمت سونپی۔ اب اس نوکر نے یہ کیا کہ کھانا تو پکایا نہیں مگر گھر کو صاف کر کے آئینہ بنادیا۔ ہر چیز قرینے سے رکھ دی جھاڑو بھی دی' فرش بھی دھویا' جالے بھی صاف کئے۔ اب جب گھر پہنچے اور دیکھا کہ ملازم نے گھر کو بہت صاف ستھرا کر رکھا ہے تو یقیناً آپ خوش ہوں گے مگر جب کھانے کے وقت' آپ کو معلوم ہوگا کہ اس نے کھانا نہیں پکایا؟ تو کیا وہ ملازم جواب دے سکتا ہے کہ صاحب میں نے گھر تو صاف کر دیا۔ اب کھانے کا مطالبہ کیسا؟ ظاہر کہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ یہاں جو کام تیرے سُپرد کیا تھا وہ تو تو نے کیا نہیں اور ایک ایسا کام کیا جو فی الجملہ اچھا ہے مگر تیرے سُپرد نہ تھا۔ اس لئے تجھ کو

یہ کام کھانا کھلانے کے بعد کرنا چاہئے تھا۔ اسی طرح صدقہ وخیرات تو عبادتِ نافلہ ہیں، مگر قربانی واجب ہے۔ تو صدقہ دینے سے اس کا مطالبہ باقی رہے گا۔

حاصل یہ کہ آپ جو صورت اختیار کریں گے، اسی کی روح اس میں ڈالی جائے گی۔ جیسے انسان کی صورت میں انسان کی روح۔ اور حیوان کی صورت میں حیوان کی۔ پھر قربانی کی روح صدقہ میں کیونکر آسکتی ہے؟ اس لئے قیامت میں ہر ایک عمل کی مختلف صورتیں ہوں گی۔ مثلاً جو شخص مسجد بناتا ہے اس کو جنت میں مکان ملتا ہے۔ روزہ دار کے لئے قیامت کے دن دسترخوان بچھایا جائے گا۔ اسی طرح قربانی کے متعلق ارشاد ہے کہ :

انه لیأتی یوم القیامة بقرونها واشعارها واظلافها۔

"قیامت کے دن قربانی کا جانور اپنے سینگوں، بالوں اور کھالوں کے ساتھ موجود ہوگا"۔

اس جگہ ان اجزا کا ذکر ہے، جن کو ہم بے کار سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ یعنی اس کے ردّی اجزا پر بھی ثواب دیا جائے گا۔ تو جو اصلی چیز یعنی گوشت ہے اس پر کیوں نہ ملے؟ پھر آگے ارشاد ہے :

ان الدم لیقع من اللّٰہ بمکان قبل ان یقع بالارض فطیبوا بھانفسا۔

"قربانی کا گوشت زمین پر گرنے سے قبل وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کا درجہ حاصل کرلیتا ہے۔ تم اس عمل کو کرکے اپنا دل ٹھنڈا کرو"۔

تو مقبولیت کا درجہ بھی قربانی کے ساتھ خاص ہے۔

مسئلہ کا بیان تو ہوچکا۔ مگر ایسے جزئی مسائل میں جو اجماعی چیزیں ہیں شبہ پیش آنا انتہائی تنزّل اور انحطاط کی علامت ہے۔ اب تک تو علماء کو صرف اصول کو ثابت کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ مگر افسوس اب جزئیات و مسلّمات کو بھی ثابت کرنا پڑتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کے علماء کے ذمہ اس کا ثابت کرنا نہیں یہ تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں۔ مگر میرا مقصد یہ ہے کہ اگر ہماری یہی رفتار رہی تو کہاں تک جزئیات کو ثابت کیا جائے گا۔ کچھ چیزیں مسلّمات سے بھی رہنے دیجئے یہ تو نہ ہو کہ ہر چیز کیلئے دلیل کی ضرورت پڑنے لگے۔ یہ انتہائی پستی اور تنزّل کی دلیل ہے۔ جس کی وجہ علم دین کی طرف لاپرواہی اور بے توجہی ہے جس کا علاج بجز اس کے کہ آپ لوگ دینی تعلیم بھی حاصل کریں۔ تاکہ روزمرّہ کے موٹے موٹے مسائل میں آپ کو شبہات پیش نہ آئیں۔ اور آپ کو ہر شخص اپنی خواہشات کا غلام نہ بناسکے۔ بلکہ آپ کو خود بھی حق و باطل میں امتیاز کی تھوڑی سی بصیرت حاصل ہو۔ قرآن مجید کا ترجمہ بھی کسی سے تعلیم کے طور پر حاصل کریں، خود دیکھنے میں ہزاروں غلطیوں کا احتمال ہے۔

اگر آپ کو کسی مسئلہ میں شبہ ہو اور اس کی وضاحت کی ضرورت ہو تو خود اپنی عقل سے کوئی رائے قائم کرنے کی بجائے علماء کی طرف رجوع کیجئے کہ دین بالکل بے غبار ہے بشرطیکہ آپ سمجھنے کا قصد رکھتے ہوں اور آپ کی بحث کا پیرایہ تحقیقی و تعمیری ہو۔ ہٹ دھرمی اور ضد کا اس میں ادنیٰ بھی دخل نہ ہو۔

اب میں ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو شرور وفتن سے بچائے اور راہِ مستقیم پر قائم رکھے، اور ایمان پر خاتمہ نصیب ہو۔

اٰمین یارب العٰلمین

والصلوٰة والسلام علیٰ سیّد المرسلین محمّد واٰلہ واَصحابہ واَتباعہ اجمعین۔

برحمتک یاارحم الراحمین

شعب الایمان

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **الایمان بضع وسبعون شعبۃ** ستر سے کچھ اوپر ایمان کی شاخیں اور شعبے ہیں' اوپر کی شاخ لا الہ الا اللہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ دلیل ہے کہ دل میں اللہ کی اتنی عظمت بیٹھ چکی ہے کہ اس کے سوا کسی کو معبود بنانے کو تیار نہیں اور ایمان کا ادنیٰ درجہ **اماطۃ الاذیٰ عن الطریق** ہے' یعنی راستے سے ایذا دہ چیزوں کو اٹھا کر پھینک دینا تاکہ مخلوق کو تکلیف نہ پہنچے۔ تو ایک ایمان کا اوپر کا سرا بتلایا گیا ہے جو اللہ سے ملا ہوا ہے اور ایک نیچے کا سرا بتلایا گیا ہے جو مخلوق سے ملا ہوا ہے اور دونوں کا منشاء بتلا دیا **والحیاء شعبۃ من الایمان** یہ دونوں شعبے وہ برتے گا جس میں حیاء اور انکسار نفس موجود ہو۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ـــــــ اَمَّا بَعْدُ ـــــــ

فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَۃً اَعْلَاھَا قَوْلُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَدْنٰھَا اِمَاطَۃُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ۔ وَالْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ۔ اَوْکَمَا قَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ۔

احوال واقعی

بزرگان محترم!

جیسا کہ آپ کے علم میں آیا ہے کہ قریب ہی میں میری آنکھ کا آپریشن ہوا۔ اس کی وجہ سے کچھ ضعف بھی لاحق ہوا جس کا اثر اب تک موجود ہے۔ ڈاکٹر کی ہدایت تو یہ تھی کہ میں کم سے کم تین چار ماہ' مئی' جون تک زور سے بھی نہ بولوں اور تقریر بھی نہ کروں۔ لیکن یہاں آکر ایک ایک کر کے اس ہدایت کی خلاف ورزی

ہوتی۔ زور سے بھی بولنا پڑا اور تقریریں بھی کرنی پڑیں اور ایسی صورت بن جاتی ہے کہ بولنے کی مجبوری پیش آتی ہے تاہم جتنا اپنے بس میں ہوتا ہے میں احتیاط بھی کرتا ہوں۔ اس لئے یہ گذارش ہے کہ شاید میں زیادہ دیر تک نہ بول سکوں۔ جتنا بھی آسانی سے بن پڑے گا' اسی قدر چند لمحات آپ حضرات کے لوں گا اور اس حدیث کے بارے میں چند کلمات گذارش کروں گا۔

حدیث کا ترجمہ

یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔ پہلے اس کا ترجمہ سن لیجئے۔ اس کے بعد اس کی تھوڑی تفسیر اور تشریح ___ ترجمہ یہ ہے 'حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ

ایمان کے کچھ اوپر ستّر شعبے اور شاخیں ہیں جن میں سے اعلیٰ ترین شعبہ لا الٰہ الااللہ کہنا اور پڑھنا ___ اور ادنیٰ شعبہ راستے سے ایذادہ چیزوں کا ہٹا دینا' تکلیف دہ چیزوں کا دور کر دینا ہے تاکہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو اور فرمایا حیاء ایمان کا ایک بہت بڑا شعبہ ہے۔ یہ حدیث کا تقریباً لفظی ترجمہ ہے۔

اس میں ایمان کے شعبے اور اس کی شاخیں بیان کی گئی ہیں۔ پہلے اس کی ضرورت ہے کہ خود ایمان کی حقیقت سامنے آئے تاکہ اس کے شعبوں کو اور اس کی شاخوں کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

ایمان کی دو بنیادیں

ایمان کی دو بنیادیں ہیں' ایک **التعظیم لِاَمر اللّٰہ** اور ایک **الشفقۃ علیٰ خلق اللّٰہ** اللہ کے اوامر اور اس کے قانون کی عظمت و تعظیم کرنا اور دوسرے اُس کی مخلوق پر شفقت کرنا اور اس کی خدمت کرنا۔ یہ ایمان کے اجزا یا اس کے دو بنیادی شعبے ہیں ___ ایک کا حاصل یہ ہے کہ آدمی اپنے پروردگار کی طرف دوڑے' اسی کی طرف جانے کی کوشش کرے' اس کی عظمت و تعظیم کے حقوق بجالائے۔ دوسرے کا حاصل یہ ہے کہ اس کی مخلوق کی خدمت کا حق بجالائے۔ اگر ایک شخص اللہ کی طرف دوڑتا ہے لیکن مخلوق کو ستاتا اور ایذا رسانی کرتا ہے۔ اس شخص کو ضعیفُ الایمان کہا جائے گا۔ اس کا ایمان کمزور' ناقص ہے۔ ایک طرف دوسرا شخص ہے جو دن رات قومی خدمات میں لگا ہوا ہے' ہروقت کا اوڑھنا اور بچھونا قوم کی خدمت ہے۔ لیکن اللہ کی طرف رجوع نہیں ہے۔ نہ عبادت ہے نہ اطاعت ہے۔ وہ اس سے بھی زیادہ ضعیفُ الایمان اور ناقصُ الایمان ہے۔ کاملُ الایمان وہی شخص سمجھا جائے گا کہ ایک طرف اللہ کی طرف جھکا ہوا ہو اور دوسری جانب مخلوق کی طرف رجوع کئے ہوئے ہو جیسا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان ہے کہ ہمہ وقت رجوع الی اللہ بھی ہے اور ہمہ وقت خدمت خلق اللہ بھی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک فرمائی گئی کہ :

کان یذکر اللّٰہ علیٰ کل احیانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی لمحہ ذکر اللہ اور یاد خداوندی سے فارغ نہیں تھا۔ اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے' چلتے پھرتے حتیٰ کہ گھر میں رہتے ہوئے' بیویوں کے پاس جاتے ہوئے بھی کوئی لمحہ فارغ نہیں تھا کہ ذکر اللہ آپؐ سے صادر نہ ہوا ہو۔ زبان مبارک' قلب مبارک اور عمل مبارک سے ___ غرض یاد خداوندی ہروقت ہر لمحے ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مخلوق کی تربیت و تعلیم' ان کی راہنمائی و ہدایت سے کوئی لمحہ فارغ نہیں تھا ___ تو آپؐ پوری عمر شریف رجوع اِلی اللہ کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اللہ کی طرف رجوع کرنا مخلوق کی خدمت سے غافل نہیں بناتا۔ اسی طرح ہر آن مخلوق کی خدمت

میں منہمک ہیں اور یہ خدمت رجوع الی اللہ سے غافل نہیں کر سکتی تھی۔ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔

اللہ نے اپنے قانون کو حجت و برہان اور بصیرت سے منوایا ہے

التعظیم لِاَمْرِ اللّٰہ اللہ کے اوامر کی تعظیم کرنا۔ یہ ایمان کا جزء اول تھا مگر یہ قدرتی بات ہے کہ کسی قانون کی عظمت تب ہوتی ہے جب قانون ساز کی عظمت دل میں ہو۔ اگر قانون بنانے والا یا قانون چلانے والا' اس کی دل میں کوئی عظمت نہ ہو بلکہ اس کی حقارت دل میں بیٹھی ہوئی ہو' تو قانون کی عظمت بھی دل میں نہیں ہو سکتی۔ اگر قانون بنانے والے کی عظمت دل میں نہ ہو تو پھر قانون دباؤ اور مجبوری کا رہ جاتا ہے۔ دلی شغف کے ساتھ آدمی قانون پر نہیں چل سکتا۔

شریعتِ اسلام کے قانون کو اللہ نے اس طرح نہیں بھیجا کہ دباؤ ڈال کر منوایا ہو۔ پہلے مالک سے محبت پیدا کی گئی ہے۔ اس محبت کے ذیل میں قانون سے خود بخود محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ آدمی قانونِ شریعت پر اپنے دل کی محبت' رضا اور شغف سے چلتا ہے دباؤ سے نہیں چلتا۔ یہ نہیں ہوا کہ تلوار کا دباؤ ڈالا اور مجبور و مقہور کر دیا ہو۔ بلکہ حجتیں پیش کیں کہ دلائل سے سمجھو' بصیرت سے سمجھو۔ جب شرح صدر ہو جائے قبول کرو' ورنہ چھوڑ دو۔ حضرات صحابہ کرامؓ کی شان فرمائی گئی' اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا ۝ جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پیش کی جاتی تھیں' تو وہ اندھوں اور بہروں کی طرح نہیں گرتے تھے بلکہ بینا و شنوا ہو کر سوچ سمجھ کر بصیرت کے ساتھ قبول کرتے تھے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی :

عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ (الیوسف پ ۱۳ آیت ۱۰۸)

میں اور میری اتباع کرنے والے اس دین پر بصیرت اور شرح صدر کے ساتھ قائم ہیں۔ کسی دباؤ یا مجبوری سے نہیں بلکہ دل کی لگن سے قائم ہیں تو شریعتِ اسلام نے بصیرت پیدا کرنی چاہی ہے۔ قرآن کریم نے جہاں جہاں اللہ کا وجود' اس کی توحید' اس کی صفات منوائی ہیں۔ وہاں دلائل دیئے ہیں۔ اَنفسی دلائل بھی' آفاقی دلائل بھی ___ کہ اپنے نفسوں میں غور کرو تو تمہیں اللہ کے وجود کی حجتیں ملیں گی۔ کائنات میں غور کرو تو اس کے وجود اور اس کی یکتائی کے دلائل ملیں گے کہیں پہاڑوں کو' کہیں دریاؤں کو' کہیں ہواؤں کے لوٹ پھیر کو پیش کیا۔ کہیں سورج کی حرکت کو پیش کیا کہ ان تمام تغیرات کو دیکھو ___ سورج کتنا بڑا عظیم کرہ ہے۔ آج کل کے فلاسفہ کا یہ دعویٰ ہے کہ زمین سے سورج گیارہ کروڑ گنا بڑا ہے۔ گویا سورج میں سے گیارہ کروڑ زمینیں بن سکتی ہیں۔ اتنا بڑا سیارہ اور چوبیس گھنٹے میں لاکھوں میل کی حرکت کرتا ہے۔ تو اتنا بڑا کرہ اور غلاموں کی طرح سے چکر کھا رہا ہے۔ اس کے اوپر کوئی بڑی طاقت ہے اس نے اسے چکر میں ڈال رکھا ہے۔ اس لئے سورج کو دیکھ کر اس کی ذات عالی کو پہچانو۔

اگر زمین حرکت کر رہی ہے جیسا کہ آج کے فلاسفہ کا دعویٰ ہے تو یہ عظیم کرہ جس میں اربوں اور کھربوں مخلوق آباد ہے اس کو کس نے چکر میں ڈال رکھا ہے؟ کس نے گھما رکھا ہے؟

لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ۔ (یٰسٓ پ ۲۳ آیت ۴۰)

سورج کی یہ مجال نہیں کہ چاند کو جا پکڑے' رات کی یہ مجال نہیں ہے کہ دن کو نہ آنے دے' خود چھا جائے ___ اپنے وقت پر دن' اپنے وقت پر رات بھی آ رہی ہے۔ یہ محکم نظام کسی نابینا کا قائم کیا ہوا نہیں بلکہ

دانا اور بینا کا قائم کیا ہوا ہے۔ ایسے دانا اور حکمت والے کا قائم کیا ہوا ہے۔ جس کی حکمت لامحدود ہے' جس کے کمالات لامحدود ہیں۔ موسم اپنے اپنے وقت پر آرہے ہیں۔ گرمی اپنے وقت پر آتی ہے۔ ایک سیکنڈ نہیں رُک سکتی' سردی' برسات اپنے اپنے وقت پر آتی ہے۔

سبزیوں کا جو نظام بنادیا ہے اسی وقت پر بیج زمین سے اپنا سر نکالتا ہے۔ تناور درخت بنتا ہے ___ درخت کی جو بنیاد اور عمر ہے وہ مقرر اور لکھی ہوئی ہے۔ اتنا پاکیزہ اور اتنا اعلیٰ ترین محکم نظام بغیر کسی حکمت والے کے ممکن نہیں ہے۔ غرض قرآن کریم نے جہاں بھی اللہ کے وجود اور یکتائی کو منوایا' وہاں یہ نہیں کہا کہ تم مجبور ہو' ماننا پڑے گا ورنہ جہنم میں جاؤ گے بلکہ دلائل و حجتیں پیش کیں کہ ان کو سوچو اور سمجھو۔

عقل و بصیرت کے ساتھ کئے ہوئے عمل سے ہی درجات بلند ہوتے ہیں

عقل کی فضیلتیں الگ بیان کیں۔ حدیث میں ہے کہ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا' یا رسول اللہ! دو شخص یکساں قسم کا عمل کریں۔ اتنی ہی نمازیں وہ پڑھتا ہے' اتنی ہی یہ۔ اتنا ہی ذکر وہ کررہا ہے' اتنا ہی یہ۔ لیکن روز قیامت ایک کے درجات زیادہ بلند ہوں گے' ایک نیچے رہ جائے گا۔ حالانکہ عمل کی تعداد دونوں کی برابر ہے۔ فرق کی وجہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا فرق کی وجہ عقل ہے۔ جو عقل اور بصیرت سے عمل کرتا ہے اس کے مدارج بلند ہوتے ہیں۔ جو بے بصیرتی سے عمل کرتا ہے وہ نجات پالے گا لیکن اس کے لئے درجات کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوگا۔ تو عقل کو (بلندیٔ درجات کے لئے) معیار قرار دیا۔ اسی کو فرمایا'

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۔

آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش میں' رات اور دن کے لوٹنے پھیرنے میں قدرت کی آیات اور نشانیاں ہیں مگر کن کے لئے؟ عقل والوں کے لئے جو تدبر کے ساتھ غور و فکر کرتے ہیں۔ جو صرف پیشانی کی آنکھ سے دیکھنے کے عادی ہیں' ان کے لئے کوئی نشانی نہیں ہے۔ جو پیشانی کی آنکھ سے دیکھنے کے بعد دل کی آنکھ سے بھی دیکھیں اور تدبر کریں' ان کے سامنے اللہ کی قدرت کی نشانیاں کھلیں گی۔

شریعتِ اسلامی کی نظر میں عقل مند کون ہیں؟

اور عقلمند کون ہیں؟ آگے ان کی تفصیل فرمائی :

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

عقل مند وہ ہیں جو اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے اللہ کے ذکر میں منہمک ہیں اور ہروقت تخلیق اور کمالات میں فکر کرتے رہتے ہیں' تو دل میں ذکر اور فکر دونوں ہوں وہ عقلمند ہیں۔ فقط ذاکر کو بھی عقل مند نہیں کہا گیا' فقط متفکر کو بھی عقل مند نہیں کہا گیا۔ اگر محض فکر ہی فکر ہے ذکر اللہ نہیں تو وہ فلسفی ہے اور اگر محض ذکر ہی ہے فکر نہیں ہے تو وہ متقشف اور جامد ہے۔ دونوں چیزیں جمع ہوں کہ ذاکر بھی اور متفکر بھی تو اس کو شریعت کی اصطلاح میں عقلمند کہا گیا ہے۔ اسی پر اللہ کی قدرت کی نشانیاں کھلتی ہیں۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے کوئی دباؤ ڈال کر نہیں منوایا۔ چونکہ اللہ کا حکم ہے۔ لہٰذا مانو۔ حالانکہ یہ فرمانے کا حق تھا کہ اللہ کا حکم آگیا ہے تو ماننا پڑے گا۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ تم اللہ کے وجود کو دلائل سے سمجھو' اس کے قانون کو بھی بصیرت سے سمجھو' سوچ سمجھ کر قبول کرو۔ اندھوں' بہروں کی طرح سے قبول نہ کرو۔ عقل کو آزاد چھوڑا ہے کہ وہ فکر کرے۔ شریعت اسلام نے جمود نہیں بتلایا۔ حاصل اس کا یہ نکلا کہ کوئی دباؤ ڈالنا مقصود نہیں ہے

بلکہ ذکراور فکر کرانا مقصود ہے۔

مدارِ نجات اللہ کا فضل ہے

اور زیادہ ذکر کون کرتا ہے؟ من احبّ شیأً اکثر ذکرہ جس شخص کو جس سے محبت ہوتی ہے اس چیز کو کثرت سے یاد کرتا ہے۔ اللہ سے جب محبت ہوگی اس کی یاد بھی بڑھے گی۔ اس کا فکر بھی بڑھے گا۔ رات دن غور بھی کرے گا۔ تو اُصل چیز محبت نکل آتی ہے یعنی دل میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت پیدا کرو۔ پھر ان کے قانون کی محبت بھی ہوگی۔ ان کے قوانین کی عظمت بھی ہوگی اور التعظیم لِأمر اللّٰہ جو ایمان کا ایک بڑا جز ہے وہ ثابت ہو جائے گا۔

تو پہلی بات یہ ہے کہ اللہ کے اوامر کی تعظیم ہو اور اوامر کی عظمت اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک دل میں اللہ کی عظمت نہ بھری ہوئی ہو۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میدان حشر میں بعض لوگ ایسے بھی آئیں گے جو بے شمار گناہوں کا بار اپنے سر پہ لئے ہوں گے۔ حق تعالیٰ شانہٗ ان لوگوں کے لئے فرماتے ہیں کہ

> ”اے بندے! اگر تو میرے سامنے اتنے گناہ لے کر آئے کہ زمین اور آسمان تیرے گناہوں میں چھپ جائیں۔ تو اتنی بڑی مغفرت لے کر میں تجھ سے ملاقات کروں گا۔ بشرطیکہ میری عظمت تیرے دل کے اندر رہو۔ تو میری بڑائی کو مانتا ہو“۔

بڑائی اور عظمتِ خداوندی وہ ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اگر اتفاقاً و اَحیاناً گناہ بھی سرزد ہو جائے۔ فرماتے ہیں، پرواہ مت کرو بچی توبہ کرلو اور اگر خدانخواستہ توبہ بھی نہ ہوئی، اس کے لئے فرماتے ہیں، اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ نیکیاں خود بدیوں کو مٹادیں گی، عملِ صالح اور نیکی کے اندر لگے رہو۔ تو عملِ صالح میں لگایا گیا تاکہ بدیاں بھی مٹ جائیں اور اگر اس کے باوجود بھی بدیاں سرزد ہوں تو دل کے اندر حق تعالیٰ کے عظمت ضرور رکھو۔

اس کا یہ مطلب نہ سمجھو کہ آج سے آدمی بدیوں پر جرّی ہو جائے کہ جی! بس میں دل کے اندر عظمت و محبت رکھتا ہوں۔ لہٰذا اب میں آزاد ہوں، میں جو چاہوں کروں۔

میں کہتا ہوں، جو بدی کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے قلب کے اندر محبت کی کمی ہے۔ پوری محبت ہے ہی نہیں۔ جس کے قلب میں محبت رَچی ہوئی ہوگی وہ بدی سے خود بخود بچے گا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدّیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ارشاد فرمایا کہ جو بھی بندہ بخشا جائے گا وہ درحقیقت اپنے عمل سے نہیں، اللہ کے فضل سے بخشا جائے گا۔ جب تک فضل متوجّہ نہ ہو، بخشش کی کوئی صورت نہیں ہے خواہ کتنی بڑی نیکیاں ہوں۔

اس پر صدّیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا،

ولا انت یا رسول اللّٰہ ؟ یا رسول اللہ! کیا آپ کی نجات بھی اللہ ہی کے فضل سے ہوگی؟ ___ فرمایا کہ ”میری نجات بھی اللہ ہی کے فضل سے ہوگی“ اگر فضل متوجّہ نہ ہو تو میری بھی نجات کی کوئی صورت نہیں ہے ___ الا ان یتغمدنی اللّٰہ برحمتہ جب تک اللہ ہی اپنی رحمت اور فضل نہ کرے۔ اس کے بغیر نجات کی کوئی صورت نہیں ہے۔

عمل بھی ضروری ہے۔ یہ بھی آپ نے سمجھئے کہ بس فضل کے اوپر آدمی بیٹھا رہے اور یوں کہے کہ فضل

ہو گا' نجات ہو جائے گی۔ پھر عمل کرنے کی ضرورت کیا ہے؟

میں کہتا ہوں عمل کرنا' اس کی دلیل ہے کہ فضل متوجہ ہو چکا۔ اگر عمل نہیں کر رہا تو اس کے معنی ہیں کے اس کے اوپر فضل نہیں ہو رہا۔ تو عمل' فضل کی علامت ہے کوئی بیکار چیز نہیں ہے۔ بہرحال عمل کرا دینا اور عمل قبول کر لینا یہ بھی فضل کی دلیل ہے' اس عمل پر نجات کا ثمرہ مرتب کرنا یہ بھی فضل کی دلیل ہے۔ اول سے آخر تک فضل خداوندی سے کام چلے گا۔ محض ہمارے اعمال کہ ہم اس پر غرّہ کریں' یہ اس درجے کے نہیں ہیں جو ہمیں نجات دلا سکیں۔ جب تک کہ اللہ کا فضل متوجہ نہ ہو۔

اسلام میں اعترافِ عجز روحِ عبادت ہے

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی عمل کتنا ہی کرے۔ اللہ کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس واسطے کہ انعامات لامحدود ہیں۔ اور ہمارا عمل محدود ہو گا۔ ہم خود' ہماری طاقت' ہمارا دماغ' عقل و قوت بھی محدود ہے' عمل جتنا کریں گے وہ ایک حد کے اندر ہو گا اور اللہ کی رحمتوں کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ بارش کی طرح سے ہر ہر آن رحمتیں برس رہی ہیں۔ ان رحمتوں کا حق ادا کرنا حقیقت میں بس کی بات ہے بھی نہیں' ناممکن ہے۔ بس یہی صورت ہے کہ عمل کر کے آدمی یوں کہے'

اے اللہ! مجھ سے کچھ نہیں بن پڑا۔

یہ اپنے عجز کا اعتراف کر لینا یہی حق کی ادائیگی ہے۔ ورنہ حقیقی معنی میں اللہ کے حق کو کون ادا کر سکتا ہے؟

حضرت داؤد علیہ السلام کو فرمایا گیا :

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا ؕ (سبا پ۲۲)

اے داؤد! ہمارا شکر ادا کرو ___ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے کلام کو سب سے زیادہ سمجھنے والے حضرات انبیاء علیہم السلام ہی ہوتے ہیں۔ داؤد علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ! جب شکر کرنے کا آپ کا حکم ہے۔ تو میرا فرض ہے اور میں شکر ادا کروں گا۔ مگر میں حیران ہوں کہ ادا کروں تو کس طرح سے کروں؟ اس لئے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا' اس شکر کی توفیق بھی تو آپ ہی دیں گے۔ تو یہ توفیق خود ایک نعمت ہو گئی۔ اس پر مجھے شکر ادا کرنا چاہئے اور جب اس پر شکر ادا کروں گا تو اس شکر کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے۔ تو پھر یہ ایک نعمت اور آگئی' تو پھر اس پر شکر ادا کرنا چاہئے۔ گویا ہر شکر سے پہلے ایک شکر نکلتا ہے۔ تو میں شکر کی ابتدا کیسے کروں؟ شکر کو انجام کیسے دوں؟ سوائے اس کے کہ اپنے عجز کا اعتراف کروں کہ میں آپ کے شکر ادا کرنے سے عاجز ہوں۔

حق تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا'

> "اے داؤد! تم نے اگر یہ سمجھ لیا کہ تم ہمارے شکر ادا کرنے سے عاجز ہو یہی ہمارے شکر کی ادائیگی ہے کہ اپنی ہاری مان لو اور اپنے عجز کو تسلیم کر لو۔

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو سید الشاکرین ہیں کہ آپ سے بڑھ کر اللہ کا کوئی بندہ شکر گزار نہیں ہے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ'

اللّٰھم لا احصی ثناءً علیک ۔

اے اللہ! میرے بس میں نہیں ہے کہ تیری ثناء اور صفت بیان کر سکوں اور تیرا شکر ادا کر سکوں۔

انت کما اثنیت علی نفسک بس اس کے سوا کیا کہوں۔ تو ویسا ہی ہے جیسے تو نے خود تعریف کی

ہے۔ میری تعریف سے تو بالا تر ہے۔ میرے قبضے میں نہیں ہے کہ تیری تعریف کر سکوں۔ اس عجز کے اعتراف کو بھی حق تعالیٰ نے شکر قرار دیا ہے کہ یہی میرا شکر ہے۔ اس لئے کہ حق ادا کرنا بندے کے قبضے میں نہیں ہے تو اعمال بھی ہمارے ناقص اور نکمے۔ شکر کی ادائیگی سے بھی ہم عاجز۔ پھر سوائے اعتراف عجز کے اور کیا صورت ہے؟ اس کا نام اللہ نے شکر اور عبادت رکھ دیا کہ کرو اور کرنے کے بعد کہو کہ ہم سے کچھ نہ ہو سکا۔

ملائکہ علیہم السلام جو ہزار ہا ہزار برس سے عبادت میں لگے ہوئے ہیں کہ ان میں اربوں کھربوں ملائکہ ایسے ہیں کہ جب سے پیدا ہوئے وہ سجدے ہی میں ہیں۔ کچھ رُکوع ہی میں ہیں اور بعض تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ ساتویں آسمان پر ملائکہ کا قبلہ ہے۔ جس کو بیتُ المعمور کہتے ہیں۔ روزانہ ستّر ہزار فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں اور فرمایا جو ستّر ہزار آج طواف کریں گے، اب اَبد الآباد تک انہیں پھر نوبت نہیں آئے گی۔ اگلے دن پھر نئے ستر ہزار اور پھر نئے۔ تو کروڑوں، کھربوں ملائکہ ہیں جو طواف میں مشغول ہیں۔ اسی طرح اربوں کھربوں ہیں جو صف بندی کئے ہوئے تسبیح و تہلیل میں ہیں۔ اتنی لاکھوں برس کی عبادت کے بعد ملائکہ قیامت کے دن عرض کریں گے،

ما عبدناک حق عبادتک وما عرفناک حق معرفتک ۔

”اے اللہ! ہم نہ تیری عبادت کا حق ادا کر سکے، نہ ہم تیری معرفت پوری کر سکے۔ تو ہماری عبادتوں سے بالا تر ہے“۔

یہ ان کا اعتراف عجز یہی حقیقت میں ان کی عبادت ہے تو عبادت گزار کا کام یہ ہے کہ اپنے عجز کا اعتراف کرے کہ مجھ سے کچھ نہیں بن سکا۔ یہ تواضع و انکسار اور یہ کسرِ نفس یہی اسلام میں عبادت کی روح ہے۔ اسی سے انسان کی مقبولیت بڑھتی ہے۔

بہرحال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قانونِ خداوندی کی عظمت نہیں ہو سکتی جب تک اللہ کی عظمت دل کے اندر نہ ہو اور اس عظمت کا تقاضا یہی ہوگا کہ ہمہ وقت زبان سے، قلب سے، دماغ سے اور اعضاء و جوارح سے بھی اطاعت و عبادت میں مشغول رہیں۔ ہر اعتبار سے ہم شکر گزار بنے رہیں۔

اور شکر گزاری یا عظمت کا اعتراف فقط زبان سے نہیں ہوتا، دل سے بھی ہوتا ہے۔ روح سے بھی اور عمل سے بھی ہوتا ہے۔ جتنا اطاعت کا عمل بڑھے گا تو عملی شکر بڑھے گا، جتنا زبان سے الحمدللہ کہیں گے۔ یہ اظہارِ عظمت کا شکر ہوگا، جتنا دماغ میں سوچیں گے کہ اللہ سب سے بڑی ذات ہے۔ یہ اس کی عظمت کا دماغ اعتراف کر رہا ہے۔ عقل سے جتنے دلائل اس کی عظمت کے قائم کریں گے یہ عقل کا اعتراف عظمت ہے کہ وہ بھی مانتی ہے ہ عظمت والی ذات وہ ہے۔ جتنی آپ کے وجدان اور ضمیر میں عظمت بیٹھے گی۔ یہ قلب کا اعتراف ہے کہ وہ عظمت کو ظاہر کر رہا ہے تو رگ و پے سے عظمت کا اعتراف ہونا چاہئے۔ وجدان، ارکان، زبان و لسان اِلغرض ہر اعتبار سے اس کی عظمتوں کا اعتراف چاہئے، جتنا شکر ادا کیا جائے گا، اتنی عظمت نمایاں ہوگی اور پھر بھی یہ کہہ دینا چاہئے کہ ہم حق ادا نہیں کر سکے۔

بہرحال اس عظمت کے بعد اب فرماتے ہیں کہ جب تم اس مقامِ عظمت پر آجاؤ گے، اگر تم سے گناہ بھی سرزد ہوں گے تو پرواہ مت کرو۔ میں اتنی بڑی بخشش لے کر تم سے ملاقات کروں گا اس لئے اگر عظمت ہے تو بندہ تو خطا و نسیان سے مرکّب ہے یہ غلطی کرے گا آخر بشریت ہے۔ معصوم صرف انبیاء علیہم السلام بنائے گئے ہیں اور محفوظ اولیاء اللہ ہی بنائے گئے ہیں۔

ہم اور آپ تو رات دن گناہوں میں غرقاب ہیں۔ اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ فضل خداوندی متوجہ ہو اور وہ بغیر عظمت کے متوجہ نہیں ہوتا۔ اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ اس لئے عظمت کا اعتراف دل میں ہوگا' تو قانونِ خداوندی کی عظمت بھی دل میں ہوگی اور جب اس کے قانون کی عظمت دل میں بیٹھے گی تو عمل درآمد دل کے لگاؤ سے ہوگا۔ خواہ وہ دیانات ہوں' خواہ وہ عبادات ہوں' خواہ وہ معاشرت ہو' انفرادی و جماعتی زندگی ہو' شہری زندگی ہو۔ جب قانون کی عظمت ہوگی تو آدمی بغیر قانون کس طرح نہیں چلے گا؟ ضرور چلے گا۔ ہر آن اس کو اس پر توجہ رہے گی کہ اس بارے میں میرے پروردگار کا کیا حکم ہے جو میں اس پر چلوں اور کس طریق پر عمل درآمد کروں۔

عظمت و محبتِ خداوندی ہی ایمان کی بنیاد ہے

بہرحال پہلی بنیاد التعظیم لِاَمْرِ اللّٰہ ہے۔ یہ ایمان کا پہلا رُکن ہے۔ اگر عظمت نہیں ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ قلب کے اندر ایمان نہیں ہے۔ پھر عظمت کے بھی درجات ہیں۔ ایک درجہ عظمت کا وہ ہے جو عوام مؤمنین کے دل میں ہوتا ہے اور ایک وہ ہے جو اولیاءِ عظام اور علماءِ ربانیین کے دل میں ہوتا ہے اور ایک وہ ہے جو ائمہ کرام کے دلوں میں ہوتا ہے۔ ایک وہ ہے جو صحابہ کرامؓ کے قلوب میں تھا۔ ایک وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے دلوں میں تھا۔ اسی طرح ایمانوں میں بھی فرق ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا ایمان سب سے اعظم ترین ایمان ہے۔ صحابہ کرامؓ کا ایمان اس کے بعد تابعین کا' اس کے بعد ہم جیسے عوام کا ایمان سب سے آخر کا درجہ ہے۔ تو جیسے درجات عظمت کے ہیں۔ ویسے ہی درجات ایمان کے بھی ہیں۔ بہرحال جب نفس عظمت میں شرکت ہوگی تو ظاہر بات ہے کہ قانون کی عظمت بھی ہوگی۔ جب عظمت ہوگی' پھر محبت بھی ہوگی۔ محبت ہوگی تو آدمی کے دل میں قانون پر عمل درآمد کرنے کی لگن پیدا ہو جائے گی۔

یہی محبت تھی جس نے حضرات صحابہ کرامؓ کو مجبور کیا کہ گھر بار انہوں نے چھوڑا' جائیدادیں انہوں نے ترک کیں' وطن چھوڑ کر بے وطن ہوئے۔ اپنی لذتیں ترک کیں' اپنا آرام و آسائش تج دیا۔ کس لئے؟ محض محبتِ نبوی اور عظمتِ خداوندی کی وجہ سے' جب محبت دل میں بیٹھ گئی تو ہر چیز اس کے سامنے ہیچ بن گئی۔ تو ہجرت کر کے وطن چھوڑ کر کے اللہ کے رسول کے ساتھ آ گئے۔ جانیں الگ قربان کیں' مال الگ چھوڑا' اولاد کو' عزیزوں کو' رشتہ داروں کو الگ چھوڑا' اگر محبت و عظمت نہ ہوتی' یہ اتنے بڑے بڑے کام ان سے سرزد نہیں ہو سکتے تھے۔

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں روایات میں فرمایا گیا ہے کہ جب غزوۂ بدر ہوا تو حضرت صدیق اکبرؓ کے چھوٹے صاحبزادے اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے' وہ کفّار کے لشکر میں مسلمانوں کے مدِّمقابل تھے' غزوۂ بدر کے بعد ایمان کی توفیق ہوئی اور ایمان لے آئے۔ ایمان لانے کے بعد ایک دفعہ اپنے والد صدیق اکبرؓ سے کہنے لگے کہ'

> "اے میرے والد! جنگ بدر کے اندر کئی دفعہ ایسا موقع آیا کہ آپ میری زد کے نیچے تھے' اگر میں تیر چلاتا یا تلوار سے آگے بڑھ کر مقابلہ کرتا' میں آپ کو ختم کر سکتا تھا' مگر میں نے یہ خیال کیا کہ یہ میرے باپ ہیں۔ میرے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ یہ میرے ہاتھ سے قتل ہوں۔ اس لئے میں باپ ہونے کی عظمت کی وجہ سے رُک جاتا تھا"۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا'

"اے میرے بیٹے! اگر تو میری زد پر آجاتا تو میں سب سے پہلے تجھے قتل کرتا پھر میں دوسروں کی طرف بڑھتا اس لئے کہ جب دل میں اللہ کی محبت آگئی تو پھر کسی دوسرے کی محبت کی سمائی کا دل میں کیا سوال' پھر کہاں کی اولاد اور کہاں کی بنیاد؟ جب میں اللہ کے لئے کھڑا ہوا تو میں پہلے اس کو دیکھتا جو دشمنِ خدا ہے اور میرا عزیز بھی ہے تاکہ میں اپنی عزیزداری کو حق تعالیٰ کی دشمنی سے پاک کردوں۔ میں پہلے تجھے قتل کرتا"۔

اولاد کے حق میں یہ جذبہ پیدا ہو جانا' ظاہر بات ہے کہ عظمت و محبت خداوندی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس درجہ کی محبت رچ بس گئی تھی کہ اصول و فروع کی محبت ہی نہ رہی تھی۔

اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں'

لا یؤمن احدکم حتی اکون احبّ الیہ من ولدہ و والدہ والناس اجمعین۔

کوئی بھی تم میں سے اس وقت تک کامل الایمان مؤمن نہیں بن سکتا جب تک کہ میرے ساتھ اتنی محبت نہ ہو کہ اتنی محبت اپنی اولاد ماں باپ سے نہ ہو جب تک اتنی محبت غالب نہیں آجائے گی اس وقت تک مت سمجھو کہ تم میں کمال ایمان پیدا ہو گیا۔ ظاہر بات ہے کہ ایمان کی بنیاد محبت نکل آتی ہے۔ یہ نہ ہو تو ایمان متحقق نہیں ہو سکتا۔

ایک محبت تو طبعی ہے جو اولاد کے ساتھ ہوتی ہے اور اولاد کو اپنے ماں باپ کے ساتھ ہوتی ہے اور ایک محبت عقلی ہے۔ ایمان عقلی محبت کا نام ہے' طبعی محبت کا نام نہیں ہے۔ طبعی طور پر آدمی اپنی اولاد سے زیادہ محبت کرتا ہے لیکن عقلاً یہ سمجھتا ہے کہ زیادہ محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ محبوب حقیقی حق تعالیٰ شانہٗ ہیں۔ اس واسطے جب اللہ کے حکم اور اولاد کا مقابلہ پڑتا ہے وہ اولاد کو دھکا دے دیتا ہے اور حکم خداوندی کو آگے رکھتا ہے۔ یہ عقلی محبت ہے' محض طبعی جذبہ نہیں ہے تو ایمان عقلی محبت و عظمت کا نام ہے۔ یہ پہلا رکن ہے۔

ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ

دوسرا رکن یہ ہے کہ الشفقۃ علی خلق اللّٰہ جتنا آدمی اللہ کی طرف جھکے اتنا ہی اس کی مخلوق کی خدمت کی طرف متوجہ ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ'

الخلق عیال اللّٰہ' فاحبّ الخلق الی اللّٰہ من یحسن الی عیالہ۔

ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے' اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی قید نہیں ہے۔ جتنے بندگانِ خدا ہیں وہ سب خدا کے کنبہ ہیں۔ اس کی پیدا کی ہوئی چہیتی مخلوق ہے۔ اللہ کو سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی مخلوق کے ساتھ احسان و سلوک کے ساتھ پیش آئے۔ وہی اللہ کا سب سے زیادہ چہیتا ہے ____ بہرحال جیسے اللہ کی محبت لازمی ہے' اسی طرح سے فرمایا گیا مخلوق کی شفقت کو لازمی سمجھو۔

اگر مخلوق ستم رسیدہ ہے' مظلوم و بے کس ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی مدد کرے۔ اگر کوئی غیر مسلم بھی مصائب میں پھنس جائے اور مسلم دیکھ رہا ہے کہ وہ مصیبت زدہ ہے تو مسلم کا کام یہ ہے کہ اس کو بھی

مصیبت سے نجات دلائے۔ جتنا بھی اس کے بس میں ہے۔ اس کو بھی ظلم و ستم اور پریشانی سے چھڑائے۔ بہرحال مخلوق کی خدمت یہ شفقت کے لئے ضروری ہے۔ جب تک مخلوق کی خدمت نہ ہو شفقت نہیں پائی جاسکتی۔

خدمت کے پھر دو درجے ہیں۔ ایک درجہ نفع رسانی کا ہے' ایک درجہ ضرر رسانی سے بچ جانے کا۔ تکلیف نہ پہنچاؤ' نفع چاہے پہنچا سکو یا نہ پہنچا سکو۔ تو ایک درجہ کفُ الاذیٰ کا ہے یعنی اپنی ایذا رسانی کو روک دو۔ اذیت مت پہنچاؤ اور ایک یہ کہ اس سے آگے بڑھ کر اس کی مخلوق کو نفع اور راحت پہنچاؤ۔ اوّلین درجہ یہ ہے کہ تم سے کسی مخلوق کو ضرر و اذیّت نہ پہنچے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو سمجھو کہ ایمان نہیں ہے۔ اگر آدمی کسی دوسرے کو تکلیف میں مبتلا دیکھے یا ایسے سامان ہوں کہ یہ مبتلا ہو جائے گا۔ آدمی کا فرض ہے کہ اسے متنبّہ کر دے' اگر متنبّہ بھی نہ کرے آنکھ بند کر کے گزر جائے تو سمجھ لو کہ قلب کے اندر ایمان نہیں ہے۔ ورنہ ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ دوسرے کو متنبّہ کر دے کہ یہ تکلیف کا راستہ ہے اس پر مت جاؤ' اسی واسطے فرمایا گیا'

ادنٰھا اماطۃ الاذیٰ عن الطریق۔

ایمان کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ راستوں سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹائے جس سے کسی کو تکلیف پہنچے۔ کانچ کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔ انہیں اٹھا کر راستے کو صاف کر دے۔ اینٹیں پڑی ہوئی ہیں جن سے لوگوں کو ٹھوکریں لگیں گی۔ اٹھا دے تاکہ مخلوق کو اذیت نہ پہنچے۔ یہ ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو فرماتے ہیں کہ قلب کے اندر ایمان نہیں ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تین قسم کے آدمی ہیں جن پر حق تعالیٰ لعنت کرتے ہیں۔ ایک وہ جو سڑک کے اوپر ایذا دہ چیزیں ڈال دے۔ ایک وہ کہ مَوارِدِ عامہ میں جہاں لوگ بیٹھتے ہوں' راحت اٹھاتے ہوں' وہاں بول و براز کر کے جگہ کو پراگندہ کرے۔ جیسے کوئی درخت کا سایہ ہے لوگوں کی بیٹھنے اٹھنے کی جگہ ہے وہاں پر آدمی نجاست ڈال دے یا بول براز کرے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس پر ہماری طرف سے لعنت ہے۔ اسی طرح سے کسی ایسی تکلیف کا سامان کر دے کہ مخلوق کو ٹھوکر لگ رہی ہے یا مخلوق کو کانٹے چبھ رہے ہیں جو اس نے پھیلا دیئے ہیں۔ اب لوگ تکلیف میں پڑتے ہیں تو یہ خوش ہوتا ہے۔ گویا اس کی تفریح ہو رہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ سمجھو ایسے شخص میں ایمان نہیں ہے۔ وہ حق تعالیٰ کی لعنت کا مستحق ہے۔ تو جہاں یہ بتلایا گیا کہ اللہ کی عظمت کرو' وہاں یہ بھی بتلایا گیا کہ مخلوق کی خدمت کرو اور خدمت کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کم سے کم اذیّت دوسروں کو مت پہنچاؤ۔

مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں

خیر کی امید نہیں تو کم سے کم آدمی بدی نہ پہنچائے۔ دوسرے کے واسطے ایذا زدہ نہ بنے۔

یہ گویا لازمی سمجھا گیا ہے کہ نہ قول سے ایذا پہنچاؤ نہ عمل سے ایذا پہنچاؤ' نہ کسی ہیئت سے ایذا پہنچاؤ جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے :

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ (حجرات پ ۲۶ آیت ۱۱)

لَمز بھی مت کرو۔ کسی کو کَن انکھیوں سے آنکھ مار دینا' پھبتی اُڑانے کے وقت آدمی آنکھوں سے اشارہ کیا کرتا ہے جس سے دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے۔ اس کی مخالفت فرمائی گئی کہ تمہاری آنکھ کو بھی حق نہیں ہے کہ دوسرے کے لئے ایذا رسانی کا سبب بنے وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بُرے لقب سے بھی یاد نہ کرو ____ جیسے حدیث میں فرمایا گیا کہ کوئی کسی کو کہے یا کافر' یا فاسق ____ فرمایا ایمان کے بعد ایسے بُرے القاب؟ بِئْسَ

اَلْاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ایمان کے بعد فسق و فجور مت اختیار کرو کہ لوگوں کو بُرے القاب سے یاد کرو یا خطاب کرو۔ بعض لوگ دوسروں کو بُرے بُرے القاب سے مخاطب کرتے ہیں' وہ بیچارے شرمندہ ہوتے ہیں۔ اس کی مخالفت فرمائی گئی۔ فرمایا گیا'

لَایَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَانِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ ۔

ایک دوسرے کے ساتھ تمسخر بھی مت کرو۔ پھبتی بھی مت کسو' ایسا مذاق بھی مت کرو کہ دوسرے کے دل کو صدمہ پہنچ جائے۔ تم جو دوسرے کو تمسخر اور اس کی تحقیر کر رہے ہو' تمہیں کیا خبر ہے کہ اللہ کے ہاں وہ زیادہ مقبول ہو اور تمہاری قبولیت اتنی نہ ہو۔ اس لئے فرمایا تمسخر بھی مت کرو' لمز بھی مت کرو۔ تکلیف دہ ہیئت بھی مت بناؤ۔ جیسے زمانۂ جاہلیت میں دستور تھا کہ یہ انگلی اگر کسی نے ذرا سی اٹھادی تو تلوار کھنچ جاتی تھی۔ چڑانے کی انگلی سمجھی جاتی تھی۔ گویا انگلی کا اٹھا دینا گالی دینا تھا۔ اسی واسطے اس انگلی کا نام "سبّابہ" تھا۔ یعنی گالم گلوچ کی انگلی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام بدلا اور فرمایا اسے "سبّاحہ" کہو یعنی اللہ کی پاکی بلند کرنے کی انگلی اور نمازوں میں اس انگلی کو اٹھاؤ جب کلمۂ شہادت اشہد ان لا الہ الا اللّٰہ پڑھو ___ تو بجائے سبّابہ کے سبّاحہ اس کا نام رکھا کہ یہ گالم گلوچ کی انگلی نہیں ہے بلکہ تسبیح و تہلیل ہے اور طاعت و عبادت کی انگلی ہے۔ اس نام کو بھی چھوڑ دو جو زمانۂ جاہلیت کا نام ہے۔

کمالِ ایمان کیسے نصیب ہو سکتا ہے؟

بہرحال کسی ایسی ہیئت سے اشارہ کرنا یا جیسے کسی زمانے میں انگوٹھا دکھلا دینے کا دستور تھا جس سے دوسرا چڑ جائے۔ وہ ایسا ہی ہے جیسا زمانۂ جاہلیت میں شہادت کی انگلی دکھا کر چڑا دینا سمجھا جاتا تھا۔ ان تمام چیزوں سے روکا گیا تاکہ ایک مسلم دوسرے مسلم کے لئے ایذا رسانی کا باعث نہ بنے۔

فرمایا گیا'

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده۔

مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ نہ زبان سے ایذا پہنچائے نہ ہاتھ سے ___ کہیں فرمایا گیا :

المؤمن من امنه الناس علی دمائهم واموالهم۔

مؤمن کون ہے؟ جس سے لوگ اپنی جان' مال' آبرو کے بارے میں امن میں ہوں اور مطمئن ہو جائیں' لوگ یوں سمجھیں کہ ہماری جان بھی محفوظ ہیں اس لئے کہ یہ مؤمن ہے یہ جان کے اندر خیانت نہیں کرے گا۔ ہماری آبرو بھی محفوظ ہے اس لئے کہ یہ مؤمن ہے خائن نہیں ہے۔

اور یہاں پر لفظ من امنه الناس ہے یعنی لوگ مطمئن ہوں۔ اس میں یہ بھی قید نہیں کہ مسلمان ہی مطمئن ہوں بلکہ غیر مسلم بھی مطمئن ہو جائیں کہ یہ موذی نہیں ہے۔ یہ ایماندار ہے تو ایمان کی علامت یہ بتلائی گئی کہ ہر کس و ناکس اس کے معاملات کو دیکھ کر یہ سمجھ لے کہ یہ مؤمن ہے۔ اس سے مال' جان' آبرو میں کوئی خطرہ نہیں۔ اس لئے کہ یہ کسی میں بھی خیانت نہیں کرے گا۔ بہرحال مؤمن کی شان یہ ہوئی کہ اس کے اندر خدمت خلق کا جذبہ بھرا ہوا ہو اور بلا استثناء ہر مخلوق کی درجہ بدرجہ خدمت کرے۔ جس کے دل میں محبت خداوندی ہوگی' اس کے دل میں اس کی مخلوق کی محبت ہوگی اور جب مخلوق کی بھی محبت ہوگی تو اسے چین

نہیں آگے گا کہ کوئی شخص اذیت و تکلیف کے اندر رہے۔ وہ سعی کرے گا کہ اس کی تکلیف رفع کروں۔ کم سے کم اس کی اذیت و تکلیف کا ذریعہ نہ بنوں اور اس کی جان و مال محفوظ رہنا چاہئے۔

اگر خدانخواستہ مومن ایسا ہو جائے کہ لوگ اس سے دور ہٹنے لگیں کہ بھائی! کہیں یہ چھری نہ مار دے' کہیں جیب نہ کتر لے' کہیں گالی نہ دیدے۔ تو وہ مومن کیا؟ وہ تو اچھا خاصا بیل ہے۔ بیل جب چلتا ہے تو لوگ پہلو بچا کر چلتے ہیں کہ بیل ہے کہیں لات نہ مار دے' کہیں دم نہ مار دے' کہیں پیشاب نہ کر دے' چھینٹا نہ پڑ جائے ___ اگر مومن سے بھی یہ کھٹک پیدا ہو گئی کہ کہیں چھری نہ مار دے' جیب نہ کتر لے وہ بھی پھر بیل بڑا مومن وہ ہے جس سے لوگ مطمئن ہو جائیں کہ یہ نہ ہماری جان کا لیوا ہے نہ آبرو گرانے والا ہے نہ مال میں خیانت کرنے والا۔ غائبانہ بھی خیانت نہ کرے بلکہ حفاظت کرے۔

ہمارے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے ایک مرید تھے' اچھے بڑے صالح لوگوں میں سے تھے۔ وہ سہارنپور سے اپنے وطن کانپور جا رہے تھے۔ سہارنپور کے گنے مشہور ہیں۔ انہوں نے کافی مقدار میں گنے خرید کئے۔ اب وہ جا کے کانٹے پر ڈالے تاکہ تلواؤں' اس لئے کہ وہ اس مقدار سے زیادہ تھے جو ایک ٹکٹ میں لے جائی جا سکتی ہے۔ تولنے والے بابو نے دیکھا کہ ایک نیک صالح آدمی' صورت بھولی بھالی' اس کے چہرے پر ایمانداری برس رہی ہے اس نے کہا مولوی صاحب! تلوانے کی ضرورت نہیں' بس تم ویسے ہی لے جاؤ۔

انہوں نے کہا صاحب! آپ تو کہہ رہے ہیں کہ ویسے ہی لے جاؤ۔ اگر میں لے گیا اور ریل میں چیکر آ گیا اور اس نے مال چیک کیا۔ وہ کہے گا یہ مال زیادہ ہے۔ وہ میرے سے جرمانہ بھی وصول کرے گا۔ میں یہاں تھوڑا دے کر چھوٹتا ہوں' وہاں زیادہ دینا پڑے گا۔ آپ مجھے کیوں زیادہ میں پھنسا رہے ہیں؟

اس نے کہا۔ نہیں' ہم چیکر سے کہہ دیں گے وہ آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ انہوں نے کہا صاحب' غازی آباد سے گاڑی بدلے گی وہاں دوسرا چیکر آئے گا' اس نے چیک کیا تو جتنا لمبا راستہ ہوتا جائے گا محصول و جرمانہ بھی بڑھتا جائے گا۔

اس نے کہا ہم اس سے کہہ دیں گے کہ وہ اس چیکر سے کہہ دے گا کہ بھئی! انہیں مت ستانا اور یہ مال لے جانے دو۔

انہوں نے کہا صاحب! اس نے چھوڑ دیا۔ لیکن جب میں کانپور کے اسٹیشن پر اتروں گا اور میرے پاس جو وزن زیادہ ہو گا تو وہ بابو کہے گا کہ یہ اپنا ٹکٹ دے رہے ہو' اس مال کا ٹکٹ کہاں ہے؟ تب میں کیا کہوں گا؟

اس نے کہا ہم اس دوسرے چیکر سے کہلا دیں گے۔ وہ اس بابو سے کہہ دے گا۔ آپ کو پاس کر دیا جائے گا۔ آپ بے فکر ہو کر لے جائیں۔

انہوں نے کہا پھر کیا ہو گا؟ اس نے کہا پھر کیا ہو گا۔ پھر آپ کا گھر آ جائے گا۔

انہوں نے کہا کہ اللہ میاں جو میرے سے پوچھیں گے کہ ریلوے کے مال میں خیانت کیوں کر کے آیا تھا؟ قیامت کے دن جو باز پرس ہو گی' تو میں کیا جواب دوں گا؟

اس نے حیرت سے دیکھ کر کہا کہ یہ کوئی مجنون اور دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ گویا اللہ کا نام لینا اس کے نزدیک دیوانگی تھی۔ حقیقت یہی ہے ۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد
اوست فرزانہ کہ فرزانہ نہ شد

دیوانہ وہ ہے جو اللہ کا دیوانہ نہیں بنتا' فرزانہ وہ ہے جو فرزانہ نہیں ہے۔ ہر وقت غرور میں مبتلا ہے ___

اکثروا ذکر اللّٰہ حتی یقولوا مجنون۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اتنی اللہ اللہ کرو کہ لوگ تمہیں دیوانہ اور مجنون کہنے لگیں۔ ایک سودا اس کے دل کے اندر سما جائے۔ جب دیکھو اللہ اللہ' جب دیکھو اللہ اللہ۔ معلوم ہوتا ہے دیوانہ ہے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کیا اور اس میں فرمایا کہ ہمارے حضرت استاذ یہ فرماتے تھے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیا العلوم میں امام اوزاعیؒ کا مقولہ نقل کیا ہے'

امام اوزاعیؒ تیسرے قرن کے اکابر علماء میں سے ہیں۔ امامت کا رتبہ رکھتے ہیں۔ امام اوزاعیؒ نے اس وقت کے مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر کہا تھا کہ

"اگر صحابہ کرامؓ آج قبروں میں سے نکل آئیں تو ہم تو انہیں مجنون کہیں گے اور وہ ہمیں کافر کہیں گے کہ وہ اسلام جو دنیا کے اندر ہم چھوڑ گئے تھے وہ تو گیا۔ اب اس کا وجود کہاں ہے؟"۔

یہ امام غزالیؒ نے امام اوزاعیؒ کا مقولہ نقل کیا ہے۔ اس پر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ

"میں یہ کہتا ہوں اس زمانے میں اگر قبر سے نکل کر امام غزالیؒ آجائیں تو وہ ہمیں کافر کہیں گے اور ہم انہیں مجنون کہیں گے"۔

اور شیخ الہندؒ نے فرمایا۔

"اگر میرے استاذ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے زمانے کے لوگ قبروں سے نکل کر آجائیں تو وہ ہمیں کافر کہیں گے' ہم انہیں مجنون کہیں گے"۔

حقیقت یہی ہے کہ دیوانہ تو وہی ہے جسے لوگ دیوانہ کہیں اور خدا کا دیوانہ اللہ کا مجنون کہ ہر وقت اللہ ہی کا نام ہے۔ اسی ہی کی رٹ ہے۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے جب تک یہ جنون نہیں سمائے گا' ایمان کا کمال نہیں ہو سکتا۔

حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ علیہ عنہ جلیل القدر صحابیؓ ہیں۔ صاحبُ سرِّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا لقب ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اَسرار اور فِتَن کے بارے میں آپؐ نے جو پیشین گوئیاں فرمائیں' ان کے اَسرار ان کے قلب میں محفوظ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے بہت سے واقعات بیان کرتے تھے اور یہ بھی فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک آنے والے فتنے مجھے بتلادیئے ہیں۔ فتنہ پردازوں کے نام اور ان کے نسب نامے بھی بتلادیئے ہیں کہ فلاں فلاں وقت میں فلاں فلاں فتنہ پرداز کھڑا ہوگا۔ لیکن ان کو زبان سے ادا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ فتنوں کے بارے میں ان سے کچھ احادیث مروی ہیں گویا اَسرارِ نبوّت کے امین ہیں۔ اَسرارِ نبوّت ان کے قلب میں ہیں ___ ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ جب ایران فتح ہوا اور اس کا دارالسلطنت بغداد تھا۔ یہ وہاں پہنچے تو آپ کھانا کھا رہے تھے' ایک فارسی غلام کھڑا ہوا کھانا کھلا رہا تھا۔ پانی وغیرہ لئے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔ تو حضرت حذیفہ ابن یمانؓ کے ہاتھ سے کھانا کھاتے ہوئے اتفاق سے ایک لقمہ گر پڑا۔ آپؓ نے فوراً لقمے کو اٹھایا۔ اس کی مٹی جھاڑ کر صاف

کیا اور تناول فرمالیا ــــ اس فارسی غلام نے کہا یہ آپ نے کیا کیا ــــ ؟ یہ متمدن لوگوں کا ملک ہے یہاں تہذیب اور شائستگی بہت پھیلی ہوئی ہے۔ زمین پر سے لقمہ اٹھا کر کھالینا' لوگ اس کو عیب شمار کریں گے اور کہیں گے کہ یہ حرص و ہوس ہے' زمین پر پڑا ہوا ٹکڑا اٹھا کے کھالیا؟ یہ تمیز کے خلاف ہے۔ آپ ایسا نہ کریں ورنہ لوگ آپ کے اوپر ملامت کریں گے' مذاق اڑائیں گے۔

اس کے جواب میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

اتر ک سنۃ حبیبی لھؤلاء الحمقاء ــــ "کیا میں اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ان احمقوں کی وجہ سے چھوڑ دوں؟"۔ اس سنت میں جو برکت ہے وہ دنیا و مافیہا میں برکت نہیں ہے۔ سبحان اللہ۔

جب تک اس درجے کا جنون دل میں نہ سماجائے کہ ایک ایک سنت پر آدمی جم جائے اور دانت سے مضبوط پکڑلے کہ دنیا کی ملامت کا خوف ترک کردے' اس وقت تک کمال ایمان نصیب نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں ایمان نام ہی جنون کا ہے۔ مگر جنون عشق کا نام ہے اور عشق بھی اللہ کا' کسی غیر اللہ کے عشق کا نام ایمان نہیں ہے۔ جب عشق دل میں گھر کر جاتا ہے تو عاشق تو واقعی مجنون سا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ غیر محبوب اس کے دل سے محو ہو جاتا ہے۔ وہ تذکرہ کرے گا تو محبوب کا' نام لے گا تو محبوب کا' فکر ہوگی تو محبوب کی۔ غرض جنہیں عشق کی دولت میسّر نہیں وہ انہیں مجنون نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے؟ اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ــــ **قل اللّٰہ اللّٰہ حتیٰ تقل مجنون** اتنی اللہ اللہ کرو کہ لوگ تمہیں مجنون کہنے لگیں۔

اسی بنا پر امام اوزاعیؒ نے کہا تھا کہ اگر آج صحابہ کرامؓ اپنی قبروں میں سے نکل کر آجائیں تو ہم انہیں مجنون کہیں گے وہ ہمیں کافر کہیں گے۔ ہم کہیں گے یہ دیوانے ہیں۔ سوتے اور جاگتے انہیں ایک ہی لگن ہے۔ وہ ہمیں کافر کہیں گے۔ وہ ذکر اللہ کی لگن اور وہ اسلام کہاں گیا جو ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ بہرحال دل کی لگن اور تڑپ کا نام ایمان ہے کہ دل میں ایک نسبت پیدا ہو جائے اور آدمی اللہ کی طرف متوجّہ ہو جائے' کھانے' پینے' سونے' جاگنے میں ایک ہی کا نام اور ایک ہی کا ذکر ہو۔

مؤمن کا کوئی لمحہ ذکر اللہ سے خالی نہیں ہونا چاہئے

آخر احادیث میں جو مختلف اوقات کے اذکار بتلائے گئے ہیں کہ مؤمن کا کوئی لمحہ ایسا نہ گزرے کہ اللہ کی طرف وہ توجّہ نہ کرے۔ گھر سے باہر نکلے تو دعا پڑھے :

بسم اللّٰہ اٰمنا باللّٰہ توکّلنا علی اللّٰہ لاحول ولا قوّۃ الا باللّٰہ ۔

گھر میں داخل ہو تو کہو :

اللّٰھم انا نسلک خیر المولج و خیر المخرج بسم اللّٰہ ولجنا وبسم اللّٰہ خرجنا وعلی اللّٰہ ربّنا توکلنا۔

استنجا کے لئے داخل ہو تو کہو :

اللّٰھم انی اعوذبک من الخبث و الخبائث ۔

استنجا کر کے باہر آؤ تو کہو :

الحمد للّٰہ الذی اذھب عنی الاذیٰ وعا فانی۔

لباس پہنو تو کہو :

الحمد للّٰہ الذی کسانی ھٰذا و رزقنیہ من غیر حول منی ولا قوۃ۔

دوستوں سے مصافحہ کرو تو کہو :

نحمد اللّٰہ تعالٰی و نستغفرہ ۔

ہم اللہ کی حمد کرتے ہیں اور اس سے استغفار کرتے ہیں۔ دستر خوان پر کھانا کھانے بیٹھو تو کہو بسم اللّٰہ اور فارغ ہو جاؤ تو کہو :

الحمد للّٰہ کثیرا۔

پھر اس کے وعدے دیئے گئے کہ اگر کسی نے بسم اللّٰہ سے کھانے کی ابتدا کی اور الحمد للّٰہ کثیرًا پر ختم کیا غفرلہ ما تقدّم من ذنبہ پچھلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں تو گناہوں کی مغفرت کا وعدہ الگ دیا گیا' تو مؤمن کا کوئی لمحہ فارغ نہیں ہونا چاہئے۔ سونے کے لئے لیٹو تو کہو :

باسمک اللّٰھم اموت واحییٰ۔

"اے اللہ! تیرے ہی نام پر مر رہا ہوں اور تیرے ہی نام پر زندہ ہوں گا"۔

جب صبح کو اٹھو تو کہو :

الحمد للّٰہ الذی احیانا بعد ما اماتنا و الیہ النشور۔

"اس اللہ کے لئے حمد ہے جس نے موت کے بعد پھر مجھے زندگی بخشی اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے یا جمع ہونا ہے اور پھیلنا ہے"۔

آفتاب نکلے تو فوراً دعا بتلائی :

الحمد للّٰہ الذی جللنا الیوم عافیۃ وجاء بالشمس من مطلعھا۔ اللّٰھم إنی اشھدک واشھد حملۃ عرشک و ملٰئکتک و جمیع خلقک انک انت اللّٰہ لا الہ الا انت ۔

"اس اللہ کے لئے حمد ہے جس نے دن چمکا دیا۔ جس نے سورج کو نکالا۔ اے اللہ میں تجھے بھی گواہ کرتا ہوں۔ تیرے حملہ عرش کو بھی گواہ کرتا ہوں تیرے ملائکہ کو بھی گواہ کرتا ہوں اور تیری تمام مخلوق کو گواہ کرتا ہوں کہ میں شاہد ہوں۔ تو اللہ ہے' تو یکتا ہے اور تیرا کوئی شریک اور سہیم نہیں ہے"۔

اسی طرح فرمایا' بیوی کے پاس جاؤ تو یہ دعا پڑھو :

بسم اللّٰہ اللّٰھم جنّبنا الشیطن و جنّب الشیطن مارزقتنا۔

اولاد کی خبر سنو تو یہ دعا پڑھو۔ نیا پھل سامنے آئے تو یہ دعا پڑھو۔ غرض تمام اوقات کی سینکڑوں دعائیں ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ مؤمن کی زندگی کو ہر آن ذاکر کی زندگی بنایا گیا ہے۔ وہ ہر آن اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ توحید کا سبق پڑھتا رہے۔ ایک ہی کی طرف جھکنا' ایک ہی کے لئے جینا' ایک ہی کے لئے مرنا۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ جیسا کہ

ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا گیا :

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۔

”اے ابراہیم! مسلم بن جاؤ“۔

اس مسلم بننے کے یہ معنی نہیں تھے کہ کلمہ پڑھ کر آج مسلم بن جاؤ۔ آپ تو پیغمبر ہیں اور پیغمبر بھی اُولوالعزم، ہزار ہا پیغمبروں کے والد بزرگوار ہیں۔ خلیل اللہ کا لقب ہے۔ تو یہ مطلب نہیں تھا کہ اب تک مسلمان نہیں۔ اب کلمہ پڑھ کر مسلمان بن جاؤ۔ مسلم بننے کے معنی گردن جھکا دینے کے ہیں۔ یعنی اپنے آپ کو ہمارے حوالے اور سپرد کردو کہ نہ تمہاری مرضی رہے اور نہ ارادہ رہے۔ جو کچھ ہو ہماری مرضی اور ہمارا ارادہ ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا :

قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (بقرہ پ۱ آیت ۱۳۱)

”اے اللہ! میں مسلم بن گیا“۔

میں نے اپنے آپ کو سونپ دیا۔ آپ کے حوالے کردیا۔ جو چاہیں آپ کریں۔ جب یہ کردیا تو اب یہ اعلان کردو :

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ (انعام پ۸ آیت ۱۶۲، ۱۶۳)

ابراہیم! کھلے بندوں کہہ دو، میری نماز، میرا حج، میرا مرنا اور میرا جینا، اور مرنے اور جینے کے درمیان جتنے افعال ہیں وہ خود سارے اس کے اندر آگئے۔ تو سونا، جاگنا، کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا۔ سب اللہ کے لئے ہے۔ میرے نفس کے لئے کچھ نہیں۔ جس کا کوئی شریک اور سہیم نہیں ہے۔ اسی کا مجھے امر کیا گیا ہے اور آج میں ہی اول مسلم ہوں۔

تو اسلام کے معنی گردن جھکا دینے کے نکل آئے۔ یعنی زندگی کے ہر موڑ پر اللہ کو ہی یاد کرو۔ اس کی یہ تفسیر ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اوقات میں اذکار بتلاتے ہیں۔ فرائض و سُنن اور واجبات اپنی جگہ، وہ تو وقتِ خاص میں ادا کرو۔ لیکن تمام اوقات جو تمہاری زندگی کے ہیں۔ ہر موقع کی دعا ہر موقع پر ذکر اللہ کرو اور اسے یاد کرتے رہو تاکہ مسلم کی زندگی سو کر اٹھنے سے لے کر رات کے سونے تک ذکر اللہ سے معمور رہے۔ یہی حقیقت میں اسلام ہے ایسا اسلام جب آدمی کا ہوگا، تو لامحالہ لوگ اسے مجنون ہی کہیں گے کہ بھئی جب سو رہا ہے تو اللہ اللہ، جاگ رہا ہے تو اللہ اللہ، کپڑے پہنتا ہے جب بھی اللہ اللہ، روٹی کھاتا ہے جب بھی اللہ اللہ۔

مؤمن کا قلب بھی ذاکر ہونا چاہئے

اور یہ واقعہ ہے جو اس کی مشق کرے، اذکار کا پابند بن جائے گا۔ پھر قلب ذاکر بن جاتا ہے۔ پھر وہ ارادہ بھی نہ کرے جب بھی ذکر اللہ بے ارادہ اس کی زبان اور قلب سے جاری ہوتا ہے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں ایک صاحب اسی شان کے تھے کہ ذکر اللہ ان کے رگ و پے میں رچ چکا تھا۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اللہ اللہ کرتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک دفعہ پانی اتر آیا، تو آپریشن کی ضرورت پیش آئی۔ جب ہسپتال گئے تو ڈاکٹر نے کہا کہ دیکھئے بالکل خاموش رہئے گا۔ ہلنا جلنا بالکل نہیں ہوگا اور میں آپریشن

کرتا ہوں۔ پہلے میں آپ کو بے ہوش کروں گا۔ اس کے بعد پھر آپ کے لئے ضروری ہوگا کہ آپ بارہ گھنٹے کے لئے حس وحرکت نہ کریں۔ انہوں نے فرمایا بہت اچھا۔

اس نے کلوروفام سنگھایا۔ بے ہوش ہونا تھا کہ ایک دم قلب میں الا اللہ الا اللہ کی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے کہا کیا کرتے ہو؟ اب انہیں تھوڑی ہی خبر تھی کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ وہ تو بے ہوش تھے۔ آخر وہ پھر ہوش میں لے آیا اور کہا یہ کیا کر رہے تھے؟ انہوں نے کہا کیا؟ کہا آپ تو اللہ اللہ کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا مجھے تو کوئی خبر نہیں۔ اس نے کہا دیکھئے اللہ اللہ کرنے کے لئے ساری عمر پڑی ہے۔ کم سے کم اس وقت خاموش رہئے۔ اس نے پھر بے ہوش کیا۔ بے ہوش ہونا تھا' پھر قلب سے الا اللہ الا اللہ کی آوازیں آنے لگیں۔ آخر ان کی آنکھ نہ بن سکی۔ ڈاکٹر نے کہا میں اس حالت میں آپریشن نہیں کر سکتا۔ تو آدمی جب بیداری میں اللہ کے نام کی مشق کرتا ہے' رات دن ذکر میں رہے پھر بلا ارادہ اس کی زبان پر ذکر جاری ہو جاتا ہے اور وہ ہر وقت ذاکر رہتا ہے۔ تو لامحالہ ایسے شخص کو مجنون ہی کہا جائے گا کہ عجیب جنونی آدمی ہے۔ ہر وقت الا اللہ۔ سونے کے لئے لیٹے تب الا اللہ' اور جاگتا ہے تب الا اللہ گھر سے نکلتا ہے جب الا اللہ مسلم کی یہ زندگی ہے۔

معاشرے کے تمام گوشوں میں ذکر اللہ موجود ہے

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام نے معاشرہ سے بالکل بیگانہ بنادیا ہے۔ نہ تجارت کرو نہ زراعت۔ بس اللہ اللہ کرتے رہو۔ اس تجارت و زراعت کو بھی اسلام نے اللہ اللہ بنادیا ہے کہ جب حسن نیت سے شریعت کے مطابق وہ تجارت ہو' زراعت' مزارعت' معاشرت' تمدن ہو' وہ خود اللہ اللہ کے اندر داخل ہے۔ وہ بھی ذکرِ حق ہے۔ جب اتباع سنت پایا جائے گا وہ خود ذکر اللہ ہو گا۔ بہرحال معاشرت کا کوئی گوشہ خالی نہیں جس میں ذکر کی شان موجود نہ ہو' ذرا سی فکر کی ضرورت ہے دل میں یہ لگن ہو کہ میں اللہ کے لئے کر رہا ہوں ور آدمی جو چیز کرے اُس نمونے کو سامنے رکھ لے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا ہے۔ پھر اس کی ساری زندگی ذکر اللہ ہی میں شمار ہوگی' اسے ذاکر کہا جائے گا' غافل نہیں کہا جائے گا۔ عظمت و محبتِ خداوندی جب قلب میں سما جاتی ہے تو ایسے ذاکر آدمی سے جب کوئی فعل سرزد ہو گا وہ خود ذکر کے حکم میں ہو گا۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی خدمت خلق اللہ کے اندر راسخ القدم ہو گا۔ وہ ایک طرف اللہ کا ذاکر ہو گا اور ایک طرف مخلوق کا خادم ہو گا۔ ایک طرف عبادتِ رب ادا کرے گا۔ ایک طرف خدمتِ خلق ادا کرے گا اور ایک چیز س کو دوسری طرف سے غافل نہیں بنا سکے گی' جو انبیاء علیہم السلام کی شان ہے اور انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چل کر آدمی ولایت کے اونچے اونچے مراتب پر پہنچتا ہے۔ اس مرتبہ کا حاصل یہی ہے کہ ذکر اللہ س کے رگ وپے میں راسخ ہو جائے۔ وہ کرسی پر بیٹھے جب بھی ذکر اللہ اس کے اندر سرایت کئے ہوئے ہو اور رش زمین پر بیٹھے جب بھی ذاکر ہو۔ وہ بہترین فاخرہ لباس پہن لے جب بھی وہ ذاکر ہو' پھٹے پرانے کپڑے پہن ہا ہے جب بھی اس کا قلب ذاکر ہے کوئی چیز اس کو ذکر اللہ سے روکنے والی نہیں ہے بلکہ وہ لباس خود اس کے لئے یاد دہانی کا ذریعہ اور مذکر بن جاتا ہے۔

اولیاء اللہ میں بزرگی کی دو شانیں

میں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کا واقعہ سنا ہے کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور ان کے طبقے کے اور بہت سے بزرگ' رامپور ضلع سہارنپور کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے وہاں جمع ہوئے۔ کسی

ایک جگہ دعوت میں یہ سب حضرات مدعو تھے۔

مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عادت اور شان یہ تھی کہ زُہد اور ترکِ دنیا انتہا درجے کا تھا میرے تو جدامجد ہی تھے۔ گھر میں جو واقعات میں نے سنے، وہ یہ ہیں کہ حضرت کی مِلک میں ایک جوڑا کپڑے سے زیادہ نہیں تھا جو بدن پر ہوتا۔ گھر بار جائیداد سب دوسروں کے حوالے کر دی تھی۔ ان کی مِلک میں ایک جوڑا کپڑا جو بدن پر تھا' ایک قرآن شریف' ایک صحیح بخاری کا نسخہ اور فتوحات مکیہ کی جلد جو شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے۔ یہ چار چیزیں کل ان کی ملک تھیں۔

کپڑے کا جوڑا جب پھٹ پھٹا کر پرانا ہو جاتا تھا اور اس درجے پر نہ آجاتا تھا کہ پہننے کے قابل نہ رہے تو دوسرا جوڑا بنتا تھا اور وہ جوڑا بھی گاڑھے کا کوئی اعلیٰ لباس نہیں ہوتا تھا۔ حضرت کا طریقہ یہ تھا کہ بند دار اچکن بِلا کرُتے کے پہنتے تھے اور ایک جوڑ پائنچے کا چوڑا پاجامہ جو پرانے زمانے میں لوگ پہنتے تھے اور ایک پرانی لنگی کندھے پر رہتی تھی۔ کپڑوں کو دھولیا اور سکھا کر پہن لیا۔ وہی ایک جوڑا تھا جب تک وہ پھٹ کر بدن سے الگ نہ ہو جائے جب تک دوسرا جوڑا نہ بنتا تھا۔

تو رامپور کی جس دعوت کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اس میں حضرت تشریف رکھتے تھے۔ اتفاق سے کپڑا بہت پرانا ہو گیا تھا پگڑی میں کچھ ڈورے بھی لٹک رہے تھے' یہ شان تو حضرت کی تھی۔

اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس دن اتفاق سے بڑا فاخرہ لباس پہنے ہوئے تھے تقریباً پانچ سو روپے قیمت کا لباس ہوگا۔ بہترین جُبّہ اور بہترین عمامہ ___ تو لوگوں کی جیسی عادت ہوتی ہے دعوت میں بیٹھ کر انہوں نے کچھ تبصرے شروع کر دیئے۔ ایک نے کہا کہ بھئی! مولانا رشید احمد صاحب عالم بہت بڑے ہیں باقی بزرگی سے کیا تعلق؟ بزرگ تو مولانا محمد قاسم صاحب ہیں۔ جو بالکل تارکُ الدنیا ہیں۔ کیا لباس دیکھو تو انتہائی زُہد و قناعت۔ بزرگی کی شان تو ان میں ہے اور یہ تو پانچ سو روپے کا جوڑا پہنے ہوئے بیٹھے ہیں۔

گویا عوامُ الناس ان بزرگوں کو لباس سے پہچانتے ہیں۔ لباس اچھا ہے تو بزرگی ندارد ہے۔ لباس پھٹا ہو ہے تو بزرگی موجود ہے۔ یہ ایک سطحی سی چیز ہے۔ مگر بہرحال لوگوں نے یہ تبصرہ شروع کیا ___ یہ بھنک حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے کان میں پڑ گئی حضرت نانوتوی کا چہرہ یہ چیز سن کر غصے میں سرخ ہو گیا اور اس شخص سے فرمایا کہ

"جاہل! تُو کیا جانے کہ بزرگ کسے کہتے ہیں تُو نے کپڑوں کو دیکھ کر بزرگی سمجھی ہے؟ کپڑوں کے معیار سے تُو بزرگی کو پرکھتا ہے؟" فرمایا "میری کیفیت یہ ہے کہ اگر میں یہ پھٹا پرانا لباس نہ پہنوں' میرا نفس اپنے آپ سے باہر ہو جائے۔ اس لباس نے اسے روک رکھا ہے"۔

اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا'

"یہ شخص وہ ہے کہ اگر ایک لاکھ روپے کا لباس پہنادو تو بھی اس شخص کے نفس میں تغیّر نہیں ہو گا نہ اس کے دل میں کوئی پھول پیدا ہو گی' نہ نفس پھولے گا' نہ غرور پیدا ہو گا۔ غنا کے اس درجے و مرتبے پر ان کا نفس پہنچ چکا ہے کہ بادشاہی تخت پر بٹھلا دو تب بھی یہ زاہد اور قانع ہیں۔ لاکھ روپے کا لباس پہنا دو تب بھی ان کے قلب میں زہد و قناعت ہے"۔

تو حقیقت یہ ہے کہ ذکر اللہ کرنے والے اگر پھٹے پرانے کپڑوں میں ہوں' تب بھی وہ ذاکر ہیں۔ ایک لاکھ کا لباس ہو تب بھی ذاکر ہیں۔ ذکر قلب کی شان ہے۔ قلب اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی شان ہی دوسری ہو جاتی ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ، کبار محدثین میں گذرے ہیں۔ امام کے رتبے کو پہنچے ہوئے ہیں۔ لباس بہت فاخرہ اور ٹھاٹھ دار پہنتے تھے۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت! بظاہر یہ زُہد و قناعت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ آپ تو ایسا لباس پہنتے ہیں جیسے نوابوں کا۔ فرمایا "میں اس لئے پہنتا ہوں' اگر میں پھٹے پرانے کپڑے پہن لوں تو ___ **لولا هذه الدنانير لتمندلت بنا هولاء الملوك** یہ امیرزادے اور بادشاہ زادے مجھے ناک پوچھنے کا رومال بنالیں۔ میں اس لئے فاخرہ لباس پہنتا ہوں تاکہ بتلادوں کہ جو چیز تمہارے پاس ہے وہ ہمارے پاس بھی ہے۔ ہم تم سے مستغنی ہیں' کسی درجے میں تمہارے محتاج نہیں ہیں۔ میں اس نیت سے پہنتا ہوں' تو اس نیت سے فاخرہ لباس پہننا یہ خود اطاعت و عبادت ہے۔ اس لئے اہل اللہ کا کوئی قدم بھی اطاعت و عبادت سے خالی نہیں ہوتا۔ اللہ والوں میں بہت سے ایسے گزرے ہیں۔ جو فاخرہ لباس پہنتے تھے۔ بہت سے ایسے بھی گزرے ہیں جو پھٹے پرانے کپڑے پہنتے تھے۔ لیکن بزرگی ایک قدرِ مشترک تھی۔ یہاں بھی تھی' وہاں بھی تھی۔ یہاں اور نیت سے تھی وہاں اور نیت سے تھی۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ کے اکابر اولیاء میں سے ہیں لیکن بادشاہوں کی وہ شان نہیں ہوتی تھی جو ان کی شان تھی۔ مسند الگ تھی' صفائی ستھرائی الگ' خدام الگ کھڑے ہوئے ہیں' دروازوں کے اوپر دربان الگ موجود ہیں اور صفائی کا یہ عالم کہ اگر ایک تنکا بھی سامنے پڑا ہوا ہوتا تھا تو سر میں درد ہو جاتا تھا۔ فرماتے تھے "کوڑا کباڑ گھر کے اندر بھر رکھا ہے۔" ___ بہت نزاکت تھی۔

بادشاہ وقت نے ملنے کی آرزو کی۔ اجازت نہیں ہوتی تھی۔ بادشاہ نے بہت چاہا کہ مجھے اجازت مل جائے۔ مگر اجازت نہیں تھی ___ آخر حضرت مرزا صاحبؒ کے خادم خاص کو اپنے پاس بلایا اور کہا تو ان کے دل میں گھر کئے ہوئے ہے۔ تیرا معاملہ بہت رُسوخ کا ہے تو میرے لئے ایک پانچ منٹ کی مہلت لے لے۔

اس نے کچھ اتار چڑھاؤ کر کے حضرت سے عرض کیا۔ تو پانچ منٹ کی اجازت ہو گئی کہ بادشاہ آسکتے ہیں۔ بادشاہ سلامت آئے۔ بہت ادب کے ساتھ دوزانو ہو کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ حضرت مرزا صاحبؒ نے کچھ نصائح فرمائیں۔ اس دوران میں حضرت مرزا صاحب کو پیاس معلوم ہوئی تو خادم کو پانی لانے کے لئے اشارہ کیا۔ بادشاہ نے سمجھ لیا کہ پانی چاہتے ہیں تو کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ اگر مجھے اجازت ہو؟ اجازت ہو گئی کہ اچھا تم پانی پلاؤ۔ تو بادشاہ پانی لینے گئے تو گھڑے کے اوپر جو بڈولی ڈھکی ہوئی تھی۔ پانی لے کر جو لاکر رکھا وہ کچھ ٹیڑھی رکھی گئی۔ بس مزاج میں تغیر پیدا ہو گیا۔

فرمایا۔ "تمہیں پانی پلانا تو آتا نہیں۔ تم بادشاہت کیسے کرتے ہو گے؟ ہٹو یہاں سے" اپنے خادم خاص کو حکم دیا کہ وہی پانی پلائے گا ___ اس شان کے بھی بزرگ گزرے ہیں۔ ان کی ولایت میں کوئی بھی نہیں۔ ولی کامل ہیں۔ ان کی نسبت و تصرّف اور تربیت سے ہزاروں اولیاء بن گئے۔ ایک شان یہ ہے۔

اور ایک شان حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے یہ بھی انہی کے ہم عصر ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ' شاہ غلام علی صاحب اور مرزا مظہر جانِ جاناں رحمہ اللہ علیہم یہ تینوں ایک قرن کے بزرگ ہیں۔ شاہ غلام علی صاحبؒ کا یہ حال کہ نہ گھر نہ در نہ کپڑا نہ لتا۔ زہد و قناعت اور فقر و فاقے اور اس پر مہمانوں کی یہ کثرت کہ تین تین سو' چار چار سو مہمان ہر وقت ان کے دستر خوان پر ہوتے تھے۔ لیکن ظاہر میں ذریعۂ معاش

پوچھ نہیں۔ ریاست ٹونک کے نواب۔ نواب میر خاں' وہ حضرت کے مرید تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شیخ کے ہاں تین تین سو' چار چار سو مہمان ہوتے ہیں۔ آخر یہ کہاں سے آتا ہوگا؟ بڑی تنگی اٹھاتے ہوں گے۔ بڑی پریشانی ہوتی ہوگی۔ تو ریاست ٹونک کا ایک ضلع جس کی ایک سال کی کئی لاکھ روپے آمدنی تھی۔ وہ پورے کا پورا حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کی خدمت میں پیتل کے پتر پر لکھ کر بھیجا کہ میں آپ کو ہدیہ کرتا ہوں تاکہ مہمانوں اور گھر والوں کا خرچ چلے۔ آپ اسے خدا کے لئے قبول فرمالیں۔ شاہ غلام علی صاحبؒ نے اسی پتر پر جواب لکھا اور اس پر ایک شعر لکھ کر بھیج دیا۔ لکھا

ماآبروئے فقر و قناعت نمی بریم
بامیر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقروفاقہ کی آبرو کھونا نہیں چاہتے۔ میری طرف سے انہیں کہہ دو کہ روزی مقدر ہے۔ تمہارے ضلع کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

تو ایک طرف یہ زُہد و قناعت اور ایک طرف یہ ٹھاٹھ باٹھ جو مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہے۔ ہیں وہ بھی ولی کامل' وہ بھی کامل۔ ولایت کے لباس مختلف ہوتے ہیں۔ ولایت کا تعلق کپڑوں سے نہیں وہ قلب سے ہے۔ قلب جب اللہ رسیدہ بن جائے۔ وہ ولی کامل ہے۔ اپنے حسن نیت سے کوئی لباس فاخرہ پہنتا ہے اس میں بھی نیکی کی نیت مضمر ہوتی ہے' اس میں بھی مصلحت ہے۔ کسی پر زہد و قناعت کا غلبہ ہوتا ہے۔

حضراتِ صحابہؓ میں بزرگی کی دو شانیں

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جلیل القدر صحابی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی ہیں۔ آپؐ نے انہیں دعا دی ہے کہ

اللھم علمہ الکتاب و الحکمۃ۔

اے اللہ! ابن عباسؓ کو کتابُ اللہ کا عالم بنادے اور اس کی حکمت سکھلادے۔ تو بڑے زبردست مفسر ہیں بلکہ تفسیر قرآن کے اندر صحابہؓ میں یکتا ہیں۔ لیکن لباس کس شان کا پہنتے تھے؟ ان کے لباس کا کپڑا اس زمانے کا بہترین کپڑا اور قیمتی ہوتا تھا۔ بڑا فاخرہ لباس ہوتا اور جس مجلس میں بیٹھتے تھے تو عجیب عطر ہوتا مجلس اس سے مہک جاتی تھی۔

اور ایک طرف ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ ہیں کہ جو بدن پر کپڑا ہے ان کا مذہب یہ تھا کہ اس کے سوا دوسرا کپڑا رکھنا جائز نہیں۔ ان کی یہ شان تھی۔

جب ملک شام فتح ہوا تو شام میں تمدن تھا۔ حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت تھی' حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا زمانہ تھا' ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ شام میں پہنچے۔ وہاں تمدّن' کھانے پینے کی افراط اور سب کے بہترین مکانات تھے۔ ان پر زہد و قناعت کا غلبہ' جس گھر میں جاتے اور دیکھا کہ دستر خوان پر بہترین کھانے جمع ہیں۔ بس لاٹھی لے کے سر ہو جاتے کہ اللہ کے رسولؐ کے دستر خوان پر کب دو کھانے جمع ہوئے ہیں جو تم نے جمع کر رکھے ہیں۔ تو یہ نہیں کہ امر بالمعروف کردیں۔ لاٹھی لے کے مار پٹائی کے لئے تیار ہو جاتے ___ لوگ عظمت کرتے تھے کہ جلیل القدر صحابیؓ ہیں۔ دستر خوان اٹھ جاتا۔ لیکن لوگ تنگ آگئے۔ اسی طرح کسی کا بہترین لباس دیکھا۔ بس لاٹھی لے کر پہنچ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا لباس کب پہنا؟ کسی کے گھر میں صندوق میں دو چار جوڑے جمع ہیں۔ لاٹھی لے کر پہنچ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کب چار

جوڑے۔ رکھے تھے جو تم رکھ رہے ہو؟ ___ اور مرنے مارنے کو تیار۔ آخر کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے واقعات حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو لکھے کہ یہ تو لوگوں کی زندگی اجیرن کر دیں گے۔ اب لوگ اس کامل زہد و قناعت پر کیسے آجائیں جو اللہ کے رسول کا زہد و قناعت تھا۔ امت میں تو ہر طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں حکم دیا جائے کہ یہ شہر میں نہ رہیں۔ ان کی کسی سے نہ نبھے گی۔ چنانچہ وہاں سے حکم پہنچ گیا کہ ربذہ میں جاکے قیام کرو تو جنگل میں جاکے قیام کیا۔

چونکہ امیر المومنین کا حکم تھا اور وہ واجب الاطاعت تھا' سر جھکا دیا اور پھر ہمیشہ کے لئے شہر چھوڑ کر جنگل میں قیام کیا۔ وفات کا جب وقت آیا تو گھر میں خود تھے اور ان کی بیوی تھی۔ تیسرا کوئی نہیں تھا' بیوی رونے لگی۔ اس لئے کہ ہاتھ پلے کچھ نہیں تھا' اس لئے کہ ان کا مذہب یہ تھا کہ صبح کا جو کھانا کھایا' تو رات کا کھانا رکھنا جائز ہی نہیں' توکل کے خلاف ہے۔ جو بدن پر کپڑا پہنے ہوئے تھے اس کے سوا اور کوئی کپڑا نہیں تھا۔

آپ نے فرمایا رو مت۔ دروازے پر بیٹھ جاؤ۔ تھوڑی دیر میں تمہیں ایک قافلہ آتا ہوا نظر پڑے گا۔ ان سے کہنا کہ اللہ کے رسول کے ایک صحابیؓ کی وفات ہوگئی ہے۔ لوگو! (سواریوں سے) اتر جاؤ اور ان کے کفن دفن کا انتظام کردو۔

بیوی باہر جاکر بیٹھ گئی۔ تو واقعی تھوڑی دیر بعد گرد اڑی اور اونٹوں پر پانچ' چھ آدمیوں کا ایک قافلہ آتا ہوا نظر پڑا۔ جب وہ ان کے گھر کے قریب پہنچا۔ بیوی نے کہا اے لوگو! اللہ کے رسولؐ کے ایک صحابی ابوذر غفاریؓ ہیں' ان کی وفات کا وقت ہے۔ آپ لوگ اتر جائیں ان کے کفن دفن کا انتظام کردیں اور نماز جنازہ پڑھادیں۔ ان سواروں میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ جلیل القدر صحابیؓ ہیں یہ سن کر کہ ابوذر غفاریؓ ہیں تو اس زور سے چلا پڑے کہ:

صدق صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا کہ:

ویحک ابی ذر یعیش فریدًا ویموت فریدًا۔

اے ابوذر! افسوس ہے کہ تنہائی میں زندگی گزاروگے اور تنہائی میں تمہاری موت بھی آئے گی۔ اللہ کے رسولؐ نے سچ فرمایا تھا۔ وہ واقعہ سامنے آگیا۔

اس کے بعد اندر آئے تو ملاقات ہوئی۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ خوش ہوئے۔ فرمایا یہ میرا آخری وقت ہے۔ میرے کفن دفن کا انتظام کردو اور یہ فرمایا کہ میرے پاس کفن کا کوئی سامان نہیں۔ بس یہ کرتہ اور لنگی ہے جو باندھے ہوئے ہوں' اس کے سوا کوئی کپڑا نہیں۔ تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور دوسرے حضرات سے خطاب کرکے کہا کہ

"کوئی شخص مجھے ایک چادر دے دے تاکہ اس چادر میں لپیٹ کر دفن کردیا جاؤں"۔

گویا اگر کفن سنت میسر نہ ہو تو کفن کفایت ہی میسر آجائے۔

کفن سنت تو تین کپڑے ہیں۔ ازار' لنگی اور ایک قمیص ہے اور کفن کفایت یہ ہے کہ ایک ہی کپڑے میں ساری لاش کو دفن کردیا جائے۔ تو فرمایا کم سے کم کفن کفایت میسر آجائے۔ ورنہ میرے پاس تو اتنا بھی نہیں۔ اور زہد و قناعت کا یہ عالم کہ فرمایا'

"تم میں سے کوئی مجھے ایک چادر دے دو مگر وہ شخص دے جو حکومت کا ملازم' محصل اور زکوٰۃ وصول کرنے والا نہ ہو۔" فرمایا "جو لوگ مالیات کے وصول کرنے کے اوپر مقرر

ہیں وہ بے احتیاطی سے کام لیتے ہیں یا بہت اعلیٰ مال وصول کراتے ہیں تو رعایا تنگ ہوتی ہے یا رعایت و مروت کرتے ہیں تو ادنی درجے کی چیزیں لے آتے ہیں۔ اس سے حکومت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اعتدال سے کام نہیں لیتے۔ اس واسطے اس شخص کی چادر میں قبول نہیں کروں گا جو مالیاتی تحقیق کے اوپر ملازم ہے''۔

حالانکہ وہ خلافت راشدہ کا دور ہے۔ یہ صحابہؓ ہیں جن کا تقویٰ اور تقدس دنیا کے لئے نمونہ اور معیار ہے۔ مگر ابوذر غفاریؓ کا تقوی یہ ہے کہ وہ اسے بھی خلافِ تقویٰ سمجھتے ہیں کہ ایسے ملازم کا ہدیہ بھی قبول کریں۔

عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا' میرے پاس دو چادریں ہیں اور وہ میری ماں کے ہاتھ کا کاتا ہوا سوت ہے اور گھر ہی بنا ہوا ہے۔

فرمایا ''ہاں! بس وہ کافی ہے' ایک چادر مجھے دے دو۔'' چنانچہ وفات ہوئی اور اسی چادر میں لپیٹ کر دفن کردیئے گئے۔ ان پانچ' چھ حضرات نے جنازہ کی نماز ادا کردی۔

تو میں عرض کررہا ہوں ایک طرف ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں جو پانچ سو روپے کا جبہ پہنے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ایک طرف ابوذر غفاریؓ ہیں کہ پھٹے پرانے کپڑوں کے سوا ان کے پاس کوئی جوڑا بھی موجود نہیں۔ لیکن بزرگی میں کوئی کلام نہیں ہے۔ وہ بھی اعلیٰ ترین بزرگ ہیں' یہ بھی اعلیٰ ترین بزرگ ہیں۔ دونوں صحابیؓ ہیں اور صحابہؓ کے بارے میں اہل سنت و الجماعت کا اجماع ہے کہ **الصحابة کلھم عدول** (رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ) سارے صحابہؓ متقی' پارسا اور پاکباز ہیں اولیائے کاملین ہیں۔ امت میں کوئی بڑے سے بڑا قطب اور ولی گزرے لیکن صحابیت کے رتبے کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ صحابیت کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا ہے۔ صحابہ کرامؓ ان میں بھی دونوں شانیں موجود ہیں' تو بزرگی کا تعلق لباس کے فاخرہ ہونے اور لباس کے کمتر ہونے سے نہیں ہے۔ وہ قلوب سے متعلق ہے۔ فاخرہ لباس پہننے میں بھی ان کی نیتیں اچھی ہوتی ہیں اور پھٹا پرانا لباس پہننے میں بھی اچھی نیت ہوتی ہے۔ بزرگی دونوں کا ہی قدرِ مشترک ہے۔

انبیاء علیہم السلام میں بزرگی کی دو شانیں

اور میں تو کہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کون بزرگ ہے۔ ان کی جوتیوں کے صدقے سے تو دنیا میں بزرگ بنتے ہیں۔ انبیاء آتے ہی بزرگی بانٹنے کے لئے ہیں۔ ان کے گھر سے بزرگی تقسیم ہوتی ہے۔ انبیاء میں بھی دونوں شانیں ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے بادشاہ اور تخت سلطنت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے شاہی محلات کھڑے ہوئے۔ ان کے نیچے نہریں اور دریا بہہ رہے ہیں اور ایک طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کہ جو چیز بدن کے اوپر ہے اس کے سوا کوئی چیز ان کی ملک ہی نہیں ہے اور اس میں بھی یہ کیفیت ہے کہ کل سامان ان کے پاس کیا تھا؟ ایک لکڑی کا پیالہ تھا۔ کھانے کا وقت آتا تو وہ کھانے کا برتن تھا۔ وضو کا وقت آتا تو وہ پانی کا ظروف تھا۔ اسی میں پانی لے لیتے اسی میں پی لیتے اور اسی میں کھالیتے۔ زندگی کا سامان ایک لکڑی کا پیالہ تھا۔ چمڑے کا تکیہ تھا کہ جہاں نیند آئی سر کے نیچے رکھا اور سوگئے۔ چاہے زمین ہی پر ہو ــــ یہ کل مال و دولت تھا۔

ایک دن تشریف لے جارہے تھے تو دیکھا کہ ایک شخص دریا کے کنارے پر کھڑا چلو سے پانی پی رہا ہے۔

رمایا اللہ اکبر اتنی دنیا ہم نے اپنے پاس رکھ رکھی ہے کہ جس کے بغیر بھی گذر ہو سکتا تھا۔ یہ بلا پیالے کے پانی ں رہا ہے۔ وہ پیالہ بھی پھینک کے چلے گئے کہ یہ بھی میرے پاس زائد تھا صرف تکیہ باقی رہ گیا تو دیکھا کہ ایک نص کہنی سر کے نیچے رکھے ہوئے سو رہا ہے۔ ___ فرمایا اللہ اکبر ___ یہ تکیہ دنیا کا ایک مستقل سامان ہے ، میں نے رکھ رکھا ہے اس کے بغیر بھی گزر بسر ہو سکتا ہے' کہنی رکھ کے بھی سو سکتے ہیں۔ اس دن سے وہ تکیہ ی چھوڑ دیا۔ اب اس کے بعد سوائے ستر ڈھانپنے کے کوئی چیز باقی نہ رہی' یہ بھی اللہ کے جلیل القدر پیغمبر ں۔ سلیمان علیہ السلام بھی جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ یہاں شاہی ٹھاٹھ ہے۔ وہاں انتہائی درویشی ہے اور ان نوں میں بزرگی اور نبوت مشترک ہے۔

تو لباس سے کسی کو پرکھنا یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ایک یہ کہ خلافِ شرع لباس ہو' اگر وہ پہنے ہوئے ہو تو ہر سلمان کو تنقید کا حق ہے کہ یہ جائز نہیں۔ پاجامہ پہنے اور وہ ٹخنوں سے نیچے ہے آپ کو نصیحت کرنے کا حق صل ہے کہ یہ جائز نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن تین شخص ہوں گے ن کی طرف حق تعالیٰ نظر رحمت نہیں فرمائیں گے۔ ان میں سے ایک شخص **المسبل المنّان** ہے۔ جس کے پڑے اتنے لمبے ہوں جو ٹخنوں سے اتنے نیچے ہوں کہ گھسٹتے جا رہے ہوں۔

یہ تکبّر کی علامت ہے اور متکبّر پر رحمت کی نظر نہیں ڈالی جائے گی' اس میں آپ اعتراض کر سکتے ہیں۔ ؤئی ریشم کا لباس پہنے ہوئے ہو یہ ناجائز ہے۔ آپ کو حق ہے آپ کہہ سکتے ہیں کہ مردوں کے لئے خالص ریشم ننا جائز نہیں سوائے اس کے کہ چار انگشت کے اندر اندر ریشم ہو کوئی پھول بوٹے یا دھاری بنی ہوئی ہو۔ یہ جائز ہے لیکن خالص ریشم کا لباس یہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے اگر کوئی خلاف شرع لباس پہنے ہوئے ہو آپ ، اعتراض کا حق ہے۔ لیکن مطلقاً کوئی شخص قیمتی لباس پہنے ہوئے ہو اور آپ اس سے دلیل پکڑیں کہ اس کے ب میں بزرگی نہیں ہے تو **ھلا شققت قلبه** آپ اس کے قلب میں گھس کر دیکھ آئے ہیں کہ اس کے ب میں بزرگی نہیں ہے۔ لباس سے بزرگی پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ مکان کے اچھے ہونے سے بزرگی کی ت یا بزرگی سے معدوم نہیں مانا جا سکتا ___ تو انبیاءؑ میں دونوں شانیں موجود' اولیاءؒ میں بھی موجود' صحابہؓ ں بھی موجود۔ ہر طبقے کے لوگ ہوتے تھے' دیکھنا اصل یہ ہے کہ قلوب کس درجے کے ہیں۔

تواضع بزرگی کی سب سے بڑی علامت ہے

بہرحال قلب وہ ہے جس کے اندر بزرگی ہو' لباس کیسا بھی ہو ___ حضرت مولانا نانوتویؒ اور مولانا نگوہیؒ کا واقعہ اس پر یاد آیا تھا کہ انہوں نے ایک شخص سے فرمایا کہ جاہل تو کیا جانے کہ بزرگی کسے کہتے ہیں؟

> "میرے لئے اس پھٹے پرانے لباس میں بھی اپنے نفس کے لئے مشکل اور بھاری ہے اور یہ وہ شخص ہے کہ اسے ایک لاکھ روپے کا لباس پہنادو' اس کے نفس میں تغیر نہیں آ سکتا"۔

یہ تو یوں کہہ رہے ہیں اور مولانا گنگوہیؒ سے جب پوچھا گیا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کس مقام ہ ہیں' یہ فرمایا کہ

> "بھائی! ہم نے ایک ہی ساتھ پڑھا' ایک ہی استاذ کے شاگرد ہوئے' ایک ہی شیخ کے مرید ہوئے' ایک ساتھ زندگی گزاری۔ لیکن باوجود اس کے وہ اتنا آگے بڑھ چکے ہیں کہ ہم

ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ پائے کہ وہ کہاں تک پہنچ چکے ہیں"۔

اُن سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں کہ یہ بہت اعلیٰ مقام پر ہیں۔ ان سے پوچھو تو یہ کہتے ہیں کہ وہ اتنے اونچے ہیں کہ میں ان کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ بزرگی کی سب سے بڑی علامت یہی ہے کہ اپنے نفس کی حقارت دل میں جمی ہوئی ہو اور دوسرے کی بزرگی جمی ہوئی ہو ___ اگر ایک شخص دوسرے کی تحقیر کرتا ہے اور وہ مدعی ہے کہ میں سب سے زیادہ بڑا ہوں۔ یہ دعویٰ ہی علامت ہے کہ بزرگی نشان کو بھی اس میں موجود نہیں ہے۔ بزرگی میں نہ دعویٰ وادّعاء ہوتا ہے نہ شیخی ہوتی ہے۔ ترکِ دعویٰ اور ترکِ شیخی کا نام بزرگی ہے۔ جب یہ پیدا ہو جائے گا بزرگی ہے۔

آج ہم اپنی حالت کو دیکھیں، ہر شخص یوں کہتا ہے کہ میں اچھا ہوں اور یہ بُرا ہے اور قدیم مسلمانوں کا یہ دستور تھا کہ ہر شخص یوں جانتا تھا کہ یہ اچھا ہے اور ساری برائیاں میرے اندر ہیں۔ اس واسطے عالم میں امن تھا۔ آج ہم دوسرے کو حقیر اور اپنے کو بڑا جانتے ہیں اور اپنے کو بڑا جان کر دوسرے پر ہر قسم کی زیادتی جائز رکھتے ہیں۔ تو دنیا فساد کا گھرانہ بن گئی۔ ہم نے دنیا کو فساد سے بھر دیا اور قدیم بزرگوں نے امن سے بھر رکھا تھا۔ ان میں اور ہم میں یہی فرق ہے۔ وہاں بزرگی کے معنی یہ تھے کہ اپنے نفس کی تحقیر ہو اور دوسرے کی عظمت۔ جہاں فرمایا گیا **ظُنّوا بالمؤمنین خیرا** ہر مسلمان کے ساتھ نیک گمان اور حسنِ ظن رکھو۔ اگر کوئی برائی بھی سننے میں آئے اس کی تاویل کرو کہ نہیں یہ نہیں یہ مطلب ہوگا۔

اچھے مطلب پر محمول کرو۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی کی نیک عبادت بھی ہو تو توڑ مروڑ کر ایسے معنی بیان کریں کہ کسی طرح اس پر الزام آجائے۔ یہ قلب کے کھوٹ کی دلیل ہوتی ہے۔ ورنہ مؤمن کا کام یہ ہے کہ اگر کسی کا قول، فعل یا کسی کی عبارت کچھ مبہم بھی ہو تو اس کو ایسے معنی پہناؤ کہ اس کی برأت ثابت ہو نہ یہ کہ وہ مجرم بن جائے۔

اسی واسطے علماء لکھتے ہیں کہ کسی مسلمان سے حسن ظن قائم کرنے کے لئے کسی دلیل کی حاجت نہیں ہے۔ لیکن بدظنی قائم کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت ہے۔ جب تک ہاتھ میں حجت نہ ہو کسی سے بدگمانی پیدا کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ سب اس وقت ہوتا ہے جب اپنے نفس کی حقارت اور دوسرے کی عظمت دل میں بیٹھی ہوئی ہو۔ آدمی یہ سمجھے کہ میں چھوٹا ہوں، دوسرا بڑا ہے۔ فساد اس سے پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ یوں کہیں گے کہ میں بڑا ہوں تو حقیر ہے وہ کہے گا تو ذلیل ہے میں عزت والا ہوں، فساد شروع ہو جائے گا۔ جب آپ یوں کہیں کہ بڑے آپ ہی ہیں، وہ کہے نہیں بڑے آپ ہی ہیں۔ پھر نزاع کیسے ہوگا؟ لڑائی کہاں سے ہوگی تو تواضع کے اندر امن ہے اور تکبّر کے اندر خللِ امن اور بدامنی ہے۔ جہاں کہیں آپ فساد دیکھیں سر پھٹول دیکھیں سمجھ لیں کہ کسی متکبّر کا وجود درمیان میں آگیا ہے۔ متواضع جب ہوگا تو وہاں بدامنی کے کوئی معنی نہیں۔ وہاں تو امن ہی امن قائم ہوگا، فلاح ہی فلاح ہوگی۔ مؤمن کو تواضع سکھلائی گئی ہے، تکبّر نہیں سکھلایا گیا۔

عظمت و کبریائی صرف اللہ کی شان ہے

تکبّر اللہ کی شان ہے۔ خدا کے سوا کسی کے لئے تکبّر زیبا نہیں، وہی فرما سکتے ہیں :

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (جاثیہ پ۲۵ آیت ۳۷)

زمین اور آسمان کے اندر سب سے بڑائیاں ان کے لئے ہیں۔ انہی کا نام المتکبّر ہے وہی تکبر کر سکتے ہیں۔

یہاں پر ممکن ہے کہ کسی کو طالب علمانہ سوال پیدا ہو کہ حدیث میں تو یہ حکم دیا گیا کہ "**تخلقوا باخلاق اللہ**" اللہ کے اخلاق اور اس کی صفات اپنے اندر پیدا کرو۔ وہ رحیم و کریم ہے تو تم بھی اپنے اندر رحم و کرم پیدا کرو۔ وہ علیم و خبیر ہے تو تم بھی اپنے اندر علم و خبر پیدا کرو۔ جہالت دور کرو۔ وہ لطیف ہے تو تم بھی اپنے اندر لطافت اور ستھرائی پیدا کرو۔ وہ حافظ و حسیب ہے۔ تو تم بھی اپنے بھائیوں کے محافظ ہو۔

جب یہ حکم ہے تو اللہ کی صفات میں سے متکبّر ہونا بھی ایک صفت ہے۔ پھر چاہئے کہ ہر شخص متکبّر بھی بنے۔ پھر کیوں کہا جاتا ہے کہ تکبّر کرنا بہت بری بات ہے۔ تو ممکن ہے کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تکبّر کرنا بری بات نہیں ہے۔ تکبّر تو اللہ کی شان ہے۔ وہ بری تھوڑا ہی ہو سکتی ہے۔ ہاں جھوٹ بولنا برا ہے۔ اس لئے کہ جب اللہ یوں کہیں گے کہ میں بڑا ہوں تو وہ سچے ہیں اور جب میں یوں کہوں گا کہ میں بڑا ہوں تو یہ جھوٹ ہو گا۔ تو جھوٹ بولنا بری بات ہے، تکبّر کرنا بری بات نہیں ہے۔ خدا سوا جو تکبّر کا دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا ہو گا۔ تو جھوٹ سے بچایا گیا ہے۔ اس لئے "**تخلقوا باخلاق اللہ**" اپنی جگہ صحیح ہے اور تکبّر اور بڑائی کا کیا مطلب ہوا؟ یہ کہ ہرگز بڑائی مت کرو، چھوٹے بن جاؤ ۔ لیکن جب متواضع ہو گے تو اللہ خود بخود بڑائی دے دے گا۔ دنیا سمجھے گی کہ تم بڑے ہو۔ تمہارے اندر بڑائی آ گئی۔ تو ایک ہے بڑا بننے کا دعویٰ کرنا اور ایک عند اللہ بڑا بن جانا ہے۔ تو عند اللہ بڑے بن جاؤ۔ اللہ تمہیں بڑائی دے دے، یہ بڑائی قابلِ قبول ہے لیکن تم خود ہی کہنے لگو کہ میں بڑا ہوں۔ یہ قابل قبول نہیں ہے۔ یہ حق تعالیٰ شانہ کا مقابلہ ہے۔ جس کو ایک حدیثِ قدسی میں حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا:

الکبریاء ردائی والعظمۃ ازاری ومن نازعنی فیھما قصمتہ۔

تکبّر میری چادر ہے، عظمت اور بزرگی میری لنگی ہے۔ جو اس میں کھینچا تانی کرے گا، میں یقیناً اس کی گردن توڑ دوں گا اور اسے نیچا دکھاؤں گا۔ تو جو بھی بڑا بول بولتا ہے ہاتھ کے ہاتھ اسی مجلس میں اسے سزا مل جاتی ہے۔ چار آدمی کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کی تذلیل کے درپے ہو جاتے ہیں اور جو چھوٹا بول بولتا ہے کہ میں ہیچ ہوں، میں حقیر ہوں۔ دوسرے تعریفیں کرتے ہیں کہ نہیں آپ بڑے ہیں، آپ بزرگ ہیں۔ آپ ایسے اور ایسے ہیں۔ تو بڑائی کا بول بولنا، دعویٰ کرنا، تذلیل کی علامت ہے۔ دوسرے یقیناً ذلیل سمجھیں گے۔ چھوٹا بنے گا تو دوسرے بڑا سمجھیں گے۔ بڑائی حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ دعوے کرے بلکہ دعویٰ ترک کر دے۔ خود بخود بڑائی آجائے گی۔ تو "**تخلقوا باخلاق اللہ**" میں اگر بزرگی لیتی ہے تو اس کا راستہ تواضع ہے۔ تکبّر اور کبریائی نہیں ہے۔

جیسے آپ کسی پہاڑ پر چڑھتے ہیں۔ جب چڑھیں گے تو جھک کے چڑھنا پڑے گا اور جب اتریں، تو جب تک اکڑیں گے نہیں اترنا مشکل ہو گا۔ یہ اس کی علامت ہے کہ اونچائی پر جب پہنچ سکتے ہو جب جھک کے چلو، جب اکڑو گے تو نیچے کی طرف جاؤ گے۔ اوپر نہیں جا سکتے۔ آدمی جتنا اکڑے گا زمین میں دھنسے گا۔ جتنا جھکے گا اتنا بلندی کے اوپر پہنچے گا۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ ؎

پستی سے سربلند ہو اور سرکشی سے پست
اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

جتنا کوئی بڑا بننا چاہتا ہے اسے زمین پر پٹخ دیتے ہیں اور جو بے چارہ خود گر جاتا ہے اسے اوپر اٹھا دیتے ہیں اور بلند بنا دیتے ہیں۔

من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ جو اللہ کے لئے نیچا بننا چاہے اللہ اسے اونچا کرتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ

اگر کوئی بندہ دعویٰ کرکے یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! میں نے نماز پڑھی، میں نے حج کیا۔ میں نے اتنی نیکیاں کیں۔ اللہ تعالیٰ فوراً فرماتے ہیں۔ نامعقول! تو نے کیا کیا؟ توفیق میں نے دی، عقل تیرے اندر میں نے پیدا کی، ارادہ میں نے پیدا کیا۔ تو نے کیا کیا ___؟

اور اگر کوئی یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ اگر میں نے نماز پڑھی تو تو نے ہی توفیق دی تھی، تو نے ہی راستہ مہیا کیا تھا، تو نے ہی مجھے ہمت دی تھی۔ ساری بات خوبیوں کی تیری طرف ہے مجھ سے کچھ نہیں ہو سکا۔ اس کو فرماتے ہیں کہ نہیں، چل کے تو ہی گیا تھا، مسجد تک تو ہی گیا تھا، حج کا ارادہ تو نے کیا تھا۔ اس کو سراہتے ہیں اور اونچا اٹھاتے ہیں۔ تو جو جھکتا ہے اسے اونچا کرتے ہیں۔ جو خود اونچا بننا چاہتا ہے اسے جھکا دیتے ہیں۔ اس لئے عزت پانے کا راستہ جھکاؤ ہے۔ عزت یوں نہیں آیا کرتی کہ آپ ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جائیں کہ کرو میری عزت، نہیں تو ماروں گا۔ یہ عزت کا طریقہ نہیں۔ عزت کا طریقہ یہ ہے کہ آپ دوسرے کی عزت کریں وہ تمہاری عزت کرے گا۔ تم معزز بن جاؤ گے۔ تم ڈنڈے سے دوسرے کی تذلیل کرو اور کہو میری عزت کرو۔ یہ تو خود اپنی ذلت اور رُسوائی مول لینا ہے۔

تواضع علامتِ آدمیت ہے

بہرحال جب تک کہ تواضع، خدمت اور خدمت گزاری نہ ہو، اس وقت تک صحیح معنی میں آدمی کے اندر بندگی نہیں پیدا ہوتی۔ مخلوق کی تذلیل و تحقیر سے آدمی خود اپنی ذلت کے راستے ہموار کرتا ہے، تو ایک طرف عظمت خداوندی دل میں ہو اور ایک طرف خدمت خلق اللہ ہو اور خادم خلق نہیں بن سکتا، جب تک کہ متواضع، منکسر المزاج نہ ہو، جب تک یہ نہ سمجھے کہ میں ان سب سے کم رتبہ ہوں۔ میرا فرض ہے کہ میں ان کی خدمت کروں۔ اب راستے میں کانٹے یا کانچ کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں، ایک متکبر کانٹے کو اٹھانے کے لئے کبھی نہیں جھکے گا، سمجھے گا میری شان کے خلاف ہے۔ میری حیثیت عرفی بہت بلند ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟ لیکن اگر متواضع ہے تو وہ جھک کر کانچ کے ٹکڑے اپنے ہاتھ سے اٹھا پھینکے گا تاکہ کسی کو تکلیف نہ پہنچ جائے۔ یہ خدمت وہ سرانجام دے گا جس کے قلب کے اندر تواضع اور انکساری موجود ہوگی، کبر اور ریاکاری جس کے اندر ہوگی، وہ کبھی یہ خدمت سرانجام نہیں دے سکے گا۔ بہر خدمت خلق اللہ کا جذبہ تب موجود ہوگا، جب دل میں تواضع للہ کا جذبہ موجود ہو، منکسر المزاج ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے آدم علیہ السلام کا بیٹا ہو تو ضرور تواضع کرے گا اور اگر اپنا نسب نامہ شیطان سے ملالے گا، کبھی تواضع نہیں کرے گا۔ اس واسطے کہ دونوں سے لغزشیں ہوئیں آدم علیہ السلام سے بھی ہوئی اور ابلیس سے بھی ہوئی ___ آدم علیہ السلام نیت کے پاک تھے مگر بھول کر ایک لغزش ہو گئی۔ حکم دیا گیا تھا کہ درخت مت کھاؤ۔ بھول کر کھالیا حالانکہ وہ نافرمانی نہیں تھی۔ نافرمانی کہتے ہیں جان بوجھ کر حکم کی خلاف ورزی کرنا۔ یہ نہیں ہوا تھا۔ جانتے تھے کہ اللہ نے روکا ہے۔ مگر شکل کیا پیش آئی؟ ایک تو کمبخت شیطان نے آکے قسم کھائی:

وَقَاسَمَهُمَا اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ۔ (اعراف پ۸ آیت ۲۱)

قسم کھاکے کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ آدم علیہ السلام کا سچا قلب، آپ کسی فریب سے واقف نہیں۔ مقام جنت میں ہیں، جو کریم مقام ہے۔ یہ شبہ بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ اللہ کا نام لے کر کوئی جھوٹ بولے، جب دل میں ایمان ہوتا ہے تو حسن ظن دل میں ہوتا ہے۔ دوسرے کو بھی آدمی یہی سمجھتا ہے کہ یہ بھی اچھا ہے۔ یہ خدا کا نام لے کر قسم کھا رہا ہے۔ بھلا خدا کا نام لے کر جھوٹ بولنے کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے؟

ان کے ذہن میں یہ آیا۔

ہمارے بزرگوں میں سے ایک بزرگ تھے۔ حضرت میاں جی منّے شاہ صاحب رحمہ اللہ علیہ' مولانا میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم کے ایک محدّث تھے' ان کے نانا تھے۔ بالکل مادر زاد ولی اور معصوم فطرت۔ بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں گھڑی گھنٹے تو تھے ہی نہیں۔ ایک جگہ کھونٹی گاڑ رکھی تھی۔ دھوپ وہاں تک پہنچ جاتی۔ کہتے کہ جاؤ بھئی! چھٹی کا وقت آگیا۔ لڑکے شرارت کر کے کھونٹی آگے گاڑ دیتے۔ دھوپ جلدی پہنچ جاتی اور کہتے میاں جی صاحب! چھٹی دے دو' وقت ہو گیا فرماتے اچھا جاؤ چھٹی۔

لوگوں نے عرض کیا' حضرت! یہ بچے جھوٹ بول رہے ہیں۔ انہوں نے کھونٹی آگے گاڑ دی ہے۔ فرماتے مسلمان کا بچہ جھوٹ نہیں بول سکتا' مسلمان بچے کا یہ کام نہیں۔ فرماتے 'بس بھئی تم جاؤ ___ تو واقعی جس کے دل میں اسلام اور سچائی ہوتی ہے۔ حسنِ ظن کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کو جھوٹا سمجھتا ہی نہیں۔ سمجھتا ہے کہ سچ ہی بول رہا ہوگا۔ جب خدا کی قسم کھا کر کہے تب تو وہم بھی نہیں جاتا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔ تو شیطان ملعون ہے سب کچھ ہے مگر جب اس نے اللہ کی قسم کھائی' آدم علیہ السلام کا دل پگھل گیا۔ فرمایا' خدا کا نام لے کر جھوٹ بولنا مشکل معلوم ہوتا ہے' مگر ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ مجھے تو حق تعالیٰ کی طرف سے ممانعت کی گئی تھی اور یہ فرمادیا گیا تھا کہ یہ درخت مت کھانا کہیں حکم کی خلاف ورزی نہ ہو جائے ___ تو اس نے تاویل بجھائی' یہ کہا کہ یہ حکم مؤبّد نہیں تھا کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہو۔ یہ حکم محدود وقت کے لئے تھا۔ اس لئے حکم دیا گیا تھا کہ اس درخت کو کھانے کی آپ میں صلاحیت نہیں تھی۔ اب جنت میں رہتے رہتے اس درخت کے کھانے کی استعداد پیدا ہو گئی ہے اور جب آپ کھالیں گے تو ابد الآباد تک جنت میں رہیں گے۔

تو جنت مقام کریم و سکون ہے۔ اس میں رہنے کی تمنا آدم علیہ السلام کی فطرت کا جذبہ تھا اور قسم کھا کے اس نے خیر خواہی جتلائی اور تاویل سمجھائی کہ یہ ممانعتِ وقتی تھی' دوامی نہیں تھی۔ ان چیزوں سے گھبرا کر درخت کھالیا تھا۔ اسے نافرمانی نہیں کہتے۔ صورۃً تو نافرمانی ہے مگر حقیقۃً نہیں۔ اسے لغزش' خطاء فکری یا خطاء اجتہادی کہیں گے۔ عصیان اور نافرمانی نہیں کہیں گے۔

اور حق تعالیٰ نے بھی تعبیر فرمادیا کہ :

وَعَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى۔ (طٰہٰ پ آیۃ ۱۲۱)

آدم نے نافرمانی کی۔ حقیقت میں آدم علیہ السلام جلیلُ القدر پیغمبر بھی ہیں۔ مگر ہیں تو اللہ کی بارگاہ کے بندے ہی اور مقرّب بندے۔ مقرّبین سے اگر ذرا سی لغزش ہوتی ہے تو ان پر شدّتِ تعلق کی بنا پر زیادہ سختی کی جاتی ہے ___ اگر کوئی دشمن آپ کو گالی دے آپ بُرا نہیں مانیں گے کہ دشمن کا کام ہی یہ ہے لیکن اگر آپ کا بیٹا ذرا ترچھی نگاہ سے بھی دیکھ لے' ڈھول مارنے کو تیار ہو جائیں گے کہ تو اپنا ہو کر یہ کام کرتا ہے۔ تو شدت تعلق کی بنا پر تھوڑی سے بات بھی بڑی محسوس ہوتی ہے۔ آدم علیہ السلام مقربان بارگاہ حق میں سے ہیں' پیغمبر ہیں۔ انہوں نے لغزش کر کے درخت کھالیا تو سختی سے خطاب کر کے فرمایا گیا کہ تم نافرمانی کر رہے ہو۔ یعنی اتنے مقرب ہو کر کیوں تم سے لغزش سرزد ہوئی؟ تمہارے حق میں یہ لغزش بھی عصیان کا نام پائے گی۔ مگر حقیقۃً وہ عصیان نہیں تھا۔ خطاء فکری اور خطاء اجتہادی تھی۔

تو ایک طرف ابلیس سے خطا سرزد ہوئی۔ فرمایا گیا تھا کہ تو آدم کو سجدہ کر' اس نے نہیں کیا اور آدم علیہ

السلام سے بھی خطا سرزد ہوئی۔ مگر فرق کیا تھا؟ آدم علیہ السلام نے خطا کے بعد کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا اے اللہ! میں نے کیا جب میں مجرم، نہیں کیا جب میں مجرم، جب تک آپ نہیں بخشیں گے میرا کہیں ٹھکانا نہیں۔

وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ہ اگر آپ میری مغفرت نہیں کریں گے تو میں ٹوٹے اور گھاٹے والوں میں سے ہوجاؤں گا۔ میرے پنپنے کی کوئی صورت نہیں۔ بہرحال ہر حالت میں خطاکار ہوں۔ تو اعترافِ خطا کیا تو خلافت کا تاج سر پر رکھ دیا گیا۔ ابد الآباد کے لئے مقبول بنائے گئے۔ ان کی اولاد میں لاکھوں کروڑوں بندگانِ الٰہی مقبول بنے اور ان سے جنت آباد ہوگی۔

شیطان نے گناہ کر کے یہ نہیں کیا کہ یہ کہا ہو کہ مجھ سے غلطی ہوئی بلکہ اللہ کے حکم میں اور نکتہ چینی کی کہ آپ کہتے ہیں کہ میں آدم کو سجدہ کروں۔ مجھے آگ سے اور آدم کو خاک سے پیدا کیا۔ جھکنا خاک کا کام ہوتا ہے آگ کا کام نہیں۔ میں کیسے آدم کے سامنے جھک جاؤں؟ گویا پورا مقابلہ ٹھانا تو ابد الآباد کے لئے ملعون بنادیا گیا۔

تو آدم علیہ السلام نے غلطی کا اعتراف کیا، تواضع وانکساری سے پیش آئے تو خلافت مل گئی۔ شیطان کبر و ریاء سے پیش آیا۔ ابد الآباد کے لئے ملعون بن گیا۔

اس نے کہا تھا اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ میں بہتر ہوں۔ آدم بہتر نہیں ہے۔ انانیت وہاں سے چلی۔ جو انانیت برتتا ہے وہ گویا اپنا نسب نامہ شیطان کے ساتھ جوڑ رہا ہے اور جو کہتا ہے کہ میں ہیچ اور خاکسار ہوں، وہ آدم کا بیٹا ہے کیونکہ انکسار کرنا اور تواضع للہ کرنا آدم علیہ السلام ہی کا کام تھا۔

حدیث میں فرمایا گیا:

كلكم بنو ادم وادم من تراب ـ

تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں، تو مٹی کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اچھل اچھل کر اوپر جائے۔ وہ جتنی پامال ہوگی اتنی ہی کارآمد ہوگی۔ اگر وہ اڑ کر کپڑوں پر پڑی، آپ لعنت برسائیں گے، کپڑے جھٹک دیں گے اگر آنکھوں میں پڑی تو برا بھلا کہیں گے اور آنکھوں کو دھوئیں گے۔ جوتوں کے نیچے رہے گی تو باعزت رہے گی اوپر چڑھے گی تو بے عزت بن جائے گی۔

انسان بھی ایسا ہے کہ جتنا متواضع ہو کر مٹی بن جائے سر آنکھوں پر رکھا جاتا ہے اور اگر وہ سروں پر چڑھنے لگے تو اسے پٹخ کر پامال کر دیتے ہیں، پیروں کے نیچے آجاتا ہے، تو متکبر بننا درحقیقت نسب نامہ شیطان کے ساتھ جوڑ دینا ہے۔ متواضع بننا آدم علیہ السلام کے ساتھ اپنی نسبت کرنا ہے۔ جتنا آدم کے ہم بیٹے بنیں گے۔ اتنا ہی عزت پائیں گے۔ جتنا اپنے کو کبر و انانیت سے نسبت دیں گے اتنا ہی پامال کئے جائیں گے۔

مخلوقِ خدا کی خدمت وہ کر سکتا ہے جس میں انانیت نہ ہو۔ جو یوں کہے کہ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ اسے کیا ضرورت ہے کہ دوسرے کو ایذا رسانی سے بچانے کے لئے مٹی، ڈھیلے، کانچ، کانٹے اٹھا کے پھینک دے وہ کہے گا میں سب سے بہتر ہوں (سب کو چاہئے میری خدمت کریں، میں کسی کی خدمت کیوں کروں، اس لئے) میں کیوں کانٹوں کو اٹھاؤں۔ لیکن متواضع آدمی کہے گا کہ میں تو خدمتِ خلق کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ میرا کام یہ ہے کہ میں خدمت کروں۔

بہرحال عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کے دو رکن ہیں۔ ایک التعظیم لامر اللہ کے

اَوامر کی عظمت اور وہ پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اللہ کی بزرگی و عظمت سے دل لبریز نہ ہو جائے۔ دوسرا الشفقة علی خلق اللّٰہ مخلوقِ خدا پر شفقت کرنا' ترس کھانا اور اس کی خدمت کرنا یہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ تواضع لِلّٰہ کا جذبہ نہ ہو۔ جب تک اپنی ہیچ دانی اپنے اندر نہ ہو' انانیت نہ ہو۔ جب یہ دو باتیں جمع ہو جائیں گی، کہا جائے گا کہ اس کے اندر ایمان ہے اور ایمان بھی کمال درجے کا ہے۔ کہ اُدھر اللہ سے واصل اِدھر مخلوق میں شامل۔ اُدھر اللہ سے ملا ہوا ہے اِدھر مخلوق میں ملا ہوا ہے۔ اللہ تک پہنچنے میں اس میں یہ کبر نہیں آتا کہ میں تو مقبولانِ الٰہی میں سے ہوں۔ یہ مخلوق میرے رتبے کی نہیں اسے پامال کر دے اور مخلوق میں آکر یہ بات نہیں کہتا کہ میں رات دن چین اڑا رہا ہوں مجھے اللہ کی بندگی سے کیا واسطہ؟ بندگی میں بھی کامل' خدمت میں بھی کامل ہو تو ایمان بھی اسی کا کامل ہو گا۔

حیادار آدمی ہی عبادت و خدمت کر سکتا ہے

مگر یہ کون کر سکتا ہے؟ جس کے اندر اللہ سے حیا موجود ہو جو حیا دار ہو۔ کوئی بے حیا و بے غیرت ہو جائے' وہ نہ عبادت کی طرف متوجہ ہو گا نہ خدمت کی طرف متوجہ ہو گا۔

تو عظیم چیز حیاء ہے اور حیاء کی حقیقت وہی انکسارِ نفس کہ نفس میں انکسار ہو' نفس ٹوٹ رہا ہو اور اپنے کو دوسرے کی عظمت کے سامنے ہیچ سمجھ رہا ہو۔

تو ایمان اس زمین پر آتا ہے جس زمین میں حیاء موجود ہو' اس قلب میں گھر کرتا ہے جس قلب کے اندر حیا موجود ہو۔ اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الایمان بضع وسبعون شعبة ۔

ستر سے کچھ اوپر ایمان کی شاخیں اور شعبے ہیں اوپر کی شاخ لا الٰہ الا اللہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ دلیل ہے کہ دل میں اللہ کی اتنی عظمت بیٹھ چکی ہے کہ اس کے سوا کسی کو معبود بنانے کو تیار نہیں ہے اور ایمان کا ادنیٰ درجہ **اماطة الاذی عن الطریق** ہے یعنی راستے سے ایذاء دہ چیزوں کو اٹھا کر پھینک دینا تاکہ مخلوق کو تکلیف نہ پہنچے۔ تو ایک ایمان کا اوپر کا سرا بتلایا گیا جو اللہ سے ملا ہوا ہے اور ایک نیچے کا سرا بتلایا گیا جو مخلوق سے ملا ہوا ہے۔ اور دونوں کا منشاء بتلا دیا۔ **والحیاء شعبة من الایمان** یہ دونوں شعبے وہ برتے گا' جس میں حیاء اور انکسارِ نفس موجود ہو اور جس میں حیا نہیں تو **اذا فاتک الحیاء فافعل ما شئت** جب آدمی سے حیا جاتی رہتی ہے تو پھر جو چاہے کرے۔ پھر قلب کے اندر زندگی باقی نہیں رہتی۔ بس جو کرتا ہے کرتا رہتا ہے۔

تو اس حدیث میں مؤمن کامل بننے کی ہدایت دی گئی اور اس کے لئے ایک طرف عبادات خداوندی ہے اس کا اعلیٰ قول ہے کہ زبان سے لا الٰہ الا اللہ پڑھے اور جب زبان سے پڑھنے کا عادی ہو گا تو یقیناً قلب میں بھی توحید جمے گی اور جب قلب میں جم جائے گی تو ہر فعل سے توحید سرزد ہو گی۔ مترشح ہو گی اور نکلے گی۔ ہر فعل میں توحید رچ جائے گی۔ پھر ہر موقع پر ذکر اس کے اندر رہے گا۔ چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے وہ ذاکر بن جائے گا۔

دوسری چیز فرمائی خدمت خلقِ اللہ ہے۔ اس کا بھی تعلق حیاء سے ہو گا۔ جتنا حیا دار ہو گا اتنا مخلوق سے شفقت سے پیش آئے گا اور اس کی خدمت کی طرف متوجہ ہو گا۔ یہ حدیث میں نے اس وقت تلاوت کی تھی اور اس کے متعلق یہ چند جملے عرض کئے۔ جیسے میں نے عرض کیا تھا کہ میں زیادہ نہیں بول سکوں گا اور اب بھی

کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔ مگر بہر حال اتنے پر قناعت ہے۔ حق تعالیٰ ہمیں، آپ سب کو کمالِ ایمان کی اور حیا کی توفیق دے۔ آمین۔

اللّٰھم ربّنا تقبل منّا انک انت السمیع العلیم
اللّٰھم توفّنا مسلمین والحقنا بالصالحین غیر خذایا ولا مفتونین
وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہ محمد والہ و اصحابہ اجمعین
برحمتک یا ارحم الراحمین۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

ذکرُ اللہ

سارے جہان ایک طرف، عرش و کرسی، لوح و قلم ایک طرف اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک ایک طرف جو عظمت اس قلب مبارک کی ہوگی، وہ عرش و کرسی، لوح و قلم اور تمام جہانوں کی نہ ہوگی۔ اس لیئے کہ آپ کا قلب مبارک اللہ کے ذکر کا خزانہ ہے اور وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔ جب یہ آتا ہے تو ساری چیزیں ہلکی پڑجاتی ہیں۔ کسی چیز میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ

بعد از خطبہ مسنونہ

اما بعد، فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ۔

صدق اللہ العلی العظیم (عنکبوت پ ۲۱ ع ۵)

بزرگانِ محترم!

یہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے۔ جو اس وقت آپ حضرات کے سامنے میں نے تلاوت کی۔ اس وقت پوری آیت کے بارے میں کچھ زیادہ عرض کرنا نہیں ہے۔ بلکہ آیت کے صرف ایک جز کے بارے میں کچھ کہنا ہے اور وہ درحقیقت ساری شریعت کی روح ہے اور وہ جز وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ہے۔

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ نماز آدمی کو بے حیائی کی باتوں سے بچاتی ہے۔ برائیوں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر بہت ہی بڑی چیز ہے۔

تو نماز فحش اور منکرات سے کس طرح بچاتی ہے؟ اس وقت اس کے بارے میں کلام نہیں کرنا۔ بلکہ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ کے بارے میں چند باتیں گذارش کرنی ہیں۔

اعمالِ شرعیہ کی روح

اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکرُ اللہ ہی سب سے زیادہ اعمال میں افضل ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں۔

۲۸ جولائی ۱۹۹۳ء

بلکہ عمل مقبول ہوتا ہے تو ذکر اللہ ہی کی وجہ سے مقبول ہوتا ہے۔ اگر نماز میں ذکر اللہ اور یادِ خداوندی نہ ہو۔ نماز بے روح رہ جائے گی' روزے میں ذکر اللہ نہ ہو روزہ بے روح رہ جائے گا' زکوٰۃ میں ذکر اللہ نہ ہو زکوٰۃ بے روح ہو جاتی ہے۔ سارے اعمالِ شرعیہ کی روح فی الحقیقت ذکر اللہ اور یادِ خداوندی ہے۔ اس لئے اس پر کلام کرنا گویا ساری شریعت پر اور ساری شریعت کے سارے احکام پر کلام کرنا ہے۔ اس وجہ سے میں نے اس آیت کا انتخاب کیا ہے۔

یہ آپ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر چیز کی زندگی روح سے ہے محض بدن سے کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب تک کہ بدن کے اندر روح نہ ہو۔ روح نکل جاتی ہے تو پھر آدمی کو مُردہ کہتے ہیں۔ پھر وہ اس قابل بھی نہیں رہتا کہ اسے باقی بھی رکھا جائے۔ بدن کو لے جا کر دفن کر دیتے ہیں یا جلا دیتے ہیں یا پانی میں بہا دیتے ہیں۔ غرض وہی انسان جس سے محبت کا تعلق ہوتا ہے جس کی طرف کشش ہوتی ہے ایک منٹ اس سے جُدا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ جہاں روح نکلی ہر شخص کو وحشت ہوتی ہے اور کہتا ہے اسے جلد سے جلد اپنے سے دور کر دیا جائے۔ تو معلوم ہوا کہ تعلق اور محبت درحقیقت بدن سے نہیں بلکہ بدن کے اندر جو روح سمائی ہوئی ہے۔ اس سے تعلق ہوتا ہے۔ وہ نکل گئی تعلق ختم ہو جاتا ہے ___ تو اصل بنیادی چیز اس دنیا میں روح ہے۔ بغیر روح کے نہ زندگی ہے' نہ کسی شی کے لئے بقا ہے ___ جس طرح سے ان مادی چیزوں میں روح سے ہی بقا ہے۔ اسی طرح سے اعمال شریعت بھی ڈھانچے ہیں۔ جب تک ان میں ذکر اللہ کی روح نہ ہو وہ لاشے کے مانند ہیں۔ ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اگر نماز میں یادِ خداوندی کی بجائے غفلت آجائے' نماز ختم ہو گئی۔ اس لئے کہ فرمایا گیا

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِكْرِیْ ہ (طٰہٰ پ۱۶ آیت ۱۴)
"نماز قائم کرو میرے ذکر کے لئے"۔

جب ذکر نہ رہا' روح نماز ختم ہو گئی۔ اب محض ایک اُٹھک بیٹھک یا ایک بدنی ورزش ہے۔ جس کی کوئی قدر و قیمت عنداللہ نہیں ہوگی۔ اس طرح سے اگر روزے کے اندر ذکر' تلاوت اور تراویح نہ ہو تو روزہ بھی ایک فاقہ ہے۔ جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ نیت کے سچے اور اس میں یادِ خداوندی ہونے سے روزہ زندہ ہو جاتا ہے۔ اس کو عبادت کہتے ہیں۔ یہ روح نکل جائے عبادت کے بجائے عادت ہو جاتی ہے۔ تو عادت اور عبادت میں فرق یہی ہے کہ عادت محض ایک ڈھانچہ ہوتا ہے۔ جس میں یاد نہیں ہوتی اگر یاد بھی ہوتی ہے تو اپنے نفس کی ہوتی ہے اور عبادت جیسا ڈھانچہ ہے جس میں اللہ کی یاد ہوتی ہے نفس کی یاد نہیں ہوتی ہے۔ عادت اور عبادت میں یہی فرق ہے۔ اگر بلا نیت کے سارا دن کھانا نہ کھائیں' پانی نہ پئیں' بیوی کی طرف رخ کر کے بھی نہ دیکھیں۔ اسے فاقہ کہیں گے اور اگر نیت کے ساتھ اور یادِ خداوندی کے ساتھ کریں تو اسی کو روزہ کہیں گے۔ ___ اگر حج میں ذکر اللہ نہ ہو اور نیتِ صحیح نہ ہو تو حج نہیں۔ بلکہ سیر و سیاحت ہے۔ اگر اسی میں یہی نیت آجائے۔ وہ حج بن جاتا ہے۔ تو عادت اور عبادت میں یہی فرق ہے۔ کہ عادت میں نفس کا جذبہ کام کرتا ہے۔ اور عبادت میں جذبہ یادِ حق ہے۔ جس سے وہ عبادت بن جاتی ہے ___ حاصل یہ نکلا جب اس کائنات کی روح اللہ کی یاد ہے۔ اس طرح سے پوری شریعت کی روح بھی اللہ کی یاد ہے۔ اگر دنیا میں سے روح نکل جائے' تو دنیا ڈھانچہ بن جائے گی۔ شریعت میں سے کوئی اس روح کو نکال دے تو شریعت عادت بن جائے گی عبادت نہیں رہے گی۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَالَ فِى الْاَرْضِ اللّٰهُ اللّٰهُ

تھا کہ ان سے ہمیں دین کا کام لینا ہے' اس میدان میں ان سے کام لینا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ وراثت تو باپ سے ہی ملتی ہے۔ کوئی پیدا تو نہیں کرتا۔ پیدا شدہ کمائی کو وراثت نہیں کہتے۔ وراثت تو وہ ہے جو باپ کا ترکہ ہو اور مل جائے۔ اور ترکہ کب ملے گا؟ جب نسب نامہ ثابت ہو۔ یعنی باپ کا بیٹا ہونا ثابت ہو' تبھی ترکہ ملے گا اور اگر یہی ثابت نہ ہو کہ یہ مرنے والے کا بیٹا ہے تو اجنبی آدمی کو کبھی بھی ترکہ نہیں ملے گا۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا روحانی ترکہ علم اور کمال ہے۔ وہ جب ملے گا' جب روحانی نسب نامہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہوا ہو کہ میرا شیخ یہ ہے' اس کا شیخ یہ' اس کا آگے شیخ وہ۔ سلسلے سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد ثابت ہو' تو ترکہ ملے گا اور اگر بیچ میں کوئی کڑی کٹ گئی اور سلسلہ متصل نہ پہنچا۔ تو وہ ایسا ہے جیسے بے باپ کی اولاد ہو کہ بیچ میں باپ ہی ندارد ہے۔ پھر ترکہ کہاں سے مل جائے گا؟ اس لئے کہ یہ علمی وراثت نسبت سے ملتی ہے۔ جیسا کہ مال ودولت کی وراثت نسب سے ملتی ہے۔ یہ نسب مادی ہے' وہ نسب روحانی ہے۔ اس کو فرمایا گیا :

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا

"پھر ہم نے کتاب اللہ اور علم کا ان لوگوں کو وارث بنایا' جن کو ہم نے اس کام کے لئے چن لیا تھا"۔

اب فرمایا' فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ بعض ان میں گندے انڈے نکل گئے کہ انہوں نے یا کتابُ اللہ کو پس پشت ڈال دیا یا کتاب اللہ کو اپنی رائے کے تابع کیا یا تھوڑے تھوڑے حیلے کر کے معنوی تحریف شروع کی۔ فرمایا یہ اپنے نفس پر ظالم ہیں۔ ان کو اس کی جزا اور صلہ ملے گا۔

اور فرمایا وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ بعض ان میں وہ ہیں کہ درمیانی راہ سے اللہ کے راستہ پر چل رہے ہیں۔ ادھر اُدھر نہیں ہٹتے۔ بٹیہ اختیار کرلی۔ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے۔ وہ بھی نجات پائیں گے ــــ اور فرمایا :

وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ

بعض وہ ہیں جو اس راستے پر دوڑ رہے ہیں اور دین کی کوئی جزئی چھوڑنا نہیں چاہتے' ہر حیثیت سے دین کو مضبوط تھامے ہوئے ہیں اور دین کی طاقت ہاتھ میں لے کر خراٹے بھر رہے ہیں۔ وہ سابق خیرات ہیں ــــ جیسے گھوڑ دوڑ کے میدان میں گھوڑا آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے یہ اس روحانی میدان میں کوشش کرتے ہیں کہ ہم آگے نکل جائیں۔ اس طرح سے دوڑنے میں مصروف ہیں ــــ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اللہ نے اس لائن پر لگادیا ہے تو کوئی دوڑ رہا ہے' کوئی لپک رہا ہے' کوئی معمولی چال چل رہا ہے' کوئی اِدھر اُدھر ہٹ کر اس بٹیہ سے ہٹ گیا۔ وہ منزل مقصود سے رہ گیا۔ لوگوں کی انواع واقسام ہیں۔ اس لئے ہمارے اور آپ کے لئے ضروری ہے کہ ہم صحیح معنیٰ میں کتاب اللہ کے وارث بنیں۔ انہی معنیٰ پر چلتے رہیں جو رویات ہو کر چلے آرہے ہیں۔ جس میں سلف کا ذوق اور سلف کا تعامل شامل ہے اور جس میں وہ مذاقِ دینی شامل ہے۔ جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تربیت کی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن وحدیث کے محض الفاظ ہی منقول نہیں ہیں' معنیٰ بھی منقول ہیں اور معانی ہی منقول نہیں بلکہ تربیت کا وہ ذوق بھی سلسلہ وار چلا آرہا ہے۔ جس ذوق پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور عمل کا نمونہ بھی دکھلایا کہ اسی نمونہ کے عمل پر رہو۔ اس لئے آپؐ کے بارے میں فرمایا گیا کہ آپؐ کی چار شانیں ہیں۔ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ اللہ کی آیتیں بامانت الفاظ آپؐ نے پہنچاویں۔ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ پھر

تعلیم کے ذریعے ان کی مراداتِ ربّانی بیان کیں۔ وَالْحِكْمَةَ پھر عملی اُسوۃ بھی پیش کیا کہ یوں عمل کرو یہ نمونہ ہے جس کو میں کر کے دکھلا رہا ہوں اور فرمایا' وَيُزَكِّيهِمْ دلوں کو مانجھ کر اس میں استقامت بھی پیدا کی۔ کجی نکال دی اور زیغ نکال دیا ـــــ ان مجاہدات اور محنتوں کے بعد استقامت نصیب ہوتی ہے۔ نہ یہ کہ آدمی چند حرف دیکھ لئے۔ کسی کی بات سن لی اور رائے دینی شروع کر دی۔ یہ چھچھورپن ہے یہ کوئی سنجیدگی کی بات نہیں ہے۔ جس کا آدمی علم نہیں رکھتا۔ اس میں کبھی رائے نہ دے ـــــ مثلاً سنہار کا کوئی مسئلہ آئے گا' آپ سے کوئی کہے کہ زیور کیسے بنتا ہے؟ آپ کہیں گے میں جانتا نہیں سنہار کے پاس جاؤ یا لوہاری کی بات ہو آپ یہ کہتے ہوئے عار نہیں کریں گے کہ بھئی! میں لوہار نہیں۔ اگر آپ کو لوہا کٹوانا ہے تو لوہار کے پاس جاؤ مگر جب دین کی بات آتی ہے تو لوگوں کو اپنے کو جاہل کہتے ہوئے عار آتا ہے۔ اس میں رائے زنی کے لئے تیار ہیں۔ گویا دین ایک کھلونا ہے۔ جس کا جی چاہے اس میں رائے زنی کرے۔

اس واسطے میں نے یہ عرض کیا جزئیات پیش کرنے کا موقع نہیں۔ میرے پاس بھی وقت کم ہے' آپ کے پاس بھی۔ اس لئے اصول میں نے عرض کر دیا۔ ایک کسوٹی پیش کر دی۔ اس سے آپ جزئیات کو عمر بھر پرکھتے رہیں۔ اس سے آپ جزئیات کا فیصلہ کر سکیں گے ـــــ یہ چند ضروری باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔ وقت یہ نے زیادہ لے لیا۔ خود میں اتنی ہمّت اور طاقت بھی نہیں تھی۔ مگر شاید ان بزرگوں نے کوئی قلبی زور لگایا ہو جس سے کچھ بات چل گئی ورنہ اپنے اندر تو طاقت تھی نہیں ـــــ بہرحال اب میں اس بات کو ختم کرتا ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو علم و عمل کی توفیق عطا فرمادے' صحیح وسیدھے راستے پر چلائے۔ زیغ اور کج راہوں سے ہمیں محفوظ رکھے اور اِدھر اُدھر کے تخیّلات سے بچا کر صرف انہی روایات پر رکھے' جو سند صحیح کے ساتھ منقول ہوتی آرہی ہیں ـــــ آمین

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ
وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

یادِ حق

زندگی فی الحقیقت ذکر اللہ اور اللہ کا نام ہے۔ جب کائنات' نباتات اور جمادات کی زندگی اس سے ہے تو انسان کی زندگی اس سے کیوں نہیں ہو گی؟ اس لئے انسان کو سب سے زیادہ ذاکر ہونا چاہئے تبھی وہ زندہ ہو گا ___ بلکہ زندہ جاوید بن جائے گا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الذَّاكِرِ فِي الْغَافِلِيْنَ كَمَثَلِ الْحَيِّ فِي الْاَمْوَاتِ اَوْ كَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ[1]

احوالِ واقعی

بزرگان محترم!

پہلے سے کوئی علم بھی نہیں تھا اور ارادہ بھی نہیں تھا کہ بیان بھی کرنا ہو گا .... لیکن حضرت مولانا نے ارشاد فرمایا کہ نماز سے پہلے کچھ نہ کچھ بیان ہو گا۔ ان کی تعمیل حکم کے طور پر میں آپ حضرات کے سامنے بیٹھ گیا ہوں۔ کوئی لمبی تقریر یا وعظ اس وقت نہیں ہو سکے گا بلکہ محض تعمیلِ ارشاد کے طور پر چند کلمات' اس حدیث کی روشنی میں گزارش کروں گا جو اس وقت میں نے پڑھی۔

تمہید

یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ :

مثل الذاکر فی الغافلین کمثل الحیّ فی الاموات ۔

اس کی تفصیل سے پہلے اتنی بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اس دنیا میں ہر چیز کا ایک پیکر' بدن اور جثہ ہے اور ایک اس کی روح' زندگی اور حیات ہے۔ یہ ظاہری بدن جو آپ کو دیا گیا ہے۔ یہ خود مستقلاً انسان نہیں ہے۔

[1] مدینہ طیبہ زادھا اللہ شرفاً وکرامۃً ۔ بتاریخ ۱۹۶۲-۱۱-۵

یہ انسان کی محض صورت اور علامت ہے۔ انسانیت اس جثّہ کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ جو روح اور حقیقت کی صورت میں ہے۔ یہ اس حقیقت کی جو ہمارے اندر چھپی ہوئی ہے، محض نمائش اور نمود ہے۔ فی الحقیقت ہماری انسانیت وہی ہے اور اسی کا نام زندگی ہے۔

اگر وہ انسان کے بدن میں سے نکال دی جائے تو بدن کا کوئی وجود نہیں۔ چند دن روح کے پچھلے اثرات کے تحت رہے گا۔ جہاں دو تین دن گزریں گے اور زندگی کے جو تھوڑے بہت اثرات سرایت کئے ہوئے تھے، وہ زائل ہو جائیں گے یہی بدن گلنا سڑنا اور پھٹنا شروع ہو گا۔ اس کا ریزہ ریزہ بکھر جائے گا۔ مٹی، مٹی میں مل جائے گی، پانی پانی میں، آگ آگ میں اور ہوا ہوا میں مل جائے گی۔ شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ اس بدن کی شیرازہ بندی اگر کر رکھی ہے تو روح نے کر رکھی ہے۔ روح نکلتے ہی بدن کی کوئی اصلیت نہیں۔ باطل محض ہے یہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ زندگی صورت کا نہیں حقیقت کا نام ہے۔ صورت اس زندگی کی محض نمائش و مظاہرہ اور دکھلاوا ہے۔

روحِ کائنات

یہی صورت سمجھ لیجئے اس پوری کائنات کی ہے۔ یہ جو ہماری مختصر بدن ""کائنات"" ہے وہ روح سے زندہ ہے۔ اسی طرح سمجھ لیجئے یہ پوری کائنات بھی کسی روح سے زندہ ہے۔ جب تک یہ روح اس کائنات میں موجود ہے، یہ کائنات زندہ کہلائے گی۔ جب روح نکال لی جائے گی، ساری کائنات کا خیمہ آپڑے گا، درہم برہم ہو جائے گا، ریزہ ریزہ بکھر جائے گا ___ یہ روح کیا چیز ہے ___ ؟ جو روح انسان کے بدن میں ہے، وہی روح کائنات میں ہے۔ انسانی روح کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا :

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ اے پیغمبر! آپ سے لوگ روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ - کہہ دیجئے روح اللہ کا ایک امر ہے۔ ایک حکم اور لطیفۂ خداوندی ہے۔ اس سے یہ کثیفۂ جسمانی سنبھلا ہوا ہے۔ وہ نکل جائے تو کثیفہ ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح سے پوری کائنات کی روح بھی در حقیقت لطیفۂ ربّانی ہے اور اس کا نام ذکر اللہ ہے۔ یادِ حق سے یہ کائنات کھڑی ہوئی ہے۔ جب اس سے ذکرِ خداوندی منقطع ہو جائے گا، جبھی یہ خیمہ آپڑے گا۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

لاتقوم الساعۃ حتی یقال فی الارض اللّٰہ اللّٰہ۔

قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی۔ جب تک اس کائنات میں ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے۔ جب ایک بھی باقی نہیں رہے گا اور سارے شرار الناس رہ جائیں گے جن کے دل میں نہ یادِ حق ہوگی نہ ذکرِ خداوندی ہوگا نہ ان کی زبان ذکرِ الٰہی سے تر ہوگی۔ قلوب یکسر بھلا بیٹھیں گے۔ نہ صرف بھلا بیٹھیں گے بلکہ خالی ہو جائیں گے، ذکر مٹ جائے گا یعنی شرارُ الناس اور بدترین خلائق رہ جائیں گے جن کے بارے میں فرمایا گیا :

لایعرفون معروفاً ولاینکرون منکراً۔

""نہ اچھائی کو اچھائی جانیں گے نہ برائی کو برائی""۔

سڑکوں پر اس طرح سے بدکاری ہوگی جیسے جانور اور بہائم پھرتے ہیں۔ نہ حیا ہوگی نہ غیرت ہوگی۔ جب ساری کائنات اور سارے انسان ایسے بن جائیں گے۔ اسی وقت قیامت قائم کر دی جائے گی ___ تو قیامت

اس عالم کو ذرہ ذرہ کر کے بکھیر دینے کا نام ہے۔ آسمان ٹوٹ پڑے گا' زمین پھٹ جائے گی' پانی میں مٹی اور مٹی میں پانی' ہوا میں میں آگ اور آگ میں ہوا سب گڈ مڈ ہو کر قصہ درہم برہم ہو جائے گا اور سارا خیمہ دنیا کا آپڑے گا۔ جس طرح روح کے نکلنے سے بدن کا شیرازہ بکھر جاتا ہے' اسی طرح پوری کائنات کا شیرازہ اس روح کے نکل جانے سے بکھر جائے گا جس کا نام ذکر اللہ اور یاد خداوندی ہے۔

اس سے معلوم ہوا اس کائنات کی روح ذکر خداوندی ہے یاد حق جب تک موجود ہے گی۔ کائنات کا خیمہ کھڑا ہوا ہے' جب یہ نکل جائے گی ، کائنات درہم برہم ہو جائے گی۔ تو ظاہر میں کائنات ہم سے اور آپ سے سنبھلی ہوئی ہے' حقیقت میں اللہ کے ذکر کرنیوالوں سے سنبھلی ہوئی ہے' جب تک یہ موجود ہیں کائنات موجود ہے۔ جب یہ ختم ہو جائیں گے کائنات ختم ہو جائے گی ___ غرض اس ساری کائنات کا خیمہ یاد حق اور ذکر کے اوپر کھڑا ہوا ہے۔

کائنات کا ذرہ ذرہ یادِ حق میں مصروف ہے

یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام بتلاتی ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ذکر خداوندی میں مصروف ہے' ہر وقت یادِ حق کرتا ہے اور جب یاد منقطع ہوتی ہے وہی اس ذرے کے مٹنے اور ختم ہو جانے کا وقت ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ ہری ٹہنی اللہ کا ذکر کرتی ہے' جب ذکر ختم ہو جاتا ہے ، ٹہنیاں خشک ہو کر پتے جھڑ جاتے ہیں تو روحِ نباتی فی الحقیقت یاد خداوندی ہے جب تک موجود ہے درخت موجود ہے' نہیں ہو گی تو ختم ہو کر مٹ جائے گا۔ اس کے پتے جھڑ جائیں گے۔ یہ اس کی موت کا وقت ہو گا۔

قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے کہ ذرہ ذرہ اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے :

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ (بنی اسرائیل پ۱۵ آیت ۴۴)

کائنات کا کوئی ذرہ نہیں ہے جو اللہ کے ذکر میں مشغول نہ ہو مگر تم اس کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔ تمہاری زبان اور ہے کائنات کے ذرے کی زبان اور ہے۔ پرندے کی زبان اور ہے۔ وہ اپنی اپنی زبان میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ تم ان کی زبان کو نہیں سمجھتے ___ اور تم ان کی زبان کیا سمجھو گے تم اپنے ہی بہت سے بھائی بندوں کی زبان کو نہیں سمجھتے۔ ایک پنجاب کا رہنے والا بنگلہ زبان نہیں جانتا۔ بنگال کا رہنے وال پشتو زبان نہیں جانتا۔ ایک پختونستان کا رہنے والا ترکی زبان نہیں جانتا۔ ترکی کا رہنے والا عربی زبان نہیں جانتا۔ تو جو اپنے بھائیوں کی زبان نہ سمجھے' وہ کنکریوں اور پرندوں کی زبان کیا سمجھے گا؟ لیکن زبان سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اگر آپ نہ سمجھیں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بنگلہ میں اللہ کو کوئی یاد نہیں کر رہا اور اگر آپ پشتو نہ سمجھیں تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ پشتو میں کوئی اللہ کا نام لینے والا نہیں ہے وہ نام لے گا' ذکر کرے گا آپ بیٹھے ہوئے منہ دیکھیں گے اس لئے کہ آپ اس کی زبان نہیں سمجھتے۔

اس کی بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے آپ ٹیلیگراف کے دفتر میں گئے ہوں گے۔ وہاں جا کے آپ نے تار دیا۔ دو تین روپے فیس کے ادا کئے' تار بابو نے پیتل کی کھونٹی پر ہاتھ رکھ کر کھٹ کھٹ کھٹ کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے کہا کہ میں نے تو یہ مضمون دیا تھا کہ میں فلاں تاریخ کو آ رہا ہوں۔ یہ بیٹھا ہوا کھٹ کھٹ کر رہا ہے' اس کھٹ کھٹ کو اس مضمون سے کیا تعلق ہے ___ ؟ لیکن آپ کے سامنے تو وہ کھٹ کھٹ آ رہی ہے۔ حقیقت میں اسی کھٹا کھٹ میں ایک ملک سے دوسرے ملک' ایک شہر سے دوسرے شہر میں علوم پہنچ رہے ہیں۔ مگر آپ اس فن سے واقف نہیں اس لئے آپ نہیں سمجھتے۔ یہ اصطلاحات ہیں جن سے ایک

شہر سے دوسرے شہر کو مضمون چل رہا ہے۔ اگر آپ اس فن کو سیکھے ہوئے ہوتے اس کھٹ کھٹ کی اصطلاحات سے واقف ہوتے آپ کو فوراً پتہ چل جاتا کہ یہ کراچی سے لاہور کی طرف اور لاہور سے ڈھاکہ کی طرف کیا مضمون جارہا ہے ___ مگر آپ کو اصطلاحات کا علم نہیں اس لئے آپ حیرانی سے دیکھتے ہیں کہ یہ کھٹ کھٹ کررہا ہے میرا بتلایا ہوا مضمون کس طرح پہنچ جائے گا۔ مگر مضمون آپ کا ہے' اصطلاح اس کی ہے اور وہ دوسری جگہ جارہا ہے۔

اسی طرح سے ایک پرندہ جب سیٹی بجاتا ہے آپ سمجھتے ہیں وہ سیٹی بجارہا ہے حقیقت میں وہ ذکر اللہ کررہا ہے۔ آپ اس کی زبان سے واقف نہیں ہیں۔ طوطا بولتا ہے وہ اللہ کی یاد کرتا ہے۔ آپ اس کی زبان سے واقف نہیں جیسا کہ آپ اپنے یورپ والے بھائی کی زبان سے واقف نہیں ہیں جو اپنی زبان میں خدا کو یاد کرے گا۔ آپ بیٹھے ہوئے منہ کو دیکھیں گے۔ تو کوئی پرندہ' درندہ' چرندہ ایسا نہیں ہے جو اللہ کے ذکر میں مشغول نہ ہو' مگر زبان اس کی ہے' فہم آپ کا نہیں ہے۔ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو ورنہ وہ تسبیح میں مشغول ہیں۔

حدیث میں ہے کہ سفید کپڑا اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ جب میل آنا شروع ہوتا ہے ذکر اللہ بند ہوجاتا ہے۔ وہی وقت اس کی فنا کا ہوتا ہے آپ نفرت سے بدن سے اتار کر پھینک دیتے ہیں جب تک دھوبی اس کو پاک صاف کرکے نہ لادے' جب سفید ہوجائے گا پھر ذکر میں مشغول ہوجائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء لکھتے ہیں کہ جس شخص کو مسجد کا امام بنایا جائے' وہ میلے کپڑوں سے نماز نہ پڑھائے' یعنی ایسے میلے کپڑے جن میں سے بدبو اٹھنے لگے۔ یوں تو کپڑا اگلے ہی دن میلا ہوجاتا ہے۔ علماء عربیت لکھتے ہیں کہ :

لذة الثوب يوم۔

کپڑے کی لذت ایک دن کی ہوتی ہے۔ اگلے دن سے میل آنا شروع ہوجاتا ہے۔ تو تھوڑا بہت میل تو فوراً شروع ہوجاتا ہے' لیکن ایسا میلا پن کہ پسینہ جذب ہوتے ہوتے زرد رنگ بن جائے' اس میں سے بدبو آنے لگے' اس کا رنگ بھی متغیّر ہوجائے' شکل بھی بدل جائے۔ اس وقت امام کو ان کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھانا مکروہ ہے۔

اس کی ظاہری وجہ تو یہی ہے کہ امام فی الحقیقت اللہ کی بارگاہ میں تمام مقتدیوں کا وکیل ہے وہ قابل تعظیم ہے اس میں نفرت کی وجوہ نہ ہونی چاہئیں کہ مقتدی متنفّر ہونے لگیں۔ اگر کپڑے غیر معمولی طور پر میلے ہوئے تو مقتدیوں کو خلجان پیدا ہوگا کہ کس بے ڈھنگے آدمی کو آگے لاکے کھڑا کردیا گیا۔ تو جو مقتدی اس کے بے ڈھنگے پن کے خیال میں مشغول ہوں گے اللہ سے ان کا کیا رابطہ قائم ہوگا؟ وہ تو امام کی مذمت میں لگے ہوئے ہیں کہ امام عجیب بے ڈھنگا ہے۔ امامت کے لئے کھڑا ہوگیا' بدبو اس میں سے آرہی ہے۔ رنگ اس کا صحیح نہیں۔ یہ ہمیں خدا تک کیا پہنچائے گا ___؟ تو امام کے لئے ضروری ہے کہ صاف ستھرا ہو۔ کپڑے بھی صاف ہوں۔ تو ظاہری وجہ تو یہی ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو باطنی وجہ یہ ہے کہ سفید کپڑا ذکر اللہ میں مشغول ہوتا ہے امام کے کپڑوں کا ذکر خود امام کی طبیعت کو ذکر اللہ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

جب اس کے اردگرد ذکر اللہ کی آوازیں آرہی ہیں اگرچہ وہ کانوں سے نہ سنی جائیں۔ ان آوازوں سے خود امام کے قلب میں ذکر اللہ کی رغبت پیدا ہوگی اور یادِ حق تازہ ہوکر وہ اللہ کی طرف زیادہ متوجہ ہوگا تو مقتدی بھی اتنے ہی متوجہ ہوجائیں گے۔

آپ نے تجربہ کر کے دیکھا ہو گا کہ جب آدمی غسل کر کے صاف کپڑے پہنتا ہے تو بے اختیار دل سے
ـد للہ نکلتا ہے؛ طبیعت میں شگفتگی ہوتی ہے اور جب کپڑے میلے ہوتے ہیں تو انقباض اور تشتت دل میں
ا ہوتا ہے، اللہ کا نام لینا بھی چاہتا ہے تو زبان سے نہیں نکلتا، طبیعت میں انقباض ہے۔ یہ حقیقت میں کپڑے
ے ذکر کا اثر ہوتا ہے جو انسانی قلب پر پڑتا ہے۔

اگر سبزے میں بیٹھیں گے ذکر اللہ کی زیادہ توفیق ہوگی جھاڑ پھنکار میں بیٹھیں گے، کم ہو جائے گی۔ اس
ے سبزہ خود تسبیح میں مشغول ہے ___ اکثر اہل اللہ کو دیکھا گیا ہے کہ دریا کے کنارے سبزے پر جا کر ذکر اللہ
رتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماحول کا ذکر ان کے قلوب کے اوپر مؤثر ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ چلتا
ا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ جب رک جاتا ہے تسبیح بند ہو جاتی ہے۔ چلتا ہوا پانی ذکر کی حیات کی وجہ سے
حقیقت زندہ ہے اور جب ٹھہر گیا جسے ماء راکد کہتے ہیں اس میں تغیّر آجاتا ہے وہ سڑ جاتا ہے، خراب
جاتا ہے، تسبیح بند ہو جاتی ہے، تسبیح کا بند ہونا ہے کہ لطافت کی روح اس میں سے کھنچ جاتی ہے، اس کے اندر
ثافت پیدا ہو جاتی ہے۔ بہرحال چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے، سبز ٹہنیاں اللہ کی تسبیح کرتی ہیں، سفید کپڑا اللہ
ی تسبیح کرتا ہے، کنکریاں تسبیح کرتی ہیں۔ بہرحال تمام چیزیں ذکر میں مشغول ہیں ہم آپ سمجھتے نہیں ہیں۔

مخلوقات کی تسبیح کے بارے میں اہلِ باطن کا ادراک

اہلِ باطن کو کبھی کبھی علم دیدیا جاتا ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کی تسبیح کو سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں انبیاء علیہم
سلام کو بطور معجزے کے یہ علم دیا جاتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام کا معجزہ یہی تھا کہ وہ پرندوں کی بولیاں سمجھتے
ے۔ سلیمان علیہ السلام کا مقولہ قرآن حکیم میں نقل کیا گیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (نمل پ ۱۹ آیت ۱۶)

"اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھلائی گئی ہیں"۔

سلیمان علیہ السلام بتلا دیتے تھے کہ یہ دو کوّے آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں اور یہ دو چڑیاں کیا کہہ رہی
ں۔

احادیث میں تقریباً مختلف جانوروں کی اٹھارہ انیس مثالیں دی گئی ہیں اور ان کی تسبیح ذکر کی گئی ہے۔ تیتر یہ
ـتا ہے اور مور یہ کہتا ہے۔ فلاں کی یہ تسبیح ہے، فلاں کا یہ ذکر ہے ___ تیتر کے بارے میں حدیث میں ہے کہ
ں کی تسبیح یہ ہے کہ:

كما تدين تدان۔

"جیسا کرو گے ویسا بھرو گے"۔

یہ ایک نصیحت ہے جو اس کی زبان سے ہر وقت نکلتی رہتی ہے ___ بعض کی یہ تسبیح ہے کہ:

سبحان من زيّن الرجال باللحىٰ وزيّن النساء بالذوائب ۔

پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو داڑھیوں سے زینت دی اور عورتوں کو مینڈھیوں اور چوٹیوں سے
ینت دی ___ مختلف عبرتیں اور نصیحتیں پرندوں کی زبان سے ادا ہوتی ہیں مگر وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ
تَسْبِيْحَهُمْ۔

کس زبانِ مرانمی داند
با عزیزاں چہ التماس کنم

لوگ میری زبان نہیں پہچانتے تو میں دوستوں سے کیا کہوں ___ پرندہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں تو نصیحت پیش کر رہا ہوں۔ مگر انسان میری زبان نہیں پہچانتے' جن کو حق تعالٰی علم دیتے ہیں وہ زبان پہچانتے ہیں۔ سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کی بولیوں کا علم جان لیا تھا۔ مگر کسی کالج یا مدرسہ میں پڑھ کر نہیں' اللہ کے الہام سے یعنی بطور معجزے کے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جانوروں کی گفتگو

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے۔ جانوروں کی زبان سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ان کے معاملات اور جھگڑوں کا فیصلہ فرماتے تھے۔ حدیث میں ہے کہ ایک اونٹ بلبلاتا ہوا اور اپنی زبان میں بڑبڑاتا ہوا حاضر ہوا اور اس شان سے آیا کہ بول رہا ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں اپنا منہ ڈال دیا ___ فرمایا ___ اس کے مالک کو بلاؤ۔ اونٹ والا بلایا گیا ___ وہ آیا ___ فرمایا ___ یہ شکایت کر رہا ہے تو اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ لادتا ہے اس نے اقرار کیا ___ یا رسول اللہ! بے شک میں اس جرم کا مجرم ہوں ___ فرمایا ___ آئندہ ایسا مت کرنا ...... اونٹ خوش ہوتا ہوا واپس ہو گیا ___ تو اونٹ کی زبان کو سمجھ کر اس کی فریاد سنی اور اس کے حق میں فیصلہ دیا۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ آپؐ تشریف لے جا رہے تھے کہ کسی دیہاتی کے مکان کے قریب سے گزر ہوا' وہ کہیں پہاڑ میں سے کوئی ہرنی پکڑ لایا تھا۔ اس کے گلے میں رسی باندھ رکھی تھی' وہ کھونٹی سے بندھ رہی تھی۔ اس نے دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد شروع کی۔

آپؐ نے فرمایا ___ دیہاتی تجھے پکڑ لایا ہے تو اس کی ملک ہو گئی ہے اس لئے کہ پہاڑ میں جو چیز ہوتی ہے' جو اس پر قبضہ کرے وہ اس کی ملک ہو جاتی ہے۔ تو اس کی ملک ہو گئی' میں تجھے کیسے چھوڑ دوں؟

اس نے عرض کیا' یا رسول اللہ! پہاڑی میں میرے دو بچے بلبلا رہے ہیں اور بھوکے ہیں۔ میں ہی انہیں دودھ پلاتی تھی' میرے بچے مر جائیں گے آپ مجھے چھوڑ دیں۔

فرمایا' وعدہ کر کہ تو دودھ پلا کے پھر یہاں آ جائے گی۔

اس نے وعدہ کیا اور حلف کیا۔

آپؐ نے گلے میں سے رسی کھول دی اس نے جونہی جا کر دودھ پلایا' واپس آ کر پھر وہیں کھڑی ہوئی۔ آپؐ نے پھر رسی اس کے گلے میں ڈال دی۔

جب دیہاتی آیا۔ آپؐ نے فرمایا' یہ کیا تو نے زیادتی کی ہے؟ اس کے بچے بلبلا رہے ہیں تو نے جا کے قبضہ کیا۔ اس کو چھوڑ دے ___ اس نے نصیحت قبول کی اور ہرنی کو آزاد کر دیا۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی ___ غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جانوروں کی بولیوں پر مطلع ہوتے تھے ___ تو انبیاء علیہم السلام کو بطور معجزے کے زبانوں کا علم دیا گیا حتیٰ کہ پرندوں کی زبانوں کا بھی۔

نوعِ انسان کے سوا دنیا کی ہر نوع کی ایک ہی زبان ہے

جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام انسانوں کی زبانوں کا علم دیا گیا تھا۔ یہ جو قرآن کریم میں فرمایا گیا :

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔

آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھلا دیئے گئے ___ اس کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا یعنی علّم اللغات کلھا۔

آدم علیہ السلام کو ساری لغتیں سکھلا دی گئی تھیں جو قیامت تک انسانوں کے اندر بولی جائیں گی وہ ہر زبان سکھلا دی تھی۔ ان کی پہلی نسل ان تمام زبانوں کو جانتی تھی لیکن جب نسل مختلف ہوئی اور دنیا میں منتشر ہوئی‘ کوئی قبیلہ کہیں آباد ہوا کوئی کہیں آباد ہوا۔ تو وہاں کی زمینوں کی خصوصیات تھیں۔ ایک ایک قبیلے کے اوپر ایک ایک لغت کا غلبہ ہو گیا ___ اس طرح زبانیں الگ ہو گئیں۔ تو ایک نے دوسرے کی زبان کو سمجھنا چھوڑ دیا اور سمجھنے سے محروم ہو گیا۔ اس کو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانی ظاہر فرمایا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ (روم پ۲۱ آیت ۲۲)

اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی پیدائش ___ اور تمہاری زبانوں کا اور تمہارے رنگوں کا اختلاف۔ یعنی بنی آدم اس میں مختلف ہیں حالانکہ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ ایک جنس‘ ایک نوع‘ لیکن ایک سے دوسرے کی صورت نہیں ملتی‘ رنگ نہیں ملتا‘ زبان نہیں ملتی۔ ایک پنجابی بولتا ہے‘ ایک بنگلہ بولتا ہے‘ ایک ہندی اور ایک انگریزی بولتا ہے۔ دنیا کے جتنے جاندار ہیں ہر نوع کی ایک زبان ہے خواہ وہ کسی ملک کا ہو۔ مثلاً طوطا ٹیں ٹیں کرے گا۔ وہ ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا‘ عربستان کا ہو یا ترکستان کا ___ مور ایک بولی بولے گا چاہے یورپ کا ہو یا ایشیاء یا افریقہ کا ہو۔ کبوتر ایک ہی طرح بولے گا کہیں کا ہو۔ لیکن انسان بھانت بھانت کی بولیاں بولتا ہے۔ ترکی اور طرح سے یورپین اور ایشین اور انداز سے ___ یہ اللہ کی قدرت کی نشانی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک جنس کے سارے افراد ہیں اور زبان الگ الگ ہیں۔ ان میں سے ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتا۔ یہ قدرت خداوندی کی نشانی ہے۔

انسان کی غفلت

بہرحال ہر ہر چیز اپنی اپنی زبان میں تسبیح کرتی ہے۔ مگر ہم ان کی زبانوں کو نہیں سمجھتے۔ جیسا کہ ہم ایک دوسرے کی زبانوں کو نہیں سمجھتے‘ غرض کنکریاں تسبیح کرتی ہیں‘ سفید کپڑا تسبیح کرتا ہے‘ چلتا ہوا پانی تسبیح کرتا ہے‘ ہری ٹہنیاں تسبیح و ذکر کرتی ہیں۔ لیکن نہیں ذکر کرتا تو انسان نہیں کرتا‘ غافل ہے تو انسان اللہ کی یاد سے غافل ہے۔ حالانکہ سب سے زیادہ اس کو ذاکر ہونا چاہئے تھا۔ اللہ نے جو نعمتیں اس پر مبذول کی ہیں‘ کائنات میں اللہ نے وہ کسی کو نہیں عطا کیں ___ جتنا چہیتا اور پیاری مخلوق انسان ہے ___ کوئی مخلوق کائنات میں اللہ کو اتنی پیاری نہیں ہے۔ تو ساری ذاکر حق ہیں‘ مگر یہ حق تعالیٰ سے غافل ہے حالانکہ سب سے زیادہ ذاکر اس کو ہونا چاہئے تھا۔ اس کے اوپر انعامات کی بارش ہے۔

ساری کائنات انسان کی غذا ہے

ہر چیز کا لباس اس کی کھال ہے۔ اس کو الگ لباس دیا گیا۔ رنگ برنگ کا لباس‘ رنگ برنگ کے کپڑے ___ ہر نوع کی غذا ایک ہے۔ کوئی نوع گھاس کھاتی ہے‘ کوئی نوع دانہ کھاتی ہے‘ کوئی پتے چابتی ہے‘ کوئی مٹی کھاتی ہے‘ کوئی ہوا چوستی ہے۔ لیکن انسان کو ہر چیز پر قادر کیا گیا۔ ہر چیز اس کی غذا ہے۔ گھاس یہ کھائے‘ پھانس یہ کھائے‘ پتے یہ کھا جائے‘ چونا یہ کھائے‘ مٹی یہ کھائے‘ چاندی یہ کھا جائے‘ سونا یہ نگل لے‘ جواہرات اس کی پیٹ میں جاتے ہیں۔ غرض جمادات‘ نباتات اور حیوانات ساری چیزیں اس کی غذا ہیں۔ تانبے اور

سونے کے ورق نگل جائے گا' چاندی سونا کا کشتہ کھا جائے گا۔ یا قوتیاں اس کی طاقت کے واسطے بنتی ہیں۔ مٹی یہ کھاتا ہے۔ یہ چونا آخر مٹی پتھر نہیں تو اور کیا ہے؟ سمجھ یہ کھائے' پتے یہ کھائے' سبزیاں یہ کھائے۔ دنیا بھر کی چیزیں اس کے پیٹ میں چلی جاتی ہیں۔ تو کائنات کی ہر نوع کی ایک غذا اور پوری کائنات اس کی غذا۔

ساری کائنات انسان کی سواری ہے

ہر چیز اپنے پیروں سے چلتی ہے۔ اس کو سواریوں پر اٹھا کے چلایا گیا۔ حیوانات اس کی سواری میں ہیں' نباتات اور جمادات اس کی سواری ہیں' ریلیں جو چلتی ہیں وہ حیوانات کی قسم میں سے نہیں ہیں وہ جمادات میں سے ہیں' اس کی سواری بنتی ہیں' گھوڑا' اونٹ' بیل یہ سب اس کی سواری بنتی ہیں ___ تو حیوانات کے سروں پر یہ سوار' جمادات کے سروں پر یہ سو . . نباتات اس کی سواری میں ہیں۔

سمندروں میں یہ سواری کر جائے' ہواؤں میں یہ سواری کر جائے' زمین کی پشت پر یہ سواری کر جائے۔

کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کو سواری دی گئی ہو۔ ہر ایک اپنے پیر سے چلنے پر مجبور ہے اس کو مقرّب اور معظّم بنایا گیا۔ ساری کائنات اس کی سواری بن گئی۔

ساری کائنات انسان کا لباس ہے

اور ساری کائنات اس کا لباس کہ درختوں کی کھال سے یہ لباس بنائے' روئی سے یہ لباس بنائے' جانوروں کی کھال کھسوٹ کر یہ لباس بنالے۔ اب سنا ہے کہ شیشے کے کپڑے چلنے والے ہیں۔ لکڑی اور کھال کے کپڑے بننے لگے ہیں ___ غرض ساری کائنات اس کا لباس' ساری کائنات اس کی غذا' ساری کائنات اس کی سواری۔ اللہ کے یہاں اتنا چہیتا اور پیارا انسان کہ ساری کائنات کو اس کی خدمت پر لگا رکھا ہے کہ کھانے کو آئے تو سر تسلیم خم کردے کہ کھالینے دو۔ لباس بنائے تو چپ ہو کر بیٹھ جاؤ۔ اس کو لباس بنانے دو۔ سواریاں بنائے تو سر جھکا دو کہ سوار ہو کر جائے' تو ساری چیزوں سے زیادہ اس کو ذاکر بننا چاہئے تھا مگر سب چیزوں سے زیادہ اگر غافل ہے تو انسان غافل ہے پتھر بھی ذکر میں لگ جاتا ہے۔

انعامات کا تقاضا کیا ہے؟

پتھروں کی شان یہ ہے کہ:

يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهٰرُ (بقرہ پ۱ آیت ۷۴)

اور کچھ نہیں تو پتھر رو پڑتے ہیں۔ ان سے پانی بہہ پڑتا ہے اور کچھ نہیں تو پتھر اوپر سے نیچے آپڑتا ہے یہ اس کی تواضع اور انکساری کی بات ہے۔ لیکن اگر فرعونیت اور کبر بھرا ہوا ہے تو انسان میں بھرا ہوا ہے کہ نہ اس کی آنکھوں سے آنسو تک ٹپکتا ہے نہ یہ تواضع سے نیچے جھکتا اور گرتا ہے۔ حالانکہ پتھر گر بھی پڑتا ہے اور پانی بھی بہا دیتا ہے تو سب سے زیادہ اگر غافل ہے تو انسان غافل ہے حالانکہ اس کو سب سے زیادہ ذاکر ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ اس پر انعامات کی بارش ہے۔

حقیقتِ زندگی

اس واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ ذکر اللہ چونکہ حیات ہے' تو ذکر کرنے والا غافلوں میں ایسا ہے جیسے مردوں میں زندہ بیٹھا ہو۔ اگر ایک بھرا مجمع غافلوں کا ہو' ایک اللہ کی یاد کرنے والا موجود ہے وہ ایسا ہے جیسے مردوں کے مجمع میں ایک زندہ بیٹھا ہوا ہو۔ اس لئے کہ زندگی نام بدن کا نہیں ہے بلکہ قلب کی زندگی زندگی ہے ؎

مجھے یہ ڈر ہے کہ دل زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

زندگی نام دل کی زندگی کا ہے اور دل کی زندگی اللہ کی یاد سے ہوتی ہے۔ روٹی اور ٹکڑے سے نہیں ہوتی۔ یہ بدن کی زندگی ہے جو روٹی سے ہوتی ہے۔ یہ اتنی عارضی ہے کہ روٹی ملنے میں دیر ہو جب بدن مرجھانے لگتا ہے اور منقطع ہو جائے تو بدن چھن جاتا ہے۔ لیکن قلب کی زندگی دوامی ہے۔ اس لئے ذکر اللہ جو زندگی پیدا کرتا ہے وہ دوامی زندگی ہوتی ہے وہ نفس کے اندر قائم ہو جاتی ہے۔

ذاکر انسان کا مقام

تو فرمایا گیا ذکر کرنے والے کی مثال غافلوں کے اندر ایسی ہے جیسے مُردوں کے اندر کوئی زندہ بیٹھا ہوا ہو۔ تو انسان اگر ذاکر بنے گا تو سارے ذاکروں پر بڑھ جائے گا اور اگر غافل بنے گا تو سب سے زیادہ بدتر ہو جائے گا ___ حق تو یہ تھا کہ سب سے زیادہ ذکر کرتا ___ اور یہ غافل بن گیا پتھر بھی اس سے اچھا' جانور بھی اس سے اچھے' درخت کی ٹہنیاں بھی اس سے اچھیں کیونکہ سب ذکر میں مشغول ہیں۔ یہ سب سے زیادہ ذلیل اور بدتر ہے اور اگر ذکر پر آجائے تو ہر ذاکر اس سے نیچے ہے اس لئے کہ اس کا ذکر جامع ہوگا جو اور انواع کو میسّر نہیں ہے۔

تو ذکر فی الحقیقت روح کی غذا ہے اور ذکر ہی فی الحقیقت انسان کی زندگی ہے غذائے روحانی ذکر اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔

زندگی کی حقیقی غذا

انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کی غذائیں قلیل ہوتی ہیں اور قوتیں سب سے زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ قوت .... ان میں یادِ خداوندی سے پیدا ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپ نے امت کو ممانعت فرمائی کہ صوم وصال مت رکھو یعنی بلا افطار کئے روزہ پر روزہ مت رکھو۔ سحر بھی کھاؤ' افطار بھی کرو' کھا پی کر اگلا روزہ رکھو۔ بلا کھائے پیئے روزے پر روزے رکھتے چلے جانا اس کو صومِ وصال کہتے ہیں۔ اس سے آپ نے ممانعت فرمائی ___ اور حدیث میں ہے کہ آپؐ صومِ وصال رکھتے تھے پندرہ پندرہ دن آپؐ کا مسلسل روزہ ہے۔

صحابہؓ نے عرض کیا' یا رسول اللہ! ہمیں تو آپ نے ممانعت فرمائی اور خود حضورؐ صوم وصال رکھتے ہیں ___ فرمایا :

ایکم مثلی یطعمنی ربی ویسقینی

تم میں مجھ جیسا کون ہے؟ مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا اور پلاتا ہے' یہ کھانا اور پلانا کیا تھا ___ ؟ یہ پلاؤ' زردے کے دسترخوان آسمان سے نہیں اترتے تھے۔ یہ ذکر اللہ اور یادِ حق غذا تھی جو روح میں پیوست تھی اس سے روح زندہ تھی اور روح سے بدن زندہ تھا تو اللہ کا ذکر جب رگ وپے میں سما جاتا ہے تو غذا اور

حاجت کم ہو جاتی ہے تو زندگی کا دارومدار ذکر پر ہو جاتا ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا جو دارالعلوم دیوبند کے بانی ہیں کہ اخیر عمر میں انتقال سے چند ماہ پیشتر یہ فرمایا کہ:

"اب بحمد اللہ بقائے حیات کے لئے مجھے کھانے پینے کی حاجت نہیں رہی ہے۔ محض اتباع سنت کے لئے کھاتا اور پیتا ہوں۔ زندگی باقی رکھنے کے لئے کھانے پینے کی حاجت نہیں رہی"۔

غرض جب ذکر اللہ رگ وپے میں رچ بس جاتا ہے تو پھر زندگی کا دارومدار روٹی پر نہیں ہوتا۔ ذکر پر رہ جاتا ہے۔ ذکر اللہ سے آدمی زندہ ہوتا ہے۔ قوتِ روحانی سے اس کی حیات اور بقاء ہوتی ہے تو اصل زندگی فی الحقیقت یادِ حق کا نام ہے۔

محبوب کے فراق ووصال کے آثار

بلکہ یوں کہنا چاہیے زندگی نام ہے نام محبوب اور وصال محبوب کا۔ محبوب کا نام آتا ہے تو محب اور عاشق میں زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک شخص کسی کی محبت میں گرفتار ہے اور رات دن اس کے دھیان میں غرق ہے اور محبوب اس سے جدا ہو جائے۔ یہ فراق میں پڑا ہوا گھل رہا ہے، گھلتے گھلتے چارپائی کو لگ گیا ملنے جلنے کی سکت نہیں رہی کھانا بھی چھوٹ گیا' پینا بھی چھوٹ گیا۔ چارپائی پر پڑا ہوا ہے فکرِ محبوب میں ہروقت گرفتار ہے ایسے وقت کوئی آکر کہہ دے کہ وہ آگیا تیرا محبوب ___ ایک دم اٹھ بیٹھے گا کہاں ہے؟ کس نے کہا؟

یہ جان اس کے اندر کہاں سے آئی؟ کیا اس نے کوئی روٹی کھائی یا کوئی یاقوتی کھائی؟ محبوب کا نام ہی تو آیا مردہ اٹھ کر زندہ ہو گیا۔ معلوم ہوا زندگی نام ہے کسی محبوب چیز کے وصال کا۔

اب اگر کسی کو روپے پیسے سے محبت ہو گئی۔ جب تک اس کے سامنے روپے پیسے کا نام آتا رہے گا اس میں زندگی ہے اگر منقطع ہو جائے تو اس کی جان پہ بن جائے' بعض آدمی جب دیوالیہ ہوتے ہیں تو ہارٹ فیل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ محبوب چھن گیا۔ زندگی ختم ہو گئی۔

یا اگر کسی کو کسی عورت سے محبت ہو جائے جب تک وہ پاس موجود ہے وہ زندہ ہے' جب چلی جائے تو فراق میں گھل کر جان دیدے گا۔ غرض وصالِ محبوب کا نام زندگی ہے ___ کسی کا محبوب' دولت' عورت یا عزت ہے۔ جن کا محبوب اللہ ربّ العزت ہے وہ اس کے نام سے زندہ ہیں جب تک ذکر حق ہے' ان میں زندگی ہے۔ جب ذکر ان سے منقطع ہو جائے' ان کی موت ہو جاتی ہے۔ جن کا دل پروردگار حقیقی سے اٹک چکا ہے ان کی زندگی جبھی ہے کہ وہ ہروقت ذکر اللہ کئے جائیں' نامِ حق لئے جائیں۔ جب اس میں کمی آجائے گی' یوں محسوس ہو گا کہ ہم ختم ہو گئے ہیں ؎

بردلِ سالک ہزاراں غم بود
گرزِ باغ دل خلال کم بود

سالک کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں' غم کا پہاڑ اس کے دل پر ٹوٹ پڑتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ باغ دل میں سے ذکر اللہ کا کوئی خلال کم ہو گیا ہے تو ایک ذاکر کے لئے موت کے برابر ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ

اب میں زندہ نہیں ہوں۔

ذاکرین کے اوپر بعض اوقات قبض طاری ہوتا ہے اس قبض کا اثر یہی ہوتا ہے کہ وہ یوں سمجھتے ہیں کہ اب ہمارے اندر ذکر اللہ باقی نہیں ہے اور حق تعالیٰ سے جو تعلق تھا اس میں کمی آگئی۔ تو بعض اوقات قبض زدہ لوگوں نے خود کشی کرلی ہے۔ اگر سنبھالنے والے موجود نہ ہوں مربی نہ سنبھالے تو قبض کی حالت میں خود کشی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے سرفراز فرمادیئے گئے اور پہلی وحی آئی کہ :

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ (علق پ ۳۰ آیت ۱)

اس کے بعد میں وحی منقطع ہو گئی۔ ایک عرصہ وحی کا انقطاع رہا۔ آپؐ کے قلب مبارک پر ایک غم اور گھٹن طاری ہوئی ___ آپؐ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات میرا جی چاہتا تھا کہ خود کشی کرلوں کہ اب زندگی کس کام کی جب وہ شئی باقی نہیں جس سے محبت ہے۔ حتیٰ کہ یہ ارادہ کرکے پہاڑ کے اوپر آئے کہ اپنے کو نیچے گرادوں تو پیچھے سے کسی نے ہاتھ پکڑلیا۔ آپؐ نے چاہا کہ گر پڑوں تو پیچھے سے کسی نے آواز دی : **یامحمد؟**

آپ نے ادھر ادھر دیکھا کوئی موجود نہیں تھا۔ یہ قبض کی کیفیت جب طاری ہوتی ہے تو موت کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے۔ سالک یہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی ختم ہو گئی ___ غرض زندگی ذکر اللہ' یاد حق اور یاد خداوندی کا نام ہے ہم چونکہ رات دن اس کھانے پینے اور پہننے میں مشغول ہیں۔ اس لئے ہم نے زندگی اسی کو سمجھ لیا ہے' ہم اس کوچے سے نابلد ہیں جو حقیقی زندگی کا سرچشمہ ہے جو اس کے اندر آگئے ان کی سمجھ میں آگیا کہ حقیقی زندگی یہی ہے ___ تو اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

مثل الذاکر فی الغافلین کمثل الحی فی الاموات ۔

ذکر کرنے والا غافلوں میں ایسا ہے جیسا کہ ایک زندہ مُردوں کے اندر بیٹھا ہوا ہو تو غفلت مردنی ہے اور ذکر زندگی ہے۔

ذکر اللہ کا عجیب اور عظیم ثمرہ

پھر اس کا عجیب اور عظیم ثمرہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قانونِ مکافات ہے' جیسے انسان خود کرتا ہے' ویسا ہی ادھر سے معاملہ ہوتا۔ فرمایا گیا :

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ ۔ (محمد پ ۲۶ آیت ۷)

اگر تم اللہ کی مدد کرو گے' اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔ اور فرمایا :

من احب لقاء اللّٰہ احب اللّٰہ لقاءہ ۔

جسے یہ پسند ہے کہ میں جلد اللہ سے جاملوں۔ اللہ کو یہ پسند ہے اور انتظار ہے کہ کب میرا بندہ مجھ سے آکر ملے گا' جو ادھر سے معاملہ وہ اُدھر سے معاملہ۔ اور فرماتے ہیں :

فَاذْكُرُوْنِیْ اَذْكُرْكُمْ (بقرہ پ ۲ آیت ۱۵۲)

مجھے یاد کرو میں تمہاری یاد کروں گا۔ اگر تم ذکر اللہ کرو گے تو میں تمہارے نفس کا ذکر کروں گا۔ حدیث (قدسی) میں فرمایا گیا کہ اگر بندہ تنہائی میں مجھے یاد کرتا ہے' میں اپنے نفس میں اسے یاد کرتا ہوں جو بھرے مجمع میں مجھے یاد کرتا ہے' میں اسے ملائکہ کے مجمع میں یاد کرتا ہوں جس نوع کا یہ ذکر کرے گا اسی نوع کا وہاں ذکر ہوگا۔ تو ذاکر جب ذکر کرتا ہے' انجام کار مذکور بن جاتا ہے۔ ادھر سے اس نے ذکر کیا اُدھر اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا تو

مذکور بن گیا۔ اس لئے اگر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اللہ کے ہاں میرا تذکرہ رہے تو یہ اللہ کا تذکرہ شروع کردے۔
جتنا یہ یاد کرے گا اتنا ہی وہ یاد کریں گے۔

دیکھئے اگر کسی بڑے حاکم' وزیراعظم یا پریذیڈنٹ کے یہاں آپ کا تذکرہ آجائے اور آپ سن پائیں کہ آج
پریذیڈنٹ نے میرا ذکر کیا تھا تو عزت وافتخار سے سر اونچا ہو جاتا ہے۔ اخباروں میں چھاپتے ہیں کہ آج
پریذیڈنٹ نے ہمارا تذکرہ کیا ہے ــــ اس لئے کہ ایک بڑی ذات جو عزت والی کہلاتی ہے مجھے یاد کرلے تو یہ
بڑے فخر کی بات ہوگی۔

حق تعالیٰ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس کے یہاں کسی کا تذکرہ ہو تو یہ تھوڑے فخر کی بات ہے ــــ؟ یہ
تھوڑی عزت کی چیز ہے کہ اللہ کسی کو یاد کرے؟ اور حق تعالیٰ کب یاد کریں گے جب تم یاد کرو گے؟

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (بقرہ پ۲ آیت ۱۵۲)

غرض اگر کوئی یوں چاہتا ہے کہ میری یاد وہاں قائم ہو جائے' وہ اس کی یاد کو اپنے اندر قائم کرلے۔ اگر یہ
ہر وقت ذکر کرے گا۔ وہاں بھی ہر وقت ذکر ہوگا یہ غافل بن جائے گا تو وہاں بھی غفلت برتی جائے گی۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ (حشر پ۲۸ آیت ۱۹)

تم ایسے مت بنو کہ اللہ کو بھلا دو ــــ تو تم اپنے نفس کو بھلا دو گے تو اللہ بھی تمہیں بھلا دے گا ــــ
قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ جو لوگ قرآن کریم یاد کرکے اسے بھول جائیں تو حق تعالیٰ قیامت کے دن اس
بندے کو نابینا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا :

رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا۔ (طٰہٰ پ۱۶ آیت ۱۲۵)

اے رب! مجھے اندھا کیوں اٹھایا' میں تو دنیا میں بینا تھا؟ میں تو دیکھنے والا تھا؟

قَالَ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسَىٰ۔ (ایضاً آیت ۱۲۶)

ہم نے اپنی آیتیں تیرے سینے میں ڈالی تھیں تو نے انہیں بھلا دیا' ہم نے تجھے بھلا دیا تو اگر یہ نسیان کا برتاؤ
کرے گا' ادھر سے بھی نسیان کا برتاؤ ہو جائے گا۔ یہ ذکر کا برتاؤ کرے گا' ادھر سے بھی ذکر کا برتاؤ ہو جائے گا۔

حق تعالیٰ شانہ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا کہ :

اے بندے! تو اپنی تندرستی کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تاکہ تیری بیماری کے زمانے میں تجھے یاد رکھوں۔
اپنی تونگری کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تاکہ تیری مفلسی کے زمانے میں میں تجھے یاد رکھوں۔ تو صحت کے زمانے
میں مجھے یاد رکھ تاکہ بیماری کے وقت میں تجھے یاد رکھوں جب کوئی تیرا یاد کرنے والا نہیں ہوگا۔ تو اپنی دنیا میں
مجھے یاد رکھ تاکہ قبر میں میں تجھے یاد رکھوں۔ جو یہاں یاد کرے گا' یہ یاد وہاں کام دے گی۔ جو یہاں بھول جائے
گا' وہ وہاں بھی کسمپرسی کے عالم میں ہوگا۔

یادِ حق کا احساس

اس لئے ذکر اللہ نہ صرف کائنات کی روح ہے بلکہ انسان کی بھی روح ہے بلکہ انسان کی روح کی روح
ہے۔ اگر ذکر منقطع ہو جائے تو روح پر مردنی چھا جاتی ہے اگر احساس ہو۔ فرق یہ ہے کہ سیاہ کپڑے پر ہزاروں
دھبے ڈال دو احساس نہیں ہوگا کہ اس پر بھی کوئی دھبہ ہے۔ اس لئے کہ وہ تو ہے ہی سیاہ اور سفید کپڑے پر ذرا
سا دھبہ لگا دو' وہ نمایاں ہوگا اور محسوس ہوگا تو جن کے قلوب میں غفلت رچ چکی ہے۔ ان میں اگر دس
غفلتیں بڑھ جائیں احساس نہیں ہوگا۔ کیونکہ دل غفلتوں میں رنگا ہوا ہے لیکن یاد کرنے والا منٹ بھر غافل

اسے احساس ہو گا کہ پتہ نہیں کیا چیز میرے اندر سے چھن گئی۔

اس لئے ذکر اللہ کا احساس پیدا کرنا چاہئے زندگی یہی ہے ___ زندگی فی الحقیقت شیرازہ بندی کا نام ہے' اور موت شیرازہ بکھر جانے کا نام ہے اس بدن میں آج پانی مٹی ہوا آگ جمع شدہ موجود ہے کہا جائے گا کہ زندہ ہے۔ قبر میں جا کے ریزہ ریزہ ہو کر اجزاء بکھر جائیں گے کہا جائے گا کہ مردہ ہے تو ذکر اللہ روح کو بدن سے ملائے رکھتا ہے اور بدن کے اجزاء کو جمع رکھتا ہے۔ تو ذکر اللہ انسان کی روح اور زندگی ہے یہ نہ ہو تو آدمی کی زندگی ختم ہے۔

یادِ حق کا اصل طریق

اس واسطے میں نے یہ حدیث پڑھی تھی اور مقصد یہ نہیں تھا کہ کوئی لمبی تقریر کی جائے مقصد صرف اس حدیث کی تشریح اور ترجمہ تھا کہ ذکر اللہ کی عادت ڈالی جائے اور اس کے تین طریقے ہیں ___

سب سے پہلا طریقہ جو اصل اور بنیادی ہے وہ فرائض کی ادائیگی ہے۔ سب سے بڑا ذکر اللہ کے فرائض میں نماز ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا گیا :

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِكْرِیْ۔ (طٰہٰ پ۱۶ آیت ۱۴)

نماز قائم کرو میری یاد کے لئے ___ معلوم ہوا نماز ذکر اللہ اور یاد حق ہے۔ حج کے بارے میں جگہ جگہ فرمایا گیا :

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ۔ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ۔ (بقرہ پ۲ آیت ۱۹۸، ۱۹۹)

حج کے ایک ایک رکن پر کہیں ذکر اللہ' کہیں استغفار' کہیں توبہ' کہیں یاد حق ان سب کا مقصد ذکر ہے نماز کا مقصد بھی ذکر ہے۔ زکوٰۃ اور صدقات کا مقصد بھی فی الحقیقت ذکر ہے فرمایا :

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (حج پ۱۷ آیت ۳۷)

جو تم قربانیاں کرتے ہو اس کا گوشت پوست اللہ تک نہیں پہنچتا بلکہ وہ تقویٰ' ذکر اللہ' یادِ حق پہنچتی ہے جو قربانی کے وقت تم نام لیتے ہو اور قلب میں نیت کرتے ہو۔ وہ چیز اللہ تک جاتی ہے۔ یہ اس کی علامت ہے ___ بہرحال قربانی ہو' زکوٰۃ ہو' حج ہو' نماز ہو' ان سب کی روح ذکر اللہ بتلائی گئی ہے تو ذکر کرنے کا بنیادی طریق فرائض شرعیہ کی ادائیگی ہے۔ یہ اصل ذکر ہے۔

ذکرِ مؤقّت

لیکن اصل ذکر کے ساتھ ساتھ امر کیا گیا کہ :

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا۔ (احزاب پ۲۲ آیت ۴۱)

اے لوگو! اللہ کی یاد کرو ذکرِ کثیر کے ساتھ ___ تو ایک ذکرِ اصل ہے وہ فرائض ہیں اور ایک ذکر زائد اور ذکر کثیر ہے وہ اس سے اوپر ہے ___ اس کے دو طریقے ہیں ایک موقت' ایک غیر موقت۔ موقت تو یہ ہے کہ صبح اور شام کا وقت مقرر کر کے کچھ تسبیح اور تہلیل کر لیا کرے۔ صبح کی نماز کے بعد بیٹھ گئے ___ فرض کیجئے

آپ نے سو مرتبہ کلمہ تمجید پڑھ لیا۔

سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر۔

سو مرتبہ استغفار پڑھ لیا' سو مرتبہ درود شریف پڑھ لیا۔ اسی طرح شام کو پڑھ لیا۔

فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ۔ (روم پ ۲۱ آیت ۱۷،۱۸)

فرمایا! اللہ کی تسبیح کرو کچھ صبح کو' کچھ شام کو کچھ دوپہر کو :

وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا۔ (احزاب پ ۲۲ آیت ۴۲)

صبح اور شام اللہ کی تسبیح کرو۔ تو یہ موقت طریق ہے کہ ایک وقت باندھ کر آدمی کچھ تسبیح پڑھے' سو مرتبہ نہ ہو تینتیس مرتبہ پڑھ لے اتنا نہ ہو کچھ کم کرلو۔ مگر ایک عدد اور وقت معین کرکے اس کو نبھادے۔

حدیث میں ہے :

خیر الامور مادیم علیہ۔

بہترین عمل وہ ہے جس پر ہمیشگی اور دوام برتا جائے۔ جو قلب میں جڑ پکڑ لیتا ہے رسوخ پیدا کرلیتا ہے پہاڑ کی ایک چٹان ہے اس پر گرد پڑ گئی ہے۔ آپ نے لاکھوں من پانی بہادیا۔ گرد ڈھل گئی لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر چڑھ جائے گی۔ تو منوں پانی بہادینے سے ظاہری صفائی آجاتی ہے۔ مگر چٹان کے اندر نمی نہیں پہنچتی' لیکن اگر آپ ایک قطرہ برس دن تک گراتے رہیں تو پتھر میں بھی سوراخ پیدا ہوجاتا ہے۔ تو تھوڑا تھوڑا عمل ہو۔ اس سے قلب میں جڑ پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن اگر آپ نے ایک دن پچاس نمازیں پڑھ لیں لیکن پھر ایسے غائب ہوئے کہ برس دن تک غائب رہے تو گرد ڈھل جائے گی' اجر مل جائے گا لیکن قلب میں کوئی ملکہ' کوئی بنیاد' کوئی جڑ قائم نہیں ہوگی۔ تو تھوڑا عمل ہو مگر دوام کے ساتھ ہو وہ کارآمد ہوتا ہے۔ دل میں ملکہ پیدا ہوجاتا ہے۔ جڑ قائم ہوجاتی ہے۔ بہرحال سو مرتبہ نہ ہو بالکل تھوڑا ہی عدد ہو مگر ایک وقتِ مقرر پر نامِ حق لیا جائے' کچھ تلاوت کرلی' کچھ تسبیح' کچھ تہلیل خواہ دس منٹ ہو مگر آدمی اس کا پابند ہوجائے' چالیس دن کے بعد خود محسوس ہوگا کہ میرے قلب کے اندر کیا اثر قائم ہوا۔

حدیث میں ہے کہ آدمی کسی عمل کو چالیس دن خلوص کے ساتھ مسلسل کرے تو قلب میں سے حکمت کا چشمہ بہہ پڑتا ہے۔ یادِ حق کی ایک بنیاد قائم ہوجاتی ہے۔ جس کی جیسی مناسبت ہے ویسی معرفت اس کو شروع ہوجاتی ہے تو ذکرِ کثیر کی ایک صورت یہ ہے کہ مقرر وقت پر آدمی کچھ اللہ کا نام لے۔

ذکرِ غیر موقت

دوسری صورت یہ ہے کہ غیر مقررہ طریق پر آدمی یہ عادت ڈالے کہ اس کی زبان سے کوئی نہ کوئی اللہ کا نام نکلتا رہے۔

لا الہ الا اللّٰہ' سبحان اللّٰہ' اللّٰہ اکبر۔

وغیرہ اٹھتے بیٹھتے ہوئے' چلتے ہوئے' کھڑے۔ وضو سے بے وضو کوئی قید نہیں۔ مہینہ دو مہینہ تو تکلف کرکے عادت ڈالنی پڑے گی۔ جب عادت پڑجائے گی تو بے اختیار اللہ کا نام زبان سے جاری ہوگا۔ کوئی حادثہ پیش آئے گا (خدانخواستہ) مثلاً آپ گر پڑے فوراً الا اللّٰہ' بسم اللّٰہ کوئی نہ کوئی اللہ کا نام زبان سے نکلے گا۔ یہ نہیں نکلے گا کہ لوگو دوڑو' مجھے بچاؤ' اللہ کا نام نکلے گا۔ ابتداءً تکلف کرنا پڑے گا۔ جب عادت پڑجائے گی

صاحبزادے مولانا رکن الدین پڑھنے کے لئے دہلی گئے اور آٹھ دس برس کے بعد بڑے اچھے عالم بن کے آئے۔ مریدین نے عرض کیا، حضرت! صاحبزادے عالم بن کے آئے ہیں۔ اگر وعظ کرا دیا جائے .....

فرمایا، ہاں بھئی! ضرور وعظ کہلاؤ۔ جب علم پڑھا ہے تو علم کا اثر ظاہر ہو، دوسروں کو مسائل معلوم ہوں۔ صاحبزادہ کھڑے ہوئے اور بڑا عمدہ وعظ کہا۔ تمام لوگ خوش ہوئے بہت سے مسائل بیان کئے، لوگوں نے مسائل سیکھے، تعریف کی۔ لیکن کوئی خاص اثر پیدا نہ ہوا کہ لوگ رونے لگے ہوں یا آپے سے باہر ہوئے ہوں۔ یہ کچھ بھی نہیں۔ بس یہ ہوا کہ بہت اچھے صحیح مسئلے بیان کئے دل میں قدر و قیمت تھی۔

جب مولانا رکن الدین وعظ کر چکے، تو حضرت قطب عالمؒ منبر کے قریب کھڑے ہوئے ایک جملہ کہا، فرمایا، "بھائی! رات عجیب بات پیش آئی۔ رکن الدین کی ماں نے فقیر کے لئے کھیر پکائی تھی، وہ کھیر پکا کے کھونٹے پہ رکھ دی، بلی جو آئی وہ کھا کے چلی گئی۔ فقیر محروم رہ گیا"۔

بس یہ کہنا تھا کہ ایک دم جو لوگوں پر گریہ طاری ہوا اور کپڑوں کو پھاڑ ڈالا اور مسجد میں ایک طوفان بپا ہو گیا۔ اب اس میں آخر کیا چیز تھی؟ کھیر پکی رکھی تھی، بلی آئی وہ کھا گئی۔ تو یہ کون سے حقائق و معارف تھے۔ مگر حقیقت میں وہ جو قلب کی تاثیرات تھیں ان تاثیرات نے ان الفاظ کو آلہ بنایا اور الفاظ نے کانوں کو کھٹکھٹایا اور دل کی تاثیر الفاظ کے راستے سے دل پر پڑی اور دلوں میں محبتِ الٰہی بھری اور انہوں نے چیخنا اور چلانا شروع کر دیا۔ تو یہ لفظوں کا اثر نہیں تھا۔ شیخ کے قلب کا اثر تھا۔ اصل میں اہل اللہ دل میں اثر ڈالتے ہیں۔ الفاظ محض اُن کا آلہ ہوتا ہے۔ الفاظ کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ کسی اللہ والے کے پاس سے آپ قلب میں کوئی اثر لے کے جائیں، کوئی آخرت کا، دین کی عظمت و محبت کا، وہ الفاظ کا اثر نہیں ہوتا، وہ قلب کی تاثیر ہوتی ہے۔ اگر اس کے قلب میں کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ بہتر سے بہتر لفظ کہتا۔ آپ اس سے کوئی بھی اثر نہ لیتے۔ لفظ تو اثر نہیں کرتے، وہ معانی کرتے ہیں۔ تو معانی لفظوں کے اندر وہی ذکر اللہ اور یادِ خداوندی ہے۔ وہی تاثیر و تصرف ہے، جس سے قلوب جگمگا اٹھتے ہیں۔ قلوب کے اندر حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو قرآن کریم نے فرمایا:۔ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۔ سب سے زیادہ وزنی چیز، سب سے زیادہ پر عظمت چیز وہ اللہ کی یاد ہے کہ دنیا وما فیہا اللہ کی یاد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

یادِ حق دل میں آجائے تو بندہ عرشی ہو جاتا ہے

جب بندے کے دل میں یہ یاد آجاتی ہے تو لاکھوں سلطنتیں ایک طرف اور یہ چیز ایک طرف۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی چیز کی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔

شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے ہیں اور سلسلۂ نقشبندیہ کے بڑے اکابر میں سے ہیں۔ ان کے ہاں بھی مہمانداری بہت تھی اور مریدین کا ہجوم رہتا تھا۔ دو اڑھائی سو تک آدمی، ان کے مریدین میں سے نواب میر خاں جو ہندوستان میں ریاست ٹونک ہے، اس کے والی تھے۔ وہ حضرت شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کے ہاں مہمانداری بہت ہے اور کوئی دولت، جاگیر، جائیداد ہے نہیں۔ تو انہوں نے ریاست ٹونک کا ایک ضلع ان کے پاس لکھ کر بھیج دیا کہ یہ میں آپ کو دیتا ہوں۔ اس کی ہزاروں روپے ماہانہ آمدنی ہے۔ مہمانوں کا خرچ چلے گا اور وہ پیتل کے پترے پہ لکھ کے بھیجا کہ یہ میں بنام حضرت شاہ غلام علیؒ عطیہ دیتا ہوں۔ یہ شاہ غلام علیؒ کے پاس پہنچا اور حضرت کی خدمت میں پیش کیا گیا کہ آپ کے مرید نواب میر علی خاں ہیں۔ انہوں نے یہ پورا ضلع ہدیہ پیش کیا ہے۔

اس کی پشت پر شاہ غلام علی صاحبؒ نے جواب میں ایک شعر لکھ کے بھیج دیا جیسے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ایک قطعہ لکھ کر بھیجا تھا۔ انہوں نے بھی ایک شعر لکھ کر بھیج دیا اور وہ شعر یہ تھا کہ

ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم
با میرخاں بگوئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقروفاقہ کی آبرو کھونا نہیں چاہتے۔ میرخاں سے کہہ دو کہ روزی مقدر ہے اور وہ آسمان سے آرہی ہے۔ تمہارے ضلع کی ہمیں ضرورت نہیں ہے ___ یہ اتنی استغناء اور اتنی بیداری اس وقت تک نہیں ہوسکتی۔ جب تک دل کے اندر کوئی دولت جمع نہ ہو۔ وہ دولت یہی ذکر اللہ کی تھی۔ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔ تو ضلع، صوبہ، پوری دنیا تو کیا چیز ہے۔ ذکر اللہ کے سامنے چاند اور سورج کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے۔ جب وہ قلب میں آجاتا ہے تو بندہ پھر عرشی بن جاتا ہے عرش کے اوپر کی باتیں کرتا ہے۔ نیچے کی نہیں کرتا۔ تو یہ ہے وہ ذکر اللہ جو ساری شریعت اور کائنات کی روح ہے۔ اگر اس دنیا میں سے ذکرِ خداوندی نکل جائے، اسی دن قیامت آجائے گی اور یہ خیمہ ختم کردیا جائے گا اور اگر کسی کے قلب میں سے نکل جائے، اسی دن ایمان واسلام ختم ہے۔ کسی قوم میں سے نکل جائے، وہ قوم بھی بے عزت اس کی آبرو اور عزت بھی ختم ___ تو ہر چیز میں دولت، عزت حکومت کچھ بھی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک دین ودیانت، یادِ الٰہی اور یادِ خداوندی شامل نہیں ہوتی۔ اس وقت تک عالم میں کوئی چیز زندہ نہیں ہوتی کیونکہ سب چیزوں کی روح یہ ہے۔

ذکر اللہ کا مظہرِ اتم

اس کا سب سے بڑا مظہرِ اتم جس سے ذکرِ الٰہی ظاہر ہوتا ہے، چونکہ نماز تھی۔ اس لئے قرآن کریم نے اس سے پہلے فرمایا، اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ۔ نماز فحش سے، بے حیائی کی باتوں اور منکرات سے بچاتی ہے۔ جو شریعت میں گناہ ہیں۔ ان سب چیزوں سے نماز بچاتی ہے اور آگے بطورِ دلیل کے فرمایا، وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ نماز کی روح ذکر ہے اور ذکر سب چیزوں سے بڑا ہے۔ ذکر کی روشنی جب آئے گی تو کوئی ظلمت اور تاریکی اس کے آگے ٹھہر نہیں سکتی۔ گناہ ہو، کچھ ہو، سب ختم ہوجائے گا۔

اس سے ایک شبہ کا جواب نکل آتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ کو شاید یہ سوال پیدا ہو کہ ہم تو خوب پابندی سے نماز پڑھتے ہیں، مسجدیں بھی بنواتے ہیں، لاکھوں روپے بھی اس میں لگواتے ہیں اور بچے بچے کو لاتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود منکرات میں مبتلا ہیں۔ بعض بے غیرتی اور بے حیائی کی باتیں بھی سرزد ہوجاتی ہیں۔ نمازی بھی ہیں۔ مگر یہ حرکتیں بھی ہوجاتی ہیں۔ تو اللہ کا وعدہ ہے کہ نماز فحش اور منکرات سے بچادیتی ہے۔ حالانکہ ہم نمازی بھی ہیں۔ پھر بھی منکرات میں مبتلا ہیں۔

اس شبہ کا سرسری جواب تو یہ ہے کہ آپ اس سے مقابلہ کیجئے، جو بالکل نماز نہیں پڑھتا۔ اس میں کتنے منکرات ہیں اور نمازی میں کتنے ہیں۔ زمین وآسمان کا فرق دکھائی دے گا۔ نماز پڑھنے والا اگر مبتلا بھی ہوگا۔ تو اتنی برائی نہیں ہوگی۔ جتنی بے نمازی کے اندر ہوتی ہے۔ نمازی کے دل میں پھر بھی خوفِ خدا تھوڑا بہت موجود ہوگا۔ تو ایک جواب تو یہ ہے، جو سرسری ہے کہ اللہ کا ذکر اور نماز بلاشبہ منکرات سے بچاتی ہے۔ آپ نہیں بچ رہے ہیں۔ تو یہ اصل میں زیادہ مبتلا نہیں، کم میں مبتلا ہیں۔ جو بالکل نماز نہیں پڑتے تھے۔ وہ اس سے زیادہ میں مبتلا ہیں۔ تو کسی نہ کسی حد تک تو آپ کو نماز نے بچادیا۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ' ہمارے مرشد بھی ہیں اور دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالب علم بھی وہی ہیں۔ مُلّا محمودؒ سب سے پہلے استاذ اور مولانا محمودؒ سب سے پہلے شاگرد ہیں۔ یہ دارالعلوم کا ابتدائیہ ہے کہ دو محمودوں سے ابتدا ہوئی ع

الٰہی عاقبت محمود گرداں

جب ابتدا محمود ہے تو انشاء اللہ عاقبت بھی محمود ہے ___ حضرت شیخ الہندؒ کے خدام میں حضرت مولانا عزیز گل صاحب مدظلہٗ ہیں۔ یہ سادات میں سے تھے۔ مگر ہیں سرحدی۔ تو وہاں کے سادات کو بھی خان ہی کہتے ہیں۔ سب پٹھان کے لقب سے معروف ہیں۔ پٹھان اور خان گویا ان کے ہاں ایک عظمت کا لفظ ہوتا ہے۔

میرا جب افغانستان جانا ہوا تو وہاں کے اخبارات نے شائع کیا کہ مولانا محمد طیب خاں۔ حالانکہ میں پٹھان نہیں ___ مگر وہ خان عزت و عظمت کا لفظ ہے۔ تو مولانا عزیز گل صاحب گویا انہیں عرف کے لحاظ سے سرحدی پٹھان کہنا چاہئے۔ یوں تو سادات میں سے ہیں۔

وہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج میں بڑے دخیل اور بعض دفعہ اتنے جوش سے بات چیت کرتے تھے۔ جیسے کوئی اپنے سے چھوٹے سے کر رہا ہے یعنی اتنے دخیل تھے کہ بعض دفعہ بے ادبی کی بات ہو جاتی تھی۔ مگر حضرت کچھ خیال نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ صحیح بخاری کے درس میں انہوں نے سوال کیا اور کہا حضرت! یہ مسئلہ کیسے ہے؟ حضرت نے سرسری جواب دے دیا۔ بس کہنے لگے کہ خود کو نہیں آتا اور سرسری جواب دے کے آگے چل دیئے۔ پڑھانے کے لئے بیٹھ گئے اور جواب دینا آتا نہیں۔ تو اس طرح سے بہت زیادہ بے تکلف تھے۔ یہ ان کی عام بات تھی کہ جب ہم لوگوں سے گفتگو شروع کرتے تو "آپ" سے شروع کرتے۔ آپ نے یہ کہا' آپ نے یہ کہا۔ اس کے بعد جب جوش آتا تو "تم" کہتے۔ تم نے یہ کہا' تم نے یہ کہا۔ اس کے بعد "تو" نے یوں کہا۔ تو نے یوں کہا اور اس کے بعد یہ کہ ارے خبیث تو نے یہ کیوں کہا۔ تو "آپ" سے شروع ہو کر "خبیث" پہ انتہا ہوتی تھی۔ ان کا ایک عام طرز تھا ___ تو بے تکلف بہت اور حضرت کی شان میں بعض جگہ بے ادبی کے کلمات کہہ دیتے تھے۔ ایک شخص نے حضرت شیخ الہندؒ سے یہ عرض کیا کہ حضرت اتنے دنوں وہ آپ کی صحبت میں رہے اور انہیں تہذیب نہ آئی۔ اتنے بے ہودہ اور بھدے کلمات کہہ دیتے ہیں۔ بیس پچیس برس آپ کی صحبت اٹھائی اور پھر بھی آدمی نہ بنے۔

حضرت نے فرمایا' یوں خیال کرو' اگر یہ بیس پچیس برس صحبت میں نہ رہتے تو کیا ہوتے؟ جب رہ کر اتنے ہوئے' اگر بالکل نہ رہتے تو کیا ہوتے؟

تو وہی میں کہہ رہا ہوں کہ نماز پڑھ کر اتنی برائیوں میں مبتلا ہیں۔ بالکل نہ پڑھتے تو کیا ہوتے؟ اور کتنی برائیاں کرتے؟ تو سیدھا جواب تو یہ ہے کہ نمازی اگر مبتلا بھی ہو گا تو کم مبتلا ہو گا۔ بے نمازی زیادہ مبتلا ہو گا۔

لیکن اصل جواب یہ ہے کہ نماز پڑھنے کے باوجود اگر آدمی فحش سے نہیں بچتا' بے حیائی اور برائی سے نہیں بچتا۔ اس نے نماز کا ڈھانچہ قائم کیا۔ وہ جو ذکر اللہ کی روح ہے' وہ قلب کے اندر نہیں ہے' روح ہوتی' یقیناً بچ جاتا۔ تو نماز بے حیائی سے بچاتی ہے۔ جب کہ نماز جاندار ہو اور اگر بے جان پڑھے جس کے اندر روح ہی نہ ہو۔ تو لاشہ اور ڈھانچہ کوئی چیز نہیں۔ وہ تو کام نہیں کر سکتا۔ تو نماز بھی کام نہیں آسکے گی۔ نماز اُٹھنے۔ بیٹھنے کا نام نہیں ہے۔ نماز عظمتِ خداوندی اور یادِ حق کا نام ہے کہ دل اللہ کی یاد میں غرق ہے دوسری چیزیں دل سے فنا محض ہو جائیں۔ تو جتنی یاد زیادہ ہو گی' اتنا ہی بے حیائی سے بچے گا۔ جتنی کم ہو گی' اتنا ہی کم

بچے گا۔ بالکل نہیں ہوگی۔ تو چاہے پانچوں وقت نماز پڑھے، جب بھی نہیں بچے گا۔ اس لئے کہ جان تو ہے نہیں تو اصل جواب یہ ہے کہ نماز بلاشبہ فحش سے بچاتی ہے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اس کا کلام حق ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ یقیناً نماز بے حیائی سے اور منکرات سے بچاتی ہے۔ بچاتی کیوں؟ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ۔ اس لئے کہ اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ۔ نماز ذکر اللہ ہی کے لئے پڑھی جاتی ہے۔ ذکر روح ہے۔ اگر روح نہیں ہوگی تو نہیں بچائے گی۔

روح نہ ہونے کے شبہ سے محض صورتِ عمل کو ترک نہ کیا جائے

لیکن میں اتنی بات عرض کئے دیتا ہوں کہ کبھی یہ سمجھئے کہ پورا ذکر تو ہے نہیں، ہماری نماز تو صورت ہی صورت ہے۔ یہ برائی سے بچاتی نہیں، تو آج سے اسے بھی چھوڑ دو۔ اس کے پڑھنے سے فائدہ کیا ہوا؟ نہیں اس صورت کو قائم رکھو۔ اس لئے کہ جو صورت بنا رہا ہے تو وقت آئے گا کہ اس صورت میں روح آجائے گی۔ اگر صورت ہی نہیں بنے گی تو پھر روح کس میں آکر پڑے گی۔ اس واسطے اس صورت کو بھی تو رکھو۔ اگر روح نہ ہو، شکل اس کی بنائے رکھو۔ اچھی شکل میں اچھی حقیقت آجاتی ہے۔ آج نہیں آئے گی کل آئے گی۔ پڑھتے پڑھتے کسی دن تو خیال ہوگا کہ بھئی! یہ جو محض رسمی اور تصویری نماز پڑھ رہا ہوں، یہ بیکار نہ جائے۔ اس میں جان پیدا کرو۔ تو پڑھتے پڑھتے چند دن کے بعد دھیان آسکتا ہے۔ اور وہ روح بن جائے گی۔ اس واسطے چھوڑنا اسے بھی نہیں چاہئے۔ جیسے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ؎

بہرِ دین و بہرِ دنیا و بہرِ نام
اللہ اللہ کردہ باید والسلام

تم اللہ اللہ کرو، دنیا کے لئے کرو، دکھلاوے کے لئے کرو، نام و نمود کے لئے کرو، کرتے رہو۔ اس لئے کرتے رہو گے تو اسی میں اخلاص بھی آجائے گا اور بالکل ہی گھر نہ بناؤ تو مسافر آکے ٹھہرے گا کہاں؟ تو گھر بنالے، ممکن ہے ذکر اللہ کا مسافر آجائے اور آکر اس کے اندر مقیم ہوجائے۔ تو چاہے ریاکاری کی نماز ہو، چاہے بے دھیانی کی ہو، قلب میں کچھ نہ ہو۔ مگر فرض ادا کرتے رہو۔ صورت ہی ان شاء اللہ چند دن کے بعد اپنی طرف کھینچ لے گی۔ تو یہ وسوسہ نہیں آنا چاہئے کہ جب اس میں روح نہیں تو پڑھنے سے فائدہ کیا؟ فائدہ ہے۔ کم سے کم مفتی فتویٰ دے رہا ہے کہ نماز ہوگئی۔ اسے دل کی خبر نہیں۔ اور جب اللہ کی ہزاروں مخلوق نمازی کہے گی تو عند اللہ بھی معتبر ہوگی۔ تو جب سرکاری گواہوں نے گواہی دے دی کہ فلاں آدمی نمازی ہے عند اللہ بھی نمازی ہے۔ تو کیا خبر ہے کہ یہ نمازی کی صورت ہی آخرت میں نجات کا ذریعہ بن جائے۔ اس کو چھوڑنا نہیں چاہئے۔

بہرحال مجھے اس ساری آیت سے کلام کرنا نہیں تھا کہ میں نماز کی حقیقت بیان کروں اور پھر یہ بیان کروں کہ نماز کس طرح منکرات اور بے حیائی سے بچاتی ہے بلکہ صرف ذکر اللہ کے بارے میں چند باتیں کہنی تھیں۔ جو آیت کا دوسرا جز ہے، وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ وہ بھی اس لئے کہ وہی سارے عالم اور ساری شریعت کی روح ہے۔ شریعت سے ذکر اللہ نکل جائے، تو شریعت کے اعمال ڈھانچہ بن جائیں گے۔ دنیا کے اندر ذکر اللہ نہ رہے، تو یہ دنیا بے جان لاشہ بن جائے گی اور ختم ہوجائے گی۔ اس واسطے ذکر اللہ کی رعایت کر

ذکرِ کثیر کے حصول کی سہل صورت

اور اس کے لئے سیدھی صورت یہ ہے کہ شریعت نے جو اعمال بتلائے ہیں۔ اگر بچپن سے ہی بچے کو وہ
رادیئے جائیں۔ موقع بموقع کی دعائیں ہیں۔ ان کو ذکر کثیر کہا گیا ہے۔ تو جب وہ دعائیں پڑھائیں گے' تو
ن حکیم میں جو حکم ہے کہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْراً کَثِیْراً اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثیر
۔ تو کثرتِ ذکر کیا ہے؟ بعض علماء نے لکھا ہے کہ کثرتِ ذکر یہ ہے کہ مختلف اوقات میں جو اذکار اور
یں آتی ہیں وہ ان اوقات میں پڑھی جاتی رہیں' تو ذکر کثیر ہو گیا۔ مثلاً جب چارپائی پر سونے کے لئے لیٹیں۔
س کی دعا الگ ہے کہ : بِاسْمِکَ اللّٰھُمَّ اَمُوْتُ وَاَحْیٰی۔
و کے اٹھیں اس کی دعا الگ ہے کہ : الحمد للّٰہ الّذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النّشور۔
ھانا کھانے کے بعد کی دعا ہے کہ : الحمد للّٰہ الذی اطعمنا وسقانا وکفانا واوانا وجعلنا من المسلمین۔
ستنجا کے لئے جائے پاخانے میں بایاں قدم رکھے اور کہے کہ : اللّٰھم انّی اعوذبک من الخبث والخبائث۔
جب واپس آئے تو دایاں پاؤں پہلے رکھے اور کہے : غفرانک' الحمد للّٰہ الّذی اذھب عنّی الاذٰی وعافانی۔
ب لباس پہنے تو پڑھے :

الحمد للّٰہ الّذی کسانی ھذا ورزقنیہ من غیر حول منّی ولاقوّۃ ۔ اللّٰھم انّی اسئلک من خیرہ وخیر ماصنع لہ واعوذبک من شرّہ وشرّما صنع لہ ۔

ثلاً بیوی کے پاس جائے تو یہ دعا پڑھے کہ :

اللّٰھم جنّبنا الشّیطٰن وجنّب الشیطٰن ما رزقتنا۔

اد مقدر ہوگی تو صالح اولاد پیدا ہوگی یا مثلاً بازار جائے تو بازار میں جانے کی دعا یہ ہے :

اللّٰھم انّی اسئلک صفقۃ رابحۃ واعوذبک من صفقۃ خاسرۃ

''اے اللہ! میں نفع کا سودا چاہتا ہوں اور گھاٹے کے سودے سے پناہ مانگتا ہوں''۔

ورج نکلے تو دعا بتلائی گئی ہے :

الحمد للّٰہ الّذی جللنا الیوم عافیۃ وجاء بالشّمس مطلعھا۔

تو ہر موقع کا ایک ایک ذکر ہے۔ یہ اذکار علماء نے چھاپ بھی دیئے ہیں۔ اگر بچے کو ابتدا سے یہ یاد
دیئے جائیں' تو یہ موتی ان کے قلوب میں بھر جائیں گے اور زندگی اسلام بن جائے گی۔ جب عادت
ئے گی کہ پاخانے جاتے ہوئے یہ' کھانے کے وقت یہ' لباس پہننے کے وقت یہ' دوستوں سے مصافحہ کرو تو
سی سے ملے تو یہ' عادت پڑ جائے گی۔ تو اسی سے اسلامی زندگی بنتی ہے یہ ذکر کثیر مفت میں ہاتھ آجاتا ہے۔
ی آسان بات یہ ہے کہ بچوں کو یاد کرا دی جائیں اور بڑے بھی اگر یاد کریں' تو مہینے ڈیڑھ مہینے میں ساری یاد
تی ہیں۔ پچاس ساٹھ سے زیادہ یہ دعائیں نہیں ہوں گی' زیادہ ہوا تو سو ہو جائیں گی۔ تو ایک دن میں اگر
دعا یاد کرلے اور تین چار مہینے لگ جائیں' تو تین چار مہینے میں پورا دین حاصل ہو جائے۔ یہ بڑے نفع کا
ہے' کوئی گھاٹے کی بات نہیں۔ تین مہینے نہیں' چار مہینے سہی اور بچے تو بہت جلدی یاد کرتے ہیں۔ چند
یں یاد ہو جائیں گی۔ اس طرح ذکر کثیر کی دولت حاصل ہو جائے گی۔

یا پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کرلیا جائے کہ صبح کی نماز کے بعد روزانہ ایک آدھ گھنٹہ آدمی اللہ میاں کے لئے دے دے۔ چوبیس گھنٹے دنیا کی ضروریات کے واسطے اگر اس میں کچھ وقت اللہ کے نام پر نکال دے تو کون سی بڑی بات ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ساری زندگی اللہ کی ہوتی' چھوٹا موٹا وقت دنیا کے کاموں کے لئے ہوتا۔ لیکن ہم کہتے ہیں چلو' تم سارا ہی وقت دنیا کے کاموں میں لگادو۔ تھوڑا سا وقت اللہ کے لئے دو۔ تو روزانہ صبح کے وقت بیٹھ کر ایک سو مرتبہ کلمہ تمجید'

سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الٰہ الّا اللّٰہ واللّٰہ اکبر۔

سو مرتبہ استغفار'

استغفر اللّٰہ الّذی لاالٰہ الّا ھوالحیّ القیّوم واتوب الیہ۔

اور سو مرتبہ درود شریف پڑھ لیا جائے اور وہ مختصر یہ ہے :

اللّٰھم صلّ علیٰ سیّدنا محمّد وّعلیٰ اٰل سیّدنا محمّد وبارک وسلّم

یہ کون سی بڑی بات ہے؟ ایک بیس منٹ کی بات ہے۔ لیکن ذکر کثیر کی دولت مفت میں حاصل ہو جاتی ہے۔ تو سوتے وقت بھی پڑھ لے اور صبح کو بھی پڑھ لے۔ دونوں وقت نہ سہی' چلو صبح کی نماز کے بعد پڑھ لو۔ صبح کو نہیں تو سوتے وقت آدھ گھنٹہ دے دو۔ تو آدمی ذکر اللہ کرنے والوں میں شامل ہو جائے گا اور وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ کی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ آدمی اگر دیندار بننا چاہے تو دین بڑا آسان ہے۔ دنیا کمانی بڑی مشکل ہے۔ دنیا اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک آپ چوبیس گھنٹے دماغ دوکان میں نہ لگائے رکھیں' ذکر اللہ اور دین آسکتا ہے اگر بیس منٹ بھی دے دیں۔ زیادہ محنت کی ضرورت نہیں۔ تو دنیا کمانا مشکل اور دین کمانا آسان ہے۔ لوگوں نے آسان کو چھوڑ دیا اور مشکل کو اختیار کرلیا۔ تو وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ کی فضیلت یوں بھی حاصل ہو جائے گی کہ مختلف اوقات کی دعائیں یاد کی جائیں اور یوں بھی حاصل ہو جائے گی کہ صبح' شام یہ تین تسبیح پڑھ لیں اور نماز کی پابندی کی۔ تو انشاء اللہ بہت سی برکات اسی سے پیدا ہو جائیں گی۔

اس واسطے میں نے اس آیت کے سلسلہ میں یہ چند باتیں گذارش کیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو ذکر اللہ کرنے اور یادِ خداوندی میں لگنے کی توفیق عطا فرمائے اور حق تعالیٰ ہمیں اپنی مرضیات پر چلائے اور اپنے دین کی ہمیں محبت عطا فرمائے۔ اپنی اور اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہمارے قلوب میں ڈال دے۔ اس محبت سے عظمت پیدا فرمادے اور عظمت سے متابعت اور اطاعت واتباع کی دولت نصیب فرمادے۔ آمین۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔

وصلّی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ محمّد وّاٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

برحمتک یا ارحم الرّاحمین ۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

فضیلتِ یوم الجمعہ

جمعہ ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ایک جگہ جمع ہوں' اور جمع ہونے کی صورت یہ ہے کہ منہ اللہ کی طرف ہو۔ قبلہ کا استقبال کرو۔ جب ایک رُخ ہو گا' مجتمع ہو جاؤ گے۔ جب آمنے سامنے ہوں گے' تب ٹکر پیدا ہوگی۔ جب سب کا رخ ایک طرف ہو گا' ٹکراؤ کی کوئی وجہ نہیں۔ جیسے یہاں ظاہری طور پر ہے اگر باطنی طور پر خُدا کی طرف منہ کر لیا جائے تو وہاں بھی وہی شکل پیدا ہو جائے گی ___ تو جمعہ کا دن بتلاتا ہیکہ جیسے تم ظاہر میں جمع ہو گئے ہو' باطن میں بھی ہم نے تمہیں جمع کیا ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہ'

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ، یا ایھا الذین اٰمنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ و ذروا البیع ۔ (الجمعۃ پ ۲۸ ع ۲)

صدق اللہ العلی العظیم

تمہید

بزرگانِ محترم!

میں اس وقت اپنی بعض مصروفیات کے وجہ سے آپ حضرات کا زیادہ وقت نہیں لے سکوں گا۔ اس کے علاوہ کہ کچھ تعب و تکان بھی ہے۔ رات تقریباً دو اڑھائی گھنٹے بیان ہوا۔ اس وقت بھی ایک گھنٹہ کے قریب ایک نکاح کی مجلس میں بیان ہوا۔ اب کچھ بیان کرنے کی ہمّت نہیں۔ لیکن چونکہ اعلان ہو چکا ہے' اس کا بھی احترام ضروری ہے۔ اسے واسطے تھوڑا سا وقت آپ حضرت کا لوں گا۔

سب سے پہلے سوال موضوع کا ہے کہ کس موضوع پر بیان کیا جائے' اور میرے لئے یہ مستقل کام ہوتا ہے کہ کون سا موضوع منتخب کیا جائے۔ اس وقت سب سے بہتر موضوع وہی ہے جس کے لئے ہم اور آپ حاضر ہوئے ہیں' اور وہ ہے نمازِ جمعہ' جو بہترین موضوع' بہترین عبادت اور بہترین قربت بھی ہے۔

ایک حدیث

اسی سلسلہ میں مجھے چند باتیں عرض کرنی ہیں' اور وہ باتیں اپنی نہیں ہوں گی۔ بلکہ ایک حدیث شریف جو ذہن میں آ گئی' اسی کو بیان کرنا ہے اور اس کا ترجمہ کرنا ہے ___ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے' اس شان سے کہ ایک آئینہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس آئینہ کے وسط میں ایک سیاہ نقطہ تھا' جو بالکل ممتاز تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا:

''اے جبرئیل! یہ سیاہ نقطہ کیسا ہے؟ اور یہ آئینہ کیسا ہے؟''

میدانِ مزید

فرمایا کہ یہ سیاہ نقطہ مزید ہے۔ جس کے معنیٰ زیادتی کے آتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مزید کیا ہے؟ ___ عرض کیا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ جنت میں ایک میدان ہے اور جنت کے بالائی حصہ میں ہے ___ یعنی اوپر نیچے سو جنتیں ہیں۔ اور ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے۔ سب سے اوپر کا حصہ جو عرش کے نیچے ہے۔ اس میں ایک میدان ہے جو بالکل سفید ہے اس کی گھاس بھی سفید' درخت سفید' غرض ہر چیز سفید اور شفاف ہے ___ اور عرض کیا کہ یہ اتنا بڑا میدان ہے کہ ہزارہا برس مجھے گھومتے ہوئے ہو گئے ہیں۔ اب تک پوری طرح اس کی کُنہ (اور حقیقت) کو نہیں پا سکا۔

حدیث میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کو اصل شکل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ دیکھا ہے۔ اس شان سے کہ زمین سے لے کر آسمان تک اور مشرق سے لے کر مغرب تک ساری فضا ان کے بدن میں گھری ہوئی تھی۔ چھ چھ بازو تھے۔ سورج سے زیادہ روشن' تاج ان کے سر پر تھا ___ اندازہ کیجئے کہ وہ میدان کتنا بڑا ہو گا جس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام ہزارہا برس سے گھوم رہے ہیں لیکن ابھی تک پورا نہیں کر سکے

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میدان کی غرض وغایت کیا ہو گی؟

عرض کیا کہ دربارِ خداوندی منعقد ہونے کا موقع ہو گا۔ انبیاء علیہم السلام کے منبر اس میدان میں بچھائے جائیں گے۔ گول دائرے کی شکل میں نُور کے منبر ہوں گے۔ ہر نبی علیہ السلام کے منبر کے پیچھے اُمّت کی کُرسیاں ہوں گی۔ اور وہ پورا میدان ان بیٹھنے والوں کی کرسیوں سے بھر جائے گا۔ دنیا میں جتنا جس کو تعلق نبی اور دین سے تھا' اتنا ہی وہ منبرِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہو گا ___ اور وہ کرسیاں اس شان سے ہوں گی کہ ایک کے دیکھنے میں دوسرا حائل نہیں ہو گا' جیسے آپ نے دیکھا ہو گا' بڑی بڑی مجالس میں کرسیاں اس ترتیب سے بچھاتے ہیں۔ اگلی صف ذرا نیچی' پچھلی اونچی تاکہ ہر شخص بے تکلف سامنے کی اسٹیج کو دیکھ سکے۔ اس انداز سے کرسیاں بچھائی جائیں گی۔ میدان کے کناروں پر کرسیاں نہیں ہوں گی۔ بلکہ کچھ غالیچے' کچھ فانوس ہوں گے۔ اس طرح سے میدان بھر جائے گا۔ اب گویا دربار بن گیا کہ چہار طرف انبیاء علیہم السلام کے منبر ہیں' ان کی پشت پر کرسیاں ہیں۔ بیچ میں حق تعالیٰ شانہ' کی کرسی آئے گی جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

حدیث شریف میں اس کرسی کی عظمت و بڑائی بیان فرمائی گئی کہ ساتوں آسمان اور زمین اس کے سامنے ایسے ہیں جیسے ایک میدان میں ایک چھلہ پڑا ہوا ہوتا ہے۔ اتنی عظیم کرسی ہے۔ آخر جس بادشاہ کی یہ کرسی

ہے اس کی بڑائی اور عظمت کے مناسب اس کی شان ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ اس کرسی و تخت پر بیٹھتے نہیں۔ وہ جسم سے بری اور صورت سے منزّہ ہیں۔ لیکن ان کی صفت "ملک" بادشاہ ہے۔ چنانچہ بادشاہت کے جتنے لوازم ہیں' وہ سب جمع کئے گئے۔ تختِ سلطنت بھی ہے جس کا نام عرشِ عظیم ہے۔ عرش مثل قبہ کے ہے جو ساری کائنات پر چھایا ہوا ہے اور ڈھانپے ہوئے ہے۔ عرش کے اوپر رحمت کی تجلّی مستوی ہے۔ فرمایا گیا:

الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى

تو عرش کے اوپر رحمت چھائی ہوئی ہے اور عرش کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کائنات کے اوپر رحمت چھائی ہوئی ہے۔ یعنی اللہ نے اپنے بندوں کے ساتھ جو تعلق قائم کیا ہے' وہ رحمت کے ساتھ ہے' غضب کے ساتھ نہیں۔ غضب اگر سامنے آجائے تو مخلوق کا پتہ بھی نہ چلے۔ رحمت ہی نے سنبھال رکھا ہے۔

تو رحمت کی تجلّی عرش پر مستوی ہے۔ اس رحمت سے احکام پھوٹتے ہیں۔ ہدایت و رہنمائی' کتب سماوی' قوانینِ خداوندی اور قضا و قدر سب وہیں سے چلتی ہیں۔ جیسے مُلک کی تمام تجاویز و احکامات تخت سلطنت سے جاری ہوتے ہیں۔ اسی طرح عرشِ عظیم سے تخت سلطنت قائم کیا گیا۔ عرش کے نیچے عظیم سمندر ہے جس پر عرش قائم ہے۔ اس سمندر کے نیچے سو جنتیں ہیں۔ ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے۔ سو جنتوں کے نیچے پھر آسمان تہہ بتہہ ہیں۔ اور اس کے نیچے پھر ہفت زمین تہہ بتہہ ہیں۔ یہ کائنات کا ایک (عجیب) سلسلہ ہے کہ نیچے زمین' اوپر فضا' اس کے اوپر آسمان' اس کے اوپر جنتیں' اس کے اوپر سمندر' اور اس کے اوپر عرش عظیم۔ عرش پر پہنچ کر مخلوق کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے ___ تو عرش اور جنتوں کے درمیان میں یہ میدان ہے۔ جس کی عظمت و بڑائی یہ ہے کہ اس میں دربارِ خداوندی منعقد ہوگا۔ بیچ میں کرسیٔ حق بچھائی جائے گی۔

میدانِ مزید میں اہلِ جنّت کی حاضری

تمام اہلِ جنت اس دربار میں شرکت کے لئے اپنی اپنی سواریوں پر پہنچیں گے' ان کی سواریوں کی یہ شان آئی ہے کہ بعض تختِ ہوا پر سوار ہوں گے۔ اُڑتے ہوئے تخت ہوں گے۔ اور مختلف قسم کی سواریاں ہوں گی جن کے ذریعے اہلِ جنت پہنچیں گے' اور ایسا وقت آئے گا کہ کل دربار منعقد ہوگا۔ تمام اہلِ جنت جمع ہوں گے۔ اور انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے منبروں پر ہوں گے۔ بیچ میں حق تعالیٰ کی کرسی ہوگی جب سارا دربار جم جائے گا تو اب بندے محسوس کریں گے کہ اب تجلیاتِ حق کا ظہور ہو رہا ہے۔ گویا کرسی پر حق تعالیٰ کی تجلّی مُستوی ہے!

حدیث میں ہے کہ وہ کرسی باوجود اس عظمت کے اس طرح چرچرائے گی' جیسے بوجھ سے دب کر کوئی چیز ٹوٹنے کے قریب ہوتی ہے۔ وہ ہیبتِ حق کا بوجھ ہوگا' کوئی جسمانی بوجھ نہیں ہوگا۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ داؤد علیہ السلام کو آواز کا معجزہ دیا گیا تھا۔ اتنی پاکیزہ آواز تھی کہ جب وہ مناجات پڑھتے تو چرند و پرند ان کے ارد گرد جمع ہو جاتے اور محو ہو جاتے ___ انسان تو بجائے خود جانوروں پر بھی ایک غنودگی کی کیفیت طاری ہوتی تھی ___ حضرت داؤد علیہ السلام کو فرمایا جائے گا کہ ان تمام درباریوں کو اپنے مضمون سے مستفیض کریں۔ حضرت داؤد علیہ السلام اس اعجازی خوش آوازی سے مناجات و مضامین پڑھیں گے کہ اہلِ جنت پر کیف طاری ہو جائے گا' جس طرح شرابِ طہور کا وعدہ فرمایا گیا۔

ملائکہ علیہم السلام کو فرمایا جائے گا کہ تقسیم کرو۔ یہ شرابِ طہور دنیا کی شراب جیسی نہیں ہوگی۔ دنیا کی شراب میں تلخی ہوتی ہے' اس میں شیرینی ہوگی۔ دنیا کی شراب سے عقلیں جاتی رہتی ہیں۔ اس سے عقلوں

میں تیزی اور معرفت وبصیرت پیدا ہوگی۔ وہ سکر اس سکر کے مشابہ ہوگا جو حضرات صوفیاء پر کثرتِ ذکر سے معرفت کا ایک نشہ سا طاری ہوتا ہے۔ اور ایک استغراق ہوتا ہے اس میں ان پر احوال وعلوم اور مواجید منکشف ہوتے ہیں۔ گویا دنیا میں جو معرفت کا سکر دیا گیا تھا' جنت میں "شرابِ طہور" اس کی صورتِ مثالی ہوگی ___ اسی طرح سے عقلوں پر کیف طاری ہوگا۔ روحوں میں بھی کیف بڑھے گا۔ معرفتِ خداوندی اور بصیرت بڑھتی جائے گی۔

میدانِ مزید میں اہلِ علم کی احتیاج

اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائیں گے سلونی ماشئتم جو جس کا دل چاہے مانگے' طلب کرے۔ سب کو خطاب عام فرمایا جائے گا ___ تو سب مل کر عرض کریں گے کہ کونسی نعمت ہے جو آپ نے عطا نہیں فرمادی۔ ہمیں ساری نعمتیں مل چکی ہیں۔ بس ہماری درخواست یہ ہے کہ اپنی رضا ہمیں عطا فرمادیجئے۔

حق تعالیٰ فرمائیں گے یہ نعمت مل چکی۔ اگر میں راضی نہ ہوتا تو تمہیں اس مقام پر گھسنے نہ دیتا۔ میں راضی ہوں اور ایسا راضی ہوں کہ اَبدالآباد تک کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ یہ مقام تمہیں مل چکا۔ کچھ اور مانگو ___ سب حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں گے کہ کیا چیز مانگیں؟ کون سی نعمت ہے جو ہمیں نہیں مل گئی ___ اس وقت سب مل کر علماء کے طرف رجوع کریں گے۔ ان سے استفتاء کریں گے کہ کیا چیز رہ گئی ہے جو ہم مانگیں؟ ہمارے علم کے اعتبار سے تو ہر نعمت مل چکی ہے ___ گویا علم اور اہلِ علم کی احتیاج وہاں بھی باقی رہے گی۔ لوگ دنیا میں علماء سے مستغنی ہونا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حاجت مندی وہاں بھی قائم رہے گی۔ وہ کسی کی ذات کی احتیاج نہیں ہوگی۔ وہ علم کی احتیاج ہوگی۔ اور اَبدالآباد تک آدمی علم کا محتاج ہے۔ اس لئے کہ علم اللہ کی صفت ہے۔ جیسے ذات لامحدود ہے' اس کی صفات بھی لامحدود ہیں۔ انسان کتنے ہی بڑے مقامات طے کرلے' پھر بھی لامتناہی مقامات رہتے ہیں جن کی طلب رہے گی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قطعہ ہے جو وہ پڑھا کرتے تھے (جس کا ترجمہ یہ ہے) کہ :

جوں جوں مجھے زمانہ ادب سکھاتا ہے۔ مجھ پر میری عقل کا نقصان وارد ہوتا ہے' جو ادب کا مقام طے کیا تو سمجھ میں آیا کہ اب تک میری عقل نے یہ نہیں پایا تھا۔ اس مقام تک میری عقل ناقص ہے۔ پھر اگلا مقام طے ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی اب تک میری عقل نہیں پاسکی تھی ___ اسی طرح جوں جوں مقام ادب آتے رہے میری عقل کا نقصان مجھ پر واضح ہوتا رہا۔ اور جیسے جیسے مراتبِ علم بڑھتے رہے۔ میری جہالت مجھ پر واضح ہوتی رہی۔ جب کسی علم کے مقام پر پہنچا' معلوم ہوا کہ اب تک میں اس سے جاہل تھا ___ مراتبِ علم کھل رہے ہیں تو میرے نفس کی جہالت کے مقامات بھی میرے نفس پر کھل رہے ہیں۔

لامحدود تک انسان جاہل اور محدود تک عالم ہوتا ہے' جو ہمیں معلومات ہیں وہ محدود ہیں۔ اور جو غیر معلوم چیزیں ہیں' وہ لامحدود ہیں۔ اس لئے کہ علم اللہ کی صفت ہے۔ علم' انسان جتنا بھی بڑھتا جائے' چاہے وہ علم کے کروڑوں مقامات ہوں' پھر بھی اَن گنت مقامات باقی رہیں گے' کیونکہ لامحدود کی طرف بڑھ رہا ہے ___ اس لئے میں نے عرض کیا کہ علم کی محتاجگی دنیا میں ہی نہیں' جنت میں بھی باقی رہے گی۔ کیونکہ صفتِ خداوندی وہاں پہنچ کر محدود نہیں بن جائے گی۔ علم اور معرفت کے مقامات وہاں بھی لامحدود رہیں گے ___ تو لوگ علماء کی طرف رجوع کریں گے کہ ساری نعمتیں مل گئیں۔ کونسی چیز باقی ہے جو ہم مانگیں ___؟ علماء مل کر ایک مشورہ دیں گے کہ ایک چیز رہ گئی ہے جو طلب کرو' وہ نہیں ملی۔ اور وہ یہ کہ حق تعالیٰ اپنا جمالِ مبارک

دکھادے۔ دیدارِ خداوندی ابھی تک باقی ہے۔ یہ نعمت ابھی تک نہیں ملی۔ قرآن مجید میں وعدہ فرمایا گیا۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ___ بہت سے چہرے تروتازہ اور شاداب ہوں گے' جو اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے ___ جیسے کفّار کے بارے میں دھمکی دی گئی كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ___ یہ (سیاہ چہرے والے) وہ لوگ ہیں کہ ان کے اور پروردگار کے درمیان حجابات حائل ہوں گے۔ یہ زیارت نہیں کر سکیں گے' ان کے لئے ابدی محرومی ہوگی۔

تو دیدارِ خداوندی کا وعدہ دیا گیا۔ اس وعدے کا ظہور وہاں ہوگا ___ علماء مشورہ دیں گے کہ ایک نعمت رہ گئی ہے' وہ طلب کریں ___ "اور وہ ہے دیدارِ خداوندی" ___ تو سب مِل کر یک زبان ہو کر عرض کریں گے کہ ہمیں یہ نعمت عطا فرما دیجئے' اپنا جمالِ مبارک دکھلا دیجئے۔ اسی کی تمنا میں ہم نے عبادتیں کیں... عمریں گزار دیں۔ مشاہدۂ حق اصل مقصود تھا۔ اب اس مقام پر مشاہدہ نہ ہوا تو اور کون سا مقام ہوگا جہاں مشاہدۂ حق ہوگا۔ درخواست قبول کرلی جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ حجابات اُٹھنے شروع ہو جائیں گے۔ صرف ایک حجابِ کبریائی اور عظمت کا باقی رہے گا۔ باقی سب حجاب اُٹھ جائیں گے اور بندے اپنے خُدا کو دیکھیں گے۔ اس شان سے کہ سمت ہے' نہ جہت ہے' نہ رنگ ہے۔ اور پھر مشاہدہ ہو رہا ہے اور دیکھ رہے ہیں ___ یہ اس مزید کا موضوع ہے جس کا نام "میدانِ مزید" ___ گویا درباری مقام ہے ___ یہ ایک حدیث ہے جس کا میں نے ترجمہ اور تفسیر آپ کے سامنے عرض کی۔

دنیا میں "میدانِ مزید" کی مثال

یہ جنّت میں میدانِ مزید ہے۔ اور ہفتے میں ایک بار اجتماع ہوگا۔ جب دربار ختم ہوگا تو اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو فرمائیں گے "جاؤ اپنے اپنے مقامات پر"۔ اہلِ جنت واپس ہوں گے۔ جنت میں اپنے اپنے گھروں میں پہنچ جائیں گے۔

دنیا میں اس دربار کی مثال جمعہ کو رکھا گیا ہے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ یہ دربارِ خداوندی ہے' جو دنیا میں منعقد ہوتا ہے۔ خطیب اور امام وہ نائبِ حق ہوتا ہے' جیسے کہ تجلیاتِ ربانی کرسی پر ہوتی تھیں۔ یہاں خطیب منبر پر بیٹھتا ہے گویا وہ نمائندۂ حق ہے' اور خطبات کی تجلّی اس میں ظہور کر رہی ہے۔ اس لئے کہ اصل خطیب حق تعالیٰ شانہٗ ہیں۔ ان کے بعد انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اس لئے حدیث میں آپ فرماتے ہیں : **انا قائد هم وانا خطيبهم** ___ قیامت کے دن میں ہی ساری امتوں کا قائد اور میں ہی خطیب ہوں گا۔ میں ہی ان کے سامنے خطبہ دوں گا ___ تو انبیاء علیہم السلام اس تجلّی کے بارے میں جو خطبات کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے' نمائندگانِ حق ہیں۔ اصل خطیب حق تعالیٰ شانہٗ' ہیں۔ اس دنیا میں ان کا نمائندہ امام اور خطیب ہوتا ہے۔

خطبۂ جُمعہ کے آداب عام خطبات سے زیادہ ہیں

یہی وجہ ہے کہ عام مواعظ اور خطبوں کے جو آداب ہیں۔ اس خطبے کے آداب ان سے ممتاز ہیں۔ فرمایا گیا۔ **اذا خرج الامام فلا صلوة ولا كلام**۔ خطبہ کے لئے جب امام اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہو' تو اب نہ سلام و کلام جائز ہے نہ نوافل پڑھنی جائز ہیں۔ صرف یہ کام ہے کہ امام کو خطبہ کی حالت میں دیکھو۔ فرمایا

گیا جو کنکریوں سے کھیلنے لگا' اس نے لغو حرکت کی۔ مکروہ کا ارتکاب کیا۔ عام وعظوں میں اگر کوئی کنکری اٹھالے' کوئی کراہت نہیں ــــ لیکن خطبہ جمعہ میں اگر کنکریوں سے' یا چٹائی کے تیلوں سے کھیلنے لگے' اس پر نکیر کی گئی ہے۔ خطبہ شروع ہونے کے بعد نماز بھی جائز نہیں۔ تلاوتِ قرآن مجید بھی جائز نہیں۔ درود شریف جیسی طاعت بھی جائز نہیں۔ خطبہ شروع ہونے کے بعد سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اس وقت خطیب کو دیکھا جائے۔ اس کے خطبہ پر کان لگائے جائیں' جو زیادہ سے زیادہ اس کو دیکھنے کی عادت ڈالے گا' اسے میدانِ مزید میں زیادہ سے زیادہ حق تعالیٰ کا دیدار میسّر ہوگا' وہاں تجلیاتِ حق سامنے ہوں گی۔

اسی لئے فرمایا گیا کہ جمعہ میں جو اذان سے پہلے اول وقت آگیا۔ صفِ اول میں اسے جگہ ملی۔ وہ ایسا ہے جیسے ایک اونٹ قربانی کا ذبح کردیا۔ اس کے بعد اس سے کم درجہ ہے کہ گائے ذبح کی پھر اس سے کم درجہ ہے کہ بکرا ذبح کیا۔ اس کے بعد جو آیا وہ ایسا ہے کہ اس نے مرغی ذبح کی۔ جب امام خطبہ کے لئے کھڑا ہوگیا' تو ملائکہ علیہم السلام اپنے صحیفے لپیٹ کر خطبہ سننے کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر درجاتِ عالی کا کوئی مقام نہیں رہتا کہ اس میں نام لکھا جائے۔ ایسے میں جو آئے گا' بس اس کا فرض ادا ہوجائے گا ــــ اور جو یہاں صفِ اوّل میں ہوگا وہاں بھی انبیاء علیہم السلام کے پیچھے صفِ اوّل میں جگہ پائے گا' جو یہاں جتنا پیچھے ہوجائے گا' وہاں بھی اتنا ہی پیچھے ہوگا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر لگاتار تین جمعے چھوڑ دیئے' بلا کسی شرعی یا طبعی عذر کے' تو ظنِ غالب یہ ہے کہ پھر اسے عمر بھر جمعہ پڑھنے کے توفیق نہیں ہوگی۔ جب تک سچی توبہ نہ کرے اور رجوع نہ کرے ــــ تو جمعہ کی نماز بھی بے شک فرض ہے مگر عام فرائض سے اس میں کچھ زیادہ خصوصیت ہے۔ اور یہ خطبہ عام خطبوں سے بڑھ کر ایک نئی شان رکھتا ہے' جو امتیازی شان ہے۔

علماء لکھتے ہیں کہ ظہر کے چار فرض ہیں۔ جمعہ کے دو ہوتے ہیں۔ دو فرضوں کے قائم مقام یہ دو خطبے ہوتے ہیں جو امام کھڑے ہوکر دیتا ہے۔ اسی لئے ان خطبوں کے آداب عام خطبات سے زائد ہیں کہ امام کو دیکھو' تلاوت مت کرو' عبادت بھی نہ کرو۔ بڑی عبادت یہ ہے کہ خطبہ سنو' اور امام کو دیکھو۔ گویا یہ دو خطبے بمنزلۂ نماز کے ہیں' تو چار رکعتیں ہوجاتی ہیں' اس شان سے کہ دو رکعتیں جمعہ کی اور دو رکعات ان خطبوں کے قائم مقام۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے اس جمعہ کو دنیا میں میدانِ مزید کا نمونہ اُتارا ہے۔ اسی لئے شریعت کی اصطلاح میں جمعہ کا نام "یوم المزید" ہے۔ اس لئے یوم المزید کہا گیا کہ یہ جنت کا میدان اس دنیا میں ہے ــــ جنت میں جاکر میدانِ مزید وہاں کی شان کے مطابق ہوگا۔ تو ساری دنیا کے جمعے اور جامع مسجدیں مل کر میدانِ مزید کا دنیا میں ایک نقشہ ہیں۔ ان کے مجموعوں کو اُٹھا کر آخرت میں لے جائیں گے' اور یہ خطبے اوپر جنتوں میں پہنچائے جائیں گے۔ تو وہاں کے دربارِ خداوندی کا یہاں ایک نمونہ ہے۔ اسی واسطے جمعہ کو سید الایام کہا گیا ہے کہ تمام دنوں کا سردار ہے۔

حق تعالیٰ کا انتخاب

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَرَبُّکَ یَخْلُقُ مَایَشَآءُ وَیَخْتَارُ۔ تیرا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے' اور اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے جس چیز کو چاہتا ہے اپنے لئے چھانٹ لیتا ہے۔ سات آسمان بنائے' ساتویں کو پسند کیا' منتخب کرلیا' وہ مقبول زمین ہے جنتوں کی بنیاد ہے ساتویں آسمان پر جنتوں کا علاقہ ہے جو مقامِ کریم ہے۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ سِدرۃُ المنتٰہی ساتویں آسمان پر ہے، جو جبرئیل علیہ السلام کا مقام ہے۔ اور قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى۔

سِدرۃُ المنتہیٰ کے پاس ہی جنت الماوٰی ہے۔ سدرۃُ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ہے۔ سدرہ کے پاس مقام جنت ہے تو جنتیوں کا علاقہ ساتویں آسمان سے شروع ہوتا ہے۔ سرکاری مہمان خانہ اسی میں بنادیا گیا ہے ___ سات زمینیں پیدا کیں، تو اوپر کی زمین منتخب کی کہ وہ سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام کا مقام ہے، اور ساتویں زمین کی تہہ میں جہنم ہے، جیسے جنت سات آسمانوں سے بالاتر ہے، جہنم سات زمینوں سے نیچے ہے۔

قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا۔ آسمان توڑ دیئے جائیں گے تو جنتیں نمایاں ہوجائیں گی۔ زمینیں ختم کردی جائیں گی، تو جہنم نیچے سے نمایاں ہوجائے گی ___ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ___ جہنم دھونکا دیا جلے گا، اور جنتیں سامنے کردی جائیں گی، زمینوں اور آسمانوں کے بیچ میں جو پردے حائل ہیں یہ سب توڑ پھوڑ کر برابر کردیئے جائیں گے، تو زمینوں میں اوپر کی زمین کو اپنے لئے پسند کیا، اور آسمانوں میں اوپر کے آسمان کو پسند کیا۔ پیدا کئے سات اور منتخب کرلیا ایک۔ جنتیں سات پیدا کیں اور اپنے لئے جنتُ الفردوس کو پسند کیا، جو انبیاء علیہم السلام کا مقام ہے اور سب سے اوپر جنت ہے۔ پہاڑ اللہ نے ہزاروں بنائے طورِ سیناء کو پسند کرلیا کہ اسے اپنی تجلّی گاہ بنایا۔ دنیا میں اس کے شہر ہزاروں لاکھوں ہیں مگر "بلدُ الامین" کو پسند کرلیا جس میں حرم واقع ہے یعنی مکّۃ المکرّمۃ زمین کے ٹکڑے کروڑوں بنائے۔ سب سے زیادہ پسندیدہ ٹکڑا وہ ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرماہیں۔

ہمارے علماء لکھتے ہیں کہ وہ ٹکڑا عرش سے بھی افضل ہے، اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ عرش کو حق تعالیٰ سے نسبت ہے، مگر حق تعالیٰ اس پر بیٹھے ہوئے نہیں ہیں، وہ تو جسم سے پاک ہیں۔ اور وہ ٹکڑا جو قبر مبارک ہے اس کو بدن مبارک لگا ہوا ہے، اور جس حصہ زمین کو بدنِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم چھوجائے وہ یقیناً عرش سے افضل ہوگا۔ کیونکہ حق تعالیٰ شانہ عرش چھوئے ہوئے نہیں ہیں کیونکہ وہ جسم سے بَری و بالا ہیں۔ صرف ایک نسبت ہے اور یہاں نسبت نہیں بلکہ اتّصال وملاپ ہے تو زمین کے ٹکڑے ہزاروں بنائے یہ زمین منتخب کرلی اور یہ ٹکڑا منتخب کرلیا۔

راتیں سات بنائیں اور لَيْلَةُ الْقَدْرِ کو پسند کرلیا، اور فرمایا کہ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ___ لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ گویا ہزار مہینے جو شخص رات دن عبادت کرے، اس محنت سے جس مقام پر پہنچے گا، اگر لیلۃ القدر کو زندہ کیا، تو اس مقام پر ایک رات میں پہنچ سکے گا ___ تو لیلۃ القدر کو اپنے لئے پسند کرلیا۔ اسی طرح سے سات دن بنائے ان میں اپنے لئے یوم الجمعہ کو پسند کرلیا کہ ہمارے دربار کا دن ہے۔

جنّت کا موسم

جنت میں بھی اسی دن میں دربار ہوگا، حالانکہ جنت میں رات اور دن نہیں۔ وہاں تو یکساں ایک وقت رہے گا۔ وہاں سورج کی گردش نہیں ہے کہ رات اور دن بنیں۔ رات اور دن کا بننا۔ کبھی دھوپ اور کبھی چھاؤں، کبھی رات اور کبھی دن، یہ گردش آفتاب کے آثار ہیں۔

حدیث میں ہے جنت میں عرش کا چاندنا ہوگا۔ عرش کی نورانیت یکساں پھیلی ہوئی ہوگی۔ اس نورانیت کی تمثیل اور تشریح دی گئی ہے کہ گرمی کے زمانہ میں صبح صادق کے بعد سورج نکلنے سے پہلے جب ٹھنڈی روشنی اور دودھ سا چاند ہوتا ہے' جنت میں روشنی کی یہ نوعیت نہ ہوگی کہ آدمی دھوپ میں نہ بیٹھ سکے۔ روشنی بھی ہے' ٹھنڈی بھی ہے' بَرد و سلام بھی ہے مگر تیزی نہیں ہے' وہ خوشگوار ہے' نگاہوں کو بھانے والی اور یکساں رہے گی' وہاں نہ رات ہے نہ دن ہے' نہ سونا ہے' بلکہ جاگنا ہی جاگنا ہے۔ اس لئے کہ سوجانا تھکن اور غفلت کی علامت ہے۔ وہاں تعب و تکان نہیں کہ آدمی پڑ کے سوجائے۔ وہاں تو رات دن کا عیش ہے اور رات دن کی بادشاہت ہے اس لئے نہ رات ہے نہ دن۔ تعب ہوتا تو رات رکھی جاتی کہ آرام سے سوجاتے۔ جب تکان نہیں تو رات کی ضرورت نہیں۔ اس لئے یکساں دن رہے گا۔

سیّد الایام

پھر یہ جو فرمایا گیا کہ ہفتے میں ایک مرتبہ دربارِ خداوندی منعقد ہوگا۔ یعنی جتنی تمہارے یہاں ایک ہفتہ کی مسافت و مدّت ہوتی ہے' اتنی مدت کا حساب لگالو۔ اتنے اتنے وقفے کے بعد دربارِ خداوندی منعقد ہوگا۔ وہ ہفتے میں ایک بار سمجھ لیجئے' اس لمحے کا نام مزید رکھا گیا ہے۔ دنیا میں ساتویں دن کا نام "یوم مزید" رکھ دیا' جو دنیا میں جنّت کا نمونہ ہے۔ اس لئے اس کو سیّد الایام فرمادیا گیا کہ یہ سب سے پاکیزہ' سب سے بڑا اور بہترین دن ہے ___ جتنے بھی عظیم و اعظم اُمور ہیں وہ اسی دن میں ظاہر ہوئے فرمایا گیا ___ فیہ جمع طین ادم "جمعہ" اس کا مادہ (ج-م-ع) ہے۔ جامعیّت کی شان جمعہ میں موجود ہے ___ منتشر چیزوں کو ایک جگہ جمع کردینا' بکھری ہوئی چیزوں کو ملادینا یہ جمعہ کا مادہ ہے' جتنی بھی بڑی بڑی چیزیں منتشر تھیں' وہ اس دن میں جمع کی گئیں' آدم علیہ السلام کی مٹی جو پوری زمین سے لی گئی' وہ جمعہ کے دن ہی جمع کی گئی' اور ان کا پُتلا بنایا گیا۔

حدیث میں ہے کہ آدم علیہ السلام جس دن جنت میں داخل کئے گئے' وہ جمعہ کا دن تھا۔ جنت سے زمین پر لائے گئے' وہ بھی جمعہ کا دن تھا' صُحُف آدم علیہ السلام آسمانوں سے اُتارے گئے' وہ دن بھی جمعہ کا تھا ___ جیسے قرآن کریم میں تفسیر بتلائی گئی اور حدیث میں زیادہ شرح ہے کہ چھ دن میں اللہ تعالی نے ساری کائنات کو تیار کیا' اور اس کے چھے دن تمہارے چھ ہزار سال کے برابر ہیں۔

وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ

تو چھ ہزار سال میں کائنات تیار ہوئی۔ گویا اتوار سے بنّی شروع ہوئی اور جمعہ پر ختم ہوئی۔ اس میں زمین بچھائی گئی' پھر آسمان بنائے گئے' پھر زمین میں قوتیں رکھی گئیں' پھر جمادات و نباتات پیدا کئے گئے' پھر آسمانوں میں ستارے پیدا کئے گئے۔ ___ اس کی تفصیلات آئی ہیں ___ جب ساری کائنات بن کر تیار ہوگئی' تو جمعہ کی آخری ساعت میں آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا۔ یہ زمین کا فرش بچھایا گیا' آسمان کا خیمہ تانا گیا' چاند ستاروں کے انڈے لٹکائے گئے۔ دریا جاری کئے گئے' غذائیں جمع کی گئیں۔ یہ کس کے لئے تھیں؟

انّ الدّنیا خُلقت لکم وانکم خُلقتم للاٰخرۃ

ساری دنیا انسان کے لئے بنائی گئی ___ انسان معبود کے لئے بنایا گیا۔ آپ جب کسی کو مہمان بلاتے ہیں تو پہلے آپ کوٹھی منتخب کرتے ہیں' وہاں مہمانداری کا سامان کرتے ہیں' کھانے کا' پینے کا' رہائش کا' جب سب کچھ مہیا ہوتا ہے تب کہتے ہیں کہ تشریف لائیے۔ تو مہمان آتا ہے۔ ساری چیزیں اس کے استعمال میں آتی

ہیں۔ تو آدم علیہ السلام ساری دنیا کے مہمان ہیں' ان کو لانے سے پہلے ساری دنیا مکمل کردی گئی۔ زمین کو فرش بنادیا گیا' آسمان کو چھت بنادیا گیا' سورج اور چاند کے چراغ لٹکائے گئے تاکہ روشنی ہو' اور پھر عجیب طریقے سے زمین کو گودام بنادیا' اس میں سے غذائیں نکل رہی ہیں' زمین کو واٹرورکس بنادیا' جس میں سے پانی نکل رہا ہے۔ ایک صندوق بنادیا' جس میں سے لباس بھی نکلتے چلے آرہے ہیں۔ تو زمین ساری ضروریات کا ذخیرہ ہے حتیٰ کہ زندگی کا بھی اور موت کا بھی۔ اس سے آدمی پیدا ہوتا ہے اسی میں کھپ جاتا ہے۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى

"جمعہ" میں شانِ جامعیّت

تو زمین ہماری قرار گاہ بھی ہے' ہماری موت گاہ بھی ہے۔ ہماری دنیا بھی ہے' ہمارا برزخ بھی ہے۔ ساری چیزیں جمع کردی گئیں۔ اس کے بعد آخر میں آدم علیہ السلام لائے گئے' تو جمعہ کا دن تھا۔ آخری ساعت تھی جس میں آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے ــــ اسی واسطے فرمایا گیا کہ جمعہ کے دن میں ایک ساعت ہے وہ اگر کسی پر گزر جائے تو اس میں جو دعا مانگتا ہے یقیناً قبول ہوتی ہے ــــ علماء لکھتے ہیں کہ یہی وہ ساعت ہے جس میں آدم علیہ السلام کی پیدائش عمل میں آئی۔ تو جتنے بڑے بڑے اُمور ہیں' سب اسی دن واقع ہوئے ہیں۔ آدم علیہ السلام کی پیدائش' آدم علیہ السلام کی مٹی کا جمع کرنا' آدم علیہ السلام کو دنیا میں اتارنا ــــ تو اس دن کو آدمی سے کوئی خاص مناسبت ہے' اور ایام بھی انسانوں کے لئے ہیں۔ مگر جمعہ کے دن ولادت' موت وحیات وجمعیت اور جنت سے نزول ہوا۔ دنیا میں آئے تو صورۃً نزول ہوا' حقیقۃً عروج ہوا۔ اس لئے کہ دنیا میں نہ آتے تو خلافت نہ پاتے' ظاہر میں تو نیچے اُتارے گئے' اور حقیقت میں اس عمل گاہ کے ذریعے سے جب انسان نے عمل کرنے شروع کئے تو بڑے بڑے مراتب اور درجات بلند ہوئے۔ تو معنوی طور پر انسان بلند ہوا۔ ظاہری طور پر اسے نیچے اتارا گیا۔ تو وہاں کھلا ہوا حسّی وُرود تھا' یہاں حسّی نزول اور معنوی خلافت کا تاج رکھا گیا۔ انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے' علمائے ربّانی پیدا ہوئے۔ ہر ایک کے جوہر ظاہر ہوئے' تو دنیا مظہر کمالات ہے۔ دنیا نہ ہوتی تو کمالات کا ظہور نہ ہوتا۔ اگر یہ ساری اولاد جنت میں پیدا ہوتی تو بادشاہوں کی طرح بسر کرتی۔ رات دن کھانے پینے اور عیش اُڑانے میں لگے رہتے۔ لیکن دنیا میں لاکر مصائب میں مبتلا کیا گیا۔ تاکہ ان مصائب کے توڑ اور دفعیہ کے لئے انسان کے اندر جوہر نمایاں ہوں ــــ مصیبت رکھی گئی تاکہ دفاع کی طاقتیں کام میں آئیں ــــ اقوام کو اقوام کے مقابلہ پر ڈالا گیا' تاکہ شجاعتوں کا ظہور ہو' صبر وتحمّل کا ظہور ہو۔ جنت میں نہ جنگ ہوتی نہ لڑائی ہوتی' نہ دفعیہ کی تدبیریں سوجھتیں' نہ صبر وتحمّل کام آتا ــــ انسان کے بہت سے جوہر چھپے ہوئے رہ جاتے۔ دنیا کو ان کے لئے ظہور گاہ بنایا گیا۔ تو آدم علیہ السلام ظاہراً تو جنت سے نیچے اتارے گئے جو نزول ہوا' حقیقت میں عروج ہوا کہ جب تک دنیا میں نہ آئیں کمالات کا ظہور نہیں ہوسکتا ــــ قیامت بھی قائم ہوگی تو جمعہ کے دن ہوگی.... جس میں اوّلین وآخرین جمع کئے جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے دن میں جامعیّت کا مادہ موجود ہے۔ آدم علیہ السلام کی بکھری ہوئی مٹی یوم جمعہ میں جمع کی گئی۔ جو کمالات چھپے ہوئے تھے' وہ جمع ہوکر جمعہ کے دن نمایاں ہوئے ــــ قیامت ہوگی تو کروڑوں اربوں انسان زمینوں میں چھپے پڑے ہوئے ہوں گے۔ لیکن اپنی اپنی قبروں سے اُٹھ کر میدان حشر میں جمع ہوں گے۔ جمعہ کا دن انہیں جمع کردے گا ــــ غرض اس میں جامعیّت کی شان ہے۔

تو دنیا میں جمعہ لایا گیا تاکہ انسان جیسے اس کی تکوینی طور پر چیزیں جمع ہوئی ہیں' اپنے ارادے سے جمعیّت کی

شان اپنے اندر پیدا کرے۔ یعنی جمع ہونا سیکھیں۔ قلوب کی یکسانی سیکھیں' قلوب کا میل ملاپ اور اتحاد سیکھیں۔ اختلاف سے بچیں۔ گروہ بندیوں سے بچیں۔ اس کے لئے جمعہ کو نمونہ بنادیا گیا۔ کہ شکلیں مختلف' عقلیں مختلف' رنگ مختلف' مگر سب اگر جمعہ کے اندر جمع ہوتے ہیں۔ دیہات کے قصبوں کے لوگ اور محلوں کے بھی ایک جگہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں ___ باوجود اختلافِ مذاق کے پھران میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔ یہ جمعہ ہی کی برکت ہے۔ جب ہفتہ میں ایک دن جمع ہونا سیکھ لیا تو بقیہ ایام میں بھی ان کے لئے جمع ہونا آسان ہو جاتا ہے۔ ان میں اجتماع کی خو پیدا ہو جاتی ہے۔

ہر انسان اس وقت جہنم میں ہے' اس سے نکلنے کی تدبیر

جمعہ کا دن اجتماعیت کی دعوت دیتا ہے کہ باہمی میل ملاپ اور محبت پیدا ہو۔ باہمی یگانگت پیدا ہو۔ تمہارے اندر اتحادِ باہمی ہو ___ مگر اس کا ذریعہ کیا ہے؟ **وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا** ___ امام خطبہ دیتا ہے' وہ قرآن پڑھتا ہے۔ نماز میں بھی قرآن پڑھا جاتا ہے' وہ اللہ کی رسی ہے۔ جس کو پکڑنے کے بعد آدمی اوپر پہنچے گا۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' قرآن اللہ کی رسی ہے۔ جو آسمان سے لے کر زمین تک لٹکا دی گئی' جس نے مجھ تک آنا ہو' اسی رسی کو مضبوط تھام لے۔ جب ہم رسی کھینچیں گے' جو اس میں لٹک جائے گا وہ لٹک کر ہم تک پہنچ جائے گا۔

شیخ محی الدین ابن عربیؒ لکھتے ہیں کہ یہ آسمانوں سے نیچے کی جگہ سارا علاقہ جس میں ساتوں زمینیں شامل ہیں۔ یہ سب جہنم کا علاقہ ہے۔ قیامت کے دن اسی میں جہنم تپے گی۔ اسی میں آگ' اسی میں سانپ اور بچھو' اور اسی میں وہ سارے عذابات ہوں گے۔ تو ہم اور آپ گویا اس وقت جہنم میں موجود ہیں ___ قرآن کی رسی ٹانگ دی گئی' جسے اس جہنم سے نکل بھاگنا ہو' وہ اس رسی کو مضبوطی سے پکڑ لے' جو نہیں پکڑے گا' اسے جہنم میں بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود بخود جہنم کے اندر موجود ہے۔ اس سے نکلنے کے لئے صرف ایک ہی ذریعہ ہے۔ اور وہ اللہ کی رسی ہے۔ وہ رسی ٹوٹ نہیں سکتی۔ البتہ اگر کوئی مضبوط نہ پکڑے تو چھوٹ سکتی ہے۔ تو پوری قوت کے ساتھ اس کو مضبوط تھام لیا جائے۔

اس روز بھی قرآن پورے شہر کے آگے پڑھا جاتا ہے۔ تاکہ لوگ پیغامِ خداوندی سن کر اس سے وابستہ ہوں۔ اور اپنے اندر اجتماعی شان پیدا کریں۔

جُمعہ یومِ امتحان

جمعہ کا دن گویا عبرت و موعظت بھی ہے' اور ایک امتحان بھی ہے۔ یہ امتِ مرحوم جمعہ کی وجہ سے امتحان میں کامیاب ہوئی' امتحان میں کامیابی کی فضیلت اس کو حاصل ہوئی۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ نے اقوام کا امتحان لیا۔ یہود سے کہا کہ تم عبادت کے لئے ایک دن منتخب کرو' جو ہمارے علم میں متعین ہے ___ انہوں نے یوم السبت مقرر کیا۔ شنبہ کا دن کہ ہفتہ کے دن بجز طاعت و عبادت کوئی کام مت کرو ___ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہود سے فرمایا' اے یہود! یوم السبت کا احترام کرو۔ جب دعوے کرتے ہو کہ وہ مقدس دن ہے تو اس کی تقدیس کرو ___ نصاریٰ سے کہا گیا کہ تم بھی ایک دن طے کرو' وہ ہمارے علم میں طے شدہ ہے۔ دیکھتے ہیں تم پہنچتے ہو یا

نہیں؟ ___ نصاریٰ نے اتوار کا دن عبادت کے لئے تجویز کیا۔ اسی میں ان کے لئے عبادت فرض کردی گئی۔ مسلمانوں سے کہا گیا تم بھی ایک دن منتخب کرلو۔ تو ہمارے پیغمبر (فداہ روحی وابی وامی) صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کا دن منتخب فرمایا ___ فرمایا یہی ہمارے علم میں طے شدہ تھا۔ تو اس وقت کو وحیِ خداوندی سے مناسبت دی گئی۔ اب پوری امت اپنے پیغمبر کے قائم مقام ہے، جو اللہ کے علم میں طے تھا، وہی طے پاگیا۔

حق، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے ساتھ گھومتا ہے

جیسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کی فضیلت بیان کی گئی کہ پچھلی امتوں میں کچھ محدّث ہوتے تھے۔ جن سے حق تعالیٰ کلام فرماتا۔ میری امت میں وہ حضرت عمر ہیں۔ فرمایا گیا کہ جدھر عمرؓ گھومتے ہیں حق بھی اُدھر ہی کو گھوم جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ جدھر حق گھومتا ہے عمرؓ گھومتے ہیں۔ گویا اس درجہ فاروقِ اعظم سراپا صدق اور حق بن چکے ہیں کہ جدھر وہ گھومتے ہیں۔ حق بھی ادھر گھوم جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بارہ، تیرہ مسئلوں میں جو حضرت عمرؓ کی رائے تھی، وہی آسمان سے وحی اُتری۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لو کان بعدی نبیاً لکان عمرؓ

اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی اور میرے بعد کوئی نبی آتا، تو وہ عمرؓ ہوتے۔ لیکن چونکہ دنیا میں نبوت باقی نہیں، اسی واسطے کوئی نبی نہیں ہوگا ___ مگر حضرت عمرؓ میں صلاحیت ہے کہ اگر دنیا میں نبی آنے والا ہوتا تو وہ نبی بنائے جاتے۔ یعنی ان کے ذوق کو ذوقِ نبوت سے مناسبت تھی، وحی سے مناسبت تھی۔ رائے وہ قائم کرتے تھے، جس پر وحی آنے والی ہوتی تھی۔ وحی ان کے معاون بن کر اُترتی تھی۔ مخالف بن کر نہیں اُترتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کے فضائل میں سے یہ عظیم فضیلت ہے کہ ان کے ذوق کو وحیِ خداوندی سے کامل مناسبت تھی۔

مجموعۂ امت میں ذوقِ نبوت

مجموعی طور پر یہ امت مِل کر اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے۔ تو مجموعۂ امت میں بھی نبوت کا ایک خاص ذوق ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قائم مقام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شریعت اصلیہ لے کر آئے۔ امت نے اجتہاد سے وہ مسائل قرآن وحدیث سے نکالے، اور لاء (LAW) اور قانون کی شکل میں پیش کئے۔ پہلے وہ مسائل نہیں تھے اس امت کے مجتہدین کے علم میں آئے تو انہوں نے قرآن سے نکال کر پوری شریعت کو گلدستہ بنا کر پیش کردیا۔ اگر پیغمبر پر وحی اُتری تھی تو اس امت کے مجتہدین پر الہامِ ربانی منکشف ہوا۔ وہ اصلی شریعت لے کر آئے۔ انہوں نے اس شریعت میں سے شریعت وضع کی۔ گویا پیغمبر کے قائم مقام ہوگئے کہ جیسے پیغمبر شرائع لائے تھے۔ اس امت کے مجتہدین بھی شرائع لے کر آئے اور شریعتیں پیش کیں۔ مگر وہ شریعتیں اصلِ شریعت میں سے نقل تھیں۔ اس لیے علماء لکھتے ہیں کہ "القیاس مظهر لامثبت"۔

مجتہد جو قیاس کر کے اجتہاد کرتا ہے تو قیاس کسی مسئلہ کو ثابت نہیں کرتا بلکہ ظاہر کردیتا ہے۔ مسئلہ شریعت میں پہلے ہی ثابت شُدہ ہے۔ مجتہد کا اجتہاد اسے شریعت کے اندر سے نکال کر لاتا ہے۔ ہم میں اور آپ میں وہ فہم نہیں کہ ہم نکال لیں، مجتہدین کو وہ فہم دیا گیا کہ وہ نکال کر پیش کردیتے ہیں۔

بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے کنواں ہے اس میں پانی بھرا ہوا ہے۔ ڈول رسی جس کے ہاتھ میں ہے پانی وہی نکالے گا۔ گویا مجتہد کا اجتہاد بمنزلہ ڈول رسی کے ہے کہ وہ قوت سے کھینچتا ہے، اور پانی کو نالیوں میں، نہروں

میں اور جنگلوں میں بہا دیتا ہے جس سے کھیت سیراب ہوتے ہیں۔

امتِ محمدیہ کی مثال

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری لائی ہوئی شریعت کی مثال ایسی ہے۔ جیسے آسمان سے شدید قسم کی بارش اُتری' اور موسلا دھار پانی زمین پر برسنا شروع ہوا۔ پانی آکر پڑا تو زمین کے تین حصے ہو گئے۔ ایک ٹکڑا نہایت پاکیزہ نہایت عمدہ تھا۔ اس نے پانی کو جذب کیا۔ اور جذب کر کے طرح طرح کے پھل اور پھول چمن اور رنگ رنگ کے باغ لگائے' اور دنیا کو بہار بنا دیا ___ ایک ٹکڑا ایسا تھا کہ کچھ اگا تو نہیں سکا' مگر اس نے بارش کے پانی کو جمع کر لیا۔ بڑے تالاب بھر دیئے کہ لوگ اس سے پانی لے جاتے ہیں' سیراب بھی ہوتے ہیں' تو وہ زمین اگر پھل پھول نہ نکال سکی' تو اس نے پانی جمع کر لیا۔

اب تیسرا ٹکڑا ایسا تھا کہ وہ چٹیل میدان تھا۔ نہ پانی کو جذب کر سکا نہ جمع کر سکا۔ پانی آیا اور بہہ کر ادھر اُدھر نکل گیا' اور وہ خالی کا خالی رہ گیا۔

فرمایا اس طرح سے وحی کا پانی اُترا' تو قلوب کی دنیا تین حصوں میں منقسم ہو گئی ___ ایک وہ قلوب جنہوں نے وحیِ الٰہی اور علمِ ربانی کے پانی کو جذب کیا' یہ طبقہ فقہاء اور علماء ربانی کا تھا۔ دوسرے وہ قلوب جنہوں نے جذب تو نہ کیا مگر پانی جمع کر لیا' یہ طبقہ حفاظ اور محدثین کا تھا۔ تیسرے وہ قلوب جن پر کوئی اثر نہیں ہوا اور یہ طبقہ کفار کا ہے۔

علمائے امتِ محمدیہ کی خدمات

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اصلِ شریعت لے کر آئے' اور اس امت کے مجددین و مجتہدین نے اس شریعت میں سے مسائلِ استنباطیہ نکالے۔ ان پر وحی تو نہیں آتی تھی۔ مگر ان کے قلوب پر اِلہام ہوتا تھا۔ انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں پر معجزات ظاہر ہوئے' ان کے ہاتھوں پر کرامتیں ظاہر ہوئیں۔

اس مضمون کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا۔ گو حدیث ضعیف ہے مگر علماء اس حدیث سے جگہ جگہ استدلال کرتے رہتے ہیں کہ میری امت کے علماء ایسے ہوں گے جیسے بنی اسرائیل کے پیغمبر۔ یعنی پیغمبر تو نہیں ہوں گے' مگر کام وہ کریں گے جو پیغمبروں نے کیا۔ ان کے کام کی نوعیت وہ ہوگی جو انبیاء علیہ السلام کے کام کی تھی' جیسے ایک نبی جس خطے میں آتا ہے تو اس خطے کو ایمان سے رنگ دیتا ہے' اور لوگ مؤمن بنتے چلے جاتے ہیں۔ عالم و عارف بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس امت کے علماء ربانی اور مجتہدین وہ ہیں کہ ایک عالم ربانی جہاں بیٹھ گیا' ہزاروں کے ایمان کو سنبھال گیا.... ہزاروں کو ایمان سے رنگ دیا ___ امام ابو حنیفہؒ ہیں پورا ہندوستان تو کیا' پاکستان (بنگلہ دیش) افغانستان اور پورا ترکستان حنفی۔ ایک عالم ربانی' ایک مجتہد اُٹھا' کروڑوں کے ایمان کو درست کیا۔ کروڑوں کو جنت تک پہنچا دیا ___ امام شافعیؒ مکہ میں پیدا ہوئے' ابتدائی عمر مکہ میں گذاری۔ آخیر عمر مصر میں' اور وہیں وفات پائی۔ تو حجاز تقریباً سب کا سب شافعی ہے۔ ایک عالم ربانی اُترا' اس نے ملکوں کو ایمان سے رنگ دیا' اور لاکھوں متبع شریعت پیدا کئے۔ جتنے حنابلہ ہیں وہ کثرت سے ادھر ہیں' مغربی ممالک میں زیادہ مالکیہ ہیں۔ امام مالکؒ کا ظہور اُدھر ہوا' اور علماء پیدا ہوئے امام بخاریؒ' عبداللہ بن مبارکؒ' امام نوویؒ' امام اسحٰقؒ یہ سب وہ ہیں' جو صاحبِ مذہب تھے' اب یہ الگ چیز ہے کہ یہ مذاہب ختم ہو گئے۔ ان چار مذاہب کو قبول عام ہو گیا۔ یہ کوئی ارادی اور اختیاری چیز نہیں ہے۔ یہ منجانبِ اللہ

ہے جیسے صوفیاء کرام کے سلاسل تو بہت سے ہیں لیکن قبول عام زیادہ تر چار سلسلوں کو ہوا۔ سلسلۂ چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ۔ تو یہ قبولیت منجانب اللہ ہے ___ حاصل یہ ہے کہ اس امت میں ہزاروں آفتاب وماہتاب پیدا ہوئے جن کی روشنی سے دنیا مستفید ہوئی۔ جہاں ایک بیٹھ گیا' کروڑوں کے ایمان درست ہو گئے۔

آفتابِ عالم تاب ﷺ کی آمد آمد

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے علماء' انبیاء بنی اسرائیل کی مثل ہوں گے' یعنی پہلی امت میں جو کام نبی علیہ السلام سے چلتا تھا۔ اس امت میں ختمِ نبوت کے طفیل وہ کام مجددین اور علماء سے چلے گا۔ گویا ایک ہی نبوت اتنی قوی ہوگی کہ اور نبوتوں کی قوت باقی نہیں رہے گی ___ جیسے مثلاً رات ہو جائے' تو آسمانوں پر ہزاروں ستارے طلوع کرتے ہیں۔ اربوں' کھربوں ستارے۔ جدھر دیکھو ستارے۔ کروڑوں ستارے روشنی دار جمع ہیں مگر رات کا دن نہیں بنتا ___ ہے رات کی رات' یعنی تاریکی کلیۃً زائل نہیں ہوتی ___ تو ستاروں نے روشنی پھیلائی۔ اس میں لوگ کچھ کام کاج بھی کرتے ہیں مگر لانڈوں کی ضرورت ہے' ٹیوب لائٹوں کی ضرورت ہے۔ یہ نہیں کہ رات کا دن ہو جائے ___ لیکن جونہی آفتاب عالم تاب صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد آمد ہوتی ہے۔ ابھی پو پھٹی ہے۔ آفتاب نے طلوع نہیں کیا۔ صبح صادق نے خبر دی کہ آفتابِ عالم تاب جو روشنی کا بادشاہ ہے' آرہا ہے ___ آمد کی خبر تھی کہ ستارے بھی غائب' رات بھی غائب' اور دن نمودار ہونا شروع ہو گیا۔ اور جب سورج آتا ہے تو سارے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ستاروں کا نور چھن گیا بلکہ اتنا ماند پڑ گیا کہ مدھم ہو جاتا ہے کیونکہ سورج کے نور میں کوئی امتیازی طور پر دکھلائی نہیں دیتا اگر آفتاب یوں کہے کہ میرے بعد کوئی ستارہ نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ میں خاتم الانوار ہوں۔ نور کا خزانہ ہوں۔ میرے آنے کے بعد اب کسی ستارے کی حاجت باقی نہیں۔ سارا دن گزر جائے گا' میری روشنی کام دیتی رہے گی۔ میدانوں میں میری دھوپ پڑے گی۔ اس سے کام لے۔ اگر کوئی میدان میں نہ آسکے' تو گھر کے دروازے کھول دے۔ اس میں بھی چاندنی پہنچ جائے گی۔ اور اگر کوئی تہہ خانے میں بیٹھا ہوا ہے تو کم از کم کچھ دمک چمک ہی پیدا ہو جائے گی۔ اس سے بھی کام کر سکتا ہے۔ تاریک سے تاریک کوٹھڑے میں میری روشنی پہنچے گی۔ دن میں چراغ جلانے کی ضرورت نہیں۔ سوائے اس کے کہ کوئی آنکھوں کا نین سکھ ہی بن جائے کہ دن میں بھی بجلیاں جلائے اس کا تو کوئی علاج نہیں' ورنہ سورج نے ہر روشنی سے مستغنی کر دیا ہے۔

اسی طرح انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام آسمانِ نبوت کے ستارے ہیں۔ یکے بعد دیگرے انبیاء علیہم السلام طلوع ہوئے۔ ایک ایک وقت میں ہزاروں نبی تھے۔ بنی اسرائیل میں چار چار ہزار نبی ایک وقت میں آئے ___ تو آسمانِ نبوت پر آدم علیہ السلام کا ستارہ طلوع ہوا۔ نوح علیہ السلام کا ستارہ طلوع ہوا۔ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام آئے۔ موسیٰ و عیسیٰ (علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام) آئے مگر رہی رات' دن نہیں نکلا۔ جونہی آفتابِ نبوت کی بشارت دی گئی۔ پو پھٹی' اور صبح صادق ہوئی' یعنی عیسیٰ علیہ السلام نے پانچ سو برس پہلے آکر کہا ___ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ أَحْمَدُ (پارہ ۲۸) میں ایک ایسے رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئیں گے۔ ان کا نام نامی احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوگا۔

صبح صادق کا نمایاں ہونا تھا کہ قلوب میں جگمگاہٹ شروع ہو گئی۔ اسی جاہلیت کے دور میں دل توحید و رسالت کی طرف مائل ہونا شروع ہوئے۔ جہالتیں رفع ہونا شروع ہوئیں۔ اور جب فاران کی چوٹیوں سے

آفتاب طلوع ہو گیا تو جس دل میں ذرا سی بھی استعداد تھی، اس میں نور داخل ہوا اور روشنی آنی شروع ہوئی۔ قیامت تک یہ دن لمبا دن ہے، جو ہزاروں برس کا ہوگا۔ جیسے کہ اب بارہ گھنٹے کا دن ہوتا ہے۔ تو صبح صادق تو گھنٹے سوا گھنٹے کی ہوتی ہے۔ جتنا بڑا دن اتنی بڑی صبح صادق ــــ یہ دن چونکہ ہزاروں برس کا تھا، تو اس کی صبح بھی پانچ سو برس کی ہوئی ــــ عیسیٰ علیہ السلام کے دور سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک تک ــــ اس کے بعد قیامت کا دن ہوگا۔ صبح قیامت کا دوسرا دن ہوگا۔ تو قیامت کی صبح تک اب آفتابِ عالم تاب کی روشنی کافی ہے، کسی اور ستارے کی ضرورت نہیں۔ یہی ایک ستارہ (آفتاب) پورے عالم کو نور پہنچائے گا، اور پہنچا رہا ہے۔

مختلف صُورتوں میں ایک ہی نُور

اس کی روشنیوں کے ظہور مختلف ہیں۔ مجددین میں اس کی روشنی کا ظہور ہے۔ علماء ربانی میں اس کی روشنی کا ظہور ہے۔ صوفیائے کرام میں اسی کی روشنی کا ظہور ہے۔ کسی نے عالم باطن کھولا، کسی نے عالم ظاہر کھولا۔ کسی نے مسائلِ شرعیہ پیش کئے۔ کسی نے مسائلِ باطنیہ پیش کئے۔ کسی نے نفس کی اُلجھنیں دور کیں۔ کسی نے مکائدِ نفس پر روشنی ڈالی۔ کسی نے فضائلِ اخلاق پیش کئے اور رذائلِ اخلاق کو دھکا دیا۔ ایک ہی نور ہے جو مختلف صورتوں سے کام کر رہا ہے ــــ اور یہ پوری امت اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے۔

امتِ محمدیہ سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا

فرما دیا گیا ــــ لا تجتمع امتی علی الضللۃ ــــ میری پوری امت مل کر کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔ حق کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ فرقے ہوں گے، گروہ بندیاں ہوں گی۔ مگر ایک فرقۂ ناجیہ ضرور ملے گا، وہ وہی کرے گا جو میں کر رہا ہوں، وہی کہتا رہے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔ وہی باتیں پیش کرے گا جو میں کر رہا ہوں۔ فرمایا۔ اس امت میں ہر صدی پر ایک نہ ایک مجدد آتا رہے گا۔ جماعت کی شکل میں ہو یا فرد کی شکل میں۔ مختلف خطوں میں مختلف مجدد ہوں گے جو دین کو نکھارتے رہیں گے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ وہ امت کیسے ضائع ہو سکتی ہے جس کے اوّل میں تو میں ہوں، اور آخر میں مسیح علیہ السلام آسمان سے نزول کریں گے، اور بیچ میں حضرت مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ ہوں گے۔ وہ امت کیسے ضائع ہوگی ــــ؟ جس میں اتنے بڑے بڑے مجدد پیدا ہوں گے۔ تو صدی پر وعدہ کیا، مجموعۂ امت پر (عدمِ گمراہی کا) وعدہ کیا۔

پھر صدی کے اندر ہر دن کے لئے بھی وعدہ ہے، فرمایا: اس امت میں ہمیشہ سلف سے خلف علم حاصل کرتے رہیں گے، جو اَخلافِ رشید ہوں گے وہ اسلاف سے علوم لیتے رہیں گے۔ اور اس علم کے ذریعے غُلو کرنے والوں کی تحریفات کا پردہ چاک کریں گے۔ ان کے غُلو کو کھول کر رکھ دیں گے۔ اور کم عقلوں اور جاہلوں کی تاویلات کا پردہ چاک کر کے قرآن و حدیث کا اصل رُوپ پیش کر دیں گے۔ جس سے روز بروز دین نکھرتا رہے گا۔ تو مجموعی طور پر امت حق پر مجتمع ہے۔ ہر صدی پر مجدد آئیں گے صدی کے اندر علماء پیدا ہوں گے۔ امت ضائع نہیں ہوگی۔ تو پوری امت مجموعی طور پر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام ہے، اور جتنے کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں وہ اس امت میں بٹے ہوئے ہیں ــــ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوتِ آیات کی، تو حفاظ کا طبقہ کھڑا ہو گیا، جو تلاوت کر رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیماتِ کتاب کیں، تو

علماء اور فقہاء کا طبقہ کھڑا ہو گیا۔ جس نے کتاب کی تعلیم دینا شروع کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم حکمت دی 'اُسوۂ حسنہ پیش کیا' تو صوفیاء کا طبقہ کھڑا ہو گیا جس نے وہی کردار اور کریکٹر بنا کر دکھلا دیا' اور لوگوں کو اس پر چلایا' جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تزکیۂ نفس کیا۔ ریاضت و مجاہدے سے نفوس کو مانجھا' تو امت میں صوفیاء کا طبقہ کھڑا ہوا۔ جس نے قرآن و حدیث کی روشنی میں ریاضت اور مجاہدے کے اصول مرتب کئے' اور امت کی تربیت کی۔

جو فرائض پیغمبر کے تھے' وہ **بجنسہٖ** آج بھی باقی ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ علماء میں بہت سی خطائیں ہوں' بہت غلطیاں بھی ہوں' بہرحال وہ معصوم تو نہیں' لیکن حق منقطع ہو جائے' یہ نہیں ہو سکتا۔ لوگوں کا کام یہ ہے کہ ان کے بیان کردہ مسائل پر چلیں۔ ان کے ذاتی کردار سے قطع نظر کریں اگر کوئی برائی ہے تو ذات کے لئے چھوڑ دیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کا زریں مقولہ

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں سوائے انبیاء علیہم السلام کے کوئی آدمی ایسا نہیں جس میں صرف خیر ہی خیر ہو' اور کوئی ایسا نہیں جس میں شر ہی شر ہو۔ خیر بھی ہے شر بھی ہے۔ بھلائی بھی ہے بُرائی بھی ہے۔ نیکی بھی ہے بَدی بھی ہے ــــ دانشمند وہ ہے کہ اس کی ہر ایک نیکی سے فائدہ اٹھائے' اور اس کی بَدی اس کے لئے چھوڑ دے۔ کہ تو جانے اور تیرا خُدا جانے ــــ تو پوری امت فرشتہ دکھائی دے گی۔ یوں معلوم ہوگا کہ سب خیر ہی خیر ہے ــــ آج ہم ہر شخص کے شر کو لیتے ہیں' اور خیر کو دھکا دے دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساری امت میں شر پھیلی ہوئی ہے۔ وہ ساری خیر ماند پڑ گئی۔ تو دانشمندی کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کی خیر سے فائدہ اٹھاؤ۔ اگر اس میں شر ہے وہ خُدا کے حوالہ کرو۔ تم سے اس کے شر کا سوال نہیں ہوگا' اسی سے سوال ہو گا وہ نمٹے گا۔ تم اس کی خیر کو اپناؤ۔ (ہو سکے تو اس کے لئے دعا ہی کر دو)۔ یہ تو انبیاء علیہم السلام کی صفات ہیں کہ ان کا چلنا پھرنا' کہنا سننا' سب حجت ہے۔ ہر گناہ' ہر برائی سے معصوم ہیں' انبیاء علیہم السلام کے بعد اور کوئی معصوم نہیں' اولیاء اللہ محفوظ ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود محفوظیت کے اِمکان ہوتا ہے کہ غلطی سرزد ہو جائے اور ہوتی رہتی ہے ــــ تو آپ کا یہ کام نہیں ہے کہ آپ ان کی کمزوریوں پر نظر کریں۔ آپ کا کام یہ ہے کہ جو علم ان کے اندر سے نکل رہا ہے' وراثت کے طور پر اس کو اختیار کریں' اور ان کی بُرائی کو ان پر چھوڑ دیں' یا اگر خیر خواہی کا جذبہ ہو تو آپ تنہائی میں ادب سے کہیں کہ یہ غلطی ہے آپ اسے چھوڑ دیں۔ وہ آپ کے ممنون ہوں گے۔

حسنِ ظن اختیار کرنے کی ضرورت

لیکن ہر شخص کی بُرائیوں کو اچھالنا' اس سے پوری قوم کو رسوا کر دینا ہے ــــ فرمایا گیا: **ظنوا بالمؤمنین خیراً** ــــ مؤمنوں کے ساتھ حُسنِ ظن اختیار کرو۔ حُسنِ ظن کے لئے کسی دلیل کی حاجت نہیں۔ بدظنی کے لئے جب تک کوئی دلیل نہیں ہوگی' بدظنی کی اجازت نہیں ــــ یہ فرض ہے کہ ہر شخص حُسنِ ظن رکھے ــــ جب ایسے دلائل ہی مہیا ہو جائیں کہ برائی پیدا ہی ہو گئی تو بے شک بدظنی قائم ہے۔

اب اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ آپ اسے اُچھالتے پھریں۔ نصیحت کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے اور فرمایا:

"اے اللہ! میں مکار دوست سے پناہ مانگتا ہوں کہ اس کی آنکھیں دیکھتی رہیں۔ میری ہر نقل و حرکت کی رقیب بنی رہیں' اگر بدی سامنے آئے اسے اُچھال دیا' نیکی سامنے آئی اسے دفن کر دیا۔ ایسے مکار دوستوں سے میں پناہ مانگتا ہوں"۔

ہمیں اور آپ کو ایسا دوست نہیں بننا چاہئے۔ بلکہ کسی کی نیکی سامنے آئے تو اسے اُچھال دو۔ بدی سامنے آئے تاویل کر دو ___ پیار و محبت سے سمجھا دو' نصیحت کرو ___ نہیں مانتا تو خُدا کے حوالے کرو۔ وہ جانے اس کا خُدا جانے ___ پھر بھی اس میں کوئی نیکی ہے' علم کی بات ہے تو ہم اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

ہر جگہ سے آدمی حصولِ خیر کرتا رہے

مولانا حبیب الرحمٰن' حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارن پوریؒ کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ بڑے صاحبزادے مولانا خلیل الرحمٰن صاحب تھے جو جمعیۃ علماء ہند کے ناظم رہے تھے ___ وہ بڑے بلا کے ذہین تھے۔ ان کی ذکاوت ضربُ المثل ہوگئی تھی۔ ان کی ذکاوت و ذہانت عجائبات تھی۔ شروع عمر جوانی میں کوئی برائی ایسی نہیں جوان سے سرزد نہ ہوئی ہو۔ یعنی جوا تک کھیلا' غصب کیا دوسروں کا مال و دولت جھپٹ لیا یہ واقعہ ہے کہ علمی استعداد اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ دیوبند تشریف لاتے تو طلباء مٹے ہوئے تھے۔ ان کے علم کی وجہ سے ان پر قربان تھے ___ اسٹیشن سے شہر کی طرف آرہے ہیں۔ طلباء کے ہاتھوں میں ہدایہ ہے۔ ہدایہ کا سبق ہو رہا ہے۔ اور طلباء پیچھے پیچھے ہیں۔ دیوبند میں پہنچے۔ بازار میں بنیا رہتا تھا۔ بلا اس کا نام تھا۔ بہت جواری تھا۔ اس کے مکان کے نیچے بنیے کو آواز دی۔ وہ سامنے آیا تو کہا کہ "تو پٹ لے گا جوتا' یا چت لے گا" اس نے کہا پٹ۔ بس جوتا پھینکا وہ چت گرا۔ دس ہزار کی شرط ٹھہری۔ دس ہزار لے کر آگے روانہ ہوئے ___ بنیا شرط ہار گیا ___ اور ساتھ ساتھ سبق بھی ہو رہا ہے۔

ایک دفعہ ایک بنیے سے قرض لیا۔ بیس ہزار روپے کی دستاویز لکھ دی۔ دستخط کر دیئے۔ میعاد طے ہوئی کہ برس دن بعد ادا کریں گے ___ برس دن بعد' بنیے نے مانگا کہ میرا روپیہ۔ کہا کیسا روپیہ؟ ___ کہا کہ حضرت وہ جو آپ نے لیا تھا۔ فرمایا : مکار! ہم نے کب لیا تھا۔ اس نے کہا صاحب دستاویز لکھی ہے۔ کہا غلط ہے۔ کوئی دستاویز نہیں' بھاگ جا یہاں سے۔

اس نے جا کر عدالت میں دعوے دائر کر دیا۔ دستاویز اس کے پاس تھی۔ مولانا کے اس پر دستخط تھے۔ کہا کہ انہوں نے بیس ہزار روپیہ مجھ سے لیا' اور دستاویز جج کے میز پر رکھ دی۔ مولانا نے کہا کہ حضور میں بھی دستاویز دیکھ سکتا ہوں ___ انہوں نے کہا دیکھو' تمہارے لئے تو حجت ہے.... تو اس نے اس طرح سے وہ کاغذ پکڑا کہ اوپر کا سرا تو جج کے ہاتھ میں تھا اور نیچے جہاں ان کے دستخط تھے' دوسرا ان کے ہاتھ میں تھا۔ خدا جانے انگوٹھے میں کوئی مسالہ لگا کر گئے تھے۔ کیا صورت تھی۔ اس طرح سے اس کو پکڑ کر مسلا ہے کہ جب کاغذ میز پر رکھا' وہ دستخط غائب تھے' سادہ کاغذ تھا ___ مولانا نے کہا کیا یہ دستاویز آپ کو بنیے نے دی ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ فرمایا کہ جعلی معلوم ہوتی ہے۔ اس پر تو دستخط نہیں' گمنام ہے۔

دیکھا تو اس پر کسی کے دستخط نہیں تھے۔ جج نے غصے کے لہجے میں بنیے سے کہا۔ گمنام دستاویز لے کر یہاں آئے ہو؟ ___ اس نے کہا حضور! دستخط تھے' میں حلف کرتا ہوں۔ اس نے کہا تھے تو کہاں گئے؟ کوئی جن کھا گیا۔ کوئی اسے لے گیا۔ کہاں گئے دستخط؟ بنیے نے سر پیٹ لیا۔ آخر مولانا کی ڈگری ہوئی۔ بیس ہزار روپے کا اور دعویٰ کر دیا کہ میری حیثیت کی ہتک ہوئی ہے بیس ہزار اور وصول کر لئے ___ یہ کیفیت تھی۔

سنار کو گھر بلایا کہ زیورات کی ضرورت ہے۔ شادی ہونے والی ہے۔ دس پندرہ ہزار کے زیورات لینے ہیں ___ فرمایا کہ اتنی مہلت ہے، اجازت ہے کہ میں گھر کی عورتوں کو دکھلا آؤں۔ اس نے کہا ضرور دکھلا دیجئے۔ کوئی بے اعتباری تھوڑا ہی ہے۔ بس وہاں سے جا کر آدھ گھنٹہ میں جو کام کیا کہ سارے نگ اکھاڑ کر چھوٹے چھوٹے پرچوں پر دستخط کر کے نیچے رکھ دیئے، اور نگوں کو اس طرح جڑ دیا جس طرح تھے۔ اور لا کر واپس کر دیئے۔ وہ لے کر چلا گیا۔

مولانا نے جا کر عدالت میں دعوے دائر کر دیا کہ سنار میرے گھر سے پندرہ ہزار روپے کے زیورات چرا کر لے گیا ہے۔ اور پتہ نہیں ہے کہ کہاں ہیں ___ تو فوراً سمن جاری ہوا۔ اس کی طلبی ہوئی۔ عدالت میں حاضر ہوا۔ مولانا کا دعویٰ تھا کہ پندرہ ہزار کے زیور لے گیا ہے۔ اس نے کہا صاحب! میں کسی کے زیور نہیں لایا۔ دکھانے کے لئے لے گیا تھا ___ مولانا نے کہا یہ جھوٹا ہے۔ چرا کر لے گیا ہے۔ بات بنا رہا ہے کہ میں دکھانے کو لے گیا تھا۔ ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی۔ میں خود دکان پر جا کر دیکھ آتا۔

جھڑپ شروع ہوئی۔ تو جج نے کہا "کوئی ثبوت"؟ مولانا نے کہا کہ ثبوت یہ ہے کہ اس کے سارے زیور عدالت میں طلب کر لئے جائیں۔ میں اپنے زیور پہچان لوں گا۔ چنانچہ سارے زیور عدالت میں حاضر کئے گئے۔ مولانا نے جتنے ان کی نگاہ میں آ چکے تھے، سب الگ کر دیئے۔ اور کہا کہ "یہ ہیں وہ سب زیور" ___ سنار نے شور مچایا کہ صاحب ان کے کہاں سے آئے؟ یہ میری دکان کے زیور ہیں، ان کے نہیں۔

جج نے کہا "ثبوت"؟ ___ انہوں نے کہا کسی زیور کا نگ اکھاڑ کر دیکھ لیجئے ہر نگ کے نیچے میرے نام کے دستخط موجود ہیں۔ اب جس نگ کو اٹھاتے نیچے مولانا کے دستخط تھے۔

پندرہ ہزار کے زیوروں پر دستخط موجود تھے۔ آخر وہ زیور مولانا کو مل گئے اور گھر لے کر چلے آئے ___ یہ حالت تھی اور ساتھ ہی علمی استعداد کا یہ حال کہ سڑک پر بھی جا رہے ہیں تو طلباء پیچھے ___ مگر خیر آخر میں اللہ تعالیٰ نے توبہ نصیب فرمائی۔ اور اس درجہ پر پہنچے کہ پوری پوری راتیں نوافل و تلاوتِ قرآن مجید، اور درود شریف میں گزری ہیں..... یہ ان کا عام معمول تھا کہ جمعہ کی پوری رات درود شریف پڑھ کر گزارتے۔ سوتے نہیں تھے۔ جیسے حضرت سفیان ثوریؒ نے کہا ہے کہ ہم نے علم دنیا کی طلب کے لئے حاصل کیا تھا۔ مگر علم نے کہا میں غیر کی طرف نہیں جاؤں گا۔ تو ہمیں بھی اللہ سے ملا دیا ___ انہوں نے علم سیکھا تو بالآخر اس علم نے اپنی طرف کھینچا۔ یہ چیزیں ختم ہوئیں۔ آخیر عمر ان کی نہایت مقدسانہ اور نہایت پاکیزہ زندگی بن گئی ___ مگر میں نے اس پر یہ عرض کیا کہ باوجود ان خرافات کے، ان کی برائیوں کے چونکہ علم تھا، تو طلباء ان کے جوتے کے درپے نہیں تھے۔ ان کے علم کے درپے تھے کہ یہ ہمیں مل جائے۔ ان کا جو ان کے ساتھ ہے، اللہ جانے اور وہ جانیں۔

پوری امت میں خیر کیسے نمایاں ہو سکتی ہے

اگر پوری امت میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہر شخص کی خیر سے فائدہ اٹھاؤ، اور اس کی شر کو اس کے لئے چھوڑ دو۔ تو ساری امت نیک نظر آئے گی۔ اور اگر پوری امت کے ایک ایک فرد کی برائیاں اچھالیں گے اور نیکیاں دفن کریں گے تو معلوم ہو گا کہ ساری امت برائیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس امت میں کوئی نیک آدمی نہیں۔

اس جذبے سے ہم پوری امت کو برا کر کے دکھلا رہے ہیں۔ نہ اجتماعیت باقی ہے، نہ اتحاد و وحدت، اور نہ

قلوب کی یگانگت۔ اس لئے ہر شخص کی نظر بُرائی پر ہے۔ اپنی جانب سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں سب سے اونچا اور دوسرا حقیر ــــ اور دوسرا یہ سمجھتا ہے کہ میں سب سے اونچا اور وہ حقیر۔ سات فقیر ایک کمبل میں سو سکتے ہیں مگر دو بادشاہ ایک مُلک میں جمع نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ فقیر میں تواضع ہے اور بادشاہ میں کبر ــــ تو کبر دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہونے دیتا۔ ہر شخص نے کبر و نخوت کو پیشہ بنا لیا۔ اس لئے فسادات اور جھگڑے بھی ہیں۔

تواضع پیدا ہو جائے تو جھگڑے ختم ہو جائیں۔ جب آپ دوسرے سے یوں کہیں گے کہ آپ بڑے ہیں میں آپ کا خورد ہوں۔ وہ کہے گا کہ آپ بڑے ہیں، میں آپ کا خورد ہوں۔ لڑائی کیسے ہوگی؟ ــــ لڑائی اس سے ہوگی کہ آپ کہیں میں عزت والا ہوں تم ذلیل ہو۔ اس نے کہا میں عزت والا ہوں تم ذلیل ہو۔ بس لاٹھی چل پڑے گی۔ جب ہر شخص یہ کہے کہ حیثیت تو آپ کی ہے، میں تو آپ کا خادم ہوں۔ تو پاؤں میں پڑے سانپ کو بھی کوئی نہیں مارتا ــــ بہرحال امت میں آپ جہاں دیکھیں کہ جھگڑا چلتا ہے، تو سمجھ لیں کہ کوئی متکبر آگیا، کوئی صاحب نخوت موجود ہے، جسے اِقتدار کی ہوس ہے۔ جاہ پسندی اس کے اندر گھر کئے ہوئے ہے۔ وہیں جھگڑا شروع ہوتا ہے۔

دو ہی چیزیں ہیں جو امت کو تباہ کرنے والی ہیں۔ ایک حُبِّ جاہ اور ایک حبِّ مال۔ جاہ اللہ کی دین ہے اسے استعمال کیا جائے۔ اس پر فخر نہ کیا جائے۔ مال اللہ کا انعام ہے۔ اس کے بتائے ہوئے مصارف میں اس کو استعمال کیا جائے۔ نہ کہ مال کوئی خدا بنانے کی چیز ہے کہ آدمی سر بسجود ہو کر جھک جائے۔ یہ تو استعمال کی چیزیں ہیں۔ بندہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو اس کی جاہ کی جاتی ہے محنت کرتا ہے تو اسے مال دیا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں خدا کی ہیں ــــ خدا ہی کے لئے استعمال میں آتی ہیں۔ اس واسطے کہ اگر ان چیزوں کو ہم مخلوق کے لئے استعمال کریں۔ اپنی نخوتوں کا سامان نہ بنائیں تو پوری امت میں خیر نمایاں ہوگی۔

بحیثیتِ مجموعی امتؐ بھی معصوم ہے

تو میں اس پر عرض کر رہا ہوں کہ پوری امت اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام ہے۔ جیسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے، بحیثیت مجموعی امت بھی معصوم ہے۔ اس میں طبقات بُرے ہوں گے، افراد بھی بُرے ہوں گے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے امت معصوم ہے یعنی دین ضائع نہیں ہو سکتا، کہ دین ختم ہو جائے، اور گمراہی عام ہو جائے۔ ہدایت بالکل باقی نہ رہے ــــ اصل ہدایت باقی رہے گی۔ تو مجموعی حیثیت سے گویا عصمت کے مقام پر ہے کہ امت ضائع ہو کر کسی دوسری امت کا وجود ہو۔ یہ نہیں ہوگا۔ جیسے، پہلی امتیں ختم ہوتی تھیں۔ نئی امت کی بنیاد پڑتی تھی ــــ تو وہ یہ ہوتا تھا کہ ایک نبوت ختم ہوتی دوسری نبوت کی بنیاد پڑی۔ اب نبوت ایک ہے جو قیامت تک رہے گی۔ تو امت بھی ایک ہے کہ قیامت تک رہے گی۔ اس لئے اس میں حق بھی رہے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ حق منقطع ہو جائے، اور گمراہی پھیل جائے۔

ہمہ وقت اللہ کا دھیان رہے

تو ساری ہدایتوں کا اجتماع جمعہ کے طفیل ہوا۔ جمعہ ہی آدم علیہ السلام کو نیچے لانے کا ذریعہ بنا۔ وہ نیچے آئے تو اولاد پیدا ہوئی، اور پیغمبریاں بھی ظاہر ہوئیں، نبوتیں بھی نمایاں ہوئیں۔ علم و کمال نمایاں ہوئے۔ پاکیزہ اخلاق بھی نمایاں ہوئے، اور اب تک یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ تو جمعہ کا دن ان تمام کمالات کا جامع اور سبب

ہے۔ اس سے ہم فائدہ اُٹھائیں کہ جس طرح ہم یہاں جمع ہوئے' کاش باہر جاکر بھی ہم بھائی بھائی بنے ہوئے ہوں۔ اسی طرح ہمارے قلوب میں یکسانی ہو۔ مسجد اور باہر کا فرق کیا؟ ___ یہ کہ جب آپ باہر جائیں گے تو دنیا سامنے ہوگی۔ جب جمعہ کے لئے مسجد کے اندر آئے تو اللہ میاں سامنے ہیں ___ معلوم ہوا خُدا سامنے ہو تو وحدت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا سامنے ہو تو اِنتشار پیدا ہوتا ہے ___ اسلام نے یہ نہیں کہا کہ دنیا کو چھوڑ دو۔ کسبِ حلال تمہارے اوپر فرض ہے ___ اسلام میں یہ ہے کہ دنیا پر قابو پاکر اس کی محبت ترک کردو۔ دنیا کو استعمال کے لئے رکھو۔ اور تمہاری شان ہو کہ ع

دل بیار و دست بکار

ہاتھ پیر کام میں لگے ہیں اور دل اپنے مالک میں لگا ہوا ہے۔ گویا اپنے پروردگار سے باتیں کر رہا ہے۔ غرض ترکِ دنیا اسلام میں اس معنٰی پر نہیں ہے کہ شہروں کو چھوڑ دو۔ آبادیوں کو چھوڑ دو۔ لذّات کو ترک کردو۔ حکم دیا گیا۔

كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا

پاک غذائیں کھاؤ۔ اور عملِ صالح اختیار کرو ___ فرمایا گیا فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ___ نکاح بھی کرسکتے ہو' ضرورت پڑے تو چار بھی کرسکتے ہو۔ بشرطیکہ ضرورت پڑے اور عدل اجازت دے۔ اور دل میں عادل بنو تب' ویسے نہیں ___ مکان بنانے کے بارے میں قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے احسان جتلایا ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا

اللہ نے تمہارے لئے سکون کی جگہ رکھی۔ سکونت کی جگہ رکھی ___ کپڑوں کے گھر دیئے' چمڑوں کے گھر دیئے۔ اگر گھروں میں بسانا منظور نہ ہوتا' جنگلوں میں بسانا منظور ہوتا تو احسان کیوں جتلایا جاتا۔ تو کھانے کی اجازت' پینے کی اجازت۔

اور فرمایا :

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ

کہہ دے اے پیغمبر! کون ہے جو اللہ کی دی ہوئی نعمت و زینت کو اپنے لئے حرام کرے۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ حلال طریقے پر لذّات کو استعمال کرو' اور شکرِ خُداوندی بجالاؤ' اور عملِ صالح اختیار کرو۔

اسلام میں ترکِ دنیا کا مفہوم

اسلام میں ترکِ دنیا کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ آدمی شہروں کو چھوڑ کر ساری لذّات سے منہ موڑ کر جنگلوں میں پہاڑوں میں جا بیٹھے۔ بلکہ یہ معنٰی ہیں کہ مال کمائے' شہر بسائے آباد کرے۔ سب میں رہے پھر بھی اللہ سے متعلق رہے۔ معبود ایک ہے۔ یہ چیزیں پرستش کے لائق نہ بنائے۔ تو روپے پیسے کو معبود مت بناؤ۔ اللہ نے یہ دولت خادم بنا کردی ہے' مخدوم بنا کر نہیں دی کہ آدمی اس کی پرستش میں لگ جائے۔ جاہ و عزت آدمی کو اللہ نے اس لئے دی ہے کہ اس کے ذریعے باطل کو دفع کیا جائے۔ اس اقتدار سے مدافعت میں کام لیا جائے۔ اس لئے نہیں دی گئی کہ آدمی غرور کی شکل میں بولے۔ بڑا بول بھرے' متکبر بنے' اور عقل کے لئے مال دیا گیا ہے۔ مال کے لئے وہ چیزیں جمع کرو جو نافع ہوں اور جاہ کے ذریعے ان چیزوں کو دفع کرو جو نفس کے لئے مضر ہوں۔ مقاصد کو چھوڑ کر آلات و وسائل میں پڑ جاؤ۔ یہ دانش مندی کے خلاف ہے۔

جُمعہ کی تعلیم

بہر حال جمعہ ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ایک جگہ جمع ہوں' اور جمع ہونے کی صورت یہ ہے کہ منہ اللہ کی طرف ہو۔ قبلہ کا استقبال کرو۔ جب ایک رُخ ہو گا' مجتمع ہو جاؤ گے۔ جب آمنے سامنے ہوں گے تب ٹکر پیدا ہو گی۔ جب سب کا رخ ایک طرف ہو گا۔ ٹکراؤ کی کوئی وجہ نہیں۔

آپ میں سے جو حضرات حج کے لئے گئے ہیں' وہ جانتے ہیں کہ طواف کرنے کی جگہ میں کئی لاکھ آدمی طواف کرتے ہیں۔ بیت اللہ شریف میں ایک ہی مقام پر لاکھوں آدمی جمع ہیں۔ مرد و عورت کا ایک ہجوم ہے۔ کندھے سے کندھا چھلتا ہے۔ لڑائی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ سب ایک ہی رُخ میں گھومتے ہیں۔ اگر کچھ ادھر کو چلتے' کچھ ادھر کو تو مڈبھیڑ ہوتی۔ اچھا خاصا تصادم ہوتا۔ کیونکہ رخ ایک ہے۔ اس لئے لاکھوں جمع ہیں' ان میں کوئی ٹکر نہیں۔

جب آپ جامع مسجد میں آئیں گے تو سب کا رخ ایک ہی طرف ہو گا' تو یگانگت پیدا ہو گی۔ آپس میں کوئی ٹکراؤ نہیں جب باہر جائیں گے تو کسی کا منہ دکان کی طرف' کسی کا منہ دفتر کی طرف' ہر کوئی دوسرے کے سامنے۔ اس میں تصادم ٹکراؤ اور جھگڑے شروع ہوں گے۔

جیسے یہاں ظاہری طور پر ہے اگر باطنی طور پر خُدا کی طرف منہ کر لیا جائے وہاں بھی وہی شکل پیدا ہو جائے گی۔ تو جمعہ کا دن بتلاتا ہے کہ جیسے تم ظاہر میں جمع ہو گئے ہو۔ باطن میں بھی ہم نے تمہیں جمع کیا ہے اس لئے جب تم باہر جاؤ تو باطن کا رخ ایک طرف رکھو۔ اللہ سے لَو لگائے رکھو۔ تم میں تفریق پیدا نہیں ہو گی۔

بہر حال جمعہ یومِ امتحان بھی ہے کہ یہ امت کامیاب ہوئی ..... جمعہ یوم جامعیت بھی ہے جس نے تمام بکھری ہوئی چیزیں جمع کیں۔ جمعہ یوم فضیلت بھی ہے جس میں انسانوں کو فضیلت ملی۔ جمعہ یوم مزید بھی ہے' جس میں دربارِ خداوندی میں حاضری کی عادت پڑی۔ اس لئے جمعہ کو انتہائی ذوق و شوق سے ادا کرنے کی ضرورت ہے' اور اذانِ جمعہ سے پہلے آکر مسجد میں صفِ اوّل ہی میں بیٹھنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ فضائل و برکات حاصل ہوں۔

اس مختصر سے وقت میں یہی موضوع جمعہ کا سامنے تھا۔ اسی کے متعلق میں نے چند باتیں عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرماوے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ
اَللّٰھُمَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِیْنَ غَیْرَ خَزَایَا وَلَا مَفْتُوْنِیْنَ
وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ
بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ۔ اٰمِیْن

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اسلام میں عید کا تصور

عید کا حاصل ذکرِ الٰہی، عبادتِ ربانی، خدمت خلق اللہ، روح اجتماعیات، دنیا میں رہ کر آخرت کو نہ بھولنا اور زندوں کے ساتھ ہی اموات سے بھی رشتہ جوڑے رکھنا اور ان میں سے ہر چیز کی روح اور معیار ایمان کو قرار دینا ـــــ نہ کہ ظاہرداری اور دنیا سازی ـــــ تاکہ خلق اللہ کے ساتھ اللہ سے وابستگی اصلِ اُصول ثابت ہوتی رہے۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةِ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ـــــ اَمَّا بَعْدُ ـــــ

فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعِيْدُ لِمَنْ خَافَ الْوَعِيْدَ لَا لِمَنْ لَبِسَ الْجَدِيْدَ (صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

اجتماعیت عامہ!

بزرگانِ محترم!

دنیا کی ہر قوم تہوار رکھتی ہے، اور اپنی حد تک اسے شاندار طریقے سے مناتی ہے، پارسیوں میں نوروز اور مہرجان کی عیدیں ہیں، عیسائیوں میں کرسمس اور بڑے دن وغیرہ کے نام سے عید ہے، ہندوؤں میں ہولی، دیوالی وغیرہ وغیرہ سینکڑوں تہوار اور آئے دن کے میلے ٹھیلے ہی۔

مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے عیدین (عیدُ الفطر، اور عید قرباں) کے تہوار عطا فرمائے، فرق یہ ہے کہ اقوام عالم میں عید اور تہوار کے معنیٰ رنگ رلیاں منانے یا اپنی قومیت کے مستحکم کرنے اور یا کسی مقتدا شخصیت کی یاد تازہ کرنے کے ہیں۔ اسلام میں عید اور تہوار کے معنیٰ اجتماعی طور پر خدا کی یاد کرنے، اس کی طرف رجوع کرنے اور اس کا قرب حاصل کرنے اور اس کے نام پر غریبوں کی مدد کرنے کے ہیں۔ تاکہ اجتماعیت عامہ کا

ظہور عادت اور عبادت دونوں میں ہو جائے' پس اگر مذاہب کے ناموں کے سلسلہ میں ہر مذہب کا نام اس کی نوعیت پر روشنی ڈالتا ہے' ہندومت کے لفظ سے وطنیت پر روشنی پڑتی ہے' عیسائیت کے لفظ سے ایک ہادی اعظم کی شخصیت سامنے آتی ہے' یہودیت کے لفظ سے ایک قومیت کا تصور بندھتا ہے' پارسیت سے ایک ملک کا دھیان دلوں میں جمتا ہے۔ جس کا حاصل حد بندی' اور محدودیت ہے تو اسلام کے لفظ سے نہ وطن سامنے آتا ہے نہ ملک' قوم نہ شخصیت بلکہ اطاعتِ حق میں فنائیت اور مالک الملک میں محویت کے جذبات کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو اس کی طرف صاف اشارہ ہے کہ دنیا کے مذاہب نسل و قوم' وطن اور شخصیت پرستی کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں لیکن اسلام نے اپنے سادہ عنوان ہی سے ان تمام حد بندیوں کو توڑ کر ایک عالمگیر تصور سامنے رکھا اور وہ اطاعتِ حق ہے کیوں کہ حق خود لامحدود اور وسیع ہے اس کی اطاعت کا دم بھرنے والی قوم بھی اپنے کو مسلم کہہ کر عبادت گزار بن کر اور عبادتِ غیر سے منقطع ہو کر گویا اعلان کرتی ہے کہ وہ ایسی ذات سے تعلق رکھتی ہے جو وسیع سے وسیع تر ہے دنیا کی پوری زمین اور اس کے رقبے اور رقبوں پر بسنے والی قومیں اپنی حد بندیوں سے اس کی لامحدود وسعتوں میں خلل انداز نہیں ہو سکتیں

حکمتِ دوگانہ

ٹھیک اسی طرح تہواروں اور عیدوں کے سلسلہ میں اپنے تہواروں سے ہر قوم اگر یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ رنگ رلیوں میں منہمک ہو کر اپنی نفسیات کی پابند ہے یا کسی بڑی شخصیت کی میلاد منا کر وہ صرف اس عظمت کو نمایاں کرنا چاہتی ہے جو اس کے دل میں اس شخص کی موجزن ہے گویا وہ اپنی شخصی عقیدت مندیوں کی پابند ہے یا کسی وطن اور قوم کا نام اُجاگر کر کے اپنے کو اس کا اسیر اور پابند دکھانا چاہتی ہے ___ تو مسلم قوم عیدوں کے تہواروں میں خدا کی جناب میں دوگانہ ادا کر کے اور اس کے نام پر قربانی دے کر حاجت مندوں پر فطرہ کا صدقہ اور قربانی کا صدقہ بانٹ کر گویا یہ بتلانا چاہتی ہے کہ ایک طرف تو وہ صرف خدائی نام لیوا ہے اور اس کی عظمتوں کو دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہے۔

حکمتِ فطرانہ و قربانی

اور دوسری طرف دنیا کے مفلوکُ الحال انسانوں کو اس خوشی کے موقع پر صدقہ اور خیرات دے کر یہ بتانا چاہتی ہے کہ وہ ایک عوامی اور عالمی قوم ہے۔ جس کو نہ قبیلے تقسیم کر سکتے ہیں نہ ملکوں کی حد بندیاں بانٹ سکتی ہیں۔ نہ شخصیتوں کی عقیدت مندیاں اسے دوسری شخصیتوں کی عظمت و عقیدت سے روک سکتی ہیں۔ اور یہ ہی وہ جماعتِ کبریٰ ہے جسے لے کر اسلام دنیا میں آیا ہے اور جس کا اعلان اس نے اپنے نام اور اپنے کام سے قدم قدم پر کیا ہے۔

روحِ عید

بہر حال اسلامی تہوار نفسیاتی یا قومیتی یا شخصیاتی تصورات کے آئینہ دار نہیں بلکہ اجتماعیت عامّہ کے حامل ہیں اور یہ اجتماعیت عامّہ جب کہ وطن' قوم' نسل' شخصیت کے تصوّر سے نہیں بن سکتی تھی بلکہ ان سب سے بالاتر اور مافوق ذات سے وابستگی سے ہی بن سکتی تھی جس کا نام پاک اللہ ربّ العزّت ہے۔

تو ان تہواروں کی روح اسی کا نام اور اسی کی عظمتِ مطلقہ قرار دی گئی ہے چنانچہ عید کی نماز کے لئے جب مسلمان چلتے ہیں تو رنگ پھینکتے ہوئے ___ یا کسی شخصیت یا قومیت کے نعرے لگاتے اور بے کار کرتے ہوئے نہیں چلتے بلکہ :

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ۔

عیدُ الفطر میں آہستہ آہستہ اور عید قرباں میں بآواز بلند تہوار کے لئے روانگی ہوتی ہے تو کبریائی الٰہی عظمتِ خداوندی اور توحید کے اعلان کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس میں نہ شور ہے نہ شر نہ ہنگامہ آرائی نہ میلوں ٹھیلوں کی شان ہے بلکہ قدوسیوں، سبوحیوں اور مقدس ملائکہ کی صفوں کی طرح تسبیح الٰہی اور تقدسِ ربانی کہتے ہوئے روانہ ہوتے ہیں عید گاہ میں پہنچ کر بھی تسبیح و تہلیل جاری رہتی ہے۔ اس کے بعد امام آگے بڑھتا ہے اس کے تکبیرِ تحریمہ کہتے ہی مکبّر تکبیرات کی آوازیں بلند کرتے ہیں، تلاوتِ قرآن ہوتی ہے سب مقتدی سکون وخشوع کے ساتھ اسے سننے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ رکوع و سجود سے اپنے مالک کے سامنے بندگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور آخر کار سلام پھیر کر پھر تکبیرات کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔

عظیم اجتماعیت

نماز سے فارغ ہوتے ہی امام خطیب کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور ممبر پر کھڑے ہو کر وعظ و نصیحت اور احکام سناتا ہے۔ جس کو تمام مقتدی سماعِ عظمت و قبول سے سنتے ہیں۔

اس عبادت سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں اس خوشی کے موقع پر جبکہ ہر طرف چہل پہل اور روحانی مسرتوں کا دلوں پر ہجوم ہوتا ہے۔ ممکن تھا کہ اس میں کسی نفسانی تفریح یا دنیاداری کے جذبات کی آمیزش ہو جائے، تو ان تہوار منانے والوں کے لئے مسنون کیا گیا کہ قبرستان میں جا کر اپنے مردہ بھائیوں کی ارواح سے ملاقات کریں۔ ان کو ثواب پہنچائیں ان سے قریب تر ہوں تاکہ ان کو آخرت کے گھرانے دیکھ کر خود بخود اپنی آخرت کی یاد تازہ ہو جائے اور دنیا میں اس خوشی کے موقع پر ادھر سے دھیان نہ ہٹ جائے۔

دوسرے لفظوں میں یہ بتلانا ہے کہ مسلمان اجتماعیتِ کبریٰ کو لے کر اُٹھا ہے اس کا دائرہ صرف اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ عالم برزخ کے اربوں کھربوں انسان بھی اس کی اجتماعیت کے ممبر ہیں کی بنیاد ڈالی ہے جو دنیا سے گزر کر برزخ سے گزر کر عالم حشر تک جا پہنچتی ہے۔ جس میں دنیا کے کسی ایک قرن کے ہی انسان نہ ہوں گے۔ بلکہ آدمؑ کی ساری اولاد، اور اولین و آخرین کی ساری شخصیتیں مجتمع ہوں گی۔

عوالم گیر اجتماعیت

پس جو لوگ مسلمانوں سے سُن کر اجتماعیت کا نام لیتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ عالمی اجتماعیت کا دم بھریں گے اور وہ بھی صرف اپنے زمانے کے ملکوں اور قوموں سے کوئی سیاسی رابطہ قائم کر لیں گے۔ لیکن حقیقتاً جو قوم اجتماعیت کے لئے دنیا میں برپا کی گئی ہے وہ عید کے وظائف کی رو سے گویا اس اجتماعیت کو بھی ایک غیر محدود اجتماعیت ظاہر کرتی ہے اور اس کا رابطہ اجتماعی دنیا سے گزر کر برزخ کے ان تمام پاکباز انسانوں سے قائم ہوتا ہے جو ایمان کے ساتھ اِس عالم سے گزر کر اُس عالم میں پہنچ گئے ہیں، اور گویا وہ محض دنیا والے بھائی بھائی کا نعرہ لگاتے ہیں مگر اس ساری اجتماعیت کی حقیقی روح جس سے یہ عالم گیر ہی نہیں عوالم گیر اجتماعیت بن جاتی ہے۔ خدا کا نام ہے کہ اس سے زیادہ واسع اور وسیع کوئی نہیں۔ اس لئے عید کے لئے جیسے اس دنیا میں ایمان

کی قید ہے ایسے آخرت کے باشندوں کی ملاقات کے لئے بھی وہی ایمان کی شرط ہے اور ایمان کے معنی بجز اس کے دوسرے نہیں کہ اللہ رب العزت کی ذات وصفات افعال واوامر ونواہی اور اس کے قوانین کو مانا جائے کیونکہ اس کے بغیر یہ وسعت واجتماعیت قائم ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس سے زیادہ وسیع رشتہ اور معیار ہی دوسرا نہیں۔

خوش قسمت قوم

اس لئے عید تہوار تو ہے مگر محض لفظ تہوار کی وجہ سے اسے دنیا کی عام اقوام کے تہواروں کی نظر سے نہ دیکھا جائے کہ اس کی غیر معمولی وسعتیں ان دوسرے ظرفوں میں کسی طرح نہیں سما سکتیں۔

پس خوش قسمت ہے وہ قوم جسے ایسے تہوار دیئے جائیں اور خوش نصیب ہیں وہ افراد جو ان تہواروں میں ان کی شرعی حدود و شروط کے مطابق شرکت کریں تہوار عید بندگی حق اور خدمت خلق ہے نہ کہ محض نیا اور اور فاخرہ لباس، عطر وخوشبو اور شیریں چیزیں کھاپی لینا۔ اسی لئے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

العید لمن خاف الوعید لا لمن لبس الجدید (الحدیث)

”یہ عید اس کی ہے جو خدا سے ڈرا اور اس کی طرف جھکا نہ کہ اس کی جس نے عمدہ اور نئے کپڑے پہن لئے“۔

عید کا اصل اُصول

پس عید کا حاصل ؟ ذکر الٰہی، ذکر ربانی، خدمت خلق اللہ، روح اجتماعیات دنیا میں رہ کر آخرت کو نہ بھولنا اور زندوں کے ساتھ ہی اموات سے بھی رشتہ جوڑے رکھنا اور ان میں سے ہر چیز کی روح اور معیار ایمان کو قرار دینا نہ کہ ظاہر داری اور دنیا سازی، تاکہ خلق اللہ کے ساتھ اللہ سے وابستگی اصل اُصول ثابت ہوتی رہے۔

سال بھر کے لئے نورانی اثرات

ساتھ ہی یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ عبادتیں دو طرح کی ہیں فعلی اور ایک ترکی، نماز، زکوٰۃ، حج وغیرہ فعلی ہیں جس میں کچھ افعال ادا کرنے پڑتے ہیں۔ ترکی عبادت روزہ ہے جس میں ترک اکل، ترک شرب اور ترک لذات ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پورے ایک ماہ تک محبت حق میں دنیا کے اس معظم حصے کو ترک کئے رہنا کوئی معمولی مجاہدہ نہیں بلکہ نفس کی ایک عظیم قربانی ہے۔ جسے بغیر مدد خداوندی پورا نہیں کیا جاسکتا۔ ماہ رمضان المبارک میں دن بھر اس مجاہدے سے نفس کو رگڑ کر اور مانجھ کر اس میں صفائی پیدا کی جاتی ہے لیکن کسی ظرف میں محض صفائی آجانا اور میل کچیل دور ہو جانا کافی نہیں جب تک کہ اس میں آب نہ آجائے اور وہ چمک نہ اُٹھے ایک قلعی گر بھی برتن کو اوّل رگڑتا اور مانجھتا ہے، اینٹ، پتھر سے برتن کو رگڑ کر اپنے پیروں تک اسے پامال کرتا ہے تاکہ برتن کا میل صاف اور زنگ دُور ہو جائے لیکن محض صفائی کے لئے برتن قلعی گر کے یہاں نہیں بھیجا جاتا بلکہ اصل مقصود اس کی آراستگی اور جگمگاہٹ ہوتی ہے چنانچہ قلعی گر بھی اس صفائی پر قناعت

نہیں کرتا بلکہ اس صاف برتن کو آنچ دیتا ہے اور تپا کر جب صاف شدہ برتن پر قلعی پھیرتا ہے تو اسی دم برتن چاندی کی طرح چمک اٹھتا ہے' اور قلعی گر کے پاس برتن بھیجنے کا مقصد اب آکر پورا ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح ظرف قلب کو صاف کرنے کے لئے تو رمضان کے روزے رکھے گئے ہیں تاکہ نفس کی محبوبیت اس سے چھڑا کر اسے رگڑ دیا جائے' اور غیر اللہ کی محبت و الفت کی ان آلائش سے اسے صاف کیا جائے پس روزے کے یہ ترک نفس کے لئے وہی کام کرتے ہیں جو برتن مانجھنے کے لئے اینٹ' پتھر اور مٹی کام کرتی ہے۔ دن بھر جبکہ نفس کی رگڑائی ہوئی اس کا دانہ پانی بند کر کے اسکی نفسیاتی لذات کے دروازے بند کر دئے گئے اور اس عمل سے اس کی روحانی آلائشوں کا میل کچیل نکال دیا گیا تو شب کو اس پر قلعی کا سامان تراویح اور تلاوت قرآن سے کیا جاتا ہے تاکہ دن بھر تپائے ہوئے نفس پر کلام خداوندی کی قلعی سے آب اور چمک پیدا کر دی جائے اور اس کی روح نور الٰہی سے جگمگا اٹھے۔ یہ تیس کے تیس دن بھر کی کمائی رگڑائی اور منجھائی اور پھر شب بھر قلعی ایک ماہ میں انسانی نفس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ سال بھر تک اس چمک دمک سے فائدہ اٹھاتا رہے اور میل کچیل سے مبترا رہ کر ان نورانی اثرات کو سال بھر تک استعمال کرے بشرطیکہ اس مجاہدہ کے اثرات کو سال بھر باقی رکھنے میں ساعی رہے۔

اجتماعیاتی صلاحیت کا شکرانہ

بہر حال یہ ایک ماہ سال بھر کی نورانیت کی کفالت کرتا ہے' اور بندے کے خدا سے قریب تر ہونے کے تمام موانع کو دور کر دیتا ہے' تاکہ اس سے قریب ہو کر بندہ وسیع الظرف اور وسعت عامہ کا اہل ہو جائے اور اس کی ذات اسلام کی اجتماعیت کبریٰ کی طویل و عریض زنجیر کی ایک مضبوط کڑی ثابت ہو۔

پورے ایک ماہ کی اس مشقت محنت اور اس پر مرتب شدہ اجتماعیاتی صلاحیت جیسی عظیم نعمت ملنے پر جو محض خدا کی مدد' اور اس کی توفیق ہی سے اسے میسر ہو سکتی تھی' اتنی ہی بڑی شکر گزاری کا فریضہ بندے پر عائد ہوتا تھا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ادائے شکر کا طریقہ دوگانہ عید کو قرار دیا تاکہ ادھر رمضان کامیاب ہو کر ختم ہوا ادھر اسی دم ہلال عید آسمان سے سر نکال کر یہ اعلان کرے کہ "اے بندو! اس عظیم کامیابی پر جو تمہیں اجتماعیت کبریٰ کی صلاحیتوں کے ملنے کی صورت میں حاصل ہوئی ہے۔ اپنے مالک کا شکر ادا کرو' یا بالفاظ دیگر رمضان میں جو صلاحیتیں تمہیں عطا کر دی گئی ہیں ان کو عید کے میدان میں فعلیت میں لا کر ان صلاحیتیں کا عملی ثبوت دو اور اجتماعیت عامہ کی صورت اور حقیقت اجتماع عید میں توجہ الی اللہ کے ساتھ نمایاں کر کے دکھلاؤ۔

حقیقت رمضان

پس رمضان المبارک صلاحیتیں پیدا کرنے کا مہینہ ہے' اور ماہ عید ان صلاحیتوں کے عملی آغاز کا مہینہ ہے جس کا سلسلہ سال بھر تک جاری رہتا ہے' اس درمیان میں اگر کچھ کمی یا کوتاہی راہ پاتی ہے تو اگلا رمضان پھر اگلے سال کے لئے ان کوتاہیوں کو دور کر کے ان صلاحیتوں کی تجدید کر دیتا ہے تاکہ نہ مجاہدے کا سلسلہ ختم ہو' نہ اجتماعیت کی روح مضمحل ہونے پائے اور انسانی عمر اسی مبارک سلسلہ میں ختم ہو جائے۔

فرد مسلم کا درجہ امت

تاکہ جب وہ اپنے رب سے ملے تو تنہا اپنا نفس ہی ساتھ نہ لے جائے بلکہ اس کے ساتھ اجتماعی نسبتوں کی

ایک عظیم کُمک ہو۔ لاکھوں دعائیں ہوں جو اس اجتماع میں مل کر کی گئی تھیں۔ ہزاروں ایصالِ ثواب ہوں جو عید کے موقع پر اَموات تک پہنچائے گئے تھے۔ کروڑوں باطنی ہمتیں ہوں جو صف بندیوں میں ایک کی دوسرے کی طرف متوجہ ہوتی ہیں اور دنیا و برزخ کے تعلقات کے بے شمار رشتے ہوں جو اس کے لئے جناب باری میں سفارشی اور مساعی ہوں تاکہ اس فرد پر جو اجتماعی صلاحیتوں سے ایک اُمّت بن کر اپنے خدا کے پاس پہنچ رہا ہے۔ اللہ کی لاکھوں رحمتیں متوجہ ہوں اور وہ اسی طرح اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا کر کے سرخروئی کے ساتھ اپنے مالک سے جا ملے۔

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ○

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

جواہر انسانیت

انسانی سیرت کے اجزائے ترکیبی چار نکل آئے' ایک علم صحیح اور علم نافع' اور عمل صحیح اور عمل صالح اور اخلاص کامل اور ایک فکر سلیم۔

یہ چار چیزیں انسان میں جمع ہوں گی تو کہا جائے گا کہ یہ انسان صحیح قسم کا انسان ہے۔ جس میں علم کے بجائے جہالت ہو' کہیں گے یہ حیوان ہے' علم ہو مگر عمل نہ ہو تو کہیں گے عالم بے عمل ہے' گردن زدنی ہے۔ عمل ہے مگر منافق ہے' مخلص نہیں ہے تو کہیں گے نامعقول ہے۔ مخلص بھی ہے مگر بے فکرا ہے تو کہیں گے کہ نہایت غلط قسم کا انسان ہے۔ جس میں علم بھی ہو' عمل بھی ہو' اخلاص بھی ہو' اور آخرت کا فکر صحیح بھی ہو' کہا جائے گا یہ قابل اعتماد انسان ہے۔ یہ ہے جس کی انسانیت کی داد دی جاسکے۔ اور کہا جاسکے کہ یہ انسان ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ——— اَمَّا بَعْدُ ———

فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ وَالْعَالِمُوْنَ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْعَامِلُوْنَ وَالْعَامِلُوْنَ کُلُّھُمْ ھَالِکُوْنَ اِلَّا الْمُخْلِصُوْنَ وَالْمُخْلِصُوْنَ عَلٰی خَطَرٍ عَظِیْمٍ۔

(اَوْ کَمَا قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ)

سیرت نبوی ﷺ کی جامعیت

بزرگان محترم!

جلسہ سیرت کے نام پر منعقد کیا گیا ہے۔ اس کا موضوع یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت

مقدسہ بیان کی جائے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی جائے تاکہ سیرت کے مختلف گوشوں سے لوگ آشنا ہوسکیں ___ ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ درحقیقت ایک ذات یا ایک شخصیت کی سیرت نہیں ہے بلکہ یہ پورے عالم انسانیت اور پورے عالم بشریت کی مقدس سیرت ہے۔ ___ دنیا میں بہت سی ذوات ایسی گزری ہیں جو ایک ایک جماعت کے قائم مقام ہوتی ہیں یعنی پوری جماعت مل کر جن کمالات کا سبب بنتی ہے۔ بعض دفعہ حق تعالیٰ وہ سارے کمالات کسی ایک شخصیت میں جمع کردیتے ہیں ___ بعض شخصیتیں وہ ہیں کہ جماعتوں کے نہیں بلکہ پوری پوری اقوام کے قائم مقام ایک شخصیت ہوتی ہے۔ اور بعض شخصیتیں پوری ملت اور امت کے قائم مقام ہوتی ہیں ___ یعنی پوری ایک امت میں جو کمالات علم وعمل کے جمع ہوں' وہ ایک ذات میں جمع کردیئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا :

اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيۡفًا

ابراہیم علیہ السلام پوری ایک امت ہیں ___ یعنی ایک عظیم ترین امت میں جو اخلاق وکمالات جمع ہوسکتے ہیں وہ ایک ذات واحد میں اللہ نے جمع کردیئے۔ ___ تو آپ اندازہ کیجئے کہ جو ذات بابرکات ملت ابراہیمی کی تکمیل کرنے کے لئے آئے' وہ ذات بابرکات کتنی عظیم ہوگی۔ وہ ایک امت نہیں بلکہ دنیا کی ساری امتوں کی جگہ وہ ایک ذات واحد ہوگی اور جو ساری امتوں اور اقوام میں مل کر کمالات جمع ہیں وہ تنہا ایک ذات واحد میں ہوں گے اور وہ ذات ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔

سیرت انسانیت

تو آپؐ کی سیرت درحقیقت مکمل انسانیت کی سیرت ہے۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس سیرت مقدسہ کے بیان کرنے سے پہلے انسانیت کی سیرت پر گفتگو کروں کہ انسان کسے کہتے ہیں؟ اور اس کی سیرت کے اجزاء ترکیبی کیا ہیں؟ ___ اگر وہ سمجھ میں آگئے تو جو ذات بابرکات پورے عالم انسانیت کی عظیم اور متوازی ہے۔ اس کی سیرت خود بخود سمجھ میں آجائے گی۔ اس لئے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث تلاوت کی ہے جس میں خود اجزائے ترکیبی بیان کئے گئے ہیں کہ انسان کسے کہتے ہیں؟ انسان کے معنی کیا ہیں؟

مادۂ انسان کے تخلیقی مراحل

اسے آپ اس طرح سمجھیں کہ انسانیت کو یا انسان کو جو کچھ فوقیت یا عظمت یا شرف حاصل ہے۔ وہ انسانی مادے کی وجہ سے حاصل نہیں ہے۔ انسان کی تمام کائنات پر جو کچھ بزرگی' بلندی اور برتری ہے وہ اس کے مادے کی وجہ سے نہیں ہے ___ اس لئے کہ انسانی خلقت کے مادے جہاں بھی قرآن کریم نے ذکر کئے ہیں وہ نہایت ہی گندے اور نجس مادے ہیں۔ ان کی وجہ سے انسان کو کوئی فوقیت یا فضیلت حاصل ہو۔ یہ نہیں۔

کہیں انسان کے بارے میں فرمایا گیا :

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ

ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔

اور کہیں فرماتے ہیں :

خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ

ہم نے انسان کو گندے قطرے سے پیدا کیا۔
کہیں فرماتے ہیں :

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ

کیا ہم نے تمہیں ایک ذلیل پانی سے پیدا نہیں کیا ___ ؟
اور کہیں فرماتے ہیں :

خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ

ہم نے انسان کو سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا۔

تو کہیں مٹی، کہیں نطفہ، کہیں سڑا ہوا گارا اور کہیں ذلیل پانی۔ یہ انسان کی پیدائش کے ذلیل مادے ذکر کئے ہیں۔ تو جن میں خود ذلت اور خود گندگی موجود ہے۔ ان مادوں کی وجہ سے انسان کو کیا شرافت اور فضیلت حاصل ہو سکتی تھی۔

ایک موقع پر قرآن عظیم نے ان سب مادوں کو یکجائی طور پر جمع کر کے ذکر فرمایا :

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

"ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا، پھر اس کو نطفے کی شکل دے کر رحم مادر میں پہنچایا، پھر ہم نے نطفے کو خون کی شکل میں تبدیل کر دیا، پھر خون کی ہم نے ایک منجمد پھٹک بنادی۔ پھر اس کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنادیا۔ پھر اس میں ہم نے ہڈیاں پیدا کیں اور کھال بھر دی۔ اور پھر اس کی ایک اور خلقت تیار کی"۔

تخلیق انسان کا پہلا مرحلہ

تو یہاں ترتیب وار چند مادوں کا ذکر کیا گیا۔

مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا ___ ظاہر بات ہے کہ مٹی کے اندر کون سی چمک دمک ہوتی ہے۔ مٹی تو وہ ہے جس کو ذلول کہا گیا۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا

اس مٹی کو ہم نے تمہارے سامنے ذلیل کر دیا۔ پست بنادیا ___ تو بیچاری پامال ہوتی ہے جوتیوں سے آپ اس کو روندتے ہیں لیکن یہ اف نہیں کر سکتی، تو اس کے عجز اور درماندگی کا یہ عالم ہے کہ اس میں کوئی چمک اور نورانیت نہیں۔ کوئی خوبصورتی نہیں ہے ___ یہ گویا انسان کی پیدائش کا ابتدائی مادہ ہے۔

تخلیق انسان کا دوسرا مرحلہ

اس کے بعد آگے ترقی کر کے فرمایا :

ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ

پھر ہم نے اس کو نطفہ بنا کر رحم مادر میں ٹھہرایا ___ تو یہ اور زیادہ گندگی کے اندر ترقی ہوئی۔ اس لئے کہ مٹی ناپاک تو نہیں تھی۔ بہت سے بہت کوڑا کباڑ کی کثافت تھی۔ کپڑے پر لگ جاتی تھی تو دھوتے تھے' بدن پر پڑجاتی تھی تو آدمی غسل کر کے بدن صاف کرلیتا تھا۔ تو کثافت تھی مگر نجاست نہیں تھی ___ بلکہ ایک حد تک مطہر بھی ہے۔ یعنی دوسروں کو پاک کرنے والی بھی ہے۔ اگر پانی نہ ملے تو تیمم کی اجازت ہے۔ مٹی' پانی کے قائم مقام ہوجاتی تھی۔ غرض خود بھی پاک ہے اور دوسروں کو پاک بنادیتی ہے صرف اتنی بات تھی کہ ایک کرکٹ اور کوڑا تھا جو بدن پر پڑجائے یا کپڑوں پر تو دھونے کی ضرورت پیش آتی تھی۔

تخلیق انسان کا تیسرا مرحلہ

لیکن جب اس کو نطفے کی شکل میں منتقل کیا تو ناپاکی پیدا ہوگئی۔ غلاظت اور کثافت کے ساتھ ساتھ نجاست بھی پیدا ہوگئی ___ اور اس درجے کی کہ اگر یہ قطرہ خارج ہو تو قرآن کریم پڑھنے کے قابل آپ نہیں رہتے۔ مسجد میں جانے کے قابل آپ نہیں رہتے۔ نماز آپ نہیں پڑھ سکتے۔ اس درجہ گویا گندگی ہے۔ اسی لئے ایک موقع پر فرمایا۔

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ

"اس انسان کی جرات تو دیکھو کہ ہم نے اس کو ایک گندے قطرے سے پیدا کیا۔ اور ہمارے ہی مقابلہ پر جھگڑالو دشمن بن کر آتا ہے"۔ گویا اب تک تو مادے میں کثافت تھی اب نجاست بھی پیدا ہوگئی۔

تخلیق انسان کا چوتھا مرحلہ

اور آگے ارشاد فرمایا :

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً

تو نطفے کے اندر کم سے کم ائمہ کا اختلاف تو تھا ___ بعض ائمہ اس کو پاک کہتے تھے ___ کم سے کم اس کی نجاست متفق علیہ نہ تھی' مختلف فیہ تھی ___ لیکن نطفہ جب خون کی شکل میں تبدیل ہوا تو خون کی پاکی کا کوئی بھی قائل نہیں تو متفق علیہ نجاست بن گئی۔ گویا نجاست کے اندر اور زیادہ ترقی ہوئی۔ مٹی کا خلاصہ ناپاک نہیں تھا۔ کثیف تھا۔ نطفہ کثیف بھی تھا اور ناپاک بھی تھا۔ مگر مختلف فیہ تھا۔ اور خون بنا تو متفق علیہ ناپاکی ہوگئی ___ اس کے بعد میں لوتھڑا بنا کے ہڈیاں پہنائی گئیں ___ ان تمام چیزوں کے اندر کوئی خوبی نہیں ہے۔ کوئی پاکیزگی اور کوئی چمک دمک بھی نہیں ___ معنوی چمک تو کیا ہوتی' مادی چمک بھی نہیں کہ ظاہری طور پر کوئی شعاع تو نظر آجائے۔ یہ انسان کی پیدائش کے مادے ہیں۔

تخلیق انسان کا پہلا ظلمانی مکان

اور پھر ان مادوں کے ساتھ انسان کو کہاں پیدا کیا گیا۔ وہ بھی گندی جگہ ہے جس میں تخلیق عمل میں آئی۔ بلکہ گندی اور ظلمانی جگہ بھی ہے۔ قرآن کریم میں ایک موقع پر ارشاد فرمایا گیا :

يَخْلُقُكُمْ فِىْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِىْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ

اللہ تعالیٰ تم کو پیدا کرتے ہیں۔ تمہاری پیدائش پر مختلف دور آتے ہیں ___ کہاں پیدا کرتے ہیں؟ ___

فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ــــ تین اندھیری کوٹھڑیوں اور تین ظلمتوں کے اندر پیدا کرتے ہیں۔

سب سے پہلی ظلمت ماں کا پیٹ ہے جس کے اندر کوئی چاندنا نہیں۔ جس کے اندر کوئی آفتاب کی شعاع نہیں پہنچتی۔ اور اندر سے بھی کوئی شعاع نہیں اٹھتی۔

تخلیق انسان کا دوسرا ظلمانی مکان

اس ماں کے پیٹ میں پھر جو اندر کوٹھڑی ہے وہ رحم مادر ہے۔ جس کے اندر بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اس میں اور زیادہ اندھیری ــــ ماں کے پیٹ میں ممکن تھا کہ مسامات کے ذریعہ ہی کوئی چیز پہنچ جائے۔ مگر رحم مادر تو پیٹ کے اندر ایک اور بند کوٹھڑی ہے۔ وہاں نہ باہر سے کوئی چیز پہنچے نہ اندر سے باہر آئے۔

تخلیق انسان کا تیسرا ظلمانی مکان

پھر اس کے اندر ایک اور تیسری کوٹھڑی ہے۔ وہ' وہ جھلی ہے جس کے اندر بچہ لپٹا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ دایا اس کو کاٹ کر بچے کو باہر نکالتی ہے۔ تو ماں کا پیٹ خود اندھیری کوٹھڑی' رحم مادر' اس کے اندر ایک اور اندھیری کوٹھڑی اور اس کے اندر جھلی ایک اور اندھیری کوٹھڑی۔

فضیلت یا ندامت

تین ظلمتیں ہیں اور تاریک گھرانے ہیں جس میں انسان کو تربیت دی جاتی ہے اور تخلیق کی جاتی ہے۔ ان تینوں اندھیری کوٹھڑیوں میں سوائے غلاظت کے اور کیا ہے؟ حیض کا خون غذا بنتا ہے۔ گندے پانی میں انسان تیرتا رہتا ہے ــــ تو پیدائش کے مادے بھی نجس' مکان بھی گندا۔ پھر جس راستے سے اندر پہنچتا ہے وہ راستہ بھی گندا' جس راستے سے نکالا جاتا ہے وہ راستہ بھی گندا ــــ تو راستے بھی گندے' مادے بھی گندے' مکان بھی گندا اور جوہر بھی گندا ــــ ان گندی چیزوں سے ان گندے مکانوں میں بن کر آپ اندازہ کیجئے کہ انسان میں کوئی فضیلت پیدا ہو سکتی ہے۔ انسان کی فضیلت تو بجائے خود ہے اگر وہ ان مادوں کی طرف دھیان کرے تو ندامت سے اس کا سر نیچا ہو جانا چاہئے۔ یہ غلاظتوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے لئے کوئی فخر اور غرور کا موقع باقی نہیں رہتا۔ کوئی موقع باقی نہیں رہتا کہ وہ شیخی کرے یا اترائے ــــ کیا گندگی پر اترایا جاتا ہے؟ کیا نجاست کے اوپر انسان فخر کرے گا ــــ؟

انسان کی خود فریبی

کوئی بزرگ چلے جا رہے تھے' ان کے سامنے ایک شخص جو بہت بڑا مالدار تھا۔ اور دنیا کی اصطلاح میں بڑا آدمی تھا۔ وہ چلا آ رہا تھا اور اپنی بڑائی کی وجہ سے اتراہٹ کی چال چل رہا تھا۔ پیر ڈالتا کہیں تھا پڑتا کہیں تھا' چھاتی ابھارے ہوئے' منہ ابھرا ہوا۔ غرض متکبرانہ چال سے چل رہا تھا ــــ ادھر سے کوئی بیچارہ اللہ والا' سادہ زندگی والا درویش انسان آ رہا تھا۔ اس نے خیر خواہی کے طور پر اسے نصیحت کی اور کہا کہ۔

"اے عزیز! خدا کی زمین پر اکڑ کر مت چل۔ لَاتَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ــــ اللہ کی زمین پر اینٹھ کر مت چل' اکڑ کر مت چل۔ یہ جو تو اینٹھ کر چل رہا ہے' چھاتی ابھار کر

چل رہا ہے۔ اِنَّک لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ___ تو ایڑھ کر زمین کو نہیں پھاڑ ڈالے گا۔ آسمان کو چیر نہیں ڈالے گا۔ اتنی ہی جگہ میں رہے گا۔ جتنی جگہ میں ہے۔ خواہ مخواہ یہ مصیبت برداشت کر رہا ہے۔ یہ انسانیت کا کام نہیں ہے"۔

اس شخص کو بہت ناگوار گزرا کہ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو مجھے ٹوکے۔ میں تو سب سے بڑا آدمی ہوں اس نے بہت ہی تمتما کر اور بہت ہی غصے سے کہا کہ :

او جاہل درویش! تو نہیں جانتا میں کون ہوں؟

اور میرے سامنے ایسا گستاخانہ کلام؟

تو نہیں جانتا میں کون ہوں؟

یہ درویش بھی بگڑے ہوئے دل کا آدمی تھا ___ اگر یہ اپنے مال میں مست تو وہ اپنی کھال میں مست۔

انسان کا حقیقی تعارف

وہ بھی آگے بڑھا اور اس نے کہا جی ہاں میں جانتا ہوں آپ کون ہیں، اور اگر آپ اجازت دیں تو بتلاؤں آپ کون ہیں ___ یہ بھی سسک کر کھڑا ہو گیا کہ بھئی! یہ بھی عجیب درویش ہے ___ آخر آپ بتلائیں گے کہ میں کون ہوں؟

"اس نے کہا میں جانتا ہوں آپ کون ہیں؟ آپ ذرا سن لیجئے"۔

اولک نطفة قذرة واخرک جیفة مذرة وانت بین ذلک تحمل العذرة

آپ کی ابتداء ایک گندے قطرے سے ہوتی ہے جو بدن سے نکل آئے تو غسل واجب، کپڑے کو لگ جائے تو دھونا واجب۔ آدمی نہ نماز کا رہتا ہے نہ تلاوت کا ___ یہ تو آپ کی ابتداء ہے۔ انتہا آپ کی یہ ہے قبر میں پہنچ کر یہی بدن پانی ہو کر بہے گا۔ کیڑے اس میں پڑیں گے۔ نجاست یہ بنے گا۔ یہ آپ کی انتہا ___ اور درمیان میں حالت یہ ہے کہ سیروں گندگی اور نجاست آپ کے پیٹ میں بھری ہوئی ہے۔ پاخانہ ہے، پیشاب بھی ہے، اور خون بھی ہے یعنی دم مسفوح بھی ہے۔

تو ابتدا گندی، انتہا گندی اور درمیانی حالت میں گند در گند ___ یہ ہے آپ کی حقیقت ___ ا فرمائیے آپ اپنی حقیقت سمجھ گئے کہ آپ کون ہیں؟

اس کی آنکھ کھلی۔ چونکہ کہنے والا حقانی آدمی تھا۔ دل سے ایک بات کہی تھی تو ع

از دل خیزد بر دل ریزد

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

دل پر اثر کیا اور اس شخص نے کہا کہ ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی
مرا باجان جاں ہمراز کردی

خدا تجھے جزائے خیر دے تو نے میری آنکھ کھول دی، میں نہیں جانتا تھا کہ میری یہ حقیقت ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ انسان اپنے مادے کے لحاظ سے اتنا گندہ اور نجس واقع ہوا ہے۔ اگر وہ اپنے مادوں پر دھیان کرے تو اس کے لئے منہ اٹھانے کی جگہ نہیں ہے۔ آنکھ اونچی کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ شرمندگی کی وجہ سے آنکھ نیچی رکھے گا۔

ستّار العیوب کا احسان

یہ تو حق تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ اس نے ہماری گندگیوں کو چھپادیا ہے اور نہایت خوبصورت کھال کا پردہ ڈال دیا ہے جس سے یہ چیزیں چھپادی ہیں۔ اگر خدانخواستہ کھل جائیں تو انسان' انسان کو دیکھ کر نفرت کھانے لگے ___ اسی گندگی کے اگر خدانخواستہ معدے سے بخارات اٹھنے لگیں اور منہ میں بدبو پیدا ہو جائے تو انسان کو انسان سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ پاس کھڑے ہوتے ہوئے نفرت آتی ہے۔ ___ وہ معدے کے بخارات ہوتے ہیں جو گندہ دہنی کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔ تو جب وہ اجاگر ہوتے ہیں تو آدمی سے آدمی گھبرانے لگتا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے گندگیوں کو چھپا رکھا ہے اور ان پر پردہ ڈال دیا ہے ___ انسان کو موقع نہیں ہے کہ ان چیزوں پر فخر کرے یا شیخی بگھارے یا اتراہٹ کی چال چلے۔ گویا بتلادیا گیا کہ انسان اپنی خلقت کے لحاظ سے گندہ واقع ہوا ہے۔

یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس میں کوئی کمال ڈال دے۔ مگر انسان کی ذات کا کوئی کمال نہیں۔ ذات تو انسان کی وہ ہے جو ہم نے پیش کردی ہے۔

ظاہر بات ہے کہ ان مادوں کے ہوتے ہوئے نہ انسانی سیرت بن سکتی ہے نہ انسان کو کوئی فوقیت اور فضیلت حاصل ہو سکتی ہے۔ کم سے کم ان مادوں کے لحاظ سے انسان کے اندر کوئی بھی خوبی نہیں۔

ظاہری خوشنمائی کی حقیقت

اب آپ یوں کہیں گے۔ یہ تو چھپی ہوئی چیزیں ہیں لیکن ان کے اوپر شکل تو خوشنما پڑی ہوئی ہے۔ کسی جاندار کو وہ خوبصورتی عنایت نہیں کی گئی جو انسان کو کی گئی ہے۔ تو انسان اپنی صورت زیبا کے اعتبار سے افضل اور اونچا ہے اور جتنا بھی وہ دعویٰ کرے کم ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ صورت درحقیقت ایک عارضی چیز ہے جلدی سے ختم ہو جاتی ہے۔ خدا بھلا کرے بخار کا کہ تین دن آجاتا ہے تو ساری شکل بگڑ جاتی ہے۔ سارا حلیہ خراب ہو جاتا ہے' نہ رنگ باقی رہتا ہے' نہ روغن باقی رہتا ہے ___ اگر انسان کی شرافت کے یہ معنی ہیں کہ وہ خوشنما ہے تو تین دن بخار آنے کے بعد شرافت چھن جاتی ہے تو وہ رذیل بن جاتا ہے۔ تو یہ شرافت کیسی ہوئی کہ تین دن پہلے شریف اور تین دن بعد رذیل ___ پہلے اشرف المخلوقات اور اڑھائی دن گذرنے کے بعد ارذل المخلوقات۔ یہ شرافت کس کام کی ہے؟ یہ صورت کی زیبائی اور رعنائی۔ یہ ایک عارضی چیز ہے۔ بخار آجائے تو ختم ہو جائے' انسان کو کوئی غم لگ جائے تو تب صورت بگڑ جاتی ہے۔ کوئی فکر پیدا ہو جائے تب صورت بگڑ جاتی ہے۔ تو جس چیز کو آنے والی کیفیت زائل کردے۔ وہ شرافت کی بنا نہیں ہو سکتی ___ شرافت تو وہ ہے کہ جو ہر میں پڑی ہوئی ہو تو جو ہر گندہ ہے۔ تو شرافت آئے گی تو کہاں سے آئے گی؟

اور اگر فرض کیجئے کہ کوئی بیماری بھی نہ ہو تو بڑھاپا تو کہیں نہیں گیا؟ بڑھاپا آتا ہے تو وہی صورت جو زیبا تھا' وہ بھیانک نظر آنے لگتی ہے۔ چہرہ شومو ہو جاتا ہے۔ صورت اور ہیئت بگڑ جاتی ہے اور بدل جاتی ہے اور

مان لیجئے بڑھاپا بھی نہ آئے موت تو ہر صورت میں آئے گی؟ وہ بالکل ہی صورت کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔

عقل کی گمراہی

یہ عقل کی گمراہی ہے کہ وہ اس صورت پر فخر کرنے لگے جو رات دن تغیر کے اندر ہے۔

ہم رات دن اس صورت کو سنوارنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ کنگا اور چوٹی۔ یہ اور وہ۔ اسے آپ کہاں تک سنواریں گے جو بگڑنے کے لئے پیدا ہوئی ہے جس چیز کو ہر چیز بگاڑ دے آپ اسے کہاں تک سنواریں گے؟ بیماری اسے بگاڑ دے‘ بڑھاپا اسے بگاڑ دے‘ فکر اور غم اسے گھلا دے‘ موت اس کا حلیہ بگاڑ دے‘ تو آپ ناحق سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو بگڑنے کے لئے بنی ہے۔ اسے سنوارنا کوئی دانائی کا کام نہیں ہے۔ اگر آدمی سنوارنے کی کوشش کرے تو اپنی سیرت کو سنوارنے کی کوشش کرے نہ کہ صورت کو۔ پائیدار چیز انسان کی سیرت ہے نہ کہ صورت۔ صورت کو آپ کتنا ہی سجائیں گے‘ کتنا ہی زیبا بنائیں گے‘ کتنا ہی آپ آراستہ کریں گے بالآخر وہ ختم ہوگی۔ اس کی زیبائش بھی ختم ہوگی۔ اگر پائیدار چیز ہے تو وہ انسان کی سیرت ہے۔

نجاست کا عشق

کسی بزرگ کا واقعہ لوگوں نے نقل کیا ہے کہ ان کی خانقاہ میں لوگ اپنی تربیت کے لئے اللہ اللہ کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے‘ شیخ لوگوں کی تربیت کرتے تھے ــــ اور شیخ کے ہاں طریقہ یہ تھا کہ بیس بیس اور پچاس پچاس مریدین اور متوسلین جمع ہوگئے‘ کھانا شیخ کے گھر سے آتا تھا‘ ایک باندی اس کام کے لئے متعین تھی‘ وہ کھانا تقسیم کر جاتی تھی‘ ایک نئے مرید آکر بیعت ہوئے‘ مقصد تو یہ تھا کہ اللہ اللہ کر کے اپنی حالت کی اصلاح کریں۔ باندی جب کھانا لے کر آئی تو وہ اتفاق سے کچھ ذرا قبول صورت تھی۔ ان مرید صاحب کی اس سے آنکھ لڑ گئی‘ اس پر کچھ فریفتہ ہوگئے۔ اب جب وہ کھانا لے کر آتی ہے تو بیٹھ کر اسے گھورتے ہیں۔ نہیں آتی تو منتظر رہتے کہ کب آئے گی۔ اس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب وہ آئی تو اسے گھورنا شروع کیا ــــ شیخ کو اس حالت کی اطلاع ہوگئی ــــ تو اہل اللہ علاج کرتے ہیں‘ وہ زبان سے نہیں ہوتا‘ طریق عمل سے علاج ہوتا ہے کہ مرض کا استیصال ہو جائے۔ شیخ نے چاہا کہ ان کا یہ مرض دور ہو۔ اگر زبانی نصیحت کر دیتے‘ فہمائش کر دیتے‘ بے شک تھوڑا بہت اثر ہوتا مگر جب طبیعت مائل تھی تو طبیعت کا بدلنا مشکل تھا‘ شیخ نے ارادہ کیا کہ طبیعت ہی کو بدل دیا جائے تاکہ یہ قصہ ہی ختم ہو۔

تو ایک عجیب وغریب ترکیب استعمال کی۔ اس باندی کو جو کھانا لے کر آتی تھی۔ اسے دستوں کی دوا کھلا دی‘ صبح سے شام تک اسے بڑی تعداد میں دست آگئے‘ ایک جگہ متعین کر دی کہ اسی جگہ جانا‘ وہاں قدمچہ رکھ دیا ــــ غرض شام تک اسے بہت دست آگئے۔ اور شام کو حالت یہ ہوئی کہ نہ وہ رنگ باقی رہا نہ وہ روغن باقی رہا۔ ہڈی سے چمڑا لگ گیا۔ اس باندی کی صورت دیکھ کر ڈر معلوم ہونے لگا۔ عجیب بھیانک شکل بن گئی ــــ اس کے بعد شیخ نے فرمایا کہ اس مرید کے پاس کھانا لے کر جا۔ اور جو کچھ وہ کہے اس کی مجھے آکر اطلاع کرنا۔

وہ کھانا لے کر بے چاری پہنچی‘ ناک پکڑو تو دم نکلے‘ قدم اس کا لرز رہا ہے۔ ضعف کی وجہ سے اس سے چلا نہیں جاتا اور صورت بھی بھیانک ہوگئی ــــ یا تو مرید صاحب اس کے انتظار میں بیٹھے رہا کرتے تھے۔ اب جو آئی اور انہوں نے اس کی شکل دیکھی تو انہیں بڑی نفرت سی پیدا ہوئی اور بجائے اس کے اسے گھورتے‘ منہ

پھیر کر کہا کہ کھانا رکھ دے اور چلی جا یہاں سے ___ وہ بے چاری کھانا رکھ کر چلی گئی ___ اور شیخ کو جاکر اطلاع کردی کہ آج اس نے مجھے بجائے گھورنے کے نفرت سے کہا کہ چلی جا یہاں سے دور ہوجا۔ میں چلی آئی۔

شیخ نے کہا۔ الحمدللہ علاج ہوگیا۔

مگر ابھی علاج کی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔ ایک جز تھوڑا سا باقی تھا۔

شیخ مرید کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ آپ ذرا میرے ساتھ چلیں۔

وہ قدمچہ جہاں باندی نے بڑی تعداد میں دستوں کا ملبہ جمع کیا تھا۔ مرید کو وہاں لے کر پہنچے اور فرمایا۔

"یہ آپ کا معشوق ہے۔ یہ جو نجاست ہے۔ اسے احتیاط سے لے جاکر اپنے حجرے میں صندوق میں رکھئے' اس لئے کہ جب تک یہ باندی کے اندر تھا' آپ کو محبت تھی۔ جب یہ نکل گیا۔ آپ کو نفرت پیدا ہوگئی ___ معلوم ہوا کہ آپ کو باندی سے محبت نہیں تھی۔ اس گندگی سے آپ کو محبت تھی۔ اس لئے اسے اٹھا کر لے جایئے۔ یہ آپ کا محبوب ہے۔"

حقیقت میں شیخ نے بتلایا کہ صورتوں کا عشق درحقیقت گندگی کا عشق ہے۔

عشق سیرت

اصل عشق' سیرت کا عشق ہے جو پائیدار عشق ہے وہ وہی ہے جس سے محبت کرنی سکھلائی گئی ہے۔

آج ہمیں اور آپ کو امام ابوحنیفہ سے محبت ہے' امام شافعی سے' امام احمد بن حنبل سے' امام بخاری اور امام ترمذی سے' حضرت جنید اور حضرت شبلی سے اور تمام اولیاء اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے ان کی محبت کو جزو ایمان جانتے ہیں' ان سے محبت کرنے کو اپنی نجات سمجھتے ہیں۔ کیا یہ محبت ان کی صورتوں سے ہے؟ ہم نے تو آج تک ان کی صورت دیکھی بھی نہیں۔ یہ کاہے سے محبت ہے ___ ان کی سیرت اور ان کے کمالات سے محبت ہے۔ اور اتنی پائیدار محبت ہے کہ نہ آج تک ہم نے ان کی شکل دیکھی۔ مگر دل میں قائم ہے ___ اور اتنی شدید محبت کہ اگر ان بزرگوں کی شان میں کوئی ادنیٰ گستاخی کرے تو ہم اس کا منہ توڑنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ برداشت نہیں کرتے۔

یہ ان کی سیرت کی محبت ہے' ان کی صورت کی محبت نہیں ہے۔

سیرت کی سرداری

امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ' عطا ابن ابی رباح رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت جو جلیل القدر تابعی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ :

مارایت افضل من عطاء بن ابی رباح

میں نے عطاء بن ابی رباح سے زیادہ عالم اور افضل شخصیت نہیں دیکھی۔

یعنی عطاء بن ابی رباحؒ اپنے دور میں بڑی زبردست شخصیت' بڑی علم والی شخصیت ہیں ___ امام ابو حنیفہؒ کی شہادت کی وجہ سے سب سے زیادہ افضل ہیں۔

اور خود عطاء بن ابی رباح کیسے ہیں؟

ایک حبشی غلام ہیں۔ کالی صورت ہے۔ موٹے موٹے ہونٹ ہیں' کرنجی آنکھیں ہیں۔ کوئی زیبا صورت

نہیں۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ افضل دنیا میں نہیں دیکھا۔ یہ افضلیت صورت کے لحاظ سے نہیں تھی، سیرت کے لحاظ سے تھی، امام ابو حنیفہؒ ان کی صورت کو نہیں سراہ رہے تھے ان کی سیرت کو پیش کررہے تھے، آج اگر حضرت بلال حبشیؓ کا نام آجائے تو رضی اللہ عنہ کہہ کر آپ عقیدت اور نیاز مندی سے گردن جھکا دیتے ہیں، حالانکہ بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی صورت کالے رنگ کی تھی، موٹے موٹے ہونٹ تھے جیسے حبشیوں کی صورت ہوتی ہے۔ مگر صورت حال یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ:

یا سیدنا ومولانا

بلال ہمارے سردار اور ہمارے آقا ہیں۔

یہ کاہے کی آقائی اور سرداری تھی۔ یہ صورت کی سرداری نہیں تھی بلکہ سیرت کی سرداری تھی۔

صورت سبب فتنہ اور سیرت ذریعۂ نجات ہے

اگر غور کیا جائے تو فتنوں میں مبتلا کرنے والی چیز انسان کی صورت ہے۔ سیرت فتنے میں مبتلا نہیں کرتی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی صورت اور ان کے حسن و جمال میں آپ کو کلام تو نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے ان کے حسن و جمال کی شہادت دی ہے۔ اسی طرح حدیث نبویؐ نے ان کے حسن و جمال کی شہادت دی۔ فرمایا گیا کہ:

"جب اللہ نے حسن پیدا کیا۔ آدھا حسن دنیا کو تقسیم کیا، آدھا حسن تنہا یوسف علیہ السلام کو عطا کیا"۔

اتنی زبردست حسین و جمیل شخصیت کہ قرآن و حدیث نے شہادت دی لیکن جہاں بھی فتنوں میں مبتلا ہوئے صورت نے مبتلا کیا۔ کنعان کے کنویں میں گرائے گئے تو صورت نے مبتلا کیا۔ مصر کے بازار میں غلام بنا کر بیچے گئے تو صورت نے مبتلا کیا، اور مصر کے جیل خانے میں رہے تو صورت کی وجہ سے قید رہے تو صورت زیبا نے ہر جگہ آفات میں مبتلا کیا۔

لیکن مصر کی حکومت لینے کا وقت آیا، مصر کے بادشاہ بنے اور سلطنت مانگی تو فرماتے ہیں:

اِجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ

مجھے یہ خزانے سپرد کردو۔ میں ملک کا نظم کرسکتا ہوں۔ کیوں؟

دلیل میں یہ نہیں کہا کہ **انی حسین جمیل** اس واسطے کہ میں بڑا خوبصورت ہوں، ملک کا انتظام کروں گا۔ یہ فرمایا کہ **انی حفیظ علیم** میرے اندر ملک کی نگہداشت کا مادہ موجود ہے، میں ملک کا نظم کرسکتا ہوں۔ جب سلطنت ملنے کا وقت آیا تو حسن صورت نے کام نہیں دیا، حسن سیرت سامنے آیا اور جب فتنے میں مبتلا ہوئے تو حسن صورت سامنے آیا، حسن سیرت سامنے نہیں آیا۔

معیار شرافت

آدمی اگر مبتلا ہوتا ہے تو صورت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ سیرت کی وجہ سے کوئی مبتلا نہیں ہوا۔ سیرت تو عظمت والی چیز ہوتی ہے ___ بہرحال انسان کے لئے وجہ شرافت نہ اس کا مادہ بن سکتا ہے نہ اس کی صورت

بن سکتی ہے۔ اور بھلا لباس تو کیا ہی بنتا؟ لباس صورت سے بھی زائد چیز ہے۔ جب انسان کے جوہر میں کوئی کمال نہیں۔ انسان کی صورت میں کوئی خاص کمال شرافت کا نہیں ہے اور ہے تو وہ زائل ہونے والی چیز ہے تو لباس تو اس سے بھی عارضی چیز ہے ___ اگر کوئی لباس پر فخر کرنے لگے اور اپنی شرافت اس سے بیان کرے اس سے زیادہ احمق کوئی نہیں۔ اس لئے کہ لباس تو وہ خود ہی رات کو اتار کے رکھ دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صبح کو شریف اور رات کو رذیل۔ یہ شرافت کس قسم کی ہوئی کہ اسے اپنے ہاتھ سے آدمی کھودے؟

جو لوگ اپنی شرافت کو لباس سے ثابت کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت سمجھے ہی نہیں کہ شرافت کسے کہتے ہیں ___ غرض انسانی شرافت کا تعلق لباس سے نہیں ہے۔

معیار کمال

سقراط کا واقعہ مشہور ہے۔ یہ ایک بہت بڑا یونانی حکیم بھی ہے' اور مجرب بھی ہے ___ فن طب کا موجد اور بڑا امام سمجھا جاتا ہے' اس نے بڑے بڑے تجربات کئے ہیں۔ رات دن جنگلوں اور پہاڑوں میں جڑی بوٹیوں کا امتحان کرتے ہوئے مارا مارا پھرتا تھا۔ اس طرح سے اس نے جڑی بوٹیوں کی خاصیتیں کتابوں کے اندر مدوّن اور مرتب کیں ___ ایک دن جڑی بوٹیوں کے امتحان میں جنگلوں اور پہاڑوں میں تمام دن لگ گیا اور شام کے وقت شہر میں آیا' تھک کے چور ہو گیا تھا ___ ایک سڑک کے قریب کسی بچ پر بیٹھا تو نیند نے غلبہ کیا' نیند آگئی۔ پیر اس کے سڑک پر لٹک گئے' اتفاق سے بادشاہ وقت کی سواری نکلی نقیب اور چوبدار ہٹو بچو کی صدائیں لگاتے ہوئے آرہے تھے' مگر یہ سقراط بے چارہ کب کا تھکا ہوا تھا' نہ اس کے کان میں ہٹو بچو کی آواز آئی' نہ کسی نقیب کی آواز نے اس کے کانوں کو کھٹکھٹایا۔ پڑا ہوا سوتا رہا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کی سواری قریب آگئی۔ بادشاہ کو بڑا غصہ آیا کہ میں سواری پر سوار جا رہا ہوں اور اس کی ٹانگیں سڑک کے اوپر پڑی ہوئی ہیں۔ بادشاہ نے غصے میں آکر سواری سے اتر کر اسے لات سے ٹھوکر ماری اور کہا کہ۔

"او احمق ___ ! اٹھتا نہیں ہے؟

وہ بے چارہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور بادشاہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ بادشاہ نے کہا ___ "احمق! تو جانتا نہیں ہے کہ میں کون ہوں؟"

اس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا کہ جی ہاں! میں اسی پر تو غور کر رہا ہوں کہ آپ کون ہیں؟ اور اب تک میں اس نتیجے پر تو پہنچ چکا ہوں کہ شاید آپ جنگل کے کوئی درندے معلوم ہوتے ہیں۔

اس واسطے کہ درندوں کی عادت ہے کہ وہ زمین پر پیر مارتے ہوئے دھول اڑاتے ہوئے چلا کرتے ہیں۔ آپ نے چونکہ ٹھوکر ماری تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاید جنگل کا کوئی درندہ آگیا ہے ___ بادشاہ کو بڑا غصہ آیا اور کہا کہ

> "جاہل! احمق! تو نہیں جانتا کہ میں بادشاہ وقت ہوں اتنے قلعے میرے قبضے میں ہیں۔ قباء شاہی میرے ہاتھ میں' تاج شاہی میرے سر پر ہے' اتنے خزانوں کا مالک ہوں"۔

اور اس نے اپنی نعمتیں شمار کروائیں۔

سقراط نے کہا کہ :

اے احمق! تو نے جتنی چیزیں اپنی بڑائی اور بزرگی میں پیش کیں۔ قلعوں کو پیش کیا' دولت کو پیش کیا' تاج کو پیش کیا' قباء شاہی کو پیش کیا ___ یہ ساری چیزیں تو تجھ سے باہر باہر کی ہیں ___ تیرے اندر کون سا

کمال ہے جس پر تو فخر کرے۔ یہ باہر باہر کی چیزیں ہیں۔ تاج اگر اچھا ہے تو اپنی ذات سے اچھا ہے۔ تجھے اس سے کیا شرف ملا۔ اور قبا اگر خوشنما لگ رہی ہے تو یہ کپڑے کی خوبی ہے۔ تیری ذات کی اس میں کیا خوبی ہے۔ تو نے اپنی ذات کی خوبیاں بیان کرنے کے لئے باہر کی چیزیں پیش کیں۔ جن کا تیری ذات میں کوئی دخل نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تیری شرافت باہر باہر کی ہے۔ تیری ذات کے اندر کچھ نہیں"۔

وہ جو مثل مشہور ہے' اور نحوی لکھا کرتے ہیں کہ سیبویہ اپنے زمانہ طالب علمی میں جب پڑھتا تھا تو اس نے بہت سی یادداشتیں مرتب کر رکھیں تھیں' استاد سے سنی ہوئی تقریریں اور اپنے مطالعے کی یادداشتیں اور کچھ سوالات وغیرہ ___ غرض بہت سے کاغذات کا ایک پلندہ لکھ رکھا تھا جسے یاد کرتا تھا۔

جب کھانے کا وقت آیا تو اس نے وہ پلندہ لپیٹ کر دستر خوان میں باندھ لیا۔ اس میں ایک آدھ روٹی بھی تھی ___ اتفاق سے کتا آیا اور وہ سارا دستر خوان بندھا ہوا لے کر چلتا بنا ___ یہ سیبویہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہے ہاتھ ہی نہیں آتا تھا۔ اور کتا بھی کم بخت کچھ ایسا سرکش تھا کہ وہ آگے ہی کو چلا جا رہا ہے پیچھے کو دیکھتا ہی نہیں ___ اور یہ اس کے پیچھے۔

لوگوں نے کہا کہ بڑا احمق ہے کہ روٹی دو روٹی ہوگی۔ کتا لے گیا تو لے جانے دے۔ اب لاٹھی لے کر پیچھے دوڑ رہا ہے۔ اپنی طاقت خرچ کر رہا ہے تو وہ روٹی کھانے سے اتنی طاقت آئے گی نہیں جتنی پیچھے بھاگنے میں خرچ کر ڈالی۔ لوگوں نے کہا کہ بے وقوف واقع ہوا ہے۔

سیبویہ نے کہا :

> "بے وقوف تو تم ہو۔ میں روٹی کی وجہ سے نہیں دوڑ رہا۔ بلکہ دستر خوان میں میرا سارا علم تھا جو کتا لے بھاگا۔ میں جاہل کا جاہل رہ گیا"۔

"احمق! وہ علم ہی کیا ہوا جسے کتا ساتھ لے جائے۔"

تو حقیقت میں بادشاہ نے اپنی فضیلت تاج اور قبا میں بیان کی۔ یہ ساری چیزیں وہ تھیں کہ اگر کوئی دشمن یا غنیم آئے' تاج چھین لے' قلعے چھین لے' تو بادشاہ کی شرافت ختم ہو گئی' شرافت تو وہ ہے کہ آدمی زمین کے اوپر رہے جب بھی باکمال ہو اور اگر زمین کی تہہ میں اتار دو جب بھی باکمال ہو۔ کمال اسے کہتے ہیں۔ نہ یہ کہ ادھر جاؤ تو باکمال اور ادھر کا رخ کر لو تو بے کمال۔ یہ کمال نہیں کہلاتا۔ کمال اپنی ذات کے اندر ہونا چاہئے۔ اپنے اندر جوہر ہونا چاہئے۔ یہ فی الحقیقت کمال ہے۔

مرکز محنت

مولانا رومی قدس اللہ سرہ نے ایک تمثیلی حکایت نقل کی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ واقعہ بھی ہو۔ تمثیل نہ ہو۔ وہ یہ کہ ایک دفعہ رومیوں اور چینیوں میں باہم جھگڑا ہوا۔ دونوں آپس میں لڑے' چینیوں نے کہا ہم زیادہ باکمال ہیں' زیادہ صناع ہیں' زیادہ دستکار ہیں ___ رومیوں نے کہا کہ ہم زیادہ صناع ہیں۔ ہم زیادہ دست کار ہیں ___ ہم زیادہ کاریگر ہیں۔ دونوں میں جھگڑا ہوا دعوے دونوں طرف سے تھے یہاں تک کہ قریب تھا کہ جنگ ہو جائے ___ لوگوں نے کہا کہ بھئی! باہم لڑتے کیوں ہو؟ کسی کو ثالث اور حکم بنالو' تو مقدمہ بادشاہ وقت کے پاس گیا کہ دو قومیں لڑ رہی ہیں۔ دعویٰ دونوں کا ایک ہے۔ ایک قوم کہتی ہے کہ ہم زیادہ باکمال ہیں ___ دوسری کہتی ہے کہ ہم زیادہ باکمال ہیں ___ چینیوں نے کہا کہ حکمت ہمارے ہاتھ پر اتری ہے۔ اور رومیوں نے کہا کہ ہمارے ہاتھ پر اتری ہے۔ بادشاہ نے کہا' دعوؤں سے کام نہیں چلتا۔ دونوں اپنی اپنی صنعت کے

نمونے دکھلاؤ۔ اسے دیکھ کر ہم فیصلہ کریں گے کہ کون زیادہ باکمال ہے۔ اور تجویز یہ دی کہ ایک ہال بنایا گیا اور اس میں پارٹیشن کردیا گیا۔ تقسیم کر کے ایک پردے کی دیوار کردی گئی اور دونوں قوموں سے کہا گیا کہ آدھے مکان میں تم اپنی صناعی دکھاؤ۔ آدھے مکان میں تم دستکاری دکھلاؤ۔ بیچ میں سے پردہ ہٹا کر پھر ہم موازنہ کریں گے کہ کس کی صناعی اور دستکاری بڑھی ہوئی ہے۔

چنانچہ دونوں قوموں نے اپنی کاریگری کا کام شروع کیا تو چینیوں نے دیوار پر پلاستر کر کے دیوار پر نقش ونگار بنانے شروع کئے اور رنگ برنگ کے پھول اور بوٹے بنائے۔ تو دیوار کو باغ وبہار بنادیا۔ کوئی بوٹا نہیں چھوڑا جو اس میں بنایا نہ گیا ہو۔ کوئی پھول اور پتی نہیں چھوڑی جو اس میں نہ بنائی گئی ہو۔ کوئی رنگ نہیں چھوڑا جو دیوار میں لگایا نہ ہو۔ تو پوری دیوار کو گلزار بنادیا کہ دیکھنے والے کی نگاہ دیوار میں اثر کرنا چاہتی ہے۔ مگر آدمی کی نگاہ اس کی خوبصورتی کی وجہ سے نہیں ہٹ سکتی ــــ یہ کاریگری تو چینیوں نے دکھلائی۔

اور رومیوں نے کیا کاریگری دکھلائی؟

انہوں نے آدھے کمرے میں پلاستر کر کے اس کو صیقل کرنا شروع کیا' اور مانجھنا شروع کیا۔ مانجھتے مانجھتے اتنا چمکدار بنادیا کہ دیواریں آئینہ بن گئیں کہ اس میں صورت نظر آنے لگی ــــ بالکل چمکا کر آئینہ کردیا۔ نہ ایک نقش بنایا' نہ ایک بوٹا بنایا نہ ایک پھول۔ بلکہ صیقل کر کے آئینہ کردیا۔ جو سامنے کھڑا ہوتا۔ اس کی تصویر نظر آتی ہے۔

جب دونوں اپنی کاریگری سے فارغ ہوگئے تو بادشاہ کو اطلاع دی گئی' بادشاہ نے حکم دیا کہ پردے کی دیوار ہٹادی جائے تاکہ موازنہ کریں ــــ پردہ کی دیوار کا ہٹنا تھا کہ چینیوں نے جتنے نقش ونگار بنائے تھے دوسری طرف نظر آنے لگے' اس لئے کہ دیواریں تو آئینہ ہوگئی تھیں۔ وہ سارے پھول ادھر نظر آرہے ہیں ــــ اب بادشاہ حیران ہے کہ جو بیل بوٹا اُدھر ہے وہی اِدھر ہے۔ جو رنگ ادھر ہے وہی ادھر ہے۔ جو نقش ونگار ادھر ہے وہی ادھر ہیں۔ اب وہ حیران ہے کہ فیصلہ کس کے موافق دوں اور کس کے خلاف دوں؟

آخر رومیوں کے حق میں فیصلہ دیا کہ رومی اپنی صنعت میں بڑھ گئے کیوں کہ انہوں نے اپنی صنعت تو دکھلائی تھی' دوسروں کی صنعت بھی چھین لی۔ یہاں بیل بوٹے ہیں اور چمک کے ساتھ ہیں۔ وہاں فقط نقش ونگار ہیں۔ چمک دمک کچھ نہیں۔ تو اپنی صنعت دکھلائی اور دوسروں کی صنعت چھین لی۔ گویا رومیوں نے ڈبل صنعت دکھلائی اس لئے رومی بڑھ گئے۔

یہ حکایت نقل کر کے مولانا رومی قدس اللہ سرہ لکھتے ہیں کہ:

"اے عزیز! تو اپنے قلب میں چینیوں کی صنعت مت کر کہ دنیا بھر کے پھولوں اور بوٹوں کو دیکھتا پھرے۔ رومیوں کی صنعت کر کہ اپنے دل کو مانجھ کر آئینہ بنالے کہ ساری دنیا کی صنعتیں تجھے گھر بیٹھے نظر آنے لگیں' تو دنیا کے اندر نقش ونگار اور پھول پتیوں کو ٹٹولتا ہوا کہاں مصیبت کے اندر پھر رہا ہے ــــ؟ تیرے اندر تو وہ کائنات موجود ہے کہ ساری دنیا کے پھول اور پتیاں تیرے اندر موجود ہیں۔ تو دل کو مانجھ کر رومیوں کی صنعت کی طرح دل کو صیقل بنالے۔ دنیا تو تجھے وہیں بیٹھے ہوئے نظر آنے لگے گی۔"

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو وچمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ در دل بکشا بچمن درآ

تیرے پاس تو دل موجود ہے۔ اس میں اگر تو ایک دروازہ نیچے کا کھولے گا تو ساری دنیا اس میں سے تجھے

نظر آئے گی اور اگر اوپر کا دریچہ کھول دے تو عالم غیب تجھے نظر آئے گا۔ دنیا کے مشاہدات قلب میں آئیں گئے اور اوپر کے علوم قلب کے اندر آئیں گے۔ تو قلب عجیب کیمیا ہے کہ اس میں دو دریچے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک عالم غیب کی طرف اور ایک عالم شاہد کی طرف ــــ محسوسات کی صورتیں بھی قلب میں ہیں۔ مغیبات کے علوم بھی قلب کے اندر ہیں۔ تو جس انسان کو یہ چیز دی جائے وہ ان پھول پتیوں میں مبتلا ہو کے رہ جائے؟ اسے تو یہ چاہئے کہ ان دریچوں کو کھول دے تاکہ اسے ساری صورتیں نظر آئیں۔ نہ صرف یہاں کی بلکہ عالم غیب کی چیزیں بھی اس پر منکشف ہوں اور نظر آنے لگیں۔

مدار علوم

حضرت عمران بن الحصین رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں۔ بیمار ہوئے اور کمر میں پھوڑا نکلا اور اتنا شدید کہ بتیس برس تک وہ پھوڑا رہا۔ اور کیفیت یہ تھی کہ کروٹ نہیں لیتے تھے۔ چت لیٹے ہوئے ہیں۔ کھانا بھی کھا رہے ہیں تو چت لیٹ کر اور استنجاء بھی کر رہے ہیں تو چت لیٹ کر۔ نماز بھی پڑھتے ہیں تو اشاروں سے چت لیٹ کر پڑھتے ہیں۔ نہ اٹھ سکتے ہیں نہ بیٹھ سکتے ہیں۔ نہ کروٹ بدل سکتے ہیں اور بتیس برس کامل اس حالت میں گزرے ہیں۔ اندازہ کیجئے کتنی عظیم تکلیف ہوگی؟ کتنی عظیم اذیت ہوگی؟

مگر اس تکلیف کے باوجود چہرہ دیکھا جاتا تھا تو نہایت بشاش کہ تندرستوں کے چہروں پر وہ رونق نہ ہو۔ جو حضرت عمران بن الحصین رضی اللہ عنہ کے چہرے مبارک پر تھی۔ نہایت ہشاش بشاش اور کھلا ہوا چہرہ۔

لوگوں نے عرض کیا کہ :

”حضرت! بیماری تو اتنی شدید کہ اذیت کی کوئی انتہا نہیں بیٹھ نہیں سکتے، اٹھ نہیں سکتے۔ اور آپ کی بشاشت کی کیفیت یہ کہ کسی تندرست کا چہرہ بھی اتنا شاداب نہیں ہو سکتا جتنا آپ کا ہے؟“۔

فرمایا ”ہاں!

”اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ نے مجھے یہ تکلیف دی تو میں نے بجائے جزع فزع کرنے کے اور بجائے اللہ کا شکوہ کرنے کے صبر اور تحمل سے کام لیا اور کہا کہ

اے اللہ! تیرا شکر ہے۔ جس حالت میں تو رکھے میں اس حالت پر راضی ہوں ــــ تو میں نے اس تکلیف پر رضا اور تسلیم کا اظہار کیا اور اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا اور صبر سے کام لیا۔ نہ صرف صبر بلکہ شکر بھی کیا ــــ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں بتیس برس سے روزانہ اس بستر کے اوپر ملائکہ سے مصافحے کرتا ہوں۔ عالم غیب میرے اوپر منکشف ہے۔ رجال غیب میرے سامنے آتے ہیں۔ ملائکہ کی آمد و رفت میرے سامنے ہے۔ اگرچہ میں نے ارادے سے مجاہدہ نہیں کیا یہ تقدیری مجاہدہ ہے۔ جو اللہ نے مجھے دیا۔ تو یہ ہے تو اضطراری مجاہدہ ــــ مگر میں نے اس مجاہدے کو قبول کر کے صبر کیا۔ اس مجاہدے کی برکت سے اللہ نے میرے قلب کے دروازے کھول دیئے، مجھ پر عالم غیب منکشف ہوا، اور میں ملائکہ سے مصافحے کرتا ہوں“۔

جس انسان کو یہ کائنات دی جائے، اگر وہ ارادی مجاہدے کرے۔ سبحان اللہ! اور اگر اضطراری مجاہدہ ہو تو اس پر صبر اور تسلیم اختیار کرے۔ تو اس پر غیبی چیزیں منکشف ہو جاتی ہیں۔ تو جس کے اندر ایسی آنکھ دی گئی

ہے کہ دنیا ہی میں بیٹھے بیٹھے وہ آخرت کی چیزیں دیکھے۔ اس کے لئے کیا مصیبت ہے کہ وہ پھول پتیوں میں الجھا ہوا پھرے۔ یہ ساری پھول پتیاں اس کے اندر موجود ہیں۔

معیت اہل حق سے انکشاف حقائق

نیز اہل اللہ اور کاملین جب اپنے کمالات' اپنے مجاہدات اور ریاضات سے اونچے مقامات پر پہنچتے ہیں تو ان کے قلب کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں ___ اور وہ تو وہ ___ جو ان کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں ان کے لئے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ وہ فائز المرام بن جاتے ہیں۔

میں نے اپنے بزرگوں سے ایک واقعہ سنا اور اس کے روایت کرنے والے مولانا منصور علی خان صاحب رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ مراد آباد کے علماء میں سے ہیں اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ جو دارالعلوم دیوبند (انڈیا) کے بانی ہیں۔ جن کا نام نامی ابھی آپ نے سنا ___ تو مولانا منصور علی خان صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے خود مجھے اپنا واقعہ سنایا۔ کوئی راوی بھی بیچ میں نہیں ___ فرمایا کہ :

"جب میں دارالعلوم میں طالب علمی کے زمانے میں مقیم تھا اور دارالعلوم کی بالکل ابتدا تھی۔ ابھی قائم ہی ہوا تھا اور حضرت نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ سے میں پڑھتا تھا ___ فرماتے تھے کہ ___ طلباء میں ایک نوجوان لڑکا بہت ہی حسین اور خوبصورت تھا اس سے ان کی آنکھ لڑ گئی۔ اور اس کا عشق ان کے قلب میں پیدا ہو گیا ___ مگر چونکہ پاک دامن اور عفیف تھے۔ اس لئے برے جذبات سے تو قلب خالی رہا مگر عشق و محبت کی وجہ سے اس میں ایک سوختگی اور ایک اضطراب اور بے چینی ہر وقت ٹھہر گئی۔ ہر وقت ایک کوفت اور ایک سوزش رہنے لگی۔ اس لڑکے کا دھیان اور تصور رہتا"۔

فرماتے تھے کہ اس کیفیت کا اتنا غلبہ ہوا کہ ایک دن میں نماز پڑھ رہا تھا کہ سجدے میں بجائے سبحان ربی الاعلیٰ کے اس لڑکے کا نام میری زبان سے نکلا اس درجہ قلب پر اس کی محبت کا غلبہ ہو گیا ___ فرماتے تھے کہ میرے دل پر صدمے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا' اس محبت نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میری دنیا گئی تھی تو گئی تھی ___ اب تو میرا دین بھی چلا۔ جب میری نمازیں ایسی ہو گئیں کہ اللہ کے نام کے بجائے غیر اللہ کا نام نکلے تو میرا دین ہی کیا باقی رہا؟

اس کی شکایت لے کر حضرت نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا کہ حضرت! یہ واقعہ ہے۔ حضرت کو پہلے سے معلوم تھا مگر فرماتے نہیں تھے۔

جب انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! اب تو میرا دین بھی ضائع ہونے لگا۔ اب میری دستگیری فرمایئے۔

حضرت نے ہنس کر فرمایا ___ یہ اصل میں پٹھان تھے۔

اے جی! مولوی منصور علی! تم تو پٹھان آدمی ہو۔ اتنے ہی میں تم گھبرا گئے ___ اور یہ دھاڑیں مار کر رو پڑے اور کہا حضرت! یہ مذاق کا وقت نہیں۔ میرا تو دین بھی چلا اور میری دنیا بھی گئی۔ آپ خدا کے لئے میرا علاج کریں۔

حضرت نے فرمایا۔ کل صبح کی نماز کے بعد جب میں مسجد سے نکلوں اور حجرے میں جانے لگوں تو میرے ساتھ میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ بولنا مت۔ میرے پاس آکر بیٹھ جانا ___ چنانچہ انہوں نے ایسے ہی کیا ___ حضرت نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ چھتے کی مسجد میں جو دارالعلوم سے بالکل ملی ہوئی ہے اور وہیں سے دارالعلوم

دیو بند کا افتتاح بھی ہوا ہے۔ اسی چھتے کی مسجد میں انار کا ایک درخت ہے۔ جو اب تک کھڑا ہوا ہے۔ اسی کے نیچے سے دار العلوم دیو بند شروع ہوا۔ ایک استاذ اور ایک شاگرد سے دار العلوم دیو بند کی ابتداء ہوئی ہے۔ استاذ کا نام ملاں محمود تھا اور شاگرد کا نام شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ تھا۔ تو چھتے کی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے دو محمودوں کے نام سے دار العلوم دیو بند کی ابتداء ہوئی۔ اسی چھتے کی مسجد میں ان تمام اکابر اہل اللہ کا اجتماع رہتا تھا۔ مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دار العلوم دیو بند کے مہتمم اول ہوئے ہیں۔ اور نقشبندیہ خاندان کے بزرگ تھے۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دار العلوم دیو بند کے بانی ہیں۔ یہ چشتی تھے ___ اور ہماری پوری جماعت پر چشتیت ہی غالب ہے اور سلسلہ ہمارا چشتیہ ہے۔ گو ہمارے اکابر چاروں سلسلوں میں بیعت کرتے ہیں۔ اور چاروں سلسلوں میں تربیت بھی کرتے ہیں۔ جس کو جس سلسلے سے مناسبت ہو' اسی میں بیعت و تلقین کی جاتی ہے ___ تو جامع الطرق ہیں مگر چشتیت کا غلبہ ہے۔ اور اصل سلسلہ ہم لوگوں کا چشتی ہے۔ یہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری چشتی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ ان سے لے کر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ تک اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تک اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔

غرض' حضرت نانوتوی رحمہ اللہ علیہ چشتیہ خاندان کے اکابر میں سے ہیں۔

تو مولانا منصور علی خان کو فرمایا کہ کل جب میں صبح کی نماز پڑھ کر حجرے میں جانے لگوں تو میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ مگر بولنا کچھ نہیں۔ چنانچہ حضرت جب نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے یہ ساتھ ہو لئے ___ اور مولانا منصور علی خان مجھ سے کہتے تھے' میں نے اس دن حضرت کی آنکھوں میں سرخی اور کچھ غیر معمولی ہیبت دیکھی جس سے میری ٹانگیں لرز رہی تھیں اور مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔

حضرت حجرے میں گئے اور میں بھی حجرے میں چلا گیا اور میں نے کواڑ بند کر دیئے۔

فرماتے تھے جب حضرت جا کر بیٹھ گئے ___ اور میں سامنے مؤدب بیٹھ گیا ___ میرے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا اور میرا ہاتھ پکڑا ___ فرماتے تھے میں نے اپنا داہنا ہاتھ حضرت کے ہاتھ میں دیا تو حضرت نے میرا داہنا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ کے اوپر رکھ دیا اور اپنا داہنا ہاتھ میرے داہنے ہاتھ پر آہستہ آہستہ پھیرنا شروع کیا جیسے کوئی رسی یا بان بٹا کرتا ہے۔

مولانا منصور علی خان مجھ سے فرماتے تھے :

میں تم سے حلف شرعی کر کے اور اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ جب تک حضرت میرے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ پورے آسمان اور زمین کی چیزیں مجھ پر روشن تھیں۔ ملائکہ کی آمد و رفت مجھے نظر آرہی تھی۔ چڑھ رہے ہیں اور اتر رہے ہیں۔ گویا پورا عالم غیب مجھ پر منکشف تھا ___ یہ میری کیفیت تھی ___ اخیر میں زور سے ہاتھ پھیر کر مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اٹھ جاؤ یہاں سے۔

فرماتے تھے میں باہر آیا۔ باہر آکر جب مسجد سے باہر نکلا تو یہ سوچتا ہوں کہ کوئی چیز میرے قلب کے اندر تھی جو نکل گئی اور یہ یاد نہیں آتا کہ وہ چیز کیا تھی۔

یہ اس لڑکے کی محبت تھی مگر یہ بھی بھول گئے کہ وہ کیا چیز تھی اور سوچتے ہوئے جا رہے ہیں کہ کوئی چیز میرے قلب سے نکلی ہے جو میرے قلب میں جمی ہوئی تھی اور یہ یاد نہیں آتا کہ وہ کیا چیز تھی۔

فرماتے تھے کہ جب دار العلوم کے اس دروازے کے قریب پہنچا ہوں جو سڑک پر ہے تو وہ لڑکا نظر آیا۔ سے دیکھ کر یاد آیا کہ اچھا اس کی محبت جو قلب میں گھسی ہوئی تھی وہ ایسی نکلی کہ یہ بھی یاد نہیں آرہا کہ وہ

قلب کے اندر تھی بھی یا نہیں۔

تو میں عرض کرتا ہوں کہ اللہ کا رسولؐ اور رسولؐ کے صحابیؓ تو بہت اونچی شخصیتیں ہیں۔ بہت بالاتر ہیں۔ ان کے غلاموں اور خدّام کو یہ کیفیت دی گئی ہے کہ اگر وہ کسی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیں تو اس پر غیبی چیزیں منکشف ہونے لگتی ہیں ___ اللہ نے انسان کو دل ایک ایسی کائنات عطا کی ہے اگر انسان دل کو سنوار لے' تو شاہد ہی نہیں بلکہ غیوب کی چیزیں بھی اس کے سامنے آتی ہیں۔ بڑے بڑے علوم اس پر منکشف ہوتے ہیں۔

مرکز تجلیات ربانی

اسی واسطے فرمایا گیا ہے کہ قلب فی الحقیقت "عرش الرحمٰن" ہے۔ دنیا کے اندر عرش عظیم کی کوئی تمثال موجود ہے' اور عرش کا کوئی نمونہ موجود ہے تو وہ انسان کا قلب ہے۔ جس میں تجلیات ربانی اترتی ہیں۔ انسان کے ہاتھ پر تجلیات نہیں اترتیں۔ انسان کے دماغ پر تجلیات نہیں اترتیں۔ تجلیات ربانی کا اگر مرکز ہے تو وہ قلب ہے۔ اس لئے کہ "عرش الرحمٰن" ہے تو کائنات آفاق میں عرش عظیم وہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت مستوی ہے۔ جس کو فرمایا گیا :

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى

اور کائنات النفس میں عرش عظیم انسان کا قلب ہے جس پر رحمٰن کی تجلیات آتی ہیں۔ تو جس انسان کو قلب جیسی دولت دی جائے جس کے اندر غائب و شاہد کے سارے نقش و نگار ہوں اسے کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ دنیا کے نقش و نگار میں گھومتا پھرے کہ۔

تو طفلی و خانہ رنگین است

اس کو ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لئے یہ موقع نہیں ہے۔ اس کا تو کام یہ ہے کہ رومیوں کی صنعت انجام دے۔ اور اپنے دل کو صیقل کرے۔ ساری چیزیں خود بخود نظر آئیں گی۔

سیرت انسانی کا جوہر اول

اور پھر جب اس میں چیزیں منکشف ہو جائیں گی' اور علم و معرفت کا کمال پیدا ہو جائے گا تو کہا جائے گا کہ اب اس میں انسانیت آئی ہے۔ اب اس کے لئے شرافت کا راستہ کھلے گا ___ تو انسان نہ اپنے مادے سے افضل بنتا ہے نہ اپنی صورت سے افضل بنتا ہے' نہ اپنے لباس سے افضل بنتا ہے۔ بنتا ہے تو اپنے دل سے افضل بنتا ہے۔ اور دل کب افضل بنتا ہے ___ اس وقت افضل بنتا ہے۔ جب عرش الرحمٰن بن جائے' اور اللہ تعالیٰ کی علمی تجلیات اس پر آنے لگیں۔ اللہ کی معرفت اس کے اندر اتر جائے۔ تب کہا جائے گا کہ اب انسان حقیقی معنی میں انسان بنا ہے۔

تو صورت سے آدمی' آدمی نہیں بنتا۔ سیرت سے بنتا ہے اور سیرت کا پہلا رکن علم ہے۔ اگر علم نہیں بلکہ قلب میں جہالت پڑی ہوئی ہے تو سیرت کا ابتدائی زینہ طے نہیں ہوا۔ غرض سیرت انسانی کا پہلا رکن یہ ہے کہ اس کے اندر علم ہو ___ جہالت سے سیرت نہیں بنتی' علم سے سیرت بنتی ہے۔ بے بصیرتی سے سیرت نہیں بنتی' بصیرت سے بنتی ہے۔ اور بصیرت کا مرکز انسان کا قلب ہے۔ علم و معرفت کا مرکز انسان کا قلب ہے۔ تو جب آدمی رومیوں کی صنعت جاری کرتا ہے تو یہ انسان کی سیرت کا ابتدائی زینہ ہے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

الناس کلهم هالکون الا العالمون

سارے انسان ہلاک ہونے والے ہیں۔ سارے انسان تباہ و برباد ہیں۔ اگر بچنے والے ہیں تو اہل علم ہیں جو بچیں گے۔

تو انسان کے معنی کیا ہیں؟ مادے کے لحاظ سے انسان' صورت کے لحاظ سے انسان' لباس کے لحاظ سے انسان؟ فرماتے ہیں' ان میں سے کوئی چیز نجات دینے والی نہیں ہے۔ خوبصورتی نجات نہیں دلائے گی۔ یہ گندے مادے نجات نہیں دلائیں گے' یہ فاخرہ لباس نجات نہیں دلائیں گے اگر نجات دلانے والی چیز ہے تو علم ہے۔ جس سے انسان حق و باطل کو پہچانے صحیح اور غیر صحیح میں فرق کرے' جائز و ناجائز کا امتیاز کرے ___ اگر اس میں یہ امتیاز نہیں اور حلال و حرام کی تمیز نہیں۔ کھانا جانتا ہے مگر حلال و حرام کو نہیں جانتا' پہننا جانتا ہے مگر حرام و حلال کو نہیں جانتا' پھر بیل میں اور انسان میں کیا فرق ہے؟

بیل بھی کھانا جانتا ہے مگر جائز و ناجائز کو نہیں جانتا۔ بیل بھی تو مکان چاہتا ہے کہ جس میں رہے' مگر حلال و حرام کو نہیں جانتا۔ غیر کا مکان ہو جب بھی آجائے گا۔ اپنے مالک کا مکان ہو جب بھی کھڑا ہو جائے گا۔ اپنے مالک کا کھیت ہو جب بھی منہ مارے گا۔ اور غیر کا کھیت ہو جب بھی منہ مارے گا۔ اسے جائز و ناجائز کی تمیز نہیں ___ آخر بیل ہی تو ٹھہرا ___ اگر انسان میں بھی جائز و ناجائز کی تمیز نہ ہو' حلال و حرام کا امتیاز نہ ہو' تو بیل اور انسان میں کوئی فرق نہیں۔ حیوانیت محضہ ہے۔ تو انسان' انسان جب بنتا ہے کہ جب اس کے اندر علم آجائے۔

علم ضروری کی مقدار

اور علم بھی وہ کہ وہ محض دانستن کا نام علم نہیں' محض جان لینے کا نام علم نہیں۔ اس لئے کہ تھوڑا بہت علم تو بیل کو بھی ہے۔ وہ بھی تو جانتا ہے کہ یہ میرا مالک ہے۔ یہ نہیں' یہ مجھے گھاس دانہ ڈالتا ہے' یہ نہیں ڈالتا۔ اس کے آگے گردن جھکا دیتا ہے۔ دوسرے کے آگے نہیں ___ اتنا علم تو کتا بھی رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ میرا مالک ہے' اس کے آگے دم ہلانے لگتا ہے۔ اور غیر آجائے اس پر حملہ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ تو وہ فرق محسوس کرتا ہے کہ یہ مکان کا مالک ہے اور یہ نہیں۔ اسے مکان میں آنے کا حق ہے اور اجنبی کو نہیں ___ ہاں اگر مالک کتے کو ڈانٹ دے' تو چپکا ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مالک نے اجازت دے دی تو اس کے آنے کا حق پیدا ہو گیا۔

ہمارے حاجی محمد شفیع صاحب جن کی کوٹھی پر ہم ٹھہرے ہوئے ہیں' انہوں نے بڑی زبردست قسم کا جنگلی کتا پال رکھا ہے۔ اگر اسے آزاد چھوڑ دیں تو صرف حملہ نہیں کرتا بلکہ وہ تو ایک دم گلا دبا دیتا ہے۔ کوئی بھی آئے اس نے بھونکنا شروع کیا لیکن حاجی صاحب جب ایک ڈانٹ لگاتے ہیں تو چاہے دس آدمیوں کے ساتھ آئیں چپکا ہو کے بیٹھ جاتا ہے ___ معلوم ہوا کہ وہ جانتا ہے کہ مکان ان کا نہیں' مالک کا ہے۔ مالک اجازت دے گا تو آنے کا حق حاصل ہے۔ نہیں اجازت دے گا تو آنے کا حق حاصل نہیں ___ غرض اتنا تھوڑا بہت علم تو کتا بھی رکھتا ہے۔ اتنا علم اگر انسان میں آئے تو اتنا علم حیوانیت کے لئے بھی ہے۔ حقیقی علم وہ ہے جس سے انسان حلال و حرام کو پہچانے' حق ناحق کو پہچانے۔ جائز و ناجائز میں فرق کرے۔ یہ کام انسانی قلب کا ہے' ہاتھ پیر کا نہیں۔

قلب کا امتیازی ادراک

امام رافعی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انسان کے اندر سارے اعضاء دنیا کے ہیں۔ صرف ایک قلب ہے جو آخرت کا عضو ہے۔ اور حق وباطل میں امتیاز کرتا ہے۔ ہاتھ اگر مال لے تو جائز مال بھی ہاتھ اٹھالے گا۔ ناجائز مال کو ہاتھ ڈالیں وہ بھی ہاتھ پکڑ لے گا۔ یہ نہیں ہے کہ رشوت کا مال ہو تو ہاتھ میں کانٹے چبھنے لگیں۔ اور جائز مال ہو تو آپ لئے چلے آئیں ___ نہیں ___ جس طرح سے خوشگواری کے ساتھ پچاس ساٹھ روپے جائز ہاتھ اٹھائے گا' اگر ساٹھ ستر رشوت کے آگئے' وہ بھی اٹھالے گا۔ چوری کے آگئے وہ بھی اٹھالے گا۔ تو جائز وناجائز میں ہاتھ کو کوئی امتیاز اور تمیز نہیں۔ یہ بیچارہ محض مالیت دینے اور پکڑنے کا عادی ہے۔ حلال ہو یا حرام ___ اگر آدمی ناجائز مال کھائے تب بھی زبان کو وہی لذت آئے گی جو زبان کو جائز مال کھانے سے آئے گی۔ کیونکہ زبان کو یہ تمیز نہیں ہے کہ یہ جائز اور یہ ناجائز ہے۔ یہ حلال اور یہ حرام ہے۔

اگر آپ چلیں تو جس طرح سے آپ مسجد کی طرف چلتے ہیں۔ یہی پاؤں آپ کو شراب کی بھٹی کی طرف بھی لے جاسکتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ شراب کی بھٹی کی طرف جائیں تو پاؤں میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی' اور مسجد کی طرف جانے میں قدم ذرا جلدی اٹھیں گے ___ بلکہ مسجد کی طرف جانے میں ذرا کم اٹھتے ہیں۔ شراب کی بھٹی کی طرف جانے میں زیادہ اٹھتے ہیں ___ مگر تمیز کی وجہ سے نہیں' عادت کی وجہ سے ___ تو پیر کو کوئی جائز وناجائز کی تمیز نہیں لیکن قلب کے اندر احساس موجود ہے' جب چور چوری کا مال لے کر آئے گا تو ضمیر اس کو ملامت کرے گا کہ کم بخت! تو نے بری حرکت کی' اب چاہے نفس مانے یا نہ مانے مگر قلب اسے صحیح مشورہ دے ہی دے گا' تو انسان کا قلب آخرت کا عضو ہے۔ وہ حق اور ناحق میں تمیز چاہتا ہے۔ وہ اچھے اور برے میں امتیاز پیدا کرنا چاہتا ہے۔

اس لئے اگر اس قلب کو صاف کرلیا جائے تو پھر اللہ کی مرضی کیا ہے اور نامرضی کیا ہے؟ اس کو پہچاننے لگتا ہے۔ حق تعالیٰ کس چیز کو پسند کرتے ہیں اور کس چیز کو ناپسند کرتے ہیں ___ تو علم کا ابتدائی درجہ تمیز ہے کہ آدمی حق وباطل اور جائز وناجائز میں امتیاز کرے۔

حقیقت علم

علم کی حقیقت ہی درحقیقت تمیز ہے۔ یعنی دو چیزوں کو ممتاز کئے رکھنا۔ اگر دو چیزیں رل مل جائیں اور مشتبہ ہو جائیں تو کہیں گے کہ اس شخص کو علم نہیں ہے۔ اگر علم ہوتا تو دونوں چیزوں کو الگ الگ دیکھتا' اور دونوں چیزوں کو الگ الگ سمجھتا' تو امتیاز پیدا کردینا یہ علم کا مرتبہ ہے۔

علم الفرقان

اور یہ علم جب اونچا بنتا ہے تو اور زیادہ تمیز پیدا ہوتا ہے۔ اور علم میں کمال تقویٰ سے آتا ہے۔ جتنی تقویٰ وطہارت ہوگی' علم میں کمال پیدا ہوتا جائے گا۔

قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرنے لگو اور متقی بن جاؤ تو اللہ تم میں فرقان پیدا کردے گا''۔

فرقان ___ کے معنی اس اندرونی قوت کے ہیں جو حق وباطل میں امتیاز پیدا کردے۔ جائز کو ناجائز سے علیحدہ کردے۔ جب یہ تمیز پیدا ہو جائے تو کہا جائے گا تقویٰ کامل ہو گیا ___ تقویٰ کا اثر یہ ہے کہ انسان کا دل خود بھلائی اور برائی میں امتیاز کرنے لگتا ہے۔

ترتیب استفتاء

اسی واسطے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے :

استفت قلبک وان افتاک المفتون

''جب کوئی معاملہ پیش آئے' پہلے اپنے دل سے فتویٰ لو''۔

دل خود بتلائے گا کہ یہ بات صحیح ہے' یہ بات غلط ہے' مفتیوں کے پاس تو بعد میں لے جاؤ پہلے دل سے فتویٰ لو۔

ایک آدمی بعض اوقات چاہتا ہے کہ فتویٰ میرے مطابق ہو جائے' فتویٰ وہ ہو جس کو میرا نفس چاہتا ہے۔ تو الٹے سیدھے سوال بنا بنا کر مفتی کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اب مفتی تو جواب وہی دے گا جیسی سوال کی صورت ہوگی۔ اس نے اپنی مرضی کے مطابق جواب حاصل کرلیا اور اس پر عمل کیا۔ ظاہری طور پر آپ کہیں گے کہ بھئی! مفتی کے فتوے پر عمل کررہا ہے۔ بے چارہ معذور ہے' مگر دیانۃً معذور نہیں ہے' اللہ جانتا ہے کہ اس نے جان بوجھ کر سوال غلط بنایا تھا کہ دنیا کو دکھلانے کے لئے کہہ سکے کہ فتویٰ پر عمل کررہا ہوں۔ یہ تو اپنے نفس کے تقاضوں پر عمل کررہا ہے ___ اور جب انسان سب سے پہلے اپنے نفس سے فتویٰ لے۔ پھر مفتیوں سے فتویٰ لے' دل خود بتلائے گا کہ یہ بات صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا :

استفت قلبک وان افتاک المفتون

بہرحال انسان کے قلب کے اندر جب علم کی طاقت آتی ہے تو امتیاز پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے تو کہا جائے گا کہ انسانی سیرت کا پہلا جوہر قلب کے اندر آگیا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ انسان میں حق ناحق کا علم اور امتیاز ہو جو جانوروں کو میسر نہیں ہے۔ اس واسطے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

الناس کلھم ھالکون الا العالمون

لوگ سب کے سب برباد ہیں۔ نہ ان کا مادہ ان کو بچا سکے گا' نہ ان کی صورت ان کو بچا سکے گی' نہ ان کا لباس ان کو بچا سکے گا ___ غرض لوگ ہلاکت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اہل علم بچنے والے ہیں۔ جن کے اندر جائز و ناجائز کا امتیاز ہے۔

سیرت انسانی کا دوسرا جوہر

لیکن اگر آپ غور کریں تو علمِ محض بھی نجات دلانے کی چیز نہیں ہے' بلکہ جتنا علم زیادہ ہوگا زیادہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔

کیوں؟

اس واسطے کہ علم سے مقصد فی الحقیقت عمل ہے۔ اگر علم پر عمل مرتب نہ ہو تو کہا جائے گا کہ یہ علم لغو' بیکار اور فضول ہے۔ علم کی غرض وغایت اس کا استعمال میں لانا ہے۔ اس پر عمل کرنا ہے۔

الشئی اذا خلا عن الغایۃ لغا

جب شے اپنی غرض وغایت سے خالی ہو جاتی ہے' وہ لغو اور بیکار ہو جاتی ہے ___ گھوڑے کی غرض وغایت یہ ہے کہ اس پر سواری ہو' جب وہ سوار ہونے نہ دے اور بد کنا شروع کرے' کھانے کو سینکڑوں روپے روز کھاجائے اور جب مالک سواری کے لئے آئے دولتیاں مارنا شروع کردے' تو کہا جائے گا کہ گھوڑے کی غرض وغایت حاصل نہیں ہوئی۔ یہ گھوڑا گولی مارنے کے قابل ہے۔ حالانکہ گھوڑا موجود ہے۔ اور عمدہ شکل میں ہے۔ مگر جتنی شکل ہوگی' آقا کو اور بری معلوم ہوگی۔ جب غرض پوری نہیں ہوگی۔ غرض اس سے یہ ہے کہ سواری کا کام دے' تو جب شی اپنی غرض سے خالی ہو جاتی ہے' وہ لغو بن جاتی ہے اور گولی ماردینے کے قابل ہوتی ہے۔

اگر انسان بیوی کرتا ہے اس کی غرض وغایت یہ ہے کہ وہ گھر کی مالکہ بنے گھرستی کا کام کرے' اس کی نسل بڑھے ___ اگر وہ اتنی پھوہڑ ہو کہ گھر کو بھی تباہ کردے۔ نسل اس سے نہیں چلتی۔ تو سوائے اس کے کہ خاوند اسے طلاق دے گا یا اس کو ایک طرف بٹھا کے کوئی دوسرا نکاح کرے گا' اس کے سوا اور کیا کرے گا ___ جو اس کے نکاح کی غرض وغایت تھی' جب حاصل نہ ہوئی تو وہ لغو اور بیکار ہو گئی' کسی نے اگر بہت زیادہ دلداری کی اور ہمدردی کی' تو طلاق نہیں دے گا' کچھ روزینہ مقرر کرے گا اور کہے گا چوکی پر بیٹھ کر اللہ اللہ کرتی رہ' اس کے سوا تو کسی کام کی نہیں ہے اور دوسرا نکاح کرے گا۔ غرض جب شے اپنی غرض وغایت سے خالی ہو جاتی ہے تو لغو اور بیکار بن جاتی ہے۔ اسی طرح سے علم اگر عمل کا فائدہ نہ دے تو وہ علم لغو اور بیکار ہے وہ وبال جان بن جائے گا' اور فضول ہو جائے گا تو جب تک علم پر عمل کی غایت مرتب نہ ہو' علم بے کار ہے۔ اس سے معلوم ہوا علمِ محض انسان کو نجات نہیں دلا سکتا ___ نجات دلانے والی چیز انسان کا عمل ہے جو اس علم کے مطابق ہو۔ یہ اصل میں نجات دینے والی چیز ہے۔ اس واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

الناس کلھم ھالکون الاالعالمون

انسان سب کے سب تباہ وبرباد ہیں وہ بچیں گے جو اپنے علم پر عمل کرنے والے ہوں گے۔

تو عمل نجات کا ذریعہ ہے۔ محض کورا علم نجات کا ذریعہ نہیں ہے۔

تجمّل علم کا فتنہ

کورا علم تو تجمّل ہے۔ اور ایک ترفّع ہے ___ حدیث میں فرمایا گیا کہ اخیر زمانے میں علم تجمّل کا ذریعہ بن جائے گا' جیسے انسان اپنے کپڑوں سے زینت حاصل کرے گا' اپنی رنگت سے زینت حاصل کرے گا' اسی طرح اپنے علم سے بھی زینت حاصل کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہوگا۔ علم کو استعمال میں لا کر انسان نجات کی طرف نہیں چلے گا۔ بلکہ فخر ومباہات کا ذریعہ بنالے گا۔ تو ایسا علم انسان کے اوپر وبال جان ہے۔ اس لئے فرمایا کہ علماء بھی سب کے سب تباہ وبرباد ہیں۔ اگر اپنے علم پر عمل کرنے والے نہ ہوں۔ گویا انسانیت کی غرض وغایت علم ہے اور علم کی غرض وغایت عمل ہے' اگر علم نہیں تو انسانیت لغو ہے۔ اگر علم ہے اور عمل نہیں تو علم لغو اور بیکار ہو گیا۔ غرض علم پر عمل نجات کا ذریعہ ہے۔

سیرت انسانی کا تیسرا جوہر

لیکن اگر آپ غور کریں تو عمل بھی نجات کا ذریعہ نہیں ہے۔ اس واسطے کہ عمل ایک ڈھانچہ ہے جب تک اس کے اندر روح نہ ہو' وہ محض ایک لاش ہے اور لاش کار آمد ثابت نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی ڈھانچے میں روح موجود نہ ہو وہ اس قابل ہے کہ اسے جلد از جلد زمین میں دفن کردیا جائے۔ اگر وہ لاش یوں ہی پڑی رہے گی تو پھولے گی' پھٹے گی' بدبو پیدا ہوگی' دماغ خراب ہوں گے' تو لاش کے لئے سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اسے جلد سے جلد خاک میں ملادیا جائے' جلد سے جلد اسے دریا برد کردیا جائے ___ ورنہ دنیا کا دماغ صحیح سالم نہیں رہے گا۔

اسی طرح سے عمل ایک لاش اور ایک ڈھانچہ ہے۔ اگر اس کے اندر روح موجود ہے تو وہ اخلاص للہ کی ہے کہ وہ خالص اللہ کے لئے ہو' اس میں شرک کا شائبہ بھی نہ ہو ___ اگر اس میں شرک کا شائبہ ہے وہ عمل غیر اللہ کے لئے ہے یا وہ عمل مشترک ہے کہ کچھ اللہ کے لئے ہے کچھ غیر اللہ کے لئے ہے تو درحقیقت وہ عمل بے روح کا ایک ڈھانچہ ہے۔ اور وہ عمل سوائے اس کے کہ پھولے پھٹے' سڑے اور گلے' آخرت میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی ___ تو عمل کی روح' اخلاص للہ ہے کہ خالص اللہ کے لئے ہو' اس میں غیر کی رضا کی آمیزش نہ ہو۔

رضائے خلق کا طریق

بلکہ غیر بھی ... ن راضی ہوگا' جب اس کی رضا پیش نظر ہو ___ کیونکہ جب اللہ کی رضا پیش نظر ہوگی' اغیار بھی راضی ہوں گے ___ اور اگر صرف غیروں کے راضی کرنے کی فکر کرو گے نہ وہ راضی ہوں گے نہ اللہ راضی ہوگا۔ تو کوئی بھی راضی نہ ہوا اور خدا کو راضی کرنے کی فکر کی تو غیر بھی راضی ہوجائے گا' انسان بھی راضی ہوجائے گا۔ انسان ہی نہیں بلکہ حیوان بھی راضی ہوجائے گا' نباتات بھی راضی ہوں گے۔ جمادات بھی راضی ہوجائیں گے۔

من کان للہ کان اللہ لہ

جو اللہ کا ہوجاتا ہے اللہ اس کا ہوجاتا ہے ___ جس کا اللہ ہوجائے ساری کائنات اس کی ہوجاتی ہے' اس سے سرتابی نہیں کرسکتی تو ؎

تو از حکم داور گردن مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

تیرا کام یہ ہے کہ مالک کے حکم سے گردن مت پھیر' اگر تو نہ پھرا تو ساری گردنیں تیرے آگے جھک جائیں گی۔ اور اگر تو نے مالک سے گردن پھیر لی تو ساری گردنیں تیرے سے الگ ہوجائیں گی اور اکڑ جائیں گی ___ بہرحال اللہ کو راضی کرے گا تو مخلوق خود بخود راضی ہوجائے گی' اور وہ راضی نہ ہوئے تو کوئی بھی راضی نہیں ہوگا۔ اس "ایک" کو آدمی پکڑ لے۔

مالک کی نگاہ کی عظمت

ہارون الرشید کا واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنے دربار میں ایک دفعہ جوش میں آکر اعلان کیا کہ آج جو شخص جو کچھ مجھ سے مانگے گا' میں اس کو دوں گا' ___ لوگوں نے مانگنا شروع کیا ___ کسی نے کہا مجھے گورنری دے،

دیجئے‘ اس نے کہا۔ دے دی۔ کسی نے کہا مجھے فلاں قلعہ دے دیجئے۔ اس نے کہا میں نے دے دیا‘ کسی نے کہا مجھے دس لاکھ روپے دے دیجئے‘ اس نے کہا میں نے دے دیا‘ ہر ایک نے اپنی مراد پیش کرنی شروع کی اور بادشاہ نے پوری کرنی شروع کر دی۔

ہارون الرشید کی پشت پر ایک باندی کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی تو ہارون نے کہا تو نے اب تک کچھ نہیں مانگا؟

اس نے کہا ان احمقوں کو نمٹنے دو‘ اس کے بعد مانگوں گی‘ ہارون الرشید نے کہا۔ اچھا ___ یہ میری دولت کے امراء و وزراء سب کے سب احمق ہیں۔

اس نے کہا سب پاگل اور بے وقوف ہیں۔ انہیں مانگنا ہی نہیں آتا ___ ہارون نے سمجھا کہ ناقص العقل تو ہے ہی‘ کون اس کے منہ لگے‘ خاموش ہو گئے‘ لوگ مانگنے پر کھڑے ہوئے تھے‘ کسی نے کچھ مانگا‘ کسی نے کچھ مانگا‘ وہ دیتے رہے‘ جب سب نمٹ گئے تو ہارون الرشید نے کہا‘ اب تو مانگ کیا مانگتی ہے۔ اس نے کہا سارے بے وقوف تو نمٹ چکے ہیں۔ اب میرے مانگنے کا موقع ہے‘ کیا آپ مجھے دیں گے ___ ؟ ہارون الرشید نے کہا۔ میں تو اعلان کر چکا ہوں کہ جو کوئی آج مجھ سے جو مانگے گا میں اس کو دوں گا‘ اس نے جا کر ہارون الرشید کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا کہ :

”میں تو آپ کو مانگتی ہوں آپ میرے ہو جائیے“۔

اس واسطے کہ جب آپ میرے ہیں تو قلعے بھی میرے ہیں‘ خزانے بھی میرے ہیں‘ رعایا بھی میری‘ ملک بھی میرا‘ اگر آپ میرے نہیں ہیں تو خزانہ آئے گا نہیں اگر آئے گا تو پھر چھن جائے گا۔ اس لئے میں تو آپ کو مانگتی ہوں۔ تو اس نے کہا جتنے مانگنے والے تھے ان میں سے جس نے دس لاکھ مانگے‘ اسے دس لاکھ مل گئے‘ آگے کچھ نہیں ملا‘ کسی نے قلعہ مانگا آپ نے قلعہ دے دیا‘ آگے اس کی کوئی چیز نہ ہوئی‘ میں نے جو چیز مانگی‘ وہ مل گئی۔ تو ساری چیزیں میری ہیں ___ اور میں نے ان کو بے وقوف اس لئے کہا کہ اگر دس لاکھ مل گئے تو دس لاکھ ہی ہوئے زائد تو نہ ہوئے‘ اور وہ دس لاکھ بھی معرض خطر میں ہیں۔ اس لئے کہ اگر ہارون الرشید کی نگاہ پھر گئی اور اس نے کہہ دیا کہ ان سے یہ چھین لو‘ اور قلعہ دیا تھا‘ بعد میں نگاہ پھر گئی تو قلعہ چھن جائے گا‘ اگر وزارت دی تھی بعد میں نگاہ پھر گئی تو بادشاہ کہہ دیں گے کہ اس سے عہدہ چھین لو ___ تو اصل میں تو بادشاہ اور صدر کی نگاہ ہوتی ہے۔ اس کو دیکھا جاتا ہے اگر یہ قائم ہے تو یہ سب چیزیں ہیں۔ اگر وہ نہیں ہے تو کسی چیز کے آپ مالک نہیں بن سکتے۔

تسخیر خلائق

یہی حالت ہے اللہ والوں کی اور دنیا والوں کی کہ دنیا والے کوئی قلعہ مانگتا ہے کوئی لاکھ مانگتا ہے‘ کوئی کروڑ مانگتا ہے اور اللہ والے کہتے ہیں کہ :

> ”یا اللہ! ہمیں تو آپ درکار ہیں اور کوئی چیز درکار نہیں‘ جب آپ مل گئے ساری دنیا ہماری‘ سارے قلعے ہمارے‘ سارے ملک ہمارے‘ ساری مخلوق ہماری‘ جانور بھی ہمارے سامنے سر جھکائیں گے‘ اور انسان بھی“۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اگر جمادات کو حکم کرتے ہیں وہ فرماں برداری کرنا اپنا فخر جانتے ہیں۔
حدیث میں فرمایا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو استنجاء کی ضرورت محسوس ہوئی اور ریگستان چٹیل

میدان تھا' درخت اور سایہ دور دور تک میلوں پر تھا۔ آپ نے دو درختوں کو اشارہ فرمایا تو ادھر سے وہ درخت دوڑتا ہوا چلا آرہا ہے ادھر سے وہ درخت دوڑتا ہوا چلا آرہا ہے۔ دونوں نے مل کر اپنی شاخیں ملادیں اور اس طرح سے ملادیں کہ ہر طرف سے بالکل پردہ سا ہوگیا' آپ ضروریات سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد اشارہ فرمایا۔ وہ درخت اپنی جگہ چلا گیا۔ یہ درخت اپنی جگہ چلا گیا۔

حکومت تو یہ ہے کہ ساری کائنات پر حکمرانی ہے اور کیوں ہے؟ اس لئے کہ جو کائنات کا مالک ہے اسے اپنا لیا تو ساری چیزیں اپنے قبضے میں آگئیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کی بڑی شان اور بڑے رتبے ہیں۔ ان کے خدام و غلام اور ان کے اولیاء کرام کی بھی بڑی شان ہے کہ جب وہ اپنے کو حق تعالیٰ کے سپرد کردیتے ہیں تو ساری کائنات ان کی تعمیل حکم کرنا اپنا فخر جانتی ہے' اپنے لئے سعادت جانتی ہے' جمادات بھی حاضر' نباتات بھی حاضر اور انسان بھی حاضر ___ سب چیزیں سامنے حاضر رہتی ہیں۔ یہ اخلاص للہ کی برکت ہوتی ہے کہ اپنے کو خالص اللہ کے سپرد کردے' جس میں غیر کا شائبہ نہ ہو۔

قلب مشرک کا تذبذب

اس لئے کہ جب غیر کا شائبہ ہوگا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ دو آقاؤں کا غلام کسی آقا کی خدمت نہیں کرسکتا۔ جو چند آقاؤں کا غلام ہوگا تو ایک کی خدمت کی طرف جائے گا تو اسے ڈر ہوگا کہ دوسرا ناراض نہ ہوجائے۔ اور سب کو ایک وقت میں راضی رکھنا مشکل ہے۔ تو نتیجہ یہ کہ چار آقاؤں کا غلام کسی ایک آقا کی خدمت نہیں کرسکتا۔ خادم وہی ہوگا جو ایک کا غلام ہو۔ سب سے کٹ کر ایک کا ہوجائے گا کہ مرتا ہوں تو اس کے لئے' جیتا ہوں تو اس کے لئے' اس کے قلب میں قوت ہوگی ___ اس واسطے کہ قوت کا مرکز اخلاص ہے اور قوت یقین سے پیدا ہوتی ہے۔ تردد اور تذبذب سے قلب میں ضعف پیدا ہوتا ہے تو مشرک کے دل میں کبھی جان نہیں ہوسکتی اور موحّد کبھی ضعیف القلب نہیں ہوسکتا' موحد کے قلب میں اس کی توحید کی وجہ سے قوت ہوتی ہے اور مشرک کے دل میں جان نہیں ہوسکتی' جس کے کروڑوں خدا ہوں' وہ کسی ایک طرف جھکے گا تو دوسرے کی فکر پڑے گی' اس کے دل میں جان نہیں رہے گی' ہمیشہ ڈانواں ڈول رہے گا۔

قلب موحّد کا یقین

اور موحد کے قلب کے اندر قوت ہوتی ہے۔ تو موحد اس کو ہی کہتے ہیں جو ایک کا ہو کر بقیہ سے قطع نظر کرے ؎

موحد چہ برپائے ریزی زرش
کہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید وہراسش نباشد زکس
ہمیں است بنیاد توحید وبس

موحد کسے کہتے ہیں ___ ؟ کہ اس کے قدموں پر لاکھوں روپیہ ڈال دو' یا اس کے سر پر فولاد ہندی کی تلوار لے کر کھڑے ہوجاؤ۔ اسے نہ کسی کا ڈر ہوگا نہ کسی سے امید ہوگی۔ وہ تو ایک کا ہوچکا ہے۔ نہ طمع مائل

کر سکے گی' نہ خوف مائل کر سکے گا۔

روح عمل

تو "ایک کا ہو جانا" اسی کے معنی ہیں "اخلاص" ___ اور عمل کے اندر اخلاص سے روح پیدا ہوتی ہے۔ جس عمل کے اندر شرک کا شائبہ بھی ہو' وہ عمل اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتا' اس میں روح ہی نہیں ہے۔

اور شرک فقط یہی نہیں ہے کہ آدمی دو خدا مانے' خدا کو ایک مانے' صفات میں شرک اختیار کرے یہ بھی شرک ہے' صفات میں ایک مانے افعال میں شرک اختیار کرے۔ یہ بھی شرک ہے۔ افعال میں بھی ایک مانے تو ذات بھی ایک' صفات بھی ایک صفات میں بھی وحدانیت اور افعال میں بھی' لیکن عبادت میں شرک کرنے لگے کہ دو کے سامنے سجدہ کرے' یہ بھی شرک ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ ظاہر میں سجدہ بھی ایک ہی کے سامنے کرے تب بھی شرک کا ایک مقام ہے جس سے بچنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اللہ کی عبادت کر رہا ہے مگر دل میں یہ خیال ہے کہ لوگ مجھے سمجھیں کہ بڑا عبادت گزار ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ریاء سب سے بڑا شرک ہے ___ دیکھنے میں شرک معلوم نہیں ہوتا مگر حقیقت میں شرک ہے۔ اور حدیث میں ارشاد ہے :

الشرک اخفی من دبیب النمل

بعض شرک ایسا دقیق ہوتا ہے جیسا کہ چکنے پتھر کے اوپر چیونٹی چلے تو اس کی کھسکھساہٹ اتنی دقیق ہوتی ہے کہ کان نہیں سن سکتے۔ تو جیسے اس کا ادراک نہیں ہوتا' اس شرک کا بھی ادراک نہیں ہوتا ___ وہ یہ کہ آدمی ایک اللہ کی عبادت کرے اس کو یکتا جانے' صفات میں بھی یکتا جانے' ریا دکھلاوا بھی نہ ہو' مگر پھر بھی ایک درجہ کا شرک ہے۔ اور وہ یہ کہ اس کے اندر عُجب موجود ہو۔ یعنی عبادت کرتے وقت یہ خیال موجود ہو کہ میں بہت بڑا کام کر رہا ہوں' کون ہے جو میرے برابر عبادت کر سکے۔ یہ جو عجب اور خود بینی پیدا ہوئی۔ یہ بھی اس سے زیادہ دقیق قسم کا شرک ہے' جو عمل کو ضائع کر دے گا' اس سے اندازہ ہوا کہ عمل کا ضائع ہونا شرک سے ہے اور عمل کی بقاء اخلاص سے ہے۔ تو جس چیز سے شئے کی بقا ہوتی ہے اسی کو تو روح کہا جاتا ہے بدن روح سے باقی رہتا ہے اگر عمل اخلاص سے باقی ہو تو اخلاص عمل کی روح ہے' جب تک اخلاص نہیں ہو گا عمل قابل قبول نہیں ہو گا اسی کو فرماتے ہیں کہ :

والعاملون کلھم ھالکون الا المخلصون

عمل کرنے والے بھی سب کے سب ہلاک و برباد ہیں۔ اخلاص سے عمل کرنے والے بچیں گے' جن کے اندر خلوص نیت اور اخلاص موجود ہو گا۔ تو انسان کے لئے نجات کی کوئی صورت نہیں' نجات کا اولین درجہ علم ہے۔ علم بھی کار آمد اور کافی نہیں ہے۔ دوسرا درجہ عمل ہے' عمل بھی کار آمد نہیں۔ تیسرا درجہ اخلاص کا ہے ___ جب یہ تینوں چیزیں جمع ہو جائیں۔ علم بھی ہو ___ عمل بھی ہو ___ خلوص بھی ہو۔ تو کہا جائے گا کہ اب انسانیت کے جوہر اس کے اندر محقق ہو گئے' اب اس میں انسانیت اور کمال انسانیت آ گئی۔

سیرت انسانی کا چوتھا جوہر

لیکن اگر غور کیا جائے تو اب بھی ایک چیز باقی رہ گئی اگر وہ نہ ہو تو پھر یہ تینوں چیزیں اکارت بن جاتی ہیں۔ یہ تینوں چیزیں ضائع ہو جاتی ہیں۔۔ نہ علم نجات دلائے گا نہ عمل' نہ اخلاص للہ جب تک وہ چوتھا جوہر موجود نہ

ہو ___ اور وہ کیا ہے ___ ایک آدمی علم رکھتا ہے۔ بڑا اچھا عالم ہے عمل بھی کر رہا ہے اور مخلصانہ عمل کر رہا ہے، لیکن اس عمل کرنے کے بعد مطمئن ہو بیٹھا کہ نجات تو میرے گھر کی باندی ہے۔ تو وہ ملے گی 'اللہ سے بے فکر ہو بیٹھا۔ یہ نہیں جانتا کہ جس نے اخلاص دیا ہے اگر وہ کل کو ناخوش ہو جائے اور یہ چھین لے تو میری کیا گت بنے گی ___ ! جسے دینا آتا ہے۔ اسے لینا بھی آتا ہے۔ جو علم دے سکتا ہے وہ لے سکتا ہے۔ جو اخلاص کا عطیہ بخشنے والا ہے اور وہ اسے چھین بھی سکتا ہے اس لئے مخلص کا کام یہ ہے کہ چوبیس گھنٹے مؤدبانہ کھڑا رہے کہ کہیں مالک کی نگاہ نہ بدل جائے اور یہ ساری نعمتیں مجھ سے سلب ہو جائیں ___ تو جب تک انسان کے اندر مالک کے راضی رکھنے کا فکر نہ ہو وہ اطمینان سے نہ بیٹھے۔ فکر میں رہے کہ معلوم نہیں کل کو کیا بات پیش آئے اپنے علم کے اوپر غرہ نہ کرے' اپنے عمل کے اوپر غرہ نہ کرے' اپنے اخلاص کے اوپر غرہ نہ کرے۔ اسے توفیق خداوندی سمجھے' اگر ذرہ غرہ کر لیا اور یہ سمجھ لیا کہ علم میرا ہے اور یہ ہنر میرا ہے۔ یہ عمل میرا ہے اور یہ اخلاص میرا ہے۔ بس یہ اس نے عمل کو اکارت کیا۔ تو یہ سمجھنے کے بجائے یہ سمجھے کہ یہ توفیق خداوندی ہے۔ یہ عطیۂ الٰہی ہے اور جو دینا جانتا ہے وہ چھیننا جانتا ہے۔ میں چوبیس گھنٹے اس کی چوکھٹ پر راضی رہوں۔ ایسے نہ ہو کہ اس کی نگاہ بدل جائے اور یہ ساری نعمتیں مجھ سے چھن جائیں۔ اس کا نام "فکر" ہے جب تک یہ فکر نہ ہو اور جب تک اس میں بے اطمینانی کی کیفیت یعنی "تفکر" کی کیفیت نہ ہو اس وقت تک بقائے علم' بقائے عمل اور بقائے اخلاص کی کوئی صورت نہیں۔

مقربین بارگاہ کی گرفت کا انداز

اور بالخصوص ؎

نزدیکاں رابیش بود حیرانی

جو زیادہ علم والے' زیادہ عمل والے اور زیادہ اخلاص والے ہیں وہ زیادہ ہلاکت کے مقام پر کھڑے ہوئے ہیں کہ ذرا قدم گرے تو ادھر بھی جہنم' ادھر بھی جہنم' ان کے خطرات اور ان کے وسواس پر بھی ان کی گرفت ہوتی ہے۔

حدیث میں ایک واقعہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ سابق زمانے میں بنی اسرائیل میں ایک عابد زاہد گزرا ہے۔ روایت میں جس کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور شیخ جلال الدین سیوطی رحمتہ اللہ علیہ نے "بدور السافرۃ فی علوم الآخرۃ" میں یہ حدیث نقل کی ہے ___ آخرت کے احوال کے بارے میں ایک کتاب اس نام سے لکھی ہے۔ اس میں قبر کے حالات' برزخ کے حالات اور عالم حشر کے حالات ہیں۔ اس میں اس واقعہ کی بھی روایت نقل کی ہے۔

پچھلی امتوں میں ایک عابد زاہد گزرا ہے جو ہر وقت اللہ کی یاد میں مشغول رہتا تھا۔ عبادت و زہادت کے سوا اسے دوسرا کام نہیں تھا ___ اس نے یہ دیکھا کہ میں عبادت تو کرتا ہوں مگر دنیوی اشغال میں بیوی ہے' بچے بھی ہیں' عزیز بھی ہیں نیز کمانا اور کھانا' دنیا بھر کے دھندے ہیں اور مجھے عبادت سے یہ چیزیں غافل بناتی ہیں کوئی ایسی صورت ہو کہ یہ دھندے ختم ہو جائیں اور میں صرف عبادت کے لئے فارغ ہو جاؤں تو اس نے تمام عزیزوں' رشتہ داروں اور بیوی بچوں کو چھوڑ چھاڑ کر سمندر کے بیچ میں ایک ٹیلے کو اختیار کیا اور وہاں جا کر ایک کٹیا ڈال دی کہ بس یہاں پر بیٹھ کر اللہ کی یاد میں مشغول رہوں گا۔

پچھلے ادیان میں رہبانیت جائز تھی۔ اس نے رہبانیت اور گوشہ گیری اختیار کی' عزلت اور انقطاع

اختیار کیا اور جا کر بیٹھ گیا، جو چھپریا ڈالی تھی اس کے نیچے بیٹھ گیا ___ حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ا
کی غذا کا یہ سامان کیا کہ اسی ٹیلے پر ایک انار کا درخت اگایا اس میں بڑے بڑے انار لگے اور اس کڑوے سمن
مین اللہ تعالیٰ نے اس پہاڑی پر ایک میٹھے پانی کا چشمہ جاری کر دیا۔

اس عابد کا کام یہ تھا کہ روزانہ چوبیں گھنٹے میں ایک انار کھالیا اور ایک کٹورا پانی پی لیا اور چوبیں گھنٹے ا
طرح اللہ کی یاد میں مشغول کہ نہ سونا، نہ آرام کرنا، بس یہی اس کا کام تھا ___ پانچ سو برس اس طرح سے ا
کی عمر کے گزرے گویا خالص عبادت جس میں ریا اور دکھلاوے کا کوئی شائبہ نہیں، ظاہر ہے کہ پہاڑ کے ٹیلے
کس کو دکھلائے گا؟ وہاں اس کو دیکھنے والا کون ہے؟ تو خالص عبادت کی جس میں علم بھی صحیح تھا، عمل بھی
تھا، اور اخلاص بھی صحیح تھا۔ یہاں تک کہ اس کے انتقال کا وقت آیا تو اس نے اللہ سے دعا کی کہ :

"اے اللہ! یہاں کوئی اور تو نہیں ہے جو مجھے نہلائے، دھلائے، کفنائے، اور دفن کرے، یہاں تو میں ا
تیری ذات بابرکات موجود ہے۔ اس لئے ایک درخواست میری یہ ہے کہ مجھے سجدہ کی حالت میں موت د
دیں۔ تاکہ عین خالص عبادت میں میری موت آئے"۔

اور دوسری درخواست یہ ہے کہ میری لاش کو قیامت تک سجدے کی حالت میں محفوظ رکھا جائے، تا
میں قیامت تک صورتاً تیرا سجدہ گزار بندہ سمجھا جاؤں ___ تو پانچ سو برس کی عبادت تو نے مجھے عطا کر دی۔ اب
جو ہزاروں برس قیامت آنے تک بقیہ رہ گئے ہیں۔ اس میں میری لاش سجدے میں پڑی رہے۔ بگڑنے نہ پا
تاکہ قیامت تک اسی طرح سجدے میں پڑا رہوں اور میرا جسم سجدہ گزار رہے"۔

حق تعالیٰ نے دونوں دعائیں قبول فرمائیں ___ سجدے کی حالت میں موت آئی اور اس کا بدن بھی محفو
ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کا بدن آج تک محفوظ ہے۔ حق تعالیٰ نے اس ٹیلے
اتنے بڑے بڑے عظیم الشان درخت اگادیئے، اتنی اندھیری ہو گئی کہ اول تو لوگوں کا وہاں پہنچنے کا موقع نہیں
اگر کوئی پہنچ جائے تو ہیبت کی وجہ سے اندر نہیں جاسکتا ___ اس لئے کہ اگر لوگوں کو موقع مل جاتا تو لوگ
مردوں کو نہیں چھوڑتے، قبروں کو نہیں چھوڑتے، اس کے آگے جاکے تو جانے کیا کیا کرتے۔ حق تعالیٰ ___
اس کو چھپادیا کہ نہ وہاں پہنچیں گے، نہ خرافات ہوں گی ___ اس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم
ارشاد فرماتے ہیں۔

"اس عابد کو اللہ تعالیٰ کے آگے پیش کیا گیا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے بندے، میں نے
اپنے فضل و کرم سے تجھے بخشا اور میں نے تجھے جنت عطا کی"۔

اس عابد کے دل میں ایک وسوسہ گزرا کہ پانچ سو برس تو میں نے عبادت کی اور خالص عبادت کی، بیوی
بچوں کو چھوڑا، عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑا اتنی محنت اٹھائی، اب بھی اپنے ہی فضل و کرم سے بخشا، ک
سے کم میری دلداری ہی کے لئے فرماتے کہ تیری عبادت کے بدلے میں تجھے جنت عطا کی۔ ذرا میرا دل تو خوش
ہو جاتا کہ میں نے کچھ کیا ___ اب تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ محض اپنے فضل و کرم سے
بخشا ___ یہ اس کا کوئی عقیدہ نہیں تھا۔ نہ کوئی جما ہوا خیال تھا، ایک وسوسے کے درجے میں اس کے دل میں
یہ بات گزری تو ۔

نزدیکاں را بیش بود حیرانی

جو مقربان بارگاہ الٰہی ہوتے ہیں۔ ان کے افعال پر اور ان کے خیالات پر بھی گرفت ہوتی ہے۔ تم اپنے
دل میں یہ خیال کیوں لائے؟ ___ حق تعالیٰ نے ملائکہ کو ارشاد فرمایا۔ اس بندے کو بجائے جنت کی طرف

لے جانے کے جہنم کی طرف لے جاؤ' مگر جہنم میں ڈالنا نہیں ہے۔ بس اتنی دور تک لے جاؤ کہ وہاں سے جہنم پانچ سو برس کا راستہ ہو' مگر جہنم کی ہوا وہاں پہنچتی ہو۔ وہاں لے جا کر اسے کھڑا کردو ___ تو حدیث میں ہے کہ ملائکہ لے گئے ___ اتنی دور تک لے جا کر اسے کھڑا کیا ___ جہنم کی ایک لپٹ اور لو آئی ہے تو سر سے پیر تک یہ عابد خشک ہو گیا' اور اس نے پیاس پیاس چلانا شروع کیا۔ تو حدیث میں فرمایا گیا کہ غیب سے ایک ہاتھ نمایاں ہوا۔ جس میں ٹھنڈے پانی کا ایک کٹورا تھا۔ یہ عابد دوڑا ہوا آیا کہ اے اللہ کے بندے! یہ پانی مجھے دے۔ جتنا یہ آگے بڑھا وہ ہاتھ اتنا پیچھے ہٹ گیا۔ یہ اور آگے بڑھا۔ وہ اور پیچھے ہٹ گیا ___ آواز یہ آئی کہ پانی تو مل سکتا ہے مگر مفت نہیں ملے گا قیمت سے ملے گا ___ اور قیمت یہ ہے کہ جس شخص کے پاس پانچ سو برس کی خالص عبادت ہو اگر وہ دے تو یہ کٹورا پانی کا مل سکتا ہے۔ ورنہ نہیں مل سکتا۔

یہ عابد دوڑا اور کہا کہ یہ حاضر ہے۔ میرے پاس پانچ سو برس کی عبادت ہے۔ یہ اس نے دی اور پانی کا کٹورا لے کر پیا ___ دم میں دم آیا اور جان میں جان آئی ___ حق تعالیٰ کی طرف سے ملائکہ کو ارشاد ہوا کہ اس عابد کو لوٹا کر لاؤ۔ وہ واپس لایا گیا۔

حق تعالیٰ نے فرمایا۔ اے بندے! تیری پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت سے تو ہم ادا ہو گئے۔ اور وہ تو نے ہی تجویز کی تھی ___ یعنی ایک کٹورا پانی ___ تو تو نے اپنی پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت ایک کٹورا پانی تجویز کیا۔ وہ ہم نے تجھے دے دیا' معاملہ برابر سرابر ہو گیا' نہ ہمارے ذمے کچھ رہا۔ نہ تیرے پاس کچھ رہا ___ اب جو دنیا میں تو نے ہزاروں کٹورے ہمارے پئے اس کا حساب دے کہ ایک ایک قطرے کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کے آیا۔ اور جو اناروں کے لاکھوں دانے کھائے' ایک ایک دانے کا حساب دے۔ ایک ایک دانے کے بدلے کتنے سجدے کئے۔

اور یہ تو دانا اور پانی ہے ___ وہ جو تیری آنکھوں میں ہم نے روشنی بخشی تھی کہ ایک تار نگاہ سے سینکڑوں چیزیں دیکھ لیتا تھا' ایک ایک تار نگاہ کا حساب دے کہ اس کے بدلے میں کیا کیا عبادتیں لے کر آیا ہے؟

اور وہ جو ہم نے ٹھنڈی ہوائیں دی تھی کہ تو سانس لیتا تھا' اور تیری زندگی قائم تھی ایک ایک سانس کا حساب دے کہ اس کے بدلے میں کیا عبادت لے کر آیا ہے؟

اور فرمایا کہ :

یہ تو اسباب ہیں۔ ان سب کے بعد جو ہم نے تجھے عبادت کی توفیق بخشی اور طاقت دی تھی' اس توفیق کے بدلے میں بتلا تو کیا لے کر آیا ہے؟

یہ عابد تھرا گیا ___ اور اس نے کہا کہ

مدار نجات فضل ہے عمل نہیں

"اے اللہ! کسی کو کسی کا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ تیرا فضل ہی نجات دلائے گا۔ ہر آدمی تیرے ہی فضل سے بخشا جائے گا"۔

اسی کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

لن ینجی احدکم عملہ

تم میں سے کسی کو تمہارا عمل نجات نہیں دلائے گا' محض اللہ کا فضل نجات دلانے والا ہے ___ صدیقہ

عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ حدیث سن کر عرض کیا :

ولا انت یا رسول اللہؐ؟

یا رسول اللہؐ! کیا آپ کا عمل بھی آپ کو نجات نہیں دلائے گا؟ جس عمل کی قیمت وہ ہے کہ سارے آسمان اور زمین مل جائے تو ایک سجدے کی قیمت نہ پڑ سکے۔ وہ عمل بھی نجات نہیں دلائے گا؟ فرمایا :

لا۔ الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ

مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا، جب تک اللہ کا فضل دستگیری نہ کرے تو جب اللہ کے رسولؐ یہ فرمائیں تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے کہ ہم اپنی کسی عبادت کے اوپر غرہ کریں تو اصل میں اس عابد کو یہ بتلانا تھا کہ عمل نجات دھندہ نہیں ہے فضل خداوندی نجات دھندہ ہے۔

توفیقِ عمل، علامتِ فضل ہے

مگر بھئی! اس کا یہ مطلب مت سمجھ لیجیو کہ جب عمل سے نجات نہیں ہوتی تو لاؤ پھر آج سے عمل وغیرہ سب چھوڑ دو، نہ نماز، نہ روزہ، نہ حج، نہ زکوۃ اس لئے کہ نجات تو عمل سے نہیں ہے وہ فضل سے ہوگی۔ اور فضل کے بارے میں کسے پتہ ہے کہ کس پر ہوگا۔ اس کے سہارے سے بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ ___؟ جس کی نجات ہونی ہوگی فضل سے ہو جائے گی۔ نہیں ہونی ہوگی، نہیں ہوگی۔ عمل تو کارآمد ہے نہیں ___ تو یہ نتیجہ مت نکال لینا۔

بے شک عمل نجات دلانے والا نہیں۔ عمل سے نجات نہیں ہوگی، فضل سے نجات ہوگی ___ مگر فضل کے پہچاننے کا طریقہ درحقیقت عمل ہے۔ اگر عمل کر رہا ہے تو یہ علامت ہے کہ اللہ کا فضل متوجہ ہے۔ اور جو عمل نہیں کر رہا تو یہ اس کی علامت ہے کہ اس کے اوپر اللہ کا فضل متوجہ نہیں ہے۔ تو نجات دینے والا فضل ہے۔ مگر فضل کی علامت عمل ہے اگر عمل نہیں ہے تو فضل بھی نہیں ہے۔ اس واسطے عمل مت ترک کیجئے۔ یہ مت سمجھ لینا کہ جب عمل سے نجات نہیں تو عمل کو چھوڑ دو، بے شک عمل نجات دھندہ نہیں، فضل ہے، مگر فضل کی علامت عمل ہے۔ عمل ہے تو یہ اس کی دلیل ہے کہ فضل خداوندی متوجہ ہے۔

دنیا میں فضل کی علامت یہ ہے کہ توفیق مل رہی ہے اور آخرت میں فضل کی علامت یہ ہے کہ جنت مل رہی ہے اور نعمتیں مل رہی ہیں۔ دونوں جہانوں میں دستگیری کرنے والا فضل ہے۔ عمل بھی تو فضل ہی سے کرتے ہیں۔ فضل متوجہ نہ ہو تو آپ عمل کیسے کریں ___؟ اس لئے کہ عمل توفیق سے کرتے ہیں۔ توفیق دینے والے وہ ہیں تو فضل ان کی طرف متوجہ ہو گیا، اگر توفیق نہ دیں تو آدمی عمل نہیں کر سکتا۔ تو سب سے بڑی نعمت انسان کے حق میں توفیق ہے۔

روحِ شکر

حضرت داؤد علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے فرمایا تھا :

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا

اے داؤد ہمارا شکر ادا کرو ___ تو انبیاء علیہم السلام اللہ کے کلام کو پورا سمجھتے ہیں۔ داؤد علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ بے شک میں شکر ادا کروں گا۔ میرا فرض ہے کہ میں ادا کروں۔ یوں بھی فرض تھا اور جب آپ حکم دے رہے ہیں تو بالکل ہی فرض ہو گیا ___ مگر سوچ رہا ہوں کہ شکر ادا کروں تو کس طرح سے

ادا کروں؟ اس واسطے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا تو اس شکر کو ادا کرنے کی توفیق بھی تو آپ ہی دیں گے۔ تو وہ توفیق ایک نعمت ہو گئی‘ پھر اس نعمت کا مجھے شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور جب اس نعمت کا شکر ادا کرنے بیٹھوں گا‘ اس شکر کی توفیق پھر آپ دیں گے۔ تو پھر ایک نعمت بن گئی‘ تو اس سے پہلے اس نعمت کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور جب اس نعمت کا شکر ادا کروں گا وہ بھی توفیق آپ دیں گے تو وہ نعمت ہو گئی تو اس سے پہلے ایک اور شکر نکلا تو ہر شکر سے پہلے ایک اور شکر نکلتا ہے‘ میں شکر کی ابتداء کروں تو کس طرح سے کروں ___ ؟ میں تو ادائے شکر سے عاجز ہوں۔

ادھر سے جواب آیا کہ :

”اے داؤد! اگر تو نے یہ سمجھ لیا کہ تو ہمارے شکر ادا کرنے سے عاجز ہے تو اپنی ہار مان لینا‘ یہی شکر کی ادائیگی ہے۔ تو نے شکر ادا کر دیا۔ کوئی بندہ اللہ کا حق ادا نہیں کر سکتا ___ ہم تو فرض ادا نہیں کر سکتے حق تو کیا ادا کریں گے۔ عاجز ہیں۔ اس عجز کو سمجھ لینا کہ ہم عاجز ہیں۔ یہی شکر کی ادائیگی ہے۔ اپنی ہار مان لے کہ میں عاجز ہوں“۔

سند شکر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو سیّد الحامدین ہیں جن سے بڑھ کر اللہ کی حمد و ثنا کرنے والا عالم میں کوئی نہیں ___ اخیر میں آپ بھی کہتے ہیں کہ :

اللھم لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک

”اے اللہ! میں تیری حمد و ثناء کا ایک شمہ بھی نہیں ادا کر سکتا۔ میں تیری حمد و ثنا کا احصاء ہی نہیں کر سکتا“۔

بس مختصر یہ ہے کہ تو ویسا ہی ہے جیسا تو نے خود اپنے آپ کو فرمادیا ___ میں عاجز ہوں کہ تیری حمد اور تیری ثناء و صفت کو ادا کر سکوں۔ اس لئے کہ وہ لامحدود ہے اور بندہ محدود ہے۔ اس کا کمال محدود‘ اس کی عقل محدود‘ اور اس کی طاقت محدود‘ تو محدود سے لامحدود کی ادائیگی کیسے ممکن ہے؟ ___ **انت کما اثنیت علی نفسک** یہ وہی عجز کا ہی اعتراف ہے کہ میں تیری ثنا ادا کرنے سے عاجز ہوں۔ اسی کو سب سے بڑی سند سمجھا گیا جس نے ہار مان لی اور عجز تسلیم کر لیا وہی سب سے بڑی ثنا کرنے والا ہے ___ میرا ہی ایک شعر ہے۔ لمبی نظم تھی وہ میں بھول گیا۔ اس میں کا ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ؎

خدا کی تو ثنا کامل یہی ہے
کہ ہم سے کچھ ثنا ممکن نہیں ہے

ہم سے کوئی ثنا ممکن نہیں۔ ___ بس ثنا کا ادا کرنا ہے ___ بہرحال حق تعالیٰ شانہ جب فضل فرماتے ہیں پھر توفیق بھی دی جاتی ہے۔ جب توفیق آتی ہے تبھی انسان عمل کرتا ہے ___ تو عمل ادھر سے ہوا۔ ہماری طرف سے نہ ہوا۔

نفی عمل سے اثبات عمل

اسی واسطے اس عمل کو زیادہ قبول کرتے ہیں۔ جس میں آدمی سمجھ لے کہ میں نے کچھ نہیں کیا‘ اور جو خود

کہے کہ میں نے سب کچھ کیا' اسے کچھ نہیں ملے گا۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ اگر کوئی بندہ عمل کر کے غرۃ اور غرور کرے اور یوں کہے کہ اے اللہ! دیکھ میں نے تیری نماز پڑھی' میں نے حج کیا' میں نے جہاد کیا' میں نے یہ کام کیا ___ تو جواب میں فرماتے ہیں کہ :

نالائق! تو نے کیا کیا۔ بدن کے اندر طاقت تو ہم نے دی تھی' توفیق تو ہم نے دی تھی' ارادہ تو ہم نے پیدا کیا۔ تو نے کیا کیا؟

اور اگر کوئی بندہ سب کچھ کر کے کہے کہ اے اللہ! تیری ہی توفیق سے سب کچھ ہوا۔ میرے اندر کوئی طاقت نہیں۔

لاحول ولا قوۃ الا بک

کوئی حول اور طاقت میرے اندر نہیں' توفیق تیری' طاقت تیری' ارادہ دقتی تیرا' میں نے تو کچھ نہیں کیا ___ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ :

"نہیں ___ عمل تو تو نے ہی کیا' حرکت تو تو نے ہی کی' مسجد تک قدم اٹھا کر تو ہی گیا تھا۔ تو نے ہی سب کچھ کیا ہے"۔

غرض جو اپنے عمل کی نفی کرتا ہے اس کا اثبات کرتے ہیں۔ اور جو خود اثبات کرنے لگے' اس کی نفی کر دیتے ہیں۔ جو نیچا بنے اسے اونچا اٹھاتے ہیں۔ اور جو خود اونچا بننے لگے اسے زمین کے اوپر پٹخ دیتے ہیں۔ کسی شاعر نے خوب کہا کہ ؎

پستی سے سربلند ہو اور سرکشی سے پست
اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

جو جتنا نیچا بنتا ہے۔ اسے اونچا بناتے ہیں اور جو خود اونچا بننے لگتا ہے اسے زمین پر گرا دیتے ہیں۔ تو اونچا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی نیچا بن جائے۔ بلند و بالا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ پست بن جائے۔

طریق عزت

عزت والا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ خود اپنی ذلت پیش کر دے' عزت آجائے گی۔ اور جو خود ہی اپنی عزت کو سراہنے لگے' تو پھر ادھر سے پھٹکار برسے گی۔ ذلت برسے گی' اس لئے کہ کوئی عزت کا مستحق نہیں۔ عزت تو اللہ کی ہے۔ جو اس کے آگے جھک جائے اس کے لئے عزت آتی ہے۔

فَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰکِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَایَعْلَمُوْنَ

تو عزت اللہ کی' اس کے رسول کی اور مؤمنین کی ہے ___ بہر حال طریقہ عزت کا یہ ہے کہ اپنی ذلت محسوس کرے۔ اگر کوئی مخدوم بننا چاہے تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ یوں کہے کہ دیکھو لوگو! میں مخدوم ہوں۔ تم سب میرے غلام ہو۔ لوگ کہیں گے۔ نامعقول! تجھے شرم نہیں آتی' ایسا کلام کر رہا ہے۔ ہاتھ کے ہاتھ پست بن جائے گا ___ مخدوم بننے کا طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کا خادم بن جائے' لوگ سروں پر اٹھائیں گے وہ خود ہی مخدوم بن جائے گا۔ تو مخدوم بننے کا طریقہ خادم بننا ہے نہ کہ مخدومی کا دعویٰ اور ادعا کرنا۔ دعویٰ کرنے والے کو پٹخ دیا جاتا ہے ___ بہر حال فضل خداوندی ہوتا ہے تو توفیق بھی ملتی ہے' توفیق ملتی ہے تو عمل بھی ہوتا ہے اور جس کی اس حقیقت پر نظر ہے کہ پہلے فضل آیا' پھر توفیق آئی' پھر میرے اندر

ارادہ پیدا کیا گیا' پھر میرے اندر طاقت پیدا کی گئی' تب جا کے عمل ظاہر ہوا۔ جو اس سلسلے کو جانتا ہے۔ وہ کبھی دعویٰ نہیں کرے گا کہ میں نے عمل کیا وہ تو یہ کہے گا کہ یہ سب کچھ اوپر سے ہے۔ میرے اندر تو کچھ بھی نہیں۔

سلسلۂ عمل پر نگاہ کا ثمرہ

اب یہ تو اس کی ایسی ہی مثال ہو گئی کہ دو آدمی کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں آئیں' اور ان دونوں کا دعویٰ ہو کہ یہ کھیتی کھڑی ہوئی ہے۔ اس کا دانہ سب میرا ہے۔ وہ بھی کہے کہ میرا ہے اور یہ بھی کہے کہ میرا ہے ___ تو ایک شخص سے مجسٹریٹ پوچھتا ہے کہ یہ زمین تمہاری ملکیت ہے؟ نہیں صاحب! زمین کا میں مالک نہیں ہوں۔ بیج تم نے ڈالا تھا ___؟ نہیں بیج بھی میں نے نہیں ڈالا ___ پانی تم نے دیا تھا ___؟ نہیں صاحب! پانی بھی اسی نے دیا تھا۔ میں نے نہیں دیا تھا ___ چھ مہینے خون پسینہ تم نے ایک کیا تھا؟ نہیں صاحب! وہ بھی اسی نے کیا تھا۔ باقی دانہ میرا ہے۔

تو مجسٹریٹ کہے گا کہ اس پاگل کو کان سے پکڑ کر نکال دو' نہ اس کی زمین' نہ اس نے بیج ڈالا' نہ اس نے پانی دیا' نہ اس نے محنت کی۔ اور دانے کا دعوے دار ہے۔ یہ کدھر سے دعوے دار ہو گیا ___؟ جس کی زمین ہے' جس نے بیج ڈالا ہے جس نے محنت اٹھائی' دانہ بھی اسی کا ہو گا۔

ایک عمل کرنے والا دیکھتا ہے کہ میرے اندر طاقت نہیں ہے۔ وہ بھی خدا نے دی' عمل کرنے کا ارادہ بھی میرا اپنا نہیں تھا' وہ بھی خدا نے دیا' توفیق میں نے خود نہیں پیدا کی وہ بھی اسی نے دی ___ باقی عمل کا مالک میں ہوں۔ تو خدا کہے گا کہ اس نامعقول کو کان سے پکڑ کر نکال دو۔ توفیق ہم نے دی' قوت ہم نے دی' ارادہ ہم نے دیا' یہ عمل کا کیسے مالک ہے؟

اور جس کی نگاہ پورے سلسلے پر ہے کہ آپ ہی فضل کرنے والے' آپ ہی توفیق دینے والے' آپ ہی قوت بخشنے والے' آپ ہی کرا دینے والے' میرا تو کچھ بھی نہیں۔ یہ سب آپ کا فضل ہے۔ تو پھر فرمائیں گے۔ نہیں' تو نے ہی عمل کیا تھا' تو نے ہی حرکت کی تھی' تو ہی چل کر کیا تھا ___ غرض جو اپنے کو خود سراہتا ہے۔ اسے مٹا دیتے ہیں۔ اور جو اپنے آپ کو مٹاتا ہے اسے باقی کر دیتے ہیں اسے اونچا اٹھا دیتے ہیں۔

دولت تفکّر

عرض کرنے کا مطلب یہ نکلا کہ نہ علم میں نجات ہے۔ نہ عملِ محض میں نجات ہے نہ اخلاص میں نجات ہے جب تک کہ اس کے ساتھ فکر شامل نہ ہو۔ نہ غرور ہو' نہ اپنے اوپر اعتماد اور بھروسہ ہو' نہ اپنی عبادت اور عمل پر کوئی غرہ ہو ___ بلکہ ہر حالت میں اللہ پر بھروسہ ہو کہ میں نے کچھ نہیں کیا' یہ انہیں کا دیا ہوا ہے اگر وہ چھین لیں تو میں کیا کروں گا۔ یہ فکر جس کو دامن گیر ہو گا اس کا اخلاص بھی کار آمد ہو گا۔ اس کا عمل بھی کار آمد ہو گا۔ اور اس کا علم بھی کار آمد ہو گا۔

روحانیت کے اربعہ عناصر

اب انسانی سیرت کے اجزائے ترکیبی چار نکل آئے۔ ایک علم صحیح' اور علم نافع' ایک عمل صحیح اور عمل

صالح' ایک اخلاص کامل اور فکر سلیم ___ یہ چار چیزیں انسان میں جمع ہوں گی تو کہا جائے گا کہ یہ انسان صحیح قسم کا انسان ہے ___ جس میں علم کے بجائے جہالت ہو۔ کہیں گے یہ حیوان ہے ___ علم ہو' مگر عمل نہ ہو تو کہیں گے عالم بے عمل ہے۔ گردن زدنی ہے ___ عمل ہے مگر منافق ہے' مخلص نہیں ہے تو کہیں گے نامعقول ہے ___ مخلص بھی ہے مگر بے فکرا ہے تو کہیں گے نہایت غلط قسم کا انسان ہے۔ جس میں علم بھی ہو' عمل بھی ہو' اخلاص بھی ہو اور آخرت کا فکر صحیح بھی ہو' کہا جائے گا' یہ قابل اعتماد انسان ہے۔ یہ ہے جس کی انسانیت کی داد دی جاسکے اور کہا جاسکے کہ "یہ انسان ہے" ___ یہ انسانیت کے چار اجزاء نکلے۔ جیسے اس کے بدن کے چار اجزاء تھے' آگ' پانی' ہوا' مٹی ان چار سے مل کر بدن بنتا تھا۔ اسی طرح سے انسانیت کے چار جوہر ہیں۔ علم نافع' عمل صالح' اخلاص کامل' اور فکر صحیح۔ یہ چار چیزیں اگر ہیں تو کہا جائے گا' انسان ہے' ورنہ کہا جائے گا کہ حیوان ہے' یا انسان نما حیوان ہے۔

کمال علم نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)

بس جب یہ چار چیزیں معلوم ہو گئیں اور یہ انسانیت کا معیار ہے۔ اس معیار کے اعتبار سے جانچا جائے تو سب سے زیادہ کامل اس معیار سے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نکلتے ہیں کہ جن کا فقط علم نافع نہیں بلکہ علم قطعی ہے۔ جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں' کتابوں سے حاصل کیا ہوا علم نہیں بلکہ ان کے علم سے کتابیں بنتی ہیں وہ براہ راست اللہ کے سرچشمے سے علم لیتے ہیں۔ وحی کا علم ان کے اوپر آتا ہے جو لازوال دولت ہے۔ جو قطعی دولت ہے۔ جس میں نہ شک کی آمیزش ہے' نہ جہل و تردّد کی آمیزش ہے۔ نہ شبہات و خیالات کی آمیزش ہے۔ خالص علم جو چشمۂ وحی سے ہے۔ وہ علم کامل اور علم قطعی ان کے قلوب مبارکہ پر ڈالا جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا کہ :

وَاِنَّهٗ لَتَنۡزِيۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِيۡنُ عَلٰى قَلۡبِكَ لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِيۡنَ

یہ قرآن کریم ___ ؟ یہ اللہ کی نازل کردہ چیز ہے۔ اے پیغمبر! یہ تمہاری بنائی ہوئی چیز نہیں ہے۔ انسانوں نے بیٹھ کر نہیں بنائی۔ یہ کسی پارلیمنٹ کا ریزولیشن نہیں ہے۔ یہ کسی کمیٹی کی تجویز اور مشروعات میں سے نہیں ہے۔

لَتَنۡزِيۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ

"یہ اللہ کا نازل کردہ کلام ہے"۔

اور نازل کرنے والا اللہ ___ ؟ اور کس کے ذریعے سے ___ ؟

نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِيۡنُ

روح الامین اس کو لے کر آئے جس میں خیانت کا کوئی ادنیٰ جذبہ نہیں۔ بلکہ کامل امانت دار فرشتہ جس کی شان ہی امین ہے۔ وہ اس کو لے کر آیا ہے۔

اور کہاں لے کر آیا؟

عَلٰى قَلۡبِكَ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر لاکر اتارا۔ جس قلب کے اندر غیر اللہ کے لئے گنجائش ہی نہیں تھی' فقط ایک اللہ کے لئے وہ قلب مستعد تھا تو اس قلب صافی کے اوپر جبریل امین لے کر آئے' اور نازل کرنے والا اللہ ہے ___ اور کیا لے کر آئے ___ ؟ کلام خداوندی اور صفت خداوندی لے کر آئے' اللہ کی ایک صفت لے کر آئے جو اس "عبد پاک" کے قلب پر ڈال دی گئی۔ وہ صفت خداوندی

سے متصف ہوگیا۔ اور وہ کمال خداوندی سے مکمل بن گیا اور وصف نبی سے موصوف بنا' اس پاک قلب کے اوپر یہ پاک چیز نازل کی گئی کہ اس علم کے اندر نہ شبہ کی گنجائش' نہ شک کی گنجائش۔ نہ وہم کی آمیزش' نہ خیالات کی آمیزش تو علم کے اعتبار سے دیکھا جائے تو قطعی اور اس کی کثرت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اوتیت علم الاولین والاخرین اگلے اور پچھلے سارے علوم ایک قلب مبارک میں جمع کردیئے گئے۔ تو کمیت دیکھیں تو اتنی بڑی کہ عالم کے تمام علوم کا سرچشمہ قلب مبارک کو بنادیا گیا' کیفیت کو دیکھا جائے تو اتنی قطعی کہ شبہ کی آمیزش کی گنجائش نہیں۔ تو جس کا علم اتنا کامل ہو کہ نہ کیفاً اس میں نقص کی گنجائش نہ کماً اس میں نقص کی گنجائش' نہ عدد کے لحاظ سے کمی' نہ کیفیت کے لحاظ سے کمی' تو اس سے بڑھ کر عالم کون ہوگا۔

اسی واسطے اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہی ہے کہ مخلوقات کے اندر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عالم کوئی نہیں ہے۔ آپ اعلم الخلائق اور اعلم البشر ہیں۔ سارے انسانوں میں' سارے ملائکہ میں سب سے زیادہ علم آپ کو دیا گیا' آپ کے علم کے مقابلہ میں ساری کائنات کا علم ایسا ہے جیسے سمندر کے مقابلہ میں قطرہ ___ البتہ یہ ضروری ہے کہ اللہ کے علم کے مقابلہ میں آپ کا علم ایسا ہے جیسے سمندر کے سامنے قطرہ' اس لئے کہ جو فرق خالق اور مخلوق میں ہے۔ وہی فرق خالق اور مخلوق کی صفت میں ہو سکتا ہے۔ وہی فرق خالق و مخلوق کے علم میں ہو سکتا ہے ___ لیکن مخلوق' مخلوق کو جب نسبت دی جائے تو نہ انبیاء علیہم السلام میں نہ ملائکہ میں' نہ اولیاء میں کسی کے اندر کوئی اتنا بڑا عالم نہیں۔ سب کے علوم کو جمع کیا جائے تو ایک ذات واحد امین بنی ہوئی ہے۔ تو جو اتنا بڑا عالم ہو۔ تو ظاہر بات ہے کہ الناس کلھم ھالکون الا العالمون سارے انسان تباہ و برباد ہیں اور علماء بچیں گے ___ تو علماء کے اندر اتنا بڑا عالم ہو کہ کائنات میں اس سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی نہ ہو۔ تو اس سے زیادہ درجہ نجات کا اور کسے مل سکتا ہے؟ اس سے بڑھ کر کمالات اور فوز و فلاح کا درجہ اور کس کے لئے ہو سکتا ہے؟ اور اس سے بڑھ کر کس کی سیرت اور مقدس ہو سکتی ہے تو سیرت کا ابتدائی جز جو علم کامل تھا' وہ اتنا ہے کہ عالم میں اس کی نظیر کوئی نہیں۔ سیرت بھی ایسی ہوگی کہ عالم میں اس سیرت کی نظیر کوئی نہیں۔

سارے انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں کو دیکھو تو سیرت محمدیؐ کے مقابلے میں کوئی نسبت نظر نہیں آئے گی' سارے انبیاء اور اولیاء کے اخلاق دیکھو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم کے سامنے کوئی نسبت نظر نہیں آئے گی۔

کمال عمل نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)

سارے کاملین کے اعمال صالحہ کو دیکھو' آپؐ کے عمل صالح کے مقابلے میں کوئی نسبت نہیں معلوم ہوگی ___ امت کا عقیدہ یہ ہے اور صحیح عقیدہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سجدہ ساری امت کی لاکھوں برس کی عبادات سے زیادہ ہے۔

وجہ اس کی صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ عمل کی صورت کو نہیں دیکھتے عمل کی حقیقت کو دیکھتے ہیں۔ جس عمل کے اندر اخلاص کامل اور معرفت کامل ہو' وہی عمل وزن دار ہوتا ہے۔ تو آپؐ سے زیادہ اخلاص والا کون ہے ___ ؟ آپؐ سے زیادہ عارف باللہ کون ہے؟ آپؐ سے زیادہ حسن نیت رکھنے والا کون ہے؟ کہ جن کی جوتیوں کی نسبت سے لاکھوں مخلص بن گئے' کروڑوں اخلاص والے بن گئے' جن کی جوتیوں کے طفیل سے حسن نیت کے پہچاننے والے پیدا ہوئے کہ نیت کہتے کسے ہیں؟ حسن نیت کے معنی کیا ہیں؟ تو جس ذات

بابرکات میں اخلاص وہ ہو جس کی نظیر نہ ہو' اس کے عمل میں جتنا وزن ہوگا' اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے ایک سجدے میں اتنا وزن ہوگا کہ عالم کے سارے سجدوں میں اتنا وزن نہیں ہو سکتا۔ اس واسطے ایک سجدہ عالم کے سجدوں سے بڑھ کر ہوگا' تو سب سے بڑا علم' آپ کی ذات بابرکات میں ہے۔ تو یہ سیرت کا ایک عنصر ہوا۔

معیار اعمال

دوسرا عنصر ___ ؟ وہ عمل صالح ہے ظاہر بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل صالح سے بڑھ کر کس کا عمل صالح ہو سکتا ہے۔ جو عمل کا معیار ہے' اور اسوہ اور کسوٹی ہے۔ عامل کے عمل کو پہچاننے کی کسوٹی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے کہ اس کے مطابق ہے تو عمل مقبول ورنہ مردود ___ غرض جس کا عمل معیار اور کسوٹی ہو' جس سے عمل کو پرکھ کر عمل کو ناقص اور کامل کہہ سکیں' تو جس عمل کی حقیقت یہ ہے تو حقیقی معنی میں عمل وہی ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی عمل' عمل نہیں' اس لئے کہ وہ عمل دوسرے اعمال کو بنانے والا ہے۔ وہ عمل نہ ہو تو دوسروں کے عمل ہی نہ بنیں۔ تو جو عملوں کا سرچشمہ اور تخم ہو کہ جس سے اعمال سرزد ہو رہے ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ اس عمل کی عظمت اور قدر و قیمت کتنی ہوگی۔ تو علم تو یہ کہ اولین و آخرین کے جامع ہوں اور عمل یہ کہ سب کے اعمال کا سرچشمہ ہوں۔ اگر اس عمل پر منطبق ہیں تو وہ عمل ہیں۔ ورنہ نہیں۔ اس لئے سیرت کا دوسرا جوہر وہ عمل پاک ہے ___ اس عمل کے بارے میں یہی کہا جائے گا اور یہی عقیدہ رکھا جائے گا اور یہ عقیدہ ہے کہ آپؐ اگر تھوڑا سا بھی عمل کریں تو امت کے لاکھوں برس کے عملوں سے بھی وہ عمل اونچا ہے۔

امر حقیقت

اور ___ عیاذاً باللہ! ___ یہ محض کوئی شاعریت نہیں ہے۔ یا معاذ اللہ! محض حسن عقیدت سے نہیں کہا جا رہا ہے۔ بلکہ یہ امر حقیقت ہے۔

حدیث میں یہ واقعہ فرمایا گیا ہے کہ بعض صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی کے جانچنے کا ارادہ کیا کہ آپؐ کی گھریلو زندگی کیا ہے؟ ___ تو تین آدمی آئے' آپؐ بیت نبوت میں موجود نہیں تھے ___ بعض ازواج مطہراتؓ سے انہوں نے پوچھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کیا ہے؟

ان کے ذہنوں میں یہ تھا کہ گھر میں آپ ہر وقت تسبیح و تہلیل اور نماز میں مشغول رہتے ہوں گے ___ تو پوچھا کہ آپؐ کی گھریلو زندگی کیا ہے؟

تو صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جواب میں یہ کہا گیا کہ جیسے گھر ہستیوں کی زندگی ہوتی ہے وہی آپ کی زندگی ہے۔ آپؐ نماز بھی پڑھتے ہیں۔ ذکر اللہ بھی کرتے ہیں۔ موقع اور ضرورت ہوتی ہے تو گھر میں جھاڑو بھی دے لیتے ہیں' برتنوں کو مانجھ بھی لیتے ہیں۔ آپؐ اپنا جوتا بھی گانٹھ لیتے ہیں۔ کپڑا پھٹ جاتا ہے تو بیٹھ کر سی بھی لیتے ہیں۔ ازواج مطہرات سے بیٹھ کر بات چیت بھی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مزاح بھی فرما لیتے ہیں۔ کبھی ازواج مطہرات سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ کوئی کہانی سنا دو' کوئی قصہ سنا دو۔ تو جیسے گھر ہستیوں کی حالت ہوتی ہے۔ ویسی آپؐ کی حالت ہے ___ تو سن کر **کانھم تقالوھا**

ان تینوں صاحبوں نے اس عمل کو کم سمجھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل کم ہے ___ مگر اپنی

طرف سے عذر یہ بیان کیا کہ حضور کی ذات مبارک تو وہ ہے کہ اللہ نے آپ کی اگلی اور پچھلی زلتیں پہلے ہی معاف کر دی ہیں۔ اس لئے اگر آپ بالکل ہی عمل نہ کریں تب بھی آپ مقامات میں سب سے اونچے ہیں اور جنتوں میں سب سے اونچے ہیں ــــــ مگر یہ عمل کم ہے ــــــ یہ وہ سمجھے۔ گویا عذر یہ بیان کر دیا' اگر آپ اتنا بھی عمل نہ کریں تب بھی آپ کے مراتب میں فرق نہیں آسکتا ــــــ اس کے بعد تینوں نے باہم ایک دوسرے کے سامنے عہد کیا اور کہا کہ یہ عمل تو کم ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اب ہم اپنی گھریلو زندگی کیسے بنائیں تو ایک نے کہا کہ **اما انا فاصلی اللیل ابداً** ــــــ میں عہد کرتا ہوں کہ اب عمر بھی کبھی نہیں سوؤں گا۔ اور پوری رات نماز کے اندر مشغول رہوں گا۔

دوسرے نے کہا :

انا اصوم النهار ابداً ولا افطر

"میں عہد کرتا ہوں کہ ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا' کبھی بھی افطار نہیں کروں گا"۔

تیسرے نے کہا :

انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابداً

"میں عہد کرتا ہوں کہ عورتوں سے دور رہوں گا اور کبھی بھی نکاح نہیں کروں گا"۔

تو یہ ان تینوں نے باہمی عہد و پیمان کیا۔ ہمیشہ قیام وصیام اس شخص کی نسبت جو رات کو سوتا بھی ہو اور قیام بھی کرتا ہو' دن کو روزہ بھی رکھتا ہو اور افطار بھی کرتا ہو بظاہر اونچے درجے کا عمل معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح نکاح کے بعد جو ذمہ داریاں اور بیوی بچوں کے مشاغل بڑھ جاتے ہیں اور عبادت کے لئے موانع پیش آتے ہیں تو اس جذبے سے ترک نکاح کرنا کہ ہمیشہ عبادت کرتا رہوں اور بیوی بچے مخل نہ ہوں' اس شخص کی نسبت جو بیوی بچوں کے مشاغل کے ساتھ عبادت کرتا ہو۔ اونچے درجے کا عمل معلوم ہوتا ہے۔ گویا مخلوق کے ساتھ تعلق کا کوئی درجہ نہیں' حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ ہی تعلق محض ہے۔

تو ترک تعلقات اور عدد کے لحاظ سے یہ عبادات گویا اونچے درجے کی معلوم ہوتی ہیں۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور استفسار فرمایا :

انتم الذین قلتم کذا وکذا اما واللہ انی لاخشاکم واتقاکم له

تم لوگوں نے ایسی ایسی گفتگو کی ہے۔

خدا کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ متقی ہوں' تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں' تم میں سب سے زیادہ خوف وخشیت والا ہوں ــــــ اور اس طرف اشارہ کیا کہ تم لوگوں نے عبادت کے معنیٰ غلط سمجھے' رات بھر نماز پڑھو تو یہ عبادت ہے' دن بھر روزے رکھے جائیں تو یہ عبادت ہے' بیوی اور نکاح چھوڑ دیں تو یہ عبادت ہے ــــــ عبادت کے معنی یہ ہیں کہ پوری زندگی اللہ کے احکام کے نیچے گزرے' یہ عبادت ہے۔ دوستوں سے باتیں کرنا بھی عبادت ہے' گھر میں بیوی سے معاملہ کرنا بھی عبادت ہے۔ تہجد پڑھنا بھی عبادت ہے۔ یہ تمام چیزیں عبادت میں داخل ہیں۔ جو حق تعالیٰ شانہ نے زندگی بنائی ہے اس زندگی کو اللہ کے احکام کے نیچے جاری رکھنا یہ فی الحقیقت حقیقی عبادت ہے' اس لئے فرمایا کہ :

فان لجسدک علیک حقاً وان لاهلک علیک حقاً۔ وان لعینک علیک حقاً۔ لصم ونم وقم

تم پر تمہارے بدن کا بھی حق ہے' تم پر تمہاری بیوی کا بھی حق ہے ــــــ تم پر تمہاری آنکھوں کا بھی حق ہے۔ تو تم جاگ کر اللہ کی عبادت کرو کہ اللہ کا حق ادا ہو' اور تم رات کو سو بھی جاؤ تاکہ نفس کا حق ادا ہو' تم

جہاد بھی کرو' تاکہ اللہ کا حق ادا ہو۔ اور تھوڑی دیر اس سے ہٹ کر اہل وعیال میں رہو تاکہ بیوی بچوں کا بھی حق ادا ہو ___ تو تم سوؤ بھی' جاگو بھی' روزہ بھی رکھو' افطار بھی کرو۔ یہ سارے کام کرو تو کہا جائے گا کہ تم نے عبادت کی ___ تو عبادت کو تم نے فقط نماز اور روزے میں محدود کر دیا۔ اپنی پوری زندگی کو اللہ کی رضا کے تحت گزارنے کو عبادت کہتے ہیں ___ انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء علیہ الصلوۃ والسلام سے زیادہ اس زندگی کو گزارنے والا کوئی اور نہیں۔

کمال اخلاص نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)

اس موقع پر آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ نمازیں پڑھنے والا ہوں' اس لئے میرا اجر زیادہ ہے' اور میں تم سب سے زیادہ روزے رکھنے والا ہوں ___ بلکہ اگر گنا جائے اور شمار کیا جائے تو شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی تعداد سے امتیوں کی تعداد بڑھ جائے۔ وہ دن بھر رات بھر ہی کرتے رہے۔ تو "عبادت کا عدد" نہیں پیش کیا۔ فرمایا :

انی اخشاکم باللّٰہ واتقاکم للّٰہ

میرے اندر اللہ کا خوف تم سب سے زیادہ ہے' تقوی تم سب سے زیادہ ہے۔ تو آپ نے "عمل کی روح" پیش کی کہ اس کامل تقوی اور خوف وخشیت کے ساتھ ایک سجدہ بھی ہوگا تو وہ تم سب کی ہزاروں برس کی عبادت سے زیادہ بڑی عبادت شمار ہوگا" گویا عبادت کی اصل بنیاد وہ اخلاص للہ ہے' وہ خشیت للہ ہے۔ وہ تقویٰ باطن ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر بھی اللہ سے ڈرے ___ اس تقوی باطن کے ساتھ جو عبادت ہوگی وہ اکمل ترین عبادت ہوگی ___ غرض جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم کامل اور جامع ہے کہ اولین و آخرین کے علم کا مجموعہ ہے اور جہاں آپ کا عمل کامل ہے۔ وہیں آپ کا تقوی اور اخلاص بھی اتنا کامل ہے کہ ساری امتوں کا اخلاص مل کر بھی وہ اخلاص نہیں ہو سکتا جو اللہ نے آپ کو اخلاص عطا کیا ہے۔ ___ اس لئے کہ جو قلب مبارک آپ کو دیا گیا وہ قلب کسی اور کو عطا نہیں کیا گیا' جو جسد مبارک اور روح پرفتوح آپ کو دی گئی وہ روح اور جسم کسی اور دوسرے کو نہیں دیا گیا' تو اس ظرف میں جو چیزیں بھریں وہ آپ ہی کے ظرف میں بھر سکتی تھیں۔ دوسرے ظروف میں نہیں آسکتی تھیں ___ غرض علم و عمل بھی انتہائی کامل اخلاص للہ بھی انتہائی کامل۔

کمال فکر نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)

اور آگے رہ گیا ___ فکر ___ کہ آخرت سے ڈرنا اور مطمئن نہ ہونا۔ اس کا عالم یہ ہے کہ حدیث میں آپ فرماتے ہیں :

> "نماز پڑھ کر جب میں ایک سلام پھیرتا ہوں تو مجھے یہ توقع نہیں ہوتی کہ دوسرے سلام کا مجھے موقع ملے گا یا نہیں ملے گا"۔

اس درجہ گویا آپ خطرہ اور خوف آخرت محسوس فرماتے تھے اور اپنی موت کی یادگاری اور تذکر' یہ اس درجہ پر ہے کہ فرماتے ہیں۔ ایک سلام پھیر کر دوسرے کی توقع نہیں ہوتی۔ یہ آپ کے فکر آخرت کی حالت ہے۔

حدیث میں ہے کہ :

كان دائم الفكرة حزينا

آپ ؐ اکثر اوقات دائم الفکر رہتے، جیسے کوئی فکر مند بیٹھا ہو، کوئی غمگین بیٹھا ہو اور حزن و غم میں ہو، وہ فکر آخرت تھا، ہمہ وقت آخرت پیش نظر تھی، تو یہ انبیاء علیہم السلام ہی کو کمال دیا گیا ہے کہ ساری دنیا والوں کے حقوق ادا کریں اور فکر آخرت بدستور قائم رہے۔ آپ ؐ گھر میں بھی تشریف لاتے ہیں، بیوی بچوں سے بھی معاملہ ہے۔ صحابہؓ سے بھی معاملہ ہے، حکومت کے فیصلے بھی آپ انجام دے رہے ہیں، فصل خصومات اور جہاد بھی ہو رہے ہیں، غنائم بھی تقسیم ہو رہی ہیں۔ مگر "فکر آخرت" ہمہ وقت بدستور ہے، بلکہ سارے اعمال کا وہی منشاء ہے اسی سے یہ سارے اعمال انجام پا رہے ہیں تو آپ ؐ سے زیادہ متفکر کون ہے؟

روح ایمان

اسی کو آپ ؐ نے فرمایا کہ ایمان درحقیقت "خوف اور رجاء" کے مجموعے کا نام ہے۔ یعنی نہ محض ڈرنے کا نام ایمان ہے۔ نہ محض امید باندھنے کا نام ایمان ہے۔ بلکہ یہ دونوں کیفیتیں جمع رہیں۔ امید بھی بندھی ہوئی ہو اور خطرہ بھی لگا ہوا ہو، تو فکر پیدا ہو جائے گا۔ یہی فی الحقیقت ایمان کی روح ہے۔

قرآن کریم میں دو لفظ فرمائے گئے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :

لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۔ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ

"اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ خدا کی رحمت سے مایوس ہونے والے کفار ہیں"۔

اس میں امید بتلائی گئی کہ اگر تم میں اللہ سے امید نہیں ہوگی۔ تو تم میں ایمان موجود نہیں۔ یہ کفار کا کام ہے کہ اللہ سے ناامید ہو جائیں۔ غرض اس میں رجا بتلائی گئی۔

اور ایک دوسرے موقع پر فرمایا :

فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ

"اللہ کی خفیہ تدبیر سے مطمئن بیٹھنے والے ہمیشہ گھاٹے میں رہیں گے"۔

تو مطلب یہ کہ مطمئن ہو کر مت بیٹھو، خوف اور فکر لگا رہے، تو اس میں گویا خوف بتلایا گیا ___ غرض پہلی آیت سے امید بتلائی گئی۔ دوسری آیت سے خوف بتلایا گیا اور خوف اور امید کے بیچ میں ایمان ہے۔ نہ محض امید باندھنے کا نام ایمان ہے اور نہ محض ڈرتے رہنے کا نام ایمان ہے۔

فکر عظیم

عمل جب بھی کرے گا وہی کرے گا، جسے امید بھی لگی ہوئی ہو۔ خطرہ بھی لگا ہوا ہو۔ جو محض امید میں غرق ہے وہ خادم کبھی عمل نہیں کر سکتا۔ محض خوف زدہ خادم ہو وہ کبھی عمل نہیں کر سکتا۔ جس کو ہر وقت آقا سے امید ہے کہ چاہے برا کروں چاہے بھلا کروں، چاہے ہزار دم گناہ کر لوں مگر بخشش ہی ہو جائے گی۔ آخر میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ سوچے گا کہ پھر عمل کی مصیبت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب آقا اتنا کریم ہے کہ بخش ہی دے گا، پھر میں خوامخواہ کیوں محنت اٹھاؤں، بخشا تو جاؤں گا۔ تو وہ عمل سے معطل ہو جائے گا، جس نے فقط امید باندھی۔

اور جسے ہر وقت خوف ہی خوف لگا ہوا ہو کہ کچھ ہی محنت کرلوں مگر جوتیاں ہی پڑیں گی، کچھ ہی محنت کرلوں مگر پٹائی ہوگی، وہ کہے گا پھر عمل کی کیا مصیبت ___؟ جب اول بھی جہنم اور آخر بھی جہنم تو کیوں خواہ مخواہ محنت اٹھائی ___ وہ بھی عمل سے معطل ہو جائے گا، تو خوف محض میں رہنے والا بھی کبھی عمل نہیں کر سکتا۔ اور امید محض میں غرق ہونے والا بھی کبھی عمل نہیں کر سکتا۔ عمل کون کرے گا ___؟

ایک طرف امید لگی ہوئی ہے کہ نیک کام کئے تو اجر ملے گا، اور ثواب ملے گا۔ ایک طرف خوف لگا ہوا ہے کہ اگر ذرا معصیت کی تو جہنم بھی تیار ہے۔ تو "امید و بیم" کے مجموعے سے انسان کے عمل کی گاڑی چلتی ہے۔ یہ دو بازو ہیں۔ ان دو بازوؤں سے عمل اڑتا ہے۔ تو ایمان خوف اور رجا کے مجموعے کا نام ہے کہ اللہ سے امید بھی بندھی ہوئی ہو اور ڈر بھی لگا ہوا ہو۔ اس لئے محض ڈر بھی ایمان نہیں اور محض امید باندھنا بھی ایمان نہیں ___ ان دونوں کے بیچ میں رہنا یہی "تفکر" کہلاتا ہے۔ یہی فکر عظیم کہلاتا ہے کہ ممکن ہے کہ میرا عمل صحیح نہ ہو، گرفت ہو جائے اور ممکن ہے کہ یہ گناہ بخشا جائے۔ میں توبہ کیوں نہ کرلوں، مالک میرا رحیم وکریم ہے، تو اللہ کی رحمت پر بھی نظر ہو اور اس کے جبر و قہر پر بھی نظر ہو۔ اس پر بھی نظر ہو کہ۔

نَبِّئْ عِبَادِیْ اَنِّیْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ

اور اس پر بھی نظر ہو کہ:

وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ

اے پیغمبر! میرے بندوں کو اطلاع کردو کہ میں بہت بڑا غفور الرحیم ہوں اور یہ بھی کہہ دو کہ میرا عذاب بھی بہت بڑا سخت عذاب ہے۔ ایسا عذاب بھی کوئی دوسرا نہیں دے سکتا جیسا میں دے سکتا ہوں ___ تو دونوں شانیں بتلائی گئیں کہ رحمت کا طالب بنایا اور عذاب سے ڈرنے والا بنایا۔ تو دونوں باتیں ایک حالت میں انسان میں مطلوب ہیں۔ اسی کا نام ایمان رکھا گیا ہے تو فکر کامل ہوگا تو ایمان کامل ہوگا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فکر کو دیکھا جائے۔ تو فرمایا گیا کہ:

کان دائم الفکرۃ حزینًا

آپ دوامی طور پر، ہمیشہ چوبیس گھنٹے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فکر میں غرق اور مستغرق ہیں۔ تو آپؐ سید المتفکرین ہیں، سید المفکرین ہیں۔ عالم میں اتنا فکر کسی کو نہیں دیا گیا جتنا آپؐ کو دیا گیا ___ اتنا بڑا اخلاص کسی میں نہیں تھا جو آپ کو دیا گیا، اتنا بڑا عمل صالح کسی میں نہیں تھا جو آپ کو دیا گیا۔ اتنا بڑا علم نافع اور کامل کسی میں نہیں تھا جتنا آپ کو دیا گیا۔

جب انسانیت کی سیرت ان چار جزوں سے بنتی ہے تو جس انسان میں یہ چار جز علی وجہ الاتم موجود ہوں گے، اس کی سیرت بھی "اکمل السیر" ہوگی، اس کی سیرت سب سے اونچے درجے کی سیرت ہوگی کہ کوئی سیرت اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی، کوئی سیرت اس کے پاس نہیں پھٹک سکے گی۔

دستورِ زندگی

اس سیرت کے جو لوگ مخاطب بنائے گئے ہیں۔ وہ مسلمان ہیں وہ دنیا کے سارے انسان ہیں جن کے سامنے یہ سیرت پیش کی گئی ہے اور اس لئے پیش کی گئی کہ اس سیرت کو کسوٹی بنا کر ہم اپنی سیرتوں کو اس کے اوپر پرکھیں کہ اس سیرت پاک سے کس حد تک ہماری عادات اور خصائل مطابقت کھاتی ہیں۔ اور کس حد تک ہم اس سے ہٹے ہوئے ہیں اور منحرف ہیں۔

غرض سیرت کا بیان اس لئے نہیں ہوتا کہ یہ کوئی کہانی ہے کہ اسے سنا دیا جائے' یہ کوئی قصہ ہے کہ اسے پڑھ کر پیش کردیا جائے' یہ تو ایک معیار اور دستور زندگی ہے۔ اس لئے پیش کی جاتی ہے کہ گھر جاکر ہر شخص اپنی زندگی کو اس سیرت کے اوپر پیش کرے۔ آیا میرے اندر علم نافع ہے یا نہیں؟ جس سے میں حق و باطل میں امتیاز کرسکوں' آیا میرے اندر عمل صالح ہے یا نہیں؟ جو میرے لئے نجات کا ذریعہ بنے۔ آیا میرے اندر اخلاص ہے؟ نفاق تو نہیں ہے کہ میرا عمل قابل قبول ہوسکے اور آیا میرے اندر فکر موجود ہے؟ یا میں بے فکری سے زندگی گزار رہا ہوں' میری کیفیت کیا ہے؟ انہی کیفیات کو جانچنے کے لئے سیرت مقدسہ کسوٹی ہے جو آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔

کتاب وسنت کی چٹان

قرآن کریم آپ کے سامنے اصول پیش کرتا ہے۔ یہ تو علم ہے اور ذات محمدی (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام) کردار پیش کرتی ہے کہ یہ کسوٹی اور معیاری کردار ہے۔ اس پر اپنے عمل کو پرکھو' تو عقائد کو قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھو کہ وہ صحیح ہیں یا غلط ہیں؟ اور عمل کو ذات محمدی (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام) کے اسوۂ حسنہ کے اوپر پرکھو کہ کس حد تک عمل مطابقت کھاتا ہے؟ کس حد تک نہیں؟

اسی کو آپ ؑ فرماتے ہیں :

ترکت فیکم الثقلین لن تضلوا بعدی ابداً ان تمسکتم بهما

"میں دو وزنی چیزیں تم میں چھوڑ کر جاؤں گا۔ اگر تم ان سے تمسک کرتے رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے' کبھی راستے سے نہیں بھٹک سکو گے"۔

وہ دو چیزیں کیا ہیں؟

کتاب اللّٰہ وسنتی

"اللہ کی کتاب اور میری سنت اور طریقہ کار"۔

ان دو چیزوں کو آپ ؐ نے ثقلین وزنی چیزیں فرمایا۔ یعنی بھاری چیزیں ___ یہ اس لئے فرمایا کہ؟

جب فتنوں کے طوفان آتے ہیں اور فتنوں کا' فسق کا' کفر کا' فجور کا' اور منکرات کا دریا چڑھتا ہے' اس وقت اگر آپ نے کسی تنکے سے تمسک کیا تو طوفانوں میں تنکا بہہ جائے گا اور آپ بھی بہہ جائیں گے۔ اگر جان بچانے کے لئے کسی شہتیر کو پکڑا تو طوفانوں میں شہتیر نہیں ٹھہرا کرتے۔ وہ بھی بہہ جائیں گے' آپ بھی بہہ جائیں گے' اسی طرح اگر آپ نے کسی درخت سے تمسک کیا تو درخت کو طوفان جڑ سے اکھاڑ کر لے جائے گا' وہ بھی بہے گا' آپ بھی بہہ جائیں گے ___ لیکن اگر آپ کسی ایسی چٹان کو پکڑلیں جو عظیم الشان پہاڑ کی مانند ہو کہ لاکھ طوفان آئیں مگر اس کو ہلا نہ سکیں' تو چٹان ہل سکے گی نہ آپ بہیں گے' طوفان کا کوئی اثر نہیں ہوگا ___ تو کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ثقلین فرمایا۔ یعنی اتنی وزنی چیزیں ہیں کہ کتنے ہی بڑے فتنوں کے اور گمراہیوں کے جھکڑ چلیں لیکن کتاب وسنت کی چٹان کو جس نے پکڑ رکھا ہے' وہ بھی اپنی جگہ سے ہلنے والا نہیں ہے' اس کے علاوہ جس چیز سے بھی تمسک کروگے' ہر چیز بہنے والی ہے۔ اتنی قوی نہیں ہے' وہ بھی بہے گی اور آپ بھی بہیں گے' تو ایک طرف قرآن کریم کو رکھا اور ایک طرف سنت کو رکھا' جس کے معنی سیرت محمدی ؐ اور اسوہ حسنہ کے ہیں تو حدیث اسوہ حسنہ کو پیش کرتی ہے اور قرآن کریم علم کو پیش کرتا ہے۔ تو قرآن کریم پر اپنے فکر کو جانچو کہ عقائد صحیح ہیں یا نہیں ___ ؟ اور عمل کو نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم کے اسوہ حسنہ پر جانچو، جس حد تک مطابقت کھا جائے، سمجھو کہ حق ہے، جس حد تک انحراف کرے، سمجھو کہ غلط ہے، دیوار پر مارنے کے قابل ہے، ان کی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔

اسوۂ صحابہؓ

آپؐ نے اس میں اور زیادہ سہولت پیدا فرمادی۔ اور وہ یہ کہ آپؐ کی ذات بابرکات تو معیار اور کسوٹی ہے ہی۔ اس پر علم وعقیدہ اور عمل کو پرکھا جائے، آپؐ نے اپنے ساتھ اپنے صحابہؓ کو بھی شامل کرلیا کہ وہ بھی معیار اور کسوٹی ہیں۔ اگر آپ اپنے علم وعمل کو ان کے اوپر پرکھو گے تو بھی حق وباطل کا پتہ چل جائے گا ___ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی تو بہت ارفع اور اعلیٰ ہے۔ ہر کس وناکس کا پہنچنا تو بجائے خود ہے اس کی بلندی کو نگاہ اٹھا کے دیکھ بھی نہیں سکتا ___ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر ہر قسم کے نمونے موجود ہیں۔ ان میں تاجر بھی ہیں، زراعت کرنے والے بھی ہیں، فقہاء بھی ہیں، علماء بھی ہیں، حکماء بھی ہیں، گھر میں بیٹھنے والے بھی ہیں، خلوت پسند بھی ہیں، جلوت پسند بھی ہیں، مجاہد بھی ہیں، مجاہدہ پسند بھی ہیں۔ ہر نمونہ موجود ہے۔ تو فرمایا کہ میرے صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں، جس کی روشنی میں چلو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

بايهم اقتديتم اهتديتم

تو واضح فرمادیا کہ میری ذات تو ہے ہی معیار، میرے صحابہؓ بھی تمہارے علم وعمل کے پرکھنے کا معیار اور کسوٹی ہیں ___ یعنی بالذات تو میں معیار ہوں، لیکن جسے میں معیار بتلادوں وہ بھی معیار ہے۔ تو آپؐ نے اپنے صحابہؓ کو معیار بتلایا۔

معیار صحابہؓ

حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ:

یہود ونصاریٰ میں بہتر فرقے ہوئے، اور میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے۔

كلها فى النار الا واحدة

سب کے سب ہلاکت میں پڑنے والے ہوں گے حقیقی معنی میں ایک نجات پائے گا ___ یعنی آخرت میں اعمال کی وجہ سے بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جن کو سزا مل جائے گی ___ گو وہ انجام کار چھٹکارا پالیں گے لیکن عقائد کی وجہ سے جن کو ہلاکت نصیب ہوگی وہ بہتر فرقے ہوں گے تہتر واں فرقہ وہ ہے کہ عقائد کی وجہ سے اس پر کوئی وبال نہیں ہوگا، کوئی عملی خرابی یا کھوٹ ہوا تو معاف کردیں گے؟ یا سزا دے دیں گے ___ تو فرمایا کہ:

كلها فى النار الا واحدة

"یہ سب کے سب ناری ہوں گے، ایک ناجی ہوگا"۔

اس پر صحابہؓ نے عرض کیا:

یا رسول اللہ! وہ ناجی فرقہ کونسا ہے؟

آپؐ نے فرمایا:

ما انا عليه اليوم واصحابى

''آج کے دن جس چیز پر میں ہوں اور میرے صحابہؓ ہیں''۔

یہی فی الحقیقت معیار ہے ___ تو اپنی ذات کو پیش کیا اور اپنے صحابہؓ کو پیش کیا ___ جس کا حاصل یہ نکلا کہ میرے صحابہؓ اور میرے عقیدے میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کا عقیدہ ایک ہے۔ میرے عمل کی نوعیت میں اور میرے صحابہؓ کے عمل کی نوعیت میں فرق نہیں، جو میرا عمل ہے وہ ان کا عمل ہے۔ جو میرا فکر ہے وہ ان کا فکر ہے، جو میرے مقاصد ہیں وہ ان کے مقاصد ہیں۔ اپنی نوعیت میں اپنے صحابہؓ کو شریک کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ تہتر فرقوں میں سے حق و باطل کو پرکھنے کے لئے ایک میں معیار ہوں اور ایک صحابہؓ معیار ہیں۔ ان پر تم اپنے آپ کو پیش کرو، جس حد تک مطابقت کھا جائے، سمجھو کہ حق پر ہے۔ جس حد تک منحرف ہو جاؤ، اس کی اصلاح کرو۔ سمجھو کہ یہ تمہارے اندر باطل ہے اور ناحق کی بات ہے۔ تو صحابہؓ کو کسوٹی بتایا۔

طبقۂ صحابہؓ کی تقدیس

گویا کسی طبقے کو من حیث الطبقہ آپ نے بجز صحابہؓ کے کسی کو مقدس نہیں بتلایا۔

امت کے اندر ___ افراد آئیں گے جو کامل اور مکمل ہوں گے۔ مگر طبقہ کا طبقہ مقدس ہو۔ اس میں سے کوئی مستثنیٰ نہ ہو۔ یہ صرف صحابہؓ کا معیار ہے، تو جب یہ معیار قرار پا گیا تو آپ دیکھ لیجئے کہ صحابہؓ معیار بن گئے۔

جس شخص کے اندر صحابہؓ کی عظمت اور محبت دیکھیں سمجھو کہ حق پر ہے۔ اگر محبت نہیں انہیں سبّ و شتم کرتا ہے یا انہیں گالم گلوچ کرتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو گا کہ وہ ناحق ہے وہ حقانی نہیں کہلائے گا۔

اگر صحابہؓ کے بارے میں یہ سمجھے کہ وہ سب کے سب متقی، پارسا اور پاکباز ہیں، ان کی نیتیں صادق ہیں، ان کے قلوب کا رخ سچا ہے تو سمجھا جائے گا کہ وہ حق پر ہے اور جو طبقہ یہ کہے گا کہ معاذ اللہ ان میں تو منافق بھی تھے ___ ان میں تو غلط کار بھی تھے۔ انہیں گالم گلوچ کرے، سمجھ لیجئے کہ وہ ناحق پر ہے۔ گویا ایک سیدھا سادہ معیار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرقوں کے حق و باطل ہونے کے بارے میں بتلا دیا ___ تو جو سبّ و شتم کرے، وہ بھی ناحق، جو قتل صحابہؓ کے درپے ہو وہ بھی ناحق۔ جو یوں کہے کہ ہم معیار ہیں، صحابہؓ معیار نہیں ہیں۔ ہم ان پر نقد و تبصرہ کر سکتے ہیں وہ ہم پر نہیں کر سکتے۔ سمجھو کہ بطلان کی بات ہے۔ کوئی حقانیت کی بات نہیں ہے ___ غرض ایک سیدھا سا معیار فرقوں کے حق و باطل اور خطا و صواب کے پہچاننے کا بتلا دیا کہ مجھے دیکھ لو۔ اور میرے صحابہؓ کو دیکھ لو۔

اعلان رضا

بہرحال قرآن کریم نے جب طبقہ کی تقدیس کی ہے وہ صحابہؓ کا طبقہ ہے۔ فرمایا کہ :

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

''وہ مہاجرین و انصار ___ اور بعد میں جو مہاجرین و انصار میں ملتے رہے، وہ سب کے سب ___ کون ہیں؟''۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

''اللہ ان سے راضی وہ اللہ سے راضی''۔

مشترکہ اعلان رضا کیا ___ اللہ ان سے کبھی راضی نہیں ہو سکتا، جن کے دل میں کوئی ادنیٰ کھوٹ اور ٹال ٹیک ہو، ان سے کبھی رضائے مطلق کا اعلان نہیں ہو سکتا۔

رضا کا اعلان ہے۔ اور قرآن کریم میں اعلان ہے ___ اور قرآن کریم قیامت تک بلکہ آگے تک چلنے والی ایک عظیم کتاب ہے۔ گویا ابد الآباد تک یہ اعلان ہوتا رہے گا۔ تو قیامت تک بھی یہ اعلان غلط نہیں ہو سکتا، اور قیامت کے بعد بھی یہ اعلان غلط نہیں ہو سکتا، تو قرآن کریم دہراتا رہے گا کہ :

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

اللہ ان سب مہاجرین و انصار سے راضی اور ان سے بھی جو ان میں بعد میں ملے۔ یعنی کل کے کل مرضی خداوندی میں ہیں ایک بھی ایسا نہیں جس سے اللہ تعالیٰ ناراض یا ناخوش ہوں ___ پہلے تو مطلق جماعت صحابہؓ سے اپنی رضا کا اعلان کیا ___ اور یہ نہیں کہ اولین مہاجرین و انصار کو لے لیا ہو، بلکہ فرمایا :

وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ

جو احسان کے ساتھ بعد میں ان کے ساتھ ملتے رہے اور ان کی جماعت میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ سب اس اعلان رضا میں شامل ہیں۔ گویا مطلق صحابہؓ کی تقدیس ہوئی کہ وہ سب مرضی اور پسندیدہ ہیں۔

پھر طبقاتی طور پر تقدیس کی، چنانچہ ایک جگہ اصحاب حدیبیہ کے بارے میں فرمایا :

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ

"اللہ تعالیٰ ان ایمان والوں سے راضی ہے جنہوں نے کیکر کے درخت کے نیچے اے نبی! تمہارے ہاتھ پر بیعت کی ہے"۔

ان کے لئے بھی رضا کا اعلان ہے۔

اعمال صحابہؓ کی تقدیس

پھر ایک آیت میں ان کے عمل کو سراہا ___ ارشاد فرمایا :

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں ___ اور جو ان کے ساتھ ہیں، ان کی شان یہ ہے کہ ان میں کفر کے اوپر شدت ہے اور باہمی طور پر ان میں رحمت ہے ___ اور ان کا طریقہ کیا ہے؟

تم انہیں دیکھو گے، کہیں رکوع میں ہیں، کہیں سجدوں کے اندر ہیں۔ اللہ کے فضل کو جابجا تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ہر جگہ خدا کا فضل ان کے پیش نظر ہے۔ ابتغاء وجہ اللہ اور ابتغاء مرضات اللہ یہ ان کا شیوہ ہے۔

کمال معرفت صحابہؓ

اور اس درجہ ان میں ایمان بھر گیا اور اس درجہ ان کے قلبی مقامات پاک ہیں کہ بالکل اس طرح ہے کہ جب کسی چیز سے ظرف بھر جاتا ہے تو اخیر میں چھلک پڑتا ہے تو فرمایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس درجہ ایمان سے بھرپور ہیں کہ چھلک کر ان کے ایمان کی ان کی پیشانیوں پر علامت پیدا ہو گئی ہے۔ جس کو ارشاد فرمایا :

سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ

''سجدوں کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشانات پڑے ہوئے ہیں''۔

گویا اندرونی ایمان کی اوپر تک علامت آگئی ہے اور اندرونی کمال معرفت کی علامت اوپر چھلک پڑی ہے۔ اور پھر یہ بھی فرمادیا کہ :

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ

یہ قرآن ہی ان کے اوصاف کو نہیں سراہ رہا' یہی مثال ان کی تورات میں بھی ہے۔ یہی انجیل میں بھی ہے''۔

تو اولین بھی ان کی مدح کرتے آئے ہیں ___ اور آخرین بھی ان کی مدح کرتے چلے جائیں گے ___ تو اللہ کے ہاں جو ممدوح' اللہ کے نیک بندوں کے ہاں ممدوح ہے' اولین و آخرین شہادت دے رہے ہیں۔ اور قیامت تک دیتے رہیں گے ___ وہ طبقہ صحابہؓ کا طبقہ ہے ___ تو اس طبقہ کے اندر کوئی کھوٹ تسلیم نہیں کیا جاسکتا' ورنہ یہ ساری آیتیں بے محل ہو جائیں گی' اللہ کی ساری رضا معاذ اللہ بے محل واقع ہو گی۔

قلوب صحابہؓ کی تقدیس

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ صاحب' تھے تو ایسے ہی ___ مگر ممکن ہے بعد میں کچھ خرابیاں پیدا ہو گئی ہوں ___ ممکن ہے بعد میں کوئی کھوٹ آگیا ہو ___؟ تو اول تو یہ غلط ہے ___ اور اس لئے غلط ہے کہ یہ قرآن کریم کی شہادت ہے اور قرآن کریم ابد الاباد تک اعلان کر رہا ہے۔ اور اعلان کیا جاتا رہے گا' لہٰذا یہ احتمال محض ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے ایک موقع پر ان حضرات کے قلوب پر بھی یہی حکم لگایا ہے۔ محض اعمال ہی پر نہیں ___ فرمایا :

أُولٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَّأَجْرٌ عَظِيمٌ

یہ وہ طبقہ ہے کہ اللہ ان کے دلوں کا امتحان کر چکا ہے۔ یہ امتحان میں پاس ہو چکے ہیں۔ ان کے دلوں میں کوئی کھوٹ اور خرابی نہیں ہے۔ ان کے لئے مغفرت بھی ہے۔ اور اجر عظیم بھی ہے ___ تو دو چیزیں ہیں۔ مغفرت اور اجر عظیم ___ مغفرت آخرت میں ہو گی اور اجر عظیم دنیا میں دیا جائے گا۔ تو ان کی دنیا و آخرت دونوں درست ہیں۔

فرقہ ناجیہ

غرض جس طبقے کی نسبت ان کے قلوب پر بھی حکم لگایا' ان کے قوالب پر بھی حکم لگایا' ان کے اعمال کو بھی سراہا' ان کے طبقے کی بھی تقدیس بیان کی گئی' وہ طبقہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ پھر اس کے بارے میں کوئی ادنیٰ کھوٹ کا یقین کیا جائے یا کوئی تخیّل ہی باندھے ___ جب یہ معیار ہوا وہ سارے فرقے نکل جائیں گے' جو قلوب میں صحابہؓ کی عظمت نہیں رکھتے جن کے قلوب میں عظمت ہو گی' وہی ناجی قرار پائے گا ___ اور وہ طبقہ کون ہے ___؟ جو یوں کہتا ہے کہ :

الصحابۃ كلهم عدول

سارے صحابہؓ عدول' متقی' پارسا اور پاکباز ہیں۔

خطاء اجتہادی

گو ان سے خطاء اجتہادی ممکن ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اجتہادی طور پر ان سے کوئی خطا سرزد ہو جائے ___ مگر مجتہد کو تو خطا پر بھی اجر ملتا ہے' اس کی خطا بھی مقبول ہوتی ہے۔ تو صحابہؓ میں اگر اجتہادی خطا ہو وہ ہماری طاعتوں سے بہتر ہے کہ اس پر اجر دیا جا رہا ہے۔ وہ خطا اجتہادی ہے۔ بہرحال نیت کی ان میں کوئی خرابی نہیں ہو سکتی۔

اور اگر دنیا میں ان کی کوئی تھوڑی بہت خرابی ہو' کوئی معصیت یا برائی سرزد ہوئی ہو تو دل ان کا کسی برائی یا نیت کے کھوٹ سے قطعاً پاک ہے اور اگر کوئی غلطی عمل میں ہوئی اور وہ بھی دنیوی عمل میں تو اس کے بعد ان کی توبہ و استغفار پر ان کو اجر ملا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ترقی مدارج کے لئے ان سے کوئی ایسی چیز کرا دی ہو۔ غرض ایسی چیز اگر ہے تو وہ دنیا سے متعلق ہے۔

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تقدس

لیکن جہاں تک دین کا معاملہ ہے۔ علم اور تبلیغ اور احکام وعقائد کا معاملہ ہے' اس میں سب کے سب صحابہؓ مل کر متقن' عدول اور پاکباز ہیں۔ ان کے قلوب کا اللہ امتحان لے چکا ہے ___ تو جس ذات بابرکات کے شاگرد ایسے ہوں ان کا استاد کیسا ہو گا؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اگر پھل میٹھا ہے تو درخت قابل مدح ہے۔ اگر پھل کڑوا ہے قابل مذمت ہے ___ تو جس درخت کے یہ پھل ہیں اس درخت کا کیا حال ہو گا ___ ؟ جس کی شاخوں میں یہ لطف ہے ان کی اصل میں کیا لطف وکرم موجود ہو گا' تو جس ذات بابرکات کی تربیت سے صحابہؓ' صحابہؓ بنے اس ذات کی برگزیدگی اور اس کی سیرت کے تقدس کا کیا عالم ہو گا' تو صحابہؓ کی سیرت کو دیکھ کر سیرت محمدیؐ پہچانی جا سکتی ہے۔ جس ذات بابرکات نے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نمونے اپنے جیسے تیار کر دیئے۔ یہ مربی کی کامل تربیت کی علامت ہے کہ اپنے شاگردوں کو اپنے جیسا بنا دیا تو صحابہؓ کو آپؐ نے اپنا نمونہ بنا دیا ___ اور ایک دو نہیں ___ ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب افراد کا نمونہ جو مقدسین کی ایک عظیم جماعت ہے۔ جو بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام بنی اور اس جماعت نے عالم کو علم اور دین سے بھر دیا ___ غرض' جس اصل کی شاخیں ایسی' اس کی اصل کیسی ___ ؟ اور جس ذات کے پھل ایسے وہ درخت کیسا ___ ؟ اور جس استاد کے شاگرد ایسے وہ استاد کیسا ___ ؟ اور جس شیخ کے تربیت یافتہ ایسے مقدس' اس شیخ کے تقدس کا کیا عالم ہو گا؟

اکمل السیر

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کو اگر انسانی اصول پر پرکھا جائے تو انسان کی سیرت کے عناصر اربعہ میں نے ذکر کر دیئے۔ ان میں سب سے زیادہ کامل اور اکمل آپ کی سیرت نکلتی ہے ___ یہ تو اصل کے اعتبار سے ہے اور فرع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو صحابہؓ کو دیکھ لو' جب صحابہؓ کی سیرت کا تقدس ایسا

ہے تو آپؐ کی سیرت کے تقدس کا کیا عالم ہو گا؟ تو اصل کے لحاظ سے دیکھا جائے تب بھی سیرت اکمل السیر ہے اور فرع کے اعتبار سے دیکھا جائے تب بھی وہ سیرت اکمل السیر ہے۔ جب وہ سیرت ہمارے سامنے آتی ہے اسکا مقصد کہانی سنانا نہیں ہوتا بلکہ معیار پیش کرنا ہوتا ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو پرکھ پرکھ کر اس کے اوپر جانچیں، مسلمانوں میں علم کی کمی نہیں فکر کی کمی ہے۔ علم تو ہے۔ رات دن وعظ سنتے ہیں کتابیں بھی پڑھتے ہیں، رسائل بھی ان کے سامنے ہیں لیکن تفکر موجود نہیں ہے کہ اس نمونے کو سامنے رکھ کر غور و فکر کریں اور اپنے کو اس نمونے کے اوپر پیش کریں کہ کس حد تک مطابقت ہے اور کس حد تک مطابقت نہیں ___ یہ فکر جب تک پیدا نہیں ہو گا سیرت کا سننا نہ سننا آپ کے اوپر کوئی اثر نہیں ڈالے گا۔ تو آپ محض کانوں سے سنتے ہیں۔ حالانکہ دل سے اور دماغ سے سننا چاہئے جس سننے میں دل بھی شامل ہو۔ یعنی اس طور پر آپ سیرت کو سنیں کہ ہم اپنا جائزہ لیں۔ نہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد و ثنا کرتے رہیں۔ آپ نہ بھی مدح کریں وہ جب بھی واجب المدح ہیں ___ آپ ایک بھی ثناء نہ کریں وہ جب بھی معظم و مکرم ہیں ___ اس سیرت پاک کی عظمت و رفعت آپ کے عظمت کرنے پر موقوف نہیں ہے۔ آپ عظمت نہ کریں وہ جب بھی باعظمت و رفعت ہے، سوال یہ ہے کہ سیرت کو سن کر آپ نے اپنے لئے کیا کیا۔ تو آپ سیرت کا بڑا مقصد یہ سمجھتے ہیں کہ سبحان اللہ کہہ کر یہ کہہ دیں کہ ہمارے نبی کو اللہ نے یہ عظمت دی وہ تو باعظمت ہیں ہی۔ آپ نہ بھی کہیں جب بھی عظمت ملی ہوئی ہے۔

لیکن یہ عظمت آپ کے سامنے کیوں لائی گئی ___ ؟ تاکہ آپ بھی باعظمت بنیں، آپ کے اندر بھی خوبیاں اور کمالات پیدا ہوں، اس لئے سیرت سامنے رکھی جاتی ہے۔ یہ جذبہ ہمارے اندر مفقود ہے۔ اس لئے اپنے جانچنے کی فکر نہیں۔ تعریف کرنے کی فکر ہے۔ تو تعریف سے زیادہ اپنا جانچئے کہ خود اپنے کو پیش کریں۔ اور سیرت کے مطابق اپنے کو پرکھیں۔ اس واسطے میں نے سیرت مقدسہ کو دو پہلوؤں سے پیش کیا، ایک سیرت کی اصل کے لحاظ سے کہ انسانیت کاملہ اسی سیرت کے اندر ہے اور ایک سیرت کی فرع کے اعتبار سے کہ اس سیرت سے اخذ کر کے جو سیرتیں بنیں وہ صحابہؓ اور بعد والوں کی ہیں جو دوسروں کو مقدس بنا سکتی ہیں۔ وہ سیرت اس قابل ہے کہ اسے سامنے رکھ کر مقدس بننے کی فکر کرے، تو دونوں پہلوؤں سے سیرت کامل اور اکمل ہے ___ حق تعالیٰ شانہ ہمیں اور آپ کو توفیق دیں کہ ہم اپنے کو پرکھنے کی کوشش کریں اور اپنے کو مطابق بنانے کی فکر کریں۔ آمین

اللهم ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم

اللهم اغفرلنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین۔

اللهم اغفر لنا وارحمنا۔ وعافنا واعف عنا۔ واهدنا سبل السلام واخرجنا من الظلمت الی النور۔ وجنبنا الفواحش ماظهر منها وما بطن۔

اللهم وتوفنا مسلمین والحقنا بالصالحین غیر خزایا ولا مفتونین۔

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد والہ وصحبہ اجمعین

برحمتک یا ارحم الراحمین

(حررہ ۲۸ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ جمعۃ المبارک)

حیوٰۃِ طیّبہ

ایمانی زندگی نہ ہو محض عقل ہو تو عقل میں زنا بھی حلال ہے اور نکاح بھی' اس میں اس کا کوئی امتیاز نہیں کہ یہ نکاح ہے اور وہ سفاح۔ طبعِ بشری میں محض نفس کی رضا پیش نظر ہوتی ہے۔ عقل آجائے تو مفادِ عامّہ سامنے آتا ہے جسے ہم جمہوریت کہیں گے اور جمہوریت میں یہی ہوتا ہے کہ سب کی رائے لے لے اور سب کی خوشی حاصل ہو جائے۔ اور جب ایمانی زندگی آتی ہے تو جمہور سے بالاتر ہو کر خدا کی رضا کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو ___ جمہور راضی ہوں یا نہ ہوں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدّظلہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ______ اَمَّا بَعْدُ ______

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم. بسم اللہ الرّحمٰن الرحیم من عمل صالحًا من ذکر وانثٰی وھو مؤمن فلنحیینہٗ حیٰوۃً طیّبۃً ولنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون (نحل ع ۱۳ پ ۱۴) (صدق اللہ العلی العظیم)

زندگی ایک مقدّس امانت

بزرگانِ محترم!

اس وقت قرآن شریف کی ایک آیت میں نے تلاوت کی ہے جس میں حق تعالیٰ شانہ نے انسان کی سعادت اور اس کی ترقی کا ایک بنیادی اصول ارشاد فرمایا ہے۔ جس کی کچھ تشریح اس وقت آپ کے سامنے عرض کروں گا۔ پہلے آیت کا ترجمہ سن لیجئے ___ حق تعالیٰ فرماتے ہیں جس نے بھی نیکی کی اور عمل صالح اختیار کیا۔ مرد ہو یا عورت' تو ہم اس کو ایک نہایت ہی پاکیزہ زندگی عطا فرمادیں گے۔ جو حیاتِ طیّبہ ہوگی۔ صاف اور اعلیٰ ترین زندگی اور اس کی اس نیکی پر ہم بہت اجر و ثواب بھی اس کو عطا کریں گے۔

نیکی کرنے پر دو وعدے کئے گئے۔ ایک پاکیزہ زندگی کا اور ایک اجر کا۔ اسے یوں سمجھئے کہ مستعار زندگی جو

چند دن کی ہمیں دی گئی ہے حقیقت میں ہمارے پاس ایک امانت ہے۔ اس امانت کو اگر نبھانا ہے تو ایمانداری کے ساتھ اس کو مالک کے سپرد کر دینا ہے اس لئے کہ اس زندگی کے ہم خود مالک نہیں ہیں۔ نہ ہم نے بنائی نہ پیدا کی نہ از خود اس کو ختم کر سکتے ہیں' دینے والے بھی حق تعالیٰ ہیں اور لینے والے بھی وہی۔ تو جس کے ہاتھ میں لینا اور دینا ہے وہی مالک قرار دیا جا سکتا ہے' ہمارے بلا ارادہ زندگی آگئی' بلا ارادہ ہم سے چھین لی جائے گی۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی سے چلے

تو محض ایک مستعار زندگی کو ہم کس طرح گزاریں۔

زندگی کا مادہ

تو ہماری زندگی کا ایک مادہ ہے اور ایک اس کی صورت ہے۔ زندگی کے مادے کو بھی سمجھ لیا جائے اور اس کی صورت کو بھی' آگے اسی زندگی کے بارے میں بہت سی صورتیں آئیں گی مگر مادہ ایک ہی رہے گا۔ اس کی شکلیں بدلتی رہیں گی ___ مثلاً گارا ایک ہے اسی گارے سے برتن بھی اور دیگر سب سامان بھی بنا سکتے ہیں۔ یہ سب گارے کی شکلیں ہیں۔ مادہ مشترک رہے گا۔ اینٹ میں بھی گارا' بلڈنگ میں بھی گارا اور برتنوں میں بھی' ایک ہی مادہ پر مختلف شکلیں آتی ہیں۔ اس طرح زندگی ___ جو ہمارے لئے ترقی یا تنزل کا باعث ہوتی ہے ___ آخیر تک اس میں ایک ہی مادہ موجود رہتا ہے اور یہ مادہ دو چار چیزیں ہیں ___ سب سے پہلی چیز کھانا پینا ہے۔ اسی سے مدار زندگی ہے اگر نہ کھائے نہ پئے تو اسے مردہ کہا جائے گا (**جسداً لا یاکلون الطعام** وہ بدن جو کھانا نہیں کھاتے) اس کے بعد پہننا اور اوڑھنا ہے۔ پھر رہنا سہنا یعنی مکان بنانا ہے جس میں ہم اپنی زندگی اور اپنے (روح وبدن کے) رشتے کو محفوظ کر سکیں' اس کے بعد موانست اور انس باہمی سے زندگی بڑھانا ہے جس کو تمدن' تعاون' توالد اور تناسل کہیں گے' یہی چار چیزیں کھانا پینا' اوڑھنا' رہنا سہنا اور باہم مل جل کر رہنا یہ بنیادی چیزیں ہیں جن سے ہماری زندگی بنتی ہے اور یہی چار چیزیں آئندہ لوٹ پوٹ کر آتی ہیں۔ اس میں کچھ اسباب اور وسائل ہیں۔ اصل میں چار ہی چیزیں ہیں۔

کھانے پینے کیلئے غلہ کی کاشتکاری وغیرہ کی ضرورت ہے۔ الغرض ایک لمبا دھندا ہے' جس سے ہمیں چار دانے سپرد ہوتے ہیں' اس کیلئے بازار بنتا ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں مل جائیں یہ خرچ کرتا ہے اور کماتا ہے۔ تو کھانا پینا اصل تھا اس کی ضرورت سے بازار قائم کئے جائیں گے اور اسی کی خاطر پیشہ حاصل کیا جائے گا۔ تو زمین' بازار' پیشہ' کھانے' پینے' رہنے سہنے کے اسباب میں سے ہوئے۔

اسی طرح آپ امن وسکون قائم کریں' باہمی لین دین کریں تو اس کا مقصد بھی یہی ہے۔ کہ باہمی لین دین سے زندگی کے اسباب آسانی سے حاصل کئے جا سکیں اور کھانے پینے' رہن سہن کی ضرورت میں سے آسمان بھی ہے جس سے پانی برسے' آفتاب بھی ہے جو گرمی پہنچائے' ہوا بھی ہے جو زندگی قائم رکھے۔ تو یہ لمبا چوڑا کارخانہ اس لئے ہے کہ چار دانے چار کپڑے اور مکان ہمیں میسر آجائے۔ تو پورا عالم ہمارے لئے خدمت کر رہا ہے۔

انسانی زندگی کا دورِ اوّل' حیوانیت' جاہل بادشاہ

تو انسان کی زندگی کا پہلا دور یہ ہے کہ اس کا تمام تر مقصد کھانا پینا ہوتا ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو پیدا

ہوتے ہی کھانے پینے کے لئے چلاتا ہے۔ جہاں ماں نے اس کے منہ میں دودھ ڈالا وہ چپکا ہو گیا۔ معلوم ہوا اس کا شور مچانا غذا کے لئے تھا۔ اگر وہ نہ چلاتا تو ماں کو خبر نہ ہوتی' اگر بچہ نہ روتا تو ماں کی چھاتی میں دودھ جوش نہیں مارتا۔ بچہ کا رونا ایک فریاد ہے' ماں کی ممتا اور محبت جوش میں آتی ہے' اور جوش سے دودھ جوش میں آتا ہے اور دھاریں پھوٹتی ہیں تو سب سے پہلے پیدا ہوتے ہی نہ کپڑا مانگتا ہے نہ مکان ___ پھر گرمی سردی ستاتی ہے تو چلاتا ہے اور ماں کپڑا اوڑھاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ سردی گرمی ستا رہی تھی۔ زیادہ کپڑے لاد دیئے پسینہ آگیا تو چلانے لگا۔ تو ماں کے دل میں الہام ہوتا ہے کہ اب اسے گرمی ستا رہی ہے یہ کپڑے اتار دیتی ہے اور پنکھا جھلنے لگتی ہے' تو پہلی ضرورت تھی کھانے کی' دوسری لباس کی' تیسری گرمی اور سردی اور دھوپ سے بچنے کے لئے مکان کی اور ذرا بڑا ہو گیا کچھ ہوش آیا تو اس میں انس و محبت کا مادہ بھی آگیا ___ اب چھوٹے بچوں کو اپنے لئے تلاش کرتا ہے' کسی بچے کو آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ بڑے بوڑھوں کی صحبت میں بیٹھے گا یا وہ علماء و صلحاء کی مجلس کو تلاش کرے گا کہ وہاں جا کر بیٹھ جائے' نہیں بلکہ اپنے ہم عمروں سے کھیل میں لگے گا ع

کند ہم جنس باہم جنس پرواز

ہر چیز اپنی جنس کی طرف مائل ہوتی ہے۔ جوان جوانوں کی طرف' بوڑھا بوڑھوں کی طرف مائل ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں انس موجود ہے' وہ جانوروں کی طرح بھٹوں اور گھونسلوں میں نہیں رہ سکتا' ایک آبادی بنا کر رہتا ہے' شہری زندگی قائم کرتا ہے تاکہ انس و موانست آتی ہے اور انسان انس سے مشتق ہے۔

وما سمّی الانسان الّا لِانُسِہٖ
وما القلب الّا لِانّہٗ یتقلب

عربی کا شاعر کہتا ہے کہ انسان کا نام انسان اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس میں انس ہے اور قلب کے معنی لوٹ پوٹ کے ہیں۔ قلب ہر وقت متحرک رہتا ہے۔ اس میں خیالات الٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔ اس تقلب کی وجہ سے اسے قلب کہنے لگے اگر بچے کو آپ تنہائی میں ڈالیں تو چلائے گا اور اس کے ساتھ کوئی بیٹھ گیا اور کسی سے بولنے لگا تو چپکا ہو جائے گا معلوم ہوا کہ اس میں انس کا جذبہ ہے اور وہ ابھر رہا تھا۔ اس کا علاج مل گیا تو خاموش ہو گیا۔ یہ چار چیزیں ہی زندگی کا مادہ ہیں اور لوگوں کا یہ مقصودِ زندگی ہے۔ اس زندگی کا نام ہم حیوانی زندگی رکھیں گے۔ یعنی حیوانیت کا تقاضا ہے کہ کھائے پئے ___ آپ نے چوپایوں کو دیکھا ہوگا کہ جب بھی آپ گائے' بھینس کو دیکھیں گے۔ چر رہی ہیں یا پھر بگ رہی ہیں اور پھر کھانے لگی ہیں۔ اس کے سوا کوئی کام نہیں' ۲۴ گھنٹے جانور کا کام کھانے کا ہے۔ بھینس کو آپ پالیں گے تو ایک مستقل آدمی رکھنا پڑے گا کہ اس کی پرورش کرے' رات بھر کھڑے کھائے گی کچھ آنکھ لگ گئی پھر جب جاگی تو کھانے لگی۔ تو حیوان کا طبعی تقاضا کھانا پینا ہے' گرمی میں سردی اور سردی میں گرمی حاصل کرنا یہ حیوانیت کا تقاضا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ انسان کی وہ زندگی جس میں کھانا پینا رہنا سہنا ہی مقصد ہو وہ حیوانیت کی زندگی ہے۔

آپ جتنا بھی اعلیٰ سے اعلیٰ کھائیں گے' بہترین بلڈنگ بنائیں گے یہ حیوانیت کا تقاضا ہے' سانپ اپنے لئے بھٹ بنا لیتا ہے۔ شیر اپنا ٹھکانہ اور چڑیا اپنا گھونسلہ بنا لیتی ہے' چونٹیاں سوراخ تلاش کر لیتی ہیں' انسان بلڈنگ بنا لیتا ہے۔ کتنی اعلیٰ بلڈنگ کیوں نہ ہو حیوانیت کے دائرے سے نہیں نکلے گا ___ تو بچہ ابتدا سے ہی ان چیزوں کو چاہتا تھا۔ یہ حیوانی زندگی تھی۔

انسانی زندگی کا دورِ ثانی' عقل و شعور

اب ذرا شعور آیا۔ دس برس کے بعد اس میں عقل کے مادے نے آنا شروع کر دیا ابھی تک اسکی زندگی

طبیعت کے نیچے تھی اور طبع بشری جو چاہتی تھی وہی کرتے تھے تو ہماری طبیعت حاکم اور ہم اس کے غلام اور محکوم تھے ـــــ فلاسفہ لکھتے ہیں کہ طبیعت بے شعور واقع ہوئی ہے' اس کے اندر جذبات ہوتے ہیں شعور اور سمجھ نہیں ہوتی تو ایک جاہل بادشاہ ـــــ طبیعت حکم دیتی ہے کہ کھاؤ بھوک لگی ہم نے کھانا شروع کر دیا۔ چاہا پانی پینے کو ہم نے کہا بہت اچھا' چاہا مکان بناؤ ہم نے تعمیل شروع کر دی۔ تو ایک بے شعور حاکم کے احکام کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے کیوں کہ یہ سب طبیعت کے تقاضے تھے۔ چودہ پندرہ برس بعد اب انسان کو شعور آنا شروع ہوا اور ہر چیز میں عقل سے غور کرنا شروع کیا اس میں سمجھ آئی تو اس شعور و عقل کے بعد مادۂ زندگی بدلتا رہے گا۔ کل تک طبعی جذبہ سے کھا رہا تھا آج عقل نے اس میں لطافت پیدا کر دی' ایک اجتماعیت کا مادہ ہے اور ایک ظرافت کا جس کو "جمال پسندی" کہتے ہیں۔ یعنی کھائے مگر ذرا خوشنما بنا کر کھائے' پہنے مگر ذرا عمدہ کر کے پہنے' رہے مگر ذرا بلڈنگ کو اچھا بنا کر رہے' اس کی طبیعت جب عقل کے نیچے آجائے تو عقل پورا زور لگا کر مکان بنائے گی' ڈیزائن بھی اچھا ہو گویا فن انجینئری پیدا ہو گا کہ عمدہ عمدہ نمونے بنائے جائیں۔ کھانا طبعی تقاضا تھا مگر عقل نے چاہا کہ برتن بھی خوشنما ہوں کھانے کا رنگ بھی ذرا عمدہ ہو۔ نگاہوں کا سینکنا بھی مقصود ہو جاتا ہے' آج نوع بنوع کھانے بنتے ہیں۔ یہ سب عقل کا تقاضا ہے طبیعت اس کے اندر کام کرتی ہے۔ عقل اس کو ذرا درست کر لیتی ہے کہ اس کی شکل بھی عمدہ بنے' آپ کیک بنائیں گے تو اس کا مادہ ایک ہی ہے مگر شکل الگ الگ بناتے ہیں کسی کی چڑیا کی شکل بنا دی' کسی کی پھول جیسی اس میں رنگ بھر دیئے' موتی لگا دیئے کہ آنکھیں بھی دیکھ کر خوش ہو رہی ہیں۔ اگر یہ کچھ بھی نہ ہوتا تو مزہ پھر بھی پیٹ کا وہی رہتا۔ اگر آپ نے سردی سے بچنے کے لئے ایک موٹا سے کمبل اوڑھ لیا تو طبیعت کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ مگر عقل کہتی ہے کہ اس کا رنگ بھی عمدہ ہو اون بھی ذرا ملائم ہو، ذرا قیمتی ہو کہ دیکھنے والا کہے کہ بڑا آدمی ہے' تو محض طبع بشری کا تقاضا تو ڈھانپنا تھا مگر عقل کا تقاضا اسے خوشنما بنانا ہے۔ تو آج دنیا میں جو ڈیزائنوں کی اِفراط ہے کہ آپ کوٹھیاں نئی نئی طرز کی بنائیں' چھت بھی ایسی ہوں' دیواریں ایسی ہوں پلاسٹر اور دیگر آلات ایسے ہوں' یہ ظرافت پسندی اور جمال پسندی ہے جو انسان میں رکھی گئی ہے آج جو کپڑوں کے ہم نمونے دیکھتے ہیں کوئی مادہ نہیں چھوڑا جس سے کپڑے نہیں بنائے روئی کے کپڑے تو خیر ہیں ہی۔ اون اور درختوں کی چھال گتوں اور کاغذ کے کپڑے بنتے ہیں اور اب کانچ کے کپڑے بنانے پر غور ہو رہا ہے۔ جتنی جڑی بوٹیاں جنگل میں ممکن ہیں انسان نے غور کر کے سب کے مطابق طرز اور نقش و نگار بنا لئے' جالدار کپڑے الگ' مشجر الگ' دنیا نے اتنے رنگ کے کپڑے کبھی نہیں دیکھے جتنے آج دیکھ رہے ہیں۔

یہ محض طبیعت کا تقاضا ہے جس میں عقل اور جمال پسندی کی آمیزش ہو گئی' اگر نمونے کا حصہ چھوڑ دیا جائے تو گھونسلہ بنا کر جہاں چاہے رہ جائے' یہ سارے مسائل نمونہ کی خوشنمائی کہ وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ پینے کے لئے سوڈے کی دکان پر جائیں گے تو رنگ برنگ کا پانی دیکھیں گے کوئی سبز' کوئی سرخ' کوئی زرد' کوئی نارنجی' ذائقہ درست کرنے کے لئے تو سب ایک ہی ہیں مگر آدمی چاہتا ہے کہ جب پیئوں تو آنکھوں کو بھی لذت ہو' ہاتھ کو بھی' زبان کو الگ لذت آجائے اور سارے ذائقے جمع ہو جائیں۔ یہ چیز انسان میں ہے جانوروں میں نہیں رکھی گئی۔ جانور تو کھائے گا ہضم کر لے گا پیٹ میں بوجھ کر دے گا ـــــ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں گائے جس طرح کھاتی تھی آج دس ہزار سال بعد اسی طرح کھاتی ہے' جس طرح پہلے قضائے حاجت کر رہی تھی ایسے ہی اب کرتی ہے' یعنی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تو جانوروں میں یہ مادہ

ظرافت اور جمال پسندی کا نہیں ہے' جنات میں بھی نہیں ہے۔ ویرانے میں رہتے ہیں آج تک ان کی کوئی بلڈنگ نہیں دیکھی' چڑیا جانور کسی میں یہ مادہ نہیں۔ کسی نے درخت کو ٹھکانہ بنالیا کسی نے زمین کھود کر ڈیرہ بسالیا ___ مگر یہ انسان ہے جو جمال پسندی میں دنیا بھر کے مادے خرچ کرتا ہے۔ مکان' کپڑا' کھانے کی شکلیں بھی عمدہ عمدہ تجویز کرتا ہے۔

ایران سے بادشاہ ہندوستان کے پاس شہزادہ آیا۔ مغلوں کی سلطنت کا زمانہ تھا' تو شاہی باورچی کو حکم دیا گیا کہ کوئی نئی قسم کی چیز تیار کرو۔ تو ناشتے کیلئے ایک چیز تیار کی اور ایک بہت عمدہ خوانچہ میں رکھ کر لے آیا۔ تو بہت عزت کے ساتھ بلا کر اسے حکم دیا کہ اسے دربار میں کھولدو ___ کھولا تو معلوم ہوا کہ بھیلیے کا کٹا ہوا سر رکھا ہے اور تازہ خون بہہ رہا ہے شہزادے کو بڑا تکدر ہوا اور حیرت زدہ ہوا کہ یہ کیا بدتمیزی ہے' بادشاہوں کے پاس بھینسے کا سر لے آیا ہے۔ اس نے کہا کہ صاحب معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ نے کبھی اچھی چیز نہیں کھائی اسے ذرا اپنے بادشاہ کو رعب دکھانا تھا ___ تو معلوم ہوا کہ ایک خاص قسم کی مٹھائی تیار کی گئی تھی' بھینسے کا سر تھا مگر اس کے اندر زبان ایک ذائقے کی مٹھائی تھی' دانت اور ذائقے کی مٹھائی اس کی کھال میں اور ذائقہ تھا۔ جب اس شہزادہ نے چکھا تو حیران رہ گیا کہ عجب چیز ہے ___ تو باورچی کو یہ حجت تمام کرنی تھی کہ تمہارے فرشتوں نے بھی کبھی اس قسم کے کھانے نہیں کھائے جو ہندوستان میں بنتے ہیں۔ یہ جمال پسندی تھی۔ محض مٹھائی لا کے رکھ دیتے شہزادہ کھالیتا اس مصیبت کی کیا ضرورت تھی کہ اس کو بھینسے کی صورت دی' اس کا گلا کٹا ہوا دکھایا کہ خون اس میں بہتا رہے فن کا کمال دکھانا تھا۔

ان فنی کمالات کیلئے آج دنیا میں مستقل کمپنیاں ہیں جن کا کام یہ ہے کہ میزوں کو سجائیں' سینکڑوں روپے محض ان کو سجانے کے لئے بطور اجرت دیئے جاتے ہیں۔ تو طبع بشری تو کھانا پینا چاہتی ہے' عقل بشری چاہتی ہے کہ اس کے اندر خوشنمائی پیدا کی جائے طبع بشری چاہتی ہے کہ کوئی ہم جولی مل جائے تو اس سے انس و محبت سے بات کی جائے اور عقل چاہتی ہے کہ بات کریں تو لہجہ بھی شائستہ ہو' کلام بھی مہذب ہو' بیٹھنے اٹھنے کا ڈھنگ بھی ذرا اچھا ہو۔

انسانی زندگی کا باشعور حکمران

جب زندگی اس نوبت پر پہنچے اور کھانے پینے کو آپ عقل کے نیچے لے جائیں تو ہم اسے انسانی زندگی کہیں گے' کل تک یہ چیزیں طبیعت کے حکم میں تھیں آج وہ عقل کی محکوم بن گئیں' پہلے ایک جاہل بادشاہ حکمرانی کر رہا تھا اور اب ایک باشعور حکمران کی حکمرانی کے نیچے آگئیں یعنی عقل کے جس میں سوچ ہے سمجھ ہے۔

اس کے ساتھ ایک چیز اور بڑھ جاتی ہے وہ یہ کہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ خود غرض بچہ یہ چاہے گا کہ میں کھالوں میرے بھائی بند کھا رہے ہیں یا نہیں اُسے کیا ___ جو جانور ہے وہ خود پیٹ بھرنا چاہے گا اور بنی نوع جتنے ہیں ان کا پیٹ بھرا ہے یا نہیں اس کی بلا سے۔ ایک کتا آجائے گا آپ ہڈی ڈالدیں گے وہ کھائے گا دوسرے کتے کو ملے یا نہ ملے اسے کیا۔ بلکہ دوسرا کتا آتا تو لڑنے مرنے کو تیار ہوگا بلکہ سارے محلہ کے کتوں سے لڑتا ہے۔ اسی طرح سے دیگر جانور بھی لڑتے ہیں کہ میری غذا دوسرے کے پاس نہ جائے۔ یہ حیوانیت کا تقاضا ہے کیونکہ طبع حیوانی بالطبع خود غرض واقع ہوئی ہے۔ اپنا نفع چاہتی ہے' دوسرے کا نفع نہیں' لیکن جب عقل آجاتی ہے تو وہ چاہتی ہے کہ عمدگی کے ساتھ میں بھی کھاؤں اور میرے بھائی بند بھی کھائیں تو عقل نے آکر

اجتماعی زندگی سکھلادی۔ تو عقل نے دو باتوں کا اضافہ کیا ہے ایک ظرافت یعنی جمال پسندی کا ایک اجتماعیت کا کہ جہاں ہمیں مل رہا ہے ہمارے بھائیوں کو بھی ملنا چاہئے۔ یہ بُری بات ہے کہ ہم تنہا بیٹھ کر کھائیں اور دوسرے بھوکے رہیں۔ تو جب آدمی میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا تو کہا جائے گا کہ یہ انسانی زندگی کے اندر آگیا' مگر اس کا مادہ بھی وہی چیز ہے جو حیوانی زندگی کا تھا۔ وہاں خود غرضی کیلئے استعمال ہوتی تھی عقل کے نیچے آکر اجتماعی شان کیلئے استعمال ہونے لگی اور سارے بنی نوع کا فائدہ ہونے لگا۔

اب اسی حالت میں انسانی تمدّن 'لین دین' تجارت اور زراعت قائم کرتا ہے تو اجتماعیت کی شان جمال پسندی اور بنی نوع کے فائدے کے لئے دیکھنا اور سوچنا یہ عقل کا کام ہے تو مادہ وہی رہا مگر اس کی شکل بدل جاتی ہے۔ کیونکہ حکّام بدلتے جاتے ہیں اگر حاکم خود غرض ہے تو محکوم بھی خود غرض ہوگا اور اگر حاکم کے اندر جماعت پسندی ہو اور جمال پسندی ہو تو محکوموں میں بھی یہی چیز آئے گی۔ جب عقل نے دائرۂ حکومت سنبھالا تو سارے افرادِ بنی آدم کا فائدہ اس میں ہوگا یہ اس لئے کرتا ہے تاکہ میں بھی راضی رہوں میرے بھائی بند بھی راضی رہیں۔ مثل مشہور ہے "نہ تنہا ہنستا ہوا اچھا لگتا ہے نہ روتا ہوا" کسی جماعت کے ساتھ مل کر ہنستا ہے تو ہنسی ہے اور جماعت کیساتھ ہی روتا ہوا بھی۔

انسانی زندگی کا تیسرا دَور ___ ایمان کی حکومت

اب انسانی زندگی کو ذرا ایک قدم اور بڑھا دیجئے کہ طبع بشری کھانے پینے سے محض نفس کی رضا چاہتی تھی۔ جب عقل آگئی تو اب بنی نوع کی رضا سامنے آگئی کہ میرے سارے بھائی بند بھی راضی ہوں۔ اگر کسی کے اندر ان تمام افعال میں یہ چیز بھی پیش نظر ہو جائے کہ تنہا میں راضی نہ ہوں نہ تنہا میرے بھائی بند راضی ہوں بلکہ میرا خدا بھی راضی ہو۔ تو اب یہ ایمانی زندگی شروع ہو گئی وہی چیزیں اب ایمان کی حکومت کے نیچے آگئیں جو اب تک عقل اور طبیعت کی حکومت میں تھیں۔

عقلِ انسانی جماعت پسندی اور مفادِ عامہ کی رہبری کرتی تھی لیکن جب ایمان کی روشنی آئی تو اب یہ فکر پڑی کہ جب کھانا کھانے بیٹھے تو سوچے کہ کھانا اس طرح کھاؤں کہ میرا خدا بھی راضی ہو' لباس پہنوں تو اسے اس طرح سے پہنوں کہ میرا خدا بھی راضی رہے' ایسا لباس نہ پہنوں جو اس کی منشاء کے خلاف ہو ___ حدیث میں فرمایا گیا کہ بنی آدم میں مردوں کیلئے ریشم کا کپڑا پہننا حرام ہے۔ ریشم کا کپڑا پہننے سے نفس اور بھائی بند تو راضی ہو جائیں گے کہ بڑا عمدہ لباس پہنا ہے مگر اللہ میاں راضی نہیں تو عقل اور نفس تو راضی ہو گئے مگر خدا راضی نہیں ہوئے۔ تو ایمان کی حکومت میں آکر آدمی سوچتا ہے کہ کون سا لباس جائز ہے کون سا ناجائز' کون سا حلال اور کون سا حرام؟ ___ حدیث میں فرمایا کہ سونے کا استعمال مردوں کے لئے حرام ہے۔ کسی نے سونے کی انگوٹھی پہن لی تو قطعاً ناجائز ہے' حرام ہے۔ فرمایا' حلیۃ اھل النار اہل جہنم کا زیور ہے۔ یہ آگ کی طرف لے جائے گا۔ البتہ سونے کے بٹن کے بارے میں شریعت نے اجازت دی ہے لیکن اس وجہ سے کہ اس کو لباس کے تابع سمجھا گیا ہے' جیسے لباس پر زری کا کام کیا جائے تو بٹنوں کو کپڑوں کے حکم میں پھول بوٹوں کی شکل میں سمجھا گیا ہے' مگر بٹن کی بھی ایک مقدار ہے کہ دو تین ماشے سے زیادہ نہ ہو بہت زیادہ وزنی پہنے گا تو یہ ہوس ناکی ہوگی اس کے ساتھ فقہاء یہ بھی قید لگاتے ہیں کہ اگر بٹن کا استعمال ہو تو بدن سے نہیں لگانا چاہئے بلکہ کسی کپڑے سے سی کر پہنا جائے تاکہ براہ راست سونا بدن سے مس بھی نہ کرے لباس سے اوپر سلا ہوا ہو۔ اتنی قیود کے ساتھ اجازت دی گئی ہے۔ تو جب آدمی ایمانی زندگی ___ ایمانی حکومت کے نیچے آئے گا

تو ایک بٹن بھی سامنے آئے گا تو سوچے گا کہ ___ کس طرح جائز ہے کس طرح نہیں؟ کتنا پہنوں کتنا نہ پہنوں، محض عقل تو اجازت دیدے گی کہ پانچ پانچ تولے کے بٹن پہن لو، چاہے تم ہار اور کنگن بھی پہن لو عقل نہیں روکے گی اس لئے کہ عقل زیادہ سے زیادہ نفس کی رضا چاہتی ہے یا انسان کی رضا ___ خدا کی رضا؟ تو اس کا تعلق تو ایمانی زندگی سے ہے۔

اسی طرح کھانا کھانے کے لئے آدمی بیٹھے گا تو غور کرے گا کہ یہ خنزیر تو نہیں جو حرام ہے۔ یہ فلاں جانور کا گوشت نہیں ہونا چاہئے۔ حرام چیز سے اس طرح بھاگے گا جیسے سنکھیا سے بھاگتا ہے اس لئے کہ سنکھیا مادی موت کا سبب ہے اور حرام چیز کھانا روحانی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ لیکن محض عقل؟ ___ وہ تو ممانعت نہیں کرے گی چاہے سانپ کھائے، خنزیر کھائے لیکن ایمان اجازت نہیں دیگا۔

اس واسطے کہ ہر گوشت ہر پوست میں ایک خاصیت ہے۔ تو جیسے اطباء بُری خاصیت کی اشیاء کے کھانے سے ممانعت کرتے ہیں، اطبائے روحانی حضراتِ انبیاء علیہم السلام بھی بُری اشیاء سے روکتے ہیں۔ ہر گوشت کی ایک خاصیت ہے۔ خنزیر کی طبیعت میں بے حیائی اور بے غیرتی ہے۔ نجاست خور ہے، غلاظت خور ہے، ایک خنزیر، دوسرے ہم جنسوں پر جست کرتا ہے۔ تو ویسی گندگی اور وہی صورت اس کے کھانے والوں میں بھی آئے گی، غلاظت، کدورت، بے حیائی اور بے غیرتی جیسے اوصاف پیدا ہوں گے، درندوں کا گوشت، شیر، بھیڑیا کو حرام قرار دیا گیا۔ کیوں کہ ان کے گوشت کے اندر درندگی کی خاصیت ہے تو ان چیزوں کا کھانیوالا انسان اعلیٰ سے اعلیٰ جانور بن جائے گا مگر انسانیت ختم ہو جائے گی۔ اس لئے شارع علیہ السلام نے ممانعت کردی ___ اور ایسے جانوروں کی اجازت دی جو اعتدال کی شان رکھتے ہوں۔ تاکہ عدل پیدا ہو۔ یہ خاصیت اللہ ہی جانتا ہے کہ اس نے کس مخلوق کو کیسا بنایا اس کا حق ہے کہ وہ کہے کہ میں نے فلاں فلاں جانور حلال کیا فلاں حرام کیا۔

حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل لغیر اللّٰہ بہ۔

حرام کیا گیا تم پر خنزیر اور مردار جس کی روح نکل جانے پر اس میں روحانیت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خالص مادیت رہ جاتی ہے اور خالص مادیت ایک تعفّن ہے، گندی چیز ہے۔ روح آکر اس سے گندگی دفع کرتی ہے۔ تو حق تعالیٰ جو شریعتوں کے بھیجنے والے اور ساری چیزوں کے پیدا کرنے والے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ میں نے کس چیز میں کیسی خاصیت اور جوہر رکھا ہے اور کیا نہیں ___ اسے حق ہے کہ وہ کہے فلاں چیز استعمال کرو، فلاں مت کرو، تو جب آدمی ایمان (کی حکومت) کے نیچے آجاتا ہے تو پھر اس میں کھانے، پینے، رہنے، سہنے، اوڑھنے میں رضائے خداوندی پیش نظر رہتی ہے کہ اگر مالک اور محسن ناراض ہوتا ہے تو مجھے حق نہیں کہ کوئی ایسا کام کروں۔

اسی طرح نسل بڑھانے میں بھی یہی خیال رہے گا، زنا سے بچے گا نکاح کی طرف آئے گا۔ اگر ایمانی زندگی نہ ہو محض عقل ہو تو عقل محض میں زنا بھی حلال ہے اور نکاح بھی، اس میں اس کا کوئی امتیاز نہیں کہ یہ نکاح ہے اور وہ سفاح۔ تو طبعِ بشری میں محض نفس کی رضا پیش نظر ہوتی ہے۔ عقل آجائے تو مفادِ عامّہ سامنے آتا ہے جسے ہم جمہوریت کہیں گے اور جمہوریت میں یہی ہوتا ہے کہ سب کی رائے لے لے اور سب کی خوشی حاصل ہو جائے اور جب ایمانی زندگی آتی ہے تو جمہور سے بالاتر ہو کر خدا کی رضا کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ راضی ہو۔ جمہور راضی ہوں یا نہ ہوں سارے انسان مل کر بھی ناراض ہو جائیں تو یہ اسے گوارا کرے گا اللہ کو نہیں۔ پروردگار کی رضا کو ہر چیز پر ترجیح دیگا تو ایمانی زندگی کے اندر وہی تمام چیزیں ہیں جو اب تک استعمال میں

آرہی تھیں صرف شکل بدل گئی۔ رضائے خداوندی کی شکل آگئی کہ کس طرح مجھے میرے مالک نے حکم دیا۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ پانی پیو تو دائیں ہاتھ سے پیو۔ بائیں ہاتھ سے پیو گے تو شیطان شامل ہو جائے گا۔ اور جب شیطان کا حصہ کھانے پینے میں آگیا تو نفس پر شیطانیت کے اثرات پڑیں گے اگر دایاں ہاتھ کھانے سے آلودہ ہو اور مجبور ہے کہ گلاس بائیں ہاتھ میں لے تو کم سے کم دائیں ہاتھ کا کوئی حصہ لگالیا جائے تاکہ دائیں ہاتھ سے پینا متحقق ہو جائے۔ اس واسطے فرمایا کہ بائیں ہاتھ سے کھانا شیاطین کا ہے اور دائیں ہاتھ سے حضرات انبیاء علیہم السلام کا۔

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يحب التيامن

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر شریف اور بہتر کام میں دایاں ہاتھ پسند تھا۔ لباس پہنتے تو پہلے دایاں ہاتھ' دائیں آستین میں ڈالتے' پاجامہ پہنتے تو پہلے دایاں پیر' دائیں پائنچے میں' کنگھی کرتے تو پہلے دائیں جانب' دانت مارتے تو پہلے دائیں جانب۔ تو دائیں جانب سے ابتدا حضرات انبیاء علیہم السلام کو پسند ہے ــــ بائیں جانب خسیس اور دائیں جانب شریف سمجھی جاتی ہے۔ تو کثافت اور رذالت کے امور شیاطین کو پسندیدہ ہیں اور ہر چیز کی پاکی اور صفائی انبیاء علیہم السلام کو پسند ہے۔ اسی طرح ایمانی زندگی کی وجہ سے کھانے پینے میں غور کرے گا کہ کھانا حلال کا ہو حرام کا نہ ہو۔ اس واسطے کہ دینی توفیق کا تعلق اکل حلال سے ہے۔ لقمہ حرام جب پیٹ میں پہنچتا ہے تو دینی جذبات کی توفیق سلب ہو جاتی ہے حلال پہنچتا ہے تو دین پر عمل اور محبت کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ اس لئے کہ دین بہرحال صاف چیز ہے اگر کسی شخص کی طبیعت نہایت پاکیزہ اور ستھری ہے اس کے سامنے اگر غلیظ آدمی کو پیش کرو تو منہ پھیر لے گا اور اگر اس کی طبیعت گندی ہے تو جتنی غلیظ چیزیں سامنے آئیں گی اس کیلئے اتنا ہی خوشی کا موقع ہو گا۔

دکن کے بادشاہ ''تانا شاہ'' تھے۔ تانا شاہ شاہی طبیعت کے ہیں۔ مشہور ہے طبیعت بہت زیادہ نفیس و نازک تھی۔ جب دشمن نے دکن کے حملے میں ان پر قبضہ کیا اور قیدی بنا کر فاتح کے سامنے پیش ہوئے تو تجویز ہوا کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ تو انہوں نے کہا کہ جب تم مجھے بہرحال واجب القتل سمجھتے ہو تو اس کے لئے تم زیادہ جدوجہد مت کرو۔ میں آسان ترکیب بتائے دیتا ہوں ــــ مزاج میں چونکہ حد درجہ لطافت تھی تو کہا کہ کسی غلیظ عورت جھنگن کو گندگی لیکر سامنے سے گزار دو تو میں ختم ہو جاؤں گا۔ چنانچہ غلاظت کا ٹوکرا سامنے لایا گیا' بس وہیں دم نکل گیا تحمل نہیں کر سکے۔

الغرض پاک و صاف اور نفیس طبیعت ستھری چیزوں سے خوش ہوتی ہے۔ جو چیزیں پاخانہ میں پیدا ہوئی ہیں اگر انہیں باہر ڈال دو وہیں مر جائیں گی۔ اس لئے کہ غلاظت ان کا طبعی تقاضا ہے اور صاف چیزوں پر ناپاک چیزوں سے مردنی چھا جاتی ہے۔ تو ہر چیز میں اس کی طبیعت کے مناسب جو چیز ہے' آتی ہے۔ جبھی وہ زندہ رہتی ہے' اسی لئے ایمانی طبائع لقمۂ حرام کو کبھی برداشت نہیں کرتی حتی کہ مشتبہ لقمہ کو بھی۔

ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی تھے ان کا تقویٰ اور طہارت مشہور ہے۔ فرماتے تھے کہ حق تعالیٰ کا میرے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ اگر نادانستگی میں بھی کوئی مشتبہ لقمہ پیٹ میں چلا جائے تو فوراً قے آ جاتی ہے۔ تو انتہائی تقوائے اور پاکیزگی بڑھتے بڑھتے حق تعالیٰ کا ایسا معاملہ ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ آدمی متقی بننے کی مشق کرے۔ جب تقوائے باطن نصیب ہو جاتا ہے تو پھر حق تعالیٰ خود حفاظت فرماتے ہیں۔

حضرت مولانا تھانوی اپنا ہی واقعہ بیان فرماتے تھے کہ میں ایک دفعہ اعظم گڑھ گیا۔ اس ضلع میں اسٹیشن سے چار میل چھوٹا سا گاؤں تھا۔ وہاں کے لوگوں نے مجھے بلایا۔ وہاں سے جب فارغ ہوا تو ریل رات کو گیارہ

بجے جاتی تھی ' سردی کا زمانہ تھا' لوگوں نے کہا کہ سردی ہے اندھیری رات' ہوگی بارشیں ہو رہی ہوں گی اس لئے رات کو جانے میں تکلیف ہوگی مناسب ہے کہ عصر کے وقت اسٹیشن پہنچادیا جائے رات ٹرین آئے گی تو سوار ہو جائیں گے ___ تو حضرت کو سوار کر کے اسٹیشن لائے جو بہت چھوٹا سا تھا۔ نہ ویٹنگ روم نہ مسافر خانہ ' دفتر کا ایک ہی کمرہ تھا اور اسی سے ملا ہوا مال گودام تھا بوریاں وغیرہ وہاں بھرتے تھے ' اسٹیشن ماسٹر تھا تو ہندو مگر بھلا آدمی تھا۔ اس نے دو چار بوریاں ہٹائیں اور مصلّے کی جگہ بنائی کچھ آرام کی جگہ ہوگئی حضرتؒ سے کہا کہ آپ آرام سے بیٹھیں ' فرماتے تھے جب مغرب کا وقت ہوا تو میں نے نماز پڑھی اس کے بعد سنتیں اور اس کے بعد نفلوں کی نیت باندھ لی ' وہ اسٹیشن ماسٹر ایک لیمپ لیکر آیا تاکہ روشنی ہو جائے ' حضرتؒ فرماتے تھے کہ مجھے معاً یہ خطرہ ہوا کہ مال گودام کے لئے گورنمنٹ نے کوئی لیمپ رکھا نہیں ہے یہ ریلوے کا لیمپ میری وجہ سے لایا ہوگا تو میں گویا غاصب ٹھہرا میرے لئے حق نہیں کہ اسے استعمال کروں نماز میں ایک بے چینی شروع ہوگئی۔ کہ اے اللہ تو نے ہمیشہ مجھے مشتبہ چیزوں سے بچایا ہے۔ یہ مشتبہ چیز آرہی ہے جس کا مجھے علم نہیں اس لئے تو ہی بچانے والا ہے ___ فرماتے تھے کہ بمشکل میں نے دو رکعات ختم کیں اور اس نے لیمپ رکھا نہیں بلکہ لئے ہوئے کھڑا ہے ' جب میں نے سلام پھیرا تو اس نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں یہ لیمپ لیکر آیا ہوں اور یہ اسٹیشن کا نہیں ' میرا ذاتی ہے۔ لایا اس لئے کہ اندھیرے کی تکلیف نہ ہو۔ ___ فرماتے تھے کہ میں نے اتنی دعائیں کیں اس کے حق میں کہ اتنی رعایت ہے۔ اس لئے اس نے خود محسوس کیا کہ مجھے حق نہیں تو اپنے گھر سے لایا ' تو طبیعت میں جب سلامتی ہو تو کافر کی بھی قدرت رہنمائی کرتی ہے۔ بشرطیکہ مذہب کا جذبہ موجود ہو اخلاقی قدریں اس کے اندر رہوں۔

الغرض متقی جب تقوٰی تک پہنچ جائے تو ؎

می وہد یزداں مراد متقین

والا معاملہ ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ ایسے راستے پیدا فرمادیتے ہیں کہ مشتبہات سے بچ جائے مگر یہ جب ہی ہوتا ہے کہ تقوٰی باطنی کی عادت ڈالے ' جو تقوٰی ظاہر کا ہے وہ تو یہ ہے کہ بُرا عمل نہ کرے ناجائز نہ کرے۔ ہر عمل جواز کی حد میں کرے اور ایک تقوٰی باطن ہے وہ زیادہ دقیق ہوتا ہے۔ وہاں تک ہر ایک کی رسائی نہیں ہوتی۔ جب تک کہ اعلیٰ درجہ کا متقی نہ ہو۔ فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر ایک شخص کوئی خوش رنگ شربت پینے بیٹھا ہے اور تصور یہ باندھا ہے کہ میں شراب پی رہا ہوں تو فرماتے ہیں کہ یہ گنہگار ہے اور اگر اس کی نیت کھل جائے تو حاکم وقت اسے سزا دے گا وہ شربت بھی اس کے حق میں مکروہ تحریمی بن جاتا ہے ' اس نے زبان سے اگرچہ شراب نہ پی مگر خیال سے پی لی دل سے پی لی۔

اسی طرح فقہاء یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے اس کے ہاتھ تھامے ہوئے ہے اور دل میں دھیان ہے کہ فلاں اجنبی عورت جس سے عشق ہے یہ وہی اجنبی عورت ہے۔ اس کا فقط تصوّر باندھ لیا۔ تو فرماتے ہیں کہ یہ باطنی طور پر حکم میں زانی کے ہو جائے گا۔ اس کے حق میں تب جائز ہوگا کہ تصوّر بدل کر توبہ کرے۔ تو دل میں تصوّرات بھی غلط طرح کے نہ ہوں ' بُرا تصور آئے گا تو آگے عمل شروع ہوتا ہے ' بُرے جذبات دل میں پیدا ہوتے ہیں تو عمل بھی ناپاک ہو جائے گا۔ اسے کہتے ہیں تقوٰی باطن کہ جذبات قلب بھی مصفّیٰ و مزکّیٰ ہوں۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ

جو لوگ تقوٰی کی عادت ڈالتے ہیں اگر ناگہانی کسی غلطی میں پڑ جاتے ہیں تو فوراً ان کی طبیعت میں روشنی

پیدا ہوتی ہے اور توبہ کر کے سنبھلتے ہیں۔ اس خیال سے بھی توبہ کرتے ہیں اس لئے کہ خیال سے ہی تو عمل پیدا ہوتا ہے۔ اگر خیالات نہ روکے اور اجازت دے کہ جیسا کر آئے تو چلتے رہو تو آدمی بہت سی بد عملیوں میں مبتلا ہو جائے گا ___ اب یہ کتنی دقیق بات ہے کہ فرمایا گیا ہے کہ اجنبی عورت کے بچے ہوئے پانی سے اجنبی مرد کے لئے وضو کرنا مکروہ ہے' اس لئے کہ اسے خیال آئے گا کہ فلاں عورت کا بچا ہوا پانی ہے اگر یہ دھیان بڑھ گیا تو ممکن ہے آگے بہت سے فسادات پیدا ہوں ___ حدیث میں فرمایا گیا **التقوٰی ھٰھنا واشار الی صدرہٖ** تقویٰ قلب کے اندر ہوتا ہے۔ جب قلب کے اندر آجائے گا۔ تب عمل کے اندر پیدا ہو گا۔ جب قلب میں ہی نہیں ہو گا تو قالب میں بھی نہیں ہے۔ وہ کیسے متقی بن جائے گا؟ تو بہر حال جب ایمانی زندگی آجاتی ہے تو خیالات پر بھی کنٹرول کرنا ہوتا ہے کہ خیالات بھی ایسے نہ ہوں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ جیسے آپ کے ہاتھ پیر کو دیکھتے ہیں ایسے اللہ دلوں کو بھی دیکھتے ہیں ___ **واللّٰہ علیم بذات الصدور۔ انّ اللّٰہ لاینظر الی صورکم واعمالکم ولکن ینظر الی قلوبکم ونیاتکم۔** اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو نہیں دیکھتے' دلوں کو دیکھتے ہیں کہ اسکے اندر نیت کیا ہے۔

تو دنیوی بادشاہوں کا قانون صرف بدن پر لاگو ہوتا ہے۔ لیکن خدائی قانون تو قلب پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ دنیوی سلطنتیں بد عملی سے روک سکتی ہیں کہ چور نے چوری کی اسے جیل بھیج دیا۔ ڈکیت نے ڈکیتی کی اسے جیل بھیج دیا لیکن قلب تو نہیں بدل سکتا وہ تو خدا کی حکومت سے بدلے گا۔ دنیوی حکومتیں افعال سے روکتی ہیں اور خدائی حکومت و قانون ان بُرے افعال کی نفرت دل میں ڈالتی ہے۔ تو جب تک اخلاقی حالت درست نہ ہو آدمی صحیح معنوں میں آدمی نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری اور لازمی چیز ہے کہ اخلاقی حیثیت سے اس کے اندر بد عملی سے نفرت پیدا ہو جائے۔ تو شریعت یہ بھی چاہتی ہے کہ بُرے افعال پر پابندی عائد کی جائے تاکہ لوگ بد عمل نہ بنیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے اخلاق درست کئے جائیں تاکہ بد عملی سے لذت حاصل نہ ہو سکے بلکہ نفرت پیدا ہو جائے۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہی کھانا' پینا' وہی سونا جاگنا وہی اٹھنا بیٹھنا وہی مکان بنانا ان افعال پر طبیعت حکومت کر رہی تھی تو حیوانی زندگی بنی جب عقل حکومت کرنے لگی تو انسانی زندگی بنی اور خدا کی وحی حکومت کرنے لگی تو ایمانی زندگی بنی' انسانی زندگی کا جو مادہ تھا انہی افعال کو شائستہ اور بہتر بنا دیا تو شریعتِ اسلام آپ کو کھانے پینے تجارت زراعت سے نہیں روکتی۔ حکمرانی کو نہیں روکتی مگر ان ساری چیزوں کو شائستہ بنا کر رضائے خداوندی کا ذریعہ بنا دے گی تاکہ آپ کے قلب میں شائستگی پیدا ہو جائے۔ تو اسلام جامع مذہب ہے' فقط نماز روزہ نہیں سکھلاتا بلکہ اس کا تعلق تختِ سلطنت سے بھی ہے' گھریلو زندگی سے بھی' میدانی اور جنگی زندگی سے بھی' صلح سے بھی اور جنگ سے بھی۔ کام وہی کرے گا جو انسانی زندگی میں ہوں۔ مگر اس کا رخ دین کی طرف بدل دیتا ہے۔ قلب کا رخ ذرا سیدھا کر دو تو دین بن جائے گا۔

غزوۂ بدر میں حضرت علیؓ نے ابو جہل کو پچھاڑ دیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے' خنجر اٹھایا تو ابو جہل نے نیچے سے حضرت علیؓ کے منہ پر تھوک دیا۔ حضرت علیؓ فوراً خنجر چھوڑ کر کھڑے ہو گئے ابو جہل نے کہا' اے علی میں تجھے بڑا دانشمند سمجھتا تھا اب آپ دشمن پر قابو پا چکے تھے اور دشمن ایسا جو نہ صرف تمہارا بلکہ تمہارے پیغمبر اور دین کا بھی دشمن ہے' تو جو تمہارے نزدیک بدترین دشمن تھا۔ آپ نے اس پر قابو پا کر چھوڑ دیا۔ اس سے بڑھ کر غیر دانشمندی کیا ہو گی؟

حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ میں تجھ سے خدا کے لئے لڑنے آیا تھا' جذباتِ نفسانی کی وجہ سے نہیں' تو

نے جب منہ پر تھوکا تو نفس میں غیظ پیدا ہوا۔ اگر میں قتل کرتا تو نفسانی جذبہ سے قتل کرتا اور میری عبادت تباہ ہو جاتی۔ میں تو اللہ کے لئے لڑتا ہوں کہ تو اللہ کے دین کا دشمن ہے' اس کے کلمہ کو نیچا دیکھنا چاہتا ہے اپنی ذات کے لئے قتل کرتا تو نفسانیت کا قتل کرتا' للّٰہیت باقی نہ ہوتی ___ تو قتل وہی تھا' طبعی جذبے سے قتل کرتے تو نفسانی جذبہ ہوتا اور یہ ہوتا کہ محفوظ ہو جاتے لیکن ایمانی جذبے سے قتل کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا خدا راضی ہو اور مجھے آخرت میں اجر ملے۔ پس جو کام انسان کرتا ہے تو وہ ہر کوئی کرتا ہے کافر کھاتا پیتا ہے' مؤمن بھی کھاتا پیتا ہے۔ وہ لڑتا ہے اور صلح کرتا ہے' یہ بھی لڑتا ہے اور صلح کرتا ہے فرق کیا ہے؟ وہ بحیثیت مؤمن کے ہر کام کرے گا۔ بوجہ اللہ کرے گا کافر وہی کام اپنے نفس کو خوش کرنے کے لئے کرے گا۔ مؤمن میں نفسانیت ختم ہو جاتی ہے وہ تو للہ فی اللہ کام کرتا ہے۔ تو عمل میں فرق نہیں ہوتا۔ نیت اور روح میں فرق ہوتا ہے۔ ایک کا رخ زمین کی طرف ہے اور دوسرے کا عرش کی طرف۔

تو ایمانی زندگی فقط رخ بدلتی ہے اعمال کو تبدیل نہیں کرتی' نفس مہذّب ہو جائے تہذیبِ نفس اصل ہے ___ تو یہ ایمانی زندگی کہلاتی ہے۔ تو اگر ہم فقط کھانے پینے میں لگے رہیں' اوڑھنے پہننے اور سنوارنے میں لگے رہیں تو حیوانیت سے آگے نہیں بڑھیں گے اور اگر قومی خدمت اور مفادِ عامّہ کے لئے کچھ کیا تو زیادہ سے زیادہ انسان بن گئے۔ لیکن مؤمن نہیں بنیں گے اور جب مؤمن بنیں گے تو ان سب چیزوں کو بوجہِ اللہ کریں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے فرمایا ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ﴾ اے ابراہیم (علیہ السلام) مسلم بن جاؤ۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ معاذ اللہ اب تک کفر میں تھے۔ اب اسلام قبول کرلیں' وہ تو پیغمبر ہیں ایمان کا سرچشمہ ہیں۔ تو مسلِم بننے کے معنیٰ ہیں گردن نہاد ہونے کے یعنی اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو کہ جو کام کرو اپنے نفس کی رضا کیلئے نہ کرو۔

﴿قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا اے اللہ! میں مسلِم بن گیا۔ فرمایا مسلِم بن گئے تو اعلان کرو' ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ کہہ دے ابراہیم (علیہ السلام) کہ میری نماز اور حج میرا مرنا جینا سب اللہ ربّ العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ تو میں ان اعمال میں کوئی شریک نہیں کرتا محض اللہ کی رضا کے لئے کرتا ہوں۔ مسلِم بننے کے معنی یہی ہیں کہ کھانا پینا مرنا جینا بوجہِ اللہ بن جائے ___ تو ایمان آکر اور زندگی نہیں سکھلاتا' اسی انسانی زندگی کو مہذّب اور شائستہ بنا دیتا ہے۔

عرفانی زندگی' منشاءِ خداوندی کی حکومت

اور جب یہ مکمل ہو جاتی ہے تو اب اللہ کی رضا کیلئے 'لڑنا' مرنا اور جینا بھی ہے۔ اب جتنا بھی اللہ کے لئے کام کرے گا حق تعالیٰ کی معرفت اور پہچان بڑھ جائے گی اور جتنی پہچان بڑھتی جائے گی قربِ خداوندی نصیب ہوتا جائے گا ___ ایمانی زندگی میں فقط عقیدہ تھا کہ مالک الملک ایک ہے اور اللہ کی رضا کیلئے کام کرتے ہیں اب فقط علم نہیں رہے گا۔ جان پہچان ہو جائے گی اور اب منشاء کی پابندی کرنے لگے گا۔ اب تک تو قانون کی پابندی کر رہا تھا۔ حکم ہوا نماز پڑھ لے کہا بہت اچھا۔ حلال اختیار کرو' حرام چھوڑ دو' کہا بہت اچھا' رشوت مت لو۔ بہت اچھا' جھوٹ مت بولو کہا بہت اچھا ___ تو جتنے احکام تھے ان کی پابندی کا نام ایمان اور اسلام ہے کہ خدا کے قانون کے نیچے زندگی بسر کر سکے' یہ ایمانی زندگی تھی لیکن ایک مرتبہ زندگی کا اس سے بھی اوپر تھا وہ یہ

کہ ___ قانون کی پابندی کرتے کرتے آخر میں قانون ساز کے منشاء کی پابندی کرنے لگتا ہے اور قانون سے بالاتر ہو کر عمل کرتا ہے۔

مثلاً قانون تو یہ ہے کہ کسی محبوب نے امر کیا کہ بھئی اپنے باغ سے ہمیں پھول دیدو اور تم نے ان کو پھول پہنچادیا اور قانون سے بالاتر منشاء کی پابندی یہ ہے کہ سارا باغ ہی اس کے سپرد کر دیا کہ پھول کیا ہے سارا باغ ہی حاضر ہے ___ اللہ نے مانگا کہ جو روٹی کھاتے ہو اس میں تھوڑا حصہ اللہ کے نام پر بھی دیدو۔ تو منشاء کی پابندی یہ کہ سارا کھانا ہی اٹھا کر اللہ کے نام پر دیدیا خود روزہ رکھ لیا ___ تو انسان ایسا جب کرے گا جبکہ حاکم سامنے موجود ہو۔ جب سامنے موجود ہو گا تو حکم کا انتظار نہ ہو گا بلکہ وہ تو اسکی نگاہ و آبرو کو پہچان کر عمل کرے گا' اس کی منشاء اس کی پیشانی سے معلوم ہو جائے گی کہ یہ چاہتا ہے یہ نہیں۔

اورنگ زیبؒ کے واقعات میں لکھا ہے کہ ان کا جو کمانڈر انچیف تھا اس نے فوجی سامان اسلحہ کی تیاری شروع کر دی اور فوج کے کانوں میں پھونک دیا کہ دکن پر جانا ہے تیار رہو۔ تو کسی نے کمانڈر سے کہا کہ بادشاہ نے حکم دیا ہے؟ کہا نہیں بلکہ ایک دفعہ اورنگ زیبؒ تخت پر بیٹھے ہوئے تھے میں کھڑا تھا۔ تو مجلس میں دکن کا جو ذکر آیا تو بادشاہ نے نہایت تیز نگاہوں سے دکن کی طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ دکن سے ان کے دل میں زنگ ہے۔ تو ابھی تو حکم نہیں ضابطہ میں تو پھر ہی ہو گا مگر میں نے اورنگ زیب کا منشاء پالیا تھا۔ تو اگر یہ عالمگیر سے دور ہوتا تب تو انتظار کرتا کہ قانونی حکم پہنچے لیکن چونکہ سامنے کھڑا تھا تو اس کی نگاہ اور پیشانی سے پہچان گیا۔ تو منشاء کی پابندی کرنا گویا پہچان پر عمل کرنا ہے۔ اس کو معرفت اور عرفان کہتے ہیں۔ ایک علم اور اعتقاد ہے جو غائبانہ ہوتا ہے اور ایک یہ کہ اللہ کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو آنکھوں سے دیکھ لیا اب قانون کا انتظار نہیں اب تو نگاہ و آبرو ہی مقصد بتلادے گی۔ اس کو معرفت کی زندگی کہتے ہیں۔ اور اس کا نام ہم عرفانی زندگی رکھیں گے۔

ایرانی شہزادے کا ایک واقعہ میں نے دیکھا کہ اس کے پاس بادشاہ ہندوستان مہمان ہوا۔ انہیں لیموں کی ضرورت پڑی' شہزادۂ ایران کے باغ میں لیموں کھٹے تھے' خادم اجازت لینے آیا وہ سن کر منقبض ہوئے اور ترشروئی سے دیکھا۔ اس نے باہر آکر کہا کہ اجازت مل گئی لیموں توڑو۔ کہا کہ بے وقوف اجازت کہاں ملی وہ تو کچھ بولے ہی نہیں۔ اس نے کہا کہ جب شہزادہ نے تُرش نگاہوں سے دیکھا تو سمجھ گئے کہ کھٹے لیموں کی اجازت دیدی گئی ہے۔ تو پاس رہنے والے منشاء اور طبیعت میں اتنا دخل پالیتے ہیں۔ خواہ لفظ سامنے نہ ہوں۔

تو انبیاء و اولیاء جو معرفتِ خداوندی حاصل کر لیتے ہیں وہ اپنے ذوق سے ان چیزوں کو پالیتے ہیں جو منشاء خداوندی ہوتے ہیں حالانکہ حکم ابھی نہیں ہوتا اور بہت سے اہل اللہ اور اولیاء کاملین کے قلب پر جو واردات ہوتے ہیں ان واردات سے ان کو منشاء خداوندی معلوم ہو جاتا ہے' وہ شریعت کا قانون نہیں ہوتا تو اس کی تبلیغ نہیں کرتے مگر وہ خود کرنے پر پابند ہیں کیونکہ انہوں نے منشاء کو دیکھ لیا ___ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرّہ العزیز جو دارالعلوم کی جماعت کی شیخ ہیں وہ مکہ معظمہ ہجرت کر کے چلے گئے تو عمر بھر سیاہ رنگ کا جوتا نہ پہنا۔ لوگوں نے کہا کہ شرعاً ناجائز ہے؟ فرمایا نہیں۔ پوچھا کیوں نہیں پہنتے۔ فرمایا بیت اللہ کا غلاف سیاہ رنگ کا ہے۔ مجھے بے ادبی معلوم ہوتی ہے کہ اس رنگ کو قدموں میں استعمال کیا جائے۔ یہ محض ایک ذوق اور منشاء کی بات تھی۔ تو ادبی ذوق کے اندر بعض دفعہ آدمی وہ چیزیں کرتا ہے کہ قانون میں نہیں ہوتیں مگر اس کا ذوق کہتا ہے کہ مجھے اس طرزِ عمل پر جانا ہے' اس کو عرفانی زندگی کہتے ہیں۔

تو اولیاء کاملین کی زندگی عرفانی ہوتی ہے کہ محض جائز و ناجائز ہی نہیں بلکہ جائز کے اندر بھی دیکھتے ہیں کہ

منشاء اگر یہ ہو کہ کم سے کم کھاؤں تو ایسا کروں اور اگر یہ ہو کہ بالکل نہ کھاؤں تو میں فاقہ کروں۔

حضراتِ صحابہؓ اور حضراتِ اہل اللہ جو فقر و فاقہ کو پسند کرتے ہیں تو شریعت نے یہ حکم نہیں دیا مگر بہت سے اولیاء کی زندگی ہے جیسے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کہ ایک ایک ہفتہ فاقہ کا گزرتا تو یہ شرعی حکم نہیں تھا۔ مگر شریعت بھیجنے والے کا منشاء ان کے حق میں یہی تھا کہ جب زیادہ سے زیادہ زہد بڑھ جائے تو زیادہ سے زیادہ درجات بلند ہوں گے۔

حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کو فاقہ سے بڑی محبت تھی اور دو دو ہفتے فاقے ہوتے تھے اور وہ ارادی فاقے ہوتے تھے۔ یہ نہیں کہ مفلس اور تنگدست تھے۔ دولت تو ایسے لوگوں کے قدموں میں آکر گرتی ہے ___ تو شاہ ابوالمعالیؒ کے پیران کے گھر آئے شاہ صاحب موجود نہیں تھے تو گھر والوں کو پریشانی ہوئی کہ ہمارے گھر کے جو بڑے ہیں (شاہ ابوالمعالی) ان کے شیخ کی کس طرح خاطر مدارت کریں۔ شیخ سمجھ گئے کہ نہ دانہ ہے نہ پانی۔ تو ایک روپے کا غلّہ منگوایا اور ایک تعویذ لکھ کر دیا اور فرمایا کہ اسے غلہ میں ڈالدو اللہ برکت دے گا۔ شیخ ایک ہفتہ ٹھہرے اور روزانہ کھایا جب چلے گئے تو وہ غلّہ ختم نہیں ہوتا تھا۔ دو تین ہفتے کے بعد شاہ ابوالمعالیؒ تشریف لائے تو دیکھا کہ دو دو وقت روٹی پک رہی ہے۔ انہیں فقر و فاقہ سے محبت تھی۔ تو فرمایا کہ کیا بات ہے فاقہ نہیں ہوتا۔ ہمارے پاس تو کچھ تھا نہیں۔ دو وقت کی روٹی کہاں سے آگئی۔ تو بتلایا گیا کہ آپ کے شیخ آئے تھے گھر میں فاقہ تھا۔ تو انہوں نے خود ایک روپے کا غلّہ منگوایا اور تعویذ لکھ کر اس میں ڈالا۔ اس کی برکت ہے۔ کہا اچھا تم بڑے گستاخ ہو۔ میرے شیخ کے تعویذ کو غلہ میں ڈالدیا ہے۔ نکال کر لاؤ۔ میں اسے اپنے سر پر رکھوں۔ اسے لے کر پگڑی میں باندھ لیا اور وہ غلّہ اسی دن ختم ہو گیا۔ اب پھر فقر و فاقہ شروع ہو گیا تو یہ کہاں شریعت کا حکم تھا کہ ہفتہ ہفتہ فاقہ کرو؟ ___ مگر قانون بنانے والے کا منشاء محسوس کیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ فقر و فاقہ کی زندگی ہو تاکہ درجات بلند ہوں، روحانیت ترقی کرے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ میں آتا ہے کہ دو دو مہینے گزرتے تھے کہ بیتِ نبوّت میں دھواں نہیں اٹھتا تھا۔ کھانے کو ایک ٹکڑا کھجور اور پانی (آسودین) پر گذر ہوتی تھی۔ تو قرآن کریم میں تو یہ حکم موجود نہیں تھا کہ آپ دو مہینے بالکل فقر و فاقہ سے رہیں۔ مگر قانون سے بالاتر ہو کر قانون بھیجنے والے کا منشاء آپ کے قلب مبارک پر روشن تھا کہ انبیاء علیہم السلام کی پاکیزہ زندگی کا یہی تقاضا ہے کہ وہ کھانے پینے اور لذّاتِ دنیا کی طرف ادنیٰ توجہ بھی نہ دیں۔ وہ توجہ کریں تو حق تعالیٰ کی ذات کی طرف، علم و عرفان کی طرف، تو قانون ساز کے منشاء کو پاکر عمل کرنا، اسے معرفت یا عرفانی زندگی کہتے ہیں۔ مگر اس عرفانی زندگی کا مادہ بھی وہی ہے جو حیوانی زندگی کا تھا، وہی کھانا پینا، رہنا سہنا، وہی سب کچھ اب منشاء خداوندی حاکم بن گیا۔

تو حیوانی زندگی میں طبیعت حاکم ہوتی ہے، جو ایک جاہل بادشاہ ہے۔ جس کے تحت آدمی جانوروں کی طرح کھاتا پیتا ہے۔ انسانی زندگی آتی ہے تو عقل حاکم ہو جاتی ہے اور عقل میں شعور ہوتا ہے تو ذرا سوچ سمجھ کے کھاتا پیتا ہے، ایمانی زندگی آتی ہے تو وحی کی رہنمائی ہوتی ہے تو عفّت اور پاکدامنی پیدا ہو جاتی ہے اور عرفانی زندگی جب آجاتی ہے تو منشاء الٰہی انسان کے اوپر حکومت کرتا ہے۔ اس وقت انسان کی زندگی نہایت بلند و بالا ہوتی ہے جیسا کہ انبیاءؑ اولیائے کاملین اور علماء ربانیین کی زندگی ___ جس کے اندر دنیا ساری موجود ہے مگر حظ نفس کا کوئی گذر نہیں، نفسانیت کا کوئی مشائبہ نہیں، للہیت کے جذبات کام کرتے ہیں عداوت اور دوستی سب کچھ اللہ کے لئے ہوتی ہے۔ نفسانی جذبات سے کچھ نہیں ہوتا۔ حدیث میں ہے:

من اعطی للّٰہ ومنع للّٰہ واحب فی اللّٰہ وابغض للّٰہ فقد استکمل الایمان۔

جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے' عداوت باندھی تو اللہ کے لئے' کسی کو دیا تو اللہ کیلئے ہاتھ روکا تو اللہ کیلئے۔ تو اس نے اپنے ایمان کو کامل کر دیا۔

صحابہؓ نے منشاء خداوندی اور اس کی رضا حاصل کرنے کیلئے گھر بار لُٹا دیا قانونِ شریعت سے آگے ہو کر ساری چیزیں وقف کیں۔ ورنہ حق تو صدقاتِ واجبہ ادا کرنے سے بھی ادا ہو جاتا ___ تو گویا عرفانی زندگی بسر کرنے والا اللہ کے سامنے حاضر ہوتا ہے' اسے دیکھتا ہے' اسے عرفانی زندگی بھی کہیں گے اور احسانی بھی ___

ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہٗ یراک اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا کہ اللہ دیکھ رہے ہو' اس مقام تک نہ پہنچ سکو تو کم از کم یہ کہ اللہ تو دیکھ رہا ہے یہ اکمل زندگی ہے۔

وحدانی زندگی' مقامِ فنائیت

اور جب اتنا قریب ہو جائے کہ گویا تمام اعمال محبوب کو دیکھ کر کر رہا ہے تو اب یہ نہیں ہو سکتا کہ صرف دیکھنے پر قناعت کرے بلکہ چاہتا ہے کہ نہ صرف دیکھوں بلکہ معانقہ کروں' گلے لگوں' تو ایک وقت یہ بھی آتا ہے کہ اس معرفت و احسان کے بعد جی چاہتا ہے کہ مصافحہ کروں' حق تعالیٰ سے مل لوں۔ حدیث میں فرمایا گیا

لایزال یتقرب عبدی بالنوافل حتّٰی کنت سمعہ اللتی یسمع بہ وبصرہ اللذی یبصر بہ ویدہ اللتی یبطش بھا۔

بندہ نوافل پڑھتے پڑھتے مجھ سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے' اس کی آنکھ بن جاتا ہے۔ جس سے وہ دیکھتا ہے' اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔

یعنی ظاہری اعضاء اس کے ہوتے ہیں قوتیں میری کام کرتی ہیں۔ یہ گویا وہ مقام ہے کہ اپنے نفس کو ہٹا کر ختم کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کر دیا اور حق تعالیٰ کی ذات اور تجلیات کے اندر غرق ہو گیا۔ لایزال یتقرب عبدی... الخ

جس کو یوں کہنا چاہئے جو کسی شاعر نے کہا ہے ؎

من تو شدم تو مَن شدی مَن تَن شدم تو جان شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

تو میری جان بن گیا کہ میرے اندر سرایت کئے ہوئے ہے' تو میں بن گیا اور میں تو' وحدت پیدا ہو گئی تاکہ کہنے والا یہ نہ کہے کہ میں کوئی اور ہوں اور تو کوئی اور۔ اس زندگی کو ہم وحدانی زندگی کہیں گے کہ وحدت پیدا ہو گئی اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ بندہ خدا میں غرق ہو کر اس کا جز بن گیا' اللہ تعالیٰ جزئیت سے پاک ہے بلکہ مطلب یہ ہو گا کہ اس نے اپنی نفسانی شہوات کو ختم کر کے مناسبت مع اللہ کے جذبات پیدا کر دیئے کہ جو وہ کرتا ہے میں بھی کروں گا۔ وہ جو چاہے گا میں بھی چاہوں گا۔ کسی نے کسی بزرگ سے پوچھا تھا کہ کیا حال ہے۔ انہوں نے فرمایا اس شخص کا کیا حال ہو سکتا ہے کہ جس کی مرضی پر دونوں جہاں کے کارخانے چلتے ہوں۔ تو پوچھنے والے نے کہا اچھا آپ اس درجہ کے ہیں۔ فرمایا ہاں الحمد للہ میں اس مقام پر ہوں۔ اس نے کہا آخر کس طرح؟ تو فرمایا' اس طرح کے دونوں جہان کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چلتے ہیں اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے۔ جو وہ چاہتا ہے وہ میں چاہتا ہوں۔ اگر کوئی پیدا ہوتا ہے تو کہتا ہوں کہ الحمد للہ یہی بہتر تھا' اگر کوئی مرتا ہے تو کہتا ہوں الحمد للہ یہی مناسب تھا۔ میں کون ہوں اللہ کے خلاف رائے دینے والا کہ وہ تو مارے میں کہوں یہ زندہ رہے تو سارا عالم میری مرضی پر چلنے لگا۔

ضلع انبالہ کے ایک بزرگ شاہ دولہ گزرے ہیں۔ سائیں توکل شاہؒ کے سلسلہ میں تھے گاؤں میں بارش ہوئی جمنا چڑھ گئی۔ کنارے پر گاؤں پڑتا تھا۔ طوفان آیا' ایک دیوار تھی جس کی وجہ سے پانی کچھ رکا ہوا تھا۔ اگر وہ دیوار نہ ہوتی تو سارا گاؤں غرق ہو جاتا' لوگ بیچارے پریشان ہو کر شاہ دولہ کی خدمت میں آئے کہ حضرت اللہ کے واسطے دعا کریں' طوفان سے گاؤں غرق ہو رہا ہے۔ فرمایا اچھا طوفان آگیا۔ چلو' پھاوڑا لیکر چلے۔ گاؤں والوں کا مجمع ساتھ تھا۔ تو جو دیوار (وقایہ) تھی شاہ دولہ نے وہ دیوار ڈھانا شروع کر دی۔ اب تو لوگ چلانے لگے کہ حضرت سارا گاؤں غرق ہو گا۔ فرمایا "جدھر مولیٰ اُدھر شاہ دولہ" میں خدا سے مقابلہ کرنے آسکتا ہوں؟__ تو یہ مقام جب نصیب ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ کی رضا میں فنا کر دے۔

وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ بس جو اللہ چاہتا ہے' وہی تم بھی چاہو۔ اس کے خلاف چاہ نہیں سکتے۔ جس کو وہ مرضی اور پسندیدہ قرار دیں ہم بھی اسے پسندیدہ قرار دیں تو کہا جائے گا کہ یہ شخص فنائیت کے مقام پر پہنچ گیا۔ فانی فی اللہ ہو گیا۔ یہ نہیں کہ ایک جز بن گیا۔ یہ جزئیت اور بعضیت سے اللہ کی ذات پاک ہے' فنائیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنے نفس کے تقاضوں کو ختم کر دے خدا کی مشیت میں اپنے آپ کو غرق کر دے کہ جو ان کا منشاء وہ میرا منشاء۔ "جدھر مولیٰ ادھر شاہ دولہ"__ اس کو ہم وحدانی زندگی کہیں گے۔

یہاں زندگی کا مادہ وہی ہے کھانا پینا' چلنا پھرنا' اوڑھنا' پہننا لیکن وہ اس درجہ پر آگیا کہ قانون سے بالاتر ہو کر محض منشاء کی پابندی میں غرق اور اس کی مرضی کے اندر فانی ہو جاتا ہے__ اسی موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے فرمایا گیا۔ وما رمیت اذرمیت ولکن اللہ رمی

غزوۂ بدر کے اندر آپ نے کنکریاں پھینک کر ماریں تو جس کے دماغ پر کنکری پڑی وہ دماغ کو تو کیا پورے بدن کو' قلب و جگر کو پھاڑ کر رکھ دیتی اور سارے بدن سے پار ہو کر گذرتی__ تو کنکر میں اتنی طاقت تو نہیں ہوتی لیکن نبی کے اندر جذباتِ حق موجود ہیں۔ ان کی طاقت سے یہ اثر پیدا ہوتا ہے۔ نبی آلۂ کار ہوتا ہے اور خدائی قوتیں ان کے اندر کار فرما ہوتی ہیں۔ اسی کو قرآن کریم میں فرمایا گیا__ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وہ تو اللہ میاں مار رہا تھا اور جیسے فرمایا گیا' وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ہمارا پیغمبر ہوائے نفس سے نہیں بولتا' وحی سے بولتا ہے تو وحی تو کلامِ خداوندی ہے مطلب یہ ہے کہ زبان تمہاری کلام ہمارا ہوتا ہے۔ تمہارا ذاتی کلام بھی تمہارا نہیں زبان تمہاری ہے۔ روشنی ہماری ہے اور چراغ تمہارا ہے' جس سے گھر روشن ہو جاتا اور جیسے کہ دوسری جگہ فرمایا گیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو تمہارے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں وہ تمہارے ہاتھ پر نہیں اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ اللہ کا ہاتھ سب ہاتھوں کے اوپر ہے۔ تو اس میں وحدت بیان کی گئی ہے۔ نبی کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ کہا' نبی کے کلام کو اپنا کلام کہا' نبی کے منشاء کو اپنا منشاء کہا۔ یہ جب پیدا ہوتا ہے کہ وحدانی زندگی آجائے۔

اہل اللہ کی زندگی کی جھلک

تو میں نے پانچ زندگیاں آپ کے سامنے پیش کیں' ایک حیوانی زندگی' ایک انسانی زندگی' ایک ایمانی زندگی' ایک عرفانی زندگی اور ایک وحدانی زندگی۔ مگر ان پانچ زندگیوں میں جو دو ابتدائی زندگیاں ہیں وہ مبادی اور سبب کے درجے میں ہیں اور آخری زندگی ثمرہ کے درجے میں ہے اور بیچ کی زندگی جس کو میں نے ایمانی زندگی کہا وہ اصل مقصود ہے' زندگی بنانے کے لئے حیوانی بھی ضروری ہے مگر یہ زندگی اصل مقصود نہیں۔ ان ساری زندگیوں سے مقصود یہ ہے کہ سارے کام رضائے خداوندی کیلئے ہوں__ اور یہ جو انسانی زندگی ہے

کہ منشاء کو پالیا اور وحدانی زندگی یعنی فانی فی اللہ ہونا یہ ثمرات کے درجے ہیں اور نتیجہ ہے ___ تو بیچ کی زندگی کیلئے دو نتیجے اور دو سبب ہیں۔ مقصود اصل بیچ کی زندگی یعنی ایمانی زندگی ہے۔ جس کا نام شریعت اور اتباعِ شریعت ہے۔ اور قانونِ شریعت کی پابندی نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسانی زندگی اور حیوانی زندگی ہم میں نہ ہوں۔ اس واسطے اصل مقصود ایمانی زندگی رہ گئی کہ میرا مرنا جینا اللہ رب العزت کیلئے ہو اس قانون کے تحت ہی ہو۔ اس کو قرآن نے حیاتِ طیبہ قرار دیا ہے کہ جو شخص ایمان اور عملِ صالح اختیار کرے گا مرد ہو یا عورت اسے ہم پاکیزہ زندگی عطا کریں گے یہ کیا ہوگی؟ اکلِ حلال کا جذبہ پیدا ہوگا' حرام خوری سے بچے گا۔ جتنا اس سے بچے گا حق تلفی سے بچے گا' جتنا حق تلفی سے بچے گا امن کا ذریعہ بنے گا' محبوب القلب بنے گا۔ مبغوض نہ ہوگا۔ اگر ایک شہر میں سب کے سب حرام چیزوں کو چھوڑ کر خالص اپنے حق پر آجائیں' غیر کی حق تلفی نہ کریں تو باہمی محبت اور حسنِ سلوک پیدا ہوگا اور شریعتِ اسلام کے اتباع ہی میں درحقیقت امن ہے جتنا اس سے ہٹو گے برائی پیدا ہوگی کیوں کہ حق تلفیوں سے نفرت اور برائی پیدا ہوتی ہے۔ تو اصل بنیادی چیز جس سے کسی مملکت میں امن و سکون ہو وہ انبیاء علیہم السلام کا اتباع ہے اور ان کی لائی ہوئی زندگی کی پیروی ہے ان کی سنتوں کا اتباع ہے۔

تو اس طرح اکلِ حلال کی عادت پیدا ہوگی پھر عبادت میں لذت پیدا ہوگی' محبتِ خداوندی کا ذائقہ انسان میں آجائے گا اور اس میں سرشار ہو کر دنیا و ما فیہا کی دولتیں ہیچ نظر آئیں گی۔ جب باطن کی دولت انسان کو میسر آجائے تو سب دولتیں ہیچ بن جاتی ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ایک ایک دن میں تین تین ہزار مہمان ہوتے تھے۔ بڑے بڑے ہال بھر جاتے تھے تو سنجر کے بادشاہ نے یہ پوچھا کہ شیخ کے ہاں مہمان داری زیادہ ہے اب اس نے اپنے اوپر قیاس کیا حالانکہ وہ اللہ پر بھروسہ کر چکے تھے' پریشانی کی کیا ضرورت تھی۔ تو ایک صوبہ پورا جسکا نام نیمروز تھا' شیخؒ کے نام وقف کیا۔ شیخؒ کی ملکیت قرار دیکر پیپل کے پتے پر لکھدیا کہ پورا صوبہ نیمروز آپ کے نام کرتا ہوں۔ جس کی سالانہ آمدنی لاکھوں روپے ہوتی ہے۔ شیخ نے اس کا جواب فارسی کے دو شعر میں لکھا ؎

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد
دردل بود اگر ہوسے ملک سنجرے

سنجر کے بادشاہ کا جو چتر ہے اسی طرح میرا منہ سیاہ اور میں بدبخت بن جاؤں اگر اسمیں ذرا بھی ہوس آجائے تو میں سیاہ بخت بن جاؤں گا۔ مجھے تمہارے صوبے کی ضرورت نہیں کیوں؟ آگے اس کی وجہ بیان کی

زانگہ کہ یا فتم خبر از ملک نیم شب
من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

جس دن سے مجھے نیم شب کا ملک ہاتھ آیا ہے۔ یعنی آدھی رات کی عبادت اور نفلوں کی وہ لذت جو حق تعالیٰ کے جلال و جمال کے مشاہدے ہوتے ہیں تو نیمروز کے ملک کی جو کے برابر بھی وقعت نہیں رہی۔ تو اہل اللہ ساری دنیا پر لات مار دیتے ہیں۔ اہل اللہ کو یہ لذتیں ملتی ہیں تو وہ ان وقتی لذتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں۔

(اللہ تعالیٰ ہم سب کو حیوۃِ طیبہ کی سعادت سے نوازے اور اتباعِ سنت خیرُ الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توفیق نصیب فرمائے اور حسنِ خاتمہ نصیب فرمائے' آمین!)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

تاثیرِ الاعمال

ایک زکوٰۃ کی خاصیت تھی کہ حسن معاشرت پیدا ہو ___ ایک روزے کی خاصیت تھی کہ نفس کے اندر سے شہوانی جذبات گھٹ جائیں ___ ایک زکوٰۃ کی خاصیت یہ تھی کہ نفس کے اندر سے بخل کا رزیلہ مٹ جائے۔ اسی طرح ایک نماز کی خاصیت ہے کہ اس سے دیدار خداوندی کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے ___ اور تڑپ بھی پیدا ہو جائے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةِ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ـ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ٥ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ ـ

تمہید

بزرگان محترم!

حدیث قدسی میں حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ :

انا عند ظن عبدی بی

میں بندے کے گمان کے ساتھ ہوں، جیسا گمان میرے ساتھ قائم کرے گا ویسا ہی میرا عمل اس کے ساتھ ہوگا۔ اگر آپ نے ایک ناکارہ کے بارے میں اچھا گمان کر لیا ہے تو کیا عجب ہے کہ حق تعالیٰ اس ناکارہ کو کارآمد بنادے ___ بہر حال اس وقت میں کچھ زیادہ کہنے کی ہمت تو نہیں ہے، نہ کچھ قوت ہی ہے اور سفر بھی بہت لمبا رہا۔ اس کی وجہ سے کچھ تھکاوٹ بھی ہے۔ اس لئے زیادہ وقت تو میں نہیں لے سکوں گا۔ البتہ جلسہ کے احترام کی وجہ سے چند جملے ضرور عرض کروں گا۔

خواص اعیان

اتنی اصولی بات سمجھ لیجئے کہ دنیا کی ہر چیز میں اللہ نے ایک خاصیت رکھی ہے۔ دوا ہو' غذا ہو ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور اس کے استعمال سے وہ خاصیت ظاہر ہوتی ہے ___ مثلاً گل بنفشہ ہے۔ زکام زائل کرتا ہے۔ یہ اس کی خاصیت ہے۔ جب آپ اسے استعمال کریں گے اور زکام ہو گا تو وہ زائل ہو گا ___ ملیٹھی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ کھانسی دفع کرتی ہے جب بھی آپ استعمال کریں گے' کھانسی ہو گی' اللہ تعالیٰ اسے زائل فرمادیں گے۔ تو ہر دوا کی ایک خاصیت ہے ___ اسی طرح ہر غذا کی ایک خاصیت ہے۔ گیہوں کھائیں گے تو اور خاصیت ہے' چنا کھائیں گے تو اور خاصیت ہے' چاول کھائیں گے تو اس کی اور خاصیت ہے۔ بہر حال ہر چیز کی ایک خاصیت ہے۔

خواص افعال

اور میں کہتا ہوں کہ یہ چیزیں تو اعیان میں سے ہیں' ان کی خاصیتیں تو ہیں ہی' انسان کی ہر حرکت میں ایک خاصیت ہے۔ ہر وضع میں ہر انداز میں ایک اثر ہے۔ اگر آپ کسی کے سامنے یوں اشارہ کریں' ممنون کرم ہو جائے گا اور اگر یوں کریں تو لڑائی بن جائے گی۔ اگر کسی کو انگوٹھا دکھلا دیں تو چڑ پیدا ہو جائے گی اور کسی کو سلام کرنے کے لئے ہاتھ اٹھائیں تو محبت پیدا ہو جائے گی۔ رخ دے کر بات کریں اس کا اثر اور ہے اور منہ پھیر کر بات کریں اس کا اثر دوسرا ہے۔ ہر ہیئت کا اثر اور ہر شے کا ایک اثر ہے۔

اسی طرح سمجھئے شرعی اعمال کی بھی کچھ خاصیتیں ہیں۔ جتنے اعمال حق تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں' ہر عمل کی ایک خاصیت اور اس کی ایک خاص تاثیر ہے جب اسے استعمال کیا جائے گا' اس کے اثرات ظاہر ہوں گے۔

روزے کی خصوصیت

مثلاً روزہ ہے اس کی ایک خاص خصوصیت اور خاصیت ہے۔ اور وہ قہر نفس ہے۔ جب آپ نفس کا دانہ پانی بند کر دیں گے اور نفس کو مقہور و مجبور کر دیں گے تو نفس مقہور ہو کر کے گناہ کی طرف نہیں جائے گا۔ یہ تو خمار گندم ہے۔ جتنی زیادہ غذا کھائی جاتی ہے' طاقت بڑھتی ہے' گناہ کی سوجھتی ہے اور سات دن فاقہ کر لیں تو گناہ کی طرف طبیعت ہی مائل نہیں ہو گی۔ اس لئے کہ نفس کے اندر ہی جان باقی نہیں ہو گی تو روزہ قہر نفس کے لئے رکھا گیا ہے کہ اس کو مقہور کر دے' قہر کے نیچے دبا دے تاکہ وہ کھل کر کوئی عمل نہ کر سکے اور مجبور ہو جائے۔

اسی واسطے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ روزہ رکھنے میں ___ نفس تو مقہور ہوتا ہی ہے اور نفس کے آثار و خواص تو مغلوب ہوتے ہی ہیں ___ نفس کے ساتھ شیطان کا ساز باز ہے ___ رمضان میں شیاطین بھی قید کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ جو کھل کر نفس پر اثر ڈالتے ہیں وہ گھٹ جاتا ہے۔ اس لئے کتنے بھی نیچے درجے کا مسلمان ہو' اس میں کچھ نہ کچھ رمضان کا احترام ضرور ہو گا۔ اگر روزہ بھی نہیں رکھے گا تو بھی دن میں کھاتے ہوئے شرمائے گا۔ بے روزہ رہنے کو اعلانیہ ظاہر کرنے سے شرمائے گا اور عار محسوس کرے گا ___ یہ

خاصیت ہے۔

زکوٰۃ کی خصوصیت

زکوٰۃ کی بھی ایک خاصیت ہے ___ پہلی خاصیت یہ ہے کہ بخل کا رذیلہ انسان کے اندر سے زائل ہوتا ہے۔ بخیلی کا جو مادہ ہے وہ گھٹ جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ غرباء کے لئے سہولت اور آسانی پیدا ہو جائے گی۔ اس سے حسن معاشرت پیدا ہوتا ہے۔ جتنا آپ غرباء پر خرچ کریں گے۔ وہ آپ کے ممنون کرم ہوں گے اور جان نثار بن جائیں گے۔ آپ تو یوں خوش ہوئے کہ میں نے اللہ کا ایک فرض ادا کیا کہ زکوٰۃ دے دی۔ غریب یہ سمجھے گا کہ میرے اوپر کرم کیا اور احسان کیا۔ تو امیر اور غریب میں ایک ربط اور رشتہ قائم ہو جائے گا۔ اور وہی حسن معاشرت کی بنیاد ہے ___ تو زکوٰۃ کے اندر جہاں نفس کے اندر یہ اثر پڑتا ہے کہ بخل کا رذیلہ زائل ہو وہاں معاشرت کی خوبی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور تمدن کی خوبی بھی سامنے آتی ہے اور امیر و غریب میں باہمی میل جول پیدا ہو جاتا ہے۔ تو یہ زکوٰۃ کی خاصیت ہے۔

ظہور خواص کی شرط

جب آپ اسے استعمال کریں گے یہ خاصیت ظاہر ہوگی' اب کوئی استعمال ہی نہ کرے تو وہ بات جداگانہ ہے۔ جیسے کوئی دوائی استعمال نہ کرے تو بیماری کیسے زائل ہوگی۔ محض طبیب کے نسخہ لکھ دینے سے تو بیماری زائل نہیں ہوگی۔ استعمال ہی کرنے سے زائل ہوگی۔ یہی صورت شرعی اعمال کی ہے کہ ہر عمل کی ایک خاصیت ہے۔ ظاہر جب ہی ہوگی جب اسے استعمال کیا جائے۔

ماہرین خواص کی اطاعت

حق تعالیٰ نے جس طرح سے اطباء جسمانی پیدا فرمائے' ڈاکٹر ہیں' طبیب ہیں وہ ان خواص و آثار کو جانتے ہیں۔ مریض کی حالت دیکھ کر وہ نسخہ لکھتے ہیں مریض اگر طبیب کی اطاعت کرے گا' شفا پائے گا۔ اطاعت نہیں کرے گا بیمار پڑا رہے گا۔ بیماری بڑھ جائے گی' ہلاکت کے قریب پہنچ جائے گا ___ تو اطباء جانتے ہیں۔ ہر شخص دوا کی خاصیت کو نہیں جانتا۔ اسے طبیب کی اطاعت کرنی پڑتی ہے۔

اگر کوئی طبیب نسخہ لکھے۔ اور بیماریوں کہے کہ آپ نے اس نسخے میں گل بنفشہ کو چھ ماشے کیوں لکھا ہے۔ ایک تولہ کیوں نہ لکھ دیا۔ اور ملیٹھی آپ نے تین ماشے کیوں لکھی ہے چھ ماشے کیوں نہیں لکھی۔ تو طبیب کان پکڑ کر مطب سے نکال دے گا کہ تو مجھے تعلیم دینے کے لئے آیا ہے یا شفا پانے کے لئے نسخہ لینے آیا ہے؟ ___ تو لامحالہ مریض کو اطاعت کرنی پڑے گی۔ جتنی مقدار وہ لکھ دے اور جو وقت وہ تجویز کرے۔ اسی وقت میں وہ دوا استعمال کی جائے گی۔ اتنی ہی مقدار میں استعمال کی جائے گی جتنی مقدار طبیب لکھ دے گا۔

پھر جو پرہیز بتلائے گا وہ بھی کرنا پڑے گا اگر آپ پرہیز نہ کریں تو دوا فائدہ نہیں دے گی ___ زکام کو زائل کرنے کے لئے اس نے گل بنفشہ لکھا۔ وہ آپ نے پی لیا۔ مگر صبح سے شام تک سیر بھر دہی برف ملا کے پی لی۔ اس سے تو زکام اور ترقی پر آجائے گا۔ تو دوا مؤثر نہیں ہوتی۔ جب تک پرہیز نہ ہو ___ ہر علاج کے

اندر دو جز ہوتے ہیں ایک دوا ایک پرہیز ___ بلکہ پرہیز زیادہ نافع ہوتا ہے۔ اگر جم کر پرہیز کرے تو بیماری آدھی ہو جاتی ہے۔ دوا سے پھر بقایا آدھی بیماری زائل ہو سکتی ہے۔ مگر ہر صورت میں طبیب کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ رائے زنی کرنے کی گنجائش نہیں ہوگی کہ اس نسخے میں آپ نے پانچ دوائیں کیوں لکھی ہیں۔ چھ کیوں نہ لکھ دیں ___ ؟ مریض کو اس کا حق نہیں ہوگا طبیب کہے گا کہ میں فن کی رو سے جانتا ہوں کہ کتنی مقدار ہونی چاہئے۔ تجھے اگر علاج کرانا ہے تو یہ نسخہ اسی مقدار میں استعمال کر۔

یہی صورت بعینہٖ طب روحانی یعنی شریعت کی ہے۔ جو اللہ نے نازل فرمائی۔ اس کے لئے اطبائے روحانی بھی نازل کئے وہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ انبیاء کی تعلیم سے ان کے ورثاء پیدا ہوتے ہیں۔ جن کو علمائے ربانی کہا جاتا ہے۔ وہ انبیاء سے وراثت پاتے ہیں اور وہ طب روحانی ان کے پاس آتی ہے ___ مریض سامنے آتے ہیں وہ بھی نسخے لکھتے ہیں۔ ہر مریض کے مناسب حال دوا تجویز کرتے ہیں ___ اگر مریض یہ کہنے لگے کہ آپ نے فلاں وقت میں مجھ دو ہی رکعات کیوں بتلائی ہیں' میں چار کیوں نہ پڑھ لوں؟ وہ کان پکڑ کے نکال دیں گے کہ تو علاج کے لئے آیا ہے یا تعلیم دینے کے لئے آیا ہے؟ اتنی ہی مقدار لازمی ہے۔ شریعت نے ایک تسبیح کی مقدار بتلائی کہ سو مرتبہ پڑھا کرو۔ مریضوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ یہ کہیں سو کے سوا سو کیوں نہ ہوئے؟ اور سو کے نوے کیوں نہ کر دیئے گئے۔ جتنی مقدار اللہ تعالیٰ نے تجویز کی ہے۔ وہی نافع ہوگی۔ جتنی مقدار تجویز نہیں کی وہ نافع نہیں ہو سکتی ___ تو ہر عمل کی ایک خاصیت ہے روزے کی بھی ایک خاصیت ہے۔ زکوٰۃ کی بھی ایک خاصیت ہے۔ حج کی بھی ایک خاصیت ہے اور نماز کی بھی ایک خاصیت ہے۔

نماز کی خصوصیت

نماز کی خاصیت کیا ہے؟

نماز پڑھنے والے میں دیدار خداوندی کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر نماز کا تارک ہے تو وہ جو میدان محشر میں دیدار خداوندی ہوگا' اس کی استعداد نہیں پیدا ہوگی وہ دیدار الٰہی سے محروم رہے گا۔ تو نماز کی خاصیت یہ ہے کہ وہ قلب کے اندر دیدار خداوندی کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔

دیدار خداوندی کے مراتب

یہاں نماز پڑھنے میں آپ اللہ تعالیٰ کو عقیدہ کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز اس طرح سے پڑھو کہ جیسے تم اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو ___ اس عقیدہ سے نماز پڑھے گا تو گویا عقیدے کی آنکھ سے حق تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے گو اس آنکھ سے نہیں دیکھ رہا ___ کوئی بزرگ ہے۔ ولی کامل ہے۔ وہ کشف کی آنکھ سے تجلیات خداوندی کو دیکھتا ہے۔ جب نماز پڑھتا ہے تو تجلیات الٰہیہ اس کے سامنے ہوتی ہیں ___ مگر قیامت کے بعد ایک وقت آئے گا کہ جس کے دیکھنے کی مشق آپ نے قلب سے' حواس سے اور باطنی آنکھ سے کی تھی وہ آج ظاہری آنکھ سے سامنے آجائے گی اور دیدار خداوندی عیاناً ہونا شروع ہو جائے گا۔ مختلف تجلیات نمایاں ہوں گی۔ جس میں بندے حق تعالیٰ شانہ کو دیکھیں گے ___ یہ دیکھنے کی استعداد نماز ہی پیدا کرتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد شریف میں تشریف رکھتے تھے اور چودھویں رات کا

ارشاد فرمایا کہ

تم جو چاند کو دیکھ رہے ہو تو ایک کا دیکھنا' دوسرے کے دیکھنے میں حارج تو نہیں ہے؟ وہ اپنی جگہ دیکھ رہا ہے' وہ اپنی جگہ دیکھ رہا ہے۔ اس کے دیکھنے میں وہ رکاوٹ تو نہیں بنا ہوا' اس کے دیکھنے میں وہ رکاوٹ نہیں بنا ا۔ دنیا کے کروڑوں اربوں انسان چاند کو ایک وقت میں دیکھتے ہیں مگر ایک کے دیکھنے میں دوسرے کا دیکھنا رج تو نہیں ہوتا ___ فرمایا ___ اسی طرح قیامت میں بندے اپنے پروردگار کو دیکھیں گے۔ اربوں کھربوں ں گے مگر ایک کے دیکھنے میں دوسرے کا دیکھنا حارج نہیں ہوگا۔ جس طرح سے تم چاند کو دیکھ رہے ہو۔

فجر وعصر کی خصوصیت

اور اس کے بعد فرمایا

اگر تم اس کی استطاعت رکھتے ہو اور یہ کر سکو کہ صبح کی نماز اور شام کی نماز پابندی کے ساتھ ادا کرو تو بدار خداوندی کا یہی ذریعہ بنیں گی۔

گویا خاصیت تو ہر نماز میں ہے مگر خصوصیت سے یہ دو نمازیں' عصر کی اور صبح کی' یہ دو نمازیں وہ ہیں کہ یہ ق تعالٰی کے دیدار کی زیادہ استعداد پیدا کرتی ہیں۔

اور بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں نمازوں میں عالم غیب آدمی کے قریب ہو جاتا ہے ___ یہ جو اعمال لکھنے والے ملائکہ ہیں' یہ رات کے اور ہیں اور دن کے اور ہیں۔ دن کے لکھنے والے صبح کی ماز کے وقت آتے ہیں اور رات کے لکھنے والے انہیں چارج دے کر واپس ہو جاتے ہیں۔ یہ دن بھر اعمال لھتے ہیں' عصر کی نماز جب پڑھتے ہیں تو یہ رات والے ملائکہ کو چارج دے دیتے ہیں۔ رات کو وہ اعمال لکھتے ں۔ تو صبح کی نماز میں بھی کروڑوں' اربوں' کھربوں ملائکہ جمع ہوتے ہیں۔ جو اعمال لکھنے والے ہیں اور اسی رح عصر کی نماز کے وقت بھی جمع ہوتے ہیں۔ ہر بندے کے اوپر دو فرشتے ہیں جو اعمال لکھتے ہیں۔ تو اگر ندے ایک ارب ہیں تو وہ چار ارب ہوں گے۔ غرض اربوں کی تعداد میں یہ ملائکہ صبح اور شام کی نماز کے قت آتے ہیں۔

فجر وعصر میں نزول ملائکہ کی حکمت

اور عجیب حکمت ہے حق تعالٰی کی کہ ان دو نمازوں کے لئے ملائکہ کا تبادلہ رکھا کیوں؟

اس لئے کہ جب آدم علیہ السلام کو خلافت دی جارہی تھی اور حق تعالٰی نے فرمایا تھا:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً

میں زمین میں اپنا نائب مقرر کرنے والا ہوں جو میری طرف سے دنیا میں میرا قانون چلائے گا۔ میری طرف سے نیابت کرے گا اور جو احکام میں نے بندوں کے لئے جاری کئے ہیں' انہیں پھیلائے گا۔ میں ایک نائب مقرر کرنے والا ہوں تو ملائکہ کو خلجان گذرا۔ جس کی وجوہ تھیں کہ:

اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ

آپ ایسی نوع کو خلیفہ بنا رہے ہیں۔ جو دنیا میں خون ریزی الگ کرے گی' فساد الگ مچائے گی اور ہم خدام لہاں چلے گئے ہیں جو ہر وقت آپ کی تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتے ہیں ___ گویا در پردہ اشارہ ادھر تھا کہ لافت ہمیں دی جائے یہ انسان تو نہایت ہی مفسد اور سفاک ہوگا۔

انسان کی تاریخ خون سے بھری پڑی ہے۔ آدم علیہ السلام کے وقت سے آدمی کا جو خون آدمی کے ذر سے بہنا شروع ہوا ہے۔ وہ آج تک بند نہیں ہوا۔ بلکہ بڑھتا ہی چلا جارہا ہے۔ تو انسان انسان کو پھاڑ کھ ہے۔

میں کہتا ہوں کہ انسان کو درندہ کہنا یہ درندے کی توہین ہے۔ اس لئے کہ درندہ مثلاً شیر ہے اگر پھاڑ تا تو بکری کو پھاڑے گا۔ شیر شیر کو تو نہیں پھاڑتا۔ انسان ایسا درندہ ہے کہ اپنے ہی بھائی بندوں کو پھاڑ کھاتا ہے جتنے مہلک ہتھیار ایجاد ہورہے ہیں اور انسان ایجاد کررہے ہیں وہ انسانوں ہی کی تباہی کے لئے ہورہے ہیں سانپ بچھوؤں کو ہلاک کرنے کے لئے تو یہ توپیں اور بندوقیں نہیں ہیں۔ آدمی آدمی کو ہلاک کرنے کے مہلک ہتھیار تیار کررہا ہے۔ تو انسانی تاریخ خون سے بھری ہوئی ہے۔ انسان ہی انسان کا خون بہارہا ہے۔ انسان ہی انسانوں کے حق میں فساد برپا کررہا ہے۔ کچھ صلاح پہ آنا چاہتے ہیں۔ یہ فساد انگیزی کرکے صلاح کے را سے ہٹادیتا ہے۔ تو فساد بھی ہے' خون ریزی بھی ہے ___ تو ملائکہ نے یہی عرض کیا تھا کہ اس نوع کے اندر خون بھرا ہوا ہے اور فساد بھرا ہوا ہے یہ آپ کی نیابت کرے گا؟ یہ تو نیابت کو اور فاسد بنادے گا اور خدام کہاں چلے گئے ہیں جو رات دن تسبیح اور تقدیس میں مصروف ہیں۔ ہم خلیفہ بنایا جائے۔

خلافت آدم پر شبہ کا حاکمانہ جواب

تو حق تعالیٰ نے اس کا ایک جواب تو حاکمانہ دیا کہ :

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ

تم نہیں جانتے ہم حقیقت حال کو جانتے ہیں ___ ملائکہ خاموش ہوگئے۔

لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ خاموش ہونے سے دل کا خلجان بھی نکل گیا ہو حاکم کے حکم سے آدمی دب ادباً چپکا تو ہو جاتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ دل کا خلجان بھی نکل جائے۔ اس لئے دوسرا جواب حکیمانہ دیا۔

خلافت آدم پر شبہ کا حکیمانہ جواب

اور وہ یہ تھا :

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

آدم علیہ السلام کو تمام ناموں کی تعلیم دے دی۔ دنیا کی جتنی چیزیں ہیں۔ ان سب کے نام بتلائے۔ سب کی خاصیتیں بتائیں۔ اللہ کے جتنے نام ہیں وہ بتلائے' ان کے خواص و آثار بتلائے۔ تو اسماء الٰہیہ اور ا کونیہ سب آدم علیہ السلام کو بتلائے۔

اس کے بعد ملائکہ سے کہا :

اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ

اگر تم اپنے دعوے میں' وہ ___ جو تمہارے دل میں دعویٰ ہے کہ ہم خلافت کے مستحق ہیں' سچے ہو تو چیزوں کے نام تو بتلاؤ

اس واسطے کہ خلافت علم سے چلتی ہے اور علم کا ابتدائی مقام یہ ہے کہ کسی چیز کا نام معلوم ہو۔ اگر معلوم نہ ہو تو شے مجہول مطلق ہے۔ نام معلوم ہوگا تو شے کو تلاش کرے گا اور اگر نام ہی معلوم نہیں تو کس سے کیا پوچھے گا؟ اور کیا کہہ کر پوچھے گا؟ تو علم کا ابتدائی درجہ ناموں کا معلوم ہونا ہے۔

پھر اس کے بعد دوسرا درجہ ان ناموں کی مسمیات کا ہے کہ وہ کیا کیا چیزیں ہیں جن کے یہ نام ہیں۔ پھر ان افعال کیا ہیں؟

پھر ان کے حقائق کیا ہیں؟ اور ان کے نفوس کے اندر جذبات کیا ہیں؟ یہ چوتھا درجہ ہے علم کے بعد، علم بعد، علم کے بعد علم ___ علم کے درجات نکلتے ہیں مگر ابتدائی درجہ علم کا ناموں کا معلوم کرنا ہے ___ تو م علیہ السلام کو جن پر حکمرانی کروانی تھی اور جن کا نظم بندھوانا تھا ان سب چیزوں کے نام بتلا دیئے۔

ملائکہ سے کہا کہ ان کے نام تو بتلاؤ؟

ملائکہ نہیں بتلا سکے ___ اس لئے کہ جن ملائکہ کو جس نوع پر متعین کیا ہے اس کے ناموں سے تو وہ ت ہیں، دوسرے ناموں سے واقف نہیں ہیں جو ملائکہ بارشیں لانے پر مقرر ہیں۔ وہ بارش کے احوال کو تو نتے ہیں لیکن بقیہ دوسرے احوال کا انہیں پتہ نہیں۔ جو اعمال لکھنے والے ہیں، اعمال کی حد تک علم رکھتے ، لیکن اعمال سے جو خارج چیزیں ہیں، ان کا انہیں پتہ نہیں ہے تو ملائکہ کو ہر نوع کی اتنی ہی چیزیں معلوم ، جن پر انہیں مقرر کیا گیا ہے، ساری دنیا کی ساری چیزوں کے نام انہیں نہیں بتلائے گئے۔ اس لئے کہ ی دنیا سے ملائکہ کا کوئی تعلق نہیں۔

غرض ملائکہ جواب نہیں دے سکے۔

پھر حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا:

يٰاٰدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ

"اے آدم! تم چیزوں کے نام بتلاؤ"۔

حضرت آدم علیہ السلام نے فرفر تقریر شروع کر دی ___ یہ آسمان ہے، یہ زمین ہے، یہ لوٹا ہے اور یہ ٹی ہے اور اس کے یہ آثار اور اس کی یہ خاصیات ہیں، تمام چیزوں کے نام اور آثار گنوانے شروع کئے۔ جو ئکہ کے علم میں نہیں تھے۔

اب ملائکہ خاموش ہوئے ___ اور کہا:

سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَکِيْمُ

بے شک آپ پاک ہیں۔ آپ نے جتنی چیزوں کے نام ہمارے حلقۂ عمل کے بارے میں بتلا دیئے ہیں۔ بس اتنا تو معلوم ہے، سب معلوم نہیں۔ آدم کو تو ساری چیزوں کے نام معلوم ہیں۔ زمین و آسمان کی چیزیں، ین کی پیداوار کی چیزیں اور آسمان کے رہنے والوں کے پتے اور ان کے آثار و خواص، سیارات کا پتہ، چاند رج کا پتہ، پھر ان چاند سورج کے جو آثار ہیں ان کا پتہ، انسانی بدن کے اندر تمام اعضا کا پتہ، معدہ کیا کام کرتا ہے۔ جگر کیا کام کرتا ہے، قلب کا کیا کام ہے، دماغ کا کیا کام ہے۔ ہر ہر چیز آدم علیہ السلام پر روشن کر دی گئی جو ئکہ پر نہیں تھی ___ آخر ہار مانی اور خاموش ہوئے اور کہا کہ سُبْحٰنَکَ آپ پاک ہیں ___ وہ جو ہمارا ان تھا، اس سے آپ بری و بالا ہیں۔ بلاشبہ آپ کا انسان کو نائب بنانا برحق ہے اور آدم ہی اس کا مستحق تھا۔

لیکن ابھی ایک درجہ جواب کا اور باقی ہے ___ وہ یہ کہ ملائکہ نے کہا تھا کہ یہ زمین پر فساد کرے گا اور ن بہائے گا۔ اس کا جواب ابھی تک نہیں ہوا تھا ___ یہ تو ہو گیا کہ آدم سب سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ جو ارے اندر نہیں ___ یہ بھی جواب ہو گیا کہ آدم کے حقائق کو ہم جانتے ہیں تم نہیں ___ لیکن وہ جو کہا تھا ۔ فساد ہو گا خون پھیلے گا وہ چیز ابھی تک باقی تھی؟

حق تعالیٰ نے اس کا جواب حکیمانہ طریق پر یہ دیا کہ جہاں کوئی عمل خیر ہو اور انسان اس کے اندر جمع

ہوں' ملائکہ کو حکم دیتے ہیں کہ اس مجلس کے اندر جاؤ۔ ایک جلسہ ہوا' اس میں بہت سے اللہ والے جمع ہیں اللہ کے ناموں کا ذکر ہو رہا ہے' مسائل کا ذکر ہو رہا ہے۔ تو حدیث میں فرمایا گیا :

ان للّٰہ ملائکۃ سیاحین

اللہ کے ہاں کروڑوں اربوں کی تعداد میں ملائکہ ہیں جن کا کام یہی ہے کہ دنیا میں گھومیں پھریں او دیکھیں کہ انسان کیا کام کر رہا ہے۔ جب دیکھتے ہیں ایک مجلس خیر و برکت کی ہے۔ مسائل کا ذکر ہے' وہ دو پڑتے ہیں اور پچھلوں کو آواز دیتے ہیں :

ھلموا الی مقصدکم

دوڑو' تمہارا مقصد اس مجلس میں پورا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے سے پچھلوں کو بلاتے ہیں یہاں تک کہ اس مجلس اور جلسے میں چہار طرف آسمان تک اربوں کھربوں ملائکہ کا جھٹ لگ جاتا ہے :

غشیتھم الرحمۃ وحفتھم الملائکۃ

ملائکہ اس مجلس کو ڈھانپ لیتے ہیں اور رحمت اس کو گھیر لیتی ہے ___ اب یہ مجلس ختم ہونے کو ختم ہوئی ___ حق تعالیٰ ملائکہ سے ارشاد فرماتے ہیں' جب یہ ملائکہ مجلس میں آتے ہیں اور دیکھتے ہیں جو مجلس میں ہو رہا ہے اب یہ آسمانوں کی طرف چڑھتے ہیں تو ان سے حق تعالیٰ سوال کرتے ہیں اس حال میں اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتے ہیں۔ مگر حکمت کے تحت سوال ہوتا ہے کہ بندوں کو کس حالت میں پایا؟

عرض کرتے ہیں کہ آپ کے ذکر میں مصروف تھے۔

کیا ذکر کرتے تھے؟

آپ کی جنت کے طالب تھے اور جہنم سے ڈرتے تھے۔

فرماتے ہیں کہ جنت کو انہوں نے دیکھا ہے جو طلب کر رہے تھے یا جہنم کو دیکھ لیا ہے جو خوف کھار۔ تھے؟

عرض کرتے ہیں دیکھا تو نہیں آپ کے انبیاء کی زبان سے سنا ہے اور ایماناً مانا ہے کہ جنت بھی حق ہے او دوزخ بھی حق ہے۔

گویا پہلا الزام تو یہ ہوتا ہے کہ تم جنت و دوزخ کو آنکھ سے دیکھ رہے ہو۔ اگر رات دن تسبیح میں مصروف رہو تو تمہارا کیا کمال ہے۔ کمال اس انسان کا ہے کہ دیکھی ایک چیز نہیں اور پھر تسبیح و تہلیل اور ہمارے ذکر میں مصروف ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ

اے ملائکہ! میں تمہیں گواہ کرتا ہوں کہ جتنے اس مجلس میں موجود تھے' جو مانگتے تھے' وہ میں نے دیا ___ یعنی جنت ___ اور جس سے ڈرتے تھے اس سے میں نے انہیں بچالیا ___ یعنی جہنم ___ اور میں نے ان کی مغفرت کر دی۔

تو ملائکہ عرض کرتے ہیں کہ

یا اللہ! بہت سے تو وہ لوگ تھے جو گھروں سے قصد کر کے آئے تھے کہ اس مجلس میں شریک ہوں گے اس جلسے میں بیٹھیں گے۔ مگر بعض تماشہ بین بھی کناروں پر آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کا مقصد نہیں تھا کہ اس جلسے میں آئیں۔ جب قریب سے گزرے تو انہوں نے کہا کہ بھئی! کیا ہو رہا ہے ہم بھی دیکھتے چلیں۔ و کھڑے ہو گئے تو کیا وہ بھی اس مغفرت میں شامل ہیں؟

جواب میں فرماتے ہیں :

هم القوم لایشقٰی جلیسهم

اس جلسے میں بیٹھنے والی ایسی قوم ہے کہ ان کے آس پاس والا بھی محروم نہیں رہ سکتا' وہ بھی مغفرت میں شامل ہے۔

سب کی مغفرت ہو گئی۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک بڑے جلسے کی مغفرت کرنی تھی۔ ہزاروں آدمی اس میں جمع تھے۔ تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ ملائکہ آسمانوں پر چڑھیں اور ان سے سوال کیا جائے کہ بندے کیا کر رہے ہیں' وہ جواب دیں۔ پھر انہیں گواہ بنایا جائے اور مغفرت کی جائے۔

اور پھر ان جلسوں کو دیکھا جائے تو ایک ہی جلسہ تو نہیں۔ ایک ہی وقت میں ہزاروں جلسے ہو رہے ہیں۔ اسی پاکستان میں آج ایک جلسہ یہاں ہے۔ ہر شہر میں معلوم نہیں کتنے جلسے ہو رہے ہوں گے۔

اور ہر جلسے پر یہی کہ ملائکہ آئیں اور پھر چڑھیں اور حق تعالیٰ سوال کریں اور مغفرت کی جائے ___ پھر ایک پاکستان ہی نہیں' ہندوستان کے شہروں میں جلسے ہو رہے ہوں گے ___ ترکی کے لوگ ہیں وہاں بھی جلسے ہوں گے۔ عرب کے لوگ ہیں وہاں بھی ہوں گے ___ دنیا میں سارے جلسے کر لو' تو لاکھوں جلسے ہوں گے۔ تو ہر جلسے پر یہی کہ ملائکہ آئیں۔ پھر وہ اوپر چڑھیں اور ان سے سوال ہو ___ تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بخشنا تھا تو بخش دیتے۔ اس کی کیا ضرورت تھی کہ ملائکہ اس طرح سے آئیں اور ان سے سوال کیا جائے اور انہیں گواہ بنایا جائے کہ تم گواہ رہو کہ ہم نے بخشش کی۔

یہ در حقیقت ان کے خلجان کا جواب ہے کہ تم نے یہ کہا تھا کہ انسان کی تاریخ خون سے بھری ہوئی ہے' یہ انسان ہی تو ہے جو ہر وقت ہمارے ذکر میں مصروف ہے ___ تم نے بھی جا کے فائدہ اٹھایا ___ تو انسانی نوع میں یہ بھی داخل ہے کہ ذکر اللہ میں مصروف' مسائل سننے میں مصروف' کتاب و سنت کے احکام جاننے میں مصروف۔ تو تم نے سارے انسانوں پر کیسے حکم لگا دیا تھا کہ سارے ہی فسادی ہوں گے' سارے ہی مفسد ہوں گے' سارے ہی سفاک ہوں گے۔ ان میں یہ بھی تو ہیں ___ ایک لاکھ فسادی ایک طرف اور ایک صالح ایک طرف۔ اس کی وجہ سے ہزاروں کی نجات ہو سکتی ہے ___ تو انسانوں کے اندر یہ بھی تو ہیں ___ یہ جواب ہے اس کا کہ جو تمہارے دلوں کے اندر خلجان گزرا تھا۔

ملائکہ پر اتمام حجت

حج جب ہوتا ہے' وہی صورت وہاں بھی ہوتی ہے۔ ملائکہ اربوں کھربوں جمع ہیں۔ حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں کہ

> "یہ بندے ننگے سر' ننگے پیر' گرد آلود ریگستان میں پڑے ہوئے ہیں آخر یہ کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ ___ میری ہی محبت تو انہیں کھینچ کر لائی ہے۔ اس محبت کا تقاضا یہ ہے کہ جتنے حج کرنے والے ہیں میں نے ان سب کی مغفرت کی ___ اور آج یہ ویسے ہو گئے جیسے ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوئے ہیں"۔

ملائکہ پر یہ حجت تام کی جاتی ہے کہ یہی وہ انسان ہے جسے تم نے کہا تھا کہ بڑا مفسد ہو گا' بڑا سفاک ہو گا۔ یہ سفاکی کر رہے ہیں؟ یہ مفسدہ پردازی کر رہے ہیں؟ ہمارے ذکر میں مصروف' ہماری اطاعت میں مصروف۔

غرض ایسے تمام مواقع میں ملائکہ کو بھیجا جاتا ہے تاکہ عملی طور پر جواب ہو جائے کہ تم نے جو پوری نوع پر حکم لگایا تھا کہ یہ مفسد نوع ہے' خلافت کے لائق نہیں۔ سارے ایسے نہیں ہیں۔ بے شک زیادہ ایسے ہوں گے جو سفاک ہوں گے مگر ان کے اندر کم و بیش وہ بھی ہوں گے جو اللہ کا نام لینے والے ہوں گے خدا کی یاد کرنے والے ہوں گے اور انہی پر دنیا قائم ہے۔ ایک بھی نہ رہے تو دنیا باقی نہیں رہ سکتی۔

ذکر انسانی پر نظام دنیا قائم ہے

حدیث میں آپؐ نے فرمایا :

لاتقوم الساعۃ حتی یقال فی الارض اللّٰہ اللّٰہ

قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک ایک بھی اللہ اللہ کرنے والا دنیا میں موجود ہے۔ جب ایک بھی نہیں رہے گا جب قیامت قائم ہوگی اور یہ سارا عالم درہم برہم کردیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اللہ کے نام پر قائم ہے۔ جب نام نکل جائے گا۔ دنیا تباہ ہو جائے گی۔ اور ختم ہو جائے گی۔

تو دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ دنیا قائم ہے اللہ کے نام لینے والوں کے اوپر' جب تک اللہ کا نام لینے والے موجود ہیں' دنیا قائم ہے۔ جب وہ مٹ جائیں گے تو دنیا ختم کردی جائے ___ جس ملک کے اندر اللہ کے نام لینے والے باقی نہ رہیں وہ تباہی کی طرف جائے گا اور جس ملک میں سارے ہی اللہ کا نام لیں' وہ بقاء اور ترقی کی طرف جائے گا۔ بہرحال اللہ کے نام میں ترقی ہے۔ تو جہاں کہیں بھی اللہ کے نام لینے والے جمع ہوتے ہیں تو فرشتوں کو بھیج کر انہیں جواب دیا جاتا ہے اور انہی کو گواہ بناتے ہیں کہ تم گواہ رہو میں نے ان کی مغفرت کی۔

انہی میں سے ایک شکل یہ بھی ہے صبح اور عصر کی نماز کے وقت لاکھوں ملائکہ جمع ہوتے ہیں۔ جب یہ دن والے چڑھتے ہیں اور رات والوں کو چارج دے دیتے ہیں۔ حق تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ بندوں کو کس حالت میں چھوڑا؟

عرض کرتے ہیں کہ نماز پڑھ رہے تھے ___ اور یہ کہتے ہیں کہ :

اتیناھم وھم یصلون وترکنا ھم وھم یصلون

جب ہم اعمال نامے لینے کے لئے گئے اور چارج لینے کے لئے گئے جب بھی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور جب صبح کی نماز میں چھوڑ کر آئے' جب بھی یہ نماز ہی پڑھ رہے تھے۔ تو ترک بھی ہم نے انہیں نماز میں ہی کیا اور جب ہم پہنچے جب بھی نماز ہی پڑھ رہے تھے۔

گویا جواب دیا جاتا ہے کہ یہی ہے وہ انسان جس کے بارے میں تم نے خلجان ظاہر کیا تھا کہ بڑا مفسد ہوگا' یہ مفسد کا کام ہے؟ کہ جب تم گئے جب بھی عبادت میں مصروف تھا' جب تم چھوڑ کر آئے جب بھی عبادت میں مصروف تھا۔ یہ ملائکہ پر اس خلجان کی وجہ سے حجت تمام کی جاتی ہے ___ بہرحال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ہر عمل کی ایک خاصیت ہے۔ تو نماز کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے دیدار خداوندی کی استعداد اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تارک نماز کے اندر دیدار خداوندی کی استعداد پیدا نہیں ہوگی۔

جلوۂ خداوندی روح عبادت ہے

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ نماز اکمل ترین عبادت ہے اور عبادت میں لطف جب ہی آتا ہے جب عابد و معبود کا آمنا سامنا ہو۔ اگر معبود بالکل غائب ہو تو نماز کے اندر لطف نہیں آئے گا' نمازی اور عبادت گزار یہ کہے گا کہ ایک خیالی چیز کی عبادت کر رہا ہوں کوئی میرے سامنے تو ہے نہیں ___ یہ خطرہ گزر سکتا تھا ___ تو اصل میں نماز کا مقصد ہی یہ ہے کہ عابد اور معبود کا آمنا سامنا ہو ___ اسی لئے حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا جب حضرت جبریل علیہ السلام نے سوال کیا :

ما الاحسان یا رسول اللہ؟

احسان کیا چیز ہے یا رسول اللہ ___ ؟ ___ فرمایا :

ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم آنکھوں سے حق تعالیٰ شانہ کو دیکھ رہے ہو۔ یعنی یہ تصور اور یہ دھیان باندھو کہ اللہ کے سامنے میں حاضر ہوں اور اگر تمہارے اندر اتنی قوت نہیں ہے تو کم سے کم یہ تصور رکھو کہ اللہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اس کی نگاہوں سے تم اوجھل نہیں ہو۔ غرض دیکھنا اور آمنا سامنا ہونا یہ عبادت کی روح معلوم ہوتی ہے کہ محسن اور احسان والا عبادت میں جب ہی بنے گا جب معبود کا آمنا سامنا ہو۔ تو حق تعالیٰ شانہ کے بارے میں تصور کی آنکھ سے ہم دیکھتے ہیں کہ معبود ہمارا سامنے ہے اور ہم اس کی عبادت کر رہے ہیں۔

دنیا میں تجلیات ربانی کا ظہور

زیادہ عبادت کی' قلب میں روشنی پیدا ہوئی۔ تو تجلیات اور انوار ربانی سامنے آنا شروع ہو جاتے ہیں تو جو آنکھوں سے دیکھتا ہے وہ ذات کو تو نہیں دیکھ سکتا' ذات تو وراء الوریٰ ہے اور نفس ذات تو قیامت کے بعد بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ وہ اتنی لطیف' اتنی چمک اور اتنی نورانیت میں ہے کہ آنکھ کتنی لطیف بن جائے۔ مگر یہ طاقت نہیں رکھتی کہ ذات بابرکات کو دیکھ سکے۔ تجلیات ربانی کو دیکھے گی' **عکوس** کو دیکھے گی۔ یعنی عکس خداوندی مختلف صورتوں میں سامنے آئے گا' اسے دیکھ لے گی' ذات کا دیکھنا وہ کبھی نہیں ہوگا ___ مگر بہرحال تجلیات وانوار سامنے آتے ہیں جو اہل اللہ کے سامنے آنے لگتے ہیں۔

تجلیٔ اخروی

البتہ قیامت کے دن اس تجلی کو دیکھیں گے جو اقرب الی الذات ہے یعنی جو ذات کے بالکل اقرب ہے۔ گویا اس کا دیکھنا ذات کا دیکھ لینا ہے۔ مگر تجلی کو دیکھیں گے۔ اس لئے کہ سب سے بڑا مقام دیدار خداوندی کا جنتیں ہوں گی۔

دربار خداوندی کا انعقاد

حدیث میں فرمایا گیا کہ ہر ہفتہ میں ___ وہاں ہفتے تو نہیں ہوں گے مگر ایک ہفتے کی جتنی مسافت اور مقدار ہوتی ہے ___ اس میں دربار خداوندی ہوگا۔ اوپر نیچے سو جنتیں ہیں اور ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے ان سو کے اوپر پھر کرسی ہے۔ اس کے اوپر سمندر ہے۔ اس کے اوپر پھر عرش خداوندی ہے۔ تو

کرسی گویا جنتوں کی چھت کے اوپر ہے۔ اس میں دربار ہو گا۔

آخرت میں رویت خداوندی کا مقام

وہ دربار کہاں ہو گا؟

تو حدیث میں اس کی شرح یہ فرمائی گئی کہ حضرت جبریل علیہ السلام ایک دفعہ حاضر ہوئے تو ایک آئینہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ آئینے کے بیچ میں ایک نکتہ تھا۔ آپؐ نے فرمایا یہ نکتہ کیسا ہے؟

عرض کیا کہ اس کا نام مزید ہے۔

فرمایا "مزید" کیا چیز ہے؟

عرض کیا یا رسول اللہ! جنت میں ایک میدان ہے جس کا نام مزید ہے اور وہ اتنا بڑا ہے کہ لاکھوں برس سے اس میں گھوم رہا ہوں اور اب تک مجھے اس کے کناروں کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں ہیں ___ اس کی ہر چیز سفید ہے' زمین سفید ہے' کنکریاں سفید ہیں' گھاس بھی سفید۔ غرض ہر چیز سفید ہے۔ تو جب جمعہ کا دن آئے گا اس وقت اس دربار کے لئے تیاری کی جائے گی۔ اس تمام میدان میں بیچوں بیچ تو اللہ تعالیٰ کی کرسی بچھائی جائے گی۔ جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے :

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَؤُدُهٗ حِفْظُهُمَا

آسمانوں اور زمینوں سے کہیں زیادہ کرسی بڑی ہے' لیکن اس میدان میں جب کرسی بچھے گی تو وہ ایسی معلوم ہو گی جیسے ایک بڑے میدان میں ایک چھوٹا سا چھلہ ڈال دیا جائے۔ وہ بیچوں بیچ بچھائی جائے گی ___ اس کے اردگرد انبیاء علیہ السلام کے منبر ہوں گے۔ وہ نور کے منبر ہوں گے۔ ہر منبر کے پیچھے امتیوں کی کرسیاں ہوں گی۔ ہر نبی کی امت اس کے پیچھے ہو گی اور کرسیاں جو ہوں گی وہ علی قدر مراتب ہوں گی۔ جو عمل میں انبیاء سے زیادہ قریب ہیں' ان کی کرسیاں منبر کے قریب اور جو عمل میں بعید تھے کوتاہ عمل تھے ان سے ان کی بعید۔ درجہ بدرجہ۔

دربار خداوندی میں اہل جنت کی شرکت

جب یہ دربار کا دن آئے گا تو تمام اہل جنت دربار کی شرکت کے لئے چلیں گے ___ اب یہ لاکھوں میل کا فاصلہ ہو گا مگر سواریوں پر جائیں گے' تخت ہوا ہوں گے۔ وہاں کوئی مشین نہیں ہے۔ جیٹ طیارے نہیں ہوں گے کہ ان کی مرمت کی ضرورت پیش آئے۔ بلکہ قوت متخیلہ کے تابع ہوں گے۔ تخت پر بیٹھ کر آپ نے ارادہ کیا کہ چلے۔ اب وہ تخت چلنا شروع ہوا اور لاکھوں میل کا فاصلہ وہاں کی سواریاں پل بھر میں طے کریں گی۔ کوئی براق پر سوار ہے' کوئی تخت ہوا پر سوار ہے۔ درجہ بدرجہ مختلف سواریاں ہوں گی۔ اس میدان میں آکر بیٹھیں گے۔ جہاں کرسیاں ہوں گی۔

پھر کرسیوں میں یہ نہیں کہ وہاں نظم کرنے والے کھڑے ہوں کہ بھئی! یہ کرسی تمہاری ہے۔ یہ سیٹ تمہاری ہے۔ وہاں نہ بیٹھ جاناں یہ نہیں ہو گا۔ ہر شخص اپنی قلبی شہادت سے اپنے مقام کو پہچانے گا۔ ٹھیک اسی کرسی پر جاکر بیٹھے گا جو اس کے نام زد ہے۔ یہ نہیں ہو گا کہ دوسری کرسی پر بیٹھ جائے تو تمام لوگ جمع ہو جائیں گے اور میدان بھر جائے گا۔ اس میں جو بالکل عوام ہوں گے' جن میں عملی کوتاہیاں زیادہ تھیں' تو کرسیوں کے پیچھے چبوترے ہوں گے۔ ان پر مشک و عنبر کے غالیچے ہوں گے وہ اس پر بیٹھے ہوئے ہوں گے۔

اب یہ پورا دربار بھر گیا بیچ میں حق تعالیٰ کی کرسی ہے۔ اب کرسی کے اوپر تجلیات ربانی کا ورود شروع ہو گا ___ جیسے احادیث میں فرمایا گیا ہے یہ محسوس ہو گا کہ جب اللہ کی تجلیات اتریں گی تو کرسی اس طرح چرچرائے گی جیسے اب ٹوٹ کے دی' اب ٹوٹ کے دی۔ وہاں بوجھ بدن کا نہیں ہو گا۔ حق تعالیٰ بدن سے پاک ہیں۔ وہ بدن کے خالق بھی ہیں اور روح کے خالق بھی ہیں۔ وہ عظمت کا بوجھ ہو گا۔ ان کے کمالات کا بوجھ ہو گا جس کو ارواح محسوس کریں گی۔ وہ حسی اور جسمانی بوجھ نہیں ہو گا ___ تو کرسی گویا ایسے چرچرائے گی جیسے تحمل کی طاقت نہیں ہے۔

اب گویا تجلیات اتر چکی ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ موجود ہیں اور انبیاء علیہم السلام ارد گرد نورانی منبروں پر ہیں اور ان کے پیچھے امتیں اربوں کھربوں اولین و آخرین جمع ہیں۔

دربار خداوندی میں شراب طہور کا دور

حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ ملائکہ علیہم السلام کو فرمائیں گے کہ وہ جو ہم نے قرآن کریم میں وعدہ کیا تھا

وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا

ایک پاک قسم کا شربت ہم پلائیں گے' وہ ان بندوں کو تقسیم کرو۔ ملائکہ تقسیم شروع کریں گے۔ گویا شاہی دربار کی طرف سے ایک ضیافت ہو گی۔ اس کو پئیں گے ___ اس سے ایسا سرور پیدا ہو گا' اس کو نشہ تو نہیں کہہ سکتے۔ روحانی نشہ ضرور ہو گا ___ یعنی دنیا کی شراب میں تو یہ نشہ ہے کہ عقل جاتی رہتی ہے' آدمی مجنون ہو جاتا ہے' خبطی بن جاتا ہے ___ اس شراب کے پینے سے عقل میں اور تیزی پیدا ہو گی اور معارف الٰہیہ اور علوم ربانیہ اور زیادہ کھلنے شروع ہو جائیں گے۔ انوار و برکات بڑھ جائیں گے ___ تو یہ شراب طہور تقسیم ہو گی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی تلاوت مناجات

اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام جن کو آواز کا معجزہ دیا گیا تھا اتنی پاکیزہ' پاک اور خوشنما آواز تھی کہ جب وہ حمد و ثنا کی مناجاتیں پڑھتے تھے تو چرند و پرند سب ان کے ارد گرد جمع ہو کر سر دھنتے تھے اور مست ہو جاتے تھے ___ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ

اے داؤد! ان اہل دربار کو وہ مناجاتیں سناؤ جو تم دنیا میں پڑھتے تھے اور اسی اعجازی آواز سے سناؤ۔

داؤد علیہ السلام حمد و ثنا کی وہ مناجاتیں پڑھنا شروع کریں گے۔ تو آواز تو معجزہ تھی ہی ___ اور وہاں میدان میں۔ سارے اللہ والے جمع ہیں سارے انبیاء علیہ السلام جمع ہیں' اربوں کھربوں ملائکہ جمع اور خود حق تعالیٰ شانہ موجود ___ تو اس کی تاثیر کی کیا انتہا ہو گی ___ جب وہ مناجاتیں پڑھی جائیں گی تو عجیب قسم کے اس کے آثار نمایاں ہوں گے' سب بندے اس کے اندر محو ہو جائیں گے۔

جمال خداوندی کے دیدار کا سوال

اس کے بعد حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ :

سلونی ما شئتم

بندے عرض کریں گے کون سی نعمت ہے جو آپ نے ہمیں عطاء نہیں کر دی۔ جنت ساری نعمتوں کا موعد ہے۔ وہاں نقص کا نشان نہیں۔ ہر چیز میں کمال ہی کمال ہے۔ جب آپ نے ہمیں سب کچھ دے دیا تو جب ہم کیا مانگیں ___؟ ہمارے تو خیال سے بھی زیادہ بلند چیزیں ہمیں مل چکی ہیں۔ اب کیا مانگیں ہمارا تو تخیل بھی نہیں جا سکتا۔

ارشاد ہوگا ___ نہیں، مانگو!

جب کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا تو سب مل کر علماء کی طرف رجوع کریں گے کہ تم فتویٰ دو اور مشورہ دو کیا چیز مانگیں ___ ہمیں تو سب کچھ مل چکا ہے۔

تو میں عرض کیا کرتا ہوں کہ لوگ دنیا میں علماء سے کنارہ کشی چاہتے ہیں کہ چھوڑ دیں، یہ وہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ وہاں بھی فتوے کی ضرورت پڑے گی۔ وہاں بھی علماء کی حاجت پڑے گی ___ علم خداوندی کے بغیر نہ دنیا میں کام چل سکتا ہے نہ آخرت میں کام چل سکتا ہے۔

علماء فتویٰ دیں گے کہ ایک چیز نہیں ملی، وہ مانگو۔ بے شک ساری نعمتیں مل گئیں۔ مگر ایک چیز ابھی تک نہیں ملی اور وہ یہ کہ جمال خداوندی کا دیدار ابھی تک نہیں ہوا۔ وہ طلب کرو۔ اس وقت بندے عرض کریں گے کہ :

"اے اللہ! اپنا جمال مبارک دکھلا دیجئے۔ آپ نے سب نعمتیں دے دیں۔ مگر یہ نعمت ابھی تک باقی ہے"۔

یہ درخواست منظور ہو جائے گی۔

نعمت مزید

اور حق تعالیٰ فرمائیں گے :

ان کما انتم

ہر چیز اپنی اپنی جگہ ٹھہری رہے ___ اگر یہ نہ فرماویں تو :

لاحرق سبحات وجهه ماانتهى بصره

اس کے چہرے کی پاکیزگیاں ہر چیز کو جلا کر خاک کر دیں ___ خود فرما دیں گے کہ ہر چیز تھمی رہے۔ اس کے بعد حجابات اٹھنے شروع ہو جائیں گے ___ اور سب حجابات اٹھ کر ایک حجاب کبریائی کا باقی رہ جائے گا۔

اس وقت بندوں کی یہ کیفیت ہوگی کہ ایک تو شراب طہور ___ روحانی نشہ چڑھا تھا۔ داؤد علیہ السلام کے مضمونوں سے معرفت کا نشہ بڑھا۔ حق تعالیٰ کا جمال دیکھ کر اتنے محو ہوں گے کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں رہے گی ___ اور یہ سمجھیں گے کہ کوئی نعمت ہی ہمیں اب تک جنت میں نہیں ملی تھی۔ آج ہمیں یہ نعمت ملی ہے۔ اس نعمت کا نام شریعت کی اصطلاح میں "مزید" ہے ___ تو جبریل علیہ السلام نے کہا کہ یہ وہ میدان مزید ہے۔ اس میں وہ نعمت ملے گی جو سب کے اوپر مزید ہے۔ جس کو قرآن کریم میں فرمایا گیا :

ولدينا مزيد

ہم ضابطے کا اجر تو سب کو دیں گے۔ اور کچھ مزید بھی ہے، جو ہم بعد میں عطاء کریں گے ___ وہ مزید نعمت ہوگی۔

یوم المزید اور اس کے آداب

اسی لئے شریعت کی اصطلاح میں جمعہ کا نام "یوم المزید" ہے تو دنیا میں اس میدان مزید کی نقل جمعہ کا د
رکھی گئی ہے۔

جمعہ کا دن گویا دربار خداوندی کا دن ہے ___ امام اور خطیب نائب خداوندی ہو کر بیٹھتا ہے۔
اسی واسطے فرمایا گیا ہے کہ کوشش کرو کہ امام کے قریب بیٹھو۔ جو جمعہ کے اندر امام کے قریب بیٹھنے ک
عادت ڈالے گا۔ اسے وہاں بھی اللہ کے قریب اور انبیاء علیہم السلام کے قریب جگہ ملے گی اور جو یہاں سس
کرے گا، پیچھے رہے گا۔ وہاں بھی پیچھے رہ جائے گا۔
اسی واسطے فرمایا گیا :

اذا خرج الامام فلا صلوٰۃ ولا کلام

جب خطبہ پڑھنے کے لئے خطیب نکل آئے نہ سلام وکلام کرنے کی اجازت ہے نہ نماز پڑھنے کی اجازت
ہے نہ تلاوت کرنے کی اجازت ہے ___ اس وقت سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ آدمی خطیب کو دیکھے
___ اگر سامنے نہ ہو تو کم سے کم اس کی آواز سے کان لگائے۔ آواز سنائی نہ دے تو استماع کرے، کان لگائے
یعنی خطیب ہی کی طرف متوجہ رہے۔ اس وقت یہی سب سے بڑا کام ہے۔ یہ خطبہ عام وعظوں کی طرح نہیں
ہے۔ اس میں تو بات بھی کر سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی سکتے ہیں ___ لیکن خطبہ کے آداب یہ
ہیں نہ کنکر سے نہ تنکوں سے کھیلو نہ نماز پڑھو نہ ذکر کرو۔ بس امام کو دیکھو۔ اس وقت تمہاری سب سے بڑی یہی
عبادت ہے۔
چنانچہ فرمایا گیا :

من مس الحصا فقد لغا

جس نے کنکری چھوئی اس نے لغو حرکت کی۔ جس نے چٹائی کا کوئی تنکا چھوا اس نے لغو حرکت کی ___
اس کا کام یہ نہیں تھا، اس کا کام یہ تھا کہ امام کو دیکھے۔ سامنے نہ ہو تو کم سے کم یہ ہے کہ ادھر آنکھ لگائے۔
آواز نہ آئے تو ادھر کان لگائے۔ غرض ہمہ تن امام کی طرف متوجہ رہے ___ جو جتنا یہاں اس توجہ کی مشق
کرے گا۔ وہی میدان مزید میں اللہ کی طرف متوجہ ہو گا۔ جو جتنا یہاں قریب ہو گا وہاں قریب ہو گا۔ جو جتنا
زیادہ جمعہ میں متوجہ ہو گا، وہاں متوجہ ہو گا تو جمعہ درحقیقت اس دربار خداوندی کی ایک نقل ہے جو دنیا میں
ہمیں دی گئی ہے۔ اس کا نام میدان مزید تھا اور دن کا نام بھی مزید، وہی نام جمعہ کے دن کا ہے۔ اسے یوم المزید
کہا گیا ہے کیونکہ اجر و ثواب کے اندر زیارت پیدا کرتا ہے۔

تو حدیث مجھے اس پر یاد آگئی تھی کہ عبادت میں اصل تو یہ ہے کہ معبود سامنے ہو، اسے دیکھ کر عبادت
کرے ___ لیکن دنیا میں یہ چیز ناممکن ہے بلکہ ذات کا دیکھنا آخرت میں بھی ناممکن ہے۔ تجلیات ہی کو دیکھے
گا، عکس ہی کو دیکھے گا، روپوں کو دیکھے گا۔ ذات نگاہ کے احاطے میں نہیں آسکتی۔

لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ

"ذات کے اوپر آپ کی نگاہ غالب نہیں آسکتی نہ فتح پاسکتی ہے"۔

رؤیت باری کے بارے میں معتزلہ کا مسلک

اسی واسطے مسلمانوں میں ایک معتزلہ کا فرقہ ہے' اس نے دیدار خداوندی کا انکار کردیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دیدار وغیرہ کچھ نہیں ہوگا۔ یہ ناممکن اور محال ہے اور اس کو عقلاً محال کہتا ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا۔

مسلک اہل حق

لیکن انبیاء علیہم السلام اور اہل حق کا مسلک یہ ہے کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ کا دیدار ہوگا ___ قرآن کریم میں فرمایا گیا:

وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ○ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ

بہت سے تر و تازہ چہرے ہوں گے جو پروردگار کو دیکھ رہے ہوں گے اور کفار کو دھمکی دی گئی ہے کہ:

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ

کفار کو دھمکی دی گئی ہے کہ قیامت کے دن تمہارے اور اللہ کے درمیان حجابات آجائیں گے تم اللہ کو نہیں دیکھ سکو گے ___ نہ دیکھنے کی دھمکی دینا جبھی ممکن ہے جب دیکھنا ممکن ہو ___ بہرحال قرآن کریم اور تمام آسمانی کتابوں کا مسلک اور تمام انبیاء علیہم السلام کا مسلک یہی ہے کہ آخرت میں دیدار خداوندی ہوگا ___ مگر معتزلہ ایک فرقہ ہے جو اسے نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے کہ عقلاً محال ہے۔

مناظرے میں معتزلہ کی شکست

چنانچہ مامون کے زمانے میں یہ بڑا فتنہ پھیلا۔ معتزلہ غلبہ پاگئے اور انہوں نے کہنا شروع کردیا کہ دیدار خداوندی محال ہے۔ عقلاً ممکن نہیں ہے' واقعتاً تو ہوگا ہی نہیں۔ عقل بھی قبول نہیں کر سکتی۔ اس کے انہوں نے دلائل بیان کئے۔ مسلمان فتنے میں گرفتار ہونا شروع ہوئے۔ علماء نے جوابات دینا شروع کئے مگر مشکل مسئلے کا اعتراض جلد سمجھ میں آجاتا ہے اور جواب دیر سے سمجھ میں آتا ہے۔ دقیقی مسئلہ تھا تو اعتراض تو سب کی سمجھ میں آگیا۔ جواب سمجھ میں نہ آئے۔ فتنہ بڑھتا رہا۔ علماء عاجز آگئے۔

آخر اس زمانے کے شیخ ہیں۔ حضرت شیخ شبلیؒ ___ ان کی خدمت میں علماء کا ایک وفد حاضر ہوا کہ حضرت! جتنا ہمارے امکان میں تھا ہم جوابات دے چکے۔ مگر وہ جوابات علمی ہیں اور عوام علم کی باتیں سمجھتے نہیں۔ اس واسطے شبہات تو ان کے دلوں میں بیٹھ گئے۔ جوابات نہیں بیٹھتے ___ مگر اب ہم کیا کریں۔ اب تو اہل اللہ کچھ قلبی تصرف و توجہ سے کام کریں تو یہ فتنہ رفع ہو۔ محض علم سے رفع نہیں ہوگا۔

حضرت شیخ شبلیؒ نے فرمایا کہ اچھا!

اعلان کردو کہ ہم معتزلہ سے مناظرہ کریں گے۔

اعلان ہو گیا۔

اور جامعہ بغداد میں لاکھوں آدمی جمع ہوئے ___ اول تو اس لئے کہ شیخ شبلی اور وعظ کہیں۔ کبھی نہیں فرماتے تھے۔ ایک نئی چیز معلوم ہوئی کہ شیخ کبھی مجمع میں وعظ کہنے کے لئے نہیں آتے تھے۔ آج وعظ فرمائیں گے تو لاکھوں لوگ جمع ہوئے۔

دوسرے یہ کہ نام مناظرہ کا تھا اور مناظرہ درحقیقت جھگڑا ہے۔ چاہے وہ علمی ہی سہی۔ عوام کو جھگڑوں سے زیادہ دلچسپی ہے۔ کوئی سکون کی بات ہو کوئی نہیں جائے گا اور جھگڑا ہو تو ہزاروں وہاں پہنچ جائیں گے۔ تو

لوگوں نے کہا آج مناظرہ اور بحث ہوگی۔ بڑا تماشہ ہوگا ___ غرض لاکھوں آدمی جمع ہو گئے۔
منبر بچھایا گیا ___ حضرت شبلیؒ بیٹھ گئے۔
معتزلہ کے جتنے علماء تھے وہ قطار باندھ کر سامنے بیٹھے گئے۔
تو شیخؒ نے فرمایا تمہارا دعویٰ کیا ہے؟
معتزلہ نے کہا کہ :

"دعویٰ ہمارا یہ ہے کہ اللہ کا دیکھنا ناممکن و محال ہے۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔ عقل گوارا نہیں کرتی، عقلاً محال ہے"۔

تو اہل اللہ پر حقائق روشن ہوتی ہیں۔ وہ لفظوں کی گرفت سے تھوڑا ہی گرفت کرتے ہیں۔ وہ لمبی تقریریں تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ وہ چٹکی میں ضمیر کو تھام لیتے ہیں۔ شیخؒ نے دو منٹ میں فیصلہ کر دیا۔ سارے مناظرے ختم ہو گئے۔

"معتزلہ سے پوچھا کہ تمہارے دلائل اپنی جگہ ہیں۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ ہم تمہارے دل سے بات پوچھنا چاہتے ہیں کہ تمہارا دل بھی چاہتا ہے اللہ کو دیکھنے کو؟"

سب نے کہا دل تو چاہتا ہے۔
فرمایا۔ یہ دلیل ہے کہ دیکھا جانا ممکن ہے ___ اس لئے کہ محال کو دیکھنے کی تمنا کبھی قلب کے اندر نہیں آسکتی۔ اسی چیز کو دیکھنے کی تمنا آئے گی جس کا دیکھا جانا ممکن ہو۔ کبھی آدمی تمنا نہیں کرے گا کہ میں کان سے دیکھ لوں۔ اس لئے کہ کان کے اندر دیکھنے کی قدرت ہی نہیں، آنکھ سے ہی دیکھنے کی تمنا کرے گا ___ کبھی یہ تمنا نہیں کرے گا کہ میں زبان سے آواز سن لوں زبان چکھنے کے لئے ہے۔ آواز سننے کے لئے نہیں۔ اس کے لئے کان ہیں۔ تو کان سے سننے کی اور آنکھ سے دیکھنے اور زبان سے چکھنے کی تمنا کرے گا۔ یہ نہیں کر سکتا کہ آنکھ کا کام زبان سے لینے لگے اور زبان کا کام آنکھ سے لینے لگے۔ یہ دل میں آتا ہی نہیں۔
تو شیخؒ نے فرمایا کہ جب تمہارے دل میں تمنا ہے کہ ہم اللہ کو دیکھیں تو تمنا اور دل کے اندر ہونا اس کی دلیل ہے کہ دیکھا جانا ممکن ہے۔ جس کا دیکھا جانا محال ہو کبھی اس کے دیکھنے کی تمنا دل میں نہیں آسکتی۔ تو امکان تمہارے ضمیر سے ثابت ہو گیا اور وقوع پیغمبر کی خبر سے ثابت ہے۔ اب بتلاؤ تمہارا اعتراض ہے؟
اب وہ چپ چاپ بیٹھے۔ وہ تو ان کا دل پکڑا گیا ___ سارا قصہ ختم ہو گیا۔ ساری بحث ختم ہوئی اور فتنہ ایک منٹ میں ختم ہو گیا ___ بہرحال مقصد یہ تھا کہ دیدار خداوندی کی تمنا ہر انسان کے دل میں ہے کہ میں اپنے معبود کو دیکھوں۔ اسی تمنا میں وہ نمازیں پڑھتا ہے۔ اسی تمنا میں وہ عبادتیں کر رہا ہے۔

دیدار خداوندی میں درجہ بدرجہ ترقی

یہاں عقیدے کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور آگے بڑھا تو خواب کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور آگے بڑھا تو کشف کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ موت کے بعد جب آگے بڑھے گا تو پھر اس آنکھ سے دیکھنا شروع کر دے گا، تو درجہ بدرجہ اس کا ابھی سے دیدار شروع ہو گیا ہے۔ نماز کے اندر تصور اور عقیدے سے دیکھنا یہ دیکھنے کی ابتداء ہے۔ ترقی کرتے کرتے بالآخر وہ چیز آنکھ کے سامنے آجائے گی۔ جو دل میں جم جاتی ہے۔
یہ ایک فطری اصول ہے کہ اگر آپ تصور سے کوئی چیز دل میں جمالیں تو چند دن کے بعد وہ آنکھوں کے

سامنے کھڑی نظر آئے گی۔

ایک بزرگ سے کوئی صاحب بیعت ہوئے۔ شیخ نے انہیں بیعت کرلیا اور ذکر شغل بتلادیا۔ محنت بھی کی' مجاہدے بھی کئے۔ مگر یکسوئی نصیب نہیں ہوتی تھی کہ ہر چیز سے کٹ کے توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے۔ بہت علاج کئے مگر یہ نہیں ہوتی تھی۔

تو شیخ نے کہا تمہیں کسی چیز سے محبت بھی ہے؟

اس نے کہا جی! مجھے بھینس سے محبت ہے۔

___ جیسی روح ویسے فرشتے ___

فرمایا اچھا۔ بیٹھ کر چلہ کرو۔ چالیس دن بھینس کا تصور کرو۔

چلہ کرایا۔ وہ حجرے میں بیٹھ گئے۔ طبیعت کا میلان تو بھینس کی طرف تھا ہی ___ تصور کیا تو وہ دل میں جمنے لگی ___ چالیس دن کے بعد شیخ نے فرمایا' باہر آؤ ___ دروازہ کھولا۔

اس نے کہا باہر کیسے آؤں۔ بھینس کھڑی ہوئی ہے۔ راستہ رکا ہوا ہے۔ حالانکہ نہ بھینس تھی نہ کچھ تھا مگر دل میں بھینس اتنی جم گئی تھی کہ آنکھوں سے وہی نظر آنے لگی۔ معلوم ہوا کہ بھینس دروازہ روکے کھڑی ہے ___ تو یہ ایک فطری چیز ہے کہ جو چیز آدمی کے دل میں جم جاتی ہے وہ مصور ہو کر آنکھ کے سامنے آنے لگتی ہے۔

تو جب دل میں جمائیں گے کہ میں اپنے پروردگار کو دیکھ رہا ہوں اور عقیدے کی آنکھ سے دیکھیں گے اور پھر ترقی کر کے خواب میں دیکھنے لگیں گے۔ تو ایک وقت آئے گا کہ اس آنکھ سے بھی اللہ کا دیدار ہو جائے گا۔ جس جس درجہ میں بھی ہو۔ بہرحال دیدار ہو گا۔ تو اصل نماز تو وہاں ہوگی۔

روح کا عروج اور عرش کے سامنے سجدہ

جیسے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب آدمی انتقال کرتا ہے تو اس کی روح کو آسمانوں کی طرف چڑھادیا جاتا ہے۔ صالح آدمی ہے تو لاکھوں ملائکہ اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ تو اس کی روح کو عروج نصیب ہوتا ہے۔ آسمان اول کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ وہاں کے ملائکہ اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اگلا آسمان آیا تو اس کے دروازے کھلتے ہیں تو وہاں کے ملائکہ اس کا استقبال کرتے ہیں۔ اس جلوس کے ساتھ' وہ عرش کے نیچے پہنچتی ہے اور وہاں جاکر سجدہ کرتی ہے۔ تو وہ سجدہ جو عین عرش کے سامنے ہے مرنے کے بعد نصیب ہو گا مرنے سے پہلے مشکل ہے۔

دنیوی جذبات کا برزخ میں ظہور

جس کے دل میں نماز کی لو لگی ہوئی ہے وہ برزخ میں بھی نماز کی لو لے کر جائے گا' حشر میں بھی نماز کا جذبہ لے کر جائے گا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب میت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو دو ملائکہ آکر اس سے سوال کرتے ہیں' وہ پوری زندگی کا جائزہ لیتے ہیں اور تین سوال ہوتے ہیں۔

من ربک؟ ——— تیرا رب کون تھا؟

وما دینک؟ ——— تیرا دین کیا تھا؟

ومن هذا الرجل؟ ـــــ اور یہ کون ہے؟

یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہوتا ہے ـــ یہ سوال کرتے ہیں ـــ تو حدیث میں فرمایا گیا کہ میت کو ایسا متمثل ہوتا ہے کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہے۔ دھوپ پر زردی چھا چکی ہے۔ مغرب کا وقت قریب ہے' حالانکہ سورج وہاں نہیں ہوتا۔ مگر وقت کی صورت مثالی نمایاں ہوتی ہے ـــ تو ملائکہ یہ پوچھتے ہیں کہ **من ربک** ؟ وہ کہتا ہے کہ **دعونی اصلی**

میاں پرے کو ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے دو۔ وقت تنگ ہو رہا ہے۔ غروب ہو جائے گا تو میری عصر کی نماز قضا ہو جائے گی ـــ تو ایک فرشتہ دوسرے سے کہتا ہے کہ اس سے کیا رب کا سوال کرتے ہو۔ یہ تو رب پر اتنا مٹا ہوا ہے کہ یہاں بھی نماز پڑھنے کو تیار ہے ـــ دوسرا فرشتہ کہتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ جواب سچا دے گا مگر ہماری تو ڈیوٹی ہے ہمیں تو ادا کرنی ہے۔ سوال کرنا ہی ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ جواب حق دے گا۔

مگر **دعونی اصلی** پرے کو ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنی ہے۔ یہ کون کہے گا؟ جسے دنیا میں نماز کی عادت ہو گی ـــ اور جو دنیا میں ٹلاتا رہتا ہے اسے **دعونی اصلی** کہنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اس کے لئے تو دنیا میں روز وقت تنگ ہوتا تھا وہ تو نہ نماز کا تھا نہ روزہ کا ـــ تو دنیا میں جس چیز کی مشق کر لیں گے وہی سامنے آئے گی۔ جس چیز کی عادت ڈال لیں گے' آخرت میں وہی متمثل بنے گی۔

دنیوی جذبات کا آخرت میں ظہور

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

تحشرون کما تموتون وتموتون کما تحیون

تمہارا حشر اس حالت پر ہو گا۔ جس حالت پر موت آئے گی اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزاری ہے ـــ اگر لہو ولعب' کھیل کود اور مختلف عیش و آرام کی حالتوں میں زندگی گزاری ہے' موت کے وقت بھی انہی چیزوں کا دھیان رہے گا اور قبر سے اٹھے گا تب بھی انہی چیزوں کا دھیان رہے گا۔

اور اگر اللہ کے ذکر اور اس کے نام لینے میں اور اس کے فرائض کے ادا کرنے میں زندگی گزاری ہے۔ وہی جذبہ موت کے وقت رہے گا کہ کسی طرح میری نماز قضا نہ ہو۔ کسی طرح میرا ورد اور وظیفہ قضا نہ ہو اور جب قبر سے اٹھے گا وہی جذبہ ہو گا کہ کہیں میرا ورد قضا نہ ہو جائے۔ بعد میں پتہ چلے گا کہ یہ میدان محشر ہے۔ مگر وہ یہی سمجھے گا کہ یہ دنیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ اگر کوئی حاجی لبیک لبیک کہہ رہا تھا اور اتفاق سے اونٹ سے گر پڑا اور موت واقع ہوئی تو قیامت کے دن جب اٹھے گا تو لبیک لبیک اس کی زبان پر جاری ہو گا اور وہ سمجھے گا کہ میں میدان عرفات میں ہوں ـــ بعد میں اس پر کھلے گا کہ یہ میدان محشر ہے۔ میدان عرفات نہیں ہے۔ مگر جذبہ وہی رہے گا جو دنیا میں پیدا کیا تھا۔

تو موت حقیقت میں قاطع نہیں ہوتی کہ کسی چیز کو قطع کر دے۔ متمم اور مکمل ہوتی ہے جو دنیا کی زندگی کے جذبات ہیں۔ ان کو حد کمال تک پہنچا کر نفس کا جوہر بنا دیتی ہے۔ تو جس حالت پر زندگی گزرے گی اسی حالت پر موت آئے گی اور جس حالت پر موت آئے گی اسی حالت پر حشر ہو گا۔

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ دنیا میں جب نماز کی عادت تھی اور وقت ٹلا کر پڑھنے کی نہیں تھی' بروقت پڑھنے کی تھی۔ وقت ٹلنے لگا اور تنگ ہونے لگا تو پریشانی اور اضطراب ہوتا تھا کہ کہیں میری نماز

قضاء نہ ہو جائے۔ وہی قبر میں کہے گا دعوئی اصلی پرے کو ہٹو' وقت تنگ ہو رہا ہے۔ مجھے نماز پڑھنے دو۔ جسے دنیا میں عادت نہیں تھی' وہ وہاں بھی نہیں کہے گا اور آخرت میں بھی یوں ہی جذبہ رہے گا۔

سایۂ عرش میں اشتیاق نماز

ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ جو پوری جماعت دیو بند کے شیخ طریقت ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ

اگر حق تعالیٰ نے مجھ سے قیامت کے دن پوچھا کہ اے امداد اللہ! مانگ کیا مانگتا ہے۔
تو میں عرض کروں گا کہ

"یا اللہ! نہ مجھے جنت کی ضرورت ہے نہ حوریں مطلوب ہیں نہ محلات مطلوب ہیں نہ باغات مطلوب ہیں۔ مجھے تو اپنے عرش کے نیچے ڈیڑھ گز کی جگہ دے دیجئے کہ کھڑا ہو کر نماز پڑھتا رہوں"۔

اللہ سے میں یہ مانگوں گا۔
تو اہل اللہ کو نماز میں وہ لطف میسر ہوتا ہے کہ سلطنتیں بھی چھوڑنے کے لئے تیار ہیں مگر نماز چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

لطف نماز

حدیث میں آپ ؐ نے فرمایا کہ :

جعلت قرة عینی فی الصلوٰة
"نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی گئی ہے"۔

نماز پڑھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ دل میں سرور اور فرحت پیدا ہوتی ہے ___ بہر حال نماز ایک ایسی چیز ہے کہ اس سے دل میں سرور اور فرحت اور دیدار خداوندی کی صلاحیت اور دیدار کی تڑپ کہ کسی طرح میں اپنے معبود کو دیکھ لوں' پیدا ہوتی ہے ___ یہ نماز کی خاصیت ہے۔
تو ایک زکوٰۃ کی خاصیت تھی کہ حسن معاشرت پیدا ہو' ایک روزے کی خاصیت تھی کہ نفس کے اندر سے شہوانی جذبات گھٹ جائیں۔ ایک زکوٰۃ کی خاصیت یہ تھی کہ نفس کے اندر سے بخل کا رذیلہ مٹ جائے۔ اسی طرح ایک نماز کی خاصیت ہے کہ اس سے دیدار خداوندی کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے اور تڑپ بھی پیدا ہو جائے تو عبادات میں اللہ تعالیٰ کو خاص تعلق نماز ہی سے ہے۔

حقیقی عبادت

حقیقت میں اگر حقیقی عبادت ہے تو وہ نماز ہے۔ دوسری عبادتیں دوسری وجوہ سے عبادت بن گئی ہیں۔ اپنی ذات سے عبادت نہیں ہیں۔ نماز اپنی ذات سے عبادت ہے۔
اس لئے کہ عبادت کے معنی غایت تذلل کے ہیں۔ یعنی اللہ کے آگے انتہائی ذلت اختیار کرنا ___ کیونکہ اللہ کی ذات وہ ہے کہ انتہائی عزت میں ہے کہ عزت کا کوئی مقام نہیں ہے کہ اس کے پاس نہ ہو۔ اس

لئے اس کے سامنے اتنی ذلت پیش کرنی چاہئے کہ ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ جو بندہ اپنے پروردگار کے سامنے پیش نہ کردے۔

اب ظاہر بات ہے کہ زکوۃ ہے اس میں غایت تذلل کہاں ہے؟

زکوۃ میں تو آپ غریب کو عطاء کرتے ہیں۔ تو عطاء کرنا تو اللہ کی شان ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مشابہت پیدا کررہے ہیں۔ وہ بھی معطی ہے۔ آپ بھی عطا کررہے ہیں تو اس میں ذلت کیا ہوئی؟ یہ تو عین عزت کی چیز ہوئی۔ جب اس میں ذلت کا نشان نہیں تو عبادت کیسے بنی؟

آپ روزہ رکھتے ہیں' کھانا چھوڑ دیا' پینا چھوڑ دیا' بیوی چھوڑ دی۔ یہ تو حق تعالیٰ کی شان ہے کہ کھانے سے بھی بری' پینے سے بھی بری' بیوی سے بھی بری۔ یہ تو اللہ کے ساتھ مشابہت ہوئی۔ اس میں ذلت کہاں ہے۔ یہ تو عین عزت کا مقام ہے ــــــ غرض روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں' اس میں غایت تذلل ہی نہیں ــــــ لیکن نماز وہ ہے کہ اول سے لے کر اخیر تک سوائے اظہار ذلت کے اور کوئی چیز نہیں۔

ابتداءً آپ نوکر چاکروں کی طرح سے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور غلاموں کی طرح گردن جھکادیتے ہیں۔ یہ ذلت کا ابتدائی درجہ ہے جو آپ اپنے رب کے سامنے پیش کررہے ہیں۔ اس کے بعد آگے بڑھے۔ سر جھکایا' رکوع کیا۔ اس میں پہلے سے بھی ذلت کا بڑا درجہ ہے۔ اس کے بعد تیسرا درجہ ہے کہ ناک اور پیشانی زمین پر رگڑتے ہیں جو انتہائی ذلت کا مقام ہے۔ اس کے بعد پھر اور ہے کہ آپ تشہد میں بیٹھ کر بھیک مانگتے ہیں کہ یا اللہ مجھے یہ دے۔ بھیک مانگنا سب سے زیادہ ذلت کی چیز ہے ــــــ تو نماز میں جتنے افعال ہیں' قیام ہو' رکوع ہو' سجدہ ہو' تشہد ہو سب میں اپنی نیاز مندی اور ذلت کا اظہار ہے ــــــ اس لئے حقیقی معنی میں اگر عبادت ہے تو صرف نماز ہے ــــــ دوسری چیزیں دوسری وجوہ سے عبادت بنی ہیں۔ زکوۃ اپنی ذات سے عبادت نہیں ہے ــــــ پھر کیوں عبادت بنی؟ تعمیل حکم کی وجہ سے۔ حکم خداوندی ہے کہ زکوۃ دو۔ تعمیل کی۔ تو تعمیل ارشاد کی وجہ سے یہ عبادت بن گئی۔

روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں ہے تعمیل حکم کی وجہ سے عبادت بن گیا ہے۔ حکم ہے کہ روزہ رکھو۔ تعمیل کی وجہ سے عبادت بن گیا۔ لیکن نماز اپنی ذات سے عبادت ہے۔ اس لئے کہ جتنی ہیئتیں ہیں سب اظہار ذلت کی ہیں۔

پھر نماز کے اندر جو بھی آپ پڑھیں گے تسبیح و تہلیل میں یا تو اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اظہار ہے یا اپنی فدویت کا اظہار ــــــ یا اللہ کی عظمت کا اظہار کریں گے کہ **الحمد للہ رب العلمین** ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں' وہ رحمن ہے' رحیم ہے' یوم الدین کا مالک ہے یا اپنی فدویت کا اظہار ہے کہ **اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ** ہم آپ ہی کی عبادت کریں گے اور ہم تو آپ ہی سے مانگتے ہیں۔ غرض یا تو اللہ کی عظمت کا اظہار یا اپنی ذلت کا اظہار ــــــ اس کے سوا نماز میں اذکار ہوں یا اعمال ہوں۔ سب کی یہی حیثیت ہے ــــــ تو حقیقی معنیٰ میں اگر عبادت ہے تو وہ نماز ہے۔ دوسری عبادتیں دوسری وجوہ سے عبادتیں بنی ہیں۔ یہ اپنی ذات سے عبادت ہے ــــــ تو ظاہر بات ہے کہ عبادت کرنے والے عابد کا جذبہ ہوگا کہ معبود میرے سامنے ہو تاکہ میں دیکھوں میں جس کی عبادت کررہا ہوں ــــــ تو یہ جذبہ لے کر کھڑا ہوا ہے۔

جذبۂ عبادت کی تسکین

اللہ نے اس جذبے کی تسکین کا سامان کردیا کہ دنیا گندی جگہ ہے۔ دیدار خداوندی یہاں نہیں ہوسکتا۔ تو

عقیدے کی آنکھ سے اللہ کو دیکھو‘ دل میں یقین کے ساتھ تصور باندھو کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں ___ اس کے بعد ہم مزید روشنی دیں گے کہ تمہارے اوپر کچھ انکشاف ہوگا‘ انوار ربانی کچھ نظر پڑنے لگیں گے۔ اس کے بعد میں اور انکشاف ہوگا۔ آنکھوں سے بھی تجلیات ایسے دنیا میں نظر آسکتی ہیں۔ اس کے بعد مزید انکشاف ہوگا۔ مگر وہ موت کے بعد قیامت کے دن ہوگا کہ ذات کے ہم پلہ تجلی سامنے آئے گی اور بندے آنکھوں سے اپنے پروردگار کو دیکھیں گے۔ تو نماز کی ایک خاصیت ہے تو بات اس پر چلی تھی کہ دواؤں کی الگ الگ خاصیتیں ہیں۔ اسی طرح سے عبادات کی بھی الگ الگ خاصیتیں ہیں۔

مجموعۂ شریعت پر عمل کی تاثیر

اور جیسے دواؤں میں ایک مقدار ہے جو فن دان طبیب مقرر کرتا ہے کہ یہ دوا تین ہی ماشے ہوگی اور یہ ایک تولہ ہوگی ___ ایسے ہی **تسبیحات** کے عدد بھی شارع علیہ السلام نے متعین کئے ہیں کہ رکوع میں **سبحان ربی العظیم** کہو تو کم سے کم تین مرتبہ ہو۔ تین سے کم نہ ہو۔ پانچ دفعہ کہہ لو۔ سات دفعہ کہہ لو۔ مگر تین سے کم سنت کے مطابق نہیں ہوگا۔ تو مقدار تین بتلائی گئی۔ اسی طرح **سبحان ربی الاعلیٰ** کم سے کم تین دفعہ ___ فاتحہ پڑھو تو ایک دفعہ‘ اس میں تکرار نہیں۔ سورۃ پڑھو تو ایک دفعہ۔ اس میں تکرار نہیں۔ تشہد میں درود شریف پڑھو تو ایک دفعہ۔ اس میں تکرار نہیں۔ تو ہر چیز میں کہیں تکرار ہے‘ کہیں تکرار نہیں۔ جہاں تکرار ہے وہاں عدد معین ہے کہ اتنے عدد میں پڑھو۔ دو دفعہ یا تین دفعہ۔

اسی طرح نمازوں کی رکعات کے اعداد متعین کردیئے صبح کی نماز دو رکعت کی‘ مغرب کی نماز تین رکعت کی‘ بقیہ نمازیں چار چار رکعت کی۔ تو کسی کو یہ حق نہیں ہے وہ کہے کہ یہ چار رکعت والی کی پانچ رکعات کیوں نہ کردیں؟ اور تین والی کی دو دو رکعات کیوں نہ کردیں؟

جو جواب طبیب دنیا میں فن کی رو سے دے گا کہ جو مقدار فن کی رو سے ضروری ہے وہی میں لکھوں گا۔ مریض کو کمی زیادتی کرنے کا حق نہیں ہے۔ وہی انبیاء علیہم السلام کی طرف سے جواب ہے کہ اللہ نے یہ اذکار کی دوائیں مقرر کی ہیں۔ اس کی مقداریں بھی خود مقرر کی ہیں۔ ہمیں اس میں کمی یا زیادتی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جتنی مقدار آئے گی اتنی استعمال کریں گے۔ زیادہ کریں گے‘ ہلاکت واقع ہوگی ___ اگر کوئی ظہر کی نماز پڑھے اور یہ خیال کرے کہ نماز تو اچھی چیز ہے‘ لاؤ آج آٹھ یا بارہ رکعات پڑھ لوں۔ وہ منہ پر ماردی جائے گی اور ہلاکت کے قریب ہوجائے گا۔ حالانکہ اس نے زیادتی ہی تو کی ہے ___ مگر زیادتی بھی ناجائز‘ کمی بھی ناجائز۔ یہ مقدار شارع حقیقی کی طرف سے معین ہے۔ وہی مقدار رکھنی پڑے گی۔ اس واسطے جب مجموعۂ شریعت پر عمل ہوگا پھر روحانی صحت کامل نصیب ہوجائے گی ___ جیسا کہ گل بنفشہ پیا تو زکام رفع ہوگیا‘ ملیٹھی کھائی تو کھانسی رفع ہوگئی یاقوتی کھائی تو دماغ میں طاقت پیدا ہوگئی‘ مفرح بارد کھایا تو قلب میں فرحت پیدا ہوگئی اور اگر ان ساری چیزوں کا مجموعہ معجون مرکب بنا کر کھاؤ تو صحت کامل بن جاتی ہے ___ یہی صورت شریعت کی ہے کہ الگ الگ اعمال کی بھی خاصیتیں ہیں اور مجموعۂ شریعت کو استعمال کرو تو مکمل طریق پر روحانی صحت حاصل ہوگی تو آدمی چاق و چوبند ہوگا۔

تو یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ ہماری اور آپ کی نجات دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی شریعت کے اتباع پر موقوف ہے ___ ہم اور آپ سب مریضان نفوس ہیں۔ کوئی شہوتوں میں گرفتار ہے‘ کوئی شبہات میں گرفتار ہے‘ کسی میں عقائد کی خرابی ہے‘ کسی میں کبر کی خرابی‘ کسی میں عمل کی خرابی ہے۔ ان ساری چیزوں کو

رفع کرنے والی چیز قرآن وحدیث اور شریعت ہی تو ہے جب آپ سب کو استعمال کریں گے تو نہ عقائد کا فتنہ باقی رہے گا نہ عمل کا فتنہ باقی رہے گا' کوئی روگ باقی نہیں رہے گا۔ سلامتی پر آجائیں گے۔

علم وعمل کی بنیادیں

جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

ترکت فیکم الثقلین ـــ لن تضلوا بعدی ابدًا ان تمسکتم بھما۔ کتاب اللّٰہ وسنتی

میں دو وزنی چیزیں تم میں چھوڑ کر جاؤں گا۔ اگر ان دونوں کو مضبوط پکڑے رہو تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ کسی فتنے میں مبتلا نہیں ہو گے۔

اور وہ دو وزنی چیزیں کیا ہیں؟

اللہ کی کتاب اور میری سنت ــــ یعنی میرا اسوۂ حسنہ۔

علم حاصل کرو قرآن سے اور عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے حاصل کرو۔ علم وعمل جب درست ہو گا تو علمی فتنے بھی ختم ہو جائیں گے۔ جو عقائد کو برباد کرتے ہیں اور عملی فتنے بھی ختم ہو جائیں گے جو اتباع سنت کو برباد کرتے ہیں اور منکرات وبدعات میں لوگوں کو مبتلا کرتے ہیں۔ تو منکرات وبدعات ختم نہیں کر سکتے۔ جب تک قرآن کو سامنے نہ رکھا جائے۔ انہی دو کے مجموعے کا نام شریعت ہے۔ شریعت کی یہی دو بنیادیں ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ۔ تو ایک سے علم حاصل کرو' ایک سے عمل حاصل کرو۔ ایک سے فکر صحیح کرو' ایک سے اخلاق درست کرو۔ اخلاق وکمالات کا مجموعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔ اعمال صالحہ کا مجموعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ علوم کاملہ کا مجموعۂ قرآن کی ذات ہے۔ ان دونوں ذاتوں کو اگر آپ ہاتھوں میں تھام لو تو کبھی فتنے میں گرفتار نہیں ہو گے ــــ جب مسلمان تباہ ہوئے ہیں' انہی دو چیزوں کے ترک کرنے سے تباہ ہوئے ہیں۔ جب ان دو کو اختیار کر لیا۔ جب ہی نجات پا گئے اور عروج پا گئے۔

بہرحال یہ چند کلمات میں نے عرض کئے۔ میں تو بہت تھوڑی دیر چاہتا تھا کچھ دماغ میں قوت نہیں تھی' اور صلاحیت بھی نہیں رہی تھی ضعف بھی بہت تھا۔ مگر خیریات بڑھ گئی۔

صدق طلب

تو مقصد اصلی یہ تھا کہ اتباع شریعت کو اصل سمجھا جائے۔ اتباع سنت کو اصل سمجھا جائے۔ اس کے لئے جن معلومات کی ضرورت ہے' وہ معلومات حاصل کی جائیں ــــ اگر آپ خود عالم ہیں تو اپنے علم کی روشنی میں آپ سنت کی پیروی کریں ــــ اگر آپ عالم نہیں ہیں تو قرآن کریم نے طریقہ بتلایا کہ :

فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

تم اگر نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو ــــ اور ان سے سوالات کر کے' استفتاء کر کے فتویٰ لو۔ پھر اس کے اوپر چلو۔ تو یا اپنے علم پر چلو یا دوسرے کے علم پر اعتماد کر کے اس سے پوچھ پوچھ کر چلو ــــ اگر دل کے اندر ٹوہ رہے گی تو یا خود علم حاصل کر کے یا علم والوں سے پوچھ کر چلنے پر مجبور ہوں گے اور اگر دل میں طلب نہیں ہو گی تو پھر کچھ بھی نہیں ــــ اس واسطے میں کہتا ہوں کہ پانی کی تلاش زیادہ مت کرو۔ اپنے اندر پیاس پیدا کرو۔ پیاس پیدا ہو گئی تو پانی خود آپ کے پاس آجائے گا ــــ پیاس ہی نہیں' طلب ہی نہیں ــــ

جیسا کہ ہمارے ڈاکٹر اقبال مرحوم جو "شکوہ جواب شکوہ" ان کی مشہور نظم ہے۔ اس میں ایک موقع پر کہتے ہیں۔

راہ دکھلائیں کسے' رہرو منزل ہی نہیں

ہم تو راہ دکھلانے کے لئے موجود ہیں۔ مگر کوئی چلنے والا بھی تو ہو؟

راہ دکھلائیں کسے' رہر و منزل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی' وہ گل ہی نہیں

وہ مٹی ہی باقی نہیں رہی جس سے آدم کی تعمیر ہوتی تھی۔ خدا جانے لوگوں میں مٹی کہاں کہاں سے آگئی ہے کہ اتباع شریعت' اتباع سنت اور اتباع دین کا کوئی رجحان نہیں آرہا ___ تو معلوم ہوتا ہے کہ مٹی ہی خراب ہوگئی ہے کہ

جس سے تعمیر ہو آدم کی' وہ گل ہی نہیں

تو خوب کہا ہے کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں' کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے' رہر و منزل ہی نہیں

حدیث میں ہے کہ روزانہ حق تعالیٰ کی تجلیات آسمان دنیا پر اترتی ہیں اور ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ جیسا ہاتھ ان کی جناب اقدس کے لائق ہے اور فرماتے ہیں :

انا الرازق من ذالذی یسترزقنی انا الغافر من ذالذی یستغفرنی

"میں رزق دینے والا ہوں' کوئی ہے رزق مانگنے والا؟ میں مغفرت کرنے والا ہوں' کوئی ہے مغفرت کا طلب کرنے والا؟"

اخیر شب میں تہائی رات میں طلوع فجر تک یہ آوازیں لگتی رہتی ہیں۔ جن کو اللہ توفیق دیتے ہیں وہ مانگتے ہیں دعائیں کرتے ہیں۔ ورنہ ہم جیسے پڑے ہوئے سوئے رہتے ہیں۔ تو یہی کہا جائے گا کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں' کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہر و منزل ہی نہیں

اس لئے میں عرض کرتا ہوں کہ اتباع شریعت اور اتباع سنت آسان ہو جائے گا اپنے اندر پیاس پیدا کرلو۔ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہم متبع بن کر رہیں۔ مبتدع اور مخترع بن کر نہ رہیں کہ ایجاد کرکے رواج کو دین بنادیں۔ جو رواج پڑ گیا وہی دین' جو رسم پڑ گئی وہی دین۔ بلکہ ہر معاملہ میں دیکھو کہ اللہ کے رسول نے کیا فرمایا۔ اس کے اوپر صحابہؓ کا کیا عمل تھا۔ جو صحابہؓ کے تعامل سے ثابت ہو' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ثابت ہو' اس پر چلو' جو بے غل و غش راستہ ہے۔ شادی ہو' بیاہ ہو' غمی ہو' خوشی ہو۔ ہر ایک میں دیکھو کہ میرے پیغمبر نے اس کے اندر کیا نمونہ دکھلایا ہے۔ اس کے مطابق کرو۔ اس میں کوئی گھاٹا نہیں' کوئی خسارہ نہیں۔ آسان راستہ ہے' حقیقت میں دنیا طلبی مشکل ہے۔ دنیا میں جھگڑوں میں پڑ کر ہزاروں طوق و سلاسل آپ نے اپنے گلے میں ڈال لئے ہیں اور اپنے کو گویا زنجیروں میں باندھ لیا ہے۔ شریعت ان زنجیروں کو کھولنے کے لئے آئی ہے کہ آزادی اور سہولت کے ساتھ عمل کرکے دنیا بھی کمالو اور اللہ تک بھی پہنچ جاؤ ___ اس لئے میں نے یہ چند جملے عرض کئے کہ

آب کم جو، تشنگی آور بدست

پانی کی تلاش زیادہ نہ کرو۔ پیاس پیدا کرو۔ پانی خود بخود مہیا ہو جائے گا۔ اتباع حق، شریعت پر عمل کرنے اور آخرت کی نجات کی پیاس ہونی چاہئے۔ اپنی موت کو یاد کرو۔ اس عالم کے ختم ہونے کو یاد کرو۔ تو جب ایک دن ختم ہونا ہے تو ایک دن جواب دہی کا بھی آنا ہے۔ اس کے لئے کچھ نہ کچھ تو تیاری کی ضرورت ہے۔

حکیمانہ بات

حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی حکیمانہ بات فرمائی اور انبیاء علیہم السلام سے زیادہ حکیمانہ بات کہہ کون سکتا ہے ___ فرمایا :

اعمل للدنیا بمقدار بقائک فیھا واعمل للاٰخرۃ بمقدار بقائک فیھا

"دنیا کے لئے اتنا کام کرو جتنا دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنا کام کرو جتنا آخرت میں رہنا ہے"۔

یہاں چند دن رہنا ہے تو تھوڑا کام بھی کافی ہے۔ وہاں ابد الآباد تک رہنا ہے تو بہت سے کام کی ضرورت ہے۔

احترام جلسہ

بہرحال یہ چند جملے میں نے عرض کئے۔ ہمت اور طاقت تو تھی نہیں۔ مگر جلسے کے احترام نے مجبور کیا۔ اب جب لوگ جمع ہوں۔ لاؤڈ اسپیکر رکھ دیا جائے اور ایک شخص کو لا کر بٹھلا دو اور تواضعاً یہ بھی کہہ دیں کہ ہم بالکل تقریر کرنے کی درخواست نہیں کرتے۔ چاہے آپ تقریر کریں چاہے نہ کریں۔ یہ بڑے عمدہ پیرائے میں تقریر کے لئے مجبور کرنا ہے۔ جب ہیئت جلسہ کی بن گئی، لاؤڈ اسپیکر رکھدیا گیا تو آدمی جھک مارے گا اور تقریر کرے گا۔

آپ تو بری ہو گئے کہ دیکھئے ہم نے تو فرمائش نہیں کی تھی نہ مجبور کیا تھا۔ آپ دعا کر کے اٹھ جاتے ہم اس پر بھی راضی تھے۔ مگر ہیئت ایسی بنا دی کہ میں کچھ عرض کرنے پر مجبور تھا ___ ارادہ تھوڑا تھا۔ مگر بہرحال ہو گیا کچھ زیادہ ___ بہرحال نفع ہی کی چیزیں بیان ہوئیں۔ مسائل ہی علم میں آئے ___ اب دعاء کر لیجئے کہ حق تعالیٰ شانہ توفیق عطا فرمائیں۔ اپنی مرضیات پر چلائے۔ اپنے رسول پاک کی سنتوں پر چلنے کی ہمیں توفیق عطاء فرمائے۔ ہمارے دلوں میں دین کی محبت عطا فرمائے۔ ہمارے دلوں کے اندر موت کی یاد اور قیامت کی حاضری کا جذبہ رہے اور حق تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا جذبہ تازہ رہے۔

اللھم ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخسرین۔

اللھم ربنا اتنا من لدنک رحمۃ وھیئی لنا من امرنا رشدا

اللھم ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار وادخلنا الجنۃ مع الابرار یا عزیز یا غفار۔

برحمتک یا ارحم الرحمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

عمل صالح

نیکی کرنے سے امید اور بدی کرنے سے مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ جو ہمیشہ نالائقیاں کرتا ہے' اسے مایوسی ہوتی ہے کہ مجھے کچھ نہیں ملنا ملانا۔ بس آقا کی طرف سے جوتیاں پڑیں گی اور جو کام عمدہ کرتا ہے' اسے تمنا رہتی ہے' کاش! میرے سے کوئی پوچھے تو نے کیا کام کیا؟ تاکہ میں بتا سکوں میں نے یہ کیا' یہ کیا۔ مجھے انعام ملے گا اور مالک کے دل میں میری قدر بڑھے گی۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ــــــ اَمَّا بَعْدُ ــــــ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ. (توبہ پ ۱۱ ع ۱۳)

تمہید

بزرگان محترم!

یہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے' جو اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی۔ اس میں حق تعالیٰ شانہ نے اپنے بندوں کو عمل کے اوپر آمادہ کیا اور ابھارا ہے کہ عملی زندگی اختیار کرو۔ محض قولی اور باتیں کرنے کی زندگی' یہ آخرت کے لئے کافی نہیں ہے۔ جب تک عملی جدوجہد اور سعی انسان میں نہ ہو ــــ اسی مقصد پر آمادہ کرنے کے لئے آیت حق تعالیٰ شانہ نے اتاری ــــ میں اسی کے متعلق چند جملے مختصر طریق پر گذارش کرنا چاہتا ہوں۔

اس سے پہلے کہ آیت کا مضمون شروع کیا جائے۔ اسی سلسلہ میں حدیث شریف کی ایک مثال آپ کے

۲۳ جولائی ۱۹۶۳ء (افریقہ)

سامنے پیش کروں گا۔ اس مثال کے ذریعے اس آیت کا مضمون بہت زیادہ واضح اور کھل جائے گا۔ کیونکہ مثال میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ باریک سے باریک مضمون بھی جب مثال کے ذریعے سمجھایا جائے تو وہ بالکل کھل جاتا اور نمایاں ہو جاتا ہے ___ یہ علم کی خاص قوت حق تعالیٰ شانہ نے انبیاء علیہم السلام کو عطا فرمائی ہے۔ وہ بڑے بڑے دقیق مسئلوں کو موٹی موٹی مثالوں سے اس طرح سمجھا دیتے ہیں کہ ایک جاہل سے جاہل اور بے پڑھے سے بھی بے پڑھا لکھا آدمی سمجھ سکے۔ یہ خاص قوت سب سے پہلے انبیاء علیہم السلام کو دی جاتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی جوتیوں کی برکت سے اولیائے کاملین اور علمائے ربّانی میں بھی یہ قوت ہوتی ہے۔

مثال ایک کھلی دلیل ہوتی ہے

مجھے اس پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ یاد آیا' جن کا نام نامی آپ نے ابھی سنا' انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی اور اپنے اعوان وانصار کے ساتھ اس ادارے کو قائم کیا اور چلایا ___ انہی کا ایک واقعہ مثال کے سلسلے میں مجھے یاد آیا۔ ان کے مریدین میں ایک شخص اللہ دین تھا' میں نے بھی دیکھا ہے' بوڑھا آدمی بالکل اَن پڑھ اور جاہل تھا اس کی گوشت کی دوکان تھی۔ بے پڑھا لکھا بھی تھا اور تجارت بھی اس کی ایسی تھی جس میں پڑھنے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ گائے بھینس ذبح کی' اس کا گوشت بیچ دیا۔ وہ حضرتؒ سے بیعت تھا ___ مگر میں نے اس کو دیکھا ہے کہ اس میں دین کی سمجھ اتنی اعلیٰ تھی کہ آج علماء میں بھی وہ نہیں ملتی۔ جو اس جاہل میں محض صحبت یافتہ ہونے کی وجہ سے تھی۔ اس نے خود ہی یہ واقعہ مجھے سنایا تھا کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے حضرتؒ سے ایک سوال کیا کہ :

حضرتؒ ! یہ جو سننے میں آیا ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مرنے کے بعد بزرگوں کے قُربِ جوار میں دفن ہونے کی کوشش کی جائے' اولیاء کے مزارات کے پاس اپنی قبر بنوائیں۔ اس کی لوگ کوشش کریں تو اس کا کیا فائدہ ہے؟ اس لئے کہ مرنے والا اگر نیک ہے اور اعمال صالحہ اس کے ساتھ ہیں' اسے کہیں بھی دفن کر دو' اس کی نیکی اس کے ساتھ ہے' قبر اس کی روشن ہو جائے گی اور اگر وہ بد عمل ہے' اسے نبی کے قریب بھی دفن کر دیں' تب بھی اس کی بدی سامنے آئے گی۔ تو انبیاء و اولیاء کے قُرب و جوار میں دفن کرنے کا فائدہ کیا ہوا۔۔۔؟

___ یہ اس نے سوال کیا ___ اب سوال کرنے والا بالکل اَن پڑھ جاہل آدمی اور عالم برزخ کا سوال کر رہا ہے۔ اس کو اگر حقائق سمجھائے جائیں اور علم کی باریک باتیں بتائی جائیں' وہ کچھ بھی نہ سمجھتا۔ موٹی سمجھ کا آدمی تھا۔

حضرتؒ نے اس کو سمجھایا اور ایک مثال کے ذریعے مسئلے کو واضح کر دیا کہ وہ جاہل بھی سمجھ گیا اور دوسرے بھی سمجھ گئے ___ جب وہ سوال کر چکا' حضرتؒ نے فرمایا' اچھا ہم اس کا جواب دیں گے ___ ابھی جواب نہیں دیا۔ موقع پر جواب دیں گے وہ بھی خاموش ہو گیا ___ گرمی شدید پڑ رہی تھی' وہ پنکھا لے کر حضرتؒ کو جھلنے کھڑا ہو گیا اسے یاد بھی نہیں رہا کہ میں نے کیا سوال کیا تھا۔ پندرہ بیس منٹ گذر چکے۔

حضرتؒ نے اس سے پوچھا میاں اللہ دین! تم یہ پنکھا کسے جھل رہے ہو؟ کہا حضرت! آپ کو جھل رہا ہوں ___ فرمایا یہ جو لوگ مجلس میں ساتھ بیٹھے ہیں انہیں تو نہیں جھل رہا؟ کہا نہیں' انہیں تو نہیں جھل رہا ___ اس واسطے کہ نہ میں ان کا شاگرد نہ ان کا مرید۔ یہ تو سارے میرے برابر ہیں۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ

ان کو پنکھا جھلوں اور ان کا خادم بنوں۔ میں تو آپ کو پنکھا جھلنے کھڑا ہو گیا۔

فرمایا' ہوا ان سب لوگوں کو لگ رہی ہے؟ کہ جی ہاں' ہوا تو لگ رہی ہے۔ فرمایا' یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔

تم نے یہ سوال کیا کہ انبیاء و اولیاء کے قریب دفن کرنے سے کیا فائدہ؟ فرمایا' اولیاء اللہ کی قبروں پر رحمت کی ہوائیں چلتی ہیں' رحمت کی ہوائیں اترتی ہیں؟ مقصود اصلی وہ ہوتے ہیں لیکن آس پاس والوں کو بھی ہوا لگتی ہے۔ رحمت کے اثرات سب کو پہنچتے ہیں۔ اس واسطے دفن کرنے کے بارے میں فرمایا گیا کہ کوشش کرو اہل اللہ اور صالحین کے پاس دفن ہوں' ان پر رحمت کی ہوائیں چلیں گی۔ آس پاس والوں کو بھی لگیں گی' چاہے وہ مقصود اصلی نہ ہوں۔ مقصود فقط وہ نبی یا ولی کامل ہوں ___ فرمایا یہ تمہارے سوال کا جواب ہے ___ تو قبر اور برزخ کے عالم کا باریک مسئلہ اس کے دل میں اتار دیا ___ سب لوگ سمجھ گئے۔ تو مثال ایک ایسی کھلی دلیل ہوتی ہے کہ دقیق سے دقیق مسائل جو سمجھ میں نہ آسکیں' وہ مثال کے ذریعے سمجھائے جاسکتے ہیں۔

اسی اللہ دین نے حضرت سے ایک اور بھی سوال کیا ___ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مظفر نگر تشریف لے گئے یہ دیوبند سے کوئی سولہ میل کا ایک ضلع ہے۔ حضرت کے ایک مرید ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب تھے' جو جیل کے ڈاکٹر تھے' وہیں ان کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ حضرتؒ ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے جیل کی طرف روانہ ہوئے یہی اللہ دین ساتھ تھا' پیچھے اور لوگ بھی تھے۔ اس نے پھر حضرتؒ سے اس سے بھی زیادہ باریک سوال کیا ___ واقعی باریک سوال کرنا بھی ہر ایک کا کام نہیں ___ حدیث میں ہے کہ **السؤال نصف العلم** سوال کرنے کے لئے بھی آدھے علم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جاہل آدمی سوال بھی نہیں کرتا' کچھ نہ کچھ معلومات ہوں گی' جبھی سوال کرے گا۔ محض جاہل ہو تو آدمی کے سوال بھی سمجھ نہیں آتا۔ یہ بظاہر جاہل تھا' مگر صحبت یافتہ تھا' اس لئے بڑے باریک باریک سوالات اس کے دل میں پیدا ہوتے اور ان کے جواب میں جب علم کھلتا' لوگ فائدہ اٹھاتے تھے ___ تو حضرتؒ مظفر نگر میں جیل کی طرف جا رہے تھے یہ بھی ساتھ تھا اس نے پھر ایک سوال کیا ___ اس نے کہا' حضرت جی! یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ پیشین گوئیاں انبیاءؑ بھی کرتے ہیں' اولیاء بھی کرتے ہیں انبیاء بھی خبریں دیتے ہیں کہ ایسا واقعہ ہونے والا ہے بلکہ مدت بتلا دیتے ہیں کہ سو یا دو سو برس کے بعد یہ واقعہ پیش آئے گا۔ جیسے حدیث میں آپؐ نے خبر دی کہ مجھے میری امت کی عمر پانچ سو برس دکھلائی گئی۔ ایک حدیث میں فرمایا کہ ہزار برس دکھلائی گئی ___ اس کا علماء نے جواب دیا ہے کہ پانچ سو اور ہزار کو کیسے جمع کیا جائے' اس وقت مجھے وہ بیان کرنا مقصود نہیں' مطلب یہ تھا کہ آپ نے پیشین گوئی کی اور مدت متعین کر دی' ٹھیک پانچ سو برس کے بعد وہ واقعہ پیش آگیا' جس کی طرف آپؐ نے اشارہ فرمایا تھا ___ اور دوسرا واقعہ بھی ٹھیک ہزار برس کے بعد پیش آگیا۔

تو اللہ دین نے کہا کہ انبیاء بھی پیشین گوئیاں کرتے ہیں اور وقت بھی متعین کر دیتے ہیں اور ٹھیک مقررّ وقت پر وہ بات پیش آتی ہے۔ مگر اولیاء اللہ پیشین گوئی کرتے ہیں اور وقت متعین کرتے ہیں۔ بعض دفعہ وقت سے پہلے ہو جاتی ہیں ہے اور بعض دفعہ وقت کے بعد ٹھیک وقت پہ نہیں ہوتی۔ کیا یہ لوگ غلط دیکھتے ہیں؟ کیا اولیاء اللہ معاذ اللہ غلط گوئی کرتے ہیں اور جھوٹ بیان کر دیتے ہیں؟ جب ان کے بیان کئے ہوئے وقت پہ کام نہیں ہوتا' کبھی پہلے ہو گیا' کبھی بعد میں' معلوم ہوا وہ غلط اطلاع دیتے ہیں اور جو غلط اطلاع دے اور معاذ اللہ جھوٹ کہدے' وہ ولی کیسا ہوا؟ ہاں انبیاء جو بات کہتے ہیں' وہ ٹھیک وقت متعین پر بات پیش آجاتی

ہے۔ تو اس نے کہا کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ نبی جو وقت مقرر کرے' وہ بات تو ٹھیک وقت پہ پیش آئے اور ولی جو مقرر کرے۔ اس میں بات آگے پیچھے ہو جاتی ہے' تو ولی کی سمجھ میں نہیں آتا یا وہ غلط گوئی کرتے ہیں یا انہیں خبر نہیں ہوتی؟ تو کیا ضرورت ہے پیشین گوئی کرنے کی' جب انہیں کسی بات کا علم ہی نہیں۔

اب یہ سوال بہت باریک' نبی اور ولی کے کشف کا سوال ایک جاہل آدمی پوچھ رہا ہے' جسے نہ کشف کی خبر نہ کشف کے اوقات کی خبر نہ اس کے تعینات کی خبر اور وہ حضرتؒ سے سوال کر رہا ہے۔

اب اگر حضرتؒ کشف کی حقیقت بیان کرتے اور کشف کی میعاد اور مدت سے بحث کرتے' وہ کوندن کیا سمجھتا؟ وہ ایسے دیکھتا رہتا جیسے دیوار کھڑی رہتی ہے۔ مگر حضرتؒ نے اس کے مناسب حال جواب دیا۔ اتنا باریک مسئلہ ایک مثال سے سمجھا دیا۔

فرمایا' میاں اللہ دین! یہ سامنے جو عمارت نظر آ رہی ہے۔ یہ کیا عمارت ہے؟ اس نے کہا کہ جیل خانہ ہے ــــ جیل خانہ وہاں سے کوئی دو فرلانگ پر تھا ــــ فرمایا یقینی بات ہے کہ جیل خانہ ہے؟ کہ جی ہاں بالکل یقینی ہے۔ میں حلف اٹھالوں کہ یہ جیل خانہ ہے۔ فرمایا یہاں سے کتنی دور ہوگا؟ اس نے کہا اندازاً چار سو قدم ہوگا۔ فرمایا چار سو کے' تین سو پچانوے اور چار سو پانچ بھی ہو سکتے ہیں؟ کہ جی ہاں ہو سکتے ہیں۔ یہ تو میرا ایک تخمینہ ہے' پانچ کم ہو جائیں یا پانچ زیادہ ہو جائیں۔ یہ یقینی ہے کہ یہ جیل خانہ ہے ــــ حضرت خاموش ہو گئے اور برابر چل رہے ہیں۔

جب جیل خانہ کے دروازے کے بالکل قریب پہنچ گئے اور اس کی دیوار بالکل ایک گز رہ گئی ــــ فرمایا' اللہ دین یہ کیا عمارت ہے؟ کہا کہ جیل خانہ ہے۔ فرمایا یقینی ہے؟ کہ جی اب تو اور بھی یقینی ہے ــــ فرمایا کتنا دور ہوگا؟ اس نے کہا' جی ایک گز۔ فرمایا' گز کی ڈیڑھ بھی ہو سکے یا پونے دو؟ اس نے کہا نہیں ٹھیک گز ہے۔ کہو تو میں ناپ کے بتلا دوں؟۔

فرمایا' یہی نبی اور ولی کے کشف میں فرق ہے۔ یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔ ــــ جو چیز نبی دیکھتا ہے' وہی ولی بھی دیکھتا ہے۔ مگر ولی دور سے دیکھتا ہے' اپنے اندازہ اور تخمینے سے مدت متعین کرتا ہے اس میں کمی بیشی ہو جاتی ہے اور نبی کو شے کے سر پر لا کر کھڑا کر دیتے ہیں' وہ جو مدت مقرر کرتا ہے' ٹھیک پنی تلی ہوتی ہے۔ اس میں کمی زیادتی نہیں ہو سکتی۔ جیسے تم نے دو فرلانگ کے فاصلہ پر کہا کہ چار سو قدم ہیں' مگر چار سو کے تین سو پچانوے بھی ہو سکتے ہیں اور چار سو پانچ بھی اور جب جیل خانے کے سر پر پہنچ گئے' تم نے کہا صاحب! گز کا پون گز اور سوا گز نہیں ہو سکتا' گز بھر ہی رہے گا ــــ فرمایا نبی اور ولی کے کشف میں یہی فرق ہے ــــ اب کتنا دقیق مسئلہ تھا۔ مگر حضرتؒ نے کیسی سہولت سے اسے حل کر دیا' کہ اس جاہل کو بھی سمجھ آ گیا اور ہم جیسے جاہلوں کو بھی فائدہ پہنچ گیا۔ اگر یہ سوال نہ کرتا' ہماری بھی سمجھ میں بات نہ آتی۔

تو مثالوں کے ذریعے سے انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام بڑے بڑے باریک مسائل موٹی عقل والوں کو سمجھا دیتے ہیں۔

اسی پر مجھے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا' حضرتؒ ایک دفعہ مظفر نگر تشریف لے گئے۔ تو مظفر نگر کے اسٹیشن پر حضرت بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی کچھ لیٹ تھی ــــ اس زمانے کا سب سے بڑا مہندس' ریاضی دان' اقلیدس کا جاننے والا ایک ہندو تھا' اسے ناز تھا کہ میں فن ریاضی میں بڑا ماہر ہوں' اسے جو معلوم ہوا کہ حضرت نانوتوی اسٹیشن پر موجود ہیں ــــ حضرتؒ بھی فن ریاضی میں بڑے مشہور تھے حتیٰ کہ حضرتؒ نے اقلیدس پر اعتراضات کئے ہیں' جس کے بارے میں یہ عام مسلّم تھا کہ اقلیدس پر اعتراض ممکن

نہیں ہے' یہ تو بدیہی چیزیں ہیں۔ حضرت نے اس پر اعتراض کیا اور اس زمانے کے ریاضی دان حیران ہوئے کہ اس کا جواب کس طرح سے دیں۔ تو اس ہندو کو معلوم ہوا کہ حضرت بھی اسٹیشن پر ہیں' وہ جلدی سے آیا اور بڑی نیازمندی سے ملا' کچھ بات چیت کی' اس کے بعد اس نے کہا حضرت جی! مجھے آپ سے ایک سوال کرنا ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ لوح محفوظ میں ساری چیزیں لکھی ہوئی ہیں۔ ہر انسان کی ہر ہر حرکت اور ہر ذرا ذرا اس میں قیامت تک کے واقعات لکھے ہوئے ہیں۔ تو ایک انسان کی اتنی بڑی زندگی ہے کہ اس میں ہزاروں واقعات ہیں تو ایک ایک واقعہ اور ایک ایک ہوں' ایک ایک چوں اس میں لکھی ہوئی ہے تو لوح محفوظ کہاں تک پھیلی ہوئی ہوگی' اس کی تو کوئی حد نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ سارے انسانوں' جانوروں' درختوں اور پتھروں کے واقعات' ایک ایک پتھر کا ہلنا جب یہ سب کچھ ہوگا' تو کتنی بڑی لوح محفوظ ہوگی؟ وہ کہاں رکھی ہوئی ہوگی؟ آسمان کتنا بھی بڑا سہی' مگر لوح محفوظ میں تو آسمان بھی لکھے ہوئے ہیں۔ وہ کہیں آ ہی نہیں سکتی؟ ــــــ یہ اس نے سوال کیا۔

حضرت نے فرمایا کہ صاحب! آپ کی عمر کتنی ہے اس نے کہا ساٹھ برس۔ فرمایا' ساٹھ برس میں آپ کی زندگی میں ہزاروں واقعات پیش آئے ہوں گے؟ کہ بالکل۔ فرمایا' آپ کو کچھ یاد بھی ہیں؟ کہ جی بہت یاد ہیں' بس وہ جو بچپن کی چار' پانچ برس کی زندگی تھی' اس کو چھوڑ کے' جب سے میں نے ہوش سنبھالا' تو حافظہ میرا قوی ہے' مجھے سارے واقعات یاد ہیں۔ فرمایا' اگر تم ان کو لکھنا شروع کرو تو کتنے کاغذوں پر لکھے جائیں گے؟ اس نے کہا جی ایک کاغذ؟ اگر میں لکھنا شروع کروں' دس بیس پچاس میل تک وہ سلسلہ چلا جائے گا' وہ تو ساری زندگی ہے۔ فرمایا اتنے لمبے چوڑے واقعات تمہیں یاد ہیں؟ تو وہ کہاں محفوظ ہیں؟ وہ جو اتنے واقعات ہیں وہ کہاں لکھے ہوئے ہیں؟ کہ تم فورا سنا دیتے ہو۔ اس نے کہا کہ جی میرے دماغ میں محفوظ ہیں۔ فرمایا زندگی اتنی سی اور اس کے واقعات لکھنا شروع کرو تو میلوں تک سلسلہ چلا جائے اور دماغ کی اتنی چھوٹی سی ڈبیہ میں وہ سارے واقعات (قوت حافظ میں) محفوظ ہیں۔ فرمایا یہ تمہاری قوت حافظ ہے' لوح محفوظ اللہ کی قوت حافظ ہے۔ جیسی تمہاری زندگی کے واقعات اس میں محفوظ ہیں' کائنات کی زندگی کے واقعات اس میں محفوظ ہیں وہ بہت بڑی سہی لیکن جیسے تم کہہ رہے ہو کہ نہیں حد ونہایت نہیں۔ یہ بات نہیں جیسے تمہارے دماغ کی بھی ایک حد ہے کہ اتنی سی ڈبیہ ہے' جو پورے سر میں نہیں' سر کے پیچھے گدی میں ہے' اس لئے کہ اگلا حصہ حس مشترک کا ہے اس میں دیکھنے' سننے' اور سونگھنے کی طاقت جمع ہے ادھر ادھر کچھ نالیاں ہیں' جن میں ملم وغیرہ گھومتا رہتا ہے یعنی فکر کی طاقت' پچھلے جو واقعات ہیں وہ گدی کے قریب ایک چھوٹے سے حصہ میں ہیں۔ تو جس اللہ کو یہ قدرت ہے کہ انچ بھر کی ڈبیہ میں ہزاروں لاکھوں واقعات لکھ دے' جنہیں کاغذ پر لکھو تو پچاسوں میل تک کاغذ چلا جائے۔ اسے یہ قدرت بھی ہے کہ ساری دنیا کے ذرے ذرے کے واقعات لوح محفوظ میں لکھ دے۔ اور وہ لوح محفوظ اتنی بڑی نہ ہو' جتنی تم سمجھ رہے ہو۔

تو کتنا باریک مسئلہ تھا اور حضرت نے کس سہولت سے مثال دے کر سمجھا دیا۔ تو مثال بڑی عجیب وغریب دلیل ہوتی ہے کہ دقیق مسائل جو عقل وفہم میں نہ آسکیں مثال کے ذریعے واضح ہو جاتے ہیں ــــــ یہی وجہ ہے قرآن کریم نے دنیا و آخرت کے لئے بڑی بڑی مثالیں دی ہیں اور ان مثالوں سے سمجھا دیا ہے۔ احادیث میں بھی باریک مسائل کی ہزاروں مثالیں دی گئی ہیں۔

تو مثال یہ خاص قوت ہوتی ہے علم کی' جو انبیاء علیہم السلام کو دی جاتی ہے اور ان کے طفیل میں اولیاء اور علماء ربانی کو دی جاتی ہے۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے تین بھائیوں کی مثال

مجھے ایک مثال حدیث کی یاد آئی' جو اس آیت سے متعلق ہے' جو میں نے تلاوت کی تھی۔ میں آیت کا مضمون اس مثال ہی سے شروع کرتا ہوں' جو حدیث میں فرمائی گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' اے لوگو! ایک مثال سنو۔!

صحابہؓ متوجہ ہوئے۔

فرمایا ایک شخص کے تین بھائی تھے۔ ایک بڑا' ایک منجھلا' ایک چھوٹا۔ تینوں حقیقی بھائی تھے اور ایک دوسرے کے بڑے قریب تھے۔ اس شخص کے مرنے کا وقت آیا' تو مرنے کی حالت میں انسان بے کس و بے بس ہوتا ہے' نہ خود کچھ کرسکتا ہے نہ کوئی دوسرا بنا سکتا ہے۔ محض اللہ کے رحم و کرم پر ایک بے کسی کا عالم ہوتا ہے۔ کوئی سہارا معاون اور مددگار اس کو نظر نہیں آتا۔ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ o اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ۔ جب پنڈلی پر پنڈلی مارتا ہوا ہوتا ہے' تشنج ہوتا ہے اور جان کھنچتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اب پروردگار کی طرف روانگی ہے۔ اب کون ہے بچانے والا اور مدد کرنے والا؟ وہ انتہائی بے کسی کا عالم ہوتا ہے۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص کے اوپر بے کسی کا عالم طاری ہوا اور مرنے کا وقت آیا۔ تو سب سے پہلے اس نے اپنے بڑے بھائی کو بلایا اور کہا اے بھائی! میں نے ہمیشہ تیرے ساتھ احسان و سلوک کیا۔ اپنے کو نعمتوں میں پیچھے اور تجھے آگے رکھا۔ کوئی بھی آڑا وقت آن پڑا' میں نے تیری حفاظت' تیرے بچانے اور تجھے آرام پہنچانے میں جان لگادی اب یہ میرے اوپر آخری اور انتہائی بے کسی کا وقت ہے۔ تو میرا بھائی ہے اور بھائی وہ جس کے ساتھ عمر بھر میں نے سلوک اور احسان کیا' میں چاہتا ہوں تو اس وقت میری مدد' کر میرا کوئی مددگار نہیں ہے میں اس وقت کسی کو بھی نہیں پکار سکتا۔ وقت پڑے بھائی ہی یاد آتا ہے تجھ سے میری توقع ہے کہ تو میری کچھ مدد کریگا ___ بڑے بھائی نے جواب دیا کہ تیرا بالکل غلط خیال ہے میں تیری کوئی مدد نہیں کرسکتا نہ میں تیرے کام آسکتا ہوں تو نے اگر میرے ساتھ احسان کیا تو تو نے جھک مارا' برا کیا' میں اس کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتا۔ صاف ٹکا سا جواب دے دیا۔ زیادہ سے زیادہ اگر میں تیری مدد کرسکتا ہوں تو اتنی کہ جب تک تیرے دم میں دم ہے میں تیرے پاس بیٹھا رہونگا لیکن یہ کہ میں تیرا کوئی کام بنادوں' تیری مصیبت کو ٹلادوں' یا اپنے اوپر لے لوں' اس کی کوئی توقع مت رکھنا۔ میں تیرے کام آنے والا نہیں ہوں ___ اسے بڑا صدمہ ہوا کہ جس بھائی کے ساتھ میں نے عمر بھر سلوک کیا۔ جب مجھ پر وقت پڑا' تو ٹکا سا جواب دے دیا۔

تو مایوس ہو کر منجھلے بھائی کو بلایا۔ اس کے سامنے بھی یہی تقریر کی اور کہا کہ یہ میرا آخری وقت ہے' کڑا وقت ہے' کوئی مددگار نہیں ہے۔ میری توقع ہے کہ تو میری مدد کریگا اس لئے کہ تیرے ساتھ بھی میں نے ساری عمر سلوک و احسان کیا' خود تکلیف اٹھائی مگر تجھ پر آنچ نہیں آنے دی۔ کیا تو میری مدد کرسکتا ہے ___ ؟

اس نے کہا کہ بالکل تیرا خیال فاسد ہے میں بالکل تیری مدد نہیں کرسکتا نہ میں تیرے کام آؤں گا۔ تو نے میری مدد کی یا احسان کیا' کیا ہوگا' اچھا کیا یا برا کیا۔ بہرحال مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں' مجھ سے کوئی توقع نہ رکھنا۔ میں تیرے کام آنے والا نہیں ہوں۔ بہت اگر کام آیا تو اتنا کام میں کردوں گا کہ جب تیرا دم نکل جائے گا' تو تجھے لے جاکر گڑھے میں دفن کردوں' اس سے زیادہ کوئی توقع مت رکھنا

اس نے کہا افسوس اِنَّا لِلّٰہِ جن بھائیوں سے توقع تھی انہوں نے وقت پر جواب دے دیا جن کے ساتھ

سلوک کیا' انہوں نے وقت پر ٹکا سا جواب دیدیا ___ تب اس نے سب سے چھوٹے بھائی کو بلایا اور کہا بھائی! مجھ پر آڑا وقت ہے' میں پریشانی میں مبتلا ہوں۔ کیا تو میری مدد کر سکتا ہے اور میرا منہ نہیں ہے کہ میں تجھ سے مدد مانگوں۔ اس لئے کہ میں نے عمر بھر تجھے تکلیف پہنچائی' ہمیشہ تجھے ایذائیں پہنچائیں۔ عمر بھر تیرے ساتھ کوئی بھلا سلوک نہیں کیا مگر بہر حال تو پھر بھائی ہے۔ شاید تو میرے کام آجائے۔

چھوٹے بھائی نے جواب دیا' تو ذرا پریشان مت ہو۔ میں تیرے کام آؤں گا کوئی مصیبت تجھ پر پڑے گی پہلے میں اپنے پر جھیلوں گا' بعد میں تجھ تک آنے دوں گا۔ اگرچہ تو نے عمر بھر مجھے ستایا اور پریشان کیا بلکہ میری تذلیل کی اور مجھے ذلیل رکھا' ___ مگر میں شریف الطبع ہوں۔ میں تیرے کام آؤں گا' تو بالکل مت گھبرا کوئی مصیبت آئے گی' پہلے میں ہوں' بعد میں تو ہے۔ اس نے کہا اللہ تجھے جزائے خیر دے' مجھے توقع نہیں تھی۔ مگر واقعی تیرا حوصلہ بہت بلند ہے۔ میں نے ساری عمر تجھے ستایا اور وقت پر تو کام آیا تو نے مجھے تسلی دی۔

یہ تین بھائیوں کا واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور فرمایا' ___ اے لوگو! سمجھے بھی یہ تین بھائی کون ہیں؟ عرض کیا' اللّٰہ ورسولہ اعلم۔

فرمایا' بڑا بھائی کیسا تھا؟ لوگوں نے کہا' بڑا کمینہ اور بد خصلت تھا کہ وقت کے اوپر کام نہ آیا۔ بھائی تو وہ ہے جو وقت کے اوپر کام آئے۔

فرمایا' منجھلا کیسا تھا؟ عرض کیا وہ بھی بہت خراب وخستہ اور بڑا بدنیت اور بے مروّت ___ جس نے عین وقت کے اوپر جواب دے دیا۔

اور فرمایا' چھوٹا بھائی کیسا تھا؟ عرض کیا بڑا شریف' بڑا عالی حوصلہ اور بڑا عالی ظرف۔ باوجود یہ کہ اس کے ساتھ برائی کی گئی' لیکن کام آیا تو وہی آیا۔

بڑے بھائی کا سلوک

فرمایا' یہ سمجھے کہ یہ تین بھائی کون ہیں؟ عرض کیا' اللہ اور رسول ہی بہتر جانتے ہیں کہ تین بھائی کون ہیں۔

فرمایا' وہ بڑا بھائی جس کے ساتھ آدمی عمر بھر سلوک واحسان کرتا ہے' وہ اس کا مال ودولت ہے۔ عمر بھر اس کے حاصل کرنے میں جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا' بلکہ بعض اوقات ایمان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ ایمان رہے نہ رہے' مگر پیسہ ہاتھ میں آنا چاہئے۔ اس کی عزت افزائی میں جان پہ مصیبت اٹھاتا ہے۔ اپنے کو ذلیل بنا لیتا ہے۔ مگر مال پر آنچ نہیں آنے دیتا ___ دنیا میں اتنی خدمت کسی چیز کی نہیں کی جاتی' جتنی رغبت اس کی طرف ہے' کسی چیز کی طرف نہیں کی جاتی۔ فرمایا' بڑے بھائی سے آدمی جتنا اچھا سلوک کر سکتا ہے' اس سے زیادہ مال سے کرتا ہے۔ لیکن جب مرنے کا وقت آتا ہے' سب سے پہلے بیگانہ یہی مال ہوتا ہے۔ اس وقت آدمی مال ودولت کی طرف رجوع کرے' تو وہ کہتا ہے' مجھ سے کسی قسم کی توقع مت رکھنا۔ زیادہ سے زیادہ میں یہ کر سکتا ہوں' جب تک تیرا سانس چل رہا ہے' میں تیرے پاس بیٹھا رہوں اور جب سانس نکل گیا' میرا تیرا کوئی واسطہ اور تعلق نہیں' تو اور عالم میں جائے گا' میں اور عالم کی چیز ہوں' تو کسی اور کی چیز بنے گا' میں کسی اور کا بنوں گا۔

چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا' جب انسان کا جنازہ نکلتا ہے' تو ملائکہ علیہم السلام پکارتے ہیں' ماقدم فلانٌ' ماقدم فلانٌ فلاں نے کیا چیز آگے بھیجی جو آخرت میں کام آئے' اور توشہ وزادِ راہ بنے۔

اور وارث کیا پکارتے ہیں؟ ماالخر فلانٌ۔ فلاں نے پیچھے کیا چیز چھوڑی جو ہم اس پر قبضہ کریں اور اس کو بٹوائیں۔ مرنے والا ابھی قبر میں پہنچنے نہیں پاتا اور وارثوں میں لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں کہ یہ چیز میں تھماؤں گا۔ یہ چیز میرے قبضے میں آئے گی۔ بہت سے لوگ فرضی وارث بن کے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اس کے مال کے وارث ہم ہیں، حتیٰ کہ بیویوں تک یہ نگاہ پہنچتی ہے کہ اس بیوہ سے میں نکاح کروں گا۔ کوئی کہتا ہے میں نکاح کروں گا۔ مالدار عورت ہے۔ تو مرنے والا ابھی قبر میں بھی نہیں پہنچا اور وارثوں کی رال ٹپکنی شروع ہو جاتی ہے۔ تو مال و دولت سب سے پہلے بیگانہ بنتا ہے اور دوسروں کی گود میں چلا جاتا ہے۔ اصل مالک پوچھتا ہوا رہ جاتا ہے کہ کوئی میرے کام آنے والا؟ وہ کہتا ہے مجھ سے بالکل توقع مت رکھنا۔

بہرحال دولت کے مالک ورثاء اور پس ماندگان بن جاتے ہیں اور اس بیچارے سے بیگانہ بن جاتی ہے، جس نے ساری عمر اس کو کمایا تھا، محنت کی تھی، حتیٰ کہ ایمان اور جان کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت کتنی ہو، مگر دھوپ اور چھاؤں کی طرح سے ہے۔ آج ایک کے ہاتھ میں ہے، کل دوسرے کے ہاتھ میں ہے، ہزاروں امیر اس دنیا میں غریب بنتے دیکھے گئے ہیں اور ہزاروں غریب امیر بنتے دیکھے گئے۔ دولت کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتی۔ اس کو آدمی خادم بنا کے رکھے، مخدوم نہ بنائے، قبلہ و کعبہ نہ بنائے کہ اس کی پرستش و پوجا شروع کر دے۔ اس کی محبت کو دل سے وابستہ نہ کرے، ایک خادم کی حیثیت سمجھے، جیسے اللہ نے اور خدمت گذار سامان پیدا کئے ہیں، یہ بھی استعمالی سامان ہے، اسے استعمال کرتا رہے اور خدا کا شکر ادا کرتا رہے، لیکن یہ کہ اپنی امیدوں کا مرکز بنا لے، جب یہ چھوڑنے پہ آتی ہے، ساری امیدیں دھری رہ جاتی ہیں۔ اس واسطے دولت اور مال کو حق تعالیٰ نے یہ حیثیت دی ہے کہ اسے دین کا ایک وسیلہ اور خادم بنایا ہے، خود مقصود نہیں رکھا۔ دنیا کا سامان انسان کا مقصود نہیں۔ مقصود دوسری چیز ہے، یہ اس کے لئے وسیلہ کا درجہ رکھتا ہے۔

حضرات صحابہؓ نے بھی یہی سمجھا۔ دولتیں کمائیں، تجارتیں کیں، زراعتیں کیں۔ اللہ نے دولت دی مگر اس کو مقصود اصلی نہ سمجھا، مقصود کا وسیلہ سمجھا۔ مقصود اصلی حق تعالیٰ شانہ اور ان کی محبت کو سمجھا۔ اس کو ایک ذریعہ اور راستہ بنایا کہ اس کے ذریعے اللہ تک پہنچیں ___ دولت مند دولت کے راستے سے اگر دین کمانا چاہے، تو کما سکتا ہے۔ ایک غریب آدمی اپنی جان اور جسم کے ذریعے دین کماتا ہے اور دولت مند دولت کے ذریعے۔ اس کو جان دی، اس کو مال دیا۔ بنایا دونوں کو وسیلہ۔

انبیاء علیہم السلام نے دولت کمانے کا حکم بھی دیا فرمایا، کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ حلال کمائی کرنا، یہ بھی ایسا ہی فریضہ ہے، جیسے نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا۔ مگر ساتھ یہ بتلایا کہ قلبی محبت کا تعلق اس سے نہ پیدا کرو۔ محبت کا تعلق صرف اللہ کی ذات سے رکھو، کام کاج کا تعلق اپنی دولت سے رکھو ؎

دل بیار و دست بکار

دل مالک کے اندر لگا ہوا ہو، ہاتھ پیر کاروبار میں لگے ہوئے ہوں۔ دل کاروبار میں نہ لگا ہوا ہو۔ دل میں اللہ کی محبت ہو۔ اس لئے کہ دل ایک پاکیزہ ظرف ہے۔ پاک ظرف میں پاک ہی چیز بھرنے کی ضرورت ہے۔ اور اللہ کی محبت سے بڑھ کر پاک چیز کوئی نہیں ہے۔ تو دل اس کا مستحق ہے کہ وہی پاک چیز اس میں بھری جائے۔ دولت حلال ہونے کی وجہ سے پاک بن جائے، مگر اپنی ذات سے کوئی اعلیٰ چیز نہیں ہے کہ قلب کے اندر بھری جائے۔

قلب فقط آخرت کا عضو ہے

وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان کے سارے بدن میں اگر آخرت کا کوئی عضو ہے' تو وہ قلب ہے۔ باقی سارے اعضاء دنیا کے ہیں۔ ہاتھ' پیر' دماغ' سر یہ سب دنیوی اعضاء ہیں۔ صرف ایک ہی عضو ہے جو آخرت کا ہے۔

اور یہ فرق کیسے معلوم ہو؟ اس طرح کہ قلب صرف حق کو قبول کرتا ہے' باطل کو کبھی قبول نہیں کرتا ___ یہ ممکن ہے کہ آپ غلط فہمی سے باطل کو حق سمجھ جائیں۔ مگر دل حق ہی سمجھ کر قبول کرے گا۔ باطل کو باطل سمجھے اور قبول کرے ، جھوٹ کو جھوٹ سمجھے اور پھر قبول کرے' مطمئن ہو جائے ایسے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ جب سچی بات دل میں آئے گی' تبھی اطمینان ہوگا۔ ملمع سازی سے آپ جھوٹ کہتے رہیں' دل کبھی مطمئن نہیں ہوگا۔ برائی کی بات کریں تو قلب مطمئن نہیں ہوگا۔ چور' چوری کرتا ہے' لیکن اندر سے اس کا دل ملامت کرتا ہے' یہ بہت بری حرکت کر رہا ہے۔ اب چاہے نفس مانے یا نہ مانے' مگر دل اعلان کر دیتا ہے کہ یہ بات بری ہے۔

آپ کسی کو بری نگاہ سے دیکھیں' دل ملامت کرے گا کہ غلط ہے' ناجائز کام ہے' بد نگاہی مت کرو۔ تو دل ملامت کرے گا' اگر آپ دیکھ لیں گے' دل میں گھٹن ہوگی کہ بہت بری حرکت ہوئی ___ تو قلب جب بھی قبول کرتا ہے' حق کو قبول کرتا ہے' باطل کو' جھوٹ کو' فریب کو کبھی نہیں قبول کرتا۔ تو اس سے زیادہ مخلص کوئی دوسرا نہیں ہے کہ سچائی کا ماننے والا ہے' جھوٹ اور باطل کا ماننے والا نہیں ہے۔

بخلاف اور اعضاء کے' وہ سچ بھی قبول کرتے ہیں' جھوٹ بھی' حلال بھی قبول کرتے ہیں' حرام بھی۔ اسی ہاتھ سے آپ پاک کمائی اٹھالیں گے اور ناجائز کمائی چوری' ڈکیتی کی وہ بھی جب اٹھائیں گے تو ہاتھ میں چبھے گی نہیں' ہاتھ اسے بھی پکڑ لے گا' دل قبول نہیں کرے گا' مگر ہاتھ قبول کر لے گا۔ حلال کی کمائی رکھ دو تب' حرام کی رکھ دو تب' دونوں کو لے کر گھر چلا آئے گا۔ منہ میں آپ کچھ ڈالیں جیسی لذت حلال چیز کے کھانے سے آئے گی' ویسی لذت حرام کمائی سے بھی آئے گی۔ مٹھائی اگر حرام کی ہے' تو یہ نہیں کہ وہ کڑوی ہو جائے۔ ویسی میٹھی لگے گی جیسی حلال کی مٹھائی۔ زبان دونوں کو قبول کر لیتی ہے' حلال کی مٹھائی کو بھی' حرام کی مٹھائی کو بھی۔ حرام کی چیز سے کانٹے نہیں چبھتے' وہ کھا جاتی ہے اور اسے ذائقہ آتا ہے ___ لیکن قلب حرام کی چیز سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے بڑی بری حرکت کی' جانے آخرت میں کیا بنے گا' کیا میری دُرگت ہوگی' ___ اسی طرح سے پیر ہیں' جس طرح سے آپ کو مسجد کی طرف لے جاتے ہیں اگر کوئی شراب کی بھٹی کی طرف جائے گا' پیر اسے بھی لے جائیں گے' پیروں میں کانٹے نہیں چبھیں گے ___ قطعاً نہیں رکیں گے' حرام موقع پر لے جاؤ' حلال موقع پر لے جاؤ' اپنی کارگزاری دکھلا دیں گے' تو ہاتھ' منہ' پیر جائز ناجائز دونوں کو قبول کرتے ہیں۔

اس آنکھ سے اگر اپنی ماں اور بیوی کو دیکھے تو پاک نگاہ ہوگی۔ لیکن اجنبی عورت کو دیکھے' ناپاک نگاہ ہوگی۔ مگر آنکھ دونوں کو دیکھ لے گی۔ اجنبی عورت کے دیکھنے میں تو وہ نہیں آئے گا۔ آنکھ کے اندر کانٹے نہیں چبھیں گے' وہ ویسی ہی لذت لے گی' جیسے حلال عورت کو دیکھنے میں لذت آتی ہے۔ لیکن دل مطمئن نہیں ہوگا۔ دل کہے گا' بڑی غلط حرکت کی' خدا جانے آخرت میں کیا خمیازہ بھگتنا پڑے ___ تو دل ہمیشہ حق کو قبول کرتا ہے' باطل کو قبول نہیں کرتا اور دل کے سوا جتنے اعضاء ہیں' حق و باطل دونوں کو قبول کرتے ہیں۔ اس

سے معلوم ہوا کہ حق کا عضو صرف دل ہے' باقی اعضاء حقانی بھی ہیں باطل پرست بھی ہیں۔ نیک بھی ہیں' بد بھی ہیں' انہیں حق بات سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے یہ فقط قلب کا کام ہے۔ تو قلب جیسے حقانی عضو میں اگر آدمی ایسی چیزیں بھرلے' جو حلال بھی بن سکتی ہوں اور حرام بھی' تو اس نے قلب کو گندہ کردیا۔ قلب میں ایسی چیز بھرنی چاہئے کہ جیسے یہ پاک ہے ویسے ہی وہ چیز بھی پاک ہو۔ وہ چیز اللہ کی محبت' علم و معرفت خداوندی اور پاکیزہ اخلاق ہیں کہ یہ حق ہی حق ہیں' ان کی جگہ قلب میں ہونی چاہئے۔ دولت کی جگہ قلب میں نہیں ہونی چاہئے' ہاتھ پیر میں ہونی چاہئے' اس لئے کہ وہ حلال و حرام اور پاک و ناپاک بھی بن سکتی ہے۔

قلب میں خالص پاک چیز آنی چاہئے۔ اہل اللہ کا مذاق ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انہوں نے کمایا' دولت ہاتھ میں آئی' لیکن دولت کو قبلہ و کعبہ نہ بنایا کہ اس کی پوجا میں لگ جائیں' اسے ایک ضرورت کا استعمالی سامان سمجھا' جائز مواقع پر خرچ کیا' حکم خداوندی کے تابع رہے ___ حاصل یہ نکلا کہ دولت کو اپنا خدا بنالینا کہ اگر وہ پاس ہے تو دل کو چین ہے اور ذرا اس میں کمی آئی' دل بے چین اور ڈانواں ڈول۔

یہ شان اللہ کی محبت کی ہونی چاہئے کہ حق تعالٰی سے ذرا بُعد ہو جائے' تو دل بے چین ہو جائے' اور قُرب میسّر آئے تو فرحت و انبساط پیدا ہو جائے۔

بازار اگر ذرا مندا پڑ جائے' لوگ پریشان ہو جاتے ہیں' اب کیا ہوگا؟ کیا بنے گا؟ جیسے معلوم ہو سارا چین و آرام چھن گیا' یہ نہیں ہونا چاہئے۔ کمانے کی چیز ہے' اسے جائز طریق پر آدمی کمائے۔ لیکن اس کو خادم سمجھے' مخدوم نہ بنائے۔ خدمت اللہ ربّ العزت کی اور اس کی محبت کی کرے۔

حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابی اور بہت بڑے تاجر ہیں۔ ان کی تجارت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا دی' تو کیفیت یہ تھی کہ روم' شام اور مصر میں جگہ جگہ ان کی تجارت کی کوٹھیاں تھیں اور مال سپلائی ہوتا تھا اور نفع کی رقم جب آتی تھی تو یہ نہیں تھا کہ ایک دو آدمی لیکے چلے آئیں۔ لاکھوں روپے کا خزانہ اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جب گھر میں رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی' تو تنگ آکے کہتے کہ بھئی! کونے میں ڈھیر لگادو۔ تو روپیہ' سونے اور چاندی کے ٹکے اس طرح چھت تک بھرے ہوتے جیسے غلہ بھر دیا جاتا ہے' تو حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کروڑپتی صحابہؓ میں سے تھے۔ مگر قلب کی کیا کیفیت تھی؟ قلب کی کیفیت یہ تھی کہ مہمانداری کثرت سے تھی' تین تین سو' چار چار سو مہمان دسترخوان پر بیٹھتے تھے اور کئی کئی قسم کے کھانے دسترخوان پر چنے جاتے' مدارات ہوتی تھی۔ جب دسترخوان پر کھانے چن دیئے گئے اور اب قریب ہے کہ کھانا شروع ہو' تو عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کا دل ایک دم روتا' آنکھوں سے آنسو جاری ___ اور فرماتے' اے اللہ! تیرے نبیؐ کے دسترخوان پر کبھی ایک سے دوسرا کھانا نہ ہوا اور عبدالرحمٰنؓ کے دسترخوان پر اتنے کھانے؟ کہیں میری جنت کی نعمتیں دنیا ہی میں تو نہیں ختم کی جارہیں؟

کہیں مجھے آخرت سے محروم تو نہیں کیا جارہا۔ یہ کہہ کر روتے۔ سارے حاضرین اور مہمان روتے۔ اس لئے کہ صحابی ہیں' صاحب دل ہیں۔ ان کے دل کا اثر دوسروں پر پڑتا۔ اب چار سو آدمی کی ساری مجلس بیٹھی رو رہی ہے' گڑگڑا رہے ہیں اور اپنی آخرت کو یاد کر رہے ہیں۔ روتے روتے بدحال ہو جاتے اور سارا دسترخوان بے کھائے پئے اٹھ جاتا۔ مہمان اور میزبان بھی فاقے سے اٹھ جاتے۔ رات کو پھر دسترخوان چنا جاتا' پھر کھانے کا وقت آتا تو بے اختیار حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کا دل دھڑکنا شروع ہوتا اور رونا شروع کرتے' اور کہتے

"اے اللہ! مہاجرین اولین اس دنیا میں اس غربت سے گئے کہ کھانے کو ان کو پانی میسّر

نہیں تھی۔ حضرت حمزہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا‘ اس غربت میں انہوں نے وفات پائی کہ کفن پورا میسر نہیں آیا‘ سر ڈھانپتے تھے‘ تو پیر کھل جاتے تھے پیر ڈھانپتے تھے‘ سر کھل جاتا تھا۔ آخر سر کو ڈھانپا گیا اور پیروں پر گھاس ڈال دی گئی‘ اس طرح سے دفن کیا‘ جن کا لقب سید الشہداء حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے“۔

تو روتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی غربت کا یہ عالم اور عبدالرحمٰنؓ کا یہ عالم کہ دس دس قسم کے کھانے چنے ہوئے ہیں۔ کہیں میری آخرت تو نہیں ختم کی جارہی ہے۔ حاضرین بھی روتے اور پھر دستر خوان بے کھائے پیئے اٹھ جاتا ___ تین تین وقت کا فاقہ اس طرح سے ہوتا تھا۔

اندازہ کیا آپ نے کہ دولت تو اتنی بے شمار کہ گھر میں غلے کی طرح سے بھری ہوئی ہے اور قلب اتنا متوجہ الی اللہ کہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا ہوش‘ مسلم کو ایسا بنایا گیا ہے۔ مسلمان کو نہ تو یہ کہا گیا کہ تو شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں میں جا کر بیٹھ‘ پہاڑوں کے دامن میں بیٹھ۔ فرمایا یہ رہبانیت ہے۔ اسلام نے رہبانیت ختم کردی۔ کمانا فرض بتلایا ہے۔ لیکن کمانے کے بعد لکھ پتی بن جائے۔ تو کیفیت یہ پیدا کردی جائے کہ ہاتھ پیر میں تو سونا چاندی رکھا ہوا ہو‘ دل اللہ میں اٹکا ہوا ہو۔ مسلمان کی یہ شان ہونی چاہئے۔

اور مذاہب میں ترک دنیا اس طرح سکھلائی گئی کہ دولت کو ختم کردو۔ اسلام میں اس طرح سے سکھلائی گئی کہ کماؤ مگر دل سے ترک کردو۔ محبت کا تعلق نہ رہے۔ یہ زیادہ حوصلہ کا کام ہے۔ دنیا کو بالکل چھوڑ کر پہاڑ میں جا بیٹھے‘ یہ آسان ہے۔ لیکن سامنے موجود ہو‘ پھر دل میں گنجائش نہ ہو‘ یہ ہر ایک کا حوصلہ نہیں۔ یہ مشکل کام ہے۔ یہ مجاہدہ مسلمان کو بتلایا گیا کہ سب کچھ لے کر پھر قلب سے بے تعلق رہے اور ہاتھ پیر سے اس طرح لگا رہے جیسے چوبیس گھنٹے اسی کام کے ہوں۔

حاصل یہ نکلا کہ دولت کتنی بڑھ جائے‘ اس کو وفادار نہیں بتلایا گیا۔ وہ دنیوی زندگی میں بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور مرنے کے وقت تو چھوڑتی ہی ہے۔ جو ایسی بے وفا چیز ہو‘ اس سے محبت کرکے آدمی کیا کرے؟ اسے غلام اور خادم بنائے رکھے‘ یہی اس کا حق ہے ___ پھر بھی اگر اس کو قبلہ بنالے‘ تو حشر یہ ہوگا‘ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال میں بیان فرمایا کہ عین مرتے وقت مال سے مدد طلب کی کہ میں نے ہمیشہ بڑے بھائی کی طرح تیری عزت کی‘ کیا تو میرے کام آئے گا؟ اس نے کہا میں تیرے کام آنے والا نہیں۔ اس وقت آدمی پچھتائے گا کہ میں نے سارا دل و دماغ کا سرمایہ اس کے اوپر لگادیا اور اس نے وفا نہ کی‘ افسوس رہا۔ تو فرمایا یہ تو بڑا بھائی ہے۔

منجھلے بھائی کا سلوک

اور فرمایا سمجھے منجھلا بھائی کون ہے؟ فرمایا وہ انسان کے بیوی اور بچے ہیں کہ انسان مرتے وقت امید کی نگاہیں ڈالتا ہے کہ شاید میری بیوی یا اولاد کام آجائے۔ میرا آخری وقت ہے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں کام آسکتے۔ تو جانے تیری قبر جانے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ تو مرجائے گا تو تجھے زیر زمین دفن کردیں گے۔ لیکن آگے تو جان‘ تیرا کام جانے۔ ہم تیرے مددگار نہیں۔ حالانکہ بیوی بچے آدمی کے وہ ہیں کہ آدمی بعض اوقات ان کی محبت میں جان بھی کھودیتا ہے‘ بعض دفعہ ایمان بھی کھودیتا ہے۔ اولاد کی صحت اور بیماری سے بچانے کے لئے بعض مرتبہ ماں باپ شرکیہ چیزیں بھی کر گزرتے ہیں۔ ٹونے اور ٹوٹکے نیز سحر اور جادو بھی کرالیتے ہیں۔ سحر حرام ہے بھی باز نہیں رہتے کہ کسی طرح سے اولاد بچ جائے‘ کسی طرح سے جان بچ جائے۔

اولاد کے لئے یہ سب کچھ کیا۔ مگر مرنے کے وقت وہ بھی ٹکا سا جواب دے دے گی کہ میں تمہارے کام کی نہیں۔ تم جانو تمہارا کام جانے ___ یہ کہے گا' میں نے عمر بھر تیرے ساتھ سلوک کیا' وہ کہے گی 'کیا ہو گا' تو نے جھک مارا' کس نے کہا تھا تجھے سلوک کرنے کو۔ اب بھگت اکیلے ہی۔ ہم تیرے کام آنے والے نہیں ہیں ___ تو فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھائی کیسا ہے۔ عرض کیا یا رسول اللہ' یہ بھائی شریف نہیں ہے۔ یہ بھی کمینہ خصلت نکلا۔

اس واسطے بیوی بچوں سے محبت ہو تو ان کی اصلاح کے لئے ہو' ان کی تعلیم و تربیت کے لئے تعلق ہو۔ بیوی کی محبت اس لئے ہو کہ اس کو بھی خدا پرستی میں لگایا جائے۔ محض نفس پرستی کی محبت ہو گی تو سب سے پہلے وہ الگ ہو کر یہ کہے گی' میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ کہے گا میں تیرا خاوند ہوں' وہ کہے گی میں نہیں جانتی۔ اب تو میں دوسرے کے گھر جانے والی ہوں یا بیٹھنے والی ہوں۔ میرا تیرا واسطہ کیا؟ ___ لیکن اگر تربیت کی اور اسے سیدھے سچے راستے پر لگایا' وہ کہے گی کہ میں ایصال ثواب بھی کروں گی' میں قبر میں بھی تجھے نہیں بھلاؤں گی۔

آخرت میں بھی نہیں بھلاؤں گی' تو مطمئن رہ میں برابر ثواب پہنچاؤں گی۔ اولاد کہے گی' میں تیرے لئے صدقہ جاریہ ہوں۔ تو نے میری تربیت کی' مجھے علم پڑھایا' عمل کے راستہ پر لگایا' آج تو جا رہا ہے' تو میرا عمل تیرے ساتھ جا رہا ہے۔ میرا صدقہ جاریہ ہونا تیرے ساتھ ہے' تو فکر مت کرنا ___ لیکن اگر محض اولاد ہی اولاد ہے' یا بیوی ہی بیوی ہے' کوئی تربیت نہیں' محض نفس پرستی اور تعیش ہی ہے اور کچھ نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرا تیرا کیا واسطہ؟ تو جانے تیرا کام جانے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' یہ منجھلا بھائی کیسا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا بالکل بیکار اور کمینہ خصلت ثابت ہوا۔

چھوٹے بھائی کا حسن سلوک

فرمایا اور سمجھے وہ تیسرا بھائی کون ہے؟ جس کے ساتھ ہمیشہ بدسلوکی کی اور اس نے کہا میں ہی آج کام آؤں گا۔ فرمایا وہ انسان کا نیک عمل ہے جس سے انسان عمر بھر بدسلوکی کرتا ہے۔ نماز کا گلا گھونٹتا ہے' یہ روز کا معمول ہے۔ نہ وقت کی پابندی نہ مسجد کی حاضری۔ کتنے انسان ہیں کہ رمضان آرہا ہے' لیکن انہیں ذرا احترام نہیں۔ بر سر بازار وہ سگریٹ پیتے اور کھاتے پھر رہے ہیں۔ بہت سے اللہ کے بندے ہیں کہ انہیں بے شمار دولت دی گئی۔ انہیں زکوٰۃ و صدقات کی طرف کوئی توجہ نہیں۔ وہ تعیش اور سینما' تھیٹر پر خرچ کریں گے' یا شراب و کباب پر خرچ کریں گے۔ تو اس میں خرچ کرتے ہیں اور نیکی کا گلا گھونٹتے ہیں۔ نہ نماز کی فکر نہ روزے کی فکر' نہ حج کی فکر ___ اور اگر یہ چیزیں سرانجام دیں' تو دل میں غرور کہ میں بڑا آدمی ہوں۔ اس لئے کہ باوجود دولت کے میں نے نماز پڑھ لی۔ معاذ اللہ اللہ پر کوئی احسان کیا۔ نماز پڑھنا چاہئے تو نہیں تھا' اس لئے کہ دولت مجھے فرصت کب دیتی ہے۔ یہ میرا احسان ہے کہ میں نے نماز پڑھ لی اور حج کر لیا۔ حج کرنے کے بعد تو گویا ساتوں جنتیں میرے قبضے کی ہو گئیں۔ اب میرے نیچے سے نکل ہی نہیں سکتیں۔ تو یا تو عمل ندارد اور اگر کرے تو غرور موجود ہے' اس سے تو نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

بہرحال نیکی کے ساتھ انسان بدسلوکی کرتا ہے۔ سوائے اس کے کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جو نیکی' تقویٰ اور طہارت کو اصل سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی نیکی کو قائم رکھنے کے لئے جان و مال کی پرواہ نہیں کرتے۔ مگر وہ

سو میں دو چار ہوتے ہیں۔ زیادہ وہی ہوتے ہیں جنہیں نیکی وغیرہ کی کوئی پرواہ نہیں۔ اس لئے کہ آخرت پیش نظر ہے ہی نہیں۔ بس یہیں کا سارا جھگڑا سامنے ہے۔

تو مرنے کے وقت جب آدمی نیک عمل کی طرف رجوع کرے گا' تو یہ نیک عمل کہے گا۔ میں ہی ہوں تیرے کام آنے والا۔ اگرچہ تو نے میرے ساتھ بوسلوکی کی۔ میں قبر میں' حشر میں' پل صراط پر تیرے ساتھ ہوں اور جنت میں بھی جو تجھے منافع ملیں گے' وہ میری وجہ سے ملیں گے۔ اس لئے وہاں بھی تیرے ساتھ ہوں۔ تو ابد الآباد تک جو چیز انسان کا ساتھ دینے والی ہے' وہ انسان کی نیکی اور عمل صالح ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب آدمی قبر میں لٹادیا جاتا ہے اور سوال وجواب میں پورا اترتا ہے' اس کی قبر جہاں تک نگاہ جاتی ہے' وسیع کردی جاتی ہے۔ اسے ایک عظیم عالم نظر پڑتا ہے' جس میں روشنی بھی ہے' چاندنا بھی ہے' تو دور سے اسے ایک شخص آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے چہرے سے خیروبرکت ٹپکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے' اسکا چہرہ دیکھ کر دل میں فرحت اور خوشی بھر جاتی ہے۔ اب وہ آہستہ آہستہ قریب آرہا ہے۔ جب قریب آتا ہے تو یہ میت پوچھتا ہے' اے شخص تو کون ہے؟ اس تنہائی کے گھرانے میں تو میرے پاس آیا۔ تیرے چہرے کو دیکھ کر مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل خوشیوں سے لبریز ہے۔ تو کون ہے جو اس بے کسی کے عالم میں میرے پاس آرہا ہے۔ وہ کہے گا تو مجھے بھول گیا' اتنی جلدی فراموش کردیا۔ **انا عملک الصالح** میں تیرا نیک عمل ہوں۔ میں تجھے تسلی دینے کے لئے آیا ہوں کہ اس تنہائی میں قطعاً مت گھبرانا' میں تیرے ساتھ ہوں۔ کوئی آنچ تجھ پر نہیں آسکتی' آئے گی تو میں اسے جھیلوں گا۔

تو عمل صالح وہ ہے جو نزع میں بھی ساتھ' قبر میں بھی ساتھ ___ حدیث میں ہے کہ نزع کے وقت خود ملک الموت علیہ السلام تلقین کرتے ہیں کہ دیکھ جان کنی کا وقت قریب ہے۔ اب بھی اللہ کرلے' اب بھی کلمہ پڑھ۔ تو نیکی کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس وقت آدمی عمل تو نہیں کرسکتا' بے بس ہے' بعض دفعہ تو زبان بھی بے بس ہوتی ہے۔ آدمی وہ بھی نہیں کرسکتا' مگر دل میں تصور کرسکتا ہے۔ اس وقت کا وہ عمل بھی کار آمد ہوجاتا ہے کہ وہ دل کے اندر توحید ورسالت اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا ورد کررہا ہے۔ تو ملک الموت بھی کہتے ہیں کہ ہاں جلدی کر۔ اس کو تلقین کرتے ہیں۔ اس لئے کہ یہی نیکی کار آمد ہوگی۔ اس وقت کی یہ نیکی بھی کار آمد ہوگی ___ تو اس وقت دولت' بیوی' بچوں کا کام نہیں کرسکتا۔ کرسکتا ہے تو صرف نیکی کا کام کرسکتا ہے۔ تو نزع میں بھی نیکی کار آمد ہوئی۔

قبر میں بھی نیکی کار آمد ہے۔ حدیث میں ہے جب میت کو قبر میں لٹادیا جاتا ہے۔ تو چاروں طرف سے عذاب اس کی طرف دوڑتا اور بڑھتا ہے۔ لیکن اگر کسی کے دماغ میں قرآن کی آیتیں محفوظ ہیں' وہ کھڑی ہوجاتی ہیں' خبردار! ادھر سے مت آنا۔ عذاب کا راستہ روک دیتی ہیں۔ دائیں طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو حدیث میں ہے کہ نمازیں کھڑی ہوجاتی ہیں کہ خبردار ادھر سے مت آنا۔ بائیں طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو روزے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ پیروں کی طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو زکوٰۃ وصدقات کھڑے ہوجاتے ہیں۔ چہار طرف سے ناکہ بندی کردیتے ہیں۔ عذاب رک جاتا ہے۔ اس طرح سے عذاب سے حفاظت کرنے والے وہاں اعمال صالحہ بنتے ہیں۔ وہاں بیوی' بچے اور رشتہ دار مدد کو نہیں پہنچتے۔ البتہ نیکی وہاں سنتری بن کے حفاظت کرتی ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جب آدمی پر پھانسی کا مقدمہ چل جائے اور تمام ثبوت بیکار ہوجائیں اور یقین ہو کہ اب پھانسی چڑھے گا۔ اس وقت دنیا کا دستور ہے کہ مجرم براہ راست بادشاہ کے سامنے مراحم خسروانہ کی

درخواست کرتا ہے کہ قانون میں تو گنجائش نہیں ہے۔ بادشاہ اگر خصوصی رحم و کرم سے مجھے چھوڑ دے' تو میری رہائی ہو سکتی ہے۔ ایسے موقع پر آدمی بادشاہ اور حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری کو پیش کرتا ہے۔

قدیم زمانے میں دستور تھا کہ اگر کسی کے گھر میں کوئی شاہی فرمان ہوتا تھا' تو لوگ مراحم خسروانہ کی درخواست پیش کرتے وقت وہ لے جا کر پیش کرتے تھے کہ ہم تو پشتینی حکومت کے وفادار ہیں' ہمارے گھر میں تو بادشاہ کا فرمان موجود ہے' ہمیں بادشاہ اور حکومت نے اپنا سمجھا تھا۔ ہم اس فرمان کو پیش کر کے نجات چاہتے ہیں۔ ہم وفادار خدام' فدوی اور غلام ہیں ___ تو دستور یہ تھا کہ شاہی فرمان ادب کے ساتھ سر پر رکھ کر پیش کیا کرتے تھے کہ یہ فرمان ہے۔ ہم حکومت کے وفادار ہیں۔ اس لئے ہم کو چھوڑ دیا جائے۔ تو ادب کی وجہ سے سر پر رکھ پیش کرتے تھے ہاتھ سے پیش نہیں کرتے تھے ___ تو علماء لکھتے ہیں کہ جب عذاب خداوندی سر کی طرف سے آئے گا تو یہ شخص جس کے دماغ میں قرآن کریم محفوظ ہے۔ یہ قرآن کریم کو پیش کرے گا کہ میں تو اللہ کی حکومت کا فرمانبردار ہوں' میں غلام رہ چکا ہوں۔ میرے گھر میں تو یہ شاہی فرمان "قرآن کریم" آیا ہوا ہے۔ میں سر پر رکھ پیش کرتا ہوں کہ اس کی بدولت مجھے نجات دی جائے اور ابدالآباد کی پھانسی سے مجھے بچایا جائے۔ تو سر کی طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو قرآن روکتا ہے۔

اسی حدیث میں ہے **الصلوٰۃ برھان** نماز انسان کی دستاویز ہے اور عدالت میں جب اپنی رہائی کے ثبوت کے لئے دستاویز پیش کرتے ہیں' تو ادباً دائیں ہاتھ سے پیش کرتے ہیں۔ گویا نماز دائیں طرف سے عذاب کو روکے گی۔ گویا یہ انسان کی دستاویز ہے۔

اسی حدیث میں ہے **الصوم جنۃ** روزہ انسان کے لئے ڈھال ہے تو جب وار روکا کرتے ہیں تو ڈھال بائیں ہاتھ میں ہوتی تھی۔ بائیں طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو روزہ مثل ڈھال کے آگے آجاتا ہے۔ تو ادھر سے بھی عذاب نہیں آسکتا ___ اور زکوٰۃ و صدقات یہ انسان کے پامزد ہیں۔ ہاتھ پیر کی کمائی ہے۔ تو پیروں کی طرف سے عذاب بڑھتا ہے تو یہ صدقات کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غرض قبر میں چار طرف سے ناکہ بندی عمل صالح ہی کرتا ہے۔

نیکی ہر عالم میں کار آمد ہو گی

حدیث میں ہے کہ آدمی جب قبر سے اٹھ کر میدان محشر میں جائے گا' تو اس کے آگے آگے لا الہ الا اللہ سر کے اوپر اللہ اکبر' دائیں طرف سبحان اللہ' بائیں طرف الحمد للہ اور پشت پر لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم ہو گا اور یہ پانچوں کلمے اس طرح سے حفاظت کرتے ہوئے لے جائیں گے' جس طرح سپاہی حفاظت سے لے جاتے ہیں اور میدان محشر کے ہولناک مناظر سے بچا دیں گے ___ بلکہ قرآن میں فرمایا گیا :

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (رعد پ۱۳ آیت ۱۱)

اللہ کی طرف سے آگے' پیچھے' دائیں اور بائیں کچھ چیزیں ہوں گی۔ جو اللہ کے امر سے حفاظت کریں گی۔ وہ مُعقّبٰت یہ **تسبیحات** ہوں گی۔ اللہ کے نام اور کلمات ہیں جن کے ذریعے سے آدمی بچے گا' تو محشر میں بھی عمل صالح ہی کام آیا۔ قبر و نزع میں بھی عمل صالح کام آیا۔

زندگی میں بھی اگر کام آتا ہے تو یہی عمل آتا ہے۔ اگر کوئی شخص متقی ہے اور وہ اتفاق سے کسی مصیبت میں پھنس جائے تو لوگوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ کہا کرتے ہیں کہ بھائی غریب آدمی ہے' بے چارہ پھنس گیا مصیبت میں' یہ کوئی چور ڈاکو نہیں' کبھی برائی نہیں کرتا تھا' آج اس پر مقدمہ قائم ہوا ہے'

معلوم ہوتا ہے کسی دشمن نے شرارت کی ہے۔ یہ اپنی ذات سے برا نہیں۔ تو نیک آدمی کو دنیا بھی اچھا کہتی ہے اور بد آدمی کو دنیا بھی برا کہتی ہے۔ تو نیکی اور تقویٰ دنیا میں بھی کام آتا ہے۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق پ ۲۸ آیت ۳-۲)

جو اللہ سے ڈرتا ہے، نیکی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مشکلات میں اس کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکال دیتا ہے۔ وہ حیران ہوتا ہے کہ میں تو ہر طرف سے پھنس چکا تھا۔ یہ کہاں سے راستہ پیدا ہو گیا۔ اللہ کی طرف سے اس کی نیکی اور تقویٰ کی وجہ سے مدد ہوتی ہے۔

وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ جب رزق کے دروازے ہر طرف سے بند ہو جاتے ہیں، اگر آدمی نیک اور متقی ہے، تو ایسے راستے سے رزق بھیجتے ہیں کہ وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ اس راستہ سے رزق آئے گا۔

تو دنیا میں، مرنے کے وقت اور قبر میں بھی حتیٰ کہ حشر میں بھی نیکی ہی کام آئی۔ اس کے سوا کوئی چیز کہیں کام نہیں آتی ___ بلکہ بیوی اور بچے بھی جبھی کام آتے ہیں، جب ان کے اندر نیکی پیدا کر دی جائے۔ وہ بد مزاج ہوں تو بیوی وبال بن جاتی ہے۔ اولاد اگر بری پیدا ہوئی تو وہ ایک مستقل مصیبت بن جاتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی ہے :

اَللّٰهم انى اعوذبک من ولدٍ یکون علیّ وبالاً۔

اَللّٰهم انى اعوذبک من امراةٍ تشیّبنی قبل المشیب۔

اے اللہ! ایسی عورت سے پناہ مانگتا ہوں، جو بڑھاپے سے پہلے مجھے بوڑھا کر دے۔ یعنی رات دن اتنا ستائے کہ میں غم میں گھل گھل کر وقت سے پہلے بوڑھا ہو جاؤں اور ایسی اولاد سے بھی پناہ مانگتا ہوں جو میرے لئے عذاب اور وبال بن جائے کہ نہ چھوڑ کے بن پڑتی ہے نہ پکڑ کے بن پڑتی ہے۔ چھوڑ کے دھکا بھی نہیں دے سکتے کہ اولاد ہے۔ رکھے تو رات دن اس کی بد مزاجی کی وجہ سے مصیبت میں گرفتار۔ اولاد و بیوی وبال جان بنتی ہیں۔ راحت کا ذریعہ کب بنتی ہیں؟ جب ان کو نیکی کا راستہ دکھایا جائے۔ تو یہاں بھی نیکی ہی کام آئی۔ اولاد اور بیوی کام نہیں آئی۔

حدیث میں ہے کہ چند چیزیں ہیں جن کے صدقہ جاریہ کا ثواب آدمی کو پہنچتا رہتا ہے۔ جیسے کنواں، سرائے یا مسافر خانہ بنوا دیا۔ تو جب تک لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے، آرام حاصل کریں گے۔ اسے ثواب ملتا رہے گا۔ یہ ابدی صدقہ ہے۔ کسی نے مسجد و مدرسہ بنوا دیا۔ جب تک لوگ اس میں پڑھیں گے، عبادت کریں گے اجر و ثواب بنانے والے کو ملتا رہے گا۔ یہ صدقات جاریہ ہیں۔ فرمایا گیا سب سے بڑا صدقہ جاریہ انسان کی نیک اولاد ہے۔ جس کو آدمی سچے راستے پر ڈال دے۔ جب تک وہ نیکی کرے گی، اس کی نیکی کو دیکھ کر کوئی اور نیکی پہ چلے گا، تو جو سب کو اجر ملے گا، وہ تنہا اس شخص کو ملتا رہے گا۔ جس نے اولاد کو صالح بنایا، دین سکھلایا، علم دین پڑھایا، ان کی نیکیاں دیکھ کر محلہ والے، شہر والے نیک بن گئے۔ تو سب کو مل کر جتنا ثواب ملے گا، اس تنہا کو ملے گا، جس نے یہ راستے پیدا کیا ___ تو اولاد صدقہ جاریہ کب بنتی ہے جب نیکی کے راستے پر ڈال دو۔ تو فی الحقیقت نیکی ہی کام آئی۔ اولاد کام نہیں آئی۔ بیوی کب راحت بنتی ہے، جب اس کے ماں باپ نے اس کے اخلاق درست کر دیئے ہوں۔ اس کو صحیح تربیت دی ہو کہ وہ اپنے خاوند اور سسرال کے لئے راحت کا ذریعہ بنے۔ تو راحت عورت نے نہیں پہنچائی، اس کی نیکی نے پہنچائی۔

حاصل یہ نکلا کہ عمل صالح دنیا میں، قبر میں اور آخرت میں بھی کام دے گا۔ نہ بیوی نہ اولاد نہ رشتہ دار اور دولت کام آئیں گے۔ وہ تو بڑے اور منجھلے بھائی ہیں جو وقت کے اوپر جواب دیں گے۔ یہ بے چارہ عمل

صالح ہی چھوٹا بھائی ہے۔جو ہر جگہ کام دیتا ہے۔

تو اس مثال سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنا باریک مسئلہ حل فرمادیا۔ اولاد اور دولت کی پوزیشن بھی بتلادی اور عمل صالح کی بھی۔ اگر ویسے حجت و برہان سے سمجھایا جاتا تو شاید میری اور آپ کی سمجھ میں نہ آتا۔ مثال دے کر سمجھایا تو بات بالکل عیاں ہوگئی اور کھل گئی ــــ یہ انبیاء علیہم السلام کی خاص علمی قوت ہے کہ باریک مسائل کو مثالوں کے ذریعے واضح فرمادیتے ہیں۔ تو عمل صالح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے عمدہ طریق پر واضح فرمادیا۔ اس کی حیثیت کھل گئی اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا،

عمل صالح کی ضرورت

وَقُلِ اعْمَلُوْا اے لوگو! عمل کرو، محض باتیں نہ بناؤ، محض معلومات میں اضافہ مت کرو۔ یہ ایک قسم کا تعیش ہے، یہ ذہن کی عیاشی ہے، یہ کارآمد نہیں ہوگی۔ علم کو اپنے اندر سمو کر عمل صالح کا راستہ بناؤ۔ یہ کارآمد ہوگا۔ تو اے پیغمبر! فرمادیجئے، اے لوگو! عمل کرو ــــ فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ یہ جو تم عمل کررہے ہو، یہ رائیگاں جانے والا نہیں ہے اسے عنقریب اللہ اور اس کے رسول اور مؤمنین بھی دیکھنے والے ہیں۔ قیامت کے دن مسلمانوں کے سامنے بھی تمہاری زندگی آئے گی۔ اللہ کے سامنے اعمال پیش ہوں گے۔

انبیاء علیہم السّلام اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے سامنے اعمال پیش ہوں گے کہ یہ ہیں آپ کی اُمّت کے اعمال اور اوّلین و آخرین جتنے ایمان والے ہیں، سب کے سامنے ہر ہر شخص کی زندگی آئے گی۔ تو فرمایا گیا، ایسے موقع سے غافل مت رہو، جس میں ساری چیزیں کھلنے والی ہیں۔ اگر ہماری کوئی برائی ہو اور ہمارے گھر والوں کے سامنے آجائے۔ تو ہم منہ چھپاتے پھرتے ہیں کہ گھر والوں کی نگاہ میں بھی ہماری ذلّت ہوگی اور گھر والوں سے گزر کر محلے والے بھی جان لیں، تو اور زیادہ شرمندگی ہوتی ہے اور محلے سے گزر کر پورے شہر میں پھیل جائے کہ فلاں صاحب نے یہ کرتوت کی، تو گھر سے نکلنے کا منہ نہیں ہوتا۔ تو دوسروں میں ذرا ہماری بدی پھیل جائے، زندگی اجیرن ہو جاتی ہے ــــ اور جب خدانخواستہ اوّلین و آخرین کے سامنے ہماری برائی آگئی، آدمؑ کی ساری اولاد دیکھے گی۔ اس میں مسلم و کافر اپنے اور پرائے سب ہی ہیں۔ ہر ہر شخص علی رؤس الاشہاد دیکھے گا کہ فلاں نے یہ حرکت کی تھی۔ اس وقت شرمندگی کا کیا حال ہوگا؟ اس وقت انسان کی خفت وندامت کا کیا عالم ہوگا؟ تو اس وقت سے بچنے کی ضرورت ہے:۔ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اس دن سے ڈرو جب سب ربّ العالمین کے سامنے کھڑے حساب دیتے ہوئے ہوں گے:

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ (مائدہ پ۷ آیت ۱۰۹)

جب قیامت کے دن اللہ، رسولوں کو جمع کریں گے اور فرمائیں گے جب تم نے ہدایت کی، اُمّتوں نے تمہارے سامنے کیا کیا جواب دیئے ــــ اور وہ کہتے ہوئے ہوں گے کہ فلاں نے میری بات مانی اور فلاں نے نہیں مانی۔ فلاں طبقے نے سنا اور فلاں طبقے نے میرے کہنے کو بالکل اکارت کردیا۔ اس وقت کی رسوائی، شرمندگی اور فضیحت کتنی بڑی ہوگی، اس کا کوئی اندازہ یہاں بیٹھ کر نہیں کیا جاسکتا۔

روز کے روز محاسبۂ اعمال کرتے رہنا چاہیے

اسی واسطے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:

حاسبوا قبل ان تحاسبوا۔

اس سے پہلے اپنی زندگی کا حساب لے لو' وہاں حساب لیا جائے ___ اس سے پہلے اپنے کچے چٹھے کو درست کرلو۔ جو وہاں پر خدا کے اکاؤنٹنٹ ہیں' وہ تمہارے حساب کو جانچیں۔

اگر یہ معمول بنالیا جائے' تو کوئی بڑی بات نہیں۔ عمر بھر کی باتیں آدمی کو یاد نہیں رہتیں۔ لیکن روز کی بات تو روز یاد رہتی ہے۔ اگر چارپائی پر لیٹ کر آدمی عشاء کے بعد ایک وقت مقرر کرلے کہ لیٹ کر دس منٹ کے لئے سوچے' دن میں کتنی بدیاں کیں اور کتنی نیکیاں کیں۔ اگر نیکیاں سمجھ میں آئیں تو اللہ کا شکر کرے' کہ یہ محض اللہ کا فضل ہے جو مجھے نیکی کی توفیق دے دی' ___ تو وعدۂ خداوندی ہے کہ جس نعمت پر شکر کرو گے' اس نعمت کو بڑھاتا جاؤں گا۔ نیکی پر شکر کرو گے' نیکی بڑھتی جائے گی اور دن بھر میں جتنی بدیاں کی ہیں' وہ بھی آدمی سوچ لے۔ جو بدی سامنے آئے' گڑگڑا کے اللہ کے سامنے توبہ کرے کہ اے اللہ! میرے سے غلطی ہوئی۔ اگر اللہ کا حق تھا' توبہ کرلے' امید ہے کہ معاف ہو جائے گا۔ اگر مخلوق کا حق تھا' اگلے دن حق کو ادا کروے' کسی کا روپیہ مار لیا تھا' اسے دے دے۔ کسی کو گالی دی تھی یا غیبت کی تھی' اس سے معافی مانگ لے حقوق اللہ ضائع کئے ہیں تو توبہ سے معاف ہو جائیں گے۔

حقوق العباد ضائع کئے ہیں' توبہ کرے اور صاحب حق سے معافی مانگ لے۔ اگر روز کے روز کچا چٹھا صاف ہوتا رہا' آدمی کو مرنے کا غم نہیں ہوگا۔ مرنے کے وقت حساب صاف ہوگا' کوئی دشواری نہیں ہوگی۔

اور اگر روز کے روز نہ کیا' آج پچاس بدیاں کیں' وہ جمع ہو گئیں۔ کل اور کیں' ایک تہہ اور چڑھ گئی۔ تیسرے دن اور بیس پچاس کیں' تو ایک تہہ اور چڑھ گئی۔ مرنے کے وقت ظلمتوں کے سیاہ پردے سامنے پڑے ہوئے ہوں گے۔

کس طرح سے آدمی انہیں دھوئے گا' اگر ایک کپڑے پر دھبہ پڑ جائے' جبھی کپڑا صابن سے دھووے کپڑا صاف اور اگر دھبے پڑتے پڑتے مہینے بھر میں سارا کپڑا سیاہ ہو گیا' تو سارے بازار کا صابن خرچ کرکے بھی دھبے نہیں جائیں گے۔ وہ تو کپڑا ہی کالا ہو گیا۔ اس واسطے آدمی روز کے دھبے دھولے۔ تو صاف ہو جائیں۔ ان کو جمع نہ کرے۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا اگر کوئی بدی کرے تو بدی کے ساتھ ساتھ توبہ بھی کرے تاکہ وہ مٹ جائے' نامۂ اعمال درست ہو جائے۔ جمع واصرار اس کے اوپر نہ کرے' تو یہ کوئی مشکل بات نہیں کہ روزانہ اپنے نفس کا محاسبہ کرلیا کرے۔ سونے کے وقت دس منٹ مقرر کرے کہ آج میں نے کتنی نیکیاں کیں۔ کتنی بدیاں کیں۔ نیکیاں یاد آئیں تو شکر کرے اور بدیاں یاد آئیں تو توبہ کرے۔ جب روز توبہ ہوتی رہے گی' بدیاں مٹتی رہیں گی۔ تو آدمی ہلکا پھلکا رہے گا۔ بڑی آسانی سے موت کے لئے منتظر ہو جائے گا اور موت کے تصور سے کوئی گرانی نہیں ہوگی۔

نیکی سے امید اور بدی سے مایوسی پیدا ہوتی ہے

اس لئے کہ نیکی کرنے سے امید پیدا ہوتی ہے' بدی کرنے سے مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ جو ملازم ہمیشہ نالائقیاں کرتا ہے' اسے مایوسی ہوتی ہے کہ مجھے کچھ نہیں ملنا ملانا' بس آقا کی طرف سے جوتیاں پڑیں گی اور جو کام عمدہ کرتا ہے' اسے تمنا رہتی ہے کاش میرے سے کوئی پوچھے' تو نے کیا کام کیا تاکہ میں بتاسکوں کہ میں نے یہ کیا یہ کیا۔ مجھے انعام ملے گا' تنخواہ بڑھے گی' مالک کے دل میں میری قدر بڑھے گی۔ تو نیکی کرنے سے امیدیں

بندھتی ہیں۔ حق تعالیٰ سے ملنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے اور بدیاں کرنے سے مایوسی پیدا ہوتی ہے' گھٹن پیدا ہوتی ہے اللہ کے سامنے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ نیک آدمی تمنا میں رہتا ہے کہ کب موت آئے اور مجھے بدلے ملیں اور بد آدمی مایوس ہوتا ہے کہ کسی طرح سے موت نہ آئے' اسے مرنا بھی موت ہو جاتا ہے۔

اسی واسطے کفار کے بارے میں فرمایا گیا' چونکہ انہیں مایوسی ہوتی ہے' کیونکہ وہ کفر میں مبتلا ہیں۔ آخرت کی کوئی توقع نہیں ہے۔ اس لئے انہیں مرنا بھی بھاری ہے وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ تم ان کو اس زندگی کے اوپر انتہائی حریص پاؤ گے۔ اگر ان کی عمر پچاس برس کی ہو تو وہ چاہیں گے' ساٹھ برس کی ہو جائے۔ دنیا سے ٹلنے کا نام نہیں لیں گے۔ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ـــــ اور جو شرک میں مبتلا ہیں' وہ اس تمنا میں ہیں کہ کاش ایک ہزار برس کی عمر مل جائے۔ وہ مل جائے تو چاہیں گے کہ ایک ہزار کی اور مل جائے۔ وہ دنیا سے ٹلنا چاہتے ہی نہیں۔ اس لئے کہ آئندہ انہیں کوئی توقع نہیں۔ مایوسیاں اور ظلمتیں ان کے سامنے ہیں۔ مستقبل ان کا تاریک ہے۔

اور نیک آدمی مؤمن تو اس کے بارے میں ہے ـــــ دوسری جگہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا' یہود نے کہا تھا ہم اولیاء اللہ ہیں' تو فرمایا گیا :

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (جمعہ پ۲۸ آیت ۶)

اے یہود! اگر تم اولیاء اللہ ہو' اور تم اللہ کے دوست ہو' تو ذرا موت کی تمنا کر کے دکھلاؤ ـــــ ولی کو تو تمنا ہوتی ہے کہ کب بس اس دنیا کو چھوڑوں اور اپنے پروردگار کے پاس جاؤں۔ تم اگر واقعی ولی ہو تو ذرا موت کی تمنا کر کے دکھلاؤ۔ حالانکہ تمہاری کیفیت یہ ہے کہ موت کے نام سے تمہیں بخار چڑھتا ہے۔ تم یہ چاہتے ہو کہ بس دنیا سے کسی طرح ٹلیں ہی نہ اور ایک ولی کامل کہتا ہے کہ یا اللہ! کب وہ دن آئے کہ اس اجڑے دیار کو ہم چھوڑ کر پاک وطن میں پہنچیں گے۔

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم
راحت جاں طلبیم و زپے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے
تا در میکدہ۔ شاداں و غزلخواں بروم

وہ کہتے ہیں کہ وہ کیسا مبارک دن ہوگا کہ اس اجڑی ہوئی بستی کو چھوڑ کر ہم اس پاک وطن میں پہنچیں گے۔ غزل خواں و فرحاں و شاداں اور اللہ کے گن گاتے ہوئے اللہ کے ہاں آخرت میں پہنچیں گے۔ تو ولایت کا خاصہ یہ ہے کہ مرنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے اور بدی کا خاصہ یہ ہے کہ مایوسی بڑھتی ہے۔ خدا سے ملنے کو جی نہیں چاہتا۔

اس واسطے فرمایا مشرکین کو حیات دنیوی پر زیادہ حریص پاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ جتنی نیکی بڑھتی جائے گی' انسان کے لئے مرنا خوشگوار ہوتا جائے گا۔

یہ جو بعض اوقات ہماری کیفیت ہوتی ہے کہ ذرا سا بیمار ہوئے اور گمان ہوا کہ موت آئی تو بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں کہ کچھ کرو' کوئی تعویذ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ٹل جائیں۔ مرنا جینا یہ تو اللہ کے اختیار میں ہے۔ مگر انسان اتنا گھبرا جائے' خدا جانے کیا ہو جائے گا۔ ایک صالح اور نیک بندے کے لئے تو خوشی کا مقام ہے کہ زندہ

رہوں تو روزہ' نماز' طاعت وعبادت وغیرہ کا عمل نصیب ہوگا اور اگر مر گیا' تو اللہ کی ملاقات نصیب ہوگی' اس سے بہتر کیا چیز ہوگی۔ تو زندگی بھی خوشگوار' مرنا بھی خوشگوار۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی وفات کا جب وقت آیا تو چہرہ کھلا ہوا ہے' خوشی اور مسرت میں ڈوبے ہوئے' لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! نزع کی تکلیف ہو رہی ہے اور خوشی ایسی جیسے معلوم ہو کہ شادی ہونے والی ہے۔ فرمایا :

غداً نلقی محمداً واصحابہ۔

پس عنقریب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ سے ملاقات ہونے والی ہے۔

اسی خوشی میں جان دے رہے ہیں کہ اب وقت قریب ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہادت کے وقت خوش ہیں' روزے سے ہیں' فرمایا بس عنقریب افطار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا کر کرنا ہے۔ چند منٹ رہ گئے ہیں۔ یہ کیفیت نیکی اور تقویٰ وطہارت سے پیدا ہوتی ہے کہ موت خوشگوار بن جاتی ہے بلکہ تمنا پیدا ہو جاتی ہے۔

بہر حال روز کے روز اگر محاسبہ کر لیا جائے اور اپنی نیکیوں کو شکر کے راستے سے بڑھایا جائے اور بدیوں کو توبہ کے راستے سے ختم کر دیا جائے۔ تو موت خوشگوار ہو جائے گی۔ اگر تصور بندھے گا کہ موت آنے والی ہے تو گھبراہٹ نہیں پیدا ہوگی۔ یہ کہے گا یا اللہ! اگر میں زندہ رہوں' تب بھی تیرا ہوں' مروں تب بھی تیرا ہوں۔ یہاں تو نے زمین کی سطح پہ رکھ رکھا ہے' وہاں زمین کی تہہ میں۔ عالم دونوں تیرے ہی ہیں۔ اس لئے تیرے ہی پاس رہوں گا' مجھے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں قبر کے ہولناک حالات ارشاد فرمائے کہ منکر نکیر اس ڈراؤنی شکل میں آئیں گے۔ قبر میں یوں تاریکی اور اندھیرا ہوگا۔ مصیبت ناک صورتیں سامنے آئیں گی۔

حضرت عمرؓ نے عرض کیا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس وقت ہماری عقل بھی درست ہوگی؟ فرمایا۔ عقل تو رہے گی ___ کہا اب کوئی فکر کی بات نہیں۔ ہوتا رہے گا جو کچھ ہوگا۔ منکر نکیر سے نمٹ لیں گے۔ تو عقل سے مراد مادی عقل نہیں تھی جس سے ہوائی جہاز اور موٹر تیار کئے جاتے ہیں۔ عقل سے مراد عقل ایمانی تھی۔ یعنی ہمارا علم' معرفت' بصیرت' توکل علی اللہ اور ایمانی قوت قائم رہے گی؟ فرمایا' رہے گی۔ عرض کیا اب کوئی فکر نہیں۔ منکر نکیر کسی صورت میں آجائیں۔ وہ بھی اللہ کی مخلوق' ہم بھی اللہ کی مخلوق۔ ڈرنے کی کیا ضرورت؟ اللہ میاں سامنے ہے۔ جس سے ہم ڈر رہے ہیں۔ جو اللہ سے ڈر گیا۔ وہ پھر کسی سے بھی نہیں ڈرے گا۔ یہ توکلِ تام اور عملِ صالح کی برکت ہے کہ موت کا فکر' نہ اس کے ہولناک مناظر کا فکر۔ بس اللہ پر بھروسہ ہے۔ جب وہ چاہیں گے لے جائیں گے۔ ہم تو ان کے زیر سایہ ہیں' ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت۔

جو بادشاہ کا ملازم ہے' صاحب خاص ہو اور ہر وقت پاس رہتا ہو' اسے کوئی غم نہیں ہوتا۔ جب بادشاہ سفر کریں گے۔ تو میں ان کے ساتھ اور جب اپنے محل سرائے میں ہوں گے تو میں ان کے ساتھ ہوں۔ میرا حلوہ مانڈہ ہر وقت صحیح ہے اور ہر وقت کی عیش ہے۔ میں سفر میں بھی ساتھ' حضر میں بھی ساتھ' مجھے فکر کی کیا ضرورت؟ ___ یہی شان مؤمن کی بھی ہے کہ سفر میں دنیا کے مسافر خانے میں ہو' تب بھی تکلیف نہیں کہ مالک کی نگاہ کے نیچے ہے اور منزلِ مقصود پر پہنچ جائے' تب تو راحت ہی راحت ہے وہاں پہنچ گئے جس کے لئے سب محنتیں کیں۔

یہ سب چیزیں عمل سے بنتی ہیں۔ اس لئے فرمایا گیا:

قُلِ اعْمَلُوْا اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! اپنی امت سے فرما دیجئے کہ اے لوگو! عمل کرو۔ اس لئے کہ عمل اکارت نہیں جائے گا' سامنے آئے گا۔ فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ عنقریب اس عمل کو اللہ' اس کا رسول اور مؤمنین بھی دیکھیں گے۔ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اور قریب وقت آرہا ہے کہ تم سب کے سب اللہ کے پاس پہنچائے جاؤ گے جو غیب و شہادت کا جاننے والا ہے۔ کوئی ادنیٰ چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے ـــ اور یہی نہیں کہ محض جانتا ہی ہے' بلکہ ـــ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ وہ جتلائے گا کہ تم نے یہ یہ کرتوتیں کی تھیں۔ اگر نیکی کی ہے' تو جتلائیں گے کہ تم بڑے اعلیٰ لوگ ہو۔ بڑی اعلیٰ کارگزاری دکھلائی۔ برائیاں کی ہیں تو یہ جتلایا جائے گا کہ یہ تمہارے کرتوت ہیں ـــ تو وہ خبر دے دیں گے کہ ہاں تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے یہ چیزیں کی تھیں۔

نیکی اور بدی دنیا میں بھی نمایاں ہو کر رہتی ہے

آدمی کی نیکی اور بدی چھپی نہیں رہتی۔ دنیا میں بھی سامنے آجاتی ہے۔ آخرت میں تو آئے ہی گی۔ حدیث میں فرمایا گیا اگر ایک کوٹھڑی فرض کی جائے' اس کے اندر ایک اور کوٹھڑی' اس کے اندر ایک اور کمرہ اور اس میں ایک اور کمرہ سات کمرے اندر باہر ہوں اور کسی کمرے میں نہ دروازہ ہو نہ روشن دان ہو نہ سوراخ ہو اور ساتویں کوٹھڑی کے اندر بیٹھ کر آدمی کوئی نیک یا بد عمل کرتا ہے' اللہ اس کے عمل کو کھول کے رہتا ہے کہ مخلوق کے دل میں پڑجاتا ہے کہ فلاں نے یہ کیا۔

یہی وجہ ہے کہ نیک آدمی کو ساری دنیا نیک کہتی ہے۔ کسی نے جاکے تو اس کو نہیں دیکھا کہ اس نے کیا کیا نیکیاں کیں۔ خواہ مخواہ دنیا کی زبان پر ہوتا ہے کہ فلاں بڑا نیک ہے۔ یہ اسی لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ دلوں میں ڈال دیتا ہے اور بد ہمیشہ ساری بدیاں چھپا کے کرتا ہے۔ کوئی کسی کے سامنے آکر بدی نہیں کرتا۔ چور چوری چھپ کر کرے گا' زناکار چھپ کر زنا کرے گا۔ مگر دنیا کی زبان پر ہے کہ فلاں بڑا بدکار' سیاہ کار اور بے ہودہ آدمی ہے۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ تم نے خود اس کو یہ عمل بد کرتے ہوئے دیکھا؟ کہیں گے نہیں' دیکھا تو نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلوں کو اطلاع دی جاتی ہے۔ تو آدمی نیکی یا بدی کرے' چھپی نہیں رہتی۔

تو اللہ' اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین اس کے عمل کو دیکھیں گے۔ صرف دنیا ہی نہیں' بلکہ اللہ کے حضور میں دیکھیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ جتلائیں گے کہ تم نے یہ یہ کیا تھا اور جتلانے کے بعد پھر ثمرہ مرتب ہوگا تو نیکی کا بدلہ نیکی سے اور بدی کا بدلہ بدی سے دیا جائے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ۔ ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ سامنے آجائے گی۔ اس کا بدلہ دیا جائے گا۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔ اور ذرہ برابر بدی کی ہے' وہ سامنے آجائے گی۔ اس کا بھی صلہ ملے گا۔

عملی زندگی اختیار کرنے کی ضرورت

میں نے یہ آیت اسی واسطے اختیار کی تھی کہ عمل کی زندگی اختیار کی جائے۔ جتنے مسائل اب تک عمل میں آچکے ہیں ـــ اپنی زندگی کا جائزہ لے کر ان کو عمل میں لایا جائے اور جو نہیں آئے' ان کو معلوم کیا جائے'

تاکہ بقیہ زندگی درست کی جائے۔ یہ جب ہی ہو گا جب دل میں عملی زندگی کا فکر ہو۔ قول ہی قول یا محض باتیں کرلینا یا بنالینا یا امیدیں اور تمنائیں باندھ لینا کہ ہم تو مسلمان ہیں یوں ہو گا۔ اس سے کام نہیں چلتا۔ جدوجہد سے کام چلتا ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی انسان کے لئے اس کی سعی ہی کار آمد ہو گی۔ اس کی جدوجہد ہی کام دے گی۔ جیسے دنیا کا معاملہ ہے کہ یہاں اگر کوئی محنت نہ کرے' تجارت وزراعت نہ کرے، تو دوسروں کی محنت کام نہیں آتی۔ اپنا ہی کیا کام آتا ہے۔ دوسرا اگر خدمت بھی کرے گا' ایک دن خدمت کردی' دو دن کردی۔ ناداروں کی طرح کفالت تو نہیں کرسکتے کہ انہیں بیٹھے بٹھائے کھلائے جاؤ۔ مثل مشہور ہے کہ آنسوؤں سے گھڑے تو نہیں بھرے جاسکتے، گھڑے تو دریا ہی بھر سکتے ہیں۔ تو لوگوں کی امداد سے زندگیاں نہیں گزرتیں۔ کچھ آدمی خود کرے' کچھ کمی رہ جائے' دوسرا کردے۔ یہ تو ہوتا ہے۔ لیکن دنیا ان کی کفالت کردے جو ہاتھ پیر ہلانا نہیں جانتے۔ ایسا کوئی نہیں کیا کرتا۔ اپنی ہی سعی کام آتی ہے تو جب دنیا جیسی مردار چیز بھی بلا سعی کے نہیں حاصل کی جاسکتی۔ تو آخرت جیسی پاک چیز بلا سعی کیسے مل سکتی ہے؟ کہ وہ گھر بیٹھے خود ہی آجائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

اَنُلْزِمُکُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا کٰرِهُوْنَ ٥ (هود پ۱۲ آیت ۲۸)

کیا ہم رحمت تمہاری کمر سے چپکادیں۔ تم بھاگے چلے جارہے ہو' اور ہم پیچھے آرہے ہیں کہ بھئی رحمت لیتے جاؤ۔ دس دفعہ محنت کرو' خوشامد کرو' تب رحمت ملے گی۔ مستغنی بنتے ہو؟ ہم تو غنی ہیں' تم محتاج ہو کے غنی بنتے ہو۔ ہم غنی ہی غنی ہیں۔ ہم میں محتاجگی کا نام نہیں' غنا تو ہمارا کام ہے نہ کہ بندے کا۔

اس واسطے یہ آیت میں نے تلاوت کی' عمل کے بارے میں چند باتیں گذارش کیں اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مثال دی کہ عمل کی یہ پوزیشن ہے۔ اسی کی طرف توجہ رکھنی چاہئے۔ علم چاہے تھوڑا ہو مگر اس پر عمل پورا ہو۔ وہی انشاء اللہ دنیا و آخرت میں کام آئے گا ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نیکی کرنے اور عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین

اللّٰهم ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخسرین۔

اللّٰهم ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔ وارنا مناسکنا وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔

وصلی اللّٰه تعالیٰ علیٰ خیر خلقه محمد واله واصحابه اجمعین۔

برحمتک یا ارحم الراحمین۔

دنیا و آخرت

اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ دنیا بھی ایک برابر کا عالم ہے، آخرت بھی ایک برابر کا عالم ہے محض راہ گزر نہیں ہے کہ دنیا تو ایک راستہ ہے یہاں سے چل پڑو اور آخرت میں پہنچ جاؤ بلکہ فرمایا: الدنیا مزرعۃ الأخرۃ۔ "دنیا آخرت کی کھیتی ہے"۔ جیسا بیج یہاں ڈال دو گے، ویسا ہی پھل آخرت میں پاؤ گے۔ تو دنیا گویا کھیتی کی جگہ ہے۔ انسان کا کام بیج ڈالنا ہے۔ اچھا بیج ڈالے گا، اچھا پھل نکل آئے گا، برا بیج ڈالے گا، برا پھل ۔

گندم از گندم بروید جوز جو
از مکافات عمل غافل مشو

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ـــــ اَمَّا بَعْدُ ـــــ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ○ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ وَلِيَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ۔ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ط

احوال واقعی

بزرگان محترم!

مجھے اس وقت کوئی لمبی تقریر کرنی نہیں ہے ـــ وقت بھی تھوڑا ہے ـــ اور میں بھی اس وقت تھکا ہوا ہوں ـــ عمر کے لحاظ سے بھی ضعیف ہوں اور عوارض کے لحاظ سے بھی اس لئے زیادہ بولنے کی ہمت

ؔ جنوبی افریقہ میں یہ تقریر ارشاد فرمائی

نہیں، مختصر طریق پر اس آیت کریمہ کی روشنی میں "چند باتیں" آپ حضرات کی خدمت میں گزارش کرنی ہیں۔

تذکرۂ دنیا کا مقصد

اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے دو عالموں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک عالم دنیا اور ایک عالم آخرت۔ عالم دنیا کا ذکر اس لئے کیا کہ ہم اس میں آباد ہیں۔ ہمارے فرائض بتلانے کے لئے دنیا کا ذکر کیا گیا ہے، دنیا کو منوانے یا دنیا پر ایمان لانے کے لئے تذکرہ نہیں کیا گیا۔ اس لئے کہ ایمان غیبی چیزوں پر لایا جاتا ہے ___ "انبیاء علیہم السلام کی خبروں پر اعتماد کر کے کسی چیز کو ماننا" یہ ایمان ہے ___ آنکھ سے دیکھ کر ماننا یہ ایمان نہیں ہے یا عقل سے سمجھ کر مان لینا، اسے ایمان نہیں کہتے ___ کوئی یوں نہیں کہہ سکتا کہ میں ایمان لایا کہ دو کا دو گنا چار ہوتا ہے۔ یہ ایک عقلی چیز ہے، ایمان لانے کی چیز نہیں، محسوسات میں سے ہے ___ یا جب صبح کو آفتاب نکلے تو کوئی یوں نہیں کہے گا کہ میں ایمان لایا کہ سورج نکل آیا ہے۔ وہ ایمان لانے کی چیز نہیں وہ تو آنکھوں سے دیکھنے کی چیز ہے ___ غرض ایمان غیبی چیزوں پر لایا جاتا ہے ___ اور وہ بھی پیغمبر کے منہ پر اعتماد اور اطمینان کر کے جیسے وہ فرمائیں ویسے مان لینا اسے ایمان کہتے ہیں ___ بہرحال اس آیت کریمہ میں دنیا کا ذکر ایمان لانے کے لئے نہیں فرائض بتلانے کے لئے کیا۔

تذکرۂ آخرت کا مقصد

اور آخرت کا ذکر ایمان لانے کے لئے کیا ہے کیونکہ وہ آنکھوں کے سامنے موجود نہیں، آخرت کی پہلی منزل "عالم برزخ" ہے جسے قبر کہتے ہیں۔ اس کے حالات کو نہ عقل معلوم کر سکتی ہے نہ آنکھ دیکھ سکتی ہے ___ بجز اس کے کہ مخبر صادقؐ کی خبر پر اطمینان کیا جائے اور کوئی صورت نہیں ___ عالم آخرت کا برپا ہونا، میدان محشر کے حالات، جنت و دوزخ کا وجود، پل صراط کا وجود آج تک کسی آنکھ نے نہیں دیکھا نہ عقل سے دریافت کیا ___ اس کو ماننا یہ ایمان ہے ___ غرض دنیا کا ذکر احکام کو بتلانے کے لئے کیا گیا ہے اور آخرت کا ذکر ایمان لانے کے لئے کیا گیا ہے۔

آخرت کو عقل سے سمجھنے کا نقصان

جن قوموں نے آخرت کو عقل سے سمجھنا چاہا ہے انہوں نے بہت ٹھوکریں کھائیں اور وہ حقیقت حال نہیں سمجھ سکیں کیونکہ عقل غیبی امور کا ادراک نہیں کر سکتی ___

عقل تو ان محسوسات میں آنکھ سے دیکھی چیز، کان سے سنی چیز یا ناک سے سونگھی چیز ان میں سے کچھ نتائج نکالتی ہے ___ لیکن غیبی امور کو پالینا یا پرکھ لینا یہ عقل کا کام نہیں ہے یہ وحی کا کام ہے اور وحی ہی یہ خبر دے سکتی ہے کہ غیب کیا چیز ہے؟ عالم غیب میں کیا واقعات پیش آئیں گے؟ اس میں عقل درکار نہیں ہے نہ عقل کار آمد ہے نہ عقل اس میں چل سکتی ہے۔ غرض جن قوموں نے آخرت کو محض عقل کا نشانہ بنایا انہوں نے ٹھوکریں کھائیں۔

منکرین آخرت کا نظریہ

بعض قوموں نے تو یہ سمجھا کہ آخرت کا کوئی وجود ہی نہیں ہے صرف دنیا ہی کا عالم ہے' آگے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں جب آدمی مرگیا تو فنا ہو گیا' اب وہ نہ آئے گا نہ پہلے تھا' نہ آئندہ ہو گا' بس قصہ ختم ہوا' وہ آخرت کو مانتے ہی نہیں کہ جزا و سزا ہو گی حساب و کتاب ہو گا اور اللہ کے آگے بندوں کی پیشی ہو گی ___ وہ نہیں مانتے ___ اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام کی خبروں پر اطمینان نہیں رکھتے بلکہ وہ عقل پر پرکھتے ہیں ___ ظاہر بات ہے کہ عقل مرنے کے بعد کی چیزوں کی کوئی خبر نہیں دے سکتی اس واسطے انہوں نے انکار کر دیا ___ اور موت کے معنی "فناء محض" کے سمجھے کہ بس گیا سو گیا۔ جیسے پہلے نہیں تھا ویسے ہی آئندہ بھی نہیں ہو گا ___ غرض بعض اقوام نے ایک نظریہ یہ قائم کیا کہ جو کچھ ہے معاذ اللہ وہ دنیا ہے اور آخرت کوئی چیز نہیں۔

دنیا کو فقط "راہ گزر" ماننے کا نظریہ

بعض قوموں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ اصل آخرت ہے' دنیا اس کا راستہ ہے۔ اس سے گزر کر ہی عالم آخرت آئے گا۔ جو دنیا میں نہیں آیا' پیدا نہیں ہوا اس کے لئے آخرت بھی نہیں۔ جو دنیا میں آگیا' پیدا ہو گیا پھر اس نے انتقال کیا اس کے لئے عالم آخرت ہے ___ غرض دنیا ایک راستہ اور راہ گزر ہے' آنے والی چیز آخرت ہے۔ وہی اصل منزل و مقصد ہے وہیں جانا ہے۔ تو ایک یہ نظریہ کہ آخرت کو مانا مگر اس کے ساتھ میں دنیا کو محض ایک راہ گزر مانا۔

پہلے نظریئے کے دنیوی آثار

ان دونوں نظریات کے اقوام پر دو اثر پڑے' جنہوں نے کہا کہ فقط دنیا ہی کا عالم ہے آخرت آنے والی نہیں۔ وہاں سے تمدن کا غلو برپا ہوا۔ انہوں نے کہا کہ جب دنیا ہی دنیا ہے تو عیش اڑانے میں کوئی کمی نہ کی جائے ؎ بابر بہ عیش کوش کو عالم دوام نیست

کھانا' پینا' پہننا اور رہنا سہنا نیز کوٹھی اور بنگلے یہی ان کی دنیا ہے اور یہی انکی آخرت ہے۔ اس سے آگے کوئی چیز نہیں۔ نہ ان کو حلال اور حرام کی تمیز کی ضرورت ___ جب دنیا ہی دنیا ہے آگے کہیں جانا نہیں ___ کوئی حساب دینا نہیں ___ اس لئے جائز و ناجائز کی بحث ہی نہیں آتی۔ بس جس طرح سے ہو عیش اڑاؤ ___ اس طرح سے تمدن کا غلو اور تمدن میں مبالغے برپا ہوئے کہ فقط یہی نہیں کہ آدمی اچھا کھالے' پی لے اور اچھا پہن کر گزر کرے ___ بلکہ کھانے اور پینے میں اتنا مبالغہ اور اتنے تکلفات بھی جہاں عقل بھی نہ پہنچے' وہ تکلفات بھی پیدا کئے جا رہے ہیں۔ غرض دنیا کو سجا دینے کا نام زندگی ہے۔ وہ نہ سجے گی تو انسان کی زندگی نہیں ہے ___ تو تمدن کے مبالغے' عیش و آرام کی چیزیں' کھانے اور پینے کے سامان' رہنے اور سہنے کے سامانوں میں مبالغے اتنے ہوئے کہ پچھلوں کی عقل میں بھی نہیں آسکتے تھے کہ دنیا ترقی کر کے اس درجے پر پہنچ جائے گی' عیش و آرام کے اتنے سامان برپا ہو جائیں گے ___ غرض اس نظریئے کے تحت تمدن کا غلو پیدا ہوا کیونکہ دیانت اور دین کوئی چیز نہ رہا۔ اللہ کے آگے حاضری اور حساب دینے کا کوئی سوال نہ رہا۔ دنیا ہی دنیا رہ گئی تو جس طرح سے چاہو اس کو برپا کر لو۔ جتنا چاہو اس کو برپا کر لو' جتنا چاہو اس میں عیش اڑا لو'

بقول شاعر کہ ؎

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوام نیست

جتنی عیش اڑانی ہے اڑالو آگے کچھ نہیں ہے ___ تو تمدن ومدنیت اور تمدنی سامانوں کی افراط پیدا ہوئی۔ اسی لئے جو لوگ اس تمدن کے موجد ہیں انہیں شاید بھول کے بھی موت کا خیال نہیں آتا۔ بھول کر بھی قبریا آخرت کا کوئی تصور نہیں ___ ایک ہی تصور ہے کہ دنیا آنکھوں کے سامنے ہے بس جس طرح چاہو اسے چلالو ___ غرض ایک نظریہ تو یہ تھا اور اس کا یہ اثر پڑا کہ دین ختم ہو گیا' دنیا رہ گئی ___ آخرت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی' فقط دنیوی سامان سامنے رہ گئے۔

دوسرے نظریئے کے دنیوی آثار

دوسرا نظریہ یہ تھا کہ آخرت ہے اور وہی مقصود ہے۔ دنیا ایک راستہ ہے جس سے گزر کر جانا ہے ___ اس کا اثر یہ پڑا کہ نہ صرف یہ کہ تمدن اختیار نہ کرو ___ بلکہ جتنا جسم کو عذاب دو' جتنا اسباب عیش کو ترک کرو' جتنی رہبانیت اختیار کرو وہی آخرت بنانے والی ہے ___ تو بعض اقوام نے یہی کیا۔

چنانچہ ہم نے برما میں دیکھا کہ ان کے جو مذہبی پیشوا ہیں جنہیں ''ٹھکمو'' کہتے ہیں' وہ نہ گھر بناتے ہیں' نہ نکاح نہ شادی نہ بیاہ ___ بلکہ کھانا پینا بھی خود نہیں پکاتے' بھیک بھی نہیں مانگتے ___ ان کا کام یہ ہے کہ صبح کو وہ نکل گئے' قوم جانتی ہے کہ کھانے کے لئے آئے ہیں۔ تو ہر گھر میں کھانے سے پہلے ایک آدھ روٹی ان کے نام کی رکھ لی جاتی ہے اور کچھ سالن رکھ دیا ___ جہاں وہ آئے انہیں دیدیا۔ یہ ان کا کھانا ہے ___ پہاڑوں کی کھوہ میں رہتے ہیں ___ ایک دھوتی انہوں نے باندھ لی اور وہی اوڑھ لی ___ اور کہتے ہیں دنیا راہ گزر ہے جتنا اس میں تکلف کیا جائے گا اتنا ہی آخرت فراموش ہو جائیگی ___ اور ہے اصل میں آخرت ___ بہرحال یہاں تمدن سرے سے ختم ہو گیا ___ پہلے نظریئے کے تحت تو تمدن ہی تمدن رہ گیا تھا اور دوسرے نظریئے کے تحت سرے سے تمدن ختم ہو کر دنیا لاشی' ہیچ اور فانی بن گئی کہ اس کے اندر ذرا سا بھی آرام کرنا یہ گویا آخرت کو کھو دینا ہے۔

عیسائیت اور دنیا

عیسائیوں میں دیکھا گیا' ان کی تاریخ شاہد ہے کہ جتنا بدن کو تکلیف پہنچائی جائے اتنا ہی آخرت بنتی ہے' چنانچہ ان میں بعض رہبان دیکھے گئے' تاریخوں میں یہ موجود ہے کہ ایک گڑھا ہے اور اس میں گارا ہے' اس میں پڑے برس گزارتے ہیں اور بڑی مکھیاں انہیں کاٹ رہی ہیں' بدن کے اوپر ورم چڑھا ہوا ہے مگر وہ گارے کے اندر پڑے ہوئے ہیں اور سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم آخرت میں جارہے ہیں' دنیا سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ شادی بیاہ سے غرض نہیں' مکان بنانے سے غرض نہیں ___ اگر گرجا میں کوئی عورت ''نن'' (NUN) بن کے گئی (راہبہ) تو وہ یہ عہد کر کے جاتی ہے کہ نہ شادی کرے گی نہ بیاہ کرے گی۔ لذات دنیا سے اسے کوئی تعلق نہ ہوگا ___ مرد جاتا ہے تو وہ عہد کر کے جاتا ہے کہ نہ نکاح کرے گا نہ عورت اس کے گھر میں آئے گی' نہ گھر در ہوگا ___ غرض ایک نظریئے کے تحت تمدن اتنا برپا ہوا کہ آخرت فراموش ہو گئی ___ اور ایک نظریئے کے تحت تمدن اتنا مٹا کہ دنیا بے رونق ہو گئی ___ بس آخرت ہی آخرت پیش نظر ہے ___ وہ بنتی

ہے یا نہ بنے' یہ الگ بات ہے ___ یہ دو متضاد نظریئے ہیں ___ ایک یہ کہ دنیا کوئی چیز نہیں ہے' آخرت ہی ایک چیز ہے ___ ایک یہ کہ جو کچھ ہے دنیا ہے' آخرت کوئی چیز نہیں ہے۔

اسلامی نقطۂ نگاہ

اسلام نے یہ تعلیم دی کہ دنیا بھی ایک برابر کا عالم ہے' آخرت بھی ایک برابر کا عالم ہے۔ محض راہ گزر نہیں ہے کہ دنیا تو راستہ ہے' یہاں سے چل پڑو اور آخرت میں پہنچ جاؤ بلکہ فرمایا :

الدنيا مزرعة الأخرة۔

"دنیا آخرت کی کھیتی ہے"۔

جیسا بیج یہاں ڈال دو گے' ویسا ہی پھل آخرت میں پاؤ گے' تو دنیا گویا کھیتی کی جگہ ہے۔ انسان کا کام بیج ڈالنا ہے ___ اچھا بیج ڈالے گا' اچھا پھل نکل آئے گا' برا بیج ڈالے گا برا پھل ۔

گندم از گندم بروید جوز جو
از مکافات عمل غافل مشو

گیہوں کا بیج ڈالو گے گیہوں اگے گا' کیکر کا بیج ڈالو گے تو کانٹے دار درخت اگے گا۔ سینڈھ کا بیج ڈالو گے تو بدبودار درخت اگے گا ___ غرض جیسا یہاں کرو گے ویسا ثمرہ سامنے آجائے گا۔ تو آخرت سے دنیا بنتی ہے' یہ نہیں ہے کہ دنیا کا تعلق آخرت سے نہیں اور آخرت کا تعلق دنیا سے نہیں۔

دنیا میں رہنے کا انداز

اب یہ کہ دنیا میں کس طرح سے رہو؟

تو اسلام نے یہ نہیں بتلایا کہ تم پھٹے حال رہو' تم بھک منگے بن کے رہو گھر گھر بھیک مانگ کر معاذ اللہ اپنا پیٹ پال لیا کرو ___ فرمایا :

اليد العليا خير من السفلى۔

"اونچا ہاتھ نیچے ہاتھ سے بہتر ہے"

مانگنے والا ہاتھ وہ کم رتبہ ہے اور عطاء کرنے والا ہاتھ بہتر ہے۔

اور فرمایا :

كسب الحلال فريضة بعد الفريضة ۔

"حلال مال کا کمانا ایسی ہی فرض ہے جیسا نماز روزہ فرض ہے"۔

آدمی کا فرض ہے کہ وہ کمائے' وہ مانگ کر نہ کھائے بلکہ دس کو کھلا کر کھانے کے بھی قابل ہو اس درجے پر آئے۔ غرض مسلمان کوئی بھک منگا نہیں بنایا گیا' کوئی سائل بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ بھکاری بنے بلکہ عطاء کرنے والا بنا کر بھیجا گیا کہ دنیا کی اقوام کو کچھ دے' ان سے مانگنے کا روادار نہ ہو بلکہ معطی بنے' عطاء کرے اور وہ چیزیں دے جس کی دنیا محتاج ہے ___ ان کو دین کی طرف دعوت دے' اس دین کی طرف جس میں دنیا بھی برابر کی ہے اور آخرت بھی برابر ہے۔ حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا :

ان الله يحب ان يرى اثر نعمة على عبده ۔

اللہ اپنے جس بندے کو نعمت دے تو اسے یہ بھی پسند ہے کہ اس نعمت کا اثر بھی اس کے اوپر کچھ آنا چاہئے۔ کچھ ڈھنگ کا لباس ہو' کچھ ڈھنگ کا کھانا پینا ہو' ڈھنگ کا رہنا سہنا ہو ___ ڈھنگ سے ہو اور جمال کے ساتھ ہو ___ مبالغے کو تو روکا ہے کہ حدود سے مت گزرو۔ جیسے دین کے بارے میں فرمایا :

لا تغلوا فی دینکم۔

"دین میں زیادہ مبالغے مت کرو کہ تحمل سے باہر ہو جائے۔ اتنا ہی عمل اختیار کرو جسے عمر بھر نبھا دو"۔

اسی طرح دنیا کے بارے میں فرمایا کہ اتنا مبالغہ مت کرو کہ وہ آخرت کے بھلانے کا ذریعہ بن جائے۔ اتنی دنیا اختیار کرو کہ عیش و آرام سے گزر بسر کرو۔ دوسرے کو کھلا کر خود کھاسکو۔ یہ ضرور کرو ___ مگر اپنی آخرت کو مت بھلاؤ کہ دنیا میں اتنا منہمک ہو جاؤ کہ دل سے موت کا تصور ہی نکل جائے ___ اس سے روکا ہے ___ یہ غلو اور مبالغہ ہے۔

دولت و عبادت کا باہمی ارتباط

حدیث میں فرمایا گیا (جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے)

تم اس طرح زندگی بسر کرو اور زہد و قناعت کے یہ معنی سمجھو کہ جب دنیا سے جاؤ تو کوئی چیز پیچھے چھوڑ کے نہ جاؤ' اولاد بھک منگی ہو ___ فرمایا ___ "یہ بہتر نہیں ہے" ___ یہ بہتر ہے کہ اپنی زندگی میں اولاد کے لئے کچھ سامان کرتے جاؤ۔

یہ جبھی تو ہو گا جب آدمی کچھ کمائے گا' کچھ دولت فراہم کرے گا' کچھ بچوں کے لئے چھوڑیگا' کچھ ان کی خدمت کرے گا' کچھ عزیز و اقرباء کی خدمت کرے گا ___ ہزاروں عبادتیں ہیں جو دولت پر موقوف ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ میں دولت نہیں' آپ زکوٰۃ کیسے دیں گے؟ تو ایک فرض سے محروم ہو گئے۔ آپ کے ہاتھ میں مال نہیں حج کیسے کریں گے؟ تو حج کی دولت سے محروم ہو گئے۔ آپ کے ہاتھ میں دولت نہیں تو غرباء کی خدمت کیسے کریں گے؟ تو عطایا سے آپ محروم ہو گئے۔ غرض ہزاروں عبادتیں ہیں جو دولت پر موقوف ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ جو مساجد میں آپ نماز پڑھ رہے ہیں۔ یہ بھی تو دولت پر موقوف ہے' دولت ہاتھ میں نہ ہوتی تو اتنی خوشنما مسجد کہاں سے بنتی ___ ؟ اللہ کا گھر اتنا آراستہ کیسے ہوتا؟ اور یہ بہترین قالین کی جانمازیں جسے دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے کہ اللہ کے گھر کو سجا رکھا ہے۔ یہ دولت ہی کا تو کرشمہ ہے ___ تو دولت پر نماز بھی موقوف' حج بھی موقوف' زکوٰۃ بھی موقوف اور صدقات بھی موقوف' ہزاروں عبادتیں ہیں جو دولت پر موقوف ہیں۔ اسلام جامع دین تھا وہ دولت کو حرام کیسے قرار دیتا؟ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ آدمی کو ساری عبادتوں سے محروم بنا تا ___ اس واسطے اس سے نے حکم دیا :

کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ ۔

"حلال کی کمائی کرنا انسان کے اوپر ایسا ہی فرض جیسا نماز روزہ فرض ہے"۔

مقصد تو یہ ہو کہ میں کسی کا محتاج بن کے نہ رہوں۔ اتنا کمائے مگر اب اللہ برکت دے اور لکھ پتی بنادے تو اس کی اجازت بھی نہیں دی کہ اس مال کو ضائع کر دو یا سمندر میں بہادو اس کو اس کے مصرف میں جائز اور حلال طریق پر خرچ کرو۔ غرض حلال ہی طریق پر کماؤ اور حلال طریق پر اسے صرف کرو۔ تو یہ صرف کرنا اور کمانا یہ سب عبادت میں داخل ہو گا۔ اس لئے کہ یہ عبادت کا وسیلہ ہے۔

وسائل عبادت کا حکم

اور وسیلہ کا حکم وہی ہوتا ہے جو مقصد کا ہوتا ہے جب مقصد عبادت ہے تو اس کا وسیلہ بھی عبادت ہے۔

آپ جو نماز پڑھ رہے ہیں اس کا وسیلہ وضو ہے اس لئے وضو بھی عبادت میں داخل ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وضو پر کوئی ثواب نہ ملے ___ البتہ نیت شرط ہے۔ بلا نیت وضو کریں گے تو پاکی تو حاصل ہو جائے گی' نماز بھی جائز ہو گی مگر وضو پر ثواب نہیں ملے گا۔ جب تک آپ یہ نیت نہ کریں کہ اس لئے وضو کر رہا ہوں کہ یہ نماز کا وسیلہ ہے تو وضو بھی عبادت ہے اس لئے کہ نماز کا وسیلہ ہے۔

مسجد کی تعمیر بھی عبادت ہے اس لئے کہ نماز اور ذکر اللہ کا وسیلہ ہے۔ مسجد کے لئے زمین خریدنا وہ بھی عبادت ہے کیونکہ عبادت اور نماز کا وسیلہ ہے۔ غرض وسائل جتنے ہوتے ہیں ان کا حکم وہی ہوتا ہے جو مقاصد کا حکم ہوتا ہے۔

دنیا وسیلۂ آخرت

اسی لئے ساری دنیا مسلمان کے لئے دین کا وسیلہ بنائی گئی ہے :

ان الدنیا خلقت لکم وانتم خلقتم للاٰخرۃ۔

"دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو"۔

تو دنیا آخرت کے لئے کماؤ۔ خدمت واطاعت کے لئے ___ اور یہ ساری چیزیں عبادت میں داخل ہیں۔ غرض کمانا اور خرچ کرنا یہ سب طاعت میں داخل ہے بشرطیکہ نیت صحیح ہو اور رضائے خداوندی مقصود ہو۔

اسی لئے قرآن کریم میں بعض آیتوں میں تو مذمت کی گئی ہے اور بعض میں مدح کی گئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ۔

"یہ تمہاری اولادیں اور یہ تمہارے مال تمہارے لئے فتنہ ہیں اور آزمائش کی چیزیں ہیں"۔

تو اس سے ایک گونہ مذمت نکلی۔

دوسری جگہ حدیث میں ارشاد فرمایا :

نعم المال الصالح للرجل الصالح۔

"اچھے انسان کا اچھا مال وہ بہترین متاع اور بہترین پونجی ہے"۔

تو یہاں مال کی تعریف کی ہے ___ غرض ایک جگہ ہے مذمت اور ایک جگہ مدح ہے' مذمت اس لئے ہے کہ رضائے خداوندی اور جائز طریق پیش نظر نہ ہو۔ مدح اس لئے کہ رضائے خداوندی مقصود ہے اس کے لئے آدمی بڑھ رہا ہے اور اس کے دائرے میں رہ کر کما رہا ہے۔ وہ مال بھی مبارک اور کمانے والا بھی مبارک۔

اگر مال مطلقاً مذمت کی چیز ہوتی تو صحابہؓ میں کوئی دولت مند نہ ہوتا۔ حالانکہ ان میں لکھ پتی بھی ہیں' ان

میں کروڑپتی بھی ہیں' ہزار پتی بھی ہیں۔ اسی طرح ائمہ ہدایت کے اندر کروڑپتی' لکھ پتی لوگ موجود ہیں۔

کروڑپتی امام

آپ ہی کے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ جن کے فقہ پر آپ چل رہے ہیں' کے ہاں ریشمین کپڑے کی تجارت تھی اور یہ نہیں کہ کوئی ایک آدھ دکان لگی ہوئی ہو کہ ریشمین کپڑا فروخت ہو گیا' بلکہ کپڑے بنانے کے کارخانے تھے اور ملکوں میں کپڑا سپلائی ہوتا تھا جس کی وجہ سے امام صاحب گویا کروڑپتی تھے۔ حتیٰ کہ وفات ہوئی تو مورخین لکھتے ہیں کہ ان کے خزانے کے اندر کروڑوں روپیہ جمع تھا جس میں کچھ وصیتیں تھیں۔ ان میں سے کچھ اولاد پر تقسیم ہوا۔

تجارت میں امام ابی حنیفہؒ کی احتیاط

بایں ہمہ کمانا بھی انتہائی حلال کا تھا ___ چنانچہ ان کے واقعات میں موجود ہے کہ امام صاحب نے ایک شخص کو تجارت کے لئے وکیل بنا کر بھیجا اور فرمایا مصر میں جا کر اس مال کو بیچو۔

اول تو اس شخص نے یہ کیا کہ بیچنے میں کچھ تاخیر کی کہ ذرا مانگ کچھ بڑھ جائے اور مال کچھ گراں ہو' تب بیچوں ___ چنانچہ مہینہ بھر روکے رکھا۔ مہینہ بھر کے بعد قیمت چڑھ گئی تو ایک لاکھ کے بجائے دو لاکھ کمایا۔ کافی نفع ملا۔

دوسرا اس نے یہ کیا کہ جب مانگ بڑھی تو اس نے ایک روپیہ فی روپیہ اس کی قیمت بڑھا دی۔ گاہک زیادہ تھے تو دو لاکھ کے اڑھائی لاکھ وصول ہوئے۔

یہ رقم لا کر امام صاحبؒ کے خدمت میں پیش کی ___ امام صاحبؒ کا اندازہ یہ تھا کہ ستر' اسی ہزار روپیہ نفع ہو گا' وہاں اڑھائی لاکھ نفع سامنے آیا۔

فرمایا :اتنا نفع کیسے ہوا؟

اس نے کہا' اول تو میں نے بیچنے میں تقریباً ایک ماہ کی تاخیر کی تاکہ کچھ مانگ بڑھ جائے' کچھ گرانی ہو جائے اور اس کے ساتھ میں میں نے ایک پیسہ فی روپیہ بڑھا دیا۔

فرمایا :

> "نعوذ باللہ! ___ پہلی صورت "احتکار" کی تھی ___ جس کے معنی یہ ہیں کہ تاخیر کرو تاکہ گاہک مجبور ہو کر خریدے ___ تو گاہک کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا یہ حرام خوری ہے۔ غرض احتکار کیا جو شریعت میں ممنوع ہے کہ مال بیچنے میں اس لئے تاخیر کرو کہ اس کی قیمت زیادہ اٹھے گی۔ بلکہ اپنے وقت پر بیچو۔ عام طور سے جتنی قیمت ہے اس پر فروخت کر دو۔ مال کا انتظار میں رکھنا کہ قیمت چوگنی ہو جائے' شریعت نے اسے حرام قرار دیا ہے"۔

پھر فرمایا کہ :

> "ایک روپیہ فی روپیہ بڑھا کر تم نے غبن فاحش کیا' شریعت اس کی بھی اجازت نہیں دیتی"۔

فرمایا:

"اب یہ تو مشکل ہے کہ تمہیں اڑھائی لاکھ روپے دے کر بھیجوں کہ لوگوں کو واپس کرو' خدا جانے کوئی گاہک کہاں کا ہوگا کوئی کہاں کا ___؟ لہٰذا ایک پائی میرے خزانے میں داخل نہ کی جائے ___ ابھی اس مال کو غریبوں پر صدقہ کردیا جائے"۔

تو اڑھائی لاکھ روپے اسی وقت غریبوں میں تقسیم کردیا ___ یہ کمائی کی صورت تھی کہ انتہائی احتیاط کے ساتھ فروختگی ہوئی اور مال کمایا جاتا۔

مصارف سے مداخل کا اندازہ

جب جائز پر طریق پر مال آتا تھا اس کے بعد تو جائز ہی طریق پر خرچ بھی ہوتا تھا ___ جیسے حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ:

"میں مال کے مصارف کو دیکھ مداخل کا پتہ چلالیتا ہوں۔ جس جگہ صرف ہوتا ہے' سمجھ لیتا ہوں کہ اگر یہ اچھی جگہ ہے تو آیا بھی اچھے طریق سے ہے۔ اگر حرام جگہ صرف ہو رہا ہے تو سمجھ لیتا ہوں کہ حرام ہی کی کمائی ہے۔ غرض مصرف دیکھ کر اس کے مدخل کو پہچان لیتا ہوں کہ یہ کس طرح سے آیا ہوگا"۔

غرض امام صاحبؒ کا مال پاک اور انتہائی پاکیزہ طریق پر آتا تھا تو خرچ بھی ایسے راستوں میں ہوتا ہے۔

امام ابی حنیفہؒ کی طرف سے علماء کرام کی تنخواہیں

امام ابی حنیفہؒ نے ایک مجلس بنائی جس میں تقریباً چار' پانچ سو علماء کرام اور محض علماء نہیں بلکہ اپنے اپنے فن کے امام اس میں جمع کئے۔ کوئی تفسیر کا امام' کوئی حدیث کا امام' کوئی لغت کا امام اور کوئی فقہ کا امام۔ ان سب پر مشتمل مجلس بنائی اور فقہ کے مسائل مرتب ہونا شروع ہوئے۔ اجتہاد اور استنباط سے مسائل نکالے گئے۔ ایک مسئلہ اس مجلس میں پیش ہوتا اور ہفتوں اس پر بحث ہوتی۔ نکھر نکھرا کر جو اخیر میں نکھری ہوئی بات نکلتی وہ مرتب کرکے لکھی جاتی کہ یہ قرآن وحدیث سے قریب تر ثابت ہے ___ یہی آپ کا فقہ حنفی ہے ___ تو ان چار' پانچ سو علماء کرام کی تنخواہ امام صاحبؒ کے خزانے سے دی جاتی ___ کسی کے ایک ہزار ماہوار مقرر' کسی کے دو ہزار اور کسی کے تین ہزار اس طرح لاکھوں روپے ماہوار کا خرچ اس پر ہوتا تھا۔

امام ابی حنیفہؒ کا غرباء پر خرچ

پھر یہ الگ تھا کہ صدقات وخیرات کے اندر کوفے کے جتنے گھرانے تھے ان کی فہرستیں امام صاحبؒ کے ہاں لکھی ہوئی تھیں کہ فلاں گھر میں اتنے بڑے ہیں' اتنے بچے ہیں' اتنی عورتیں ہیں اور اتنے مرد اور غریب ہیں۔ بس روز روز کا کھا پی لیتے ہیں اور پس انداز اور پیچھے کچھ چھوٹا ہوا نہیں۔

ہر گھر میں جتنے افراد ہوتے اور کوفے کے اندر جتنے غریبوں کے گھر ہیں سب کے لئے لباس ان کی قدو قامت کے مناسب رمضان میں تیار ہوتے ___ عید کا چاند دیکھا گیا اور فجر کی نماز سے پہلے ہر گھر میں گھر

کے افراد کی تعداد کے مطابق لباس پہنچ جاتا تھا۔ تو غرباء کہتے کہ ہم غریب نہیں، ہماری عید بھی امیروں کی سی ہے۔ ابی حنیفہؒ سلامت چاہئے ـــــ غرض یہ خرچ الگ تھا کہ کوئی غریب گھرانہ خالی نہ رہتا تھا کہ ان کی عید نہ ہو۔ اعلیٰ ترین لباس جتنا اس کے مناسب حال ہے پہنچتا تھا ـــــ تو علماء پر لاکھوں کا یہ خرچ تھا اور غرباء پر یہ خرچ تھا۔

ایک مقروض سے امام صاحبؒ کا معاملہ

پھر اوپر سے قرض کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ قرض لیتے تھے۔ کسی کو پچاس ہزار کی ضرورت ہے تو امام صاحبؒ دے دیتے تھے، تیس ہزار کی ضرورت ہے تو دے دیتے تھے۔

اس میں بعض لوگ ایسے بھی تھے کہ لینے کے بعد ان کی نیت بدل گئی، دینے کو جی نہ چاہا۔ چنانچہ ایک شخص نے پچاس ہزار روپیہ کا قرض لیا۔ اب یا تو یہ کہ دینے کی قوت نہیں رہی تھی یا یہ کہ اتنی بڑی رقم کیسے واپس کردوں ـــــ تو کترانا شروع کیا۔ دیکھا کہ امام صاحبؒ آرہے ہیں تو کسی گلی میں گھس گیا۔ پھر دیکھا کہ ادھر سے آرہے ہیں تو دوسری گلی میں گھس گیا ـــــ سامنے نہیں ہوتا تھا ـــــ شرمندہ ہوتا۔

امام صاحب سمجھ گئے کہ اس کی نیت کچھ بدلی ہوئی ہے۔

امام صاحبؒ آرہے تھے وہ دیکھ کر دوسری گلی میں گھسا ـــــ تو امام صاحبؒ لپک کر اسی گلی میں گھسے اور جاکر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا ـــــ فرمایا :

"بھائی! ہم نے کیا قصور کیا جو ہم سے کترانے لگے؟ ہم کوئی اچھوت اقوام میں سے ہیں کہ ہم سے کنارے کنارے چلو؟ آخر کیا وجہ ہے؟"۔

اب وہ چپ۔ کیا کہے، دل میں چور تھا ہی ـــــ فرمایا :

"ایسا معلوم ہوتا ہے پیسہ واپس کرنے کو جی نہیں چاہتا"۔

یہ نہیں فرمایا کہ پاس نہیں ہے۔ وہ خود مالدار آدمی تھا ـــــ یہ فرمایا کہ قرض ادا کرنے کو جی نہیں چاہتا ـــــ کترانے کی یہ وجہ ہے ـــــ فرمایا :

"مال بھی ایسی چیز ہے کہ اس کی وجہ سے تعلقات خراب کئے جائیں؟ پچاس کا پچاس ہزار روپیہ بالکل معاف۔ مگر تعلقات پہ پانی نہیں پھیرنا چاہئے۔ آمدورفت ویسی ہی جاری رکھنی چاہئے۔ بالکل معاف ہے۔ تمہیں ایک پائی بھی دینی نہیں پڑے گی"۔

سینکڑوں واقعات ہیں کہ ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں قرضے معاف کردیئے۔ یہ سخاوت کا دریا جاری تھا ـــــ تو کمانا بھی انتہائی احتیاط کا اور خرچ کرنا بھی انتہائی احتیاط کا تھا۔

عبادت مالیہ کی توفیق کا معیار

اس لئے شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ میں مال کے مصرف کو دیکھ کر اس کے آنے کے راستہ کا پتہ چلالیتا ہوں۔ اگر مصرف صحیح ہے تو آیا بھی صحیح راستہ سے ہے اور اگر مصرف غلط ہے تو آیا بھی غلط راستہ سے ہے۔

مال حرام بود بجائے حرام رفت

جو ناجائز یا غیر محتاط طریق پر کمایا جاتا ہے وہ خرچ بھی ایسے ہی مصارف پر ہوتا ہے' اس مال کے لئے صحیح مصارف میں خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی جو ناجائز طریق پر کمایا گیا ہو۔

اظہار نعمت کا موقع

بہر حال میرا مقصد یہ تھا کہ اسلام نے دنیا کو لاشئ اور ہیچ نہیں قرار دیا کہ آخرت کو پیش نظر رکھو اور دنیا میں بھک منگے بن کے رہو۔ دنیا میں بالکل ژولیدہ حال ہو کر رہو اور پھٹے حال سے رہو ___ یہ نہیں فرمایا ___ بلکہ :

ان اللّٰہ یحب ان یری اثر نعمتہ علی عبدہ ۔

"جس بندے کو اللہ نعمت دے تو اللہ کو یہ بھی پسند ہے کہ اس نعمت کا کچھ اثر آئے"۔

کچھ لباس ڈھنگ کا ہو ___ کچھ کھانا بھی ڈھنگ کا ہو ___ کچھ رہنا سہنا بھی ڈھنگ سے ہو ___ اور کچھ معاشرت بھی اچھی ہو ___ یہ نہیں کہ پھٹے حال سے رہے۔

شخصی احوال قابل اتباع نہیں

اب بعض کو یہ شبہ ہو گا کہ بعض احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اللہ نے تو ٹاٹ تک پہنا ہے ___ اچھے کپڑے چھوڑ دیئے۔

وہ ان کا حال تھا اور حال قانون نہیں ہوتا ___ یہ قانون شریعت ہے۔ باقی کسی پر زہد و قناعت کا حال غالب آجائے اور وہ سارا مال و دولت صدقہ کر کے قبرستان میں جا بیٹھے' وہ اس کا حال ہے۔ اسے برا نہیں کہا جائے گا۔ وہ اپنے حال میں مگن ہے۔ لیکن اسے قانون نہیں بنایا جائے گا کہ دنیا کو اس کی دعوت دی جائے۔ دعوت اس چیز کی دی جائے گی جس کا شریعت اسلام نے حکم دیا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قانون غیبی پیش کیا' قانون وہی رہے گا۔ لوگوں کے احوال قانون نہیں بن سکتے۔ ان لوگوں کی عظمت کی جائے گی' ان کی عزت کی جائے گی' ان کے اس فعل کو بڑا سمجھا جائے گا مگر قانون نہیں بنایا جائے گا کہ اس فعل کی آپ تبلیغ کریں کہ فلاں نے سارا گھر چھوڑ دیا تھا لہٰذا تم بھی چھوڑ دو ___ غرض یہ قانون نہیں' شخصی حال ہے ___ آپ کے اندر وہ حال آجائے گا' آپ اس پر عمل کریں پھر کوئی روکنے والا نہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کا اتباع

بعض حضرات صحابہؓ میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کو اپنا مذہب قرار دیا ___ لیکن انبیاء علیہم السلام کی شان وہ ہے کہ کون ان کے قدم بہ قدم چل سکتا ہے ___ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سید الانبیاء ہیں' تو آپؐ کی زندگی اور بھی اونچی ہے اور بھی بڑھ کر ہے۔ اس لئے ہر ایک اس کے اوپر چل نہیں سکتا۔ صحابہ کرامؓ گنے چنے ہیں جو اس شان پر چلے ہیں جو خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی ذاتی شان تھی‘ اس لئے وہ شہروں میں نہیں رہ سکے۔

چنانچہ ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ___ صحابہؓ میں ان کا زہد و قناعت مشہور ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور خلافت تھا ___ یہ شام میں گئے اور شام میں تمدن و تکلفات اور کھانا‘ پینا خوب تھا وہ غربت تھوڑا ہی رہی تھی جو عربوں میں تھی۔

مکانات اور بلڈنگیں بھی ہیں‘ کھانے پینے کی بھی متعدد چیزیں ہیں‘ لباس بھی عمدہ ہے ___ اب جس کے ہاں دیکھا کہ دسترخوان پر دو کھانے تھے۔ بس ڈنڈا لے کر وہاں پہنچے اور فرمایا :

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دسترخوان پر کب دو کھانے آئے؟ ابھی صدقہ کرو"۔

صحابہؓ و تابعین ڈر کے مارے صدقہ کر دیتے تھے ___ کسی کے گھر میں ایک لباس کے علاوہ دوسرا جوڑا بھی موجود ہے۔ بس ڈنڈا لے کر پہنچ گئے کہ :

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں دوسرا جوڑا کب تھا؟ تو تمہارے لئے رکھنا کب جائز ہے؟"۔

یا کسی کے پاس کچھ پیسہ جمع ہو گیا‘ بس ڈنڈا لے کر پہنچ گئے کہ :

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کب دولت جمع تھی جو تم نے جمع کی‘ ابھی صدقہ کرو"۔

حتیٰ کہ لوگ عاجز آ گئے ___ اور حضرت عثمان غنیؓ کو لکھا گیا کہ :

"انہوں نے ہماری زندگی تنگ کر دی۔ ہم قانون شریعت پر چلتے ہیں۔ قانون میں گنجائش ہے‘ توسعات ہیں"۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کی ایک جھلک

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی تو بہت اعلیٰ عزیمت کی زندگی ہے۔ کس کی مجال ہے کہ ہو بہو اس کی پیروی کر سکے۔ ہر ایک کی قوت نہیں ___ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو یہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ :

"مغرب کی تکبیر ہوئی اور آپؐ مصلے پر تھے۔ تکبیر ہو چکی‘ نماز شروع کرانے سے پہلے ایک دم گھبرا گئے اور گھر میں تشریف لے گئے اور تھوڑے سے وقفے کے بعد تشریف لائے اور مغرب کی نماز پڑھائی"۔

صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ!

"آج خلاف عادت تکبیر کے بعد کچھ وقفہ‘ گھر میں تشریف لے گئے پھر واپس تشریف لائے۔ کچھ دیر لگی‘ کیا وجہ پیش آئی؟ ___ فرمایا : مجھے یاد آیا کہ میرے گھر کے طاق میں ایک دینار پڑا ہے اور نبی کے لئے جائز نہیں ہے کہ اس کے گھر پر رات گزرے اور سونا‘ چاندی اس کے گھر میں ہو"۔

وہ ایک دینار تھا جو سات درہم کا ہوتا ہے ___ اس کا مطلب یہ ہے ہمارے لحاظ سے دو اڑھائی روپے کا

سونا تھا ___ فرمایا :

”جا کے اسے صدقہ کیا‘ گھر کو اس سے پاک کیا تب آ کر میں نے نماز پڑھائی۔ نبی کے لئے زیبا نہیں ہے کہ نبی کے گھر پر رات گزرے اور سونا یا چاندی اس کے گھر میں ہو“۔

تو آج کون ہے جو اس ذاتی چیز پر عمل کرے کہ بیوی کا سارا زیور لے کر ابھی صدقہ کرے۔ جو کچھ تجوری میں رکھا ہے سب غریبوں کو بانٹ دے ___ یہ کس کی مجال اور کس کی ہمت ہے؟

توسعات شریعت

شریعت نے جب اجازت دی کہ زکوٰۃ دے دو‘ صدقات دے دو‘ بقیہ مال تمہارے لئے حلال ہے۔ عام لوگ تو اسی پر چلیں گے ___ اب یہ کیفیت کہ ایک پائی گھر میں نہ رہے۔ یہ جب حال ہو گا‘ جب کیفیت ہو گی اور حال کسی کا حجت نہیں بنا کرتا‘ وہ قانون نہیں بنا کرتا۔ حجت قانون شریعت ہے۔ ہاں اللہ تمہیں وہ حال دے دے۔ سبحان اللہ! تم یہ کام کرو‘ تمہاری بھی تعظیم کریں گے۔ لیکن تم قانون بنا کر اسکو اسٹیج پر پیش کرنے لگو کہ سارے گھر کی چیزیں ابھی صدقہ کر دو‘ یہ جائز نہیں ہو گا بلکہ یہ قانون کا مقابلہ ہو گا۔

بہرحال شرعی توسعات الگ چیز ہیں اور لوگوں کے ذاتی احوال الگ چیز ہیں۔ ہر کس و ناکس کے لئے جو پیغام ہو گا وہ شریعت کا قانون ہو گا۔ حال اسکے لئے حجت ہو گا جو صاحب حال ہے۔ وہ عمل کرے‘ اس کی عظمت کی جائے گی۔

اتباع بلاحال

ورنہ ایسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ ایک شیخ طریقت‘ جن کے بہت سے مرید تھے ___ شیخ بیمار ہوئے اور اطباء نے کہا اگر آپ نے وضو کیا تو بیماری بڑھ جائے گی یا کھڑے ہونے کی قوت نہیں تھی‘ تو شریعت نے اجازت دی ہے‘ انہوں نے بیٹھ کر نماز پڑھی۔

اگلے دن مریدین نے اعلان کیا کہ شیخ نے بیٹھ کر نماز پڑھی ہے لہٰذا آج سے سب لوگ بیٹھ کر نماز پڑھا کریں گے اور قیام جو فرض تھا وہ ترک کر دیا ___ یہ حرکت کی جو بالکل ناجائز تھی۔

اس لئے کہ فعل میں نقالی کی۔ نقالی فعل پیغمبر کی ہوتی ہے نہ کہ لوگوں کے فعل کی ___ پھر یہ کہ اگر نقل اتارنی تھی تو شیخ کی سی بیماری کا حال بھی اپنے اندر پیدا کرتے۔ اتنی بیماری آنی چاہئے تھی جو شیخ پر آئی تھی تو انہیں بھی بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت ہوتی ___ بیماری تو ندارد ہٹے کٹے اور فعل میں شیخ کی نقل اتاری۔ تو ایسی نقالی محض روپ بنانا ہے۔ حقیقت اس کے نیچے کچھ نہیں ہے۔ اس لئے شرعی قانون ہی سب کے لئے حجت ہے۔ اسی پر عمل کیا جائے گا۔ اسی پر چلا جائے گا۔

تعظیم صاحب حال

البتہ صاحب حال کی تعظیم کی جائے گی۔ اس پر کوئی ملامت نہیں کی جا سکتی۔ اللہ ویسا حال سب کو نصیب کر دے تو وہ خوش نصیبی ہو گی۔

توسعات شرعیہ کا دائرہ کار

بہرحال شریعت اسلام نے وسعتیں اور گنجائش دی ہے۔ صرف یہ کہا ہے کہ ایک تو حرام کے دائرے میں مت پڑو' حلال کے دائرے میں رہو۔

دوسرے یہ کہ سامانوں میں مبالغہ مت کرو۔ اتنا رکھو کہ زندگی بھی آراستہ اور اچھی ہو اور قلب بھی اٹکا ہوا نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ آدمی ان سامانوں کا بندہ بن جائے ___ ایسے شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعاء دی ہے۔ فرمایا :

تعس عبد الدرهم تعس عبد الدينار تعس عبد الخميصة ۔

''برباد ہو پیسے کا بندہ' برباد ہو گنیوں کا بندہ' برباد ہو شالی چادروں کا بندہ''۔

یعنی جس کا دل ان چیزوں میں اٹکا ہوا ہے کہ ان میں پڑ کر نہ موت یاد نہ آخرت یاد نہ فرائض یاد ___ ایسی دولت تو وبال جان ہو جائے گی ___ تو ایسے آدمی کو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعاء دی ہے ___ لیکن جائز حدود میں رہ کے۔ ''جمال پسندی'' جو انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ پھٹے حال سے رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ خوبصورتی کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ کھانا زمین پر ڈال کے اور منہ لگا کے کھالے بلکہ رکابی ہو' پھر رکابی ذرا نفیس اور کچھ اچھی بھی ہو۔ دیکھنے والوں کی نظروں میں نہ چبھے۔ تو تھوڑا بہت جائز حد تک تکلف بھی کر لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ مبالغہ نہ کرے کہ صبح کی رکابیاں اور ہوں' شام کی اور ہوں' دوپہر کی اور ___ اسی طرح رات سونے کا لباس اور' دوپہر کا اور' یہ تو لباس کی اور برتن کی بندگی ہے حالانکہ بندگی اسے اللہ کی کرنی تھی۔

دولت دنیا کی مدح وذم کا معیار

بہرحال مطلب یہ ہے کہ دولت دنیا کی مذمت بھی آئی ہے اور مدح بھی آئی ہے۔ اس دنیا کی مذمت آئی ہے جو آخرت سے غافل کردے اور اس دنیا کی مدح آئی ہے جو آخرت تک پہنچانے کا ذریعہ بن جائے۔

اسی لئے عارف رومی نے مثال دی ہے کہ جیسے ایک سمندر ہے تو کشتی جب اس میں پڑی ہوئی ہو تو پانی اگر کشتی سے باہر باہر ہے تو کشتی کے لئے مددگار ہوگا۔ کنارے پر جالگائے گا اور منزل آجائے گی ___ لیکن اگر پانی کشتی کے اندر آگیا تو کشتی بھی ڈوبی اور کشتی والے بھی ڈوبے۔ دونوں کی تباہی ہے۔

اسی طرح فرمایا کہ انسانی قلوب کشتیوں کی مثل ہیں اور دنیا کی دولت اور سامان مثل دریا اور سمندر کے ہیں۔ تو قلب سے جب تک دولت باہر رہے گی وہ قلب کو کنارے تک پہنچانے کا ذریعہ بنے گی اور اگر اندر آگئی تو قلب بھی ڈوبا اور قلب والا بھی ڈوبا۔

استعمال دنیا

مطلب یہ کہ ایک دنیا کا استعمال ہے' اس کی شریعت نے ممانعت نہیں کی۔ ایک دنیا کی محبت ہے کہ اس میں پڑ کر محبت خداوندی رہ جائے' محبت نبوی رہ جائے' اس کی مذمت کی گئی ہے۔

محبت طبعی

پھر یہ بھی ہے کہ قرآن کریم نے توسع دیا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ مال کی محبت بالکل نکال دو۔ یہ تو طبعی بات ہے کہ جب آدمی کمائے گا تو کچھ نہ کچھ اپنے مال سے محبت ہوتی ہے' اپنے گھر سے محبت ہوتی ہے' اپنے سامان سے بیوی بچوں سے محبت ہوتی ہے۔ بالکل محبت نکالنا انسان کے بس میں نہیں ہے۔

یہ تو طبیعت کا تقاضا ہے کہ جو چیز انسان کے پاس ہے اس سے تھوڑی بہت محبت ہو جاتی ہے۔ اجنبی بھی اگر پڑوسی بن جائے اور چند دن رہنا سہنا ہو تو آپس میں محبت ہو جاتی ہے۔ تو اپنے گھر اور مکان سے تو طبعاً محبت ہوگی تو قرآن کریم نے اس کی اجازت دی ہے۔

کیونکہ ایک مطلقاً محبت ہونا ہے۔ یہ ممنوع نہیں ہے۔ ایک ہے ایسی محبت ہونا جو فرائض اور واجبات میں حارج ہو جائے۔ اس سے بچو۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا :

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۔

"حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے فرمادیجئے یہ تمہارے آباء واجداد' یہ تمہاری آل واولاد' یہ تمہارے عزیز واقارب اور تمہارے بیوی اور بچے' یہ تمہاری دولت اور مال تجارت جس کی کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو کہ بازار مندانہ ہو اور رات دن جوڑ توڑ میں ہو کہ نفع زیادہ ہو اور یہ تمہاری بلڈنگیں اور مکانات جن کے اندر تم راحت اٹھاتے ہو' یہ سب چیزیں اگر "احب" بن جائیں اور اتنی محبوب بن جائیں کہ خدا اور رسول سے غفلت پیدا کریں تو عذاب خداوندی کا انتظار کرو کہ یہ دولت چھننے والی ہے"۔

لیکن اگر یہ نہ ہو کہ "احب" نہیں بلکہ مطلق محبت ہے تو وہ فطری اور طبعی ہے۔ اس کو شریعت نے نہیں روکا کہ فطرۃً اپنے مال اور گھر بار سے تھوڑی بہت محبت تو ہوگی۔ تو مطلق محبت کو منع نہیں کیا' احبیت کو روکا ہے۔

"احب" ہونے کے یہ معنی ہیں کہ مجھے صرف یہ محبوب ہے۔ نہ خدا محبوب نہ رسول محبوب نہ فرائض محبوب' نہ واجبات ــــ اس محبت کو روکا ہے۔ لیکن اگر اتنی محبت ہے جو طبعی ہے اور ساتھ میں دین کی محبت بھی دل کے اوپر چھائی ہوئی ہے کہ دولت بھی ہے اور ساتھ میں نمازیں بھی پڑھ رہا ہے۔ روزے بھی رکھ رہا ہے' حج بھی کر رہا ہے۔ اور ذکر میں بھی مصروف ہے۔ یہ دولت ممنوع نہیں نہ اس کی فی الجملہ محبت ممنوع ہے۔

دولت دین و دنیا

خدا کا شکر ہے کہ ہم افریقہ میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دولت دین بھی دی اور دولت دنیا بھی دی ہے۔ تجارتیں بھی ہیں' منافع بھی ہیں' گھر بار بھی اچھے ہیں' پہننا' رہنا سہنا اچھا ہے اور اس کے ساتھ میں مساجد بھی ہیں اور نمازیں بھی ہیں ــــ بلکہ مساجد کو اتنا آراستہ کیا ہوا ہے کہ شاید لوگوں نے اپنی کوٹھی بنگلوں کو بھی اتنا نہ سجایا ہو۔ قالینوں کی جانمازیں بچھی ہوئی ہیں۔ راحت کا ہر سامان موجود ہے۔ جتنا اپنے گھر کی فکر ہے اس

سے زیادہ اللہ کے گھر کی فکر ہے کہ وہ بھی آراستہ ہوں اور سجے سجائے ہوں۔

اللہ میاں کے بنگلے

میں نے تو یہاں آ کے کہا کہ مسجدوں کو اللہ کا گھر کہا جاتا ہے۔ میں نے کہا یہ اللہ کے گھر نہیں یہ تو اللہ میاں کے بنگلے ہیں۔ آراستہ پیراستہ قالینوں سے سجے ہوئے۔ بجلی کی روشنی اور چھتیں بھی منقش اور آراستہ ___ یہ گھر تھوڑا ہی ہیں۔ گھر تو ہم جیسوں کے ہوتے ہیں۔ یہ تو بنگلے ہیں۔

ہمارے ہاں جو مسجدیں ہیں وہ تو اللہ میاں کے گھر ہیں۔ یہاں جو مسجدیں ہیں وہ اللہ میاں کے بنگلے ہیں۔

جو بنگلے بنانے والے ہیں وہ اپنے لئے بنگلہ بنالیں تو ان کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے' کوئی مضرت نہیں ہے' جو اللہ کے گھر کو سجا رہے ہیں وہ تھوڑا بہت اپنے گھر کو بھی سجالیں' اس میں کیا حرج ہے۔ اس طرح اپنے لباس کو بھی سجالیں۔ اللہ کے گھر میں قالین بچھائے۔ اگر اپنے گھر میں بھی قالین بچھالیں تو اس میں کیا حرج ہے ___ بس یہ ہے کہ مبالغہ نہ ہو اور اتنا تعلق نہ ہو کہ اس سے دینی کاموں میں خلل پڑنے لگے۔

ورنہ اگر یہ چیز بھی ممنوع ہوتی تو صحابہؓ میں ایک بھی متمول نہ ہوتا ___ حالانکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مال دار لوگوں میں سے ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بڑے مال دار صحابہؓ میں سے ہیں۔

حضرت جابر کا تمول اور قلبی کیفیت

مگر قلب کی کیفیت کیا ہے؟

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن گھر میں تشریف لائے' کچھ اداس' غمگین اور چہرہ اترا ہوا ___ تو بیوی نے پوچھا آج آپ غمگین کیوں ہیں؟ فرمایا :

"خزانے میں دولت اتنی جمع ہو گئی ہے کہ میرے دل کے اوپر بار پڑ رہا ہے اور میرا قلب پریشان ہو رہا ہے"۔

وہ بھی صحابیہؓ تھیں ___ انہوں نے کہا پھر آپ نے کیا کیا ___؟

فرمایا :

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا"۔

فرمایا :

"گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ صدقہ کرنا شروع کردو' غریبوں کو دینا شروع کردو"۔

فرمایا : "واقعی تدبیر تو اچھی بتائی"

چنانچہ جاکر خزانچی کو حکم دیا کہ تقسیم شروع کردو۔

صبح کو جو حساب لگایا تو رات بھر میں غرباء کے اوپر چھ لاکھ روپیہ تقسیم ہوا ___ صبح کو آکر بیوی کے ہاتھ چومے کہ اللہ تجھے جزائے خیر دے' کیسی اچھی تدبیر بتائی' میرا دل ہلکا ہو گیا ___ تو اتنے دولت مند بھی تھے مگر قلب متوجہ الی اللہ تھا۔ زیادہ دولت بڑھتی تھی تو ان کے دل پر بار پڑتا تھا۔ ہمارے ہاں کم ہو جائے تو دل پر بار پڑتا ہے۔ زیادہ ہو تو خوشی ہوتی ہے۔ وہاں قصہ الٹا تھا اور واقعہ بالکل برعکس تھا۔

حضرات صحابہؓ کا مال کے بارے میں انوکھا جھگڑا

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے زمین خریدی۔ قیمت ادا کردی زمین قبضے میں آگئی۔ عمارت بنانے کے لئے جو بنیاد کھودی تو ایک بہت بڑا دیگچہ نکلا جس میں سونا اور چاندی بھرا ہوا تھا۔ گویا لاکھوں روپے کا مال نکلا ___ اسے لے کر ان کے ہاں پہنچے جن سے زمین خریدی تھی ___ اور فرمایا :

"یہ آپ کا دیگچہ ہے؟"

انہوں نے کہا

"کیسا دیگچہ ہے"۔

فرمایا :

"وہ جو زمین میں نے خریدی تھی اس میں سے نکلا ہے اور میں نے زمین خریدی تھی، دیگچہ تھوڑا ہی خریدا تھا ___ یہ آپ کا حق ہے"۔

انہوں نے کہا :

"جب میں نے زمین بیچی تھی، زمین میں تحت الثریٰ تک جو کچھ تھا وہ سب بیچنے میں آگیا۔ لہٰذا یہ آپ کا حق ہے میرا حق نہیں"۔

اب لڑائی اس پر ہو رہی ہے ___ وہ کہتے ہیں کہ آپ کا حق ہے ___ انہوں نے کہا نہیں میرا حق نہیں یہ آپ کا حق ہے۔

آخر کو وہ مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گیا ___ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"تم دونوں کی کوئی اولاد ہے؟"۔

تو ایک کے ہاں بیٹا اور ایک کے ہاں بیٹی تھی ___ فرمایا :

"دونوں کی شادی کردو اور اس میں اس دولت کو خرچ کردو! بس سکون ہو گیا"۔

ہمارے ہاں تو اس پر لڑائی ہوتی ہے کہ میرا حق ہے تمہارا نہیں ہے ___ دوسرا کہتا ہے میرا حق ہے ___ وہاں لڑائی اسپر تھی کہ آپ کا حق ہے میرا نہیں ___ دوسرے کہہ رہے ہیں آپ کا حق ہے میرا نہیں ___ ان میں اور ہم میں یہ فرق ہے ___ دولت مند وہ بھی تھے ہم بھی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان کے دل دولت کے ساتھ اللہ رب العزت میں اور محبت دین میں فانی تھے۔ ہمارے قلوب میں وہ بات نہیں ہے ___ لیکن اس حد تک کہ اگر تھوڑی بہت محبت ہو اور دین کی محبت زائل نہ ہو، شریعت نے اجازت دی ہے کہ جمع بھی کرلو اور خرچ کرلو۔ کچھ اچھا کھا، پہن لو، کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے

بہرحال مطلب یہ ہے کہ جو آیت میں نے پڑھی تھی تو اس کے ضمن میں یہ عرض کیا تھا کہ ایک نظریہ تو یہ ہے کہ دنیا راستہ ہے اور ختم ہو جانے والا ہے اور ہمیں تو گزر جانا ہے۔ چاہے چوراہے میں پڑ کے گزرے، چاہے میلے میں پڑ کے گزرے، چاہے بھیک مانگ کے گزرے۔ بس آخرت میں پہنچ جائیں گے۔ اس کا نام تو

رہبانیت ہے اور سرے سے دنیا کی حیثیت ختم ہے۔ اگر اس مذہب پر دنیا چلتی تو ویران ہوتی اور جگہ جگہ ویرانی کے اثرات ہوتے، دنیا آباد نہ ہوتی۔

اسی طرح یہ نظریہ بھی صحیح نہیں ہے کہ آخرت کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہے بس دنیا ہے لہٰذا حلال و حرام کی تمیز نہ کرو، بس کھاؤ، اڑاؤ، عیش کرو اور مزے کرو ___ اس کا بھی شریعت اسلام نے رد کیا ہے ___ اور یہ بتلایا ہے کہ :

الدنیا مزرعۃ الآخرۃ۔

"یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے"۔

جیسا بیج ڈال دو گے، ویسا ہی آخرت میں پھل کما لوگے۔ اگر دولت کا بیج پاک مصرف میں ڈالا ہے تو وہاں پاک ثمرات اور پاک پھل نمایاں ہوں گے ___ ناپاک جگہ میں ڈالا ہے، بیج بھی ناپاک اور وہاں کانٹے دار درخت ملیں گے اور "زقوم" وغیرہ ملے گا جس کا تحمل کرنا مشکل ہوگا کیونکہ وہ عذاب کی صورت اختیار کرے گا۔

غرض دنیا کو نہ تو راستہ بتلایا کہ بھئی! مسافری کی طرح گزر جاؤ نہ کماؤ نہ دھماؤ اور نہ ہی اصل قرار دیا بلکہ کھیتی قرار دیا جس میں "بونا" ضروری ہے۔

کاشتکار کا فریضہ

ظاہر بات ہے کہ جب کاشتکار بوئے گا تو کچھ نہ کچھ محنت تو کرنا پڑے گی، خون پسینہ ایک رنگ بھی کرنا پڑے گا، بیج بھی ڈالنا پڑے گا، پانی بھی دینا پڑے گا۔ اچھی خاصی محنت اٹھانا پڑے گی ___ تب جا کے وہ چھ مہینے غلہ کمائے گا اور اس سے پھر پیسہ کمائے گا ___ غرض دنیا کو فرمایا یہ کھیتی ہے اور تم کاشتکار ہو۔ کاشتکار کا یہ کام نہیں ہے کہ گھر پر پڑا رہ جائے، ورنہ پھر لوگ غلے لے کر آئیں گے تو وہ بیٹھ کر روئے گا اور کہے گا کہ میں بیج ڈالتا تو میں بھی غلہ کماتا۔ اس وقت حسرت میں مبتلا ہوگا ___ لہٰذا حکم دیا کہ دنیا میں رہو اور کچھ کام کرو۔

مقام آخرت

اور اس دنیا ہی سے اپنی آخرت پیدا کرو۔ اس لئے یہ تصور نہیں ہونا چاہئے کہ دنیا یہ عالم ہے اور آخرت ساتویں آسمان پر رکھی ہوئی ہے بلکہ آپ کی آخرت اسی دنیا میں سے نکلے گی۔ نکالتے رہو۔ انہی افعال میں سے نکلے گی جو ادا کر رہے ہو۔ نیت اچھی ہونی چاہئے، اتباع سنت ہونا چاہئے۔ اسی دنیا میں سے آخرت پیدا ہوگی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ آدمی دسترخوان پر بیٹھے بسم اللہ سے شروع کرے اور الحمد للہ کثیراً پر ختم کرے :

غفرلہ ماتقدم من ذنبہ۔

"اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے"۔

تو کھائی تو روٹی اور گناہ بخش دیئے گئے تو اس روٹی سے ہی آخرت نکلی۔ اگر روٹی نہ کھاتا اور سنت طریق پر حمد و ثناء سے ابتداء و انتہاء نہ کرتا تو یہ مغفرت گناہ کا وعدہ کہاں سے ہوتا ___؟ تو روٹی میں سے آپ کی آخرت نکلی۔

اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص شفقت و محبت اور پیار سے یتیم کے سر پر ہاتھ

رکھدے تو جتنے بال ہاتھ کے نیچے آئیں گے اتنی نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں لکھ دی جائیں گی ___ دیکھا جائے تو یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنا تو ایک دنیوی فعل ہے ___ مگر نیت کی سچائی سے نیکیوں کے اضافے کا ذریعہ بن گیا۔ اگر یتیم کے سر پر ہاتھ نہ رکھتا یا اسے دین نہ جانتا تو بالوں کے برابر نیکیاں کہاں سے آتیں؟ ___ تو یتیم کے سر میں سے آپ کی آخرت نکلی اور آپ کے ہاتھ میں سے آخرت نکلی۔ آپ یہ ہاتھ یتیم کے سر پر نہ رکھتے تو نیکیوں میں یہ اضافہ نہ ہوتا۔

حدیث میں فرمایا گیا اگر کسی شخص نے صدقہ کیا اور "زوج" بنا کے صدقہ کیا' یعنی پیسہ دیا تو ایک نہیں بلکہ دو دیئے' روپیہ دیا تو ایک نہیں بلکہ دو دیئے' کپڑا دیا تو ایک نہیں بلکہ دو دیئے :

من انفق من کل شئی زوجین۔

"ہر چیز میں سے جس نے جوڑا جوڑا صدقہ دیا"۔

تو فرماتے ہیں ___ جنت کے آٹھوں دروازے اس کے لئے کھلے ہوئے ہیں' جس میں سے چاہے داخل ہو جائے ___ تو دنیا میں دو چیز کا' یعنی جوڑے کا صدقہ کیا' اس سے ہی تو آخرت بنی۔ تو آخرت آپ کے فعل سے نکلی۔ آخرت کہیں الگ تو نہیں رکھی ہوئی تھی۔؟

بہر حال دنیا آخرت کے کمانے کا ذریعہ ہے اور اس دنیا ہی میں سے آپ کی آخرت نکلے گی۔

تجارت میں مخفی آخرت

آپ تجارت کر رہے ہیں' نیت صاف رکھیں۔ یہ تجارت آخرت کا ذریعہ بنے گی' چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا :

التاجر الصدوق الامین مع السفرة الکرام البررة۔

"ایک سچا تاجر جو امانت دار ہو اس کا حشر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہو گا' جنتوں میں ان کے ساتھ جائے گا"۔

کتنی بڑی فضیلت ہے۔ اگر دیانت کے ساتھ تجارت نہ کرتے تو یہ فضیلت ان کو کیسے ملتی؟

اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا :

غفر اللہ لرجل کان سھلاً اذا اشتری سھلاً واذا باع سھلاً۔

"اللہ اس شخص پر مغفرت اور رحم کرے جو شفقت کے ساتھ خریدتا ہے اور شفقت کے ساتھ بیچتا ہے"۔

بیچنے میں اس کا جذبہ یہ ہے کہ میرے گاہک کو نقصان نہ ہو۔ گاہک خریدتا ہے تو اس کا جذبہ یہ ہے کہ میرے تاجر کو نقصان نہ پہنچے۔ دونوں کے دل میں نیک جذبہ ہے تو دونوں کے لئے دعا دی کہ :

غفر اللہ لرجل۔

"اللہ اس کی بھی مغفرت کرے جو رحمدلی سے بیچ رہا ہے اور اللہ اس کی بھی مغفرت کرے جو رحمدلی سے خرید رہا ہے"۔

اگر یہ تجارت نہ ہوتی تو یہ آخرت کا وعدہ آپ کے لئے کہاں سے پورا ہوتا ___؟ اسی میں سے تو آخرت نکلی ہے' یہ نہیں ہے کہ آخرت کہیں عرش کے نیچے چھپی ہوئی ہے اور دنیا یہاں ہے ___ اسی دنیا میں

آخرت چھپی ہوئی ہے۔ نکال لینا آپ کا کام ہے۔ جیسے اسی زمین کے اندر یہ پھل پھول چھپے ہوئے ہیں' نکال لینا کاشتکار کا کام ہے کہ بیج ڈالتا ہے' پانی ڈالتا ہے پھل نکالتا ہے ___ اگر وہ یہ سمجھتا کہ یہ تو زمین ہے اور یہ جو پھلوں کی دنیا ہے یہ آسمان پہ رکھی ہوئی ہے' وہاں سے پھل برسیں گے تو کبھی بھی اسے پھل نہیں ملیں گے۔ اسی زمین پر محنت کرنی پڑے گی ___ تو انسان دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ دنیا کو رد کر کے پس پشت ڈال دے بلکہ اس سے اپنی آخرت کا کام لے ___ ہر چیز سے کام لے ___ حیات سے بھی کام لے' موت سے بھی کام لے۔

موت میں مخفی آخرت

چنانچہ جب انسان کا کوئی عزیز گزر جاتا ہے تو طبعی طور پر آدمی کو صدمہ پیش آتا ہے لیکن دانش مند وہ ہے جو اس صدمے سے اپنے لئے کوئی اجر نکال لے۔ وہ یہ ہے کہ نہ تو جزع فزع کرے نہ بیان کر کے روئے نہ یہ کہ بالکل پتھر ہو جائے کہ اس کی آنکھ سے آنسو تک نہ نکلے' قلب کی سلامتی کے ساتھ جتنا طبعی غم ہے وہ ہو۔ اور عبرت پکڑے کہ جہاں آج یہ گیا ہے مجھے بھی کل کو جانا ہے۔ اس کی موت کو اپنی موت کی یادگاری کا ذریعہ بنائے تو اس کی موت دین کی ترقی کا ذریعہ بن گئی ___ اگر یہ میت نہ ہوتی تو اسے یہ اجر کیسے ملتا۔؟

حدیث میں ہے کہ ایک بڑھیا کا جوان بیٹا مر گیا۔ وہ واویلا کر رہی تھی ___ سر کے بال نوچ رہی تھی کہ ہائے ہائے ___ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گزرے۔ فرمایا :

"بڑی بی! صبر کرو"۔

بڑی بی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس نے کہا :

"ہاں! تم نے یہ کہہ دیا کہ صبر کرو' تمہارے گھر میں یہ آفت آتی جب میں جانتی تم صبر کرتے' مجھے صبر کرانے کے لئے آئے ہو؟ میں نہیں صبر کر سکتی"۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا : "اچھا تو جان!"

آپؐ آگے تشریف لے گئے ___ اگلے دن اس کو پتہ چلا کہ وہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے ___ تب حاضر ہوئی اور عرض کیا :

"یارسول اللہ! مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ ہیں' آپ نے صبر کی تلقین فرمائی تھی۔ میں اب صبر کرتی ہوں"۔

آپ نے ارشاد فرمایا :

الصبر عند الصدمة الاولیٰ۔

"جب صدمہ پیش آیا تھا' جب صبر کرتی تو اجر ملتا"۔

یوں تو چار برس کے بعد خود بخود ہی صبر آجاتا ہے۔ کوئی ساری عمر آدمی تھوڑا ہی روتا رہتا ہے ___ تو وہ مجبوری کا صبر ہے اور صدمہ کے وقت اختیاری صبر ہوتا ہے۔ جو نفس کا ضبط کرنا ہے وہی اجر کا باعث ہے ___ مجبوری کی چیز اور بے اختیاری چیز پر کوئی اجر نہیں ہوتا۔ جس چیز میں ارادہ اختیار صرف کیا جائے اور طبیعت کے خلاف جدوجہد کی جائے اس پر اجر مرتب ہوتا ہے۔

غرض موت تک کو آخرت کی یادگاری کا ذریعہ بنایا ہے۔ جیسے زندگی کو بھی آخرت کی یادگاری کا ذریعہ بنایا۔

دوسرے کی نیکی ذریعۂ ترقی

علماء کرام لکھتے ہیں کہ کسی کی اچھائیاں دیکھوتو حرص کرو۔ برائیاں دیکھوں تو حرص مت کرو ___ مثلاً آپ نے کسی کو دیکھا کہ نوافل بہت پڑھ رہا ہے اور دل میں حرص آئی اور دعاء کی کہ یا اللہ! مجھے بھی اتنے نفلوں کی توفیق دے ___ اور توفیق ہو گئی تو اس کے نوافل آپ کو نوافل پڑھوادینے کا ذریعہ بنیں۔
لوگوں کی نیکی بھی ہماری ترقی کا ذریعہ بنتی ہے اور لوگوں کی موت بھی ہماری ترقی کا ذریعہ بنتی ہے۔

دوسرے کی برائی ذریعۂ عبرت

اور اگر برائیوں کو دیکھ کر آپ نے عبرت پکڑی اور ان سے بچ گئے تو لوگوں کے گناہ بھی ہمارے لئے ترقی کا ذریعہ بن گئے 'غرض دنیا کی ہر چیز میں عبرت 'نصیحت و موعظت موجود ہے۔ انسان اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ دنیا کو مٹا کر ختم کردے۔ اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اس کی ہر چیز سے عبرت پکڑے۔ ہر ہر چیز سے نصیحت حاصل کرے' ہر ہر چیز سے اپنی آخرت بنائے اور اپنی آخرت کو یاد کرے ___ یہ جبھی ہو گا جب دنیا بچی ہوئی ہو۔ اس کو دیکھ دیکھ کر ہم عبرت پکڑیں۔

حضرات کا احترام

اس واسطے یہ چند جملے میں نے عرض کئے۔ وقت بھی تھوڑا تھا' اور کچھ زیادہ ہمت بھی نہیں تھی اور ضعف بھی کافی تھا اور کچھ کام بھی زیادہ ہے اور اس سفر کی آخری رات بھی ہے۔ اس واسطے ارادہ کیا جب اعلان ہو گیا تو کچھ نہ کچھ عرض کیا جائے۔ اعلان کے احترام ___ اور حضرات کے جمع ہونے کے احترام میں یہ چند جملے میں عرض کئے۔
اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے اور ہمیں علم و عمل کی توفیق دے۔ ہماری دنیا بھی درست فرمادے اور آخرت بھی بھی درست فرمادے اور ہمیں عدل واعتدال پر قائم رکھے ___ افراط و تفریط اور مبالغوں سے ہمیں محفوظ رکھے۔ آمین!

دعاء

اللهم ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم

اللهم افتح لنا بالخير واختم لنا بالخير واجعل ثوابه الجنة امين

اللهم انا نسئلک خير الدنيا وخير الاخرة۔

اللهم انا نسئلک خير الحيوة وخير الممات وثقل موازيننا وثبت اقدامنا وانصرنا على القوم الكفرين۔

اللهم اغفرلنا ذنوبنا

اللهم انصرنا واعف عنا واهدنا سبل السلام واخرجنا من الظلمت الى النور وجنبنا الفواحش ما ظهر منها وما بطن۔

اللهم ربنا اتنا في الدنيا حسنة وفي الأخرة حسنة وقنا عذاب النار۔

وادخلنا الجنة مع الابرار يا عزيز يا غفار برحمتک يا ارحم الراحمين۔

حقیقتِ نکاح

سب سے بڑا سلسلہ دنیا میں انسانوں کو مِلانے والا نکاح کا سلسلہ ہے جس سے دو اجنبی جُڑ جاتے ہیں، جن میں پہلے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور اچانک ان میں ایسا جوڑ لگتا ہے کہ منافع مشترک، اتحادِ باہمی اور خاندانی اِشتراک سے ایسی محبت و مودّت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس سے پہلے اتنی محبت اور مودت نہیں دیکھی گئی۔ نکاح جوڑ لگانے کا سلسلہ ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام اس سِلسلے کے حامِل ہیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدّ ظلّہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ــــــ اَمَّا بَعْدُ ــــــ

فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ۔بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، ومن اٰیٰتہٖ ان خلقکم من انفسکم ازواجًا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ۔ ان فی ذٰلک لاٰیٰتٍ لقوم یتفکرون ۔ (روم پ ۲۱ ع ۳) صدق اللّٰہ العلی العظیم ۔

اَحوالِ واقعی

بزرگانِ محترم!

ابھی آپ کے سامنے نکاح کی تقریب انجام پائی ہے۔ اور اس میں اپنے عزیزوں میں سے ایک عزیز کا نکاح ہوا۔ اس تقریب کا تقاضا یہ ہے کہ میں نکاح ہی کے سلسلہ میں کچھ کلمات گزارش کروں، جو نکاح کے ثمرات پر مشتمل ہوں۔ چونکہ موقع کے مناسب کوئی بیان ہوتا ہے، تو وہ نفع دیتا ہے۔ جو وقت کا تقاضا ہو۔ اسی کے مطابق بیان کیا جائے۔ گویا اس تقریب نے تقریر کا موضوع متعین کر دیا۔ اسی موضوع کے سلسلہ میں کچھ بیان کیا جائے گا۔

اس وقت دو تین باتیں عرض کرنی ہیں۔ ایک یہ کہ نکاح کی حقیقت کیا ہے؟ دوسرے نکاح کی غرض وغایت، اور یہ کہ نکاح کے احکام کیا ہیں؟ ــــ یہ تین باتیں اس تقریر کا موضوع ہوں گی۔

دنیا جنّت اور جہنم سے مرکّب ہے۔ (تمہید)

ان تین باتوں کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک مختصر سی بات بطورِ تمہید کے سمجھ لیجئے۔ پھر تینوں باتیں آسان ہو جائیں گی۔

وہ یہ کہ اس کائنات میں اللہ نے دو سلسلے پیدا کئے ہیں۔ ایک خیر کا سلسلہ ہے' اور ایک شر کا ایک سلسلہ بھلائی' خوبی اور نیکی کا ہے' اور ایک سلسلہ بدی' بُرائی اور شر کا ہے۔ ہر اصل کے مقابلے میں' جو اچھی اصل ہے' کوئی نہ کوئی اس کی ضد ساتھ لگی ہوئی ہے یہ دنیا اکہری نہیں ہے بلکہ بھلائی اور بُرائی دونوں سے مرکّب ہے۔ جو خیر آپ کے سامنے آئے گی' اس کے مقابلے میں کوئی شر ضرور ہو گی' جو اس کی ضد کہلائے گی۔ اگر اللہ نے دنیا میں اسلام پیدا کیا' تو مقابلے میں کُفر بھی پیدا کیا۔ اگر دنیا میں سچ آیا تو مقابلے میں جھوٹ بھی آیا اگر نور دنیا میں لایا گیا' تو مقابلے میں ظلمت بھی لائی گئی۔ اگر تقویٰ وطہارت لایا گیا تو مقابلے میں فسق وفجور بھی لایا گیا' ___ غرض ہر چیز کی اصل کے مقابلے میں کوئی ضد ضرور ہے ___ اگر دن لایا گیا' تو مقابلے میں رات لائی گئی۔ یہ ایک سلسلہ ہے خیر و شر کا۔ اگر آپ کو محض خیر کی تلاش ہو' جہاں بُرائی کا نشان نہ ہو' وہ جنّت کا عالم ہے کہ وہاں سوائے خیر اور بھلائی کے کچھ نہیں۔ اور اگر شر ہی شر دیکھنی ہے' جس میں کہیں بھلائی کا نشان نہ ہو تو وہ جہنم کا عالم ہے کہ وہاں سوائے بُرائی' اور کدورت اور تکلیف کے کچھ نہیں۔ دنیا کو اللہ نے جنت اور جہنم سے مرکّب بنا دیا ہے' کہ کچھ خیر جنت سے لائی گئی' اور کچھ شر جہنم سے لائی گئی دونوں سے مِلا کر ایک عالم بنا دیا گیا' جس کا نام دنیا ہے۔ اس لئے یہاں خیر بھی ہے شر بھی اور نیکی بھی ہے بدی بھی' بُرائی بھی ہے بھلائی بھی۔ اسلام بھی ہے ظلمت بھی' ہر اصل کے مقابلے میں ایک ضد لگی ہوئی ہے۔

عالمِ غیب میں خیر و شر کا سلسلہ

اس کائنات میں اوپر سے لے کر نیچے تک یہی سلسلہ ہے۔ غیب کو دیکھا جائے۔ یعنی وہ مخلوق جو آنکھوں سے اوجھل ہے' وہاں بھی یہ دونوں سلسلے ہیں ایک طرف ملائکہ علیہم السلام ہیں جو خیرِ محض ہیں۔ ان کے مقابلے میں شیاطین ہیں' جو شرِ محض ہیں۔ ملائکہ ہر بات میں خیر کی طرف چلتے ہیں شیاطین ہر معاملے میں شر کی طرف چلتے ہیں۔ ملائکہ کے لئے فرمایا گیا۔

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝

یہ اللہ کے پاکباز اور مکرم بندے ہیں۔ لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ۔ ان کا شیوہ یہ کہ اللہ کی ذرہ برابر نافرمانی یا عِصیان کا کوئی شائبہ تک ان میں نہیں' سوائے اِطاعت' پاکیزگی اور برگزیدگی کے۔ تو ان کو کہا گیا لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ عِصیان کا نشان نہیں۔ اور شیاطین کو کہا گیا وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا۔ شیطان کا کام ہی کفر کرنا اور کُفرانِ نعمت ہے۔

ملائکہ علیہم السلام جہاں ہوں گے' خوشبو کی طرف دوڑیں گے۔ شیاطین جہاں ہوں گے بدبو کی طرف دوڑیں گے۔ حدیث میں ہے کہ مساجد اور ذکرُ اللہ کی مجالس میں' ملائکہ علیہم السلام کا ہجوم ہوتا ہے۔ جتنی کوڑیاں اور گندگی کی جگہیں ہیں' وہاں شیاطین کا ہجوم ہوتا ہے۔ انہیں وہ پسند ہے' انہیں یہ پسند ہے۔ یہ خیر کی طرف جاتے ہیں۔ وہ شر کی طرف جاتے ہیں۔

ملائکہ کا کام کیا ہے؟ ہر مخلوق کی خیر خواہی کرنا' ہر ایک کے لئے دعا کرنا' ہر ایک کے لئے بھلائی چاہنا۔

شیاطین کا کام ہے' ہر ایک کی بُرائی چاہنا' ہر ایک کو ایذا پہنچانا۔ ہر ایک کے لئے تکلیف کا سامان کرنا۔ ملا ئکہ علیہم السلام کی شان قرآن کریم میں فرمائی گئی کہ :

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ

جو ملا ئکہ عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں' ان سے زیادہ مقرّب کون ہو گا ___ ؟ وہ اتنے نزدیک ہیں حق تعالیٰ کے کہ ملا ئکہ میں سے کسی کو اتنا قُرب حق تعالیٰ کا میسّر نہیں ہے۔ اور جو ان کے اردگرد اربوں کھربوں ملا ئکہ ہیں۔ ان کا کام کیا ہے؟ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ___ حق تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں' اور زمین والوں کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ ہماری اولادوں کے لئے' ہماری بیویوں کے لئے' اہل وعیال کے لئے دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ! ان کے لئے دنیا میں' آخرت میں بھلائی دے۔ یہ ان کا کام ہے۔

اور شیاطین نے کیا کیا؟ سب سے پہلے بڑے شیطان نے اللہ ہی کے سامنے کہا کہ : قَالَ فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ تیری عزّت کی قسم کھاکر کہتا ہوں کہ ایک ایک انسان کو گمراہ کرکے رہوں گا۔ ایک ایک انسان کو بھٹکا کے رہوں گا۔ کبھی خیر پر نہیں آنے دوں گا۔

حق تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ میں بھی اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں' تیرے متّبع ایک ایک کو جہنم میں ڈال کے رہوں گا' اور جہنم کو بھردوں گا ___ تو ملا ئکہ کہتے ہیں یا اللہ! سب کو بھیج جنت میں' خیر ان کے لئے پیدا کر۔ شیطان کہتا ہے کہ میں گمراہ کروں گا' تاکہ ایک ایک کو جہنمی بنا کے چھوڑوں۔ تو وہ انتہائی خیر خواہ' یہ انتہائی بدخواہ۔ وہ نیکی کی طرف لاتے ہیں' یہ بدی کی طرف۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر انسان کے قلب کی دائیں جانب فرشتہ بیٹھا ہوا ہے اور بائیں جانب شیطان بیٹھا ہوا ہے۔ فرشتہ کا کام کیا ہے؟ خیر کا راستہ دکھلاتا ہے' قلب میں خیال ڈالتا ہے کہ یہ بھی نیکی کرلے۔ یہ بھی نیکی کرلے ___ شیطان کہتا ہے' یہ بھی بدی کر' یہ بھی بدی کر۔ اس میں بڑی لذّت ہے۔ زناکاری کر' اس میں بڑا لُطف آئے گا۔ چوری کر' اس میں مال بڑھ جائے گا۔ یہ بدی کو مزیّن اور آراستہ کرکے پیش کرتا ہے' تاکہ انسان دل لُبھادے اور مبتلا ہوجائے ___ فرشتہ نیکی کا راستہ دکھلاتا ہے کہ گناہ میں لذّت تو آجائے گی' مگر انجام کو سوچ لے کہ جہنم بھی بھگتنا پڑے گا۔ معصیت کے اندر نفس کو نہایت لذّت آتی ہے' مگر تھوڑی دیر کے لئے' اس کے بعد قلق' کدورت اور تشویش پیدا ہوتی ہے۔ انسان میں نفرت بڑھتی ہے ___ نیکی کرنے میں ابتداءً تکلیف ہوتی ہے۔ مگر انجام کار قلب میں راحت' سکون' بشاشت اور ایک نورانیت پیدا ہوتی ہے ___ تو فرشتہ خیر کی راہ دکھلاتا ہے۔ اور شیطان شر کی راہ دکھلاتا ہے۔ فرشتہ نیکی کے خطرات ڈالتا ہے۔ اور یہ بدی کے وساوس ڈالتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہو گا' یہ جو بعض اوقات انسان کش مکش میں مبتلا ہوتا ہے۔ کبھی تو جی چاہتا ہے کہ لاؤ نیکی کرلوں۔ اور کبھی سُستی آتی ہے کہ دیکھی جائے گی۔ کبھی دل میں خیال آتا ہے کہ تہجد پڑھ لوں۔ پھر خیال آیا کہ رات کا آخیر ہے' بڑی میٹھی نیند ہے' کون پڑھے' کل کو دیکھی جائے گی۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ یہ فرشتے اور شیطان کی جنگ ہوتی ہے' جس کی وجہ سے انسان ڈانواں ڈول ہوتا ہے۔ جو غالب آجائے' وہی انسان کر گزرتا ہے۔ ادھر ہی کو طبیعت مائل ہوجاتی ہے۔

شیطان کے کہنے سے نیکی بھی درست نہیں

اسی واسطے فرمایا گیا۔ کہ شیطان انسان کا انتہائی دشمن ہے۔ اس کے کہنے سے نیکی بھی مت کرو۔ نیکی اپنے ضمیر کے تقاضے سے کرو۔ وہ اگر یوں بھی کہے کہ نماز پڑھ لو۔ سمجھو کہ اس میں بھی کوئی مکاری اور شر پوشیدہ ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہٗ سو رہے تھے۔ اتفاق سے شیطان نے وسوسے ڈالے۔ بہر حال نبی اور معصوم تو نہیں تھے۔ حضرات صحابہؓ کو بھی ابتلاء ہو سکتا ہے۔ تو اس کی کچھ حرکت اور تصرف سے ان کا تہجد قضا ہو گیا ___ شیطان بہت خوش ہوا کہ ایک جلیل القدر صحابیؓ کا تہجد قضا کرا دیا۔ فرض تو چھڑا نہیں سکتا تھا۔ صحابیؓ ہیں۔ نفل چھوٹ سکتی تھی' وہ چھوٹ گئی ___ مگر امیر معاویہ رضی اللہ عنہٗ کو اتنا صدمہ گزرا کہ برسوں کا میرا معمول چھوٹ گیا۔ سارے دن روئے' استغفار کیا' بیسیوں نفلیں پڑھیں۔ توبہ کی ___ اگلا دن جب ہوا' تو ارادہ کر کے سوئے کہ آج اِنشاء اللہ ضرور اٹھوں گا۔ اور آج میرے اوپر نیند کا غلبہ نہیں ہونا چاہئے۔

ابھی اُٹھنے نہیں پائے تھے۔ ایک شخص نے آکر پیر ہلایا کہ امیر معاویہ! اُٹھیے اُٹھیے۔ تہجد کا وقت آگیا۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا' کہ میرے اٹھانے کے لئے میرے محل سرائے میں رات کے وقت کون اجنبی آیا ___؟ ہاتھ پکڑا تو معلوم ہوا یہ شیطان ہے ___ وہ بھی صحابیؓ ہیں قوی الایمان ہیں۔ فرمایا۔ مردود تو یہاں کیوں آیا ___؟ اس نے کہا کہ آپ کی خیر خواہی پیش نظر تھی۔ کل آپ کا تہجد قضا ہو گیا تھا۔ میں نے کہا آج میں ہی جا کے اٹھاوں۔ آپ کو تکلیف دی تھی ___ کہا ___ منحوس! تو؟ اور خیر خواہی؟ ___ اللہ نے کہا ہے کہ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا شیطان تمہارا دشمن ہے' اسے دشمن ہی سمجھو۔ یہ مت سمجھنا کہ دوست ہے۔ تو اور دوستی کرے اور خیر خواہی کرے۔ سچ سچ بتلا' تو نے مجھے نماز کے لئے کیوں اٹھایا' کوئی مکاری اس میں ضرور پوشیدہ ہے' کوئی اس میں شر ہے۔ کہا کہ نہیں خیر خواہی پیش نظر تھی۔ فرمایا کہ تو اور خیر خواہی؟ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اللہ نے کہہ دیا کہ تو دشمن ہے' یہ ممکن نہیں کہ تو دوستی کرے۔

میں بھی صحابی ہوں۔ روحانیت میری بھی قوی ہے۔ آج میں تجھے انتہائی طور پر پکڑ کے پیٹوں گا' ورنہ بتا اصلیت کیا ہے؟ ___ ہاتھ پکڑا ہوا ہے۔ چھوٹتا نہیں۔ وہ اگر مزاج کا لطیف تھا۔ تو یہ روحانیت کے لحاظ سے قوی تھے' ان میں بھی لطافت تھی۔ کوئی ہم جیسا ہوتا' شیطان کبھی کا دھکا دے کے بھاگ بھی جاتا ___ تب وہ بات کھلی۔

اس نے کہا اصل قصہ یہ ہے کہ کل میں نے کچھ تصرف کیا تو آپ کا تہجد قضا ہو گیا۔ آپ نے توبہ کی' استغفار کیا' پچاسوں نفلیں پڑھیں تو اتنا ثواب ملا کہ تہجد کا بھی اتنا نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ لاؤ اٹھادوں کہ ثواب تو تھوڑا ہو جائے۔ دن بھر محنت کریں گے' پچاس رکعتوں کی بجائے یہ چار رکعات ہی سہی۔ فرمایا۔ اب بات تو نے ٹھیک کہی' پھر اس کو چھوڑ دیا' کہ دور ہو ملعون۔ تجھ پر لعنت۔ تو شیطان خیر خواہی کبھی نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ بد خواہی کرتا ہے۔ وہ اگر خیر کا راستہ بھی دکھائے۔ اس میں بھی کوئی نہ کوئی شر ہو گی۔ اس کے کہنے سے خیر بھی نہیں کرنی چاہیے۔ جب دل میں اور ضمیر میں آجائے۔ تبھی آدمی کرے۔ تو ملائکہ علیہم السلام انتہائی خیر خواہ ہیں' اور شیاطین انتہائی بد خواہ ہیں۔

تو غیب کا عالم ہے۔ دونوں سلسلے وہاں بھی قائم ہیں۔ ایک خیر کا' وہ ملائکہ علیہم السلام ہیں۔ اور ایک شر کا' وہ شیاطین ہیں۔

دنیا میں خیر و شر کا سلسلہ

دنیا میں آنے کے بعد یہ سلسلہ یہاں بھی قائم ہے۔ انسانوں میں مقدس ترین طبقہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، جو خیرِ محض ہیں۔ ان میں شر کا نشان نہیں ہے۔ ہر چیز میں بھلائی، ہر چیز میں خیر اور ہر انسان کے خیر خواہ ___ اور اس درجہ خیر خواہ کہ بعض اوقات حق تعالیٰ کو روکنا پڑتا ہے کہ اس درجہ خیر خواہی بھی مت کرو ___ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمت للعالمین ہیں۔ آپ ہدایت فرماتے، کوئی ہدایت کو نہ مانتا، تو بیٹھ کر گھٹتے۔ محبت اور مخلوق کی خیر خواہی کی وجہ سے قلب مبارک کو تکلیف پہنچتی۔ کہ کیوں نہیں یہ سیدھے راستے پر آتے، کیوں برائی کے راستے پر چل رہے ہیں؟ کیوں تھوڑی سی لذت کے لئے اپنی آخرت کو تباہ کر رہے ہیں۔ کیوں نہیں انہیں سمجھ اور عقل آتی۔ تو جب نہیں مانتے تھے تو آپ گھٹتے تھے۔ حق تعالیٰ نے روکا : لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ___ کیا ان کی ہدایت کی طمع میں آپ اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے ___ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کر دی، نہیں کوئی مانتا تو جائے جہنم میں۔ آپ اس میں کیوں مبتلا ہیں کہ قلب میں ضیق اور گھٹن ہے ___ تو روکنے کی نوبت آئی، اس لئے کہ خیر خواہی انتہائی درجہ کی تھی۔ ہر ایک کے لئے چاہتے تھے کہ ایماندار بن جائے۔ اس لئے جو خلاف کرتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچتی تھی۔ تو انبیاء علیہم السلام خیرِ محض ہیں۔ انتہائی محبت رکھتے ہیں۔ اور محبت ہی دنیا میں پھیلاتے ہیں۔

دنیا میں جو انبیاء علیہم السلام کے مقابل ہیں۔ وہ دجال کہلاتے ہیں۔ ہر نبی علیہ السلام کے مقابلے میں کوئی نہ کوئی دجال آیا۔ اور انبیاء علیہم السلام کے زمانے میں دجال آئے، انہوں نے نبوت کا دعوے کیا۔ دجل کے معنی ہی یہ ہیں کہ ظاہر کچھ اور باطن کچھ۔ آدمی تلبیس پیدا کرے۔ دعوے نبوت کا، اور اندر سے کفر بھرا ہوا۔ یوں تلبیس کر کے دنیا کو کفر پر لاتے تھے۔ تو نبی کا ٹھیک مقابلہ دجال سے ہوتا ہے۔ نبی خیرِ محض اور دجال شرِ محض ہے۔ ہر نبی کے مقابلے میں ایک نہ ایک دجال لایا گیا ہے کہ نبی مخلوق کو خیر کی طرف لائے، اور دجال شر کی طرف لائے۔

چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ اور نبوت، علم اور ایمان کا کمال غرض سارے مراتبِ نبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ختم ہو چکے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی کامل الایمان نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی کامل الہدایت نہیں ہے۔ سارے مراتبِ خیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات پر ختم ہیں۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں کہ نبوت کا ہر درجہ اور مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر آ کر ختم ہو گیا۔ اسی لئے آپ کی امت میں جو دجال آئے گا، وہ اتنا بڑا دجال ہو گا کہ کوئی دجال ایسا نہیں گزرا ہو گا۔ اس لئے کہ اتنے بڑے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ ہے تو اتنا ہی بڑا دجل و فریب ہونا چاہیے ___ یہی وجہ ہے کہ اور دجالوں نے نبوت کے دعوے کئے۔ اسلام میں جو آخیر میں دجال آئے گا، وہ خدائی کا دعوے کرے گا۔ اس پر شر کے مراتب ختم ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کی پشت مبارک پر مہرِ نبوت تھی، جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کی علامت تھی، اور اس پر لکھا ہوا تھا۔ **سر حیث شئت فانک منصور۔** جہاں بھی جاؤ، خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہے۔ خیر تمہارے ساتھ ہے۔ خیر کے مراتب تم پر ختم ہیں۔ تو آپ کے لئے مہرِ نبوت تھی۔ جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خیرِ مجسم ہیں ___ دجال کی پیشانی پر کفر لکھا ہوا ہو گا۔ ک۔ف۔ر۔ تو یہ کفرِ مجسم ہے۔ وہاں کفر کے مراتب ختم ___ تو انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ دجالوں سے ہے۔ انبیاء خیر و محبت لے کر آتے ہیں۔ دجال عداوت اور شر لے کر آتے ہیں ___ تو وہاں ملائکہ اور شیاطین کا

مقابلہ تھا' یہاں انبیاء اور دجّالوں کا مقابلہ ہے۔

انبیاء کے ماننے والوں میں جو اعلیٰ مقام پر پہنچتے ہیں۔ انہیں امام کہتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا۔

"ہم نے لوگوں کو امام بنایا' وہ خیر کے راستے کی ہدایت کرتے ہیں"۔

دجّالوں کے جو اعلیٰ ترین متبع ہیں' ان کو ائمۃ الکفر کہا گیا ہے:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ۔

"ہم نے ایسے امام بنائے' جو جہنم کی دعوت دیتے ہیں۔ لوگوں کو آگ کی طرف لے جاتے ہیں"۔

یہ امام شر کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ امام خیر کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ امام ایمان کے ہیں۔ یہ امام کفر کے ہیں۔ پھر ان ائمہ کے متبع ہیں۔ ائمۂ ہدایت کے جو متبع ہیں' ان کا لقب اولیاءُ الرَّحمٰن ہے۔ اور ائمۂ کفر کے جو متبع ہیں' ان کا لقب اولیاءُ الشیطٰن ہے۔ ایک حزبُ اللہ ہے' اور ایک حزبُ الشیطان ہے۔ ایک کے لئے کہا گیا ہے: اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ اللہ ہی کے لشکر کو انجام کار فلاح نصیب ہوگی۔ ادھر کہا گیا: اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ شیاطین کے جو لشکر ہیں' وہ انجام کار گھاٹے' خسارے اور ٹوٹے میں رہیں گے۔

غرض اوپر سے لے کر نیچے تک دو سلسلے ہیں۔ ایک خیر کا' ایک شر کا۔ اُدھر ملا ئکہ' ادھر شیاطین۔ اُدھر انبیاء' ادھر دجّال۔ اُدھر ائمۃ الایمان' ادھر ائمۃ الکفر۔ اُدھر اولیاء الرّحمٰن' ادھر اولیاء الشیطٰن۔ یہ دو متضاد سلسلے دنیا میں چلے آرہے ہیں۔

خیر و شر کے سلسلوں کے کام

اس خیر کے سلسلہ کا کام کیا ہے؟ یہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا ہے۔ جو بچھڑ جاتے ہیں' ان کو ملاتا ہے۔ جن میں عداوت ہو' ان میں محبتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جن میں لڑائی ہو' ان میں صلح کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ ملا ئکہ' انبیاء اور اولیاءُ الرّحمٰن کا سلسلہ یہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا بس ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائے۔ سب کے قلوب ایک بن جائیں' سب ایک دوسرے سے محبت کریں' ایک دوسرے سے ملیں' ایک دوسرے کی خیر خواہی میں غرق ہو جائیں ___ شیاطین' دجّالوں اور ائمۃ الکفر کا سلسلہ یہ چاہتا ہے کہ جو جُڑے ہوئے ہیں' ان میں بھی تفریق پیدا ہو جائے' جو ملے ہوئے ہیں' ان میں پھوٹ پڑ جائے، جو محبتیں کر رہے ہیں' ان میں عداوتیں پھیل جائیں، جو ایک دوسرے کی خیر خواہی کر رہے ہیں وہ ایک دوسرے کی بد خواہی میں لگ جائیں، ہر ایک دوسرے کے راستے میں کانٹے بچھائے' ہر ایک دوسرے کو ذلیل و خوار کرنے کی کوشش کرے، دنیا میں فتنہ و فساد پھیلے۔ یہ دجّالوں کا شیاطین کا اور ائمۃ الکفر کا تقاضا و مقتضٰی ہے تو انبیاء محبتیں پیدا کرانے' اور دجّال عداوتیں پیدا کرانے کے لئے آئے ہیں۔

انبیاء کا کام یہ ہے کہ جو بندے خُدا سے بچھڑ جائیں' انہیں خدا سے ملا دیں۔ جو آپس میں بچھڑ جائیں۔ انہیں آپس میں ملا دیں۔ شیاطین چاہتے ہیں کہ بندے خدا سے بھی ٹوٹ جائیں۔ بندے بندوں سے بھی آپس میں ٹوٹ جائیں۔ بھائی بھائی میں لڑائی ہو۔ گھر گھر میں فساد ہو۔

اسی واسطے جتنے سلسلے محبتیں اور اتحاد کے ہیں' انبیاء علیہم السلام ان کے حامل ہیں۔ اور جتنے سلسلے لڑائی'

فتنے اور دنگے فساد کے ہیں' شیاطین ان کے حامل ہیں۔

انسانوں کو مِلانے والا سب سے بڑا سلسلہ

سب سے بڑا سلسلہ دنیا میں انسانوں کو مِلانے والا نکاح کا سلسلہ ہے' جس سے دو اجنبی جُڑ جاتے ہیں' جن میں پہلے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' اور اچانک ان میں ایسا جوڑ لگتا ہے کہ منافعِ مشترک' اِتحادِ باہمی اور خاندانی اشتراک سے ایسی محبت ہو جاتی ہے' ایسی مودّت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس سے پہلے اتنی محبت اور مودّت نہیں دیکھی گئی۔ نکاح جوڑ لگانے کا سلسلہ ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام اس سلسلے کے حامل ہیں۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ :

النکاح سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ (الحدیث)
''نکاح میری سنت ہے' جو اس سے بھاگے گا' گریز کرے گا۔ وہ میری جماعت سے خارج ہے''۔

وہ میری جماعت میں شامل نہیں۔ اس واسطے کہ نکاح اتحاد کا ذریعہ ہے' اور انبیاء علیہم السلام کا مقصد ہی یہ ہے کہ وَحدت و محبّت باہمی پیدا ہو۔
شیاطین اس کے حامل ہیں کہ یا نکاح ہونے نہ پائے' یا ہو کر ٹوٹ جائے' ایسی تفریق ان میں پڑے کہ نکاح ٹوٹ جائے' کہیں طلاق ہو جائے' آپس میں پھوٹ پڑ جائے' وہ یہ چاہتے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام نکاح سے محبّت رکھتے ہیں۔ طلاق اگرچہ جائز ہے' اور مجبوری کے وقت میں اسے استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کے نزدیک جائز ہو کر بھی اس سے بُغض ہے۔ ارشاد ہے۔

ابغضُ المباحات عند اللّٰہ الطلاق۔

وہ چیز جو جائز ہے' پھر اللہ کو اس سے عداوت اور بُغض ہے' وہ طلاق ہے۔ اس لئے کہ طلاق نکاح کو توڑنے والی ہے' جس سے لوگ بچھڑ جائیں گے' عداوتیں پیدا ہوں گی۔ اور یہ انبیاء کے موضوع کے خلاف ہے۔ اس لئے انبیاء نکاح سے محبّت رکھتے ہیں۔ شیاطین طلاق سے محبّت رکھتے ہیں۔ اللہ و رسول کے نزدیک طلاق مبغوض ہے۔ مجبوری کی بات الگ ہے مگر مبغوض ہے۔ نکاح کے بارے میں کہا گیا ہے۔ **النکاح سنتی۔** اور یہ نہیں کہا گیا کہ **الطلاق سنتی۔** طلاق میری سنت ہے۔ یہ تو مجبوری کی چیز ہے' کوئی عاجز آجائے' ایسے وقت میں اجازت دی جاتی ہے۔
یہی وجہ ہے کہ چونکہ طلاق نکاح کو توڑنے والی ہے' اوّل تو اس سے بُغض کیا گیا۔ اور پھر اس کی تقسیم کی گئی۔ وہ یہ کہ ایک طلاق سنّت ہے' اور ایک طلاقِ بدعت ___ طلاقِ سنت یہ ہے کہ آدمی تین طلاق ایک دفعہ میں نہ دے۔ الگ الگ دے۔ اس لئے ہر طلاق کے بعد موقع رہتا ہے کہ پھر رُجوع کرے۔ نکاح کی ضرورت نہ پڑے۔ تو سنّت یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ مجبوری یا ضرورت پیش آئے۔ تینوں طلاقیں ایک دم ہاتھ سے نہ نکالے' پھر وہ بائنہ ہو جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ ڈرانے دھمکانے کی خاطر دینا ہی ہے تو ایک دے۔ تاکہ تین مہینے اور دس دن جو عِدّت ہے' اس میں پھر آدمی کو رُجوع کا حق رہے۔ اس کے بعد بھی اگر نوبت آئی' پھر ایک اور دے دے۔ پھر تین چار مہینے موقع رہے گا کہ پھر رُجوع کرے۔ اور تین طلاق ایک دم ختم کر دیں' سارے تیر ترکش سے نکال دیئے۔ آگے رجوع کا کوئی موقع نہیں۔ اکھٹی تینوں دے دینا' اسے طلاق بدعت کہا گیا ہے۔ اور طلاق سنت یہ ہے کہ ایک ایک کر کے دے تاکہ رجوع کرنے کا موقع رہے ___ بہرحال انبیاء علیہم

السلام ہر ایسے طریق کو چاہتے ہیں' جس سے رشتہ جڑا رہے۔ یہ تعلق قائم رہے۔ اس لئے کہ یہ اتحاد باہمی کا ذریعہ ہے۔

عورت کے ذریعے خاندانوں میں محبت قائم ہوتی ہے

ایک اور دو کے اتحاد کا ذریعہ نہیں کہ خاوند اور بیوی مِل جائیں۔ ایسی بات ہے کہ جب خاوند بیوی آپس میں ملیں گے تو خاوند کے عزیز' بیوی کے عزیزوں سے' اور بیوی کے عزیز خاوند کے عزیزوں سے ملیں گے۔ یہ دو کا ملنا نہیں ہے۔ یہ کئی کا ملنا ہے۔ یہ دو خاندانوں کا ملنا ہے' دو خاندانوں کا آپس میں جُڑ جانا ہے۔ پھر حقوق قائم ہو جاتے ہیں۔ محبّتیں ہو جاتی ہیں۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمائے۔ اور نو اَزواجِ مطہّرات ہوئی ہیں۔ ان کی مصلحت یہی تھی کہ ان خاندانوں سے جوڑ لگایا جائے۔ جن کے ذریعے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کے لئے کام لینا تھا۔ جب خاندانوں میں نکاح ہو گیا' وہ مربُوط ہو گئے۔ ٹوٹ نہیں سکتے تھے۔ ان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغِ دین میں کام لیا' ان نکاحوں کی برکت سے قبیلے کے قبیلے اسلام میں داخل ہوئے ___ اس لئے کہ عرب میں اس کی بڑی رعایت کی جاتی تھی کہ جہاں سلسلہ ورشتہ دامادی کا قائم ہو گیا' وہ کئی کئی پُشتوں تک اس کی رعایت کرتے تھے۔ اور ان حقوق کو مانتے تھے۔

جب مصر فتح ہوا تو مصر سے جو قیدی پکڑ کر لائے گئے ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں، عورتیں بھی۔ حضرت صفیّہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا' جو زوجہ مطہرہ ہیں۔ وہ مصر سے پکڑی ہوئی آئی تھیں۔ آکر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمالیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دیکھو مصر سے سُسرال کا رشتہ قائم ہو گیا۔ اس کی رعایت کرنا۔ پوری امّت پر حق عائد کردیا کہ مصر والوں کی رعایت کرو۔ کیونکہ وہ میری سُسرال بن گئی۔ یہ جو دامادی اور خسر کا رشتہ ہے یہ گویا اتنا لگاؤ پیدا کردیتا ہے کہ خاندان اس سے مربوط ہو جاتے ہیں ___ تو انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ عزیز نکاح کا تعلق ہے ___ حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

حبب الی من دنیاکم ثلاث۔

"تمہاری دنیا میں مجھے تین چیزیں پسند ہیں"۔

ان میں سے ایک چیز فرمائی کہ وہ عورت ہے۔ عورت کو اس لئے پسند نہیں فرمایا کہ وہ معاذاللہ شہوت رانی کا ذریعہ ہے۔ اس لئے کہ وہ تعلق ومحبت کے قائم ہونے کا ذریعہ ہے۔ محبّتیں عورت کے راستے سے قائم ہوتی ہیں۔ مرد تو اپنے کام کاج میں لگے رہتے ہیں۔ کوئی دکان پر' کوئی دفتر میں' کوئی کھیتی باڑی میں۔ یہ جو رشتہ داریاں جُڑتی ہیں' اور حقوق ادا ہوتے ہیں۔ یہ زیادہ عورتوں کے ذریعہ سے ہوتے ہیں ___ اگر عورت بد سلیقہ ہو' وہ توڑ پیدا کردیتی ہے۔ اس کے اندر سلیقہ ہو' خاندانوں کو ملادیتی ہے۔ محلِ محبت فی الحقیقت عورت ہے۔ اس لئے کہ اسی سے محبتوں کے اگلے سلسلے چلتے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' حبب الی من دنیاکم ثلاث۔ تمہاری دنیا میں مجھے تین چیزیں پسند ہیں۔ اس میں سے خوشبو کو پسند فرمایا، نماز کو پسند فرمایا' اور عورت کو پسند فرمایا ___ اس واسطے کہ خوشبو لگے گی' تو ملائکہ کا ہجوم ہو جائے گا۔ یہ بھی محبت باہمی کا ذریعہ بن جائے گی۔ عورت آئے گی' یہ بھی خاندانوں کے جُڑ جانے کا ذریعہ بن جائے گی۔ اس سے بھی محبت واتحاد قائم ہوا۔ تو نکاح کی بڑی غرض وغایت وحدتِ باہمی اور سکون باہمی ہے۔

نکاح کی غرض وغایت

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جو نکاح کی غرض وغایت ذکر کی گئی' وہ سکونِ باہمی ذکر کی گئی ہے۔ لیکن نسل بڑھنا' یہ تو طبعی طور پر بڑھے گی۔ غرض وغایت اصلی جو ہے وہ یہ ہے :
وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ تم میں سے تمہارا جوڑی جوڑا نکال دیا۔ مرد میں سے عورت نکال دی' عورت میں سے مرد نکال دیا۔ ورنہ دونوں سلسلے الگ الگ ہیں۔ مرد میں سے اگر کوئی نکلتا تو مرد ہی نکلتا۔ عورت میں سے عورت نکلتی۔ اس قدر عجیب قدرت صنّاعی ہے کہ مرد میں سے عورت نکال دی۔ اور عورت میں سے مرد کو پیدا کیا ___ فرمایا کہ یہ ہماری قدرت کی نشانی ہے کہ تم میں سے تمہارا جوڑا نکالا۔ اگر عورت انسانوں کی جنس میں سے نہ ہوتی' فرشتوں میں سے یا جنّات میں سے ہوتی' کبھی باہمی محبت قائم نہ ہوتی۔ دوسری جنس کے ساتھ میلان ہی نہیں ہوتا۔ جانوروں میں ہر طبقے میں ہزاروں مادائیں ہیں۔ شیر ہے تو شیرنی بھی ہے۔ بھیڑیا ہے تو اس کی مادہ بھی ہے۔ انسانوں کا کبھی رجوع نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ غیر جنس سے کبھی میلان نہیں۔ اپنی جنس کی طرف میلان ہوتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ ہماری قدرت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے میں سے تمہارا جوڑا پیدا کیا' تمہاری جنس میں سے اور تمہارے اندر میں سے' تاکہ تمہارا جب جُٹ بنے تو تمہارے میں محبت قائم ہو۔ اگر غیر جنس کا جوڑا ملادیتے۔ جنّی عورت بنادیتے' تمہارا رابطہ کبھی نہ ہوتا۔ وہ مقصد اور موضوع ختم ہوجاتا۔ تو ___ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ۔ تم میں سے تمہارے نفسوں میں سے پیدا کیا۔ اَزْوَاجًا تمہارے جوڑوں کو ___ کیوں پیدا کیا ___ ؟ لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا۔ تاکہ تم اس سے سکون حاصل کرو۔ وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اور تم خاوند بیوی میں محبت اور مودّت پیدا ہو۔ تم ایک دوسرے کے خیر خواہ بنو۔ ایک دوسرے میں تم میں محبت پیدا ہو۔ اس لئے ہم نے جوڑا بنایا ___ اور فرمایا ___ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ جو لوگ فکر رکھتے ہیں' وہ اس چیز کی قدر کریں گے' جو ہم کہہ رہے ہیں۔ جو بے فکر ہیں' عقل ہی نہیں رکھتے' انہیں کیا خبر ہوگی کہ اس میں کیا مصلحت ہے؟ ___ لیکن جب تم زندگی میں گزروگے' اور اس مقام پر آؤ گے۔ تمہیں قدر آئے گی کہ ہم نے تم کو کتنی بڑی نعمت دی ہے۔ جو تمہارا جوڑا تم میں سے پیدا کیا۔ تاکہ تم میں سکون پیدا ہو۔

نکاح اللہ کی قدرت کی نشانی بھی ہے

نکاح کو آیت کہا گیا ہے۔ آیت قدرت کی نشانی کو کہتے ہیں۔ کہ خدا ہی کرسکے' اسے دوسرا نہ کرسکے۔ اسے آیت کہتے ہیں۔ جیسے قرآن کریم کی آیتیں ہیں۔ آیتِ کرسی ہے' آیتِ استخلاف ہے' آیت الرّحمن ہے' آیتِ رحمت ہے۔ یہ اللہ کی آیتیں اور قدرت کی نشانیاں ہیں۔ کوئی دوسرا ایسا کلام نہیں لاسکتا ___ اسی طرح سے اس کے افعال میں بھی کچھ آیتیں ہیں۔ فرمایا۔ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا۔ یہ ہماری آیتوں میں سے ہے کہ زمین ہمیں بناسکتے ہیں' کوئی دوسرا نہیں۔ زمین مردہ ہوجاتی ہے' بارش برسا کے ہم اسے دوبارہ زندہ کردیتے ہیں ___ کہیں فرمایا۔ انّ الشمس والقمر اٰیتان من اٰیٰت اللّٰہ لا ینخسفان من موت احدٍ ولا لحیاتہ۔ سورج اور چاند اللہ کی قدرت کی آیتوں میں سے دو آیتیں ہیں' جیسے قرآن کی آیت کا جواب نہیں۔ ان آیتوں کا بھی جواب نہیں لاسکتا کہ اس جیسا کوئی سورج بنادے۔ چاند جیسا چاند بنادے۔ تو

زمین سورج اور چاند کو بھی آیت کہا، اور فرمایا وَاٰیَۃٌ لَّھُمُ الَّیْلُ یہ جو رات ہے یہ ہماری قدرت کی نشانی اور آیت ہے اسی کے اندر سے جب ہم کھینچتے ہیں' تو دن نکل آتا ہے۔ اندھیروں میں سے چاند نکل آتا ہے۔ ابھی دنیا پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کہیں نور کا نشان نہیں تھا۔ انسانوں نے بے چاروں نے محنت کر کے مصنوعی انڈے' قمقمے لاکھوں چلائے۔ چاند نا تو ہو گیا۔ مگر رات بدستور رہی۔ دن نہیں نکلا۔ ہماری قدرت دیکھو۔ جب دن نکالنا چاہتے ہیں۔ بس سورج کی آمد آمد ہوئی' اور رات غائب ہوئی۔ یا تو دُنیا پر ظلمت چھائی ہوئی تھی یا ایک دَم چاند کی حکومت قائم ہو گئی۔ ایک دم عالم میں نُور پھیل گیا۔ یہ ہماری قدرت کی نشانی ہے۔

اسی طرح سے قدرت کی نشانی نکاح کو بھی کہا گیا ہے۔ آپ کہیں گے نکاح میں نشانی ہونے کی کیا بات ہے؟ دو مرد عورت کا نکاح کر دیا۔ اس میں نشانی ہونے کی کیا بات ہے؟ کہ اللہ ہی بنا سکتا ہے اور کوئی نہیں۔ تو نکاح میں آیت ہونے کی کیا شان ہے؟ خطیب نے خطبہ پڑھ دیا۔ مولانا انصاری صاحب نے بڑا عمدہ خطبہ پڑھا' ایجاب و قبول ہو گیا۔ اس میں قدرت کی نشانی کیا ہے؟

اس میں قدرت کی نشانی یہ ہے کہ دو بول پڑھے جانے سے پہلے مرد کو عورت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بالکل ایک اجنبیت تھی۔ اگر رشتہ داری بھی ہوگی' تو رشتہ داریاں ہزاروں سے ہوتی ہیں' لیکن یہ کہ اس مرد کا قلب کا لگاؤ اس عورت سے تھا' قطعاً نہیں یا اس عورت کا لگاؤ مرد سے تھا' قطعاً نہیں۔ وہ بالکل اجنبی' یہ بالکل اجنبی' اس کا دل اُس سے بیگانہ' اُس کا دل اِس سے۔ لیکن جہاں چار حروف پڑھے گئے' ایجاب و قبول ہوا۔ ایک دَم انقلاب پیدا ہوا۔ اب اس مرد کے دل کا تعلق اس عورت سے قائم ہوا۔ ایسے وقت اگر یہ خبر آئے کہ میری بیوی کو تکلیف ہے' اسے دُکھ پہنچے گا۔ اگر اسے پہلے خبر پہنچتی تو کہتا ہزاروں عورتیں تکلیف میں ہوں گی۔ لیکن چار حرف پڑھے گئے' اور قلب کا رابطہ قائم ہو گیا ___ عورت کو اگر اطلاع ہو جائے کہ جس سے میرا نکاح ہوا ہے خدانخواستہ وہ کسی تکلیف میں ہے۔ وہ پریشان ہو جائے گی۔ لیکن نکاح پڑھے جانے سے پہلے پچاس خبریں آئیں۔ وہ کہتی ہزاروں مرد ہیں' عزیز بھی ہیں' رشتہ دار بھی ہیں' مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟۔ یہ دو حرف پڑھنے کے بعد جو انقلاب عظیم برپا ہوا' یہ اللہ کے سوا کون کر سکتا ہے؟ دلوں کو ایک دم موم اور مائل کر دیا۔ ابھی اجنبیت تھی' ابھی یگانگت پیدا ہو گئی۔ ابھی بے تعلقی تھی' منٹ بھر کے بعد تعلق پیدا ہو گیا۔ یہ مرد عورت بے واسطہ تھے' اب ایک دم واسطہ پیدا ہو گیا۔ ایسے میں اگر کوئی خوشی کی خبر بیوی کی نسبت آئی' خاوند کا دل بڑھ جائے گا' کہ جس سے میرا نکاح ہوا' اس کی کیسی عمدہ خبر ملی۔ خاوند کی طرف سے کوئی خوشی کی خبر پہنچے' اس کا دل بڑھ جائے گا کہ جس سے میرا رشتہ قائم ہوا۔ اس کے لئے بڑی عزت کا سامان ہے۔ وہ عورتوں میں سر اونچا کرے گی کہ میرے لئے فخر کی بات ہے۔ یہ مردوں میں سر اُونچا کرے گا۔ لیکن جب تک چار حرف نہیں پڑھے گئے تھے' نہ اِس کا سر اونچا تھا' نہ اُس کا سر اونچا تھا۔ یہ جو ایک دم عظیم انقلاب برپا ہو گیا' یہ خدا کے سوا کون کر سکتا ہے؟ میرا آپ کا کام تو نہیں ہے۔ یہی معنے ہیں نشانی ہونے کے' کہ قلوب میں' روحوں میں انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ ابھی کچھ تھا' ابھی کچھ ہو گیا۔ اس لئے فرمایا۔ ومن آیٰتہٖ اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم میں سے تمہارا جوڑا نکالا اور یہ اسی کی نشانی ہے بھی کہ تم میں دو حرف کے پڑھے جانے سے اچانک سکون و مودّت پیدا کر دیا۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے اسے موضعِ انعام میں ذکر فرمایا۔ معلوم ہوتا ہے اللہ کو یہ محبوب و مطلوب ہے کہ یہ خاوند بیوی ملیں۔ ان میں محبت پیدا ہو۔ غرض و غایتِ نکاح کی یہ ذکر کی گئی۔ تو جب اللہ کا منشاء یہ ہے کہ مرد عورت جن کا نکاح ہے' وہ محبت سے ملیں۔ تو انبیاء کیسے نہیں پسند کریں گے؟ انبیاءؑ وہی چیز پسند کرتے ہیں جو اللہ کو پسند ہو۔ وہ اللہ کے ترجمان بن کر آتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم

السلام کو بھی پسند ہے کہ محبّت باہمی پیدا ہو جائے۔

خانگی زندگی میں سکون کا راز

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات ایسی چیزیں عمل میں لاتے تھے جس سے محبت بڑھے۔ حدیث میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ بیٹھ کر ایک برتن میں کھانا کھاتے۔ اور ایسے دنوں میں جب وہ نماز نہیں پڑھ سکتی تھیں ___ زمانۂ جاہلیت میں دستور یہ تھا' ایامِ حیض میں عورت کو اچھوت سمجھتے تھے۔ اس کے سائے کو بھی ناپاک سمجھتے تھے۔ ایک الگ کوٹھری میں بٹھا دیتے تھے' روٹی پانی بھی دیتے تھے تو بانس کے نلکے سے دیتے تھے کہ کہیں اس کا سایہ نہ پڑجائے۔ یہ نجس ہو گئی۔ اسلام نے اس خیال کو مٹایا کہ یہ بیہودگی ہے۔ وہ نجاستِ حکمی ہے۔ اللہ کا حکم ہے۔ کوئی اس کا عین اور اس کا اندر اور بدن تھوڑا ناپاک ہوا ہے۔ وہ تو ایسا ہے جیسے کوئی استنجا کر کے آئے' تو وضو کرنی واجب۔ وہ حکمی نجاست ہے' یہ تھوڑا ہی ہے کہ کوئی بُرائی اور گندگی لگی ہوئی ہے۔

حکمی طور پر نجاست ہے۔ حکم ہے کہ پاک بنالو۔ طاہر بن جاؤ۔ اسی طرح سے ایامِ حیض میں جو نجاست ہے' وہ حکمی ہے' یہ نہیں کہ بدن پر نجاست لگی ہوئی ہے۔ اس کا دھونا ضروری ہے۔ حکمِ خداوندی ہے نجس سمجھو' پاک بناؤ۔ مگر زمانۂ جاہلیت والے اس نجاست کو اتنی بڑی نجاست سمجھتے تھے کہ عورت کو اچھوت سمجھتے تھے۔ اس کا کھانا' پینا اور مکان تک الگ۔ اس کے سائے سے بچتے تھے۔ اسلام نے یہ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عین اس زمانے میں جب صدیقہؓ پر ایامِ حیض گزر رہے ہیں۔ ایک برتن میں کھانا کھاتے۔ اور نہ صرف یہی بلکہ یہ بھی حدیث میں ہے صدیقہؓ لقمہ لیتیں' منہ میں رکھ لیا' زبان لگا دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس سے چھین کے خود تناول فرمالیا۔ تاکہ امّت کو بتلادیں کہ عورت کی ذات میں کوئی نجاست نہیں آتی۔ اس سے محبّت قطع کردینا' اسے اچھوت بنادینا' یہ انسانیت کے خلاف بات ہے۔ یہ اسی لئے تھا تاکہ اس تعلّق کی مضبوطی زیادہ سے زیادہ ہو۔ اس واسطے اس قسم کی چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم عملاً فرماتے۔

حدیث میں ہے ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا آؤ ہم اور تم مل کر دوڑیں۔ آپس میں بھاگ ہوئی کہ کون آگے نکلتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے' صدیقہؓ پیچھے رہ گئیں۔ آخیر عمر میں جب بدن مبارک بھاری پڑ گیا۔ پھر ایک دفعہ فرمایا کہ اچھا ہم اور تم مل کے بھاگیں۔ کون آگے نکلتا ہے۔ اب کے صدیقہؓ آگے نکل گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک بھاری پڑ گیا تھا۔ فرمایا تلک بتلک چلو برابر سرابر قصہ ہو گیا۔ ایک دفعہ ہم جیت گئے تھے۔ ایک دفعہ تم جیت گئی سہی۔

اب کوئی کہے' انبیاء علیہم السلام کو بھاگ دوڑ سے کیا تعلّق؟ حقیقت یہ ہے کہ عورت کے دل کو مٹھی میں لینے کے لئے' اس کی دلداری کرنے کے لئے یہ چیزیں فرمائیں ہیں ___ اور فرمایا' ہر وہ لہو لعب جو حرام ہے بیوی کے ساتھ جائز ہے۔ تاکہ اس کا دل مٹھی میں آئے' اس کی دلداری و دل جوئی ہو ___ مقصد یہ ہے' اس کے لئے تسلّی کا سامان ہو۔ اس کے ساتھ محبّت و یگانگت کا معاملہ ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

ان اکرم المؤمنین احسنکم اخلاقاً الطفکم اھلاً

''تم میں سے زیادہ قابلِ تکریم مسلمان وہ ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں۔ اور بیویوں کے

ساتھ لطف ومحبت اور مدارات کا برتاؤ کرتا ہو"۔

سخت گیری نہ کرتا ہو' تیز و تُند لب ولہجے سے نہ بولتا ہو۔ ہر وقت ڈرانے اور دھمکانے کے فکر میں نہ رہے' جیسے بے وقوف خاوندوں کی عادت ہوتی ہے اپنی شوخی اور قوت جتانے اور حکومت قائم رکھنے کے لئے سخت کلامی سے پیش آتے ہیں۔ جب آئیں تو ناک منہ چڑھی ہوئی ہے' تاکہ بیوی بیچاری ڈر جائے کہ کوئی شیر اور بھیڑیا آگیا۔ تاکہ میرا رُعب قائم رہے۔ یہ نہایت لغو حرکت ہے۔ انسانیت و محبت کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔

ایک صحابی ہیں حضرت انجشہؓ ، انہوں نے کہیں اپنی بیوی کو مارا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غضبناک ہوئے۔ چہرہ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا۔ فرمایا :

اے انجشہ! کانچ کی شیشیوں کو توڑ ڈالنا کوئی جوان مردی کی بات ہے؟ عورت پر ہاتھ اٹھایا ___ ؟ لڑنا تھا تو کسی مدمقابل سے لڑتے۔ اپنے سے زیادہ قوی سے لڑتے۔ اگر تمہیں کوئی شوخی اور طاقت دکھلانی تھی۔ عورت پر ہاتھ اُٹھایا؟ نازک صنف کو مارنا شروع کیا' تاکہ آپ کی بہادری واضح ہو۔ اتنے بڑے بہادر ہو' عورت کو مارا۔ اور آکے فخر کیا کہ میں نے مارا۔ بھئی کسی پہلوان پہ ہاتھ اٹھایا ہوتا۔ کسی جوانمرد کے مقابلے پہ آتے۔ تم ایک مارتے' وہ چار رسید کرتا۔ جوانی معلوم ہو جاتی۔ عورت کے مقابلے پہ جوانی دکھلانا کہ میں بڑا طاقت ور ہوں۔ یہ تو کمینوں کی سی بات ہے۔ شرافت کی بات نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے' خفا ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ تو یہ تھا کہ ایک پیالے میں کھانا کھاتے ہیں۔ بعض اوقات بھاگنے دوڑنے کو فرمایا' تاکہ عورت کا دل مٹھی میں رہے' اس کی مدارات ہو۔ اس کے ساتھ لطف وکرم کا برتاؤ ہو۔ اور دوسرا برتاؤ جو حضرت انجشہؓ نے کیا' تو آپ نے ڈانٹا' خفا ہوئے اور ناراض ہوئے۔

اس سے معلوم ہُوا انبیاء علیہم السّلام کا مقصد یہ ہے کہ دونوں خاوند بیوی میں مدارات کا برتاؤ رہے ___ اور وجہ اس کی یہ ہے اگر یہ دونوں مدارات اور لُطف کا برتاؤ کریں گے' خانگی زندگی بہترین ہو جائے گی۔ جس گھر کے اندر خاوند بیوی ایک ذات ہوں' ایک دل اور ایک جان ہوں۔ اولاد میں بھی محبت پیدا ہو گی۔ عزیزوں میں بھی محبت پیدا ہو گی۔

اور جہاں خاوند بیوی کی لڑائی ہے۔ یہ اُس کی صورت دیکھ کر منہ بِھُور رہا ہے۔ وہ اِس کی صورت دیکھ کر منہ بِھُور رہی ہے' اس کا نتیجہ ہو گا کہ اولاد میں بھی وہی چیزیں پیدا ہوں گی۔ اور گھر جہنم بن جائے گا۔ اُس کا منہ اِدھر کو' اِس کا منہ اُدھر کو۔ وہ گھر کیا ہوا ، وہ تو دوزخ ہو جائے گی۔ جنت جب بنے گا گھر' جب ایک کو دیکھ کر دوسرا خوش ہو۔

نیک بیوی آدمی کی سعادت کی علامت ہے

حدیث میں فرمایا ہے آدمی کی خوش نصیبی اور سعادت کی تین علامتیں ہیں۔ پہلی تو یہ ہے کہ آدمی کا رزق اس کے وطن میں اُترے' اس کے لئے مارا مارا نہ پھرے کہ دنیا میں رزق کی تلاش کرتا ہوا جا رہا ہے۔ جہاں گھر ہے وہیں رزق کا سامان اللہ نے کر دیا۔ پہلی علامت خوش نصیبی کی یہ ہے۔

دوسری علامت یہ فرمائی گئی' اس کو گھر وسیع ملے' تنگ کوٹھری نہ ہو کہ دیکھ کر اس کے دل میں تنگی اور گھٹن پیدا ہو جائے۔ صحن اس کا وسیع ہو' مکان ذرا اچھا ہو' اس لئے کہ مکان کی خوشنمائی سے دل میں بھی وسعت پیدا ہوتی ہے' اور مکان کی تنگی اور گھٹن سے دل میں بھی تنگی اور گھٹن پیدا ہوتی ہے۔ تو دوسری علامت خوش نصیبی کی یہ فرمائی گئی کہ مکان اور اس کا صحن وسیع ہو' گھر اچھا ملے۔ تاکہ دل میں بھی وسعت

پیدا ہو ___

اور تیسری علامت یہ ہے کہ بیوی نیک بخت ملے۔ جب اس کی صورت دیکھے' دل میں خوشی پیدا ہوجائے' اور جب اسے گھر میں چھوڑ کر جائے تو وہ مرد کی عزت و ناموس کی حفاظت کرے۔ ایسی صالحہ بیوی کہ وہ اللہ کا بھی حق ادا کرے' اپنے خاوند کا بھی حق ادا کرے۔ فرمایا' وہ آدمی خوش نصیب ہے جس کے پاس یہ تین چیزیں ہوں۔ گھر بھی درست ہو' بیوی بھی درست ہو۔ روزی بھی اس کی اس کے وطن میں اترے۔ باہر مارا مارا نہ پھرے۔ یہ تین علامتیں خوش نصیبی کی فرمائی گئیں۔ ان میں بڑی علامت یہ ہے کہ بیوی صالحہ ملے۔

جب اسے دیکھے' دل کے اندر خوشی بھر جائے اور جب اس کے ساتھ برتاؤ اور معاملہ کرے' خوشی پیدا ہو کہ بڑی سمجھدار ہے اور جب اسے گھر پہ چھوڑ کے جائے تو اتنا مطمئن رہے کہ میرے گھر میں کوئی خرابی نہیں آسکتی' میری بیوی سلیقہ مند ہے' خوش نصیب ہے۔ تو واقعی بیوی کی صلاحیت و سوچ مندی' اور اعلیٰ درجہ کی ہوش مندی نہایت ہی بڑی نعمت' اور ایک بڑی مسرت ہوتی ہے۔

فنِ نحو کے امام یحییٰ ابن اکثمؒ ہیں۔ ان کے واقعات میں ہے۔ بڑے جلیل القدر عالم تھے۔ مگر انتہائی بدصورت' رنگ بھی کالا' ہونٹ بھی موٹے' آنکھوں میں زردی اور دانتوں میں بھی زردی ___ غرضیکہ جتنی بدصورتی کی علامتیں ہوسکتی ہیں وہ سب جمع تھیں۔ اور بیوی اتنی حسین و جمیل تھی کہ ملکوں میں اس کا جواب موجود نہیں۔ جتنی علامتیں حسن و جمال کی ہوسکتی تھیں' وہ بیوی میں تھیں ___ جب دونوں خاوند بیوی بیٹھتے' جیسے دھوپ چھاؤں بیٹھی ہوتی ہے۔ ایک طرف دھوپ چھن رہی ہے۔ دوسری طرف رات نظر آرہی ہے۔ جب ایک دوسرے کے سامنے بیٹھتے' تو یحییٰ ابن اکثم بیوی کو خطاب کرکے کہتے۔ تو بھی یقیناً جنتی ہے۔ میں بھی یقیناً جنتی ہوں۔ دونوں جنتی ہیں ___ کیوں؟ ___ اس واسطے کہ مجھے تو ملی۔ تجھ جیسی بیوی۔ تو میرا کوئی منٹ شکرگزاری سے خالی نہیں ہوگا۔ شکر کے راستے سے تو جنت میں جاؤں گا۔ اور تجھے ملا مجھ جیسا خاوند کہ کوئی منٹ بھی تیرا صبر سے خالی نہیں۔ تو صبر کے راستے سے جنت میں پہنچ جائے گی۔ میں بھی جنتی' تو بھی جنتی۔

حقیقت یہی ہے اگر بیوی صالحہ ہو اور حسن و جمال بھی ہو۔ دونوں کی خوش نصیبی ہے۔ وہ اسے دیکھ کے خوش ہے' وہ اس سے راضی ہے ___ تو محبت باہمی مقصود ہے۔

بیوی کے انتخاب کا معیار

مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھ لینا چاہئے کہ محبت عورت سے محض صورت کی وجہ سے نہ کرنی چاہیے۔ صورت ڈھلتی ہوئی دھوپ ہے۔ آج اچھی صورت ہے' کل کو بگڑ گئی۔ بڑھاپے میں تو کم سے کم بگڑ ہی جاتی ہے۔ اور اللہ بھلا کرے بخار کا کہ وہ تین دن ہی میں حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ تین دن بخار آیا۔ نہ رنگت رہی' نہ عنفوانی رہی۔ گلاب کا سا رنگ تھا وہ ختم ہوگیا قصہ۔ اور اگر بخار نہ آئے تو بڑھاپا تو کہیں گیا ہی نہیں۔ بڑھاپا آکے صورت کو بگاڑ دیتا ہے۔ اور بڑھاپا بھی نہ آئے تو موت کہیں گئی ہی نہیں۔ وہ سب کی صورتیں ختم کردیتی ہے۔ صورت ایک آنی جانی چیز ہے۔ اس لئے اگر کوئی بیوی سے محبت محض صورت کی وجہ سے کرے گا' وہ محبت غائب ہوجائے گی۔ اس لئے کہ جب صورت ڈھلی' محبت بھی ڈھل جائے گی ___

اس واسطے محبت کاہے سے کرنی چاہیے؟ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا معیار ارشاد فرمایا ___ فرمایا:

تنکح المرأة لمالها ولحسبها ولجمالها ولدینها۔

عورت سے چار وجوہ سے نکاح کیا جاتا ہے' کبھی تو اس کی خوبصورتی کی وجہ سے۔ صاحبِ جمال ہے۔ آدمی کا دل چاہا' نکاح کرلیا۔ کبھی اس کے مالدار ہونے کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے کہ نکاح کریں گے تو جائیداد قبضے میں آئے گی۔ رئیس بن کے بیٹھ جائیں گے۔ کبھی اس کی حیثیتِ عُرفی کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے کہ بڑے اونچے خاندان کی ہے' اس کا نام بلند ہے۔ اس کے ماں باپ کی عزت دنیا میں قائم ہے۔ میں ایسی عورت سے نکاح کروں گا تو میری بھی عزت بڑھ جائے گی۔ اور کبھی اس کی دینداری کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے' کہ اس کا دین بہت اعلیٰ ہے ___ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فاظفر بذات الدین نہ صورت کو دیکھو' نہ حسب کو دیکھو' نہ دولت کو دیکھو' دین کو دیکھو ___ اس لئے کہ اگر دین کی وجہ سے محبت قائم کریں گے' تو مرتے دم تک قائم رہے گی۔ اس میں ڈھلاؤ کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن اگر صورت کی وجہ سے محبت کی' تو جہاں جوانی ڈھلی' محبت میں کمی آگئی۔ اور آپس میں لڑائی شروع ہوگئی۔ دولت کی وجہ سے محبت کی۔ تو دولت کو رات دن آفت آتی رہتی ہے۔ جائیداد وغیرہ خدانخواستہ ختم ہوگئی' محبت کو بھی خیرباد کہیں گے' جب وہ بات ہی نہیں رہی' جس کی وجہ سے محبت تھی۔ اور اگر حیثیتِ عرفی' یا ظاہری عزت کی وجہ سے کی۔ تو عزت وذلت تو اضافی چیز ہے' کبھی عزت ہوجاتی ہے' کبھی ذلت ہوجاتی ہے۔ کبھی وقار' کبھی بے وقاری ___ تو جہاں بے وقاری پیدا ہوئی۔ آپ کی محبت ختم ہوجائے گی ___ لیکن اگر دین کی وجہ سے محبت ہے' فرض کرلو عورت کالی کلوٹی ہے۔ آدمی یہ سمجھے گا' حق تعالیٰ نے اس کا حق میرے اوپر قائم کیا' میرا فرض ہے کہ میں اس کا حق ادا کروں۔ چاہے یہ گوری ہے' چاہے یہ کالی ہے۔ چاہے یہ دولت مند ہے۔ چاہے یہ مفلس ہے۔ چاہے یہ باحیثیت ہے' چاہے یہ بے حیثیت ہے۔ میری قسمت میں لکھ دی گئی' میرے اوپر اس کا حق آگیا ہے۔ میرا فرض ہے کہ مرتے دم تک اس کا حق ادا کروں۔ دین کی وجہ سے مرد وعورت کا معاملہ سدابہار ہوجاتا ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نکاح دین کی وجہ سے کرو۔ تاکہ محبت میں دوام حاصل ہوجائے۔ حقوق کی ادائیگی دائمی طور پر ہوجائے۔

تو انبیاء علیہم السلام کے ہاں نکاح سنّت ہے اس لئے کہ وہ محبت اور اتحادِ باہمی کا ذریعہ ہے۔ شیاطین کے ہاں نکاح سے بُغض ہے۔ اس لئے کہ وہ اتحاد کا ذریعہ ہے۔ شیاطین چاہتے ہیں کہ لڑائیاں ہوں' پھوٹ پڑے۔ نکاح ہونے نہیں دیتے' انہیں نکاح سے بُرائی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آدمی زناکاری اور بدکاری کی طرف چلے' اس لئے کہ بدکاری کا انجام لڑائی' پھوٹ' قلب کی کدورت اور قلق ہے۔

زوجین میں لڑائی بڑے فتنے کا پیش خیمہ بنتی ہے

یہی وجہ ہے' حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے' شیطان روزانہ عصر کی نماز کے بعد سمندر کے کنارے یا پانی کے اوپر اپنا تخت بچھاتا ہے اور اس پر بیٹھتا ہے ___ پانی پر اس لئے بچھاتا ہے کہ اللہ میاں سے مقابلہ کرتا ہے۔ ان کا پانی کے اوپر عرش ہے۔ تو میں بھی اپنا عرش بچھاتا ہوں ___ فرق اتنا ہے' ان کا عرش جو پانی پر ہے وہ نہایت لطیف اور پاک ہوتا ہے۔ اور یہ کڑوا' نمکین' اور بعض اوقات اس سے اذیت بھی پہنچتی ہے۔ یہ مادی پانی ہے۔ وہ روحانی پانی ہے۔ مگر بہرحال شیطان ظاہری صورت بناتا ہے کہ اگر اللہ میاں عرش پر ہے' تو میں بھی عرش پر ہوں۔ ان کا عرش پانی پر' تو میرا عرش بھی پانی پر۔ کیونکہ یہ حق کے مقابلے میں ہے۔ تو وہاں بھی کمبخت مقابلہ ہی ٹھانتا ہے۔ صورت ہی مقابلے کی بنالیتا ہے' روزانہ سمندر پر تخت بچھا کر اس کے اوپر بیٹھتا ہے ___

کیوں بیٹھتا ہے؟۔ اس کے شتونگڑے‘ اس کی اولاد وذریت دن بھر میں لوگوں سے بدکاریاں کراتی ہیں۔ ہر ایک آکر اس کے پاس رپورٹ دیتا ہے۔ ایک آتا ہے۔ میں نے فلاں کی نماز قضا کردی۔ شیطان کہتا ہے کہ کام تو بہت عمدہ کیا‘ مگر کوئی بڑی بات نہیں کی‘ کہ تجھے انعام یا شاباش دوں۔ دوسرا آتا ہے میں نے فلاں سے زنا کروادیا ہے۔ کہتا ہے کہ ہاں ٹھیک کی۔ مناسب کام کیا۔ کوئی بڑا قابل قدر کام نہیں کیا۔ ایک آتا ہے میں نے جھوٹ بُلوادیا‘ جھوٹی گواہی دِلوادی۔ کہتا ہے تو نے بھی اچھا کام کیا۔ مگر کوئی بڑی بات نہیں ہوئی۔ ایک آتا ہے کہتا ہے کہ میں نے آج خاوند بیوی میں لڑائی کرادی۔ حدیث میں ہے اس کو سینے سے لگاتا ہے کہ تو میرا سپوت۔ تو نے بڑا کام کیا ہے۔ تیرے سے میں خوش ہوں۔ تیرے سے زیادہ بہترین میری دوسری اولاد نہیں ہے۔ تو نے یہ کام کیا کہ خاوند بیوی میں لڑائی کرادی۔ تو سینے سے لگاتا ہے‘ چمٹاتا ہے‘ اسے شاباش دیتا ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زنا کا فعل بُرا ہے۔ اس پر شاباش دینی چاہئے تھی۔ یہ خاوند بیوی میں لڑائی کرادی۔ یہ تو گھروں میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ لڑائی بھی ہوجاتی ہے‘ صلح بھی ہوجاتی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کیوں خوش ہوتا ہے؟ اس لئے کہ خاوند بیوی کی لڑائی دو کی لڑائی نہیں ہے‘ بلکہ سَو کی لڑائی ہے۔ اس لئے کہ جب خاوند بیوی لڑیں گے‘ تو خاوند کے جتنے عزیز ہیں‘ وہ خاوند کی حمایت کریں گے۔ بیوی کے جتنے رشتے دار ہیں‘ وہ بیوی کی حمایت کریں گے۔ تو دو آدمیوں میں نہیں چلی‘ بلکہ دو گھرانوں میں چل گئی۔ اب گھرانے ایک دوسرے سے منہ پھیرے ہوئے بیٹھے ہیں۔ وہ اِن کے بِالمقابل‘ یہ اُن کے بِالمقابل۔ پھر ان دونوں گھرانوں کے لوگ آدھے اُدھر آجائیں گے‘ آدھے اِدھر آجائیں گے۔ بیوی والے بیوی کی طرف‘ خاوند والے خاوند کی طرف۔ تو دو گھروں میں نہیں چلی‘ دو خاندانوں میں چلی جاتی ہے۔

اور اگر خاوند بیوی باحیثیت ہیں۔ جیسے مَلِک اور مَلِکہ‘ بادشاہ اور بادشاہ بیگم ہیں۔ ان میں لڑائی ہوجائے‘ تو فوجیں کٹ مرتی ہیں۔ دو مُلکوں میں لڑائی ہوجاتی ہے اور جنگِ عظیم برپا ہوتی ہے۔ تو دو کی لڑائی‘ دَر حقیقت سینکڑوں کی لڑائی ہے ___ اور جب دو خاندانوں میں چلتی ہے‘ پھر کیا ہوتا ہے؟ بدگوئی الگ‘ وہ اِسے بُرا کہیں گے یہ اُسے۔ غیبت کا گناہ سرزَد ہوا۔ یہ اس کے ایذا رسانی کے درپے ہے۔ وہ اس کے درپے ہے۔ یہ ایذا رسانی کا گناہ الگ۔ اس کے بعد مقدمہ بازی چلے گی۔ وہ الگ بے عزتی‘ یہ الگ بے عزتی‘ پھر مقدمہ بازی میں جانبین کا روپیہ خرچ ہوا۔ لاکھوں اُنہوں نے برباد کئے‘ لاکھوں اِنہوں نے‘ جائیداد ختم ہوئی۔ تو ایک گناہ میں سینکڑوں گناہ چھپے ہوئے ہیں۔ جب دو میں لڑائی ہوگی‘ تو غیبتیں الگ ہوں گی۔ چغلخوریاں الگ ہوں گی‘ مقدمہ بازی الگ ہوگی‘ مال الگ ختم ہوگا‘ گھر الگ بے عزت ہوگا‘ شہر میں الگ فتنہ برپا ہوگا۔ لوگ کہیں گے‘ میاں دیکھا۔ فلاں دو بڑے بن رہے تھے۔ کیسی جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے۔ دیکھا آپ نے لڑائی ہو رہی ہے؟ وہ الگ تحقیر کر رہا ہے‘ الگ بُرائی بیان کر رہا ہے۔ تو بدنامی الگ‘ مال کی بربادی الگ‘ عزت کی تباہی الگ‘ سکونِ دِل الگ مِٹا۔ بیوی خاوند کی لڑائی ایک گناہ نہیں‘ بلکہ سینکڑوں گناہ اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ اس لیے شیطان خوش ہوتا ہے کہ اس میں فتنہ پھیلتا ہے‘ اور ہزاروں گناہ اپنے اندر رکھتا ہے ___ اگر کسی نے جھوٹ بول دیا۔ بس ایک گناہ ہے‘ ختم ہوگیا‘ لیکن اس گناہ میں غیبت بھی ہے۔ عزت کی تباہی ہے‘ مال کی بربادی ہے‘ وغیرہ وغیرہ۔ شیطان کے لئے کتنا خوشی کا موقع ہے؟

تو انبیاء علیہم السلام نکاح کے ختم ہونے پر خفا اور ناراض ہیں۔ اور شیاطین نکاح کے کمزور ہونے اور ٹوٹ جانے پر خوش ہیں۔ اس لئے کہ نکاح ٹوٹنے سے فتنہ پھیلے گا۔ اور اگر نکاح جڑا رہے گا‘ تو امانت داری پھیلے گی۔ انبیاء امانت کے حامل ہیں۔ شیاطین فتنہ کے حامل ہیں‘ وہ فتنہ پردازی پر خوش ہیں۔ یہ امانت داری پر

خوش ہیں۔ انبیاء کو نکاح سے محبت ہے اور شیاطین کو اس کے ٹوٹ جانے سے محبت ہے۔

بیوی پر خاوند کی انتہائی اِطاعت واجب ہے

اس لئے خاوند سے کہا گیا ہے کہ تو عورت سے لُطف و کرم کا معاملہ کر۔ عورت کو کہا گیا ہے کہ تو اپنے خاوند کے سامنے انتہائی اطاعت سے پیش آ۔ حدیث میں ہے اگر خاوند کسی کام کا حکم دے۔ اور عورت نہ مانے' تو جس دن اور رات میں اس نے حکم نہیں مانا' اس دن اور رات میں تمام ملا ئکہ اس عورت کے اوپر لعنت کرتے ہیں' کہ تو نے خاوند کی نافرمانی کی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اگر میں غیرُ اللہ کے لئے کسی کو سجدہ کا حکم دیتا ہے تو بیویوں کو حکم دیتا کہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کرو۔ بیوی کے مقابلے میں اتنا واجبُ الاحترام شریعتِ اسلام نے خاوند کو بنایا' کہ اگر غیرُ اللہ کے لئے سجدہ حرام نہ ہوتا تو سجدے کرنے کی اجازت دے دیتا' اس تک کے کئے میں تیار ہو جاتا ___ معلوم ہوا' بیوی کے اوپر اطاعت لازم ہے۔

گویا یوں سمجھو' کہ ایک تو ربِ حقیقی ہے' جو اللہ ربُ العزت ہے۔ عورت کے حق میں اس کا خاوند ربّ مجازی ہے' جو اس کی پال پرورش کرتا ہے' محنت کر کے کماتا ہے۔ بیوی کے ہاتھ پہ لا کے دیتا ہے' تو اس کے حق میں گویا وہ ایک مجازی طور پر رب ہے۔ اس واسطے عورت کا فرض ہے کہ وہ اپنے اس خاوند کی جو ربّ مجازی ہیں اور اللہ کا سایہ ہیں اس کے اوپر کی اطاعت کرے۔

اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ جب نکاح ہو گیا تو ظاہر بات ہے عورت پر ماں باپ کا تو کوئی حق باقی نہیں رہا۔ سوائے اس کے کہ تعظیم و توقیر کرے۔ لیکن یہ کہ خاوند کے مقابلے میں ماں باپ کوئی امر یا حکم دیں' اس کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔ جب عورت اپنے ماں باپ کے گھر سے آگئی' وہ گھر اس سے منقطع ہو گیا۔ ماں باپ کے حقوق ختم ہو گئے ___ اب تو وہ خاوند کے رحم و کرم پر ہے ___ اگر یہ اطاعت کرے گی' وہ رحم کرے گا۔ تو اسی کا گھر بنے گا۔ اور اگر اس نے لڑائی جھگڑا ٹھان لیا' اور اس نے سختی کی۔ ماں باپ کا تو گھر رہا نہیں کہ وہاں جا کے پناہ پکڑے' خاوند کو الگ ناراض کر دیا۔ نہ اِدھر کی رہی نہ اُدھر کی رہی ___ تو دانش مندی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ خاوند کی اطاعت کرے۔ نافرمانی کرنے میں نہ اس گھر کی رہے گی نہ ماں باپ کے گھر کی رہے گی ___ تو ادھر سے عورت کو یہ حکم دیا کہ انتہائی اطاعت کر۔ اور اگر تو نہیں کرے گی' ملا ئکہ علیہم السلام تجھ پر لعنت کریں گے ___ ادھر خاوند کو کہا کہ انتہائی شفقت کر۔ انتہائی مدارات کر۔ لطف و کرم کا برتاؤ کر۔ تو نے اگر ذرا کمی کی تو تیری گردن قیامت میں نپے گی کہ تجھے ہم نے بادشاہ بنایا تھا' تو نے اپنی رعیت کے ساتھ ظلم کیوں کیا؟ عورت تیرے عیال میں تھی' تیری زیرِ تربیت تھی۔ تجھے اس کے اوپر سختی کا کیا حق تھا؟

پھر یہ کہ عورت تجھے باندی بنا کے تھوڑا ہی دی گئی ہے کہ تیری محکومہ ملازمہ ہے وہ تو برابر کی شریک زندگی ہے۔ جو تیرا حق ہے' وہی اس کا حق ہے۔ کوئی باندی' ملازمہ اور نوکر نہیں ہے۔ تجھے کیا حق ہے کہ اسے حقیر سمجھے یا کم مرتبہ سمجھے؟ تو مرد کو کہا گیا کہ تو اس کی انتہائی توقیر کر۔ انتہائی محبت کر۔ عورت کو کہا تو انتہائی اطاعت کر۔ جب ادھر سے اطاعت' اُدھر سے شفقت ہو گی۔ تو گھریلو زندگی کی گاڑی اچھی طرح چلے گی۔ اگر ادھر سے اطاعت' اُدھر سے شفقت نہ ہو' تو گھر کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ گھر تباہ ہو جاتا ہے۔ اولاد ہوئی تو وہ بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ رشتہ دار اور ماں باپ الگ پریشان ہوتے ہیں۔ اس واسطے فرمایا گیا ہے کہ دونوں مل کر اس گھر کو چلاؤ۔ جیسے بیل گاڑی ہوتی ہے۔ دو بیل آگے جُڑے ہوتے ہیں تو بیل گاڑی چلتی ہے۔ اگر ایک کندھا ڈال

دے، گاڑی آگے نہیں چلے گی تو گھر کی گاڑی نہیں چل سکتی جب تک خاوند بیوی محبت سے مدارات سے نہ چلیں۔ اسی واسطے جگہ جگہ تاکید کی گئی۔

کم خرچ نکاح میں برکت دی جاتی ہے

مگر اس میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے۔ وہ یہ کہ یہ چیز جب ہوگی جب نکاح میں برکت ہو، اگر نکاح میں خدانخواستہ برکت نہ ہوئی، پھر بُرے آثار پڑتے ہیں۔ اور نکاح میں برکت کب ہوتی ہے؟ فرمایا گیا جس نکاح میں خرچ کم ہوگا اس میں برکت زیادہ ہوگی۔ جس نکاح میں خرچ زیادہ ہوگا، برکت اُٹھالی جائے گی ___ اس لئے کہ خرچ عموماً فخرو مباہات کی وجہ سے زیادہ ہوتا ہے کہ برادری میں ناک نہ کٹ جائے۔ ہم ذرا اونچے سمجھے جائیں۔ اس لئے آدمی حیثیت سے بڑھ کر خرچ زیادہ کرتا ہے۔ اور یہ غلطی ہے۔ اس لئے کہ جسے برادری کہتے ہیں، وہ ہر صورت میں ناک کاٹنے ہی کے فکر میں رہتی ہے۔ کتنا ہی خرچ کرلے، آدمی کی ناک نہیں رہتی ___ اس لئے کہ بھائی برادر اس فکر میں رہتے ہیں کہ ذرا سی کمزوری ملے، اسے ہی اُچھالتے ہیں۔ تو جسے ناک کہیں، وہ پھر بھی نہیں رہتی۔ تو مایہ بھی کھوئی، اور ناک بھی کٹوائی، فائدہ کیا ملا؟

وہ کسی ساہوکار نے اپنی بیٹی بیاہی، تو اس نے یہ سوچا کہ میں اتنا خرچ کروں کہ دنیا میں آج تک کسی نے نہ کیا ہو۔ تاکہ دنیا میں میرا نام ہو جائے ___ تو اس نے ایک ہزار آدمی کی تو بارات بُلائی۔ اور خُدا جانے پچیس چالیس قسم کے کھانے پکوائے۔ تمام کمرہ کھانوں سے بھر گیا۔ اور ہر ہر مہمان کے لئے کہیں بستر کہیں تکیے۔ غرض سامان کی انتہا کردی۔ اور چلتے ہوئے فی مہمان دس دس گنی بھی دیں۔ دس دس پونڈ بھی پیش کئے جو آج تک کسی نے نہیں دیئے تھے ___ مقصد یہ تھا کہ میرا نام ہو جائے کہ بھائی ساہوکار نے بڑی شادی کی۔ یہ سب کچھ کر کرا کے جب بارات رخصت ہوئی۔ لاکھوں روپے کا سامان بھی اپنی لڑکی کو دیا۔ تو ساہوکار ذرا میل بھر آگے چلا گیا، کہ کسی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھوں۔ تاکہ میری تعریف کرتے ہوئے لوگ جاویں گے، کہ بھائی لالہ جی نے بڑا کام کیا۔ اور ساہوکار نے بڑا جہیز دیا۔ تو ذرا دل میرا بڑھے گا۔ اس واسطے بارات کو رخصت کر کے، گھوڑے پر سوار ہو کر، دوسرے راستے سے میل بھر آگے جا کے آپ جھاڑی میں جا کر بیٹھ رہے، جہاں سے بارات گذرنی تھی۔ کہ لوگ جب تعریفیں کرتے ہوئے گذریں گے، میرا دل خوش ہوگا، اور میری محنت وصول ہو جائے گی۔ میں نے اپنا گھر کھویا ہے۔ گھر تو کھویا گیا، دل تو نہ کھویا جائے ___ جب وہاں بارات پہنچی۔ اتفاق سے وہاں زمین ناہموار تھی۔ اونچ نیچ تھی۔ مٹی بہت جمع ہو گئی تھی۔ اندیشہ تھا کہ اگر گاڑیاں گزریں، تو اُلٹ جائیں گی اور لوگ گریں گے۔ تو یہ ارادہ کیا گیا کہ بھئی پہلے مٹی درست کرلو۔ یہ جو مٹی جمع ہو گئی۔ اسے کھود کر ایک طرف پھینک دو۔ تو پھاوڑے کی تلاش ہوئی، جس سے مٹی کھودا کرتے ہیں۔ اتفاق سے پھاوڑا کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ اب کسی کو کیا خبر تھی کہ ہمیں راستہ میں سڑک بھی بنانی پڑے گی جو پھاوڑا رکھتے، کسی نے بھی نہیں رکھا۔ لوگوں نے کہا، بھئی! تلاش کرو جہیز میں ہوگا، سارے جہیز میں تلاش کیا، پھاوڑا نہ ملا ___ ساروں نے کہا۔ سسرے نے دیا ہی کیا، پھاوڑا تک تو دیا ہی نہیں ... بس ساہوکار اٹھے کہ لعنت اس بارات کے اوپر، لعنت اس خرچ کے اوپر، سارا گھر کھودیا، اور اب بھی میں سسرا ہی بنا رہا۔ اور یہ کہ کیا دیا سسرے نے، پھاوڑا تک تو دیا ہی نہیں۔

اور جو کچھ دیا تھا، وہ سب اکارت ___ تو جسے ناک کہتے ہیں۔ ناک رہ جانا، برادری والے کسی کی ناک نہیں رہنے دیتے۔ وہ ناک کاٹ کے ہی رہتے ہیں ___ پھر آدمی بے وجہ فضول اپنا گھر بھی تباہ کرے، ناک بھی

کٹوائے؟ موقع سے اعتدال کا جو درجہ ہے' اس کے مطابق خرچ کرے۔ بیٹی کو دینا ہے' ساری عمر دے سکتا ہے۔ یہ کیا ضروری کہ آج ہی دے۔ آج جو دے رہا ہے وہ محض نام آوری کے لئے دے رہا ہے۔ بیٹی پیش نظر نہیں ہوتی۔ ناک پیش نظر ہوتی ہے۔ شریعت یہ کہتی ہے اگر کچھ دو تو بیٹی کو دو۔ ناک کو کچھ مت دو۔ یہ رہنے والی نہیں' یہ تو کٹ جاتی ہے۔ بیٹی کو دے' تو ساری عمر دے سکتا ہے۔ مگر وہ بھی اعتدال کے ساتھ دے۔ اس لئے کہ اگر ایک ہی بیٹی ہے' چلو بہت سا دے دیا۔ لیکن اگر اور بھی بیٹی ہے' تو اور اولاد کا بھی حق ہے۔ اب نام آوری کے لئے سارا گھر ایک کے اوپر خرچ کر دیا' کل کو جب دوسری شادی ہو گی' اور ہاتھ پلے کچھ نہیں ہو گا۔ لوگ یہی کہیں گے کہ بڑا بے وقوف آدمی تھا۔ پہلی پہ تو اتنا خرچ کر دیا۔ دوسری اولاد کیا سوتیلی تھی' حقیقی نہیں تھی؟ اس کے لئے کچھ بھی نہ کیا۔ جب ناک نہیں کٹی تھی۔ تو اب کٹ جائے گی۔ اس واسطے آدمی مال خرچ کرنے میں اعتدال سے کام لے ___ حدیث میں فرمایا گیا۔ اس نکاح میں برکت دی جاتی ہے' جس میں خرچ کم ہو۔ اور جس میں خرچ زیادہ ہوتا ہے' اس سے برکت اٹھالی جاتی ہے' یا کم کر دی جاتی ہے۔

معاملات میں سب سے زیادہ آسان نکاح ہے

اس کی بنا یہی ہے کہ وہ زیادہ خرچ مفاخرت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ نام آوری یا نمود کی وجہ سے۔ یہی خراب کرنے والی چیز ہے۔ ورنہ نکاح کو اللہ نے سب سے زیادہ معاملات میں آسان بنایا ہے جسے ہم نے سب سے زیادہ مشکل بنا رکھا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نکاح ایسی سادہ چیز تھی کہ حضرت عبدالرحمن ابن عوف رضی اللہ عنہٗ جو جلیل القدر صحابی ہیں۔ اور ایسے جلیلؓ القدر صحابی ہیں کہ بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں جاتے تو اپنا نائب بنا کر جاتے تھے۔ اتنے بڑے لوگوں میں ہیں۔ اور جنت کی بشارت جن دس لوگوں کو دی گئی ہے' ان میں عبدالرحمن ابن عوفؓ شامل ہیں۔ تو دنیا ہی میں جنتی ہیں۔ اتنے جلیلؓ القدر ہیں۔ ایک دن مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے تو کپڑے اور چہرے پر زرد دھبے تھے۔ فرمایا :

عبدالرحمنؓ! یہ کیا بات ہے؟

عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے نکاح کیا ہے ___ اس زمانے میں جب نکاح ہوتا تھا تو ایک خاص قسم کا عطر ہوتا ہے' جو زعفران سے بنتا تھا۔ اس کو لگاتے تھے تو کپڑے پر کوئی دھبہ بھی آجاتا تھا۔ جیسے بعض عطر مخصوص ہوتے ہیں۔ جو نکاح ہی کے دن لگائے جاتے ہیں' جیسے لڑکی کو نخ جلا کر بسایا جاتا ہے۔ نخ یہ چھوٹے چھوٹے چوپارے سے ہوتے ہیں' ان کو جب جلاتے ہیں' تو خوشبو مہکتی ہے کپڑوں میں وہ خوشبو لگاتے ہیں تو کپڑے مہک اٹھتے ہیں۔ اس کو نخ بسانا کہتے ہیں۔ وہ شادی ہی کے دن لگائی جاتی ہے۔ ویسے اس کو کوئی نہیں لگاتا۔ ایسا ہوتا ہے' رواج کی بات ہے۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ زرد رنگ کیسا ___ ؟ عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے نکاح کیا ہے۔ اور نکاح کے دن خوشبو لگائی ___ فرمایا۔ کنواری سے نکاح کیا ہے یا بیوہ سے؟ ___ عرض کیا ___ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! بیوہ سے ___ فرمایا کیوں؟ ___ عرض کیا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! پہلی بیوی مر گئی تھی' اس کی کچھ اولاد تھی۔ کنواری سے کرتا' تو پال نہ سکتی۔ بیوہ بیچاری خدمت کر دے گی۔ اولاد کو پال دے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا دی۔

آپ نے دیکھا کہ عبدالرحمن بن عوفؓ سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عاشق کون ہو سکتا تھا۔

صحابی بھی جلیل القدر ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر محبوب کون ہو سکتا تھا؟ ___ ان کی دنیا اور آخرت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے اندر پوشیدہ ہے۔ ایمان نام ہی محبت کا ہے۔ تو عبدالرحمٰن ابن عوفؓ عاشقِ صادق، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم محبوبِ کامل۔ نکاح کرتے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلاتے، ___ یہاں نکاح ہوتا ہے کہ جب تک نویل نہ پھرے، جب تک برادری، اور کنبے کے سر نہ جمع ہوں، یہ ناک کی مصیبت ہے کہ کہیں یہ نہ کٹ جائے۔ چاہے گھر میں کچھ ہو یا نہ ہو، لیکن ناک کی وجہ سے جمع کریں گے۔ اور وہاں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک کو دعوت نہیں دی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بُرا نہیں مانا۔ یہ نہیں فرمایا۔ بھئی! ہمیں تو تم نے بلایا ہی نہیں۔ نہ کوئی شکایت کی۔ معلوم ہوا نکاح جیسی سادہ چیز اسلام میں کوئی نہیں تھی کہ نکاح کریں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کو خبر نہ ہو ___ معلوم ہوا گھر میں بیٹھ کر کرلیا۔ اتنی سادہ چیز تھی۔

نکاح میں معمولی دو خرچ ہیں

نکاح کے بڑے اخراجات دو ہی ہیں۔ ایک مہر کا خرچ ہے۔ ایک ولیمہ کا خرچ ہے۔ خاوند کے ذمہ یہی ہے کہ ولیمہ کرے اور مہر ادا کرے ___ یہ اتنے آسان بنا دیئے کہ ولیمے کے بارے میں تو فرمایا : **اولم ولو بشاۃ** اگر کچھ بھی نہ ہو، تو ایک بکری ذبح کر کے کھانا کھلا دو۔ بکری بھی نہ ہو۔ جو ہاتھ لگے ہے، وہی کھلا دو۔

اُمِ حبیبہؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی ہوئی گھر میں کچھ تھا نہیں کہ ولیمہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے کہ کیا کھلاؤں۔ گھر میں تو فقر و فاقہ ہے۔ اسی وقت ایک شخص ہدیہ میں کچھ کھجوریں لے کر آیا، اور ایک مٹکا لے کر آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گٹھلیاں نکلوا کے مٹکے میں ملوا کے چمڑے کے دسترخوان پہ ڈال دیا۔ حاضرین سے فرمایا۔ کھاؤ، یہ ہمارا ولیمہ ہے ___ تو بکری نہیں لانی پڑی، جو پاس تھا کھلا دیا۔ بس ولیمہ ہو گیا۔ ایک خرچ نکاح میں یہ تھا۔ یہ اتنا سادہ، اور ایک مہر کا خرچ ہے۔ تو فرمایا گیا۔ دس درہم بھی اگر کسی کے پاس ہوں، نکاح ہو جائے گا۔ دس درہم کی ہندوستانی قیمت اڑھائی روپے بیٹھتی ہے۔ تو اڑھائی روپے میں نکاح شرعی ہو سکتا ہے۔

نکاح میں زیادہ خرچ کا نتیجہ

یہ جو آدمی اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرتا ہے۔ تو نکاح تو ہو جاتا ہے۔ تھوڑی بہت واہ واہ بھی ہو جاتی ہے۔ مگر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گھر برباد ہو جاتا ہے۔

ہمارے ہی عزیزوں میں سے تھے شیخ ظفر حسین صاحب مرحوم بہت بڑے رئیس تھے، ان کی حویلی آج بھی دیوبند میں کھڑی ہے، یوں معلوم ہو کہ شاہی قلعہ ہے۔ ہاتھی کے گھسنے کا دروازہ اور بڑی بڑی چیزیں ___ انھوں نے اپنے بڑے بیٹے کا نکاح کیا۔ تو ولیمہ جو کیا ہے، وہ فقط سارے دیوبند کا نہیں بلکہ دیوبند کے ارد گرد جتنے دیہات تھے، سب کو مدعو کیا۔ ہزاروں دیہات والے۔ پھر ایک وقت کا نہیں، بلکہ ایک ہفتے تک دعوت کی۔ پورے سات دن یعنی چودہ وقت کا کھانا کھلا دیا۔

اور یہ بھی اعلان تھا کہ دیہاتیوں کو آنے میں زحمت ہوگی، کوئی دس میل سے آئے گا کوئی بیس میل سے۔ تو کھانے پک پک کے بہلیوں پر گاؤں گاؤں پہنچے ہیں۔ اور گھر گھر تقسیم ہوئے۔ ایک ہفتے تک کھانے پہنچتے رہے، بڑا نام ہو گیا، دنیا میں ایسا ولیمہ کسی نے نہیں کیا ہوگا۔ دنیا ایک وقت کا ولیمہ کرتی ہے، انہوں نے چودہ

وقت کھلادیا ___ مگر نتیجہ یہ نکلا کہ نکاح تو ہو گیا' لیکن آج اگر جا کے دیکھا جائے ان کی اولاد کا گزر بھیک کے ٹکڑوں پر ہے (اَلْعِیَاذُ بِاللہِ) کسی نے خدا واسطے دے دیا' کھانا کھالیا۔ نہیں تو نہیں۔ ایسی شادی سے فائدہ کیا؟ یہ خانہ آبادی نہیں یہ تو خانہ بربادی ہے۔

نکاح میں پاک ثمرات کب ظاہر ہوتے ہیں

میں اس پہ عرض کر رہا تھا کہ پاک ثمرے جب ظاہر ہوتے ہیں جب نکاح میں برکت ہو۔ اور برکت جب ہوتی ہے' جب نکاح میں خرچ کم ہو ___ اس لئے جو رائج الوقت مہر ہو اس کو باندھ دو۔ کوئی خاص مہر تلاش کرنا' یا جہیز کے سلسلے میں بہت زیادہ حُدود سے گزر کر خرچ کرنا' یہ سب غلط چیزیں ہیں۔ مسلمانوں کی جائدادیں اسی میں تباہ ہوئی ہیں۔ یا شادی کی رسوم میں' یا غمی کی رُسوم میں ___ مرنے والا مرتا ہے' وہ تو گیا۔ اس کے بعد آپ برادری کے کھانے ہو رہے ہیں۔ چالیس دن کا الگ ہو رہا ہے۔ دس دن کا الگ ہو رہا ہے۔ برسی الگ ہو رہی ہے' اور چہلم الگ ہو رہا ہے۔ نہیں ہو تا تو قرض لے لے کر کرتے ہیں ___ تو مسلمانوں کی جائدادیں برباد ہوئی ہیں۔ حکومتیں چھن گئیں۔ شادی کی رسموں میں' یا غمی کی رسموں میں۔ رسوم کی وجہ سے مسلمان تباہ ہوئے۔ اور اب تک بھی ہوش نہیں آتا' اسی میں مبتلا ہیں۔

بہر حال میں نے اس لئے عرض کیا کہ نکاح کی غرض وغایت باہمی سکون و مودّت ہے۔ مودّت ومحبت کا اثر جب پڑتا ہے' جب نکاح بابرکت ہو۔ بابرکت جب بنتا ہے جب اخراجات میں کمی کی جائے۔ نام ونمود اور شہرت کے جذبات سے خالی ہو۔ فرض کی ادائیگی پیش نظر ہو کہ اولاد کا فرض ہے' اللہ کا حکم ہے' اس کو ادا کر رہے ہیں۔ اس میں دین پیشِ نظر ہو۔ خاوند کے پیشِ نظر بھی یہ ہو کہ لڑکی سے اس کے دین کی وجہ سے نکاح کر رہا ہوں۔ وہ خوب صورت ہو یا بد صورت اس کے ساتھ دین کی وجہ سے معاملہ کروں گا۔ میرے ذمّے تو حق ہے۔ مرتے دم تک مجھے ادا کرنا ہے۔ وہ مالدار ہو یا بے مال ہو۔ میرے ذمّے اس کا حق ادا کرنا ہے۔ جب اللہ نے میرے حصے میں لگا دیا ہے' مجھے حقوق کی ادائیگی پیش نظر ہے۔ جب اللہ نے حکم دیا کہ محبت سے برتاؤ کر' میرا فرض ہو گا کہ میں اپنی بیوی کا دل مٹھی میں رکھوں' اس کی مدارات کروں' اس کے ساتھ حُسنِ سُلوک سے پیش آؤں۔ اس میں پھر ایسی برکت ہو گی کہ اولاد میں برکت ہو گی' گھر بار میں برکت ہو گی' معاملات میں بھی برکت ہو گی۔

ادھر عورت کا یہ فرض ہے وہ یوں سمجھے کہ خاوند کا حق مجھ پر عائد کر دیا گیا۔ یہ خوبصورت ہو' یا بدصورت۔ میرا فرض ہے اس کا حق ادا کرنا۔ میرے لئے تو وہ ربّ مجازی بنایا گیا ہے۔ یہ انتہائی بدصورت سہی' مگر میرے لئے تو سرتاج ہے۔ میرا فرض ہو گا میں اس کے حقوق ادا کروں گی۔ یہ جذبات ہوں گے تو حقوق کی ادائیگی مرتے دم تک ہو گی۔ گھر جنت بن جائے گا۔ عارضی چیزوں پر مدار ہو گا۔ دولت' عزت' حیثیت' یہ آنی جانی چیزیں ہیں۔ آتی بھی ہیں' جاتی بھی ہیں' ان پر اگر مدار رکھ دیا' محبت بھی عارضی ہو گی۔ چند دن کے بعد ختم ہو جائے گی۔ تو مقصودِ اصلی اور غرض وغایت نکاح کی یہ ہے **لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً** اس لئے تم میں سے تمہارا جوڑا پیدا کیا۔ تم میں اُنس' سکون ہو۔ تم ایک دوسرے کے ساتھ محبت ومودّت کا برتاؤ کرو۔ اگر تم غور وفکر کرو تو یہ اللہ کی بڑی قدرت کی نشانی ہے۔

نکاح کے احکام

نکاح کی یہ غرض وغایت رکھی گئی۔ اس غرض وغایت کے تحت احکام وہ رکھے گئے جن سے میل ملاپ پیدا ہو ـــــ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خاوند بیوی میں جھڑپ بھی ہو جاتی ہے۔ فرشتے تو ہیں نہیں ' انسان ہی تو ہیں۔ اس کا مضائقہ نہیں۔ بعض دفعہ خاوند ناخوش ہو جاتا ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ کر دیتا ہے۔ بعض دفعہ بیوی بھی ناخوش ہو جاتی ہے ' اسے بھی ناز ہوتا ہے۔ وہ بھی خاوند کو چار باتیں کہہ دیتی ہے۔ ایسا بھی گھروں میں ہوتا ہے۔ جب وہ بشر ہیں ' تو ہوگا اس میں ہدایت یہ کی گئی ہے کہ اگر ایسا ہو تو حکمت سے کام لے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا یہ عورت جو ہے ' یہ بائیں پسلی کی پیدائش ہے۔ بائیں بھی پسلی آدم علیہ السلام کی نیچے والی۔ جو زیادہ ٹیڑھی ہوتی ہے ' اس سے پیدا ہوئی۔ اس کے مزاج میں ٹیڑھ ہے ' اور تھوڑی سے کجی ہے ـــــ فرمایا نہ اسے بالکل ویسے ہی چھوڑ دو ' ورنہ اور ٹیڑھی بنے گی۔ اور نہ بالکل سیدھی کرنے کی فکر میں رہو ' ورنہ ٹوٹ جائے گی۔ تو نہ بالکل سیدھی کرو ' نہ ویسے ہی چھوڑ دو۔ کچھ نرمی ' کچھ گرمی ' کچھ مدارات ' کچھ ڈانٹ ڈپٹ ' کچھ سمجھانا بجھانا ' دونوں چیزیں رہنی چاہئیں۔

درشتی و نرمی بہم در بہ است

فرمایا گیا نہ بالکل ویسے آزاد چھوڑ دو ' زیادہ ٹیڑھی ہو جائے گی۔ نہ اتنی سختی کرو کہ وہ بالکل ٹوٹ جائے۔ اِعتدال کا معاملہ رکھو۔

اسی واسطے قرآنِ حکیم میں اس کی ہدایت کی گئی۔ برداشت اور صبر کے برتاؤ کا حکم دیا گیا ' فرمایا گیا :

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ

نیک بیویاں کون ہیں؟ نیک ازواج کون ہیں؟ جو صالحات ہیں۔ وہ اللہ کی عبادت گزار بندیاں ہیں۔ جو اپنے نماز ' روزے ' دین و دیانت کی پابند ہیں۔ وہی صالح بن سکتی ہیں۔ چکنی چپڑی باتیں کرنے والی صالح نہیں ہوتیں۔ حق ادا کرنے والی صالح ہوتی ہیں ـــــ حٰفِظٰتٌ جو غیب کی حفاظت کریں۔ غیب سے مراد خاوند کے راز اور اسرار ہیں۔ وہ کسی پہ ظاہر نہیں کرتیں۔

خاوند کی ناقدری کا اِنجام

بعض عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔ کسی محفل میں بیٹھیں۔ اس نے کہا تیرا خاوند ایسا بُرا ' اس نے کہا تیرا ایسا بُرا۔ رات دن اسی لعن طعن میں مبتلا ہیں ـــــ اگر اس (تقریر) میں میری بہنیں بھی شریک ہوں ' جو سُن رہی ہوں۔ وہ بھی کان کھول کر سُن لیں۔ جہاں میں نے ان کے لئے یہ کہا ہے کہ خاوند کا فرض ہے ان کی مدارات کرے۔ حقوق ادا کرے۔ یہ کرے وہ کرے۔ کچھ ان کے ذمے بھی حقوق ہیں۔ کچھ ان میں بھی کجی اور ٹیڑھ ہے۔ وہ اپنی اِصلاح و حفاظت کریں۔

حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن عورتوں میں وعظ فرمایا۔ عورتیں ایک طرف تھیں ' مرد ایک طرف تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ' اور عورتوں کے گروہ میں وعظ فرمایا۔

تصدقن　یا　معشر　النسآء
فانی　اریتکن　اکثر　اھل　النار

اے عورتوں کے گروہ! صدقہ کثرت سے دیا کرو۔ اس لئے کہ جہنم میں کثرت سے عورتوں کو دیکھتا ہوں۔

صدقہ دو گی تو بلیّات رد ہوں گی۔ حدیث میں ہے :

الصدقۃ تطفئ غضب الرب کما یطفئ الماء النار

صدقہ اس طرح سے اللہ کے غضب کو بجھا دیتا ہے، جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ تو فرمایا صدقہ کثرت سے کیا کرو۔ اس لئے کہ عورتوں کو جہنم میں میں کثرت سے دیکھتا ہوں ___ حدیث میں ہے۔ ایک عورت کھڑی ہوئی، اس کا حلیہ بھی آتا ہے۔ کالے رنگ کی تھی۔ موٹے موٹے ہونٹ تھے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کوئی حبشی ہوگی۔ کہنے لگی **وبم یا رسول اللّٰہ**؟ یا رسول اللہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم ہی جہنم میں زیادہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں بھی ہم ہی چولہا جھونکیں۔ یہاں بھی آگ وہاں بھی آگ۔ دونوں جگہ آخر ہماری کیا مصیبت آئی۔ ایسا آخر کیوں ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وجہ ارشاد فرمائی ___ وہ میری بہنوں کے سننے کی ہے اور اس کو پلّہ باندھ لیں۔ اس لئے کہ انہوں نے یا مردوں نے مجھے اس کرسی پر بٹھلایا ہے یہ کرسی معالج کی ہے، جو دلوں کا علاج کرتا ہے۔ معالج چُن چُن کے امراض سامنے رکھ دے کہ یہ کھوٹ ہے، یہ بیماری ہے۔ تاکہ علاج کر سکیں۔ وہ طبیب بہت خائن ہو گا کہ وہ تعریف کے کلمات کہہ جائے، اور کھوٹ کو ظاہر نہ کرے۔ وہ حکیم نہیں۔ وہ علاج نہیں کر سکتا۔ اس واسطے اگر میری بہنیں یہاں ہوں، تو بُرا نہ مانیں۔ بہرحال جو اصلی بات ہے وہ کہہ دوں تاکہ علاج کی طرف متوجہ ہو جائیں ___ اور یہ میں تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں۔ یہ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ میں نقل کر رہا ہوں۔ اس واسطے میرے سے بُرا ماننے کی ضرورت نہیں۔ میں تو ناقل ہوں، حکیم شرعی جو ہے وہ پہنچا دیا۔ اب تم بُرا مانو یا بھلا، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس عورت نے کہا **وبم یا رسول اللّٰہ**؟ آخر ہم ہی کیوں آگ میں ہیں۔ یہاں بھی وہاں بھی۔ یہ ہماری قسمت میں ہی کیوں آگ رہ گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دو وجہیں ارشاد فرمائیں :

تکثرن اللعن وتکفرن العشیر تم میں دو بیماریاں اور دو روگ ہیں۔ ایک **تکثرن اللعن** لعن کی تم میں کثرت ہے۔ جس مجلس میں عورتیں بیٹھیں گی، لعن طعن، نام رکھنا، تیرا زیور بہت بُرا، میرا زیور بہت اچھا، اس کی صورت اچھی نہیں، میری صورت اچھی، اس کا لباس خراب، میرا لباس اچھا۔ دنیا بھر کی بات اگر مجلس میں ہے تو وہ یہ فلانی بُری اور میں اچھی۔ صورت بھی میری اچھی، زیور بھی میرا اچھا۔ کسی لفظ سے کہے، مطلب اس کا یہی نکلتا ہے کہ بڑائی میری طرف ہے، اور بُرائی دوسرے کی طرف ہے۔ یہ لعن طعن ہے، تو تم میں کثرت سے لعن طعن کرنے کی عادت ہے۔ اور دوسرے کو طعن وہ دے گا، جو اپنی حیثیت سے بے خبر ہو۔ جاہل کا کام دوسرے کو طعن دینا ہے کیونکہ ان میں جہالت زیادہ ہوتی ہے، اس واسطے دوسرے کو طعنے دیتی رہتی ہیں۔ اگر اپنے عیب پیشِ نظر ہوں۔ دوسرے کو طعن دینے کی کبھی جرأت نہیں ہو سکتی۔ اس کی بنا یہ ہے کہ اپنی چیز پیشِ نظر ہوتی ہے۔ دوسرے کی ہوتی نہیں۔ اپنی بُرائی سامنے ہے نہیں۔ بس دوسروں کی بُرائی نظر آتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے آئینہ ہے تو صورت تو اچھی نظر آرہی ہے، اور دل کا آئینہ ہے نہیں کہ یہ دیکھے دل میں کیا کارگزاری ہے۔ اس واسطے فرمایا کہ ایک بات تم میں یہ ہے کہ تم کثرت سے لعن طعن کرتی ہو۔ ایک مرض تو تم میں یہ ہے۔

اور فرمایا **وتکفرن العشیر** دوسرے یہ کہ خاوندوں کی ناقدری اور کُفرانِ نعمت یہ بھی تمہارے اندر زیادہ ہے ___ یہ میں نہیں کہتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ میں تو اسے نقل کر رہا ہوں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں، ایک خاوند عمر بھر سلوک کرے، جب وہ زیور مانگے، تو زیور بھی لا کے

دے' اور جب خاوند کے ساتھ اس کی لڑائی ہوگی تو کہا کہے گی؟ **ماراٗیت منک خیراً قطّ** میں نے تو اس اجڑے گھر میں آ کے کبھی خیر دیکھی ہی نہیں۔ مصیبت ہی میں مبتلا رہی' سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ عمر بھر جو اس نے سلوک کیا تھا' وہ ایک جملے میں ختم کر دیا' کہ میں نے تو کبھی اس گھر میں خیر دیکھی ہی نہیں۔ بس ڈولے میں آئی تھی' اور کھٹولی میں نکل جاؤں گی۔ بیچ میں یہی مصیبتیں میری تو قسمت میں تھیں۔ یہ ناقدری کا حال ہے۔ اب وہ خاوند غریب دیکھ رہا ہے کہ میں نے چوری کر کے' ڈکیتی ڈال کے اس کے لئے اشیاء فراہم کردیں اور اس نے یہ قدردانی کی کہ **ماراٗیت منک خیراً قطّ** میں نے تو کبھی اس اُجڑے گھر میں آ کے خیر دیکھی ہی نہیں۔ اب وہ بیچارہ جواب دے تو کیا دے۔ اپنا سا منہ لے کر چپکے سے آجاتا ہے۔ یا تو خفا ہو' پھر لڑائی بنتی ہے۔ سوائے اس کے کہ صبر کرے کہ اس عورت سے کون لڑے۔ غریب آجاتا ہے۔

ہمارے مولانا عبدالرّب صاحب مرحوم تھے۔ انہوں نے عورتوں کی ذہنیت نمایاں کرنے کے لئے بڑی مقفّی بات کہی۔ کہنے لگے اگر خاوند ان سے پوچھے گھر میں تمہارے پاس کچھ ہیں کپڑے؟ تو کہیں گی' آئے تھے کپڑے وہ چار چیتھڑے پڑے ہوئے ہیں' کون سا میرے لئے لباس بنایا تھا؟ اور اگر کہے کہ تمہارے پاس جوتا بھی ہے؟ تو کہیں گی۔ آئے تھے جوتے' وہ دو لیتھڑے پڑے ہوئے ہیں۔ لاکے دیئے تھے تم نے جوتے۔ اور پوچھے کہ بھئی برتن بھی ہیں گھر میں؟ دھرے تھے برتن' وہی چار ٹھیکرے پڑے ہوئے ہیں۔ خود باپ کے گھر سے لے آئی تھی' وہ کام آرہے ہیں' ورنہ تم نے کون سے لاکے دیئے تھے ___ غریب کے سارے کئے کرائے پہ پانی پھیر دیا۔ اس نے محنت کی' عمر بھر کما کما کے دیا۔ یہ اس کی قدر نکلی کی چار چیتھڑے ملے' دو لیتھڑے ملے' اور چار ٹھیکرے ملے' یہ اس کی قدردانی ہوئی۔ خاندوں کی ناقدری کرنا تمہارا شیوہ ہے۔

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

اتنی ناقدری کرتی ہیں کہ عمر بھر کے احسان کا بدلہ دو لفظ میں چکا دیتی ہیں ___ فرمایا یہ وجہ ہے کہ جہنم میں کثرت سے جاؤ گی۔ اس کا علاج بتایا کہ صدقہ کثرت سے دو۔ تاکہ غضبِ خداوندی بجھے۔ اس لئے کہ لعن طعن کرنے سے اللہ کا غصہ بڑھتا ہے۔ کفرانِ نعمت سے اللہ کا غضب بڑھتا ہے۔ صدقہ دوگی' یہ غضب ٹھنڈا ہو جائے گا۔ جتنی غریبوں کی خبر گیری صدقات خیرات سے کروگی۔ تو اس برائی کی تلافی ہو جائے گی' جو تمہارے اندر ہے ___ تب جاکے اس عورت کو بات ذرا تسلیم ہوئی۔

عورت مرد کو اپنی ہدایت پر نہ چلائے

اور اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ ہو نا تم ناقصاتُ العقل؟ اس پر کھڑی ہو گئی ہم میں کیا نقصان عقل ہے؟ گویا اپنے نزدیک وہ بڑی افلاطون تھی' ارسطو بنی ہوئی تھی کہ ہم سب سے زیادہ عقل مند ہیں۔ اور بعضوں کو تو یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ مردوں میں کیا عقل رکھی۔ عقل تو ہمارے اندر ہے ___ اور یہ ایک حد تک انہوں نے صحیح بھی کہا ___ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

ماراٗیت من ناقصات عقل ودین اذھب للبّ الرجل الحازم من احدٰ لکن

فرمایا کہ ہے تو یہ ناقصُ العقل! مگر بڑے بڑے مردوں کی جو کاملُ العقل ہوتے ہیں' ان کی عقلیں اُچک لی جاتی ہیں' اسے پاگل بنا کے چھوڑتی ہیں۔ ایسے اُتار چڑھاؤ سے بات کریں گی' اچھا خاصا عقلمند آدمی ان کے سامنے بیوقوف بن جائے گا' اور جو کہیں گی' وہ کرنا پڑے گا۔

چنانچہ ان رسوم کے بارے میں جب لوگ کہتے ہیں کہ بھئی تم عقلمند ہو' تم یہ کیا کر رہے ہو' کہ جی

عورتیں نہیں مانتیں۔ گویا عورتیں حُکام ہیں۔ آرڈر وہاں سے آتا ہے۔ یہ حضرات نیاز مند اور غلام ہیں۔ تعمیل کرنا ان کا فرض ہے۔ یہ جواب دیتے ہیں ___ تو ان کا ایک حد تک دعویٰ بھی صحیح ہے کہ ہم عقل مند ہیں۔ جب عقلمندوں کو بے وقوف بنانے کی قدرت ہے تو اور اس سے زیادہ کیا عقل مندی ہوگی؟ مگر فرمایا کہ ناقصُ العقل اور ناقصُ الدّین ___ اس پر ایک عورت نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں کیا نقصانِ عقل ہے اور نقصانِ دین کیا ہے؟

فرمایا مہینہ میں بیس دن نماز پڑھوگی‘ دس دن سوؤ گی تو دین سے محروم ہی رہیں؟ اور نقصان دین کیا ہوتا ہے؟ اتنے دن دین سے بالکل محروم نہ نماز نہ روزہ‘ اور نقصان عقل یہ ہے۔ اگر عدالت میں شہادت ہو تو دو عورتیں ایک مرد کے برابر لی جاتی ہیں۔ گویا وہ آدھے مرد کے برابر ہیں۔ تو عقل بھی آدھی رہ گئی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ عورت کی جو خِلقت ہے‘ وہ مرد کی نسبت کمزور ہے۔ جیسے قُویٰ ظاہری کمزور ہیں‘ قُویٰ باطنی بھی کمزور ہیں۔ (فہم اور عقل وغیرہ) مگر بھئی! یہ جنس کی بات کہہ رہا ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بعضی عورتیں ایسی بڑی بڑی عقل مند گزری ہیں کہ ہزاروں مرد بھی عقل وفہم میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ افراد کی بات ہے‘ یہ جنس کی بات ہے۔ جنس مرد کی قوی ہے۔ عورت کی جنس ضعیف ہے۔ اب اگر اتفاق سے کوئی عورت پہلوان بن جائے تو جنس اپنی جگہ رہے گی‘ افراد ایسے ہی نکلیں گے۔

جیسے ہمارے ہاں ہندوستان میں ایک حمیدہ بانو پہلوان ہے۔ بڑے بڑے پہلوانوں کو اس نے پچھاڑ دیا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ مجھے کوئی نہیں پچھاڑ سکتا۔ ہر لڑائی کے اندر وہی پالا جیتتی ہے۔ اب جنس تو اس کی کمزور رہے گی۔ اتفاق سے ایک عورت ایسی بھی قوی نکل آئی۔ جنس تو ناقصُ العقل رہے گی۔ لیکن اتفاق سے بعضی عورتیں ایسی کاملُ العقل بھی گزری ہیں کہ انہوں نے سلطنتیں چلائیں ہیں۔ مردوں میں وہ عقل کی قوت نہیں ہے‘ جو اُن کے اندر ہے‘ تو وہ افراد کا قصہ ہے‘ افراد‘ آحاد دانش مند بھی نکلیں‘ شاعر بھی نکلیں‘ ادیب بھی نکلیں‘ محدِّث ومفسِّر بھی نکلیں۔ مگر جنس جو ہے اس کی عقل میں بہرحال نقصان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا۔ لن یفلح قوم ولّوا امر ھم امرأۃً وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنی سلطنت کے کاروبار عورت کے ہاتھ دے دیئے۔ یعنی اس کی عقل پہ چھوڑ دیئے۔ وہ لے کے سارے کنبے کو ڈوبے گی۔ اس کی جیسی عقل ہے اس کے مطابق چلے گی ___ عورت کی عقل مرد کے اعتبار سے کمزور ہوتی ہے۔ اتفاق سے کوئی اعلیٰ ترین عقل والی نکل آئے تو وہ ایک فرد کی بات ہوگی‘ جنس کی نہیں‘ جیسے مردوں کی جنس عقل مند ہے۔ لیکن بعضے اتنے احمق ہوتے ہیں کہ ان سے زیادہ کوئی بے وقوف ہی نہیں‘ بلکہ بعضوں کو گدھوں سے بھی کم عقل ہوتی ہے۔ بعضے ایسے بھی انسان نکلتے ہیں۔ مگر یوں نہیں کہا جائے گا کہ انسانوں کی جنس بے عقل ہے۔ مردوں کی جنس عقلمند‘ عورتوں کی جنس کم عقل‘ بعضی عورتیں بڑی عقل مند‘ بعضے مرد بڑے بے وقوف۔ یہ الگ قصہ ہے ___ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا کہ نقصانِ عقل بھی ہے‘ نقصانِ دین بھی ہے۔ اس واسطے تمہارا فرض ہے کہ مردوں کی ہدایت پر چلو۔ انہیں اپنی ہدایتوں پر مت چلاؤ۔ ورنہ وہ بھی ڈوبے گا‘ اور پورا کنبہ بھی ڈوبے گا اگر تمہاری ہدایتوں پر چلا۔

عورت پر خاوند کیسے مہربان ہو سکتا ہے

تو میں نے چند باتیں عرض کیں۔ ایک یہ کہ نکاح کی غرض وغایت کیا ہے؟ وہ باہمی سکون ومودّت ہے۔ نسل کی تکثیر خود بخود ہوگی۔ احکام کیا ہیں کہ مرد کے ذمّے شفقت واجب ہے۔ عورت کے ذمّے اطاعت واجب ہے۔

مرد کا کام یہ ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ لُطف وکرم کا برتاؤ کرے۔ بیوی کا کام یہ ہے کہ کامل اِطاعت کا برتاؤ کرے۔ اور اپنے خلاف بھی ہو' تو سننے کی عادت ڈالے۔ یہ نہ ہو کہ جہاں خاوند نے مزاج کے خلاف بات کہی اور اس کی ناک چڑی ہوئی ہے۔ ایک کیا چار جواب دینے کو تیار۔ اس سے بے مہری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ گھر کی گاڑی جب چلتی ہے' جب عورت خاوند کی مطیع ہو' اور خاوند عورت کا مطیع بن جائے' مگر مطیع کب بنے گا؟ جب عورت انتہائی محبت اور ایثار کا برتاؤ کرے گی۔ اطاعت' اطاعت کو کھینچتی ہے۔ سرکشی کرے گی تو اسے بھی نفرت پیدا ہو جائے گی ___ اگر کوئی عورت یہ چاہتی ہے کہ میرا خاوند بالکل میرے کہنے میں رہے' میرا غلام بن جائے۔ تو پہلے خود غلام اور باندھی بن جائے۔ وہ بھی مجبور ہو کے غلام بن جائے گا۔ غلام بنانا' غلام بننے سے ہوتا ہے۔ پہلے خود عملاً باندھی بن کے دکھلائے وہ خود بخود غلام بن جائے گا۔ اطاعت سے راحت ہوتی ہے؟ جتنی اس کی اطاعت کی جائے گی' وہ بھی اس کی اطاعت کرے گا ___ تو عورت کا یہ فرض ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے اس فکر میں رہے کہ کن چیزوں سے میرا خاوند ناخوش ہوتا ہے' میں وہ بات نہ کروں' اور جن چیزوں سے وہ خوش ہوتا ہے' قصداً ہی وہ چیزیں کروں کہ اس کا دل راضی ہو' جتنا راضی ہوگا' میرے اوپر مہربان بن جائے گا' میرا گھر چلے گا۔ اور مرد کا یہ فرض ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ اس کی ذہنیت کیا ہے۔ کن چیزوں سے یہ خوش ہوتی ہے۔ وہ چیزیں کرے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ اپنی عورت کو راضی کرنے کے لئے اس کی خواہشات کچھ پوری کرے۔ آخر اس کا کچھ حق بھی تو ہے۔ وہ گھر میں آتی ہے' اپنے جذبات لے کر آتی ہے۔ اگر خاوند ان جذبات کی رعایت نہیں کرے گا۔ تو کیا محلّے والے رعایت کریں گے؟ یہ خاوند کا فرض ہے ___ جانبین سے جب یہ بات ہوگی' تو گھر کی گاڑی عمدگی کے ساتھ چلے گی۔ پھر سکون و محبّت اور باہمی مودّت پیدا ہو جائے گی۔

عورت کی طرف سے نافرمانی پر تنبیہ کے درجات

اس میں اگر اتفاق سے کوئی ناچاقی پیش آ گئی' تو جانبین کو ذرا صبرو تحمل سے کام لینا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ ایک دَم آپے سے باہر نکل کے وہیں جنگ چھڑ جائے۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس کے بارے میں ہدایت کی۔ فرمایا :

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ

نیک بیویاں کون ہیں؟ جو قانتات ہیں' عبادت گزار ہیں۔ اس لئے کہ جو اللہ کا حق ادا کرے گی' وہی خاوند کا حق ادا کر سکتی ہے۔ جو حق تعالیٰ کی نافرمانی کرے' وہ کسی کی مطیع نہیں بن سکتی۔ آگے فرمایا : حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ غیب کی حفاظت کریں' مرد کے رازوں اور اَسرار کی۔ بعض مفسّرین نے لکھا ہے کہ غیب سے مراد خاوند کا مال ودولت ہے۔ اس کی حفاظت کرے۔ یہ سمجھے کہ میں اس کی نگراں ہوں۔ اگر وہ باہر جائے تو گھر میرے سپرد ہے۔ پوری طرح سے اس کی حفاظت کرے۔

آگے فرماتے ہیں :

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ

جن عورتوں سے تمہیں یہ خطرہ ہو کہ اب یہ نافرمانی کریں گی۔ اس کا پارہ تیز ہو گیا ہے۔ اب ممکن ہے یہ جنگ پہ آ جائے۔ اور مقابل آ جائے۔ اس کی ہدایت دی۔ یہ نہ ہو کہ تم یہ محسوس کرو کہ بیوی میں غصہ بڑھ گیا ہے۔ یہ مدمقابل آئے گی۔ تم چار برے بھلے کہہ کے اس کے دل کو بیزار کر دو ___ فرمایا جس سے نافرمانی کا خوف ہو' وہ خفا ہو چکی ہے۔ کچھ زبان سے کہہ بھی رہی ہے' بکواس بھی کر رہی ہے۔ لیکن اندیشہ ہے کہ بالکل بات ٹوٹ جائے۔ تو پہلا درجہ یہ نہیں ہے کہ اس کو بُرا بھلا کہہ کے گھر سے نکال دو ___ نہیں فَعِظُوْهُنَّ

کچھ وعظ و نصیحت بتلا کے کرو۔ اور یوں کہے کہ شریف زادیوں کے یہ دستور نہیں ہوا کرتے۔ شریف گھرانے کی بیویوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ شرافت سے رہیں' اس طرح سے رہیں۔ یہ غلط طریقہ ہے تو پیار و محبت سے سمجھایا جائے۔ جو شریفُ الطبع عورت ہوگی۔ وہ یہ لفظ سُن کر فوراً پگھل جائے گی۔ اور غصہ سب ڈھیلا پڑ جائے گا ___ تو چار لفظوں سے نصیحت کرنا' یہ کارگر بن جائے گا' اور جھگڑا و فساد ختم ہو جائے گا ___ گھر جنت بن جائے گا۔

لیکن اگر کوئی ایسی بے وقوف ہے کہ نصیحت نے اس پر اثر نہ کیا' اب بھی یہ نہیں کہا کہ اسے جُدا کر دو۔ یا معاذ اللہ اسے طلاق دے کر نکاح توڑ دو۔ نہیں۔ فرمایا جب نصیحت سے نہیں مانی' تو **وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ** دوسرا علاج یہ ہے کہ اس کو بستر سے تنہا چھوڑ دو' اپنا مردانے میں آ کے لیٹنا شروع کر دو۔ جو شریف زادی ہے' طبیعت میں رعایت ہے' وہ سمجھے گی خاوند کی نگاہ پھر گئی ہے' راضی کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ وہ تو گھر چھوڑ کے باہر بیٹھ گیا۔ مردانہ میں سونے لگا۔ اب گھر میں نہیں آ رہا ہے ___ ایسا نہ ہو کہ کہیں مجھ سے بالکل ہی بیزار ہو جائے۔ کہیں گھر ہی اُجڑ جائے' تباہ ہو جائے۔ تو آپ پیام وسلام شروع ہو جائیں گے۔ آدمی پہنچے گا' تشریف لائیے' ذرا بات چیت کیجئے۔ وہ جو ایک بُعد تھا' وہ ختم ہو جائے گا ___ تو اوّل درجہ یہ ہے کہ نصیحت کر دے' نصیحت سے نہ مانے تو اسے گھر میں تنہا چھوڑ کے باہر قیام کر لے۔ ایک رات نہیں گزرنی پائے گی کہ دماغ سیدھا ہو جائے گا۔

لیکن اگر کوئی ایسی کوڑ مغز ہے کہ اس کو نہ نصیحت کا اثر ہُوا نہ باہر کا۔ اس نے کہا میری جوتی سے اگر باہر لیٹ جائے' لیٹ جائے جا کے۔ پھر آوے گا۔ دو دن میں آوے گا' چار دن میں آوے گا' جھک مارے گا' پھر آوے گا ___ یہ جو ایسی کوڑ مغز ہے تو اس کے بارے میں فرمایا : **وَاضْرِبُوْهُنَّ** تھوڑی سی تنبیہہ تھوڑی سی مار پٹائی بھی ایسے حالات میں جائز ہے۔ مگر شریعت نے مار پٹائی کی صورت بھی بتلائی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ لکڑی لے کے اس کے سر ہو جاؤ۔ غریب کے ہاتھ پیر توڑ دو' یہ نہیں ہے۔

امام شافعیؒ نے **وَاضْرِبُوْهُنَّ** (مار سکتے ہیں) کی تفسیر یہ کی ہے کہ اسی کا دوپٹہ لے کر ذرا اُسے البیٹ دے کے دو چار مار دو۔ اس سے تم کو یہ ظاہر کرنا ہے کہ خُدا کی طرف سے مجھے یہ بھی اختیار حاصل ہے۔ مارنا پیٹنا مقصود نہیں ہے۔ تھپڑوں سے مارے یا لکڑی سے مارے۔ یہ نہیں بلکہ اس کی صورت یہی ہے کہ اسی کا دوپٹہ یا رومال لے کر ایک دو البیٹ دے کے رسید کرے۔ چوٹ ووٹ تو اسے لگے گی نہیں۔ وہ یہ سمجھ لے گی کہ اُوہو یہ کام بھی اس کو آتا ہے۔ کل اگر اس کے ہاتھ میں لکڑی آ گئی' تو کیا ہوگا؟ گھبرائے گی۔ مگر یہ اس کا علاج ہے جو کوڑ مغز ہو۔ جس پر نہ نصیحت اثر کرے' نہ بستر پر تنہا چھوڑ دینا اثر کرے' ایسی کوڑ مغز کا تو یہی علاج ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کی اجازت نہیں کہ اسے چھوڑ دو۔ یا نکاح توڑ دو۔

فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا

اب اس کے بعد اگر اطاعت کر لے تو بس اب راستہ چھوڑ دو۔ زیادہ اسے تنگ مت کرو۔ مقصد پورا ہو گیا۔ لیکن اگر کوئی ایسی احمق ہے کہ نہ نصیحت نے اثر کیا' نہ خاوند کے چھوڑ کر چلے جانے نے اس پر اثر کیا اور دو چار دوپٹے البیٹ دے کے اس نے کھینچ مارے' اس کا بھی اثر نہ ہوا ___ معلوم ہُوا بڑی احمق ہے۔ اس کے دل میں کوئی کجی اور عناد بھرا ہوا ہے' اُلٹی کھوپڑی کی ہے ___ اس کے لئے اب چوتھا علاج ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اب اسے نکاح سے جدا کر دو۔ یہ اب تک بھی اجازت نہیں دی۔

علاج یہ کہ اب تحکیم کا مسئلہ جاری کرو۔ حَکم بناؤ۔ ایک حکم عورت کی طرف سے آئے' ایک حکم مرد کی طرف سے۔ دونوں طرف سے ایک ایک ثالث مقرر ہو۔ وہ دونوں ثالث مل کر فریقین کی شکایتیں پیش کریں۔

بیوی کا ثالث کہے کہ بیوی کو یہ یہ شکایتیں ہیں۔ خاوند کا ثالث کہے کہ خاوند کو یہ یہ شکایتیں ہیں ___ فرماتے ہیں حق تعالٰی ___ اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا اگر نیک نیتی سے یہ دونوں ثالث بات چیت کریں گے' تو اللہ ضرور اصلاح فرمادے گا۔ اور صلح صفائی ہو جائے گی۔ اور وہ جو کدورت بیٹھ گئی تھی' وہ نکل جائے گی۔

عند الضرورت آداب طلاق

لیکن اگر اتنا کوڑ پڑ گیا ہے کہ نصیحت و مار پٹائی بجائے خود' ثالث بھی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے مزاجوں میں توافق نہیں ہے۔ عمر بھر ان میں کھٹ پٹ ہی رہے گی۔ لڑتے ہی رہیں گے۔ اب اجازت دی گئی کہ اتنے مرحلے گزارنے کے بعد اس حالت میں طلاق دے سکتے ہو ___ لیکن طلاق میں میں نے جیسے عرض کیا۔ ایک طلاقِ سنت ہے ایک طلاقِ بدعت ہے۔ تو طلاقِ بدعت ممنوع ہے ___ طلاقِ سنت یہ کہ ایک طلاق دے' تاکہ مدتِ عدت میں پھر تمہیں رجوع کرنے کا حق رہے۔ اگر ایک دم تینوں دے دیں۔ اور پڑ گئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بائنہ ہو گئی' بات ہاتھ سے نکل گئی۔ بہت ممکن ہے۔ بعد میں پچھتاوا پیدا ہو' کہ بھئی ایسے جھگڑے تو روز ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنی بیوی کو الگ کر دیا۔ پھر بیٹھ کے روئے گا۔ اور بیوی بھی روئے گی۔ اس لئے فرماتے ہیں اگر مجبور ہو گئے ہو اور طلاق دینی ہی پڑے تو طلاقِ سنت ہی دو۔ ایک طلاق دینے کے بعد عدت کی مدت گزارے۔ عدت میں بلا نکاح رجوع کر سکتا ہے۔ طلاق دینے کے بعد ممکن ہے دل میں آئے میں نے بڑی غلطی کی کہ طلاق دے دی۔ معاملہ سلجھ سکتا تھا۔ تو جدید نکاح کی ضرورت نہیں۔ بس رجوع کر لے۔ اس سے معاملہ شروع کر دے۔ وہ اس کی بیوی ہے۔ پھر بھی اگر نباہ نہیں ہو سکا' پھر آگے دوسری طلاق کا حق ہے۔ پھر آگے اس کی عدت ہے۔ اس میں پھر رجوع کرنے کی گنجائش ہے۔ جب کوئی بھی گنجائش نہ ہو۔ اور معلوم ہو کہ یہ عورت ہی اُلٹے مزاج کی ہے۔ اور یہ گھر ہی کو تباہ کر کے رہے گی۔ جب تیسری طلاق دے کے قصہ پاک کیا جا سکتا ہے۔

آپ نے اندازہ کیا کہ شریعت نے کتنی داشت کی ہے۔ اگر لڑائی کا خوف ہو تو نصیحت کرو' نصیحت سے نہ مانے تو ذرا گھر میں اس کو تنہا چھوڑ دو۔ اس سے نہ مانے تو اس کے دو تھپڑ سے ذرا اس کو تنبیہ کر دو۔ اس سے بھی نہ مانے تو ثالث مقرر کر لو' اور اس سے بھی نہ مانے تو طلاقِ سنت دے دو۔ نکاح کو قطع مت کرو۔ اس سے اندازہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے ہاں نکاح کتنی محبوب چیز ہے کہ اسے توڑنا نہیں چاہتے۔ اور شیاطین کے ہاں اتنی مبغوض چیز ہے وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح نکاح ٹوٹ جائے۔ اور ناچاقی پھیل جائے۔ خاوند بیوی کو لڑانے والا شیطان بھی آتا ہے' تو اسے بڑا شیطان گلے لگاتا ہے کہ تو ہے میرا سپوت۔ تو نے بڑا کام کیا۔ اس سے واضح ہوا کہ نکاح انبیاء علیہم السلام کو محبوب اور عزیز ہے۔ اور شیاطین کو نکاح کا ٹوٹنا عزیز ہے۔

اللہ کے جوڑ کو باقی رکھنے والے ہی نیک نہاد ہیں

تو نیک نہاد وہ ہوں گے جو انبیاء علیہم السلام کے راستے پر چلیں گے۔ اور نکاح کرنے کے بعد دل میں عہد باندھیں کہ ہمیں صبر و تحمل سے اپنی بیوی کی داشت کرنی ہے۔ اس کے حقوق ادا کرنے ہیں۔ اگر وہ تھوڑی بہت زیادتی بھی کرے گی' ہمیں صبر و تحمل کرنا ہے' درگزر کرنا ہے' اس لئے کہ ہمیں گھر بگاڑنا نہیں ہے۔ اور گھر بھی الگ رہا۔ دو خاندانوں کو لڑوانا نہیں ہے یہ خاوند اور بیوی کے مزاج کے اوپر موقوف ہے۔ یہ نیک نیتی سے سچا معاملہ رکھیں گے تو دو گھر بھی جڑے رہیں گے' دو خاندان جڑے رہیں گے۔ دو برادریاں آپس میں جڑی رہیں گی۔ انہوں نے بے وقوفی کی تو دو خاندانوں اور برادریوں میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ دارومدار ان دو

کے اوپر ہے۔ اگر وہ دونوں حقوق پہچان لیں۔ نکاح کی غرض وغایت' آداب اور وہ حقوق پہچان لیں جو شریعت نے بیان کئے ہیں تو گھر بار' برادری سب عزیز و اقارب درست اور اپنی جگہ رہیں گے۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے کہ ایک آدمی پوری برادری کو سنبھالنے کا ذریعہ بن جائے۔ اور وہ کتنا بُرا انسان ہو گا جو پوری برادری میں پھوٹ ڈلوانے کا ذریعہ بن جائے۔ اس واسطے نکاح کا مرحلہ بڑا نازک بھی ہے اور آسان بھی ہے ___ آسان تو یہ کہ چار بول پڑھے گئے' اور وہ جڑ گئے' نازک اس لئے کہ ذمّہ داریاں اس میں بہت آجاتی ہیں۔ عورت کی بھی ذمّہ داری بڑھ گئی۔ مرد کی بھی ذمہ داری بڑھ گئی۔ ان کا نبھانا صبر و تحمل والے کا کام ہے' جو ذرا ذرا سی چیزوں میں آپے سے باہر نکل جانے کا عادی ہو' وہ تو لڑائی ہی کرا کے رہے گا۔ خاندانوں میں بگاڑ ہی پیدا کرا کے رہے گا۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے اس لئے نکاح کو اپنی آیت بتلایا کہ یہ ہماری قدرت کی ایک بڑی نشانی ہے۔ ہم ہیں دلوں کے بدلنے والے۔ جب اللہ دلوں میں جوڑ لگادے۔ تو نیک طینت بندہ وہ ہے جو اللہ کے جوڑ کی عزت کرے۔ اسے مرتے دَم تک باقی رکھے۔ اور اس کی غرض وغایت کہ تم سکون حاصل کرو' مرد عورت کی طرف رجوع کر کے سکون حاصل کرے۔ عورت مرد کی خدمت کر کے سکون حاصل کرے۔ اور ان دونوں کے درمیان میں مودّت' محبت اور رحمت کا علاقہ ہو' غضب و قہر اور توڑ پھوٹ کا علاقہ نہ ہو ___ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ اس نکاح میں قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں ___ میں کہتا ہوں ان ساری چیزوں کو ادا کیا جائے' تو ہر ہر چیز مستقل ایک قدرت کی نشانی ہے۔ اگر خاوند اور بیوی اس پر تیار ہوں اور عمل کریں تو ساری چیزیں نشانیاں بن جائیں گے۔ مگر ان کے لئے جو غور و تفکر کرتے ہیں اور عقل لڑاتے ہیں۔

"تبریک"

اس آیت کی روشنی میں یہ چند باتیں میں نے اس لئے عرض کیں کہ اس وقت نکاح کی تقریب تھی۔ عزیز و اقرباء نے تو مبارک باد پیش کی۔ میری مبارک باد یہ ہے کہ میں نے نکاح کے بارے میں اس کے حقوق و آداب عرض کئے۔ ان الفاظ کے ساتھ میں بھی مبارک باد پیش کرتا ہوں' ان دونوں خاندانوں کے سامنے۔ لڑکے والوں اور لڑکی والوں کے لئے بھی ___ بس فرق اتنا ہی ہے کہ آپ حضرات نے عزیز داری کے ضمن میں مبارک باد دی۔ میں ایک خادمِ قوم ہونے کی حیثیت سے مبارکباد دیتا ہوں۔ اور خادمِ قوم کا کام یہی ہے کہ خدمت کے طریقے پیش کردے۔ یہ سب سے بڑی مبارک باد ہے اگر خاوند بیوی ان نصائح پر عمل کریں۔

تو سب سے بڑی مبارک باد کی بات فی الحقیقت یہی ہو گی۔ اور وہی نکاح باعثِ خیر و برکت ہو گا۔ اب آپ سب حضرات دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں خاوند بیوی میں باہمی محبت نصیب فرمائے۔ جو دو گھرانے آپس میں جُڑے ہیں۔ ان دونوں کے اندر محبت و مودّت کا رشتہ قائم ہو۔ ایک دوسرے کی خیر خواہی میں لگے رہیں' اور ایک دوسرے سے محبت و مدارات کا نفع حاصل کریں۔ ان کے دلوں میں سکون و تحمل رہے' اور ایک دوسرے کے لئے خوشی کا باعث بنیں۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۔
رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا ۔
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۔

پیغامِ ہدایت

ایک خط جو شادی کے موقع پر ارسال فرمایا

ازرسالہ دارالعلوم دیوبند جون ۱۹۷۵ء

الحمد للّٰہ وکفٰی وسلامٌ علٰی عبادہ الذین اصطفٰی

اما بعد

شادی اور نکاح سنت انبیاء علیہم السلام ہے اور اسے اسلام نے صرف معاملے کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ عبادات کے زمرہ میں شمار کیا۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

النکاح نصف الدین فلیتق اللّٰہ فی النصف الباقی۔

"نکاح آدھا دین ہے آدمی کو چاہئے کہ بقیہ آدھا دین تقویٰ اور طہارت سے حاصل کرے"۔

نکاح ہی ہے جس کے ذریعہ عفت، پاکدامنی اور خیال کی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے آدمی حرام سے بچتا ہے اور حلال کے دائرہ میں محدود رہتا ہے ___ نکاح ہی ہے جس کے ذریعہ اتحاد باہمی اور قبائل اور خاندانوں کے باہمی تعاون کی بنیاد پڑتی ہے۔ کتنے ہی اجنبی باہم مربوط ہوجاتے ہیں اور پہلے سے بیگانے ہوں تو یگانگت بڑھ جاتی ہے اور باہمی حقوق قائم ہوجاتے ہیں اسی لئے حق تعالیٰ شانہ نے جہاں آبائی اور جدی نسب کو محل نعمت میں شمار فرمایا وہیں صہری اور سسرالی رشتہ کو بھی نعمت ظاہر فرمایا۔ ارشاد خداوندی ہے :

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا۔ (فرقان پ ۱۹ ایت ۵۴)

"اور اللہ ہی وہ ہے جس نے ایک قطرہ پانی سے بشر کو پیدا کیا اور پھر اس کے لئے نسب آبائی اور سسرالی رشتہ پیدا فرمایا"۔

پس جیسے نسب کو نعمت ظاہر فرماکر بشر پر اپنا احسان جتایا کہ یہ نعمت اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں دے سکتا ایسے ہی سسرالی رشتہ کو بھی نعمت ظاہر فرمایا کہ اجنبی دلوں کو اس طرح باہم ملادینا بھی اسی کا کام ہے جو کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے نکاح کی غرض وغایت ظاہر فرماتے ہوئے اسے اپنی قدرت کی نشانی اور آیت قرار دیا۔

کیا یہ قدرت ہی کا کرشمہ نہیں کہ نکاح سے ایک منٹ پہلے مرد وعورت باہم اجنبی ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد کو بعینہ اپنا دکھ درد نہیں سمجھتے اگر کبھی اجنبی عورت کسی تکلیف میں مبتلا ہوجائے تو سوائے عام انسانی ہمدردی کے آدمی اس کی کوئی خاص ٹیس اور چبھن اپنے دل میں اس طرح محسوس نہیں کرتا کہ بے

چین ہو جائے اور اپنے دکھ درد کو بھول جائے۔ لیکن نکاح سے ایک منٹ بعد اگر عورت کے دکھ درد کی بات اس کے کان میں پڑ جائے تو وہ متفکر، پریشان اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنے دکھ درد کو بھول کر منکوحہ کے دکھ درد کے مداوے میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ یہی صورت عورت کی بھی ہے ــــــ یہ دلوں کا ملاپ اور قلوب کی وحدت کیا محض قدرت کا ہی کرشمہ نہیں کہ دلوں کی دنیا یکدم بدل ڈالی اور جانبین کے دلوں میں انقلاب عظیم رونما فرمادیا اس لئے اگر اسے آیت اور نشانی فرمایا گیا ہے تو وہ ایک حقیقت واقعی ہے محض کوئی نظریہ نہیں ــــــ ظاہر ہے کہ دو کا یہ ملاپ فریقین کے متعلقین کا بھی قدرتی ملاپ ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ لڑکی والے لڑکے والے کے اور لڑکے والے لڑکی والے کے دکھ درد میں شریک نہ ہوں اور باہم یگانگت محسوس نہ کریں اس لئے نکاح جیسے خود ایک آیت اور قدرت کے کرشموں کی ایک عظیم نشانی ہے ایسے ہی وہ باہمی اتحاد ویگانگت کا بھی ایک معجزانہ وسیلہ ہے اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد نکاح فرماکر قبائل کو اپنے ساتھ ملایا، باہم شیر وشکر فرمایا اور اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نکاح کے تعلق کی پختگی اور مضبوطی کا اہتمام تھا طلاق جو قاطع نکاح ہے باوجود جائز ہونے کے عنداللہ اس کو مبغوض قرار دیا چنانچہ فرمایا

ابغض المباحات عنداللّٰہ الطلاق ۔

جائز چیزوں میں سے زیادہ عداوت خدا تعالیٰ کو طلاق سے ہے۔ کیونکہ یہ قاطع نکاح ہے۔ نکاح جو ذریعہ اتحاد ووحدت ہے تو طلاق قاطع اتحاد وملاپ بھی ہے اس حال میں کہ انبیاء علیہم السلام کا مقصد وحید توحید کے ساتھ اتحاد باہمی بھی ہے کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا جائے اور بچھڑے ہوؤں کو ملا دیا جائے اور خدا سے ٹوٹے ہوئے دل کو خدا کے ساتھ جوڑ دیا جائے اس لئے وہ نکاح کے تعلق میں کسی ادنیٰ اختلال کو بھی کیسے گوارا فرماسکتے تھے البتہ نکاحی تعلق مضبوط سے مضبوط اور ذریعہ اتحاد بنانے کا جو راستہ شریعت الٰہی نے طے فرمایا وہ بنیادی طور پر دو چیزیں ہیں ایک شفقت ایک اطاعت، جس سے معاشرہ کی گاڑی چلتی ہے۔

خاوند کو تو حکم دیا کہ وہ بیوی کے ساتھ انتہائی شفقت اور دلداری سے پیش آئیں اور نرم اخلاق سے اس کے دل کو موہ لینے کی سعی میں لگے رہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ :

ان اکرم المومنین احسنکم اخلاقًا الطفکم اھلاً۔

(یعنی) تم میں سب سے زیادہ قابل تکریم وہ مسلمان ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں اور بیوی کے ساتھ لطف ومدارات کا برتاؤ کرتا ہو۔

حتیٰ کہ آپ نے فرمایا کھانا کھاتے وقت اپنے ہاتھ سے بیوی کے منہ میں لقمہ دے دینا بھی صدقہ کے حکم میں ہے جس پر اجر دیا جاتا ہے اور اسے عبادت شمار کیا جاتا ہے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ازواج مطہرات کے ساتھ انتہائی ملاطفت اور دل جوئی کا عمل فرماتے تھے اس لئے بیویوں کے ساتھ دل جوئی اور ان پر لطف وکرم اور شفقت ومحبت کے برتاؤ سے جہاں نکاح کی حقیقی غرض وغایت نکلتی ہے وہیں اس سے قلوب میں سکون اور باہمی مودۃ اور اتحاد پیدا ہوتا ہے، ارشاد باری ہے :

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۔

”اور اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تم میں سے تمہارے جوڑے بنائے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم میں آپس میں مودۃ اور رحمت پیدا ہو، بلاشبہ اس میں فکر کرنیوالوں کے لئے قدرت کی نشانیاں ہیں (کہ بے تعلق قلوب میں

وہ کس طرح اچانک تعلق خاص بلکہ محبت باہمی کا علاقہ قائم فرمادیتا ہے)''۔

اور یہ اس لئے کہ بیوی خاوند کی وجہ سے اپنے گھربار' ماں باپ' اپنے عزیز واقرباء کو چھوڑ چھاڑ کر خاوند کے گھر آتی ہے کہ اس کی بن کر رہے اگر وہ بھی ملاطفت اور شفقت سے دست کش ہو جائے اور اس کے ساتھ بے رحمی اور ایذا رسانی کا برتاؤ کرے تو یہ غریب عورت کہاں جائے نہ ادھر کی رہے گی نہ ادھر کی اپنے عزیز تو خاوند کی وجہ سے چھوٹے اور خاوند بھی اپنا نہ ہوا تو اس غریب کا ٹھکانہ ہی کیا باقی رہا سوائے اس کے کہ غم میں گھل گھل کر اپنی زندگی ختم کردے۔

ادھر بیویوں کو حکم دیا گیا کہ وہ خاوند کی اطاعت اور اتباع میں سرگرمی دکھلائیں اور کوئی حرکت ایسی نہ کریں جس سے خاوند کا دل ٹوٹے اور بیوی سے بیزار ہو جائے۔ جس سے اس تعلق کی غرض وغایت ہی فوت ہو جائے جیسے بدمزاجی' درشت کلامی' سرکشی اور نافرمانی اور شوہر کے مال میں خیانت یا مال کو بجائے شوہر کے گھربار پر خرچ کرنے کے اس کی اجازت کے بغیر اپنے میکے پر صرف کرنے لگے جو بلاشبہ خیانت ہوگی اور خاوند کے لئے بددلی اور بیزاری کا باعث ہوگا' جس سے یقیناً اس تعلق کی خوشگواری اور آخر کار نفس تعلق ہی کی بقا میں خلل پڑ جائے گا جس کے اثرات پورے گھرانے پر پڑنا قدرتی امر ہے اسی بنا پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتہائی بات فرمادی کہ اگر میں غیر اللہ کے لئے کسی کو سجدہ کا حکم دیتا تو بیویوں کو حکم دیتا کہ وہ شوہروں کو سجدہ کیا کریں چونکہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا شرک اور قطعی حرام ہے اس لئے یہ امر نہیں کیا مگر اس سے اطاعت شوہر کی انتہائی تاکید برآمد ہوتی ہے کہ حرام اطاعت کے سوائے کوئی بھی اطاعت ایسی نہیں ہے جس کے لئے بیوی مامور نہ ہو اس لئے احادیث میں فرمایا کہ اگر شب میں بیوی خاوند کیساتھ سرکشی برتتی ہے تو تمام ملائکہ اس پر لعنت کرتے ہیں یہی صورت دن کے بھی ہوتی ہے۔

بہرحال یہ دو ہی باتیں اطاعت شوہر' ملاطفت زوجہ وہ ہیں جن کے بغیر زندگی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ان دونوں باتوں کا تعلق کسی ظاہری نمائش یا زینت پر نہیں رکھا گیا بلکہ ایک ایسی حقیقت پر رکھا گیا جو لافانی اور جاودانی ہے مثلاً اگر خاوند کی ملاطفت کا تعلق عورت کے ظاہری حسن وجمال' مال ودولت اور عرض وجاہت وعزت سے ہے تو یہ تمام چیزیں دنیا ہی میں پائیدار نہیں ہیں چہ جائیکہ آخرت میں کارآمد ونافع ثابت ہوں اس لئے کہ جب یہ کم یا گم ہوں تو شوہر کی ملاطفت ختم ہو جائے گی اور تعلقات میں کشیدگی بلکہ آخر کار انقطاع تعلق تک نوبت پہنچے گی اور اگر اس تعلق کی بنیاد عورت کی دین داری پر رکھی جائے تو دین سدا بہار اور دنیا کے بعد آخرت تک ساتھ جانے والا ہے اس لئے اس پر مبنی شدہ تعلق بھی دائمی اور مضبوط اور خوشگوار رہے گا جس میں کوئی عارضی چیز خلل انداز نہ ہوگی اس لئے حدیث نبوی میں ان امور کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ

تنکح المرأة لاربع لمالها ولجمالها ولحسبها ولدينها فاظفر بذات الدين۔

''عورت سے نکاح (بظاہر اسباب) چار وجوہ سے کیا جاتا ہے اس کے مالدار ہونے کی وجہ سے' اس کے خوبصورت ہونے کی وجہ سے' اس کے عرفی عزت ووجاہت کی وجہ سے' اس کی دینداری کی وجہ سے سو تم ان تمام امور میں دینداری کو ترجیح دو''۔

ظاہر ہے کہ مال وجمال اور عرفی حیثیت آنی جانی چیزیں ہیں اگر بیوی پر لطف وشفقت ان کی بنا پر ہے تو اول تو یہ لطف وشفقت نہیں بلکہ خود غرضی ہے اور جس حد تک ہے بھی تو اس کے زوال سے تعلق زائل ہو جائے گا اور گھریلو زندگی میں ناچاقی اور بیزاری رونما ہو جائے گی جس سے گھر تباہ ہونے کی صورت پیدا ہوگی

لیکن اگر نکاح کا مبنیٰ عورت کی دینداری ہے جو خاوند کے بھی دیندار ہونے کی کھلی علامت ہے۔ اور لطف وشفقت اس بنا پر ہوگا تو اس کی بنیاد خوف خدا پر ہوگی اور آدمی محسوس کرے گا کہ جب خدا نے اسے میرے ذمہ لگا دیا تو حسب اوامر خداوندی اس کے ساتھ لطف وکرم کا برتاؤ کروں خواہ وہ حسین وجمیل ہو یا نہ ہو' مالدار ہو یا نہ ہو' صاحب جاہ ومنزلت ہو یا نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ اس جذبہ سے یہ ملاطفت وشفقت عین دین ہوگی اور مرتے دم تک قائم رہے گی ہاں اگر حق تعالیٰ دینداری کے ساتھ ساتھ حسن وجمال' مال ومنال بھی جمع فرمادیں تو یہ سونے پر سہاگہ ہے لیکن یہ امور تعلق کی بنیاد بنانے کے قابل نہیں ہیں کیونکہ ہر آن قابل زوال واختلال ہیں۔ بہرحال نکاح کے تعلق میں پختگی اور پائیداری ان دوہی امور سے آتی ہے شوہر کی اطاعت اور زوجہ کی دلداری ــــ دوسری بات یہ بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ زوجہ کوئی باندی نہیں ہوتی بلکہ شریک حیات اور رفیقۂ زندگی ہوتی ہے اس لئے اس کے ساتھ اونچ نیچ کا برتاؤ کسی طرح بھی جائز نہیں وہ قابل احترام بنائی گئی ہے نہ کہ مورد تذلیل واہانت ــــ چنانچہ عرب ممالک میں آج بھی اگر عورت سامنے آجائے تو "حرمۃ" کہہ کر لوگ توقیر کے ساتھ اسے راستہ دیتے ہیں نیز اگر اس کی حرمت وعزت باقی نہ رہے تو گھر والے بلکہ اولاد تک بھی اس کی عزت نہیں کر سکتے اس لئے شریعت نے جہاں مرد کو عورت پر حقوق دیئے ہیں اسی طرح عورت کو بھی مرد پر حقوق دیئے ہیں تاکہ وہ معاشرہ میں باعزت رہے چنانچہ قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ اور عورتوں کے بھی حقوق (مرد پر) اسی طرح ہیں جس طرح (مرد کے حقوق) عورت پر ہیں۔

مثلاً اگر مرد کو طلاق کا حق دیا گیا ہے تو عورت کو بھی خلع کا حق سونپا گیا ہے اگر نزاع باہمی ہے تو مرد اور عورت دونوں کو اپنے اپنے افراد کو حکم منتخب کرنے کا برابری کے ساتھ حق دیا گیا ہے جو اس کی واضح دلیل ہے کہ عورت کو لاوارث بنا کر مرد کے سپرد نہیں کیا جاتا' بلکہ باعزت اور باحقوق بنا کر دیا ہے پس اگر بیوی کو اطاعت کا ذمہ دار بنایا گیا ہے تو مرد کو دلداری کا ــــ تو یہ دونوں کے منصب کا تقاضا ہے کوئی اونچ نیچ پیش نظر نہیں ــــ خلاصہ یہ کہ معاشرتی مساوات کے ساتھ شوہر کی شفقت واعانت اور زوجہ کی فرمانبرداری ہی سے گھریلو زندگی کی گاڑی رواں دواں ہو سکتی ہے جس کا اسلام نے راستہ بتلا دیا ہے کہ وہ دین اور دینی جذبات کی پائیداری اور شرعی معاشرہ کی پابندی کے سوا دوسرا نہیں ہے اس لئے شوہر اور زوجہ کے مطالعہ میں ایسی کتابیں رہنی چاہئیں جن میں زوجیت کے حقوق اور اسلامی معاشرہ' رہن سہن اور باہمی تعلقات کے خوشگواری کے طریقے واضح ہوں اور وہ بکثرت شائع شدہ ہیں جیسے حضرت تھانویؒ کی بہشتی زیور یا حقوق الزوجین یا حقوق المعاشرۃ وغیرہ وغیرہ۔

امید ہے کہ احقر کی شرکت وحاضری نکاح سے یہ پیغام زیادہ نافع ہوگا شرکت تو وقتی چیز رہتی ہے اور یہ دوامی دستور العمل ہوگا۔

واللہ الموفق وھم المستعان۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

پیغام ہدایت

ایک خط کا جواب

(از رسالہ دارالعلوم دیوبند ستمبر ۱۹۵۸ء)

محترم المقام زید مجدکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کا مفصل گرامی نامہ ملا ___ میں سفروں میں رہا، اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی، آپ نے اپنے کچے مگر سچے حالات تحریر فرمائے اور اپنی اصلاح سے مایوسی ظاہر فرمائی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں مایوسی کفر ہے، مایوس ہرگز نہ ہو جایئے، کوئی مرض ایسا نہیں جس کا علاج اللہ تعالیٰ نے نہ رکھا ہو ___ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے مرض پیدا کئے تو علاج بھی پیدا کئے ہیں تاکہ بندوں کی عزیمت عمل اور اندرونی جوہر، ہمت قوی، عزیمت اور مدافعت کا ظہور ہو۔ اگر آپ کے خیال کے مطابق امراض پیدا ہی نہ کئے جاتے تو باطنی امراض میں کفر وفسق کا نام ونشان ہی نہ ہوتا اور امراض باطن کے اسباب، شیاطین اور کفار اور فساق کا ماحول پیدا ہی نہ کیا جاتا تو علاج اور اس کے اسباب یعنی اچھے اعمال، اچھے اشخاص کے پیدا کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوتی اور جب نہ اچھے ہوتے اور نہ برے، اچھائی ہوتی اور نہ برائی تو دنیا آخر کس چیز کا نام ہوتا، جسے پیدا کیا جاتا، بالفاظ دیگر دنیا ہی نہ پیدا کی جاتی ___ اس کا حاصل یہ نکلا کہ دنیا کا پیدا کیا جانا قرین حکمت تھا تو خوبی کے ساتھ خرابی، نیکی کے ساتھ بدی، تقویٰ کے ساتھ فجور، اسلام کے ساتھ کفر کا پیدا کیا جانا بھی ضروری اور عین حکمت تھا، تاکہ کفر کے مقابلہ سے اسلام کی قوت، فسق کے مقابلہ سے تقویٰ کی طاقت، بدی کے مقابلہ سے نیکی کی رفعت، کذب کے مقابلہ سے صدق کی عزت و فخامت نمایاں ہو آپ کے تخیل کے مطابق کہ اس شیطان کو کیوں میرے پیچھے لگا دیا ___ شیطان پیدا نہ ہونا چاہئے تھا تاکہ آپ کو نہ ورغلاتا ___ لیکن پھر آپ ہی کے پیدا ہونے کی کیا ضرورت تھی نیز آپ میں مدافعت شر کی قوتیں رکھنے کی کیا ضرورت تھی اور نیکی وبدی میں امتیاز کی قوت یعنی عقل پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور قوت ارادی پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ آپ حق کو باطل سے ممتاز دیکھ کر حق کی طرف اپنے ارادے سے دوڑیں اور یہ سب غیر ضروری تھا، تو وہ انسان کہاں رہتا، جس میں نہ قوت ارادی ہوتی نہ قوت تمیزی نہ عقل ہوتی نہ عزیمت ہوتی نہ طاقت مدافعت ہوتی، تو انسان کیا ہوتا، اینٹ پتھر کا ایک تودہ ہوتا اور جب ساری کائنات انسان کے لئے بنائی گئی اور انسان کا یہ عالم کہ وہ ایک تودۂ خاک، تو کائنات ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اسے علم وعقل سے استعمال کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ لہٰذا آپ کی رائے کے مطابق اور وہ بھی آپ کی کم ہمتی کی وجہ سے اس دنیا کو ناپید رہنا چاہئے تھا اور اب بھی اگر وہ ہے تو اسے صرف ایک تودۂ خاک ہونا چاہیے یہ سوائے **تخیلات** فاسدہ کے اور کیا ہے۔

آپ نے جو کچھ نیکی یا بدی کی' ارادہ واختیار سے کی' اللہ تعالیٰ نے مجبور ہو کر کے نہیں کرائی' کب ایسا موقع آیا کہ آپ اینٹ' پتھر کی طرح مسلوب الاختیار ہو گئے ہوں کہ آپ چاہتے ہوں نیکی کرنا مگر زبردستی آپ کا اختیار چھین کر آپ سے بدی کرادی گئی۔ اس لئے اپنے کئے دھرے کو تقدیر کے سر ڈال کر بری الذمہ ہونے کی کوشش نہ کیجئے یہ انتہائی جسارت اور گستاخی ہے ____ ایک تو آدمی بدی کرے اور اوپر سے بری الذمہ بن کر بدی کو اپنے مالک کے سر تھوپنے کی کوشش کرے۔

ان سارے فاسد تخیلات کا ایک ہی علاج ہے' سب سے پہلے اپنی زندگی کا ایک نصب العین متعین کیجئے کہ آیا وہ دنیا ہے یا آخرت' اگر دنیا ہے تو اس کے کمانے کی فکر میں لگ جائیے اور حلال وحرام کا کوئی سوال نہیں جو جی میں آئے یا نام نہاد عقل میں آئے کرتے رہیے بجز اس کے کہ جسے دنیا برا سمجھے دنیا کی خاطر اسے ترک کیجئے' جسے اچھا سمجھے اسے اختیار کرتے رہیے' عاقبت کی فکر کو ترک کر دیجئے اور آخرت ہے تو اسے کمانے کی فکر کیجئے' تو پھر اخروی قانون سے مدد لیجئے کہ اس کی رو سے کون سی چیز حلال ہے' کون سی حرام اور دونوں دائروں میں خواہ دنیا ہو یا آخرت بہرحال اپنا ارادہ صرف کرنا ہوگا اور اختیار سے کام کرنا ہوگا' تقدیر پر حوالہ کر کے بری الذمہ ہونا ہے تو آج سے ملازمت' تجارت' زراعت' سب ترک کر دیجئے کہ جو مقدر ہوگا' آپ ہی مل رہے گا' لیکن اس دائرہ میں اسباب رزق کا اختیار کرنا آپ کے نزدیک ضروری ہے' اس لئے زندگی کا ایک نصب العین متعین کر کے اپنی قوت ارادی اور قوت مدافعت کا جائزہ لیجئے کہ وہ کس حد تک اس نصب العین کے اجزاء کو حاصل کرنے اور اس کی منافی اشیاء کو دفع کرنے میں کام کرتی ہے۔

اخروی نصب العین کے لئے دستور شریعت ہے' جس کے پانچ ارکان ہیں ____ عبادات' اخلاق' اعتقادات' معاملات' عقوبات اور سب اختیاری ہیں' ان سب کو بنام خدا شروع کیجئے' فرائض کی پابندی' اخلاق کے تکمیل کے لئے کسی متخلق باخلاق اللہ کی طرف رجوع' عقیدہ کی اصلاح اور **تخیلات** فاسدہ سے گریز' معاملات میں فقہ کی پابندی' خود علم نہ ہو تو پوچھ پوچھ کر عمل۔

عقوبات کے سلسلہ میں مادی سزائیں' مادی قوت نہ ہونے کی وجہ سے آج نہیں دی جاسکتی ہیں تو اسے بھی اللہ کی رحمت کہنا چاہئے اور اس کے قائم مقام استغفار کو رکھا جائے' جس کے معنی ماضی پر ندامت مستقبل کے لئے عزیمت کہ کچھ بھی ہو آئندہ یہ معصیت ہرگز نہیں کرنی' پھر بھی اتفاقاً شہوات سے مغلوب ہو کر ہو جائے تو پھر توبہ اور اپنے اوپر مالی جرمانہ جو صدقات کی صورت سے ہو' کیا جائے' ماحول کو حتی الامکان بدلا جائے' اگر وہ معصیت کا ماحول ہے اور دل کی کمزوری سے اس کے اثرات سے بچاؤ زیادہ دشوار ہو تو ماحول کی تبدیلی کی پوری سعی کی جائے جب اللہ کے لئے آدمی اپنے منافع تک ترک کرنے پر آمادہ ہو جائے تو کیسے ممکن ہے کہ حق تعالیٰ اسے ادھر میں چھوڑ دیں' ادھر سے بلاشبہ دستگیری ہوگی ان سب عملی و نظری مفاسد سے بچنے کا ایک بڑا ذریعہ ذکر اللہ کی کثرت ہے زبان کو ذکر سے تر رکھا جائے' صبح و شام ذکر کا کوئی معمول کرلیا جائے' مثلاً صبح و شام سو سو مرتبہ **حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ** اور کلمہ **"لا الٰہ الا اللّٰہ"** کا ذکر کیا جائے یعنی ایک تسبیح حَسْبُنَا کی اور ایک تسبیح کلمہ توحید کی صبح اور ایک شام کو' اس کے خلاف خیالات فاسدہ آویں تو **لاحول** پڑھی جائے جب نصب العین آخرت قرار دے لیا گیا تو منافی آخرت خیالات کو سوائے لاحول سے دفع کرنے کے اور کیا ہو سکتا ہے' یہ کثرت ذکر خود ہی قلب کو پاک کرے گی خیالات فاسدہ کو کم یا گم کرے گی قلب کی سختی کو مٹا کر رقت پیدا کر دے گی' اور برے ماحول سے نفرت دلا کر اچھے ماحول کے جذبات پیدا کرے گی' اس لئے ہر طرف سے ہٹ کر اس دستور العمل کو اختیار کر لیجئے اور برے خیالات پر لاحول بھیجئے' اس کے سوا دوسری راہ

اصلاح کی نہیں، ساتھ ہی کسی کو اپنا رفیق عمل بنالیجئے جو نیک مشورہ دے، اور کسی ایک کو مرجع افکار بنایئے کہ وہ وساوس اور منغصوں کے وقت سنبھالتا رہے حاصل یہ کہ بیماری ہے تو طبیب معین کیجئے اور اس کے سامنے حالات کی اطلاع، تدابیر کا اتباع اس پر اعتماد اور اس سے اعتقاد قائم کر کے ان چاروں باتوں کو مشعل راہ بنایئے۔ بھروسہ خدا کے فضل پر کیجئے مگر فضل کی علامت نیک عمل کو سمجھئے، اگر وہ نہیں ہے تو سمجھئے کہ فضل متوجہ نہیں ہے۔

اس وقت اس سے زیادہ کسی اور بات کی حاجت نہیں، اسی لئے سر دست اسی پر اکتفاء کرتا ہوں ــــ اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت، استقامت، ہمت اور عزیمت عطا فرمائے اور حسن انجام نصیب فرماوے، آمین، والسلام۔

محمد طیب غُفِرلہٗ
مہتمم دارالعلوم
دیوبند، ۱۱-۹-۷۷

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اظہارِ تعزیت

اُذْكُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاكُمْ اپنی میت کی خوبیاں بیان کیا کرو۔ تاکہ ان خوبیوں کے تذکرہ سے ایک طرف تو میت کی طرف سے قلوب میں محبت پیدا ہو' اور محبت کے داعیہ سے لوگ اسے ثواب و دعا سے یاد رکھیں۔ اور دوسرے یہ کہ اس کی خوبیوں کے تذکرے سے خود ہم میں ان خوبیوں کے حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو اور ہم بھی اس کے نقش قدم پر چل کر وہی مقام حاصل کریں جو مرنے والے نے حاصل کیا تھا۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۔۔۔۔۔ اَمَّا بَعْدُ ۔۔۔۔۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ)

موت کا جام

بس اتنی سی حقیقت ہے فریبِ خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہوجائے

بزرگانِ محترم!
دنیا میں موت و حیات کا سلسلہ ابتدائے آفرینش عالم سے جاری ہے' ولادتیں بھی ہو رہی ہیں اور موتیں بھی آ رہی ہیں' ولادت کے بعد موت سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں رکھا گیا۔ عالم میں ہر کلیہ میں کچھ نہ کچھ مستثنیات نکلتے ہیں۔ مگر جس کلیہ سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں وہ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ کا کلیّہ ہے' جب انبیاء اور اولیاء اور دنیا کے بڑوں میں اُمراء و سلاطین مستثنیٰ نہیں رہے تو کون ہے کہ موت کے پنجہ سے اسے بچا ہوا باور کرلیا جائے۔ پس جو بھی پیدا ہوتا ہے اس کی آخری منزل موت ہی ہے۔

[1] ۱۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو اسلامیہ ہائی اسکول دیوبند میں خان بہادر محمد ضیاء الحق صاحب مرحوم کی تعزیت میں ایک جلسہ ہوا جس میں حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ نے ذیل کی تقریر ارشاد فرمائی۔

ع

ہر آں کہ زاد بنا چار بایدش نوشید
زجامِ دہر مئے کُلُّ مَنۡ عَلَیۡھَا فَانٍ

یعنی جو بھی پیدا ہوا ہے اسے بہر حال موت کا جام نوش کرنا ہے۔

لِاَنَّ الۡمَوۡتَ غَایَۃُ کُلِّ حَیٍّ

''موت ہی ہر زندہ کی آخری منزل ہے''۔

اسی لئے ولادتوں کے ساتھ موت کا سلسلہ بھی دنیا میں قائم ہے اور رہے گا ۔

کسی کا کُندہ نگینہ پہ نام ہوتا ہے
کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دُنیا کہ جس میں شام وسحر
کسی کا کُوچ، کسی کا مقام ہوتا ہے

فرقِ مراتب

لیکن ولادت وموت سب کی یکساں نہیں ہوتی بلکہ جیسے پیدا ہونے اور مرنے والے مختلف مراتب کے لوگ ہوتے ہیں ایسے ہی ان کی ولادتوں اور موتوں میں تفاوت اور فرقِ مراتب ہوتا ہے کسی کی پیدائش صرف ماں باپ کے لئے خوش کُن ہوتی ہے۔ کسی کی خاندان بھر کے لئے باعث مسرت ہوتی ہے۔ کسی کی ولادت پر پورا شہر خوشی کرتا ہے اور کسی کی پیدائش پر ملک بھر اور دنیا بھر میں خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ ایسے ہی موت بھی برابر نہیں۔ کسی کے مرنے پر کوئی بھی رونے والا، اور میراث بانٹنے والا نہیں ہوتا۔ جیسے حدیث شریف میں ارشاد ہے :

قَلَّتۡ بُرَاثُہٗ وَقَلَّتۡ بَوَاکِیۡہِ

''نہ اس کے رونے والے نہ میراث لینے والے''۔

کسی کی موت پر صرف اس کے ماں باپ یا قریبی عزیز غم کر لیتے ہیں۔ کسی کی موت صرف خاندان کے لئے غم ساتھ لاتی ہے، کسی کی موت سے شہر کا شہر سوگوار ہو جاتا ہے اور کسی کی موت پر شہر ہی نہیں ضلع اور صوبہ روتا ہے۔

خان بہادر مرحوم انہیں لوگوں میں سے تھے کہ جن کی ولادت بھی صرف ایک گھر کی خوشی نہ تھی بلکہ کئی خاندانوں اور ایک پورے علاقہ کی خوشی تھی۔

اِحسانات کا غم

اور آج جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کا غم بھی صرف ان کے گھر کا غم نہیں بلکہ خاندانوں پورے شہر والوں اور پورے ضلع والوں بلکہ بعض حیثیات سے پورے صوبے کا غم ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی کسی کی ذات کو نہیں روتا، بلکہ اس کے اوصاف کو، اس کے احسانات کو اور اس کی خوبیوں کو روتا ہے۔ ٹھیک اس وقت جب کہ اچھے اوصاف کا انسان مرنے کے وقت ہنستا ہوا اور خوش ہوتا ہوا اپنے اللہ سے ملتا ہے اس وقت دنیا روتی ہوتی ہے۔

کسی شاعر نے خوب کہا ہے ۔

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو
ہمہ خنداں شوند تو گریاں
آں چناں زی کہ وقت مردن تو
ہمہ گریاں شوند تو خنداں

تجھے یاد بھی ہے کہ تیری پیدائش کے وقت تو تو رو رہا تھا اور سب خوشی سے ہنس رہے تھے۔ بس زندگی ایسا گزار کہ مرنے کے وقت تو تو خوشی سے ہنستا ہوا ہو' اور سب روتے ہوئے ہوں۔'' تو یہ واقعہ ہے کہ خان بہادر مرحوم اسی شعر کے مصداق تھے کہ وہ تو انشاء اللہ اپنے نیک کردار کے سبب ہنستے ہوئے اپنے مالک سے جا ملے اور دنیا آج ان کے ماتم میں رو رہی ہے تو یہ رونا ان کی ذات کا نہیں بلکہ ان کے اوصاف اور خوبیوں کا ہے جو آج ہم سے چھن گئی ہیں۔

سلامتیٔ فطرت

خان بہادر مرحوم کی جوانی اور پیری میرے سامنے گزری ہے۔ میرا لڑکپن تھا اور وہ جوان تھے ان کی زندگی کا ایک عجیب اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن ہی میں ہو گئی تھی اور وہ لڑکپن میں بلا مربّی کے رہ گئے تھے۔ آپ اندازہ کیجئے کہ ایک نونہال جو خاندانوں کی آنکھ کا تارا ہو اور دولت سے گھر بھرپور ہو تمام وسائل زندگی اور مال وجاہ خاندانی طور پر ورثہ میں ملا ہو اور اوپر سے کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی نہ ہو تو ایسی حالت میں مال ودولت کی فراوانی کی جو بُری لت بھی پڑجائے وہ حیرت انگیز نہیں ہوتی۔ ہزاروں رئیس زادے اس طرح بگڑتے دیکھے گئے کہ سر پر بڑا اور مربّی نہ رہا اور خاندانی دولت بلامنت ہاتھ لگ گئی تو بدکاریوں اور بُرائیوں میں مبتلا ہو کر دولت بھی برباد کردی' جائیداد بھی ضائع کردی اور خاندانی وجاہت کو بھی خاک میں ملادیا۔ لیکن یہ خان بہادر کی ہستی تھی کہ گھر کی ریاست ہاتھ میں ہے سر پر کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں لیکن اپنی سلامتیٔ فطرت سے وہ کسی بُری لت کے شکار نہیں ہوئے' کسی عیّاشی' کسی تعیّش' کسی فضول خرچی' کسی نمود ونمائش کے چکر میں نہیں پھنسے۔ ان کی جائیداد نہ صرف یہ کہ محفوظ ہی رہی' بلکہ باغ وراغ کا اس میں بھی اضافہ ہوا۔

یہ بلاشبہ ان کے قلب کی سلامتی اور فطرت کی خوبی تھی کہ وہ خود بخود اسی راہ پر چلے جس پر نیک دل رئیس کو چلنا چاہئے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ خدا نے انہیں دولت کے ساتھ عزت کے خزانے بھی بخشے' وہ آنریری مجسٹریٹ بھی ہوئے' چیئرمین بھی ہوئے اور برسہا برس رہے۔ صوبائی کونسل کے ممبر بھی ہوئے۔ اونچی سوسائٹی میں ان کا مقام بھی بنا اور شہر یا ضلع ہی کے نہیں صوبہ کے نمائندہ کی حیثیت سے وہ صوبہ بھر کے بڑوں میں شمار ہوئے' دوسرے لفظوں میں انہوں نے پوری صوبائی ملّت کا اعتماد حاصل کرلیا جو ہر ایک کو میسّر نہیں آتا۔

ضمیر کی سچّائی

ساتھ ہی اس سے بھی زیادہ حیرت ناک امر یہ ہے کہ وہ جس حالت میں قوم کے معتمد علیہ تھے اسی حالت

میں گورنمنٹ کے بھی معتمد علیہ تھے۔ اعتماد کا آخری ڈپلومہ سرکاری خطاب ہے۔ سو وہ بھی گورنمنٹ کی جانب سے انہیں عطا ہوا' اور پھر عجیب تر یہ ہے کہ قوم اور گورنمنٹ کا ان پر اعتماد بیک وقت اس قوت بھی بدستور قائم رہا جب کہ قوم اور حکومت میں کشمکش اور مقابلہ ٹھن گیا اور جو لوگ قوم میں معتمد تھے ان کا اینٹی گورنمنٹ ہونا لازمی تھا اور جو گورنمنٹ کے معتمد علیہ ہوتے تھے ان کا اینٹی قوم ہونا ضروری تھا لیکن خان بہادر کے قلب کی یہ جامعیت اور صفائی حیرت ناک ہے کہ وہ اس کشمکش کے دوران میں بھی بدستور قوم اور گورنمنٹ دونوں ہی کے معتمد علیہ رہے۔ کس طرح رہے؟ بعض لوگ دو رُخا اعتماد نفاق سے حاصل کرتے ہیں کہ جدھر جاتے ہیں ادھر ہی کی کہہ کر آتے ہیں۔ لیکن یہ اعتماد وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔ اس نتیجہ میں انسان دونوں جانب سے دُھتکار دیا جاتا ہے۔ خان بہادر نے ان دونوں متضاد جانبوں کا اعتماد اپنے ضمیر کی سچائی سے حاصل کیا۔ وہ گورنمنٹ اور قوم کے سامنے سچائی سے وہی بات کہتے تھے جو ان کے ضمیر کی آواز ہوتی تھی۔ بے غرض کہتے تھے' وہ کسی لالچ یا طمع سے کبھی بھی کسی کے سامنے نہیں آئے۔ وہ گورنمنٹ پر تو قوم کے اثرات کا دباؤ ڈال کر گورنمنٹ کو قوم کی بھلائی کے لئے ہموار کرتے تھے اور قوم کو سچائی کے ساتھ اس کی موافقت و مخالفت کی پرواہ کئے بغیر اپنے ضمیر کی بات پہنچادیتے تھے جس میں ان کے نزدیک قوم کی بھلائی و بہبودی ہوتی تھی' ان کی یہ سب باتیں اس قدر سُلجھی ہوئی اور بااُصول ہوتی تھیں کہ انہیں مانے بغیر چارۂ کار نہیں ہوتا تھا' اس لئے قوم اور حکومت دونوں ہی ان پر اعتماد کرنے میں مجبور تھے۔

بہرحال ان کے پیچھے جاہ ومال کی کوئی بُری لت نہ تھی' جس سے ان کی دنیوی جاہ وعزت بڑھی' دولت نے ترقی کی اور اونچی سوسائٹی نے انہیں قبول کیا اور دنیوی حیثیت سے وہ کبھی کسی تنزل سے دوچار نہیں ہوئے۔

دینی مقبولیت

ہاں! جوانی میں اگر ان کے پیچھے کوئی دولت لگی تو وہ بزرگانِ دین کی طرف رجوع ان کی مجلسوں میں بیٹھنا ان کی عادت بنی۔ یہ بھی ان کے ضمیر کی خوبی اور دل کی ہدایت کی بات تھی کہ لت بھی لگی تو وہ جو دنیا و آخرت میں مقبولیت کا ذریعہ بنے اور ان کی عزت کو چار چاند لگادیئے۔ مجھے یاد ہے کہ ہر دوسرے تیسرے روز حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس نشینی۔ میرے والد صاحب قبلہ کی مجلس مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس میں بیٹھنا ان کی زندگی کا ایک جزو بن گیا تھا۔ اکثر وبیشتر والد مرحوم کے ساتھ ان کے گھر پر آنا مجالس میں بیٹھ کر کچھ حاصل کرنا ان کا امتیاز بن گیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ نیکوں میں بیٹھ کر آدمی نیک اور بدوں میں بیٹھ کر بد ہوتا ہے۔ خان بہادر جیسے سلیم الطبع انسان کو دل کی سلامتی کے ساتھ جب مجلسیں بھی اہلِ خیر کی ملیں تو ان کی طبعی نیکی اور زیادہ دوبالا ہوگئی۔

ماہ رمضان میں مجھے یاد ہے کہ کئی کئی بار میرا قرآن شریف سننے مسجد دارالعلوم میں آتے اور تراویح کے بعد ان بزرگوں کی مجلس میں بیٹھ کر طویل صحبت حاصل کرتے تھے جس سے دنیوی مقبولیت کے ساتھ انہیں دینی مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

اعتمادِ اکابر

اور وہ جس طرح گورنمنٹ اور قوم میں معتمد علیہ تھے اسی طرح دینی طبقہ اور جماعت علماء میں بھی معتمد علیہ بن گئے' ان کی زندگی کا عنوان ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ وہ جس طبقہ میں بھی پہنچ جاتے تھے اس کا اعتماد لے

کر واپس ہوتے تھے۔ جو ان کی طبیعت کے بے لوث اور صاف ہونے کی دلیل ہے۔ گورنمنٹ کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ خطاب یافتہ ہوئے۔ قوم کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ کونسل کے نمائندہ (ممبر) منتخب ہوئے، شہر کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ دیوبند کے چیئرمین ہوئے تو علماء کا اعتماد حاصل کر کے وہ دارالعلوم دیوبند کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۳۵۳ھ سے ۱۳۷۴ھ تک اکیس برس انہوں نے رکنیت کی یہ خدمات اس خوبی اور دیانتداری سے انجام دیں کہ ان کے دوست اور مخالف سب ان سے خوش رہے، جس کی بڑی وجہ وہی تھی کہ وہ ہر اقدام اپنے ضمیر کی سچائی سے کرتے تھے۔ کسی رورعایت سے ان کے یہاں کام کی انجام دہی نہ ہوتی تھی۔ اس لئے کہ ان کے بڑے اور چھوٹے سب ان کے مداح تھے۔ کوئی بھی ان سے نالاں اور گریاں بریاں نہ تھا کیوں کہ نہ وہ خود غرضی سے کام کرتے تھے نہ انتقامی جذبات سے کام لیتے تھے، بلکہ اصول پسندی سے ان کی رائے اور عمل کا کام انجام پاتا تھا۔ اس دینی سلسلہ کی رکنیت اور علماء کی صحبت و معیّت کا انجام دنیوی بہبود وفلاح کے ساتھ اُخروی کامیابی کی صورت میں نمایاں ہوا، نماز، روزہ کی پابندی، زکوٰۃ کا حساب کتاب، حج کی توفیق، مسلمانوں کی اخلاقی اور مالی امداد کے کام ان سے بے تکلف سرزد ہوتے تھے۔ مدینہ منورہ کے غرباء کی امداد گھر بیٹھ کر کرتے تھے۔ دو مرتبہ ان کے عطیات کا امین میں خود بنا، اور ان کے منشاء کے مطابق ان کی رقم مدینہ منورہ میں تقسیم کی گئی۔ پس مرحوم ان خوش نصیب افراد میں سے تھے جنہیں دنیا کے ساتھ دین اور جائز عیش کے ساتھ طاعات وعبادت کی توفیق بھی بخشی گئی۔

انفرادی اعتماد

آج اگر یہ شہر اور ضلع خان بہادر کو رو رہا تھا تو وہ ان کی ذات کو نہیں بلکہ ان کے اوصاف کو رو رہا ہے جن کی بدولت وہ ہر طبقہ میں مقبول، ہر طبقہ کے معتمد علیہ تھے اس پر مزید خوبی ان کی بے تکلفی تھے بڑے ہی نہیں چھوٹوں کے ساتھ بھی ایسے اخلاق سے پیش آتے تھے کہ چھوٹا انہیں بڑا سمجھنے پر مجبور ہو جاتا کیونکہ وہ خود اپنی نگاہ میں اپنے کو بڑا نہیں سمجھتے تھے۔ برادری میں برابر کے بھائی کی طرح، بزرگوں میں نیک سرشت خوردوں کی طرح اور خوردوں میں مشفق بزرگوں کی طرح پیش آتے تھے جس سے انفرادی اعتماد بھی ان کا افراد میں قائم تھا۔

بہرحال یہی وہ اوصاف اور خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے شہر اور ضلع سوگوار ہے اور غم میں گریاں ہے۔ چنانچہ آج کی مجلس میں بھی وہی مجلس غم اور تعزیت کی مجلس ہے جو شہر کی طرف سے منعقد ہوئی ہے۔ اس مجلس کا موضوع یہی ظاہر کیا گیا ہے کہ ان کے غم کو جو چھپایا نہیں جاسکتا اور دل میں اس کی سمائی مشکل نظر آرہی ہے کھول دیں۔ اور آنکھیں اگر روتے روتے تھک گئی ہیں تو دل کو ہی گریہ وبُکا سے ہلکا کر لیں۔

لیکن میں اپنے بزرگوں کی خدمت میں ادب سے عرض کروں گا کہ رونا اور غم کرنا نہ کوئی فائدہ مندبات ہے نہ اس سے دنیا و آخرت کا کوئی نفع متعلق ہے۔ اگر رونے اور غم کرنے سے جانے والا واپس ہو جایا کرتا تو سو برس تک بھی رونا بند نہ کیا کرتے۔ بقول عرفی کے ؎

عرفی گر بر گریہ میسّر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنّا گریستن

''اے عرفی اگر رونے سے مرنے والا مل جایا کرتا تو سو سال بھی ہم رونے سے نہ تھکتے اور روتے رہتے''۔

رسمی نوحہ وبکاء

لیکن رونا اور غم کرنا کسی کو واپس نہیں لاسکتا' اسی لئے شریعت کے نزدیک غم لے کر بیٹھنا اور بہ تکلف اسے نمایاں کرنا جاہلیت کی رسم قرار دیا گیا ہے۔ زمانہ جاہلیت کا دستور تھا کہ بڑے لوگ مرتے وقت وصیت کر جایا کرتے تھے کہ ہمیں برس دن رویا جائے تاکہ دنیا پر واضح ہو کہ کوئی بڑا شخص دنیا سے اٹھا ہے۔ ظاہر ہے کہ برس دو برس کون ہے کہ دل سے روئے کیونکہ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں رونے والیاں کرایہ پر رکھی جاتی تھیں اور انہیں اُجرت دے دے کر رُلایا جاتا تھا' جب کوئی تعزیت اور پُرسہ کے لئے آتا تو وہ جلدی سے حلقہ باندھ کر بیٹھتیں اور آوازیں ملا کر نوحہ وبکاء کرنا شروع کر دیتیں۔ مؤثر اشعار اور غم افزا کلمات سے دلوں کو پگھلاتیں اور لوگ آنسو پونچھ کر یہ کہتے ہوئے چلے جاتے کہ حقیقتاً ایک بڑا آدمی دنیا سے اُٹھ گیا جس کا یہ سوگ کیا جارہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس رسمی رونے میں نہ رونے والیوں کا دل شریک ہوتا تھا نہ رونا دیکھنے والوں کا۔ دونوں زمانہ سازی سے روتے تھے برادری یا شہر کو دکھلانے کے لئے یہ حرکت کرتے تھے۔

میت کی راحت رسانی

اس لئے ہماری مجلس اور ہماری انفرادی نشست کا موضوع غم وماتم نہ ہونا چاہئے کہ یہ رسمِ جاہلیت ہے۔ بلکہ موضوع یہ ہونا چاہئے کہ ہم سے تو میت کو نفع پہنچے اور میت سے ہمیں نفع پہنچے۔

شریعت نے ہم سے میت کو نفع پہنچنے کی صورت تو ایصالِ ثواب بتلائی ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ:

"قبر کے اندھیرے گھرانے میں میت اپنے گھر والوں سے آس باندھتا ہے کہ شاید مجھے کوئی یاد کرے اور شاید مجھے کوئی ثواب پہنچادے"۔

حدیث شریف میں ہے کہ:

"قبر میں میت کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی بیچ دریا میں منجدھار کے ہچکولے کھارہا ہو' اور اسے تنکا بھی ہاتھ لگ جائے تو وہ اسے بھی اپنا سہارا سمجھتا ہے' ٹھیک اسی طرح میت قبر میں راحت ونجات کی خاطر اپنے وارثوں اور دوستوں سے آس لگائے رہتا ہے کہ کاش مجھے کوئی یاد کرے اور ثواب پہنچائے جو میرے لئے تنکے کا سہارا ہو جائے"۔

سو خان بہادر کی خیر خواہی یا ان کے حقوق کی ادائیگی جو ہم سب کے ذمہ ہے یہ نہیں ہے کہ اس نیک ہستی کے غم میں ہم چار آنسو بہالیں اور رومال سے آنکھوں کو پونچھ کر اپنے گھر روانہ ہو جائیں بلکہ یہ ہے کہ ان کی راحت رسانی کا سامان بہم پہنچائیں اور وہ ایصالِ ثواب ہے۔

ایصالِ ثواب کی آسانی

کوئی بڑی بات نہیں ہے اگر ہر شخص روزانہ یا دوسرے تیسرے روز قل ھو اللہ شریف تین بار پڑھ کر مرحوم کو ثواب اور دعا میں یاد کرلیا کرے۔ قل ھو اللہ کو تین دفعہ پڑھنے کا ثواب حدیث شریف میں ہے کہ:

"ایک پورے قرآن کے ثواب کے برابر ہے"۔

اللہ نے کس قدر آسانی فرمادی کہ دو منٹ میں تین دفعہ قل ھو اللہ پڑھو اور ثواب حاصل کرو جو دس بارہ

گھنٹے کی محنت سے پورا قرآن شریف پڑھ کر حاصل ہوتا ہے اس لئے چند آنسو بہالینا یا چند کلماتِ تعزیت زبان سے ادا کردینا مرحوم کی خیر خواہی نہیں بلکہ ایصالِ ثواب کرنا حقیقی خیر خواہی ہے۔ خواہ جان سے جیسے تلاوت نماز اور دوسری عبادات کا ثواب پہنچانا یا مال سے جیسے غرباء و مساکین کو بہ نیتِ ایصالِ ثواب کھانا یا کپڑا پہنچانا وغیرہ۔

محاسنِ مرحوم

پس ہماری مجلس یا انفرادی نشست کا ایک موضوع تو بحکم شریعت یہ ہونا چاہئے کہ ہم میت کو نفع پہنچائیں اور دوسرا موضوع یہ ہے کہ میت سے ہم خود نفع حاصل کریں اس کی صورت شریعت نے یہ بتلائی ہے کہ:

اذکرو محاسن موتاکم

''اپنی میت کی خوبیاں بیان کیا کرو''۔

تاکہ ان خوبیوں کے تذکرہ سے ایک طرف تو میت کی طرف سے قلوب میں محبت پیدا ہو اور محبت کے داعیہ سے لوگ اسے ثواب و دعا سے یاد رکھیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی خوبیوں کے تذکرہ سے خود ہم میں ان خوبیوں کے حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو اور ہم بھی اس کے نقشِ قدم پر چل کر وہی مقام حاصل کریں جو مرنے والے نے حاصل کیا تھا۔

پس! ایصالِ ثواب سے میت کو ہم سے کچھ ملتا ہے اور میت کے عمدہ تذکروں سے ہمیں میت سے کچھ ملتا ہے۔ اس لئے ہماری اس مجلس کا موضوع رونا اور اظہارِ غم کرنا نہیں ہونا چاہئے بلکہ خان بہادر مرحوم کو نفع پہنچانا اور ان سے خود نفع حاصل کرنا ہونا چاہئے۔

مرحوم کی یادگار

خان بہادر مرحوم کی عمدہ ترین یادگار ''یہ ہائی اسکول ہے جو ان کی تنہا کوششوں سے قائم ہوا۔ اور اس وقت قائم ہوا جب کہ سب اس کے قیام سے مایوس تھے لیکن ان کی ہمتِ مردانہ تھی کہ مایوسیوں کے ہجوم میں پامردی کے ساتھ وہ کھڑے ہوئے اور اسکول قائم کر کے چھوڑا' جس کا نفع آج قصبہ کے ہندو' مسلمان دونوں کو پہنچ رہا ہے۔ درمیانی مدت میں ایسا وقت بھی آیا کہ اسکول باقی رہنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی' مرحوم نے مجھ سے بھی اس کا تذکرہ فرمایا اور یہ کہ لوگوں کو اس کی امداد کی طرف متوجہ کیا جائے۔ میں نے بھی ان کے بزرگانہ ارشاد کی تعمیل میں اس کی جدوجہد کی اور اس میں کامیابی ہوئی جس پر ہمیشہ ممدوح مسرت کا اظہار فرماتے تھے لیکن حقیقتاً یہ کام صرف ان کی ہمتِ مردانہ کا نتیجہ تھا کہ اسکول کو مایوسیوں کے ہجوم میں بھی چلاتے رہے۔ حتی کہ انہیں کتنے ہی ماہ تنخواہ میں اپنی ذات سے ہزاروں روپیہ خرچ کرنا پڑا۔ مگر اس کارِ خیر سے نہ ہٹے۔ علم کی بقا کا راستہ پیدا کرنا خواہ وہ کسی بھی چیز کا علم ہو امرِ خیر ہے۔ جبکہ حسنِ نیت سے ہو اور صدقہ جاریہ ہے کیوں کہ عمل تو عامل کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے لیکن علم عالم کے ساتھ یا علم کا انتظام کرنے والے کے ساتھ ختم نہیں ہوتا بلکہ باقی رہتا ہے۔ یہ مادی دولت نہیں ہے کہ اسے جتنا خرچ کرو گھٹتی ہے بلکہ روحانی دولت ہے کہ جتنا خرچ کرو بڑھتی ہے۔

اس لئے ہم سب کا فرض ہے کہ ان کے اور محاسن کے ساتھ ان کے اس صدقہ جاریہ کو باقی رکھنے کی امکانی سعی کرتے رہیں' جس سے مرحوم کی روح خوش رہے گی اور اجرِ دائمی سے مستفع ہوتی رہے گی۔

بہر حال رونے اور غم والم کے اظہار کے بجائے ہمارا کام ایصالِ ثواب اور ذکری محاسن ہونا چاہئے کہ یہی ان کے دلوں میں ہمہ وقت زندہ رہنے کی سبیل ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خان بہادر مرحوم کو اعلیٰ علیین میں مقامات بلند عطا فرمائے اور جس طرح انہیں دنیا میں اس نے قبول فرمایا تھا اسی طرح آخرت میں انہیں قبول فرمائے اور ان کے پسماندگان اور تمام وارثوں اور عزیزوں کو ان کے نقشِ قدم پر چلائے اور صبر و تسلی عطا فرمائے۔ ہم سب ان کے دُکھ دَرد کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

آداب دعاء

دعاء عبادت کا مغز ہے ___ اس لئے کہ عبادت کے معنی غایت تذلل کے ہیں۔ انتہائی ذلت اختیار کرنا۔ یہ عبادت کی حقیقت ہے۔ آدمی غایت درجہ ذلیل ہو جائے اور اتنی ذلت اختیار کرے کہ اس ذلت کے بعد کوئی درجہ ذلت کا باقی نہ رہے۔ یہ حقیقت عبادت ہے تو ہاتھ پھیلا کر مانگنے سے زیادہ کسی چیز میں ذلت نہیں۔ یہ انتہائی طور پر ذلیل چیز ہے کہ آدمی بھیک مانگے' اللہ کے آگے جب بھیک مانگے گا تو بندے کا حق ہے کہ وہ انتہائی طور پر ذلیل بن جائے۔ اس لئے کہ انتہائی ذلت اس ذات کے سامنے اختیار کی جاسکتی ہے جس کی عزت انتہائی ہو۔ جس کے بعد کوئی درجہ عزت کا باقی نہ ہو ___ تو اللہ کی ذات انتہائی عزت میں ہے۔ اس کے سامنے ذلت بھی انتہائی پیش کی جائے گی کہ جس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ تو دعاء مانگنے میں انتہائی ذلت ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ ٥

سید الایام

بزرگان محترم!

اتنا وقت نہیں ہے کہ کوئی مستقل مضمون شروع کیا جائے۔ جمعہ سے قبل جو تھوڑا سا وقت ہے۔ اس میں چند مختصر باتیں منتشر طریق پر گزارش کرنی ہیں۔ جس وجہ سے ہم جمع ہیں وہ جمعہ ہے۔ تو جمعہ نے موضوع

لہ شروع بیان میں تو جمعہ کے متعلق کچھ ارشاد فرمایا۔ بعد میں دعا کے آداب زیادہ تر بیان فرمائے اسلئے تقریر کا نام آداب دعا رکھا گیا

متعین کردیا۔ جمعہ ہی کے متعلق چند باتیں عرض کردی جائیں گی۔

جمعہ کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے کہ یہ سید الایام ہے۔ یعنی تمام دنوں کا سردار اور تمام دنوں کا بادشاہ یہ دن گنا گیا ہے ___ اور اس کو "عید المومنین" بھی فرمایا گیا ہے۔

شان جامعیت

"جمعہ" لغت عرب میں اس کا مادہ جمع ہے۔ یعنی جمعہ کے اندر جمع کرنے اور جامعیت کی شان موجود ہے۔ کہ یہ منتشر اجزاء کو جمع کردیتا ہے۔ اس لئے اس کا نام جمعہ رکھا گیا۔

جب سے اللہ نے اس دن کو پیدا کیا۔ اس دن سے اس کا کام برابر یہی ہے کہ یہ منتشر اجزاء کو جمع کرتا رہتا ہے۔ جتنے بڑے بڑے کام اور عظام امور دنیا میں پیش آئے ہیں' جمعہ ہی کے دن پیش آئے اور سب میں جمعیۃ کی شان موجود ہے۔

اجزائے انسان کی جمعیت

سب سے پہلے اسی دن میں انسان کے منتشر اجزاء کو جمع کیا گیا' جن سے انسان تیار کیا گیا ___ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے لئے حضرت جبریل علیہ السلام کو جمعہ ہی کے دن حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ : زمین کی مٹی میں سے ہر ہر موقع میں سے اجزاء جمع کرکے ایک مٹھی بھر کر لے آؤ تاکہ میں ایک نئی مخلوق تیار کروں۔ اس کا واقعہ طویل ہے۔ وہ سنانا مقصود نہیں ہے ___ جبریل علیہ السلام پہنچے اور زمین نے معذرت کی کہ میں اپنے اجزاء نہیں دینا چاہتی کہ میرے ذریعے ایسی مخلوق تیار ہو جو جہنم میں جلائی جائے۔ تو خوامخواہ بیٹھے بٹھائے مصیبت میں کیوں گرفتار ہوں۔ اس لئے آپ مجھے معاف کریں۔ انہیں رحم آیا اور چھوڑ کر چلے آئے ___ حضرت اسرافیل علیہ السلام بھیجے گئے۔ ان کے سامنے بھی زمین نے معذرت کی اور فریاد کی۔ انہیں بھی رحم آیا۔ وہ بھی چھوڑ کر چلے آئے ___ عزرائیل علیہ السلام ملک الموت بھیجے گئے۔ ان کے سامنے بھی زمین نے فریاد کی۔ انہوں نے کہا تیری فریاد کے سننے کی بہ نسبت مالک کا حکم ماننا زیادہ اونچی چیز ہے۔ اللہ کا مجھے یہ حکم ہے کہ میں مٹی جمع کروں۔ مجھے ہر صورت میں جمع کرنی ہے۔ چاہے کوئی جنت میں جائے چاہے کوئی جہنم میں جائے۔ مجھے اس سے بحث نہیں مجھے تعمیل حکم کرنی ہے۔ انہوں نے تمام اجزاء جمع کئے اور لاکر پیش کئے۔ آدم علیہ السلام بنادیئے گئے اور ان کا پتلا تیار کردیا گیا۔ اور ملک الموت کو فرمایا گیا کہ موت پر ہم نے تم ہی کو مقرر کیا۔ اس لئے کہ موت میں ایک منٹ کی تاخیر اس سے نہیں ہوسکتی جس کا جو وقت مقرر ہے اگر آپ بھی اس طرح فریاد سنتے تو مرنے کے وقت ہر شخص فریاد کیا کرتا کہ خدا کے لئے چند منٹ کی مہلت اور دے دو۔ تو نظام عالم درہم برہم ہوجاتا۔ تو ایسا ہی فرد موت کے لئے مناسب ہے۔ لہٰذا تم ہی موت کے اوپر مقرر کئے گئے ___ بہرحال حضرت آدم علیہ السلام کے اجزاء جمعہ کے دن جمع کئے گئے اور پتلا تیار کیا گیا تو جامعیت کی شان ابتداء سے چلی کہ منتشر اجزاء اس میں جمع ہوئے۔

جمع شرائع

پھر جب آدم علیہ السلام جنت سے اتارے گئے ہیں وہ بھی جمعہ ہی کے دن اتارے گئے ہیں اور اس وقت

انسانی اعمال کے جمع کرنے کا پیش خیمہ تھا۔ جن عملوں سے سعادت میسر آتی ہے' جن اعمال شرعیہ سے انسان کو ترقی دی جاتی ہے وہ دنیا ہی میں پہنچ کر ممکن تھے۔ تو شریعتوں کی آمد جبھی ممکن تھی کہ انسان دنیا میں آتا' جنت میں نہ شریعت کی ضرورت تھی نہ احکام وقوانین کی ضرورت تھی' دنیا ہی میں احکام شرعیہ کی ضرورت تھی اور احکام ایک دو نہیں ہزاروں تھے۔ دین اور شریعتیں مختلف رنگوں میں آئیں۔ تمام انبیاء علیہم السلام مختلف شریعتیں لے کر تشریف لائے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب دنیا میں پیغمبر تشریف لائے۔ دین بے شک ایک ہی رہا' اصول ایک ہی رہے۔ مگر شریعتیں مختلف ہوئیں۔ ان تمام شریعتوں کا اجتماع دنیا میں ہوا اور اس کا سبب آدم علیہ السلام کا نزول ہے۔ تو منتشر شرائع کو جمع کرنے والا دن بھی درحقیقت جمعہ ہی کا دن ہے۔ تو پہلے اس نے اجزائے آدم کو جمع کیا' پھر اجزاء احکام کو اس نے جمع کیا اور اسی دن میں حضرت آدم کی حضرت حوا سے ملاقات ہوئی ہے تو دونوں جمع ہوئے۔ تو وہ بھی اسی دن میں جمع ہوئے۔

اجتماع قیامت

قیامت قائم ہوگی وہ بھی جمعہ ہی کے دن قائم ہوگی۔ اس دن اولین و آخرین کو ایک میدان میں جمع کیا جائے گا۔ یہی زمین جس میں اونچ نیچ ہے' پہاڑ ہیں' دریا ہیں تو قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا کہ اس دن زمین ایسی بنادی جائے گی جس میں نہ اونچ ہوگی نہ نیچ ہوگی' پہاڑ ہوں گے نہ دریا ہوں گے **کانھا طبق فضة** جیسے چاندی کی ایک پلیٹ ہوتی ہے۔ بالکل ہموار زمین ___ تمام بنی آدم قبروں سے نکال کر اس پر جمع کئے جائیں گے۔ آدم علیہ السلام کی ساری اولاد اولین وآخرین جمع ہوگی۔

یوم مجموع لہ الناس ___ جس دن سارے انسان جمع کردیئے جائیں گے۔ تو وہ بھی جمعہ کا دن ہوگا۔ جس دن قیامت قائم کی جائے گی ___ غرض آدم علیہ السلام کی مٹی جمعہ کے دن جمع ہوئی۔ احکام شرعیہ کے جمع ہونے کا سبب جمعہ کا دن بنا۔ پھر تمام انسانوں کو ایک جگہ ایک میدان میں اسی دن نے جمع کیا تو اس جمعہ کے اندر جامعیت کی شان موجود ہے کہ بکھرے ہوئے کو جمع کردے۔

اسی واسطے اس کو "عید المومنین" کہا گیا ہے جس میں ایک محلہ یا ایک شہر کے منتشر افراد جمع ہو کر ایک جگہ آجاتے ہیں۔ ان کو جمعہ کا دن جمع کردیتا ہے۔ اس لئے اس میں جمع کرنے کی یا جامعیت کی شان پائی جاتی ہے۔

تعیین جمعہ میں اقوام کا امتحان

یہی وہ دن ہے جس کے ذریعہ سے دنیا کی بڑی قوموں کا امتحان لیا گیا ہے اور اس میں صرف مسلمان کامیاب ہوئے۔

اور وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کی نگاہ میں یہ دن متعین تھا کہ اس میں اس کی عبادت کی جائے۔ تمام کام چھوڑ کر دن کا زیادہ حصہ عبادت خداوندی میں لگایا جائے۔ لیکن ابھی تک حق تعالیٰ نے ظاہر نہیں فرمایا۔

یہود کی امت جب دنیا میں آئی تو فرمایا کہ عبادت کے لئے ایک دن منتخب کرو! اگر تمہارا انتخاب اس دن تک پہنچ گیا جو ہمارے علم میں ہے تو تم کامیاب قوم سمجھے جاؤ گے۔ ورنہ نہیں۔ یہود نے اٹکل لڑائی تو یوم السبت یعنی شنبہ (ہفتہ) کا دن عبادت کے لئے منتخب کیا۔

اور اس کی بناء یہ قرار دی کہ یہ یوم الراحت ہے۔ یعنی اتوار کے دن سے عالم کی پیدائش شروع کی گئی اور

جمعہ پر ختم کی گئی۔ تو شنبہ کا دن فارغ رہا۔ یہ یوم الفراغ ہے۔ للذا یہ خوشی کا دن ہونا چاہئے۔ اس دن یہود نے عید منائی اور عبادت کے لئے اس دن کو منتخب کیا ___ لیکن وہ اس نکتے تک نہیں پہنچے جو حق تعالیٰ کے علم میں مرکوز اور مقدر تھا۔

نصاریٰ کی امت آئی تو ان سے کہا گیا کہ ایک دن عبادت کے لئے منتخب کرو۔ اگر ہمارے علم کے مطابق تمہارا انتخاب ہو گیا تو تم امتحان میں کامیاب سمجھے جاؤ گے۔ انہوں نے اتوار کا دن منتخب کیا اور اسے یوم العید قرار دیا۔

اور بناء یہ قرار دی کہ "یوم الافتتاح" ہے۔ یعنی دنیا کی پیدائش کا آغاز اتوار کے دن سے کیا گیا ہے اور یوم افتتاح خوشی کا دن ہوتا ہے۔ للذا انہوں نے اتوار کا دن متعین کر دیا اور اس کو عبادت کے لئے رکھا۔

مسلمان دنیا میں آئے تو حق تعالیٰ نے یہی سوال ان کے سامنے ڈالا کہ ہفتے میں ایک دن عبادت کے واسطے منتخب کرو! جس میں زیادہ حصہ تم عبادت میں صرف کرو گے۔

مسلمانوں نے اپنی تخمین و انتخاب سے جمعہ کا دن متعین کیا کہ اس دن ہم عبادت کریں گے۔

اور اس کی بنا یہ قرار دی کہ یہ یوم تکمیل ہے۔ یعنی اتوار کے دن عالم کی تخلیق شروع ہوئی ہے اور جمعہ کے دن ختم ہوئی اور جمعہ کی آخری ساعت میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے۔

جمعہ میں قبولیت دعا کی گھڑی

اسی واسطے جمعہ کی آخری ساعت اللہ کے ہاں مقبول ہے کہ اس میں جو شخص بھی جس مراد کی دعا مانگنے کے لئے بیٹھے گا' وہ دعا قبول کی جائے گی اور وہ ساعت آخری ساعت ہے ___ یعنی غروب سے پہلے پہلے کا جو گھنٹہ ہوتا ہے جس میں غروب واقع ہوتا ہے۔ وہی آخری ساعت ہے۔ اس ساعت کو مقبول قرار دیا گیا کہ اس میں جو بھی دعا مانگی جائے گی حق تعالیٰ قبول فرمائیں گے۔

یہ خیال نہ کیا جائے کہ بعض دفعہ ہم دعا مانگتے ہیں اور قبولیت کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ حالانکہ نص حدیث ہے کہ ہم قبول کریں گے۔ ہم نے تو بارہا ایسا دیکھا کہ ایک دعا مانگی۔ لیکن وہ قبول نہیں ہوئی۔ مہینہ بھر انتظار کیا مگر قبولیت کے کچھ آثار ظاہر نہیں ہوئے۔

قلبی دعا قابل قبول ہے

اول اس پر غور کرنا چاہئے کہ دعا کی کچھ شرائط ہیں اور کچھ آداب ہیں۔ ان شرائط اور آداب کو پورا کر کے آدمی دعا مانگے تو ممکن نہیں کہ قبول نہ ہو۔ ان شرائط و آداب کو اگر چھوڑ دیا جائے اور پھر قبول نہ ہو تو اس میں ساعت مقبولہ کا کوئی قصور نہیں۔ وہ قصور ہمارا ہو گا۔

مثلاً حدیث میں فرمایا گیا کہ :

ان اللّٰہ لا یستجیب دعاءً عن قلب لاہٍ

لہو و لعب میں پڑے دل کی دعا ہرگز قبول نہیں کی جاتی۔ اللہ سے دعا مانگ رہا ہے اور خیالات دوسری طرف ملتفت ہیں۔ کہیں بیوی میں' کہیں بچوں میں' کہیں تجارت میں اور کہیں مکان میں۔ تو خیالات بٹے ہوئے ہیں' قلب میں وساوس آ رہے ہیں اور ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے ہوئے ہیں۔ تو یہ دعا قبول نہیں کی جاتی۔

دعا وہ قبول کی جاتی ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا :

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَا

مضطر اور بے قرار ہو کر جب آدمی مانگتا ہے۔ کبھی ممکن نہیں ہے کہ وہ دعا رائیگاں ہو اور قبول نہ کی جائے۔ لیکن جب دل کے اندر اضطرار نہیں رسمی طور پر مانگ رہا ہے' دل کے اندر بے چینی نہیں ہے۔ خیالات منتشر اور بٹے ہوئے ہیں ___ فرماتے ہیں وہ دعا ہم قبول نہیں کرتے وہ الفاظ کی دعا ہے اور ہم دل کی گہرائی کی دعا قبول کرتے ہیں۔ دل کی گہرائی سے آدمی مانگے تو ممکن نہیں ہے کہ قبول نہ ہو ___ تو پہلی چیز تو یہ ہے۔

مال حرام قبولیت دعا میں منع ہے

حدیث میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے عرض کیا'

یا رسول اللہ! بعض لوگ دعائیں مانگتے ہیں مگر قبول نہیں ہوتیں۔

فرمایا :

مطعمہٗ حرام وملبسہٗ حرام یقول یارب یارب فانّٰی یستجاب لہٗ

کھانا دیکھو حرام' پینا حرام کا' لباس حرام کا اور کہہ رہا ہے یا رب یا رب دعا کہاں سے قبول ہو جائے گی' یعنی دعا کی قبولیت کے لئے لازمی ہے کہ پاکیزہ بن کر جائے۔ کسی بادشاہ کے دربار میں جاتے ہیں۔ تو قاعدہ ہے کہ کپڑے بدلتے ہیں' بدن کو صاف ستھرا کرتے ہیں' غسل کرتے ہیں' عطر لگاتے ہیں' معطر اور معنبر ہو کر جاتے ہیں۔ دربار کے آداب کا یہی تقاضا ہے۔ اگر کوئی شخص میلے کچیلے کپڑے پہن کر چلا جائے اور اوپر سے عطر کے بجائے گندگی بھی لگالے تو کیا اس کو درباد میں بیٹھنے بھی دیا جائے گا۔ اسے کان پکڑ کر نکال دیں گے کہ اس نے دربار کے آداب کے خلاف کیا۔ بات سننا تو بعد کی چیز ہے۔ اسے بیٹھنے بھی نہیں دیا جائے گا کہ یہ بے ادب ہے۔ آداب دربار کی اسے کوئی رعایت نہیں ___ تو حرام کا کپڑا پہننا یا حرام کی غذا کھا کے جانا ایسا ہی ہے جیسا کپڑے اور بدن کے اوپر نجاست لگا کر جانا ___ بلکہ یہ تو ظاہری نجاست ہے جو پانی سے دھل جاتی ہے گناہ کی نجاست معنوی نجاست ہے جسے پانی بھی نہیں دھو سکتا۔ وہ زیادہ گندی چیز ہے۔ حق تعالیٰ کے دربار میں آدمی جائے اور گندہ بن کر جائے۔ تو بیٹھنے بھی نہیں دیا جائے گا چہ جائیکہ اس کی دعاء قبول کی جائے۔ اسی کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا کہ :

مطعمہ حرام وملبسہ حرام یقول یارب یارب فانی یستجاب لہ

لباس حرام کا' کھانا پینا حرام کا۔ اور یا رب یا رب کہتا ہے۔ کہاں سے دعا قبول کی جائے گی؟ وہ تو گندگی لگا کر گیا ہے۔

جیسا کہ یہ ادب تھا کہ دل میں لہو ولعب نہ ہو۔ خیالات بٹے ہوئے نہ ہوں۔ ویسے ہی یہ بھی دعا کے آداب میں سے ہے کہ آدمی پاک بن کر جائے۔ نیت کو صاف کر کے جائے۔ لباس حلال کمائی کا پہن کر جائے۔ ان شاء اللہ قبولیت ہوگی۔

دعا بالقیود

پھر دعا مانگنے میں بعض لوگ قیدیں لگاتے ہیں۔ یا اللہ مجھے مکان دیجیو' جو اس رنگ کا ہو ایسے ڈیزائن اور ایسے نقشے کا ہو۔ یہ بے ادبی اور گستاخی ہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک دیہاتی نے دعا مانگی :

اللهم انی اسئلک القصر الابیض فی الجنة

یا اللہ میاں! مجھ جنت میں محل دیجیو' مگر سفید رنگ کا ہو' اتنا بڑا ہو' ایسی منزلیں ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ دعا مانگنے کا کیا طریقہ ہے تم تو مطلق دعا مانگو ___ اگر جنت میں داخلہ بھی ہو گیا یہ عظیم ترین نعمت ہے۔ یہی سب سے بڑا انعام ہے۔ تم نے جو قیدیں لگائیں کہ محل ایسا ہو۔ پیمائش اتنی ہو۔ رنگ ایسا ہو۔

یہ تو معاذ اللہ! اللہ کی ذات کے اوپر واجب کرنا ہے۔ کہ دیکھئے یہ یہ چیزیں دینی پڑیں گی۔ یہ بے ادبی اور گستاخی ہے۔ آدمی مطلق سوال کرے اور مانگے ___ اگر کوئی سائل ___ آپ کے دروازے پر آ کر یوں کہے مجھے آپ پلاؤ پکا کر دیں۔ چینی کی رکابی ہو اور اس کا رنگ سبز قسم کا ہو اور پھول سنہرے بنے ہوئے ہوں۔ تب تو میں قبول کروں گا ___ تو مالک کہے گا چلا جا نا معقول میرے گھر سے' میں کہاں سے لاؤں۔ میرے بچوں کے پاس بھی نہیں ہے کہ میں ایسی رکابی استعمال کروں تیرے لئے کہاں سے لاؤں؟ اور یہ مانگنے کا کون سا ڈھنگ ہے؟ ___ تو وہ اس کو نکال دے گا۔

تو اس سے زیادہ گستاخی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی جناب میں مانگے اور قیدیں اور شرائط لگائے۔ جو واقعی مراد ہے جس کی وجہ سے وہ پریشان ہے' معذور اور مجبور ہے اسے مانگ لے۔ اس میں قیدیں اور شرائط لگانا یہ ادب کے خلاف ہے ممکن ہے کہ دعاء رد ہو جائے۔

وسعت رحمت کے منافی قید سے بھی دعا رد ہو جاتی ہے

یا یہ کہ آدمی (دعا میں) کوئی ایسی قید لگائے جو اللہ کی وسیع رحمت کے خلاف اور منافی ہو۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے دعا مانگی :

اللهم ارحمنی ولا ترحم علی احد

یا اللہ! مجھ پر رحم کر' اور کسی کے اوپر رحم نہ کر۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

لقد تحجرت واسعاً

بندۂ خدا! تو نے ایک لامحدود' وسیع چیز کو کم کر کے رکھ دیا۔ اللہ کی رحمت تو وہ ہے کہ سارے جہانوں پر بٹے' جب بھی شمہ برابر کمی نہیں آسکتی اور تو کہتا ہے کہ مجھ پر تو رحم ہو اور کسی پر رحم نہ ہو۔ تو یہ اس سے بھی زیادہ گستاخی اور بے ادبی کی بات ہے ___ تو لہو و لعب میں پڑے ہوئے دل سے دعا مانگنا وہ بھی قبول نہیں ہوتی ___ دعا مانگنا اور اس میں اپنی طرف سے قیدیں اور شرائط لگانا' وہ بھی مقبول نہیں ہوتی۔ دعا مانگنا اور رحمت کے دائرے کو تنگ کر کے مانگنا یہ بھی قبول نہیں ہوتی۔ تو دعا کے کچھ آداب اور ڈھنگ ہیں۔ آدمی اس طریق پر مانگے تو ملتا ہے۔ سائل قیدیں نہیں لگایا کرتا۔ وہ تو مراد پیش کرتا ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ مجھے عطاء کر دیجئے آپ کے دربار سے مجھے کچھ نہ کچھ مل جائے۔

مانگنے کا ڈھنگ

تو ہم دعا کے آداب پورے نہیں کرتے اور جب قبولیت کے اثرات ظاہر نہیں ہوتے تو حدیث پر سوال کرتے ہیں کہ گھڑی تو مقبولیت کی تھی۔ مگر ہمارے حق میں تو کچھ بھی قبول نہ ہوا ___ سوال یہ ہے کہ گھڑی تو

مقبولیت کی تھی مگر تم نے مقبولیت کا ڈھنگ بھی اختیار کیا؟ تم نے قبولیت کے آداب بھی اختیار کئے یا نہیں؟

تو انسان کی نظر اپنی کوتاہی پر نہیں وہ اللہ کے احکام اور قوانین پر الزام ڈال دیتا ہے۔ یہ غلط طریقہ ہے۔ اگر قبولیت کے آثار ظاہر نہ ہوں تو اپنے اندر غور کرے کہ آیا میں نے کوئی کوتاہی تو نہیں کی؟ کوئی غلطی تو نہیں کی؟

فوری قبولیت

اچھا! پھر یہ ہے کہ اگر آپ نے سارے آداب پورے کئے، ساری شرائط آپ نے جمع کیں اور دعا مانگی۔ ان شاء اللہ ضرور قبول ہوگی۔ لیکن قبولیت کے طریقے مختلف ہیں ___ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ منہ مانگی مراد فوراً ہاتھ کے ہاتھ مل گئی اور آدمی کہا کرتا ہے کہ بھئی! عجیب قبولیت کی گھڑی تھی کہ جو مانگا وہی مل گیا۔ کاش میں اس وقت فلاں چیز مانگ لیتا۔ تو وہ بھی مل جاتیں تو بعض دفعہ تو منہ مانگی مراد ہاتھ کے ہاتھ مل جاتی ہے اور انسان دعا مانگ کر کامیاب اٹھتا ہے۔

ازدیاد قبولیت

اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ شے تو نہیں ملتی۔ مگر اس سے بڑی چیز مل جاتی ہے۔ تو بعد میں خوش ہوتا ہے کہ اچھا ہوا وہ چیز نہ ملی جو مانگی تھی۔ مجھے تو اس سے بھی بڑی چیز مل گئی۔ ایسی چیز ملی کہ اس کے ملنے سے جو چیز مانگی تھی، اس جیسی ہزاروں چیزیں خود بخود آجاتی ہیں۔ تو انسان خوش ہوتا ہے کہ بہت اچھا ہوا کہ فلاں مراد کی قبولیت نہ ہوئی اس سے بڑی چیز مجھے مل گئی۔

تاخیر قبولیت

بعض دفعہ منہ مانگی ہی مراد ملتی ہے۔ مگر ذرا دیر سے ملتی ہے۔ مانگنے والے میں کچھ کھوٹ ہوتا ہے۔ انتظار کیا جاتا ہے کہ وہ کھوٹ رفع ہو اور اس مراد کے لینے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ تب اس کو دیتے ہیں، انسان سمجھتا ہے کہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس کی مصلحت کی وجہ سے قبولیت میں تاخیر کی جاتی ہے۔

مصلحت تاخیر

اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کا بچہ ہو اور بچے سے زیادہ کون محبوب ہوتا ہے، اولاد سے زیادہ کس سے محبت ہوتی ہے؟ محبوب ترین اولاد ہے اور اللہ نے آپ کو سب کچھ دیا ہے، آپ لاکھ پتی ہیں۔ اگر سو روپے روز بھی جیب خرچ دیں تو آپ پر بھاری نہیں۔ آپ کا بیٹا مانگتا ہے کہ مجھے سو روپے دے دیجئے تو کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ فوراً بٹوہ جیب سے نکالا اور سو روپے کا نوٹ اس کے حوالے کیا۔ بیٹا بڑا خوش ہوا کہ باپ محبت والا بھی ہے، کریم النفس بھی، جو میں نے مانگا فوراً دے دیا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بیٹا مانگ رہا ہے کہ مجھے بیس یا دس روپے ہی روز دے دیجئے اور آپ نہیں دیتے۔ مہینے گزر گئے یہاں تک کہ چھ مہینے گزر گئے اور وہ یہ خیال کر رہا ہے کہ شاید باپ کے دل میں میری محبت باقی نہیں رہی ورنہ لکھ پتی ہے۔ اگر دو سو بھی روز دے دیتا تو کوئی بڑی بات نہیں تھی اور میں تو دس ہی روپے روز کے مانگتا ہوں ___ مگر نہیں دیئے ___ اب وہ کڑ رہا

ہے ___ چھ مہینے کے بعد دس روپے روز کے حساب سے آپ نے کئی سینکڑوں کی تھیلی حوالے کی اور کہا کہ لو بیٹا! ___ میں نے اس لئے نہیں دیئے تھے کہ تم مریض تھے۔ معدے کی مریض تھے۔ جگر بھی خراب تھا اور تمہارا علاج ہو رہا تھا۔ اگر میں تمہیں دس روپے روزانہ دیتا تو سوائے اس کے کہ تم کھانے پینے اور چاٹنے میں اڑا دیتے تو اس سے روپیہ بھی ضائع ہوتا، صحت بھی برباد ہوتی۔ تو میں نے انتظار کیا کہ جب تمہیں پوری تندرستی حاصل ہو جائے تمہارا معدہ ہر چیز کے ہضم کرنے کے لائق ہو جائے جب میں تمہیں دوں تاکہ جو بھی کھاؤ، ہضم ہو جائے۔ صحت میں قوت پیدا ہو۔ اب طبیب نے کہہ دیا ہے کہ تم اچھے ہو گئے۔ لہٰذا اب یہ روپیہ موجود ہے۔ اب بیٹا خوش ہو گا اور باپ کو دعائیں دے گا کہ بہت ہی اچھا ہوا کہ وقت پر منہ مانگی مراد پوری نہ کی۔ اگر باپ پوری کر دیتا تو میں بد پرہیزی کرتا اور ہلاکت کے گڑھے میں جا گرتا۔ خوش ہوتا ہے کہ اچھا ہوا بروقت منہ مانگی مراد مجھے نہ ملی۔

تاخیرِ قبولیت پر تشکر

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ برس گزر گئے اور بیٹا مانگ رہا ہے اور آپ نہیں دیتے ہے۔ اس کے دل میں برائی پیدا ہو گئی کہ باپ بے انتہا بخیل ہے اور باپ کے دل میں شفقت باقی نہیں رہی، دوسروں سے شکایتیں کرتا پھرتا ہے۔ مگر باپ کوئی خیال نہیں کرتا اور اس کی رعایت نہیں کرتا۔ بدستور جما ہوا ہے کہ بھئی! کچھ نہیں ملے گا۔

جب دس پندرہ برس گزر گئے۔ تو اس وقت اس نے بیٹے کو جو اس نے مانگا تھا، جمع کر کے ایک بیس ہزار روپیہ دیا اور کہا کہ میں نے اس لئے نہیں دیا تھا کہ اگر سو روپے روز دوں تو محض فضولیات میں اڑا دیتا ___ میں نے تیرے لئے جمع کیا۔ آج دیتا ہوں تاکہ اس سے جائیداد خریدے اور جائیداد خریدنے کے بعد اتنی آمدنی روزانہ تجھے ہو جائے کہ جتنی تو مانگا کرتا تھا بلکہ اس سے دوگنی ہو جائے۔ تیرے کام آئے گی۔ ورنہ فضول بیس ہزار روپیہ ضائع ہو جاتا۔ اب یہ بیس ہزار تیرے ہی نہیں بلکہ تیری نسل کے بھی کام آئیں گے۔

اس وقت بیٹا دعا دیتا ہے کہ واقعی باپ نے بڑی خیر خواہی کی کہ نہ دیا ___ اور اس صورت سے مجھے دیا کہ نہ صرف میرے ہی بلکہ میری نسل کے بھی کام آئیں گے ___ تو دیکھئے تاخیر یہاں بھی ہوئی۔ لیکن اس تاخیر پر مانگنے والا اخیر میں جا کر شکریہ ادا کرتا ہے۔ جب حقیقت حال کھلتی ہے اور جب حقیقت حال سامنے نہیں تھی، شکایتیں کرتا پھرتا تھا کہ باپ کو محبت نہیں رہی۔

ٹھیک یہی صورت یہاں بھی سمجھئے کہ بندہ حق تعالیٰ سے مانگتا ہے کہ اے اللہ! مجھے ایک جائیداد دے دیجئے۔ مجھے اتنے ہزار یا اتنے لاکھ دے دیجئے۔

کہیں تو ایسا ہوتا ہے کہ ہاتھ کے ہاتھ منہ مانگی مراد مل گئی۔ بندہ بڑا خوش ہوا کہ اللہ نے مانگتے ہی وہ چیز دے دی۔ اگر میں اس سے چوگنا مانگتا وہ بھی مل جاتا۔ وہ تو مقبولیت کی گھڑی تھی ___ اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آپ مانگ رہے ہیں۔ مگر نہیں مل رہا۔ دو یا تین مہینے یا برس دن گزر گئے۔ برس دن کے بعد اسباب ایسے ہوئے کہ حق تعالیٰ شانہ نے وہ مراد پوری کی اور دل میں آپ کے القاء کیا اور آپ کے اوپر واضح کر دیا کہ معصیت اور گناہوں کا مادہ موجود تھا۔ اگر ایسے ہم جائیداد دے دیتے سوائے اس کے کہ تم سینما دیکھتے، سوائے اس کے کہ تم لہو و لعب میں خرچ کرتے اور زیادہ اللہ کی حجت تمام ہوتی۔ لیکن ایک دم ہم نے پیسے بند کر دیے اس کی وجہ سے تمہارے ہاتھ پلے کچھ نہیں رہا۔ تم میں پریشانی بڑھی۔ اس پریشانی کا اثر یہ ہوا کہ اخلاقی حالت درست ہونی شروع ہوئی، وہ جو لہو و لعب میں بالکل آزاد تھے، وہ آزادی ختم ہوئی۔ اب جب حالت درست

ہو گئی' حق تعالیٰ نے مراد پوری کر دی تا کہ بے جا مصرف میں رقم صرف نہ ہو۔ گناہ انسان کے نہ بڑھیں۔ بلکہ نیکی اور تقویٰ بڑھے۔ اس وقت بندہ خوش ہوتا ہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے برس دن پہلے یہ جائیداد نہ دے دی۔ میں تو واقعی اڑا دیتا۔ برس دن کے بعد دی جب کہ میرے قلب کی رفتار صحیح ہو گئی' دل کی کلیں درست ہو گئیں۔

دعا کا اخروی ذخیرہ

اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بندہ مانگ رہا ہے' مانگ رہا ہے۔ عمر گزر گئی' مرتے دم تک کچھ نہیں دیا گیا۔ اسی افلاس اور پریشان میں مبتلا ہے اور کہتا ہے کہ معلوم نہیں کون سی مجھ سے ایسی غلطی ہوئی کہ کسی طرح میری دعا قبول نہیں ہوتی۔ عمر بھر مانگتا رہا اور نہ ملا۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں موت بھی آ گئی انتقال کر گیا ___ حدیث میں ہے کہ جب یہ بندہ میدان محشر میں حاضر ہو گا دیکھے گا کہ اجر و ثواب کے بے انتہا ڈھیر لگے ہوئے ہیں ___ عرض کرے گا یا اللہ! میں نے تو کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس کا اجر اتنا بڑا ہوتا یہ نعمتیں کہاں سے میرے لئے جمع ہوئیں؟

حق تعالیٰ فرمائیں گے وہ جو تو دعائیں مانگا کرتا تھا ہم تیری دعاؤں کا ذخیرہ کرتے رہے۔ تیرے پاس عمل کا ذخیرہ نہیں تھا۔ لیکن تو ہم سے مانگتا تھا ہم نے اسی کو تیرے لئے ذخیرہ بنایا۔ عمر بھر کی دعائیں جمع کر کے آج اتنی بڑی نعمت جمع کی کہ اب تو ابد الآباد تک جنت میں چین اڑا اور آرام کر۔

اس وقت بندہ خوش ہو گا کہ اے اللہ! تیرا شکر اور احسان ہے کہ اس وقت تو نے دعا قبول نہ کی اور اب آ کر کے وہ قبولیت کا ذخیرہ مجھے عطا کیا۔

دعا میں تفویض

تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ دعا تو مانگے مگر اپنی طرف سے تجویز نہ کرے کہ اگر میں مانگ رہا ہوں تو یوں ہونا چاہئے۔ یہ مالک کے اوپر چھوڑ دے۔ کبھی ہاتھ در ہاتھ ملے گا۔ کبھی دیر سے ملے گا۔ کبھی مرنے کے قریب ملے گا' کبھی مرنے کے بعد ملے گا۔ مگر مضطرب ہو کر جو دعا مانگی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ رائیگاں چلی جائے۔ ضرور قبول ہو گی۔

دعا کا مقام عبادت

اور میں کہتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ دعا قبول نہ ہوئی۔ نہ دنیا میں ملا نہ آخرت میں ملا۔ کچھ نہیں ملا۔ مگر دعا مانگنا خود عبادت تو ہے تو عبادت کی توفیق ہوئی یہ آپ کو تھوڑا نفع ہے؟

حدیث میں ہے کہ :

الدعاء مخ العبادة

دعا عبادت کا مغز اور خلاصہ ہے۔

اس لئے کہ عبادت کے معنی غایت تذلل کے ہیں۔ انتہائی ذلت اختیار کرنا' یہ عبادت کی حقیقت ہے۔ آدمی غایت درجہ ذلیل ہو جائے۔ اتنی ذلت آدمی اختیار کرے کہ اس ذلت کے بعد کوئی درجہ ذلت کا باقی نہ

رہے۔ یہ حقیقت عبادت ہے۔ تو ہاتھ پھیلا کر مانگنے سے زیادہ کسی چیز میں ذلت نہیں ہے۔ یہ انتہائی طور پر ذلیل چیز ہے کہ آدمی بھیک مانگے۔ اللہ کے آگے جب بھیک مانگے گا تو بندے کا حق ہے کہ وہ انتہائی طور پر ذلیل بن جائے۔ اس لئے کہ انتہائی ذلت اس ذات کے سامنے اختیار کی جا سکتی ہے جس کی عزت انتہائی ہو جس کے بعد کوئی درجہ عزت کا باقی نہ ہو۔ تو اللہ کی ذات انتہائی عزت میں ہے۔ اس کے سامنے ذلت بھی انتہائی پیش کی جائے گی کہ جس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ تو دعا مانگنے میں انتہائی ذلت ہے۔

مثلاً آپ نماز پڑھتے ہیں تو کانوں تک ہاتھ اٹھا کر ہاتھ باندھتے ہیں۔ یہ اظہار ذلت کا ابتدائی درجہ ہے کہ نوکروں چاکروں اور غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہیں۔ مگر یہ انتہائی ذلت نہیں بلکہ ابتدائی ذلت ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ رکوع میں سر جھکا دیتے ہیں تو رکوع میں بہ نسبت قیام اور ہاتھ باندھنے کے زیادہ ذلت ہے۔ رکوع میں گردن جھک گئی اور سر جھک گیا۔ لیکن یہ بھی انتہائی ذلت نہیں۔ ایک درمیانی قسم کی ذلت ہے۔ جب آپ سجدے میں جاتے ہیں تو ناک اور پیشانی خاک پر رگڑتے ہیں۔ یہ انتہائی ذلت ہو گئی۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ بھی انتہائی ذلت نہیں ہے۔ انتہائی ذلت اخیر میں رکھی گئی ہے کہ سلام پھیر کر ہاتھ اٹھا کر اللہ کے سامنے دعا مانگو۔ یا سلام پھیرنے سے پیشتر وہ دعائیں پڑھو جو شریعت نے تلقین کی ہیں۔ تو دعا کا مانگنا اور بھیک مانگنا یہ انتہائی ذلت ہے۔

سوال ممانعت

اسی واسطے سوال کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے کہ آدمی آدمی سے سوال کرے یعنی بھیک مانگے۔ سوائے اس کے کہ مضطر ہو جائے، مخمصہ کی حالت ہو کہ اگر نہیں مانگوں گا تو جان جانے کا خطرہ ہے۔ اس وقت اجازت دی گئی ہے کہ مانگ لو۔ عام حالات میں بھیک مانگنے کی اجازت نہیں۔

سوال محبت

ایک ہے سوال محبت اور سوال تعلق ___ وہ اس سے خارج ہے۔ جیسے بیٹا باپ سے مانگنے لگے یا دوست احباب میں باہم گہرا تعلق ہے اور وہ مانگے کہ بھئی! ہمیں چند پیسے دے دو یا کھانا کھلا دو یہ سوال نہیں۔ یہ سوال تعلق ہے۔ یہ سوال ذلت کا نہیں۔ بلکہ یہ سوال محبت کا ہے۔ اس سوال کی اجازت ہے۔

بلکہ بعض اوقات شریعت نے تلقین کی ہے کہ بعض مواقع میں جا کر خود مانگ کر کھاؤ تاکہ تعلق میں اضافہ ہو جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَلَا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَن تَأْكُلُوا مِن بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمَّاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخْوَالِكُمْ أَوْ بُيُوتِ خَالَاتِكُمْ أَوْ مَا مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهُ أَوْ صَدِيقِكُمْ

تمہارے اوپر کوئی نہیں گناہ اگر تم اپنے گھر میں مانگ کر کھاؤ۔ اگر آدمی اپنی بیوی سے کہے کہ فلاں چیز مجھے نکال دے۔ یہ سوال ذلت کا تھوڑا ہی ہے۔ یہ حق کا سوال ہے اور تعلق کا سوال ہے۔ تو آدمی اپنے گھر سے بلا کسی دعوت کے کھائے اسے یہ حق ہے بلکہ کھانا ہی چاہئے ___ اگر اپنے گھر میں بھی یہ انتظار کرے کہ

مجھے دعوت دی جائے۔ تو میں کھاؤں۔ تو بھوکا مرے گا گھر میں بیٹھ کر روز کون اسے دعوت دے گا۔

اسی طرح فرمایا کہ 'یا تمہارے باپ کا گھر ہو' بیٹے کو الگ کر دیا ہے۔ باپ کا گھر الگ ہے ___ فرماتے ہیں۔ یہاں بھی مانگ کر کھانے میں کوئی گناہ نہیں۔ یعنی اشارہ کیا جا رہا ہے کہ جانا چاہئے اور مانگ کر کھانا چاہئے تاکہ تعلق میں اضافہ ہو باپ یہ نہ سمجھے کہ بیٹا مجھ سے اجنبی ہو گیا یا مستقل اپنی بارگاہ بنالی کہ اس میں بیٹے ہونے کی شان باقی نہیں رہی۔ کبھی کبھی باپ کے سامنے اپنے بیٹے ہونے کی اور اپنی محتاجگی کی شان ظاہر کرنی چاہئے تاکہ اس کی بڑائی واضح ہو ہماری خوردی واضح ہو۔ اس لئے فرمایا کہ باپ کے گھر میں جا کے مانگ کر کھالو۔

یا ماں کا گھر جدا ہے۔ تو وہاں جاؤ اور مانگ کر کھالو یا پھوپھی اور خالہ 'ان کے گھروں میں جاؤ اور مانگ کر کھالو۔ اس لئے کہ خالہ بھی ماں کے برابر ہے پھوپھی بھی ماں کے برابر ہے۔ وہ باپ کی بہن ہے۔

یا فرماتے ہیں کہ :

اَوْمَا مَلَكْتُمْ مَفَاتِحَهٗ

یا تمہاری باندی کا گھر ہے یا تمہارے غلام کا گھر ہے جو تمہارا زر خرید ہے۔ وہ تمہارا مملوک ہے تمہاری اولاد کی مثل ہے۔ اس سے اگر مانگو گے تو یہ مانگنا ذلت کا نہیں بلکہ ازدیاد تعلق کا ہے۔

اَوْ صَدِيْقِكُمْ یا دوست احباب ہوں یا تم میں میل جول ہے ___ اپنے کسی دوست کے گھر جا کے کہے کہ بھئی! آج تو تمہارے گھر سے کھانا کھائیں گے۔ تو یہ ذلت کی بات نہیں بلکہ اس سے تعلق بڑھتا ہے۔ اس کے دل میں یہ گنجائش پیدا ہو گی کہ اس نے مجھے اپنا سمجھا تو آ کر مانگا۔ آدمی کسی اجنبی کے ہاں جا کر تھوڑا مانگ لیتا ہے۔

خود فرمائش

حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے ___ تو بریرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی باندی اور مملوکہ ہیں۔ بے چاری غریب تھیں۔ آپ نے جا کے خود فرمائش کی کہ بریرہ کوئی چیز کھانے کی رکھی ہے؟

انہوں نے عرض کیا' ہے تو مگر آپ کے کھانے کی نہیں۔

فرمایا کیا ہے؟

عرض کیا۔ کچھ گوشت رکھا ہوا ہے مگر وہ آپ کے لئے نہیں۔

فرمایا' کیوں؟

عرض کیا وہ صدقے کا میرے پاس آیا ہے۔

فرمایا لک صدقة ولنا ہدیة

فرمایا صدقہ تیرے لئے ہے۔ جب تو ہمیں دے گی تو ہمارے لئے ہدیہ بن جائے گا۔ آپؐ نے تناول فرمایا تو معاذ اللہ یہ ذلت کا سوال نہیں تھا یہ محبت بڑھانے کا سوال تھا۔ تعلق بڑھانے کے لئے آپ نے مانگا تھا تو تعلق میں اضافہ کرنا ہوتا ہے تو اس وقت آدمی مانگتا ہے۔ دوسرا سمجھتا ہے کہ ہمیں اپنا سمجھا ہے۔

ترک تکلف

میرا جب افغانستان جانا ہوا تو وہاں ترکستانیوں میں ایک رواج دیکھا جو ترکستان سے مہاجرین آئے ہوئے تھے' خود کابلی افغانیوں میں بھی ہے۔ شہر کابل میں گویا یہ ایک عام تمدن ہے کہ بیٹھے بیٹھے چند دوست احباب جمع ہوئے کہ آج فلاں دوست یا بھائی کے ہاں کھانا کھائیں گے تو دس بیس آدمی اکٹھے پہنچ گئے۔ وہ بہت خیر مقدم کرے گا۔ دعائیں دے گا اور استقبال کرے گا کہ آیئے بیٹھئے اور کھانا پکنا شروع ہو جائے گا۔ دس بیس اور احباب جمع ہوئے۔ وہ ہمارے گھر آ گئے کہ ہم تو کھانا کھانے آئے ہیں۔ تو ہر شخص وہاں دس بیس آدمی کے کھانے کا بندوبست رکھتا ہے۔ ایک عام رواج ہے کہ بے بلائے دس دس' بیس بیس آدمی پہنچ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب دوستوں میں بھی یہ تکلف ہو کہ آدمی دعوت کا انتظار کرے تو وہ دوستی کیا ہوئی؟ وہ بے تکلفی کیا ہوئی؟ وہاں یہ ایک عام رواج ہے جس سے وہاں تعلقات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور تعلقات مضبوط ہیں۔

اسلامی بے تکلفی

وہ کسی بزرگ کا واقعہ ہے وہ کھانا کھا رہے تھے۔ کوئی صاحب وہاں پہنچ گئے۔ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ تواضع کریں گے۔ انہوں نے کوئی تواضع نہیں کی ان کے دل میں بڑی گرانی ہوئی کہ بزرگ آدمی ہیں کھانا کھا رہے ہیں۔ یہ تو اخلاقی بات بھی ہے اور ایک مسلمان کا حق بھی ہے کہ یوں کہے کہ بھئی! کھانا کھاؤ ___ بلکہ اگر کسی کو نہیں بھی کھلانا ہوتا تو ظاہر داری کے طور پر ہی کہہ دیا کرتا ہے کہ بھائی! کھانا کھایئے اور جب دوسرا کہتا ہے کہ میں تو کھا کے آیا ہوں۔ تو دل میں شکر کرتا ہے کہ اچھا ہوا کھا آیا ___ تو ظاہر داری تو کی ___ تو اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کم از کم ظاہر داری کے طور پر ہی تواضع تو کر لیتے۔ یہ تو ایک اسلامی تعلق ہے۔ تو کچھ منقبض اور گھٹے گھٹے سے رہے۔

وہ بزرگ کھانا کھا کے فارغ ہو گئے۔ تو اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے شکایت کی کہ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ آپ بزرگ ہیں اور اسلامی تعلق کا مقتضی ہے اور اسلامی بے تکلفی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کہتے کہ کھانا کھاؤ۔

تو انہوں نے حیرت سے کہا کہ اچھا آپ مسلمان ہیں؟

کہا کہ الحمدللہ میں مسلمان ہوں جیسا کہ آپ مسلمان ہیں۔

فرمایا اسلامی بے تکلفی کے تو یہ معنی تھے کہ آپ نے اپنا گھر سمجھا تھا تو کھانا کھانے بیٹھ جاتے۔ یہ انتظار کرنا کوئی تمہیں دعوت دے' تواضع کرے۔ معلوم ہوا تمہارے ذہن میں تکلف موجود ہے۔ بے تکلف تعلق نہیں رکھتے۔ تمہاری محبت کامل نہیں تھی۔

یہ انہوں نے جواب دیا۔

خیر یہ بات اب عام تو نہیں ہے مگر بعض جگہ واقعی یہ ہوتا ہے کہ اس کا انتظار کیا کہ ہماری تواضع کی جائے۔ تب بیٹھیں گے یہ داخل تکلف ہوتا ہے۔ بے تکلف آ کے بیٹھ جائے۔ اب باپ بھائی بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے ہیں' شیخ یا استاذ کھانا کھا رہے ہیں جن سے نہایت بے تکلفی کا اور نیاز مندانہ تعلق ہے۔ اگر آدمی بے تکلف آ کے بیٹھ جائے کہ صاحب! مجھے تو کھانا کھانا ہے۔ تو وہ اور شکر گزار ہوں گے کہ نہایت بے تکلف آدمی ہے۔ تعلق مضبوط ہے ___ حاصل یہ نکلا کہ شریعت کے ہاں یہ مطلوب ہے کہ بعض جگہ تواضع اور دعوت کا انتظار مت کرو تا کہ تعلق واضح ہو۔ اس میں اپنا گھر ہے' ماں کا گھر ہے' باپ کا گھر ہے' پھوپھی اور خالہ کا گھر ہے۔ ان میں آدمی جا کے مانگے اور بے تکلف کھائے تا کہ تعلق بڑھے ___ اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً کھانے اور پینے کی چیز کا سوال کرنا ممنوع نہیں ہے۔

ذلت سوال

بلکہ سوال ذلت ممنوع ہے جس میں بھکاری بن کے جائے اور ذلیل النفس بن کے جائے ___ اور اگر عزیز النفس بن کے جائے، محبت کے بڑھانے کے لئے سوال کرے یہ سوال اس سے مستثنیٰ ہے ___ تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ سب سے زیادہ ذلت انسان کو سوال کرنے کے وقت پیش آتی ہے اور سوال کرنے والا جب سوال کرتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے منہ کی آب جاتی رہتی ہے۔ اس کے منہ پر جو ایک رونق ہوتی ہے۔ وہ ختم ہو جاتی ہے۔ خود اپنے ذہن میں اپنے کو ذلیل سمجھتا ہے کہ میں نے بہت برا کام کیا۔ تو سب سے زیادہ ذلت سوال کے وقت پیش آتی ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ احادیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن وہ لوگ جو دنیا میں بے وجہ محض طمع اور لالچ سے سوال کرتے تھے اور ذلیل النفس بنتے تھے۔ ان کا حشر اس حالت میں کیا جائے گا کہ ان کے چہرے کا گوشت اڑا ہوا ہوگا۔ کچھ ادھر لٹک رہا ہے کچھ ادھر لٹک رہا ہے۔ ہڈیاں نمایاں ہیں۔ نہایت ذلیل صورت ہوگی یہ گویا عمل کے مطابق جزا ہے۔ اس لئے کہ جب بھیک مانگتا ہے تو چہرے کی آب و تاب جاتی رہتی ہے۔ چہرے کی رونق اڑ جاتی ہے۔ اس بے رونقی کو اس شان سے ظاہر کیا جائے گا کہ گوشت کچھ ادھر لٹکا ہوا اور کچھ ادھر لٹکا ہوا ہے اور ہڈیاں نمایاں ہیں ___ یعنی ایسا چہرے لے کر آئے گا کہ دنیا اس چہرے کو دیکھ کر نفرت کرے گی۔ وہ جو ذلت نفس اس کے اندر تھی اس ذلت کا مظاہرہ کیا جائے گا۔ وہ ذلت اس صورت میں چمکے گی کہ چہرے پر عزت کے کوئی آثار باقی نہیں رہیں گے اور چہرے کی رونق اڑ جائے گی۔

تو قیام میں انسان اللہ کے سامنے ذلت اختیار کرتا ہے مگر یہ ابتدائی مرتبہ ہے، رکوع میں اس سے زیادہ ذلت ہے، سجدے میں اس سے زیادہ ذلت ہے اور مانگنے میں اس سے زیادہ ذلت ہے۔

بندہ کے سوال سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی

یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ سوال کرنے سے جتنے خوش ہوتے ہیں اتنے کسی چیز سے خوش نہیں ہوتے ---- فرماتے ہیں کہ اگر کوئی بندہ سوال کرتا ہے تو ہم اس سے خوش ہیں۔ اگر سوال نہیں کرے گا تو ہم اس سے ناراض اور ناخوش ہیں ___ دنیا میں اس کے برعکس قصہ ہے اگر آپ کسی کے آگے سوال کرنے لگیں تو وہ خوش نہیں ہوگا بلکہ ناخوش ہوگا۔ محبت بھی ہوگی تو ختم ہو جائے گی اور حق تعالیٰ کے ہاں اگر نہ مانگے تب ناخوش ہوتے ہیں، مانگنے پر خوش ہوتے ہیں۔

اس کی بناء یہ ہے کہ دنیا میں آپ جس سے بھی مانگیں گے، چاہے وہ ارب پتی ہو، مگر اس کا خزانہ پھر بھی محدود ہے جتنا دے گا اتنی خزانے میں کمی پڑ جائے گی۔ اللہ کے خزانے لامحدود ہیں اگر عالم بھی بخش دیں تب بھی کمی نہیں پڑے گی۔ اس لئے ناخوش ہونے کی کوئی وجہ نہیں البتہ یہ امتحان ہے کہ کون بندگی اختیار کر کے آتا ہے۔ کون بندہ کی صورت سے آتا ہے۔ تو بندہ وہی ہے جو پوری بندگی نمایاں کرے اور بندگی کے معنی اظہار ذلت کے ہیں۔ اس واسطے مانگنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑنی چاہئے۔ خوب مانگا جائے ___ مگر اپنی طرف سے تجویز نہ کی جائے۔ مراد مانگ لی جائے۔ مگر اس میں قیدیں اور شرائط لگانا یا جس سے آپ مانگ رہے ہیں، اسے آپ کہیں کہ آپ کو یوں کرنا ہوگا تو یہ حق تعالیٰ کے ہاں بے ادبی اور خلاف تہذیب ہے۔ تو مانگنے میں کسر نہ چھوڑے مگر اپنی طرف سے تجویز نہ کرے۔ جتنا مانگے گا اتنی ہی ادھر خوشی بڑھے گی اور رضا کا تعلق بھی اتنا

ہی ہو گا۔

تعلیم دعا

مجھے مکہ معظمہ کا ایک واقعہ یاد آیا۔ جن لوگوں کو حج کرنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں حجاز اور مکہ میں غرباء بہت زیادہ ہیں۔ بے چارے مانگتے ہیں اور لپٹ بن کر مانگتے ہیں۔ حرم شریف میں باوجود یکہ حکومت انتظام کرتی ہے کہ سائل نہ آئیں مگر پھر بھی ہزاروں کی تعداد میں پہنچ جاتے ہیں اور وہ ہر ایک کے آگے ایک قرش دو قرش مانگتے پھرتے ہیں ___ اور اس طرح سے مانگتے ہیں کہ دینے والا اگر دے دے تو تھوڑی دیر میں پھر لوٹ کے آجائیں گے ___ پھر لوٹ کے آجائیں گے۔ نہ دے تو وہ کھڑے رہیں گے یا وہ انکار کرے یا وہ منہ پھیرے۔ غرض لوگ مانگنے والوں سے زچ آجاتے ہیں اور تنگ آجاتے ہیں۔ تو بعض لوگ جھنجلائے ہوئے میرے پاس آئے کہ صاحب! یہ عجیب بے وقوف قسم کے سائل ہیں۔ انہوں نے ہماری تلاوت بھی ختم کردی، نوافل بھی ختم کردیئے۔ جہاں تلاوت کرنے بیٹھے وہ آکے کھڑے ہو گئے۔ اب یا تو دے یا جب تک زبان سے یوں نہ کہے "اللہ کریم" آگے جاؤ اس وقت تک ٹلتے نہیں۔ اب تلاوت کے سینکڑوں ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ چند آیتیں پڑھیں پھر کہا' اللہ کریم۔ چند آیتیں پڑھیں پھر دوسرا آگیا پھر اس سے کہا' اللہ کریم آگے جاؤ ___ تو ہم عاجز آگئے اور پریشان ہیں اور آپ یہ کہتے ہیں کہ سائل کو جھڑکو بھی نہ۔ آپ کیا کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے **وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ** کہ سائل کو مت جھڑکو۔ اب نہ کہیں یا نہ جھڑکیں تو انہوں نے تو عاجز کردیا' کیا کریں؟ ___ غرض بہت ہی غصے اور خفگی میں تھے اور کئی آدمی تھے۔

میں نے کہا آپ نے غور نہیں کیا۔ یہ سوال کرنے والے آپ کے معلم ہیں۔ آپ کو تعلیم دینے آئے ہیں۔

کہنے لگے کہاں کی تعلیم؟

میں نے کہا یہ آپ کو مانگنا سکھانے آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح لپٹ ہو کے مانگو کہ ہم تو لے ہی کے اٹھیں گے ___ خیر وہ اس پر ٹھنڈے ہو گئے اور بہت خوش ہو کے واپس ہوئے۔ پھر انہوں نے نہ کسی سائل کو برا بھلا کہا نہ جھڑکنے کی نوبت پیش آئی۔ وہ سمجھ گئے کہ واقعی یوں ہی مانگنا چاہئے۔ مانگنے کا ڈھنگ یہی ہے۔

فرق اتنا ہے کہ انہوں نے غلطی یہ کی آدمی سے اس طرح مانگنا شروع کیا حالانکہ اس طرح سے اللہ میاں سے مانگنا چاہئے کہ آدمی گھٹنے ٹیک دے کہ میں لئے بغیر نہیں اٹھوں گا۔ میں رب کریم کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور محروم چلا جاؤں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تو اس عزم سے آدمی مانگے تو کبھی محروم نہیں ہو سکتا۔

علامت قبولیت

اور بعض علامتیں بھی ایسی ہیں۔

چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب کوئی بوڑھا آدمی جس کی داڑھی سفید ہو اور وہ اللہ کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے شرم آتی ہے کہ اس سفید ریش کو خالی ہاتھ واپس کروں۔ یوں تو میں کریم ہوں ہی' لیکن میری کریمی اور بڑھ جاتی ہے جب کوئی سفید ریش' سفید بال والا مانگتا ہے کہ اس بوڑھے کو میں محروم واپس کروں۔ اس کے چہرے پر ایک ہیبت کا اثر ہے اور ایک وقار ہے تو میں اس کو ذلیل کر کے

واپس کروں تو حق تعالیٰ اس کی بات تھامتے ہیں۔ فرماتے ہیں میں اس کو خالی ہاتھ واپس نہیں کرتا اس کی مراد پوری کرتا ہوں۔

اہل قبولیت سے مشابہت کا اثر

اور اس میں بعض بزرگوں نے تو لطیفہ کیا۔ یحیی ابن اکثمؒ ایک بزرگ گزرے ہیں اور صاحب فنون ہیں۔ نحو یا صرف کے غالباً امام ہیں۔ بہرحال بڑے لوگوں میں ہیں۔ جس وقت ان کے انتقال کا وقت آیا۔ تو انہوں نے ایک دوست کو وصیت کی کہ جب مجھے قبر میں اتاریں تو میری داڑھی کے اوپر سفید میدہ یا چونا کوٹ کر رکھ دینا کہ میری داڑھی سفید ہو جائے۔ کس لئے رکھنا؟ تجھے اس سے بحث نہیں۔ اس نے تعمیل حکم کی کہ کفن دیتے ہوئے کوئی میدہ اور چونا ایسا مل دیا کہ داڑھی کے بال بالکل سفید ہو گئے اور ڈھانپ دیا اور نماز پڑھ کے دفن کر دیا ___ حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہوئے اور عرض کیا کہ میری مغفرت فرما دیجئے۔

فرمایا! او بوڑھے! تو نے فلاں حرکت نہیں کی؟

فلاں حرکت نہیں کی؟ فلاں گناہ نہیں کیا؟

عرض کیا جی ہاں! سب کچھ کیا کہ پھر تو اس قابل ہے کہ تیری مغفرت کی جائے۔ مانگنے کو تو آیا ہے؟ کیا تیری مراد پوری کی جائے؟

عرض کیا کہ یا اللہ! میری داڑھی سفید ہے۔ اسے تو دیکھ لیجئے۔ آپ ہی نے تو فرمایا ہے کہ ہم سفید داڑھی رکھنے والے کو واپس نہیں کرتے ___ تو میں سفید داڑھی نہیں رکھتا تھا تو میں نے سفید داڑھی رکھنے والوں سے کم از کم مشابہت پیدا کرنے کے لئے چونا لگایا اور داڑھی کو سفید کر لیا۔ تو رنگ تو سفید ہو گیا۔ چاہے عارضی طور پر ہو چاہے اصلی طور پر ہو اور آپ نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ سفید وہ ہو جو اصلیت سے سفید ہو۔ سفید داڑھی کے معنی سفید بالوں کے ہیں اور میں سفید بال لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ وعدہ کے مطابق بخش دیجئے ___ فرماتے ہیں کہ ___ حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا ___ او بڈھے جا ہم نے تجھے بخشا اور معاف کر دیا۔

تو بعض بزرگ وہاں بھی جا کر مذاق کرتے ہیں مگر اس قسم کا مذاق جو اصول شرعیہ سے ماخوذ ہو۔ حق تعالیٰ اس کی رعایت فرماتے ہیں۔ چنانچہ یحیی ابن اکثمؒ کو بخش دیا۔ جس شخص نے انہیں خواب میں دیکھا تو اس کو انہوں نے یہ واقعہ سنایا کہ میں نے تو اپنی سفید داڑھی سامنے کر دی تھی اور عرض کیا کہ آپ ہی کا وعدہ ہے کہ ہم سفید ریش کو واپس نہیں کرتے۔ میں تو مغفرت مانگتا ہوں۔

بہرحال اس سے معلوم ہوا کہ سفید داڑھی تو وقار ہے ہی اور نیکی اور تقویٰ کی علامت ہے اس کے ساتھ اگر مشابہت ہی پیدا کر لی جائے وہ آدمی بھی محروم نہیں رہتا تو کم سے کم اس لئے ہی مشابہت پیدا کر لیجئے۔ اگر ہماری داڑھی نہیں ہے تو ہم اس لئے رکھ رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ وہ معاملہ ہو جائے جو داڑھی والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

اسلامی صورت

نیز یہ کہا گیا کہ قیامت کے دن داڑھی کو نور بنایا جائے گا۔ داڑھیاں نور کی صورت اختیار کریں گی۔ یعنی اس روشنی میں آدمی راستہ طے کرے گا۔ تو اس لئے رکھ لے کہ بھائی! میرا راستہ ہی طے ہو گا۔ ایسا نہ ہو کہ میرا نور بجھ جائے۔ اس اندھیرے میں کس طرح قدم اٹھاؤں گا تو کم سے کم یہ رعایت کرے۔

اور مسلمان کی صورت تو داڑھی ہی سے اچھی معلوم ہوتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ داڑھی نہ ہو ___ آپ خود غور کریں ___ یہ صحیح ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن میں منفعل بھی ہیں کہ کچھ سوسائٹی اور ماحول کی مجبوری سے ایسا کرلیتے ہیں ___ یہ صحیح ہے مگر مجبوری تو وہ پیش نظر رکھنی چاہئے جس کا کوئی جواب نہیں ہوگا اور وہ قیامت کے دن کی مجبوری ہے، یہاں کی مجبوریاں تو سہی جاسکتی ہیں۔ لیکن اگر وہاں کوئی ایسی بات سامنے آئے تو کسی صورت میں وہاں تدارک ہی نہیں۔ وہاں تو پھر بھگتان ہی کی صورت ہے۔ تو کم سے کم اسی نیت سے کرے۔

تشبہ باسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ثمرہ

اور کچھ نہیں تو یہی نیت کرے کہ میری جو محبوب ترین ذات ہے وہ میرے رسول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان کی صورت پاک ایسی تھی، کم از کم میں ان سے ہی مشابہت کروں ___ تشبہ میں بڑی برکتیں ہیں اگر نام بھی رکھ لے اس میں برکت ہے ___ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن جب میدان محشر میں لوگ جمع ہوں گے۔ حق تعالیٰ اپنے پیغمبر کو یا محمد کہہ کرپکاریں گے۔ تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جتنے لوگوں کے نام محمد ہوں گے، ہر ایک یہی سمجھے گا کہ مجھے پکارا ہے تو لاکھوں آدمی کھڑے ہوجائیں گے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم نے تو اپنے پیغمبر کو پکارا تھا۔ جنہیں ہم نے جنت میں بھیجنا تھا۔ لیکن جب تم کھڑے ہوگئے تو تم بھی ان کے ساتھ جاؤ۔ اب ہم تمہیں بٹھانا نہیں چاہتے۔ اس نام کی برکت سے نجات اور مغفرت ہوجائے گی، تو جن کے نام پاک کے نام کی نقل اتارنے کی یہ برکت ہے اگر ان کی صورت کی نقل اتارلی تو کتنی برکات ظاہر ہوں گی۔ اگر ان کی سنتوں کی، ہم نقل اتارنے لگیں تو کتنی برکات ظاہر ہوں گی۔ بہرحال اتباع سنت میں خیر ہی خیر ہے کوئی برائی نہیں اور ترک سنت میں برائی ہی برائی ہے۔ چاہے وہ آج واضح نہ ہو، کل کو واضح ہوجائے گی یا قبر میں واضح ہوگی یا محشر میں واضح ہوگی۔

میں تو یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ اگر مولویوں کی سی داڑھی نہ رکھیں تو کم سے کم اتنی رکھ لیں کہ دور سے نظر آئے کہ بھئی! داڑھی ہے۔ مسلمان ہے۔ وہ بھی ان شاء اللہ نور کا کام دے گی، ان شاء اللہ ضائع نہیں کی جائے گی، یہ فعل بھی اکارت نہیں جائے گا ___ اتباع سنت کے لئے ایک قدم بڑھے گا، ایک ہی قدم کا اجر ملے گا۔ دو بڑھیں گے، دو کا اجر ملے گا، لیک کر چلیں گے اس کا اجر ملے گا۔ جتنا بھی آپ بڑھیں گے۔ خیر کی طرف بڑھیں گے، خیر دنیا و آخرت دونوں اس میں ظاہر ہوں گی ان شاء اللہ برکات نمایاں ہوں گی۔

مشابہت کا تمدنی فائدہ

مصر میں میں نے ایک واقعہ سنا، اس سے واقعی مجھے عبرت ہوئی وہاں عام طور سے لوگ داڑھی نہیں رکھتے بلکہ جو رکھ لیتا ہے اسے پکارتے ہیں کہ یہ تو یہودی ہوگیا۔ یہ اس کو طعن دیتے ہیں ___ مگر جن لوگوں کے داڑھی ہے ان سے پوچھا تم نے کیا فائدہ سوچا؟ ___ یعنی شرعی بات تو الگ ہے اس سے قطع نظر کر کے تمدن کی حیثیت سے تم نے کیا بات سوچی جو تم داڑھی رکھتے ہو؟ ___ یہ جواب تو صحیح ہے کہ اتباع سنت کرتے ہیں پیغمبر علیہ السلام کی صورت سے مشابہت بے شک برکت ہی برکت ہے۔ لیکن تم پر جو ملامتیں پڑتی ہیں۔ اس کے مقابلہ کے لئے تمدنی حیثیت سے داڑھی رکھنے میں تم نے کیا مصلحت سوچی؟

انہوں نے کہا کہ ایک بڑی مصلحت یہ ہے کہ یہاں پردہ بالکل نہیں۔ نوجوان لڑکیاں پھرتی ہیں اور بہت

زیادہ بالکل آزاد ہیں، داڑھی والا جوان کے سامنے آتا ہے، منہ پھیر کے چلی جاتی ہیں۔ کبھی اس کی طرف رجوع نہیں کرتیں ___ تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے لئے تقویٰ کا راستہ صاف ہو گیا۔ اگر ہم نہ بچنا چاہیں تو وہ ہم سے بچتی ہیں۔ ہم برائی میں مبتلا نہیں ہو سکتے ___ میں نے کہا الحمد للہ دنیا میں کم سے کم یہ مصلحت تو نمایاں ہوئی کہ داڑھی والے کی طرف آزاد اور اوباش قسم کی عورتیں متوجہ نہیں ہوتیں۔ اگر متوجہ ہو گی تو اپنی ہی بیوی متوجہ ہو گی۔ یعنی حلال ہی کام اس سے سرزد ہو گا، حرام سرزد نہیں ہو گا ___ یہ کتنا بڑا فائدہ ہے۔

اور پھر یہ کہ اگر آپ نے مولویانہ صورت بنالی تو آپ کو کبھی جرأت نہیں ہو گی کہ سینما میں جاکے بیٹھیں۔ لوگ یوں کہیں گے کہ نامعقول مولویانہ صورت سے تم یہاں آئے؟ ___ دنیا طعن دے گی۔

تو اس داڑھی کی وجہ سے آدمی بہت سے مصائب اور برائیوں سے بچ جاتا ہے۔ تو ایسی چیز تو محبت کرنے کے قابل ہے، جو بہت سی برائیوں سے بچانے کا ذریعہ بن جائے ___ تو ایک تو اتباع سنت ہے وہ تو عظیم چیز ہے۔ دنیا میں بہت سے منافع بھی ہیں اور فوائد و برکات بھی ہیں۔

سنت نبویؐ سے کمال عشق و محبت

اور اصل یہ ہے کہ محبت کی کمی ہے۔ اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تام اور پوری ہو جائے۔ پھر اس قسم کے معاذیر اور عذرات کچھ پیش نہیں چلتے۔ محبت ناقص اور عشق ناتمام میں اس قسم کی چیزیں ہوتی ہیں کہ ملامت کرنے والے یوں ملامت کر دیں گے تو ہم کیا کہیں گے اور فلاں عیب لگا دے گا تو ہم کیا کہیں گے ___ جب عشق قلب میں تام ہو جاتا ہے تو پھر کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ باقی نہیں رہتی۔

حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ عنہ، جب ایران فتح ہو گیا، بغداد میں تشریف رکھتے تھے اور کھانا تناول فرما رہے تھے۔ ایک فارسی غلام کھڑا ہوا کھانا کھلا رہا تھا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ کر گر پڑا۔ انہوں نے فوراً جھک کر زمین پر سے لقمہ اٹھایا اور خاک وغیرہ اڑا کر صاف کیا اور تناول کر لیا ___ وہ فارسی غلام جو کھڑا ہوا تھا، اس نے کہا کہ یہ آپ نے کیا حرکت کی؟ یہاں بڑا تمدن ہے۔ بڑے متمدنوں کا ملک ہے اور بڑے معزز لوگ ہیں؟ ___ زمین پر پڑی ہوئی چیز اٹھا کر کھا لینا، یہاں بڑی بدتہذیبی سمجھی جاتی ہے۔ لوگ آپ پر طعن کریں گے کہ یہ بڑے حریص ہیں کہ انہوں نے ایک گری ہوئی چیز اٹھا کر کھالی ___ تو اس کو عیب اور ذلت سمجھا جاتا ہے۔ آپ حضرات کو اپنا وقار تھامنے کے لئے ان باتوں کی رعایت رکھنی چاہئے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کیا جواب دیتے ہیں؟ فرماتے ہیں :

أأترک سنة حبیبی لهؤلاء الحمقاء

کیا میں اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ان احمقوں کی وجہ سے ترک کر دوں؟ کہ یہ ملامت کریں گے ___ ان کی ملامت مجھ پر کیا اثر کر سکتی ہے؟ سنت کے فوائد میرے سامنے ہیں اور اس ملامت کا کوئی ضرر مجھ تک دنیا و آخرت میں نہیں پہنچ سکتا۔ تو جو چیز کہ کوئی ضرر نہ پہنچا سکے، اس کی وجہ سے میں وہ فعل اختیار کر لوں جو دنیا میں بھی میرے لئے مضر ہو اور آخرت میں بھی مضر ہو ___؟ تو فرمایا کہ میں ان ملامت گروں کی ملامت کی وجہ سے سنت حبیبؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو ترک نہیں کر سکتا۔

اس میں گویا روٹی کا بھی ادب ہوا اور اتباع سنت بھی ہوا اور عظمت سنت بھی ہوئی اور سنت کے مقابلہ میں کسی ملامت اور لومۃ لائم کی پرواہ بھی نہ ہوئی۔ تو اس سے حضرت حذیفہ ابن یمان رضی اللہ عنہ کا کمال

عشق اندر کمال ایمان واضح ہو جاتا ہے۔

عطیۂ خداوندی کی قدر و منزلت

اور روٹی کی عزت کرنا یہ خود شرعاً فی نفسہٖ واجب ہے۔ صریح حدیث میں فرمایا گیا:

اکرموا الخبز

"روٹی کا اکرام کرو"۔

اس لئے کہ روٹی اللہ کا تبرک ہے۔ اس کو عزت کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ۔ اس کو استعمالی سامان مت سمجھو کہ کھائی اور جو باقی بچی اٹھا کر پھینک دی ___ جیسے ہم بعض دفعہ ریلوں میں دیکھتے ہیں۔ یہاں تو الحمد للہ دیکھنے میں نہیں آیا مگر ادھر کہ روٹی کھائی اور جو بچی اس سے منہ صاف کیا اور اسے لپیٹ کر باہر پھینک دیا۔ یہ نہایت ذلیل حرکت ہے۔ میں نے تو بعض کو ملامت کی حالانکہ وہ غیر مسلم تھے۔ میں نے کہا یہ کیا طریقہ ہے ___؟ کہنے لگے کہ اب یہ کام کی نہیں رہی۔ میں نے کہا کہ یہ کرتہ پائجامہ میلا ہو گیا۔ اسے بھی اتار کر ذلت سے پھینک دو۔ کام کا نہیں رہا۔ اس لئے کہ میلا ہو گیا۔ اس وقت کھانا تمہارے کام کا نہیں رہا۔ شام کو تمہارے کام آجائے گا۔ تمہارے کام کا نہ ہو کسی غریب کے کام آجائے گا۔ یہ تو خدا کا دیا ہوا رزق ہے' اسے ذلیل کر کے پھینکنا' اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ روٹی سے محروم کر دیئے جاؤ گے۔ روٹی کا ادب سکھلایا گیا ہے۔ اس کی بے ادبی جائز نہیں رکھی گئی' اس کا احترام واجب ہے۔ اسی طرح اگر دانے زمین پر گر جائیں۔ انہیں چگ لینا چاہئے یہ نہیں کہ انہیں جوتیوں میں روند دیا جائے۔ وہ اللہ کا عطیہ ہے اور حق تعالیٰ شانہ کا تبرک ہے۔

احترام رزق

ہمارے اساتذہ میں سے حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند کے محدث تھے۔ ان کی وفات ہو گئی۔ بلند پایہ بزرگوں میں سے تھے اور صاحب حال لوگوں میں سے تھے۔ ان کا عجیب طریقہ تھا۔ جب کوئی مہمان آتا اور کھانا باہر آیا تو جب مہمان کھانا کھا کر فارغ ہو جاتے۔ تو کچھ تو روٹیوں کے ٹکڑے بچ جاتے ہیں' کچھ چھوٹے موٹے کنے بچ جاتے ہیں اور کچھ ریزے ہوتے ہیں جو دسترخوان پر پڑے ہوتے ہیں ___ تو میاں صاحب مرحوم کا عجیب طریقہ تھا' روٹیوں کے جو بڑے ٹکڑے بچ جاتے' انہیں جمع کر کے احتیاط سے گھر میں بھیجتے کہ یہ مہمان کا تبرک ہے۔ یہ گھر والوں کو کھانا چاہئے وہ جو کنارے اور چھوٹے چھوٹے کنے رہ جاتے' ان کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے فرماتے کہ انہیں چھت پر پھیلا دو' یہ چڑیوں اور کوؤں کا حق ہے۔ ہمارے رزق میں اللہ نے ان کا بھی حصہ رکھا ہے ___ اور وہ ریزے جو چھوٹے چھوٹے بھورے ہوتے ان کو جمع کر کے جہاں چیونٹیوں کے سوراخ ہوتے وہاں ڈال دیتے کہ چیونٹیاں انہیں لے جائیں کہ ان کا بھی ہماری غذا کے اندر حق ہے ___ تو ادب بھی ہوا اور ٹھکانے بھی لگا ___ تو روزی اور رزق اسی قسم کی چیز ہے۔ پرانے بزرگوں میں اس کا بڑا احترام کیا جاتا اور کہا جاتا کہ:

"روزی کا مارا ہوا اور روٹی کا مارا کہیں نہیں پنپتا"۔

یعنی جو روٹی کے ساتھ بے ادبی کرے' رزق کے ساتھ گستاخی کرے۔ وہ محروم الرزق بن جاتا ہے۔ اس لئے شریعت اسلام نے روٹی کا ادب سکھلایا کہ اس کی توقیر کرو' اس کو کوڑے میں مت ڈالو' اس کو خاک پہ مت ڈالو' اسے منہ پونچھنے کا رومال مت بناؤ' بلکہ جتنا بچ جائے' ادب کے ساتھ احتیاط سے رکھو خود تمہارے

ام آئے گا۔ تمہارے کام نہیں آئے گا کسی فقیر کے کام آئے گا، کسی غریب کے کام آئے گا۔ دنیا میں ہزاروں
کھوں آدمی ہیں جو نان شبینہ کے محتاج ہیں۔ انہیں کھانے کو ٹکڑا نہیں ملتا اور تم سینکڑوں ٹکڑے ضائع کر کے
ینک دیتے ہو۔ یہ خود بے ادبی کا ثبوت دیا اور دنیا کو رزق سے محروم کیا۔ جو دنیا کو رزق سے محروم کرے کہیں
ل پر یہ اثر نہ پڑے کہ اللہ اسے رزق سے محروم کر دے وہاں تو ادل بدل ہے ___ بہرحال روٹی کا اکرام بھی
جب قرار دیا گیا۔ رزق کا احترام بھی واجب قرار دیا گیا۔ ذرا ذرا سی چیزوں میں ادب سکھلایا گیا۔

احترام لباس

یہی ادب کپڑے پہننے میں ہے۔ مثلاً رات کو آدمی سوتے وقت کپڑے اتارتا ہے۔ اچکن اتارا، کرتہ اتارا،
لی باندھی ___ فرمایا گیا کہ ان کپڑوں کو زمین پر مت ڈالو۔ فرش پر بکھرا ہوا مت چھوڑو۔ یعنی بے ادبی اور
بے توقیری سے پھیلا ہوا مت چھوڑو ___ اول تو یہ ادب کے خلاف ہے۔ جب یہ عطیۂ خداوندی ہے تو جس
م نے دیا ہے اس کی نعمت کا احترام کر کے تہہ کر کے سرہانے رکھ دو یا کسی کھونٹی پر ٹانگ دو۔ زمین پر پڑا ہوا
ت چھوڑو اور اس میں یہ بھی فرمایا گیا کہ اس میں دنیوی مضرت بھی ہے فرماتے ہیں کہ :

اطوو اثيابكم ترد اليها ارواحها

کپڑوں کو لپیٹ کر احتیاط سے رکھو۔ بکھرے ہوئے چھوڑو گے تو ممکن ہے اس کے اندر چیونٹیاں گھس
ئیں اور جب پہننے لگو تو ایذا پہنچائیں ممکن ہے کوئی بچھو گھس جائے اور تکلیف پہنچائے کپڑے کو پڑا ہوا مت
وڑو۔ بے ادبی بھی ہے اور دنیوی مضرت بھی ہے۔ بلکہ اس کو تہ کر دیا یا کھونٹی پر ڈالو، ہر چیز کے اندر شریعت
ے آداب سکھلائے ہیں کھانے کا ادب بتلایا، لباس پہننے کا ادب بتلایا، لباس پہننے کا ڈھنگ بتلایا کہ ڈھنگ بھی
ے ادبی کا مت اختیار کرو کہ وہ اللہ کا عطیہ ہے۔

ہیئت احترام

کوئی بادشاہ اگر کسی کو کوئی عطیہ دے، اگر آدمی نے منہ ادھر کو پھیر کر بائیں ہاتھ سے لے لیا وہ انعام سے
م کر دیا جائے گا کہ شاہی عطیہ کی اس نے قدر نہیں کی۔ دونوں ہاتھوں سے لیتے ہیں یا دایاں ہاتھ بڑھاتے
ہ۔ ادب کے ساتھ لیتے ہیں کہ شاہی عطیہ ہے۔ اسی طرح فرمایا کہ جب کھانا کھانے بیٹھو دائیں ہاتھ سے
ی کھاؤ، دائیں ہاتھ سے پانی پیو۔ گویا حق تعالیٰ ایک ایک لقمہ تمہیں پہنچا رہے ہیں۔ ہر ہر منٹ پر انعام ہو رہا
اور تم لیتے جا رہے ہو تو بائیں ہاتھ سے مت لو کہ یہ بے ادبی ہے۔
جھک کر کھاؤ، متکبر بن کر مت کھاؤ، چوکڑا مار کر مت کھاؤ کہ یہ متکبروں کا طرز ہے۔ سوائے اس کے کوئی
ور ہو۔ بعض دفعہ آدمی لحیم شحیم اور موٹا تازہ ہے۔ اب اس غریب سے اکڑوں نہ بیٹھا جائے۔ نہ یہ کہ
ے پاؤں کھڑا کر کے ایک بچھا کے بیٹھا جائے۔ چوکڑا ہی مار کر بیٹھ سکتا ہے۔ وہ معذور ہے۔ تو معذور کا باب
ہ ہے۔ لیکن اصل حکم یہ ہے کہ تربع یعنی چوکڑا مار کر کھانا مکروہ ہے۔ لیٹ کر کھانا مکروہ ہے کہ یہ بے ادبی
گستاخی ہے اور طبی اصول کے بھی خلاف ہے۔ تو یہ سارے آداب اس لئے سکھلائے گئے کہ دنیا کی بھی
ت حاصل ہو اور اخروی نفع بھی حاصل ہو اور رضائے خداوندی بھی حاصل ہو۔

احکام شریعت میں فوائد اخروی و دنیوی

شریعت کے ہر حکم میں جہاں آخرت کے منافع ہیں وہاں دنیا کے بھی منافع ہیں۔
حدیث میں ارشاد فرمایا گیا :

السواک مطهرة للفم ومرضاة للرب

مسواک کرنے میں منہ کی پاکیزگی اور خوشبو ہے اور آخرت کا ثواب ہے اور حق تعالیٰ کی رضا ہے۔ مسواک کرنے میں دونوں فائدے حاصل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور منہ کی صفائی اور منہ کی صفائی کا صحت اچھا اثر پڑتا ہے۔ دانت صاف رہیں گے تو پائیوریا نہیں ہوگا تو معدہ نہیں بگڑے گا۔ معدہ نہیں بگڑے گا صحت اچھی رہے گی گویا جسمانی صحت بھی اچھی ہوئی اور صحت روحانی بھی حاصل ہوئی کہ رضائے حق میں آگئی۔ تو چیز ایک ہے' ایک حکم ہے۔ اس سے دنیا کا فائدہ بھی اور آخرت کا فائدہ بھی۔

حدیث میں واقعہ فرمایا گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب زخمی ہو چکے اور مرض الوفات میں تھے تو ایک نوجوان مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا۔ مزاج پوچھا اس سے بات چیت فرمائی۔ وہ واپس ہو گیا۔ جب تھوڑی دو گیا تو غلام سے کہا کہ اس نوجوان کو بلاؤ ___ وہ آیا ___ لنگی پہنے ہوئے تھا جو ٹخنوں سے نیچے زمین پر گھسٹ ہوئی جا رہی تھی۔ تو آپ نے نہایت ہی محبت سے فرمایا یا فتیٰ! (اے نوجوان)

ارفع ازارک فانه انقی لثوبک واتقی لربک

اس کپڑے کو اٹھا۔ اس میں تیرے لئے دو فائدے ہیں انقی لثوبک سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تیرا کپڑا صاف ستھرا رہے گا۔ یہ جو زمین پر گھسٹتا ہوا آرہا ہے' تو کہیں جگہ پاک ہے کہیں ناپاک ہے۔ پاکی لگی ناپاکی لگی۔ کپڑا بے اعتبار بن گیا۔ نہ عبادت کے قابل رہا نہ نماز کے قابل رہا۔ تو انقی لثوبک دنیوی فائدہ یہ ہے کہ کپڑا پاک رہے گا۔ واتقی لربک اور پروردگار کے لحاظ سے دیکھیں تو تیرے اندر تقویٰ پیدا کرے گا۔ خوف خدا پیدا کرے گا ___ اس لئے کہ کپڑا زیادہ گھسٹتا ہوا ہوتا ہے تو دل میں رعونت پیدا ہوتی ہے اور کبر کا مضمون دل میں پیدا ہوتا ہے اور اگر کپڑا ٹخنے سے اونچا ہوتا ہے تو تواضع کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

آثار لباس

اسی واسطے سلاطین اور بادشاہوں کا لباس آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان کے لباس تین تین گز ادھر ادھر پڑے ہوتے ہیں۔ کندھے پر قبا ہے اور دو دو گز ادھر ادھر بکھری ہوئی پڑی ہے۔ یہ انتہائی کبر و نخوت اور رعونت کی دلیل ہوتی ہے۔ شریعت نے اس کو ناجائز اور ممنوع قرار دیا کہ بندے کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ بندگی کو چھوڑ کر کوئی دوسرا کام جو منافی بندگی ہو کرے۔ لباس کا زمین پر پھیلا ہوا رہنا کبر کی علامت ہے اور لباس کا اونچا رہنا یہ تواضع کی علامت ہے۔ اس میں تزئین کم ہوتا ہے۔ اس میں زینت زیادہ ہوتی ہے۔ جتنی زینت بڑھ جائے گی تبختر اور اتراہٹ پیدا ہوگی' کبر و نخوت پیدا ہوگی' کبر و نخوت کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔

اور اگر زینت میں کمی ہے' یعنی جمال تو ہے' تزئین نہیں ہے۔ جمال کے معنی صفائی ستھرائی' موٹا کپڑا لیکن آدمی اگر بناؤ اور سنگھار میں لگ جائے اسی سے کبر نفس کی طرف طبیعت جاتی ہے ___ عورت چونکہ محل زینت ہے' اس واسطے عورتوں میں تکبر زیادہ ہوتا ہے۔ مرد چونکہ زینت کم اختیار کرتے ہیں' اس لئے عورتوں کی نسبت متکبر کم ہوتے ہیں۔ متواضع زیادہ ہوتے ہیں۔ تو عورت میں ناز و نخرہ اور کبر و نخوت زیادہ

تی ہے۔ کیونکہ وہ محل زینت ہوتی ہے اور مرد محل شجاعت اور محل ہمت ہے ___ اگر مرد بھی محل زینت ۓ لگے تو مرد اور عورت میں فرق نہیں رہے گا۔ اگر مرد اسی طرح بناؤ سنگھار کرنے لگے جس طرح عورتیں تی ہیں تو ان میں کبر نفس پیدا ہوگا' جتنا زینت کو چھوڑ کر تجمل اختیار کریں گے' اتنی تواضع پیدا ہوگی۔ تزین ؤ سنگھار کو کہتے ہیں اور تجمل صفائی و ستھرائی ڈھنگ اور طریقے کو کہتے ہیں۔ تو شریعت نے تجمل کا حکم دیا ہے۔ ں موٹا کپڑا پہنو مگر صاف ستھرا ہو اور جمال کی شان ہو اور ایک زینت ہے یعنی بناؤ سنگھار کرنا' یہ عورتوں کے ۓ مخصوص کی گئی۔ تو عورتیں متکبر زیادہ ہوتی ہیں۔ اس کا علاج دوسرے ڈھنگ سے بتلایا گیا۔ عورت سے ینت ترک نہیں کرائی بلکہ زینت کا حکم دیا گیا ___ اس واسطے کہ زینت سے محبت کا تعلق ہے۔ اور یہ طلوب ہے کہ عورت خاوند کی محبوب بنے۔ اس کو محبت اور تعلق رہے۔ اگر خاوند میں بیزاری پیدا ہوئی تو گھر ر معاشرت منزلی تباہ ہو جائے گی۔ اس لئے مرد کو عورت کا محب بنانا چاہا ہے اور عورت کو مرد کا محبوب بنانا ا ہے۔ اس لئے عورتوں کے لئے زینت کا حکم دیا ہے۔

اسی واسطے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر عورت سارے سفید کپڑے پہن لے تو یہ مکروہ ہے کوئی نہ کوئی کپڑا نگین ہونا چاہئے تاکہ زینت کی شان اس کے اندر پیدا ہو۔

حرف آخر

بہرحال شروع میں میں نے یہ عرض کیا تھا کہ کوئی منضبط بات تو ہے نہیں منتشر چیز ہے۔ مگر مختلف مسائل ئے۔ اب وقت بھی پورا ہو گیا۔ جمعہ پر بات چلی تھی کہ جمعہ یوم جامع ہے۔ معلوم نہیں ادھر کس طرح نکل ۔ بس اللہ کا حکم تھا ادھر نکل آیا۔ جمعہ کے متعلق جو بیان کرنا تھا' وہ رہ گیا۔ پھر کبھی آنا ہوا تو اس کی تقریر جائے گی۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

اہمیت تزکیہ

اصل میں جرائم سے بچانے والا خدا کا خوف ہے' پولیس نہیں بچا سکتی' اگر پولیس سے' ہتھیاروں سے اور فوجی قوت سے گناہوں سے روکا جا سکتا تو آج کی دنیا سب سے زیادہ متقی ہوتی' اس لئے کہ آج نہ فوج کی کمی' نہ پولیس کی کمی' نہ ہتھیاروں کی کمی ___ زمانے میں کبھی ایسے نئے نئے ہتھیار نہیں دیکھے گئے جتنے آج کے زمانے میں ہیں۔ فوج کی اتنی تعداد دنیا میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی جتنی آج ہے' پولیس اتنی کبھی نہیں بنی جتنی آج ہے۔ حتیٰ کہ راستے راستے پر پولیس ہے۔ لیکن جتنی یہ چیزیں بڑھتی جا رہی ہیں' جرائم بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ بنا وہی ہے کہ جرائم کا روک لینا پولیس کا کام نہیں ہے' محض قانون کا کام نہیں ہے جب تک انسان کی اخلاقی حالت اندر سے صحیح نہ ہو۔ اور جب تک اللہ کا خوف سامنے نہ ہو' آدمی جرائم سے نہیں بچ سکتا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةِ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ـ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ـ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ـ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ـ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ـ

حرف آغاز

بزرگان محترم!

یہ قرآن شریف کی چند آیات ہیں۔ جو اس وقت میں نے تلاوت کی ہیں' انہیں حق تعالیٰ شانہ' نے اپنے دین کا ایک بنیادی اصول ارشاد فرمایا ہے۔ جو اصل مقصد ہے اور انسان کی پیدائش کی بنیادی غرض وغایت ہے ___ قبل اس کے کہ ان آیات کی تشریح کی جائے پہلے بطور تمہید کے ایک مقدمہ سمجھ لیجئے' پھر ان آیات کا

سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

خیر و شر سے مرکب مخلوق

اور وہ یہ ہے کہ ہر انسان میں اللہ نے دو مادے رکھے ہیں' ایک خیر کا مادہ ہے اور ایک شر کا مادہ ہے' خیر کے مادے سے وہ اچھے افعال انجام دیتا ہے اور شر کے مادے سے برائی' بدی اور معصیت کا ارتکاب کرتا ہے۔ کوئی انسان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے کہ دو مادے اس کے اندر نہ ہوں۔ انسان' انسان بنا ہی اس لئے ہے کہ اس میں خیر اور شر دونوں موجود ہیں ___ اگر وہ خیر محض ہوتا' تو وہ انسان نہ ہوتا' اس کو فرشتہ کہتے ___ اور اگر شر محض ہوتا تب بھی انسان نہ ہوتا' اس کو شیطان کہتے' تو جس میں شر کا نشان نہیں ہے فرشتہ ہے' اور جس میں خیر کا نشان نہیں ہے وہ شیطان ہے ___ انسان دونوں کا مجموعہ ہے۔ کہ وہ فرشتہ بھی ہے اور شیطان بھی ہے۔ دونوں مادے اس کے اندر رکھے ہوئے ہیں۔

انسان کی ترقی کا راز

اور اسی لئے اسی میں ترقی ہے۔ نہ فرشتہ ترقی کر سکتا ہے نہ شیطان' مادی و روحانی جتنی ترقی کی ہے وہ انسان نے کی ہے ___ اس لئے کہ اس میں دونوں مادے موجود ہیں۔ اور دو ضدیں جب ٹکراتی ہیں تبھی کوئی تیسری چیز پیدا ہوتی ہے' اس لئے انسان کو اللہ تعالیٰ نے ترقیات عطا فرمائی ہیں کہ اس میں یہ دونوں مادے موجود ہیں ___

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بارے میں ارشاد فرمایا کہ ہر انسان میں ایک لَمّہ خیر کا موجود ہے اور ایک لَمّہ شر کا موجود ہے۔ یعنی ایک جذبہ اور داعیہ بھلائی کا موجود ہے ___ ایک جذبہ اور داعیہ برائی کا موجود ہے۔ پھر ان دونوں مادوں کو امداد دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو ہی خزانے رکھے ہیں جن سے ان دونوں مادوں کو امداد پہنچتی ہے ___

جذبات خیر و شر کا محرک

حدیث میں ہے کہ ہر قلب کی دائیں جانب ایک فرشتہ بٹھلایا گیا ہے' جو بندے کو خیر کی طرف ابھارتا ہے' اور ہر قلب کی بائیں جانب ایک شیطان بٹھلایا گیا ہے جو بندے کو برائی پر آمادہ کرتا ہے ___ اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔

جب یہ حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی تو صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ :

"یا رسول اللہ! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کی بائیں جانب بھی شیطان بٹھلایا گیا ہے ___ ؟

فرمایا : بلی ولکنہ اسلم

میرے قلب کی بائیں جانب بھی شیطان بٹھلایا گیا ہے مگر وہ میرے تصرف اور میری برکت سے مسلمان ہو گیا' اب اگر وہ بھی مجھے امر کرتا ہے تو خیر کی بات کرتا ہے' سجھاتا ہے تو خیر کی بات سجھاتا ہے"۔

گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خیروبرکت نے اس کی ماہیت بدل دی کہ بجائے شر کے خود اس میں خیر پیدا ہو گئی ___ مگر بٹھلایا گیا ضرور ___

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں تو یہ فرمایا گیا تھا ___ قرآن کریم سے بھی واضح ہے اور حدیث میں بھی ہے کہ :

"جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ چیختا ہوا اور روتا ہوا پیدا ہوتا ہے۔

فرمایا کہ شیطان اس کو چوکے لگاتا ہے۔ اپنے اثرات پہنچانا چاہتا ہے تو اس کی کوکھ میں اپنی چونچ مارتا ہے تاکہ اس کا اثر پہنچ جائے۔ صرف دو ہستیوں کو مستثنیٰ کیا گیا جن کو شیطان کوئی اثر نہیں پہنچا سکا ___ ایک حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ایک حضرت مریم علیہا السلام ___ ان کی پیدائش کے وقت شیطان اپنا کوئی اثر نہیں پہنچا سکا"۔

اس سے سوال پیدا ہوتا تھا کہ بظاہر اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی افضلیت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صرف دو ہی انسان ہیں جن تک شیطان اپنا اثر نہیں پہنچا سکا ___ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہما السلام ___ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہیں بلکہ حضرت مریم علیہا السلام بھی۔

لیکن میں نے جو ابھی حدیث بیان کی اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت واضح ہوتی ہے ___ اور وہ یہ کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام تک شیطان اپنا اثر نہیں پہنچا سکا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شیطان پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر غالب ہو گیا، تو وہ شیطان ہی باقی نہ رہا۔ تو قوی تاثیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نکلتی ہے نہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی۔ وہاں بہت سے بہت دفعیہ ہوا کہ شیطان نہیں آسکا ___ یہاں آ بھی نہیں سکا۔ اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا اثر ڈال کر اسے بدل ڈالا، اس سے آپ کی افضلیت واضح ہوئی۔

بہر حال یہ واضح ہے کہ ہر انسان میں دو مادے رکھے گئے ہیں، ایک خیر کا اور ایک شر کا، اور قلب کی دائیں جانب ایک فرشتہ بٹھلایا گیا ہے اور بائیں جانب ایک شیطان بٹھلایا گیا ہے۔ فرشتہ خیر کی طرف توجہ دلاتا ہے اور شیطان شر کی طرف۔

محرکات خیر و شر کی جنگ اور انکی مدد

یہ تو آپ نے بعض اوقات دیکھا ہو گا کہ ایک کام کرنے میں آدمی کو تردد ہوتا ہے کہ کروں یا نہ کروں ___ ؟ یہ شیطان اور فرشتے کی جنگ کا اثر ہوتا ہے۔ فرشتہ کہتا ہے کہ خیر کر، شیطان کہتا ہے کہ شر کر، آدمی تردد میں پڑتا ہے کہ کیا کروں، جو چیز غالب آجاتی ہے وہی کرتا ہے ___ خیر غالب آگئی تو گویا فرشتے نے غلبہ پالیا، شر غالب آگئی تو گویا شیطان نے غلبہ پالیا، بہر حال ہر انسان میں دو مادے بھی ہیں اور ان دونوں مادوں کو امداد بھی پہنچتی ہے، اس لئے انسان دو ہی قسم کے افعال کرتا ہے یا برائی کے یا بھلائی کے، یا نیکی کرے گا یا بدی کرے گا۔

اوامر ونواہی کی حکمت

یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام دو حصے لے کر دنیا میں اتری' ایک حصہ اوامر کا ہے۔ حکم دیا گیا کہ یہ کام کرو' یہ تو خیر کو ابھارنے کے لئے ہے' ایک حصہ نواہی اور ممانعت کا ہے کہ ان کاموں کو مت کرو۔ یہ شر کو دبانے کا ہے تو شریعت کے دو حصے ہیں' ایک مامورات کا' ایک منہیات کا' مامورات کا معنی ہے جن کے کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور منہیات کا معنی ہے جن کے نہ کرنے کا حکم دیا اور ان سے روکا گیا ___ ایک طرف کہا گیا تم نماز پڑھو' تم عبادت کرو' تم روزے رکھو' تم حج کرو' تم سچ بولو۔ یہ اوامر اور احکام خداوندی ہیں' اور ایک طرف نواہی ہیں' **لاتقتلوا۔۔ لاتسرقوا۔۔ لا تزنوا** نہ چوری کرو' نہ زنا کرو' نہ قتل کرو اور نہ شراب پیو' نہ بدکاری کرو ___ یہ منہیات کا حصہ ہے' اس لئے شریعت کے دو حصے ہو گئے' ایک امر بالمعروف یعنی اچھائیوں کا حکم دینا اور ایک نہی عن المنکر' یعنی برائیوں سے روکنا۔ یہ شریعت کی دو جانبیں ہیں ان دو کے بغیر انسان کو ترقی نہیں ہو سکتی' اگر وہ ساری نیکیاں کرتا رہے مگر بدیوں سے نہ بچے' ادھر نماز پڑھتا ہے' ادھر شراب خوری بھی کرتا ہے۔ ادھر روزہ بھی رکھتا ہے' ادھر معاذ اللہ زنا کاری میں بھی مبتلا ہے' اسے کوئی ترقی نہیں ہو گی۔ بلکہ اس کی نیکیاں اکارت جاتی رہیں گی' دونوں چیزیں جب تک جمع نہ ہوں بچنے کی چیزوں سے بچتا رہے' کرنے کی چیزوں کو کرتا رہے' اس کے بغیر انسان کی ترقی نہیں ہو سکتی۔

تقدیم نواہی

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص بیمار ہو' طبیب یہ کہے کہ یہ دوائیں پینی پڑیں گی ___ یہ امر کا حصہ ہے ___ اور فلاں فلاں چیز سے پرہیز کرنا پڑے گا ___ یہ نہی کا حصہ ہے ___ تو علاج میں دو چیزیں نکلتی ہیں۔ ایک دوا کا پینا' ایک پرہیز کرنا ___ اگر آدمی دوا پیتا رہے مگر پرہیز نہ کرے' بیماری رفع نہیں ہو گی' اطباء ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ پرہیز کرنا دوا پینے کی نسبت زیادہ مقدم ہے۔ بعض دفعہ دوا نہ بھی پئے۔ پرہیز کرنے سے آدمی سے زیادہ بیماری خود بخود ختم ہو جاتی ہے' اس لئے پرہیز مقدم ہے' اسی طرح سے شریعت میں بچنے کی چیزوں سے بچنا' کرنے کی چیزوں سے زیادہ مقدم ہے' اگر آدمی معاصی سے' بدعملیوں سے اور برائیوں سے بچتا رہا تو اس کے دین کا بہت سا حصہ محفوظ ہو جائے گا۔ اگرچہ کرنے کی چیزیں اس نے نہیں کیں ___ بہر حال انسان میں بہت حد تک پاکی پیدا ہو جائے گی۔ تو پرہیز دوا سے مقدم ہوتا ہے' مضرت سے بچنا' نفع حاصل کرنے سے مقدم ہوتا ہے۔

ایک تاجر کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مجھے نقصان نہ پہنچ جائے جب نقصان سے بچ گیا تو دوسری سعی ہوتی ہے کہ نفع حاصل کرے۔ تو خسارے اور نقصان سے بچنا مقدم ہے ___ اسی طرح شریعت میں مقدم یہ ہے کہ آدمی بدعملی سے بچ جائے' اس سے کچھ نیکی کرنے کی توفیق ہو جاتی ہے۔ اور بدعملیوں میں مبتلا رہنے سے توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ آدمی نیکی نہیں کرتا ___ یہ عقلی اصول ہے کہ دفع مضرت جلب منفعت سے مقدم ہے۔ تو شریعت کے اعمال میں منکرات سے بچنا جتنا ضروری ہے' معروفات پر عمل کرنا اس درجہ کا نہیں' پہلے ضرورت ہے آدمی منکرات سے بچے ___ قتل ناحق ہے ___ شراب خوری ہے ___ جوا ہے ___ جھوٹ بولنا ہے ___ رشوت ستانی ہے ___ سود بٹے کا کاروبار ہے۔ ان سے بچنا مقدم ہے' اس کے بعد نماز سے بھی نفع پہنچ سکتا ہے' روزے سے بھی' حج سے بھی' زکوٰۃ سے بھی' اگر ایک انسان کی کمائی ناپاک ہے وہ سود خوری بھی کرتا ہے' نفلیں بھی پڑھتا رہے نفلوں کی تاثیر نہیں ہو گی' ممکن ہے فرض ادا ہو جائے' ممکن ہے کہ مفتی فتویٰ دیدے کہ فریضہ ادا ہو گیا لیکن قلب پر کوئی اثر پہنچ جائے ___ نہیں پہنچے گا

جب تک اس چیز سے نہ بچے۔

آدمی چوریاں کرتا پھرے، اور ساتھ ہی روزے بھی رکھتا رہے، بے شک فریضہ ساقط ہو گیا ــــ لیکن روزے کی وہ تاثیر کہ نفس پاک بن جائے، نہیں ہو گی۔ جب تک ایک طرف سے آلائش لگی ہوئی ہے کہ چوری، بدکاری کر رہا ہے، تو بدعملی سے بچنے پر ہی قلب میں نیکی کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں اس لئے شریعت کی تاکید ہے۔ اور علماء نے لکھا ہے کہ پہلے منکرات سے بچنے کی کوشش کرے، بدعملی سے بچے تاکہ نیکی تمہارے لئے کارآمد اور مفید ثابت ہو۔

وسائل منہیات سے احتراز

ان منکرات میں دو درجے رکھے ہیں۔ ایک درجہ تو آخری ہے جو اصل مقصد ہوتا ہے، اور ایک درجہ اس کے وسائل کا ہے۔ شریعت وسائل سے بھی بچاتی ہے تاکہ مفسدے سے آدمی خود بخود بچ جائے۔

مثلاً شریعت نے زنا سے روکا اور فرمایا:

لَاتَقْرَبُوا الزِّنٰی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّسَآءَ سَبِیْلًا۔ زنا کے پاس بھی مت پھٹکو اس لئے کہ وہ فحش اور بے حیائی کی حرکت ہے اور بدترین راستہ ہے جو انسان کو دنیا میں بھی رسوا کرتا ہے اور آخرت میں بھی رسوا کرتا ہے مقصود اصلی زنا سے روکنا ہے ــــ لیکن زنا تک پہنچانے والے جو افعال تھے شریعت نے ان سے بھی روکا۔

حکم دیا گیا کہ عورت پر بری نگاہ بھی مت ڈالو، اجنبیہ کی طرف چل کر بھی مت جاؤ اس کی خوشبو سونگھنے کی طرف بھی ناک کو متوجہ مت کرو، اس کی آواز پر بھی کان مت دھرو ــــ حالانکہ آواز کا سن لینا کوئی گناہ نہ تھا، خوشبو کا ناک میں آجانا کوئی گناہ نہیں تھا، لیکن چونکہ یہ ایک گناہ کا ذریعہ بنتا ہے اس واسطے اس سے روک دیا گیا اور کہا گیا کہ اس سے رکو۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ ذٰلِکَ اَزْکٰی لَھُمْ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ۔

"اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! ایمان والوں سے فرما دیجئے، اپنی نگاہوں کو نیچا اور پست کریں ــــ"

اسی طرح:

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ

اور مومن عورتوں سے بھی کہدیجئے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

نگاہ نیچی رکھنے کا حکم کیوں بیان کیا گیا ــــ؟

اس لئے کہ نگاہ پڑے گی، تو قلب اس سے اثر لے گا، ممکن ہے کہ دل میں فتنہ پیدا ہو جائے یا برائی کا جذبہ پیدا ہو جائے، اس لئے وہیں سے روک دیا۔

اسی طرح سے عورت کی آواز کو بھی عورت کہا گیا ہے کہ اس کی آواز سننے کی بھی کوشش مت کرو ــــ بعض دفعہ آواز کی تاثیر سے بھی آدمی کے قلب میں برے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، اس لئے آواز سے بچایا گیا۔

حکمت حجاب

یہی وجہ ہے کہ عورتوں کے لئے حجاب رکھا گیا کہ باہر نکلیں تو نقاب ڈال کر نکلیں کھلے چہرے نہ نکلیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

ان المرأة عورة مستورة۔ اذا خرجت استشرفها الشیطن۔

عورت' مرد کا ایک چھپا ہوا خزانہ ہے' اس کا ناموس اور اس کی آبرو ہے' جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان ے تاکتا ہے کہ اب کتنوں کو مبتلا کرونگا۔ کسی کو بدنگاہی میں' کسی کو بدخیالی میں مبتلا کروں گا ___ اس واسطے رشاد فرمایا گیا کہ جب عورت باہر نکلے تو چہرے پر نقاب ڈال کر نکلے۔

پھر یہی نہیں فقط ___ یہ بھی کہا گیا کہ خوشبو لگا کر نہ نکلے۔ خوشبو لگا کر نکلی تو خوشبو پھیلنے پر خیالات متوجہ وتے ہیں۔ اس کو بھی روک دیا گیا' بلکہ یہاں تک فرمایا گیا :

من اصابت بخورا فهی کذا و کذا۔

جو عورت خوشبو لگا کر باہر نکلی' وہ بمنزلہ زناکار کے ہے۔ گویا اس نے زنا کر لیا' اور زنا کا راستہ صاف کر دیا ___ حتیٰ کہ بعض روایات میں یہاں تک بھی ہے وہ گھر میں آکر غسل کرے۔ اس نے ناپاکی کا راستہ اختیار لیا۔

ممانعت اختلاط

پھر تاکید فرمائی گئی کہ جب عورت باہر نکلے اور نقاب ڈال کر نکلے تو راستے کے بیچ میں نہ چلے' کنارے پر چلے' تاکہ مردوں سے اس کی مڈبھیڑ نہ ہو ___ مسلم کا حق فرمایا گیا ہے سلام کرنا اور سلام کا جواب دینا ___ ورت کو ممانعت کی گئی کہ اجنبی مردوں کو نہ سلام کرے اور نہ ان کے سلام کا جواب دے۔ یہ صرف اس لئے ہ عورت مرد کا اختلاط پیدا نہ ہو۔ یہی اختلاط برائیوں اور بد عملیوں کا ذریعہ بنتا ہے۔ جس سوسائٹی میں مرد' ورت کا اختلاط بڑھ جائے گا یقیناً وہ سوسائٹی بدکار بن کر رہے گی۔ کتنا ہی وہ دعوے کرے کہ وہ تقویٰ شعار ہے مگر ناممکن اور محال ہے' اس لئے شریعت نے روکا اجنبی مرد عورت کا خلط ملط نہ ہو۔

اول تو بے ضرورت گھر سے باہر جانے کی ممانعت ہے' لیکن اگر کسی ضرورت سے جائے تو نقاب ڈال کر جائے' نقاب بھی ڈال کر جائے تو راستے کے کناروں پر چلے وسط میں نہ چلے' کناروں پر بھی چلے تو خوشبو لگا کے نہ چلے کہ وہ خود کو لوگوں کی توجہات کا ذریعہ بنائے۔ سب چیزیں اس لئے کہ اختلاط نہ ہونے پائے۔

مسجد نبوی میں صحابیہؓ کی شرکت جماعت کیلئے درخواست

حدیث میں ام حمید ساعدیہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے جو ایک انصاری عورت ہیں۔ اور خیر القرون ہے۔ نیکی ہی نیکی مردوں اور عورتوں میں پھیلی ہوئی ہے اور زمانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے ___ غرض م حمید ساعدیہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک درخواست پیش کی اور عرض کیا :

> "یا رسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ میں مسجد نبوی میں آکر جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کروں' حضورؐ کی امامت میں میری نماز ہو"۔

کتنی پاکیزہ درخواست پیش کی ___ !

اول تو نماز افضل العبادات ہے کہ اس سے اونچی کوئی عبادت نہیں' اس کی درخواست کی ___ پھر اس

عبادت کی درخواست بھی کہاں کی ___ ؟ مسجد نبوی میں ___ جس میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے ثواب کے برابر ملتا ہے ___ کون سے امام کے پیچھے درخواست کی ___ ؟ جو عالم میں سب سے افضل ہستی اور ذات بابرکات ہے ___ اور کس جماعت میں شامل ہو کر نماز پڑھنے کی درخواست کی ___ ؟ صحابہؓ کی جماعت میں ___ جن کے بارے میں مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ ہے کہ امت میں بڑے سے بڑا قطب، غوث کسی مقام پہ پہنچ جائے۔ صحابیت کے مقام کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا، تو صحابہؓ تمام امت سے بالا جماع افضل ہیں ___ تو کتنی پاکیزہ درخواست کی کہ افضل العبادات نماز کی درخواست تھی۔ بہترین اور اعلیٰ ترین مسجد میں نماز پڑھنے کی درخواست تھی ___ اعلیٰ ترین جماعت میں شامل ہونے کی درخواست تھی اور اعلیٰ ترین امام کے پیچھے نماز کی درخواست تھی۔

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا :

صلوٰتک فی دارک خیرمن صلوٰتک فی مسجدی هذا

تیرا نماز گھر میں پڑھنا میری مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔۔

پھر فرمایا :

وصلوٰتک فی بیتک خیرمن صلوٰتک فی دارک

اور گھر کے صحن اور احاطے میں نماز پڑھنے سے بہتر گھر کے دالان میں نماز پڑھنا ہے۔

پھر فرمایا :

وصلوٰتک فی مخدعک خیرمن صلوٰتک فی بیتک

اور گھر میں بھی اندر کی کوٹھڑی میں نماز پڑھنا افضل ہے۔ گھر کے دالان میں نماز پڑھنے سے۔

گویا اس کا مطلب یہ نکلا کہ جس حصے میں پردہ بڑھتا گیا، اس حصے میں افضلیت بڑھتی گئی ہے۔ مسجد میں جانے کی بہ نسبت گھر میں عورت زیادہ پردہ نشیں ہے تو اس میں نماز افضل قرار دی گئی، پھر گھر کے صحن سے دالان میں زیادہ پردہ ہے کہ آسمان سے اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اس میں بہ نسبت صحن کے افضل ہے، پھر اندر کی کوٹھڑی دالان سے زیادہ افضل ٹھہرائی گئی کہ اس میں اور بھی زیادہ پردہ ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ جتنا زیادہ پردہ ہو گا، جتنا زیادہ چھپنا ہو گا اتنی ہی زیادہ افضلیت عورت کے لئے بڑھتی جائے گی۔

حتیٰ کہ مسجد حرام و مسجد ابراہیمی مکہ مکرمہ میں جس کے حج کے لئے عالم جاتا ہے۔ جو ہم سب کی عبادت کا مرکز ہے کہ جب تک ہماری اپنی مسجد کا رخ مسجد حرام کی طرف نہیں ہو گا اس وقت تک نماز قبول نہیں ہوگی۔ گویا ہر مسجد، مسجد حرام کی طرف رخ کئے ہوئے ہے ___ اس کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے کہ :

”وہاں ایک نماز پڑھنا، ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے“۔

گویا ایک لاکھ گنا اجر ملتا ہے ___ لیکن عورت کے لئے یہ افضلیت نہیں رکھی گئی۔ عورت وہاں بھی اگر گھر میں پڑھے گی تو اس نماز سے زیادہ افضل نماز ہوگی جو کہ وہ مسجد حرام میں نماز پڑھتی ___ تبرّکاً آدمی عورت کو اجازت دے دے کہ وہ کسی نہ کسی وقت جاکے مسجد حرام میں نماز پڑھ لے۔ لیکن وہ اتنی پابندی کرے کہ دھوپ ہو، گرمی ہو، کسی نہ کسی طرح پہنچے ___ فرمایا افضل یہی ہے کہ گھر میں نماز پڑھے۔ اس کا حاصل بھی وہی نکلا کہ وہاں اجنبی مردوں کا ہجوم ہے، اختلاط زیادہ بڑھے گا، ممکن ہے کہ قلب میں کوئی فساد پیدا ہو جائے ___ ممکن ہے کوئی برائی آجائے، ممکن ہے کوئی برائی پیدا ہو۔ تو شریعت چاہتی ہے کہ نفس انسانی کو پاک بنایا

جائے جس میں خیالات بھی برے پیدا نہ ہوں' اس لئے ان اسباب کو قطع کیا جائے گا جن سے کوئی بدخیالی ہو سکتی ہے۔

یہ کیفیت کیوں ہے؟ دراصل اسے اسی بری حرکت سے بچانا ہے' یہ چیزیں اس برائی کا جسے زنا کہتے ذریعہ بن سکتی تھیں' تو یہیں سے روک دیا گیا۔ اس کو شریعت کی اصطلاح میں سدِ ذرائع کہتے ہیں ___ وسائل سے روک دیتے ہیں تاکہ آدمی مقاصد سے بچ سکے ___ اگر وسائل اور ذرائع میں پھنس گیا تو ایک دن وہ ضرور مقصد تک پہنچ جائے گا۔

طریق تربیت

حدیث میں ہے کہ :

مااسکر کثیرہ فقلیلہ حرام

جس چیز کے بہت سے حصے میں نشہ ہے اس کا تھوڑا حصہ بھی ناجائز ہے۔ شراب کا جیسے ایک گھونٹ ممنوع ہے' ایک قطرہ چکھنا بھی ممنوع ہے' حالانکہ ایک قطرہ پینے سے نشہ نہیں پیدا ہوتا' اور شراب نشے کی وجہ سے حرام کی گئی ہے' تو ایک قطرہ پی لینا جائز ہونا چاہئے' اس لئے کہ اس میں حکم کی علت نہیں پائی جاتی اور وہ نشہ ہے۔ جب ایک قطرہ چکھنے میں نشہ نہیں ہے تو جائز ہوتا' مگر اسے ناجائز قرار دیا گیا ___ کیوں؟ اس لئے کہ جس نے آج ایک قطرہ چکھا ہے' وہ کل ایک گھونٹ بھی پیئے گا۔ اور جو کل کو ایک گھونٹ پیئے گا' وہ کل کو ایک گلاس بھی پیئے گا۔ اور جو پرسوں کو ایک گلاس پیئے گا وہ چند دن کے بعد شرابی بن جائے گا۔ شرابی بننے سے روکنا اصل مقصود ہے۔ تو ایک قطرہ سے رکاوٹ شروع کی تاکہ وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

حدیث میں ہے کہ :

من اتی عرافاً فقد کفر بما انزل علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم

حدیث میں ہے کہ جو کسی جادوگر کے پاس گیا اس نے شریعت محمدی کے ساتھ کفر کیا۔

حالانکہ کفر جب ہوتا ہے جب آدمی توحید کا انکار کردے' نبوت کا انکار کردے' قیامت کا انکار کردے' تب کفر لازم ہوتا ہے۔ جادوگر کے پاس جانے سے تو بظاہر کفر نہیں آنا چاہئے۔

مگر اسے کفر کیوں قرار دیا گیا ___ ؟

نتیجے کے اعتبار سے کہ جو آج جادوگر کے پاس گیا ہے تو اول تو اس کے دل سے جادو کی برائی نکلے گی۔ کل کو وہ فرمائش کرے گا کہ تو کچھ جادو کر۔ پرسوں کو وہ سیکھے گا کہ مجھے بھی یہ تعویذ اور منتر سکھلادے اور ترسوں کو اچھا خاصا جادوگر بن جائے گا۔

اس سے بچانے کے لئے جادوگر کے پاس جانے ہی سے روک دیا گیا۔ کہ جادوگر کے پاس جاتے ہی کیوں ہو ___ ؟ اور یہ نوبت آئے ہی کیوں ___ ؟ تو یہ سد ذرائع ہے کہ وسائل سے روک دیتے ہیں تاکہ آدمی مقاصد تک نہ پہنچ پائے۔

آج کی عورت کا تمدن

اب آج کی زندگی میں اگر دیکھا جائے تو ہم سب سے زیادہ منکرات میں گرفتار ہیں۔ یعنی کہا تو یہ گیا ہے کہ اجنبی عورت باہر نہ نکلے' بے پردہ نہ نکلے' آج عورتوں کا کیا' قوم کا شعار اور تمدن یہ بن گیا ہے کہ جتنی عورتیں

زیادہ سے زیادہ باہر جائے اسے تہذیب سمجھا جاتا ہے ___ حالانکہ حدیث میں صاف فرمایا گیا اور خبر دی گئی کہ :

رب كاسيات عاريات مائلات مميلات لايدخلن الجنة

بہت سی عورتیں جو لباس پہنی ہوئی ہیں لیکن پھر بھی ننگی ہیں۔ وہ نکلیں گی کہ لباس بھی پہنے ہوں گی، مگر پھر بھی عریاں ہوں گی۔ خود بھی اجنبیوں پر مائل ہوں گی، دوسروں کو بھی اپنی طرف مائل کریں گی۔ ان کو جنت میں داخل نہیں ہونے دیا جائیگا۔ جنت کا مقام کریم ان کا ٹھکانا نہیں ہو گا جب تک انہیں سزا دے کر پاک نہ بنایا جائے یا جو بھی اللہ چاہے، ایکا ایکی وہ اس مقام کریم میں داخل ہو جائیں۔ ایسا نہیں ہو گا۔

فرمایا گیا کہ ایک وقت آئے گا کہ عورتوں کے سر ایسے ہوں گے جیسے اونٹ کی کوہان حرکت کرتی ہوئی ہوتی ہے ___ یعنی بال اس طرح سے بنائیں گی جیسے اوپر ایک ٹوکرا سا رکھا ہوا ہو اور معلوم ہو کہ اونٹ کی کوہان ہے۔ آج ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ وہ پیشین گوئی پوری ہو رہی ہے۔ اسی طرح سے مائلات بھی ہیں اور ممیلات بھی ہیں اور کاسیات بھی ہیں اور عاریات بھی ہیں۔

لباس کی عریانی

لباس پہنے ہوئے ہیں اور پھر عریاں ہیں ___ اس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ لباس ہی ناقص ہو۔ جیسے آج کل ہے کہ پنڈلیاں بھی کھلی ہوئی ہیں بازو بھی کھلے ہوئے ہیں۔ سینہ بھی کھلا ہوا، پشت بھی کھلی ہوئی اور سر بھی کھلا ہوا ہے۔ حالانکہ عورت کا بدن گردن سے لے کر ٹخنوں تک ستر قرار دیا گیا ہے کہ اس کو اگر وہ نہ چھپائے تو نماز نہیں ہو سکتی۔ سوائے خاص حالتوں کے۔ تنہائی میں بھی اس کا چھپانا ضروری ہے۔ چہ جائے کہ بھرے مجمعوں میں عورتیں ستر کھول کر نکلیں۔ تو ایک تو لباس کے ناقص ہونے کی وجہ سے عریانی ہو اور لباس ہی ناتمام ہو کہ گھٹنے ٹخنے سب ننگے۔

اور ایک یہ کہ لباس تو پورا ہو، گردن سے لے کر ٹخنے تک سب بدن چھپا ہوا، لیکن اتنا باریک ہو کہ چھپنے کے باوجود بدن اندر سے ڈھیک رہا ہے۔ یہ بھی کاسیات اور عاریات میں داخل ہے کہ لباس بھی ہے اور عورت پھر بھی ننگی ہے۔ اتنا باریک لباس لائیلون کا پہن لیا کہ وہ لباس نظر نہیں آتا، مگر بدن اندر سے نظر آتا ہے۔

اور تیسری صورت یہ ہے کہ لباس سر سے پیر تک ہو اور موٹے کپڑے کا ہو مگر بدن کے اوپر اتنا چست ہو کہ بدن کی ساری حیثیت نمایاں ہو رہی ہے۔ یہ بھی اس کا فرد ہے۔ جیسے آج کل ہم سنتے ہیں کہ ایک لباس چلا ہے جسے ٹیڈی کہتے ہیں کہ پاجامہ ہے تو وہ اتنا کسا ہوا، اور چست ہے کہ اس میں ران اور پنڈلی کی پوری حیثیت نمایاں ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ نظر نہ آئے ___ غرض ایک عریانی یہ ہے کہ لباس ناتمام ہو، اور ایک عریانی یہ کہ لباس پورا ہو مگر اتنا باریک ہو کہ بدن کو چھپا نہ سکتا ہو۔ اور ایک یہ کہ لباس پورا بھی ہو، اور موٹا بھی ہو مگر چست اتنا ہو کہ بدن کی حیثیت نمایاں کرتا ہو ___ یہ سب کاسیات وعاریات کہ لباس پہنے ہوئے ہو کر بھی عریانی کے افراد میں داخل ہیں۔

اس کو فرمایا گیا :

لا يدخلن الجنة

وہ جنت کی ہوا نہیں پائیں گی، مقام کریم تک نہیں پہنچیں گی۔ انہیں رضائے خداوندی کا مقام حاصل نہیں ہو گا، ___ آج نماز، روزہ جتنا ضروری ہے ان سے زیادہ ان چیزوں سے بچنا اور بچانا ضروری ہے کہ ہم

خود بھی بچیں اور اپنی نسلوں کو بھی بچائیں اور اپنی عورتوں کو بچائیں۔

اجتناب منکرات کی تاکید

شریعت نے یہاں تک اس کی تاکید کی ہے کہ حقیقی بہن بھائی ہوں' ابھی جوان بھی نہیں ہوئے' دس گیارہ برس کے ہیں تو فرمایا گیا کہ دونوں کو تنہا مکان میں مت چھوڑو' ایک چارپائی پر شریعت نے دو بہن بھائی کو لیٹنے کی اجازت نہیں دی' حالانکہ حقیقی بہن بھائی ہیں۔ ابھی بالغ بھی نہیں ہیں۔ مراھقت کا درجہ ہے۔ دس گیارہ سال کی عمر ہے۔

مثل مشہور ہے کہ آدمی کا شیطان آدمی ہوتا ہے۔ شیطان کو آتے ہوئے کیا دیر لگتی ہے۔ شریعت رحیم وکریم ہے وہ ایسے اسباب ڈالتی ہے کہ ہر انسان مقدس اور منزہ بنے' پاک اور پارسا بنے' تو ان اسباب سے بچنا پڑے گا۔ جو تقویٰ وطہارت اور پارسائی میں حارج ہوتے ہیں ___ ان سے بچنا اس سے زیادہ ضروری ہے۔ جتنا کہ فرائض کا انجام دینا ضروری ہے' ایک طرف آپ نماز پڑھیں اور ایک طرف گھر کی معاشرت جو بدکاری کی طرف جارہی ہو اسے نہ روکیں' تو وہ نماز بھی اپنا اثر نہیں دکھلائے گی جب تک ان چیزوں سے بچاؤ نہ ہو' دوا اثر نہیں دکھلائے گی' جب تک پرہیز نہ کیا جائے' ایک طرف تو زکام کی حالت میں آپنے گل بنفشہ پیا اور دوسری طرف آپ نے سیر بھر دہی برف ملا کر پی لی' تو گل بنفشہ کا ایسے میں کیا اثر ظاہر ہوگا ___ ؟

غرض منکرات سے بچنا اس سے زیادہ ضروری ہے' جتنا کہ معروف چیزوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔

سوسائٹی کی تباہی کے عوامل

اور منکرات میں بھی چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بچنا زیادہ ضروری ہے۔

صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں :

اياكم ومحقرات الذنوب۔

اے لوگو! حقیر گناہوں سے زیادہ بچنے کی کوشش کرو' بڑے بڑے گناہوں سے تو آدمی کبھی وضع داری اور ظاہرداری کی وجہ سے بچ جاتا ہے۔ ایک اچھی سوسائٹی میں بیٹھنے والا کبھی کھلے بندوں شراب نہیں پئے گا۔ اس کا جی تو چاہتا ہے مگر خیال یہ ہے کہ دنیا کیا کہے گی کہ ایسا بڑا آدمی اور شراب خانوں میں بیٹھا ہے۔ تو اس سے بچنا کبھی سوسائٹی کی وجہ سے بھی ممکن ہوتا ہے ___ لیکن چھوٹے چھوٹے گناہ جن کی طرف کسی کی بھی نگاہ نہیں جاتی' انہیں آدمی کرتا رہتا ہے۔ اس کو یہ سمجھتا ہے کہ وضع داری کے خلاف مجھ پر کوئی ملامت نہیں ہوگی ___ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ان سے بچنے کی زیادہ کوشش کرو' وہی آدمی کے قلب کا ناس مارتے ہیں آپ اجنبیہ کی طرف نگاہ ڈالدیں کوئی دیکھنے والا نہیں' کوئی بھی نہیں سمجھے گا' لیکن اس سے بچنا' اس سے زیادہ ضروری ہے جتنا زنا سے بچنا' کیونکہ آگے بڑھنے کا یہی راستہ ہے۔ تو ___ **واياكم ومحقرات الذنوب**

سب سے زیادہ چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بچو جن کو آدمی یہ بھی نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی گناہ ہوگا طور کر بھی لیتا ہے۔ اور انجام کار وہ بڑی برائی کی طرف پہنچا دیتے ہیں۔ سوسائٹی جو تباہ ہوتی ہے۔ وہ منکرات سے تباہ ہوتی ہے۔ اس واسطے ان سے زیادہ بچنے کی ضرورت ہے۔

اخلاقی جرأت کے بغیر استیصال جرائم ممکن نہیں

اور یہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ قلب کے اندر پارسائی کا جذبہ پیدا نہ کر لیا جائے یعنی دوسرے روکتے رہیں اور آپ رکتے رہیں۔ اسے رکنا نہیں کہتے یہ تو مجبوری کا رکنا ہے' آپ کے قلب کے اندر خود داعیہ پیدا ہو کے مجھے رکنا چاہئے اگر قانون آپ کو روکے اور آپ رک جائیں' یہ مجبوری کا رکنا ہے۔ ہزاروں جرائم اور ہزاروں برائیاں ہیں کہ قانون سے ان کا استیصال نہیں ہو سکتا' قانون سے وہ جرائم بند نہیں ہو سکتے جب تک خود انسان میں بچنے کی اخلاقی جرات نہ ہو اور اپنے اندر جذبہ نہ ہو۔

ایک تھیلی میں بھرا ہوا تین لاکھ روپیہ ایک تنہا مکان میں رکھا ہوا ہے وہاں پولیس کا بھی کوئی آدمی نہیں' سی آئی ڈی کا بھی کوئی آدمی نہیں۔ اگر آپ اٹھالیں کوئی روکنے والا نہیں۔ پھر بھی اگر آپ رکتے ہیں۔ تو کیوں رکتے ہیں ___ ؟ اللہ کا خوف آپ کو رکاوٹ ڈالتا ہے۔ تو اصل میں جرائم سے بچانے والا خدا کا خوف ہے' پولیس نہیں بچا سکتی ___

قوانین کی کثرت سے جرائم کم نہیں ہوسکتے

اگر پولیس سے' ہتھیاروں سے' اور فوجی قوتوں سے گناہوں سے روکا جا سکتا تو آج کی دنیا سب سے زیادہ متقی ہوتی۔ اس لئے کہ آج نہ فوج کی کمی' نہ پولیس کی کمی' نہ ہتھیاروں کی کمی ___ زمانے میں کبھی ایسے نئے نئے ہتھیار نہیں دیکھے گئے جتنے آج کے زمانے میں ہیں' فوج کی اتنی تعداد دنیا میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی جتنی آج ہے۔ پولیس اتنی کبھی نہیں بنی جتنی آج ہے ___ حتیٰ کہ راستے راستے پر پولیس ہے ___ لیکن یہ چیزیں بڑھتی جا رہی ہیں جرائم بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ بتا و ہی ہے کہ جرائم کا روک لینا' پولیس کا کام نہیں ہے' محض قانون کا کام نہیں' جب تک انسان کی اخلاقی حالت اندر سے صحیح نہ ہو' اور جب تک اللہ کا خوف سامنے نہ ہو آدمی جرائم سے نہیں بچ سکتا ___

تقویٰ شعار ہی جرم سے بچتا ہے

حضرت مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ جو خود حضرتؒ نے ہی سنایا تھا کہ وہ سہارنپور کا سفر فرما رہے تھے۔ اور سہارنپور کے گنے مشہور ہیں بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ تو دو تین دھڑی گنے خرید لئے۔ اتفاق سے ساتھ میں دو ایک مسلمان چیکر بھی تھے جو حضرتؒ سے عقیدت رکھتے تھے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ :

"بھائی! کانٹے پر جا کر انہیں تلوا دو۔ تاکہ محصول ادا کر دوں"۔

وہ جو چیکر ساتھ تھے' انہوں نے کہا' حضرت! اس کی ضرورت نہیں' ہم ہی تو چیک کرتے ہیں اور ہم ساتھ چل رہے ہیں۔ آپ بے تکلف تشریف رکھئے ___

فرمایا :

"بھائی! مجھے آگے جانا ہے"۔

انہوں نے کہا' آگے آپ کہاں جائیں گے؟

فرمایا :

"فی الحال تو میں کانپور جا رہا ہوں۔ اور آپ لوگ غازی آباد میں میرا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ دلی چلیں جائیں گے ___ پھر آگے کیا ہو گا؟ وہ دوسرے چیکر آئیں گے۔ اور وہ ڈبل محصول لیں گے' ممکن ہے کہ وہ

جرمانہ بھی ڈالیں، تو آپ مجھے مبتلا کرنا چاہتے ہیں ___؟"

انہوں نے کہا کہ ہم غازی آباد میں اس گاڑی کے چیکر کو کہہ دیں گے، وہ بھی آپ کو نہیں روکیں گے ___ فرمایا ___

"جب میں کانپور کے اسٹیشن پر اتروں گا اور دروازے سے باہر جاؤں گا تو وہاں ٹکٹ لینے والا کھڑا ہو گا، وہ کہے گا ___"

انہوں نے کہا۔ ہم ان چیکروں کے ذریعے اس بابو سے بھی کہلوا دیں گے، وہ بھی آپ کو نہیں چھیڑے گا ___

اس پر فرمایا :

"بھائی! مجھے اور آگے جانا ہے ___"۔

انہوں نے کہا، حضرت! آگے اور کہاں جانا ہے۔ بس آپ گھر پہنچ گئے، فرمایا "اس سے بھی آگے جانا ہے"۔

"مجھے اللہ کے پاس بھی تو جانا ہے، مجھے اپنے خدا کو بھی منہ دکھانا ہے، اگر چیکر نے چھوڑ دیا اور گھر تک پہنچ گیا، مگر قبر اور حشر میں میرا کیا حال ہو گا۔ پھر مجھ سے گرفت ہوگی کہ تم نے کیوں یہ ناجائز حرکت کی؟ تم نے قانون کی یہ چوری کیوں کی ___؟ اس وقت میں کیا جواب دوں گا؟ اس لئے آپ مہربانی کر کے تلوا دیں، میں یہیں سے محصول دیئے دیتا ہوں، تاکہ میں دنیا اور آخرت کی گرفت سے بچا رہوں"۔

یہ چیز تھی جس نے حضرتؒ کو بچایا، اور ہر مسلمان کو بچانے والی چیز یہ "خوف خداوندی" ہے جو قلب کے اندر ہوتا ہے یہ جرائم سے بچاتا ہے، قانون منظر عام کی برائیوں کو روک سکتا ہے، اگر آپ کھلے بندوں ڈکیتی ڈال رہے ہوں یا کھلے بندوں بدامنی کی، پولیس آکر آپ کو پکڑ لے گی، مگر تنہائی میں چھپ کر بدامنی ہوتی ہے جہاں پولیس کو کانوں کان خبر نہ ہو، وہاں بچانے والا کون ہے، وہ تو وہی اپنا ضمیر اور اپنا قلب بچائے گا۔ تو سب سے بڑی پولیس وہ قلب کا جذبہ ہے جو انسان کے اندر موجود ہے، ایک بھی پولیس نہ ہو اور قلب کے اندر یہ موجود ہو تو آدمی خود بخود بچے گا ___

انسداد جرائم میں پارلیمنٹ کی ناکامی

دو واقعے یاد آئے۔ اور دونوں میں فرق کا آپ اندازہ کریں۔

پچھلے دنوں اخبارات میں یہ خبر آئی تھی کچھ عرصہ ہوا ہے کہ امریکہ میں یہ سوال اٹھا کہ شراب کی بندش ہونی چاہئے۔ چنانچہ جتنے ذمہ داران حکومت تھے وہ اس پر متفق ہو گئے کہ شراب کو بند ہونا چاہئے۔ اس کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جو شراب بندی کا قانون بنائے۔ اس کے لئے کتنے لاکھ روپے کا بجٹ منظور کیا گیا کہ برس ڈیڑھ برس میں وہ قانون تیار ہو گا، تو قانون بنانے والوں کی تنخواہیں دی جائیں گی، دفتری اخراجات ہوں گے، تو لاکھوں روپے کا بجٹ منظور ہوا ___ برس دن میں وہ قانون تیار ہوا ___ جب قانون بن گیا، اسے پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا، اس کی پہلی خواندگی ہوئی ___ اس کے بعد پارلیمنٹ نے منظور کر کے یہ حکم جاری کیا کہ پبلک میں اس کا اشتہار دیا جائے اور اس قانون کو عام کیا جائے، تاکہ اس کے بارے میں رائے عامہ معلوم ہو ___ اس کی لکھائی چھپائی اور رائج کرنے کے لئے کئی لاکھ روپے کا بجٹ منظور ہوا، تاکہ اس قانون کو چھاپ کر پورے ملک میں شائع کریں۔ تاکہ جتنے اہل فکر ہیں وہ اس پر رائے زنی کریں ___

ایک عرصے تک اس کو منتشر رکھا گیا اور پھیلایا گیا' تاکہ لوگ اپنی اپنی رائے ظاہر کریں۔

جب رائیں آگئیں پھر وہ پارلیمنٹ میں پیش ہوا' پارلیمنٹ نے اس کو منظور کی' اب اس کے چلانے کے لئے کئی کروڑ روپے کا بجٹ منظور کیا گیا' کہ زائد پولیس رکھی جائے جو اسے جاری کرے اور نافذ کرے' تاکہ اہل ملک اس پر عمل کریں' گویا کروڑوں روپے خرچ کر کے قانون بنا اور وہ جاری کر دیا گیا۔

پولیس کو ہدایت کی گئی کہ ایک برس کے بعد رپورٹ کرے کہ اس پر عملدر آمد کیسا رہا' اور اس کے کیا اثرات نمایاں ہوئے___؟

برس دن کے بعد پولیس نے رپورٹ دی کہ پہلے اگر شراب پینے والے پچاس ہزار تھے تو اب ایک لاکھ بن گئے ہیں___ یہ اس کا اثر نمایاں ہوا___ اور وہ کیوں نمایاں ہوا___؟

اس لئے کہ پہلے شراب خانے کھلے ہوئے تھے' ہزاروں آدمی پیتے تھے___ مگر بہت سے وضعدار لوگ اس لئے نہیں پیتے تھے کہ ہماری ساکھ پر دھبہ آئے گا لوگ ہمیں برا سمجھیں گے کہ یہ شرابیوں کی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں' وہ بچتے تھے اور اکا دکا آدمی چھپ چھپا کر پی لیتا تھا۔

لیکن جب قانون کی بندش ہو گئی' اور سب کو روک دیا گیا تو سب نے بلیک کر کے اسے چوری سے پینا شروع کیا' تو جو لوگ وضعداری کی وجہ سے کھلم کھلا نہیں پی سکتے تھے' انہوں نے کہا کہ اب جب سارے چوری سے پی رہے ہیں تو ہم بھی چوری سے پینے لگیں' تو پہلے پینے والے پچاس ہزار تھے' اب ایک لاکھ بن گئے___ یہ گویا اس قانون کا نتیجہ نکلا۔ گورنمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا___ اس نے کہا کہ یہ حکمت کے وقار کے خلاف ہے کہ اس قانون کو واپس لیا جائے۔ قانون جاری رہے اور پولیس دارو گیر کرتی رہے تو قانون بھی چلتا رہا۔ اور شراب خوری بھی چلتی رہی۔ دونوں چیزیں اپنی جگہ رہیں۔ انسداد نہیں ہو سکا' بالکل شراب بند نہیں ہو سکی' پینے والے پیتے رہے' چوری سے پیتے رہے۔ گویا وہ لاکھوں کروڑوں روپیہ اکارت گیا جو صرف کیا گیا تھا۔ جو پہلے صورت تھی وہی اب ہے بلکہ بری ہو گئی کہ چھپ چھپ کر لوگ پیتے ہیں___

ایک تو یہ واقعہ آپ کے سامنے ہے___ اور ایک دوسرا واقعہ سامنے رکھیے۔

انسداد جرائم میں اسلام کا طریق کار

اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں شراب عام تھی' تمام عرب پیتے تھے شراب ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی' حتی کہ بچہ پیدا ہوتا۔ تو پہلے اس کو شراب چٹاتے تھے۔ اتنی شراب عام تھی___ اسلام آنے کے بعد بھی شراب رائج رہی' لوگ پیتے رہے___ مسلم بھی ہیں اور پیتے بھی رہے___ لیکن جب وقت آیا کہ شراب کو بند کیا جائے' تو ایکا ایکی حکم نہیں دیا گیا کہ روک دو' سب سے پہلی چیز یہ تھی کہ قلوب میں ایک سوال پیدا ہوا۔ قرآن کریم نے اس کو نقل کیا۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ

اے پیغمبر! لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں :

قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

آپ فرما دیں کہ جوئے اور شراب میں کچھ نفع ہے' کچھ نقصان ہے' مگر نقصان غالب ہے' نفع مغلوب ہے۔ نقصان زیادہ ہے نفع کم ہے۔

وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا

شراب اور جوئے کا نقصان زیادہ ہے، نفع کم ہے ___ بس اتنی آیت نازل ہوئی، شراب پینے کی ممانعت نہیں فرمائی گئی، صرف اس کی مذمت بیان کی گئی، تو حدیث میں ہے کہ بہت سے وہ خواص صحابہ رضی اللہ عنہم جو منشاء نبوت کو سمجھتے تھے، انہوں نے آج ہی سے شراب ترک کردی کہ جب اللہ تعالیٰ نے نقصان بیان کیا ہے تو شراب پسندیدہ معلوم نہیں ہوتی۔

غرض بہت سے حضرات نے تو اسی دن ترک کردی تھی ___ لیکن کچھ لوگ پیتے بھی رہے۔ چند دن کے بعد ایک دوسرا حکم نازل ہوا۔ اور ایک دوسری آیت نازل ہوئی :

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰی

”اے ایمان والو! شراب پی کر نشے کی حالت میں نماز مت پڑھو“۔

تو نمازوں کے اوقات میں شراب ممنوع قرار دی گئی۔ نمازوں کے اوقات کے سوا لوگ پیتے رہے، نماز کی حالت میں شراب پی کر جانا حرام قرار دیا گیا، گویا پانچ اوقات میں بندش ہوئی، باقی اوقات میں جائز ہوئی ___ اس آیت کے اترنے کے بعد ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم نے شراب ترک کردی کہ رخ یہ بتلا رہا ہے کہ یہ ممنوع کی جائے گی اللہ کو یہ پسند نہیں ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد تیسرا حکم نازل ہوا :

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

”اے اہل ایمان! یہ شراب اور جوا، اور یہ فال نکالنے کے تیر و ترکش یہ سب شیطانی حرکتیں ہیں، ان کے پاس بھی مت پھٹکو ___ آج مکمل طور پر شراب حرام ہوئی“۔

حدیث میں ہے کہ جس دن یہ آیت نازل ہوئی ہے، جس کے گھر میں دس مٹکے تھے، اس نے وہ پھوڑ دیئے، جس کے ہاں ایک مٹکا تھا، اس نے وہ توڑ دیا، اور مدینے کی گلیوں میں، نالیوں میں شراب اس طرح بہتی پھر رہی تھی جیسے برسات میں پانی برستا ہے۔ ایک قطرہ کسی کے گھر میں باقی نہیں رہا۔

تو آپ نے فرق دیکھا کہ امریکہ نے کئی کروڑ کا بجٹ منظور کیا اور ثمرہ یہ نکلا کہ پینے والے دونے ہوگئے، اسلام کے دور میں نہ ایک بجٹ منظور ہوا، نہ ایک کروڑ کا، نہ ایک پیسے کا۔ ممانعت کا حکم بھی پوری طرح سے نہیں آیا کہ لوگوں نے شراب کو چھوڑنا شروع کردیا ___ اور ایک ایک گھر پاک اور صاف ہوگیا ___

قانونِ حکومت اور قانونِ الٰہی کا فرق

فرق کیا تھا ___؟

وہاں قانون کا دباؤ تھا، یہاں اللہ کا خوف تھا، خوف خداوندی آیا تو شراب کا استیصال ہوگیا اور جڑ کٹ گئی، وہاں قانون محض کا دباؤ تھا۔ تو قانون محض سے جرائم بند نہیں ہوا کرتے جب تک اپنے قلب میں اللہ کا خوف اور ڈر موجود نہ ہو ___ تو شریعت اسلام برائیوں اور منکرات سے بچانا چاہتی ہے، مگر دباؤ سے نہیں۔ اس کے ذریعے بچانا چاہتی ہے کہ خود تمہارے ضمیر کے اندر دباؤ پیدا ہو۔ ضمیر خود کہے کہ یہ بری چیز ہے۔ ہم اسے چھوڑنا چاہتے ہیں۔

حقیقت معصیت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا :

ما الاثم یا رسول اللہؐ؟

یا رسول اللہؐ گناہ کیا چیز ہے ___؟

آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ شراب پینا گناہ ہے' زنا کرنا گناہ ہے' چوری کرنا گناہ ہے' یہ نہیں فرمایا ___ کیا فرمایا ___؟

ما حاک فی صدرک ___

تم پوچھتے ہو گناہ کیا ہے ___؟

جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کرے وہ گناہ ہے۔ اسے ترک کردو' جس کو تم کھلے بندوں نہ کرسکو' لوگوں کے سامنے کرتے ہوئے شرماؤ' سمجھ لو' وہ برائی ہے اور گناہ ہے' بس اس سے بچنے کی کوشش کرو ___ گویا گناہ سے بچنے کا تعلق قلب سے رکھا گیا۔ **ماحاک فی صدرک'** جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کردے' اس سے بچو۔ یہ نہیں کہا گیا جس سے پولیس روکے اس سے بچو' جس سے حکومت اور فوج روکے اس سے بچو' اس لئے کہ وہ منظر عام کی چیزوں سے روکیں گی' اور دل میں تمہارے کھوٹ رہا تو آنکھ بچا کے پھر تم وہی حرکت کرو گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ دل پاک ہو۔ فقط ہاتھ اور پیر کے پاک ہونے سے کام نہیں چلتا۔

گورنمنٹ جب چور کو جیل میں بند کردیتی ہے۔ وہ یقیناً اتنے دن چوری سے بچا رہے گا جتنے دن جیل میں رہے' لیکن اس کے قلب سے چوری کا جذبہ نہیں نکلتا وہ اس ارادے میں ہے کہ جب چھوٹوں گا پھر آکر وہی حرکت کروں گا ___ بلکہ بعض چور تو یہ کہتے ہیں کہ گھر ویسی اچھی روٹی نہیں ملتی جتنی آزادی سے جیل میں ملتی ہے' اس لئے ایک دفعہ پھر چوری کرو تاکہ بڑے گھر میں پہنچ جاؤں' بے محنت روٹی ملے گی ___ اسلام چاہتا ہے کہ قلوب پاک کئے جائیں قانون فقط بدن کو پاک کرے گا' قلب کو پاک نہیں کرے گا' دنیوی حکومتوں کا قانون بدن پر نافذ ہوتا ہے' لیکن اللہ کا قانون دلوں پر نافذ ہوتا ہے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ حکام کی حکومت فقط ظاہر پر ہوتی ہے۔ اللہ کی حکومت باطن کے اوپر بھی ہے' اس کا قانون جیسے ظاہر کو روکے گا' ویسے باطن کی برائی کو بھی روکے گا' تو شریعت تو یہی چاہے گی کہ فقط یہی نہ ہو کہ تم زنا سے بچ جاؤ یہ ہو کہ زنا کا خیال بھی نہ لاؤ' بلکہ یہ ہو کہ تمہارے قلب میں زنا سے اس طرح نفرت ہو جائے جس طرح نجاست سے نفرت ہوتی ہے' شراب خوری سے تمہیں اس طرح نفرت ہو جیسے پیشاب پاخانے سے نفرت ہوتی ہے ___ یہ جب ہوگا۔ جب قلب پاک ہوگا۔

تربیت کا مرکزی نقطہ

تو سب سے بڑی چیز اسلام میں "تزکیۂ قلوب" یعنی دلوں کو پاک بنادینا ہے تاکہ جذبات صالح پیدا ہو جائیں' برے جذبات مغلوب ہو جائیں۔ مطمئن ہوکر رہیں'

اس لئے فرماتے ہیں کہ :

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا

فلاح وہ پائے گا جو اپنے نفس کو پاک کرے گا۔ یہ نہیں کہا کہ فلاح وہ پائے گا جو برائی چھوڑدے گا اور برے عمل سے بچ جائے گا' عمل چھوڑدیا مگر دل میں کرنے کی تمنا ہے۔ جبری طور پر اس نے چھوڑدیا' صلاح اور فلاح پانے والا وہ ہے جس کا قلب پاک ہو جائے' اس میں برائی سے نفرت بیٹھ جائے۔ اور قلب خودیوں کے

کہ اس برائی کو مت کرو

اس کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گناہ' شراب اور زنا نہیں بلکہ **ماحاک فی صدوک** 'جب تمہارا دل یوں کہے کہ یہ برائی ہے تو اس برائی کو چھوڑ دو' وہی فی الحقیقت برائی ہے تو انسان کی پاکی کا دارومدار اس کے قلب کے اوپر ہے' قلوب صحیح ہو گئے تو قالب بھی صحیح ہو گیا' قلب فاسد ہیں تو قالب بھی فاسد ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

وفی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب۔

انسان کے بدن میں گاجر کی شکل کا ایک گوشت کا لوتھڑا ہے' جو بائیں طرف لٹکا ہوا ہے' وہ صحیح ہے تو سارا انسان صحیح ہے۔ وہ فاسد ہے تو سارا انسان فاسد ہے ___ فرمایا :

الا وھی القلب

آگاہ ہو جاؤ' وہ انسان کا قلب ہے' اگر آپ کا دل درست ہے تو بدن بھی درست ہے اور دل میں کھوٹ ہے تو سارے بدن میں کھوٹ ہے۔

اس لئے کہ دل ہی کے حکم سے آپ برا یا اچھا عمل کرتے ہیں۔ دل میں خیال آتا ہے' خیال سے ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ ارادے سے عمل ظاہر ہوتا ہے اگر قلب میں فساد ہے تو خیالات بھی برے پیدا ہوں گے۔ برے خیالات سے برے ارادے پیدا ہوں گے۔ برے ارادوں سے اعمال بھی برے سرزد ہوں گے' اس لئے شریعت چاہتی ہے کہ بجائے اسکے کہ تم ہاتھ پیر کو مانجھو' دھوؤ اور صاف کرو تم قلب کو کیوں نہیں دھوتے' اس کو اگر تم نے دھولیا اور پاک کر لیا' تو سارا بدن خود بخود پاک ہو جائے گا۔

تطہیر قلب

اور قلب کی پاکی ذکر اللہ کی کثرت اور اللہ کے خوف کا مراقبہ کرنے سے ہے کہ آدمی سوچے' بہرحال ایک وقت مجھے اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اپنی زندگی کا جواب دینا ہے۔ میں کیا جواب دوں گا۔

حضرت جنید رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے دنیا میں کوئی عمل ایسا نہیں کیا جس کی حجت میں نے پہلے تلاش نہ کر لی ہو' تاکہ اللہ کے سامنے کہہ سکوں کہ فلاں بات فلاں حجت سے کی۔ محض نفسانی جذبہ سے نہیں کی تھی ___ تو قلب حجت تلاش کر لے کہ جو بھی کرو' اس کی کوئی ایسی قابل قبول وجہ ہو کہ اللہ کے سامنے عرض کر سکوں' کہ یہ وجہ پیش آئی۔ تو اللہ سے زیادہ عذر کا سننے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر کوئی سچا عذر لے کر پہنچیں گے' یقیناً آپ کی بات مانی جائے گی۔

کسی بھی گناہ کے کرنے پر یہ نہیں کیا جائے گا کہ ایک دم سزا دے دی جائے' اور جہنم میں جھونک دیا جائے۔ پوچھا جائے گا' اس کو کیوں کیا ___ ؟ کوئی عذر تمہارے پاس ہے۔؟ اگر کوئی معقول عذر بیان کیا' معاف کیا جائے گا' کوئی عذر آدمی بیان نہ کر سکا' اور واضح ہو گیا کہ محض شقاوت نفس سے کیا جائے' اس وقت سزا جاری کریں گے' اس لئے آپ جو چیز کریں پہلے اس کی حجت تلاش کریں' اور حجت جب تلاش کریں گے جب قلب میں صلاحیت پیدا ہو جائے گی :

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا

''صلاح اور فلاح وہ پائے گا جس نے اپنے قلب کو پاک کرلیا''۔

بدن کی پاکی کافی نہیں ہے ___ کپڑوں کی پاکی کافی نہیں ہے۔ اصل پاکی دل کی ہے۔ وہ پاک ہے تو آپ بدن کو بھی پاک کریں گے، کپڑوں کو بھی پاک کریں گے۔

درجات معصیت

بہرحال فرمایا گیا :

اجتنبوا کبائر وتحقرات الذنوب

گناہوں سے تو بچو، مگر چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بہ نسبت بڑے گناہوں کے بہت زیادہ بچو، یہی بڑے گناہ تک پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

اس واسطے شریعت اسلام نے گناہ کے دو درجے رکھے ہیں۔ ایک صغیرہ، ایک کبیرہ، مقصود کا درجہ وہ تو کبیرہ ہے اور وسائل کا درجہ صغیرہ کا ہے ___ زنا کا فعل یہ تو کبیرہ گناہ ہے، اور عورت پر نگاہ ڈالنا، تاک جھانک کرنا، اور اس کے پیچھے چلنا یہ صغائر ہیں۔

درجات توبہ

اگر کبیرہ سے بچ گیا، تو صغیرہ گناہ نیکیوں سے خود بخود معاف ہوجاتے ہیں :

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ۔

نیکیاں، بدیوں کو خود مٹادیتی ہیں ___ انسان جب نیکی کرے گا، جتنے صغیرہ گناہ ہیں، کبیرہ سے بچنے کی وجہ سے وہ خود بخود ختم ہوجائیں گے۔ مگر کبیرہ معاف نہیں ہوگا جب تک آدمی توبہ نہ کرے، بلا توبہ کے اس کی گرد انسان کے قلب سے نہیں دھل سکتی ___

اور اس میں بھی اگر کبیرہ گناہ کیا اور اس میں مخلوق کی حق تلفی کی، وہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہوگا۔ جب تک وہ صاحب حق معاف نہ کرے۔ اللہ کی آپ چوری کریں گے تو انسان ہے توبہ سے معاف ہوجائے گی ___ لیکن بندوں کی چوری کریں ہزار بار آپ توبہ کریں معاف نہیں ہوگی، جب تک اس کا مال اس کو واپس نہ دیدیں جس کا مال چرایا ہے ___ اگر کسی کو گالی دی ہے ہزار توبہ کریں معاف نہیں جب تک وہ معاف نہ کردے جس کو آپ نے ناحق گالی دی ہے۔ تو گناہ اس میں صغیرہ اور صغیرہ میں کبیرہ ___ تو صغیرہ معاف ہوجاتا ہے جب آدمی کبیرہ سے بچ جائے، اور کبیرہ توبہ سے معاف ہوجاتا ہے۔ اور وہ کبیرہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا جس کا تعلق مخلوق سے ہو۔ جب تک اس صاحب حق سے معاف نہ کرائے۔

قانونی سزا

مثلاً زنا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اس میں آدمی تین گناہ کرتا ہے اور تین کی حق تلفی کرتا ہے، چنانچہ زنا کرنے والے نے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حق تلفی کی اس نے حکم دیا تھا کہ زنا مت کرو، اس نے کیا تو خلاف ورزی کی۔ ایک گناہ تو یہ ہوا کہ اس نے قانون خداوندی کی خلاف ورزی کی۔

دوسرا اس نے پبلک کا گناہ کیا کہ امن اٹھادیا اور ایسا راستہ پیدا کردیا کہ لوگ زنا کرتے پھریں۔ تو یہ پبلک

کا گناہ کیا ـــــ

تیسرا گناہ اپنے نفس کا کیا کہ لازم تھا کہ نفس کو اس برائی سے پاک بناتا۔ اس نے زنا کر کے اپنے قلب کو، نفس کو، بدن کو، سب کو آلودہ کیا اور ملوث کیا۔ تو ایک خدا کی حق تلفی کی ـــــ ایک عوام کی حق تلفی کی ـــــ اور اپنے نفس کی حق تلفی کی، توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ اپنے حق کو اگر چاہیں گے تو معاف کر دیں گے ـــــ لیکن یہ جو نفس میں گندگی بیٹھی ہوئی ہے اور یہ جو پبلک کا نقصان کیا ہے یہ توبہ سے ختم نہیں ہوں گے، جب تک سنگسار نہ کیا جائے اور رجم نہ کیا جائے، اس کے بعد امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب پر توبہ کرنا ضروری ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ تو کہتے ہیں کہ حد زنا جاری کر دی گئی، سنگسار کر دیا گیا، گناہ معاف ہو گیا ـــــ امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ معاف نہیں ہوا۔ سنگسار کر دینے سے جو پبلک کی حق تلفی کی تھی وہ ختم ہو گئی، لیکن اللہ کی جو حق تلفی کی تھی وہ ابھی باقی ہے۔ وہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوگی۔ اور نفس کی جو حق تلفی کی تھی وہ اس کے بغیر معاف نہیں ہوگی کہ آدمی آئندہ کے لئے عہد کرے کہ میں پھر اس حرکت بد سے بچوں گا۔

بہر حال حدود شرعیہ کی قانونی سزا بھی جاری ہوگی اور ساتھ ساتھ توبہ بھی ضروری ہے۔ اس قسم کے جرائم میں ایک انسان بہت سی حق تلفیاں کرتا ہے خدا کی حق تلفی الگ، عوام کی حق تلفی الگ، ملک کی الگ، اور اپنے نفس کی الگ ـــــ تو توبہ سے خدا کا گناہ معاف ہوگا، حد جاری کرنے سے وہ گناہ معاف ہوگا جو پبلک کا ہے۔ وہ جو اس نے بدامنی کا راستہ ڈال دیا تھا، حد جاری کرنے سے امن قائم ہوگا۔

نسخۂ تطہیر

مگر دیکھا جائے تو تینوں کا تعلق قلب ہی سے ہے۔ اگر قلب میں پاکی نہیں ہے۔ تو انسان نہیں بچے گا، اگر قلب میں پاکی ہے بے شک بچ جائے گا۔ اس واسطے سب سے زیادہ ضروری قلب کو صالح بنانا ہے، اس کے لئے شریعت نے ذکر اللہ کا نسخہ تجویز کیا ہے کہ یاد خداوندی ہمہ وقت تمہارے سامنے رہے، جتنا اللہ کی یاد سامنے ہوگی، اتنا ہی خوف خدا دل میں بیٹھے گا، اتنا ہی آدمی جرائم سے بچنے کی کوشش کرے گا اور ذکر کے بجائے جتنی غفلت پیدا ہوگی، اتنی ہی معاصی اور گناہوں کی کثرت ہوگی ـــــ اس لئے بنیادی چیز بتلائی گئی۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

"یاد خداوندی اپنے اندر پیدا کرو ـــــ"

ذکر معاشرت

اور ہمہ وقت یاد ہو ـــــ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی کہ:

کان یذکر اللہ علی کل احیانہ

ہر دم اور ہر لمحہ آپ ذکر اللہ کرتے تھے۔

امت کو بھی ایسا ہونا چاہئے ـــــ لیکن آپ یہ کہیں گے کہ ہر وقت کس طرح ذکر کریں۔ دکان پر بھی جانا ہے، تجارت بھی کرنی ہے، زراعت بھی کرنی ہے، بال بچوں میں بھی رہنا ہے۔ ہر وقت ذکر کرتے رہیں گے، یہ بظاہر محال معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ غور کریں تو یہ سارے کام کریں پھر بھی آپ ہر وقت ذکر اللہ کر سکتے

ہیں ___ ایک تو ذکر اللہ عرفاً ذکر ہے جیسے صبح و شام ایک ایک تسبیح پڑھی' یا نمازیں پڑھیں یہ تو ذکر ہی ہے ___ دوسرے اوقات میں' بال بچوں میں' دکان پہ جانا ہو' اس میں ذکر کی صورت یہ ہے کہ آپ دوکان پر جائیں' یہ نیت کر کے جائیں کہ میں اس لئے جارہا ہوں کہ چار پیسے ہاتھ لگیں تاکہ بال بچوں کی پرورش کروں یہ حکم خداوندی ہے' تو میں تعمیل حکم کے لئے جارہا ہوں اپنے نفس کے حظ کے لئے نہیں جارہا' اطاعت خداوندی کے لئے جارہا ہوں ___ زراعت کرنے والا زراعت کر کے اور یہ نیت کرے کہ چار دانے پیدا ہوں گے' بچوں کو بھی کھلاوں گا' مخلوق کی بھی خدمت کروں گا' خدا کی مخلوق کی پرورش کروں گا' ___ یہ سب ذکر اللہ میں داخل ہو جائے گا' اس کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ بازار اور کھیت چھوڑ کے مسجد میں آ کے تسبیح لے کر بیٹھیں' اسی بازار اور کھیت میں نیت کرلیں ___ اسی طرح سے ہر معاشرت کی چیز عبادت بن جاتی ہے اور اجر وہی ملتا ہے جو عبادت پہ ملتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ آدمی کھانا کھانے کے لئے بیٹھتا ہے' ابتداء میں بسم اللہ کہے اور اخیر میں الحمد للہ کثیراً ___ فرماتے ہیں جب اس طرح سے اول و آخر میں ذکر کے ساتھ کھانا کھائے گا۔

غفرله ماتقدم من ذنبه۔

اس کے اگلے پچھلے گناہ سب بخش دیئے جائیں گے۔

تو یہ کھانا' کھانا ایک معاشرتی فعل ہے۔ مگر مغفرت گناہوں کی ہو رہی ہے جیسے نماز پر ہوتی ہے' ذرا سی نیت اور فکر کے بدلنے سے مغفرت مرتب ہوگئی۔

حدیث میں ہے کہ :

من قاد اعمی غفرله ماتقدم من ذنبه۔

''جس نے اندھے کو راستہ دکھایا' جتنے اس کے صغیرہ گناہ ہیں بخش دیئے گئے''۔

اندھے کو راستہ دکھایا بظاہر کوئی نماز' روزہ نہیں کیا' لیکن ثمرہ وہی مرتب ہوا جو عبادت پر مرتب ہوتا تھا' اس لئے کہ نیت صحیح تھی ___ اسی طرح سے بہت سے اعمال فرمائے گئے ہیں جو معاشرتی ہیں اجر و ثواب ان پر طاعت و عبادت کا ملتا ہے' چونکہ وہ ذکر بن جاتے ہیں اس لئے کہ نیت صحیح ہوتی ہے۔

ذکر دائمی

آپ سے یہ نہیں کہا جارہا کہ نماز روزہ سے فارغ ہو کر آپ مسجد ہی کے اندر بقیہ سارے اوقات بیٹھے رہیں' یا ہمہ وقت ذکر کرتے رہیں ___ یہ نہیں ___ بلکہ دنیا کا جو کام ہو' نیت درست کرلو' اتباع سنت کرو' وہ سب ذکر میں شامل ہوتا جائے گا' تو آپ بھی ہمہ وقت ذکر اللہ کرنے والے بن گئے' جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ وقت ذکر فرماتے تھے' تمہیں بھی یہ مقام میسر آسکتا ہے۔

اسی طرح شریعت نے مختلف اوقات کی کچھ دعائیں بتلائی ہیں۔ انہیں یاد کرلو اور پڑھ لو تو پورے اوقات ذکر میں مشغول سمجھے جائیں گے' سورج نکلتے وقت یہ دعاء' لباس پہنتے ہوئے یہ دعا پڑھ لی' استنجاء کو گئے تو یہ دعا پڑھ لی' بھائیوں سے مصافحہ کیا تو یہ دو جملے پڑھ لئے' یہ سب اذکار ہیں' ان کی عادت ڈالی جائے تو پوری زندگی ذکر اللہ میں گزر جائے گی ___ غرض ذکر اللہ ہمہ وقت ہونا چاہئے' اور ہمہ وقت ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی سب کھانے پینے کو چھوڑ دے' سب کاروبار چھوڑ دے' اس کھانے پینے ہی کو ذرا سی نیت کی تبدیلی سے ذکر بنائے تو پورے اوقات ذکر میں صرف ہو جائیں گے' اس سے قلب میں صفائی پیدا ہوگی' قلب میں جلا پیدا

ہوگی۔

تمرین ذکر

اور یہ کوئی بات نہیں ہے کہ آپ اس کی مشق کرکے عادت ڈالیں کہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے کوئی نہ کوئی اللہ کا نام زبان پر رہے' اوپر چڑھنے لگیں تو اللہ اکبر اللہ اکبر کہنا شروع کردیا' نیچے اترنے لگیں تو سبحان اللہ سبحان اللہ کہنا شروع کردیا۔ کوئی تعجب کی بات پیش آئی' آپ کہنے لگے سبحان اللہ' کیسی عجیب بات ہے' آپ نے کسی چیز کی قدر بڑھائی تو کہا ماشاء اللہ ــــ اس کی اگر آپ عادت ڈالیں تو ابتدا میں تو ذرا تکلف ہوگا اور آپ کو تکلیف ہوگی۔ لیکن جب عادت پڑ جائے گی تو بے ارادہ بھی زبان پر ہروقت اللہ کا نام جاری ہو جائے گا' عارفین اسی کی مشق کراتے ہیں' ابتداء میں ذرا سا تکلف ہوتا ہے۔ اخیر میں وہ چیز بے ساختہ جاری ہو جاتی ہے۔

دوام ذکر کا ثمرہ

اور اس کا ثمرہ کیا نکلتا ہے ــــ؟

پوری زندگی میں جب ذکر کی عادت پڑگئی اور بلا اختیار زبان پر جاری ہوا تو مرتے وقت بھی اللہ ہی کا نام زبان پر جاری ہوگا' خاتمہ صحیح ہوجائے گا' اس خاتمے کے صحیح کرنے کے لئے یہ ساری جدوجہد اور محنت ہے کہ وہ آخری دم درست ہوجائے۔

من کان اول کلامہ وآخر کلامہ لا الہ الا اللّٰہ دخل الجنۃ۔

توجیسے حدیث میں ہے کہ اول کلام اور آخر کلام جس کا لا الہ الا اللہ بن گیا ہے وہ شخص جنتی ہے ــــ یہ آخر کلام لا الہ الا اللہ کب ہوگا؟ جب زندگی میں خدا کا نام لینے کی مشق ہوگی۔

چنانچہ حدیث شریف میں فرمایا گیا :

تحشرون کما تموتون وتموتون کما تحیون

تمہارا حشر اس حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئے گی' اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر تم نے زندگی گزاری ہے۔

غرض زندگی جس حالت میں گزاری ہے' موت اسی حالت پر آئے گی' اور جس حالت پر موت آئے گی میدان محشر میں اسی حالت پر آپ اٹھیں گے' اگر کسی نے زندگی میں یاد خداوندی کی مشق کی ہے' یقیناً مرتے وقت قلب میں اللہ کی یاد ہوگی' اور زبان پر اللہ کا نام جاری ہوگا۔ اور جب قبر سے اٹھے گا تو وہی کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھے گا' جو کلمہ پڑھتے ہوئے انتقال کر گیا تھا۔

حدیث میں ہے کہ اگر ایک حاجی لبیک' لبیک کہتے ہوئے مرگیا ہے جب قبر سے اٹھے گا تو اس کی زبان پر لبیک جاری ہوگا' اور یہ سمجھتے ہوئے اٹھے گا کہ میں میدان عرفات میں ہوں' بعد میں معلوم ہوگا کہ یہ میدان محشر ہے' عرفات کہاں ہے۔ میں مکہ میں نہیں بلکہ عالم آخرت میں ہوں' مگر زبان پر لبیک جاری ہوگا' ــــ اسی طرح سے جو کلمہ آدمی زبان پر جاری کرلے اور اللہ کے نام کی مشق کرتا رہے' اللہ کا وہی نام خاتمہ کے وقت بھی نکلے گا' اور وہی نام لیتا ہوا آدمی میدان محشر میں اٹھے گا۔

قبر وحشر میں ذکر کا محافظتی کردار

یہی اذکار یہی کلمات اس کے لئے سنتری اور محافظ بنیں گے

حدیث میں ہے کہ جب آدمی قبر سے اٹھے گا تو لا الہ الا اللہ اس کے آگے آگے ہوگا۔ اللہ اکبر سر کے اوپر ہوگا سبحان اللہ اسکے دائیں طرف ہوگا الحمد للہ اسکی بائیں جانب ہوگا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ اسکی پشت کی جانب ہوگا اور یہ کلمات چاروں طرف سے گھیر کر آدمی کو اپنی حفاظت میں لے کر میدان محشر میں لے چلیں گے' ہر طرف سے عذاب سے بچائیں گے۔

حدیث میں ہے کہ جب میت کو قبر میں لٹادیا جاتا ہے تو سر کی طرف سے عذاب بڑھتا ہے' اگر سر میں قرآنی آیات محفوظ ہیں جنہیں وہ یاد کرتا رہا تھا' وہ آیتیں کھڑی ہو جاتی ہیں کہ خبردار ادھر سے مت آنا ___ دائیں جانب سے عذاب بڑھتا ہے تو حدیث میں فرمایا گیا الصلوٰۃ برھان ___ نماز انسان کی دستاویز ہے وہ دائیں جانب سے عذاب کو روک دیتی ہے ___ بائیں جانب سے عذاب بڑھتا ہے تو روزے کھڑے ہو جاتے ہیں' اس لئے کہ حدیث میں ہے کہ الصوم جنۃ' روزہ انسان کے لئے ڈھال ہے' بائیں جانب ڈھال کر کے ہی وار کو روکتے ہیں اور اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں ___ پیروں کی جانب سے عذاب بڑھے گا تو حدیث میں ہے کہ صدقات اور زکوٰۃ عذاب کو روکنے کے لئے کھڑے ہو جائیں گے' کیونکہ یہ انسان کی چلت پھرت کی کمائی ہے اس لئے پیروں کی طرف سے عذاب کو روکتی ہے ___ غرض قبر میں بھی اگر عذاب کو روکنے والی کوئی چیز ہوگی تو وہ ذکر اللہ ہوگا۔ میدان محشر میں بھی اگر آبرو کے ساتھ انسان کو کوئی چیز لے جائے گی اور بڑھائے گی' وہ بھی ذکر اللہ ہوگا اور اللہ کا نام ہوگا۔ جو خاتمہ اچھا کرے گی وہ بھی انسان کا ذکر اور یاد خداوندی ہوگی۔

مدار محافظت

مگر سب کچھ جب ہی ہوگا جب زندگی میں ذکر اللہ کی مشق کی ہوگی' اگر زندگی میں غفلت رہی ہوگی' تو موت کے وقت بھی قانوناً غفلت ہی ہوگی۔ ویسے اللہ جانتا ہے کس کے ساتھ کیا معاملہ ہے ___ مگر حشر میں وہ چیزیں سامنے آئیں گی جن کو جزو نفس بنالیا تھا ___

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ میت کو جب قبر میں لٹاتے ہیں اور منکر نکیر سوال وجواب کے لئے آتے ہیں اور اس میں روح ڈالی جاتی ہے اسے یوں نظر آتا ہے کہ آفتاب نکلا ہوا ہے مگر غروب ہونے کے قریب ہے۔

یتمثل لہ الشمس' آفتاب کی صورت مثالی سامنے ہوتی ہے' یوں معلوم ہوتا ہے کہ دھوپ پر زردی چھا چکی ہے اور مغرب کا وقت بالکل قریب ہے۔ ملائکہ سوال کرتے ہیں۔

من ربک ___ ؟ تیرا رب کون ہے؟ تو میت جواب دیتا ہے۔ دعونی اصلی ___ میاں' پرے ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے دو' میرا وقت تنگ ہو رہا ہے۔ نماز قضا ہو جائے گی ___ ایک فرشتہ دوسرے سے کہتا ہے' اس سے رب کا کیا سوال کرنا ہے' جو رب میں اتنا فنا ہے کہ یہاں بھی نماز پڑھنے کو تیار ہے اس سے کیا پوچھتے ہو کہ تیرا رب کون ہے ___

دوسرا کہتا ہے کہ ہمیں تو ڈیوٹی انجام دینی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جواب سچا دے گا' مگر پوچھنا ہمارا فرض ہے ___ تو یہ جواب دینا کہ دعونی اصلی پرے کو ہٹو' مجھے نماز پڑھنے دو ___ یہ کون کہے گا۔ جو دنیا میں مشق کر چکا ہوگا کہ میری نماز قضا نہ ہونے پائے وقت پر ادا ہو۔ اور اگر دنیا میں وقت گزارتے جاتے ہیں۔ وہ ادا چھوڑ' قضا چھوڑ' سرے سے پڑھتا ہی نہیں وہ وہاں دعونی اصلی نہیں کہے گا' اس لئے کہ اسے نماز کی عادت ہی نہیں۔ غرض زندگی میں جو عادت ڈالی جائے گی' وہی عالم قبر اور عالم حشر میں قائم رہے گی اور وہی ذریعہ نجات بنے گی۔

ذکر اللہ کے دو اجزاء

اس واسطے اتباع شریعت' ذکر اللہ' اور یاد خداوندی اس زندگی میں رکھی جائے اور اس کے دو جز ہیں۔ ایک منکرات سے بچنا اور ایک معروفات پر عمل کرنا' ایک امر پر عمل کرنا' ایک نہی پر عمل کرنا' اس میں مقدم یہ ہے کہ منکرات سے بچا جائے جن چیزوں کو شریعت نے گناہ قرار دیا ہے اور جن چیزوں کو کبیرہ اور صغیرہ کہا ہے ان چیزوں سے بچنے کی کوشش کی جائے' تو یہ مامورات پر عمل کرنے کا ذریعہ بنیں گی' احکام شرعیہ کے اتباع کرنے کا ذریعہ بنیں گی۔ اور جو منکرات سے نہیں بچتا اسے نیکی کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ اگر توفیق ہوتی ہے تو نیکی اپنا اثر نہیں دکھلاتی' اس لئے کہ مضر چیزیں استعمال میں آرہی ہیں ___ اس کے مجموعے کو کہ نیکی کو کرنے لگے اور بدی سے بچنے لگے' اسی کا نام شریعت کی اصطلاح میں "تزکیہ" ہے کہ اس نے اپنے نفس کو پاک بنالیا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْخَابَ مَنْ دَسّٰهَا۔

اس انسان نے جس نے بدی چھوڑ دی' نیکی اختیار کی' اتباع شریعت اختیار کیا اور محرمات' مکروہات اور ممنوعات کو چھوڑ دیا' تو اس نے اپنے نفس کو پاک بنالیا۔ وہ صلاح و فلاح کی منزل تک پہنچ گیا ___ ان آیات کے شروع میں فرمایا گیا۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا

اس ذات کی قسم جس نے نفس کو صحیح صحیح بنایا' اس میں الہام کیا فجور کا بھی اور تقویٰ کا بھی۔ نیکی کا بھی جذبہ ڈالا اور بدی کا بھی جذبہ ڈالا تاکہ دونوں کے ٹکراؤ سے انسان ترقی کرے ___ یہی چیز میں نے ابتداء میں عرض کی تھی کہ ان آیات میں بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے کہ انسان میں نیکی اور بدی دونوں کے مادے ہیں۔ بدی بچنے کے لئے ہے' نیکی کرنے کے لئے ہے۔ دونوں کو ملا کر انسان میں ترقی کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور صلاح و فلاح کی منزل سامنے آجاتی ہے۔ اس لئے اجمالی طور پر اصول عرض کر دیا۔ اور اس اصول کی قدرے تشریح عرض کر دی۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نیکی کے امتثال کی اور بدیوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

دعاء

اللهم ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذهديتنا وهب لنا من لدنك رحمة۔ انك انت الوهاب'

اللهم افتح لنا بالخير۔ واختم لنا بالخير۔ اللهم نسئلك الخير كله' ونعوذبك من الشر كله۔

اللهم وتوفنا مسلمين والحقنا بالصالحين غير خزايا ولا مفتونين۔

وصلى اللّٰه تعالىٰ علىٰ خير خلقه سيدنا ومولانا محمد واله وصحبه اجمعين برحمتك يا ارحم الراحمين

تنبیہہ

ایک مسئلہ سن لیجئے۔
بعض لوگوں کو عادت ہوتی کہ وہ وعظ میں بیٹھتے ہیں مگر کچھ وظیفہ بھی پڑھتے رہتے ہیں۔ یہ مکروہ ہے۔ آداب درس اور وعظ کے خلاف ہے۔ وعظ سننا یہ خود مستقل طاعت وعبادت ہے۔
یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی نماز بھی پڑھے اور ساتھ میں دوسروں کو پیسے بھی تقسیم کرے' تو نہ نماز ہوگی نہ پیسے ہی صحیح تقسیم ہوں گے' تو آداب مجلس وعظ کے یہ چیز خلاف ہے ___ ہر شخص کا فرض ہے جو مجلس میں بیٹھے وہ استماع کرے اور سننے کی طرف توجہ کرے اور ان چیزوں کو قلب میں اتارنے کی فکر کرے جو کہی جارہی ہیں ___ اور اگر وظیفے کا ضروری وقت ہے تو دوسرے مقام پر جاکر اپنا وظیفہ پڑھے' اس مجلس میں نہ بیٹھے۔

وصلی اللّٰہ تعالٰی علی خیر خلقہ محمد والہ وصحبہ اجمعین۔

(حررہ ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ بروز جمعۃ المبارک)

فضیلتِ تقویٰ

عام طور سے دنیا میں فسق و فجور، مار دھاڑ، بدامنی، بدنیتی، اور فسادات عام ہوتے جارہے ہیں۔ اِرتکاب جرائم کی وجہ یہ نہیں کہ اس دور میں پولیس اور فوج کی کمی ہے ____ بلکہ دلوں میں اللہ کا ڈر اور خوف باقی نہیں ہے اگر یہ ہو تو آدمی میں اِرتکابِ جرائم کی ہمت ہی نہیں ہوگی۔ خواہ وہاں پولیس اور فوج ہو یا نہ ہو۔ پھر چاہے تنہائی میں بھی ہو وہاں بھی گناہ سے بچے گا۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ____ اَمَّا بَعْدُ ____

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۚ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا۔
صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ۔

احوالِ واقعی

بزرگانِ محترم!

یہاں آنے کے بعد میں نے کچھ بیان کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر بیماری کا سلسلہ شروع ہو گیا، نزلہ زکام، بخار وغیرہ کی وجہ سے کچھ کمزوری پیدا ہوئی تو میں نے معذرت کردی کہ بھائی! آج رہنے دو پھر دیکھی جاوے گی، چنانچہ ہمارے بھائی رشید نے یہ بھی فرمایا کہ واپسی میں ایک دن دیا جائے اس میں کچھ بیان ہو جائے گا۔ میں نے اس پر کہا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ آج میں نے سوچا کہ شاید بھول گئے ہوں گے اور یہ دیکھ کر کوئی سامان بھی جلسہ واجلاس کا نہیں بالکل مطمئن تھا مگر اب معلوم ہوا کہ سب جمع ہیں تو اچانک ایک چیز سامنے آئی اور

مجمع کے احترام کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ کچھ بیان کر دیا جائے چاہے وہ مختصر ہی ہو۔ اس لئے زیادہ وقت بھی نہ لے سکوں گا۔ مختصر طریق پر چند باتیں گزارش کروں گا۔

طریقِ سلف اور وصیتِ تقویٰ

سلفِ صالحین یعنی حضرات صحابہؓ اور حضرات تابعینؒ کی یہ عادت رہی ہے کہ جب ایک دوسرے سے رخصت ہوتے تھے تو کہتے تھے کہ کچھ نصیحت کیجئے چھوٹے اپنے بڑوں سے نصیحت کی فرمائش کرتے تھے اور بڑے اپنے چھوٹوں سے نصیحت طلب کرتے تھے۔ عام طور سے سلف کی یہ نصیحت ہوتی تھی کہ :

اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ

''میں تمہیں تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں''۔

یہ سلف کا عام جواب ہوتا تھا۔ اسی مناسبت سے میں نے یہ آیت تلاوت کی جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جو شخص اللہ سے تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ اللہ اس کے لئے مشکلات میں ایسے راستے کھولتا ہے کہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا۔ مشکل میں پھنسا ہوا ہے ہر طرف سے راستے بند ہیں غیب سے سامان ہوتا ہے اور راہ نکل آتی ہے اور وہ مشکل سے نکل جاتا ہے۔

نتائجِ تقویٰ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا۔

''تقویٰ پر مرتّب شُدہ پہلا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشکلات میں اس کے کام آتے ہیں''۔

اور دوسرا وعدہ یہ ہے کہ :

وَیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ۔

''حق تعالیٰ اس کو ایسے انداز سے رزق دیتے ہیں کہ اسے وہم وگمان بھی نہیں ہوتا کہ میرا رزق یہاں سے پہنچ جائے گا اور پہنچتا ہے وہیں سے''۔

تیسرا وعدہ یہ فرمایا ہے :

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یُکَفِّرْ عَنْہُ سَیِّاٰتِہٖ۔

''کہ جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفّارہ کر دیتے ہیں''۔

اور چوتھا ثمرہ اور نتیجہ یہ بیان فرمایا ہے :

وَیُعْظِمْ لَہٗ اَجْرًا۔

''اللہ اس کے اجر وثواب ___ کو بہت بڑھا دیتا ہے''۔

تو تقویٰ اختیار کرنے پر ان آیات میں چار وعدے دیئے گئے ہیں۔ مشکلات میں راستہ کھول دینا' رزق بے شان وگمان پہنچانا' معصیت کا کفّارہ کر دینا۔ اجر وثواب کو بڑھا دینا۔

تقویٰ کے ایک معنیٰ تو لغت میں ڈرنے اور خوف کے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ :

''اللہ سے ڈرو اور خوف و خشیت اختیار کرو''۔

کسی حالت میں بے فکر ہو کر مت بیٹھو' خواہ دولت مند ہو خواہ مفلس ہو۔ ہر حالت میں اللہ کا ڈر انسان کو رہنا چاہئے۔

تقویٰ 'امنِ عالم کا ضامن ہے

اگر غور کیا جائے تو جتنے بھی جرائم اور معصیتیں ہیں وہ اللہ کے ڈر سے ہی ختم ہوتی ہیں۔ جرائم کو نہ پولیس روک سکتی ہے' نہ فوج روک سکتی ہے اور نہ ہتھیار روک سکتے ہیں۔ جب تک کہ دل میں ڈر اور خوف خداوندی نہ ہوگا۔ آدمی جرائم سے باز نہیں رہ سکتا۔ اگر محض پولیس اور فوج کی طاقت سے جرائم بند ہوجایا کرتے تو آج کی دنیا سب سے زیادہ متقی ہوتی۔ اس لئے کہ آج نہ فوجوں کی کمی ہے اور نہ پولیس کی کمی ہے اور نہ ہتھیاروں کی کمی ہے بلکہ آج کل ایسے ایسے ہتھیار موجود ہیں کہ دنیا نے کبھی دیکھے بھی نہ ہوں گے۔ توپیں بھی ہیں' بم بھی ہیں۔ غرض ایسے ایسے ہتھیار موجود ہیں جن کے اثرات دُور دُور تک جاتے ہیں۔

ایک بم سے لاکھوں آدمی ختم ہوسکتے ہیں۔ اگر ان ذرائع سے دنیا میں امن قائم ہوسکتا اور جرائم مٹ سکتے تو آج کی دنیا میں کوئی جرم باقی نہ رہتا۔ سب کے سب متقی اور پرہیزگار ہوتے لیکن جتنی پولیس بڑھتی جاتی ہے اور جتنی فوج اور ہتھیار بڑھائے جاتے ہیں اس سے دُگنے جرائم بڑھتے جاتے ہیں۔ اور عام طور سے دنیا میں فسق وفجور' مار دھاڑ اور بدامنی' بدنیتی اور فسادات عام ہوتے جارہے ہیں۔ اِرتکابِ جرائم کی وجہ یہ نہیں کہ اس دَور میں پولیس اور فوج کی کمی ہے' بلکہ دلوں میں اللہ کا ڈر اور خوف باقی نہیں ہے۔ اگر یہ ہو تو آدمی کو انکارِ جرائم کی ہمت ہی نہیں ہوگی۔ خواہ وہاں پولیس اور فوج ہو یا نہ ہو پھر چاہے تنہائی میں بھی ہو وہاں بھی گناہ سے بچے گا۔

تقویٰ کے بغیر قیامِ امن ناممکن ہے

مثلاً آپ کے سامنے لاکھوں روپے کا خزانہ رکھا ہوا ہے اگر آپ اُٹھا کر لے جانا چاہیں تو لے جاسکتے ہیں کیونکہ وہاں نہ پولیس ہے نہ فوج ہے مگر آپ اسے نہیں اٹھاتے۔ کیوں۔؟ اس لئے کہ اللہ کا ڈر دل میں گھر کئے ہوئے ہے کہ میں نے اگر ایسا کیا تو اللہ کے سامنے قیامت کو کیا جواب دوں گا۔ جب پوچھا جائے گا کہ تو نے غیر کے مال میں بغیر اس کی اجازت کے کیوں تصرف کیا تھا۔

تو سب سے بڑی پولیس جو دِلوں پر بیٹھی ہوتی ہے وہ خوفِ خُداوندی ہے۔ وہی تمام جرائم سے بچانے والی ہے اور معصیت سے روکنے والی ہے۔ ورنہ دنیا میں کوئی صورت نہیں ہے جرائم سے روکنے کی اور جرائم سے بچنے کی۔ اسلام نے آخرت کا جو عقیدہ پیش کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ کو ہر وقت یہ تصوّر رہے کہ مجھے اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کرنی پڑے گی۔ اور ہر شخص سے اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ زندگی کس طرح سے گزاری۔ اس کا جواب دینا پڑے گا۔ تو یہ عقیدہ ایسا ہے کہ جس سے انسان حرکاتِ ناشائستہ سے رُک سکتا ہے۔ اسی عقیدے کی وجہ سے دنیا میں امن قائم ہوسکتا ہے۔ اور ہر شخص اِرتکابِ جرائم سے بچ سکتا ہے۔ اور کوئی صورت ایسی نہیں جس کے اختیار کرنے سے جرائم سے بچ سکے۔

باطنی فساد بھی تقویٰ سے رفع ہوتا ہے

جبلّی طور پر انسان درندہ واقع ہوا ہے۔ مار کاٹ' چیر پھاڑ اس کا خاصہ ہے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ

جب حضرت آدمؑ کو زمین پر اتارا گیا اور حضرت حوا ؑ بھی اُتریں تو فرمایا :

اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔

جاؤ تم دنیا کے اندر' اور ایک دوسرے کی دشمنی تمہارے اندر ڈال دی گئی ہے۔ اس لئے انسان ایک دوسرے کا دشمن بھی ہے اور بُرا چاہنے والا بھی۔ اس کے قلوب میں کہیں حرص رکھی گئی ہے کہیں بغض رکھا گیا ہے' کہیں حسد رکھا گیا ہے' کہیں تکبّر رکھا گیا ہے۔ ان اخلاقِ رذیلہ کی بنا پر جب آدمی حریص ہو گا تو دوسرے کے مال پر نگاہ ڈالے گا۔ اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ پھر اسے جائز و ناجائز کی پرواہ نہ ہوگی۔ چوری ڈکیتی بے تحاشہ کرے گا۔ اس لئے کہ اس کے اندر حرص کا مادہ موجود ہے اور اگر انسان میں حسد کا مادہ موجود ہے تو وہ اپنے کسی بھائی کو بڑھتا ہوا دیکھنا نہیں چاہے گا۔ دنیا میں کوئی عزت کے اعتبار سے ذرا بڑھا تو دلوں میں حسد شروع ہو جاتا ہے کہ یہ کیوں بڑھ گیا۔ لوگ اس پر تو غور نہیں کرتے کہ اس نے اپنی صلاحیتیں استعمال کیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے بڑھا دیا۔ ہم بھی وہ صلاحیتیں پیدا کریں مگر یہ نہیں ہوتا بلکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ ترقیات و مراتب اس کے پاس نہ رہیں چاہے مجھے ملیں یا نہ ملیں۔ یہ حسد کا خاصہ ہے کہ آدمی دوسرے کی نعمت کو زائل ہوتا دیکھ کر خوش ہو' چاہے خود بالکل محتاج اور مفلس کیوں نہ ہو۔

ایسے ہی تکبّر' طمع لالچ وغیرہ ہیں۔ ان اشیاءِ رذیلہ پر اگر بریک لگانے والی کوئی چیز ہے تو وہ تقویٰ اور خوفِ خداوندی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو سوائے مار دھاڑ کے اور ڈکیتی ڈالنے کے اور کیا کرے گا تو اس سے دنیا میں ایک عجیب انارکی پھیل جائے گی۔ یہ اخلاق عام ہیں اور یہ انسان کی جبلت ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اپنا قانون اُتارا کہ ان چیزوں سے بچ کر زندگی گزارو۔

اس لئے حکم ہے کہ حسد ختم کرو اور ایثار اختیار کرو' اگر اپنے کسی بھائی کو دیکھو کہ دولت ملی ہے تو اس میں اتنے ہی خوش ہو جیسے کہ یہ دولت مجھے ہی مل گئی اور یہ سمجھو کہ وہ میری ہی دولت ہے اگر کسی کو عزت ملی ہے تو یہ سمجھو کہ یہ میری عزت ہے' اگر خدانخواستہ یہ ذلیل بنا تو یہ میری ذلت ہے۔ یہ جذبہ دین نے پیدا کیا ہے کہ حسد کو چھوڑ کر ایثار اختیار کرو۔ لالچ چھوڑ کر قناعت اختیار کرو کہ جتنا تمہیں اللہ نے دیا ہے اس پر خوش رہو' شکر کرتے رہو اللہ تعالیٰ اسے بڑھا دے گا۔

اسی طرح کبر سے بچا کر دین نے تواضع کی تعلیم دی ہے کہ خاکساری برتو' ہر ایک کے سامنے چھوٹے بن کر پیش ہو کہ تم بڑے ہو' میں چھوٹا ہوں۔ لڑائی دنگا جب بھی ہوتا ہے تکبّر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہر ایک کہتا ہے کہ میں بڑا ہوں اور قاعدہ ہے کہ دو بڑے ایک جگہ نہیں سما سکتے۔ یقیناً ایک گھٹے گا ایک بڑھے گا۔ ایک ختم ہو گا ایک آگے آئے گا۔ لیکن جب ہر ایک یوں سمجھے گا کہ میں بڑا نہیں۔ بڑا تو وہ ہے۔ جو یہ کہے کہ میں بڑا نہیں یہ بڑا ہے۔ تو پھر لڑائی جھگڑا کس چیز کا ہو گا۔؟

اس لئے امن وامان کا ذریعہ تواضع اور خاکساری ہے اور لڑائی جھگڑوں کا سبب تکبّر اور نخوت ہے۔ یہ تمام چیزیں انسان میں موجود ہیں ان کا علاج اگر کیا ہے تو دین نے کیا ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے دنیا میں آکر اس کی تعلیم دی اس کے طریقے بتلائے ہیں کہ اگر یہ طرز اختیار کرو گے تو تمہاری حرص زائل ہو جائے گی اور یہ طریقہ اختیار کرو گے تو تمہارا حسد ختم ہو جائے گا۔ یہ تمام طریقے دین کے بتلائے ہوئے ہیں۔

تقویٰ محاسبۂ آخرت سے نجات کا ذریعہ ہے

یہ دو بنیادی باتیں ہیں ایک دل میں اللہ کا ڈر' دوسرے آخرت کے عقیدے میں مضبوطی اور پختگی کہ جو

کچھ دنیا میں کر رہا ہوں مجھے جواب دینا ہے اور حق تعالیٰ کے پاس ایک ایک چیز کا حساب ہو گا۔ حتیٰ کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سردیوں میں گرم پانی نعمت ہے اس کا بھی احسان جتلایا جائے گا کہ ہم نے سردیوں میں گرم پانی دیا تم نے اس کا کیا حق ادا کیا؟ گرمیوں میں ٹھنڈا پانی نعمت ہے اس کا حساب ہو گا کہ تم نے اس ٹھنڈے پانی کو استعمال کر کے کیا شکریہ ادا کیا۔

وہاں ایک ایک چیز کا حساب ہو گا۔ تمہیں اتنی عمر دی تھی تم نے کاہے میں صرف کی۔ تمہیں اتنی دولت دی گئی تھی تم نے اس کو کاہے میں صَرف کیا۔ تو سب چیزوں کو الگ الگ پوچھا جائے گا۔

یہ نہیں کہ سارے بنی آدم سے مشترکہ طور پر سوال ہو گا اور وہ سب مل کر جواب دیں گے نہیں۔ بلکہ ہر کسی کی پوری زندگی سامنے کر دی جائے گی اور پھر اسی کے مطابق حساب و کتاب ہو گا ___ یہ عقیدہ جب ایک مؤمن کے دل میں جما ہوا ہے تو وہ جرأت و ہمت نہیں کر سکتا۔ خیانت کی بددیانتی کی۔ اور جب بھی یہ حرکت کرے گا تو معلوم ہو گا کہ عقیدے میں ڈھیلا پن آ گیا ہے۔ وہ عقیدہ دل میں چھپ گیا ہے۔ سامنے نہیں رہا ہے لیکن اگر سامنے ہو تو پھر یقیناً جرأت نہیں ہو گی اور اگر کر ہی گزرے گا تو پھر جلدی سے توبہ کی توفیق ہو گی اور ندامت ہو گی کہ میں نے بہت بری حرکت کی ہے۔ اس کے نتیجے میں توبہ کرے گا' استغفار کرے گا۔ یہ ندامت توبہ و استغفار اسی وجہ سے کہ یہ دو بنیادیں ہیں اس کے ذہن میں۔

تقویٰ میں احتیاط کا پہلو

تقویٰ کے ایک معنیٰ ہیں ڈرنے کے کہ آدمی اللہ سے ڈرے اور یہ ہی گویا جرائم سے انسداد کا طریقہ ہے۔

تقویٰ کے دوسرے معنیٰ ہیں احتیاط ___ کہ آدمی محتاط زندگی بسر کرے۔ جس میں بڑے جرائم سے بچنے کے لئے چھوٹے جرائم کو چھوڑ دے کہ اگر میں نے مکروہ فعل کیا تو ممکن ہے کہ کل کو فعل حرام کروں اور مکروہ سے بچنے کے لئے بعض جائز چیزیں بھی ترک کرنی پڑتی ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ جائز میں گھر گھرا کر مکروہ میں مبتلا ہو جاؤں۔ شریعت کی اصطلاح میں اسی کا نام سدِّ ذرائع ہے یعنی ذرائع اور وسائل کو ترک کر دو تاکہ ناجائز مقاصد تک پہنچنے نہ پاؤں اور پہلے ہی رُک جاؤں۔

مثلاً زناکاری ایک فعل خبیث ہے اور حرام ہے۔ اس سے بچانے کے لئے فرمایا گیا کہ اجنبی عورت پر نگاہ بھی مت ڈالو۔ اجنبی عورت سے خلوت بھی مت اختیار کرو۔ اجنبی عورت کی آواز پر کان بھی مت لگاؤ یہ ساری چیزیں سدِّ ذرائع ہیں۔ جو ان چیزوں میں پڑا تو اندیشہ ہے کہ مبتلا ہو جائے گا۔ اصل گناہ سے بچانے کے لئے شریعت نے یہاں سے روکنا شروع کیا کہ نگاہ ہی مت ڈالو' کان ہی مت لگاؤ ___ اور اگر عورت خوشبو لگائے ہوئے ہو تو اپنی ناک کو موڑ لو۔ گویا ہم خوشبو نہیں سونگھ رہے ہیں۔ کیونکہ بعض دفعہ خوشبو ذریعہ بنتی ہے خیال کے متوجہ ہونے کا۔

یہ ہے احتیاط جسے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر عورت وضو کرے اور اس کا بچا ہوا پانی لوٹے میں موجود ہے اس سے وضو مت کرو۔ دوسرا نیا پانی لو۔ اس لئے کہ اس کے بچے ہوئے پانی سے دھیان جا سکتا ہے کہ یہ فلاں عورت کا وضو ہے۔ اس خیال کو اگر متوجہ کر دیا جائے تو اندیشہ ہے کہ دل کے اندر فتنہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے شریعت نے احتیاط کی رو سے حکم دیا کہ تم اس پانی کو چھوڑ دو نیا پانی الگ لو۔ کیوں اپنے خیال کو گندہ کرتے ہو۔ خیال گندہ ہوا تو ارادہ گندہ ہو گا اور ارادہ گندہ ہو گا تو فعل ناپاک ہو جائے گا۔ اس لئے شروع اور ابتدا ہی سے بچتے ہیں۔

زنا گناہ کبیرہ ہے اور یہ جو ابتدائی وسائل ہیں ان کو صغیرہ گناہ کہتے ہیں۔ اور صغیرہ گناہوں سے اس لئے بچایا گیا ہے کہ کبیرہ تک نہ پہنچنے پائے۔ یہ احتیاط کی زندگی ہے۔ چوری کے اندر جو اصل فعل ہے اور جس کی ممانعت ہے وہ یہ ہے کہ غیر کے مال کو بلا اس کی مرضی کے اٹھالائے لیکن شریعت نے اس سے بچانے کے لئے ایک سلسلہ قائم کیا ہے کہ کسی کے گھر میں جاؤ تو اس کے سامان کو مت دیکھو ممکن ہے خیال پیدا ہو کہ آنکھ بچا کر اُٹھالوں یہ تانک جھانک پیش خیمہ ہے اور چوری تو انجام کار اور آخری فعل ہے جو اصل میں ممنوع ہے۔ اس سے بچانے کے لئے یہ لمبا سلسلہ قائم کیا ہے ___ ہاں اگر خود مالک ہی دکھلائے کہ مجھے اللہ نے یہ نعمت دی ہے تو آدمی شوق سے دیکھے اور دیکھ کر شکریہ ادا کرے اور خوشی کا اظہار کرے گویا کہ یہ جو کچھ اللہ نے آپ کو دیا ہے ہمیں ہی دیا ہے لیکن از خود تانک جھانک کرنا یا یہ غور کرنا کہ کس مکان میں ہے مال اور یہ دھیان جائے کہ اگر نقب لگاؤں تو یہاں سے مناسب رہے گا یہاں سے یہ نقب لگانے کا دھیان اور تانک جھانک کرنا اور نگاہ ڈالنا۔ صغیرہ گناہ ہیں۔ شریعت نے ان صغیرہ گناہوں سے روکا ہے تاکہ اصل گناہ جو کہ چوری ہے اس تک نہ جانے پائے۔ اسی کو کہتے ہیں سدِّ ذرائع اور وسائل پر پابندی تاکہ اصل مقصد تک نہ پہنچنے پائے۔

درجاتِ تقویٰ

یہ ہی ہے وہ سدِّ ذرائع کہ ابتدا میں جو ہلکی صورت ہے اسے بھی اختیار مت کرو تاکہ بری صورت تک نہ پہنچ سکو۔ تو شریعتِ اسلام نے ایک سلسلہ کبائر کا رکھا ہے۔ کہ یہ حرام ہے مثلاً زناکاری، چوری، بے ایمانی اور کچھ اس کے دواعی واسباب ہیں ان تک کو روکا ہے تاکہ اصل مقصد تک پہنچنے نہ پائے، اب اگر تقویٰ کے لغوی معنیٰ بھی مراد لئے جاویں۔ یعنی ڈرنے کے تو بھی اپنی جگہ درست ہیں اس لئے کہ ڈر سے معاصی چھوٹ جاتی ہیں اور اگر تقویٰ سے احتیاط کے معنیٰ لئے جاویں تو بدرجۂ اولیٰ معصیت سے حفاظت ہو جائے گی کہ بعض جائز چیزیں بھی چھوٹ جاتی ہیں۔

پھر اس کے بعد آدمی کی زندگی پاک بن جاتی ہے۔ یہ وہ زندگی ہے جو دنیا کی تمام آلائشوں اور گندگیوں سے پاک ہو جاتی ہے اور آدمی کو جہنم سے ہٹا کر جنت میں اَبدالآباد والی نعمتوں میں داخل کر دیتی ہے اور آدمی کو اللہ کا مقرّب بنا دیتی ہے۔ مگر تقویٰ کے اس درجہ کا حصول موقوف ہے بادشاہ حقیقی کے مرتبے کے معلوم ہونے پر۔

یہ محتاط زندگی والا تقویٰ تو بڑوں کا نصیب ہے۔ ہم اور آپ جیسے بہت مشکل سے اس کی طرف جا سکیں گے کہ ناجائز سے بچنے کے لئے جائز چیزوں کو بھی ترک کر دیں یہ تو بہت اونچا مقام ہے مگر ابتدائی درجہ ہر ایک کے بس کا ہے کہ اللہ سے ڈرے۔

حصولِ تقویٰ

اور ڈرنے کی صورت یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی قدرت اور اس کے اقتدار اور قبضے کو تصور میں لاتا رہے کہ وہ مالک ہے جس طرح چاہے کرے۔ جب چاہے موت دیدے جب چاہے حیات دے، جب چاہے صحت دے دے، جب چاہے بیماری مسلّط کر دے، جب چاہے امن دے دے اور جب چاہے بدامنی مسلّط کر دے۔ اسی کی یہ قدرت ہے اور اس کی اس قدرت کا جب دھیان ہوتا ہے تو ڈر پیدا ہوتا ہے کہ میں بڑے قادر کے قبضے میں ہوں معلوم نہیں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ تو آدمی حق تعالیٰ کی عظمت و جلال کا تصوّر کرتا رہے اس سے ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔

جاہل مقامِ تقویٰ سے نا آشنا ہے

اگر کوئی بالکل اَنجان اور جاہل محض ہے اسے کبھی بھی ڈر نہیں ہوگا اس لئے کہ وہ واقف ہی نہیں ہے بادشاہ کے اِقتدار سے ___ ایک دیہاتی اگر بادشاہ کے دربار میں آئے تو وہ زیادہ نہیں ڈرے گا۔ اس لئے کہ وہ واقف ہی نہیں ہے کہ بادشاہ کے اختیارات کیا ہیں اس کا اقتدار کیا ہے؟ بادشاہ کو یوں ہی سمجھے گا کہ مجھ جیسا ایک آدمی ہے۔ مگر وزیر اعظم تھرائیگا' کپکپائے گا۔ اس لئے کہ وہ بادشاہ کے اختیار واقتدار کو جانتا ہے۔ وہ آنکھ نیچی رکھے گا۔ اِدھر اُدھر بھی نہیں دیکھے گا کہ کہیں بے اَدبی نہ ہو جائے۔ میری گردن نہ ماردی جائے۔

تو جس کو علم اور پہچان ہوگی باری تعالیٰ کی بڑائی اور اقتدار کی اور اس کے جلال کی' اس کے دل کے اندر خوف پیدا ہوگا۔ اور جو جاہل ہے اس کے دل کے اندر کچھ بھی پیدا نہ ہوگا۔

کہتے ہیں کہ اکبر بادشاہ نے مشاعرہ کی مجلس کی کہ شعراء آئیں اور اپنا اپنا کلام سنائیں اور اعلان کیا کہ جس کی نظم عمدہ ہوگی اسے انعام دیا جائے گا۔ سینکڑوں شعرائے نے نظمیں اور غزلیں لکھیں اور بہت بڑا دربار ہوا۔ گاؤں کے ایک دیہاتی نے بھی ارادہ کیا کہ میں بھی کچھ تک بندی کر کے لے جاؤں تو مجھے بھی بادشاہ انعام دے گا۔ تو چودھری صاحب بھی دربار میں کچھ لکھ کر لائے۔ وزیر اعظم نے دیہاتی آدمی سمجھ کر اسے بُلایا اور پوچھا کہ تو کیا لایا ہے اسے شبہ ہوا کہ پتہ نہیں کیا اناپ شناپ لکھ کر لایا ہوگا' الٹا بادشاہ ناراض ہو کر اس کی گردن نہ مار دے۔ اس بنا پر وزیر اعظم نے دیہاتی سے کہا۔ کہ چودھری صاحب! تم نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی مجھے سنادو۔

اس نے کہا اچھا سُن لو ___ چودھری صاحب نے وہ قطعہ سنایا۔
قطعہ یہ تھا کہ ؎

سب درکھت ماں بجرگ بڑ
ہرے ہرے پتوا میں لال لال پھل

یعنی سارے درختوں میں جو بڑا درخت ہے وہ بَڑ کا درخت ہے جس کی ڈاڑھی اور چھالیں لٹکی رہتی ہیں اور اس کے سبز سبز پتے ہوتے ہیں اور سرخ سرخ پھل ہوتے ہیں۔ گویا یہ قطعہ کہا اور اس قطعہ کے آخیر میں کہا کہ ؎

اکبر بادشاہ گیدی خر

یعنی اکبر بادشاہ حرام زادہ ہے۔

یہ سُن کر وزیر اعظم تو کانپ گیا کہ اس کمبخت نے خود بھی جان کھوئی اور مجھے بھی پٹوائے گا' تو خیر وزیر اعظم نے کہا کہ :

چودھری صاحب! شعر بڑے عمدہ ہیں مگر یہ جو آخیر کا شعر ہے (اکبر بادشاہ گیدی خر) یہ نہ لکھو۔

اس نے کہا کہ اور کیا لکھوں؟

وزیر اعظم نے کہا کہ یہ لکھو کہ :

اکبر بادشاہ بحروبَر ___

یعنی اکبر' بحروبَر کا بادشاہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بڑا اونچا بادشاہ ہے۔ اس نے کہا جی اچھا کہدوں گا۔

مشاعرہ شروع ہوا۔ شعراء نے اپنی اپنی نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ اعلان ہوا کہ چودھری صاحب بھی ایک قطعہ پڑھیں گے۔

چودھری صاحب نے کھڑے ہو کر ایک قطعہ پڑھا کہ

سب درکھت ماں بجرگ بڑ
ہرے ہرے پتوا میں لال لال پھل
اکبر بادشاہ بحر وبر

اکبر نے کہا چودھری صاحب! یہ مصرع تو بہت عمدہ ہے مگر یہ جو آخیر کا مصرع ہے

اکبر بادشاہ بحروبر

یہ بہت بڑا مصرع ہے۔ اکبر سمجھ گیا کہ مصرعہ اس کا نہیں ہے۔ یہ اس کو کسی نے بتایا ہے تو چودھری نے وہیں کھڑے کھڑے وزیر اعظم کو ماں کی گالی دے کر کہا کہ اس حرام زادے نے کہا تھا کہ اس طرح کہنا ورنہ میں تو یوں لکھ کر لایا تھا

اکبر بادشاہ گیدی خر

اکبر بادشاہ نے کہا یہ بہت عمدہ ہے وہ ٹھیک نہیں تھا۔

چودھری صاحب نے کہا جی ہاں! میرا تو یہ ہی مصرعہ ہے پھر اس کو بادشاہ کی طرف سے بہت انعام واکرام ملا۔ اس نے یہ مصرعہ "اکبر بادشاہ گیدی خر" کیوں کہا تھا؟ اس لئے کہ وہ دیہاتی ہے۔ نہ اکبر کی جاہ وجلال سے واقف اور نہ اس کی عظمت واقتدار سے واقف، فقط ایک دیہات کا رہنے والا ہے۔ تو دیہاتی لوگ بیچارے بالکل سادہ ہوتے ہیں۔ ان میں چھل فریب، مکروفریب دغابازی، دھوکہ دہی کچھ نہیں ہوتی ہے۔ سادہ زندگی ہوتی ہے جو دل میں آیا بے تکلف کہہ دیا۔

قدرِ تقویٰ بقدرِ عظمت

اسی واسطے احادیث میں آیا ہے کہ حضرات صحابہؓ انتظار میں رہا کرتے تھے کہ کوئی دیہاتی آئے اور آکر سوال کرے تاکہ علوم کھلیں اور ہم سب کو اس کی بدولت تازہ علوم حاصل ہوں۔ صحابہؓ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جاہ وجلال کی عظمت غالب تھی اس لئے ہر ایک کو سوال کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ چونکہ شانِ نبوّت سے واقف تھے۔ اس لئے ان کی دل پر ہیبت تھی اور خوف تھا۔ اور دیہات والے بیچارے سادے لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی جو چاہے آکر پوچھ لیا، جو چاہے آکر کہہ دیا۔

جیسے کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ حضورؐ مال غنیمت تقسیم فرمارہے تھے ایک دیہاتی بھی آگیا اس کو دینے میں دیر لگی۔ آپؐ اوروں کو دے رہے تھے۔ اس نے کھڑے ہو کر فوراً کہا کہ :

"اے محمد! یہ مال نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے اس میں ہمارا بھی تو حق ہے"۔

آپؐ نے فرمایا کہ :

"چودھری صاحب تمہیں بھی ملے گا گھبراؤ مت"۔

یہ کہہ دینا کہ یہ مال تیرا نہیں اور نہ تیرے باپ کا ہے۔ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جسے شانِ نبوّت کا پتہ نہ ہو۔

اس لئے صحابہؓ منتظر رہا کرتے تھے کہ کوئی دیہاتی آجائے اور آ کے سوال کرے حضورؐ جواب دیں گے اور ہمارا علم بڑھے گا، جتنا جلال و عظمت دل میں پیدا ہوگی اور ڈر بڑھتا چلا جائے گا۔ اور عظمتِ خُداوندی سے جتنا جاہل ہوگا اتنا ہی آزاد ہوگا جو چاہے کر گزرے۔

تقویٰ کا اعلیٰ ترین ذریعہ

تو اس کے لئے اعلیٰ ترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم اپنے دل میں خوفِ خداوندی پیدا کریں تاکہ جرائم سے بچیں اور خوف پیدا کرنے کی یہی صورت ہے کہ ہم تصور کریں کہ اللہ مالکُ الملک ہے۔ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ موت و حیات اسی کے قبضے میں ہے۔ صحت و بیماری اسی کے ہاتھ میں ہے۔ تونگری و مفلسی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

”جو کچھ وہ کر دے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ یہ کیوں کیا ہے؟“۔

وہ بری ہے ان سب چیزوں سے تو جب یہ یقین و تصور ہوگا بندہ کو کہ وہ غنی مطلق ہے جو چاہے کرے، تو دل میں ہیبت پیدا ہوگی کہ میں ایک بندۂ ذرۂ بے مقدار ہوں اور مالکُ الملک کے سامنے ہوں۔ ایسا نہ ہو کوئی بے ادبی ہو جائے۔ تو دل میں ڈر بیٹھ جائے گا تو پہلا درجہ یہ ہے تقویٰ کا جس کے معنیٰ خوف کے ہیں کہ دل میں اللہ کا ڈر اختیار کرے تاکہ معصیت سے بچ جائے۔

فقر و غنا میں تقویٰ کی ضرورت

بہرحال خوفِ خدا جب دل میں ہوگا تو آدمی مالداری میں بھی گناہ سے بچے گا۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور کیسی پاک نصیحت ارشاد فرمائی ہے۔ حدیث قدسی ہے آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اپنے بندوں سے کہ :

> ”اے بندے! تونگری اور دولت مندی کے زمانے میں تو مجھے یاد رکھ تاکہ تیری مفلسی کے زمانے میں تجھے یاد رکھوں اور اے بندے! تو اپنی صحت کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تاکہ میں تیری بیماری کے زمانے میں تجھے یاد رکھوں“۔

اس سے معلوم ہوا کہ تونگری کی حالت میں ہو تو جب بھی خوفِ خدا ضروری ہے اور مفلسی کی حالت میں ہو تو جب بھی خوفِ خدا ضروری ہے۔ اگر تونگری میں خوفِ خدا نہیں تو ڈر ہے کہ تونگری چھن جائے اور اگر مفلسی میں خوف ہے تو ممکن ہے کہ وہ تونگر بن جائے۔ یہ اللہ کے قبضے میں ہے جسے چاہے دیتے ہیں اور جس سے چاہتے ہیں لے لیتے ہیں۔ جس کو دینا بہتر سمجھتے ہیں اس کو دے دیتے ہیں مگر دیتے ہیں اسی حد تک جس حد تک باری تعالیٰ کی حکمت و مصلحت اجازت دیتی ہے۔ معاذ اللہ یہ کوئی الللٹپ بات نہیں کہ جسے چاہیں لکھ پتی بنا دیں اور جسے چاہیں مفلس۔

تقسیمِ دولت احوالِ قلوب کے مُطابق ہے

اس نے جیسی خِلقت بنائی ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کو یہ دینا مصلحت ہے اور اس کو نہ دینا مصلحت ہے اسے تونگر بنانا حکمت ہے اور اسے مفلس بنانا مصلحت ہے۔ قلوب کی حالت کو وہی بہتر جانتا ہے جس نے

خلقت بنائی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ چار پیسے ان کے ہاتھ میں آئے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں تکبر اور غرور میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو حقیر جاننے لگتے ہیں ایسوں کو اگر دنیا کی دولت دیدی جائے تو ظلم کا کارخانہ کھل جائے اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ لاکھوں روپے آجائیں پھر بھی انسان بنے ہوئے ہیں پھر بھی ان میں وہی دینداری ہے پھر بھی ان میں وہی جذبہ ہے۔ پھر حق تعالیٰ ان کو دولت دنیا میں ترقی دیتے ہیں۔ تو باری تعالیٰ جسے دولت دیتے ہیں اسے جانتے ہیں کہ کس مصلحت کے تحت اسے دولت دی گئی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ :

کاد الفقران یکون کفرا۔

بعض دفعہ فقروفاقہ کفر کا ذریعہ بن جاتا ہے اور آدمی' اللہ کی شکایتیں کرنے لگتا ہے اور ایمان کھو بیٹھتا ہے۔ اس کو پیسے دے دیئے جائیں تاکہ ایمان محفوظ رہے اور بعض ایسے ہیں کہ چار پیسے ہاتھ میں آئے وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں انہیں مفلس رکھا جاتا ہے تاکہ وہ آپے میں رہیں۔

تو مفلس اور تونگری مِن جانبِ اللہ ہے۔ جیسی جیسی جس کی خلقت بنائی ہے اس کی مناسبت سے اسے دیتے ہیں۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔

ہم نے ہی رزق تقسیم کیا ہے ہم نے ہی معاش تقسیم کی ہے اور ہم نے ہی درجے قائم کئے ہیں بعضوں کو اونچا بنایا بعضوں کو نیچا بنایا۔ اب اونچے کا کام یہ ہے کہ وہ جھکے اور شکر کرے اور نیچے کا کام یہ ہے کہ وہ صبر کے ساتھ دعا کرے اور مانگے۔ اس سے دونوں کا فائدہ ہو گا۔ اللہ نے دونوں کے لئے راستہ رکھ دیا ہے۔ تونگر بھی نجات پائے اور مفلس بھی نجات پائے۔

باطنی دولت

حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ ہر ایک کے کچھ درجات ہیں' کچھ نعمتیں دولت مندوں کو بھی ملیں گی اور کچھ مفلسوں کو بھی ملیں گی یعنی مایوس نہ ہوں کہ ہمیں کچھ مِلا ہی نہیں بلکہ ان کے بڑھنے کی دوسری چیزیں ان کو دے دیں۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے صدقات وخیرات کے فضائل بیان فرمائے کہ صدقات دیں گے زکوٰۃ دیں گے' دین کا کام ان سے چلے گا۔ وہ بہت دین کا کام کریں گے ان کا مال آخرت کا ذریعہ بنے گا' درجات کمائیں گے' ان فضائل سے مفلسوں کا دل ٹوٹنے لگا۔ کہ بھائی یہ تونگر تو بڑے اچھے رہے کہ دنیا میں بھی انہوں نے مزے کی زندگی گزاری اور آخرت میں بھی ان کے درجات بلند ہیں اور ہم نے دنیا میں بھی مصیبت جھیلی اور آخرت میں بھی ہمارے لئے کچھ نہیں۔ یہ مالدار لوگ بڑھ گئے اور ہم رہ گئے۔ تو یہ گروہ مفلسین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ :

"یارسول اللہ! سبق المفترضون یہ مالدار تو جیت گئے ہم سے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ مالدار اپنی دولت کا حساب دیتے رہ جائیں اور تم پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل ہو"۔

انہوں نے کہا کہ بس یا رسول اللہ! ہمارے لئے کافی ہے۔ ہمیں دولت نہیں چاہئے تو بہت سی دولتیں مفلسوں کو بھی دی گئی ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ تونگروں کو ہی نعمتیں دی گئی ہیں۔ نہیں بلکہ سب کو دی گئی

ہیں۔ کسی کو یہاں دی گئی ہے کسی کو وہاں کیا گیا سب کو برابر۔ یہ مالک کی حکمت ہے کہ کسی کو یہاں بڑھا دیا مگر فیضان سب کے اوپر عام ہے' اگر کسی کی ظاہری دولت بڑھا دی تو کسی کی باطنی بڑھا دی۔ وہ اپنے رنگ میں خوش ہے یہ اپنے رنگ میں خوش اور بسا اوقات باطنی نعمت مال سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر ایمان کی دولت مضبوط ہے اور توکل کی دولت مضبوط ہے تو ہزاروں مال اس کے نیچے دب جاتے ہیں اور یہ دولت سب سے اونچی ہو جاتی ہے۔

دولتِ معرفت کا تفوّق

ایک بزرگ کسی شہر میں پہنچے۔ بڑا شہر تھا اور قلعہ بند تھا۔ دیکھا کہ سارے دروازے بند ہیں۔ اور ہزاروں مال گاڑیاں ادھر رُکی ہوئی کھڑی ہیں' اور ہزاروں مال گاڑیاں اندر رُکی ہوئی کھڑی ہیں۔ دن کا وقت ہے اور شہر میں بالکل آمد و رفت نہیں ہے۔ انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ اتنا بڑا تجارتی شہر ہے کروڑوں کا بیوپار ہے اس میں اور دروازے بند ہیں۔

انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ بھائی شہر کے دروازے کیوں بند ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ صاحب! بادشاہ کا باز گم ہو گیا ہے (باز ایک شکاری پرندہ ہوتا ہے) اس لئے بادشاہ نے کہا ہے کہ شہر کے دروازے بند کر دو کہیں باہر نہ جا سکے اور پھر ڈھونڈتے پھریں۔

بزرگ بڑی حیرت میں رہ گئے کہ بادشاہ بے وقوف ہے کہ ایک پرندہ کے لئے دروازے بند ہیں۔ بھلا وہ اُڑ کر نہیں جا سکتا چھتوں کے اوپر سے؟ دل ہی دل میں کہا کہ بڑا بیوقوف ہے بادشاہ اور اللہ میاں سے عرض کیا کہ :

> ''خدایا تیری قدرت! کہ کُندہ ناتراش کو تو نے بنا دیا بادشاہ' جسے اتنی بھی عقل نہیں کہ جانور کو روکنے کے لئے جال ڈالنے کی ضرورت ہے یا شہر پناہ کے دروازے بند کرنے کی۔ اسے تو نے ملک دے دیا اور ہم جیسا فاضل جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہے۔ جس کے اندر علم بھی ہے' معرفت بھی اور کمالات بھی بھرے ہوئے ہیں ہمیں کوئی پوچھنے والا بھی نہیں' ایک وقت کھا لیا اور ایک وقت فاقہ ہے۔
>
> تو جس میں یہ دولت موجود ہے وہ جوتیاں چٹخاتا پھرے اور جو ایسے احمق اور کُندہ ناتراش ہیں وہ تختِ سلطنت پر بیٹھ جاویں۔ آپ کی عجیب قدرت ہے''۔

یہ گویا ایک سوال اور خلجان اللہ کے سامنے پیش کیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ اچھا کیا۔ تم اس پر راضی ہو کہ تمہارا علم' تمہاری معرفت' تمہارا ایمان چھین کر اس بادشاہ کو دے دیں اور اس کی ساری سلطنت تمہیں دیدیں۔ تیار ہو؟ انہوں نے کہا نہیں اس پر تیار نہیں ہوں۔ معلوم ہوا کہ ایمان کی قوت زیادہ تھی اور توکّل کی قوت زیادہ تھی دولت سے ورنہ راضی ہو جاتے کہ میں نے علم بھی دیا ایمان بھی دیا۔ لائیے مجھے تخت سلطنت دیجئے نہیں بلکہ تخت سلطنت پر لات مار دی اور ایمان و علم اور معرفت نہیں چھوڑی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بڑی دولت ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو دونوں دولتیں دے دے کہ مال کی دولت بھی ہو اور ایمان کی قوت بھی ہو اور اللہ پر بھروسہ بھی ہو تو اس کے پاس اللہ نے دین و دنیا دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے جسے چاہے دے دے۔ تو بہر حال دولت دنیا بھی ایک نعمت ہے اور دولت دین اس سے بڑھ کر نعمت ہے اگر جمع ہو جاویں تو سب نعمتوں سے بڑھ کر نعمت ہے۔

صبر و شکر کے ذریعے ترقی درجات

دونوں کے بچاؤ کی صورت یہ ہے کہ مالداری کے اندر آدمی غرور میں نہ پڑے اور ہر وقت شکر گزار رہے اپنے پروردگار کا اس لئے کہ جو کچھ اسے ملا ہے وہ اس کا حق نہیں تھا بلکہ محض عطاء خداوندی ہے۔ اللہ کے اوپر کسی کا حق نہیں۔ جب فضل سے ملے تو شکر واجب ہوتا ہے لہٰذا ملنے پر شکر ادا کرے اور جس کو مفلسی دی ہے وہ عدل سے دی۔ گویا حکمت و انصاف کا یہی تقاضا تھا کہ اس کو اس حالت میں رکھا جائے تاکہ وہ صبر کرے کیونکہ دونوں ہی راستے جنت کی طرف لے جاتے ہیں۔ صبر اپنے راستے سے جنت میں پہنچائے گا اور شکر اپنے راستے سے جنت کی طرف لے جائے گا' ہیں دونوں کامیاب اور ناجی۔ اور محبوبِ خداوندی شاکر بھی ہے اور صابر بھی ــــ علماء میں ایک عالم گذرے ہیں فنِ نحو کے بہت بڑے امام جن کا نام ہے اکشم اور انتہائی درجہ بدصورت تھے۔ جتنی بدصورتی کی علامتیں ہیں وہ سب ان میں جمع تھیں۔ رنگ بے حد کالا۔ دانت بہت چوڑے چوڑے۔ آنکھیں نہایت چھوٹی اور کرنجی اور آنکھوں میں چیپڑے لگے ہوئے' دانتوں میں زردی لگی ہوئی غرض جتنی بدصورتی کی علامتیں ہو سکتی ہیں ساری ان میں جمع تھیں اور علم و ہنر کا یہ عالم کہ بہت اونچا اور بہت بلند' ان کی شادی ایک ایسی عورت سے ہوئی کہ دُور دُور تک اس کی نظیر نہیں تھی' جب خاوند اور بیوی آمنے سامنے بیٹھتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے دھوپ چھاؤں' کہ ایک طرف دھوپ نکل رہی ہے اور ایک طرف سایہ ہے اور ایک طرف نور اور ایک طرف ظلمت۔

تو آمنے سامنے بیٹھ کر بیوی سے کہتے ہیں کہ میں بھی قطعی جنتی ہوں اور تو بھی قطعی جنتی۔ بیوی کہتی کہ کیا بات ہے۔ فرماتے کہ میں تو اس لئے جنتی کہ تجھ جیسی مجھے بیوی ملی میں رات دن شکر ادا کرتا ہوں اس شکر کے راستے سے جنت میں پہنچوں گا اور تو اس لئے جنتی کہ مجھ جیسا بدصورت خاوند تجھے ملا' تو رات دن صبر کوتی ہے کہ کس بلا میں گرفتا ہو گئی ــــ اس لئے تو صبر کے راستے سے جنت میں پہنچے گی۔ تو میں بھی اور تو بھی جنتی۔

اس بنا پر دولت مند کے لئے اللہ نے شکر کا راستہ رکھا ہے اور وعدہ ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ

"جتنا تم شکر کرو گے اتنا ہی میں اس نعمت کو بڑھاتا چلا جاؤں گا"۔

یہ صاحب دولت کے لئے ترقی درجات کا ذریعہ ہے۔

غریب اور مفلس کو حکم ہے کہ تو کسی دولت مند کی دولت پر نگاہ مت کر' صرف میرے اوپر نگاہ رکھ اور صبر اختیار کر میں نے کتنی دولت تیرے لئے جمع کر رکھی ہے۔ تجھے معلوم نہیں ہے' گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ عنقریب ملنے والی ہے۔ حدیث صحیح میں موجود ہے کہ اگر کوئی شخص دعا مانگتا ہے کہ اے اللہ مجھے رزق دے دے' مجھے دولت دے دے' فاقے گزر رہے ہیں اور حال یہ ہے کہ دعا پوری نہیں ہوتی۔ مہینے گزر گئے' برس گزر گئے' حتیٰ کہ عمر گزر گئی۔ اب اس نے کہا کہ کچھ بھی میری قسمت میں نہیں ہے۔ مانگتے مانگتے تھک گیا۔ نہیں ملا۔ قیامت میں جب میدان محشر میں پہنچے گا تو دیکھے گا کہ اجر و ثواب کے ڈھیر کے ڈھیر بھرے ہوئے ہیں۔ ہزاروں' لاکھوں کو وہ نعمتیں نہیں ملیں جو اس کے لئے جمع ہیں۔

عرض کرے گا کہ اے اللہ یہ نعمتیں کہاں سے آئی ہیں۔ میں نے تو کوئی عمل نہیں کیا؟

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیا تو دعائیں نہیں مانگا کرتا تھا؟ اس دعا کو ہم نے پالا پرورش کیا' بڑھایا۔ یہ تیری ان دعاؤں کے ثمرات ہیں۔ وہاں دنیا میں اگر دیدیتے تو تو آپے سے باہر ہو جاتا۔ اس لئے ہم نے تیری دعا کو

ذخیرہ کیا۔ اب تو ابدی طور پر عیش و آرام کر تیرے لئے انتہائی درجات ہیں۔ تو غریب کے لئے موقعہ مایوسی کا نہیں اور امیر کے لئے موقعہ کفرانِ نعمت کا نہیں۔ اس پر شکر واجب ہے' اس پر صبر واجب ہے اور دونوں کے اوپر اعتماد علی اللہ واجب ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے تو میرا کوئی حق نہیں محض اپنے فضل و کرم سے دیا ہے اور اسے اگر نہیں دیا تو کوئی ظلم نہیں ہے وہ عدل ہے جس کہ وجہ سے نہیں دیا ہے۔ دونوں انشاء اللہ کامیاب ہیں ___ باقی جسے بھی جو ملتا ہے وہ ملتا ہے فضلِ خداوندی سے کسی کا کوئی حق اللہ کے اوپر نہیں کہ وہ مجبور کرے بھلا اللہ پر کس کا جبر چل سکتا ہے۔؟

بہر حال تقویٰ اور اس کی فضیلت کے سلسلہ میں یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین!

دعا کیجئے اللہ تعالیٰ اعمالِ صالحہ کی توفیق عطا فرمائے۔ خاتمہ بالخیر فرمائے۔ اور اپنے نیک بندوں میں شامل فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین ۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

طریقِ اصلاح

اگر آپ اپنے اخلاق کو درست کرنا چاہیں تو راستہ بند نہیں ہے۔ ہاں اپنے اخلاق کی آپ ہی اصلاح نہ چاہیں تو پیغمبر کے زمانے میں لوگ موجود ہوتے ہیں۔ اپنی اصلاح نہیں کرتے جب کرنا چاہیں تو اللہ کے رسول نے راستے بتلادیئے کر سکتے ہیں۔ نہ چاہیں تو خود پیغمبر بھی نصیحت کرے' آدمی درست نہیں ہو سکتا' جنہیں اپنی اصلاح منظور تھی' اللہ کے رسول کے قول پر عمل کیا۔ کوئی صدیقؓ بنا' کوئی فاروقؓ بنا' کوئی ذوالنورینؓ بنا' کوئی علی مرتضیٰؓ بنا۔

اور جنہیں اصلاح مقصود نہیں تھی۔ کوئی ابوجہل بن گیا' کوئی ابولہب بن گیا' کوئی مسیلمہ کذّاب بن گیا' غرض بگڑے ہی رہے اور نبیٔ وقت سے بھی ان کے اصلاح نہ ہو سکی اس لئے کہ انہیں خود اپنی اصلاح منظور نہیں تھیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ

بعداز خطبہ مسنونہ ــــــــــ امابعد ــــــــــ

دنیا کی ایک عام حالت (تمہید)

بزرگانِ محترم!

اس دنیا کی بناوٹ اور ساخت پر ہم غور کریں۔ تو اس سے یہ اندازہ و مشاہدہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں دو سلسلے جاری ہیں۔ ایک خیر اور بھلائی کا' ایک شر اور بُرائی کا۔ ہر چیز میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کی ذوات کو چھوڑ کر کہ وہ خیر محض ہیں۔ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں۔ ان میں کچھ بھلائی پائی جاتی ہے اور کچھ بُرائی۔ نہ کوئی خیرِ محض ہے نہ شرِ محض ــــ ہر چیز میں سے ایک راستہ شر کا اور ایک بھلائی کا نکلتا ہے۔ روٹی جیسی نعمت جو ہم روز کھاتے ہیں' وہ جس طرح زندگی بناتی اور طاقت دیتی ہے۔ ذرا بے اعتدالی ہو جائے' وہی موت کا سبب بنتی ہے۔ یہی پانی' جس کے بارے میں فرمایا گیا' وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ

ہر چیز کو ہم نے پانی سے زندگی دی۔ یہی پانی اگر زیادہ پیا جائے تو تخمہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ یہی ہوا حیات کا سبب ہے۔ اگر یہی زیادہ پہنچ جائے' سانس اکھڑ جاتی ہے۔ فنا کا سبب بن جاتی ہے اسی طرح سے زمین فرش بھی ہے اور قبر بھی بن جاتی ہے۔ موت کا بھی ذریعہ ہے' حیات کا بھی ___ تو ہر چیز میں خیر بھی ہے اور رُشد بھی۔

انسان کو دیکھا جائے تو جہاں اس سے بھلائیاں پہنچتی ہیں کہ جتنی بھلائیاں یہ کرتا ہے اتنی کوئی نہیں کر سکتا۔ یہی جب شریر آتا ہے تو اس سے اتنی شر پہنچتی ہے کہ شیطان بھی اتنی نہیں پہنچا سکتا' جتنی راحتیں اس سے پہنچتی ہیں' اتنی ایذائیں بھی پہنچتی ہیں۔ تو انسانوں میں کھانے میں' پہننے میں اور استعمال کی ہر چیز میں کچھ بھلائی ہے اور کچھ برائی۔

لیکن جہاں تک ہم غور کرتے ہیں تو اندازہ یہ ہوتا ہے کہ برائی تو ہر شئی کی ذات میں رکھی ہوئی ہے اور بھلائی باہر سے لاکر اس کے اندر داخل کی جاتی ہے۔ ذات میں کوئی بھلائی موجود نہیں۔ جدّوجہد اور محنت کرتے ہیں تو کچھ خوبی آجاتی ہے۔ اگر محنت نہ کریں تو خرابی لانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خود بخود اندر موجود ہے۔

فرض کیجئے کھانا ہے تو اس کی عمدگی یہ ہے کہ خوش ذائقہ' خوش رنگ اور خوشبودار ہو۔ ان صفات کو قائم رکھنے کے لئے آپ کو محنت کرنی پڑتی ہے کہیں آپ نعمت خانہ بنائیں گے' کہیں بہترین الماری بنوائیں گے۔ جس کی جگہ بھی ٹھنڈی ہو' ہوا بھی پہنچتی رہے ؛ تاکہ کھانا خراب نہ ہو۔ تو کھانے کی خوبیوں کو برقرار رکھنے کے لئے محنت کی ضرورت ہے لیکن اگر آپ کھانے کو سڑانا چاہیں کہ اس میں بد بو آنے لگے' خراب ہو جائے تو کسی محنت کی ضرورت نہیں۔ اپنی محنت چھوڑ دیجئے' دو دن کے بعد سڑ جائے گا۔ بدبو آنے لگے گی' رنگ بھی بگڑ جائے گا ___ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ برائی اس کھانے کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ آپ نے اپنی محنت سے اسے دبا دیا تھا۔ جب محنت ختم ہوئی وہ اندر کی برائی خود بخود سامنے آگئی۔

یا مثلاً ایک بہت عمدہ باغ ہے تو اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ سرسبز ہو' ہرا بھرا ہو' شاداب ہو' درخت لہلہا رہے ہوں' سبزہ چھایا ہوا ہو' ان خوبیوں کو دیکھ کر آپ مال بھی خرچ کریں گے' ملازم بھی رکھیں گے۔ جو پانی بھی دے اور درختوں کی نگرانی بھی کرے تب جا کے باغ کی یہ خوبی برقرار رہے گی ___ لیکن اگر آپ باغ کو اُجاڑنا چاہیں کہ وہ خشک ہو جائے اور جلانے کے قابل ہو جائے۔ تو نہ مالی اور تنخواہ دار ملازم رکھنے کی ضرورت' محنت بند کر دیجئے۔ دس دن کے بعد وہ خراب' خشک ہو کر پتے جھڑیں گے' شاخیں ٹوٹیں گی۔ جلانے کے قابل ہو جائے گا ___ معلوم ہوا کہ خرابی اس باغ کی ذات میں چھپی ہوئی تھی۔ تم نے اپنی محنت سے اسے دبا دیا تھا۔ جب محنت ختم کر دی۔ خرابی خود بخود اندر سے ابھر آئی۔ خرابی پیدا کرنے کے لئے محنت اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اسی طرح مکان ہے۔ کئی لاکھ روپے لگا کر آپ نے بلڈنگ بنوائی۔ اس کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے ملازم رکھنے پڑتے ہیں۔ تب مکان خوشنما اور بہتر طریق پر باقی رہے گا۔ لیکن اگر آپ مکان کو اُجاڑنا یا ویرانہ بنانا چاہیں' اس کے لئے ملازم رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ایک دن کے لئے جھاڑو دینا چھوڑ دیجئے۔ پہلے گرد جمے گا' پھر پلاستر گرے گا' پھر اینٹیں گریں گی۔ چند دن کے بعد مکان کھنڈر بن جائے گا' تو کھنڈر بنانے کے لئے محنت کی ضرورت نہیں۔ عمدہ بنانے کے لئے محنت کی ضرورت ہے ___ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمدگی کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ خرابی خود بخود بلا محنت اندر سے اُبھر آتی ہے۔ یہ دنیا کی عام حالت ہے۔

بُرائی انسان کی ذات میں موجود ہے

اسی پر اپنے آپ کو قیاس کیجئے۔ انسان بھی بہرحال دنیا ہی کی ایک چیز ہے۔ انسان کو قابل بنانے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کسی کو عالم بنائیں گے تو کسی مدرسہ میں بھیجنا پڑے گا' گھر پڑھائیں گے تو ایک عالم کو رکھنا پڑے گا۔ تنخواہ اسے الگ دیں گے خوشامد الگ کریں گے۔ بچے کی ڈانٹ ڈپٹ الگ ہو گی کہ محنت کرے' تعلیم پائے۔ تب جا کر وہ عالم بنے گا ___ لیکن جاہل بنانے کے لئے نہ آج تک کوئی مدرسہ کھلا نہ کسی معلم کو رکھا گیا کہ آپ ہمارے بچے کو جاہل بنا دیجئے۔ جاہل خود ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ علم کو لانے کے لئے معلم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جہالت ذات میں موجود ہے۔ علم لا کر اسے چھپا دیا جاتا ہے۔ جس کے لئے محنت اٹھانی پڑتی ہے۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے اور خوب کہا ہے کہ ؎

قرنہا باید تایک سنگِ خاراز آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

سالہا سال کی مدت چاہئے کہ سنگ خارا کا ایک پتھر آفتاب کی گرمی سہتے سہتے تپش اور جلن لیتے لیتے صدیوں میں جا کر لعل بدخشاں اور یاقوت بنے گا۔ جس کی قیمت اٹھے گی۔ تو یاقوت بننے کے لئے پتھر کو ضرورت پڑی کہ آفتاب کی گرمی کو سہے۔ اس کی تپش کو جذب کرے۔ تب جا کر لعل بنے گا ___ لیکن پتھر بنانے کے لئے وہ تو پہلے ہی سے بنا بنایا پتھر ہے۔ لعل بنانے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ بے قیمت پتھر بنانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں۔ تو شاعر نے خوب کہا کہ سینکڑوں برس ایک پتھر آفتاب کی کرنوں کو جذب کرے۔ تب جا کے لعل بدخشانی بنتا ہے اور شاعر کہتا ہے کہ ؎

ماہ ہا باید کہ یک پنبہ دانہ بعد کشت
جامہ گردد شاہدے را یا شہیدے را کفن

مہینوں کی مدت چاہئے کہ بنولہ کا ایک دانہ' اسے زمین میں ڈالو' مہینوں وہ مٹی میں دبے' اپنی ہستی کو ختم کرے' اس میں سے کونپل نکلے' درخت بنے' اس میں روئی لگے' پھر روئی کو صاف کیا جائے۔ پھر دھنا جائے' پھر کپڑا بننے والے کے ہاں بھیجا جائے کہ اس کے تار بنائے اور مشینوں پر لگائے' کپڑا بنے' تب جا کے کپڑا کسی محبوب کا لباس بنے گا یا کسی شہید کا کفن بنے گا۔ لیکن اگر یہ روئی کا دانہ محنت نہ اٹھائے۔ نہ اسے کپڑا بننا نصیب ہو گا' نہ جامہ محبوب بننا نصیب ہو گا۔ وہ محض ایک بنولہ کا دانہ ہے جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ تو بنولہ کے دانے میں یہ کمال آجانا کہ اس میں سے نکلی ہوئی چیز محبوبوں کے سر پر جائے' جب ہوتا ہے جب بنولہ کا دانہ محنت اٹھائے مٹی میں مل کر اپنی ہستی کو فنا کرے' اور کاشت کار کی محنتوں کو سہے۔ جب جا کے اس رتبے پر پہنچتا ہے۔ کمال پیدا کرنے کے لئے محنت کی ضرورت پڑی اور بے کمالی پیدا کرنے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں۔ دانہ پڑا پڑا خود ہی خراب ہو جائے گا اور خوب کہا ہے، اسی شاعر نے کہ ؎

سالہا باید تایک کود کہ از درسِ علم
عالمے گردد نکو' یا شاعرِ شیریں سخن

سالہا سال کی مدت چاہئے کہ آدمی کا ایک نادان بچہ میاں جی کی مصیبتیں سہے۔ مکتب میں جائے' نو برس تک مصیبتیں اٹھا کر کورس کو حاصل کرے۔ تب جا کے عالم یا شاعر شیریں سخن بنے گا۔ لیکن اگر یہ محنت نہ

اٹھائی جائے۔ تو جاہل رکھنے کے لئے کسی محنت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ بے محنت چھوڑ دو' جاہل بنا بنایا ہے تو جاہل بنانے کے لئے آج تک کوئی مدرسہ قائم نہیں ہوا۔ کوئی کہے کہ بھئی ہمارے بچے کو جاہل بنادو۔ وہ کہے گا کہ جاہل تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ بنوانا چاہتے ہو تو عالم بنادوں گا بشرطیکہ یہ بھی محنت کرے اور میں بھی محنت کروں۔ تو خوبی محنت سے لائی جاتی ہے۔ خرابی کے لئے محنت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ خرابی ہر چیز کی ذات میں موجود ہے۔

با اخلاق بنانے کے لئے مرّبیوں کو محنت کرنی پڑے گی۔ مرّبیانِ دین کے سپرد کرنا پڑے گا' شیوخِ طریقت محنت کریں گے' اپنے مرید سے محنتیں کروائیں گے۔ جب جاکے برسہا برس میں اس کے اخلاق درست ہوں گے۔ تو خانقاہ اس لئے بنائی جاتی ہے کہ اخلاق کو درست کریں' کیریکٹر کی اصلاح کریں۔ انسان کو اعلیٰ انسان بنائیں۔ آج تک کوئی خانقاہ اس لئے قائم نہیں ہوئی کہ کسی بچے کو بد اخلاق بنادیا جائے۔ بد اخلاق بنتا نہیں۔ آپ ذرا محنت کر کے اخلاق کو خراب کر دیجئے۔ یہ کہے گا ارے احمق! یہ تو ماں کے پیٹ سے ہی بد اخلاق پیدا ہوا ہے۔ محنت خوبی کے لئے کی جاتی ہے' خرابی کے لئے نہیں کی جاتی۔

تو انسان کے اندر دو ہی بڑے بڑے کمال ہیں۔ ایک علم اور ایک اخلاق۔ جس سے عمل درست ہوتے ہیں۔ یہ دونوں کمال محنت سے لائے جاتے ہیں اور محنت نہ کی جائے تو علم کی جگہ جہالت ہے' وہ بھی پہلے سے موجود اور حسن اخلاق کی جگہ بد اخلاقی' وہ بھی پہلے سے موجود۔ قرآن کریم میں علم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا:

وَاللّٰهُ اَخرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ اُمَّهٰتِكُمْ لَاتعلمُونَ شيئا وَجعل لكم السمع وَالْاَبصار والافئدة لعلّكم تشكرُونَ ۝ (نحل پ۱۴ آیت ۷۸)

اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا۔ اس حالت میں کہ تم جاہلِ مطلق تھے۔ ذرہ برابر تمہارے اندر علم نہیں تھا۔ انسان کا بچہ ایک مُضغۂ گوشت پیدا ہوتا ہے۔ نہ اسے اچھے بُرے کی تمیز' نہ سیاہ کو جانتا ہے نہ سفید کو۔ حق تعالیٰ اس کے اندر سمجھنے' دیکھنے اور سننے کا مادہ رکھتے ہیں۔ تب سن سن کر' دیکھ دیکھ کر' سوچ سوچ کر برسہا برس میں جاکے وہ عالم بنتا ہے' محنت کرتا ہے تو عالم بن جاتا ہے۔ مگر خلقی طور پر جہالت لے کر پیدا ہوتا ہے تو علم انسان کی ذات میں نہیں ہے۔ انسان کی ذات میں جہالت ہے۔

اخلاق کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا' حضرت یوسف علیہ السلام خود فرماتے ہیں کہ **وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِىْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ** میں اپنے نفس کی برئت نہیں کرتا۔ نفس جب حکم دے گا' بُرائی کا حکم دے گا۔ اس میں شرہی شر چھپا ہوا ہے۔ تو خیر لائی جاتی ہے شر پہلے سے موجود ہے۔ اخلاق میں بھی بدی پہلے سے موجود' نیکی محنت سے لائی جائے گی۔ علم میں بھی جہالت پہلے سے موجود' علم محنت کر کے لایا جائے گا۔ دو ہی کمالوں سے آدمی آدمی بنتا ہے' علم سے اور اخلاق سے اور وہ دونوں اس کی ذات میں موجود نہیں ہیں۔ اس کی ذات کے اندر بد اخلاقی اور جہالت ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان کی پیدائش کے جتنے مادے ہیں۔ وہ سب گندے اور نجس ہیں۔ ان سے علم پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ ان سے نیک اخلاقی بن ہی نہیں سکتی۔ ان کے ساتھ جہالت اور بد اخلاقی ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ ___ قرآن کریم نے ذکر کیا:

خلق الْانسانَ مِن نطفة فَاِذا هُوَ خصيمٌ مُّبِيْنٌ ہم نے انسان کو ایک گندے قطرے سے پیدا کیا۔ اس گندے قطرے میں کوئی خوبی' شعور' بھلائی اور دانش مندی نہیں' بلکہ ناپاک قطرہ ہے۔ بدن سے نکل آئے تو غسل واجب' کپڑے کو لگ جائے تو اس کا دھونا واجب' مسجد میں آنا جائز نہیں' قرآن پڑھنا جائز

نہیں۔ اس درجہ گویا ناپاک اور نجس چیز ہے کہ عبادت سے آدمی جاتا رہتا ہے۔ مسجد میں آنے سے روک دیا جاتا ہے۔ اس سے تو انسان کی پیدائش واقع ہوئی۔

بعض ائمہ کا اس بارے میں مذہب یہ ہے کہ وہ قطرہ پاک ہے۔ جیسا کہ امام شافعیؒ کہتے ہیں۔ عام ائمہ کہتے ہیں کہ انسان کا مادہ ناپاک ہے۔ مگر بعض اس کے قائل ہیں کہ وہ پاک ہے وہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاءُ اللہ کا مادہ ہے۔ تو اس کو نجس کیسے کہہ دیں ___ ؟ تو کچھ نہ کچھ اختلاف ہو گیا۔

لیکن ماں کے پیٹ میں جا کر آگے کیا ہوتا ہے۔ چالیس دن کے بعد خون بنتا ہے۔ خون کے پاک ہونے کا کوئی قائل نہیں۔ گویا ناپاکی ہی کی طرف بڑھا ___ اب تک اختلاف تو تھا کہ کوئی پاک کہتا تھا' کوئی ناپاک' لیکن حدیث میں ہے کہ وہی نطفہ چالیس دن کے بعد خون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خون بالاتفاق ناپاک ہے۔ اس کی پاکی کا کوئی قائل نہیں۔ تو گویا دوسرا مادہ انسان کی پیدائش کا ایسا گندہ ہے کہ سب ہی اس کی گندگی کے قائل ہیں ___ چالیس دن کے بعد یہ خون کی بوند ایک لوتھڑا بن جاتا ہے۔ اس میں بھی کوئی خوبی نہیں' کوئی نورانیت اور چاندنا نہیں۔ اس کے چالیس دن بعد ماں کے پیٹ میں اس میں ہڈیاں پیدا کی جاتی ہیں اور ان پر گوشت ڈالا جاتا ہے' کھال بن جاتی ہے' ایک شکل بنا دی جاتی ہے اس میں بھی کوئی خوبی نہیں ہے۔ غرض ابتدا سے لے کر انتہا تک گندے یا خراب قسم کے مادے ہیں۔ جس کو قرآن کریم نے ایک موقع پر ذکر فرمایا کہ :

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۝ (مومنون پ۱۸ آیت)

"ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا"۔

ظاہر بات ہے کہ مٹی میں نہ شعور و عقل نہ تمیز و امتیاز نہ علو شرف' ہر وقت پامال ہے' جوتیوں میں روندی جاتی ہے۔ یہ انسان کی پیدائش کا مادہ ہے۔ مٹی کے خلاصے سے پھر گندہ قطرہ بنا' وہ نجس' اس گندے قطرے سے خون بنا' وہ نجس ___ اور فرمایا :

ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ۝ (مومنون پ۱۸ آیت ۱۲ تا ۱۴)

یہاں حق تعالیٰ نے دور بتلائے ہیں کہ پہلے انسان مٹی تھا۔ مٹی سے گندہ قطرہ' پھر مُضغہ گوشت بنا' پھر ہڈیاں آئیں' پھر کھال پہنائی گئی۔ تب جا کے کہیں اس میں جان پڑی۔ اتنے ادوار میں جتنے مادے آئے۔ وہ سب گندے اور ناپاک۔ ان میں کوئی خوبی نہیں۔ اس سے انسان کی پیدائش عمل میں آئی۔ جس مکان میں پیدائش ہوئی وہ بھی گندا۔ ماں کے پیٹ میں کوئی چاندنا تھوڑا ہی ہے۔ نہ ظاہری روشنی نہ باطنی روشنی۔ قرآن کریم نے ایک موقع پر فرمایا :

یَخْلُقُكُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ (زمر پ۲۳ آیت ۶)

ہم نے تمہیں ماں کے پیٹ میں تین اندھیری کوٹھڑیوں کے اندر پیدا کیا۔ ان میں ظلمت کے سوا نورانیت کا نشان نہیں ___ تو پہلے ماں کا پیٹ ہے۔ اس میں کون سا چاندنا ہے' پھر اس میں رحم مادر ہے۔ اندھیری کوٹھڑی میں ایک اور اندھیری کوٹھڑی۔ اس میں اور زیادہ ظلمت۔ پھر اس میں ایک اور اندھیری کوٹھڑی ہے۔ وہ جھلی جس میں بچہ لپٹا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ دایا اسے کاٹ کر بچے کو نکالتی ہے۔ گویا تین ظلمتوں میں انسان کو پیدا کیا گیا تو پیدائش کے مادے وہ بھی گندے' مکان پیدائش کے وہ بھی گندے۔ اتنے گندے مادوں میں سے

علم کیسے پیدا ہو سکتا تھا؟ اخلاق کیسے پیدا ہو سکتے تھے؟ نجاستوں میں سے خوبی نہیں نکلتی۔ جب انسان کی پیدائش ہی ایسے مادوں سے ہے، اس میں خوبی کہاں سے آتی۔

اِنسان میں کمال منجانبِ اللہ ہے

لیکن آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ دنیا میں جتنی خوبیاں ظاہر ہوئی ہیں۔ وہ انسان ہی سے ظاہر ہوئی ہیں۔ انسان میں اولیاء، علماء پیدا ہوئے، انبیاء و حکماء پیدا ہوئے۔ دنیا کو بھی انسان نے سجایا اور آخرت کو بھی انسان نے بنایا۔ تو خوبیاں بھی انسان میں ہیں ___ پھر اگر یہ ایسا گندہ تھا تو یہ خوبیاں کیوں اس کے اندر ظاہر ہو گئیں؟

اس کا جواب بھی سن لیجئے۔ وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جہاں انسان کی پیدائش کے مادے ذکر کئے۔ وہاں ان گندی چیزوں کا ذکر کیا۔ لیکن ان گندی چیزوں میں سے نہ کوئی علم نکلتا ہے نہ کمال۔ علم کا تعلق اس کی روح، حقیقت اور روحانیت سے ہے۔ روح کا جب ذکر کیا، اسے اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا فرمایا:

وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (ص پ۲۳ آیت ۷۲)

”میں نے انسان کے اندر اپنی روح ڈال دی“۔

فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا ___ تو جہاں کمال کا ذکر آیا۔ اسے اپنی طرف منسوب کیا کہ ان کے اندر کمال میرا ہے۔ جہاں گندگی اور گندے مادوں کا ذکر آیا۔ وہاں انسان کی طرف نسبت کی خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ طِيْنٍ انسان کو ہم نے مٹی سے بنایا۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ انسان کو سڑے ہوئے گارے سے بنایا تو جہاں انسان اور اس کے مادوں کا ذکر ہے۔ وہاں انسان کی طرف نسبت کی گئی۔ جہاں روح کا ذکر آیا۔ وہاں کہا کہ میں نے اپنی روح انسان میں ڈال دی۔

معلوم ہوا کہ کمالات جتنے آتے ہیں، وہ خدا کی طرف سے آتے ہیں۔ عیب جتنے ہیں وہ انسان کی ذات میں پہلے سے موجود ہیں۔ اس واسطے اسے کمال پیدا کرنے کے لئے اللہ کی طرف جھکنا پڑے گا۔ وہیں سے کمال ملے گا۔ اس کی ذات میں کچھ نہیں ہے۔ علم اور اخلاق کے لئے محنت کرنی پڑے گی اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ کیونکہ علم و کمالات اور اخلاق کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے۔

لیکن کتنا ہی علم آجائے، ذات تو انسان کی ذات ہی رہے گی۔ ذات میں وہی کوراپن وہی گندگی ___ یہی وجہ ہے کہ علم آجانے کے بعد جتنا علم بڑھتا رہتا ہے، اتنے ہی اہل علم تواضع سے جھکتے رہتے ہیں، سر نیچا رکھتے ہیں، غرور نہیں کرتے۔ اس لئے کہ یہ جانتے ہیں کہ علم ہمارا کمال نہیں ہے۔ غرور آدمی کرے تو اپنی چیز پر کرے۔ دوسرے کی چیز پر آدمی کیا غُرور کرے۔ جو آ بھی سکتی ہے، چھینی بھی جا سکتی ہے۔ یہ ہماری چیز نہیں ہے۔

آپ اپنے خزانے پر کسی خزانچی کو بٹھلا دیں اور خزانچی آپ کے امر سے دوسروں کو دیتا رہے تو خزانچی کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا ہوگا کہ میں اس خزانہ کا مالک ہوں اور میں دے رہا ہوں؟ وہ جانتا ہے کہ خزانے کا مالک دوسرا ہے۔ اس کی اجازت سے میں خرچ کر رہا ہوں۔ میں تو امین ہوں اور میں تو محض منتقل کر دینے کا ذمہ دار ہوں، مالک نہیں ہوں تو خزانچی کے دل میں کبھی غرور پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ خزانہ میرا نہیں ہے۔

اسی طرح سے انسان کتنا ہی عالم و فاضل بن جائے۔ مگر جب وہ یہ دیکھے گا کہ میری ذات میں سے یہ علم

نہیں آیا۔ یہ تو باہر سے آیا ہے۔ یہ عمدہ اخلاق میرے نہیں ہیں۔ میرے مادے تو گندے اور بُرے تھے۔ یہ کہیں اور سے آئے ہیں۔ اس لئے دانش مند آدمی کبھی شیخی نہیں کرے گا۔ کبھی اِترائے گا نہیں۔ اصلیت کو سمجھے گا اور یوں کہے گا کہ میں ان کمالات پر شکر تو کر سکتا ہوں۔ لیکن فخر نہیں کر سکتا۔ فخر اپنی چیز پر ہوتا ہے۔ یہ چیز میری ہے ہی نہیں۔ جتنے بڑے لوگ' علماء' اولیاء اور حکماء گزرے ہیں جتنا اونچے بنتے گئے' اتنا ہی سر جھکاتے گئے ہیں کہ ہم کوئی چیز نہیں' ہم ہیچ در ہیچ ہیں' ہم میں کوئی خوبی نہیں۔ اس لئے کہ ان پر اصلیت منکشف ہوتی ہے۔

اہل کمال میں تواضع بھی بدرجہ کمال ہوتی ہے

اس عالم میں سب سے بڑے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مخلوقات میں آپ کا برابر کا کیا ہوتا؟ کوئی آپ کے لگ بھگ بھی نہیں ہے۔ سب سے بالا اور برتر آپ کی ذات عالی ہے۔ اللہ کے بعد اگر رتبہ ہے تو بس خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اتنی بڑائی عالم میں کسی کو نہیں دی گئی جتنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔ اگر غرور فرماتے تو آپؐ فرماتے' اگر اِتراہٹ ظاہر فرماتے تو آپؐ فرماتے۔ لیکن آپؐ سے زیادہ تواضع کرنے والا بھی عالم میں کوئی نہیں۔ آپؐ سے زیادہ سر کو جھکانے والا بھی کوئی نہیں۔ قدم قدم پر اپنی تواضع ظاہر فرماتے ___ کبھی زمین پر اکڑوں بیٹھ کر ننگے پیر کھانا کھاتے اور فرماتے اکل کما ياكل العبد میں ایسے کھانا کھاتا ہوں جیسے غلام کھایا کرتے ہیں۔ میں کوئی بادشاہ اور سلطان نہیں ہوں۔ میں ایک غلام ہوں۔ جیسے غلام کھانا کھاتے ہیں' میں کھاتا ہوں کبھی آپؐ نے نہیں فرمایا کہ میں کوئی چیز ہوں۔

اسی طرح سے جب آپؐ چلتے تو یہ نہیں ہوتا تھا کہ آپؐ فرمائیں کہ میں آگے آگے رہوں' بقیہ سب پیچھے رہیں۔ وہاں بھی کمال تواضع کہ صحابہؓ آگے پیچھے' دائیں بائیں چل رہے ہیں۔ آپؐ کوئی اپنا امتیاز ظاہر نہیں فرماتے۔ یہ کمال تواضع ہے لیکن یہ آگے اللہ کی دی ہوئی بزرگی ہے کہ آپؐ اپنے کو لوگوں میں کتنا ہی رلاتے ملاتے اور رل ملا کر لوگوں میں چلتے۔ لیکن سب سے اونچے آپؐ ہی نظر پڑتے تھے' حالانکہ بہت سے صحابہؓ ہیں جن کے قد لمبے لمبے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قد مبارک میانہ تھا نہ پست قد تھے نہ بہت لمبا قد۔ نہایت موزوں اور خوبصورت قد تھا۔ جب آپؐ چلتے تو سب سے اونچے آپؐ دکھائی دیتے تھے۔ یہ اللہ کی دی ہوئی بزرگی تھی۔ آپؐ خود آگے بڑھنے کی کوشش نہیں فرماتے تھے۔

مجلس میں جب آپؐ بیٹھتے تو اور لوگ بھی بیٹھتے۔ صحابہؓ آگے پیچھے اور دائیں بائیں بھی ہیں۔ کبھی اپنے لئے کوئی امتیازی مقام تجویز نہیں فرماتے تھے لیکن اللہ کی دی ہوئی بزرگی تھی کہ لمبے لمبے قد کے لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ مگر سب سے اونچے آپؐ ہی نظر پڑتے تھے تو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں میں سب سے بلند اور بالا آپؐ کی ذات ہے۔ لیکن سب سے زیادہ تواضع آپؐ ہی فرماتے تھے۔ کہیں فرماتے ہیں' لا تطرونی کما اطرت النصاری عيسى ابن مريم اے لوگو! میری تعریف میں مبالغے مت کرنا' مجھے میری حد سے مت گزارنا' جیسے عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی تعریف میں مبالغے کئے کہ انہیں خدا کا بیٹا نہیں بلکہ خدا تک کہہ دیا۔ میری بزرگی یہ ہے کہ مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔ انی عبد الله ورسوله نہ میں خدا ہوں' نہ خدا کی اولاد' وہ اولاد ہونے اور باپ ہونے سے بَری ہے۔ انی عبد الله ورسوله میں تو اللہ کا بندہ ہوں۔ ہاں یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مجھے اپنا رسول بنایا مجھے اپنا ایلچی اور پیغمبر بنایا اور اتنی عظمت مجھے عطا کی۔ یہ اس کی دین ہے' میں بندہ ہی ہوں' تو جگہ جگہ فرماتے ہیں۔ انی عبد

للہ ورسولہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

حدیث میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے آپؐ کو کہا کہ یا سیدنا اے ہمارے سردار! حقیقت میں آپؐ سردار ہی تھے۔ آپ تو جہانوں کے سردار ہیں۔ لیکن فرمایا' السید اللّٰہ انی عبد اللّٰہ ورسولہ سردار اللہ ہے۔ میں تو اللہ کا بندہ اور غلام ہوں۔ فوراً اصلاح فرمائی کہ ایسے خطاب بھی مت دو جس سے مبالغے ٹپکتے ہوں۔ کہیں آپؐ نے فرمایا' لا تقولوا انا خیر یونس ابن متی اے لوگو! یہ کبھی میری نسبت مت کہو کہ میں حضرت یونس علیہ السلام سے بہتر اور برتر ہوں۔ حالانکہ آپؐ تمام انبیاء میں افضل ہیں۔ لیکن روکا یعنی اس طرح تعریف مت کرو کہ دوسرے کی تنقیص وتوہین ہونے لگے۔ مقابلے ڈال ڈال کر میری بڑائی مت بیان کرو کہ میرے مقابلے میں دوسرے کم رتبہ ہیں اور میں زیادہ رتبے والا ہوں۔ یہ ادب کے خلاف ہے۔ گستاخی کی بات ہے۔ یہ کمال تواضع ہے تو کہیں ہدایت فرمائی کہ میری تعریفوں میں مبالغے مت کرو اور کہیں فرمایا کہ دیکھو میری حیاتِ طیبہ میں ادب کرو۔ مگر مبالغے مت کرو اور وفات کے بعد فرمایا' لاتجعلوا قبری وثناً یعبد میری قبر کو بت مت بنالینا کہ پوجا شروع کردو' سجدے شروع کردو یا جھکنا شروع کردو' بت مت بنالینا ___ اور کہیں فرمایا' لاتجعلوا قبری عیداً میری قبر کو عید گاہ مت بنانا کہ وہاں میلے ٹھیلے کرنے لگو' وہاں جماعتیں بن کر آئیں۔ یہ مت کرنا۔ جہاں سے بھی مجھ پر درود وسلام پڑھو گے' مجھ تک پہنچ جائے گا۔ ہاں جب تم البتہ حج کرنے کے لئے آؤ۔ اس وقت میرا حق ہے کہ تم میری زیارت کرنے کے لئے آؤ۔ روضہ اقدس پر حاضر ہو۔ حدیث میں فرمایا' من حج ولم یزرنی فقد جفانی جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی' اس نے میرے اوپر ظلم کیا۔ میرا حق ہے کہ وہ میرے پاس آئے۔ اگر زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آدمی سفر کر کے جائے۔ تو اس کا حق ہے کہ سفر کرے اور زیارت کرے اور روضۂ اقدس پر حاضر ہو اور صلوٰۃ وسلام پڑھے۔

بہر حال وفات کے بعد اور وفات سے پہلے جتنے آداب بتلائے ان میں اپنی عبدیت وبندگی ظاہر فرمائی کہ میرے ساتھ نہ زندگی میں مبالغے کرو' نہ وفات کے بعد۔ کہیں فرمایا'

لاتقوموا لی کما یقوم الاعاجم

میرے دربار میں میرے پاس آکر یہ مت کرو کہ میں بیٹھا ہوا ہوں اور لوگ میرے سامنے کھڑے ہوئے ہوں۔ جیسے عجمی بادشاہوں کے سامنے لوگ کھڑے رہا کرتے تھے اور درباری بادشاہوں کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ چاہے دو گھنٹے ہوں یا تین گھنٹے۔ بادشاہ بیٹھتا تھا۔ لوگ کھڑے ہوتے تھے۔ فرمایا' یہ مت کرو جیسے سلاطین دنیا کے سامنے کیا جاتا ہے۔ یہ رسمی تعظیم ہوتی ہے۔ حقیقی ادب نہیں ہوتا۔ حقیقی ادب یہ ہے کہ دل میں عظمت اور عقیدت گھر کی ہوئی ہو اور بیٹھے رہو۔ جیسے میں بیٹھا ہوں ___ اس سے منع فرمایا تو یہ بھی کمالِ عبدیت کا اظہار ہے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ میری بندگی پیش نظر رکھو۔

رسالتؐ وبشریت

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جیسے اللہ کے بندے ہیں۔ اس کے رسول بھی ہیں اور رسالت کی بزرگی کی وجہ سے ان کے ہاتھوں پر معجزات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر کرامتیں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ تو ایک طرف تو یہ کرامت کہ اشارہ فرمادیں تو چاند کے دو ٹکڑے ہوجائیں۔ اشارہ فرمائیں تو درخت اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگتے ہوئے سامنے آجائیں۔ طشت میں انگلیاں ڈال دیں تو انگلیوں سے چشمے جاری ہوجائیں

اور چودہ سو آدمی سیراب ہو جائیں۔ ایک طرف تو یہ اور ایک طرف یہ کہ غزوۂ احد میں پتھر پیشانی مبارک پر لگا تو خون مبارک بہہ نکلا' گھوڑے سے آپ گڑھے میں گر پڑے۔ ایک طرف تو عظمت کے تصرّفات آسمان تک پہنچے ہوئے کہ چاند تک اثر پہنچا اور ایک طرف یہ بے بسی کہ آپ گھوڑے سے گر پڑتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ جب بخار آتا ہے تو اوروں کو ایک درجے کا آتا ہے' مجھے دوگنا آتا ہے۔ جتنا اوروں کو چڑھتا ہے' اس سے دوگنا مجھے چڑھتا ہے اور زیادہ قوت کے ساتھ بخار آتا ہے۔ تو ایک طرف یہ بے بسی اور ایک طرف یہ اقتدار کہ اشارہ کریں تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں' اشارہ کریں تو سورج ہٹ جائے' زمانے کی حرکت بند ہو جائے۔ حق تعالیٰ نے یہ چیزیں کیوں رکھیں کہ ایک طرف بے بسی رکھی اور ایک طرف یہ دعویٰ رکھ دیا کہ میں اللہ کا بندہ اور عبد ہوں اور رسول بھی ہوں ___ یہ اس لئے کہ جب انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر معجزے ظاہر ہوتے ہیں تو لوگ کہیں ان کی خدائی کے قائل نہ ہو جائیں۔ اس لئے بشریت کے لوازم رکھ دیئے تاکہ خدائی کا کوئی اقرار نہ کرے۔ یوں کہیں کہ بندے ہیں ___ تو جہاں چاند کے دو ٹکڑے ہوئے' وہاں یہ بھی کہ گڑھے میں گر پڑے۔ ایک دفعہ شکست بھی ہو گئی۔ بیماری بھی آجاتی تھی۔ علاج کرنا پڑتا تھا۔ یہود نے سحر کرا دیا تو آپ سحر سے متاثر ہو گئے۔ غم بھی آجاتا تھا۔ خوشی بھی آجاتی تھی جتنے بشریت کے عوارض اور لوازم ہیں۔ وہ خود آپ پر طاری ہوتے تھے اور یہ اس لئے کئے جاتے تھے کہ آپؐ کے معجزات دیکھ کر کہیں آپؐ کو خدا ہی نہ مان لیں۔ یوں سمجھیں کہ آپؐ بندے ہی ہیں اور یہ خدا کی دی ہوئی بزرگی ہے۔ اس لئے آپؐ زبانِ مبارک سے بھی تواضع کے کلمات فرماتے' عمل بھی تواضع کا فرماتے۔ حق تعالیٰ آپؐ سے معاملہ بھی وہی کرتے جو بندے کے ساتھ کیا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ انبیاء علیہم السلام باوجود رسول ہونے کے' باوجود اللہ کے مقرّب بندے ہونے کے ہیں بندے ہی' خدا نہیں' ہیں انسان اور بشر ہی' بشر بھی ایسے کہ جو بشریت کے آثار وخواص ہیں' وہ ان پر طاری ہوتے ہیں۔

بہرحال عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ مقدّس اور زیادہ بزرگ طبقہ اس عالم میں کوئی دوسرا نہیں اور اس میں بھی سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کہ آپؐ نے فرمایا :

انا نبیّ الانبیاء

"اور نبی امتوں کے نبی ہیں' میں نبیوں کا نبی ہوں"۔

یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا کہ نبی آخر الزمان پر ایمان لاؤ۔ قرآن کریم میں تذکرہ فرمایا :

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ (آل عمران پ۳ آیت ۸۱)

حق تعالیٰ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تمہیں نبوت دوں اور کتاب دوں۔ اس کے بعد وہ رسول آئیں۔ جن کی تمہیں بشارت دی گئی ہے تو اس پر ایمان بھی لانا اور اس کی مدد بھی کرنا' اس کا اتباع کرنا اور اس کے ساتھ رہنا ___ گویا انبیاء علیہم السلام سے بھی عہد لیا گیا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور ایمان نبی پر لایا جاتا ہے۔ گویا نبیوں کا بھی آپ کو نبی بنایا گیا اور انبیاء علیہم السلام کو ایمان لانے کا مکلّف قرار دیا گیا۔ جیسے ہمیں اور آپ کو حکم ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ انبیاء کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ بھی ایمان لائیں۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ :

انا نبیّ الانبیاء اور نبی امتوں کے لئے نبی ہیں' میں نبیوں کے لئے نبی بنایا گیا ہو ___ تو اتنی بڑی

ذاتِ اقدس کہ انبیاء میں بھی آپ کا اتنا اونچا درجہ کہ خاتم انبیاء بنائے گئے۔ اگر عیاذاً باللہ غرور یا تکبر کرتے تو آپ کرتے۔ مگر آپ سب سے پہلے زیادہ تواضع فرماتے ہیں ___ اس سے معلوم ہوا کہ جتنے کمالات ہیں وہ اللہ کے ہیں ادھر سے آتے ہیں۔ انسان کی ذات میں کمال نہیں ہے ___ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول سے، عمل سے یہ بتلادیا کہ انسان اپنے کو کورا سمجھے اور اللہ کا شکر مانے کہ اس نے تمہیں کمال دے دیا۔ اس لئے دنیا میں جتنے بھی بڑے گزرے ہیں۔ جتنے بڑے ہوتے گئے، اتنی ہی تواضع میں بڑھتے گئے۔ اتنی خاکساری اور عجز ونیاز برتنے لگے۔ اس لئے کہ ان پر حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ یہ کمال ہمارا نہیں اللہ کا ہے۔

اور جب آنکھوں سے نظر آتا ہے کہ کمال دینے والا دیتا ہے۔ لیکن جب لینے پر آتا ہے لے بھی لیتا ہے۔ انسان کے بس میں نہیں کہ روک لے۔ جیسے ایک طرف یوں فرمایا کہ انسان ماں کے پیٹ سے علم وہنر اور اخلاق لے کر نہیں آتا، ہم دیتے ہیں۔ اسی طرح آخری عمر کے بارے میں فرمایا:۔

مَنْ تُرَدُّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْلَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا انسان آخیر میں جب اَرذلِ عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے جو عمر بہت ہی گری ہوئی ہے۔ سو یا سو سے زیادہ برس کا ہوگیا۔ تو ایک ایک کر کے اس کا علم کھونا شروع ہو جاتا ہے۔ آج آنکھوں میں فرق آگیا تو دیکھنے کا علم ختم ہوگیا، دماغ کمزور ہوگیا تو سوچنے سمجھنے کا علم ختم ہوگیا، کانوں کے سننے میں فرق آگیا تو سننے کا علم ختم ہوگیا۔ نیا علم نہیں آرہا۔ پُرانا علم حافظ میں محفوظ تھا۔ آج حافظہ کمزور ہوگیا تو پچھلی معلومات ختم ہو گئیں، اگلی معلومات کا دروازہ بند ہوگیا۔ پچھلی ختم ہو گئیں۔ انسان جیسا آیا تھا ویسا ہی چلا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ بتلادیتے ہیں کہ علم تیری چیز نہیں۔ جب چاہا ہم نے دے دیا، جب چاہا ہم نے چھین لیا۔ پھر ایسا انسان کس طرح سے غرور کرسکتا ہے؟ اگر اس کے پاس علم وکمال آجائے۔ وہ جانے گا کہ علم وکمال میرا نہیں، میرے مالک کا ہے، میں خزانچی اور امین ہوں۔ خزانچی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دعویٰ کرے کہ یہ مال میرا ہے۔ یہ مال تو مالک کا ہے۔

علم واخلاق کے حصول کا طریقِ اوّل، فیضِ صحبت

بہرحال میرا مطلب یہ ہے کہ انسان کی ذات میں ہنر نہیں ہے اور کچھ محنت کرے گا تو آئے گا۔ اب علم واخلاق کے آنے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے؟ اتنی بات تو واضح ہوگئی حاصل کرنا پڑے گا۔ بلا حاصل کئے نہ علم آئے گا نہ اخلاق پیدا ہوں گے۔ تو پھر اچھے اخلاق پیدا کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟

سب سے بہتر طریقہ علم اور اخلاقی کمال حاصل کرنے کا فیض صحبت ہے۔ اہلُ اللہ اور اکابرِ دین کی خدمت میں رہ کر ان کی زبان سے جب آدمی سنتا ہے تو علم آدمی کے دل میں اترتا ہے۔ ان کے فیضِ صحبت سے اخلاق درست ہوتے ہیں۔

حضرات صحابہؓ کو صحابہؓ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ ہیں۔ صحابہؓ اس طرح علم حاصل نہیں کرتے تھے کہ کوئی کتاب سامنے کھلی ہوئی ہے رات دن مطالعہ کررہے ہیں۔ جس طرح ہم مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے، فیضِ صحبت حاصل کیا۔ فیضِ صحبت کی برکت سے علماء، عرفاء، کامل، زاہد اور درویش بن گئے۔ علم واخلاق کے سارے کمالات پیدا ہو جاتے تھے۔ اعلیٰ ترین طریق فیضِ صحبت ہے کہ اہلُ اللہ کی صحبت اختیار کی جائے۔ ان کے قلب کا اثر انسان کے قلب پر پہنچتا ہے۔ ان کے قلب میں اگر علم ہے تو قلب سے قلب کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ان کے اندر اگر پاکیزہ اخلاق

ہیں تو اخلاق منتقل ہوتے ہیں، قلب پر اثر پڑتا ہے۔ اسی واسطے تاکید کی گئی ہے کہ اچھی صحبت حاصل کرو، بری صحبت سے بچو، اچھے ماحول میں رہو، بُرے ماحول سے پرہیز کرو۔ مولانا رومیؒ نے کہا ہے کہ ؎

صحبتِ صالح ترا صالح کند
صحبتِ طالح ترا طالح کُند

نیک صحبت تجھے نیک بنادے گی، بُری صحبت تجھے بُرا بنادے گی۔ تو صحبت و معیّت کا اثر پڑتا ہے۔

اور انسان تو انسان۔ میں کہتا ہوں کہ ہر چیز کی صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ آپ کپڑوں کے صندوق میں گلاب کے پھول بھردیں۔ ہفتہ بھر بعد جب نکالیں گے، سارے کپڑوں میں سے گلاب کی خوشبو آئے گی۔ تو کپڑا گلاب نہیں تھا۔ گلاب کے پھول کی صحبت حاصل کی، خوشبو ادھر بھی منتقل ہوگئی اور کپڑوں میں سے وہی خوشبو آنے لگی۔ جو گلاب کے پھول میں سے آتی تھی۔

آپ جب گرم کپڑے کیڑے کے ڈر کی وجہ سے صندوقوں میں بند کرتے ہیں تو فرنیل کی گولیاں اس میں ڈال دیتے ہیں۔ یا تمباکو ڈال دیتے ہیں۔ تاکہ کیڑا نہ لگے۔ اب جب سردیوں میں کپڑے نکالیں گے تو کپڑوں میں سے تمباکو کی بو آتی ہوئی ہوگی۔ حالانکہ خود کپڑا تمباکو نہیں تھا۔ مگر تمباکو کی صحبت میں رہ کر کپڑے نے بھی وہی خوبی پیدا کرلی۔

لوہے کو آپ بھٹی میں ڈال دیں۔ ایک پندرہ منٹ آگ کی صحبت میں رہنے کے بعد جو آپ نکالیں گے تو شکل بھی اس کی آگ جیسی، وہی سرخ رنگت، کام بھی وہی کرے گا۔ جو آگ کرتی ہے۔ اس میں روشنی گرمی بھی ہے۔ اس کا سرخ رنگ ہوگیا۔ جیسے آگ کا ہوتا ہے اگر آپ اس جلتے ہوئے لوہے کو کسی چھپّر میں ڈال دیں تو دو منٹ میں سارا گھر پھونک دے گا۔ جو کام آگ کرتی ہے، وہی لوہا کرے گا۔ اس لئے کہ آگ کی صحبت میں رہ کر وہی خوبی اس نے اختیار کرلی۔ بلکہ شکل بھی وہی بنالی جو آگ کی شکل تھی۔

صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ، اکابر اولیاء اللہ اور بڑے کاملین میں سے ہیں۔ دہلی میں ان کا مزار ہے۔ حضرت مجدد صاحب کے شیوخ میں سے ہیں ___ ان کے یہاں اتفاق سے مہمان آئے اور شیخ کے گھر میں کچھ نہیں تھا۔ کئی دن سے فاقہ ہو رہا تھا ___ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ پریشان کہ کس طرح مدارات کروں۔ گھر میں ایک دانہ نہیں، مہمانوں کو کیا کھلاؤں؟ اسی گھبراہٹ میں کبھی گھر میں جاتے ہیں، کبھی باہر آتے ہیں۔ پریشان ہیں کہ کس طرح سے مہمان کو کھلاؤں پلاؤں۔ گھر میں تو ایک دانہ بھی نہیں۔

حضرت خواجہ صاحبؒ کے مریدوں میں سے ایک بھٹیارہ، جو کھانے کی دوکان کرتا تھا ___ آج اسے ہوٹل اور ہوٹل مالک کہتے ہیں۔ کل وہ بھٹیاری سرائے اور بھٹیارہ کہلاتا تھا، کھانا پکاتا تھا اور بیچتا تھا ___ وہ بھٹیارہ سمجھ گیا کہ شیخ کے گھر فاقہ ہے اور کھانے پینے کو کچھ ہے نہیں۔ مہمانوں کی وجہ سے پریشان ہیں۔ تو فوراً مجلس سے اٹھا۔ اپنی دوکان پر گیا اور عمدہ عمدہ کھانے، جو اس کے ہاں پکے ہوئے تھے ان میں سے کھانے لے کر خوان تیار کیا۔ کئی آدمیوں کا اور کئی قسم کا بڑا عمدہ کھانا، سر پر رکھ کر لایا اور ہدیہ کے طور پر پیش کیا ___ حضرت خواجہ صاحبؒ بے حد خوش ہوئے۔ مہمانوں کو بڑی عزت اور مدارات سے کھانا کھلایا اور خوشی سے چہرہ کھل گیا کہ اَلحمدُللہ میرے مہمانوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور میں مدارات کرسکا۔

جب مہمان رخصت ہوگئے۔ تو خواجہ صاحبؒ نے جوش میں آکر بھٹیارے سے فرمایا، تونے آج مجھے اتنا خوش کیا ہے۔ مانگ کیا مانگتا ہے؟ جو تو آج مانگے گا، تجھے ملے گا۔

بھٹیارے کی زبان سے یہ نکلا کہ حضرت! مجھے اپنے جیسا بنادو ___ اب یہ چیز بڑی بھاری تھی کہ بھٹیارہ بعینہٖ خواجہ باقی باللہ بن جائے۔ خواجہ باقی باللہ کی استعداد اور صلاحیتیں اور بھٹیارہ بے چارہ معمولی آدمی۔ نہ اس میں علم کی وہ صلاحیت نہ اخلاق کی استعداد۔ گویا اس نے درخواست اپنے حوصلہ سے بڑھ کر کی۔ یہ کہتا کہ دعا کیجئے مجھے اللہ نیک اور صالح بنادے' اللہ مجھے جنت دے دے' یہ نہیں۔ بلکہ فرمایا بس اپنے جیسا مجھے بنادیجئے۔

خواجہ صاحبؒ نے فرمایا۔ یہ تو نے اپنے حوصلہ سے بڑھ کر درخواست کی ہے۔ کوئی اور چیز مانگ۔ اس نے کہا نہیں۔ میں تو یہی مانگتا ہوں ___ اب خواجہ صاحبؒ متأمل کہ اس کو آخر میں اپنے جیسا کیسے بنادوں ___ اور اگر میں کوشش بھی کروں تو اس میں اتنی استعداد کب ہے کہ اتنا علم اٹھا سکے' تحمل بھی کرسکے اور ان اخلاقی کمالات کو برداشت کرسکے' جو میرے اندر اللہ نے دیئے ہیں۔ ہر انسان کی صلاحیت الگ ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی استعدادیں اور ہیں۔ جو نبوت کے کمالات برداشت کرتے ہیں۔ امت میں کسی بڑے سے بڑے، قطب' غوث اور ولی کی مجال نہیں کہ ان کمالات کی برداشت کرسکے' وہ ولایت کے کمال کا تحمل کریں گے۔ جو ولی نہیں ہے' معمولی عالم ہے' وہ ولایت کے کمالات کا تحمل نہیں کرسکتا۔ عوام الناس میں سے ہے۔ وہ اہل علم کے کمالات کو برداشت نہیں کرسکتا۔ تو ہر ایک کی استعداد و صلاحیت الگ ہے ___ اگر پیالہ پاؤ بھر کا ہو' جس میں پاؤ بھر غلہ آسکے۔ وہ یوں کہے کہ میرے اندر دو مَن بھردو' کیسے بھردیں؟ اس کے اندر کب صلاحیت ہے اتنا بھردینے کی؟ تو بھٹیارے کا یہی قصہ تھا کہ استعداد تو پاؤ بھر کی بھی نہیں تھی اور مانگ لیا اس نے کہ دس من میرے اندر بھردو۔ اب خواجہ صاحبؒ اس کے اندر کیسے بھردیں؟

خواجہ صاحبؒ نے پھر فرمایا' تو نے اپنی ہمت سے بڑھ کر درخواست کی ہے تیرے اندر تحمل اور قوت نہیں ہے۔ اتنی بات مانگ جتنی تو برداشت کرسکے ___ اس نے کہا نہیں' اب تو میری زبان سے نکل گیا۔ اب تو مجھے اپنے ہی جیسا بنالو ___ اب پھر خواجہ صاحبؒ متأمل ہوئے۔ فرمایا' اچھا اللہ کے نام پر ___ فرمایا' اٹھ میرے ساتھ' اسے اپنی کوٹھڑی میں لے گئے۔ اندر سے دروازہ بند کیا اور بیٹھ کر اس کے اوپر توجہ ڈالنی شروع کی' اس کی روح میں تصرف کرنا شروع کیا۔ اس درجہ تصرّف کیا اور اس درجہ اس کی روح کے اندر نسبت و کمالات کو بھرنا شروع کیا کہ وہ ساری چیزیں بھردیں جو اپنے اندر تھیں۔ اور کیفیت یہ ہوئی کہ بھٹیارے کی شکل بھی ویسی بن گئی۔ جیسی خواجہ باقی باللہؒ کی تھی۔ اب جب کوٹھڑی سے باہر نکلے تو دو خواجہ باقی باللہ آرہے ہیں۔ ایک اس طرف' ایک اس طرف' شکل بھی وہی' صورت و رنگ بھی وہی۔ اپنی استعداد و صلاحیت سے اس طرح اس کے باطن کو بھرا کہ اس کی ظاہری شکل بھی ویسی بن گئی ___ لوگوں نے پہچانا کس طرح سے؟ ایک خواجہ باقی باللہ تو بڑی قوت اور متانت سے آرہے تھے اور ایک خواجہ باقی باللہ اس طرح کہ پیر لڑھک رہے ہیں' بدن لرز رہا ہے' جیسے بوجھ ہے برداشت نہیں ہوتا۔ اس سے لوگوں نے سمجھا کہ یہ بھٹیارہ ہے۔ جس کی صورت خواجہ صاحبؒ کی بن گئی۔ تین یا چار دن کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ بے چارہ برداشت نہیں کرسکا تو ___

آرزوی خواہ لے دیاندازہ خواہ

آرزو کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ مگر اتنی آرزو کرو' جتنی آدمی برداشت کرسکے' جتنی اندر صلاحیت ہو ___ میں نے کس وجہ سے یہ واقعہ ذکر کیا؟ اس لئے کہ خواجہ باقی باللہؒ کی دس منٹ صحبت اٹھائی' دوسرا باقی باللہ بن گیا۔ تو صحبت کا اثر پڑتا ہے اچھے آدمی کی صحبت سے قلوب کے اندر اچھائیاں پیوست ہوتی ہیں۔ اس

سے انسان میں صلاحیتیں بڑھتی ہیں۔ کمالات پیدا ہوتے ہیں۔ تو حضرات صحابہؓ کو جو کمالات حاصل ہوئے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے حاصل ہوئے۔

فیضِ صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم کے معجزے

میں تو کہا کرتا ہوں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات پر نظر کی جائے۔ تو آپؐ کے ہزار ہا معجزات ہیں۔ زمین و آسمان کی چیزوں سے الگ معجزے ظاہر ہوئے۔ چاند سورج پر الگ معجزات ظاہر ہوئے اور دنیا کی ہر چیز پر آپ کے معجزات نمایاں ہوئے۔ پتھروں نے آپؐ کی نبوت کی شہادت دی اور بول پڑے۔

حدیث میں ہے کہ آپؐ کو استنجا کی ضرورت پیش آئی۔ ریگستان تھا۔ میلوں تک کوئی آڑ نہیں تھی۔ کوئی صورت نہیں تھی کہ بیٹھ سکیں۔ میل بھر پر ایک اور دوسرے میل پر ایک درخت تھا۔ آپؐ نے ادھرادھر اشارہ فرمایا۔ دونوں درخت دوڑتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ دو میل کی مسافت طے کر کے آئے اور آکر اس طرح کھڑے ہوئے کہ اپنی شاخیں پھیلا دیں۔ جیسے خیمہ اور پردہ بن گیا ___ استنجا فرمایا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ وہ درخت اپنی جگہ چلا گیا تو درختوں سے آپؐ کے معجزے الگ ظاہر ہوئے۔ جانوروں سے آپؐ کے معجزے الگ ظاہر ہوئے۔

حدیث میں ہے کہ ایک اونٹ بلبلاتا ہوا روتا ہوا آیا۔ آنکھوں میں اس کے آنسو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں آکر سر ڈال دیا اور بلبلا رہا ہے۔ آنکھوں سے پانی جاری ہے۔ آپؐ نے فرمایا' اس کے مالک کو بُلاؤ۔ مالک حاضر ہوا۔ فرمایا' یہ شکایت لے کر آیا ہے کہ تو اس کی طاقت سے زیادہ اس کے اوپر بوجھ لادتا ہے۔ تجھے غیرت نہیں آتی؟ تیرا ذریعہ معاش یہ ہے' تیری کمائی اس کے ذریعے ہے۔ پھر اس پر رحم نہیں کھاتا؟ واقعہ سچا نکلا۔ اس نے توبہ کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' آئندہ میں ظلم نہیں کروں گا' اس کا حق پہچانوں گا' اسے غذا دوں گا' اتنا ہی بوجھ لادوں گا جتنی اس میں طاقت ہے ___ تو جانور آکے شکایتیں کرتے ہیں۔ حضورؐ فیصلے فرماتے ہیں تو یہ معجزہ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اسی طرح پتھروں نے بھی آپ کی نبوت کی شہادت دی۔

حدیث میں ہے کہ آپؐ نے کنکریاں اٹھائیں۔ تو کنکریوں میں سے سبحان اللہ' سبحان اللہ کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ ساری مجلس والوں نے سنا۔ آپؐ نے وہ کنکریاں صدیق اکبر رضی اللہ عنہٗ کے ہاتھ میں دے دیں۔ تسبیح جاری رہی' پھر انہوں نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہٗ کو دے دیں پھر تسبیح جاری رہی' پھر انہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے ہاتھ میں دے دیں تو تسبیح بند ہوگئی ___ بہرحال یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا کہ کنکریوں سے سبحان اللہ' سبحان اللہ کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔

تو چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا' کنکریوں کا تسبیح پڑھنا' پتھروں کا شہادت دینا' درختوں کا دوڑ کے چلے آنا' انگشتانِ مبارک سے پانی کے چشمے بہہ پڑنا' یہ عظیم معجزات ہیں جو نمایاں ہوئے ___ لیکن میں کہا کرتا ہوں کہ یہ سارے معجزات ایک طرف اور یہ ایک معجزہ ایک طرف کہ ہر ہر صحابیؓ آپ کا ایک مستقل معجزہ ہے۔ کیوں ___؟ اس واسطے کہ پتھر کو موم بنا دینا آسان ہے۔ لوہے کو نرم کر دینا آسان' لیکن انسان کی روح میں انقلاب پیدا کر دینا' یہ بڑا مشکل ہے۔ انسان کو انسان بنا کر اس کے دل کو پھیر دینا یہ بڑا مشکل ہے ___ آپؐ کے ہاں یہ ہے کہ ایک شخص مجلس مبارک میں آتا ہے' وہ کافر بھی ہے مشرک بھی ہے۔ بدعقیدہ بھی ہے اور بدعمل بھی ہے۔ ساری خرابیاں اسی میں ہیں۔ لیکن جونہی دستِ مبارک پر بیعت کر کے واپس ہوتا ہے تو اس حالت میں

ایسی ہوتا ہے کہ عالم بھی ہے، عارف بھی ہے، کامل بھی ہے، زاہد بھی ہے، عابد بھی ہے اور متقی بھی ہے۔ ایک دم دل کے اندر انقلاب پیدا ہو گیا تو پتھر میں انقلاب آسان ہے۔ مگر انسان میں انقلاب پیدا کرنا بڑا مشکل ہے تو ہر ہر صحابیؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مستقل معجزہ ہے یہ اعجاز کیسے ظاہر ہوا؟ یہ فیضِ صحبت کی برکت تھی۔ آپؐ کی صحبت مبارک میں منٹوں میں وہ تاثیر ہوتی تھی کہ دوسری جگہ برسوں میں بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ بیعت کرتے ہی ہر شخص کامل ہو جاتا تھا۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اس حالت میں آئے کہ شرک و کفر میں مبتلا ہیں۔ لیکن آکر جونہی دست مبارک پر بیعت کی۔ اسلام قبول کیا۔ تو یہ وہ زمانہ تھا کہ چھپ کر نماز پڑھی جاتی تھی۔ کل تیرہ آدمی مسلمان تھے۔ دار ارقم میں اندر سے زنجیر بند کر کے نماز پڑھتے تھے ___ فاروقِ اعظمؓ پہنچے، بیعت کی، اسلام قبول کیا۔ عرض کیا، یا رسول اللہؐ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ فرمایا کیوں نہیں ہیں؟ عرض کیا پھر چھپ کر نماز پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ پر ہمیں بھروسہ کرنا چاہئے۔ آپؐ نے فرمایا چلو، آگے آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور پیچھے پیچھے فاروقِ اعظمؓ ہیں۔ مسجد حرام میں پہنچے۔ مشرکین کی مجلسیں جمی ہوئی تھیں۔ اعلان سے کہا کہ

جو جانتا ہے، وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا وہ اب جان لے۔ میں عمرؓ ہوں اور میں کلمہ پڑھ کر آیا ہوں

اشهد ان لا الٰه الا الله واشهد ان محمداً رسول الله

یہ کہنا تھا کہ تمام مشرکین مارنے پیٹنے پر پل پڑے۔ فاروقِ اعظمؓ نے بھی آستینیں کھینچی، مار پٹائی سب کچھ ہوئی، لڑائی بھی ہوئی۔ مگر اللہ پر بھروسہ ایک منٹ میں اتنا پیدا ہو گیا کہ یا کفر میں پڑے ہوئے تھے یا ایک دم ایمان میں بڑھ گئے۔ یہ فیضِ صحبت ہی کا اثر تھا۔ بہرحال نبوّت کی صحبت سے صحابہؓ بنے اور صحابہؓ کے بارے میں اہل السنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اس امت میں صحابہؓ سے بڑھ کر کوئی مقدس نہیں۔ کوئی ولی، قطب بن جائے، غوث بن جائے۔ مگر صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ صحابہؓ کی جو شان ہے، وہ کسی کی نہیں بن سکتی۔ وہ اسی وجہ سے کہ انہوں نے براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی ہے۔ دوسروں کو یہ شرف میتسر نہیں ہے۔ تو سب سے بڑی بنیادی چیز جس سے اخلاق درست ہوتے ہیں، وہ فیضِ صحبت ہے۔ اگر ہمیں اپنے اخلاق اور اپنا علم صحیح کرنا ہو تو جو نیک اور صالح لوگ ہیں۔ ان کے پاس بیٹھنا چاہئے۔ چاہے کچھ بولیں یا نہ بولیں۔ لیکن پاس بیٹھنے سے ہی ایک اچھا اثر پیدا ہوتا ہے۔

بے شعور اشیاء کی صحبت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھی اور بُری صحبت کی مثال دی ہے فرمایا، نیک صحبت کی مثال تو عطار کی دُکان جیسی ہے۔ عطر بیچنے والے کی دکان پر جب آپ بیٹھیں گے، چاہے عطر نہ بھی خریدیں۔ کم از کم دماغ میں ہی خوشبو آجائے گی۔ دماغ تو معطّر ہو ہی جائے گا، کپڑوں میں خوشبو کی ہوا بھرے گی۔ گھر پہنچیں گے تو گھر والے کہیں گے۔ یہ خوشبو کہاں سے آرہی ہے۔ اور کچھ نہیں تو بدن کو ہی خوشبو لگ جائے گی، ناک میں تو پہنچ جائے گی اور اگر کہیں عطر خرید ہی لیا اور مل لیا، پھر تو سبحان اللہ۔ مگر عطار کی دوکان پر محض جانے سے کم از کم دماغ تو معطّر ہو ہی جاتا ہے۔

اور بُری صحبت کی مثال ایسی فرمائی کہ جیسی لوہار کی دوکان کہ بعض دفعہ لوہا گرم ہوتا ہے۔ کٹتا ہے تو اور کچھ نہیں تو تھوڑی سی کالک ہی کپڑے کو لگ جائے گی، لوہا جلنے کی تھوڑی سی بدبو ناک کے اندر آجائے گی غرض آدمی کوئی نہ کوئی کدورت دماغ میں لے کر آئے گا۔ کوئی نہ کوئی کالک اور سیاہی کپڑے کو لگا کر آئے

____ بُری صحبت کی مثال یہی ہے کہ برے کے پاس بیٹھ کریا تو بُرا بنے گا' برا نہیں بنے گا تو کم سے کم بُرائی کی بُرائی دل سے نکل جائے گی۔ کل کو بُرائی پر آمادہ ہو جائے گا۔ نیکوں کے پاس اگر بیٹھے گا' اگر دیندار نہیں بنے گا' تو کم سے کم دین کی محبت تو پیدا ہو ہی جائے گی محبت نہ بھی پیدا ہو' کوئی کلمہ سن کے دل کی برائی ہی جاتی رہے گی تو راستہ درست ہو جائے گا۔ جیسے عارف رومیؒ نے کہا ہے کہ ۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریاء

اللہ کے کسی ولی' مقبول اور دوست کے پاس ایک گھڑی بیٹھنا' یہ سو برس کی عبادت سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ ایک گھڑی بیٹھنے سے بعض دفعہ دل کی گرہیں ایسی کھل جاتی ہیں کہ سو برس کی عبادت کا راستہ صحیح ہو جاتا ہے۔ یہ جو دل میں گنجلک پڑی ہوئی ہوتی ہے' وہ نکل جاتی ہے تو فائدہ سے خالی نہیں ہوتا۔ اس واسطے آپؐ نے تاکید فرمائی ____ مثل مشہور ہے کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ ہر چیز اپنا اثر کرتی ہے۔ آپ روز دریا کے کنارے دو چار گھنٹے جا کر بیٹھیں۔ مزاج میں رطوبت پیدا ہو جائے گی' نرمی آجائے گی' تری آجائے گی۔ اس لئے کہ پانی کی صحبت اختیار کی۔ آپ آگ کے پاس بیٹھیں مسینہ بھر سینکتے رہیں۔ مزاج میں جھنجھلاہٹ اور گرمی پیدا ہو جائے گی۔ آپ مٹی پر بیٹھیں' یبوست اور خشکی پیدا ہو جائے گی۔ مٹی کا اثر ہی یہ ہے۔

جب یہ ساری چیزیں جو بے شعور اور بے جان کہلاتی ہیں۔ یہ بھی اثر کرتی ہیں۔ کسی جاندار کے پاس بیٹھیں گے تو اس کا اثر کیوں نہیں ہو گا؟ اور جاندار کے ساتھ اگر ایماندار کے پاس بیٹھیں گے تو ایمان کا اثر کیوں نہیں ہو گا؟ اسی طرح سے اگر کسی کفر والے کے پاس بیٹھیں یا کسی فاسق و فاجر کے پاس بیٹھیں۔ آپ کے اندر وہی جذبات پیدا کر دے گا۔ جو اس کے اندر تھے۔ تو اصل چیز اخلاق درست کرنے کی یہ ہے کہ صحبت صالح اختیار کی جائے کہ ان کے پاکیزہ اخلاق کا اثر آپ کے قلب پر پڑے گا۔ چند دن کے بعد آپ کو فرق محسوس ہو گا کہ اخلاق کچھ صحیح ہونے لگے۔ دل کا راستہ بدل جائے گا۔ دل ادھر ہی کو چل پڑے گا' جدھر کو اس صالح اور نیک آدمی کا چل رہا ہے۔ اس لئے سب سے اعلیٰ طریقہ علم و معرفت اور اخلاق حاصل کرنے کا اہلُ اللہ' اہلِ دل اور سچوں کی صحبت ہے۔ اسی واسطے قرآن کریم میں امر فرمایا گیا' يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کی معیّت اختیار کرو۔ یعنی ڈر تمہارے دل میں قائم نہیں رہے گا۔ جب تک ڈر والوں کی معیّت نہ اختیار کرو۔ ان کے پاس بیٹھو تو ڈر دل میں اثر کر جائے گا۔ تقویٰ دل کے اندر اثر کر جائے گا۔

دین اہلُ اللہ کی صحبت سے پیدا ہوتا ہے

اصل یہی ہے کہ دین محض کتابوں کے ورقوں سے نہیں پیدا ہوتا۔ اہلُ اللہ کے دلوں سے پیدا ہوتا ہے۔ کتابیں کوئی لاکھ پڑھ لے۔ صحبت نہ ملے' دین اثر نہیں کرے گا۔ قلب کے اندر رنگ نہیں پیدا ہو گا۔ محض کتاب یا کاغذ سے مراد نہیں' اہلِ دل کے پاس بیٹھ کر دل میں اثر پیدا ہو گا۔ لسانُ العصر اکبر الٰہ آبادی یوپی کا بڑا شاعر گزرا ہے۔ اس نے کہا ہے۔ وہ اکثر علی گڑھ کالج کے لڑکوں سے خطاب کیا کرتا تھا۔ جو چوٹیں ہوتی تھیں۔ ان پر طعن بھی کرتا تھا۔ ساتھ میں انہیں سمجھاتا بھی تھا۔ تو کالج کے لڑکوں سے اس نے خطاب کر کے کہا کہ ۔

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اہل اللہ کی نظر پڑتی ہے' دین آنا شروع ہو جاتا ہے۔ نہ کتاب سے آتا ہے نہ مدرسے کے دروازوں سے اہلِ دل کے دل سے آتا ہے۔ ؏

از دل خیزد بردل ریزد

دل سے بات اٹھتی ہے تو دل ہی سے جا کے ٹکراتی ہے۔ اس واسطے اعلیٰ ترین طریقہ دین اور دینی اخلاق حاصل کرنے کا وہ فیضِ صحبت ہے خواہ علماء ربانی کی صحبت میسّر ہو یا کوئی حقانی درویش اور اہل اللہ میں سے ہو اس کی صحبت میسّر ہو۔ وہ بھی نہ ہو' تو کسی نیک آدمی ہی کی صحبت میسّر ہو۔ عوام میں بھی نیک ہوتے ہیں، تاجروں میں ہوتے ہیں۔ ہر طبقے میں اللہ کے نیک بندے ضرور ہوتے ہیں۔ آدمی چھانٹ لے کہ یہ مقبول ہے اور مقبولیت اعمال سے معلوم ہو جاتی ہے۔ بلکہ صورت سے نظر پڑتی ہے کہ یہ آدمی مقبول ہے۔ اس کے چہرے پر لکھا ہوا نہیں ہوتا۔ مگر دل سے پڑھ لیتا ہے کہ یہ کوئی اللہ والا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک ایمان کی نرمائی' ایک بھول پن' ایک سادگی' اللہ پر بھروسہ اور توکل ہوتا ہے' نہ چالاکی اور عیّاری برستی ہے۔ بلکہ سچائی برستی ہے۔ جیسے فرمایا گیا'

المؤمن غرّ کریم والمنافق خبّ لئیم مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ بھولا بھالا' سیدھا' سچا ہوتا ہے۔ بھولے پن کے معنیٰ بیوقوف کے نہیں بے وقوف ہونا اور بات ہے' بھول پن اور بات ہے۔ بھول پن کے معنی یہ کہ عیّاری' مکّاری' چالاکی نہیں سیدھی سیدھی بات ہے اور ایک بے وقوفی ہے یہ اور چیز ہے۔ مؤمن بے وقوف نہیں ہوا کرتا۔ جس درجے کا ایمان ہوگا۔ اس درجے کی عقل مندی بھی اس کے اندر ہوگی۔ ہاں ایمان ہی کمزور ہے' عقل بھی کمزور ہوگی۔ ایمان قوی ہے تو عقل بھی قوی ہوگی۔ ان کے چہروں پر بھول پن ہوتا ہے۔ یعنی فریب کاری نہیں ہوتی۔ سیدھی سیدھی جو دل میں ہے' وہی زبان پر' جو زبان پر ہے وہ دل میں۔ تو چہرہ مہرہ بتلا دیتا ہے کہ یہ آدمی سچا ہے۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ حضراتِ صحابہؓ جب ہندوستان میں آئے ہیں۔ تو اول سندھ میں داخل ہوئے ہیں، سندھ کے راستے سے پنجاب پھر پنجاب کے راستے سے ہندوستان پہنچے ہیں۔ جب صحابہؓ سندھ کے بازاروں سے گزرے ہیں۔ تو ہزاروں آدمیوں نے ان کے چہرے دیکھ کر اسلام قبول کیا ہے اور کہا کہ یہ جھوٹوں کے چہرے نہیں۔ ان چہروں پر سچائی برستی ہے۔ ان کے چہرے دلیل ہیں کہ ضرور اسلام حق ہے۔ اسلام ان کے چہروں پر برستا ہے۔

ہمارے استاذ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے زبردست محدّث' عالم' عارف باللہ تھے۔ ان کے چہرے پر نورانیت برستی تھی۔ مظفر نگر میں مسلمانوں کا آریوں سے مناظرہ ہوا۔ اُدھر ہندو آریہ تھے ادھر مسلمان تھے' تو اسٹیج پر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی بیٹھے ہوئے تھے' مناظرہ نہیں فرمایا۔ مناظرہ دوسرے علماء کر رہے تھے۔ مگر صدر کی حیثیت سے حضرت شاہ صاحبؒ تشریف رکھتے تھے۔ تو آریہ مناظر نے کہا کہ ___ اگر کسی کی صورت دیکھ کر اسلام قبول کیا جا سکتا تھا۔ تو میں اس شخص کا چہرہ دیکھ کر اسلام قبول کر لیتا۔ اس کے چہرے پر نور برس رہا ہے' اس کے چہرے پر ایمان کھل رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس شخص کا دل' ایمان و علم اور کمال سے بھرا ہوا ہے تو ۔

مرد حقانی کی پیشانی کا نور
کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

مرد حقانی کی حقانیت چہرے پر آجاتی ہیں

یہ چہرہ اصل میں چغل خور ہے۔ جو دل میں ہوتا ہے' چہرہ چغلی کھادیتا ہے کہ یہ چیز دل میں بھری ہوئی ہے۔ ر بدنیتی بھری ہوئی ہے' چہرے پر برستا ہے کہ یہ آدمی اچھا نہیں اور سچائی بھری ہوئی ہے تو چہرہ بول دیتا ہے کہ ہے یہ سچا۔ مادی کیفیات ہوں یا روحانی چہرے پر برسنے لگتی ہیں۔ اگر کسی کے دل میں خوف بھرا ہوا ہے تو رے پر ایک زردی اور پریشانی ظاہر ہوگی۔ دیکھتے ہی آپ کہیں گے کہ بھئی! تم ڈر رہے ہو؟ حالانکہ ڈر چہرے پا نہیں۔ ڈر دل کے اندر ہے مگر دل کے اثرات چہرے پر آتے ہیں۔ چہرہ آئینہ ہے۔ دل کی چیز چہرے پر کھل تی ہے ___ اگر آپ کے دل میں خوشی بھری ہوئی ہے' کسی تقریب سے مسرت ہے۔ چہرہ خوشی سے دمکتا اہو گا۔ لوگ دیکھ کے کہیں گے کہ بھئی! بڑے خوش نظر آرہے ہو' کیا بات پیش آئی۔ حالانکہ خوشی تو دل ں بھر رہی ہے۔ مگر چہرہ چغلی کھادیتا ہے کہ دل میں خوشی ہے۔ اگر دل میں غمی ہے چہرہ اُداس پریشان ہو گا۔ ۔ کہیں گے کہ بھئی کیا بات ہے' کیوں پریشان ہو؟ حالانکہ پریشانی دل میں ہے' چہرے میں تھوڑا ہی ہے۔ مگر ہ آئینہ ہے۔ جو دل میں ہوتا ہے وہی اوپر آجاتا ہے۔ جب قلب میں نور ایمان چمکتا ہے۔ تو اس کی چمک ۔ چہرے کے اوپر نمایاں ہوتی ہے۔ کفر اندر بھرتا ہے تو چہرے پر فساد اور سخت دلی نمایاں ہوتی ہے۔ تو ایمان نور چہرے پر آتا ہے ؎

مرد حقانی کی پیشانی کا نور
کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

آدمی فوراً پہچان لیتا ہے۔ بہر حال **الظاهر عنوان الباطن** ظاہر باطن کا عنوان ہوتا ہے۔ جو باطن میں پا ہوا ہوتا ہے وہ ظاہر کھول دیتا ہے۔ صحابہؓ کے چہروں پر نور ایمان برس رہا تھا تو ہزاروں آدمی ان کے چہرے لھ کر مسلمان ہوگئے کہ یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہیں۔

حدیث میں ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ' یہ خبر سن کے عرب میں آئے کہ کوئی نبی پیدا ہوئے ں۔ چونکہ پچھلی کتابیں پڑھی تھیں۔ دنیا کو انتظار لگا ہوا تھا کہ اس زمانے میں کوئی نبی مبعوث ہونے والے ں۔ وہ علامتیں جو اس نبی کی ہیں' پائی جارہی ہیں۔ تو جب دعویٰ نبوّت سنا۔ یہ فوراً گئے کہ میں جاکر دیکھوں ___ آپ صحابہؓ کے مجمع میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی یہ پاس نہیں پہنچے' تو اچانک دور سے چہرہ مبارک پر نظر ی' تو چلّا کر کہا کہ

واللّٰہ لیس ھذا الوجه وجه الکذّاب خدا کی قسم یہ چہرہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہے۔ چہرہ خود بتلا رہا ہے ۔ اس کے اوپر سچائی برس رہی ہے۔ اس کے چہرے کا نور بتلا رہا ہے کہ اس کے قلب کے اندر نورِ نبوت بھرا ا ہے۔

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ صحبت سے وہ قلبی نور منتقل ہوتا ہے جو دوسروں کے قلب کے ر ہے۔ اس لئے دین میں کمال پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ اہلُ اللہ' اکابرِ دین کی صحبت ہے کہ کتاب ، وہ چیز حاصل نہیں ہوگی' جو قلوب سے حاصل ہوگی۔ بلکہ کتاب کا مضمون بھی آپ سمجھیں گے، تو میتوں کی بدولت سمجھیں گے۔ اگر معلّم اور مربّی کتاب کا مطلب نہ سمجھائیں' وہ مطلب آپ کا اپنا مطلب گا' کتاب والے کا مطلب نہیں ہوگا' خدا کا مطلب نہیں ہوگا' کتاب والے کا مطلب جب سمجھیں گے' ب کتاب والا خود بتلائے یا کسی کو بتلا کر بھیجے تو اللہ نے اپنی کتاب کا مطلب اپنے رسول کو سمجھایا' رسول نے

اپنی صحبت سے صحابہؓ کو سمجھایا۔ صحابہؓ نے اپنی صحبت سے اپنے شاگردوں کو سمجھایا۔ محض کتاب سے کام نہیں چلا' جب تک مربیوں کی شخصیت سامنے نہ ہوئی۔ ان کی صحبت حاصل نہ ہوئی۔ تو بڑا ذریعہ فیضِ صحبت ہے۔ جس سے دین اور دینی اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

علم واخلاق کے حصول کا دوسرا طریق' مواخاۃ فی اللہ

اس لئے بڑی چیز فیضِ صحبت ہے۔ لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ صاحب ہم ایک ایسی بستی میں ہیں۔ وہاں ہمیں کوئی اچھا آدمی نظر نہیں پڑتا۔ جس کی صحبت میں بیٹھا کریں نہ ہماری بستی میں کوئی عالم ہے' نہ کوئی درویش ہے اور ویسے ہی اچھے تو خود ہم بھی اچھے ہی ہیں۔ ہم کس کے پاس جائیں؟ اتنے اچھے ہم بھی ہیں۔ تو کوئی ہے ہی نہیں۔ جس کی صحبت اٹھائیں کیا ہمیں مایوس ہو جانا چاہئے؟ کیا ہمارے اخلاق درست نہیں ہوں گے؟ اس لئے کہ آپ نے بتلایا کہ دین' علم اور اخلاق کے کمال کے لئے صحبت اصل چیز ہے اور ہمارے پاس کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے کہ ہم اس کے فیضِ صحبت سے دین واخلاق حاصل کرلیں تو ہماری اصلاح کی کوئی صورت نہیں رہی۔ کیا ہمیں مایوس ہو جانا چاہئے؟ ___ میں اس کے لئے عرض کرتا ہوں کہ نہیں۔ آپ کے لئے ایک دوسرا راستہ ہے۔ اگر نیک صحبت میسّر نہ ہو' پھر ایک اور تدبیر ہے۔ جس سے آپ اپنے دین میں کمال پیدا کرلیں۔ اخلاق درست کرلیں اور سیدھے راستے پر پڑ جائیں۔

وہ یہ ہے کہ آپ کسی ایک آدمی سے دوستی پیدا کرلیں۔ اور دوستی اللہ کے لئے پیدا کریں۔ معاہدہ یہ ہو کہ ہم اس لئے دوستی کررہے ہیں کہ میں تمہارے دین کی حفاظت کروں گا' تم میرے دین کی حفاظت کرنا اگر میں نماز میں سستی کروں کان سے پکڑ کر گھسیٹ کر مسجد کے اندر لے جانا اور تم نے اگر سستی کی' میں لے جاؤں گا۔ تم اگر بُرے راستہ پر گئے' میں زبردستی ہٹاؤں گا۔ اگر میں چلوں تو تم ہٹانا۔ ہم اس لئے آپس میں دوستی کرتے ہیں کہ اس دوستی کی وجہ سے ایک دوسرے کے دین کی حفاظت ہو جائے۔

آپ اندازہ کیجئے کہ اگر آپ نے کسی ایک شخص سے دوستی کرلی اور اس میں روک ٹوک شروع ہوئی اور روک ٹوک دوسرا ہی کرسکتا ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ اپنا عیب انسان کو نظر نہیں آتا۔ دوسرا فوراً پرکھ لیتا ہے کہ یہ عیب کی بات ہے۔ مثل مشہور ہے کہ دوسرے کی آنکھ کا تنکا بھی شہتیر ہو کے نظر پڑتا ہے اور اپنی آنکھ کا شہتیر بھی آدمی تنکا نہیں سمجھتا۔ اپنی بُرائی کو آدمی خود محسوس نہیں کرتا۔ دوسرا فوراً سمجھ لیتا ہے۔ یہ بُرائی ہے۔ اپنے ساتھ آدمی کو بڑا حُسنِ ظن ہوتا ہے کہ میں تو اچھا ہوں۔ میرے میں کوئی خرابی نہیں۔ اس حُسنِ ظن سے جب دیکھتا ہے اپنی ہر حرکت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے کوئی بُرائی کی۔ دوسرے کو اتنا حُسنِ ظن ہوتا نہیں۔ اس واسطے وہ نگاہ رکھتا ہے۔ پھر پتہ چل جاتا ہے کہ یہ بُرائی ہے اور ہے وہ دوست' تو فوراً ٹوکے گا کہ بھئی! اس برائی کو چھوڑ دو۔ اس دوستی کو شریعت کی اصطلاح میں مواخات کہتے ہیں۔ یعنی دین کی خاطر بھائی چارہ قائم کرنا۔ کہ بھئی! جب میں کسی اچھی جگہ جاؤں گا' تمہیں ساتھ لے جاؤں گا' تم کہیں جاؤ تو مجھے ساتھ لے جانا۔ تم بُرائی کرو' تو میں روک دوں گا۔ میں بُرائی کروں تو تم مجھے روک دینا۔ غرض ایک دوسرے کے دین کی حفاظت کریں گے۔ اس لئے بھائی بندی اور دوستی اختیار کرتے ہیں۔ اس کو مواخات فی اللہ کہتے ہیں۔

یہ اصول خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ آپؐ تشریف لائے۔ تو ایک مہاجر اور ایک انصاری کو ملا کر دونوں میں آپؐ نے بھائی چارہ قائم کیا۔ جتنے تھے سب کو جوڑا

وڑا بنادیا۔ یہ تمہارا دینی بھائی' یہ تمہارا دینی بھائی۔ اخیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ رہ گئے۔ انصار کی تعداد تم ہوگئی۔ سب مہاجرین کا بھائی چارہ قائم ہوگیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نمبر آیا تو اب کوئی انصاری باقی ہیں تھا کہ ان کی بھائی بندی کسی سے کرائی جائے۔ حضرت علیؓ میں کچھ آزردگی پیدا ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا انا اخوک فی اللہ تیرا دینی بھائی میں بنتا ہوں اور میرے ساتھ معاہدہ کر۔ حضرت علیؓ خوش ہوگئے۔ اس سے بہتر کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھائی بنیں۔ بہرحال اس کو مواٰخات فی اللہ یعنی اللہ کے لئے بھائی بندی ائم کرنا کہتے ہیں۔ اس طرح سے اگر آپ بھائی بندی اختیار کریں تو چالیس دن میں پتہ چلے گا کہ کتنی بُرائیاں ور ہوگئی ہیں۔ اس واسطے کہ وہ دوست آپ کی بُرائیاں دیکھ دیکھ کہ آپ کو مطلع کرے گا۔ آپ متنبہ ہوں گے۔ بہت سی بُرائیوں کی اصلاح ہوجائے گی بہت سے بُرے اخلاق چھوٹ جائیں گے' اس کے بھی چھوٹ جائیں گے' آپ کے بھی چھوٹ جائیں گے۔ تو بھائی بندی کے اصول سے آپ نے وہ چیز کمالی۔ جو کسی شیخ قت سے کماتے' کسی عالم ربانی کی صحبت سے کماتے یا کسی درویش ربانی کی صحبت میں بیٹھ کر کماتے ___ اب یہ عذر باقی نہیں ہے کہ صاحب! میری بستی میں نہ کوئی عالم ہے نہ درویش نہ بچے لوگوں میں سے کوئی ہے' یرے اخلاق درست نہیں ہوسکتے تو دوسرا طریقہ مواٰخات کا ہے۔ اس کے ذریعے اپنے اخلاق درست کریں۔ لر اس اصول پر چل کر چالیس دن کے بعد فرق محسوس کریں گے۔ اگر اسی طرح برس دن گزر جائیں۔ اس قت تک آپ ولی بن جائیں گے۔ اس لئے اصل چیز فیضِ صحبت ہے۔ دوسرے درجے کی چیز مواٰخات ہے۔

علم واخلاق کے حصول کا تیسرا طریق' اِتعاظ بالغیر

لیکن اگر آپ پھر کہیں کہ صاحب! میں ایک ایسی بستی میں ہوں جہاں کوئی اچھا آدمی نہیں کہ میں اسے وست بناؤں۔ سب بُرے ہی برے پھر رہے ہیں۔ یہ عقل سے تو بعید ہے کہ کوئی ایسی بستی ہو کہ اس میں کوئی ی اچھا آدمی نہ ہو۔ یہ ناممکن اور محالات میں سے ہے۔ جہاں مسلمانوں کا مجمع ہوگا۔ سو پچاس ہوں گے۔ تو لماء یہ لکھتے ہیں کہ چالیس آدمی جمع ہوجائیں۔ ان میں کوئی نہ کوئی مقبولِ الٰہی ضرور ہوتا ہے۔ تو ایک بستی کی ستی ہو اور کوئی اللہ کا مقبول نہ ہو۔ یہ نہیں ہوسکتا ___ لیکن میں تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرتا ہوں کہ بستی کے اندر کوئی بھلا آدمی نہیں اور دوست ہونے کے بجائے سارے آپ کے دشمن ہی دشمن پھر رہے ہیں' خواہ ہی بدخواہ ہیں کوئی بھی نیک انسان نہیں۔ میں کس سے بھائی چارہ قائم کروں؟

میں اس کے لئے ایک تیسری تدبیر بتلاتا ہوں کہ آپ ان دشمنوں سے فائدہ اٹھائیں۔ وہ کیسے؟ اس کو تعاظ بالغیر کہتے ہیں۔ یعنی دوسروں سے عبرت پکڑ کر اپنی حالت کو درست کرنا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ س کی ٹوہ لگائیں ، کہ آپ کے دشمن آپ کے حق میں کیا کہتے ہیں ___ ظاہربات ہے کہ دشمن آپ کی ھلائیاں تو پھیلانے سے رہے۔ وہ تو چھانٹ چھانٹ کے آپ کی برائیوں کو شہرت دیں گے۔ فلانے میں یہ ھوٹ ہے' یہ بُرائی ہے۔ اگر آپ کی بھلائیاں شائع کرنے لگیں' وہ دشمن ہی کیا ہوئے۔ وہ تو آپ کے دوست وئے۔ مگر دشمن کا کام یہی ہے کہ بُرائیاں چن چن کر پھیلائے' بدنام کرنے کی کوشش کرے' رسوا کرے' آپ س دشمن سے شیخ وقت کا کام لیں۔ وہ یہ کہ آپ یہ سنیں ، کہ میرے دشمن کیا کہتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے جائیں پ اسے چھوڑتے جائیں۔ جتنی برائیاں وہ بیان کریں' آپ اسے ایک ایک کرکے چھوڑ دیں۔ چالیس دن نک آپ عمل کرکے دیکھیں۔ بیسیوں برائیاں آپ میں سے ختم ہوجائیں گی۔ تو دشمن سے آپ نے وہ کام لے لیا' جو شیخ وقت سے لیا جاتا ہے۔ اگر آپ کام لینا چاہیں' دشمن سے بھی لے سکتے ہیں ___ تو پہلی چیز فیض

صحبت، دوسری مواٰخات فی اللہ اور تیسری اِتعاظ بالغیر ہے ۔ کہ غیر سے نصیحت حاصل کرنا۔ تو دشمن سے آپ نے شیخ وقت کا کام لے لیا۔ اس لئے اگر کوئی اپنے دین کو درست بنانا چاہے تو راستہ کہیں رُکا ہوا نہیں ہے۔

علم واخلاق کے حصول کا چوتھا طریق ’محاسبۂ نفس

اور اگر آپ یوں کہیں کہ صاحب! میں ایک ایسی جگہ ہوں کہ جہاں نہ کوئی عالم وعارف نہ کوئی دوست نہ دشمن۔ گویا یہ بعید بات ہے کہ دوست نہ ہو۔ لیکن دشمن بیسیوں مل جاتے ہیں۔ دشمن تو ٹکے سیر ملتے ہیں اور دوست سینکڑوں روپے سیر بھی نہیں ملتا۔ بلکہ ٹکے سیر بھی زیادہ قیمت ہے۔ دشمن تو مفت بھی مل جاتے ہیں۔ اس واسطے کہ آدمی پڑھا نہ لکھا تو جہالت کی وجہ سے دوسروں کے ساتھ دشمنیاں ہی کرے گا۔ دوستیاں علم واخلاق سکھاتے ہیں۔ جب علم واخلاق حاصل نہ کئے تو آدمی دنیا کی دشمنی اور حسد ہی کرتا پھرے گا۔ بُرائی چاہے گا بھلائی نہیں چاہے گا۔ اگر آپ یوں کہتے ہیں کہ میں بالکل تن تنہا ہوں۔ میرے اخلاق کی درستگی کا کوئی طریقہ نہیں۔ اس لئے کہ سفر کرکے یوں نہیں جاسکتا کہ میرے پاس پیسہ نہیں۔ گھر میں میرے پاس کوئی عالم اور درویش نہیں۔ اپنے ماحول میں میرا کوئی دوست اور دشمن نہیں۔ میرے لئے اب تحصیل علم واخلاق اور کمال پیدا کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

تو میں چوتھی تدبیر بتلاتا ہوں کہ آپ اس کے باوجود بھی اپنے اخلاق درست کرلیں۔ اور وہ بھی صحیح طریقہ ہے، فرضی نہیں ہے۔ اس طریقہ کا نام محاسبۂ نفس ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ روزانہ آپ عشاء کی نماز کے بعد دس منٹ مقرر کرلیں اور اس میں یہ سوچیں کہ آج دن میں میں نے کتنی بھلائیاں کی ہیں اور کتنی برائیاں کی ہیں، تو عمر بھر کی بھلائی برائی یاد نہیں رہے گی۔ لیکن دن بھر کی بھلائی برائی یاد رہے گی کہ آج کس کو فائدہ پہنچایا، سخاوت کی، کس کی غیبت کی، کس کی چغلی کھائی، میں نے کوئی جھوٹی گواہی دی، کتنوں کا میں نے مال دبالیا، بدنیتی کرکے کس کا قرضہ دبالیا، جیب کتری غرض جو بھی بُری حرکت دن میں کی ہے، رات کو ضرور یاد رہے گی۔ اتنا بدحافظہ کوئی نہیں ہوتا کہ دن بھر کی باتیں عشاء کے بعد بھول جائے۔ تو محاسبہ کرکے شمار کرلیجئے کہ دس میں نے نیکیاں کی ہیں اور دس ہی بدیاں۔ دس نیکیوں پر اللہ کا سچے دل سے شکر ادا کیجئے کہ اے اللہ! میں قابل نہیں تھا کہ نیکی ادا کروں۔ یہ تیرا فضل اور احسان ہے تو نے مجھ سے نیکی کرادی۔ میرے میں کہاں اہلیت تھی۔ اگر میں نے اپنے ارادے سے نیکی کی تو ارادہ بھی تو ہی پیدا کرنے والا ہے۔ میں ارادے سے نیکی کرتا۔ لیکن اگر عمل کرنے کے سامان نہ ہوتے، عمل کیسے کرتا؟ وہ سامان تو نے ہی پیدا کئے، توفیق تو نے دی، بدن میں طاقت تو نے دی۔ تیرے فضل وکرم سے یہ نیکی ہوتی ہے۔ میں شکر کرتا ہوں اور تیرا احسان مانتا ہوں وعدۂ خداوندی ہے:۔ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ــــ جس نعمت پر شکر ادا کروگے اس نعمت کو بڑھاؤں گا، ترقی دوں گا۔ لہٰذا جب آپ نیکیوں پر شکر ادا کریں گے۔ اللہ کے وعدے کے مطابق نیکیاں بڑھنی شروع ہوں گی۔ مال پر شکر ادا کروگے، مال بڑھے گا، صحت پر شکر ادا کروگے، صحت ترقی کرے گی۔ قوت پر شکر ادا کروگے، قوت بڑھے گی۔ دین پر شکر ادا کروگے، دین بڑھے گا۔ عمل صالح پر شکر کروگے عمل صالح ترقی کرے گا۔ اس لئے کہ آیت عام ہے، لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ یہ نہیں فرمایا، لَئِنْ شَكَرْتُمْ فِي الْمَالِ لَأَزِيدَنَّكُمْ مال پر شکر کروگے، میں بڑھاوں گا اور کسی چیز پر وعدہ نہیں۔ تو کوئی قید نہیں لگائی اور جب بلا قید کے فعل آتا ہے تو ہر چیز اس میں داخل ہوجاتی ہے۔ جب آپ نے نیکیوں پر شکر ادا کیا۔ تو وعدۂ خداوندی کے مطابق اس میں ترقی ہوگی۔

اور دس ہی برائیاں یاد آئیں کہ کچھ چغلی کھائی تھی' غیبت کی تھی' کچھ یہ کیا' کچھ وہ کیا' کسی کا مال مار لیا' کچھ ناپ تول میں کمی کردی' ڈنڈی ماری اور مال کم دیا' پیسے گاہک سے پورے لے لئے یا مال خراب دے دیا دام پورے لے لئے ___ تو ایک تو حقوق العباد ہیں' وہ توبہ سے معاف نہیں ہوں گے جب تک آپ صاحب حق سے معافی نہ چاہیں' معاف نہیں ہونگے اور ایک حقوق اللہ ہیں دیانت کے بارے میں۔ اس میں توبہ سے معاف ہو جانے کی توقع ہے۔ تو جب بدیاں یاد آئیں۔ ان سے توبہ کرلیں دس بدیاں تھیں۔ چاہے دس دفعہ توبہ نہ کریں۔ ایک دفعہ ہی توبہ کرلیں۔ دس بدیاں معاف ہو جائیں گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر وعدۂ خداوندی ہے:۔ التائب من الذنب کمن لا ذنب لہٗ ___ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے' جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ بالکل پاک صاف ہو گیا۔ تو نیکیوں پر شکر کیا' وہ بڑھنی شروع ہو گئیں۔ بدیوں پر توبہ کی وہ گھٹنی شروع ہو گئیں۔ چالیس دن اگر آپ اس عمل کو روزانہ کریں گے۔ اگر دس دس بدیاں روزانہ حساب لگائیں تو چالیس دن میں چار سو بدیاں کم ہو گئیں۔ حالانکہ چار سو آپ کرتے بھی نہ' مگر بالکل مٹ گئیں۔ شیخ وقت اتنی بدیاں نہ مٹا سکتا۔ جتنی آپ نے محاسبۂ نفس سے مٹا دیں۔ آپ نے اپنے اخلاق درست کرلئے ___ اب آپ کے لئے کوئی حجت باقی نہیں رہی کہ صاحب! میرے ہاں نہ کوئی شیخ ہے نہ عالم نہ دوست نہ دشمن۔ مجھ سے اللہ میاں پوچھیں گے کہ تو نے اخلاق کیوں نہیں درست کئے؟ میں کہہ دوں گا' حضور! اخلاق کو درست کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں کیسے درست کرتا اور پیسہ میرے پاس نہیں تھا کہ سفر کر کے کسی بزرگ کے پاس جاؤں۔ اس واسطے میں بد اخلاق رہ گیا۔ فرمائیں گے نہیں تو تنہا پہاڑ پر تھا۔ جب بھی اخلاق درست کرنے کا طریقہ تھا اور وہ محاسبہ تھا۔ اپنے نفس کا حسب لیتا تھا۔

اگر آپ عشاء کے بعد دس منٹ روز اس مراقبہ کو کرلیا کریں اور پھر اندازہ کریں چالیس دن کے بعد کتنے اخلاق درست ہوتے ہیں۔ کتنی بد اخلاقیاں مٹتی ہیں' کتنی نیکیاں بڑھتی ہیں۔ آپ جتنا کام ایک شیخ وقت سے لیتے۔ آپ نے شیخ وقت اپنے نفس کو بنالیا۔ نفس نے وہی کام کیا جو ایک شیخ وقت اور مربی دین کرتا ہے۔

اپنے عزم کے بغیر اصلاح ممکن نہیں

حاصل یہ نکلا کہ اگر آپ اپنے اخلاق کو درست کرنا چاہیں تو راستہ بند نہیں ہے۔ ہاں اپنے اخلاق کی آپ اصلاح نہ چاہیں تو پیغمبر کے زمانے میں لوگ موجود ہوتے ہیں۔ اپنی اصلاح نہیں کرتے۔ جب کرنا چاہیں تو اللہ کے رسول نے راستے بتلا دیئے ہیں' کر سکتے ہیں۔ نہ چاہیں' خود پیغمبر بھی نصیحت کریں۔ آدمی درست نہیں ہو سکتا۔ جنہیں اپنی اصلاح منظور تھی۔ اللہ کے رسول کے قول پر عمل کیا۔ کوئی صدیقؓ بنا' کوئی فاروقؓ بنا' کوئی ذوالنورینؓ بنا' کوئی علی مرتضیٰؓ بنا اور جنہیں اصلاح مقصود نہیں تھی تو کوئی ابوجہل بن گیا' کوئی ابولہب بن گیا' کوئی مسیلمہ کذاب بن گیا۔ غرض بگڑے ہی رہے اور نبی وقت سے بھی ان کی اصلاح نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ انہیں خود اپنی اصلاح منظور نہیں تھی

تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

جب تمہیں ہی مقصود نہیں کہ اپنی اصلاح کرو تو دس تاویلیں کرلو گے' دس باتیں بنالو گے۔ مگر اللہ کے ہاں تاویلیں نہیں چلیں گی۔ دنیا کو آدمی دھوکہ دے سکتا ہے۔ تو خدا کی حجت بندے پر پوری ہو چکی۔ کسی بھی حالت میں ہوں اصلاح اخلاق کا راستہ موجود ہے۔ دوست و دشمن میں ہوں جب بھی' تنہا یا جماعت میں ہوں تب بھی۔

یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ دنیا میں ہر چیز میں شر اور برائی اس کی ذات میں گھسی ہوئی ہے اور خوبی محنت کر کے لائی جاتی ہے۔ تو انسان کا بچہ بھی پیدائشی طور پر برائیوں سے بھرپور ہے۔ جب تک اصلاح کی جدوجہد نہیں کرے گا۔ اس میں خوبی پیدا نہیں ہوگی۔ اس کی طبعی جہالت رفع نہیں ہوگی۔ جب تک علم حاصل نہ کرلے۔ اس کے اخلاق پاکیزہ نہیں بنیں گے جب تک کسی بااخلاق کی صحبت نہ اٹھائے یا قلب کا محاسبہ نہ کرے۔

آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

جب آدمی اپنی اصلاح خود نہ چاہے' کوئی اصلاح نہیں کرسکتا۔ خود اپنی خواہش سے آدمی اصلاح کے لئے آمادہ ہوتا ہے ۔۔۔ قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا'

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰهَا اے پیغمبر! قیامت سے آپ اسی کو ڈرا سکتے ہیں' جو دل میں ڈرنے کا ارادہ رکھتا ہے' جو اپنے دل میں ڈرنے کا مادہ رکھتا ہے اور جس نے یہ تہیہ کرلیا کہ کچھ بھی ہو مجھے نہیں ڈرنا' اسے کوئی نہیں ڈرا سکتا۔ وہ جب قبر میں جائے گا جبھی اسے ڈر لگے گا ۔۔۔ دنیا میں اسے کوئی نہیں ڈرا سکتا۔ جب تک کوئی خود نہ چاہے۔ بڑے سے بڑا عالم آجائے لیکن وہ یہ نہ چاہے کہ مجھے علم پہنچے' کبھی بھی علم نہیں پہنچے گا۔ بڑے سے بڑا درویش اور ربانی آجائے اور اس کا جذبہ نہ ہو کہ میں اخلاق درست کروں' کبھی بھی اخلاق درست نہیں ہوں گے اور اگر اپنا جذبہ ہو کہ اخلاق درست کروں۔ تو کوئی بھی نہیں آئے گا۔ آپ اپنے نفس سے درست کرلیں گے۔ اصل میں آپ کا جذبہ اور آپ کا عزم ہے۔ یہ اصل چیز ہے۔ عارف رومیؒ نے کہا ہے کہ

آب کم جو' تشنگی آور بدست

پانی کی تلاش زیادہ نہ کرو' اپنے اندر پیاس پیدا کرو۔ پیاس ہوگی تو پانی خود آجائے گا۔ پیاس تو ہے نہیں۔ اور آدمی یوں چاہے کہ پانی آجائے' تو اوپرے دل سے پانی کی تلاش کرے گا۔ اوپرے دل سے طلب کرنے پر کچھ بھی نہیں ملا کرتا۔ دل کے جذبے سے جب طلب ہوتی ہے' جبھی ملتا ہے۔

اگر بیوی یوں کہے کہ فلاں زیور بنوا کے دے اور خاوند کے دل میں جذبہ پیدا ہو تو خاوند چوری کرے گا' ڈکیتی کرے گا۔ مگر اسے بنا کے دے گا۔ اس لئے کہ جذبہ پیدا ہوگیا اور جذبہ نہیں ہے تو وہ لاکھ چلائے' کچھ بھی نہیں ہوگا۔ کام تو اپنے جذبے سے چلتا ہے جب تک دل میں طلب نہیں ہوگی' محض کہنے سننے سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہ حال ایمان اور دین کا ہے۔ لاکھ وعظ کہنے والے وعظ کہیں۔ لیکن جب تک آپ کا عزم نہیں ہوگا کہ ہم درست ہوں۔ کبھی بھی درست نہیں ہوں گے۔ اگر آپ وعظ میں اس نیت سے آئیں کہ بھئی! دیکھیں کون کیسا بولتا ہے۔ گویا آپ تماشہ دیکھنے آئے کہ بھئی! مداری کا تماشہ تھا۔ فلاں نے اچھا کہا اور فلاں نے غلط۔ کبھی بھی فائدہ نہیں ہوگا اور اگر اس لئے آئے کہ مجھے بھی کچھ دین کی بات لے کے جانی ہے' مجھے زندگی میں انقلاب پیدا کرنا ہے۔ اگر کوئی جاہل آدمی بھی سچی بات کہے گا۔ تو اس سے بھی آپ عبرت پکڑیں گے۔ اپنے دل کی خود ہی اصلاح کرلیں گے۔ تو پھر اپنے اوپر بات رہی۔ اپنے اندر طلب صادق پیدا کیجئے۔ اپنے اندر پیاس پیدا کیجئے۔ پانی آجائے گا۔ اپنے اندر زر کی طلب پیدا کیجئے۔ دولت آنے لگ جائے گی۔ اس لئے کہ دس حیلے کریں گے۔ دوکان پر بیٹھیں گے' زمین پر جائیں گے' صنعت و حرفت کریں گے۔ دولت آجائے گی اور اگر آپ کے دل میں طلب نہیں ہے' سست پڑا رہنا آپ کو گوارا ہے کہ بس چارپائی پر پڑے رہو' اس سے کیا ملے گا؟

اس کی ایسی مثال ہے' جیسے ایک کاشت کار ہو۔ برسات کی ہوائیں چلیں اور پانی پڑنا شروع ہوا۔ تو اس وقت بیج ڈالا جاتا ہے' بیج ڈالتے ہیں تو کھیتی اگتی ہے۔ مگر کاشت کار نے کہا' کیسی عمدہ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور یہ چار مہینے ٹھنڈی ہواؤں کے ہیں۔ میں پڑ کے آرام سے سوؤں گا۔ کون جائے کھیت پر؟ کون بیج ڈالے؟ برسات کے چار مہینے اس نے آرام سے چارپائی پر پڑ کے گزارے۔ یہاں تک کہ برسات ختم ہوگئی' گرمی آئی اور لو چلنی شروع ہوئی۔ لوگ اپنے اپنے گھر میں غلے لے کے آئے اور یہ اب منہ تک رہا ہے۔ بیج ڈالتا تو غلہ لے آتا؟ مگر اس نے سونے میں اور آرام طلبی میں سارا وقت گزار دیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب تو جو بیج پڑا ہوا ہے' اس کے بھی مارے جانے کا اندیشہ ہے' لُو چل رہی ہے' آگ کی سی ہوائیں چل رہی ہیں۔ اب کھیتی باڑی کا کیا کام؟ تو جیسے اس وقت سُست کاشت کار کو پشیمانی اور ندامت ہوگی۔ مگر وہ ندامت کام نہیں دے گی۔ اس لئے کہ وقت گزر چکا۔ اسی طرح سے اگر ایک دین کے طالب میں سچی طلب نہیں ہے اور یہ دنیا کی عمر اس نے لہو ولعب اور کھیل کود میں گزار دی اور یہ سمجھ کے کہ آج تو چارپائیاں بھی ہیں' بستر بھی ہیں اور کھانے کی نعمتیں بھی ہیں۔ اب کون جائے نماز کو؟ اور کون روزے رکھے؟ کون دین کی تلاش کرلے؟ یہ مزے پھر کہاں ملیں گے۔ تو جب موت کا وقت آئے گا۔ اس وقت کہا جائے گا۔ **اَخْرِجُوْا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ** اس نفس کو حوالے کرو' یہ تمہاری ملک نہیں ہے۔ آج کے دن عذاب چکھنا پڑے گا۔ اب ندامت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تو اس وقت ندامت نہ فائدہ دے گی نہ عمل کا وقت ہوگا۔

دنیا کا ہر ذرہ واعظ ہے

حدیث میں ہے کہ بعض لوگ موت کے وقت ملکُ الموت سے کہیں گے کہ اے ملکُ الموت! مجھے تھوڑا سا وقفہ دے دو کہ میں توبہ کرلوں اور میں اللہ کی طرف رجوع کرلوں۔ ملکُ الموت حیرت سے کہیں گے کہ کیا تیرے پاس میرے قاصد نہیں پہنچے؟ انہوں نے تجھے موت کا پیغام نہیں پہنچایا؟ جو آج توبہ کے لئے مجھ سے وقت مانگ رہا ہے؟

میرے بیسیوں قاصد اسی لئے پہنچے کہ تو توبہ کرے' وقت موجود ہے۔ اتنے قاصدوں پر جب تو نے توبہ نہ کی۔ میں تو آج آخری قاصد ہوں۔ اس کے بعد توبہ کا زمانہ ہی نہیں۔ وقت گزر گیا۔

وہ کہے گا کہ میرے پاس تو کوئی قاصد نہیں پہنچا۔

ملکُ الموت کہیں گے' قاصد نہیں پہنچا؟ میں نے بہت سے اپنے پیامبر بھیجے۔ جنہوں نے اطلاع دی ہوگی کہ میں تیرے پاس آنے والا ہوں ___ وہ کہے گا میرے پاس کوئی نہیں پہنچا ___ فرمائیں گے۔ کیا تیری داڑھی میں سفید بال نہیں آئے؟ کیا تیرے سر کے اندر بڑھاپے کے آثار نمایاں نہیں ہوئے؟ یہ بڑھاپا میرا ہی تو قاصد تھا' جو خبر دے رہا تھا کہ میرے آنے کا وقت آرہا ہے۔ موت کا پیغام آچکا ہے۔ موت قریب آنے والی ہے۔ وہ میرا قاصد ہی تھا۔

فرمائیں گے۔ کیا تیرے پوتے نہیں پیدا ہوئے؟ نواسے نہیں پیدا ہوئے؟ یہ پوتے اور نواسے میرے ہی قاصد تھے کہ اب ان کا زمانہ آگیا ہے۔ تمہارے لئے دنیا کا وقت ختم ہو چکا۔ ان کے لئے جگہ خالی کرو۔ یہ میرے ہی تو قاصد تھے' جو خبر دے رہے تھے۔ **وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ** کیا ڈرانے والے تیرے پاس نہیں آئے؟ یہ سارے میری طرف سے آئے تھے۔

اور فرمائیں گے' کیا یہ دن رات کا لوٹ پھیر' اس نے تجھے وعظ نہیں کیا؟ سورج طلوع ہوا' طلوع کے بعد

عروج کرتے کرتے اوپر پہنچ گیا۔ اس کے بعد جب گرنا شروع ہوا' یہ اس کی موت کا پیغام تھا۔ سورج کا چہرہ فق ہوا' روشنی زرد پڑ گئی اور آخر میں غروب ہو کر چھپ گیا۔ گویا ختم ہو گیا۔ گویا روز طلوع اس کی حیات ہے اور غروب اس کی موت ہے۔ جب اتنی بڑی ہستی روزانہ آتی بھی ہے اور فنا بھی ہوتی ہے۔ یہ اطلاع ہے کہ دنیا کے ہر ذرّے کے لئے فنا بھی ہے' مٹنا بھی ہے' چھپ جانا بھی ہے۔ تو سورج بھی ایک واعظ ہے۔ جو وعظ و نصیحت کہتا ہے۔ لیکن کوئی عبرت کی نگاہ سے دیکھے، تو اس کے وعظ کو سنے گا ___ اور اگر بیلوں کی نگاہ سے دیکھے' تو بیل کے سامنے بھی سورج چھپتا ہے۔ مگر وہ اس سے نصیحت حاصل نہیں کرتا۔ اس لئے کہ نہ عقل ہے نہ علم۔ اگر انسان بھی کائنات کے واقعات کو بیلوں کی طرح دیکھنے لگے کہ واقعات کی صورت تو دیکھ لے۔ عبرت' نصیحت حاصل نہ کرے تو ہم میں اور جانوروں میں کیا فرق رہ گیا۔ انسان اور جانور میں یہی فرق ہے کہ جانور واقعات کی صورتوں کو دیکھتا ہے۔ انسان ان کی حقیقتوں میں گھس کر ان سے کچھ علم اور نصیحت حاصل کرتا ہے۔

حق تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی۔ فرمایا :

وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○
وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ○ (یوسف پ۱۳ آیت ۱۰۵،۱۰۶)

کتنی ہماری قدرت کی نشانیاں ہیں کہ انسان پر گزرتی ہیں۔ انسان دیکھتا ہے اور آنکھ بند کر کے چلا جاتا ہے۔ اس سے عبرت و نصیحت حاصل نہیں کرتا اور فرمایا' یہ بہت سے وہ لوگ ہیں کہ ایمان لائے ہوئے ہیں۔ پھر بھی شرک میں مبتلا ہیں۔ مومن بن گئے ہیں' مگر شرک سے خالی نہیں ہیں۔ اس واسطے کہ ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ ہر چیز سے کٹ کر اللہ کی طرف رجوع کرتے۔ ہر حادثے کو دیکھ کر عبرت پکڑتے اور مالک کو پہچانتے۔ لیکن یہ پھر بھی اپنے ہی نفس کی رضا میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنی ہی نفسانی خواہشات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اپنے ہی آرام کی فکر میں ہیں۔ نہ آخرت نہ عبرت نہ نصیحت پیش نظر' تو مومن بھی ہیں مگر ساتھ میں مشرک بھی ہیں۔ انسان اور حیوان میں یہی فرق ہے کہ سورج کے طلوع و غروب کے واقعات حیوان کے اوپر بھی گزرتے ہیں اور انسان بھی دیکھ رہا ہے۔ حیوان فقط شکل کو دیکھتا ہے' انسان اس کی حقیقت پر غور کرتا ہے کہ جب اس میں تغیر ہے تو کون سا ذرّہ خالی ہوگا' جس میں تغیرات نہ ہوں۔ ہواؤں کا چلنا' زمین کی تعمیر و تخریب' موسموں کا آنا جانا' پھلوں کا آنا اور مٹ جانا۔ ذرہ ذرہ گواہی دے رہا ہے کہ یہ عالمِ موت اور حیات کی کشمکش میں ہے۔ پیدائش بھی ہے اور موت بھی ہے' عروج بھی ہے زوال بھی ہے۔ ترقی بھی ہے' تنزّل بھی ہے' تعمیر بھی ہے' تخریب بھی ہے۔ جو چیز پیدا ہوئی وہ موت کے منہ میں ضرور جائے گی۔

حدیث میں فرمایا گیا :

لدوا للموت وابنوا للخراب

جنو موت کے لئے' بچوں کو مرنے کے لئے پیدا کرو' تعمیریں بناؤ ڈھانے کے لئے' جو تعمیر بنے گی' ایک دن اس کی تخریب بھی ہوگی۔ دنیا میں ہر تعمیر کے لئے تخریب اور ہر بقاء کے لئے فنا لازم' ہر حیات کے لئے موت لازم' ہر آغاز کے لئے انجام لازم ہر ابتدا کے لئے انتہا لازم۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس میں تغیر نہ ہو۔

ہمارے مرشد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاذ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ دنیا کے ذرّات کو اور حالات کو دیکھو کہ وہ اعلان کر رہے ہیں کہ **فافهم فافهم** اب بھی سمجھو' اب بھی سمجھو' غفلت کی نیند کو چھوڑ دو ان تغیّرات کو دیکھ کر اب بھی متوجہ ہو

لو کہ تم میں بھی تغیّر آنے والا ہے۔ تم بھی اس دنیا کے جز ہو۔ جب دنیا کے ہر جز میں تغیّر ہے اور تغیر کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہر چیز فنا کی طرف جارہی ہے۔ تو تم میں بھی تغیّر ہے۔ تم بھی فنا کی طرف جارہے ہو۔ انسان پر جو بیماریاں آتی ہیں۔ یہ علامت ہے کہ جب یہ تغیّر صحت سے پیدا ہوا تو صحت والے پر بھی ایک دن تغیّر آنے والا ہے، طاقت بدن میں آتی ہے ایک دن اس کے گھٹنے کا زمانہ بھی آتا ہے۔ غذائیں ہضم کرنے کی قوت ہوتی ہے، ایک دن ضعف میدہ کا زمانہ ہے، جوانی آتی ہے، ایک دن بڑھاپے کا دور آنے والا ہے۔ جب انسان کے عوارض میں تغیّرات ہیں تو ذات میں بھی تغیّر ہوگا۔ یہ بھی ایک دن ختم ہو جائے گا ___ ان تمام چیزوں کو دیکھا جائے تو یہ سارے واعظ اور مقرّر ہیں۔ سارے نصیحتیں کر رہے ہیں۔ آپ اس تلاش میں ہیں کہ کسی واعظ، مقرّر یا عالم کو بلائیں اور تقریر سنیں۔ میں نے ہزاروں واعظوں کا پتہ دے دیا کہ گھر بیٹھے اور وعظ سنتے جایئے۔ سورج زمین، ہواؤں کا چلنا، دنیا کے تغیّرات۔ الغرض ذرہ ذرہ واعظ ہے، سننے والا اور عبرت پکڑنے والا ہونا چاہئے وہ ہر جز سے عبرت پکڑے گا۔ تو گھر میں واعظ موجود ہے اور گھر چھوڑ آپ کے بدن کے اندر واعظ موجود ہیں۔ اپنے اندر کے تغیّرات کو دیکھئے کہ ہر ہر چیز فنا کی طرف جارہی ہے۔ ___ استاد داغ بڑا شاعر ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ؎

ہوش و حواس، تاب و تواں داغؔ جاچکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

سامان تو چلا گیا۔ اب مسافر بھی روانہ ہو رہا ہے۔ روزانہ سامان جاتا رہتا ہے اور ہمیں عبرت نہیں کہ یک وقت آرہا ہے کہ ہمیں بھی جانا ہے۔

اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے گلستان میں نوشیرواں کا واقعہ لکھتے ہوئے خوب کہا ہے کہ ؎

خیرے کن اے فلاں وغنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ در آید فلاں نماند

اے عزیز! کچھ نہ کچھ خیر اور بھلائی کرلے اور عمر کو غنیمت سمجھ۔ یہ موتیوں جیسے دن ہیں۔ جو جارہے ہیں، نمول موتی ہیں۔ جو قیمت سے نہیں، اللہ نے بلا قیمت دے دیئے ہیں۔ تو کوئی خیر کرلے اور عمر کو غنیمت سمجھ۔ س سے پہلے کہ یہ آواز دی جائے کہ آج فلاں نہیں رہا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ اس سے پہلے کچھ کرنا ہے تو کرلے۔ آج ہم قبرستانوں سے گزرتے ہیں۔ ہزاروں وہ آدمی جو ہمارے دوست، احباب، والد، عزیز، قرباء تھے آج وہ قبر کی تہہ میں پڑے ہوئے ہیں اور خاک کا جز بنے ہوئے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ افسوس یہ آدمی تھے اور آج نہیں۔ کل کو ہم پر بھی یہی وقت آنے والا ہے کہ گزرنے والے ہمارے اوپر سے گزریں گے اور ہیں گے کہ یہ لوگ کسی زمانے میں تھے۔ مگر آج ان کا نشان اور پتہ نہیں۔ تو ہر شخص اس راستے پر جانے والا ہے کچھ اس راستے کی بھی فکر کرلینی چاہئے۔

شیطانی دھوکہ

بعض آدمی کو دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ ابھی تو میں جوان ہوں۔ میرے اندر قوت ہے۔ جب ھاپا آئے گا، توبہ کرلیں گے ابھی تو کھانے پینے، لہو ولعب اور قوت کا دور ہے۔ موت کے کچھ آثار و نشانات میں ہیں۔ جب بڑھاپا آئے گا اور یہ بات سامنے آجائے گی کہ اب چند دن باقی رہ گئے۔ اس وقت توبہ کرلیں ے۔ اب مزے اڑالیں۔ عیش میں رہیں ___ مگر یہ محض دھوکہ اور شیطانی وسوسہ ہے۔ اس لئے کہ موت

کے لئے بڑھاپا' جوانی' بیماری شرط نہیں ہے۔ بلا بیماری کے آدمی بیٹھے بٹھائے چلا جاتا ہے۔ جوان بھی مرتے ہیں' بچے' بوڑھے بھی مرتے ہیں۔ موت کا بازار گرم ہے۔ سب کو آرہی ہے۔ اس وسوسے کو تب آپ دل میں جگہ دیں کہ بڑھاپے کے بغیر آدمی مرا ہی نہ کرتا۔ کہہ سکتے تھے کہ ابھی موت کا وقت ہی نہیں آیا۔ لیکن جب بڑھاپے سے پہلے موت آجاتی ہے۔ پھر دل میں یہ خیال کیسے گزرا کہ بڑھاپا آئے گا' جب توبہ کرلیں گے۔ کیا خبر ہے کہ بڑھاپا آئے گا بھی یا نہیں؟ یہ اللہ کے علم میں ہے بلکہ اگر آپ غور کریں' میں تو یوں کہوں گا کہ جوان زیادہ مرتے ہیں۔ بوڑھے کم مرتے ہیں۔ جوانی میں موت زیادہ آتی ہے۔ بڑھاپے میں کم آتی ہے۔

اور دلیل اس کی یہ ہے کہ آپ مجمعوں کو دیکھیں' بازاروں میں گھومیں۔ آپ کو بوڑھے کم نظر آئیں گے' جوان زیادہ نظر پڑیں گے اور یہ اس کی دلیل ہے کہ جوان زیادہ مرتے ہیں۔ اس واسطے کہ اگر سارے بوڑھے ہو کر مرا کرتے' تو دنیا میں بوڑھوں کی تعداد زیادہ ہوتی۔ سارے سفید داڑھی کے نظر پڑا کرتے۔ حالانکہ جوان زیادہ نظر پڑتے ہیں' بوڑھے کم نظر پڑتے ہیں۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ بڑھاپے تک پہنچنے ہی نہیں پاتے۔ پہلے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ تو جوانی میں زیادہ اور بڑھاپے میں کم موت آتی ہے۔ یہ محض ایک دھوکہ ہے کہ جب بڑھاپا آئے گا' توبہ کرلیں گے۔ بڑھاپا شرط نہیں اور تو اور ماں کے پیٹ میں بھی مرجاتے ہیں۔ دنیا میں آنے ہی نہیں پاتے۔ اس کی بھی نظیریں ہیں تو موت کے لئے کوئی خاص سبب متعین نہیں ہے۔ پھر اس میں اس دھوکے میں پڑنا کہ جب فلاں بات ہوگی' تب توبہ کریں گے۔ آج نہیں کل کریں گے یہ جو کل پر بات ٹالنے کا عادی ہو گیا ہے۔ جب وہ کل آئے گی تو اگلی کل پر ڈال دے گا۔ وہ آئے گی تو اس سے اگلی کل پر۔ اسی کل کل میں رہے گا اور موت کا وقت آجائے گا۔ توبہ نصیب نہیں ہوگی۔ جسے توبہ کرنی ہے' وہ آج کرے اور اس عمر کو غنیمت سمجھے۔

عمل کا زمانہ جوانی ہے

بلکہ یہ خیال کرے کہ عمل کرنے کا زمانہ جوانی کا ہے۔ بڑھاپے کا زمانہ عمل کا نہیں ہوتا۔ بڑھاپے کا زمانہ پنشن کا زمانہ ہے اور حق تعالیٰ کے ہاں پنشن دی جاتی ہے۔ جیسے گورنمنٹ کے ہاں پچپن سال کی عمر ہو جائے تو پنشن دے دیتے ہیں۔ مگر گورنمنٹوں بے چاریوں کے خزانے چھوٹے ہیں۔ اس واسطے وہ آدھی پنشن دیتے ہیں۔ دو گنی اور تگنی تو کیا؟ پوری تنخواہ بھی نہیں۔ آدھی تنخواہ دیتے ہیں۔ اللہ میاں کے ہاں سے پوری پنشن ملتی ہے ___ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص جوانی میں کوئی عمل کرتا تھا۔ بڑھاپا آگیا' طاقت رہی نہیں اور عمل نہیں کر سکتا۔ حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں۔ کہ نامۂ اعمال میں ثواب برابر لکھتے رہو۔ اس واسطے کہ اس نے خود نہیں چھوڑا۔ بڑھاپا ہم نے بھیجا ہے۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ لہٰذا عمل برابر لکھتے رہو۔ گویا آج بھی عمل کر رہا ہے۔ جو دس مسئلے پڑھتا اور آج وہ بھی نہیں پڑھ سکتا۔ مگر ثواب دس ہی کا لکھتے جاؤ۔ اس لئے کہ اس کے ارادے کا قصور نہیں ہے۔ لہٰذا جوانی عمل اور بڑھاپا پنشن کا زمانہ ہے۔ جس نے جو کچھ کیا' جوانی میں کیا ہے۔ اس واسطے جوانی کے اندر یہ لَیتَ وَلَعَلَّ کہ جب بڑھاپا آجائے گا' جب توبہ کرلیں گے۔ "الٹے بانس بریلی کو" یہ تو اوندھا قصہ ہے کہ جب پنشن ملنے کا زمانہ آئے' جب آدمی کہے کہ میں کام کروں گا۔ جیسے کوئی آدمی گورنمنٹ سے کہے کہ صاحب! ابھی تو میری پندرہ برس کی عمر ہے۔ ابھی آپ مجھے ملازم نہ رکھیں۔ جب میں ساٹھ برس کا ہو جاؤں' جب ملازم رکھیں۔ گورنمنٹ کہے گی کہ تو پاگل ہو گیا ہے۔ ارے ملازمت کا زمانہ جوانی کا ہے۔ بڑھاپا پنشن کا اور عمل کے چھوڑنے کا زمانے ہے۔ تو عمل کا زمانہ سمجھ رہا

ہے۔ یہی دین میں بھی بات ہے۔ جس نے جو کچھ بھی کیا ہے' جوانی میں کیا ہے۔ بڑھاپے میں تو ثواب لوٹنے کا زمانہ ہے۔ وہ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

من نمی گویم کہ زیاں کن' یا بفکر سود باش
اے زفرصت بے خبر' در ہرچہ باشی زود باش

میں یوں نہیں کہتا کہ کوئی نفع یا نقصان کا کام کرو۔ یہ کہتا ہوں کہ جو کرنا ہے جلدی کرلو۔ اس لئے کہ وقت تھوڑا رہ گیا ــــ تو عمل کا زمانہ یہی ہے جسے توبہ کرنی ہے آج کرے' کل پر اٹھا کے نہ رکھے۔

اس واسطے وعظ سن کریا دنیا کے ان ذروں سے وعظ سن کریا دیکھ کر کچھ کرنے کا جذبہ پیدا ہو' فوراً کرے۔ ممکن ہے کل کو یہ جذبہ بھی باقی نہ رہے۔

نیک کام کے لئے مشورے کی ضرورت نہیں

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: اگر کسی کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو کہ میں ایک پیسہ اللہ کے راستے میں صدقہ کروں' فوراً کردے۔ اس لئے کہ ممکن ہے گھنٹہ بعد قلب کی وہ کیفیت نہ رہے کہ ایک پیسہ دے کے کیا کروں گا اور ہزار دینے پر قادر نہیں۔ پھر یہ نہ ایک کرے گا نہ ہزار کرے گا۔ محرومی اس کے سر پر پڑے گی۔ اس لئے جب کسی نیکی کا جذبہ پیدا ہو' فوراً کر گزرے' نیکی کے اندر مشورے طلب کرنے یا استخارے کرنے کی ضرورت نہیں۔ استخارہ و مشورہ ان چیزوں میں ہوتا ہے۔ جن میں حق واضح نہ ہو کہ بھئی مشورہ کرلو' حق واضح ہو جائے۔ جس چیز کا اللہ نے حکم دے دیا۔ اس میں استخارہ کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ نے کہا کہ نماز پڑھو۔ آپ نے کہا' میں ذرا گھر والوں سے مشورہ کرلوں کہ پڑھنی چاہئے یا نہیں' تو لوگ کہیں گے' احمق آدمی! خدا کے حکم کے بعد مشورے کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ نے کہا زکوٰۃ دو کہ جی میں ذرا استخارہ کرلوں۔ اگر استخارہ اللہ سے پوچھنے کو کہتے ہیں تو وہ خود کہہ رہے ہیں کہ زکوٰۃ دے' قرآن میں حکم دے رہے ہیں۔

در کارِ خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست

کار خیر میں استخارہ کی ضرورت نہیں۔ جس میں آدمی مذبذب ہو اور اس کا خیر ہونا پوری طرح ثابت نہ ہو۔ اس میں استخارہ و مشورہ کرے۔

آج اگر کسی وعظ و نصیحت سے نیکی کرنے کا جذبہ پیدا ہو' فوراً کر گزرے' کل پر اٹھا کے نہ رکھے۔ اللہ پر بھروسہ کرے۔ پھر وہ جاری بھی ہو جائے گی۔ لَیتَ و لَعَلَّ میں نہ پڑے کہ کل کرلوں گا' پرسوں کرلوں گا۔ یہ شیطان کی طرف سے ڈھیل کرائی جاتی ہے کہ اس کے دل سے یہ جذبہ نکل جائے پھر میں اس سے نمٹ لوں گا۔ تو جب جذبہ خیر' جذبہ حق آجائے۔ اسے خدا کی طرف سے امر سمجھو' اسے کر ڈالو۔ تو اپنی اصلاح کا تھوڑا بھی جذبہ پیدا ہو' آدمی کر گزرے۔ اپنے اخلاق کو درست کرنے کا جذبہ خواہ نفس کے محاسبے سے ہو یا مواخات فی اللہ سے ہو یا غیروں سے عبرت پکڑنے سے ہو یا بچوں کی صحبت اختیار کرنے سے ہو' آدمی کر گزرے۔ اس لئے یہ حیلہ کام نہیں دے گا کہ صاحب! کوئی درویش' عالم نہیں ہے' کوئی دوست نہیں ہے' کوئی دشمن نہیں ہے۔ میں کہاں جاؤں۔ بھئی! کوئی بھی نہیں تو خود تو موجود ہے۔ اپنے نفس سے ہی کام لے سکتا ہے۔

تو یہ ایک نسخہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا۔ جو چار دواؤں پر مشتمل ہے۔ صحبتِ صالحین' مواخات فی

اللہ' اِتعاظ بالغیر اور محاسبۂ نفس۔ اب ان میں سے کوئی ایک چیز بھی مل جائے۔ وہ بھی ان شاء اللہ کار آمد ہے۔ بعض نسخہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کی ایک دوا بھی مل جائے۔ تو وہ بھی صحت کے لئے مفید ہوتی ہے اور اگر چاروں دوائیں مل کے معجون مرکب بن جائے' تو سبحان اللہ کہ صحبت نیک بھی میسّر ہو مواٰخاۃ فی اللہ کہ دینی بھائی بندی بھی ہو جائے' دشمنوں سے عبرت بھی پکڑے اور روزانہ اپنے نفس کا محاسبہ بھی کرے۔ چاروں دواؤں کا نسخہ اگر پیئے تو بڑا مقوّی ہو گا۔ جس نسخہ کا ایک ایک جز شفا کا ذریعہ ہو۔ اس نسخے کے اگر سارے اجزا مل جائیں' وہ تو اکسیر بن جائے گا۔

اس واسطے یہ چند چیزیں میں نے ذکر کیں تاکہ ان سے عبرت بھی ہو۔ ان سے اپنی اصلاح کا جذبہ بھی پیدا ہو اور ان سے اپنے اخلاق بھی درست ہوں اور آدمی یہ سمجھ لے کہ میری ذات میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ خوبی کی میں جتنی محنت کروں گا' آجائے گی۔ بُرائی محنت سے نہیں آتی۔ وہ میرے اندر پیدائشی طور پر ہے۔ اسے زائل کرنے کے لئے مجھے کچھ کرنا ہے اور اس کے زائل کرنے کے یہ چار طریقے ہیں۔ جو میں نے عرض کئے بس یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔ اب وقت بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے نفس کی اصلاح کرنے' اپنے اعمال واخلاق کو درست کرنے اور اپنے عقائد کو سچا بنانے کی توفیق دے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر چلنا نصیب فرمادے' اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمادے' حق تعالیٰ ہمارے دین اور ہماری دنیا کو درست فرمادے' ہماری آخرت کو بھی درست فرمادے' ہم میں جتنے کھوٹ ہیں۔ اللہ ان کو نکال دے' نفس میں جتنی بیماریاں گھسی ہوتی ہیں' ان کو زائل فرمادے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دشمنوں کے نرغے سے محفوظ رکھے' حق تعالیٰ ہر مشکل سے ہمیں بچائے' ہماری راہ درست فرمادے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ
وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

صُحبتِ صالح

حکومتوں کے قوانین جرائم کے افعال تو روک سکتے ہیں لیکن جرائم کی نفرت دل میں نہیں بٹھا سکتے۔ زانی زنا سے اور چور چوری سے قانون کی وجہ سے رُک سکتا ہے لیکن زنا اور چوری کی نفرت اس کے دل میں قوانین سے نہیں بیٹھ سکتی، جرائم کی نفرت اور معصیت سے بیزاری اہل اللہ کی صحبت و معیت سے نصیب ہوتی ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ـــــ اَمَّا بَعْدُ ـــــ

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یاایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصٰدقین ۔ صدق اللہ العلی العظیم (توبہ پ ۱۱ ع ۱۴)

کثرتِ علم کے باوجود بے عملی کثرت سے ہے

بزرگانِ محترم!

یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے ایک بہت اہم مضمون بیان فرمایا ہے۔ جس پر انسان کی دینداری کی بقا موقوف ہے۔ اگر کوئی دیندار بننا چاہے تو اس کے لئے اس پر عمل کرنا ضروری ہے ـــ یہ مشاہدہ ہے کہ آج کل تقریروں، جلسوں اور لٹریچر کی کمی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی دینی حالت تنزّلی میں ہے۔ صرف دین ہی نہیں بلکہ دنیا کے اعتبار سے بھی تنزّلی کا شکار ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جب تک اسبابِ مرض معلوم نہ ہوں، اس وقت تک مریض کا علاج ناممکن ہے۔ اب دین میں کمی اس وجہ سے تو نہیں کہ کم علمی ہو۔ کیونکہ اس زمانے میں علم کے ذرائع اشاعت جتنے موجود ہیں وہ پہلے کبھی موجود نہ تھے۔ اسی طرح آج جو جلسے ہوتے ہیں وہ بھی ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں ایک ہزار دو ہزار آدمی تو معمولی بات ہے اور بعض جگہ تو لاکھوں تک بھی شرکت ہوتی ہے۔ بلکہ آج

کل تو تمام دنیا ایک جلسہ گاہ بنی ہوئی ہے۔ ایک شخص ریڈیو میں بولتا ہے مشرق و مغرب تک اس کی آواز پہنچتی ہے۔ اور صرف دنیوی باتیں ہی نہیں بلکہ ترجمے اور تفسیریں بھی مختلف ممالک میں سنی جاتی ہیں۔ آپ کا ریڈیو پاکستان روزانہ ترجمۂ قرآن مجید نشر کرتا ہے۔ اور مسائل تو بچہ بچہ جانتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دین میں وہ پختگی نہیں جو پہلے زمانوں میں تھی ___ دوسرا ذریعہ نشر علم کا قلم ہے۔ آج کے زمانے میں اس کی بھی کمی نہیں۔ قلم کی علماء نے دس قسمیں لکھی ہیں۔ پہلی قلم لوحِ محفوظ والی قلم ہے۔ جس کے متعلق حدیث شریف میں ہے کہ :

خلق اللّٰہ القلم فقال لہ اکتب' قال ما اکتب قال اکتب ماکان ومایکون۔

اور ایک قلم وہ ہے جس سے روزانہ کے حالات لکھے جاتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شبِ معراج میں جب عرش کے قریب پہنچے' تو قلموں کی کھسکھساہٹ سنی۔ آپ نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کس چیز کی آواز ہے۔ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ یہ دفتر ہے جس میں مخلوق کے واقعات کو لکھا جاتا ہے' اور ایک ایک انسان دن میں لاکھوں حرکتیں کرتا ہے۔ معلوم نہیں وہ دفتر بھی کتنا بڑا ہوگا۔

ایک قلمِ وحی ہے۔ وہ یہ کہ وحی آتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زید بن حارثہؓ یا کسی دوسرے صحابی کو بلوا کر لکھوا دیتے تھے۔ اسی قلم پر ہمارے دین کی بقا موقوف ہے۔ ایسے ہی اگر حدیث کی کتابت نہ ہوتی تو اتنی کتب بھی ہمارے پاس موجود نہ ہوتیں۔ پس یہ ذخیرۂ احادیث اور قرآن کریم قلم کے ذریعہ ہی محفوظ کئے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے آج ہم نماز' روزہ' حج وغیرہ کے احکام پمفلٹوں میں شائع کرتے ہیں۔

ایک قلم تصوّف ہے۔ جس سے تصوف کے ضروری مسائل اور تزکیۂ نفوس کے طریقے محفوظ کئے جاتے ہیں ___ اور ایک قلمِ سیاست ہے' جس سے تمام سیاسی معاملات محفوظ کرلئے جاتے ہیں۔ دین کے سلسلے میں آج جتنی قلمکاریاں ہیں' وہ پہلے کسی زمانہ میں نہ تھیں۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم تصنیف میں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ حجاز کے کتب خانوں میں لاکھوں بلکہ کروڑوں کتابیں محفوظ ہیں۔ اُندلس کے کتب خانوں کے متعلق ایک عیسائی عورت اپنی کتاب "حاضر الاُندلس وغاربھا" میں لکھتی ہے کہ تعصب میں آکر عیسائیوں نے ارادہ کیا کہ مسلمانوں کا لٹریچر ضائع کردیا جائے۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے اس کام کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا' جس کا کام یہ تھا کہ کتب خانوں کو جلائے یا دریا برد کردے۔ وہ عورت لکھتی ہے کہ پچاس برس تک یہ مہم جاری رہی۔ تاتاریوں نے حکومتِ بغداد کے کتب خانوں کو دریا میں ڈال دیا۔ تو وہ ایک بڑا پُل بن گیا۔ تاریخ کی کتب میں لکھا ہے کہ ایک ماہ تک دریا کا پانی سیاہ رہا۔ جب ایک کتب خانہ کی یہ حالت تھی تو باقیوں کا کیا حال ہوگا۔ انجیل کے شباب کے زمانہ میں بھی عیسائی اتنے کتب خانے نہ بنا سکے' اور نہ ہی یہودی تورات کے شباب کے زمانہ میں ایسے کتب خانے بنا سکے۔ اور آج بھی جو انہوں نے تصانیف کی ہیں' موجودہ یورپ کی ترقی انہیں کی مرہونِ منّت ہے۔ وہیں سے یورپ کے لوگ پڑھ کر آئے' اور اپنے ملک میں علم پھیلایا۔ اسی کی برکت ہے کہ آج عیسائی اس قابل ہیں کہ تصنیف کرسکیں اور ان کو اقرار ہے کہ یہ مسلمانوں کے فیض سے ہے۔

ماحول کا اثر

اَلغرض مسائل کی اشاعت کثرت سے ہے لیکن اس کے باوجود دین مسلمانوں میں نہیں پھیلتا۔ اور نہ ہی سلف کی طرح ایمان میں مضبوطی ہے' اور نہ ہی ہمارا دل ایسا ہے کہ اعمالِ صالحہ اس کی طبیعتِ ثانیہ بن جائیں

___ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہماری معاشرت غیر اسلامی ہے.... اور ماحول بھی غیر اسلامی بن گیا۔ دار العلوم دیوبند میں دو ہزار کا عملہ ہے۔ ممکن نہیں کہ وہاں کوئی بے نمازی ہو۔ اذان ہوتی ہے سب کے سب ہر طرف سے دوڑتے ہیں۔ یہ تمام ماحول کا اثر ہے۔ ورنہ وہاں کوئی نماز کے متعلق کہنے والا نہیں ہوتا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر کام پہلے ریا ہوتا ہے' پھر عادت ہوتی ہے' پھر عبادت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے :

مروا صبیانکم بالصلوٰۃ اذا بلغوا سبعاً ویضربوھم علیھا اذا بلغوا عشراً۔

"اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب کہ وہ سات سال کے ہو جائیں' اور مار کر نماز پڑھاؤ جب کہ دس سال کے ہو جائیں"۔

یہ مار کر نماز پڑھانا حقیقی نماز نہیں' کیونکہ وہ ڈر کے مارے پڑھتا ہے' یہاں تک کہ سجدہ کرتے ہوئے بھی ایک آنکھ سے دیکھتا رہے گا۔ جب دیکھا کہ باپ نہیں بھاگ جائے گا۔ لیکن جب اس کو عادت پڑ گئی اور ساتھ ساتھ کچھ علم آگیا' تو خیال کرے گا کہ یہ بہت ضروری چیز ہے۔ تو یہی عبادت بن جائے گی۔

عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

بہر دنیا بہر دین و بہر نام
اللہ اللہ کردہ باید و السلام

اس لئے نمازی کو اس وجہ سے نہیں رکنا چاہئے کہ شاید یہ ریا ہو۔

ظاہر کا اثر باطن پر

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ جو فقہ کے امام ہیں۔ مگر اُن کا مذہب مدوّن نہیں ہوا۔ وہ فرماتے ہیں :

طلبنا العلم لغیر اللہ فابٰی ان یکون الا للہ۔

"ہم نے علم غیر اللہ کے لئے طلب کیا لیکن علم تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہو کر رہا"۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ ظاہر کا اثر باطن پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً اگر ایک آدمی عورتوں کا سا لباس پہن لے' تو چند دن کے بعد اس کا دل یہ چاہے گا کہ وہ کلام بھی عورتوں کی طرح کرے' بلکہ تمام حرکات و سکنات عورتوں جیسی کرے ___ اسی طرح اگر کوئی بتکلف علماء کا سا لباس پہن لے تو وہ مخلوق کی خاطر بہت سے گناہوں سے بچے گا۔ ایسے ہی اگر کوئی درویشوں کا سا لباس پہن لے' تو اس کا اثر بھی قلب پر پڑے گا۔ اگر کفّار کا سا لباس پہننا شروع کر دے تو چند دنوں میں دیگر افعال بھی کفار کی طرح ہی کرنے لگے گا۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ **فان لم تبکوا فتباکوا** یعنی اگر تمہیں رونا نہ آئے تو رونے کی شکل ہی بنا لو ___ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی ظاہری افعال کا اثر حقیقی افعال کا سا مرتّب ہوتا ہے۔ رونے کی شکل بنانے میں وہی اَجر و ثواب ملے گا' جو حقیقۃً الحاح و زاری پر ملتا ہے ___ بہرحال ظاہر کا اثر نہ صرف باطن پر مرتّب ہوتا ہے' بلکہ ایک درجہ میں عند اللہ بھی بلحاظِ اجر و ثواب اس کا اعتبار ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ حُنین سے واپس آرہے تھے' راستہ میں ایک جگہ پڑاؤ کیا' کفّار کے بہت سے بچے مسلمانوں کے لشکر کے پاس جمع ہو گئے' ان میں حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہٗ بھی تھے ___ جب مؤذن نے اذان کہی تو ان بچوں نے بھی نقل اُتارنا شروع کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کو

پکڑ کر لاؤ۔ بچے تو بھاگ گئے مگر حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ' ان میں سے کچھ بڑے تھے۔ انہیں بھاگتے ہوئے شرم آئی' وہ نہ بھاگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب ان کو حاضر کیا گیا۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ اب اسی طرح نقل اُتارو۔ اور کہو اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر حضرت ابو محذورہؓ نے کہہ دیا پھر آپؐ نے فرمایا کہ کہو اشھد ان لآ الٰہ الاّ اللّٰہ ان کو تأمل ہوا۔ کیوں کہ اس میں توحید کا اقرار تھا۔ لیکن دبے لفظوں سے کہہ دیا۔ آپؐ نے پھر فرمایا کہ کہو۔ اشھد ان لآ الٰہ الاّ اللّٰہ ابو محذورہؓ نے دوبارہ کہہ دیا۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ کہو اشھد انّ محمّداً رّسول اللّٰہ ___ اس میں حضرت ابو محذورہؓ کو زیادہ تأمل ہوا۔ کیونکہ توحید کے تو کسی درجہ میں مشرکینِ مکّہ بھی قائل تھے۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے :

لبّیک اللّٰھم لبّیک لاشریک لک لبّیک الاّشریکاً ھولک

اور قرآن مجید میں بھی ہے کہ :

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰہِ

یعنی اگر آپؐ ان سے پوچھیں کہ ساتوں آسمانوں اور زمین کو اور اس کے بڑے عرش کو کس نے پیدا کیا' تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ___ توحید کے تو کسی درجہ میں قائل تھے۔ تو توحید کے کلمات کہنے میں اس قدر تأمل نہ ہوا۔ لیکن رسالت کے وہ منکر تھے اور سارا جھگڑا رسالت کے نہ ماننے پر تھا۔ اس لئے ابو محذورہؓ پہلے چُپ ہو گئے۔ لیکن پھر دبے لفظوں میں کہا اشھد انّ محمّداً رّسول اللّٰہ۔ آپؐ نے فرمایا کہ زور سے کہو تو ابو محذورہؓ نے زور سے دوسری مرتبہ بھی کہا۔

ابو محذورہ رضی اللہ عنہ' نے یہ اذان اسلام کی حالت میں نہیں کہی تھی۔ محض نقّالی تھی۔ لیکن اس کا اثر دل پر اُتر گیا۔ کہنے لگے کہ یا رسولَ اللہ! اب تو میں آپؐ کا ہوں۔ اب اذان میں شوافعؒ احناف کے خلاف ہیں۔ شوافع کہتے ہیں کہ ترجیع صفتِ اذان میں سے ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ یہ تعلیم تھی۔ یہ فقہاء کے اختلاف ہیں۔ لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابو محذورہؓ نے جب ظاہر سے اسلام کا اقرار کیا تو اس کا اثر دل میں بھی اُتر گیا۔ اور اسلام قبول کر لیا ___ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر رونا نہ آئے تو رونے کی شکل ہی بنالو۔ پس اگر نماز کو جی نہ بھی چاہے تو بھی نماز نہ چھوڑنی چاہئے۔ مگر یہ چیز ماحول سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر ماحول اچھا ہو تو بچے بھی نمازی بن جاتے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ مطالبۂ پاکستان کے وقت بچوں کے کھیل بھی جلسے اور جلوس بن گئے تھے کیونکہ اس وقت ماحول ہی ایسا تھا۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایک نوجوان طالب علم آیا۔ اور جلدی سے نماز پڑھ کر چلدیا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ تو نے نماز اچھی طرح سے کیوں نہ پڑھی؟ اس کے منہ نکلا کہ حضرتؒ میں چھوٹی کتابیں پڑھتا ہوں۔ حضرتؒ کو غصہ آیا اور فرمایا کہ یہ اعمال تو ماں باپ سے ورثہ میں ملتے ہیں۔ ان میں کتابوں کی ضرورت نہیں لیکن یہ جب ہوتا ہے جب ماں باپ بھی ایسے ہی ہوں۔ اگر عیسائی ذہنیت کا ماحول بن جائے تو دل اسی طرف مائل ہونے لگے گا۔

تربیت میں ماحول کا اثر

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ ایک شادی کے سلسلے میں تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ تو خیال ہوا کہ حضرت حاجی (امداد اللہ صاحب مہاجر مکّیؒ) صاحب کی زیارت بھی کرلوں۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ کو معلوم ہو گیا' کہ یہ فطرتِ سلیمہ رکھتے ہیں۔ تو آپؒ نے پوچھا کہ آپ کسی سے

بیعت بھی ہوئے یا نہیں؟ آپ نے کہا کہ نہیں۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ پھر مجھ سے بیعت ہو جاؤ۔ حضرت گنگوہیؒ نے کہا کہ میں اس شرط پر بیعت ہوں گا کہ آپ مجھے ذکر و شغل کا حکم نہ فرمائیں گے۔ حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے تو بیعت ہونے کو کہا ہے شغل کا تو میں نے کہا ہی نہیں اور وعدہ بھی فرمایا کہ آئندہ بھی نہیں کہوں گا۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے بیعت فرمایا اور یہ فرمایا کہ دو تین دن یہاں ٹھہر جاؤ۔ آپ وہیں تھانہ بھون میں تین دن ٹھہرے جب رات کے وقت اڑھائی تین بجے دیکھا کہ سب لوگ اٹھ کر تہجد ادا کر رہے ہیں۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو شرم آئی انہوں نے بھی اٹھ کر تہجد پڑھی ___ پھر جب لوگوں کو ذکر و شغل میں دیکھا، آپ بھی ذکر میں مشغول ہو گئے۔ دوسرے دن پھر یہی حالت ہوئی۔ تیسرے دن خود بخود خوشی سے تہجد پڑھی، اور ذکر و شغل میں مشغول ہو گئے۔ تیسرے دن حضرت کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ حضرت آپ نے تو سب کچھ ہی کرا دیا۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے تھوڑا ہی کہا تھا۔ میں نے وعدہ خلافی نہیں کی۔ اب آپ جا سکتے ہیں، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ اب تو میں نہیں جاتا ___ چالیس دن وہاں ٹھہرے اور اس تھوڑے عرصہ کے بعد خلافت لے کر واپس ہوئے۔ بس یہ عبادت پہلے ریا تھی، پھر عادت ہوئی، پھر عبادت ہو گئی اور ساتھ ہی خلافت بھی مل گئی۔

میرا مشاہدہ ہے کہ جب میری عمر آٹھ برس کی تھی۔ ایک دفعہ میرا گنگوہ جانا ہوا وہاں ذکر و شغل کا ماحول تو تھا ہی۔ گنگوہ کی مسجد میں بہت سے دھوبی کپڑے دھوتے تھے، وہ جب کپڑے کو مارتے تو الا اللہ کی ضرب ساتھ کہتے۔ یہ ماحول کا اثر تھا ورنہ ان کو پڑھنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔

مقولہ مشہور ہے۔ "ہرچہ در کان نمک رفت نمک شد"۔

بس ماحول کا اثر یہی ہے۔ جو نیک ماحول میں ہو گا، اس کا بھی اثر ضرور ہو گا ___ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا بھی ایک ماحول تھا کہ جو بھی اس میں آتا وہ متأثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اور ان کا ماحول بھی بہت قوی تھا۔ حتی کہ حضرت انبیاء علیہم السلام کے بعد انہی کا درجہ تھا۔ امت کا اجماع ہے کہ **"الصحابۃ کلھم عدول"** وہ معصوم تو نہیں تھے لیکن محفوظ تو ضرور تھے۔ امت کا اتفاق ہے کہ کوئی شخص کتنا بڑا غوث اور قطب بن جائے لیکن ادنیٰ صحابی کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے کہ جو ماحول ان کو میسر آیا وہ کسی کو میسر نہ آسکا۔ ایسے ماحول سے ابو جہل جیسا بدبخت ہی متأثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔ اور جبری طور پر تو وہ بھی مؤمن، تھا۔ چنانچہ اپنے گھر میں کہتا تھا کہ بات تو ٹھیک ہے لیکن اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مان لیں، پھر ان کی غلامی کرنی پڑے گی۔ اسی سے ان کو عار تھی ___ بہرحال اگر ایک گھرانہ یہ عہد کرے کہ ہم گناہ چھوڑ دیں گے، تو ان کے ماحول میں جو داخل ہو گا۔ انہی کی طرح ہو جائے گا۔

قول و فعل میں مطابقت کا اثر

حضرت مولانا عبید اللہ صاحبؒ سندھی ایک سیاسی مفکر تھے۔ روس کے انقلاب میں وہیں تھے۔ فرماتے تھے کہ اسٹالن سے ملا، اور اسلامی نظام اور اس کے اصول مع دلائل اس کے سامنے رکھے۔ تو اسٹالن نے کہا کہ یہ بالکل ٹھیک ہے، اور اگر دنیا میں کوئی نظام جاری ہوا تو اسلام ہی جاری ہو کر رہے گا۔ لیکن یہ بتائیے کہ اس کا کوئی عمل دنیا میں بھی موجود ہے .... اس پر مولانا خاموش ہو گئے۔ تو آج دنیا قول کو نہیں دیکھتی بلکہ فعل کا مطالبہ کرتی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

فمن وافق قولہٗ فعلہٗ فنجا ومن لم یوافق قولہٗ فعلہٗ فقد ھلک

یعنی جس آدمی کا قول اس کے فعل کے موافق ہوا' نجات پا گیا' اور جس کا قول فعل کے موافق نہ ہوا' وہ ہلاک ہو گیا۔ ____ آج اسلامیہ جمہوریہ کا اعلان کیا گیا۔ لیکن دنیا اس قول کو نہیں دیکھتی بلکہ عمل کو دیکھتی ہے۔ اس لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم دنیا کے سامنے ایک عملی نقشہ پیش کریں۔ ایک شخص بڑے سے بڑا عالم ہو۔ لیکن جب تک وہ اپنے کہے کے مطابق عمل نہ کرے' اس کو اپنے قول کا خود بھی تذبذب رہتا ہے۔

ماحول قوانینِ حکومت سے بھی بڑھ کر ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آنے والوں میں نماز روزہ وغیرہ کا اہتمام تو تھا ہی۔ مگر حضرتؒ کے ہاں یہ بھی قانون تھا کہ کوئی کسی کے لئے اذیت کا موجب نہیں ہو گا۔ چنانچہ تھانہ بھون کی خانقاہ میں ایک دفعہ کسی صاحب کا ایک رومال گر پڑا۔ لیکن کسی نے وہاں سے نہ اٹھایا اور تین دن تک پڑا رہا۔ ماحول کی وجہ سے کسی کو چرانے کی ہمت نہ ہوئی' اسی وجہ سے حجروں کو تالا لگانے کا دستور ہی نہیں تھا۔

حجاز کی حکومت ہے۔ وہاں بادشاہ کا جذبہ یہ ہے کہ اسلامی قانون نافذ ہو۔ اب ایک عورت زیور پہن کر سفر کرتی ہے۔ تو اس کو کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ تلواروں اور بندوقوں سے دلوں میں ڈر پیدا نہیں ہوتا۔ پولیس اور ہتھیاروں کی کمی نہیں۔ لیکن دنیا میں فسق و فجور کی کثرت ہو رہی ہے۔

ہم حج پر گئے تو دیکھا کہ چند بوریاں بھری ہوئی رکھی ہیں۔ ایک شخص نے پولیس میں جا کر خبر دی کہ فلاں جگہ دو کھجوروں کی بوریاں پڑی ہیں۔ پولیس نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ان میں کھجوریں ہیں؟ معلوم ہوا کہ تو نے ٹٹول کر دیکھی تھی؟ اور چرانے کا موقع تلاش کرتا رہا۔ لیکن موقع نہیں ملا۔ اس شخص کو اس پر بھی سزا ملی۔

ہندوستان میں مختلف میلے ہوتے ہیں' مسلمان بھی ہندوؤں کو دیکھ کر میلے کرنے لگے ہیں۔ ان میں ہر طرح سے فسق و فجور اور چوریاں ہوتی ہیں۔ لیکن مکہ مکرمہ میں لاکھوں کا مجمع ہوتا ہے اور کبھی چوری نہیں ہوتی۔ مکہ والے کبھی چوری نہیں کرتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان سے غلطی سرزد نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ غلبہ دیانت کا ہے۔ مگر چور کا ہاتھ ایک دفعہ کاٹا جائے تو برسوں تک چوری سے نجات ملتی ہے۔ اسلامی حدود رجم اور قطع ید وغیرہ کو وحشیانہ سزا کہنا انہی سے ہو سکتا ہے جن کے نزدیک زنا یا چوری کوئی غیر وحشی فعل ہیں ____ ادیانِ سماویہ میں زنا سے بڑا کوئی جرم نہیں تھا۔ ایک عورت کے زنا کرنے سے سارا خاندان بدنام ہو جاتا ہے۔ شہرت پر الگ دھبہ آتا ہے اور نسل کا بھی اختلاف ہوتا ہے۔ تو یہ فعل بھی تو وحشی ہے اگر وحشی فعل پر وحشیانہ سزا ہو' اس میں کیا جرم ہے؟ طرہ تو یہ ہے کہ آج کل قانون میں اس کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ کہ صرف جبراً زنا کرنا ہی جرم ہے۔ فریقین کی رضا ہو جائے تو جرم ہی نہیں۔ بہر حال ان چیزوں کا ماحول کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔

حکومتوں کے قوانین جرائم کے افعال کو تو روک سکتے ہیں لیکن جرائم کی نفرت دل میں نہیں بٹھلا سکتے۔ زانی زنا سے اور چور چوری سے قانون کی وجہ سے رک سکتا ہے لیکن زنا اور چوری کی نفرت اس کے دل میں قوانین سے نہیں بیٹھ سکتی۔ جرائم کی نفرت اور معصیت سے بیزاری اہل اللہ کی صحبت و معیت سے نصیب ہوتی ہے۔

غیبت کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ۔

"کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے"۔

تو غیبت کو مردہ بھائی کے گوشت کھانے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو کہ نجس ہے۔ لیکن غیبت سے بچے گا کب؟ جب دل میں معاصی سے نفرت ہوگی۔ ورنہ حکومت کا قانون تو یہاں نہیں لاگو ہوگا۔

جھوٹ کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ انسان جب جھوٹ بولتا ہے' اس کے منہ میں ایک بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور فرشتہ اس کی وجہ سے اس سے دُور ہو جاتا ہے۔ جب وہ جھوٹ ختم کر لیتا ہے تو وہ واپس آجاتا ہے ___ گویا فرشتے کو معصیت سے نفرت ہے۔ اسی طرح انسان میں جب ملکوتی صفات آتی ہیں۔ وہ بھی معاصی سے متنفر اور بیزار ہو جاتا ہے تو یہاں حکومت کی طرف سے اِحتساب نہیں ہے۔ جس کی بنا پر جھوٹ سے بچے لیکن دل میں معاصی سے نفرت آچکی ہے اس لئے جھوٹ سے بھی بچے گا اور معاصی سے بھی بچے گا۔ مشرکین کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ یعنی مشرکین (اعتقادی طور پر) نجس اور ناپاک ہیں ___ معلوم ہوا کہ شرک اور ایسے ہی دوسرے معاصی معنوی نجاستیں ہیں۔ آدمی جس طرح ظاہری نجاست کی آلودگی سے بچتا ہے اور دور بھاگتا ہے۔ اسی طرح جن کا باطنی احساس زندہ ہے وہ معنوی نجاستوں سے بچتے ہیں۔ اور اپنے باطنی احساس سے ان نجاستوں کو پہچانتے بھی ہیں ___

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے زمانہ میں ایک شخص آپ کے پاس آرہا تھا کہ راستے میں ایک عورت پر نظر پڑ گئی۔ تو یہ نظر تو گناہ نہیں تھی۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ النظرۃ الاولیٰ لک والثانیۃ علیک یعنی پہلی نظر میں کوئی گناہ نہیں اور دوسری میں گناہ ہے ___ لیکن اس شخص نے قصداً دوسری دفعہ بھی نظر اٹھا کر دیکھا۔ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ :

مالرجال یاتوننا وفی قلوبھم اثر الزنا

یعنی لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے پاس آتے ہیں اور ان کے دلوں میں زنا کا اثر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے قلب اور روح کا حاسہ تیز تھا جس سے یہ گناہ نظر آگیا تھا' اور وہ تیز کیوں تھا؟ اس لئے کہ آپ کو صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میسّر تھی۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ گناہ نظر آجاتے تھے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جب مسجد میں آتے اور لوگ وضو کرتے ہوتے تو آپ نظر نیچی کر لیتے۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی۔ آپؒ نے فرمایا۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب انسان وضو کرتا ہے تو اس کے اعضاء کے تمام گناہ جھڑ جاتے ہیں' جب کُلّی کرتا ہے تو منہ کے گناہ جھڑتے ہیں۔ جب سر کا مسح کرتا ہے تو سر کے گناہ جھڑتے ہیں اور جب پاؤں دھوتا ہے تو پاؤں کے گناہ جھڑتے ہیں۔ تو فرمایا کہ جب گناہ جھڑتے ہیں' مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص فلاں گناہ کا مرتکب ہوا ہے اور اس سے مجھے بدظنی پیدا ہوتی ہے تو میں نظریں نیچی کر لیتا ہوں تاکہ گناہ کا علم نہ ہو اور بدظنی پیدا نہ ہو ___ جن کی روحانیت قوی ہوتی ہے ان کو معاصی نظر آجاتے ہیں۔

محاسبۂ آخرت کی دنیا میں صُورتِ مثالی

اور قیامت میں تو اعمال بھی سب کو نظر آنے لگیں گے۔ حدیث میں ہے کہ قیامت میں انسان کے سامنے دو چیزیں ہوں گی۔ ایک جہنم اور دوسرے اعمال کی صورت مثالی۔ اعمال کی صورت مثالی کی مثال یہ ہے کہ دیوان غالب اب چھپا ہے۔ تو غالب نے جس شعر میں جس خیال کا اظہار کیا ہے۔ اس شعر کے نیچے اس کی

تصویر کھینچ کر اس خیال کو ظاہر کیا گیا ہے ___ حدیث میں علم کی صورتِ مثالی دودھ بتائی گئی ہے اور نماز کی صورتِ مثالی حسین عورت اور سخاوت کی صورتِ مثالی ایک عظیم الشان درخت بتائی گئی ہے۔ جس کے سایہ میں سخی آدمی بیٹھے گا' جیسا کہ اس کی سخاوت سے دنیا میں غریبوں نے فائدہ اٹھایا۔ یہ تو اعمالِ صالحہ کی صُوَرِ مثالیہ ہیں۔ اسی طرح اعمالِ سیئہ کے بارے میں بھی حدیث میں ہے کہ جو شخص مالدار ہو' اور وہ زکوٰۃ ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اس کا وہ خزانہ سانپ کی شکل میں متشکل ہوگا۔ اور اس مال دار کے گلے کا طوق بن جائے گا جو اس کو کاٹے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں' کیونکہ مال کی ظاہری صورت بہت عمدہ ہوتی ہے اور اس کا تصور بھی دل کو خوش کرتا ہے۔ چنانچہ ایک آدمی کے پاس اگر مال ہو وہ اسے خرچ بھی نہ کرتا ہو تو چوری ہو جانے پر اس کو بہت رنج ہوتا ہے۔ اور اگر ناجائز طریق سے حاصل کیا جائے مثلاً چوری کی جائے تو اس میں ایک قسم کا زہر بھی ہوتا ہے کیونکہ اس پر سزا ہوتی ہے۔ اس لئے اس عمل بد (یعنی عدم اداءِ زکوٰۃ) کو سانپ کی شکل دی گئی۔ حاصل یہ ہے کہ ہر عمل کو اس کے اوصاف کے مطابق شکل دی جائے گی.... اور یہی صفات مذمومہ اگر خود آدمی میں راسخ ہو جائیں تو آخرت تو آخرت دنیا میں بھی آدمی پر اس کا پرتو پڑتا ہے۔ دیکھنے میں وہ صحیح' شکل و صورت کے لحاظ سے آدمی ہی کے لباس میں ہے۔ مگر حقیقتِ آدمیت اس میں نہیں ہوتی۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے بینائی دی ہے۔ وہ اس کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔

شیخ تقی الدین ابن دقیق العید بہت بڑے عارف باللہ' صاحبِ کشف و کرامۃ تھے۔ جب بغداد کی مسجد میں داخل ہوتے تو منہ پر نقاب ڈال لیتے۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی۔ آپ نے فرمایا کہ جب میں مسجد میں جاتا ہوں تو کوئی کتا نظر آتا ہے اور کوئی خنزیر نظر آتا ہے تو میں منہ پر نقاب ڈال لیتا ہوں تاکہ مسلمانوں سے بد ظنی پیدا نہ ہو ___ یہ ایک الگ عالم ہے جو اہل اللہ پر مخفی نہیں۔ وہ خوب واقف ہیں۔

اقبالؒ کہتے ہیں ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
مقاماتِ آہ و فغاں ابھی اور بھی ہیں

اس جہان کی ایجادات نے اس صورتِ مثالی کو سمجھنا تو اب اور بھی آسان کر دیا ہے۔ چنانچہ سی۔ آئی۔ ڈی (C.I.D) کے محکمہ کے پاس ایسے آلات موجود ہیں جن کے ذریعے سے وہ ہر خفیہ بات کو معلوم کر لیتے ہیں' اور تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ مجرم کو انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ امریکہ میں فیصلے ایسے ہی ہوتے ہیں ___ حق تعالیٰ بھی اس وقت تک کسی کو سزا نہیں دیں گے۔ جب تک پہلے اس کو تمام زندگی کا ریکارڈ نہ دے دیں گے۔ اور پھر تمام اعمال کی صورتِ مثالیہ صف کی صورت میں اس کے سامنے پیش کر دی جائے گی۔ (جیسے کہ آج کل ٹی۔ وی میں اعمال بعینہٖ موجود و متشکل باقی رہتے ہیں)۔

حدیث شریف میں ہے کہ زمین کے جس ٹکڑے پر کوئی نیک عمل کیا ہوگا۔ نماز پڑھی ہوگی تو وہ ٹکڑا گواہی دے گا۔ اور جس ٹکڑے پر کوئی گناہ کیا ہوگا' تو وہ ٹکڑا بھی گواہی دے گا کہ اس نے فلاں گناہ میرے اوپر کیا تھا۔ اسی پر بس نہیں بلکہ ملائکہ علیہم السلام بھی گواہی دیں گے۔ اس سے بڑھ کر تمام اعضاء میں قوتِ گویائی دے دی جائے گی۔ اور زبان سے یہ قوت سلب کر لی جائے۔ تو جس عضو سے جو کام کیا ہوگا' وہ خود گواہی دے گا کہ اس نے فلاں کام میرے اوپر کیا ہے۔ اتنی حجتوں کے بعد اس کو انکار کی ہمت نہ ہوگی' اور خود زبان حال سے اقرار کرے گا کہ میں اس سزا کا مستحق ہوں۔ پھر خواہ اللہ تعالیٰ معاف ہی فرما دیں یا سزا دیں۔ لیکن معافی اقرار گناہ کے بعد ہوگی۔

ترتیبِ اصلاح

دلوں کو متقی بنانا دین کا کام ہے۔ انسان کا نہیں۔ اور یہ ماحول کے بہتر ہونے سے ہوتا ہے اور اس کی ابتدا اپنے گھر سے کرنی چاہیے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے یہ فرمایا گیا:

قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا

یعنی اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔ جب گھر نیکی کا نمونہ بن گیا پھر حکم فرمایا وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ___ تو آپ نے اپنے رشتہ داروں کو بلایا، اور ایمان لانے کی تبلیغ کی۔ جن میں کچھ سعادت تھی، وہ متوجہ ہوئے اور ایمان قبول کرلیا اس کے بعد فرمایا لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وحی آپ کی طرف اُتاری گئی تاکہ آپ مکہ والوں کو اور اردگرد والوں کو ڈرائیں ___ پھر فرمایا لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا تاکہ آپ تمام جہان والوں کے لئے ڈرانے والے ہوں ___ چنانچہ پھر آپؐ نے تمام بادشاہوں کی طرف خطوط لکھے، اور ایمان کی تبلیغ کی۔ بس اصلاح کا یہی طریقہ ہے کہ اصلاح کی ابتدا پہلے اپنے گھر سے کرنی چاہئے۔ نیکی بدی میں انسان ایک بھیڑ چال ہے۔ بارہا کا میرا مشاہدہ ہے کہ اگر مجلس میں ایک نے مصافحہ کیا تو تمام ہی شروع ہو جاتے ہیں ایسے ہی اگر ایک ابتدا کرے تو دوسروں سے بھی تمام بُری عادتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ اور ترتیب بھی یہ ہونی چاہئے کہ اولاً گناہوں کو چھوڑنا چاہئے پھر نیکیوں کو اختیار کرنا چاہئے۔ اور گناہوں میں بھی پہلے کبائر کو پھر صغائر کو چھوڑنا چاہئے ___ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا۔ اور اس نے عرض کیا کہ حضورؐ ایمان تو لاتا ہوں مگر تین بُرے کام کرتا ہوں ان سب کو چھوڑ نہیں سکتا۔ حضورؐ نے فرمایا تم صرف جھوٹ کو چھوڑ دینے کا وعدہ کرتے ہو؟ اس نے کہا جی ہاں۔ اور خوشی خوشی یہ وعدہ کر کے چلا گیا۔ مگر پھر جب گناہ کا خیال آتا تو محاسبہ کا خیال پہلے آتا۔ چنانچہ جب شراب پینے چلا تو خیال ہوا کہ یہ فعل چھپے گا نہیں.... یا جھوٹ بولوں گا۔ یا پھر حد لگے گی اور رسوائی ہوگی۔ جب چوری کا جذبہ پیدا ہوا تو بھی خیال ہوا کہ چوری چھپے گی نہیں، خواہ مخواہ رسوائی ہوگی۔ کیونکہ جھوٹ نہ بولنے کا سچا عہد کر کے ایمان قبول کیا تھا۔ تو اس عہد سے تمام ہی گناہ ازخود چھوٹ گئے۔ چنانچہ یہ تینوں گناہ اس سے چھوٹ گئے صبح کو حاضر ہوا تو عرض کی۔ یا رسول اللہؐ آپ نے چھڑائی تو ایک برائی اور چھوٹ گئیں ساری برائیاں۔

طبیبِ کامل مختصر سا نسخہ ہی تجویز کیا کرتا ہے۔ جس سے تمام امراض کا علاج ہو جاتا ہے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک دیہاتی آیا اور بیعت ہوگیا۔ کہنے لگا کہ مولوی جی! آپ نے پوچھا ہی نہیں میں تو افیون بھی کھاتا ہوں۔ تو آپ نے حرام کہہ کر افیون نہیں چھڑائی بلکہ فرمایا کہ جتنی افیون کھاتے ہو، بیس روز تک اس سے نصف کھایا کرو۔ پھر بیس دن اس نصف کا نصف کھایا کرو۔ کرتے کرتے ان شاء اللہ تعالیٰ چھوٹ جائے گی ___ لیکن وہ آدمی پکا تھا۔ جب سنا کہ یہ حرام ہے تو ایک دم ہی چھوڑ دی۔ خانقاہ سے چلا گیا۔ اور بیمار ہوگیا، خوب دست جاری ہوئے چھ ماہ تک بیمار رہا۔ آخر صحت ہوئی تو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور پانچ روپے بھی آپ کی خدمت میں پیش کئے۔ حضرت چونکہ غریب آدمی سے کچھ لیتے نہیں تھے اسلئے واپس کر دیئے۔ اس نے کہا کہ حضرت میں چھ ماہ میں پانچ روپے کی افیون کھاتا تھا تو میرا نفس خوش ہوا کہ اچھا ہوا پانچ روپے بچ گئے۔ میں نے کہا یہ پانچ روپے اب نفس کے لئے نہیں ہیں، اب یہ افیون چھڑوانے والے کو ہی دینے ہیں۔ پھر آپ نے اس میں سے کچھ تھوڑا سے لے لیا۔

اصلاح کا عزم

آج ساری مصیبت ہی یہ ہے کہ اصلاح کا عزم ہی نہیں ہوتا۔ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ ماحول بہتر نہیں۔ ماحول کوئی ایسی بارش تو نہیں جو آسمان سے برسے۔ آخر ماحول کا بہتر بنانا بھی تو عزم ہی سے ہوتا ہے

تو ہی اگر نہ چاہے تو بہانے ہزار ہیں

ہر یکے ناصح برائے دیگراں۔ شریعت نے یہ تعلیم دی ہے کہ اپنے نفس سے ہمیشہ بد ظنی رہے اور اپنے سوا ہر ایک سے حُسنِ ظن ہو۔ اور دنیا نے اس کے برعکس کیا ہوا ہے ___ دہلی کے آخری تاجدار، بادشاہ ظفر ان سے سلطنت چِھن گئی تھی ___ آخر عمر میں صوفی ہو گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی جب اپنی برائیوں پہ نظر
تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

تو میں نے عرض کیا کہ دین کا اثر اس وجہ سے کم نہیں کہ علم نہیں، بلکہ معاشرہ خراب ہے۔ اس لئے پہلے ماحول اور معاشرہ کی اصلاح کرنی چاہئے۔

آج خیر خواہی سے اسلامی نظام کا مطالبہ ہو رہا ہے، اور حکومت بھی خیر خواہی ہی سے اس کو نافذ کرنا چاہتی ہوگی۔ لیکن تمام کام قانون سے نہیں ہوتے۔ زنا کا اعلان حکومت تو نہیں کر رہی۔ یہ جو زنا ہو رہے ہیں ماحول کی خرابی سے ہیں۔ اسی طرح چوری دیکھ لیجئے آج بھی چوری، زنا قانوناً جرم ہے۔ گویا اسلامی نظام اگر مکمل طور پر نافذ نہیں، بعض اسلامی قوانین تو آج بھی نافذ ہیں۔ اس کے باوجود زنا، چوری آج بھی ہو رہی ہیں۔ اگر کل اسلامی نظام نافذ ہو گیا اور معاشرت ایسی ہی رہی تو بھی زنا، چوری ہوتے رہیں گے۔ اس لئے تمام کام حکومت پر ہی نہیں چھوڑنا چاہئے۔ کم از کم جتنے اجزاء اسلامی قانون کے نافذ ہیں ان پر تو عمل کرنا چاہئے ان پر بھی عمل نہیں۔

میں نے یہ آیت پڑھی تھی جس میں صرف تقویٰ ہی نہیں بلکہ صحبتِ صالح اختیار کرنے کا بھی حکم ہے اس لئے اہلِ علم اور درویش صوفیاء کی صحبت اختیار کرنے چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھی صحبت کی مثال عطّار کی دکان سے دی ہے، کہ اگر انسان جائے تو خوشبو لے کر آتا ہے اگرچہ عطر نہ خریدے۔ اور بُری صحبت کی مثال لوہار کی دکان سے دی ہے۔ اگر آدمی جائے اور کچھ نہیں تو دھواں اس کو ضرور پہنچے گا اگرچہ کپڑے نہ جلیں ___ بہرحال نیک صحبت اور صالحین کی معیّت اختیار کرنے کی ضرورت ہے ___ بقدرِ ضرورت آیت کی تشریح ہو گئی۔ وقت بھی کافی ہو گیا۔ اب میں ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حُسنِ خاتمہ نصیب فرماوے، اور اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرماوے۔ آمین!

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اِخلاص فی الدّین

دین ودنیا کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر اخلاص کامل اور (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع کامل پیدا کرے یہی دو چیزیں کلید نجات ہیں اور کامیابی کی ضمانت ہیں۔ جو بھی کامیاب ہوا' وہ اسی طریق پر چل کر ہوا' اور جو راستہ سے ہٹ گیا' وہ منزل مقصود تک نہ پہنچ سکا' اور زندگی کا مایہ یوں ہی گم کر بیٹھا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ'

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ــــــــ اَمَّا بَعْدُ ــــــــ

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ، قل اننی ھدٰنی ربی الی صراط مستقیم دینا قیما ملۃ ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین ○ قل ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للّٰہ رب العلمین ○ لا شریک لہ وبذٰلک امرت وانا اول المسلمین ○ صدق اللّٰہ العلی العظیم (انعام پ)

طریقِ سُنّت پر عمل سے عادت بھی عبادت بن جاتی ہے

بزرگانِ محترم!

حق تعالیٰ کا شکر اور احسان ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور اس پر ہم کو فخر ہے لیکن کبھی اس پر غور نہیں کرتے کہ اسلام کا کیا معنٰی ہے؟

اس لئے مختصر سے وقت میں اس کا معنٰی بیان کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے دو لفظ "عادت اور عبادت" سُنے ہوں گے۔

عادت تو اُن کاموں کو کہا جاتا ہے جو ہم روز مرّہ (کی زندگی میں) کرتے ہیں۔ مثلاً کھانا' پینا' دوستوں سے ملنا' گھریلو زندگی' اجتماعی زندگی اور ایسے ہی جتنے طبعی افعال ہیں ان کو عادت کہا جاتا ہے۔

اور عبادت یہ ہے کہ انہی (مذکورہ بالا) افعال کو طریق سنّت کے مطابق کیا جائے' اور یہ جو ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ مسجد میں جانا تو عبادت ہے لیکن گھر میں رہنا عبادت نہیں۔ یہ خیال غلط ہے کیونکہ اگر ہم گھر معاملات میں بھی سنّت طریقہ پر عمل کریں گے تو وہ بھی عبادت ہو جائیں گے۔ صرف نیّت کی ضرورت ہے یہی روزہ ہے اگر ایک آدمی بلانیّت سارا دن بھوکا رہے تو کوئی ثواب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر روزے کی نیّت کرے' تو تھوڑی نیّت کی تبدیلی سے یہی عبادت بن جاتی ہے ___ تو اگر ہم ساری دنیا کو دین۔ بنالیں تو کیا اچھا سودا ہے' اور اگر ہم نیّت کے ذرا سے فرق سے دین کو دنیا بنالیں تو کتنا مہنگا سودا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ اگر ایک آدمی بِسْمِ اللّٰہِ سے کھانا شروع کرے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْراً ختم کرے تو اس کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ صرف نیّت کرنے سے اتنا بڑا اجر ملا کہ دنیا تو ہی لیکن دین بھی ساتھ ہی بنا۔ اسلام چاہتا ہے کہ تمام دنیاوی کاموں کو دین بنادیا جائے ___ حدیث شریف میں ہے :

السّواک مطھرۃ للفم ومرضاۃ للرّب

مسواک کرنا منہ کی صفائی کا ذریعہ اور خوشنودئ الٰہی کا باعث ہے ___ تو مسواک کرنا دنیا بھی ہے (جب محض یہی نیّت ہو کہ دانت اچھے ہوں گے) اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا بھی سبب ہے اس لئے دین بھی ہے احادیث میں ہے کہ آپ بہت مسواک فرماتے تھے۔ نمازوں کے اوقات' تہجد کے وقت اور اکثر اپنے دوستو سے فارغ ہو کر مسواک فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ مرضِ وفات میں بھی آپ نے مسواک کی طرف دیکھا۔ تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سمجھ گئیں کہ آپؐ مسواک کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپؐ مسواک دیا تو آپ نے مسواک فرمایا' پھر وہی مسواک حضرت عائشہؓ نے بھی کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا باقی ازواجِ مطہرات پر اس بناپر فخر کیا کرتی تھیں کہ آپؐ کا لعاب مبارک میرے حلق میں گیا' اور آپؐ کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ آپؐ کا سر مبارک میری گود میں تھا۔

اِسلام کا ہر عمل دو حیثیّت کا حامل ہے

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپؐ اس قدر کثرت سے مسواک کیوں فرماتے ہیں؟ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا :

"ملائکہ علیہم السلام سے میری گفتگو ہوتی ہے' اور ان کو بُو سے نفرت ہے ایسے ہی اسلام کے ہر عمل میں ایک راستہ دنیا کی طرف اور ایک راستہ دین کی طرف جاتا ہے"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کی عیادت کے لئے ایک نوجوان حاضر ہوئے۔ جب واپس جانے لگے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ان کو بلاؤ۔ جب ان کو بلایا گیا' تو آپؓ نے فرمایا :

یا اخی ارفع ثوبک فانہٗ انقٰی لثوبک وارضٰی لربک

اے بھائی! (ٹخنوں سے نیچے جو آپ کا کپڑا ہے اس) اپنے کپڑے کو اوپر اٹھاؤ' کیونکہ اس سے کپڑا بھی صاف رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی راضی ہوتے ہیں۔

(تو کپڑے کی صفائی بھی ہے اور رضائے خداوندی بھی ہے' عمل ایک ہے لیکن دونوں حیثیتیں اس میں آگئی ہیں)

مسلم شریف میں ایک حدیث ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تین آدمیوں کی طرف نظرِ رحمت نہ

رمائیں گے۔ ان میں سے ایک "المُسبل" اِزار کو نیچے کرنے والا بھی ہے (ٹخنوں سے اِزار کا نیچا ہونا علامت تکبر ہونے کے باعث غضبِ خداوندی کو دعوت دیتا ہے۔ اس لئے اِزار کا اوپر ہونا اگرچہ اس سے صفائی بھی رہتی ہے لیکن اللہ کی رضا کا ذریعہ بھی ہے) تو ہر عمل میں حیثیتیں دو ہی ہیں' آپ کو جو ثواب ملتا ہے وہ آپ کے معین حیثیت ہی پر تو ملتا ہے' چنانچہ ایک حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ وفی بضع احدکم صدقۃ ___ تمہاری شرمگاہوں میں بھی صدقہ ہے تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ ایأتی احدنا شھوتہ ولہ فیھا اجر ___ یعنی ہم میں سے کوئی اپنی شہوت کو پورا کرے تو اس میں بھی اس کے لئے اجر ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ یہی پانی اگر حرام موقع میں ڈالتا تو گناہ نہ ہوتا؟ جب اس نے حرام سے اِجتناب کیا تو یہی عبادت ہوگی۔ تو شہوت کے پورا کرنے میں بھی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک محض شہوت رانی اور ایک یہ ہے کہ اجتناب عن الحرام کی نیت سے شہوت کو پورا کیا جائے۔ تو اس حیثیت کے متعیّن کرنے کی وجہ سے وہ عبادت بن گئی۔

اِتباعِ حکم ہی عبادت ہے

حاصل یہ کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کے لئے نامزد ہو جائے وہ عبادت بن جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض گناہوں کی بھی شریعت کی طرف سے اجازت مل جائے تو وہ عبادت بن جاتے ہیں۔ مثلاً جھوٹ بولنا اگرچہ بہت بڑا گناہ ہے لیکن صلح اور دفعِ فتنہ کے لئے واجب ہے۔ تو یہ عبادت میں شامل ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ عبادت کسی کام کے کرنے کا نام نہیں بلکہ حکم ماننے کا نام ہے ___ (اسی لئے باوجود اس کے کہ ایک چیز اپنی ذات کے لحاظ سے درست ہوتی ہے مگر شریعتِ حقّہ خلافِ حکم ہونے کے باعث اس کے نتائج کو غلط قرار دیتی ہے مثلاً) جب نماز پڑھنے کا حکم دیا جائے تو پڑھنا عبادت ہے اور جب روکا جائے تو عبادت نہیں۔ جیسا کہ تین اوقات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ تو ان اوقات میں نماز پڑھنا حرام ہے۔ ایسے ہی روزہ ایک عبادت ہے لیکن جب اس سے روکا جائے تو عبادت نہیں۔ مثلاً عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے' کیونکہ اس سے روکا گیا ہے ___ اسی طرح سچ کہنا عبادت ہے لیکن اگر سچ کہنے سے فتنہ و فساد بڑھے تو ناجائز ہے۔ جیسے غیبت کرنا جو کہ واقع میں تو سچ ہوتا ہے۔ (کیونکہ خلافِ واقعہ بموجب حدیث بُہتان ہے) لیکن شریعت نے اس سے منع فرمایا ہے ___ معلوم ہوا کہ عبادت حکم ماننے کا نام ہے (کسی خاص فعل یا قول کا نام نہیں) اور حکم دینے والے اللہ تعالیٰ ہوتے ہیں' وہی جانتے ہیں کہ کس جگہ حکم دینا مناسب ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔ کیونکہ اکڑ کر نہ ہی تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو' اور نہ ہی پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بندہ ہے' بندگی کے لئے آیا ہے۔ اس کی مشیت (اس کا چلنا پھرنا) بھی بندگی والی ہونی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا

یعنی اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔ غرض اِترا کر چلنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ تکبر کی علامت ہے۔ اور اکڑ کر وہی چلتا ہے جو اپنی اصلیت کو بھول جاتا ہے ___ ایک متکبّر آدمی بہت اکڑ کر چل رہا تھا۔ ادھر سے ایک بزرگ بھی آ رہے تھے' جن کی چال سے تواضع اور عاجزی ٹپک رہی تھی۔ تو اس بزرگ نے کہا کہ بھائی اکڑ کر نہ چلو تو اس کو غصہ آیا' اور کہنے لگا کہ تم جانتے نہیں میں کون ہوں؟ تو یہ شخص چونکہ مال میں مست تھا تو وہ بزرگ اپنی کھال میں مست تھے۔ انہوں نے فرمایا' جانتا ہوں تم کون ہو' اور تمہارا

تعارف یہ ہے کہ :

اوّلک قطرة واٰخرک جیفة وانت تحمل بینهما قذرة

یعنی تیری ابتدا تو اس پانی سے ہوئی جو بدن کو لگ جائے تو پلید ہو جائے' کپڑے کو لگ جائے تو ناپاک ہو جائے' اور بدن سے نکلے تو غسل واجب ہو۔ اور انتہا میں تو ایک مردار ہے' اور ان دونوں حالتوں کے درمیان گندگی اٹھائے پھرتا ہے۔ تو اس شخص کو اپنی حقیقت نظر آئی' توبہ کی اور کہا ۔

جزاک اللہ کہ چشم باز کردی
مرابا جانِ جاں ہمراز کردی

انسان کی ذات میں کوئی کمال نہیں

کمال درحقیقت جو بھی ہو وہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ انسان کی اپنی ذات تو گندگی ہی ہے۔ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس میں عقل بھی نہیں ہوتی۔ فخر تو انسان اس وقت کرے جب اس کی ذات میں کوئی کمال ہو۔ ورنہ فخر کرنا جہالت ہے۔

انسان کا سب سے بڑا کمال ایمان ہے۔ لیکن اس پر غرور کرنا ٹھیک نہیں' شکر کرنا واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایمان کی توفیق دی۔ ورنہ جیسے دنیا میں سینکڑوں کفار پھرتے ہیں۔ اگر ہمیں بھی انہیں میں سے کر دیتے تو ہماری کیا مجال تھی؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

یَمُنُّوْنَ عَلَیْکَ اَنْ اَسْلَمُوْا ط قُلْ لَّاتَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ ط بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ ھَدٰکُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○

یعنی اپنے اسلام کا احسان اللہ پر نہیں کرنا چاہئے بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان ماننا چاہئے کہ اس نے ایمان کی توفیق بخشی ۔

منّت منہ کہ خدمت سُلطاں ہمی کنی
منّت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

بادشاہ کے خادم کو بادشاہ پر احسان نہیں رکھنا چاہئے کہ وہ اس کی خدمت کر رہا ہے' بلکہ اس کو بادشاہ کا احسان ماننا چاہئے کہ اس نے اسی کو خدمت کے لئے چُن لیا ہے (ورنہ بادشاہ کے ہزاروں لوگ خدّام بننے کی خواہش رکھتے ہیں)

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ انسان کو اکڑ کر نہیں چلنا چاہئے لیکن اگر اکڑ کر چلنے کا خود حکم دیں تو یہ عبادت بن جاتی ہے۔ جیسا کہ حج کرتے وقت طواف کے پہلے تین چکروں میں رَمَل (اکڑ کر چلنا) کرنا واجب ہے۔ لہٰذا یہ عبادت بن گئی ۔

گر طمع خواہد زما سلطانِ دیں
خاک برفرق قناعت بعد ازیں

معلوم ہوا جو چیز اللہ تعالیٰ کے لئے نامزد ہو جائے وہ عبادت ہو جاتی ہے۔ پس یہی عبادت عادت ہے اور یہی عادت نیّت کے ساتھ عبادت ہے۔

اِسلام کا سہل راستہ

اگر انسان نماز پڑھتا ہے تو زیادہ سے زیادہ سوا گھنٹہ لگتا ہے تو گویا سوا گھنٹہ عبادت ہوئی۔ لیکن اسلام ایک
ما (سہل اور آسان) راستہ بتاتا ہے کہ ہر ایک کام عبادت بن جائے۔ چنانچہ کھانا' پینا' سونا تمام عبادت ہو سکتے
ں۔ مثلاً اس نیت سے انسان سوئے کہ میں اُٹھ کر تہجّد پڑھ سکوں یا بیت الخلاء میں اس لئے جائے کہ گندگی
ں جائے' اور طبیعت میں نشاط پیدا ہو تو فراغت سے عبادت کر سکوں۔ روٹی اس نیت سے کھائے کہ اس سے
ت پیدا ہو تو اللہ کی عبادت کروں۔ تو یہ ساری چیزیں عبادت بن جاتی ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ من قاداعمٰی غفرلہٗ ماتقدم من ذنبہٖ یعنی جس نے اندھے کو لاٹھی پکڑ کر
ایا تو اس کے اگلے پچھلے تمام صغائر (چھوٹے گناہ) معاف ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی جنازہ اٹھانا ایک طبعی امر ہے۔ ثواب نہ بھی ہو تو بھی انسان اٹھاتا ہے۔ لیکن حدیث میں ہے کہ جو
ص جنازے کے چاروں پاؤں کو کندھا دے تو اس کو چالیس نیکیاں ملتی ہیں۔ مردہ کو دفن کرنا ایک امر طبعی
ہے۔ لیکن اِتباعِ سنّت کی نیّت سے کیا جائے تو عبادت ہے۔ یتیم پر شفقت تو ہر ایک کو ہوتی ہے لیکن لوجہ اللہ
ں جائے تو عبادت ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص یتیم کے سر پر ہاتھ رکھے تو جتنے بال اس کے
ھ کے نیچے آئیں تو اس کو اتنی نیکیاں ملتی ہیں۔

عمل کے لِوَجہِ اللہ ہونے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں

اور عمل کے لِوَجہِ اللہ ہونے کے لئے دو چیزوں کی رعایت ضروری ہے۔ ایک اخلاص یعنی خالص اللہ کے
ئے ہو۔ ریا یا شہرت کے لئے نہ ہو۔ اور حظِ نفس کے لئے بھی نہ ہو۔ عبادت میں اگر اخلاص نہ ہو تو وہ قبول
یں ہوتی۔ پس ہر عبادت میں توحید کا رنگ ہونا چاہئے۔ اگر نماز پڑھی جائے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے۔
زہ رکھا جائے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے۔ نذر مانی جائے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اور دوسرے کو شریک
یں کرنا چاہئے۔ مشرکین کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں :

> وَجَعَلُوا لِلّٰہِ مِمَّا ذَرَءَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِیْبًا فَقَالُوْا ھٰذَا لِلّٰہِ بِزَعْمِھِمْ وَھٰذَا لِشُرَکَآئِنَا۔ فَمَا کَانَ لِشُرَکَآئِھِمْ فَلَا یَصِلُ اِلَی اللّٰہِ وَمَا کَانَ لِلّٰہِ فَھُوَ یَصِلُ اِلٰی شُرَکَآئِھِمْ۔

یعنی کفّار نے کھیتوں اور جانوروں میں تقسیم کی ہوئی تھی کہ یہ حصہ اللہ تعالیٰ کا ہے' اور یہ حصہ ان کے
سرے معبودوں کا ہے۔ پس یہ عبادت مشترک ہوئی اور مشترک عبادت اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں۔ اللہ
لیٰ فرماتے ہیں :

انا اغنی الشرکاء من الشرک

کسی دوسرے کو عبادت میں شریک کیا جائے' تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دوسرے حصے کو بھی تو ہی رکھ لے
ے تیری عبادت کی ضرورت نہیں۔ ایسے ہی اگر خیرات دی جائے تو چھپا کر دینی چاہئے۔ ہاں اگر کسی دینی
صلحت کے لئے اظہار ہو تو یہ بھی اچھا ہے۔ مثلاً اس نیت سے مشہور کر کے دے تاکہ دوسرے بھی دینے
یں تو بہتر ہے۔ ورنہ اصل میں صدقہ کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ اس طرح دیا جائے کہ بائیں ہاتھ کو بھی علم نہ

ہو۔ اور جو کچھ مانگا جائے وہ بھی اللہ تعالیٰ سے ہی مانگا جائے۔ حدیث میں ہے کہ اگر انسان کا تسمہ ٹوٹ جائے اور اس کو ٹھیک کرانے کے لئے پیسے بھی موجود ہوں تو جیب میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے مانگنا چاہئے۔ اس پر بھی ثواب ملتا ہے۔ کیونکہ نافع حقیقت میں صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔ یہ چیزیں اسبابِ نفع ہیں اور اسبابِ نفع پر خاصیت کا مرتب ہونا عقلاً ضروری نہیں۔ مثلاً آگ پر جلانے کا مرتب ہونا ضروری نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کی خاصیت بدل دے تو یہی پانی کا کام دے سکتی ہے ___ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس آگ میں پھینکا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے جلانے کی خاصیت چھین لی، تو آپ صحیح سالم رہے۔ ایسے ہی روپیہ سببِ نفع تو ہے لیکن نافع نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اس سے اس کی خاصیت چھین لیں تو بے کار ہے۔ ایسے یہ تلوار گلا کاٹنے کا سبب تو ہے لیکن خود نہیں کاٹتی۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری کو پھیرا، لیکن اس نے کاٹا ہی نہیں ___ یہی پانی آبِ حیات ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ

لیکن یہی پانی قبطیوں کے لئے سببِ موت بن گیا۔ اسی پانی سے بنی اسرائیل کے لئے راستے بن گئے اور ایک ایک قبیلہ ایک ایک راستے سے گزرنے لگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ڈبونے کی خاصیت اس سے سلب کر لی، اور قبطیوں کو اسی پانی میں ڈبو دیا۔ ماں باپ انسان کے لئے خالق نہیں۔ سببِ تخلیق ہیں، اور اللہ تعالیٰ چاہے تو بدوں اس سبب کے پیدا کر دے۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو بدوں ماں باپ کے پیدا کیا۔ البتہ "عادتُ اللہ" یوں ہی جاری ہے کہ اولاد میاں بیوی دونوں سے ہوتی ہے۔ سینکڑوں کیڑے مکوڑے بدوں ماں باپ کے صرف گندگی جمع ہونے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

ءَأَنْتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ

اور کاشتکار سے فرماتے ہیں :

ءَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ

اور اگر ظاہری طور پر کاشت کار ہی بوتا ہو تو بونے کے لئے اعضاء، اسباب، بیج، اور پھر بیج کا اگنا سب ہی تو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ حقیقت میں نافع اور ضارّ اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔

اللہ کی عبادت کیوں کی جائے؟

اور عبادت نافع اور ضارّ ہی کی ہوتی ہے۔ اسبابِ نفع و ضرر کی نہیں ہوتی۔ یہی دھوکہ دوسری قوموں کو لگا تو کوئی سورج کو سجدہ کرنے لگا تو کوئی درخت کو۔ کیونکہ کچھ نہ کچھ نفع تو ہر چیز میں موجود ہے۔ پس تمام عبادتیں (جانی ومالی ہمہ قسم) اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہونی چاہئے۔ نہ غیر اللہ کی نذر ماننی چاہئے، نہ غیر اللہ کو سجدہ کیا جائے، اور نہ رکوع کیا جائے۔ البتہ جو چیزیں جائز ہیں ان کی تعظیم جائز ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام نے بھی یہی تعلیم دی ہے فرمایا گیا :

أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ

یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرو اور اسی سے ڈرو۔ اور میری اتباع کرو اور حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان تو یہ تھی کہ اگر تکلیف ہوتی تو شکوہ بھی اللہ تعالیٰ سے کرتے تھے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام گم ہو گئے تو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا :

اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْ اِلَی اللّٰهِ

یعنی میں اپنے غم کی شکایت اللہ تعالیٰ سے کرتا ہوں۔ کیونکہ ان کو علم تھا کہ یوسف علیہ السلام انہی کی مرضی سے گم ہوئے ہیں اور انہی کی مرضی سے ملیں گے۔

حدیث شریف میں ہے :

اذا استعذت فاستعذ باللّٰہ واذا استعنت فاستعن باللّٰہ۔

یعنی جب تو پناہ پکڑے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ۔ اور جب تو مدد چاہے تو بھی اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ ـــــ مثلاً حضرت زکریا علیہ السلام نے بیٹے کی دعا کی تو پہلے ولادت کے تمام اسباب کے نہ ہونے کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ فرمایا کہ اے اللہ! میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں اور جب ہڈیوں تک کمزوری پہنچ گئی ہو تو گوشت اس سے اوپر ہوتا ہے' وہ بطریق اولیٰ کمزور ہو گا۔ یہ تو اندرونی حالت تھی۔ اور باہر کے متعلق فرماتے ہیں کہ میرا سر بڑھاپے سے سفید ہو گیا۔ لیکن اے اللہ! میں تجھ سے مانگ کر کبھی نامراد نہیں گیا۔ اور اولاد طلب کرنے کی وجہ بیان فرمائی کہ یہ میرے رشتہ دار ہیں۔ ان سے مجھے ڈر ہے کہ یہ میرے مشن کو چلا نہیں سکیں گے۔ اور تربیت وہدایت نہیں کریں گے۔ پھر فرمایا کہ میری بیوی بانجھ ہے۔ اس میں اولاد کی صلاحیت ہی نہیں۔ گویا اولاد کی صلاحیت نہ خاوند میں نہ بیوی میں' اور نہ رشتہ داروں سے تعلیم وتربیت کی امید' جو میرے مشن کو آگے بڑھا سکیں۔

بعد ازاں فرماتے ہیں اے اللہ! ایسا بیٹا دے جو میرا وارث ہو' اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی وراثت مال نہیں ہوتا بلکہ علمِ الٰہی ہوتا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہے :

انّ الانبیاء لم یورّثوا دیناراً ولا درھماً ولکن ورّثوا العلم

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان جب دعا کرے تو تردد نہ کرے بلکہ عزم کے ساتھ کرے ـــــ جیسا کہ ایک بدوی حج کو آیا تو بیتُ اللہ کے پاس کھڑے ہو کر کہنے لگا :

یا رب البیت یا رب البیت جئتک واھلی فی البیت الا تغفرلی الاتغفرلی

پھر دعا کے بعد بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ بعینہٖ وہی چیز مل جاتی ہے۔ اور بعض دفعہ اس سے اچھی چیز مل جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی دیر سے بھی ملتی ہے جیسا کہ بیٹا باپ سے کچھ پیسے مانگے تو باپ نہ دے اور کچھ دن گزرنے کے بعد دے۔ بیٹا کہے کہ جب میں نے مانگے تھے اس وقت تو آپ نے دیئے نہیں تھے تو باپ کہتا ہے کہ بیٹا تو اس وقت بیمار تھا اگر میں تمہیں پیسے دے دیتا تو تو ایسی چیزیں کھاتا جن سے تمہاری صحت بگڑتی ـــــ (بلا تشبیہ) ایسے ہی اللہ تعالیٰ سے اگر کوئی مال مانگے تو بعض اوقات مال نہیں ملتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضول خرچ ہے۔ اگر اس کو مال دیا گیا تو یہ اور زیادہ معاصی میں مبتلا ہو جائے گا۔ لیکن جب مفلس ہو جاتا ہے اور معاصی سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ دے دیتے ہیں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیٹا ساری زندگی مانگتا رہتا ہے باپ کچھ بھی نہیں دیتا۔ لیکن جب بیٹا بوڑھا ہو جائے تو باپ اس کو خزانہ دے دیتا ہے ـــــ بیٹا کہتا ہے کہ آپ نے ساری زندگی تو مجھے کچھ دیا نہیں باپ کہتا ہے کہ میں دیتا رہتا تو تو سارا مال ضائع کر دیتا۔ تو جتنا مجھ سے مانگتا رہا میں جمع کرتا رہا۔ اور آج اتنا خزانہ ہو گیا ہے۔ ایسے ہی انسان کی دعا بعض اوقات ساری زندگی قبول نہیں ہوتی۔ لیکن قیامت میں نیکیوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا ہو گا تو یہ انسان کہے گا کہ اے اللہ! میں نے تو اتنی نیکیاں نہیں کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو دنیا میں دعائیں کرتا رہا۔ میں ان کو تیری آخرت کے لئے جمع کرتا رہا۔ چنانچہ یہ تیری دعائیں ہیں۔ اس لئے انسان کو دعا سے کبھی تنگ نہیں ہونا چاہئے۔ اور میں کہتا ہوں کہ کچھ بھی نہ ملے تو بھی دعا کو چھوڑنا نہیں چاہئے۔ اس لئے کہ حدیث میں ہے :

الدعاء مخ العبادۃ

دعا عبادت کا مغز ہے۔ مغز کو چھوڑ کر محض چھلکے پر اکتفا کرنا کون سی دانش مندی ہے؟

غیر اللہ میں سے کس کی تعظیم ضروری ہے؟

اور دعا وطلب صرف اللہ تعالیٰ سے ہونی چاہئے۔ لیکن جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے لئے نامزد ہو جائیں ان کی تعظیم بھی ضروری ہے۔ مثلاً حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعظیم ضروری ہے کہ ان کی اتباع کی جائے۔ اور قرآن مجید کی تعظیم بھی ضروری ہے کہ اس کو بے وضو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ بیت اللہ المکرّم کی تعظیم کرنی چاہئے کہ قضاء حاجت کے وقت اس کی طرف منہ یا پیٹھ نہ کی جائے کیونکہ وہ جہتِ صلوٰۃ ہے لیکن معبود نہیں۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ حج کو تشریف لے گئے تو حجرِ اسود کو بوسہ دینے کا موقع نہ ملا۔ اور اس وقت ایسی حکومت تو نہ تھی کہ بذریعۂ پولیس آپؓ کے سامنے سے سب کو ہٹا دیا جاتا۔ تو آپؓ نے لاٹھی کو حجرِ اسود کے ساتھ لگا کر اس کو بوسہ دے لیا۔ اور حجرِ اسود سے خطاب کر کے فرمانے لگے:

انّی اعلم انک حجر لاتنفع ولاتضر لولا انی رایت رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم قبلک ما اقبلک

یعنی میں خوب جانتا ہوں تو ایک پتھر ہے نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ کسی کو ضرر دے سکتا ہے اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا ہوتا کہ وہ تجھے بوسہ دے رہے ہیں تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔

حدیث میں ہے ایک صحابیؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کو سجدہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ کہنے لگے میں نے قیصر و کسریٰ کو دیکھا کہ لوگ ان کو سجدہ کر رہے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کو سجدہ کیا جائے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے ___ اس لئے کہ عبادت وسجدہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کے لئے مخصوص ہے۔ کسی اور کی نہ عبادت ہے نہ کسی کو سجدہ ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام نے خود بھی تعلیم دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

مَاكَانَ لِبَشَرٍاَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًالِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کسی بشر کو کتاب اور نبوت دے۔ پھر وہ نبی کہنے لگے کہ میری عبادت کرو، اللہ تعالیٰ کی عبادت نہ کرو ___ تو حاصل اخلاص کا یہ ہوا کہ تمام عبادتیں صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے کرنی چاہئے۔

قبولیتِ اعمال کے لئے اخلاص کے ساتھ اتباعِ نبوی ضروری ہے

دوسرا اُصول یہ ہے کہ عمل میں اتباع کی شان موجود ہو۔ ہر فعل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جائے۔ جو عبادت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے نمونہ پر ہوگی، وہ مقبول ہوگی ورنہ نہیں۔ مثلاً

اگر کوئی شخص اخلاص کے ساتھ ظہر کی چھ رکعتیں پڑھے تو یہ عند اللہ مقبول نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ کے خلاف ہے۔ ایسے ہی اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ روزہ مغرب تک تو ہوتا ہی ہے۔ میں آج عشاء کے وقت افطار کروں گا۔ تو یہ قبول نہیں ___ نیز نمونے بنانے کی ضرورت نہیں بلکہ نمونے بنے ہوئے موجود ہیں۔ کیونکہ دین کامل اور مکمل ہو چکا ہے۔ اس میں ہر قسم کی ہدایات موجود ہیں۔ چنانچہ بعض مشرکین حضرت سلمان فارسیؓ سے کہنے لگے کہ تمہارا نبی تمہیں ہر چیز کی تعلیم دیتا ہے حتیٰ کہ قضائے حاجت کا طریقہ بھی بتلاتا ہے۔ تو آپؓ نے جواب میں فرمایا کہ ہاں آپ ہم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں حتیٰ کہ قضائے حاجت کا طریقہ بھی بتلاتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں حکم فرمایا ہے کہ ہم فارغ ہوتے وقت قبلہ کی طرف منہ نہ کریں اور نہ ہی پیٹھ کریں۔ تو جب حدیث میں ایسی ایسی چیزیں موجود ہیں تو اور کس چیز کی کمی ہو گی۔

اس لئے جتنا اخلاص کم ہوتا جائے گا اتنا شرک بڑھتا جائے گا' اور جتنی اتباع میں کمی ہو گی اتنی ہی بدعات داخل ہوتی جائیں گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی ہمارے سامنے نمونہ کے لئے موجود ہے۔

سیرِ حضراتِ انبیاء علیہم السلام میں سے صرف اُسوۂ محمدیؐ ہی موجود ہے

یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے دنیا کی کوئی قوم اپنے مقتدا کی سیرت دنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکتی ___ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گھریلو زندگی کا آج ہمیں کوئی علم نہیں۔ اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عملی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ صرف مسلمان ہی یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی ہمارے سامنے موجود ہے۔ چنانچہ کھانے' پینے' سونے' غرض زندگی کے ہر کام کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔

چین میں آٹھ صحابہؓ تشریف لے گئے اور وہاں جا کر تجارت شروع کر دی۔ تو صحابہ کرامؓ چونکہ دیانتدار تھے۔ اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے الصحابۃ کلھم عدول۔ تمام صحابہ کرامؓ عادل ہیں ___ دیانتداری سے وہاں تجارت شروع کی تو تمام بازار ٹھنڈا پڑ گیا ___ تاجروں نے حکومت کے پاس شکایت کی کہ یہ لوگ عرب سے آئے ہیں اور مُلک لوٹنا چاہتے ہیں۔ اگر ان کو ایسے ہی چھوڑ دیا گیا تو یہ تمام دولت نکال کر عرب میں لے جائیں گے ___ اس شکایت کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ ایک کمیشن صرف اس مقصد کے لئے بنا اور وزیرِ اعظم خود اس کے صدر بنے اور آ کر صحابہ کرامؓ سے کہنے لگے۔ "تم ہمارے مُلک کو ویران کرتے ہو اس لئے تم یہاں نِکل جاؤ" ___ صحابہؓ نے فرمایا کہ آپ کے تاجروں نے غریبوں کو لوٹ رکھا تھا جب ہم نے دیانتداری سے کام شروع کیا تو ان کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا' اور حسد کی وجہ سے شکایت لے کر آپ کے ہاں پہنچے ہم تو آپ کے مُلک کو آباد کرنے آئے ہیں۔ ویران کرنے نہیں آئے ___ وزیرِ اعظم نے کہا کہ ہم کو بہرحال شکایت ہے اس لئے تم یہاں سے چلے جاؤ۔

صحابہ کرامؓ نے فرمایا اگر ہمارا قصور ہو تو ہم اقرار کرنے کے لئے تیار ہیں اور بِلا قصور تم نکالنا چاہتے ہو تو ہماری طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ رعایا نے کہا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ چنانچہ حکومت دَب گئی۔ انہی آٹھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی برکت ہے کہ آج چین میں آٹھ کروڑ مسلمان ہیں ___ (تو نیّت کی درستگی اور دیانت کی وجہ سے آٹھ نفوسِ قدسیہ پر مشتمل یہ چھوٹا سا گروہ جو اپنی زندگی کا مقصد اتباعِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بنا چکا تھا۔ اتنی بڑی تعداد پر غالب آیا اور رہتی دنیا تک اپنے اَنمِٹ نقوش چین پر ثبت کر دیئے۔ آج بھی توحید کی آواز چین کے در و دیوار سے بلند ہو رہی ہے)

توحید کی قوّت اور شرک کی بے بسی

ایران پر چڑھائی کے لئے جب مسلمانوں کا لشکر گیا تو راستے میں دریا آگیا۔ حضرت سعدؓ نے لشکر سے فرمایا کہ جس خدا کے بندے ہو اسی کے قبضۂ قدرت میں یہ دریا ہے۔ اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دو۔ چنانچہ سب صحابۂ کرامؓ نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے اور تیرتے ہوئے دریا کو عبور کر گئے۔ ایک صحابیؓ کا پیالہ دریا میں گر پڑا' دوسروں نے کہا کہ اس کو پکڑلو۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر پیالہ میرا ہو تو یہ نہیں ڈوبے گا۔ (اللہ اس کی حفاظت فرمادیں گے) چنانچہ دریا کی موجوں نے پیالے کو دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچا دیا تھا۔ جب وہ صحابیؓ وہاں پہنچے تو پیالہ وہاں پڑا ہوا تھا۔ یہ تمام چیزیں قلب کی قوّت سے ہوتی ہیں اور قلب کی قوّت توحید سے پیدا ہوتی ہے۔ شرک سے دل میں تذبذب آجاتا ہے۔ ان کے ہاں نہ شرک کا واہمہ تھا نہ بدعت کا شبہ۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ' آٹھ سو صحابہؓ کو لے کر ماہان آرمنی عیسائی کے مقابلہ میں تشریف لے گئے۔ ماہان ارمنی حضرت خالدؓ سے کہنے لگا' میں تو سمجھا تھا کہ مسلمان عقلمند ہیں لیکن تم تو احمق ہو کہ اتنے آدمیوں کو لے کر ہزاروں کے لشکر کے مقابلہ کے لئے آگئے۔ مجھے تمہارے نوجوانوں پر رحم آتا ہے۔

حضرت خالدؓ نے فرمایا کہ اے ماہان؟ تو کمانڈر انچیف بن کے آیا ہے یا واعظ بن کر آیا ہے؟ تو اگر لڑنا نہیں چاہتا تو صاف کیوں نہیں کہہ دیتا کہ میں لڑائی نہیں کر سکتا ___ ماہان کو غصہ آیا تو فوجوں کو لڑنے کا حکم دے دیا۔

حضرت خالدؓ نے بھی صحابہؓ کو کفّار میں گھس جانے کا حکم فرمایا ___ راوی کہتے ہیں کہ سات گھنٹے تک لڑائی ہوئی آخر کفّار شکست کھا کر بھاگ گئے مسلمان صرف سات شہید ہوئے اور عیسائیوں کے تیرہ ہزار آدمی مارے گئے ___ اس کی وجہ یہی تھی کہ آدمی جب دین کے لئے لڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ مدد فرماتے ہیں۔ اور ہمّت صرف توحید سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ مشرک میں یہ جان نہیں کہ وہ اتنی قوّت پیدا کر سکے حاصل یہ کہ ایک طرف اخلاصِ کامل اور دوسری طرف اِتباعِ کامل کی ضرورت ہے' آج مسلمانوں میں شرک وبدعات داخل ہو رہی ہیں۔ اس لئے آج ذلّت کی بھی یہ حالت ہے کہ خدا کی پناہ۔

اَقوامِ عالَم کی اصلاح کا ذمّہ دار مسلمان ہے

اس کی اصلاح کی صورت یہ ہے کہ ایک دوسرے سے حُسنِ ظن رکھنا چاہیے' بد ظنی سے بچنا چاہیے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکَر بھی ضروری ہے لیکن کسی کو رسوا نہیں کرنا چاہیے۔ حدیث میں ہے کہ اے اللہ! میں اس مکّار دوست سے پناہ مانگتا ہوں' جو دوستی کا دعویٰ کرے لیکن جب میری بھلائی دیکھے تو اس کو دفن کردے اور جب میری برائی دیکھے تو اس کو اِفشاء کردے۔

حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں:

لن یصلح اخر ھذہ الامّۃ الابما صلح بہ اوّلھا۔

اس امت کے آخر میں فتنہ وفساد رونما ہونے کی اصلاح قطعی طور پر اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ امت اس راستہ پر نہ آجائے گی جس راستہ پر امّت کا پہلا طبقہ تھا۔ اور امّت کی اصلاح پہلے اخلاصِ کامل اور اتباعِ کامل سے ہوئی تھی۔

آج مسلمان یہ شکایت کرتے ہیں کہ مجھے فلاں سکھ نے ایذا پہنچادی' فلاں ہندو یا عیسائی نے مجھے تکلیف

دی ___ میں کہتا ہوں کہ تمام اقوامِ عالم کی برائیوں کی ذمّہ داری مسلمانوں پر ہے۔ کیونکہ یہ دنیا کے معلّم تھے۔ جب معلّم درست ہوں تو دوسرے خود بخود درست ہو جاتے ہیں ___ حدیث میں ہے :

الاسلام یَعلو ولایُعلیٰ

اسلام غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا۔ لیکن جب ہم اسلام کے دائرے میں ہی نہ آئیں تو ہم پست ہوں گے۔ ورنہ اسلام میں پستی نہیں ہے۔

بندہ کو اپنی مرضی ختم کردینی چاہئے

تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ نیّت تبدیل کرنے سے عادت عبادت بن جاتی ہے ___ ایک شخص نے ایک مکان بنوایا اور اس میں روشندان بھی لگائے۔ بن جانے پر اپنے شیخ کو بلوایا۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ روشندان کس لئے بنوائے ہیں؟ اس نے عرض کی ہوا آنے کے لئے بنوائے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ کے بندے اگر یہ نیّت بھی کرلیتے کہ اَذان کی آواز آئے گی تو ثواب بھی ہوتا، اور ہوا بھی اس سے بند نہ ہوتی۔ کیونکہ نیّت تو ان چیزوں کے لئے ضروری ہے جو نیّت پر موقوف ہیں تو ثواب تو نیّت پر موقوف ہے لیکن ہوا کا آنا نیّت پر موقوف نہیں۔ پس ہر کام میں ثواب کی فکر ہی ہونی چاہئے اور اللہ کی رضا کی طلب ہونی چاہئے۔ عبداللہ (اللہ کا بندہ) کا معنیٰ ہی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی کے موافق کام کرے۔

کسی شخص نے ایک غلام سے پوچھا کہ تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو کچھ مولا کھلائے گا۔ اس نے کہا کہ پیئے گا کیا؟ غلام نے جواب دیا کہ جو کچھ مولا پلائے گا ___ اس نے پوچھا کہ تو پہنے گا کیا؟ اس نے جواب دیا کہ جو کچھ مولا پہنائے گا ___ اس شخص نے کہا کہ اللہ کے بندے تیری بھی کچھ مرضی ہے یا نہیں؟ غلام نے جواب دیا کہ اگر اپنی مرضی ہوتی تو غلام نہ ہوتا۔

آیتِ متعلقہ بیان

جو آیت میں نے پڑھی تھی اس میں اسی اخلاص اور اِتّباع کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے ابراہیم! کہہ دو کہ میری نماز، میری قربانی، میرا مرنا، میرا جینا، سب اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اسی ملّت ابراہیمیہ کی تکمیل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا ___ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

مِلَّةَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰهِیۡمَ۔

یعنی اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملّت کا اتباع کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے اس امت کو خود امّت مسلمہ فرمایا ہے : هُوَ سَمّٰىكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ۔

ابراہیم علیہ السلام نے ہی تمہارا نام مسلمان رکھا ہے اور اسلام کے معنیٰ اطاعت اور سونپ دینے کے ہیں۔

اسلام کا اقرار کرنے کے بعد اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سُپرد نہ کرنا غدّاری ہے پسندیدگی کا بھی اظہار اور ناپسندیدگی کا بھی اظہار یہ اجتماعِ ضدّین ہے۔

نام کے اور کام کے مسلمان

پنجاب کے ضلع انبالہ میں ایک بزرگ جمنا کے کنارے ایک بستی میں رہتے تھے۔ ایک دفعہ دریا کو طغیانی

آئی تو وہ گاؤں بھی غرق ہونے لگا۔ لیکن ایک دیوار کی وجہ سے کچھ بچاؤ تھا۔ لوگ ان بزرگ صاحب کے پاس گئے اور عرض کی حضرت شاہ صاحب! گاؤں غرق ہونے لگا ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو غرق کرنے سے بچائے۔ تو شاہ صاحبؒ نے پھاوڑا لیا اور جو دیوار باقی تھی اس کو بھی توڑنے لگے۔ لوگوں نے کہا حضرت یہ کیا کررہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا۔ "جدہر مولیٰ ادھر شاہ دولا" تم مجھ سے اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کرانا چاہتے ہو؟ اگر اللہ تعالیٰ چاہے کہ یہ بستی ڈوب جائے تو بندہ کو بطریق اولیٰ کہنا چاہیے کہ یہ بستی ڈوب جائے۔

اسی طرح ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا حال ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اس کا کیا حال پوچھتے ہو جس کی مرضی کے موافق دو جہاں کا کارخانہ چل رہا ہے۔ اس نے کہا کہ دونوں جہاں کا کاروبار آپ کی مرضی کے موافق چل رہا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں۔ اس طرح کہ دونوں جہاں کا کاروبار اللہ کی مرضی کے موافق چل رہا ہے۔ اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی میں ایسا فنا کردیا ہے کہ اللہ کی مرضی ہی میری مرضی ہے۔

نازم بچشم خود کہ روئے تو دیدہ است
افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

عوام صحابہؓ میں سے ایک صحابیؓ زمین کاشت کررہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سُنی تو وہیں کھڑے ہوکر دعا کی کہ اے اللہ مجھے آنکھیں اس لئے عزیز تھیں کہ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وفات پاگئے تو ان آنکھوں کے ساتھ اب کسی دوسرے کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ بس اسی وقت وہ صحابیؓ نابینا ہوگئے ___ یہ تو بہرحال صحابی تھے۔ ان کا تو مقام ہے ہی۔ اس کے علاوہ اولیاء اللہ میں ایسے بزرگ ہوئے ہیں' امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ جن کی کتاب مدارسِ عربیہ میں پڑھائی جاتی ہے' ان کے شیوخ میں سے ایک شیخ ہیں جب وہ بازار نکلتے تو کانوں میں روئی ٹھونس لیتے تھے۔ لوگوں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حافظہ بہت قوی دیا ہے۔ جو چیز سنتا ہوں یاد ہوجاتی ہے۔ چاہتا ہوں جن کانوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنوں' ان کانوں میں کوئی دوسری آواز نہ پڑے۔ یہ لوگ کام کے مسلمان تھے۔ ہم تو نام کے مسلمان ہیں۔

آج اگرچہ ہم ان جیسے تو نہیں ہوسکتے بلکہ جو بزرگ ہمارے قریب زمانے کے ہیں ان کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ مثلاً جُنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ان کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن ہم کم از کم ان کے راستہ پر تو چل پڑیں۔ وہ تو دوڑتے جاتے ہیں ہم چلیں تو سہی۔ ہم بھی کبھی نہ کبھی ان شاء اللہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ اور بغیر سلف صالحین کے نقشِ قدم پر چلے دین و دنیا نہیں ملتی۔

بہرحال دین و دنیا کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر اخلاصِ کامل اور اتباع کامل پیدا کرے۔ یہی دو چیزیں کلیدِ نجات ہیں اور کامیابی کی ضمانت ہیں۔ جو بھی کامیاب ہوا وہ اسی طریق پر چل کر ہوا' اور جو راستہ سے ہٹ گیا وہ منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکا۔ اور زندگی کا مایہ یوں ہی گم کر بیٹھا۔

یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیقِ عمل نصیب فرمائے۔ آمین

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ
وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

رضائے الٰہی

جو ایسا بندہ ہو کہ اللہ اس سے راضی اور وہ اللہ سے راضی، بندے کا اطلاق اسی پر آئے گا۔ حقیقی بندہ وہی ہے اس لئے فرمایا کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ میرے ان بندوں میں داخل ہو جا جو میرے بندگانِ خاص ہیں۔ انہوں نے بندگی کا انکار کر دیا، جنہوں نے میرا دین نہیں مانا۔ تو میں بھی انہیں بندہ نہیں کہتا۔ جب وہ بندے بننا نہیں چاہتے۔ ہم بھی انہیں بندہ بنانا نہیں چاہتے۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہ

بعد از خطبہ مسنونہ

اما بعد - فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم - بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ - (پ۳۰ الفجر آیت ۲۷ تا ۳۰) صدق اللہ العلی العظیم

تمہید

بزرگانِ محترم

یہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے۔ جو اس وقت میں نے تلاوت کی۔ یہ سورۃ فجر کی آخری آیت ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :

"اے نفسِ مطمئنہ! لوٹ چل اور واپس آ اپنے پروردگار کی طرف اس حالت میں کہ تو اللہ سے راضی ہے اور اللہ تجھ سے راضی اور میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا"۔

یہ آیت بہت سے علوم و معارف اور حقائق پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ موقع نہ سب کے بیان کرنے کا ہے اور نہ ہی وقت ہے کہ پوری تفسیر کی جائے اور پورے حقائق کی تشریح بیان کی جائے۔ ورنہ آیت کا حق ادا ہو کہ پہلے نفسِ مطمئنہ کی تشریح کی جائے کہ نفسِ مطمئنہ کیا ہے؟ کسے کہتے ہیں؟ اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ یہ لوٹنا کیسا ہے؟ لوٹنا جب ہوتا ہے کہ پہلے آنا واضح کیا جائے۔ راضی اور مرضی ہونے کے کیا معنی ہیں؟ خاص بندوں میں شامل ہونے کی کیا حقیقت ہے؟ جنت میں داخل ہونے کی کیا کیفیت ہے؟ ــــ غرض یہ بہت سے مقاصد ہیں جن پر یہ آیت مشتمل ہے۔ ہر مقصد ایک مستقل موضوع ہے اور مستقل وقت چاہتا ہے اور اتنا وقت نہیں ہے۔ اس لئے اس آیت کے سلسلے میں تین باتوں کے متعلق میں کچھ تشریح تھوڑی سی عرض کروں گا۔

یہ آیت ایک تو واقعہ پر مشتمل ہے، جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ایک بشارت پر جس کی آیت میں وضاحت کی گئی ہے اور ایک انعام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس مختصر سے وقت میں انہی تینوں چیزوں کی مختصر تشریح کرنی ہے۔

وقتِ نزع کا خطاب

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مؤمن کو اس کی موت و نزاع کے وقت خطاب کیا جائے گا۔ جو اس کا آخری وقت ہوگا۔ گویا یہ خاتمے کے وقت کا خطاب ہے۔ جیسے شرعی خطابات زندگی میں کئے گئے ہیں کہ **صلوا** نماز پڑھو یا **علیکم بالصیام** روزے رکھو یا **علیکم بالحج** حج ادا کرو وغیرہ۔ یہ زندگی کے خطابات ہیں اور یہ زندگی کے خاتمے کے وقت کا خطاب ہے۔ جب کہ آدمی اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوگا اور اس دنیا کی زندگی کو ختم کر رہا ہوگا۔

اور اسی وقت کی یہ بشارت ہے جو اس آیت میں دی گئی ہے اور اسی وقت ایک انعام کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔

یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ یہ خطاب کس وقت ہوگا؟ حدیث میں اس کی تفصیل فرمائی گئی ہے کہ جب مؤمن پر اس کا آخری وقت آتا ہے اور اس کا نزع شروع ہوتا ہے تو ملک الموت کے اعوان و انصار اس شخص کے پاس پہنچتے ہیں جو حالت نزع میں ہے اور اس کی موت کی ابتدا ہو رہی ہے۔

مَلَکُ الْموت کے دو قسم کے اَعوان ہیں۔ ایک اصحابِ یمین اور ایک اصحابِ شمال۔ ایک دائیں جانب کے ملائکہ ہیں اور ایک بائیں جانب کے۔ دائیں جانب کے ملائکہ کی یہ شان بیان کی گئی ہے کہ وہ بِیْضُ الوجوہ ہیں۔ یعنی سورج اور چاند کی طرح سفید اور روشن چہرے والے ہوں گے۔ بائیں جانب کا لشکر وہ ہے جو مظلم ہے۔ تاریک اور سیاہ اور ڈراونے ان کے چہرے ہوں گے۔

مؤمن کی جب روح قبض کرنے کا وقت آتا ہے۔ اس وقت پہلے دائیں جانب کے ملائکہ بھیجے جاتے ہیں جنہیں اصحابِ یمین سا جاتا ہے اور حدیث میں ہے کہ یہ محتضر بندہ جس کی موت قریب آچکی ہے۔ یہ دور سے دیکھتا ہے جیسے منزلوں پر سینکڑوں سورج اور چاند روشن ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب بڑھتے جا رہے ہیں۔ اسے ایک قسم کا تحیر پیش آتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے؟ یہ وہی ملائکہ ہوتے ہیں جو اصحابِ یمین اور ملکُ الموت کا دائیں جانب کا لشکر کہلاتے ہیں۔

دور سے اس لئے نظر پڑتے ہیں کہ ایک نئے عالم سے سابقہ ہے نئی عالم کی مخلوق سامنے آرہی ہے۔ ایک

دم سامنے آنے سے کہیں مؤمن گھبرا نہ جائے اور جزع فزع میں مبتلا نہ ہو جائے' اس لئے پہلے دُور بیٹھ کر اپنا جمال دکھلاتے ہیں اور آہستہ آہستہ قریب ہوتے جاتے ہیں تاکہ رفتہ رفتہ اُنس پیدا ہو۔

یہ وقت اس میت پر ایسا ہوتا ہے کہ اس میت پر ایک عالمِ تحیّر طاری ہے کہ سورج اور چاند ہیں کیا چیز ___ ؟ آہستہ آہستہ قریب آرہے ہیں۔ یہاں تک کہ بالکل قریب آجاتے ہیں۔ اب **مشخّص** ہوتا ہے کہ یہ محض روشنیاں نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی شکل و صورت سب مشخّص ہو کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ اس مؤمن کے ساتھ نہایت ہی خاطر و مدارات اور نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ یہ نہیں کرتے کہ آتے ہی اس کی جان نکالنی شروع کردیں۔ بلکہ ترغیب دینا شروع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ :

اخرجی ایّتها النفس الطیبة کانت فی الجسد الطیب۔ اخرجی الی روح و ریحان ورب غیر غضبان۔

اے پاک روح اور نفس! نکل اس بدن میں سے کہ تو نے اپنے عمل سے اسے پاک بنادیا تھا۔ تیرا بدن بھی پاک اور تو خود بھی پاک ___ کہاں نکل اور کہاں جا؟ راحتوں' نعمتوں' آسائشوں اور آرام کی طرف اور ایسے پروردگار کی طرف چل جو کبھی تجھ پر غضب ناک نہیں ہو گا۔ بلکہ رحمت کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس طرف چل۔ یہ گویا ایک قسم کا وعظ ہوتا ہے۔ جس سے وہ آخرت کی طرف جانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس میں دنیا کی گندگی اور بُرائیاں بھی بیان کرتے ہیں کہ تو کس گندے عالم میں پھنسا ہوا ہے۔ پاک عالم کی طرف چل جس میں نہ غم والم اور نہ پریشانی ہے۔ بلکہ بشاشتیں' راحتیں اور انبساط ہے۔ ادھر چل اور آخیر میں اس پروردگار کی طرف چل جس کے لئے تو نے زندگی بسر کی' محنتیں اٹھائیں۔ اب وہ نتیجہ قریب آرہا ہے۔ یہ ایک وعظ و ترغیب ہے تاکہ مؤمن کا دل آخرت کی طرف پھر جائے تو مرنا آسان ہو جائے گا۔ دوسرے عالم کی طرف نکلنا سہل ہو جائے گا۔

ملائکۂ موت مؤمن کو ترغیب دے کر آخرت کے لئے آمادہ کرتے ہیں

غرض پہلے دنیا کی بُرائی دل میں بٹھاتے ہیں اور آخرت کی ترغیب دیتے ہیں۔ مگر طبعی طور پر انسان کو موت شاق ہے کہ اس عالم سے نکل کر جس میں پچاس' ساٹھ' ستر برس گزارے ہوں' دوسرے عالم میں جائے۔ اس لئے جیسے بدن کا چھوڑنا بھاری ہے۔ اس جہان کا چھوڑنا بھی بھاری ہے۔ اس لئے طبعی طور پر موت انسان کے حق میں مکروہ ہے۔ طبیعت گوارا نہیں کرتی' لاکھ بشارتیں دی جائیں' نعمتوں کا پیغام سنایا جائے۔ مکروہ طبعی کراہت اور **جھجھک** غالب ہے تو آمادہ نہیں ہوتی۔

بعض طبائع تو وہ ہیں۔ جنہوں نے دنیا میں رہ کر ہی اپنے قلب کو فارغ بنالیا تھا۔ وہ فوراً ہی آمادہ ہو جاتی ہیں۔

ہمارے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ' میں ایک دن ان کی مجلس میں حاضر تھا۔ دو یا تین آدمی اور بیٹھے ہوئے تھے۔ عام مجلس نہیں تھی۔ بیٹھے بیٹھے حضرت کی طبیعت میں کچھ جوش سا پیدا ہوا۔ تو ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی اجنبی آدمی تو نہیں۔ دیکھا تو کوئی اجنبی آدمی نہیں۔ جیسے گویا کوئی بڑی راز کی بات کہنا چاہتے ہوں' تو اِدھر اُدھر دیکھا تاکہ کوئی بیگانہ آدمی نہ ہو۔ جب مطمئن ہو گئے تو ہم سے خطاب کر کے فرمایا کہ

"الحمد للہ! میں موت و آخرت کے لئے اتنا تیار بیٹھا ہوں کہ اگر ابھی پیغام آجائے تو

خوشی خوشی چلا جاؤں''۔

یہ بات فرمائی۔ یہ بات ہمیں کچھ عجیب سی معلوم ہوئی کہ کون سی ایسی نئی بات ہے جس شخص کے پاس بھی موت کا پیغام آئے گا' خواہی نخواہی اسے تو جانا ہی پڑے گا۔ یوں کہنا میں تیار بیٹھا ہوں۔ اس سے کیا حاصل؟ یہ تیار ہو یا نہ ہو۔ جب موت آئے گی تو جانا ہی پڑے گا۔ اس میں تیاری کی کیا بات ہے؟

گویا ہمیں ایک اِستعجاب سا ہوا کہ یہ کون سی ایسی راز کی بات تھی کہ حضرت نے دیکھا کہ ادھر ادھر کوئی اجنبی اور بیگانہ ہو ___ مگر بعد میں واقعی معلوم ہوا کہ ایک تو موت کا آنا تکوینی طور پر ہے۔ جب آجائے گی تو آدمی جائے گا۔ جیسے پیدا ہونے میں مجبور ہے۔ جب اللہ کسی کو دنیا میں لانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہے نہ چاہے اسے آنا پڑتا ہے۔ اسی طرح جب آخرت میں لے جانا چاہیں گے۔ وہ چاہے نہ چاہے جانا ہی پڑے گا۔ تو ایک فعلِ خداوندی ہے کہ تکوینِ الٰہی کے سامنے انسان مجبور ہے۔ ایک رضا ہے کہ اپنی خوشی سے جائے۔ یہ جب ہوگا جب اللہ سے اُنس و محبت غالب آجائے۔ آخرت کی نعمتوں کی رغبت غالب آجائے۔ وہاں کی نعمتوں کے مقابلے میں دنیا کی ہر نعمت ہیچ معلوم ہو۔ قرآن کریم کی ایک آیت دنیا ومافیہا سے زیادہ اونچی اور برتر نظر آئے اور یہ سمجھے کہ اگر ایک آیت کا مفہوم میرے ذہن میں آگیا اور کیفیت یہ طاری ہوگئی کہ پوری دنیا مجھ سے چھین لی جائے' یہ نعمت میں دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ یہ جب ہوتا ہے جب حق تعالیٰ اور دینِ اسلام کی محبت کا غلبہ ہوجائے۔ اس وقت پھر انسان کے دل میں موت کی تمنا پیدا ہوتی ہے اور چاہتا ہے کہ کس طرح سے دنیا سے نکلوں جیسے بعض عارفین کا قول ہے کہ ؎

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بردیم
تادر میکدہ شاداں و غزل خواں بردیم

وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ اس اُجڑے ہوئے دِیار کو چھوڑ کر ہم اس آباد دیار میں پہنچیں گے اور اس شہر مطلوب میں پہنچیں گے۔ جہاں کے ہم سے وعدے کئے گئے ہیں۔ اس لئے موت کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔

مؤمن کو عند الموت حق تعالیٰ براہِ راست بھی خطاب فرماتے ہیں۔

حدیث میں موت کی تمنا کی ممانعت فرمائی گئی۔ فرمایا لا یتمنین احد کم الموت کوئی شخص تم میں سے موت کی تمنا نہ کرے۔ اس سے کہ موت آکر زندگی اور عمل کو بھی قطع کردے گی۔ جتنی زیادہ زندگی نیکی کے ساتھ اتنی بہتر ہے۔ اس لئے موت کی تمنا مت کرو اور ایک جگہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ جمعہ پ۲۸

''اے یہود! اگر تمہیں اولیاء اللہ اور ولی کامل ہونے کا دعویٰ ہے تو ذرا موت کی تمنا کرکے دکھلاؤ''۔

اس سے معلوم ہوا کہ مؤمن ہونے اور ولایت کا خاصہ یہ ہے کہ موت کی تمنا پیدا ہوتی ہے ___ اور یہاں فرمایا جارہا ہے کہ کوئی شخص موت کی تمنا نہ کرے۔ بظاہر ایک تعارض سا محسوس ہوتا ہے کہ ایک جگہ حکم ہے تمنا کرو' ایک جگہ حکم ہے کہ ہرگز مت کرو۔ یہ دو باتیں آپس میں ٹکرا گئیں۔ لیکن ایک دوسری حدیث نے اس مضمون کو صاف کردیا۔ فرمایا گیا'

لایتمنین احدکم الموت بضر نزل بہ کوئی شخص کسی مصیبت سے اُکتا کر موت کی تمنا نہ کرے۔ یہ بے صبری اور اللہ پر بے اعتمادی کی علامت ہے کہ مصیبت کی وجہ سے آدمی کہے کہ موت ہی کیوں نہیں آجاتی ___ اگر موت آگئی اور وہاں بھی مصیبت ہی ہوئی تو پھر کیا ہوگا؟ کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا' یہ انعام خداوندی کو ٹھکرانا ہے' بے صبری ہے۔ اس کی ممانعت ہے ___ لیکن اگر اللہ سے ملاقات کے شوق میں موت کی تمنا ہو۔ یہ عین مطلوب ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی جب وفات قریب آئی تو چہرہ بشاش' داڑھی کا ایک ایک بال کھلا ہوا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ خوشی ان کے دل سے اُبلی پڑتی تھی۔

فرمایا غدا نلقی محمدا واصحابہ کل انشاء اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحابؓ سے ملاقات ہو جائے گی۔ اس کی خوشی ہے۔ یہ خوشی عین مطلوب ہے۔ اس لئے اگر موت کی تمنا ہے تو یہ عین مطلوب ہے۔ البتہ کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا یہ خلاف مطلوب ہے ___ بہرحال ولایت جب کامل ہوتی ہے تو موت کی تمنا ہوتی ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے'

اللھم حبب الموت الی من یعلم انی رسولک

"اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت پیدا کر دے جو میرے نبی اور رسول ہونے کا قائل ہے"۔

اور ایک دوسری حدیث میں اس کی وجہ بیان فرمائی گئی کہ

الموت تحفۃ المؤمن موت مؤمن کے لئے تحفہ ہے۔ یوصل الحبیب الی الحبیب۔ جو ایک عاشق کو اس کے محبوبِ حقیقی تک پہنچاتا ہے ___ اگر عاشق ہو تو محبوب کے پاس جانا مطلوب ہوتا ہے یا مکروہ ___؟ جو عاشقِ خداوندی ہے اس کو اللہ سے ملنے کی تمنا ہوگی اور اللہ سے نہیں مل سکتا جب تک بیچ میں موت نہ آئے۔ تو موت درمیانی واسطہ ہے۔ اس واسطے کے بغیر محبوب سے نہیں مل سکتا ___ بہرحال جب ولایت ہوتی ہے تو موت کی تمنا ہوتی ہے۔ اس وقت ان لوگوں کا ذکر نہیں ہے جو واقعی موت کے شائق ہیں۔ لیکن ہم اور آپ جیسے جن کو طبعاً موت مکروہ ہے۔ ملائکہ علیہم السلام اور ملکُ الموت کے اعوان و انصار آکر انہیں موت کی ترغیب دیتے ہیں کہتے ہیں کہ کس گندے عالم میں پڑے ہوئے ہو۔ اس عالم کی طرف چلو جہاں روح و ریحان ہے اور اس رب کی طرف جو کبھی نامہربان نہیں ہوگا اور اس کی مہربانی دوامی ہوگی۔ جب اس کے دل میں انعام

کی ذرا مضبوطی ہوتی ہے اور وہ راضی ہو جاتا ہے۔ پھر نزع شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن بعض ایسے ہیں کہ ان کے چہرے دیکھ کر بھی پوری طرح آمادہ نہیں ہوتے۔ کیونکہ طبعاً موت مکروہ ہے اور جان آمادہ کر کے نکالنی ہے۔ گویا ظاہری طور پر جبراً اس کو کھینچنا نہیں ہے۔ یہ مؤمن کے ساتھ لطف اور مدارات کا برتاؤ ہے۔ تو حدیث میں ہے اس وقت ملائکہ اس کو کچھ تحفے لا کر دکھلاتے ہیں۔ یہ چیزیں جب سامنے آتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر پھر مؤمن اپنے قابو میں نہیں رہتا اور ایک دم بہادری کرنے کا جوش پیدا ہوتا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ پھر اس طرح سے روح نکلتی ہے جیسے پانی سے بھری ہوئی مشک کو تم اُلٹا کر دو۔ تو غرغرا کر ایک ایک قطرہ ٹپک جاتا اور باقی نہیں رہتا۔ اس طرح سے روح پرواز کر جاتی ہے۔ اس وقت یہ کہا جاتا ہے :

یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ۝ اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً۝ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۝ (فجر پ ۳۰ آیت ۲۷، ۳۰)

تو بالواسطہ ملائکہ پیغام دیتے ہیں کہ :

اخرجی الی روح وریحان۔ اخرجی ایتھا النفس الطیبۃ۔ کانت فی الجسد الطیب۔

اے پاک روح چلی آ۔ تیرا بدن بھی پاک تھا اور خود بھی تو پاک ہے۔ یہ تو ملائکہ علیہم السلام کے واسطے سے بشارت ہوتی ہے اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ براہ راست پیغام دیا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ خود پکارتے ہیں۔ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ اے نفسِ مطمئِنّہ آ۔ اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ لوٹ اپنے پروردگار کی طرف کہ تو خود بھی اپنے پروردگار سے راضی تھا اور تیرا پروردگار بھی تجھ سے راضی۔ یہ اس وقت کا خطاب اور بشارت ہے جو اللہ کی طرف سے بندہ کو ہوگا۔

یہ تو وہ واقعہ ہے جو ہر بندے کو پیش آئے گا۔ مگر یہ خطاب صرف مؤمن کے لئے ہوگا۔

مؤمن کے لئے اعلانِ رضا کی بشارت

بشارت اس میں کیا ہے؟ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً یہ بشارت ہے۔ ___ یعنی اے نفسِ مطمئِنّہ آ اور ہماری طرف لوٹ۔ اس حالت میں کہ تو اللہ سے راضی اور اللہ تجھ سے راضی۔ اعلانِ رضا یہ سب سے بڑی بشارت ہے۔ مؤمن کو کہا جائے گا تو ہم سے اور ہم تجھ سے راضی۔ مؤمن کے راضی ہونے کے کیا معنیٰ؟

بظاہر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کا کون سا انسان ہے جو اللہ سے راضی نہیں ہے۔ سوائے چند دہریوں کے جو خدا کے وجود ہی کے قائل نہیں ہیں۔ باقی پوری دنیا خدا سے راضی ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب کی ہو۔ مذہب کی بنیاد ہی خدا کے وجود پر اور اس کے ماننے پر اور اس کے راضی ہونے پر ہے۔ کیا ایک یہودی کہہ دے گا میں اللہ سے راضی نہیں ہوں؟ کیا کوئی عیسائی کہہ دے گا کہ میں اللہ سے ناراض ہوں؟ یا ایک مشرک جو سینکڑوں خداؤں کو مانتا ہے اور کہتا ہے کہ بڑا خدا ایک ہی ہے۔ یہ بھی یہی کہتا ہے کہ میں اس سے راضی ہوں۔ غرض مؤمن کے لئے یہ کون سی نئی بات ہے۔ سارے اللہ سے راضی ہی ہیں۔ مؤمن کی کیا خصوصیت ہے؟

احادیث کے اندر اس رضا کی تفسیر فرمائی گئی ہے۔

وہ یہ کہ ایک تو رضا خدا کی ذات کے ساتھ ہے۔ ایمان کے لئے یہ تنہا کافی نہیں ہے۔ یوں تو ہر قوم کہے گی کہ ہم خدا سے راضی ہیں۔ جب تک ان افعال الٰہیہ کے ساتھ رضامندی نہ ہو، جو بندے کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔ یعنی ہر تقدیر پر راضی اور ہر اس فعل پر راضی ہو جو اللہ اپنے بندے کے ساتھ کر رہا ہے۔ یہ ایمان کے لئے ضروری ہے ___ حق تعالیٰ شانہٗ جیسے خالق و مالک ہیں، رب بھی ہیں۔ رب کے معنیٰ پالنے والے کے ہیں۔ پال پرورش کے اندر وہ افعال بھی کئے جاتے ہیں، جن سے ظاہری طور پر بندہ خوش ہو جائے اور ایسے افعال بھی کئے جاتے ہیں جن سے بظاہر وہ ناراض بھی ہے۔

ماں بچے کو پالتی ہے تو جیسے چمکارتی ہے تھپڑ بھی تو مارتی ہے۔ جیسے پیار کرتی ہے کبھی کبھی طمانچہ بھی مارتی ہے۔ باپ جیسے بچے کو کھلاتا پلاتا ہے، کبھی کبھی مکتب میں نہ جانے پر یا پڑھنے میں کوتاہی کرنے پر سزا بھی دیتا ہے۔ کبھی یہ بھی کہہ لیتا ہے کہ میرے گھر سے نکل جا۔ تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ دل میں محبت موجود ہے مگر کہہ رہا ہے کہ گھر سے نکل جا اور کبھی جوش میں کہہ دیتا ہے کہ اب اگر تو نے کوتاہی کی تو دیوار سے دے

کر تجھے ماروں گا۔ کیا واقعی اس کا جذبہ یہ ہے کہ بچے کو دیوار میں دے کے مار دے۔ صرف ڈرانے دھمکانے کے لئے ایسا کہتا ہے۔ غرض جیسے پیار کرتا ہے کبھی کبھی سزا بھی دیتا ہے۔ تو ماں اپنی ماتا کے سبب جیسے پالتی اور پرورش کرتی ہے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی سختی بھی کرے۔ اسے بھی تربیت کہتے ہیں۔ یہ تربیت سے خارج نہیں ہے۔

اگر بچہ ماں کے دودھ پلانے پر خوش ہو جائے' روٹی کا نوالہ کھلائے تو بھی راضی رہے اور جب تھپڑ مارے تو کہے کہ نہ تو میری ماں ہے نہ میں تیرا بیٹا ہوں۔ تو کہا جائے گا کہ بڑا نامعقول اور ناخلف بیٹا ہے۔ جیسے اسے ماں کے دودھ پلانے پر راضی ہونا چاہئے تھا ویسے ہی ماں کے تھپڑ مارنے پر بھی راضی ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ تھپڑ مارنا بھی اس کی مصلحت کے لئے ہے۔ کیوں کہ ماں کا جذبہ عداوت کا نہیں' محبت کا ہے۔ اگر نہ مارے گی بچے کی راہ ہی درست نہ ہوگی۔ خلف صالح وہ کہلائے گا جو باپ کے چمکارنے اور تھپڑ مارنے پر بھی راضی ہے۔ کھانا کھلانے پر بھی راضی اور جب سزا دے کہ تو پڑھنے کیوں نہیں گیا۔ ایک وقت کی روٹی بند کر دے۔ تو بھی راضی ہے اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ میری ہی مصلحت کے لئے ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ ایک دودھ پیتا ہوا بچہ اس وجہ کو سمجھتا ہے جسے کوئی شعور نہیں جب ماں دودھ پلاتی ہے جب بھی وہ ماں کی گود میں جاتا ہے۔ جب طمانچہ مارتی ہے تو روتا جاتا ہے۔ مگر دوڑتا ماں ہی کی طرف ہے سمجھتا ہے کہ اس گود کے سوا میرے لئے کوئی اور پناہ گاہ نہیں ہے۔ میرا ٹھکانہ یہی ہے۔ بہر حال جب کھلانا پلانا ور سب چیزیں دینا یہ تربیت ہے۔ تو کبھی کبھی تھپڑ مارنا یہ بھی تو تربیت ہے۔ بندہ وہ ہے کہ اللہ کے ہر فعل پر راضی ہو۔ اگر وہ تونگر بنادے' تو جتنا اس وقت راضی ہو' اس پر بھی اتنا ہی راضی ہو جب وہ ساری نعمتیں چھین کر مفلس بنادے۔ تب کہا جائے گا کہ یہ صحیح معنی میں اللہ کا بندہ ہے جتنی رضامندی نعمت میں ہو' اگر وہ مصیبت بھیج دے تو اتنی ہی رضامندی مصیبت میں بھی ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ اللہ بندہ کو مصیبت بھیجتا ہے کسی عداوت کے سبب نہیں۔ یہ بھی محبت کا تقاضا ہے۔ یہ بھی تربیت کا حصہ ہے۔

بعض دفعہ نعمت دے دی جاتی ہے۔ مثلاً بے شمار دولت دے دی' اقتدار دے دیا' لیکن بندے نے اس کو غلط طریق سے استعمال کرنا شروع کیا۔ بجائے اس کے شکر گزاری سے رات دن اپنے پروردگار کے آگے جھکتا۔ اس نے تعیش میں آکر اسی دولت کو خدا سے بے گانہ ہونے کا ذریعہ بنالیا۔ تو انصاف اور عقل سے سوچئے کہ تھپڑ مارنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں ___؟ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ تنبیہ کی جائے۔ اس لئے کبھی کبھی دولت چھین لیتے ہیں۔ حقیقتہً وہ چھیننا نہیں ہوتا۔ ورنہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ معاذ اللہ ہمارے خزانے میں کمی تھی۔ لاؤ اس سے چھین کے بھر لو بلکہ ایک تنبیہ مقصود ہوتی ہے۔ شاید یہ اس چھیننے سے عبرت پکڑے اور باز آجائے اور جس برائی کی طرف جا رہا ہے، پھر توبہ کر کے ہماری طرف رجوع کرے۔ جس کو قرآن کریم میں ایک موقع پر فرمایا گیا:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ○ (انعام پ۷ آیت ۴۲)

"ہم دنیا کی قوموں کو کبھی کبھی مصیبت سے آزماتے ہیں' کبھی کبھی خوف میں مبتلا کرتے ہیں' کبھی دشمنوں کو مسلط کر کے آزماتے ہیں۔ تاکہ یہ دوبارہ تضرع اور زاری کے ساتھ ہماری طرف رجوع کریں۔ ہماری پناہ ڈھونڈیں"۔

بہت سے قومیں ہیں کہ عبرت پکڑ کے جھک جاتی ہیں۔ پھر ان پر مزید انعاموں کی بارش ہوتی ہے ___

لیکن بہت سے ہیں کہ پھر بھی نہیں جھکتے۔ آگے اس کا ذکر کیا'

فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جب ہماری طرف سے مصیبت بھیجی جائے۔ تو یہ جھک کر تضرع اور زاری اختیار کریں۔ ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اس لئے کہ ان کے دل پتھر ہو چکے ہیں۔ یہ عبرت قبول نہیں کرتے۔ نصیحت کا اثر ان پر نہیں ہوتا ___ اور شیطان نے یہ زندگی ان کے سامنے اتنی آراستہ کردی ہے کہ اگلی اور دوسری زندگی کا وہم ہی نہیں گزرتا۔ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو قبضے کی زندگی ہے۔ اس کو کوئی چھیننے والا نہیں ہے ___ اس درجہ ان کے سامنے دنیا مزین ہو جاتی ہے' اسی کی رنگینیوں میں اُلجھ کے رہ جاتے ہیں۔ دوسری طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ تو جسے دینا آتا ہے اسے لینا بھی آتا ہے۔ وہ چھین بھی سکتا ہے۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَاذُكِّرُوْا بِهٖ جب نصیحتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں اور بھلا دیتے ہیں اور جتنی یاددہانی کی گئی سب اکارت جاتی ہے تو فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ہم بھی آزمائش کے لئے ان پر نعمتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ ہر طرف سے دروازے کھل گئے۔ عزت' آبرو' رزق کے' اشیاء اور سامانوں کے' اولاد کے بھی۔

حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا۔ جب وہ مطمئن ہو گئے کہ اب تو وسائل زندگی قابو میں ہیں۔ اب چھننے والے نہیں ہیں۔ کون ہے جو ہم سے لے لے؟

فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا مگن اور مطمئن ہو گئے' انجام کو بھلا چکے ___ پھر ___ اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً اچانک ہم پھر پکڑ کرتے ہیں اور عقاب کا پنجہ آکر پڑتا ہے۔ فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ○ اب حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی؟ اس کا تو وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ یہ آفت کہاں سے آگئی؟

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (انعام پ آیت ۴۵-

اس وقت ظالموں کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے۔ ظلم اور ظالم دونوں ختم کر دیئے جاتے ہیں۔

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ربوبیتِ الٰہیہ میں جیسے انعام ہیں ویسے انتقام بھی ربوبیت کے لئے ہے۔ جیسے دینا ربوبیت ہے' چھیننا بھی ربوبیت ہے۔ تو عبرت و نصیحت دلانے کے لئے کبھی کبھی ایسا بھی کرتے ہیں۔

اللہ کی ذات سے ہی نہیں اس کے افعال پر بھی راضی رہنا چاہئے

حاصل یہ نکلا کہ بندہ صحیح معنوں میں وہ ہے جو اللہ سے راضی ہو۔ اس کے افعال سے بھی راضی ہو۔ یعنی اس کے دینے پر اور چھیننے پر راضی ہو۔ اس کے انعام پر بھی راضی ہو اور کبھی سزا یا انتقام لے تو اس پر بھی اتنا ہی راضی ہو جتنا نعمت پر تھا۔ اس لئے کہ نعمت اور مصیبت بھیجنے والا اللہ ہے اور حکمت کے ماتحت بھیجتا ہے' بندے پر شفقت کے ماتحت بھیجتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کی دی ہوئی نعمت پر ہم راضی ہو جائیں اور بھیجی ہوئی مصیبت پر نہ ہوں۔ دونوں پر یکسانی کے ساتھ رضامندی ہونی چاہئے۔

اس لئے راضی اس بندے کو کہیں گے جو اللہ کی ذات سے ہی نہیں' بلکہ اس کے افعال سے بھی راضی ہو۔ اس کی تقدیرات سے بھی راضی ہو۔ اس کے معاملات سے بھی راضی ہو اور جب بندہ اتنا راضی ہو گیا کہ نعمت میں بھی راضی اور مصیبت میں بھی راضی۔ نعمت آتی ہے جب بھی اس کا نام لیتا ہے۔ مصیبت آتی ہے

جب بھی اس کا نام لیتا ہے۔ تو پھر ادھر سے رضا شروع ہوتی ہے کہ یہ بندہ پسندیدہ ہے۔ ہر حالت میں اپنا ہے' لہٰذا ہم بھی اس کے۔ یہ اگر ہم سے راضی ہو تو ہم بھی اس سے راضی۔ اسے نہ عیش کا دھیان' نہ مصیبت کا دھیان۔ اسے تو عیش اور مصیبت بھیجنے والے کا دھیان ہے۔ نہ یہ عیش میں اُلجھا ہوا ہے نہ مصیبت میں۔ اس کا دھیان تو ہماری طرف ہے۔

ہمارا دہلی کا جو آخری بادشاہ ظفر تھا۔ کچھ بے چارہ صوفی مزاج تھا ہی کچھ مصائب اور آفات نے اسے بنا دیا تھا اور بہترین شاعر بھی تھا۔ اس نے ایک قطعہ اپنے ان مصائب کے وقت کہا تھا۔ بڑی عبرت کی اور بڑی عجیب بات کہی' پہلی بات تو اس نے یہ کہی کہ ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی خرابیوں پر جو نظر
تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا! !

دوسروں کو آدمی اس لئے بُرا کہتا ہے کہ اپنی برائی اس کی نگاہ میں نہیں ہوتی اور اگر اپنی برائی سامنے آئے تو دوسرے کو معذور سمجھے گا' بلکہ اچھا سمجھے گا۔ کسی عرب کے شاعر نے کہا ہے کہ ؎

لعمری ان فی ذنبی لشغلا
بنفسی عن ذنوب بنی امیہ

خدا کی قسم مجھے اپنے گناہوں کا اتنا شغل ہے کہ مجھے بنی امیہ کے گناہ یاد کرنے کی فرصت ہی نہیں۔ تو ظفر کہتا ہے کہ ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی خرابیوں پر جو نظر
تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا! !

اور آگے کہتا ہے کہ ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا
گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم وذکا

اسے آدمی نہ سمجھنا' خواہ کتنا ہی دانا اور دانش مند ہو۔

جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

تو آدمی وہ ہے کہ عیش میں بھی اللہ کو نہ بھولے اور طیش میں بھی۔ نعمت میں بھی نہ بھولے مصیبت میں بھی نہ بھولے۔ دنیا میں نعمت بھی آزمائش کے لئے ہے، مصیبت بھی آزمائش کے لئے ہے۔ بندہ وہ ہے کہ دونوں حالتوں میں پورا اُترے۔ اسے کہیں گے کہ یہ اللہ سے راضی ہے۔ اس لئے رضا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب اللہ کے قائل ہو گئے اور ہم اس کی ذات سے راضی ہیں۔ اس طرح تو مؤمن اور غیر مؤمن دونوں راضی ہیں۔ مؤمن کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے افعال سے' اس کی تقدیرات سے اور اللہ

اپنے بندے کے ساتھ جو معاملہ کرے اس سے راضی ___ اگر وہ نعمت بھیج کر بادشاہ بنا دے۔ تو کہے اے اللہ! میں راضی ہوں، تیرا بندہ ہوں اور اگر یوں کہے کہ اس تخت کو چھوڑ کر جاکر اس وقت جنگ کر وہ کہے میں اس پر بھی راضی ہوں' میں جاکر جنگ کروں گا اور اگر کہے کہ جان دے دو تو بندہ کہے کہ میں اس پر بھی راضی ہوں اور اگر کہے کہ ہم سب مال چھیننا چاہتے ہیں۔ کہے کہ میں اس پر بھی راضی ہوں۔ اس لئے کہ آپ جو کچھ بھی کریں گے میری مصلحت سے کریں گے۔ آپ کے افعال میں کوئی غرض نہیں ہو سکتی۔ آپ غنی عن العالمین ہیں۔ حق تعالیٰ اپنے کسی نفع کے لئے بندے کو نہ نعمت دیتے ہیں نہ مصیبت۔ ان کو نفع نقصان سے کیا تعلق؟

حدیث میں ہے کہ اگر سارے بندے مل کر اتقیٰ قلب ہو جائیں۔ سب کا قلب ایسا بن جائے جیسے انبیاء کا قلب ہوتا ہے تو میرے ملک میں ذرہ برابر اضافہ نہیں کرسکتے اور اگر سب کے قلوب شیاطین کے قلوب بن جائیں تو میرے ملک میں ذرہ برابر نقصان نہیں کرسکتے۔ اللہ کو نہ نفع کی پرواہ نہ نقصان کی نہ وہ نفع کا محتاج نہ نقصان کا۔ اس لئے جو کچھ بھی ہے بندے کی مصلحت کے لئے ہے اور بندہ اس پر ہر طرح سے راضی ہے' اس کو راضیۃ کہا گیا ہے۔ اس حالت میں تو ہمارے پاس آرہا ہے کہ تو راضی تھا۔ دنیا میں ہم نے جو معاملہ تیرے ساتھ کیا تو نے اس پر رضا کا اظہار کیا۔ ہر حالت اور ہر تقدیر پر راضی رہا۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تجھ سے راضی نہ ہوں؟ تو تو مرضی ہے بھی کہ ہم تجھ سے راضی ہیں۔

آدمی صاحبِ نسبت کب ہوتا ہے؟

حضرات صوفیاء کی اصطلاح میں اسی کا نام نسبت ہے۔ یہ جو آپ نے سنا ہوگا کہ فلاں صاحبِ نسبت بزرگ گزرے ہیں' اربابِ نسبت میں سے ہیں۔ اس نسبت کے معنیٰ یہ ہیں کہ بندے کو اللہ سے اتنا قوی تعلق پیدا ہو جائے کہ وہ اللہ سے راضی' اللہ اس سے راضی۔ جانبین سے جب رضا ہوگی تو کہیں گے کہ آدمی صاحبِ نسبت بن گیا۔ جہاں ایک طرف سے رضامندی ہو وہ صاحبِ نسبت نہیں۔ اللہ بھی راضی ہو۔ جب صاحبِ نسبت بنے گا۔

جیسے نکاح اس وقت ہوتا ہے کہ عورت بھی راضی ہو۔ مرد کہہ دے کہ صاحب میں تو راضی۔ بس ہو گیا میرا نکاح اور عورت راضی نہیں، نکاح کیسے ہو سکتا ہے؟ جانبین کی رضا شرط ہے۔ جب یہ تعلق مضبوط ہو گا۔ اس سے نیک ثمرات پیدا ہوں گے۔ آگے اولاد ہوگی تو جانبین کی رضا سے نکاح منعقد ہوتا ہے۔

اسی طرح سے حق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ جو تعلق ہے وہ جانبین سے ہوگا۔ تب کہا جائے گا یہ بندہ صاحب نسبت ہے کہ یہ اللہ سے راضی اور اللہ اس سے راضی ہے تو بندے کے راضی ہونے کا مطلب یہ نکلا کہ اللہ کی ہر تقدیر پر راضی اور اللہ کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس بندے کے ہر فعل سے راضی ہو گیا۔ حتیٰ کہ اگر یہ بندہ کوئی غلطی بھی کر گزرے گا، تب بھی ناراض نہیں ہوں گے۔ کیونکہ منشاء صحیح ہے۔ رضامندی سے کر رہا ہے۔ بھول چوک ہو گئی' کام غلط ہو گیا' اس لئے وہ بھی ناراض نہیں ہوتے۔

یہ وہ مقام ہے جس کو صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ

> "یا رسول اللہ! آپ کی ذات بابرکات عجیب و غریب ہے کہ اللہ میاں آپ کی خواہش پوری کرنے کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ آپ میں خواہش پیدا ہوئی اور پوری ہوئی۔ حق

تعالیٰ آپ کی ہر خواہش اور نفس کے تقاضے کے ساتھ ہیں"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نفس اللہ کی رضا میں اتنا فانی ہے کہ اس نفس سے خدا کی مرضی کے خلاف کوئی فعل ہوتا ہی نہیں۔ جو ہوگا رضا کے مطابق ہوگا۔ لہٰذا وہ پسندیدہ ہوگا۔ تو انبیاء علیہم السلام کا نفس اتنا پاک ہوتا ہے کہ نفسانی خواہش بھی اُبھرتی ہے۔ وہ بھی عین حق و صواب ہوتی ہے۔ اگر نبی بیوی کے پاس جانا چاہیں تو وہ خواہشِ نفسانی کہلاتی ہے۔ مگر نفس اتنا پاک ہے کہ اس میں بھی رضائے خداوندی مطلوب ہوتی ہے اس لئے ان کو اس میں بھی وہی اَجر ملتا ہے جو آپ کو نماز اور روزے میں ملتا ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کا ہر فعل پسندیدہ ہے۔ کیونکہ نفس رضائے حق میں فانی بن چکا ہے۔ تو جو اتنے اللہ سے راضی ہیں کہ اس کی ہر تقدیر پر راضی، تو اللہ ان سے اتنا راضی ہے کہ ان کے ہر فعل پر راضی اور ان کا ہر فعل پسندیدہ۔

یہی وجہ ہے کہ حدیث میں ہے **المجتهد يخطى ويصيب ومن اخطأ فلهٗ اجر ومن اصاب فلهٗ اجران** مجتہد خطا بھی کرتا ہے اور صواب بھی۔ صواب کرے گا تو دو اَجر ملیں گے۔ خطا کرے گا تو ایک اَجر ملے گا۔ تو خطا کرنے پر بھی اَجر ملنا، حالانکہ غلطی تھی۔ اس لئے کہ یہ اس غلطی میں اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے دوڑ رہا ہے۔ چاہتا ہے کہ مسئلہ حق واضح ہو، اتفاق سے پہنچ نہیں سکا۔ تو اس نے جان بوجھ کر غلطی نہیں کی۔ بلکہ عقل کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکی۔ اس واسطے یہ غلطی بھی کرتا ہے تو اسے ایک اَجر دیا جاتا ہے۔ تو یہ کس لئے کہ کر تو رہا ہے خطا اور اوپر سے مل رہا ہے ثواب۔ غلطی کر رہا ہے اور ثواب دیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ نفس رضاءِ حق میں فانی ہو چکا ہے۔ اس حالت میں غلطی بھی کر جائے گا وہ بھی اس کا صواب سمجھا جائے گا۔

این خطا از صد صواب اولیٰ تراست

یہ خطا بھی ہمارے صواب سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ یہ فانی فی اللہ اور فانی فی الحق ہے۔

مقامِ صاحبِ نسبت

اس مقام کے بارے میں فرمایا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ **دارالحق معهٗ حيث دار** حق ادھر ہی کو گھوم جاتا ہے جدھر کو حضرت عمرؓ گھومتے ہیں۔ یعنی بظاہر تو یوں فرماتے کہ جدھر کو حق گھومتا ہے عمرؓ ادھر گھوم جاتے ہیں۔ حق کے ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن یہ کہا جا رہا ہے کہ جدھر عمرؓ گھومتے ہیں حق ادھر گھوم جاتا ہے۔ یہ کب کہا گیا؟ جب عمرؓ رضائے حق کے اندر اتنے فانی ہو چکے تھے کہ اب وہ جو بھی کرتے تھے وہ عین مرضئ خُداوندی ہوتا تھا۔ تو حضرت عمرؓ کو اللہ کی رضا خود ڈھونڈتی تھی۔ جو وہ کہہ دیں بس وہی حق ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بارہ اُمور میں حضرت عمرؓ کی رائے وحی سے مل گئی۔ جو رائے دی اسی کے مطابق وحی نازل ہو گئی۔

حدیث میں ہے کہ ابتدا میں عام عورتوں کا پردہ نہیں تھا۔ مجلس میں ازواجِ مطہّرات بیٹھتی تھیں، ذکر و تلاوت اور علم کی باتیں سنتی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا،

یا رسول اللہؐ! آپ کی مجلس میں ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ جہاں صحابہؓ ہیں، بعض منافق بھی شامل ہوتے ہیں۔ مجھے پسند نہیں آتا کہ ازواجِ مطہرات چہرے کھول کر بیٹھیں۔

یہ رائے دی تھی اور اسی دن وحی نازل ہو گئی کہ **فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ** اور **قَرْنَ فِيْ**

یُؤتِیْنَ گھروں میں ٹھہری رہو' باہر مت نکلو۔ جو رائے دی، عین اس کے مطابق وحی آئی۔

اس طرح سے متعدد واقعات گزرے کہ حضرت عمرؓ نے رائے عرض کی اور وحی آ گئی ___ حدیث میں ہے کہ مقامِ ابراہیم' حج کرنے والے جانتے ہیں کہ طواف کرنے کے بعد دو رکعت اس طرح پڑھی جاتی ہیں کہ مقامِ ابراہیم کو بیچ میں لے لیا جائے، تاکہ استقبال قبلہ کا کیا جائے اور بیچ میں مقام ابراہیم آجائے۔ طواف کا دوگانہ واجب ہے مگر اس شان کے ساتھ۔ یہ ابتدائے اسلام میں نہیں تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام ابراہیم کے فضائل بیان کئے کہ یہ وہ پتھر ہے جس کے اوپر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیتُ اللہ کی تعمیر کی اور اس پر حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے پیر کا نشان بھی ہے۔ آپؐ یہ فضائل بیان فرما رہے تھے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا'

لو کنا نصلی خلفہ

یا رسول اللہ! کیسا اچھا ہو کہ ہم مقام ابراہیم کو بیچ میں لے کر نماز پڑھیں۔ جس دن یہ کہا' اسی دن شام کو یہ آیت نازل ہوئی :

وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (بقرہ پ۱ آیت ۱۲۵)

"مقام ابراہیم کو مصلّٰی بناؤ اور اسے درمیان میں لے کر دوگانہ ادا کرو"۔

اس طرح کی متعدد چیزیں جو تقریباً بارہ ہیں۔ جن کے بارے میں حضرت عمرؓ نے جو رائے دی' وحی بعینہٖ اس طرح سے نازل ہوئی۔ گویا ان کا ضمیر وحیِ خداوندی کا اِتباع کرتا تھا۔ ادھر ہی چلتا تھا جدھر وحیِ خداوندی آنے والی ہوتی تھی۔

اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

لو کان بعدی نبی لکان عمرؓ۔

اگر میرے بعد نبوّت کا دروازہ کھلا ہوا ہوتا اور کوئی نبی آتا' تو عمرؓ ضرور نبی بنائے جاتے۔ مناسبت نبوّت سے اتنی ہے کہ جو رائے دیتے ہیں، وحی اس کے مطابق آتی ہے۔ ___ مگر یہ صورت کب ہوئی ___؟ یہ صورت جب ہوئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کا نفس رضائے خداوندی میں بالکل فانی ہو گیا۔ اپنے نفس کی کوئی خواہش باقی نہیں رہی۔ اس حالت میں نفس میں بھی جو خواہش آتی ہے وہ بھی پسندیدہ' حق اور مرضیِ خداوندی ہوتی ہے۔ تو اللہ کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بندے کے ہر فعل پر اللہ راضی ہو جائے۔ حتیٰ کہ اگر نفسانی خواہش بھی پیدا ہو تو اس پر بھی اللہ راضی ہو۔ اس لئے کہ اس کا منشاء حق کی طلب ہے اور بندے کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ہر تقدیر پر راضی۔ نعمت دے دے جب راضی' مصیبت دے دے جب راضی۔

اللہ کے ہر فعل پر راضی ہونے کا دُنیا میں اِنعام

حضرت عمران ابن الحصین رضی اللہ عنہٗ جو جلیلُ القدر صحابی ہیں۔ ان کے پہلو میں ایک پھوڑا نکلا۔ وہ ناسور بن گیا۔ کوئی بتیس برس تک اس کا زخم رہا ہے۔ ہر وقت اس میں پیپ وغیرہ بہتی اور بتیس برس تک چت لیٹے رہے' کسی ایک جانب کی کروٹ نہیں لے سکتے تھے۔ چت لیٹے لیٹے کھانا کھاتے۔ اسی طرح وضو کرنا' اسی طرح نماز پڑھنا ___ اندازہ کیجئے جو شخص بتیس برس تک ایک کروٹ پر چارپائی پر پڑا رہے۔ اس کی کیا حالت ہوگی۔ لیکن حضرت عمران بن الحصین کے چہرے پر وہ بشاشت تھی کہ کسی تندرست و توانا کے چہرے پر

بھی وہ رونق نہ ہو۔ جو ان کے چہرے پر تھی۔

لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! تکلیف کا تو یہ عالم۔ برسا برس گزر گئے آپ اُٹھ نہیں سکتے' کروٹ نہیں لے سکتے چت لیٹے ہوئے ہیں۔ پھر اتنے ہشاش بشاش؟ ان دونوں باتوں کا جوڑ سمجھ میں نہیں آتا۔

فرمایا "تکلیف آئی۔ میں نے رضا کا اظہار کیا کہ اے اللہ! میں راضی ہوں جس حالت میں تو رکھے۔ میں راضی ہوں۔ اس لئے کہ تو میری مصلحت کو جانتا ہے۔ میں اپنی مصلحت کو خود نہیں جانتا۔ میں نے رضا کا اظہار کیا۔ وہ رضا میری طبیعتِ ثانیہ بن گئی۔ میرے صبر و رضا سے اب یہ کیفیت ہے کہ میں چت لیٹے لیٹے ملائکہ علیہم السلام کی زیارت کرتا ہوں۔ عالمِ غیب مجھ پر منکشف ہے' عالمِ ملکوت مجھ پر روشن ہے۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ یہ تکلیف جائے۔ اتنا میں راضی ہوں۔

تو جو اللہ کے افعال پر اور اس کی تقدیر پر ہر طرح راضی ہو جائے تو اللہ بھی اس بندے کے ہر فعل سے راضی ہو جاتا ہے۔ یہ کچھ بھی کرے اللہ اس سے راضی اور یہ بُرا کرے گا ہی نہیں۔ جو کرے گا اچھا ہی کرے گا۔

جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک میں' کہ مسلمان تنگی کی حالت میں تھے اور شام کی طرف رومیوں سے مقابلہ تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقابلہ فرمایا۔ لیکن اس سے پہلے آپؐ نے لوگوں کو ترغیب دی کہ جہاد ہونے والا ہے۔ اس کی یہ فضیلت ہے۔ اس کے لئے چندہ جمع کرو۔ مسلمان غُربت کی حالت میں تھے۔ چندہ لا نہیں سکتے تھے۔ امراء میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے سو اونٹ مہیا کر کے ان کی زینیں' چادریں' ہر اونٹ کے مناسب ہتھیار' اس پر توشہ چڑھا ہوا کہ مجاہد بیٹھ کر کیا کھائے گا۔ اس طرح سو اونٹ مکمل لا کر پیش کئے۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک کھل گیا اور چمک ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے سورج آپ کے چہرے کے اندر دوڑ رہا ہے' اور یہ لفظ فرمائے :

ما علی عثمان ما عمل بعد الیوم

"آج کے بعد عثمان کچھ بھی کرے۔ اس کے اوپر کوئی وبال نہیں ہے۔ اللہ کی طرف سے کوئی برائی اور نامرضی نہیں ہے۔ جو چاہے کرے"۔

یہ مطلب نہیں تھا کہ معاذ اللہ کبیرہ گناہ کر لیں۔ جب بھی اللہ ان سے راضی ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ آج کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا نفس اتنا مطمئن بن گیا ہے کہ ان کی نفسانی خواہش بھی پاک ہو گئی۔ جو کر لیں گے وہ پسندیدۂ الٰہی ہو گا۔ یہ گویا رضا کے متعلق آپؐ نے بشارت دی۔

بشاشت کے ساتھ رضا کا اعتبار ہے مجبوری کے ساتھ نہیں

تو انسان کے نفس میں اللہ سے اتنی محبت' تعلق اور اتنا اطمینان پیدا ہو جائے کہ اس کی ہر تقدیر پر وہ بشاشت کے ساتھ راضی ہو۔ مجبوری کے ساتھ نہیں۔ صبر بشاشت کے ساتھ ہو۔ مجبوری کا صبر بھی کو آ جاتا ہے۔ کسی کے ہاں خدانخواستہ کوئی میت ہو جائے۔ تین چار دن کے بعد خود ہی صبر آ جاتا ہے مگر صبر وہ ہے جو بروقت ارادے سے کیا جائے۔ جب کہ غم کا پہاڑ ٹوٹ رہا ہو۔ اسے صبر کہتے ہیں۔ جیسے ایک بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی اور بین کر کے رو رہی تھی۔ اس کا بیٹا مر گیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گزرے۔ آپؐ نے فرمایا' بڑی بی! صبر کر۔ بڑی بی کو غم میں غصہ آ گیا۔ کہا تمہارے کوئی مرجاتا تب میں جانتی تم صبر کرتے۔ میرا تو ایک ہی بیٹا تھا۔ گزر گیا میں کیسے صبر کروں؟

فرمایا اچھا تیری مرضی۔ مت صبر کر۔

آپؐ روانہ ہو گئے۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو پریشان ہو گئی اور دوڑی ہوئی پہنچی کہ یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے خبر نہیں تھی کہ آپؐ تھے اور آپؐ نے صبر کے لئے فرمایا ___ میں اب صبر کرتی ہوں آپؐ نے ارشاد فرمایا: الصبر عندالصدمۃ الاولیٰ صبر کا وہ وقت تھا جب صدمہ پڑا ہوا تھا۔ تین دن کے بعد تو سبھی کو صبر آجاتا ہے۔ یہ تو مجبوری کا صبر ہے سب کو حاصل ہو جائے گا۔ صبر وہ ہے جو ارادے اور اختیار سے ہو اور اس حالت میں ہو جب کہ غم پڑا ہوا ہے اس وقت بندہ مطمئن ہو کہ جو کچھ ہے مِن جانبِ اللہ ہے اور اس کے اندر خیر ہی خیر ہے۔ میں راضی ہوں اور مطمئن ہوں در حقیقت یہ اطمینان رضا ہے۔

رضاءِ الٰہی پر اُخروی و اَبدی انعام

غرض مؤمن کو یہ ایک بشارت مرنے کے بعد دی جائے گی کہ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ اے نفسِ مطمئنہ! تجھے اللہ کے ہر فعل اور ہر تقدیر پر اطمینان حاصل تھا۔ ضرّاء ہو یا سرّاء ہو، نعمت ہو یا مصیبت ہو، خوشی ہو یا غمی ہو۔ تو ہر حالت پر اللہ سے مطمئن تھا کہ جو ہو رہا ہے میرے لئے خیر ہو رہا ہے۔ تو اے نفس! جس کی یہ کیفیت تھی کہ اسے اللہ کے افعال پر طمانینت و بشاشت حاصل ہو گئی تھی۔ اب تو اس حالت میں اِرْجِعِیْ ہماری طرف لوٹ کہ تو بھی راضی، ہم بھی تجھ سے راضی۔ تو نے اپنی عمر رضا میں گزار دی۔ ہم اب تیری ابدی عمر اپنی رضا میں گزاریں گے کہ ہم تجھ سے راضی ہیں، کبھی ناراض نہیں ہوں گے۔

جب تو اس مقام پر رہے تو فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ اب تیرا نام میرے بندگانِ خاص میں لکھ لیا گیا ہے۔ تو ان میں داخل ہے۔ مطلقاً بندے تو سبھی ہیں۔ کفار و فجار بھی اس کے بندے ہیں۔ ابلیس بھی اسی کا بندہ ہے۔ مگر عبادِ خاص نہیں ہیں۔ جن کو مقرب کہا جائے، جن پر عبد کا اطلاق آئے۔ عبد وہ ہے جس میں عبدیت ہو اور عبدیتِ مطلقہ۔ عبدیت کے معنی غلامی کے ہیں ___ یعنی اللہ کے سامنے ایسی غلامی ہو کہ جو بھی وہ کہیں بس اس کے سامنے راضی ہی راضی ہو۔ ناخوشی کا کوئی سوال نہ پیدا ہو۔ اسے عبدِ مطلق کہتے ہیں۔ اس کو دوسرے لفظوں میں قرآن کریم نے تفویض کہا ہے:

اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ (مومن پ ۲۴ آیت ۴۴)

ہر معاملہ اللہ کو سونپتا ہوں۔

تفویض میں راحت، تجویز میں مصیبت ہے

جو وہ کرے میں مطمئن اور راضی ہوں ___ واقع یہ ہے کہ بندے کے لئے راحت بشاشت جتنی ہے تفویض کے اندر ہے۔ جتنی مصیبتیں ہیں سب تجویز سے آتی ہیں۔ خود ہم تجویز کرتے ہیں کہ یوں ہونا چاہئے۔ ایسا ہوتا نہیں، تو بیٹھ کے گھٹتے ہیں۔ یہ مصیبت ہے ___ اور اگر شروع سے یہ کہہ دیں کہ جو اللہ میاں کردے۔ بس میں اس پر راضی ہوں۔ پھر خلافِ طبع کوئی چیز پیش ہی نہیں آئے گی۔ جب خلافِ طبع نہیں پھر مصیبت کیا ہوئی۔ مصیبت ہے ہی اپنی تجویز اور جب تفویض کردی۔ سارا معاملہ اللہ کو سونپ دیا اور یہ سمجھ لیا کہ جو ہو گا خیر ہو گا۔ قلب کے اندر گھٹن ہی پیدا نہیں ہو گی۔ نعمت آجائے جب بھی راضی، مصیبتیں آجائے تب بھی راضی۔

کسی نے کسی بزرگ سے پوچھا تھا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو، جس کی مرضی پر دونوں جہان کے کارخانے چل رہے ہیں۔

لوگوں نے کہا، آپ کیا اس درجے کے ہیں کہ دونوں جہان کے کارخانے آپ کی مرضی پر چل رہے ہیں۔

فرمایا ہاں، الحمدللہ۔ میں اسی درجے کا ہوں۔

لوگوں نے کہا، آخر یہ ہو کیسے سکتا ہے؟

فرمایا، یہ اس طرح سے ہو سکتا ہے اور میرے اندر ہو گیا ہے کہ دونوں جہان کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے۔ جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔ تو کوئی چیز میرے خلافِ طبع دنیا میں ہوتی ہی نہیں۔ کوئی پیدا ہوتا ہے، میں کہتا ہوں، الحمدللہ یہی ہونا چاہئے تھا، کوئی دنیا سے گزرتا ہے۔ میں کہتا ہوں الحمدللہ یہی ہونا چاہئے تھا۔ میں کون ہوں کہ اللہ کوئی کام کرنا چاہے۔ میں کہوں کہ یہ نامناسب ہے نہ ہونا چاہئے۔

جیسے بعض لوگ اخبارات میں کسی بڑے آدمی کے انتقال کے موقع پر لکھ دیا کرتے ہیں کہ فلاں صاحب کی بے وقت موت سے ہمیں بڑا صدمہ پہنچا ___ اس بندہ خدا سے کوئی پوچھے کہ خدا کی طرف سے کوئی چیز بے وقت بھی ہوتی ہے۔ بے محل اور بے موقع بھی ہو سکتی ہے؟ یہ بڑی گستاخی کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو معاذ اللہ آپ سے مشورہ لینا چاہئے تھا کو کون سا وقت مناسب ہے۔ جس میں اس بندے کو موت دی جائے اور پھر موت دی جاتی ___ بڑی جرأت کی بات ہے ___ موت جب آئے گی اپنے وقت پر آئے گی، مرضیٔ الٰہی سے آئے گی۔ ہم اس معاملہ میں گھسنے والے کون ہیں؟ ___ کسی کی ولادت ہوگی اپنے وقت پر ہوگی۔ اس پر کسی کو صدمہ کرنے کا حق کیا ہے؟ ہر حالت میں بندہ کو رضا اپنانی چاہئے۔

تو اس بزرگ نے کہا کہ دونوں جہان کے کارخانے میری مرضی پر چل رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے۔ جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔ لہٰذا کوئی چیز دنیا میں خلاف طبع ہوتی ہی نہیں۔ یہ در حقیقت ان کی عبدیت کا مقام ہے کہ جو پیش آئے گا وہ من اللہ ہو گا اور جو من اللہ ہو گا وہ خیر ہو گا، وہی مصلحت ہو گا۔ اس پر ہم راضی ہیں۔ ہمیں ناراض ہونے کا مطلب کیا ہے؟

اس مقام کی طرف اشارہ کیا گیا کہ اے نفسِ مطمئِنہ! جب تو نے اپنی زندگی میں نیکی سے، فلاح و رُشد سے اپنے نفس میں طمانیت پیدا کر لی اور اللہ کے کسی فعل پر تجھے کوئی اعتراض باقی نہیں رہا۔ جو ادھر سے فعل ہوا، تو نے کہا ٹھیک ہے میں مطمئن ہوں۔ تو جب تو نے اطمینان کا برتاؤ کیا۔ ہم بھی تجھ پر مطمئن ہو گئے جب تو ہم سے راضی، ہم بھی تجھ سے راضی۔

دنیا میں قانونِ مکافات کا عمل جاری ہے

اس لئے کہ دنیا میں اللہ نے قانون مکافات جاری کیا ہوا ہے۔ یعنی اَدل بدل کا قانون کہ جیسا تم کرو گے ویسا ہی تمہارے ساتھ برتاؤ ہو گا۔ کما تدین تدان جیسی راہ تم اختیار کرو گے، ویسے ہی تمہارے متعلق ادھر سے اختیار کی جائے گی ___ بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا گیا، اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ اگر تم گناہ کرنے سے لوٹ جاؤ گے ہم عذاب دینے سے لوٹ جائیں گے۔ ان عدتم عدنا تم بدی کی طرف لوٹو گے ہم عذاب دینے کی طرف لوٹیں گے۔ جیسا تم کرو گے ویسا ہم کریں گے۔ من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاءہ

، جو ہم سے ملنا پسند کرتا ہے' ہم بھی اس سے ملنا پسند کریں گے۔ من کرہ لقاء اللہ کرہ اللہ لقاءہ جو ہم سے ملنا مکروہ جانتا ہے۔ ہم بھی اس سے ملنا مکروہ جانتے ہیں۔ ہم بھی اسے نہیں ملیں گے۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ تم اللہ کی مدد کرو گے اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ تم ہماری یاد کرو گے' ہم تمہاری یاد کریں گے۔ غرض قانون مکافات ہے۔ جو برتاؤ بندے کا ہو گا' وہ اللہ کا بندے کے ساتھ ہو گا۔

اپنے بارے میں اللہ کی رضا معلوم کرنے کی کسوٹی

اس لئے اگر کوئی شخص یہ دیکھنا چاہے کہ حق تعالیٰ کا تعلق میرے ساتھ کیسا ہے؟ تو وہ یہ دیکھ لے کہ اللہ کے ساتھ میرا تعلق کیسا ہے۔ اس پر قیاس کر لے۔ ویسا ہی ان کا تعلق ہے۔ اگر آپ کی طبیعت میں اللہ کی طرف سے بعد ہے تو ادھر سے بھی بعد ہے۔ اگر آپ کی طبیعت میں رجحان ہے اور جھک رہے ہیں۔ ادھر سے بھی رحمت جھکی ہوئی ہو گی۔ یہ کسوٹی ہے۔ ہر شخص پہچان سکتا ہے کہ اللہ کا میرے ساتھ کیسا معاملہ ہے۔ وہ اپنا معاملہ دیکھ لے اپنے سے قطع نظر کر کے اللہ کے معاملات کو دیکھنا چاہے، مسئلہ کبھی حل نہیں ہو گا۔ شکایت پیدا ہو جائے گی۔ کوئی بُرائی آئی اور شکایت پیدا ہوئی کہ یہ کفار سارے رہ گئے تھے مصیبت کے لئے میرا ہی گھر رہ گیا تھا۔ مجھ پر ہی مصیبت بھیجنی تھی۔ حالانکہ میں مؤمن ہوں۔ یہ شکوہ کیوں پیدا ہوا؟ اس لئے کہ اپنے معاملات پر نگاہ نہیں۔ جب بندہ یہ دیکھے گا کہ میں کتنی عبادت کر رہا ہوں۔ کتنی اطاعت کر رہا ہوں اور اللہ سے کتنا راضی ہوں۔ تو جتنی کوتاہی اپنے اندر ہو گی' سمجھ لے کہ اتنی رحمت کی ادھر سے کمی ہو جائے گی۔

اگر یہ پوری طرح سے متوجہ ہے تو یہ ناممکن ہے کہ ادھر سے بُعد ہو۔ غرض اللہ کے معاملات کو پہچاننے کی کسوٹی یہ ہے کہ آدمی اپنے معاملات کو اللہ سے دیکھ لے' حدیث میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے عرض کیا' یا رسول اللہ ﷺ! ہم کیسے پہچانیں کہ اللہ ہم سے راضی ہے یا یہ کہ ہم حق تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہیں۔

فرمایا' اس پر دیکھ لو کہ تم اپنے پڑوسی کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہو۔ اگر پڑوسی کو ستاتے ہو' سمجھ لو کہ اللہ میاں کو بھی تم سے بُعد ہے' اس کا معاملہ بھی تمہارے ساتھ ویسا ہی ہو گا۔ اگر تم پڑوسی کے ساتھ انتہائی لطف و کرم کا معاملہ کرتے ہو۔ یقیناً امید رکھو کہ ادھر سے لطف و کرم کا برتاؤ ہو گا۔ تو کسوٹی بیان کر دی گئی کہ آدمی اپنے معاملے کو دیکھ کر اللہ کے معاملے کو پہچان لے۔ اس لئے اگر آپ خود اللہ سے راضی ہیں اور صبح سے شام تک آپ کے قلب کا رخ یہ ہے کہ جو پیش آ جائے' آپ مطمئن ہیں کہ میں راضی ہوں۔ بس ٹھیک ہے میں شکر گزار ہوں۔ سمجھ لو کہ حق تعالیٰ بھی آپ کے ہر فعل سے راضی ہیں اور آپ کو اچھی راہ دے رہے ہیں۔ تم اسی راہ پر چلو گے جو ان کی پسندیدہ ہو گی اور اگر آپ ان کی راہ سے ناراض ہیں کہ وہ جو معاملہ کرتے ہیں آپ اس سے اکتاتے ہیں۔ وہ آپ کے معاملے سے ناراض ہیں آپ کی عبادت بھی ناپسندیدہ ہو گی۔ آپ لاکھ سجدے کریں جب دل میں ناراضگی ہے تو سجدے سے کچھ نہیں ہوتا۔

ایک ملازم اپنے آقا کی خدمت بہت کرتا ہے مگر آقا کے ساتھ اچھا خیال نہیں رکھتا۔ اس کی خدمت آقا کے لئے تکلیف دہ بن جائے گی اور ایک ملازم ہے کہ دل سے محبت کرتا ہے مگر بے وقوف ہے۔ رات دن غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ آقا کہتا ہے اسے کچھ نہ کہو یہ میرا اپنا ہے۔ غلطی ہوئی تو کیا ہوا۔ بندہ بشر ہے۔ غلطی ہوا ہی کرتی ہے۔ اس کی غلطی سے بھی راضی ہیں۔ تو اصل چیز قلب کا رخ اور قلب کا معاملہ ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

اے بندے! قیامت کے دن اگر تو میرے پاس اتنے گناہ لے کر آئے کہ زمین و آسمان تیرے گناہوں میں

چھپ جائیں تو میں اتنی بڑی رحمت و مغفرت لے کر تجھ سے ملاقات کروں گا۔ بشرطیکہ میری عظمت تیرے قلب کے اندر رہو۔

ہر بندہ دیکھ لے کہ اللہ کی کتنی عظمت اور بڑائی میرے دل میں ہے۔ آیا دولت کے مقابلے میں، میں دولت کی عظمت کو جانتا ہوں یا اللہ کی عظمت کو؟ اسے حاجت روا سمجھتا ہوں یا اللہ کو حاجت روا سمجھتا ہوں؟ جب کوئی معاملہ آتا ہے تو پہلے میری نگاہ اسباب کی طرف جاتی ہے یا مسبّبُ الاسباب کی طرف اسباب کو محض حکم برداری کے اِتباع کے لئے اختیار کرتا ہوں۔ اس لئے کہ نظر ہماری اسباب پر ہے۔ مگر چونکہ ہمارا عقیدہ بھی یہ ہے کہ کرنے والا وہی ہے۔ تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ کرنے دھرنے والے تو اللہ میاں ہیں۔ اسباب اختیار کئے جائیں گے۔ مگر اطمینان اسباب پر ہے مسبّبُ الاسباب پر نہیں ہے ___ اور ایک یہ کہ مسبّبُ الاسباب پر اطمینان ہے اور عقیدہ یہ ہے کہ اسباب نہ بھی اختیار کریں تب بھی وہی نتیجہ نکلے گا۔ مگر حکمِ الٰہی ہے اس لئے ہم اسباب اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ تابعداری کے لئے اسباب اختیار کرتے ہیں۔ اسی ایک کسوٹی سے پتہ چل جائے گا کہ ہم اسباب سے کتنے اور مسبّبُ الاسباب سے کتنے راضی ہیں۔ اسی سے اللہ سے معاملہ سمجھ لیجئے کہ ویسا ہی برتاؤ ادھر سے ہوگا۔ غرض کما تدین تدان جیسی آپ راہ اختیار کریں گے۔ ویسی راہ ادھر سے اختیار کی جائے گی۔

مؤمن کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے کافر کو نہیں

اس کو فرمایا گیا اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ اے نفس لوٹ کر آ۔ یعنی ہم نے تجھے دنیا میں امتحان کے لئے بھیجا تھا۔ تو دنیا کی چیز نہیں تو آخرت کی چیز ہے۔ اب تو نے اپنی رضا و اطمینان کا امتحان دے دیا۔ اس لئے مقصد پورا ہوگیا۔ اس لئے اب واپس لوٹ کر ہماری طرف آجا اس حالت میں کہ تو ہم سے راضی، ہم تجھ سے راضی۔

اب جو بندہ مطمئن نہیں ہے اسے اِرْجِعِیْ کہ "لوٹ کے آ" کا خطاب نہیں کیا جائے گا۔ تو دنیا کا تھا، دنیا ہی میں رہ۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ کافر کی روح جب چڑھتی ہے ملائکہ اسے لے جاتے ہیں تو آسمانوں کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں۔ اس پر نفرین و لعنت کی جاتی ہے۔ وہیں سے اس کو پٹخ دیتے ہیں اور وہ جہنم کے طبقے تحت الثریٰ میں پہنچ جاتی ہے ___ شیخ اکبرؒ نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ اس آسمان سے نیچے نیچے جتنا علاقہ ہے وہ سب جہنم کا ہے۔ آسمان سے اوپر جتنا علاقہ ہے وہ سب جنت کا ہے۔ گویا ہم اور آپ اس وقت جہنم میں موجود ہیں۔ اس سے نکل بھاگنے کی کوشش کررہے ہیں۔ حق تعالیٰ نے ایک رسی ٹانگ دی ہے کہ اس کو جو پکڑ لے گا وہ اس قید خانہ سے نکل کر ہم تک پہنچ جائے گا۔ اور وہ رسی کیا ہے؟

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ (آل عمران پ ۴ آیت ۱۰۳)

"اللہ کی رسی کو مضبوط تھامو"۔

القراٰن حبل اللّٰہ الممدود من السماء الی الارض یہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو اللہ نے آسمان سے ٹانگ دی ہے۔ جو اس کو تھام لے گا اسے جہنم سے نکال کر اپنے تک پہنچادیں گے۔ گویا مؤمن اس جہنم سے نکل بھاگنے کی کوشش کررہے ہیں۔ کفار نے ایمان اختیار نہیں کیا۔ وہ جہنم میں موجود ہیں۔ جہنم میں ہی رہیں گے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ جہنم میں داخل کئے جائیں گے۔ وہ اب بھی جہنم میں ہیں۔ نکلنے والے نکل جائیں گے جو رہ جائیں گے وہ رہ جائیں گے۔

تو حق تعالیٰ نے اس عالم میں مؤمن کو اس لئے بھیجا ہے کہ اپنا امتحان دے کر لوٹ کر آئے۔ کافر کو اس لئے بھیجا ہے کہ تو جارہا ہے تو اَبد الآباد تک وہیں رہے گا۔ اسی کو ہم جہنم کی شکل دے دیں گے۔ اس لئے کافر کو دنیا سے نکلنا نہیں ہے۔ مؤمن کو نکل بھاگنا ہے اس لئے اِرْجِعِیْ رجوع کرو۔ تو پہلے بھیجا گیا ہے۔ بعد میں رجوع کرایا گیا ہے کہ ہم نے برائے چند دن بھیجا تھا اب لوٹ آؤ۔

علّتِ رُجوع

اور کس حالت میں لوٹ آؤ؟ ___ یہ گویا رجوع کی علّت ہے کہ کیوں لوٹ کے آؤ؟ کیوں ہم اپنی طرف بلا رہے ہیں کہ تم ہم سے راضی ہو چکے ہو۔ جو ہم سے ناراض ہے۔ اسے ہم اپنے پاس نہیں بلانا چاہتے۔ تو اِرْجِعِیْ کی حکمت یا علت رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ہے کہ لوگو! اس لئے کہ تم ہم سے اور ہم تم سے راضی ہو چکے اور جب تم ہم سے راضی اور ہم تم سے راضی، تو تمہاری جگہ ہمارے قرب میں ہے اس بُعد کے عالم میں نہیں ہے۔ جس کو ہم دنیا کہتے ہیں۔ بعینہٖ یہی جہنم ہے۔ مؤمن کو اس سے نکالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس لئے کہ وہ ایمان قبول کر چکا۔ کافر نکلنا نہیں چاہتا، اس لئے کہ اس نے ایمان قبول نہیں کیا۔

• جو بندہ نہیں بننا چاہتا، حق تعالیٰ اسے بندہ بنانا نہیں چاہتے

اور جو ایسا بندہ ہو کہ وہ اللہ سے راضی اور اللہ اس سے راضی، بندے کا اطلاق اسی پر آئے گا۔ حقیقی بندہ وہی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ میرے ان بندوں میں داخل ہو جا جو میرے بندگانِ خاص ہیں۔

انہوں نے بندگی کا انکار کر دیا جنہوں نے میرا دین نہیں مانا۔ تو میں بھی انہیں بندہ نہیں کہتا۔ جب وہ بندے بننا نہیں چاہتے۔ ہم بھی انہیں بندہ بنانا نہیں چاہتے۔

جیسے حضرت رابعہ بصریہؒ کا مقولہ ہے کہ جب انہیں دفن کر دیا گیا تو جیسے حدیث میں ہے کہ دو فرشتے آتے ہیں اور سوال کرتے ہیں من ربک تیرا رب کون ہے؟ ان کے پاس بھی منکر نکیر آئے۔ انہوں نے کہا من ربک تیرا پروردگار کون ہے؟ تو رابعہ بصریہؒ تو ولیہ اور عارفہ باللہ تھیں۔ انہوں نے کہا مجھ سے پوچھتے ہو؟ رب سے پوچھو کہ وہ مجھے بندی سمجھتے بھی ہیں یا نہیں؟ مجھ سے کیا پوچھتے ہو کہ میں اسے رب جانتی ہوں یا نہیں اس لئے کہ اگر میں پچاس دفعہ کہوں کہ وہ میرے رب ہیں اور وہ یوں کہہ دیں کہ ہم تجھے بندی بنانا ہی نہیں چاہتے ہیں۔ میرے کہنے سے کیا ہوگا؟ تو ان سے پوچھو کہ وہ مجھ کو اپنی بندی سمجھتے ہیں یا نہیں؟ بعد میں مجھ سے پوچھنا ___ وہ فرشتے حیران ہوئے کہ یہ کس قسم کا بندہ ہے کہ جو ہم سے ہی سوال کرنے لگا ___ تو بات وہی ہے کہ بندہ وہی ہے جسے وہ بندہ بنالیں اور جسے وہ کہہ دیں کہ تو ہمارا بندہ ہی نہیں ہے۔ وہ نہ بندہ ہے نہ اس کا کہیں ٹھکانہ ہے۔ تو کافر نے صفائی سے کہہ دیا کہ میں آپ کا بندہ بننا نہیں چاہتا۔ میں آپ کا غلام اور مطیع بننا نہیں چاہتا نہ آپ کی راہ اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی فرمادیتے ہیں کہ یہ خود ہی اپنا ذمّہ دار ہے۔ بے شک اسی عالم میں رہ جس پر تو راضی ہے ہم سے راضی ہوتا، ہماری طرف آتا تو ہم سے بعد پر راضی ہے تو اسی بعد کے عالم میں رہ ___ اور مؤمن کہتا ہے کہ اٰمنّا باللہ ہم ایمان لے آئے۔ جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم آپ کی ہر چیز پر راضی ہیں۔ اس کو فرماتے ہیں کہ جب تو راضی ہے تو پھر ہم بھی راضی ہیں۔ پھر وہاں ٹھہرنے کی ضرورت کیا ہے۔ اس لئے چلے آؤ ___ اس لئے اِرْجِعِیْ کا لفظ رکھا کہ لوٹ کر آ اور جب راضی و مرضی بن

کرلوٹ کر آگیا تو فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ میرے عباد میں داخل ہوجا۔ صحیح معنوں میں تو ہی بندہ ہے اور تو ہی میری جنت کا وارث اور مستحق ہے اور تو ہی اس قابل ہے کہ تو اس مقام کریم و قرب میں پہنچ جائے۔

اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ ویسے تو یہ آیت بہت سے علوم پر حاوی ہے۔ اس میں صبح سے شام ہوجائے' پورے نہ ہوں۔ لیکن میں نے موٹے موٹے تین مقصد اختیار کئے۔ ایک واقعہ کے متعلق ہے ،:و نزع کا پیش آتا ہے۔ ایک بشارت سے متعلق ہے جو اللہ کی طرف سے اس بندۂ محتضر کو دی جائے گی کہ اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً اور تیسرا انعام ہے فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ تو میرے بندگان خاص میں داخل ہوجا اور اس مقام قرب میں تجھے داخل کرنے کی نوبت آگئی جو شہر مطلوب ہے۔ جو ہمارے باپ کو دیا گیا تھا۔ پھر ایک لغزش کی وجہ سے وہ وہاں سے الگ کئے گئے ہم اور تم یہاں پیدا ہوئے۔ وہاں پیدا ہوتے' وہیں کے وارث ہوجاتے اور یہاں آگئے۔ مگر آدم علیہ السلام سے کہہ دیا گیا کہ آپ کے اندر اس شہر مطلوب کی طلب موجود ہے۔ جہاں سے آپ کو نکالا گیا ہے اب وہاں تک پہنچنے کے لئے اس دنیا کی گھاٹیوں میں سے گزرنا ضروری ہے اور اس کے لئے میں اپنا قانون بھیجوں گا۔ جو اس قانون پر چل پڑے گا اسے واپس بلالیں گے اور جو نہیں چلے گا وہ وہیں رہ جائے گا۔

اس واسطے میں نے یہ آیت پڑھی تھی اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کیا عرض کروں رات میں نے ایک دوست سے پوچھا کہ کیا عرض کروں۔ جنہوں نے کہا تھا کہ کچھ بیان کرنا چاہئے میں نے کہا کہ بھئی! میں نے تو مکہ مکرمہ سے لکھا تھا کہ آکر اس مسجد میں نماز پڑھوں گا۔ تقریر کو نہیں کہا تھا۔ میرا مقصد تو صرف ملنا اور ملاقات کرنا ہے۔ وعظ و تقریر کرنا مقصد نہیں تھا۔ مگر انہوں نے اعلان کردیا۔ جب اعلان کردیا۔ میں نے کہا اب کوئی بات تو بتائی جائے۔ میری سمجھ میں تو نہیں آرہا ___ اس پر ہمارے ایک دوست نے کہا اللہ کی رضا کے بارے میں کچھ کہہ دیا جائے کہ اللہ کی رضا اختیار کرنی چاہئے۔ اس سے کچھ ذہن اس مضمون کی طرف منتقل ہوا۔ یہ گویا انہی کی رہنمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو توفیق عمل عطا فرمائے اور ہم کو راضی و مرضی بنائے اور اپنے عباد خاص میں داخل فرمائے اور اپنے مقام قرب میں ہمیں پہنچائے اور ہم سب کو اس مقام کریم میں جمع فرمائے۔ آمین

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ محمد وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

برحمتک یا ارحم الرّاحمین۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

بلند ہو' وہ دوسری بات ہے۔ لیکن ارادہ کر کے آدمی چلاّئے' یہ سمجھ کر کہ دوسرے کے اوپر میری آواز کا
پڑے یہ ممنوع ہے۔ بس ضرورت کے وقت اعتدال کے ساتھ آواز بلند کرے۔ تو بولنے اور چلنے دونوں
اعتدال ہونا چاہئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چال مبارک کا جو نقشہ حدیث میں آتا ہے کہ یمشی کانما یتقلع آ
اس طرح چلتے تھے کہ عجیب شان تھی، اس طرح کہ گردن تو جھکی ہوئی جس کو خاکساری کی چال کہتے ہیں۔
ساتھ میں قوت اتنی تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا زمین کو کھود کر اندر گھس جائیں گے۔ اتنی قوت سے قدم
تھا۔ تو قوت بھی ہو' شجاعت بھی ہو اور خاکساروں کی طرح نیاز مندی بھی ہو' وقار بھی اور تواضع بھی ہو
نہ بیماروں کی چال چلے جیسے کوئی مریض جارہا ہے کہ ذرا کوئی تھپڑ ماردے تو گر پڑے' یہ بھی نہیں اور نہ اُبھ
چلے جیسے کوئی متکبر جارہا ہے۔ بیچ کی چال ہو کہ اس سے خودداری اور خاکساری بھی ٹپکے یَمْشُوْنَ هَوْنًا
مطلب نہیں ہے کہ آہستہ آہستہ چلے۔ بلکہ یہ کہ تواضع سے چلے چاہے تیز چلے گویا یہ پہلا نقشہ بتلایا گ
جب گھر سے نکلو تو ایسی چال چلو۔ اس لئے کہ مسلمان بے فکرا نہیں پیدا کیا گیا کہ جس طرح اس کا جی چا
چل پڑے۔ قدموں پر نگاہ ہونی چاہئے کہ یہ کس طرح سے چلیں۔ اس لئے کہ مؤمن کا عقیدہ یہ ہے کہ
حاضر وناظر ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا :

مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا
اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا۔ (مجادلہ پ ۲۸ آیت ۷)

تم تین آدمی تنہائی میں بیٹھ کر آہستہ آہستہ سرگوشی کرو گے تو چوتھا خدا وہاں موجود ہوگا۔ یہ نہیں ۔
تمہاری باتوں کا سننے والا کوئی نہیں۔ تم چار ہوگے پانچواں خدا ہوگا۔ تم زیادہ ہوگے تب خدا موجود' کم ہو
تب خدا موجود ___ جب اللہ ہر جگہ حاضر وناظر اور موجود ہے تو آدمی کو ہر جگہ ادب سے چلنا پڑے گا۔
ادبی وہ کرے جس کا عقیدہ یہ ہو کہ مسجد میں خدا ہے اس لئے میں ادب کرتا ہوں اور سڑک پر گویا خدا نہیں
میراجی جس طرح چاہے چلوں۔ یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے۔ ہر جگہ کے مناسب ادب ہوگا اور عجز ونیاز م
اختیار کی جائے گی۔ تو زندگی گزارنے کی پہلی بات یہ ہے کہ ہم زندگی میں قدم قدم پر نگاہ رکھیں کہ ہماری
ڈھال کیا ہے۔

رحمٰن کے بندوں کا قال

اس کے بعد آگے فرمایا' چلتے چلتے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ تو اس میں اچھے بھی ملتے ہیں اور بُرے
بعضے تو ایسے ملتے ہیں جو بڑے مہذب اور شائستہ ہیں۔ آپ نے سلام کیا' انہوں نے جواب دیا۔ انہو
آپ کا شکریہ ادا کیا' آپ نے ان کا شکریہ ادا کیا' محبت بڑھ گئی اور بعض ایسے بھی ملتے ہیں جو جھگڑے اور
کی بات اٹھاتے ہیں کہ کسی کو بُری نگاہ سے دیکھ لیا یا کسی پر پھبتی کس دی۔ ایسے موقع پر ہماری گفتار کیا
چاہئے اس پر فرمایا :

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔ (فرقان پ ۱۹ آیت ۶۳)

"اگر جاہل ملیں اور جاہلانہ حرکتیں کریں تو تم ان کے ساتھ جاہل مت بنو"۔

تم سلام کہو۔ یعنی جب وہ جاہلانہ بات کریں۔ بس ان سے کہہ دو کہ بھئی! ہمارا سلام۔ ہم یہ باتیں

جانتے۔ تمہارے لئے بھی زیبا نہیں‘ ہمارے لئے بھی اور اگر آپ بھی جھگڑے میں لگ گئے تو وہاں اچھی خاصی لاٹھی چل جائے گی۔ جھگڑا اُٹھ جائے گا اور جھگڑا اُٹھانا بہت آسان ہے۔ مگر اس کا مٹانا بہت مشکل ہے۔ اس لئے صبر وتحمل کرنا پڑتا ہے۔ تو فرمایا گیا جب چلو تو چال میں نرمی پیدا کرو۔ نرم چال رکھو کہ ہر ایک آدمی محبت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ آپ سے کوئی جھگڑا نہیں کرے گا۔ جھگڑا جب کرے گا جب آپ متکبرانہ انداز سے جائیں اور جب تواضع سے گئے‘ تو اوّل تو سب عزت کریں گے۔ لیکن پھر بھی اگر کوئی بے وقوف آدمی مل جائے اور جاہلانہ باتیں کرے‘ تو آپ کہیں گے **قَالُوْا سَلَامًا** بھئی! ہم یہ بات نہیں جانتے‘ ہمارا سلام ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ ہمارا کام یہ نہیں ہے۔ تم جانو تمہارا کام جانے۔

سلام کی برکات اور آداب

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلام ایک ایسی عظیم چیز ہے جو جھگڑوں کو ختم کر دیتی ہے۔ سلام آدمی نہ کرے تو برا سمجھا جاتا ہے اور اگر سلام کر لے تو جاہل بھی ہوں گے‘ وہ بھی جھک جائیں گے کہ یہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ سلام کر رہا ہے۔

اس واسطے فرمایا گیا اگر باہم دشمنیاں بھی ہوں‘ عداوتیں بھی ہوں۔ اگر دشمن آپ کو سلام کریں گے دشمنیاں ڈھیلی پڑ جائیں گی۔ وہ وعلیکم السلام کہنے پر مجبور ہوگا۔ جس کا مطلب ہے کہ تمہارے لئے بھی سلامتی ہو۔ جب سلامتی کی دعا دے گا تو جھگڑا اٹھائے گا کیوں؟ خود کہہ رہا ہے کہ اللہ تمہیں صحیح سلامت رکھے۔ تو دعا بھی دے اور اوپر سے جھگڑا بھی اٹھائے؟ اس سلام نے ساری دشمنی ختم کر دی۔

اس واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ

افشوا السلام علی من عرفت ومن لم تعرف جب چلو سلام کرنے کی عادت ڈالو‘ خواہ تعارف ہو یا نہ ہو۔

آج کے زمانہ کا تمدن یہ ہے کہ جب تک تیسرا آدمی تعارف نہ کرائے۔ نہ بول نہ چال نہ سلام نہ کلام۔ یہ متکبرانہ تمدن ہے۔ یہ اسلام کا تمدن نہیں ہے۔ اسلام کا تمدن یہ ہے کہ جب ہم میں اور تم میں اسلام کا رشتہ مشترک ہے‘ اسلامی اخوت اور بھائی بندی پھیلی ہوئی ہے تو کیا ضرورت ہے کہ کوئی تیسرا تعارف کرائے۔ پہلے سے ہی تعارف حاصل ہے۔ یہ ہمارا بھائی مسلمان ہے۔ اس میں اسلام بھرا ہوا ہے۔

ہمارا تعارف بھی اسے حاصل ہے۔ یہ بھی جانتا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ جب دونوں کے اندر ایک رشتہ مشترک ہے‘ پھر تیسرے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ تعارف کرائے۔ اگر گھر میں دو حقیقی بھائی موجود ہوں۔ وہ دونوں یوں کہیں کہ کوئی تیسرا محلے والا آ کر تعارف کرائے کہ یہ آپ کے حقیقی بھائی ہیں اور یہ آپ کے حقیقی بھتیجے ہیں۔ تب آپ کلام کریں گے۔ آپ کہیں گے کہ میری رشتہ داری ہے۔ مجھے کیا مصیبت ہے کہ میں تیسرے آدمی کو بلاؤں کہ بھئی! میرا تعارف کرا دو۔ یہ تکلف اور بناوٹ ہے تو نسبی رشتے سے زیادہ قوی رشتہ اسلام کا ہے۔ دو حقیقی بھائی اتنے قریب نہیں ہوتے۔ جتنے دینی رشتہ کی وجہ سے دو مسلمان قریب ہوتے ہیں۔ اس لئے ضرورت نہیں ہے کہ کوئی چوتھا آدمی تعارف کرائے۔

ہاں اس میں البتہ اس زمانے میں ایک مصیبت پڑ گئی کہ ہم صورت سے یہ نہیں سمجھتے کہ مسلمان ہے بھی یا نہیں؟ بعض اوقات سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن سوچتے ہیں کہ یہ مسلمان ہے یا عیسائی ہے یا یہودی ہے۔ یہ مصیبت آ کے پڑ گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہیئت اور وضع بھی ایسی ہو جس سے دور سے سمجھ لیا جائے

کہ پہلے جواب پڑھا گیا بعد میں سوال کیا گیا۔

یہ جو پورا رکوع ہمارے محترم قاری صاحب نے پڑھا ہے' یہ دس احکام پر مشتمل ہے۔ دس ہدایتیں ہیں جو حق تعالیٰ نے دی ہیں اور پھر ایک ایک ہدایت بہت سی چیزوں پر مشتمل ہے۔ تو مجموعے کے لحاظ سے یہ چیزیں بہت ہو جاتی ہیں۔ لیکن اصولاً اس میں دس باتیں بیان کی گئی ہیں اور وہ دس باتیں انہی سوالات کے جوابات ہیں کہ ہمیں زندگی کس طرح گزارنی چاہئے؟ اس کے کیا اصول ہیں؟ کس کی رضامندی اور کس کو خوش کرنے کے لئے ہم زندگی گزاریں اور وہ مبدا کیا ہے جس سے ہماری ابتدا ہوتی ہے۔ پھر اس زندگی کا انجام کیا ہوگا۔ تو اسی رکوع میں انجام بھی بتادیا گیا ہے۔

غرض مذہب کی بنیاد تین چیزیں ہیں۔ ایک مبدا' ایک معاد' ایک میعاد۔ مبدا کا مطلب یہ ہے کہ ابتدا کہاں سے ہوئی۔ معاد کا مطلب یہ کہ لوٹ کر کہاں جانا ہے۔ میعاد کا مطلب یہ کہ درمیان میں کس طرح زندگی گزاری جائے۔ تو اس رکوع میں مبدا کا بھی ذکر ہے کہ وہ کون ذات ہے جو تمہاری اصل ہے۔ معاد کا بھی ذکر ہے کہ تمہارا انجام کیا ہونا ہے اور اس کا بھی ذکر ہے کہ درمیان کی زندگی کس طرح گزارنی ہے۔ اس لئے اس وقت کسی تقریر کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تفسیر کی ضرورت ہے کہ اس رکوع کی تفسیر کردی جائے۔ ترجمہ و شرح میں تقریر بھی ہو جائے گی۔

اِنسان کا مبدا کیا ہے؟

تو ابتدا یہاں سے کی گئی ہے کہ:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا۝ (فرقان پ ۱۹ آیت ۶۱)

برکت والی وہ ذات ہے جس نے آسمان میں بُرج قائم کئے' منزلیں قائم کیں اور ان منزلوں میں سے سورج اور چاند کو گزارا' جس سے رات اور دن پیدا ہونے لگے' موسم بننے لگے' سردی گرمی اور برسات آنے لگی۔

یہ گویا مبدا کا ذکر ہے کہ اصل ابتدا جس ذات سے ہے۔ اس کی قدرت آسمانوں' زمین میں بھی کام کررہی ہے۔ آسمان بنادیئے' چاند' سورج پیدا کردیئے اور ان میں حرکت پیدا کردی۔

رحمٰن کے بندوں کی چال

اس کے بعد دس احکام شروع کئے کہ اس کی رضا کے لئے کس طرح زندگی گزاری جائے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (فرقان پ ۱۹ آیت ۶۳)

رحمٰن کے بندوں کا دنیا میں کیا ڈھنگ ہونا چاہئے؟

رحمٰن لغت میں اور شریعت میں بھی اس ذات کو کہتے ہیں جو ساری نعمتوں کا مالک ہو۔ ظاہری اور باطنی تمام نعمتیں دینے پر قادر ہو۔ ہر نعمت اس کے قبضے میں ہو۔ ساری نعمتوں کا والی' وارث اور مالک ہو ___ تو اس رحمٰن کے بندے کس طرح سے دنیا میں زندگی بسر کریں ___ فرمایا' رحمٰن کے بندوں کا ڈھنگ یہ ہونا چاہئے کہ جب وہ زمین میں چلیں تو نرم چال چلیں۔ اس میں ہدایت دی گئی کہ زندگی کی بنیاد تواضع اور خاکساری پر رکھی جائے۔ کبر و نخوت پر نہ رکھی جائے۔ تکبّر اور اپنے کو بڑا بنانا یہ نہیں بلکہ چال سے واضح ہو کہ کوئی خدا کا

بندہ جارہا ہے۔ یہ نہ معلوم ہو کہ کوئی جبّار قہّار جارہا ہے۔ یہ انسان کی شان نہیں ہے اور انسان کی شان یہ کیوں نہیں ہے؟

اس کی وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی کہ کلکم بنو اٰدم واٰدم من تراب تم سب کے سب آدم کی اولاد۔ آدم کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ مٹی کا یہ کام نہیں ہے کہ اُچھل اُچھل کر اوپر جائے۔ یہ جب تک پست اور پامال رہے گی جبھی تک اس کی قدر ہوگی ___ مٹی جوتوں میں روندی جاتی ہے مگر چوں نہیں کرتی۔ جبھی تک اس کی قدر ہے کہ جس طرح ہم تصرّف کریں۔ بلاچوں وچرا اس تصرّف کو قبول کرے' اگر مٹی اوپر اُڑی' کسی کی آنکھ میں پڑی' وہ لعنت کرے گا۔ کسی کے کپڑے پر گرے گی وہ کپڑے کو جھنک دے گا۔ کہے گا کہ کمبخت گرد کہاں سے آگئی تو مٹی نے ذرا ابھرنے کا نام لیا تو اس پر لعنتیں برسنا شروع ہو گئیں۔

تو جس مٹی سے انسان پیدا کیا گیا' اگر وہ اینٹھنے لگے' غرور کرنے لگے' کبر و نخوت اختیار کرنے لگے۔ ہر شخص اس انسان کو بُرا کہے گا اور جو تواضع و خاکساری اختیار کرے اور مٹی بن کر رہے' سب اس کو سر پر اٹھائیں گے کہ یہ بڑی کیمیا معلوم ہوتا ہے۔ کسی بھی مجلس میں جو بڑا بول بولتا ہے۔ ہاتھ کے ہاتھ وہیں اس کو سزا مل جاتی ہے اور جو تواضع کا کلمہ بولتا ہے' سب اس کی قدر کرتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہٗ کی عادتِ کریمہ بھی یہ ہے۔ چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی بندہ عبادت کر کے یوں کہے کہ اے اللہ! میرے سے کچھ نہیں بن پایا۔ میرے بس میں تو کچھ نہیں۔ تیرا فضل ہے کہ یہ کام تو نے مجھ سے کرادیا۔ میرے اندر یہ طاقت نہیں تھی۔ حق تعالیٰ شانہٗ فوراً فرماتے ہیں کہ نہیں۔ عمل تو نے ہی کیا تھا۔ مسجد کی طرف چل کر تو ہی گیا تھا۔ حج کے لئے بیتُ اللہ کی طرف تو نے ہی سفر کیا تھا۔ تو نے سب کچھ کیا اور اگر کوئی کبر و نخوت سے یوں کہے کہ اے اللہ میں نے نماز پڑھی' میں نے عبادت کی' میں نے یہ کام کیا۔ فرماتے ہیں کہ نالائق! تو نے کیا کیا؟ ارادہ ہم نے تیرے اندر پیدا کیا۔ بدن' روح اور طاقت ہم نے دی۔ تو نے کیا کیا؟ تو خود دعوے کرتا ہے اسے پست کردیتے ہیں اور جو دعویٰ چھوڑ کر کہتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اسے فرماتے ہیں کہ تو نے سب کچھ کیا۔ اس لئے سنت اللہ یہ ہے کہ جو آدمی خاکساری برتے' عجز و نیاز برتے' بندگی کی شان سے آئے۔ اسے اونچا اٹھاتے ہیں' اسے عزّت دیتے ہیں اور جو خود ابھرنے لگے اسے زمین پر پٹخ دیتے ہیں۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ ؎

پستی سے ہو سربلند اور سرکشی سے پست
اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

تو انسان کی فطرت یہی بنائی گئی کہ تیرے سامنے مٹی ہے۔ اگر وہ اُبھرتی ہے تو تو لعنت بھیجتا ہے۔ یہ جوتیوں کے نیچے رہتی ہے تو تو عزت کرتا ہے۔ تو جس چیز سے تو بنا ہے۔ تیرا مزاج بھی ایسا ہی ہونا چاہئے کہ جتنی تو خاکساری برتے گا تیری عزت ہوگی۔ جتنا تو غُرور کرے گا' اتنا ہی تجھے پست کردیا جائے گا ___ تو پہلی بات تو یہ فرمائی گئی کہ رحمٰن کے بندوں کی زندگی کا ڈھنگ کیا ہونا چاہئے۔ جب گھر سے باہر نکلیں اور چلیں تو زمین پر ہلکی چال چلیں۔ نخوت و کبر کی چال نہ چلیں۔ اس کو دوسرے موقع پر قرآن کریم نے فرمایا'

وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ ط اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ

اپنی چال میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو اور زیادہ زور سے چلّا کر مت بولو۔ حسبِ ضرورت آواز بلند کرو۔ بہت زیادہ شور مچا کے بولنا' کبر و نخوت کی علامت ہوتی ہے ___ ایک تو یہ کہ کسی کی آواز ہی خلقۃً

تسکینِ فطرت

جہاں سے ہم آئے وہ اللہ رب العزت کی ذاتِ بابرکات ہے جس کے امر سے آئے' اس کے وجود سے ہمیں پرتو ملا ہمارا وجود ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ ہو جاؤ ہم ہو گئے۔ تو اصل اللہ کا حکم اور امر ہے اور کہاں جائیں گے؟ یہ معاد ہے کہ اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ وہیں جاکر راحت مل سکتی ہے اور بیچ میں ہم اس کے کہنے کے مطابق زندگی گزاریں اور اس کا کہا ہوا کیسے سامنے آئے؟ اس کے رسول' اس کا فرمایا ہوا لے کر آتے ہیں جس کو صراطِ مستقیم کہا جاتا ہے۔ جس پر ہم کو چلنا ہے۔ جب ان تینوں چیزوں پر آجائیں' جبھی فطرت کو تسلی ہوتی ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ'

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی اما بعد۔

تین فِطری سوال

بزرگانِ محترم!

ابھی آپ کے سامنے میرے ایک عزیز نے چند سوالات نقل کئے جو انسان کی فطرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جانا ہے؟ اور اس آنے اور جانے کے درمیان ہمیں زندگی کس طرح گزارنی چاہئے؟ جب تک ان تینوں سوالوں کا جواب شفابخش طریقے سے نہیں مل جاتا۔ انسان میں بے چینی رہتی ہے سکون قلب پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تین سوال جو انسان کی فطرت کا تقاضا ہیں۔ اس سلسلے میں اس وقت جو ہمارے محترم قاری صاحب نے رکوع تلاوت کیا۔ ان تینوں سوالات کا جواب اس رکوع کے اندر موجود ہے۔ فرق اتنا ہو گیا کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلے سوال کیا جاتا ہے بعد میں اس کا جواب دیا جاتا ہے۔ یہاں ایسا ہو گیا

(۲۱ جولائی ۱۹۶۳ء افریقہ)

کہ مسلمان آرہا ہے۔ تاکہ سلام وکلام کی نوبت آجائے۔

بہرحال اس حدیث میں ہدایت کی گئی کہ پہچان پہچان کر سلام نہ کرو۔ اس واسطے کہ تعارف کرانے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بڑا آدمی ہوا۔ اس کا تو تعارف ہوگیا اور اگر کوئی چھوٹا موٹا آدمی آئے تو اس کا کوئی تعارف نہیں کراتا۔ گویا آپ کا سلام بڑے آدمی کو تو ہوگا چھوٹے کو نہیں ہوگا' یہ خود ایک تکبر ہے کہ چھوٹوں کو منہ نہ لگایا جائے اور بڑوں کے سامنے جھکے۔

اسی واسطے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر کوئی سواری پر سوار جارہا ہو اور لوگ سڑک پر سامنے بیٹھے ہوں۔ تو سوار ہونے والے کا فرض ہے کہ وہ بیٹھنے والوں کو سلام کرے۔ اپنے اندر خاکساری پیدا کرے۔ ایسی صورت نہ پیدا ہونے دے جس میں یہ انتظار ہو کہ یہ مجھے سلام کریں کیونکہ یہ میرے سے چھوٹے ہیں یہ چھوٹائی بڑائی کہاں کی؟ آدمی خود ہی چھوٹا ہے۔ بڑا اللہ ہے۔ سب سے بڑی ذات وہ ہے۔ اس کے سامنے سب چھوٹے ہیں۔ اس لئے ہر شخص یہ سمجھے کہ میں چھوٹا ہوں اور وہ بڑا ہے۔ جب یہ سمجھے گا تو سلام کی ابتدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس لئے سلام کے آداب میں سے یہ ہے کہ جب دو آدمی ملیں تو یہ انتظار نہ کریں کہ دوسرا مجھے سلام کہے۔ کوشش کرے کہ پہلے میں سلام کہوں۔ یہ زیادہ افضل ہے نہ کہ انتظار کرے کہ دوسرا مجھے سلام کرے۔ اسی کو فرمایا گیا:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا

رحمٰن کے بندے جب چلیں تو خاکساری کی چال چلیں اور جب لوگوں سے ملیں تو سلام کی عادت ڈالیں۔ اگر نیک لوگ ہیں تو سلامتی کی دعا ہوگی۔ اگر برے اور جھگڑالو لوگ ہیں۔ تو یہ سلام رخصت کا ہوگا کہ بھئی! ہمارا سلام ہم جاتے ہیں۔ ہم ان جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔ تو سلام ہر صورت میں انسان کے لئے رہا۔

پھر یہ اتنی پاکیزہ چیز ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا:

تحیۃ الیھود بالاصابع وتحیۃ النصارٰی بالکف وتحیۃ المسلمین السلام علیکم۔

یہودیوں کا سلام انگلیوں سے ہے' نصاریٰ کا سلام ہتھیلی سے ہے اور مسلمانوں کا سلام السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ہے ___ تو یہود ونصاریٰ کا سلام اشارۂ محض ہیں اور مسلمانوں کا سلام ایک مستقل دعا ہے کہ تم پر سلامتی ہو۔ اللہ کی رحمتیں تم پر نازل ہوں' برکتیں تم پر نازل ہوں۔ ہر مسلمان جو دوسرے کو دعا دے۔ اس سے اس کی خیر خواہی اور محبت ظاہر ہوگی۔ تعلق بھی مضبوط ہو جائے گا۔

وہ مثل مشہور ہے کہ کسی آدمی کے سامنے کوئی جن آگیا۔ تو اسے خطرہ لاحق ہوگیا کہ یہ تو کھا جائے گا۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا ماموں جان! سلام۔ اس نے کہا بھانجے وعلیکم السلام اور کہا کہ میرا ارادہ تجھے کھانے کا تھا۔ لیکن تو نے ماموں کہا اور سلام کہا۔ میرے دل میں رحم آگیا۔ میں نے چھوڑ دیا اب تو آزاد ہے جہاں چاہے جا چلا جا۔ تو سلام نے جان بچائی۔ یہی صورت دشمن کی بھی ہے۔ اگر کسی سے پکی دشمنی ہے۔ آپ کہیں السلام علیکم' وہ بھیج جائے گا۔ دشمنی ڈھیلی پڑ جائے گی تو یہ بہت بڑی نعمت اور عظیم دعا ہے۔

تو زندگی گزارنے کے طریقے میں پہلی چیز چال ہے دوسری چیز قال ہے کہ قال میں دعا ہو' چال میں تواضع ہو اور جھگڑالوؤں سے بھی جب کلام کرو' سلام کے ساتھ کرو کہ **سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِيْنَ** ہمارا سلام ہو' ہم ان باتوں میں نہیں پڑتے۔

گویا اسلامی شریعت نے رہن سہن کے لئے ابتدائی دو چیزیں بتلائیں۔ ایک زبان کو قابو میں رکھو' دوسرے قدم کو قابو میں رکھو۔ بے ڈھنگا چلو بھی مت اور کلام بھی مت کرو۔

رحمٰن کے بندوں کی تنہائی

یہ تو لوگوں کے ساتھ معاملہ ہے۔ اب آگے اور چلے تو آگئی مسجد ___ یا تنہائی آگئی یا رات کا وقت آگیا۔ جس میں لوگوں کے ساتھ اختلاط نہیں، پھر کیا کرے۔ آگے اس کی ہدایت دی' وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب وہ رات گزارتے ہیں تو سجود اور قیام کے ساتھ گزارتے ہیں کہ سو بھی جاتے ہیں۔ کبھی سجدے میں ہیں، کبھی قیام اور رکوع میں ہیں، اللہ کی یاد کرتے ہیں، اس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ گویا مخلوق کے آگے مہذب بن کر آتے ہیں اور خدا کے سامنے عابد بن کر آتے ہیں، یہاں عبادت کی ضرورت ہے، وہاں شفقت کی ضرورت ہے۔ شفقت کا اثر یہ ہے کہ سلام کرے اور عبادت کا اثر یہ ہے کہ سجدہ ورکوع کرے۔ ناک اور پیشانی کو اللہ کے سامنے سجدے میں رگڑے۔

یہ گویا جانی عبادت بتلائی گئی کہ جب تم اپنے گھر میں آؤ۔ یعنی مسجد میں تو سبھی عبادت کرتے ہیں، اس کو تو ساری دنیا جانتی ہی ہے۔ لیکن اگر گھر میں مبیت کے لئے آؤ ___ مبیت کہتے ہیں رات گزارنے کو رات گزارنے میں ہر انسان تنہا ہوتا ہے جب سو گیا تو وہ تن تنہا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ جاگتا ہوا ہوگا، مجلس کرے گا، دوستوں میں بیٹھے گا، باتیں بھی کرے گا اور جب سو گیا تو ایک لاکھ آدمی اگر ایک جگہ سوئے ہوئے ہیں، ہر ایک ان میں سے تن تنہا ہے۔ اس وقت ہر ایک کا سابقہ اللہ کے ساتھ ہے۔ بندوں کے ساتھ نہیں۔ اس واسطے اس موقع کا ادب بتلایا کہ جب تم تن تنہا ہو اور اللہ کے سوا کوئی نہ ہو۔ اس وقت سجود وقیام اور طاعت وعبادت کو اپنا شیوہ بنالو تاکہ تمہاری بندگی نمایاں ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حدیث میں فرماتے ہیں کہ ثلث درجات تین چیزیں ہیں جن سے انسان کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ عند اللہ بھی اس کا رتبہ اونچا ہے اور خلقت کے نزدیک بھی اس کا رتبہ بلند ہوتا ہے:

افشاء السلام واطعام الطعام والصلوٰة بالليل والناس نيام

سب سے پہلی چیز افشاء السلام ہے۔ یعنی مخلوق کو سلام کرنا ہے۔ اس سے انسان کے درجات بلند ہوتے ہیں اور اتنی بلندی کہ اللہ کے ہاں جو مرتبہ ہوگا اسے اللہ جانے یا یہ بندہ آخرت میں جانے گا۔ دنیا میں یہ ہے کہ کثرت سلام سے لوگوں کے دلوں میں عزت ووقار پیدا ہوجاتا ہے۔

دوسری چیز فرمائی، اِطعام الطعام حاجت مندوں کو کھانا کھلانا۔ اس میں مسکین، غریب، سائل، مسافر، مہمان سبھی آتے ہیں۔ کھانا کھلانا سب کے لئے عام ہے۔ یعنی حقوق قائم کردیئے۔ گویا یہ فرمایا گیا کہ اس سے درجات بلند ہوتے ہیں۔ خواہ کوئی سائل بن کر آئے، مہمان بن کر آئے یا ان میں سے کوئی نہ ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ فلاں حاجت مند ہے۔ از خود آپ اس کو کھانا کھلائیں۔ اس سے بھی درجات بلند ہوتے ہیں۔

تیسری چیز رات کو نماز پڑھنا، جب کہ دنیا پڑی سو رہی ہو۔ اس لئے کہ یہ نماز انتہائی خلوص کی ہوگی۔ نہ اس میں نام ونمود کا جذبہ ہوگا نہ ریاء وشہرت پسندی کا ہوگا نہ لوگوں کو دکھلاوے کے لئے ہوگی۔ دکھلاوے بھی کس کو؟ سب تو سو رہے ہیں، لوگوں کو کچھ خبر نہیں۔ اس وقت جو نماز پڑھتا ہے تو بجز اس کے کہ اللہ ہی کی محبت اس کو جگا کر اٹھائے اور کچھ نہیں۔

علماء لکھتے ہیں کہ جس کو بھی جو کچھ ملا ہے وہ رات کی نماز سے ملا ہے۔ دنیا بھی ملی ہے وہ بھی رات کی نماز سے۔ آخرت بنی ہے وہ بھی رات کی نماز سے:

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا

اسی طرح اس کی صفات بھی یکتا ہیں۔ مثلاً اس کی صفت علم ہے۔ آپ کا علم ہوگا کہ سو مسئلے معلوم ہوں
ے' ہزار ہوں گے' دس ہزار معلوم ہوں گے۔ اس کے بعد پھر جہالت آگے کچھ معلوم نہیں۔ لیکن اللہ کی
ت کا علم لامحدود ہے۔ کوئی ذرّہ نہیں ہلتا کہ اسے علم نہ ہو۔ کوئی پتہ نہیں حرکت کرے گا کہ اس کے علم میں
ہو۔ آپ کی اور ہماری قدرت ایک حد میں ہے۔ ہم یہ لاؤڈ اسپیکر اٹھالیں گے' جائے نماز تہہ کر کے اٹھالیں
گے۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ مسجد کو اٹھالو۔ آپ ہم کہہ دیں گے کہ یہ ہماری قدرت میں نہیں ہے ہمارے بس
میں نہیں ہے۔ ایک جن مسجد کو اٹھالے گا لیکن اس کو اگر کہا جائے کہ ساری زمین کو اٹھالے وہ کہے گا میرے
قبضے میں نہیں۔ ملائکہ علیہم السلام زمین کا ایک ٹکڑا اٹھا کے پھینک دیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے لوط علیہ السلام
کی قوم کی بستیاں الٹ دیں۔ لیکن ان سے کہا جائے کہ آسمانوں کو پلٹ دو۔ وہ کہیں گے میری قدرت ہی
میں نہیں۔ غرض بڑے سے بڑے طاقت والے کی طاقت کی ایک حد ہے۔ مگر اللہ کی طاقت کی کوئی حد نہیں ہے'
قدرت' علم' سماعت' بصارت ساری صفات اس کی ایسی ہیں۔

ایسے ہی وہ اپنے افعال میں بھی یکتا ہے کہ اس جیسا کوئی بھی فعل نہیں کر سکتا۔ وہ ماں کے پیٹ میں بچے
کو بنا دیتا ہے۔ کوئی اور دوسرا نہیں کر سکتا۔ اس نے چاند' سورج بنائے۔ ہمارے آپ کے بس میں نہیں ہے۔
ساری زمین کے حکماء ملیں چاند تو بڑا اونچا ہے زمین کا ایک ذرّہ بنا دیں۔ جس میں وہ خاصیتیں ہوں جو اللہ کی
زمین میں ہیں۔ زمین کے ٹکڑوں کو جوڑ توڑ کر کچھ بنالیں گے لیکن خود زمین کی ایجاد کریں۔ ایک ذرّہ بھی نہیں
کر سکتے۔ ساری دنیا کے فلاسفر جمع ہو جائیں سورج کی ایک کرن بھی نہیں بنا سکتے اور اللہ نے بنایا۔ معلوم ہوا
اس جیسا فعل کوئی نہیں کر سکتا۔

تو ذات' صفات اور افعال سب کچھ یکتا اور بے مثل ہے۔ اس لئے جب جھکیں گے تو
جھکیں گے۔ اگر اس کا کوئی شریک اور ساجھی ٹھہرالیں تو یہ کیسے درست ہوگا؟ کیوں کہ جب
صفات اور افعال میں کوئی شریک نہیں تو عبادت میں کون شریک ہو سکتا ہے؟ سب عبادتیں اس
کی۔ سجدہ' رکوع اور فریاد اسی کے سامنے کریں گے۔ رزق' اولاد اسی سے مانگیں گے۔ اس کی
دینے والا کوئی نہیں ہے۔

انبیاء علیہم السلام اتنے مقدس بندے ہیں اور ان میں سے سب سے زیادہ افضل نبی کریم
و سلم ہیں ساری کائنات سے آپؐ برتر ہیں۔ لیکن عبدیت کا یہ حال ہے کہ آپؐ سے نہ فرمایا گیا
زبان سے کہو :

قُلْ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا

"اے پیغمبر! اعلان کرو کہ میں نہ تمہارے نفع کا مالک ہوں نہ نقصان کا"۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آپؐ نے خطاب کر کے فرمایا :

یا فاطمۃ بنت محمد لا اغنی عنک من اللّٰہ شیئا

"اے فاطمہؓ بیٹی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے قبضے میں کچھ نہیں
ایمان اور عمل ہوگا تو نجات پا جائے گی میں نجات نہیں دلا سکوں گا
میں ہے نہ آخرت"۔

جب سیّد الاوّلین والآخرین یہ فرمائیں کہ میرے بس میں کچھ نہیں
مخلوق کیا چیز ہے؟ جو اس سے زنٹ لے۔ بالکل کسی کے بس میں کچھ نہیں

کچھ ہے وہ اللہ کی ذات ہے۔

ہارون الرشید کی بادشاہت کا زمانہ تھا۔ اس وقت قحط پڑا۔ ایک دیہاتی آیا کہ میں بھی جا کر بادشاہ سے کچھ مانگوں۔ تاکہ میری اصلاح حال ہو۔ بچے بھوکے مر رہے ہیں۔ میں جا کر بادشاہ سے کہوں کہ اپنے خزانے سے مجھے کچھ دے۔ جب آیا تو دیکھا کہ ہارون الرشید نماز میں مصروف ہے۔ تو چوب دار نے کہا ذرا ٹھہر جا ___ یہ دیہاتی بے چارہ ٹھہر گیا۔ ہارون الرشید جب سلام پھیر چکے اور دعا مانگ چکے تو ہارون الرشید نے پوچھا کہ چودھری صاحب کیوں آئے؟

چودھری صاحب نے کہا یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا کہ کیوں آیا۔ پہلے یہ بتا کہ تو کر کیا رہا تھا۔ یہ کیا بات تھی۔ اس نے کہا میں اپنے اللہ کے آگے جھک رہا تھا۔ اس نے کہا اچھا تیرے سے بھی کوئی بڑا ہے؟ اس نے کہا میرے سے بڑے اللہ میاں ہیں۔ میں ان سے مانگتا ہوں۔

بس دیہاتی وہیں سے لوٹا کہ مجھے اس سے مانگنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس سے کیوں نہ مانگوں، جس سے تو مانگ رہا ہے۔ جب تو بھی اس کا محتاج ہے تو میں محتاج کا محتاج کیوں بنوں؟ حقیقت یہی ہے کہ سب اس کے سامنے بے بس ہیں۔ وہی سب کے کام کرتے ہیں۔ نہ کوئی کسی کو دے سکتا ہے نہ چھین سکتا ہے۔ وہی دیتا ہے، اسی کو چھیننے کی قدرت ہے۔

آدمی کو اگر کچھ لینا ہے تو اپنے معاملے کو اللہ میاں سے درست کرے۔ سب کچھ مل جائے گا۔ ان سے بگاڑی تو ملا ملایا بھی چھن جائے گا۔

ہارون الرشید ایک دفعہ دربار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بادشاہی کا جوش جو آیا تو ہارون الرشید نے کہا۔ آج جس کا جو جی چاہے مانگے۔ اسے وہی دوں گا۔ بس لوگ کھڑے ہو گئے۔ کسی نے کہا مجھے دس لاکھ روپے دے دو۔ اس نے کہا دے دیا۔ کسی نے کہا مجھے فلاں صوبے کی گورنری دے دیجئے۔ اس نے کہا دے دی۔ کسی نے کہا، مجھے وائسرائے بنا دیجئے۔ اس نے کہا بنا دیا۔ کسی نے کہا مجھے قلعہ دے دیجئے۔ اس نے کہا دے دیا۔ جو جس نے مانگا۔ ہارون نے حکم دیا کہ وہ اسے دے دیا جائے۔

ہارون الرشید کی پشت پر باندی کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی تو ہارون نے گردن پھیر کر باندی سے کہا کہ تو نے کچھ نہیں مانگا۔ سب درباری مانگ رہے ہیں۔

باندی نے کہا ان بے وقوفوں کو نمٹنے دیجئے۔ بعد میں میں بھی مانگوں گی۔

اس نے کہا۔ اچھا یہ میرے وزراء، امراء سب بے وقوف، پاگل اور احمق ہیں۔

ہارون الرشید کو بُرا معلوم ہوا کہ اس نے میرے سارے وزراء، امراء کو پاگل بنا دیا۔ ان امراء کو بھی بُرا لگا۔ مگر امیرُ المؤمنین کی باندی تھی۔ اس لئے کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بہر حال اس نے کہا کہ پہلے یہ احمق نمٹ لیں۔ اس کے بعد میں بھی آپ سے مانگوں گی۔ جب سب دربار والوں کی مرادیں پوری ہو گئیں۔ ہارون نے کہا، اب مانگ کیا مانگتی ہے؟ اس نے کہا، جو کچھ میں مانگوں گی آپ دے سکیں گے۔ ہاں میں دوں گا۔ میرا اعلان ہے ضرور دوں گا۔ اس نے ہارون الرشید کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا کہ میں تو آپ کو مانگتی ہوں۔ جب آپ میرے ہو گئے تو ملک، قلعے، دولت اور خزانے سبھی کچھ میرے ہیں۔ یہ سارے بے وقوف تھے۔ اس لئے کہ جس نے خزانہ لیا، اسے خزانہ مل گیا آگے کچھ بھی نہیں۔ قلعہ مانگا، قلعہ مل گیا۔ باقی کچھ نہیں۔ کسی نے گورنری مانگی، گورنر بن گیا باقی کچھ نہیں۔ تو انہوں نے ایک ایک چیز مانگی اور میں نے وہ چیز مانگی کہ ساری چیزیں میرے قبضے میں آ جائیں۔

نہیں کہ جان اور بدن سے عبادت کریں مال سے نہ کریں' مال اسی کی چیز ہے۔ اس نے ہمیں دے دیا۔ یہ اس کا فضل ہے مگر اصل مالک وہ ہے ــــــ تو فرمایا جب بدن سے فارغ ہو گئے۔ بدن کا' قدموں کا' زبان' ہاتھ' پیر اور سونے جاگنے کا ڈھنگ معلوم ہو گیا۔ اب ایک چیز رہ جاتی ہے جو مالیات ہیں۔ اس کے بارے میں فرمایا :

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا

رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب اللہ ان کو مال و دولت دے تو وہ اعتدال کے ساتھ چلیں۔ نہ تو بخیل بنیں کہ ایک پائی بھی ان کے ہاتھ سے نہ نکلے نہ فضول خرچ کریں کہ بے جا اپنی دولت خرچ کر کے محض اپنے نفس کی راحتوں میں گنوا دیں۔ اعتدال کے ساتھ چلیں۔ نہ اسراف کریں نہ تقصیر کریں۔ اسراف فضول خرچی کو کہتے ہیں۔ تقصیرِ امساک اور بخل کو کہتے ہیں۔ جس طرح اور جگہ فرمایا گیا :

وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَلَا تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ○

نہ تو اپنے ہاتھ کو اتنا سکیڑو کہ تمہارا ہاتھ مونڈھے کو لگ جائے کہ دینے کے لئے کچھ نہیں اور نہ اتنا پھیلاؤ کہ جو کچھ ہے سب دے ڈالو۔ کل کو بھیک مانگنے لگو۔ دونوں چیزیں ممنوع ہیں۔ درمیانی چال یہ ہے کہ دو بھی اور نہ بھی دو۔ یعنی یہ پہچان کر کہاں دینا جائز ہے کہاں ناجائز ہے۔ کہاں موزوں ہے کہاں ناموزوں ہے کہاں دینا حق ہے' کہاں دینا ناحق ہے۔ لہو و لعب' کھیل تماشے میں مت دو۔ وہاں بخیل بن جاؤ۔ یہی بہتر ہے اور اگر عمل خیر ہو' یہاں دینا بہتر ہے۔ جب آدمی اعتدال کے ساتھ خرچ کرے گا تو حدود معلوم کرنے کی ضرورت ہو گی کہ کہاں خرچ کروں کہاں نہ کروں؟

اسلام کا اصول ہی اعتدال ہے' عمل میں بھی اعتدال ہو۔ چنانچہ یہ اسراف ہے کہ آدمی نفل پڑھنے پر آئے تو ساری رات پڑھتا رہے اور جب چھوڑ کے بھاگے تو فرضوں کی بھی خیر نہیں۔ یہ اچھی چیز نہیں' عبادت کرے' نفل پڑھے۔ مگر اس طرح کہ پھر عمر بھر اس کو نبھادے۔ فرائض تو ادا کرے۔ مگر نوافل پڑھے تو ان کو پھر عمر بھر نبھائے۔

اسی کو فرمایا گیا' **خیرالامور مادیم علیہ** آدمی کا بہترین عمل وہ ہے' جس پر وہ ہمیشگی کر سکے۔ مثل مشہور ہے کہ "نہ دوڑ کے چلے نہ اکھڑ کے گرے" چلے تو آدمیوں کی طرح چلے۔ نہ دوڑے نہ بالکل ضعیف بن جائے۔ بیچ کی چال چلے۔ اسی کو فرمایا گیا کہ نفل' تلاوت' ذکر کرنے میں اعتدال ہو۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہٗ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا جی چاہتا ہے کہ ایک قرآن روز ختم کیا کروں گا؟

فرمایا ہرگز نہیں۔ یہ نبھ نہیں سکے گا' کم کرو۔

عرض کیا' یا رسول اللہؐ! دو دن میں ایک ختم کر لیا کروں گا؟

فرمایا' نہیں' یہ نبھ نہیں سکے گا۔

پھر عرض کیا یا رسول اللہ! میں چاہتا ہوں کہ دس پارے روز پڑھوں اور ہر تیسرے دن ختم کروں؟

فرمایا' نہیں' نبھ نہیں سکے گا۔

پھر عرض کیا' یا رسول اللہ! ایک منزل روزانہ پڑھ لیا کروں؟

آپؐ نے زیادہ خوشی سے اس کی بھی اجازت نہیں دی۔ مگر جب اصرار دیکھا تو فرمایا اچھا۔

عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہٗ کہتے ہیں کہ جب میرا بڑھاپے کا زمانہ آیا۔ اب مجھے قدر ہو گئی کہ پانچ پارے

روز بھی نہیں پڑھ سکتا تھا تو میں کہتا تھا کہ اگر میں روز کا ایک قرآن شریف شروع کردیتا۔ تو چھوڑ کے بن پڑتی اور محرومی اختیار کرتا۔ اللہ کے رسولؐ نے کیسی سچی بات فرمائی تھی۔ کیسی پاک نصیحت فرمائی تھی۔ یہ بھی منشاء نہیں تھا کہ پانچ پارے روزانہ پڑھوں۔ مقصد نبھانا تھا۔ اب ان پانچ کا نبھانا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ اس لئے آدمی کام اتنا کرے جو نبھ سکے۔

حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم کی زوجۂ مطہرہ ہیں' یہ مسجدِ نبوی میں عبادت کیا کرتی تھیں۔ آپؐ ایک دن تشریف لائے۔ دیکھا کہ چھت میں ایک رسی لٹک رہی ہے ___ فرمایا یہ رسی کیسی ہے؟

عرض کیا گیا کہ امّ سلمہؓ عبادت کرتی ہیں۔ جب بیٹھے بیٹھے تھک جاتی ہیں' اونگھ آنے لگتی ہے تو رسی کا سہارا لے کر بیٹھتی ہیں' پھر عبادت کرنے لگتی ہیں۔

فرمایا۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ جب نیند آئے پڑ کے سو جاؤ۔ جب سو کر اٹھو بشاشت ہو۔ پھر اللہ کو یاد کرو۔ اس تکلف کی کیا ضرورت ہے کہ نیند آرہی ہے' اونگھ آرہی ہے۔ کہیں رسی کی آڑ' کہیں دیوار کی آڑ۔ اس تصنع اور بناوٹ کی ضرورت نہیں۔ اتنا کام کرو جتنا نبھ جائے۔ تو اقتصاد یعنی عمل میں میانہ روی یہ معتبر ہے۔ خواہ جان کے خرچ کرنے کا عمل ہو یا مال کے خرچ کرنے کا' اعتدال ہونا چاہئے۔

رحمٰن کے بندوں کی قلبی عبادت

یہاں تک گویا اعمال آگئے۔ چال ایسی ہو' سلام کرنا ایسا ہو وغیرہ۔ یہ گویا ہاتھ' پیر اور زبان کی عبادت آگئی۔ آگے قلب کی عبادت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس مبدا اور معاد کے درمیان میں جو زندگی گزارو تو دل کیسا ہونا چاہئے۔ دل کی عبادت کیا ہو ___ ؟ تو فرمایا:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ

رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب وہ اللہ کو پکاریں تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں' کسی کو ساجھی نہ ٹھہرائیں نہ اس کی ذات میں نہ صفات میں اور نہ ہی افعال میں۔ ذات بھی اس کی یکتا ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں۔ صفات و کمالات بھی اس کے یکتا ہیں کہ کوئی اس جیسا نہیں۔ افعال میں بھی وہ یکتا ہے کہ کوئی اس جیسا نہیں۔

ذات لامحدود ہے پس اس کی حد نہیں۔ اس کے سوا جو بھی ہے۔ اس کی ایک حد ہے۔ سب سے بڑی مخلوق انسان ہے۔ مگر اس کی ایک حد ہے۔ ڈیڑھ گز کے اندر ہے اس سے باہر نہیں ہے۔ ہم ایک حد میں ہیں اس سے آگے نہیں ہیں۔ آپ اپنی حد میں ہیں اس سے باہر نہیں۔ میں اپنی حد میں ہوں اس سے باہر نہیں ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ جہاں جاؤ وہ موجود' کہیں پہنچ جاؤ وہ موجود ہے۔ آسمانوں' زمینوں اور ان کی تہوں میں گھس جاؤ تب اللہ موجود ہے' اس کے وجود کی کوئی حد نہیں ہے۔ تو اللہ کے سوا کون ہے کہ اس کے وجود کی حد نہ ہو۔ جسے دیکھو اس کی ایک حد ہے۔ پہاڑ ہیں گو کتنے بڑے ہیں' مگر ایک حد میں ہیں۔ سمندر ہیں ان کی ایک حد ہے۔ جہاں کنارہ آگیا سمندر ختم ہو گیا۔ آگے زمین شروع ہو گئی۔ یہ نہیں کہ سمندر ہر جگہ موجود' آسمانوں' زمینوں' فضا میں بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے اپنے دائرے کے اندر ہے۔ زمین اپنے دائرے میں ایک حد میں ہے۔ حد سے آگے کچھ نہیں ہے اور اللہ کی ذات اس کی کہیں حد ہی نہیں ہے کسی عالم میں پہنچو اللہ کی ذات موجود ہے۔ اس جیسی دوسری ذات نہیں۔ وہ بے مثل و بے مثال ہے۔

سکون و آرام کا وقت وہ رات ہی کا وقت ہوتا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تہجد آدابِ صالحین میں سے ہے کیونکہ دن میں ریاکاری اور دکھلاوے کا وہم ہو سکتا ہے۔ رات کی نماز میں دکھلاوے اور ریاکاری کا کوئی دخل نہیں۔ غرض جس کو جو ملا وہ رات کی نماز سے ملا۔

حدیث میں ہے کہ چند باتیں ایسی ہیں کہ ان سے اللہ کو ہنسی آتی ہیں جیسی ہنسی اس کی شان کے مناسب ہے۔ یہ ایسی ہنسی نہیں۔ جیسے ہم اور آپ ہنستے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جسم سے پاک ہے مگر ہماری جسمانی ہنسی کی حقیقت یہ ہے کہ جب دل میں کوئی خوشی پیدا ہو جب ہنسی آتی ہے۔ غم دل میں بھرا ہوا ہو تو کون ہنسا کرتا ہے۔ تو رونا غم کی اور ہنسا خوشی کی علامت ہے۔ غرض خوشی ایک کیفیت ہے۔ اسے ظاہر کرنے کے لئے اللہ نے ہنسی رکھ دی چونکہ ہمارے پاس بدن ہے۔ تو جب اندر خوشی ہے تو باہر بدن پر ہنسی آتی ہے۔ حق تعالیٰ چونکہ بدن وصورت سے پاک ہیں۔ اس لئے جب اس کو بیان کریں گے تو کہیں گے' ہنسی درست ہے مگر ہنسی کا وہ مطلب نہیں ہو گا جو ہمارے ہاں ہوتا ہے۔

تو حدیث میں ہے کہ تین موقعوں پر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے۔ ایک میدانِ حج میں جب ننگے سر' ننگے پاؤں' گرد پڑا ہوا' بال بکھرے ہوئے' ناخن بڑھے ہوئے' نہ خوشبو اور نہ زینت اور لبیک لبیک کہتے ہوئے بندے پھر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ کو اس موقع پر ہنسی آتی ہے کہ کیا چیز ان کو ان کے گھروں سے نکال کر لائی ہے۔ بیوی بچے چھوڑے' وطن چھوڑا۔ آخر یہ کیوں فقیروں کی طرح سے بے وطن ہوئے ہیں؟ میری محبت میں ہی تو پھر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ ہنستے ہیں اور ملائکہ سے کہتے ہیں کہ تمہیں گواہ کرتا ہوں۔ میں نے ان سب کی مغفرت کی یہ میری محبت میں گھر بار' بیوی بچوں کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ میں کریم ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ گھر بار چھوڑ دیں اور میں توجہ نہ کروں۔ میں نے ان سب کی مغفرت کی تو خوش ہو کر مغفرت فرماتے ہیں۔ اس خوشی کو ہنسی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دوسری ہنسی کب آتی ہے؟ جب مکبّر تکبیر کہے اور لوگ دوڑ دوڑ کے آ رہے ہیں کہ صفِ اولیٰ میں جگہ ملے۔ ہر ایک کہتا ہے مجھے ملے گویا ایک قسم کا جھگڑا ہے اور آگے پیچھے ہونے کی دوڑ ہے۔ حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ یہ جو اپنا گھر چھوڑ کے میرے گھر میں آئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہاں کوئی مٹھائی روٹی نہیں مل رہی؟ یہ آخر کیوں دوڑ رہے ہیں؟ یہ میری محبت میں دوڑ رہے ہیں' یہ میرا دربار جان کر آئے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے جتنا بھی قریب ہو جائیں گے اتنے ہی ہمارے درجات بلند ہوں گے۔ اس سے خوش ہو کر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے۔

اور تیسرا موقع کون سا ہے؟ فرمایا گیا کہ خاوند اور بیوی پڑے ہوئے سو رہے ہیں۔ اچانک خاوند کی آنکھ کھلی اور اس کا جی چاہا کہ تہجد پڑھوں۔ اس نے بیوی کے منہ کے اوپر پانی کا چھینٹا مارا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھی۔ اس نے کہا کیا مصیبت آئی ہے۔ خاوند نے کہا دو رکعت نفل پڑھ لے تہجد کا وقت ہے حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ یہ اس کی محبوبہ ہے اس کے پاس لیٹی ہوئی ہے۔ آرام سے میٹھی نیند سو رہی تھی ایک دم گھبرا کے اٹھی کہ بارش تو نہیں آگئی۔ خاوند نے کہا۔ بارش تو نہیں۔ مگر دو رکعت پڑھ لے۔ تو یہ آگے سے کہتی ہے کہ میں شکریہ ادا کرتی ہوں کہ مجھے دو رکعت پڑھنے کی توفیق ہو گئی۔ اس نے بھی کھڑے ہو کے دو رکعات پڑھیں۔ یا بیوی نے خاوند کے منہ پر چھینٹا مار دیا اور وہ ہڑبڑا کے اٹھا تو یہ موقع بھی حق تعالیٰ کی ہنسی کا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ تینوں چیزیں درجات کے بلند ہونے کا باعث ہیں اور اللہ کی انتہائی رضا کا وقت ہے۔ اس واسطے اس کو ہنسی سے تعبیر کیا گیا۔ تو یہ جو فرمایا گیا کہ :

وَالَّذِیۡنَ یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّہِمۡ سُجَّدًا وَّقِیَامًا۔

کہ جب رات تنہائی میں گزارتے ہیں تو کبھی سجدہ رکوع میں اور کبھی تلاوت میں ہیں۔ اس پر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ کوئی دیکھنے والا نہیں۔ کسی کو یوں نہیں کہہ سکتے کہ دیکھو میں بڑا عابد، زاہد ہوں۔ کسی کو دکھلانے کے لئے یہ نہیں اٹھا۔ یہ صرف مجھے دکھلانے اور میری رضا کے لئے اٹھا ہے۔ میں کریم ہوں۔ میں بخشتا ہوں اور مغفرت کرتا ہوں۔

اب گویا تین باتیں ہوئیں۔ گھر سے نکلو تو تواضع کی چال چلو، قال ہو تو سلامتی کا کلمہ ہو، بُرے کلمات نہ ہوں، جاہلانہ باتیں نہ ہوں اور رات گزارو تنہائی میں۔ جب کہ کسی انسان سے سابقہ نہیں، تو سجود و قیام اور اللہ کے ذکر و اطاعت کرو۔

رحمٰن کے بندوں کی زبان سے عبادت

اور یہ تو عمل ہے کہ قیام کرلیا، سجدہ کرلیا اور قلب کے جذبات کیا ہونے چاہئیں؟ وَالَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا اصۡرِفۡ عَنَّا عَذَابَ جَہَنَّمَ دل میں خوف بھرا ہوا ہو، زبان پر اس کو ادا کرے اور یہ دعا کرے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم سے جہنم کا عذاب ہٹادیں اس کو ہمارے سے دور دور رکھ۔ اِنَّ عَذَابَہَا کَانَ غَرَامًا اس لئے کہ یہ عذاب گلے کا ہار ہے۔ جب لٹک جائے گا تو اس کا جُدا ہونا مشکل ہوگا۔ کسی کے بس میں نہیں ہوگا کہ اس عذاب کو دُور کرے۔ اللہ کی طرف سے جب عذاب آتا ہے تو کوئی پناہ دینے والا نہیں ہے۔ آخرت تو آخرت دنیا میں بھی حق تعالیٰ اگر کسی کو عیاذاً باللہ مبتلا کردیں کہیں پناہ کی جگہ نہیں ملتی۔ جب تک اللہ ہی پناہ نہ دے۔ کسی قوم کو گھیرے تو چار طرف سے راستے بند ہوجاتے ہیں۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ بجز اس کے اللہ ہی پناہ دے اور مخرج پیدا کردے اور آخرت میں تو اسباب کا ذکر ہی نہیں۔ وہاں تو سارا کارخانہ مسبّب الاسباب کا ہے۔ اس لئے بڑا ڈر وہاں کا ہے۔

اس لئے کہ یہاں اگر آدمی مبتلا ہوجائے تو کم سے کم خیال تو باندھ لے گا کہ شاید کل کو چھٹکارا ہوجائے، شاید پرسوں کو۔ وہاں تو خیال پر بھی پابندی ہوگی کہ راحت کا آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔ تو انتہائی قید و بند ہے کہ دل بھی گرفتار، زبان بھی گرفتار، ہاتھ پیر بھی گرفتار، کوئی پناہ کی جگہ نہیں۔ یہ ہے عذاب جہنم ۔۔۔۔ اس لئے فرمایا گیا کہ تم ایک تو بدن سے عمل کرو۔ یعنی سجود اور قیام کرو اور ایک زبان سے یہ دعا پڑھو:

رَبَّنَا اصۡرِفۡ عَنَّا عَذَابَ جَہَنَّمَ اِنَّ عَذَابَہَا کَانَ غَرَامًا۔

غرض پہلے قدموں کو لیا کہ انہیں ٹھیک ڈالو کہ چال درست ہو۔ پھر بدن کو لیا کہ سجدے اور قیام میں لگو۔ پھر زبان کو لیا کہ سلامتی کی بات کرو۔ اللہ سے دعائیں کرو۔ اِنَّہَا سَآءَتۡ مُسۡتَقَرًّا وَّمُقَامًا اس لئے کہ جہنم جسے کہتے ہیں وہ بدترین ٹھکانا ہے۔ اللہ اس سے پناہ دے اور نجات عطا فرمادے۔ اب گویا قول، بدن اور قدم کی سب عبادتیں آگئیں۔

مالیات کے سلسلہ میں رحمٰن کے بندوں کی شان

اب اس سے آگے انسان کے وسائل اور اسباب ہیں جن کو مالیات کہتے ہیں۔ نقد، سامان، گھربار یہ سب اموال کہلاتے ہیں۔ جب ہم اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں تو ہمارا سامان بھی اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ تو کوئی

یہی شان اہلُ اللہ اور اہلِ دنیا کی ہے۔ مثلاً اہل دنیا مانگتے ہیں کہ یا اللہ! مجھ کو لکھ پتی بنادیجئے یا کروڑ پتی بنادیجئے۔ تو وہ بنادیئے گئے۔ کسی نے کہا کہ مجھے جاگیر دے دیجئے۔ فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ دے دی۔ اللہ والے کہتے ہیں کہ آپ میرے ہوجایئے تو سب کچھ میرے قبضے میں ہے۔ وہ کروڑ پتی بھی ہے' لکھ پتی بھی ہے۔ تو دانش مندی کی بات یہ ہے کہ جڑ بنیاد کو آدمی پکڑے۔

اس لئے آدمی کو اگر مانگنا چاہئے تو اللہ سے مانگے۔ اس سے کیا مانگے جو خود مانگنے والا اور محتاج ہو۔ اسی لئے فرمایا گیا :

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (فرقان پ۱۹ آیت ۶۸)

رحمن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب وہ پکارنے بیٹھتے ہیں تو تنہا اللہ کی ذات کو پکارتے ہیں۔ کسی اور کو ساجھی نہیں سمجھتے۔ اس لئے کہ اللہ کا کوئی اور مددگار تو نہیں ہے۔ جب انہوں نے آسمان بنایا تھا تو کسی سے کہا تھا کہ اتنا کام تم کردو' اتنا میں کرلوں گا۔ جب پیٹ میں بچے کو بنایا تھا تو کیا کسی سے مدد مانگی تھی کہ آتو بھی شریک ہوجا۔ مجھ اکیلے سے نہیں بنتا۔ تو شریک ہو جائے گا تو بن جائے گا۔ جس کسی کام کی تخلیق میں کوئی شریک نہیں ہے تو عبادت میں کیسے شریک ہوگئے؟ وہ تنہا بناتا ہے' تو تنہا وہ معبود بھی ہوگا :

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۔ فاتحہ پ۱ آیت ۴

''تنہا آپ ہی کی عبادت کریں گے۔ تنہا آپ ہی سے مدد مانگیں گے''۔

مسلم کو اللہ نے یہ شان دی ہے کہ اس کا سر خدا کے سوا کسی اور کے آگے نہیں جھکتا۔ یہ ذلت پیش کرے گا تو اللہ کے سامنے کرے گا۔ بندہ بندہ کے آگے ذلیل ہونے کے لئے دنیا میں نہیں بھیجا گیا۔ اسی واسطے شریعت نے بھیک مانگنے سے ممانعت فرمائی ہے۔ کوئی کسی کے آگے بھیک نہ مانگے۔ اس لئے کہ مانگنے سے زیادہ ذلت کسی چیز میں نہیں ہے۔ بھیک مانگنا اپنے کو بے آبرو کرنا ہے۔ بندے کو حق نہیں ہے کہ اپنے جیسے بندہ کے آگے بے آبرو بنے۔

ایک دوستی میں مانگنا ہے۔ جیسے آپ کسی بے تکلفی میں یوں کہیں کہ بھئی! یہ چیز مجھے دے دو۔ یہ تعلق کو بڑھانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا :

اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْ بُيُوْتِكُمْ اَوْبُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْبُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْبُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْبُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْبُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْبُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْبُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْبُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْمَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ اَوْصَدِيْقِكُمْ (نور پ۱۸ آیت ۶۱)

فرماتے ہیں اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔ تم اپنے گھروں میں جس طرح تمہارا جی چاہے کھاسکتے ہو۔ ماں کے گھر سے مانگ کے کھاسکتے ہو۔ نہ مانگنا تکبر اور مانگنا تعلق کی علامت ہوگا۔ باپ' حقیقی بھائی' بہن' چچے' پھوپھی' ماموں' خالہ یا ایسے گھروں سے جن کی کنجیاں تمہارے اختیار میں ہیں یا اپنے دوستوں کے گھر سے بھی مانگ کر کھاسکتے ہو۔ کوئی حرج نہیں ۔۔۔ ان سے مانگ کرلوگے تو وہ یہ سمجھیں گے کہ جب انہوں نے اپنا سمجھا' جب تو مانگا۔ کوئی دنیا کے آگے تو یہ مانگتا نہیں پھرتا۔ اس طرح بے تکلفی سے اگر کوئی مانگ لے تو یہ بجائے بے آبروئی کے آبرو کا ذریعہ بنتا ہے اور تعلق کے استحکام کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس کی اجازت دی گئی ہے ایک ہے بھیک مانگنا یعنی محتاج و مفلس بن کے کسی کے آگے آنا کہ تم ہمارا کام پورا کردو۔ ہم تو کچھ بھی نہیں ۔۔۔ اس ذلت کے اظہار سے ممانعت کی گئی ہے۔ وقار کے ساتھ مانگنا جو ہے اس کی ممانعت نہیں ہے۔ ۔۔۔ سوال میں چونکہ ذلت تھی اور ایسی ذلت صرف اللہ کے آگے اختیار کی جاسکتی ہے' غیر کے آگے

نہیں۔ اس لئے اس کی ممانعت کی گئی ہے اور مانگو تو صرف خدا سے مانگو۔ فریاد اس سے کرو۔ اولاد' صحت سب کچھ اس سے مانگو۔ اس لئے کہ ہر چیز کے خزانے اس کے قبضے میں ہیں۔ اس لئے فرمایا :

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (فرقان پ ۱۹ آیت ۶۸)

رحمٰن کا بندے وہ ہیں کہ جب وہ پکارنے بیٹھتے ہیں تو اللہ کے سوا کسی کو شریک نہیں مانتے۔ تنہا اسی کو پکارتے ہیں۔

حقوق العباد کے بارے میں رحمٰن کے بندوں کا طرزِ عمل

تو یہاں تک چال ڈھال' زبان' ہاتھ' پیر' مال و دولت اور روح کی سب عبادت آگئی۔ اب آگے دوسرے کے ساتھ معاملہ' دوسرے کے حقوق کو بتلایا گیا اس بارے میں رحمٰن کے بندوں کی کیا شان ہے؟

وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ○

"رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو ناحق قتل نہیں کرتے"۔

کہ کسی کی جان لے لی' کسی کی گردن اُڑادی ــــــ یہ رحمٰن کے بندوں کی شان نہیں ہے۔ یہ فُسّاق و فُجّار کی شان ہے کو دوسروں کو اِیذا پہنچائیں۔ اپنی بڑائی جتلانے کے لئے دوسروں کی حقارت چاہیں۔ معاملات میں دوسروں کو حقیر سمجھیں۔ یہ متکبّروں کی شان ہے ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ وہ دنیا میں اپنے آپ کو سمجھیں کہ ہم بہت بڑے ہیں۔ لیکن دنیا ہی میں ایسے لوگوں کا انجام برا ہو جاتا ہے۔ جو دوسروں کی تحقیر کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔

ہاں اللہ ہی حکم دیں کہ قتل کرو' پھر قتل کرنا فرض ہے جیسے قصاص میں قتل کریں۔ کسی نے ناحق قتل کیا تھا تو سزا میں اس کا قتل کرنا یہ جائز ہے۔ یا کوئی اپنے دین سے مرتد ہو جائے۔ اس کا قتل کر دینا جائز ہے یا اس طرح سے کوئی زنا کار ہو۔ پتھروں سے سنگسار کر دینا۔ یہ اس کا قتل کر دینا ہے۔ یہ بھی جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اسے پتھروں سے قتل کیا جائے۔ غرض زنا کاری یا قاتلوں کو دنیا سے پاک کرنے کے لئے یا مرتدین جو دین کی کوئی اہمیت نہ سمجھیں اور اپنے دین کو بدل ڈالیں۔ ایسے لوگوں سے دنیا کو پاک کرنے کے لئے قتل کرنا جائز ہے۔ یہ قتل حق ہے۔ ناحق وہ قتل ہے کہ قتل کا کوئی استحقاق نہیں تھا اور چار پیسے کی خاطر گردن ماردی یا ڈاکہ ڈالنا تھا جاکے قتل کر دیا' یا جذبہ آیا' لڑائی شروع ہوئی۔ اِدھر سے بھی چھری نکل آئی' اُدھر سے بھی نکل آئی۔ قتل و غارت شروع ہو گیا۔ اس کا کوئی حق نہیں۔ تو یہی فرمایا گیا جن کی نسبت رحمٰن کی طرف ہوگی اور وہ رحمانی ہوں گے۔ وہ یہ کام نہیں کریں گے۔ یہ فُسّاق و فُجّار کا کام ہے کہ وہ بیلوں کی طرح سے پھرتے ہیں۔ بیل کا کام یہی ہے کہ جو سامنے آگیا اس کے سینگ ماردیا یا شیر کے آگے کوئی گیا تو وہ دانت کھول کر پھاڑ کر کھانے کے لئے جا پڑا۔ غرض یہ بہائم کا کام ہے۔ انسانوں کا کام نہیں ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ مومن کون ہے؟ مومن کی علامت کیا ہے؟

فرمایا :

المؤمن من امنہ الناس علٰی دمائھم واموالھم

مؤمن وہ ہے کہ لوگ اس سے اپنی جان' اپنے مال اور اپنی آبرو کے بارے میں مطمئن ہو جائیں کہ یہ مؤمن ہے کہ یہ ہماری جان نہیں لے سکتا۔ یہ ہمارے مال کو ضائع نہیں کر سکتا اور ہماری آبرو کو خراب نہیں کر سکتا۔ لوگوں کو اتنا اطمینان پیدا ہو جائے۔ پھر سمجھا جائے گا کہ یہ مؤمن ہے۔

پھر امنہ الناس میں لفظ بھی عام ہے کہ لوگ مطمئن ہوں۔ خواہ مسلم یا غیر مسلم ہوں۔ ہر ایک کو اطمینان ہوجائے کہ بھئی! یہ مؤمن ہے۔ اس کا کام یہ نہیں ہے کہ مار دھاڑ کرتا پھرے یا آبرو ریزیاں کرتا پھرے۔ دنیا اس سے مطمئن رہے کہ یہ صالح آدمی ہے۔ اس سے کسی نقصان کا اندیشہ نہیں ہے۔

اور اگر آپ کسی سے کھٹکتے رہیں کہ بھئی کہیں یہ چھری نہ مار دے۔ یہ مؤمن کیا یہ اچھا خاصا بیل ہے' بیل جب سڑک پر چلتا ہے تو آپ دامن بچا کے چلتے ہیں کہ کہیں پیشاب نہ کردے کہ کوئی چھینٹ نہ آجائے' کہیں سینگ نہ ماردے۔ تو اگر مؤمن سے بھی کوئی یوں بچنے لگے کہ بھئی جیب بچاؤ کہیں جیب نہ کترلے' کہیں جیب سے فونٹین پین نہ نکال لے جائے۔ تو یہ مؤمن کیا ہوا ___ مؤمن کا یہ کام نہیں ہے۔

اس لئے فرمایا کہ رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو نفس انسانی کے درپے نہیں ہوتے۔ قتل وغارت کرتے نہیں پھرتے۔ ہاں خدا کا حکم آجائے' حکم کی تعمیل کے لئے قصاص لے لیں تو قتل کردیں۔ ویسے ان کا کام نہیں۔

وَلَا يَزْنُوْنَ آبرو ریزی نہیں کرتے۔

سب سے بڑی آبرو ریزی زنا کاری ہے کہ ایک عورت کی آبرو ختم کردی اور اس درجے ختم کردی کہ عمر بھر کے لئے بے آبرو ہوگئی۔ اس سے اگر بچہ پیدا ہوا وہ ولدُ الزّنا ہوگا۔ تو پوری برادری کہے گی کہ یہ حرام کا بچہ ہے۔ اس کو بیٹی مت دو۔ اس سے معاملہ مت کرو۔ تو کتنا عظیم اس نے گناہ کیا کہ ایک عورت کی پوری زندگی برباد وتباہ کردی۔ سوسائٹی میں اس کی کوئی وقعت اور آبرو باقی نہ رہی۔ ایسا شخص قابل گردن زدنی ہے۔

پھر آبرو ریزی ایک کی کی اور امن ساری سوسائٹی سے اٹھا دیا۔ دوسروں کو جرأت ہوگی کہ وہ بھی یہ حرکت کریں' تو دنیا کے اندر بدامنی پھیل گئی۔ آبرو باقی نہ رہی۔ تو ایک کی آبرو جائے گی اور دوسرے کو اس نے آبرو ریزی کرنے کی جرأت دلائی۔ اس واسطے فرمایا گیا کہ زانی کی سزا سنگسار کرنا ہے۔ تو فقط یہ نہیں ہے کہ قتل کیا جائے۔ بلکہ اس کا نصف حصہ زمین میں گاڑ کر پبلک اکٹھی ہو اور پتھر مار مار کر اسے سنگسار کیا جائے۔ ظاہر میں تو یہ سزا بڑی سخت معلوم ہوتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وحشت والی سزا ہے۔ لیکن میں عرض کرتا ہوں کے جرم کی نوعیت کو دیکھو کہ ایک شخص کی آبرو ضائع کی، سوسائٹی برباد کی' دنیا سے اس نے امن اٹھادیا۔ ایسے شخص کو تو اس سے زیادہ سزا دینی چاہیے۔

اس لئے فرمایا گیا کہ رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ نہ وہ کسی کی جان گنواتے ہیں نہ کسی کی آبرو گنواتے ہیں۔ دونوں کی حفاظت کرتے ہیں :

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ○

"پھر بھی اگر کوئی یہ حرکت کرے گا اسے اثام میں ڈالا جائے گا"۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اثام ایک وادی اور جہنم میں جنگل ہے۔ اس میں شدید عذاب ہے کہ جہنم بھی اس سے پناہ مانگتی ہے اس میں اس کا ٹھکانا بنایا جائے گا۔ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ دوگنا تگنا عذاب اس کے اوپر بڑھتا ہوا ہوگا ___ اس لئے کہ جیسے اس نے دنیا میں آبرو ریزی کرکے آبرو کو تہ وبالا کیا کہ پھر آبرو ابھر ہی نہ سکے۔ اس طرح عذاب بھی تہہ بہ تہہ ڈالا جائے گا تاکہ وہ ابھر ہی نہ سکے۔ اسے بھی وہاں امن نہیں ہوگا۔ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ○ اور ایک لمبی مدت تک ذلت ورسوائی کے ساتھ یہ عذاب بھگتے گا۔

توبہ کرنے والوں سے حق تعالیٰ کا معاملہ

اِلَّا مَنْ تَابَ سوائے اس کے کہ کوئی توبہ کرے' اس سے آخرت کا عذاب ٹل جائے گا۔ دنیا میں تو عذاب

آگیا کہ اسے سنگسار کردیں گے' لیکن ابھی آخرت کی توبہ باقی ہے' اگر توبہ کرلی' وہاں کا عذاب ختم ہوجائے گا۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ (فرقان پ۱۹ آیت۷۰)

جو توبہ کرے اور توبہ کے بعد نیک راستے پر چلنے لگے۔ فضول حرکتوں کو ترک بھی کردے۔ پھر فقط گناہ معاف ہی نہیں ہوں گے۔ بلکہ اس کی نیکیاں بدیوں کو بھی مٹادیں گی۔ اس کی نیکیاں غالب آجائیں گی۔ اللہ تعالیٰ اس کی برائیاں نیکیوں سے بدل دے گا اور اس تبدیلی کا ظہور آخرت میں ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص میدانِ محشر میں حاضر ہوگا۔ حق تعالیٰ اسے بلائیں گے وہ بے چارہ یا تو توبہ کرکے گیا ہوگا یا توبہ نہ کی ہوگی تو حق تعالیٰ کا فضل متوجہ ہوگا ___ اسے فرمائیں گے قریب ہوجا' وہ قریب ہوگا۔ فرمائیں گے اور قریب ہوجا۔ یہ بے چارہ لرز رہا ہے کپکپا رہا ہے' ہیبت زدہ اور ڈر رہا ہے۔ فرمائیں گے اور قریب ہوجا۔ اتنا قریب آئے گا کہ حدیث میں ہے اس کے کانوں میں آہستہ آہستہ بات چیت ہوگی۔ حق تعالیٰ اس کو اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ یاد دلائیں گے۔ فرمائیں گے یہ حرکت کیوں کی؟ اس کا دل اُچھل اُچھل کر منہ کو آرہا ہوگا کہ اب میری نجات کی کوئی صورت نہیں اور حکم ہوگا جاؤ جہنم میں۔ اس لئے کہ ابھی تو چھوٹی چھوٹی برائیاں پوچھ رہے ہیں۔ جو میں نے بڑی بڑی حرکتیں کی ہیں۔ ان کی نوبت آگئی تو کیا ہوگا؟ یہ معمولی باتیں تھیں ان کو پوچھ لیا ہے۔

عُذر کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ عرض کرے گا اللہ میاں میں نے اپنی بدبختی سے ایسی حرکتیں کیں۔ بہت سی بدیاں گنوانے کے بعد حق تعالیٰ فرمائیں گے ان سب کے بدلے ہم تجھے نیکیاں دیتے ہیں اور تیرے نامۂ اعمال میں وہ لکھی جاتی ہیں ___ اب وہ حیران ہوگا کہ یہ تو دوسرا قصہ ہے۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ میرے لئے ہلاکت ہے۔ یہاں تو بدیوں کو نیکیوں سے بدلا جارہا ہے۔ اب خود ہی کہے گا اللہ میاں وہ جو بہت بڑی بدی میں نے کی تھی وہ تو آپ نے پوچھی ہی نہیں۔ فرمائیں گے حق تعالیٰ وہ کیا تھی؟ بندہ عرض کرے گا وہ یہ تھی۔ فرمائیں گے اس کے بدلہ میں اتنی نیکیاں دیں۔ تو رحمت متوجہ ہوجائے تو ہلاکت کی کوئی صورت نہیں اور غضب خدانخواستہ متوجہ ہوجائے تو نجات کی کوئی صورت نہیں۔

آگے فرمایا:

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّہٗ یَتُوْبُ اِلَی اللّٰہِ مَتَابًا (ایضاً آیت ۷۱)

اس سے پہلے تو وہ گناہگاروں سے معاملہ تھا۔ اب آگے اصول بیان کیا جس سے جو بھی قصور ہو وہ توبہ و رجوع کرے' توبہ کا دروازہ کسی کے لئے بند نہیں۔ مؤمن کا فرض یہ ہے کہ وہ اللہ سے مایوس نہ ہو۔ توبہ کا دروازہ اس وقت بند ہوگا جب آفتاب مغرب سے طلوع کرے گا اور قیامت کی بڑی علامات نمایاں ہوں گی اور دنیا کا خاتمہ قریب ہوگا۔ اس وقت توبہ کا دروازہ بند ہوگا۔ اسی لئے اگر ستر برس سے بھی معصیت میں مبتلا ہو اور آج دل سے سچی توبہ کرلے۔ آج بھی معافی مل جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ کسی شخص نے زنا کیا اور اس کے دل میں ندامت اور شرمندگی آئی۔ اس نے ہاتھ اُٹھا کر کہا اے میرے پروردگار!

فرماتے ہیں کہ ابھی اس نے یہ نہیں کہا کہ مجھے بخش دیجئے۔ حق تعالیٰ فوراً فرماتے ہیں۔ اعلم ان لہٗ ربًا یعنی یہ جان گیا کہ اس کا بھی کوئی ربّ ہے جو اس کی پکڑ کرے گا۔ یہ جان گیا' فرماتے ہیں جب یہ جان گیا تو قبل اس کے کہ یہ مغفرت مانگے۔ اس کی مغفرت ہوجاتی ہے ___ اور حدیث میں ہے کہ مغفرت مانگ کر گیا اور اب پھر زنا کیا پھر ندامت ہوئی پھر آیا یا ربّ پھر حق تعالیٰ فرمائیں گے اچھا اب بھی سمجھ گیا کہ ہے ربّ؟ پھر

مغفرت مانگنے سے پہلے مغفرت کر دیتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اے لوگو! تم گناہ کرتے کرتے تھک جاؤ گے۔ لیکن اللہ بخشتے بخشتے نہیں تھکیں گے۔ تمہارے گناہوں کی ایک حد ہے مگر اس کی رحمت کی کوئی حد ونہایت نہیں ہے ___ تو اس لئے یہ اصولاً فرمادیا کہ :

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَاباً

اس کے بعد ایک دوسرا معاملہ ارشاد فرمایا :

وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَاماً

رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ جب ان سے کوئی معاملہ پڑتا ہے تو وہ جھوٹ میں نہیں پڑتے۔ زُور کے معنی، جھوٹی گواہی دینے کے ہیں۔ تو رحمٰن کے بندے جھوٹی گواہیوں اور جھوٹی مقدمہ بازیوں میں نہیں پڑتے اور جب وہ لغو اور فضول مجلسوں سے گزرتے ہیں تو سادگی اور صفائی سے گزر جاتے ہیں، اُدھر متوجہ نہیں ہوتے۔ کِرام بن کے گزر جاتے ہیں۔

اور ان کی دعا ہر وقت یہ ہوتی ہے کہ :

وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا

”اے ہمارے پروردگار! ہمیں جو ہماری بیویوں سے اولاد دے وہ صالح اور پاک اولاد دے اور ہمیں صالح اور پاک لوگوں سے آگے چلنے والے بنا کہ ہم خود اپنی اولاد اور بیویوں کو راہ دکھلائیں“۔

اور یہ بھی فرمایا گیا :

وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمّاً وَعُمْيَاناً

اور ان کے دلوں پر دینی سمجھ اور علم اتنا ہوتا ہے کہ جب قرآن کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہوں تو فوراً قلب کی سلامتی کی وجہ سے اس کا مطلب سمجھتے ہیں۔ دین پر استقامت کی وجہ سے اس کا مطلب سمجھتے ہیں۔ دین پر استقامت کی وجہ سے ان میں سمجھ پیدا کر دی جاتی ہے۔ وہ ان آیات کو اندھے بہروں کی طرح قبول نہیں کرتے بلکہ سمجھ داری کے ساتھ شنوا و بینا ہو کر قبول کرتے ہیں۔ وہ مطلب سمجھتے ہیں جو اللہ کا مطلب ہے۔

رحمٰن کے بندوں کی معاد

آگے فرماتے ہیں:

أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ یہی وہ لوگ ہیں جن کو بالائی منزلوں میں اعلیٰ سے اعلیٰ بلڈنگیں عالم آخرت میں عطا کی جائیں گی۔ مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ محلات اور باغات ان کو عطا کئے جائیں گے اور ان کو اَبدی زندگی دی جائے گی گویا یہ ہماری مقامات معاد ہے جہاں ہم کو جانا ہے اور ایک وہ جگہ ہے جہاں سے ہم آئے تھے۔ یعنی اللہ کی ذاتِ بابرکات اور اس کا حکم۔ وہ ہمارے لئے مبداء تھا جس سے ہماری ابتدا ہوئی اور یہ (جزاء غرفات) ہماری معاد ہوگی اور بیچ میں زندگی گزارنے کا یہ طریقہ ہے کہ زبان، ہاتھ، پیر، روح اور مالیات کی بھی حفاظت ہو اور ہر چیز اللہ کے حکم کے مطابق صرف کرنے کا جذبہ ہمارے اندر رہو اور یہ جبھی ہوگا جب شریعت سامنے آئے۔ اس کا علم اور تعلیم ہمارے سامنے آئے جس کے ذریعے ہم ہاتھ، پیر، قلب، دماغ، روح

وغیرہ کو اس راستے پر ڈال سکیں۔

تو یہ جو ابتداء میں کہا گیا تھا کہ تین سوال ہیں اور فطرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ کہاں سے آئے؟ کہاں جائیں گے؟ کس طرح زندگی گزاریں؟ تو جہاں سے ہم آئے وہ اللہ ربّ العزّت کی ذاتِ بابرکات ہے جس کے امر سے آئے۔ اس کے وجود سے ہمیں پر تو ملا تو ہمارا وجود ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ ہو جا ہم ہو گئے۔ تو اصل اللہ کا حکم اور امر ہے اور کہاں جائیں گے؟ یہ معاد ہے کہ لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔ وہیں جا کر راحت مل سکتی ہے۔ اور بیچ میں ہم اس کے کہے کے مطابق زندگی گزاریں اور اس کا کہا ہوا کیسے سامنے آئے؟ اس کے رسول اس کا فرمایا ہوا لے کر آئے ہیں۔ جس کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں۔ جس پر ہم کو چلنا ہے۔ جب ان تینوں چیزوں پر آ جائیں، جبھی فطرت کو تسلی ہوتی ہے۔ اتنا آدمی اندھا رہے کہ اسے راستہ ہی نہ ملے جس کے اوپر وہ رہے اور یہ نہ پتہ ہو کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ بس یہ کہ دنیا یوں ہی چلتی آتی ہے۔ اس کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ اس کی فطرت میں سکون کبھی نہیں ہو گا۔

اسی طرح سے اگر کوئی یوں کہے کہ بس ایسے ہی چلتے رہیں گے نہ آخرت آئے گی نہ قیامت آئے گی نہ یہ عالم ختم ہو گا تو پھر یہ اُلجھن پیدا ہو گی کہ جس چیز کی ابتداء ہوتی ہے اس کی انتہا بھی ہوتی ہے۔ جب اس عالم کی ایک ابتداء ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ عالم کے ہر ہر جز کی ابتداء ہے تو کُل کی بھی ابتداء ہے۔ جب ابتداء ہے تو انتہا بھی ہو گی۔ گویا عقل اسے مجبور کرتی ہے کہ مان اور اس کا نفس مجبور کرتا ہے کہ نہ مان، تو سکون پیدا نہیں ہو گا۔ لیکن اگر مان لیتا ہے تو سکون قلب پیدا ہو جاتا ہے کہ آدمی ایک راستے پر لگ گیا اسے پھر طمانینت اور بشاشت حاصل ہو جاتی ہے۔

اس واسطے اس رکوع کی میں نے تفسیر کی۔ بس یہی تقریر تھی اور یہی تفسیر بھی تھی اس میں میں نے وہ جوابات عرض کئے جس سے فطرت کو تسلی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلائے اور اپنی بھیجی ہوئی راہ پر لگا دے اور انبیاء علیہم السلام اور سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پیروی ہمیں نصیب فرما دے۔ آپ کی زندگی پر ہماری زندگیوں کو منطبق بنا دے۔ ظاہر و باطن ہمارا ایسا بنا دے جس سے اللہ راضی اور خوش ہو۔ ہمارے قلوب کے اندر اطمینان اور سکون پیدا فرما دے اور انجام ہمارا بخیر فرمائے۔ آخرت ہماری درست فرمائے۔ دنیا ہماری صالح فرمائے۔ ہر مصیبت کو دفع فرمائے۔ جن مشکلات میں ہم مبتلا ہیں، ان سے رہائی نصیب فرما دے۔ آمین

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

تعارفِ اہلِ حق

انبیاء علیہم السلام کا روحانی ترکہ علم اور کمال ہے۔ وہ جب ملے گا' جب روحانی نسب نامہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہوا ہو کہ میرا شیخ یہ' اس کا شیخ یہ' اس کا آگے شیخ وہ ___ سلسلے سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد ثابت ہو تو ترکہ ملے گا۔ اور اگر بیچ میں کوئی کڑی کٹ گئی اور سلسلہ متصل نہ پہنچا' تو وہ ایسا ہے کہ جیسے بے باپ کی اولاد ہو۔ کہ بیچ میں باپ ہی ندارد ہے۔ پھر ترکہ کہاں سے مل جائے گا؟ یہ اس لیے کہ علمی وراثت نسبت سے ملتی ہے۔ جیسا کہ مال و دولت کی وراثت نسب سے ملتی ہے۔ یہ نسب مادی ہے وہ روحانی نسب ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ

بعد از خطبہ مسنونہ

اما بعد - فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم - بسم اللہ الرحمن الرحیم - والذی اوحینا الیك من الکتٰب ھو الحق مصدقا لما بین یدیه - ان اللہ بعبادہ لخبیر بصیر - ثم اورثنا الکتٰب الذین اصطفینا من عبادنا - فمنھم ظالم لنفسه - ومنھم مقتصد ومنھم سابق بالخیرات باذن اللہ - ذلك ھو الفضل الکبیر -

صدق اللہ العلی العظیم (پ ۲۲ فاطر ع ۴)

کچھ اپنے بارے میں

بزرگانِ محترم!

اس مجمع خیر و برکت میں جس میں بہت سے حضرات کی نورانی شکلیں اسٹیج پر اور اسٹیج سے نیچے بھی ہیں۔ بہت سے وہ لوگ بھی ہیں کہ ان کے چہرے مہرے سے دین ٹپک رہا ہے۔ دین کی علامتیں نمایاں ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اندر سے باہر تک وہ دین کے دلدادہ ہیں۔ انہیں حضرات میں ممکن ہے کہ کچھ ایسے لوگ بھی ہوں' جو ہم سے کچھ حسنِ ظن نہ رکھتے ہوں' کچھ خیالات کا تفاوت رکھتے ہوں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنا

---

[1] انگلستان۔

تعارف خود کرادوں۔ تاکہ اِشتباہ باقی نہ رہے اور جسے ہماری بات سنی اور ماننی ہو بصیرت کے ساتھ مانے اور نہ مانے تو نہ مانے۔ مگر ہم اِشتباہ میں نہ ڈالیں۔

اس سپاسنامے میں یا نظم میں 'یا حضرت العلاّم دام ظلہٗ کی زبان پر جو چیزیں بطورِ تعارف کہی گئی ہیں۔ وہ حقیقت میں میرا تعارف نہیں تھا۔ انہوں نے یہ اپنا تعارف کرایا ہے اس ناکارہ کے لئے اپنی عالی ظرفی 'اپنی عالی حوصلگی 'اپنی اُولو العزمی اور اپنی ذرہ نوازی و خورد نوازی کا تعارف کرایا ہے۔ یہ ان کا تعارف تھا۔ میرا تعارف نہیں تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنا تعارف خود کرادوں۔

معیارِ تعارف اہلِ حق

لیکن تعارف سے پہلے یہ ضروری ہے کہ تعارف کا کوئی معیار تو ذکر کیا جائے۔ جس کی رو سے یہ پرکھا جائے کہ یہ آدمی سچ کہہ رہا ہے یا غلط کہہ رہا ہے۔ ہمارے لئے کوئی کسوٹی ہونی چاہئے۔ جس پر پرکھ کر ہم یہ کہیں کہ فلاں کی بات سچی ہے یا غلط؟

تو پہلی چیز تعارف اور تعارف سے بھی پہلی چیز تعارف کا معیار اور کسوٹی ہے۔ اس لئے میں نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی ہے۔ جس میں حق و باطل کا معیار ذکر کیا گیا ہے۔ جس کی رو سے یہ پرکھا جاسکتا ہے کہ کس کا قول حق ہے کس کا قول غلط ہے۔ کون سچی بات کہہ رہا ہے اور کون بات ہی بنا رہا ہے ___ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ کے سامنے اس آیت کا ترجمہ کردوں۔ اس کے بعد پھر اس کی تشریح عرض کردوں۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ ھُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ

اے پیغمبر! اللہ ہی وہ ذات جس نے آپ کی طرف وحی کی 'علم قطعی بھیجا اور اپنی کتاب آپؐ کے اوپر اتاری۔ تو جو اللہ نے کتاب کی صورت میں آپ کی طرف وحی کی ہے۔ سچی وہی ہے۔ وہ کسی کے حق و باطل کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ لوگ سامنے ہوں یا گرد و پیش میں ہوں ان کو اگر کچھ پرکھنا ہے تو رائے سے نہ پرکھا جائے' محض عقل سے نہ پرکھا جائے۔ بلکہ اس کسوٹی پر پرکھا جائے جو حق تعالیٰ نے نازل فرمائی' ھُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ یہ ہماری کتاب ہے 'جو حق اور سچی ہے اور تمہارے سامنے اور تمہارے گرد و پیش کے حالات کی تصدیق اور تکذیب کا معیار ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ کتاب بھی آگئی اور پیغمبر بھی آگئے اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔ وہ تعلیم دے کر پردہ فرماگئے۔ تو کیا آگے دین ختم ہوگیا؟ اس لئے فرمایا :

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا

ہم نے اس پر بس نہیں کی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسے لوگوں کو وارث بنایا کہ جن کو وراثت میں یہ کتاب اللہ ملی اور وراثت میں یہ حق ملا اور جنہوں نے اس حق کو قبول کیا اور وہ بھی ایک زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ قیامت تک کا وعدہ دیا کہ وہ آتے رہیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ۔ ینفون عنہ تحریف الغالین۔
وانتحال المبطلین وتاویل الجاھلین

ہمیشہ سلف کے بعد خلف کھڑے ہوں گے، جو اس علم کو لیتے رہیں گے، جو سلفِ صالحین لے کر آئے تھے اور اس علم کی روشنی سے غلو کرنے والوں کی تحریفات کا پردہ چاک کریں گے۔ دروغ بافوں کی دروغ بافیوں کا پردہ چاک کریں گے۔ جاہلانہ اور رکیک تاویلات کا پردہ چاک کریں گے۔ تو قیامت تک یہ دین اصل حالت میں باقی رہے گا اور اسی طرح چلتا رہے گا۔

ایک طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاع دی کہ :

ان اللّٰہ یبعث لھٰذہ الامۃ علٰی رأس کلّ مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا

ہر قرن کے بعد جب دوسرا قرن شروع ہوگا۔ تو اللہ ایسے لوگ بھیجے گا، جو دین کی تجدید کریں گے، اس کو نکھار دیں گے اور جتنی رکیک تاویلات تھیں، ان کو کھول کر الگ کردیں گے اور دین پھر اصل حالت میں آجائے گا۔ ہر قرن پر ایسے لوگ آئیں گے جن کا نام مجدِّد ہے۔

قرن کی قید اس لئے لگائی کہ قرن عموماً سو سال کی مدت کو کہتے ہیں اور سو سال میں ایک نسل ختم ہوجاتی ہے۔ اگلی نسل شروع ہوتی ہے نئی نسل آتی ہے تو کچھ نئے نظریات بھی آتے ہیں، نئے افکار پیدا ہوتے ہیں، نئے حوادث اور واقعات سے دنیا دوچار ہوتی ہے۔ اس وقت ممکن تھا کہ نئے نظریات اور نئے افکار کی وجہ سے دین دب جائے یا ختم ہوجائے یا مشتبہ ہوجائے اس لئے اللہ نے ہر قرن پر ایک مجدّد رکھا۔ تاکہ ان نئے نظریات کے اندر دین کو پھر نکھار دے اور انہی نظریات کے مطابق ایسے دلائل کو پیش کرے کہ دین پھر تازہ بتازہ ہوجائے اور نئے افکار کا کوئی اثر دین کے اوپر نہ پڑے۔ تو ہر قرن پر وعدہ دیا۔

اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ :

لا تزال طائفۃ من امتی منصورین علی الحق لایضرھم من خذلھم ولا من خالفھم حتی یاتی امر اللّٰہ۔

"میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت باقی رہے گی، جو وہی چیز کہے گی جو میں نے کہی، وہی عمل کرکے دکھلائے گی جس نوع کا عمل میں نے کیا ہے۔ انہیں رسوا کرنے والے رسوا نہیں کرسکیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ کا امر آجائے اور دنیا ختم ہوجائے"۔

دین اسی رنگ میں باقی رہے گا۔ اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوگا تو پوری امت کے لئے وعدہ دیا کہ ایک جماعتِ حقہ قائم رہے گی۔ ہر قرن پر وعدہ دیا کہ مجدّد آئیں گے پھر قرن کے اندر وعدہ دیا کہ سلف کے بعد خلف آئیں گے، جو علم لیتے رہیں گے اور سلسلہ علم کا منقطع نہیں ہوگا تو فرمایا کہ :

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا

نبی کے بعد اور کتاب کے کامل اتر آنے کے بعد ہم ایسی قوم اور ایسے افراد کو وارث بنائیں گے، جن کو ہم منتخب کریں گے اور پسند کریں گے۔ لوگوں کی رائے پر نہیں ہوگا کہ وہ کہیں یہ مجدِّد ہیں، یہ معظَّم ہیں۔ ہم قلوب میں براہ راست ڈالیں گے کہ حق کہنے والے یہ ہیں۔

دین نقلی ہے عقلی اور اختراعی نہیں ہے

بہرحال اس سے اتنی بات معلوم ہوئی کہ دین نقلی اور روایتی ہے، عقلی اور اختراعی نہیں ہے۔ یعنی دین اللہ کی طرف سے آیا ہوا ہے۔ کسی پارٹی یا مجلس کا ریزرویشن نہیں ہے۔ جنہوں نے بیٹھ کر دین بنالیا ہو، بلکہ

اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعہ آیا ہوا ہے۔ عقلی اختراعات دین کی بنیاد نہیں ہیں۔ نقل و روایت دین کی بنیاد ہے۔ اس لئے دین کی جب بھی کوئی بات سامنے آئے گی تو پہلا مطالبہ یہ نہیں ہو گا کہ تم عقل سے اس سے کیا سمجھے؟ تم نے اپنے فکر سے کیا جانا؟ اللہ کی وحی کے مقابلے میں ہمارا فکر کیا چیز ہے؟ اور ہماری عقل نارسا کیا ہے کہ اس معیار پر دین کو پرکھا جائے' دین معیار ہے جس پر ہماری عقلوں کو پرکھا جائے گا کہ یہ عقل ناقص ہے یا کامل' اس میں کھوٹ ہے یا اصلیت تو دین معیار بنے گا' عقل معیار نہیں بنے گی۔ عقل کو دین اور وحیِ خداوندی کی غلامی کرنی پڑے گی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ دین روایتی اور نقلی ہے۔ عقلی اور اختراعی نہیں ہیں

نقلی کے معنیٰ یہاں وہ نہیں جو ہماری اردو میں بولے جاتے ہیں۔ اردو میں نقلی اصلی کے مقابلے میں آتا ہے کہ یہ چیز اصل ہے۔ اور یہ چیز نقل ہے۔ اس میں اصلیت ہے اور اس میں ملمع سازی ہے نقلی کے یہ معنیٰ نہیں ہیں۔ نقلی کے معنیٰ روایت سے منتقل ہونے والی چیز کے ہیں۔ تو دین روایت کے ذریعے سے منتقل ہونے والی چیز ہے۔ عقل کی تجویز سے دین نہیں بنا۔

دین ایک غیبی حقیقت ہے' عقل اس کی موجد نہیں ہو سکتی

وجہ اس کی یہ ہے کہ دین **الطریق الموصل الی اللّٰہ** کا نام ہے' وہ راستہ جو بندے کو اللہ تک پہنچائے' ظاہر ہے کہ بندہ جب اللہ کی طرف جائے گا تو راستہ اتنا لمبا اتنا کٹھن ہے کہ جب تک اللہ ہی نہ بتلائے کہ یہ میرا راستہ ہے۔ یہ اس راستے کو نہیں سمجھ سکتا۔ حق تعالیٰ نے اپنا راستہ خود بتلایا کہ یہ میرا طریق ہے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ

یہ میرا سیدھا راستہ ہے' اس کی پیروی کرو اور بعد میں جو عقلی اختراعات سے نئے نئے راستے نکلے ہیں۔ ان کی پیروی مت کرو۔ ورنہ تشتّت' پراگندگی اور پارٹی بازی میں پڑ جاؤ گے۔ اصل دین کی تلاش کرو۔ تو **الطریق الموصل الی اللّٰہ** جو اللہ تک پہنچانے والا راستہ ہو۔ اللہ ہی بتائے گا جب اس کی مرضیات معلوم ہوں گی تو خدا کی مرضی عقل سے نہیں سمجھ سکتے اور محض گریبان میں منہ ڈال کر ہم پتہ نہیں چلا سکتے کہ اللہ کس چیز سے راضی ہے اور کس چیز سے نہیں۔

دو حقیقی بھائی ہوں۔ جنہوں نے ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے ہوں۔ وہ سینہ سے سینہ ملا کر بیٹھ جائیں مگر ایک کے قلب کی بات دوسرے کے قلب میں نہیں آئے گی۔ جب تک وہی خود نہ بتائے کہ میرے ضمیر میں یہ بات چھپی ہوئی ہے تو دو انسان ایک نوع' ایک جنس اور ایک اصل کی دو شاخیں' ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے۔ لیکن جب تک ایک ظاہر نہ کرے' دوسرا اس کے باطن کی بات کو نہیں سمجھ سکتا۔ تو اللہ ربّ العزّت کے باطن سے جو چلی ہے' اسے محض دور بیٹھ کر ہم کیسے سمجھ لیں گے؟ جب تک وہ خود نہ ظاہر کرے تو اس کی مرضی و نامرضی کا پتہ اسی کے کلام سے چل سکتا ہے ہماری عقل سے پتہ نہیں چل سکتا۔ عقل زیادہ سے زیادہ اس آگ پانی کے گھروندے میں کام کرے گی۔ محسوسات تک پہنچے گی اور محسوسات تک پہنچتی ہوئی بھی ٹھوکریں کھائے گی جو عقل محسوسات کے دائرے میں بھی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ وہ غیب کی چیزیں کس طرح سے جان لے گی۔ وہ اس کا دائرہ ہی نہیں۔ وہ اپنے دائرہ کی بات کرے گی۔

آپ کی آنکھ ہے' وہ شکلیں اور صورتیں دیکھ سکتی ہے۔ کان ہیں' وہ آواز سن سکتے ہیں۔ زبان ہے جو ذائقے چکھ سکتی ہے اور یہ سب چیزیں دو تین انچ کے اندر جمع ہیں۔ لیکن آنکھ کے دائرے میں کان قدم نہیں رکھ سکتا کہ کان یوں چاہے' میں صورتیں دیکھ لوں' نہیں ہو سکتا۔ آنکھ چاہے کہ میں آوازیں سن لوں' تو کان

کی طرف آنکھ کو رجوع کرنا پڑے گا۔ آنکھ صورتیں دیکھنے کے لئے ہے' آوازیں سننے کے لئے نہیں۔ اگر آپ ذائقہ چکھیں گے تو آنکھ لاکھ کوشش کرے کہ میں کھٹا میٹھا سمجھ لوں' نہیں سمجھ سکے گی ___ تو اس چہرے میں دو انچ کے فاصلے پر ساری قوتیں جمع ہیں۔ مگر ایک قوت دوسری قوت کے دائرے میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ اسی دائرے میں جانا پڑے گا۔ اس سے اوپر عقل کا درجہ ہے تو اگر آپ عقل سے یہ چاہیں کہ غیب کی چیزیں معلوم کروں۔ تو عقل کی دوڑ صرف محسوسات تک ہے' وہ مغیبات تک نہیں پہنچ سکتی۔ وہ علم کی موجد و ایجاد کنندہ نہیں ہے۔ وہ دریافت کنندہ ہے کہ علم سامنے آئے تو اس سے کچھ اصول نکال لے۔ کچھ جزئیات سامنے آئیں تو کلیات نکال لے۔ لیکن خود اصول و جزئیات بنا لے یا واقعہ بنا دے تو عقل موجد نہیں ہے۔ جو واقعات کی ایجاد کرے۔ پیدا شدہ واقعات میں عقل غور کر سکتی ہے' مگر واقعات کو پیدا نہیں کر سکتی۔ دین اللہ کی خبر اور حقیقت غیبی ہے۔ اسے نہ عقل بنا سکتی ہے نہ اس میں اختراع کر سکتی ہے۔ اس کا تو اسے ساتھ دینا پڑے گا۔ غلامی کرنی پڑے گی۔

عقل کو مغیبات میں وحی کا اِتباع ضروری ہے

عقل کو اسلام نے بیکار نہیں ٹھہرایا' یہ بہت کار آمد ہے۔ اللہ نے عقل کے فضائل بیان کئے اور فرمایا' **اول ما خلق اللّٰہ العقل** سب سے پہلے اللہ نے عقل کو پیدا کیا اور فرمایا' **اَقْبِلْ** سامنے آ' وہ سامنے آئی فرمایا' **اَدْبِرْ** پشت پھیر۔ اس نے پشت پھیری۔ فرمایا' تو ہی ہے جس کے ذریعے سے میں بہت لوگوں کو عزت دوں گا اور بہت کو ذلیل کروں گا۔ تو عقل کوئی بے کار چیز نہیں۔ لیکن اپنے ہی دائرے میں کام دے گی۔ آنکھ بے کار چیز نہیں۔ مگر صورت ہی میں کام دے گی' آوازیں نہیں سنے گی' کان بے کار نہیں ہیں۔ مگر خوشبو نہیں سونگھیں گے۔ اپنے دائرے میں کام کریں گے۔ عقل بھی اپنے دائرے میں کام کرے گی۔ عقل سے بالاتر جب **مغیبات** کی چیزیں آئیں گی۔ وہاں وحی اور خدا کی طرف رجوع کرنا پڑے گا کہ اللہ جو غیب کی چیزیں بتلائے وہ ہم مانیں گے۔ آپ کی عقل دنیا کی چیزوں میں اختراعات کر سکتی ہے لیکن یہ پتہ نہیں دے سکتی کہ عرشِ عظیم کیسا ہے یہ نہیں بتا سکتی کہ کرسی کی شان کیسی ہے۔ جس کی قرآن کریم نے خبر دی۔ جنت کی نعمتیں کیا ہیں؟ جہنم کے عذاب کی کیا کیفیت ہے۔ یہ عقل کا دائرہ ہی نہیں ہے جو لوگ عقل سے اس دائرے کو سمجھنا چاہتے ہیں' وہ ایسے ہیں جیسے آنکھ سے خوشبو سونگھنا چاہیں۔ کان سے صورتیں دیکھنا چاہیں۔ ان کی عقل کے اوپر ماتم کیا جائے گا۔ اسی طرح ان کی عقلوں پر بھی ماتم کیا جائے گا جو غیبی چیزوں کے دائرے میں عقل کو لڑائیں۔ جہاں اس کی رسائی نہیں ہے۔ اس لئے لامحالہ عقل کو غیبی اُمور میں اِتباع کرنا پڑے گا۔ ہاں اس دائرہ میں رہ کر پھر عقل موشگافیاں کرے گی۔ طرح طرح کے نکتے پیدا کرے گی۔ لیکن مقصد کو پیدا کر دے' یہ کام عقل کا نہیں۔ مقصد معلوم کر کے اس کی تشریح کرے گی۔ اس میں سے نئے نئے علوم پیدا کرے گی۔

قرآن کریم کو حق تعالیٰ نے علیٰ وجہِ البصیرت ماننے کی دعوت دی ہے۔

بہرحال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دین روایتی اور نقلی چیز ہے۔ جو منتقل ہو کر آیا ہے' عقلی اور اختراعی نہیں ہے۔ اس لئے جب بھی کوئی دین کا دعویٰ کرے گا۔ تو سب سے پہلے سند کا مطالبہ کیا جائے گا کہ یہ چیز تم تک کیسے پہنچی؟ کس راستے سے پہنچی؟ روایت کرنے والے کون ہیں؟ ان کا کردار اور کیریکٹر کیا ہے؟

قرآن کریم اللہ کا کلام ہے لیکن اس کے باوجود حق تعالیٰ نے اس کی سند کا اہتمام فرمایا۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ہمارا کلام ہے۔ ہم دباؤ ڈالتے ہیں تمہیں ماننا پڑے گا۔ بلکہ فنی طور پر اس کی سند بیان کی کہ سند کے ساتھ جب یہ ثابت ہو گا کہ یہ کلامِ خداوندی ہے' پھر ماننا فرض ہے۔ اس سے پہلے ہم دباؤ سے منوالیں کہ اللہ کا کلام ہے۔ لہٰذا مانو' ہم یہ زور نہیں ڈالتے' ہم فنی طور پر سمجھائیں گے۔ اس قرآن کریم کے اللہ سے آنے تک سند کے دو مرتبے ہیں۔ ایک اللہ سے رسول تک اور ایک پھر رسول سے ہم تک۔ سند کے دو دائرے ہیں' دونوں دائروں میں حق تعالیٰ نے ہماری تسلی فرمائی ہے کہ سندِ متّصل کے ساتھ پہلے اس کو سمجھ لو کہ یہ ہمارا کلام ہے۔ پھر ماننے نہ ماننے کا فیصلہ کرو۔ محض عقل اور خود رائی سے فیصلہ مت کرو۔

پہلی سند کہ اللہ سے کس نے کلام سنا ہے؟ اور کون ہے جو نبیؐ تک لے کر آیا؟ اس سند کو حق تعالیٰ نے تفصیل سے بیان فرمایا اور تفصیل بھی فنی طور پر کی۔ یعنی راویوں کے جو اوصاف ہیں۔ جن سے ان کی روایت معتبر ہوتی ہے۔ ان کا کردار جس سے بات سچی سمجھی جائے وہ بیان کی۔ یہ نہیں کہا کہ ہمارا کلام ہے۔ تم ماننے کے لئے مجبور ہو ___ مثلاً حضرت جبرئیل علیہ السلام بیچ میں واسطہ ہیں۔ جو اُولو العزم فرشتوں میں سے ہیں۔ سید الملائکہ ان کا لقب ہے۔ وہ واسطہ ہیں تو اللہ کا نام اَمین ہے' جبرئیل علیہ السلام کا لقب اَمین ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب بھی اَمین ہے۔ تو اَمین سے کلام چلا' اَمین کے واسطے سے آیا' اَمین پر اُترا۔ یہ جو بیچ میں اَمین ہے۔ اس کے اوصاف کیا ہیں؟ حق تعالیٰ نے اسے ظاہر فرمایا اور سورۃ اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ میں اس کی تفصیل فرمائی ___ قرآن کریم کے بارے میں فرمایا کہ :

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿التکویر:۱۹﴾

جبرئیل علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ایک رسولِ کریم کا قول اور اس کا پڑھایا ہوا ہے ___ تو اوّل تو رسول کا لفظ استعمال کیا کہ جو کلام لے کر آیا' وہ ہمارا قاصد ہے ___ ظاہر بات ہے کہ سفیر یا قاصد' حکومت اسے بناتی ہے ، جس پر پورا اعتماد اور اطمینان ہو اس میں بغاوت کی بُو تک نہ ہو۔ حکومت کی ساری پالیسیوں کا دلدادہ اور ان کا اَمین ہو۔ اگر گورنمنٹ کو ذرا بھی یہ شبہ ہو جائے کہ جس کو سفیر بنا کر دوسرے مُلک میں بھیجا جا رہا ہے' وہ قابلِ اعتماد نہیں ہے یا اس کے اندر کچھ سرکشی کی خوبو ہے۔ وہ کبھی بھی سفیر نہیں بنایا جائے گا۔ تو اللہ کی گورنمنٹ نے بھی اپنے کلام کے لئے ایسا سفیر و قاصد بنایا' جس کے اوصاف خود حق تعالیٰ بیان فرما رہے ہیں۔ اس سے زیادہ اَمین اور کون ہو گا۔ اس سلسلے میں پہلا لفظ تو یہ فرمایا کہ یہ کلام رسول کا ہے۔ رسول کے معنی ہی پاکباز کے ہیں۔ قاصدِ خداوندی کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ پاکیزہ ہیں۔ اس کے اندر سرکشی کی بو نہ ہو' بغاوت کا رنگ ذرہ برابر نہ ہو۔ اس لئے اوّل رسول کہنا' یہ خود ان کی تصدیق اور توثیق ہے۔ جو شخصیت ہمارا قرآن لے کر آئی ہے یہ باوثوق ہے۔

پھر رسول کے آگے کریم کا لفظ بھی بولا کہ رسول کرامت اور بزرگی والا ہے۔ دیکھا جائے تو رسول کے لفظ میں ہی ساری بزرگیاں آجاتی ہیں اور جب آگے یہ بھی فرمایا کہ کریمُ النفس ہے تو دو وصف جمع ہو گئے کہ اللہ کا قاصد اور اپنی ذات سے کریمُ النفس۔ اس کے اندر کوئی خدشہ نہیں' بغاوت کی بو نہیں۔

ہو سکتا ہے کوئی شخص کہے کہ رسول بھی ہو' قاصد بھی ہو' کریمُ النفس بھی ہو' لیکن دبّو قسم کا ضعیف آدمی ہو' پیام لے کے آیا۔ قوم نے جھڑ جھڑا کے کہا' کیا کہا تو نے؟ اپنی بزدلی اور کمزوری کی وجہ سے ڈر کے کہہ دے کہ جی میں یہ نہیں یہ کہہ رہا تھا' تو ہو سکتا ہے کوئی یوں کہے کہ جبرئیل علیہ السلام تو رسول تھے اور کریمُ النفس بھی تھے۔ مگر ضعیف اور دبّو قسم کے آدمی تھے۔ کیا اعتبار ہے۔ انہوں نے کلام کو بدل دیا ہو۔ اس لئے

ایک جملہ آگے بڑھایا فرمایا:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِىْ قُوَّةٍ

طاقت ور فرشتہ ہے۔ ضعیف نہیں ہے کہ کوئی اسے دبا لے۔ کوئی اسے دھمکی دے اور جو چاہے کہلوا لے تو کریمُ النفس رسول کا قول ہے جو طاقت ور ہے

جیسا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قوم لوط پر جب عذاب خداوندی نازل ہوا تو مجھے امر فرمایا گیا۔ میں نے ان کی ساری بستیاں ہتھیلی پر اوپر لے جاکر پلٹ دیں اور پوری قوم تباہ ہوگئی۔ یہ اس فرشتے کی طاقت ہے۔ ایسا آدمی دب کر کلام بدل سکتا ہے۔ جس کی یہ طاقت ہو؟ یہ عقلی طور پر بھی ناممکن ہے کہ وہ کسی سے دب کر کلام کہہ دے۔ جیسے بعض لوگوں کے متعلق مشہور ہے کہ نیک تو تھے۔ مگر ضعیف قسم کے تھے۔ انہوں نے آکر کہا کہ بھئی! سچی بات تو یہ ہے کہ دوسرے نے لاٹھی اٹھائی۔ اس نے کہا نہیں نہیں۔ میرا مطلب تو یہ تھا' یہ نہیں تھا جان بچانے کے لئے بات بدل دی۔ تو جبرئیل علیہ السلام ان میں سے نہیں ہیں۔

اس کے بعد ممکن ہے کوئی یوں کہے کہ جبرئیل رسول بھی ہیں' کریمُ النفس بھی ہیں' طاقت ور بھی ہیں۔ مگر اللہ کا کلام بہت دور سے سنا' معلوم نہیں صحیح سنا بھی یا غلط سنا' کچھ کا کچھ سمجھ گئے ہوں۔ کچھ کی کچھ بات کان میں پڑ گئی ہو۔ تو ایسے راوی کی روایت کا کیا اعتبار' چاہے وہ کتنا ہی نیک اور صالح ہو۔ مگر دس میل سے بات سن رہا ہے۔ کیا خبر پوری بات کان میں پڑی بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ایک جملہ اور بڑھایا کہ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ان کا مقام عرش والے کے پاس ہے کہیں دور نہیں ہے۔ اس لئے وہ ہمارا کلام قریب سے سنتے ہیں' کہیں دور سے نہیں سنتے کہ آواز کے سننے میں فرق پڑ جائے ___ اگر کوئی راوی روایت کرے اور اسے اپنے شیخ سے ملاقات نصیب نہ ہو۔ اس کی روایت قابل قبول نہیں ہوتی یا ملاقات ہو مگر دور سے ایک آواز سنی' دس احتمال ہیں کہ صحیح آواز پہنچی یا نہیں پہنچی۔ اس لئے راوی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے شیخ کے قریب ہو تاکہ پوری طرح سے سن کر آئندہ روایت کر سکے۔ اس میں کوئی کمی بیشی نہ ہو۔

اب کوئی شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ ہم نے مان لیا کہ جبرئیل رسول بھی ہیں' بہت پارسا ہیں' کریمُ النفس بھی ہیں' ان پر کریمی برستی ہے' طاقت ور بھی ہیں اور عرش والے کے پاس مقیم بھی ہیں' کہیں دور سے نہیں سنا ___ لیکن ان کے پاس کوئی عہدہ نہیں ہے۔ اس لئے ان کا وقار اور حیثیت عرفی کچھ نہیں ہے۔ لوگ اعتماد کیسے کریں؟

اس لئے کہ کلام میں حیثیت عرفی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ وہی بات میں کہوں اور وہی بات آپ کے انگلستان کی ملکہ کہے۔ اس کا اور اثر ہوگا۔ بادشاہ یا وزیر اعظم اگر بات کرے تو عالم کی سیاست کی بساط اُلٹ جاتی ہے۔ اس کے معنیٰ نکلتے ہیں' حکومتیں اس سے نتائج مرتب کرتی ہیں۔ وہی کلام میں بولوں' کوئی اثر نہیں کہ ہاں بھئی! اچھی بات ہے ایک نیک آدمی نے کہا ہے۔ ٹھیک کہا ہوگا۔ تو وہی کلام صاحب حیثیت کہے اور وہی کلام بے حیثیت کہے۔ اثرات میں فرق پڑ جاتا ہے ___ اس بنا پر جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں کوئی یوں کہے کہ ان کی کوئی حیثیت عرفی نہیں ہے۔ اس لئے آگے فرمایا' مُطَاعٍ وہ سید الملائکہ ہیں۔ سارے ملائکہ ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ آسمانوں میں ان کی سرداری مسلّمہ ہے۔ تو سارے ملائکہ جن کی شان یہ ہے کہ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ اللہ کے پاکیزہ بندے ہیں۔ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ وہ عمل کرنے کے لئے اللہ کے قول کا انتظار نہیں کرتے ہیں۔ منشاء دیکھتے ہیں کہ منشاء خداوندی کیا ہے اور اطاعت میں جھک پڑتے ہیں اور لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ کبھی انہوں نے

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی۔ جو امر کیا جاتا ہے اسی کی اطاعت کرتے ہیں۔ اپنی طرف سے اضافہ وکمی نہیں کرتے۔ تو سارے ملائکہ کمال امانت وکمال دیانت کے پیکر ہیں۔ ان ملائکہ کے سردار جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ تو اتنے پاکباز بندے کسی کی سرداری کو کیسے مان سکتے تھے جب تک کہ اس کی حیثیت اعلیٰ نہ ہو ___ آپ ذرا سا ایک امیر بنائیں تو اس کی خصوصیت دیکھتے ہیں۔ امیر حکومت اور بادشاہ الگ چیز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امامت کے سلسلے میں دیکھیں کہ کسی کو آپ امام بنائیں گے تو خیال کریں گے کہ اس میں کوئی ایسی خصوصیت ہونی چاہئے کہ مقتدی اس کی اقتدا کرتے ہوئے کراہت نہ کریں۔

جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ:

یؤم القوم اقرأھم لکتاب اللّٰہ

”امام اسے بناؤ جو سب سے زیادہ قرآن جانتا ہو“۔

فان کانوا فی القرأۃ سواء اگر قرآن دانی اور قرأت میں سب برابر ہیں۔ تو **فاعلمھم بالسنۃ** جو سنت کا علم زیادہ رکھتا ہو اسے امام بناؤ اور اگر قرآن اور سنت میں سب برابر ہیں، پھر اسے بناؤ جو مسائل صلوٰۃ سے پورا واقف اور کامل العلم ہو۔ حتیٰ کہ لکھتے ہیں، اگر اس میں بھی سب برابر ہوں، علم اور اخلاق میں بھی سب یکساں پھر اسے بناؤ جو زیادہ خوبصورت اور حسین وجمیل ہو۔ مقصد یہ ہے کہ اقتدا کرنے والوں میں کوئی گریز اور اعراض پیدا نہ ہو۔ تو جس کو آپ نماز کا امام بنائیں گے، اس میں بھی خصوصیات کا خیال کریں گے۔ اگر آپ کسی کو ملک اور قوم کا امام بنانے لگیں۔ تو اس میں کیا کسی خصوصیت کی رعایت نہیں کی جائے گی؟ سب سے زیادہ رعایت کی جائے گی ___ حق تعالیٰ نے تمام ملائکہ کا حضرت جبرئیل علیہ السلام کو سردار بنایا اور ملائکہ وہ ہیں کہ عفت، عصمت اور پاکدامنی میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ اگر جبرئیل علیہ السلام کی کوئی خصوصیت نہ ہوتی، ملائکہ ان کی اقتدا نہ کر سکتے۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ جبرئیل صاحبِ حیثیت ہیں۔ اسی کو حق تعالیٰ نے فرمایا، مُطَاعٍ وہ واجبُ الاطاعت بھی ہیں۔ یہ نہیں کہ ایرا غیرا ہم نے اپنا نائب یا سفیر بنا دیا۔ ایسا نہیں، بلکہ تمام آسمانوں میں واجبُ الاطاعت ہیں۔ سید الملائکہ ہیں ___ تو اب گویا جبرئیل امین، رسول، کریمُ النفس، طاقت ور، عرش کے پاس مقیم اور واجب الاطاعت بھی ہیں۔ لیکن اب کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ ساری باتیں مان لیں۔ مگر بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وصف امانت میں کوئی خرابی ہوتی ہے ان تمام اوصاف کے باوجود یہ کمی ہے کہ رازداری کے اندر کچھ زیادہ کامل نہیں ___ بعض لوگ نیک اور صالح ہوتے ہیں۔ مگر پیٹ ان کا ذرا ہلکا ہوتا ہے۔ ان سے کوئی رازداری کی بات کہو، وہ چند دن میں دنیا جان لیتی ہے اور راز فاش ہو جاتا ہے، نیکی اور بزرگی میں کلام نہیں۔ مگر پیٹ کا ہلکا ہونا اور چیز ہے۔

جیسے ہمارے ہاں دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا حبیبُ الرّحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو مجھ سے پہلے مہتمم تھے۔ وفات کے دن چند باتیں بطور وصیت مجھ سے فرمائیں۔ ایک بزرگ کا نام لے کر فرمایا، جو ہمارے استاذوں میں ہیں۔ نہایت، پارسا، متقی اور صالح۔ فرمایا ان کو راز کی بات کبھی مت کہنا۔ اگر راز فاش کرنا ہو، تب تو کہنا اور اگر چھپانا ہو، تو ہرگز مت کہنا تو ساری خوبیاں تھیں۔ مگر پیٹ کے ہلکے تھے۔ جس چیز کا افشاء کرانا ہو۔ بس ان سے کہہ دو۔ اگلے دن وہ سارے بازار میں مشہور۔ وہ ایک ایک کے کان میں ڈال دیتے تھے۔ غرض سارے اوصاف کے باوجود پیٹ کا ہلکا ہونا ہو سکتا ہے۔ اس لئے ایک جملہ اور فرمایا، ثَمَّ اَمِیْنٍ۔ وہ امانت میں بھی کامل ہیں، گھٹیا درجے کے نہیں۔ تو رسول، کریم، واجبُ الاطاعت، عرش والے کے پاس مقیم بھی ہیں اور ساتھ ساتھ امانت دار بھی ہیں حتیٰ کہ ان کا لقب ہی جبرئیل امین ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ جب راوی میں یہ اوصاف ہوں کہ رسالت و بزرگی الگ صلاح و تقویٰ الگ اور قرب خداوندی الگ۔ تو کیا وجہ ہے کہ ان کی روایت کو نہ مانا جائے اور ٹھکرایا جائے۔ اگر پھر بھی کوئی ٹھکرائے۔ اس کے اوپر عقل خود ملامت کرے گی کہ یہ عقلی اصول کے خلاف ہے۔ روایت کے بارے میں راوی کے کیریکٹر اور کردار کو دیکھا جاتا ہے۔ جب کردار صحیح ثابت ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی روایت پر اعتبار نہ کیا جائے۔

تو اللہ ربّ العزّت کلام کے نازل کرنے والے اور اللہ کی ذات بے عیب ذات ہے وہاں ادنیٰ نقص و کمی کی گنجائش نہیں۔ مصدر خیر و برکت ہے۔ **الخیر کلہٗ منک والیک والشر لیس الیک** حدیث میں فرمایا گیا کہ اے اللہ! خیر ساری تیری ہے اور تیری ہی طرف لوٹ جانے والی ہے اور شر و برائی تیرے پاس نہیں پھٹک سکتی۔ تیری ذات تو بری ہے ہی۔ باہر کی بُرائی بھی تیرے قریب نہیں پھٹک سکتی۔ حق تعالیٰ شانہٗ جو کلام فرمادیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس میں کسی قسم کے تأمل کی گنجائش ہی نہیں۔ اگر گنجائش ہوتی تو راوی کی وجہ سے ہوتی کہ راوی میں خدانخواستہ کھوٹ ہے تو راوی کے فنی طور پر اوصاف بیان کئے کہ محض ہماری خدائی کی وجہ سے دَب کر مت مانو جس کے ذریعے سے روایت کو بھیج رہے ہیں۔ اس کے اوصاف کو فنی طور پر پرکھو۔ کیا وجہ ہے کہ تم اس کی روایت نہ مانو۔ جس کے یہ کامل اوصاف ہیں۔ تو اللہ بھی امین اور واسطہ بھی امین۔

اب آگے پیغمبر ہیں۔ پیغمبر تو کہتے ہی اس کو ہیں جو معصوم ہو۔ جو ہر بُرائی سے بَری اور بالا تر ہو۔ جو ہر وقت حق تعالیٰ شانہٗ کے اندر فانی ہو۔ ہر وقت رضائے خداوندی کے اندر مستغرق ہو کہ ذرہ برابر شائبہ بھی نہ ہو کہ وہ اللہ کی ناراضگی کو لے سکتے ہیں۔ جن کی شان فرمائی گئی ہے۔ **کان یذکر اللّٰہ علیٰ کل احیانہ** حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی لمحہ ذکر اللہ سے فارغ نہیں تھا۔ ہر وقت آپ کے قلب مبارک میں یاد' زبان سے ذکر الگ' قلب مبارک سے الگ' روح پُرفتوح سے الگ' جسمانی حرکات سے الگ' کوئی لمحہ ذکر اللہ سے فارغ نہیں تھا۔ ہر وقت حضوری اور جلال و جمال کا مشاہدہ ہے تو جو دربارِ خداوندی میں ہر وقت حاضر ہو۔ کیا اس کے متعلق یہ گمان ہو سکتا ہے کہ معاذ اللہ وہ غلط گوئی کرے گا؟ اور غلط گوئی بھی اللہ کے اوپر؟ عقل اس سے گریز کرتی ہے اور نہیں مانتی تو نازل کرنے والا اللہ' کلام کو لے کر آنے والے جبرئیل امین اور جن پر نازل ہوا' وہ پیغمبر اور نہ صرف پیغمبر بلکہ خاتمِ پیغمبراں' خاتم الانبیاء اور خاتم المرسلین ___ جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ نبوت کے جتنے کمالات ہیں۔ وہ سب اس ذات پر لا کر مکمل کردیئے گئے۔ نبوت کا کوئی درجہ باقی نہیں کہ کسی اور نبی کو لا کر اس درجہ کو پورا کردیا جائے۔ سارے کمالات 'علمی' اخلاقی اور عملی ان سب کا منتہیٰ ایک ذات کو بنادیا گیا۔

خاتم الدّیانت والامانت کی روایت کی تکذیب ممکن نہیں

اس لئے آپ کا نام خاتم ہے کہ خاتم الرّسل اور خاتم الانبیاء ہیں۔ تو خاتم کے معنیٰ یہ نہیں کہ نبوت کو ختم کردیا اور نبوت قطع ہوگئی۔ خاتم کے معنیٰ یہ ہیں کہ نبوت کی ایسی تکمیل ہوگئی کہ نبوت کا کوئی درجہ باقی نہیں ہے جو آپ کی ذات پر لا کر پورا نہ کردیا گیا ہو تو خاتم کے معنیٰ منتہائے کمالات کے ہیں۔ جس پر آ کر کمالات منتہی ہو جائیں۔ اس لئے خاتم نبوت کے معنیٰ قاطع نبوت کے نہیں ہیں کہ نبوت قطع کردی بلکہ خاتم کے معنی تکمیل نبوت کے ہیں کہ ایک ذات کے اوپر تمام مراتب نبوت کے ختم کردیئے گئے۔ اب اس کا نور قیامت تک کافی ہے کوئی درجہ ایسا نہیں ہے کہ کسی نبی کو لا کر اس درجے کو پورا کردیا جائے۔ ایک ہی آفتاب کا نور ہے۔ جو

آخر تک جائے گا۔

جب رات میں آسمان ستاروں سے جگمگا اٹھتا ہے۔ ایک ستارہ نکلا' دوسرا' تیسرا' اربوں کھربوں ستارے نکلے۔ سارے ستارے مل کر کتنا ہی نور پھیلائیں۔ وہ دن نہیں بنتا رات ہی رہتی ہے لیکن جب آفتاب کی آمد شروع ہوئی۔ ابھی نکلا نہیں۔ صبح صادق ہوتی ہے کہ ستارے ایک ایک کر کے غائب ہونا شروع ہو گئے اور جب آفتاب نکل آیا تو ایک ستارہ بھی نظر نہیں پڑتا۔ اب آفتاب اگر یوں کہے کہ **انا خاتم الانوار** میں سارے انوار کا ختم کرنے والا ہوں۔ تو کیا یہ مطلب ہو گا کہ آفتاب نے نور ختم کر کے اندھیرا پھیلا دیا ؟ خاتم کا مطلب یہ ہو گا کہ سارے ستاروں کے جتنے انوار تھے وہ تنہا میری ذات کے اندر جمع ہیں۔ میرے ہوتے ہوئے اب کسی ستارے کی ضرورت نہیں ہے جب تک میرا دور باقی ہے میں ہی تنہا کافی ہوں۔ چاند' مشتری اور زہرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہی سارے انوار کے پھیلانے کے لئے کافی ہوں۔ تو خاتم کے معنی مکمل کے ہیں نہ کہ قاطع کے۔ خاتم الانوار کے معنی قاطع الانوار کے نہیں کہ انوار قطع کر کے اندھیرا پھیلا دیا بلکہ تکمیل انوار کے ہیں۔

یہ ایک اُصولی بات ہے کہ جو وصف کسی پر ختم ہوتا ہے۔ اسی سے شروع بھی ہوتا ہے۔ وہی فاتح بھی ہوتا ہے' وہی خاتم بھی ہوتا ہے۔ مثلاً آپ یوں کہیں کہ آفتاب خاتم ہے۔ یعنی سارے انوار اس پر ختم ہو گئے۔ تو فاتح انوار بھی وہی ہے کہ اسی کے نور سے ستارے جگمگا رہے ہیں۔ سارے فلاسفر لکھتے ہیں کہ چاند اور دوسرے ستاروں میں کوئی ذاتی روشنی نہیں ہے آفتاب کی روشنی پڑتی ہے' وہ چمک اٹھتے ہیں۔ ذات میں اگر روشنی ہے تو آفتاب کے ہے آفتاب اگر خاتم الانوار ہے تو فاتح الانورار بھی ہے۔ اس نے نور کی ابتدا کی ہے اسی پر آکر انتہا ہو گئی۔

آپ یوں کہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام خاتم الأباء ہیں۔ یعنی آپ بھی باپ ہیں۔ آپ کے باپ بھی باپ تھے۔ ان کے باپ بھی باپ تھے ایک لمبا سلسلہ ہے تو سب کا باپ ہونا آدم علیہ السلام کے اوپر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ آگے کوئی باپ نہیں نکلتا جو خاتم الأباء ہیں وہی فاتح الأباء بھی ہیں۔ وہیں سے باپ ہونے کی رسم چلی ہے؟ اگر وہ نہ ہوتے۔ اگلے بھی باپ پیدا نہ ہوتے۔ اس لئے جو کسی وصف کا خاتم ہے وہی اس وصف کا فاتح بھی ہو گا۔

آپ یوں کہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ خاتم الوجود ہیں۔ آپ کا وجود میرا وجود' زمین و آسمان کا وجود سارے وجود اللہ کی ذات پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ آگے کوئی نہیں ہے کہ وجود کا سلسلہ چلے' وجود کے سارے مراتب اللہ پر منتہی ہو گئے تو فاتح الوجود بھی وہی ہیں۔ وہیں سے وجود چلا جس سے ہم اور آپ موجود ہوئے اگر وہ وجود نہ دیتے۔ ہم آپ کہاں سے موجود کہلاتے؟

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبوت کہا گیا یعنی وصفِ نبوت کے سارے کمالات آپ پر ختم کر دیئے گئے۔ ظاہر بات ہے کہ جیسے آپ خاتم ہیں۔ فاتح بھی آپ ہیں۔ نبوت کی ابتدا بھی آپ سے ہی ہوئی ہے جس کو آپ فرماتے ہیں کہ **انا اوّلھم خلقاً وآخرھم بعثاً** میں سب سے پہلا ہوں بلحاظِ تخلیق کے اور سب سے آخری ہوں بلحاظِ بعثت کے کہ میرے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ اس لئے آپ ہی خاتم النبوت اور آپ ہی فاتح النبوت بھی ہیں۔

بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر نبوت کے مراتب ختم کر دیئے گئے۔ اس لئے نہ جدید نبی آسکتا ہے نہ اس کی ضرورت ہے۔ کوئی درجہ ہی باقی نہیں کہ نبی کے ذریعے اس کی تکمیل کرائی جائے۔ تنہا آپ کی

ذاتِ بابرکات کافی ہیں۔

اور ظاہر بات ہے کہ نبوت کے اوصاف میں امانت' دیانت' راست بازی' سچائی' عفت و عصمت اور پاکدامنی علیٰ وجہ الکمال ہونی چاہئیں۔ تو جب آپ خاتم النبوت ہیں' تو پھر خاتم الحیاء بھی ہیں کہ حیاء کے مراتب بھی آپ کے اوپر ختم ہیں۔ خاتم الشجاعت بھی ہیں کہ بہادری کے مراتب بھی آپ کے اوپر ختم ہیں۔ خاتم السخاوت بھی ہیں کہ سخاوت کے سارے مراتب آپ کے اوپر ختم ہیں۔ گویا آپ تمام کمالاتِ پاکیزہ کا منتہیٰ ہیں۔ اس واسطے جب آپ کو خاتم النبوت کہا گیا تو خاتم الامانات بھی کہا گیا کہ آپ سے بڑھ کر امین بھی کوئی نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کے دشمن کفار مکہ بھی آپ کو امین کہہ کر پکارتے تھے۔ تو امین کی طرف سے وحی آئے' امین لے کر آئے' امین کے اوپر اُتری۔ جب ایک خبر تین امینوں کے بیچ میں ہے تو اس کے نہ ماننے کی وجہ کیا ہے؟ اس کے انکار کی وجہ کیا ہے؟ جب کہ دنیا ایسی ایسی چیزوں کو مان رہی ہے کہ سند کا بھی پتہ نہیں کہ اللہ سے کب چلی؟ کون لے کر آیا؟ کس نے لکھا؟ کہاں پہنچایا؟ تو جس کی سند اللہ سے لے کر نبی تک متصل ہے۔ اس کو بدرجہ اولیٰ ماننا چاہئے۔ پھر اس کے بعد آگے جو سند چلی ہے۔ وہ یہ نہیں ہے ایک دو نے قرآن کریم پڑھ لیا۔ لاکھوں کی تعداد میں وہ لوگ ہیں جو قرآن کو سینے میں لئے ہوئے ہیں۔ ایک ایک حرف اس کا محفوظ' ایک ایک اعراب اس کا گنا ہوا' ایک ایک تشدید' جزم' زبر' زیر اور پیش اس کا گنا ہوا۔ اسی طرح رکوع' سورتیں سب گنی ہوئی ہی۔

امتیازی حفاظت

اور حفاظت اللہ نے کہاں کرائی؟ ___ محض کاغذ سے نہیں کرائی۔ کاغذ کو سمندر میں ڈال دو' نوشتہ بھی گل جائے گا۔ کاغذ بھی گل جائے گا۔ کاغذ کو زمین میں دفن کردو' زمین کھاجائے گی' کاغذ اور حروف بھی گم ہوجائیں گے۔ محض کاغذ ہو' اس کو دیمک بھی کھاسکتی ہے۔ حروف ختم ہوجائیں گے۔ یہ سب آفات کاغذ اور تختی پر ممکن تھیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ان کے ذریعے حفاظت نہیں کرائی بلکہ فرمایا :

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (عنکبوت پ ۲۱ آیت ۴۹)

یہ آیات بینات وہ ہیں جو ہم نے اہل علم کے سینے میں محفوظ کی ہیں۔ تو کاغذ کو دیمک کھاسکتی ہے مگر مؤمن کے دل کو دیمک نہیں کھاسکتی۔ وہاں آگ پہنچ سکتی ہے یہاں آگ نہیں پہنچ سکتی۔ اس کو پانی گلاسکتا ہے۔ قلب پر پانی اثر نہیں کرسکتا۔ اس لئے قلب کے اندر محفوظ کیا گیا۔

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ نے خود فرمایا کہ :

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (حجر پ ۱۴ آیت)

''ہم نے ہی یہ ذکر مبارک اتارا۔ ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں''۔

پچھلی کتابوں کے بارے میں اللہ نے ذمہ داری نہیں لی تھی بلکہ اقوام کے اوپر ذمہ داری ڈالی تھی۔ جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا :

اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ (مائدہ پ ۶ آیت ۴۴)

تورات ہم نے اُتاری۔ اَحبار اور رُہبان پیدا کئے۔ جن کو تورات سکھلائی گئی۔ بِمَا اسْتُحْفِظُوا اَحبار اور رُہبان کو حفاظت کا ذمّہ دار قرار دیا گیا کہ تم اس کی حفاظت کرو ــــ تو وہ نہیں کر سکے' اصلیت باقی نہ رہی ــــ قرآنِ پاک کے بارے میں یہ نہیں کہا۔ اس لئے کہ یہ آخری کتاب تھی۔ اس کے بعد کوئی کتاب نہیں آنے والی تھی۔ آخری دین تھا۔ اس کے بعد کوئی دین آنے والا نہیں تھا۔ آخری پیغمبر تھے۔ کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا ــــ اگر اس کی حفاظت ہمارے اور آپ کے سپرد ہوتی تو وہی حشر ہوتا' جو پچھلی امتوں نے اپنی کتُبِ سماویہ کا کیا' قرآن میں ردوبدل بھی ہوتا' محفوظ بھی نہ رہتا۔ آخری کتاب کی حفاظت اللہ نے اپنے ذمّہ لی اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ہم نے اسے اُتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمّہ دار ہیں ــــ اس حفاظت کو اللہ نے واقعی کس عجیب طریق سے پورا کیا۔ یعنی عموماً حفظ کرنے والے چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے ہیں۔ بڑے آدمی اکثر حفظ نہیں کرتے اور کرتے بھی ہیں تو کچّا رہتا ہے۔ بچے ایسا محفوظ کرتے ہیں' جو پورا پکّا یاد ہوتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ اگر بڑے حفظ کیا کرتے' تو کہا جا سکتا تھا کہ بھائی یہ قرآن کی حفاظت کے ذمّہ دار ہیں۔ اس ذمّہ داری کو جانتے ہیں۔ سمجھ دار' دانا اور عالم ہیں۔ قرآن کریم کی حفاظت کر رہے ہیں۔ تو حفاظت اللہ کی طرف منسوب نہ ہوتی' لوگوں کی طرف منسوب ہو جاتی کہ بڑے علماء اور بوڑھے مشائخ مکتبوں میں بیٹھ کر یاد کر رہے ہیں۔ لیکن مکتبوں میں ایک بوڑھا نہیں ملے گا۔ پانچ پانچ چھ چھ برس کے بچے ہیں اور دس سال کی عمر میں قرآن کریم محفوظ ــــ انہیں یہ خبر نہیں کہ یہ قرآن ہے کیا؟ انہیں یہ خبر نہیں کہ اس کی حفاظت ضروری ہے۔ ان کے ذریعے جو حفاظت کرائی جا رہی ہے۔ یہ حفاظتِ خداوندی کہلائے گی۔ بچے کچھ سوچ سمجھ کر حفاظت نہیں کر رہے۔ اگر بوڑھے کرتے تو حفاظت ان کی طرف منسوب ہوتی۔ بچوں کے ذریعے سے حفاظت کرائی گئی۔ اس واسطے اللہ کی حفاظت کہی جائے گی ــــ اور ہر قرن میں لاکھوں کی تعداد میں حافظ موجود رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص عیاذاً باللہ سارے قرآن کریم خرید کر کے دریا بُرد کر دے' قرآن مِٹ نہیں سکتا۔ ایک دن میں پھر لکھا جائے گا۔ وہ سینوں میں لکھا ہوا ہے۔ لکھے ہوئے سے ہم اپنی یادداشت کی حفاظت کرتے ہیں کہ کوئی متشابہ لگ گیا' کوئی غلطی ہوئی حافظ نے لکھا ہوا دیکھ لیا۔ مگر مدارِ حفاظت لکھا ہوا نہیں ہے۔ مدارِ حفاظت اہلِ علم کے سینے ہیں۔

پھر روایت تواتر کی ہے اور تواتر بھی طبقہ کا ہے۔ یعنی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تین تین آدمی بھی روایت کرتے چلے آئیں۔ وہ خبرِ متواتر کہلاتی ہے۔ یہاں تین تین سو اور تین ہزار نہیں۔ بلکہ ہر دور میں لاکھوں روایت کرتے آ رہے ہیں۔ تو لاکھوں کی تعداد میں جب حافظ موجود ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ وہ کلام ختم ہو سکے۔ یا اس کے اندر کوئی ردوبدل ہو سکے۔ بہر حال قرآن کریم کی اس شان سے حفاظت کرائی گئی کہ نازل کرنے والے نے خود حفاظت کی۔

مرادِ خداوندی اپنی رائے اور عقل سے متعین نہیں کی جا سکتی

اب ظاہر بات ہے کہ قرآن کریم دستورِ اساسی ہے۔ اس میں اصول بیان کر دیئے گئے۔ ساری جزئیات اس میں نہیں بیان کی گئی۔ اصول کلیہ ہیں۔ ان سے جزئیات نکالتے رہو۔ ان کی شرح کرتے رہو۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیث پاک سے آیتوں کی شرح کی۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے' مراد ربانی یہ ہے تو حدیث درحقیقت مبین ہے۔ اللہ کی مراد کو بیان کرتی ہے۔ محض اپنی رائے سے ہم سمجھ لیں کہ یہ مراد ہو گی۔

یہ ممکن نہیں ہے جب تک اللہ ہی یہ نہ بتلائے کہ میری مراد یہ ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ قرآن کریم نے لغت عرب سے الفاظ لئے ہیں۔ ایک لفظ کے لغت میں اور معنیٰ ہیں۔ قرآن نے اس میں دوسرے معنیٰ ڈالے۔ وہ مراد ہوں گے۔ لغوی معنیٰ مراد نہیں ہوں گے۔ مثلاً صلوٰۃ کا لفظ ہے۔ لغت میں اس کے دعا کرنے کے معنیٰ ہیں تو آپ گھر بیٹھ کر دعا مانگ لیا کریں۔ بس نماز ہو گئی۔ شریعت نے صلوٰۃ کا لفظ لغت سے لیا اور معنیٰ اس میں اپنے ڈالے۔ اس طرح نیت کرو' اس طرح ہاتھ باندھو' اس طرح رکوع و سجود کرو۔ یہ صلوٰۃ ہے تو صلوٰۃ لغوی محض دعا مانگنا ہے اور صلوٰۃ شرعی وہ خاص افعال ہیں جو اللہ کے رسول نے بتلائے اگر رسول خود نہ بتلائیں کہ صلوٰۃ سے اللہ کی یہ مراد ہے' وہ مراد نہیں ہے جو تم نے لغت میں پڑھی تو صلوٰۃ کے معنیٰ ہم کیسے سمجھیں گے؟ بس لغت میں جو لکھا ہے' وہ سمجھ لیں گے۔

یا مثلاً حج کے معنیٰ لغت میں قصد کرنے کے ہیں۔ بس گھر بیٹھ کے آپ نے قصد کر لیا اور حاجی ہو گئے۔ یہ ہزاروں روپے خرچ کرنا اور ہوائی جہازوں سے مکہ پہنچنا اور عرفات میں جانا' یہ سب ضائع اور دُور از کار ہو جائے گا۔ شریعت نے جب اس لفظ کو لیا تو اس کے معنیٰ مرادی بیان کئے کہ حج سے مراد ہماری یہ ہے کہ یوں احرام باندھو' طواف کرو' عرفات جاؤ' منیٰ اور مزدلفہ جاؤ' ذبیحہ کرو' اس سارے مجموعہ کو کہا کہ اللہ کی حج کے لفظ سے مراد یہ ہے اگر کوئی شخص محض لغت کے بل بوتے پر قرآن کا حج کرنے لگے اور حدیث کو ترک کر دے۔ جو اس کی شرح اور بیان ہے تو مرادِ ربانی تک کبھی نہیں پہنچ سکے گا۔ وہ اس کی نفسانی مراد ہوگی اور دنیا کو دھوکہ دے گا کہ اللہ نے یہ کہا حالانکہ لفظ اللہ کے لے رہا ہے اور معنیٰ اپنے نفسانی بیان کر رہا ہے۔ یہ تلبیس اور دھوکہ دہی ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن کریم نازل ہوتا تو آپؐ کبھی یہ نہیں فرماتے کہ اس آیت کے ایک معنیٰ یہ بن سکتے ہیں' ایک معنیٰ یہ بن سکتے ہیں اور زمانے کے مناسب حال یہ معنیٰ ہیں۔ لہٰذا اللہ کی یہ مراد ہے۔ جس طرح اللہ نے لفظ نازل کئے اللہ ہی نے اس کی مراد اور اس کا علم آپؐ کے قلب مبارک پر اُتارا۔ جس کو آپؐ نے کھولا۔ چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ جب وحی آتی تھی تو آپؐ رٹنا شروع کر دیتے تھے تاکہ الفاظِ خداوندی میرے سینے میں محفوظ ہو جائیں' کہیں بھول نہ جاؤں۔ حق تعالیٰ نے روکا' فرمایا:

> لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ
>
> "اے نبیؐ! اپنی زبان کو حرکت مت دو۔ جلدی مت کرو۔ تم اسی لئے تو جلدی کرتے ہو کہ بھول نہ جاؤں"۔

فرمایا:

> اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ
>
> "یہ ہمارا ذمّہ ہے کہ تمہارے سینے میں محفوظ کر دیں گے تمہاری زبان سے پڑھوا دیں گے تم اس کی فکر مت کرو"۔

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ جب ہم قرأت کرنے لگیں' تمہارا کام یہ ہے کہ تم سنتے رہو۔ جمع و محفوظ کر دینا اور زبان سے پڑھوا دینا یہ ہمارے ذمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا اللہ جیسے لفظوں کا نازل کرنے والا ہے اور اس کی حفاظت کا ذمّہ دار ہے۔ اسی طرح معانی کا بھی ذمّہ دار ہے۔ نبی کے قلب کے اوپر معانی بھی خود ہی نازل فرماتا ہے۔ چنانچہ اگلا جملہ یہ ہے: اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کو کھول دینا اور اس کو بیان کر دینا۔

قرأت پڑھنے کو کہتے ہیں۔ اس کا تعلق زبان سے ہے اور بیان کہتے ہیں کھول دینے کو۔ اس کا تعلق سینے اور قلب سے ہے۔ تو لفظ زبان سے پڑھے جائیں گے اور معنیٰ سینے سے سمجھے جائیں گے ___ حق تعالیٰ نے الفاظ کی حفاظت میں جو لفظ استعمال کیا وہ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ کہ ہم پر لازم ہے ہم حفاظت کریں گے۔ وہی لفظ معانی کے لئے بھی استعمال فرمایا کہ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ہمارے ہی ذمہ اس کا بیان کرنا ہے۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا :

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (نحل پ ۱۴ آیت ۴۴)

”اے نبی! ہم نے تم پر یہ قرآن نازل کیا تاکہ تم کھول کھول کر مخلوق کو سمجھادو کہ اس لفظ سے اللہ کی یہ مراد ہے‘اس لفظ سے یہ مراد ہے“۔

جب مراد وحی سے متعیّن ہو گئی۔ اب اس میں غور و تدبّر کرو۔ تو وہ علوم و معارف کھلیں گے جو اللہ کی مراد سے تعلق رکھتے ہیں۔ مراد کو عقل اور فکر سے متعیّن نہیں کریں گے مراد علم الٰہی اور کلام پیغمبر سے متعیّن کریں گے پھر اس میں عقل سے غور و فکر کریں گے۔ اس میں نئے نئے علوم پیدا ہوں گے۔ وہ قرآنی علوم ہوں گے اور اگر مراد ہی عقل سے متعیّن کرو‘ وہ نفسانی مراد ہوگی‘ خدائی مراد نہ ہوگی‘ لغت کی مراد ہوگی۔ شریعت کی مراد نہیں ہوگی۔ حاصل یہ کہ سنت نبوی مراد ربّانی کو متعیّن کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خوارج کے مقابلے میں بھیجا کہ ان سے جاکر مناظرہ کرو‘ تو یہ نصیحت فرمائی کہ خوارج کے مقابلے پر قرآن سے کوئی دلیل مت پیش کرنا۔ سنت سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سے پیش کرنا۔ ابن عباسؓ نے عرض کیا‘ اے امیر المؤمنین! مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی ہے کہ :

اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

”اے اللہ! ابن عباس کو کتاب کا علم اور حکمت دے“۔

تو میرا خاص مضمون کتاب اللہ کے علوم ہیں اور انہی سے آپ روک رہے ہیں کہ میں ان سے دلیل نہ پکڑوں۔ سنت سے دلیل پیش کروں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

فرمایا کہ اَلْقُرْاٰنُ ذُوْ وُجُوْهٍ قرآن کے جملے بلیغ ہیں اور کئی کئی معنیٰ پر ڈھل سکتے ہیں۔ تم اگر خوارج کے مقابلے میں ایک آیت سے ایک معنیٰ بیان کرو گے۔ وہ اسی آیت سے دوسرے معنیٰ بیان کریں گے اور تم پر حجت قائم کریں گے۔ عوام کہیں گے یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں‘ وہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں تو حق و باطل واضح نہیں ہوگا ___ لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سے مراد متعیّن کرو گے۔ اس میں دوسری چیز کی گنجائش نہیں۔ مراد متعیّن ہو جائے گی ___ تو سنت درحقیقت مراد ربّانی کو متعیّن کرتی ہے کہ اللہ کے یہ معنیٰ مراد ہیں۔

اور سنت میں بھی اگر عموم ہو تو پھر اس کی مراد مجتہد فقہ سے متعیّن کرتا ہے جو ائمہ مجتہدین ہیں۔ وہ آیتوں میں غور و فکر اور تدبّر کرتے ہیں۔ رات دن ان کا اوڑھنا بچھونا قرآن کی آیتوں میں تفکّر و تدبّر کرنا ہے اور قرآن میں سے وہ ایسے مسائل نکال لیتے ہیں کہ ہمارا فہم وہاں تک نہیں پہنچتا۔ اس لئے کہ علم کے درجات ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ سارے عالم ایک ہی درجے کے نہیں ہوتے بعضے ادنیٰ‘ بعضے اوسط‘ بعضے اعلیٰ اور بعضے افضل ہیں۔ سب انبیاء میں بھی درجات قائم ہیں۔

تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ بعض رسولوں کو ہم نے بعض پر فضیلت دی۔ تو علماء تو بعد کی چیز ہیں ان میں بھی تفاضل موجود ہے' بعض ادنیٰ واوسط درجے کے اور بعض اعلیٰ مرتبے کے۔ تو اعلیٰ مرتبے کے علماء قرآن کریم سے جو اس کے حقائق سمجھیں گے ادنیٰ واوسط مرتبے کے نہیں سمجھیں گے اور ان سب سے اوپر جن کو اللہ نے ملکۂ اجتہاد دیا ہے وہ جو سمجھیں گے' وہ عوام علماء بھی نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن جب ایک فقہ کا مسئلہ سامنے آجائے گا کہ واقعی یہ آیت سے نکل رہا ہے تو ہماری بھی سمجھ میں آجائے گا۔ اس لئے وہ شریعت سے الگ نہیں ہوتا ___ تو قرآن کریم کی مثال ایسی ہے جیسے ایک کنواں ہو' اس سے پانی جاری ہے اور اجتہاد ایسا جیسے ڈول رسی۔ تو آپ ڈول ڈال کر پانی نکالیں گے تو وہ پانی جو ڈول دے رہا ہے۔ وہ کوئی الگ پانی نہیں ہے۔ اسی کنویں میں سے نکل کر آیا ہے۔ ڈول اس کے نکالنے کا ذریعہ بن گیا ___ اسی طرح امام مجتہد کا اجتہاد قرآن کے مخفی علوم نمایاں کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ قرآن پر کسی خاص علم کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ زیادتی کمی کا کسی کو حق نہیں ہے۔

اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ :

اَلْقِیَاسُ مُظْهِرٌ لَا مُثْبِتٌ

"قیاس کسی مسئلے کو ثابت نہیں' ظاہر کر سکتا ہے قرآن میں چھپا ہوا تھا قیاس کرنے والے مجتہد نے اسے نکال کر سامنے رکھ دیا"۔

بہر حال اوّل کتاب اللہ پھر سنت رسول اللہ' سنت رسول اللہ کے بعد مجتہد کا اجتہاد ہے۔ اس کے بعد اجماع امت ہے ___ تو ہم جس مسئلہ کو بھی دیکھیں گے پہلے قرآن میں تلاش کریں گے' پھر قرآن کی شرح جو حدیث ہے' اس میں تلاش کریں گے۔ پھر اس کی شرح میں جو فقہ ہے' تلاش کریں گے۔ اس کے بعد پھر امت کا تعامل دیکھیں گے کہ صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ کا کیا عمل رہا' اس سے کٹ نہیں سکتے' جہاں ایک طرف علمی دائرہ ہے۔ وہ محض لفظوں تک محدود ہے لیکن اس کے ساتھ ایک عملی دائرہ ہے کہ تمام سلف صالح اجماع کر چکے ہیں اور وہ ایک ہی چیز سمجھتے آرہے ہیں۔ تو تعامل اور عمل امت کو معتبر سمجھا جائے گا اور امت کے عمل کا مطلب زید' عمرو' بکر اور میرا تمہارا عمل نہیں۔ ان علماء ربانی اور صلحاء و مشائخ حقانی کا عمل ہے۔ جنہوں نے قرآن و حدیث کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا' صحابہؓ و تابعینؒ' تبع تابعینؒ' مجتہدینؒ' محدثینؒ و فقہاءؒ ہیں۔ یہ اجماع کریں اور عمل کا راستہ ڈال دیں تو یقیناً اس عمل کا ماخذ کتاب و سنت میں ہے اور غور کرتے ہیں تو وہ ماخذ نکل آتا ہے یہ نہیں کہ وہ کوئی الگ چیز ہے۔

مسائلِ دینیہ میں مطالبۂ سند اس امت کا ذوق ہے

بہر حال اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ ادھر تو قرآن کی سند متواتر' ادھر حدیث کی سند متواتر۔ یعنی کلامِ رسول کی اس امت نے وہ حفاظت کی ہے کہ دوسری قومیں اپنے کلامِ خداوندی کی وہ حفاظت نہیں کر سکیں۔ حدیث کا ایک ایک لفظ اور راویوں کی پوری سند بیان کرتے ہیں۔ حدثنا فلان مجھ سے فلاں' اور فلاں نے اس سے' اس نے اس سے اور اس نے فلاں نے بیان کیا۔ یہاں تک کہ ___ سند حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتی ہے۔ ایک چھوٹے سے جملے کے لئے بھی یہی طریق کار ہے۔ ___ تو ایک ایک حدیث کی سند محفوظ۔ حتیٰ کہ مسلمانوں نے پچاس ہزار راویان حدیث کا کریکٹر اور تاریخ مرتب کر دی اور ایک فن بنا دیا جس کو فن اسماءُ الرجال کہتے ہیں کہ ان لوگوں کے نام اور کردار و کریکٹر جو حدیث کے راوی ہیں۔ ان کا حافظہ ایسا

تھا، تقویٰ ایسا تھا، خاندانی نسبت ایسی تھی تو ایک ایک چیز لکھی اور اسے تاریخ کا جز بنادیا۔
تو جب قرآن کی سند متواتر، کوئی حدیث سند سے خالی نہیں پھر فقہ میں بھی یہی صورت ہے۔ یعنی اس امت کی عادت یہ پڑگئی کہ بے سند کے کوئی چیز نہ مانے۔ مثلاً "ہدایہ" (جو فقہ کی مستند اور مشہور زمانہ کتاب ہے۔ ایک عرصہ سے داخل درس نظامی ہے) اس کی سند دی جاتی ہے کہ ہدایہ کی روایت مصنفِ ہدایہ سے کس نے کی اور اس سے کس نے اور اس سے کس نے روایت کی ہے؟ ہماری سند صاحب ہدایہ تک متصل ہے۔ حتیٰ کہ تصوف میں جو محققین صوفیاء ہیں۔ انہوں نے کتابیں لکھیں تو تصوف کے مسائل میں بھی اسی طرح سند بیان کرتے ہیں جس طرح سے حدیث کی سند بیان ہوتی ہے کہ ہم سے فلاں نے بیان کیا، ان سے جنیدؒ نے اور ان سے شبلیؒ نے بیان کیا۔ وہ بھی سند کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ تو اس امت کا گویا ذوق ہی قرآن نے یہ بنادیا کہ بے سند کسی چیز کو جو دین کے بارے میں ہو، مت قبول کرو۔ آج بھی اگر کوئی دین کا مسئلہ پیش کرے گا۔ پہلا مطالبہ یہ ہوگا کہ بھئی! قرآن وحدیث فقہ اور تعامل امت میں ہے؟ صحابہؓ و تابعینؒ کا عمل اس پر تھا؟ ان میں سے کسی میں بھی موجود نہ ہو، تو بات رد کردی جائے گی ان سب میں موجود ہوگا تو کہیں گے کہ سر آنکھوں پر، ضرور قبول ہے۔

سندِ صحیح سے کسی مسئلہ کے ثبوت کے بعد اِتباع فرض ہے

اس سے ایک اور بات بھی معلوم ہوئی کہ جو لوگ قرآن، حدیث، فقہ اور امت کے اکابر کی سند تک کے محتاج ہیں اور ایک ایک جزئی میں کہتے ہیں کہ ان کی سند لاؤ۔ یہ دلیل ہے کہ ان کی سب سے پہلی محبت تو اللہ سے قائم ہے۔ اس کے بعد ان کی محبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ہے۔ اس کے بعد ان کی محبت ائمہ مجتہدین سے قائم ہے۔ ان کے بعد علماء ربانی اور مشائخ حقانی سے قائم ہے۔ محبت سے ہی یہ سارا سلسلہ چلتا ہے۔ اگر ائمہ محبوب نہ ہوتے تو ایک ایک جزئی میں ان کی طرف رجوع نہ کرتے۔ اگر مشائخ طریقت محبوب نہ ہوتے۔ تو ان کی کسی بات کی یہ روایت نہ کرتے۔ حالانکہ اسے سر آنکھوں پر بٹھلاتے ہیں۔ اگر ائمہ مجتہدین محبوب نہ ہوتے، ان کا اجتہاد کبھی نہ قبول کرتے۔ تو اللہ سے الگ محبت، رسول سے الگ محبت، ائمہ مجتہدین سے الگ محبت، فقہاء امت اور مشائخ طریقت سے الگ محبت۔ یہ تو سب کی محبت میں گرفتار ہو کے عاشقِ کل ہیں۔ انہیں کوئی یوں کہے کہ ان کے دلوں میں بزرگوں سے محبت ہے ہی نہیں۔ اس سے زیادہ دھوکہ دینے والا کون ہے؟ یہ تو اللہ کے ساتھ محبت رکھتے ہیں۔ تو علماء، مجتہدین اور فقہاء تک محبت رکھتے ہیں، مشائخ طریقت سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کی بات کی بھی سند لاتے ہیں کہ حضرت جنیدؒ نے یہ فرمایا، حضرت شبلیؒ نے یہ فرمایا، یہ ہمارے مقتدا ہیں۔ سند سے ایک بات ثابت ہوتی، ہم سر آنکھوں پر رکھتے ہیں تو تصوف، حدیث، تفسیر سب ان کے سر آنکھوں پر، سب کی محبت کے اسیر ہیں اور یہ سب کے عشاق اور سب کی محبت میں غرق ہیں ___ بہرحال سب سے پہلا مطالبہ سند کا ہوگا اور سند کے بعد جو درجہ رہ جاتا ہے وہ اِتباع کا ہے۔ تو جب سند صحیح سے ایک مسئلہ ثابت ہو جائے تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی اِتباع کریں۔ اب خود رائی یہاں سے ختم ہو جاتی ہے۔ دین میں رائے زنی یا کسی مسئلہ کو رائے سے بنانا، یہ کارخانہ ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں صاف فرمایا گیا:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ (احزاب پ ۲۲ آیت ۳۶)

کسی مومن مرد و عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اللہ و رسول کا حق آجانے کے بعد وہ اس کے اندر اپنی رائے زنی کرے۔ اس کا اختیار حکم خداوندی آجانے کے بعد سلب ہو جاتا ہے۔ نہ اس کا ارادہ باقی نہ اختیار باقی' اگر ہے تو اِتباع باقی ہے کہ پیروی کرو کہ جب اللہ سے ایک چیز ثابت ہوگئی۔ تو اب اس میں رائے کی گنجائش نہیں اور فقہ و تعامُل امّت سے ثابت ہوگئی اب اس میں بھی رائے زنی اور ٹال مٹول کرنے کی گنجائش نہیں۔ اب صرف عمل کرنا ہے تو قانونِ شریعت عمل کے لئے ہے' تجویز کے لئے نہیں ہے۔ تجویز تو اللہ پاک کرچکا۔ ہمارا کام تجویز نہیں بلکہ تفویض ہے کہ اپنے کو سونپ دیں اور حوالے کردیں کہ جو اللہ نے کہا وہ میری سر آنکھوں پر ہے۔ اسی میں دنیا و آخرت کی نجات ہے اور اسی میں گروہ بندی اور پارٹی سازی قطع ہوتی ہے۔ پارٹی بندی کبھی نقل سے نہیں عقل کے گھوڑے دوڑانے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمیشہ **تخیلات** سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر نصِ صریح نصِ فقہی یا نصِ حدیث موجود ہے یا امّت کا تعامُل موجود ہے تو اختلاف کی کوئی وجہ ہی باقی نہیں رہتی۔

رائے زنی کبھی غلو محبت سے ہوتی ہے کہ کسی بزرگ سے بے حد محبت ہے۔ اس کا کوئی فعل دیکھا۔ اسے قانون کی صورت میں پیش کردیا۔ کسی سے عداوت ہے' اس کا کوئی قول دیکھا اسے رد کردیا تو ردّ و قبول بعض دفعہ غلو محبت سے ہوتا ہے۔ بعض دفعہ غلو عداوت سے ہوتا ہے۔ بعض دفعہ بدفہمی اور بعض دفعہ بدنیتی سے ہوتا ہے کہ نیت ہی خراب ہے کہ دین میں رخنہ ہی ڈالنا مقصود ہے۔ لیکن جب نصِ صریح آگئی۔ یہ ساری چیزیں قطع ہوجاتی ہیں۔ خیال آرائی کا دین میں کوئی تعلق نہیں' وہ منقول دولت ہے جو آئی ہے' ہمارا کام اس کے سامنے گردن جھکانا ہے۔

بہرحال یہ معیار ٹھہرا' میں نے عرض کیا تھا کہ میں اپنا تعارف کرادوں۔ تو میں تو کوئی چیز نہیں' لاشیٔ محض ہوں۔ نہ کوئی عالم نہ فاضل' علماء کی جوتیاں سیدھی کرنے والا ہوں۔ مگر علماء سے ایک نسبت ہے۔ ان کا ایک ڈھنگ دیکھا ہے۔ یہ جو اکابرِ دیوبند کہلاتے ہیں۔ ان کا یہی ڈھنگ ہے کہ ہر مسئلہ میں کتابُ اللہ یا سنت رسول اللہ' فقہ حنفی' یا جس فقہ کا تابع ہے۔ فقہ حنبلی یا شافعی' اس کے بعد تعامُل امّت اور امّت کا ذوق کہ کس ذوق پر امّت چل رہی ہے۔ کس ذوق پر سلف صالحین چلے ہیں۔ ان سب کو لے کر ایک مسلک بنتا ہے۔ جس میں قرآن بھی داخل' حدیث' فقہ' تصوّف' طریقت و شریعت بھی داخل ہے۔ ساری چیزوں کا مجموعہ ہے' اس کا اِتباع ہو۔ تو میں تو نہ کوئی عالم' نہ فاضل' دارالعلوم دیوبند کا ایک معمولی سا طالب علم ہوں۔ مگر ان بزرگوں سے نسبت حاصل ہے۔ ذرے کو بھی آفتاب سے نسبت حاصل ہوتی ہے۔ ذرّہ چھوٹی اور حقیر چیز ہے۔ مگر جب آفتاب روشنی ڈالتا ہے۔ ایسے چمکنے لگتا ہے جیسے ہیرا۔ حالانکہ وہ چمک اس میں نہیں۔ وہ چمک آفتاب کی ہے۔ ایک نسبت آفتاب سے قائم ہوگئی۔ جس سے وہ چمک رہا ہے ___ اس لئے میں عرض کررہا تھا کہ ان حضرات نے سپاسنامے میں جو تعارف کرایا۔ وہ میرا تعارف ہی نہیں تھا۔ وہ انہوں نے اپنا تعارف کرایا کہ ہم ایسے عالی حوصلہ ہیں کہ خوردوں کو بڑھا سکتے ہیں' اپنے چھوٹوں کو عزت دے سکتے ہیں۔ اپنے علو حوصلہ اور عالی ظرفی کا تعارف کرایا۔ میرا تعارف صرف یہ ہے کہ میں لاشیٔ محض ہوں مگر ایک نسبت رکھتا ہوں ؎

گرچہ خوردیم نسبتی است بزرگ
ذرّہ آفتاب تابانیم

ہم اگرچہ حقیر و ذلیل ہیں۔ مگر نسبت بڑی ہے۔ جن بزرگوں سے وابستہ ہیں۔ وہ بیشک بڑے تھے۔ ان کی وجہ سے کوئی ہمارا نام بھی لے لیتا ہے' ہمیں پوچھ لیتا ہے۔ ورنہ ہم میں کیا رکھا ہے۔

اصل چیز ہمارے سامنے کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، تعامل امت، فقہ اسلامی اور اکابر طریقت و شریعت کی محبت اور ان کی عظمت، یہ چیزیں ہیں جن پر فی الحقیقت دین کا مدار ہے۔

ادب و عظمت دین کی بنیاد ہے

دین کی بنیاد ادب پر قائم ہے۔ بے ادبی اور گستاخی پر قائم نہیں ہے
بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

جو جسارت اور بے باکی برتے گا، وہ آخرت سے کبھی حصہ نہیں پائے گا۔ کبھی اللہ والوں کا اعتماد نہیں پائے گا۔ جیسے قرآن کریم نے فرمایا:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ (الحجرات پ۲۶ آیت۲)

"اے ایمان والو! نبی کی مجلس میں بیٹھ کر نبی کی آواز سے اپنی آواز بلند مت کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو اس جرأت و گستاخی کی وجہ سے تمہارے سارے عمل حبط کر لئے جائیں"۔

یہ رسول کا ادب بتلایا۔ قرآن کریم کا ادب بتلایا، **لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ** قرآن کو ہاتھ بھی نہ لگاؤ جب کہ تم باوضو اور پاک نہ ہو۔ مساجد اللہ کا ادب بتلایا کہ جب مساجد میں آؤ، ادب کے ساتھ آؤ۔ **لا تاتوھا وانتم تسعون وأتوھا وانتم تمشون** مسجد میں دوڑے ہوئے مت آؤ۔ جیسے بچے بھاگتے ہوئے آتے ہیں۔ یہ سبک حرکتی ہے۔ متانت، وقار اور سکون کے ساتھ آؤ۔ نیز فرمایا گیا، مساجد کے اندر دنیا کے جھگڑے اور باتیں مت کرو۔ ذکر اللہ کرو، نماز میں مشغول ہو جاؤ، درود شریف پڑھو یا تلاوت کرو۔ جو جھگڑے گھروں میں چھوڑ کے آئے تھے، انہیں مسجد میں بھی لے آئے۔ یہ مسجد کا احترام ہوا یا بے احترامی؟ جس کو فرمایا گیا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ (البقرۃ پ۱ آیت۱۱۴)

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس سے زیادہ بدنصیب، بدقسمت اور ظالم کون ہے؟ جو اللہ کی مسجدوں کو ڈھادے ___ مسجد کی ایک صورت ہے۔ ایک حقیقت ہے۔ صورت اینٹیں ہیں۔ انہیں کوئی ڈھادے، یہ بھی مسجد کا ڈھانا ہے۔ ایک یہ کہ اینٹیں تو نہیں ڈھاتا۔ مگر دنیا کی باتیں اور لغو شغل اتنے زور سے کرتا ہے کہ ذکر اللہ کرنے والوں کے ذکر کرنے میں خلل پڑ رہا ہے۔ نماز پڑھنے والے اور تلاوت کرنے والوں کی نماز و تلاوت میں خلل پڑ رہا ہے۔ اس کو بھی فقہاء نے منع لکھا ہے۔ بلکہ تلاوت بھی اتنے زور سے مت کرو کہ دوسرے کے ذکر میں خلل پڑے۔ یہ مسجد کی حقیقت کو ڈھانا ہے۔ اس لئے کہ مسجد کی حقیقت ذکر اللہ ہے۔ جب تم ذکر اللہ میں آڑے آگئے اور دوسرے کو روک دیا تو مسجد کی صورت نہیں ڈھائی مگر حقیقت تم نے ڈھادی۔

بعض روایات میں ہے کہ مسجد میں دنیا کی غیر ضروری باتیں کرنا ایسا ہے جیسے مسجد میں خنزیر ذبح کر دیا۔ یعنی مسجد کو آلودہ اور گندہ کر دیا ___ اس لئے مسجد، بیت اللہ، حرم محترم، اولیاء اللہ، انبیاء اللہ اور کتب اللہ، ان سب کا ادب بتلایا۔ سارے دین کی بنیاد ادب و عظمت کے اوپر قائم ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جن کا ذکر ابھی آپ نے سنا، انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ سلسلہ چشتیہ کے اکابر میں سے ہیں۔ ہمارا یہ سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری

حضرت خواجہ صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہما سے گزرتا ہوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ ان حضرات کے اوپر چشتیت غالب ہے۔ گو تربیت قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ طریق پر بھی کرتے ہیں ان کے اذکار بھی بتلاتے ہیں اور جس کی جیسی مناسبت دیکھتے ہیں۔ ویسی ہی اس کی تربیت کرتے ہیں۔ تو چاروں سلسلے ان کے پاس ہیں مگر چشتیت کا غلبہ ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ حضرت صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر سال دو سال میں ایک دفعہ ضرور حاضر ہوتے۔ تو رڑکی سے نہر کی پٹڑی پر کنارے کنارے کلیر شریف کو راستہ جاتا ہے۔ وہاں سے کوئی پانچ چھ میل ہے۔ حضرت جب نہر کی پٹڑی پر پہنچتے، جوتے اٹھا کر بغل میں داب لیتے۔ پانچ میل ننگے پیر طے کرتے تھے ــــ یہ کیا چیز تھی؟ مشائخ طریقت کا ادب کہ جن کی جوتیوں کے صدقے ہم نے اخلاق سیکھے، جن کی بدولت ہمارے نفوس پاک ہوئے۔ ان کے احسان کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں؟ کس طرح انہیں سر پر نہ بٹھلائیں۔ اس لئے پانچ میل کی مسافت ننگے پاؤں طے کرتے۔

حضرت مولانا جب حج کو گئے ہیں تو یہ وہ قافلہ ہے جس میں بڑے بڑے بزرگ تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صاحب وغیرہ۔ یہ سارے حضرات ایک ساتھ گئے تھے۔ مدینہ منورہ (زادھا اللہ شرفاً و کرامۃً) جب قریب آتا ہے تو بیر علی ایک منزل ہے۔ اس پر جب اونٹ چڑھتے ہیں تو چڑھتے ہی حرم شریف کے مینارے نظر پڑتے ہیں ــــ اب موٹروں کی سواریاں ہیں۔ اس زمانے میں اونٹوں کی سواریاں ہوتی تھیں ــــ یہ سب حضرات اونٹوں پر روانہ ہوئے۔ مکہ سے گیارہویں دن مدینے پہنچتے تھے۔ گیارہ راتیں راستے میں لگ جاتی تھیں۔ یہ قافلہ جب بیر علی پر پہنچا اور حرم شریف کے مینارے نظر پڑے تو حضرت مولانا محمد قاسمؒ صاحب سواری سے ایک دم اُچھل کر نیچے کودے اور ننگے پیر چلنا شروع کیا حالانکہ وہاں کی کنکریاں ایسی نوکیلی ہیں کہ ایسی چبھتی ہیں جیسے سوئیاں چبھتی ہیں۔ ہر ایک کا بس نہیں ہے کہ وہاں چل سکے۔ حضرت کی دیکھا دیکھی سینکڑوں آدمی نیچے کود گئے کہ ہم بھی پیدل چلیں گے۔ مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہ یہ بے وقوفی نہیں ہے؟ ان پر تو محبت نبوی کا حال غالب ہے۔ انہیں نہ کانٹوں کی پرواہ نہ چُبھن کی پرواہ ــــ یہ نقل اتار رہے ہیں، یہ کہاں تک چلیں گے؟ چنانچہ کوئی سو قدم، کوئی ڈیڑھ سو قدم چلا، پھر اونٹ پر بیٹھ گیا اور حضرت مولانا جیسے بالکل محبت نبویؐ میں ربودہ اور غرق ہوتے ہیں۔ اسی حالت میں پیر لہولہان ہو گئے اور انہیں کچھ پتہ نہیں وہ جا رہے ہیں۔

تو ادب کا یہ عالم تھا کہ حرم شریف کے منارے دیکھ کر یہ جرأت نہیں ہوئی کہ اونٹ پر بیٹھیں۔ ننگے پیر کنکریوں میں چلے جس سے معلوم ہوتا ہے ان حضرات کے دلوں میں شریعت کا ادب کتنا غالب تھا۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس اللہ سرہٗ جو اس پوری جماعت کے شیخ طریقت ہیں۔ ہندوستان سے انگریزوں کے اقتدار کے بعد مکہ مکرمہ میں ہجرت فرمائی۔ لوگوں نے دیکھا کہ سیاہ جوتا نہیں پہنتے پہلے تو اتفاقی بات سمجھے۔ مگر جب کوئی لے کے آیا، اسے رد کر دیا۔ سرخ یا زرد رنگ کا پہنتے۔ اب لوگوں کو احساس ہوا کہ یہ ارادی فعل ہے، اتفاقی نہیں ہے۔ حضرت سے عرض کیا، حضرت کیا سیاہ جوتا ممنوع ہے۔ فرمایا نہیں۔ آپ کیوں نہیں پہنتے؟

فرمایا ادب کے خلاف ہے۔ جو رنگ بیتُ اللہ کے غلاف کا ہے میں اسے پیروں میں ڈالوں؟ شرعاً سیاہ جوتا پہننا ممنوع نہیں۔ مگر جب ادب غالب ہوتا ہے، آدمی قانون سے آگے بڑھ کر عمل کرتا ہے۔

ادب میں قانون سے آگے بڑھ کر عمل کرنا یہ خود قانون نہیں

مگر یہ سمجھ لیجئے کہ قانون سے آگے بڑھ کر عمل کرنا۔ یہ خود قانون نہیں ہوتا کہ آپ لوگوں کو تلقین کریں۔ تم بھی سیاہ جوتا پہننا چھوڑ دو' تم بھی ننگے پیر چلا کرو۔ یہ ایک شخص کا حال ہے۔ اگر وہ حال آپ میں پیدا ہو جائے۔ آپ یہ کام ضرور کریں گے۔ آپ کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ لیکن اگر نقالی کریں گے پھر پیغمبر کی نقل اصل ہے۔ لوگوں کی نقل اصل نہیں ہے صاحب حال کا مقام اور نقال کا اور نقل کرنے والے سے کہا جائے گا کہ تو فلاں کی نقل مت کر' قانون شریعت کی نقل کر' سب کے لئے جو عام حجت ہے' وہ قانون شریعت ہے۔ طریقت شخصی احوال کا نام ہے۔ وہ قانون نہیں ہوتے کہ دنیا کو پابند کیا جائے' طریقت کے اوراد بتائے جائیں گے اوراد کرتے کرتے کوئی حال تک پہنچ گیا۔ اس کے لئے مبارک ہو پھر وہ اس حال کے مطابق عمل کرے گا۔ کسی کو ملامت کرنے کا حق نہیں ہے۔ لیکن قانون بہرحال نہیں بنے گا کہ دنیا کو اس کی دعوت دے ــــ منصورؒ پر حال غالب ہوا اور غلبہ حال میں کہا کہ انا الحق۔ میں حق ہوں یہ مطلب نہیں تھا کہ خدائی کا دعویٰ کر رہے تھے۔ انا الحق کا یہ مطلب ہے کہ حق ہی حق موجود ہے۔ میں اپنے اندر دیکھتا ہوں' حق ہی کا جلوہ پاتا ہوں۔ خود میری ذات کوئی چیز نہیں جگہ جگہ حق ہی نظر آتا ہے۔ تو انا الحق کے معنیٰ یہ لئے کہ حق کا اتنا غلبہ ہو گیا کہ اپنی ہستی گم ہو گئی۔

اس کی بالکل ایسی ہی مثال ہے کہ جیسے آپ آفتاب کو دو منٹ ٹکٹکی باندھ کر دیکھیں۔ اب جو نگاہ ہٹائیں گے جدھر نظر پڑے گی' آفتاب کی ٹکیا سبز' سرخ اور سیاہ رنگ کی نظر پڑے گی۔ ساری چیزیں اوجھل ہو جائیں گی۔ آفتاب ہی آفتاب نظر آئے گا حتیٰ کہ آپ اپنے آپ کو دیکھیں' وہاں بھی آفتاب ہی نظر آئے گا۔ ایسے میں اگر کوئی یوں کہہ دے کہ میں آفتاب ہوں تو یہ مطلب نہیں کہ میں آفتاب بن گیا۔ بلکہ یہ کہ آفتاب میرے اوپر اتنا غالب آگیا کہ آفتاب کے سوا مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی ــــ تو منصور پر فنائیت کا غلبہ ہوا۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی تجلیات اور انوار اتنے غالب ہوئے کہ اپنے اندر دیکھتے' وہاں بھی جلوہ حق نظر آتا تھا ادھر ادھر دیکھتے تھے' وہاں بھی جلوہ حق نظر آتا ــــ بہرحال منصور کا ایک حال تھا جو انہوں نے انا الحق کہا۔ کیا یہ قانون ہے کہ آپ لوگوں کو تلقین کریں کہ تم بھی انا الحق کہا کرو۔ اگر لوگ کہیں گے تو انہیں پھانسی دی جائے گی۔ گردن زنی ہوں گے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ منصور نے کہا' ہم کہیں گے۔ منصور کا حال بھی تو پیدا کرو۔ جب حال پیدا ہو گا۔ تم خود بخود اس کو انجام دو گے۔ بلا حال نقل کرو گے تو قانون شریعت کی نقل لازمی رہے گی۔ شخصی حالات قانون نہیں ہوتے۔

مثلاً اگر کوئی بزرگ بیمار ہو اور اٹھنے کی سکت نہیں تھی۔ بیٹھ کر نماز پڑھ لی۔ مریدین معتقد تھے۔ انہوں نے سب کو جا کر کہا کہ شیخ بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ لہٰذا سب بیٹھ کر پڑھا کرو۔ سب نے کھڑے ہو کر نماز پڑھنی چھوڑ دی کہ شیخ بیٹھ کر پڑھ رہے ہیں ــــ انہیں کہا جائے گا کہ شیخ کی بیماری کا وہ حال بھی اپنے اندر پیدا کرو۔ جب بیٹھنے کی اجازت ہو گی۔ حال کا نشان نہیں اور شیخ کی نقالی کر رہے ہیں۔ یہ حرکات وجدی ہیں۔ وجد جب پیدا ہوتا ہے جب وہ حرکت سرزد ہوتی ہے۔ وجد آپ کے اندر رہے ہی نہیں اور ان کی نقلیں اتاریں۔ وہ نقل بھونڈی ہو گی۔ پھر شریعت اور احکام شرعیہ کی نقل اتاری جائے گی۔ ان احوال کی عظمت کی جائے گی۔ صاحب حال کو سر پر بٹھایا جائے گا۔ ان کی تعظیم کی جائے گی مگر قانون کے طور پر نہیں پیش کریں گے۔

مشائخ طریقت کے ذاتی احوال کو قانون عام بنانے سے نزاع پیدا ہوتا ہے

مگر یہ وہی سمجھ سکتا ہے۔ جس کے اندر معرفت کامل ہو۔ حق کی پہچان کامل ہو' قرب خداوندی حاصل

ہو' وہ یہ کر سکتا ہے کہ اتنی چیز میرے کرنے کی ہے۔ اتنی چیز میرے قبضے سے باہر ہے۔ میں نہیں کر سکتا ___ کسی کے ذاتی حال کو قانون بنا کر پیش کرنے سے جنگ شروع ہوتی ہے کہ علماء کھڑے ہوں گے' کہیں گے یہ ناجائز ہے' دوسرے کہیں گے یہ بزرگوں کے خلاف کر رہے ہیں' ہم تو بزرگوں کا حال پیش کر رہے ہیں۔ یہ کہیں گے بزرگوں کا حال قانون نہیں۔ قانون شریعت پر عمل کرو۔ عمل کرتے کرتے اس حال پر آجاؤ' جو ان بزرگ کا ہے پھر ہم تمہیں کوئی ملامت نہیں کریں گے بلکہ گردن جھکا دیں گے۔ مگر تم بلا حال کے کرو تو قانون شریعت کی نقالی کی جائے گی۔ لوگوں کے احوال کی نقالی نہیں کی جائے گی۔[1]

بعض احوال شخصی ہوتے ہیں قانون نہیں ہوتے۔ حضرت شیخ نظام الدینؒ بہت بڑے اولیائے کاملین میں سے ہیں ___ ایک تو خواجہ نظام الدین سلطان الاولیاءؒ ہیں۔ دوسرے مولانا نظام الدین ہیں۔ ایک شخص جو ان کے مریدین میں سے تھا' ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا :

حضرت! میرا جی چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھ لوں۔ کوئی تدبیر بتلا دیجئے"۔

فرمایا : "فرض نماز چھوڑ دو"۔

یہ حیران ہوئے کہ فرض نماز چھوڑنے سے اللہ کا قُرب پیدا ہوگا یا بُعد؟ نماز پڑھنے سے قُرب پیدا ہوتا ہے' نہ کہ نماز چھوڑنے سے؟ ___ حضرت فرما رہے ہیں کہ نماز چھوڑ دو' اللہ میاں کی زیارت ہو جائے گی ___ ادب سے بول کچھ نہیں سکا۔ مگر عمل کرنے کی جرأت نہیں کی' اس لئے کہ یہ بالکل خلاف شرع ہے کہ ترک نماز کا حکم دیا جائے۔ مگر وہ جذبہ اندر تھا کہ کسی طرح حق تعالیٰ کی زیارت ہو۔ تین چار دن کے بعد پھر حاضر ہوا کہ حضرت! میرا جی چاہتا ہے کہ کسی طرح سے اللہ کو خواب میں دیکھ لوں' کوئی تدبیر؟

فرمایا۔ بیوقوف بتلا تو دی کہ فرض نماز چھوڑ دو۔

اب یہ بے چارہ پھر چپ کہ شیخ کیسے فرما رہے ہیں۔ پھر جرأت نہیں ہوئی۔

تیسری دفعہ چند دن کے بعد پھر کہا۔ فرمایا تو احمق میرا وقت ضائع کر رہا ہے۔ تدبیر بتلا دی کہ فرض نماز چھوڑ دو۔

ایک دن جا کے یہ جرأت تو نہ ہوئی کہ فرض چھوڑ دے۔ فرض پڑھ لئے۔ سنتیں چھوڑ دیں رات کو خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ فرما رہے ہیں کہ

بھائی! ہم نے کیا قصور کیا تھا جو ہماری سنتیں چھوڑ دیں۔

یہ جلدی سے گھبرا کے اٹھا' وضو کیا' عشاء کا وقت باقی تھا۔ جلدی جلدی سنتیں ادا کیں ___ صبح کو حضرت شیخ نظام الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کیا حضرت یہ واقعہ گزرا۔ فرمایا :

"اگر فرض چھوڑتا تو اللہ میاں آ کے پڑھواتے۔ تو نے سنتیں چھوڑنے پر قناعت کی"۔

شریعت و طریقت کو محقق ہی ایک ساتھ لے کر چل سکتا ہے

اب یہ ایک مسئلہ آیا۔ اس میں دو پہلو نکلتے ہیں۔ بے ادبی کا یہ پہلو ہے کہ مولانا شیخ نظام الدین نے سخت غلطی کی فرض نماز چھڑانے میں۔ اللہ تو نماز فرض کرے' وہ کہیں چھوڑ دو۔ ہم نہیں ان کی بات مانتے۔ ان کی بات کو دیوار پر مارو۔ یہ بھی ہلاکت کا راستہ ہے کہ ایک شیخ وقت کی شان میں گستاخی کی جائے۔

---

[1] جلد دوم "راہ اعتدال" میں یہی واقعہ مولانا فخرالدین نظامی کے نام سے بیان کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

اور ایک راستہ یہ نکلتا ہے کہ بھئی! ہم نہیں جانتے۔ قرآن وحدیث میں کیا ہے۔ نماز فرض ہے یا نہیں؟

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید

شیخ وقت جو کہہ دے وہ قرآن ناطق ہے ہم اس پر عمل کریں گے۔ ہمیں خبر نہیں قرآن وحدیث میں کیا ہے ــــ یہ بھی ہلاکت کا راستہ ہے۔ کہ شیوخ طریقت کی وجہ سے قرآن وحدیث کو ترک کیا جائے یا قرآن و حدیث کا نام لے کر شیوخ کے طُرق کو رد کر دیا جائے۔ دونوں راستے تباہی اور ہلاکت کے ہیں۔ نہ قرآن وحدیث کی بے ادبی جائز نہ اکابر اولیاء اللہ کی بے ادبی جائز۔ معتدل حق راستہ یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں قرآن کا دامن رہے اور ایک ہاتھ میں بزرگوں کا دامن رہے اور جامع راستے پر چلے ــــ مگر یہ راستہ محقق سمجھ سکتا ہے، غیر محقق کے بس کی چیز نہیں ہے۔

مجھے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں یہی واقعہ پیش کیا گیا بعض نے تو کہا ہم نہیں مانتے۔ یہ قرآن وحدیث کے خلاف ہے۔ اس بات کو رد کرو۔ بعض نے کہا ہم مانتے ہیں، ہم نہیں جانتے ان کاغذوں میں لکھے ہوئے قرآن وحدیث کو۔ فرمایا یہ دونوں راستے تباہی کے ہیں۔ معتدل اور حق راستہ یہ ہے کہ دونوں کی عظمت قائم رہے اور آدمی بیچ میں سے نکلے ــــ فرمایا وہ (معتدل اور حق راستہ) کیا ہے؟

واقعی یہ تحقیق کی بات ہے۔ فرمایا پہلے ایک بات سمجھ لو، اس کے بعد مسئلہ سمجھ میں آجائے گا۔

فرمایا اولیاء اللہ کے دو طبقے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو اپنی ریاضت، محنت اور مجاہدے کرتے کرتے کسی بڑے مقام پر پہنچ جائے۔ کوئی قطب، کوئی غوث بنا، محنتیں اور ریاضتیں کیں اور بڑے مقام تک پہنچ گئے۔

اور ایک وہ ہے کہ حق تعالیٰ اسے منتخب فرمالیں کہ اسے اس مقام کے اوپر لانا ہے۔ وہ نہیں بھی چاہے گا تو زبردستی ایسے اسباب پیدا ہوں گے کہ وہ اس مقام پر پہنچے گا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک شخص اپنی محنت، دیانت سے بڑے عہدوں تک پہنچ جائے۔ سپاہیوں میں ملازم ہوا۔ دیانت داری سے کام کیا تو وہ ہیڈ کانسٹیبل بن گیا اور محنت سے کام کیا تو اور اوپر کا عہدہ مل گیا اور محنت سے کام کیا تو وزیر پولیس بن گیا اور اونچے مقام تک پہنچ گیا ــــ اور ایک وہ ہے کہ شاہی خاندان کا ایک فرد ہے اور حکومت نے چاہا کہ یہ ولی عہد ہو۔ اس کو تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر وہ بھاگے گا بھی، زبردستی تعلیم دی جائے گی تاکہ اس کو نیابت کے عہدے پر لائیں اور ولایت عہد سپرد کریں ــــ اولیاء میں یہ دونوں طریقے ہیں۔ بعض اپنی محنت سے مقامات طے کرتے ہیں۔ بعض منتخب ہوتے ہیں کہ وہ نہ بھی آنا چاہیں تو زبردستی انہیں لایا جاتا ہے ــــ جیسا کہ حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا، آپ مجلس مبارک میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک دم آپ مسکرائے، ہنسے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ما یضحک؟ کس چیز نے ہنسایا۔

فرمایا، میں دیکھ رہا ہوں، بعض لوگ جنت میں داخل ہونا نہیں چاہتے۔ ان کے پیروں میں زنجیریں ڈال کر جنت میں لے جانے کے لئے کھینچا جارہا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو منتخب کر لیا جاتا ہے۔

تو صوفیاء کی اصطلاح میں جو اپنی محنت سے مقامات طے کرے اسے مرید کہتے ہیں اور جو اللہ کی طرف سے منتخب ہو اسے مراد کہتے ہیں۔ تو ایک مرید ہے جو اپنی ارادت اور عقیدت سے ترقی کر رہا ہے اور ایک مراد ہے کہ جس کو منتخب کر لیا گیا ہے۔ وہ نہیں چاہے گا تو زبردستی اسے اونچے مقام پر پہنچائیں گے۔

قرآن کریم میں بھی یہ دونوں مقامات بیان کئے گئے مگر قرآن کی اصطلاح دوسری ہے جو لوگ اپنی محنت سے آگے بڑھتے ہیں۔ انہیں قرآن میں مُنیب کہتے ہیں۔ یعنی اِنَابَتْ اِلَی اللہ اور رُجوع اِلَی اللہ کے راستے سے

ترقی کر کے پہنچتے ہیں اور جو منتخب کئے جاتے ہیں انہیں مجتبیٰ کہتے ہیں۔ جس کو ارشاد فرمایا :

اَللّٰهُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ۔ (الشوریٰ پ۲۵ آیت ۱۳)

اللہ جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے، اسے مقامات پر پہنچاتا ہے اور جو ہدایت، اِنابت اور محنت کا راستہ اختیار کرے، اسے ہدایت دیتا ہے۔ اسے مدد دے کر مقامات تک پہنچادیتے ہیں تو ایک **مجتبین** کی جماعت ہے اور ایک **منیبین** کی جماعت ہے اور صوفیاء کی اصطلاح میں ایک مُریدین اور ایک مرادین کی جماعت ہے۔

یہ فرما کر اب حضرت حاجیؒ صاحب نے فرمایا کہ وہ بیچ کا راستہ کیا ہے کہ نہ مولانا نظام الدّین کی بے ادبی لازم آئے نہ کتاب وسنت کی۔ فرمایا کہ یہ شخص جس نے یہ درخواست کی تھی کہ اللہ کو خواب میں دیکھوں۔ اس بارے میں مولانا نظام الدّین نے یہ جان لیا تھا کہ یہ مُریدین میں سے نہیں ہے، مرادین میں سے ہے اگر یہ نماز ترک کرے گا۔ اس سے زبردستی پڑھوائیں گے۔ کیوں کہ اللہ کے یہاں منتخب کیا جاچکا ہے، اس لئے تدبیر بتلائی کہ فرض نماز چھوڑ دے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ چھوڑ سکتا ہی نہیں۔ اس سے پڑھوائیں گے اور زیارت بھی ہوجائے گی۔ اب اس میں کتاب وسنت کی عظمت بھی اپنی جگہ قائم رہی اور اکابردین کی عظمت بھی قائم رہی۔

بلا تربیت وصحبت محقّق نہیں ہوسکتا

مگر اسے محقّق سمجھے گا غیر محقق نہیں۔ غیر محقّق یا مولانا نظام الدّین کی توہین کرے گا یا کتاب وسنت کو ترک کردے گا اور یہ دونوں راستے تباہی وبربادی کے ہیں۔ نجات کا راستہ یہ ہے کہ قرآن کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے اور اہلُ اللہ کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ ان کی عظمت بھی اور کتابُ اللہ کی عظمت بھی دل میں جاگزیں ہو۔ مگر اس کے لئے ضرورت ہے کہ تربیت ہو، محققین کی صحبت میسّر ہو، اولیائے کاملین کی زیارت کے ساتھ ساتھ ان کا معالجہ نصیب ہو۔ تب آدمی کہیں محقق بنتا ہے۔ محض کتاب دیکھ لینے اور بزرگوں کا کلام سُن لینے سے محقق نہیں بنتا جب تک کہ محنت کر کے تربیت نہ پائے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ ؎

ماہ ہا باید تایک پنبہ دانہ بعد کشت
جامہ گرد شاہدے را یا شہیدے را کفن

مہینوں کی مدّت چاہئے کہ ایک بنولے کا دانہ منوں مٹی کے اندر جائے۔ اپنی ہستی کو فنا کرے۔ اس میں سے درخت پیدا ہو۔ اس میں سے روئی نکلے، اس سے لباس بنے پھر کہیں جاکے کسی محبوب کا لباس بنے اور دنیا اس کی قدر کرے۔ تو بنولہ کا دانہ اگر اپنی ہستی کو مٹا کر روئی کی صورت میں اپنے کو نہ پیش کرتا۔ نہ شہید کے لئے کفن میسّر آتا اور نہ محبوب کے لئے لباس اور کہتے ہیں کہ ؎

قرنہا باید تایک سنگ خاراز آفتاب
لعل گرد دربدخشاں یا عقیق اندریمن

قرنہا قرن کی مدّت چاہئے کہ سنگ خارا کا ایک ٹکڑا آفتاب کی گرمی سہتے سہتے صدیوں میں جاکے لعل بدخشانی بنے اور بازار میں لاکھوں روپے اس کی قیمت اٹھے۔ مگر جب تک وہ سنگِ خارا آفتاب کی گرمی اور آفتاب کی تپش کو نہیں سہے گا اور اپنے کو جلا کر پھونک نہیں دے گا۔ لعل بدخشانی نہیں بنے گا ___ اور اسی طرح سے کہا ہے کہ

سالہا باید تایک کود کے از درسِ علم
عالمے گرد نکو، یا شاعرِ شیریں سخن

سالہا سال کی مدّت و محنت چاہئے کہ ایک نادان بچہ سات آٹھ برس میں جاکے عالم بنے یا شاعرِ شیریں سخن بنے۔ گھر بیٹھے علم کی دولت نہیں ملتی۔ بلا محنت کے باتیں بنانے سے یہ مقام میسّر نہیں آتا۔ اپنی جان کو سوہان لگانی پڑتی ہے، جان کو جلانا پڑتا ہے، تب جاکے وصل کا مقام میسّر آتا ہے۔

عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

باطن کے بادشاہ

اور ؎

مبین حقیر گدایانِ عشق راکیں قوم
شہان بے کمر و خسروان بے کلاہ اند

یہ مُلّانے اور درویش بے چارے، انہیں حقیر مت سمجھو۔ یہ بادشاہ ہیں گو سر پہ تاج نہیں ہے۔ یہ بادشاہ ہیں گو کمر میں سونے کا پٹکا بندھا ہوا نہیں ہے۔ مگر سلاطین ان کے آگے جھکتے ہیں۔ یہ سلاطین کے آگے نہیں جھکے۔ ان کو اللہ نے بڑی دولت دی ہے۔ جو باطن کی دولت ہے ظاہری دولت والے نہیں جانتے کہ انہیں کیا دولت میسر ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ محدّث ہیں۔ جلیل القدر عالم اور امامت کا رتبہ رکھتے ہیں جب کوئی فقہ کا مسئلہ حل ہوتا تو بعض دفعہ رقص کرنے لگتے۔ وجد میں آکے ناچنے لگتے اور کہتے کہ :

این ابناء الملوک من هٰذه النعمة

کہاں ہیں بادشاہ زادے کہ ہماری اس دولت کو دیکھیں۔ اچھا ہوا کہ یہ اندھے ہیں اگر یہ اس دولت کو سمجھ لیتے تو شاید اس دولت کو چھیننے کے لئے تلواریں لے کر ہم سے جہاد کرتے۔ مگر ان کی آنکھیں بند ہیں۔ اس لئے ہماری دولت محفوظ ہے ___ تو ایک باطنی دولت کے اور ایک ظاہری دولت کے بادشاہ ہیں۔ ظاہری دولت والے باطن والوں کے آگے جھکے ہیں۔ بشرطیکہ باطن ہو، اربابِ باطن ہوں، اربابِ بطن نہ ہوں۔ محض پیٹ کے بندے نہ ہوں کہ کھاپی لیں۔ اربابِ باطن ہوں تو اربابِ ظاہر ان کے آگے جھکتے ہیں۔

اہل اللہ کے قدموں میں دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی آتی ہے

حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ خاندان کے اکابر مشائخ میں سے ہیں۔ ان کے ہاں تقریباً ہزار ڈیڑھ ہزار مہمانوں کا روزانہ دونوں وقت ہجوم رہتا تھا۔ نواب میر خاں جو ریاست ٹونک کے والی تھے۔ وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے مرید تھے۔ ان کے دل میں فکر پیدا ہوئی، میرے شیخ کے ہاں ہزار دو ہزار مہمان رہتے ہیں بڑی پریشانی رہتی ہوگی۔ شیخ کی کوئی جائداد نہیں اور تجارت و ملازمت نہیں ہے۔ بڑے پریشان رہتے ہوں گے کہ مہمانوں کو کہاں سے کھلاؤں گا تو انہوں نے ریاست ٹونک کا ایک پورا ضلع جس کی سالانہ آمدنی کئی لاکھ روپے تھی۔ پیتل کے پترے پر لکھ کر بھیجا کہ حضرت کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ تاکہ آپ کو مہمانوں کی مہمانی میں دشواری نہ ہو۔

حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ نے اس پیتل کے پترے پر جواب لکھا۔ عجیب جواب تھا۔ لکھا کہ ؎

ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم
بامیر خاں بگوئے کہ روزی مقدراست

ہم اپنے فقروفاقہ کی آبرو نہیں کھونا چاہتے میر خاں سے کہہ دو کہ روزی مقدّر ہے آسمان سے آرہی ہے۔ تیرے ضلع کی ہمیں ضرورت نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے حکومتوں کو ٹھکرادیا ہے اور حکومت والے پیش پیش ہیں۔

اسی مقام کو حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو اللہ ورسول کا ہو جاتا ہے تو **اتت الدنیا وھی راغمۃ** دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی قدموں میں آکر پڑتی ہے' وہ ٹھکراتے ہیں اور وہ زبردستی قدموں میں گرتی ہے۔ دنیا کے بندے خود دنیا کے قدموں میں گرتے ہیں اور وہ ٹھوکریں مارتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک غنی بن کے کماتا ہے ایک محتاج بن کے کماتا ہے۔ اہل اللہ بھی کماتے ہیں مگر غنی بن کر۔ اہل دنیا بھی کماتے ہیں مگر محتاج وفقیر بن کر۔ ایک فقیر الی اللہ ہے' ایک فقیر الی الدّنیا ہے۔ جو اللہ کا فقیر ہے دنیا سے وہ بھی محروم نہیں رہتا۔

اس دنیا کا حاصل یہی ہے کہ آدمی پیٹ بھر لے' لباس سے تن ڈھانپے۔ کون سا اللہ والا ہے جسے کھانے کو میسر نہیں؟ اب رہا یہ کہ ان کے پاس بڑی کوٹھی بنگلہ نہیں۔ وہ چاہتے ہی کب ہیں کوٹھی بنگلے کو؟ وہ تو ایک جھاڑ کے نیچے گزر بسر کرنے کو بہت سمجھتے ہیں۔ یہ تو جب ہو جب وہ آپ کے بنگلوں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں۔ آپ انہیں لالچی کہیں۔ مگر انہیں کوئی لالچ نہیں۔

اہلُ اللہ تارکُ الدّنیا ہیں

حقیقت میں یہ لوگ تارکُ الدنیا ہیں کہ دنیا پر قابو پاتے ہیں اور پھر ترک کرتے ہیں اور جس کے ہاتھ میں ہی دنیا نہ ہو اور وہ کہے کہ میں ترک کر رہا ہوں وہ متروکُ الدنیا ہے' تارکُ الدنیا نہیں ہے۔ دنیا نے اسے ترک کردیا۔ دل میں اس کے ہے کہ دنیا آئے مگر دنیا اس کو چھوڑ چکی ___ اسلام نے لوگوں کو تارک الدنیا بنایا ہے' متروکُ الدنیا نہیں بنایا۔ دنیا پر قابو پاکر' پھر اس کو ترک کرو۔ خواہ ہاتھ سے خواہ قلب سے اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم دولت مندمت بنو اور بھک منگے بنو۔ مسلمان بھک منگا اور سائل بننے کے لئے نہیں آیا۔ وہ دنیا کو دینے کے لئے آیا ہے' دنیا سے مانگنے کے لئے نہیں آیا۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کماؤ۔ **کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ** نیک اور پاک کمائی ہر مسلمان کے اوپر فرض ہے اور اللہ اس میں برکت دے دے۔ تو یہ نہیں کہ جا کے سمندر میں ڈبو دے۔ اپنے مصرف میں خرچ کرو' دولت مند بھی بنو۔ خدا اگر کروڑ پتی بنائے بن جاؤ۔ اسے ضائع مت کرو۔ مگر قلب کا تعلق اس سے نہ رکھو۔ قلب کا تعلق اللہ سے رکھو' ہاتھ پیر کا دنیا سے رکھو۔ دنیا ترک نہیں کرائی کہ تم بھک منگے بن کے بیٹھ جاؤ۔ دنیا کو قلب سے ترک کرایا۔ ان کی شان یہ ہے کہ

ع دل بیار دست بکار

ہاتھ پیر کاروبار میں لگے ہوئے اور دل اپنے مالک میں لگا ہوا یہ اسلام کی تعلیم ہے نہ یہ کہ تم دنیا ترک کر کے پہاڑوں میں جا کے بیٹھ جاؤ۔ اس کو رہبانیت فرمایا۔ اسلام میں گوشہ گیری نہیں دنیا کے اندر کماؤ بھی۔ چاہے خدا کروڑ پتی بنائے' اس کی قدر کرو اور اسے اپنے مصارف میں خرچ کرو۔ مگر دل کا تعلق اللہ سے ہو۔

اولیاء اللہ کا یہی کردار اور کریکٹر تھا۔ یہی ہیں وہ علمائے دیوبند جو ان اکابر اولیاء اللہ کے جانشین ہیں شاہ

ولی اللہؒ، شاہ غلام علیؒ، مرزا مظہر جان جاناںؒ، حضرت جنیدؒ اور عبد اللہ ابن مبارکؒ کے۔
حضرت عبد اللہ ابن مبارکؒ تقریباً دو ہزار اشرفی ہر وقت پاس رکھتے اور بعض دفعہ مجلس میں بیٹھ کر انہیں خوب اُچھالا کرتے۔ لوگوں نے عرض کیا، حضرت آپ اور یہ اشرفیاں اور اس طرح اچھال رہے ہیں؟ فرمایا:

لولا هذه الدنانير لتمندل بنا هؤلاء الملوك

اگر یہ درہم اور دنانیر روپیہ پیسہ ہاتھ میں نہ ہو یہ بادشاہ زادے تو ہمیں ناک پوچھنے کا رومال بنالیں۔ ہم بتلادیتے ہیں جو تمہیں میسر ہے، وہ ہمیں بھی میسّر ہے۔ ہم تمہارے محتاج نہیں۔ لیکن جو ہمیں میسّر ہے وہ بقدر ضرورت بھی تمہیں میسّر نہیں۔ تم ہر حالت میں محتاج ہو کہ ہم سے آکر سیکھو۔
تو اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سائل و مفلس بنانا مقصود نہیں، غنی بنانا مقصود ہے۔ وخير الغنىٰ غنى النفس غنی اور امیری قلب کی امیری ہے۔ ہاتھ پیر میں چاہے لاکھوں روپے ہوں۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں بیٹھ کر ایک ایک دن کے اندر کئی کئی لاکھ روپے اپنے دست مبارک سے تقسیم کئے ہیں۔ تو یہ شان بتلائی گئی کہ دنیا قبضے میں بھی کرو۔ پھر قلب سے ترک کرو اور اگر دنیا ملتی نہیں اور کہا ہم تارکُ الدنیا ہیں، تارکُ الدنیا نہیں متروکُ الدنیا ہو۔ دنیا نے تمہیں ترک کر رکھا ہے۔ جیسے نامرد اور عِنّین یوں کہے کہ میں بڑا پارسا ہوں کہ میں عورت کے پاس نہیں جاتا لوگ کہیں گے تجھ میں جانے کی طاقت کہاں ہے؟ تو کہاں سے متقی بن گیا۔ متقی وہ ہے کہ جانے کی طاقت ہے پھر بھی نہیں جاتا۔ اللہ کے خوف سے ڈرتا ہے نہ کہ نامرد ہونے کا نام متقی ہے۔ بہرحال تارکُ الدنیا وہ ہے کہ دنیا قبضے میں ہے۔ پھر ترک کر رہا ہے۔ وہ تارکُ الدنیا نہیں کہ دنیا ہاتھ میں نہیں، للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے اور لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے کہ میں تارکُ الدنیا ہوں۔

اَدب و عظمت کے حامل کتابُ اللہ کے سچّے وارث ہیں

بہرحال میرا مطلب یہ ہے کہ دین کی بنیاد ادب و تأدّب پر ہے، عظمت شریعت کا ادب، اولیاء اللہ اور علماء ربّانی کا ادب، کتابُ اللہ کا ادب، بیت اللہ کا ادب، مدارسِ دینی اور خانقاہوں کا ادب۔ ان سارے ادبوں پر دین کا مدار ہے۔ بے ادبی اور گستاخی میں آدمی کا دین نہیں بنتا۔
پھر ادب کے بعد اِتّباع ہے کہ قرآن، حدیث، فقہ، اجماعِ امّت کا اِتّباع اور اس ذوق کا اِتّباع جس کے اوپر پوری امّت کے صلحاء چل رہے ہیں اس سے الگ ہو کر خیال آرائی اور تخیّل سے کوئی پگڈنڈی بنانا، اسلام نے ان سب کو رد کیا ہے کہ یہ دین نہیں ہے، دین وہی ہے کہ نقل صحیح، ذوق سلیم کے ساتھ اِتّباع اور ادب کے ساتھ اسے قبول کیا جائے اسی کو اس آیت میں ظاہر فرمایا گیا کہ حق و باطل کا معیار یہ ہے کہ۔

وَالَّذِىٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ۔ (فاطر پ۲۲ آیت ۳۱)
”اے پیغمبر! جو ہم نے آپ کی طرف کتاب کی وحی کی ہے۔ وہی ہے حق، وہی مصدّق ہے۔ اس کی تصدیق اور تکذیب سے آدمی سچا اور جھوٹا سمجھا جائے گا“۔

اور فرمایا

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (ایضاً)

ہم نے ایک جماعت کو اس کتاب اللہ کا وارث بنایا۔ کن لوگوں کو بنایا؟ جن کو ہم نے منتخب اور پسند کر لیا

تھا کہ ان سے ہمیں دین کا کام لینا ہے‘ اس میدان میں ان سے کام لینا ہے۔

ظاہریات ہے کہ وراثت تو باپ سے ہی ملتی ہے۔ کوئی پیدا تو نہیں کرتا۔ پیدا شدہ کمائی کو وراثت نہیں کہتے۔ وراثت تو وہ ہے جو باپ کا ترکہ ہو اور مل جائے۔ اور ترکہ کب ملے گا؟ جب نسب نامہ ثابت ہو۔ یعنی باپ کا بیٹا ہونا ثابت ہو‘ تبھی ترکہ ملے گا اور اگر یہی ثابت نہ ہو کہ یہ مرنے والے کا بیٹا ہے تو اجنبی آدمی کو کبھی بھی ترکہ نہیں ملے گا۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا روحانی ترکہ علم اور کمال ہے۔ وہ جب ملے گا‘ جب روحانی نسب نامہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہوا ہو کہ میرا شیخ یہ ہے‘ اس کا شیخ یہ‘ اس کا آگے شیخ وہ۔ سلسلے سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد ثابت ہو‘ تو ترکہ ملے گا اور اگر بیچ میں کوئی کڑی کٹ گئی اور سلسلہ متصل نہ پہنچا۔ تو وہ ایسا ہے جیسے بے باپ کی اولاد ہو کہ بیچ میں باپ ہی ندارد ہے۔ پھر ترکہ کہاں سے مل جائے گا؟ اس لئے کہ یہ علمی وراثت نسبت سے ملتی ہے۔ جیسا کہ مال ودولت کی وراثت نسب سے ملتی ہے۔ یہ نسب مادی ہے‘ وہ نسب روحانی ہے۔ اس کو فرمایا گیا :

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا

”پھر ہم نے کتاب اللہ اور علم کا ان لوگوں کو وارث بنایا‘ جن کو ہم نے اس کام کے لئے چن لیا تھا“۔

اب فرمایا‘ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ بعض ان میں گندے انڈے نکل گئے کہ انہوں نے یا کتابُ اللہ کو پس پشت ڈال دیا یا کتاب اللہ کو اپنی رائے کے تابع کیا یا تھوڑے تھوڑے حیلے کر کے معنوی تحریف شروع کی۔ فرمایا یہ اپنے نفس پر ظالم ہیں۔ ان کو اس کی جزا اور صلہ ملے گا۔

اور فرمایا وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ بعض ان میں وہ ہیں کہ درمیانی راہ سے اللہ کے راستہ پر چل رہے ہیں۔ ادھر اُدھر نہیں ہٹتے۔ بٹیہ اختیار کرلی۔ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے۔ وہ بھی نجات پائیں گے ___ اور فرمایا :

وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ

بعض وہ ہیں جو اس راستے پر دوڑ رہے ہیں اور دین کی کوئی جزئی چھوڑنا نہیں چاہتے‘ ہر حیثیت سے دین کو مضبوط تھامے ہوئے ہیں اور دین کی طاقت ہاتھ میں لے کر خراٹے بھر رہے ہیں۔ وہ سابقِ خیرات ہیں ___ جیسے گھوڑ دوڑ کے میدان میں گھوڑا آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے یہ اس روحانی میدان میں کوشش کرتے ہیں کہ ہم آگے نکل جائیں۔ اس طرح سے دوڑنے میں مصروف ہیں ___ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اللہ نے اس لائن پر لگادیا ہے تو کوئی دوڑ رہا ہے‘ کوئی لپک رہا ہے‘ کوئی معمولی چال چل رہا ہے‘ کوئی اِدھر اُدھر ہٹ کر اس بٹیہ سے ہٹ گیا۔ وہ منزلِ مقصود سے رہ گیا۔ لوگوں کی انواع واقسام ہیں۔ اس لئے ہمارے اور آپ کے لئے ضروری ہے کہ ہم صحیح معنیٰ میں کتاب اللہ کے وارث بنیں۔ انہی معنیٰ پر چلتے رہیں جو روایات ہو کر چلے آرہے ہیں۔ جس میں سلَف کا ذوق اور سلَف کا تعامُل شامل ہے اور جس میں وہ مذاقِ دینی شامل ہے۔ جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تربیت کی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن وحدیث کے محض الفاظ ہی منقول نہیں ہیں‘ معنی بھی منقول ہیں اور معانی ہی منقول نہیں بلکہ تربیت کا وہ ذوق بھی سلسلہ وار چلا آرہا ہے۔ جس ذوق پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور عمل کا نمونہ بھی دکھلایا کہ اسی نمونہ کے عمل پر رہو۔ اس لئے آپ کے بارے میں فرمایا گیا کہ آپ کی چار شانیں ہیں۔ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ اللہ کی آیتیں با مانت الفاظ آپ نے پہنچادیں۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ پھر

تعلیم کے ذریعے ان کی مرادات ربّانی بیان کیں۔ وَالْحِکْمَۃَ پھر عملی اُسوہ بھی پیش کیا کہ یوں عمل کرو یہ نمونہ ہے جس کو میں کر کے دکھلا رہا ہوں اور فرمایا' وَیُزَکِّیْھِمْ دلوں کو مانجھ کر اس میں استقامت بھی پیدا کی۔ کجی نکال دی اور زیغ نکال دیا ___ ان مجاہدات اور محنتوں کے بعد استقامت نصیب ہوتی ہے۔ نہ یہ کہ آدمی نے چند حرف دیکھ لئے۔ کسی کی بات سن لی اور رائے دینی شروع کر دی۔ یہ چھچھورپن ہے یہ کوئی سنجیدگی کی بات نہیں ہے۔ جس کا آدمی علم نہیں رکھتا۔ اس میں کبھی رائے نہ دے ___ مثلاً سنہار کا کوئی مسئلہ آئے گا' اگر آپ سے کوئی کہے کہ زیور کیسے بنتا ہے؟ آپ کہیں گے میں جانتا نہیں سنہار کے پاس جاؤ یا لوہاری کی بات ہو۔ آپ یہ کہتے ہوئے عار نہیں کریں گے کہ بھئی! میں لوہار نہیں۔ اگر آپ کو لوہا کٹوانا ہے تو لوہار کے پاس جاؤ۔ مگر جب دین کی بات آتی ہے تو لوگوں کو اپنے کو جاہل کہتے ہوئے عار آتا ہے۔ اس میں رائے زنی کے لئے تیار ہیں۔ گویا دین ایک کھلونا ہے۔ جس کا جی چاہے اس میں رائے زنی کرے۔

اس واسطے میں نے یہ عرض کیا جزئیات پیش کرنے کا موقع نہیں۔ میرے پاس بھی وقت کم ہے' آپ کے پاس بھی۔ اس لئے اصول میں نے عرض کر دیا۔ ایک کسوٹی پیش کر دی۔ اس سے آپ جزئیات کو عمر بھر پر کھتے رہیں۔ اس سے آپ جزئیات کا فیصلہ کر سکیں گے ___ یہ چند ضروری باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔ وقت میں نے زیادہ لے لیا۔ خود میں اتنی ہمت اور طاقت بھی نہیں تھی۔ مگر شاید ان بزرگوں نے کوئی قلبی زور لگایا ہو۔ جس سے کچھ بات چل گئی ورنہ اپنے اندر تو طاقت تھی نہیں ___ بہر حال اب میں اس بات کو ختم کرتا ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو علم و عمل کی توفیق عطا فرمادے' صحیح وسیدھے راستے پر چلائے۔ زیغ اور کج راہوں سے ہمیں محفوظ رکھے اور اِدھر اُدھر کے تخیلات سے بچا کر صرف انہی روایات پر رکھے' جو سند صحیح کے ساتھ منقول ہوتی آ رہی ہیں ___ آمین

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ
وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

یادِ حق

زندگی فی الحقیقت ذکر اللہ اور اللہ کا نام ہے۔ جب کائنات، نباتات اور جمادات کی زندگی اس سے ہے تو انسان کی زندگی اس سے کیوں نہیں ہوگی؟ اس لئے انسان کو سب سے زیادہ ذاکر ہونا چاہئے تبھی وہ زندہ ہوگا ____ بلکہ زندہ جاوید بن جائے گا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ____ اَمَّا بَعْدُ ____

فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الذَّاکِرِ فِی الْغَافِلِیْنَ کَمَثَلِ الْحَیِّ فِی الْاَمْوَاتِ اَوْ کَمَا قَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ [1]

احوالِ واقعی

بزرگانِ محترم!
پہلے سے کوئی علم بھی نہیں تھا اور ارادہ بھی نہیں تھا کہ بیان بھی کرنا ہوگا .... لیکن حضرت مولانا نے ارشاد فرمایا کہ نماز سے پہلے کچھ نہ کچھ بیان ہوگا۔ ان کی تعمیلِ حکم کے طور پر میں آپ حضرات کے سامنے بیٹھ گیا ہوں۔ کوئی لمبی تقریر یا وعظ اس وقت نہیں ہوسکے گا بلکہ محض تعمیلِ ارشاد کے طور پر چند کلمات، اس حدیث کی روشنی میں گزارش کروں گا جو اس وقت میں نے پڑھی۔

تمہید

یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ:

مثل الذاکر فی الغافلین کمثل الحیّ فی الاموات۔

اس کی تفصیل سے پہلے اتنی بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اس دنیا میں ہر چیز کا ایک پیکر، بدن اور جثہ ہے اور ایک اس کی روح، زندگی اور حیات ہے۔ یہ ظاہری بدن جو آپ کو دیا گیا ہے۔ یہ خود مستقلاً انسان نہیں ہے۔

[1] مدینہ طیبہ زادھا اللہ شرفاً وکرامۃً — بتاریخ ۵-۱۱-۱۹۶۲

یہ انسان کی محض صورت اور علامت ہے۔ انسانیت اس جثہ کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ جو روح اور حقیقت صورت میں ہے۔ یہ اس حقیقت کی جو ہمارے اندر چھپی ہوئی ہے، محض نمائش اور نمود ہے۔ فی الحقیقۃ ہماری انسانیت وہی ہے اور اسی کا نام زندگی ہے۔

اگر وہ انسان کے بدن میں سے نکال دی جائے تو بدن کا کوئی وجود نہیں۔ چند دن روح کے پچھلے اثرا کے تحت رہے گا۔ جہاں دو تین دن گزریں گے اور زندگی کے جو تھوڑے بہت اثرات سرایت کئے ہوئے تھ وہ زائل ہو جائیں گے یہی بدن گلنا سڑنا اور پھٹنا شروع ہوگا۔ اس کا ریزہ ریزہ بکھر جائے گا۔ مٹی، مٹی میں جائے گی، پانی پانی میں، آگ آگ میں اور ہوا ہوا میں مل جائے گی۔ شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ اس بدن شیرازہ بندی اگر کر رکھی ہے تو روح نے کر رکھی ہے۔ روح نکلتے ہی بدن کی کوئی اصلیت نہیں۔ باطل محض۔ یہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ زندگی صورت کا نہیں حقیقت کا نام ہے۔ صورت اس زندگی کی محض نمائش و مظاہرہ اور دکھلاوا ہے۔

روحِ کائنات

یہی صورت سمجھ لیجئے اس پوری کائنات کی ہے۔ یہ جو ہماری مختصر بدن ""کائنات"" ہے وہ روح سے ز ہے۔ اسی طرح سمجھ لیجئے یہ پوری کائنات بھی کسی روح سے زندہ ہے۔ جب تک یہ روح اس کائنات میں موجود ہے، یہ کائنات زندہ کہلائے گی۔ جب روح نکال لی جائے گی، ساری کائنات کا خیمہ آپڑے گا، درہم بر ہو جائے گا، ریزہ ریزہ بکھر جائے گا ___ یہ روح کیا چیز ہے ___؟ جو روح انسان کے بدن میں ہے، وہی رو کائنات میں ہے۔ انسانی روح کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا :

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ اے پیغمبر! آپ سے لوگ روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ ۔ کہہ دیجئے روح اللہ کا ایک امر ہے۔ ایک حکم اور لطیفۂ خداوندی ہے۔ ا سے یہ کثیفۂ جسمانی سنبھلا ہوا ہے۔ وہ نکل جائے تو کثیفہ ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح سے پوری کائنات روح بھی در حقیقت لطیفۂ ربّانی ہے اور اس کا نام ذکر اللہ ہے۔ یادِ حق سے یہ کائنات کھڑی ہوئی ہے۔ جب اس سے ذکرِ خداوندی منقطع ہو جائے گا، جبھی یہ خیمہ آپڑے گا۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

لاتقوم الساعۃ حتی یقال فی الارض اللہ اللہ۔

قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی۔ جب تک اس کائنات میں ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موج ہے۔ جب ایک بھی باقی نہیں رہے گا اور سارے شرار الناس رہ جائیں گے جن کے دل میں نہ یادِ حق ہوگی ذکرِ خداوندی ہوگا نہ ان کی زبان ذکرِ الٰہی سے تر ہوگی۔ قلوب یکسر بھلا بیٹھیں گے۔ نہ صرف بھلا بیٹھیں بلکہ خالی ہو جائیں گے، ذکر مٹ جائے گا یعنی شرار الناس اور بدترین خلائق رہ جائیں گے جن کے بارے میں فرمایا گیا :

لایعرفون معروفاً ولاینکرون منکراً۔

""نہ اچھائی کو اچھائی جانیں گے نہ برائی کو برائی""۔

سڑکوں پر اس طرح سے بدکاری ہوگی جیسے جانور اور بہائم پھرتے ہیں۔ نہ حیا ہوگی نہ غیرت ہوگی۔ جب ساری کائنات اور سارے انسان ایسے بن جائیں گے۔ اسی وقت قیامت قائم کر دی جائے گی ___ تو قیام

ں عالم کو ذرہ ذرہ کر کے بکھیر دینے کا نام ہے۔ آسمان ٹوٹ پڑے گا' زمین پھٹ جائے گی' پانی میں مٹی اور مٹی ں پانی' ہوا میں میں آگ اور آگ میں ہوا سب گڈمڈ ہو کر قصہ درہم برہم ہو جائے گا اور سارا خیمہ دنیا کا ڑے گا۔ جس طرح روح کے نکلنے سے بدن کا شیرازہ بکھر جاتا ہے' اسی طرح پوری کائنات کا شیرازہ اس روح ے نکل جانے سے بکھر جائے گا جس کا نام ذکر اللہ اور یاد خداوندی ہے۔

اس سے معلوم ہوا اس کائنات کی روح ذکر خداوندی ہے یاد حق جب تک موجود ہے گی۔ کائنات کا خیمہ ڑا ہوا ہے' جب یہ نکل جائے گی، کائنات درہم برہم ہو جائے گی۔ تو ظاہر میں کائنات ہم سے اور آپ سے ھلی ہوئی ہے' حقیقت میں اللہ کے ذکر کرنیوالوں سے سنبھلی ہوئی ہے' جب تک یہ موجود ہیں کائنات موجود ے۔ جب یہ ختم ہو جائیں گے کائنات ختم ہو جائے گی ___ غرض اس ساری کائنات کا خیمہ یاد حق اور ذکر ے اوپر کھڑا ہوا ہے۔

کائنات کا ذرہ ذرہ یادِ حق میں مصروف ہے

یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام بتلاتی ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ذکر خداوندی میں مصروف ہے' ہر وقت یادِ کرتا ہے اور جب یاد منقطع ہوتی ہے وہی اس ذرے کے مٹنے اور ختم ہو جانے کا وقت ہوتا ہے۔ حدیث میں ر کہ ہری ٹہنی اللہ کا ذکر کرتی ہے' جب ذکر ختم ہو جاتا ہے، ٹہنیاں خشک ہو کر پتے جھڑ جاتے ہیں تو روحِ ں فی الحقیقت یاد خداوندی ہے جب تک موجود ہے درخت موجود ہے' نہیں ہوگی تو ختم ہو کر مٹ جائے گا۔ ں کے پتے جھڑ جائیں گے۔ یہ اس کی موت کا وقت ہوگا۔

قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے کہ ذرہ ذرہ اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے :

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (بنی اسرائیل پ۱۵ آیت ۴۴)

کائنات کا کوئی ذرہ نہیں ہے جو اللہ کے ذکر میں مشغول نہ ہو مگر تم اس کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔ تمہاری ن اور ہے کائنات کے ذرے کی زبان اور ہے۔ پرندے کی زبان اور ہے۔ وہ اپنی اپنی زبان میں اللہ کو یاد تے ہیں۔ تم ان کی زبان کو نہیں سمجھتے ___ اور تم ان کی زبان کیا سمجھو گے تم اپنے ہی بہت سے بھائی وں کی زبان کو نہیں سمجھتے۔ ایک پنجاب کا رہنے والا بنگلہ زبان نہیں جانتا۔ بنگال کا رہنے وال پشتو زبان نہیں نتا۔ ایک پختونستان کا رہنے والا ترکی زبان نہیں جانتا۔ ترکی کا رہنے والا عربی زبان نہیں جانتا۔ تو جو اپنے ئیوں کی زبان نہ سمجھے' وہ کنکریوں اور پرندوں کی زبان کیا سمجھے گا؟ لیکن زبان سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور آپ نہ سمجھیں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بنگلہ میں اللہ کو کوئی یاد نہیں کر رہا اور اگر آپ پشتو نہ سمجھیں تو یہ نہیں جائے گا کہ پشتو میں کوئی اللہ کا نام لینے والا نہیں ہے وہ نام لے گا' ذکر کرے گا آپ بیٹھے ہوئے منہ دیکھیں اس لئے کہ آپ اس کی زبان نہیں سمجھتے۔

اس کی بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے آپ ٹیلیگراف کے دفتر میں گئے ہوں گے۔ وہاں جا کے آپ نے تار ۔ دو تین روپے فیس کے ادا کئے' تار بابو نے پیتل کی کھونٹی پر ہاتھ رکھ کر کھٹ کھٹ کھٹ کرنا شروع یا۔ آپ نے کہا کہ میں نے تو یہ مضمون دیا تھا کہ میں فلاں تاریخ کو آرہا ہوں۔ یہ بیٹھا ہوا کھٹ کھٹ رہا ہے' اس کھٹ کھٹ کو اس مضمون سے کیا تعلق ہے ___؟ لیکن آپ کے سامنے تو وہ کھٹ کھٹ ی ہے۔ حقیقت میں اسی کھٹا کھٹ میں ایک ملک سے دوسرے ملک' ایک شہر سے دوسرے شہر میں علوم رہے ہیں۔ مگر آپ اس فن سے واقف نہیں اس لئے آپ نہیں سمجھتے۔ یہ اصطلاحات ہیں جن سے ایک

شہر سے دوسرے شہر کو مضمون چل رہا ہے۔ اگر آپ اس فن کو سیکھے ہوئے ہوتے اس کھٹ کھٹ کی اصطلاحات سے واقف ہوتے آپ کو فوراً پتہ چل جاتا کہ یہ کراچی سے لاہور کی طرف اور لاہور سے ڈھاکہ کی طرف کیا مضمون جا رہا ہے ــــ مگر آپ کو اصطلاحات کا علم نہیں اس لئے آپ حیرانی سے دیکھتے ہیں کہ کھٹ کھٹ کر رہا ہے میرا لکھایا ہوا مضمون کس طرح پہنچ جائے گا۔ مگر مضمون آپ کا ہے' اصطلاح اس کی۔ اور وہ دوسری جگہ جا رہا ہے۔

اسی طرح سے ایک پرندہ جب سیٹی بجاتا ہے آپ سمجھتے ہیں وہ سیٹیاں بجا رہا ہے حقیقت میں وہ ذکر اللہ کر رہا ہے۔ آپ اس کی زبان سے واقف نہیں ہیں۔ طوطا بولتا ہے وہ اللہ کی یاد کرتا ہے۔ آپ اس کی زبان سے واقف نہیں جیسا کہ آپ اپنے یورپ والے بھائی کی زبان سے واقف نہیں ہیں جو اپنی زبان میں خدا کو یاد کرے گا۔ آپ بیٹھے ہوئے منہ کو دیکھیں گے۔ تو کوئی پرندہ' درندہ' چرندہ ایسا نہیں ہے جو اللہ کے ذکر میں مشغول نہ ہو' مگر زبان اس کی ہے' فہم آپ کا نہیں ہے۔ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو ورنہ وہ تسبیح میں مشغول ہیں۔

حدیث میں ہے کہ سفید کپڑا اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ جب میل آنا شروع ہوتا ہے ذکر اللہ بند ہو جاتا ہے۔ وہی وقت اس کی فنا کا ہوتا ہے آپ نفرت سے بدن سے اتار کر پھینک دیتے ہیں جب تک دھوبی اس کو پاک صاف کر کے نہ لادے' جب سفید ہو جائے گا پھر ذکر میں مشغول ہو جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء لکھتے ہیں کہ جس شخص کو مسجد کا امام بنایا جائے' وہ میلے کپڑوں سے نماز نہ پڑھائے یعنی ایسے میلے کپڑے جن میں سے بدبو اٹھنے لگے۔ یوں تو کپڑا اگلے ہی دن میلا ہو جاتا ہے۔ علماء عربیت لکھتے ہیں کہ :

لذة الثوب يوم۔

کپڑے کی لذت ایک دن کی ہوتی ہے۔ اگلے دن سے میل آنا شروع ہو جاتا ہے۔ تو تھوڑا بہت میل فوراً شروع ہو جاتا ہے' لیکن ایسا میلا پن کہ پسینہ جذب ہوتے ہوتے زرد رنگ بن جائے' اس میں سے بدبو آنے لگے' اس کا رنگ بھی متغیر ہو جائے' شکل بھی بدل جائے۔ اس وقت امام کو ان کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھانا مکروہ ہے۔

اس کی ظاہری وجہ تو یہی ہے کہ امام فی الحقیقت اللہ کی بارگاہ میں تمام مقتدیوں کا وکیل ہے وہ قابل تعظیم ہے اس میں نفرت کی وجوہ نہ ہونی چاہئیں کہ مقتدی متنفر ہونے لگیں۔ اگر کپڑے غیر معمولی طور پر میلے ہوں تو مقتدیوں کو خلجان پیدا ہوگا کہ کس بے ڈھنگے آدمی کو آگے لا کے کھڑا کر دیا گیا۔ تو جو مقتدی اس کے بے ڈھنگے پن کے خیال میں مشغول ہوں گے اللہ سے ان کا کیا رابطہ قائم ہوگا؟ وہ تو امام کی مذمت میں لگے ہوئے ہیں کہ امام عجیب بے ڈھنگا ہے۔ امامت کے لئے کھڑا ہو گیا' بدبو اس میں سے آ رہی ہے۔ رنگ اس کا صحیح نہیں۔ یہ ہمیں خدا تک کیا پہنچائے گا ــــ؟ تو امام کے لئے ضروری ہے کہ صاف ستھرا ہو۔ کپڑے بھی صاف ہوں۔ تو ظاہری وجہ تو یہی ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو باطنی وجہ یہ ہے کہ سفید کپڑا ذکر اللہ میں مشغول ہو' ہے امام کے کپڑوں کا ذکر خود امام کی طبیعت کو ذکر اللہ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

جب اس کے ارد گرد ذکر اللہ کی آوازیں آ رہی ہیں اگرچہ وہ کانوں سے نہ سنی جائیں۔ ان آوازوں سے خود امام کے قلب میں ذکر اللہ کی رغبت پیدا ہوگی اور یاد حق تازہ ہو کر وہ اللہ کی طرف زیادہ متوجہ ہوگا تو مقتدی بھی اتنے ہی متوجہ ہو جائیں گے۔

آپ نے تجربہ کر کے دیکھا ہوگا کہ جب آدمی غسل کر کے صاف کپڑے پہنتا ہے تو بے اختیار دل سے الحمد للہ نکلتا ہے، طبیعت میں شگفتگی ہوتی ہے اور جب کپڑے میلے ہوتے ہیں تو انقباض اور تشتت دل میں پیدا ہوتا ہے، اللہ کا نام لینا بھی چاہتا ہے تو زبان سے نہیں نکلتا، طبیعت میں انقباض ہے۔ یہ حقیقت میں کپڑے کے ذکر کا اثر ہوتا ہے جو انسانی قلب پر پڑتا ہے۔

اگر سبزے میں بیٹھیں گے ذکر اللہ کی زیادہ توفیق ہوگی جھاڑ پھنکار میں بیٹھیں گے، کم ہو جائے گی۔ اس لئے سبزہ خود تسبیح میں مشغول ہے ___ اکثر اہل اللہ کو دیکھا گیا ہے کہ دریا کے کنارے سبزے پر جا کر ذکر اللہ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماحول کا ذکر ان کے قلوب کے اوپر مؤثر ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ جب رک جاتا ہے تسبیح بند ہو جاتی ہے۔ چلتا ہوا پانی ذکر کی حیات کی وجہ سے درحقیقت زندہ ہے اور جب ٹھہر گیا جسے ماء راکد کہتے ہیں اس میں تغیر آجاتا ہے وہ سڑ جاتا ہے، خراب ہو جاتا ہے، تسبیح بند ہو جاتی ہے۔ تسبیح کا بند ہونا ہے کہ لطافت کی روح اس میں سے کھنچ جاتی ہے، اس کے اندر کثافت پیدا ہو جاتی ہے۔ بہرحال چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے، سبز ٹہنیاں اللہ کی تسبیح کرتی ہیں، سفید کپڑا اللہ کی تسبیح کرتا ہے، کنکریاں تسبیح کرتی ہیں۔ بہرحال تمام چیزیں ذکر میں مشغول ہیں ہم آپ سمجھتے نہیں ہیں۔

مخلوقات کی تسبیح کے بارے میں اہلِ باطن کا ادراک

اہلِ باطن کو کبھی کبھی علم دیدیا جاتا ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کی تسبیح کو سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں انبیاء علیہم السلام کو بطور معجزے کے یہ علم دیا جاتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام کا معجزہ یہی تھا کہ وہ پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے۔ سلیمان علیہ السلام کا مقولہ قرآن حکیم میں نقل کیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (نمل پ ۱۹ آیت ۱۶)

"اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھلائی گئی ہیں"۔

سلیمان علیہ السلام بتلا دیتے تھے کہ یہ دو کوّے آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں اور یہ دو چڑیاں کیا کہہ رہی ہیں۔

احادیث میں تقریباً مختلف جانوروں کی اٹھارہ انیس مثالیں دی گئی ہیں اور ان کی تسبیح ذکر کی گئی ہے۔ تیتر یہ کہتا ہے اور مور یہ کہتا ہے۔ فلاں کی یہ تسبیح ہے، فلاں کا یہ ذکر ہے ___ تیتر کے بارے میں حدیث میں ہے کہ اس کی تسبیح یہ ہے کہ:

كما تدين تدان۔

"جیسا کرو گے ویسا بھرو گے"۔

یہ ایک نصیحت ہے جو اس کی زبان سے ہر وقت نکلتی رہتی ہے ___ بعض کی یہ تسبیح ہے کہ:

سبحان من زيّن الرجال باللّحى وزيّن النساء بالذوائب۔

پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو داڑھیوں سے زینت دی اور عورتوں کو مینڈھیوں اور چوٹیوں سے زینت دی ___ مختلف عبرتیں اور نصیحتیں پرندوں کی زبان سے ادا ہوتی ہیں مگر وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ۔

کس زبانِ مرانمی داند
باعزیزاں چہ التماس کنم

لوگ میری زبان نہیں پہچانتے تو میں دوستوں سے کیا کہوں ___ پرندہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں تو نصیحت پیش کر رہا ہوں۔ مگر انسان میری زبان نہیں پہچانتے' جن کو حق تعالیٰ علم دیتے ہیں وہ زبان پہچانتے ہیں۔ سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کی بولیوں کا علم جان لیا تھا۔ مگر کسی کالج یا مدرسہ میں پڑھ کر نہیں' اللہ کے الہام سے یعنی بطور معجزے کے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جانوروں کی گفتگو

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے۔ جانوروں کی زبان سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ان کے معاملات اور جھگڑوں کا فیصلہ فرماتے تھے۔ حدیث میں ہے کہ کہ ایک اونٹ بلبلاتا ہوا اور اپنی زبان میں بڑبڑاتا ہوا حاضر ہوا اور اس شان سے آیا کہ بول رہا ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں اپنا منہ ڈال دیا ___ فرمایا ___ اس کے مالک کو بلاؤ۔ اونٹ والا بلایا گیا ___ وہ آیا ___ فرمایا ___ یہ شکایت کر رہا ہے تو اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ لادتا ہے اس نے اقرار کیا ___ یا رسول اللہ! بے شک میں اس جرم کا مجرم ہوں ___ فرمایا ___ آئندہ ایسا مت کرنا ...... اونٹ خوش ہوتا ہوا واپس ہو گیا ___ تو اونٹ کی زبان کو سمجھ کر اس کی فریاد سنی اور اس کے حق میں فیصلہ دیا۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ آپؐ تشریف لے جا رہے تھے کہ کسی دیہاتی کے مکان کے قریب سے گزر ہوا' وہ کہیں پہاڑ میں سے کوئی ہرنی پکڑ لایا تھا۔ اس کے گلے میں رسی باندھ رکھی تھی' وہ کھونٹی سے بندھ رہی تھی۔ اس نے دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد شروع کی۔

آپؐ نے فرمایا ___ دیہاتی تجھے پکڑ لایا ہے تو اس کی ملک ہو گئی ہے اس لئے کہ پہاڑ میں جو چیز ہوتی ہے' جو اس پر قبضہ کرے وہ اس کی ملک ہو جاتی ہے۔ تو اس کی ملک ہو گئی' میں تجھے کیسے چھوڑ دوں؟

اس نے عرض کیا' یا رسول اللہ! پہاڑی میں میرے دو بچے بلبلا رہے ہیں اور بھوکے ہیں۔ میں ہی انہیں دودھ پلاتی تھی' میرے بچے مر جائیں گے آپ مجھے چھوڑ دیں۔

فرمایا' وعدہ کر کہ تو دودھ پلا کے پھر یہاں آ جائے گی۔

اس نے وعدہ کیا اور حلف کیا۔

آپؐ نے گلے میں سے رسی کھول دی اس نے جونہی جا کر دودھ پلایا' واپس آکر پھر وہیں کھڑی ہوئی۔ آپؐ نے پھر رسی اس کے گلے میں ڈال دی۔

جب دیہاتی آیا۔ آپؐ نے فرمایا' یہ کیا تو نے زیادتی کی ہے؟ اس کے بچے بلبلا رہے ہیں تو نے جا کے قبضہ کیا۔ اس کو چھوڑ دے ___ اس نے نصیحت قبول کی اور ہرنی کو آزاد کر دیا۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی ___ غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جانوروں کی بولیوں پر مطلع ہوتے تھے ___ تو انبیاء علیہم السلام کو بطور معجزے کے زبانوں کا علم دیا گیا حتیٰ کہ پرندوں کی زبانوں کا بھی۔

نوعِ انسان کے سوا دنیا کی ہر نوع کی ایک ہی زبان ہے

جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام انسانوں کی زبانوں کا علم دیا گیا تھا۔ یہ جو قرآن کریم میں فرمایا گیا:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔

آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھلا دیئے گئے ___ اس کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا یعنی علم اللغات کلھا۔

آدم علیہ السلام کو ساری لغتیں سکھلا دی گئی تھیں جو قیامت تک انسانوں کے اندر بولی جائیں گی وہ ہر زبان سکھلا دی تھی۔ ان کی پہلی نسل ان تمام زبانوں کو جانتی تھی لیکن جب نسل مختلف ہوئی اور دنیا میں منتشر ہوئی، کوئی قبیلہ کہیں آباد ہوا کوئی کہیں آباد ہوا۔ تو وہاں کی زمینوں کی خصوصیات تھیں۔ ایک ایک قبیلے کے اوپر ایک ایک لغت کا غلبہ ہو گیا ___ اس طرح زبانیں الگ ہو گئیں۔ تو ایک نے دوسرے کی زبان کو سمجھنا چھوڑ دیا اور سمجھنے سے محروم ہو گیا۔ اس کو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانی ظاہر فرمایا ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ (روم پ۲۱ آیت ۲۲)

اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی پیدائش ___ اور تمہاری زبانوں کا اور تمہارے رنگوں کا اختلاف۔ یعنی بنی آدم اس میں مختلف ہیں حالانکہ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ ایک جنس، ایک نوع، لیکن ایک سے دوسرے کی صورت نہیں ملتی، رنگ نہیں ملتا، زبان نہیں ملتی۔ ایک پنجابی بولتا ہے، ایک بنگلہ بولتا ہے، ایک ہندی اور ایک انگریزی بولتا ہے۔ دنیا کے جتنے جاندار ہیں ہر نوع کی ایک زبان ہے خواہ وہ کسی ملک کا ہو۔ مثلاً طوطا ٹیں ٹیں کرے گا۔ وہ ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا، عربستان کا ہو یا ترکستان کا ___ مور ایک بولی بولے گا چاہے یورپ کا ہو یا ایشیاء یا افریقہ کا ہو۔ کبوتر ایک ہی طرح بولے گا کہیں کا ہو۔ لیکن انسان بھانت بھانت کی بولیاں بولتا ہے۔ ترکی اور طرح سے یورپین اور ایشین اور انداز سے ___ یہ اللہ کی قدرت کی نشانی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک جنس کے سارے افراد ہیں اور زبان الگ الگ ہیں۔ ان میں سے ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتا۔ یہ قدرت خداوندی کی نشانی ہے۔

انسان کی غفلت

بہرحال ہر ہر چیز اپنی اپنی زبان میں تسبیح کرتی ہے۔ مگر ہم ان کی زبانوں کو نہیں سمجھتے۔ جیسا کہ ہم ایک دوسرے کی زبانوں کو نہیں سمجھتے، غرض کنکریاں تسبیح کرتی ہیں، سفید کپڑا تسبیح کرتا ہے، چلتا ہوا پانی تسبیح کرتا ہے، ہری ٹہنیاں تسبیح وذکر کرتی ہیں۔ لیکن نہیں ذکر کرتا تو انسان نہیں کرتا، غافل ہے تو انسان اللہ کی یاد سے غافل ہے۔ حالانکہ سب سے زیادہ اس کو ذاکر ہونا چاہئے تھا۔ اللہ نے جو نعمتیں اس پر مبذول کی ہیں، کائنات میں اللہ نے وہ کسی کو نہیں عطا کیں ___ جتنا چہیتا اور پیاری مخلوق انسان ہے ___ کوئی مخلوق کائنات میں اللہ کو اتنی پیاری نہیں ہے۔ تو ساری ذاکر حق ہیں، مگر یہ حق تعالیٰ سے غافل ہے حالانکہ سب سے زیادہ ذاکر اس کو ہونا چاہئے تھا۔ اس کے اوپر انعامات کی بارش ہے۔

ساری کائنات انسان کی غذا ہے

ہر چیز کا لباس اس کی کھال ہے۔ اس کو الگ لباس دیا گیا۔ رنگ برنگ کا لباس، رنگ برنگ کے کپڑے ___ ہر نوع کی غذا ایک ہے۔ کوئی نوع گھاس کھاتی ہے، کوئی نوع دانہ کھاتی ہے، کوئی پتے چابتی ہے، کوئی مٹی کھاتی ہے، کوئی ہوا چوستی ہے۔ لیکن انسان کو ہر چیز پر قادر کیا گیا۔ ہر چیز اس کی غذا ہے۔ گھاس یہ کھائے، پھانس یہ کھائے، پتے یہ کھا جائے، چونا یہ کھائے، مٹی یہ کھائے، چاندی یہ کھا جائے، سونا یہ نگل لے، جواہرات اس کی پیٹ میں جاتے ہیں۔ غرض جمادات، نباتات اور حیوانات ساری چیزیں اس کی غذا ہیں۔ تانبے اور

سونے کے ورق نگل جائے گا' چاندی سونا کا کشتہ کھا جائے گا۔ یا قوتیاں اس کی طاقت کے واسطے بنتی ہیں۔ مٹی یہ کھاتا ہے۔ یہ چونا آخر مٹی پتھر نہیں تو اور کیا ہے؟ کتھ یہ کھائے' پتے یہ کھائے' سبزیاں یہ کھائے۔ دنیا بھر کی چیزیں اس کے پیٹ میں چلی جاتی ہیں۔ تو کائنات کی ہر نوع کی ایک غذا اور پوری کائنات اس کی غذا۔

ساری کائنات انسان کی سواری ہے

ہر چیز اپنے پیروں سے چلتی ہے۔ اس کو سواریوں پر اٹھا کے چلایا گیا۔ حیوانات اس کی سواری میں ہیں' نباتات اور جمادات اس کی سواری ہیں' ریلیں جو چلتی ہیں وہ حیوانات کی قسم میں سے نہیں ہیں وہ جمادات میں سے ہیں' اس کی سواری بنتی ہیں' گھوڑا' اونٹ' بیل یہ سب اس کی سواری بنتی ہیں ــــ تو حیوانات کے سروں پر یہ سوار' جمادات کے سروں پر یہ سوار' نباتات اس کی سواری میں ہیں۔

سمندروں میں یہ سواری کر جائے' ہواؤں میں یہ سواری کر جائے' زمین کی پشت پر یہ سواری کر جائے۔

کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کو سواری دی گئی ہو۔ ہر ایک اپنے پیر سے چلنے پر مجبور ہے اس کو مقرّب اور معظّم بنایا گیا۔ ساری کائنات اس کی سواری بن گئی۔

ساری کائنات انسان کا لباس ہے

اور ساری کائنات اس کا لباس کہ درختوں کی کھال سے یہ لباس بنائے' روئی سے یہ لباس بنائے' جانوروں کی کھال کھسوٹ کر یہ لباس بنالے۔ اب سنا ہے کہ شیشے کے کپڑے چلنے والے ہیں۔ لکڑی اور کھال کے کپڑے بننے لگے ہیں ــــ غرض ساری کائنات اس کا لباس' ساری کائنات اس کی غذا' ساری کائنات اس کی سواری۔ اللہ کے یہاں اتنا چہیتا اور پیارا انسان کہ ساری کائنات کو اس کی خدمت پر لگا رکھا ہے کہ کھانے کو آئے تو سر تسلیم خم کر دے کہ کھالینے دو۔ لباس بنائے تو چپ ہو کر بیٹھ جاؤ۔ اس کو لباس بنانے دو۔ سواریاں بنائے تو سر جھکا دو کہ سوار ہو کر جائے' تو ساری چیزوں سے زیادہ اس کو ذاکر بننا چاہئے تھا مگر سب چیزوں سے زیادہ اگر غافل ہے تو انسان غافل ہے پتھر بھی ذکر میں لگ جاتا ہے۔

انعامات کا تقاضا کیا ہے؟

پتھروں کی شان یہ ہے کہ :

يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ۔ (بقرہ پ۱ آیت ۷۴)

اور کچھ نہیں تو پتھر رو پڑتے ہیں۔ ان سے پانی بہہ پڑتا ہے اور کچھ نہیں تو پتھر اوپر سے نیچے آپڑتا ہے یہ اس کی تواضع اور انکساری کی بات ہے۔ لیکن اگر فرعونیت اور کبر بھرا ہوا ہے تو انسان میں بھرا ہوا ہے کہ نہ اس کی آنکھوں سے آنسو تک ٹپکتا ہے نہ یہ تواضع سے نیچے جھکتا اور گرتا ہے۔ حالانکہ پتھر گر بھی پڑتا ہے اور پانی بھی بہا دیتا ہے تو سب سے زیادہ اگر غافل ہے تو انسان غافل ہے حالانکہ اس کو سب سے زیادہ ذاکر ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ اس پر انعامات کی بارش ہے۔

حقیقتِ زندگی

اس واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ ذکر اللہ چونکہ حیات ہے' تو ذکر کرنیوالا غافلوں میں ایسا ہے جیسے مردو میں زندہ بیٹھا ہو۔ اگر ایک بھرا مجمع غافلوں کا ہو' ایک اللہ کی یاد کرنے والا موجود ہے وہ ایسا ہے جیسے مردوں مجمع میں ایک زندہ بیٹھا ہوا ہو۔ اس لئے کہ زندگی نام بدن کا نہیں ہے بلکہ قلب کی زندگی زندگی ہے ۔

مجھے یہ ڈر ہے کہ دل زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

زندگی نام دل کی زندگی کا ہے اور دل کی زندگی اللہ کی یاد سے ہوتی ہے۔ روٹی اور ٹکڑے سے نہیں ہوتی۔ بدن کی زندگی ہے جو روٹی سے ہوتی ہے۔ یہ اتنی عارضی ہے کہ روٹی ملنے میں دیر ہو جب بدن مرجھانے لگتا اور منقطع ہو جائے تو بدن چھن جاتا ہے۔ لیکن قلب کی زندگی دوامی ہے۔ اس لئے ذکر اللہ جو زندگی پیدا کر ہے وہ دوامی زندگی ہوتی ہے وہ نفس کے اندر قائم ہو جاتی ہے۔

ذاکر انسان کا مقام

تو فرمایا گیا ذکر کرنے والے کی مثال غافلوں کے اندر ایسی ہے جیسے مُردوں کے اندر کوئی زندہ بیٹھا ہوا ہو۔ انسان اگر ذاکر بنے گا تو سارے ذاکروں پر بڑھ جائے گا اور اگر غافل بنے گا تو سب سے زیادہ بدتر ہو جائے حق تو یہ تھا کہ سب سے زیادہ ذکر کرتا ___ اور یہ غافل بن گیا پھر بھی اس سے اچھا' جانور بھی اس سے اچھے' درخت کی ٹہنیاں بھی اس سے اچھیں کیونکہ سب ذکر میں مشغول ہیں۔ یہ سب سے زیادہ ذلیل اور بد ہے اور اگر ذکر پر آجائے تو ہر ذاکر اس سے نیچے ہے اس لئے کہ اس کا ذکر جامع ہو گا جو اور انواع کو میسر نہیں ہے۔

تو ذکر فی الحقیقت روح کی غذا ہے اور ذکر ہی فی الحقیقت انسان کی زندگی ہے غذائے روحانی ذکر اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔

زندگی کی حقیقی غذا

انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کی غذائیں قلیل ہوتی ہیں اور قوتیں سب سے زیادہ ہوتی ہیں۔ قوت ..... ان میں یادِ خداوندی سے پیدا ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپ نے امت کو ممانعت فرمائی کہ صو وصال مت رکھو یعنی بِلا افطار کئے روزہ پر روزہ مت رکھو۔ سحر بھی کھاؤ' افطار بھی کرو' کھاپی کر اگلا روزہ رکھو بلا کھائے پیئے روزے پر روزے رکھتے چلے جانا اس کو صومِ وصال کہتے ہیں۔ اس سے آپ نے ممانعت فر ___ اور حدیث میں ہے کہ آپؐ صومِ وصال رکھتے تھے پندرہ پندرہ دن آپؐ کا مسلسل روزہ ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا' یا رسول اللہ! ہمیں تو آپ نے ممانعت فرمائی اور خود حضورؐ صوم وصال رکھتے ہیں ___ فرمایا :

ایکم مثلی یطعمنی ربی ویسقینی

تم میں مجھ جیسا کون ہے؟ مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا اور پلاتا ہے' یہ کھانا اور پلانا کیا تھا ___ ؟ یہ پلاؤ زردے کے دسترخوان آسمان سے نہیں اترتے تھے۔ یہ ذکر اللہ اور یادِ حق غذا تھی جو روح میں پیوست اس سے روح زندہ تھی اور روح سے بدن زندہ تھا تو اللہ کا ذکر جب رگ وپے میں سما جاتا ہے تو غذاؤ

ت کم ہو جاتی ہے تو زندگی کا دارومدار ذکر پر ہو جاتا ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا جو دارالعلوم ند کے بانی ہیں کہ اخیر عمر میں انتقال سے چند ماہ پیشتر یہ فرمایا کہ :

"اب بحمد اللہ بقائے حیات کے لئے مجھے کھانے پینے کی حاجت نہیں رہی ہے۔ محض اتباعِ سنت کے لئے کھاتا اور پیتا ہوں۔ زندگی باقی رکھنے کے لئے کھانے پینے کی حاجت نہیں رہی"۔

غرض جب ذکر اللہ رگ وپے میں رچ بس جاتا ہے تو پھر زندگی کا دارومدار روٹی پر نہیں ہوتا۔ ذکر پر رہ جاتا ۔ ذکر اللہ سے آدمی زندہ ہوتا ہے۔ قوتِ روحانی سے اس کی حیات اور بقاء ہوتی ہے تو اصل زندگی فی یقت یادِ حق کا نام ہے۔

محبوب کے فراق ووصال کے آثار

بلکہ یوں کہنا چاہیئے زندگی نام ہے نام محبوب اور وصال محبوب کا۔ محبوب کا نام آتا ہے تو محب اور عاشق زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک شخص کسی کی محبت میں گرفتار ہے اور رات دن اس کے دھیان غرق ہے اور محبوب اس سے جدا ہو جائے۔ یہ فراق میں پڑا ہوا گھل رہا ہے، گھلتے گھلتے چارپائی کو لگ گیا ہلنے کی سکت نہیں رہی کھانا بھی چھوٹ گیا' پینا بھی چھوٹ گیا۔ چارپائی پر پڑا ہوا ہے فکرِ محبوب میں ہر وقت فتار ہے ایسے وقت کوئی آکر کہہ دے کہ وہ آگیا تیرا محبوب ___ ایک دم اٹھ بیٹھے گا کہاں ہے؟ کس نے ؟

یہ جان اس کے اندر کہاں سے آئی؟ کیا اس نے کوئی روٹی کھائی یا کوئی یاقوتی کھائی؟ محبوب کا نام ہی تو آیا وہ اٹھ کر زندہ ہو گیا۔ معلوم ہوا زندگی نام ہے کسی محبوب چیز کے وصال کا۔

اب اگر کسی کو روپے پیسے سے محبت ہو گئی۔ جب تک اس کے سامنے روپے پیسے کا نام آتا رہے گا اس زندگی ہے اگر منقطع ہو جائے تو اس کی جان پہ بن جائے' بعض آدمی جب دیوالیہ ہوتے ہیں تو ہارٹ فیل جاتا ہے۔ اس لئے کہ محبوب چھن گیا۔ زندگی ختم ہو گئی۔

یا اگر کسی کو کسی عورت سے محبت ہو جائے جب تک وہ پاس موجود ہے وہ زندہ ہے' جب چلی جائے تو ق میں گھل کر جان دیدے گا۔ غرض وصالِ محبوب کا نام زندگی ہے ___ کسی کا محبوب' دولت' عورت یا ت ہے۔ جن کا محبوب اللہ ربّ العزت ہے وہ اس کے نام سے زندہ ہیں جب تک ذکر حق ہے' ان میں رگی ہے۔ جب ذکر ان سے منقطع ہو جائے' ان کی موت ہو جاتی ہے۔ جن کا دل پروردگار حقیقی سے اٹک چکا ان کی زندگی جبھی ہے کہ وہ ہر وقت ذکر اللہ کئے جائیں' نامِ حق لئے جائیں۔ جب اس میں کمی آجائے گی' محسوس ہو گا کہ ہم ختم ہو گئے ہیں ؎

بردلِ سالک ہزاراں غم بود
گرز باغِ دل خلالِ کم بود

سالک کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں' غم کا پہاڑ اس کے دل پر ٹوٹ پڑتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ باغ میں سے ذکر اللہ کا کوئی خلال کم ہو گیا ہے تو ایک ذاکر کے لئے موت کے برابر ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ

اب میں زندہ نہیں ہوں۔

ذاکرین کے اوپر بعض اوقات قبض طاری ہوتا ہے اس قبض کا اثر یہی ہوتا ہے کہ وہ یوں سمجھتے ہیں
اب ہمارے اندر ذکر اللہ باقی نہیں ہے اور حق تعالیٰ سے جو تعلق تھا اس میں کمی آگئی۔ تو بعض اوقات قبض
زدہ لوگوں نے خودکشی کرلی ہے۔ اگر سنبھالنے والے موجود نہ ہوں مربّی نہ سنبھالے تو قبض کی حالت میں
کشی کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوّت سے سرفراز فرمادیئے گئے اور پہلی وحی آئی کہ

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ (علق پ ۳۰ آیت ۱)

اس کے بعد میں وحی منقطع ہوگئی۔ ایک عرصہ وحی کا انقطاع رہا۔ آپؐ کے قلب مبارک پر ایک غم
گھٹن طاری ہوئی ___ آپؐ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات میرا جی چاہتا تھا کہ خودکشی کرلوں کہ اب زندگی
کام کی جب وہ شئے باقی نہیں جس سے محبت ہے۔ حتیٰ کہ یہ ارادہ کرکے پہاڑ کے اوپر آئے کہ اپنے کو
گرادوں تو پیچھے سے کسی نے ہاتھ پکڑلیا۔ آپؐ نے چاہا کہ گر پڑوں تو پیچھے سے کسی نے آواز دی : یامحم
آپ نے ادھر ادھر دیکھا کوئی موجود نہیں تھا۔ یہ قبض کی کیفیت جب طاری ہوتی ہے تو موت کی طرف
طبیعت مائل ہوتی ہے۔ سالک یہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی ختم ہوگئی ___ غرض زندگی ذکر اللہ، یادِ حق اور
خداوندی کا نام ہے ہم چونکہ رات دن اس کھانے پینے اور پہننے میں مشغول ہیں۔ اس لئے ہم نے زندگی اسی
سمجھ لیا ہے، ہم اس کوچے سے نابلد ہیں جو حقیقی زندگی کا سرچشمہ ہے جو اس کے اندر آگئے ان کی سمجھ
آگیا کہ حقیقی زندگی یہی ہے ___ تو اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

مثل الذاکر فی الغافلین کمثل الحی فی الاموات ۔

ذکر کرنے والا غافلوں میں ایسا ہے جیسا کہ ایک زندہ مُردوں کے اندر بیٹھا ہوا ہو تو غفلت مردنی ہے ا
ذکر زندگی ہے۔

ذکر اللہ کا عجیب اور عظیم ثمرہ

پھر اس کا عجیب اور عظیم ثمرہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قانونِ مکافات ہے، جیسے انسان خود کرتا ہے
ویسا ہی ادھر سے معاملہ ہوتا۔ فرمایا گیا :

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ ۔ (محمد پ ۲۶ آیت ۷)

اگر تم اللہ کی مدد کروگے، اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔ اور فرمایا :

من احب لقاء اللّٰہ احب اللّٰہ لقاءہ ۔

جسے یہ پسند ہے کہ میں جلد اللہ سے جاملوں۔ اللہ کو یہ پسند ہے اور انتظار ہے کہ کب میرا بندہ مجھ سے آ
ملے گا، جو ادھر سے معاملہ وہ اُدھر سے معاملہ۔ اور فرماتے ہیں :

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (بقرہ پ ۲ آیت ۱۵۲)

مجھے یاد کرو میں تمہاری یاد کروں گا۔ اگر تم ذکر اللہ کروگے تو میں تمہارے نفس کا ذکر کروں گا۔ حدیث
(قدسی) میں فرمایا گیا کہ اگر بندہ تنہائی میں مجھے یاد کرتا ہے، میں اپنے نفس میں اسے یاد کرتا ہوں جو بھرے مجمع
میں مجھے یاد کرتا ہے، میں اسے ملائکہ کے مجمع میں یاد کرتا ہوں جس نوع کا یہ ذکر کرے گا اسی نوع کا وہاں ذ
ہوگا۔ تو ذاکر جب ذکر کرتا ہے، انجام کار مذکور بن جاتا ہے۔ ادھر سے اس نے ذکر کیا اُدھر اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا

در بن گیا۔ اس لئے اگر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اللہ کے ہاں میرا تذکرہ رہے تو یہ اللہ کا تذکرہ شروع کردے۔ ا یہ یاد کرے گا اتنا ہی وہ یاد کریں گے۔

دیکھئے اگر کسی بڑے حاکم، وزیر اعظم یا پریذیڈنٹ کے یہاں آپ کا تذکرہ آجائے اور آپ سن پائیں کہ آج ریذیڈنٹ نے میرا ذکر کیا تھا تو عزت و افتخار سے سر اونچا ہو جاتا ہے۔ اخباروں میں چھاپتے ہیں کہ آج ریذیڈنٹ نے ہمارا تذکرہ کیا ہے ___ اس لئے کہ ایک بڑی ذات جو عزت والی کہلاتی ہے مجھے یاد کرلے تو یہ ے فخر کی بات ہوگی۔

حق تعالیٰ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس کے یہاں کسی کا تذکرہ ہو تو یہ تھوڑے فخر کی بات ہے ___؟ یہ ڑی عزت کی چیز ہے کہ اللہ کسی کو یاد کرے؟ اور حق تعالیٰ کب یاد کریں گے جب تم یاد کرو گے؟

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (بقرہ پ۲ آیت ۱۵۲)

غرض اگر کوئی یوں چاہتا ہے کہ میری یاد وہاں قائم ہو جائے، وہ اس کی یاد کو اپنے اندر قائم کرلے۔ اگر یہ وقت ذکر کرے گا۔ وہاں بھی ہر وقت ذکر ہوگا یہ غافل بن جائے گا تو وہاں بھی غفلت برتی جائے گی۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ (حشر پ۲۸ آیت ۱۹)

تم ایسے مت بنو کہ اللہ کو بھلا دو ___ تو تم اپنے نفس کو بھلا دو گے تو اللہ بھی تمہیں بھلا دے گا ___ آن کریم میں فرمایا گیا کہ جو لوگ قرآن کریم یاد کرکے اسے بھول جائیں تو حق تعالیٰ قیامت کے دن اس ے کو نابینا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا:

رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا۔ (طٰہٰ پ۱۶ آیت ۱۲۵)

اے رب! مجھے اندھا کیوں اٹھایا، میں تو دنیا میں بینا تھا؟ میں تو دیکھنے والا تھا؟

قَالَ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسَىٰ۔ (ایضاً آیت ۱۲۶)

ہم نے اپنی آیتیں تیرے سینے میں ڈالی تھیں تو نے انہیں بھلا دیا، ہم نے تجھے بھلا دیا تو اگر یہ نسیان کا برتاؤ رے گا، ادھر سے بھی نسیان کا برتاؤ ہو جائے گا۔ یہ ذکر کا برتاؤ کرے گا، ادھر سے بھی ذکر کا برتاؤ ہو جائے گا۔

حق تعالیٰ شانہ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا کہ:

اے بندے! تو اپنی تندرستی کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تاکہ تیری بیماری کے زمانے میں تجھے یاد رکھوں۔ تو ں تونگری کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تاکہ تیری مفلسی کے زمانے میں میں تجھے یاد رکھوں۔ تو صحت کے زمانے ں مجھے یاد رکھ تاکہ بیماری کے وقت میں تجھے یاد رکھوں جب کوئی تیرا یاد کرنے والا نہیں ہوگا۔ تو اپنی دنیا میں ے یاد رکھ تاکہ قبر میں میں تجھے یاد رکھوں۔ جو یہاں یاد کرے گا، یہ یاد وہاں کام دے گی۔ جو یہاں بھول جائے ، وہ وہاں بھی کسمپرسی کے عالم میں ہوگا۔

یادِ حق کا احساس

اس لئے ذکر اللہ نہ صرف کائنات کی روح ہے بلکہ انسان کی بھی روح ہے بلکہ انسان کی روح کی روح ے۔ اگر ذکر منقطع ہو جائے تو روح پر مردنی چھا جاتی ہے اگر احساس ہو۔ فرق یہ ہے کہ سیاہ کپڑے پر ہزاروں ھبے ڈال دو احساس نہیں ہوگا کہ اس پر بھی کوئی دھبہ ہے۔ اس لئے کہ وہ تو ہے ہی سیاہ اور سفید کپڑے پر ذرا ا دھبا لگا دو، وہ نمایاں ہوگا اور محسوس ہوگا تو جن کے قلوب میں غفلت رچ چکی ہے۔ ان میں اگر دس فلتیں بڑھ جائیں احساس نہیں ہوگا۔ کیونکہ دل غفلتوں میں رنگا ہوا ہے لیکن یاد کرنے والا منٹ بھر غافل ہو

اسے احساس ہوگا کہ پتہ نہیں کیا چیز میرے اندر سے چھن گئی۔

اس لئے ذکر اللہ کا احساس پیدا کرنا چاہئے زندگی یہی ہے ___ زندگی فی الحقیقت شیرازہ بندی کا نام ہے' اور موت شیرازہ بکھر جانے کا نام ہے اس بدن میں آج پانی مٹی ہوا آگ جمع شدہ موجود ہے کہا جائے گا کہ زندہ ہے۔ قبر میں جا کے ریزہ ریزہ ہو کر اجزاء بکھر جائیں گے کہا جائے گا کہ مردہ ہے تو ذکر اللہ روح کو بدن سے ملائے رکھتا ہے اور بدن کے اجزاء کو جمع رکھتا ہے۔ تو ذکر اللہ انسان کی روح اور زندگی ہے یہ نہ ہو تو آدمی کی زندگی ختم ہے۔

یادِ حق کا اصل طریق

اس واسطے میں نے یہ حدیث پڑھی تھی اور مقصد یہ نہیں تھا کہ کوئی لمبی تقریر کی جائے مقصد صرف اس حدیث کی تشریح اور ترجمہ تھا کہ ذکر اللہ کی عادت ڈالی جائے اور اس کے تین طریقے ہیں ___

سب سے پہلا طریقہ جو **اصل** اور بنیادی ہے وہ فرائض کی ادائیگی ہے۔ سب سے بڑا ذکر اللہ کے فرائض میں نماز ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا گیا:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ۔ (طٰہٰ پ ۱۶ آیت ۱۴)

نماز قائم کرو میری یاد کے لئے ___ معلوم ہوا نماز ذکر اللہ اور یادِ حق ہے۔ حج کے بارے میں جگہ جگہ فرمایا گیا:

فَاِذَا اَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْکُرُوْہُ کَمَا ھَدٰکُمْ وَاِنْ کُنْتُمْ مِنْ قَبْلِہٖ لَمِنَ الضَّآلِّیْنَ۔ ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰہَ۔ (بقرہ پ ۲ آیت ۱۹۸، ۱۹۹)

حج کے ایک ایک رکن پر کہیں ذکر اللہ' کہیں استغفار' کہیں توبہ' کہیں یادِ حق ان سب کا مقصد ذکر ہے نماز کا مقصد بھی ذکر ہے۔ زکوٰۃ اور صدقات کا مقصد بھی فی الحقیقت ذکر ہے فرمایا:

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ (حج پ ۱۷ آیت ۳۷)

جو تم قربانیاں کرتے ہو اس کا گوشت پوست اللہ تک نہیں پہنچتا بلکہ وہ تقویٰ' ذکر اللہ' یادِ حق پہنچتی ہے جو قربانی کے وقت تم نام لیتے ہو اور قلب میں نیت کرتے ہو۔ وہ چیز اللہ تک جاتی ہے۔ یہ اس کی علامت ہے ___ بہرحال قربانی ہو' زکوٰۃ ہو' حج ہو' نماز ہو' ان سب کی روح ذکر اللہ بتلائی گئی ہے تو ذکر کرنے کا بنیادی طریق فرائض شرعیہ کی ادائیگی ہے۔ یہ اصل ذکر ہے۔

ذکرِ مؤقّت

لیکن اصل ذکر کے ساتھ ساتھ امر کیا گیا کہ:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا۔ (احزاب پ ۲۲ آیت ۴۱)

اے لوگو! اللہ کی یاد کرو ذکرِ کثیر کے ساتھ ___ تو ایک ذکرِ اصل ہے وہ فرائض ہیں اور ایک ذکر زائد اور ذکر کثیر ہے وہ اس سے اوپر ہے ___ اس کے دو طریقے ہیں ایک موقت' ایک غیر موقت۔ موقت تو یہ ہے کہ صبح اور شام کا وقت مقرر کر کے کچھ تسبیح اور تہلیل کر لیا کرے۔ صبح کی نماز کے بعد بیٹھ گئے ___ فرض کیجئے

آپ نے سو مرتبہ کلمہ تمجید پڑھ لیا۔

سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر۔

سو مرتبہ استغفار پڑھ لیا' سو مرتبہ درود شریف پڑھ لیا۔ اسی طرح شام کو پڑھ لیا۔

فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ۔ (الروم پ ۲۱ آیت ۱۷، ۱۸)

فرمایا! اللہ کی تسبیح کرو کچھ صبح کو' کچھ شام کو کچھ دوپہر کو :

وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۔ (احزاب پ ۲۲ آیت ۴۲)

صبح اور شام اللہ کی تسبیح کرو۔ تو یہ موقت طریق ہے کہ ایک وقت باندھ کر آدمی کچھ تسبیح پڑھے' سو مرتبہ نہ ہو تینتیس مرتبہ پڑھ لے اتنا نہ ہو کچھ کم کر لو۔ مگر ایک عدد اور وقت معیّن کر کے اس کو نبھادے۔

حدیث میں ہے :

خیر الامور مادیم علیہ۔

بہترین عمل وہ ہے جس پر ہمیشگی اور دوام برتا جائے۔ جو قلب میں جڑ پکڑ لیتا ہے رسوخ پیدا کر لیتا ہے پہاڑ کی ایک چٹان ہے اس پر گرد پڑ گئی ہے۔ آپ نے لاکھوں مَن پانی بہادیا۔ گرد دھل گئی لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر چڑھ جائے گی۔ تو منوں پانی بہادینے سے ظاہری صفائی آجاتی ہے۔ مگر چٹان کے اندر نمی نہیں پہنچتی' لیکن اگر آپ ایک قطرہ برس دن تک گراتے رہیں تو پتھر میں بھی سوراخ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو تھوڑا تھوڑا عمل ہو۔ اس سے قلب میں جڑ پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ نے ایک دن پچاس نمازیں پڑھ لیں لیکن پھر ایسے غائب ہوئے کہ برس دن تک غائب رہے تو گرد دھل جائے گی' اجر مل جائے گا لیکن قلب میں کوئی ملکہ' کوئی بنیاد' کوئی جڑ قائم نہیں ہوگی۔ تو تھوڑا عمل ہو مگر دوام کے ساتھ ہو وہ کار آمد ہوتا ہے۔ دل میں ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جڑ قائم ہو جاتی ہے۔ بہر حال سو مرتبہ نہ ہو بالکل تھوڑا ہی عدد ہو مگر ایک وقتِ مقرر پر نامِ حق لیا جائے' کچھ تلاوت کر لی' کچھ تسبیح' کچھ تہلیل خواہ دس منٹ ہو مگر آدمی اس کا پابند ہو جائے' چالیس دن کے بعد خود محسوس ہوگا کہ میرے قلب کے اندر کیا اثر قائم ہوا۔

حدیث میں ہے کہ آدمی کسی عمل کو چالیس دن خلوص کے ساتھ مسلسل کرے تو قلب میں سے حکمت کا چشمہ بہہ پڑتا ہے۔ یادِ حق کی ایک بنیاد قائم ہو جاتی ہے جس کی جیسی مناسبت ہے ویسی معرفت اس کو شروع ہو جاتی ہے تو ذکرِ کثیر کی ایک صورت یہ ہے کہ مقرر وقت پر آدمی کچھ اللہ کا نام لے۔

ذکرِ غیر موقت

دوسری صورت یہ ہے کہ غیر مقررہ طریق پر آدمی یہ عادت ڈالے کہ اس کی زبان سے کوئی نہ کوئی اللہ کا نام نکلتا رہے۔

لا الہ الا اللّٰہ' سبحان اللّٰہ' اللّٰہ اکبر۔

وغیرہ اٹھتے بیٹھتے ہوئے' چلتے ہوئے' کھڑے۔ وضو سے بے وضو کوئی قید نہیں۔ مہینہ دو مہینہ تو تکلّف کر کے عادت ڈالنی پڑے گی۔ جب عادت پڑ جائے گی تو بے اختیار اللہ کا نام زبان سے جاری ہوگا۔ کوئی حادثہ پیش آئے گا (خدانخواستہ) مثلاً آپ گر پڑے فوراً الا اللّٰہ، بسم اللّٰہ کوئی نہ کوئی اللہ کا نام زبان سے نکلے گا۔ یہ نہیں نکلے گا کہ لوگو دوڑو' مجھے بچاؤ' اللہ کا نام نکلے گا۔ ابتداءً تکلّف کرنا پڑے گا۔ جب عادت پڑ جائے گی

تو پھر بلا ارادہ ذکر حق زبان سے شروع ہو جائے گا۔

ذکر غیر موقت کا ثمرہ

اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مرتے وقت بھی بلا ارادہ اللہ کا ذکر زبان سے جاری ہو گا۔ خاتمہ ایمان پر ہو گا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ :

تحشرون كما تموتون وتموتون كما تحيون -

"تمہارا حشر اس حالت پر ہو گا جس حالت پر موت آئی ہو گی اور موت اس حالت پر آئے گی جس حالت پر زندگی گزار دی ہے"۔

اگر اللہ کے نام کی مشق پر زندگی گزاری ہے تو موت کے وقت یقیناً اللہ کا نام زبان پر جاری ہو گا اور جب آدمی اللہ کا نام لیتا ہوا مرے گا تو قبر سے جب اٹھے گا وہی نام اس کی زبان پر جاری ہو گا ___ وہ یہی سمجھے گا کہ میں در حقیقت موت میں ہوں اور اللہ کا نام لے رہا ہوں۔ بعد میں پتہ چلے گا کہ یہ تو میدان حشر ہے۔

آدمی کو جب عادت پڑتی ہے تو غیر ارادی طور پر وہ چیز جاری ہو جاتی ہے جس کی عادت ہوتی ہے۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ ہر عبادت ابتدا میں ریاکاری ہوتی ہے دکھلاوا ہوتا ہے۔ بعد میں عادت بنتی ہے' اخیر میں عبادت بنتی ہے ___ اور حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا :

مروا صبيانكم بالصلوٰة اذا بلغوا سبعًا واضربوهم اذا بلغوا عشرًا۔

بچہ جب سات برس کا ہو' اس کو نماز کی تاکید کرو' اسے مسجد میں ساتھ لاؤ۔ اگر دس برس کا ہو جائے اور نہ مانے تو اس کو مار کر نماز پڑھاؤ۔

ظاہر بات ہے کہ سات برس کے بچے کو جب آپ نماز پڑھائیں گے وہ نماز اللہ کی تھوڑا ہی ہو گی وہ باپ کی ہو گی۔ وہ مار پٹائی کے ڈر سے نماز ہو گی کہ مسجد میں جائے گا تو کن انکھیوں سے دیکھے گا کہ باپ دیکھ رہا ہے کہ نہیں۔ اگر دیکھا کہ کھڑا ہوا ہے تو بڑے خشوع سے سجدہ کرے گا اور اگر دیکھا کہ باپ چلا گیا تو وہ بھی تھوڑی دیر میں کھسک جائے گا۔ یہ باپ کی نماز ہے۔ حقیقی نماز نہیں ہے آٹھ نو برس کی عمر تک یہ ریاکاری رہی۔ دس برس کی عمر میں آکر عادت پڑ گئی کچھ سمجھ بوجھ نہیں۔ نماز کی حقیقت منکشف نہیں۔ بس ایک عادت پڑی ہوئی ہے کہ گھر سے نکلے مسجد تک آگئے۔ جماعت میں کھڑے ہو گئے۔ اس کا کچھ پتہ نہیں کہ میں کیا کر رہا ہوں اس کے اندر حقیقت کیا ہے ___ ؟ یا یہ کوئی عبادت یا طاعت ہے ، بس ایک عادت ہے تو ابتداءً ریاکاری تھی کرتے کرتے عادت پڑ گئی پندرہ بیس برس کے بعد جب آثار و کیفیات طاری ہوں گے تب سمجھے گا یہ کوئی عبادت ہے۔ اب آکر عبادت بنے گی۔ تو ہر عبادت ابتدا میں ریاکاری ہوتی ہے' بعد میں عادت بنتی ہے' پھر عبادت بنتی ہے۔

مگر اس کے باوجود شریعت نے حکم دیا کہ ریاکاری ہی سہی مگر نماز پڑھو اور عادت کے طور پر ہی سہی مگر نماز پڑھواؤ تاکہ عبادت بن جائے ___ تو اگر کوئی ذکر اللہ کرنے آئے اور دل میں خیال ہو کہ یہ تو ریاکاری ہے۔ لوگ کہیں گے کہ بڑے صوفی بن گئے' بڑے نمازی آئے' بڑے ذکر کرنے والے آئے' تو سمجھ لو یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ دکھلاوے کے لئے ہی تم ذکر اللہ کرو' کرتے رہو۔ یہ ذکر خود کھینچ لے گا اور آپ کے قلب کے اندر رچ جائے گا تو ابتداءً ۔

الله الله کرده باید والسلام

دین کے لئے ہو' دنیا کے لئے ہو یا دکھلاوے کے لئے ہو' اللہ کا نام لیتے رہو۔ یہ نام آپ کو اپنی طرف خود کھینچ لے گا۔

امام سفیان ثوریؒ کہتے ہیں جن کا محدثین میں عظیم رتبہ ہے۔

طلبنا العلم لغير الله فابٰى ان يكون الاللّٰه۔

ہم نے دنیا کے لئے علم حاصل کیا تھا کہ علم پڑھ کر شہرت کمائیں گے۔ کچھ نام ونمود ہو گا۔ ممکن ہے کچھ پیسے بھی مل جائیں' سیکھا تو دنیا کے لئے تھا' مگر جب علم آگیا تو علم نے انکار کیا کہ میں دنیا کے لئے نہیں میں تو اللہ ہی کے لئے ہونا چاہتا ہوں۔ آخر اس نے ہمیں بھی اللہ سے جاملایا ___ تو علم آدمی چاہے دنیوی غرض سے سیکھے مگر سیکھ لے' علم آخر وہیں پہنچاتا ہے جو اس کا مقام ہے ___ تو علم پست رہنا نہیں چاہتا' علم بلندی کی چیز ہے۔ آپ کتنا ہی پست رہیں گے۔ مگر وہ آپ کو پکڑ کر اوپر لے جائے گا۔

یہی حقیقت ذکر اللہ کی بھی ہے کہ اللہ بلند ہے' اس کا نام بھی بلند ہے' اس کا ذکر بھی بلند ہے۔ بلند چیز کو جب آپ زبان پر رکھیں گے۔ چاہے اس کی غرض دنی اور پست ہو مگر انجام کار وہ رفعت کی طرف جائے گا او اپنے ساتھ آپ کو بھی لے جائے گا۔ اس واسطے صبح اور شام کچھ نہ کچھ اللہ کا نام لینا چاہئے۔

تسبیح مذکّرہ ہے

اگر ویسے یاد نہ آئے تو آدمی تسبیح ہاتھ میں رکھ لے۔ تسبیح مذکّرات میں سے ہے' یاد دلاتی ہے۔ تسبیح دیکھ کر خواہ مخواہ ہی سبحان الله سبحان الله جاری ہو جاتا ہے ___ یہ تسبیح مذکرات میں سے ہے۔ یاد دہانی کرادیتی ہے۔

جواب شبہ

اس پر اگر یہ شبہ ہو کہ لوگ کہیں گے بڑے صوفی بنے ہیں تو حضرت جنید بغدادیؒ لکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیال کی وجہ سے ذکر کا چھوڑ دینا یہ شرک میں داخل ہے۔ اس واسطے اس کی پرواہ مت کرو لوگ کیا کہیں گے۔ اپنا معاملہ اللہ کے ساتھ کرلو۔ ضمیر سے معاملہ ہے حق تعالیٰ کا لوگوں سے نہیں ہے۔

آپ جب اپنے قلب میں خالص اللہ کے لئے ذکر اللہ کر رہے ہیں' تو یہ وسوسہ اگر آئے کہ میں دکھلاوے کے لئے کر رہا ہوں تو یہ شیطان کی طرف سے ہے۔ اس پر لاحول پڑھ لے۔

عشق کامل ہو تو ملامت کارگر نہیں ہوتی

اگر کوئی ملامت کرے' کرنے دیجئے ___ اس لئے کہ ملامت جبھی کارگر ہوتی ہے جب عشق ناتمام ہوتا ہے۔ جب محبت کامل ہوتی ہے۔ پھر ملامت گروں کی ملامت کوئی اثر نہیں کرتی۔

حضرت حذیفہ ابن الیمان رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں' جب ایران فتح ہوا تو حضرت حذیفہ ایران پہنچے' اسلامی حکومت قائم ہو گئی' تو ایران کا ملک بڑا متمدّن ملک تھا۔ اس زمانے میں دو ہی بڑی حکومتیں تھیں' ایک قیصری حکومت یعنی رومیوں کی حکومت جو عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی' ایک کسریٰ کی حکومت جو فارسیوں

کے ہاتھ میں تھی۔ باقی ساری حکومتیں یا ان کے ماتحت تھیں یا ان کے زیرِ اثر تھیں جو صورت آج روس اور امریکہ کی ہے وہی اس زمانے میں ان کی تھی۔

تو حذیفہ ابن یمانؓ کھانا کھانے بیٹھے اور ایک فارسی غلام کھڑا ہوا کھانا کھلا رہا تھا۔ پانی اس کے ہاتھ میں تھا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں سے زمین پر لقمہ گر پڑا۔ انہوں نے جلدی ادب کے ساتھ لقمہ کو اٹھا کر مٹی جھاڑی اور تناول فرمالیا۔

فارسی غلام نے کہا یہ آپ نے کیا کیا ___ ؟ یہ ملک تو بڑا مہذّب ملک ہے۔ یہ بات یہاں کی تہذیب کے خلاف ہے' لوگ کہیں گے یہ بڑے حریص ہیں ایک ایک لقمہ پر جان دیتے ہیں۔ مٹی تک جھاڑ کر کھا گئے۔ یہ حرص کی دلیل ہے۔ ایسا نہ کیجئے یہ تمدن والوں کا ملک ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کیا جواب دیا ___ ؟ فرمایا :

أأترک سنت حبیبی لھولاء الحمقاء ۔

کیا میں اپنے حبیب پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت ان احمقوں کی وجہ سے چھوڑ دوں ___ ؟ گویا اس درجہ ایک سنت محبوب تھی' عزیز تھی کہ فارسیوں کا پورا ملک اور ان کی تہذیب وتمدن اتنا عزیز نہیں تھا۔ جب محبت کامل ہوتی ہے تو ملامت گر کی ملامت اثر نہیں کرتی۔ ملامت سے منفعل ہونا جبھی ہوتا ہے جب اپنے اندر خامی ہوتی ہے ___ اس واسطے خامی کو رفع کیجئے اور خامی رفع ہونے کی یہی صورت ہے کہ ذکرُ اللہ اور یادِ حق کی عادت پڑ جائے۔ جب چوبیس گھنٹے اللہ کا نام دل اور زبان پہ ہوگا' محبت اور معرفت بڑھ جائے گی۔ پھر ملامت کرنے والے ہزار ملامت کریں گے' کوئی اثر نہیں ہوگا' ان پر ہنسی آئے گی کہ یہ احمق ہیں اس چیز سے روک رہے ہیں۔ آپ خود منفعل اور شرمندہ نہیں ہوں گے۔

بہرحال یہ حدیث بتلاتی ہے کہ زندگی فی الحقیقت ذکرُ اللہ اور اللہ کا نام ہے جب کائنات' نباتات' جمادات کی زندگی اس سے ہے تو انسان کی زندگی اس سے کیوں نہیں ہوگی ___ اس لئے انسان کو سب سے زیادہ ذاکر رہنا چاہئے' تبھی وہ زندہ ہوگا بلکہ زندہ وجاوید بن جائے گا۔

بس مولانا کی تعمیلِ حکم کے لئے یہ چند کلمے میں نے عرض کر دیئے اور اس حدیث کی شرح کی' دعا فرمایئے اللہ تعالیٰ ہم کو یادِ الٰہی اور ذکرِ حق کی توفیق عطا فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَامِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ ۔

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ سیدنا مولانا محمد والہ واصحٰبہ اجمعین۔ برحمتک یاارحم الراحمین۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

محبت و معیت

جو مجھ سے محبت کرے گا۔ وہ میری اطاعت بھی کرے گا' اور میری سنتوں کی پیروی بھی کرے گا ــــــ اور جو میری سنتوں پر چلے گا وہ میرے ساتھ بھی ہوگا جنت میں۔ وہ میرے سے الگ نہیں رہے گا ــــــ آپؐ نے بنیاد قرار دیا ہے محبت کو کہ مجھ سے محبت کرنا علامت ہے اس بات کی کہ وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل تو محبت ہے۔ مگر محبت پہچاننے کی علامت اطاعت اور اتباعِ سنت ہے۔ جب یہ ہوگی تو معلوم ہوگا کہ محبت میں سچا ہے۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃِ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ــــــ اَمَّا بَعْدُ ــــــ

فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ۔ وَقَالَ اللّٰہُ جَلَّ ذِکْرُہٗ فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ وَصَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ۔

حقیقتِ ہر شیٔ

بزرگانِ محترم!

دنیا کی ہر چیز بلکہ ہم اور آپ بھی دو چیزوں سے مرکب ہیں۔ ایک ہمارا ظاہری حصہ ہے جس کو ہم بدن کہتے ہیں یہ ہیئت و شکل ہے مثلاً آنکھ ہے جس سے ہم ایک دوسرے کی شکل وصورت دیکھ کر پہنچانتے ہیں۔ یہ ظاہری حصہ اور ظاہری پیکر ہے اور ایک اس کے اندر پوشیدہ حقیقت ہے۔ وہی درحقیقت انسان ہے۔ اس

صورتِ ظاہری کا نام انسان نہیں۔ انسان حقیقت کا نام ہے جو اندر چھپی ہوئی ہے اس کے دکھلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ صورت بنادی ہے جو کہ دراصل ذریعۂ تعارف ہے اصل مقصود نہیں ہے۔

پھر مقصود کہاں ہے؟ شریعتِ اسلام پتہ دیتی ہے کہ اندرون باطن ایک قلب ہے اسی میں ساری حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں اور اسی کا نام انسان ہے' اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے جب پھیلایا اور صورت و شکل دی تو قالب نمودار ہو گیا۔ شکل بن گئی۔ اب اسے دیکھ کر پہچان گئے کہ یہ فلاں ہے یہ فلاں ہے ورنہ حقیقت میں انسان قلب ہی ہے اور اسی کے اندر سب کچھ پوشیدہ ہے۔

تائید و نکتہ چینی

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب حق تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا فرمایا اور بدن بنایا۔ ابھی اس میں روح بھی نہیں ڈالی تھی تو ملائکہ علیہم السلام اس کی زیارت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے عجیب شکل و صورت بنائی ہے اور بہت ہی عمدہ ہے اور سب کے دل میں ایک عظمت و محبت اس صورت کی بیٹھ گئی۔ اِدھر ابلیس کو بھی حکم ہوا کہ تو بھی اس صورت کو جاکر دیکھ۔ اس کے دل میں عداوت چھپی ہوئی تھی' اس نے جاکر دیکھا اور حضرت آدمؑ کے پتلے کے اندر گھسا اور ریزے ریزے میں سرایت کی' بعد میں اس نے کہا کہ کوئی عجیب چیز نہیں ہے اور کہا کہ :

نَفْسٌ لَا تَتَمَلَّکُ

یہ تو اندر سے کھوکھلا ہے خود کو بھی نہیں سنبھال سکتا ہے جب تک کہ باہر سے اس کی مدد نہ ہو اور غذا' ہوا' گرمی باہر سے نہ پہنچے اس کے اندر کوئی طاقت نہیں۔ اس ابلیس نے اپنی شیطنت اور عداوت کے مطابق رپوٹ دی۔

سارے ملائکہ نے تو تائید کی اور مدحت کی اور اس کمبخت نے آکر نکتہ چینی کی مگر یہ کہا کہ میں نے سارے بدن میں گھس کر دیکھا ہے یہ اندر سے بالکل کھوکھلا ہے البتہ اس کے بیچ میں ایک چھوٹی سی پوٹلی ہے اس میں سب کچھ ہو گا اگر ہوا۔ وہاں میں گھس نہ سکا۔

اشارہ تھا قلب کی طرف کہ جو کچھ حقیقت ہے وہ اس قلب میں رکھی گئی ہے اس کی حقیقت اس لعین کے سامنے نہ کھل سکی وہاں جاکر مجبور ہو گیا۔

اقلیمِ بدن کا بادشاہ

چنانچہ سب سے بڑی چیز انسان میں قلب ہے ___ اور باقی جتنے اعضاء ہیں سب اس کے خُدّام ہیں۔ قلب میں جو جذبہ پیدا ہوتا ہے یہ سب خدّام اس کے مطابق عمل شروع کر دیتے ہیں۔ اگر دل میں آیا کہ کسی چیز کو دیکھوں تو دل آنکھ کو زبان سے آرڈر نہیں دیتا کہ تو دیکھ بلکہ دل میں خیال آتے ہی اپنا کام شروع کر دیتی ہے' دل میں خیال آیا کہ میں چلوں' تو دل کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ پاؤں کو زبان سے حکم دے کہ چلو' بلکہ دل کا منشاء ہوا اور پیروں نے حرکت شروع کر دی۔ دل نے کسی چیز کو پکڑنا چاہا تو دل ہاتھوں کو لفظوں میں حکم نہیں دے گا کہ اے ہاتھو! تم پکڑو۔ بلکہ دل میں جذبہ آیا اور ہاتھوں نے اپنا کام شروع کر دیا تو انسان کے تمام اعضاء خدّام ہیں۔ اصل حاکمِ اعلیٰ اور اس اقلیمِ بدن کا سلطان وہ دل ہے اور دل میں ہی سب کچھ ہے۔

قلبؒ اصل ہے یا دماغ؟

اس میں اطباء اور موجودہ زمانے کے ڈاکٹروں کا اختلاف ہوا ہے کہ اصل انسان میں دماغ ہے یا قلب۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اصل انسان میں دماغ ہے کیونکہ اسی سے تمام چیزیں چلتی ہیں اسی میں شعور ہے' اسی میں ادراک ہے' اسی میں علم ہے' اسی میں احساس ہے اور قلب صرف ایک آلہ ہے جو خون کے ذریعہ سے دماغ کو بنا دیتا ہے اور دماغ کے اندر کچھ چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہر حال وہ کہتے ہیں کہ قلب آلہ کار ہے اصل نہیں ہے۔ یہ بعض اطباء کا بھی خیال ہے اور اس زمانے کے ڈاکٹروں کا بھی یہی خیال ہے لیکن ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ یہ بالکل غلط ہے اور یہ بھی نہیں کہتے کہ بالکل صحیح ہے. بہت سی اس میں صحت بھی ہے اور بہت سی اس میں غلطیاں بھی ہیں۔

مدارِ اعمال قلبؒ ہے

چنانچہ ہم بنانے والے کی طرف رُجوع کریں گے کہ اس نے کس چیز کو اصل کہا ہے حق تعالیٰ خالق ہے وہ جانتا ہے کہ میں نے کیا چیز بنائی ہے اور کس لئے بنائی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان چیزوں کی اصلاح کے لئے آئے ہیں۔ آپ کو علم دیا گیا ہے اس بات کا کہ دل کیا ہے اور دماغ کیا ہے اور ہاتھ پیر کیا ہیں اس لئے ہم نے رجوع کیا کہ بنانے والے سے پوچھو کہ اصل کیا چیز ہے قلب ہی اصل ہے یا دماغ اصل ہے۔ تو شریعت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلب ہی اصل ہے وہی حاکمِ مطلق ہے اس اقلیم بدن کا۔ بدن کی ساری حکومت اسی سے چل رہی ہے۔

حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

> انّ فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہٗ واذا فسدت فسد الجسد کلہٗ الا وھی القلب۔
>
> ''انسان کے بدن میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے وہ اگر صحیح ہو تو سارا انسان صحیح ہے وہ اگر غلط ہے تو سارا انسان غلط ہے اور فرمایا کہ وہ قلب ہے''۔

تو انسان کی خوبی و خرابی کا دارومدار قلب پر ہوتا ہے۔ دل ہی کے اندر نیّت پیدا ہوتی ہے اور نیّت سے سارے اعمال بنتے ہیں اور فرمایا گیا کہ :

> انّما الاعمال بالنّیات۔
>
> ''سارے اعمال کا مدار نیت پر ہے''۔

نیّت اچھی ہے تو عمل بھی اچھا ہے اور نیت اگر بُری ہے تو عمل بھی بُرا ہوگا اور نیّت کا دارومدار قلب کے اوپر ہے۔ تو معلوم ہوا کہ سارے کے سارے اعمال وافعال کا دارومدار انسان کے قلب پر ٹھہر گیا اور فی الحقیقت زندگی بھی قلب ہی سے چلتی ہے۔

مدارِ حیات قلبؒ ہے

جیسے اعمال کا مدار قلب پر ہے ایسے ہی حیات کا مدار قلب پر ہے' کیونکہ قلب پہلے زندہ ہوتا ہے پھر حیات دماغ میں پہنچتی ہے۔ تو اس بنا پر مدارِ حیات دل کے اوپر رکھا گیا ہے اور اطباء بھی اسی کا اقرار کرتے ہیں۔ اطباء کہتے ہیں کہ آدمی جو غذا کھاتا ہے وہ اولاً معدے کے اندر پہنچی ہے۔ معدے کے اندر خار ہوتے ہیں جو اسے

پیتے ہیں اور پیس کو حریرہ بنا دیتے ہیں۔ اس میں جو حصّہ فضلات کا ہے وہ زائد ہے وہ انتڑیوں میں چلا جاتا ہے اور بول وبراز ہو کر نکل جاتا ہے اور جو رقیق جوہر ہے اس کو قلب معدے کی طرف سے جگر کی طرف بھیجتا ہے۔ معدے کی طرف سے جگر کی طرف کو جانیوالی نالیوں کی شکل کی چھوٹی چھوٹی رگیں ہیں ان کے ذریعے سے وہ غذا جگر میں پہنچتی ہے۔

جگر کو کہتے ہیں کہ وہ طباخ اور بدن کا باورچی ہے' جگر میں گرمی اور حرارت ہے وہ اس گرمی سے حریرے کو پکاتا ہے اور خوب گرمی پہنچاتا ہے جب وہ ہنڈیا پکتی ہے تو اس میں ایک حصّہ اُبال کا آتا ہے جھاگ کی شکل میں ایک حصّہ نیچے بیٹھ جاتا ہے جسے تلچھٹ کہتے ہیں۔ ایک حصہ بیچ میں پانی میں رہتا ہے وہ کھولتا رہتا ہے۔ اطباء کہتے ہیں کہ جو اوپر کا حصہ ہے جھاگ کا وہ بلغم کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اور نیچے کا حصہ جو تلچھٹ ہے سیاہ ہوتا ہے اسے سوداء کہتے ہیں اور بیچ میں جو رقیق اور پتلا حصہ ہے اسے اطباء کہتے ہیں کہ وہ صفراء ہے۔

تو سوداء' صفرا' بلغم۔ یہ تین حصے ہیں جن کو جگر تیار کرتا ہے اور پکاتا ہے ان تینوں چیزوں کے مجموعے سے خون بنتا ہے تو جگر کا کام ہے خون بنانا' معدہ کا کام تھا غذا کو پیسنا۔ پھر جگر اسی خون کو بھیجتا ہے قلب کی طرف۔ جگر سے قلب کی طرف جانے والی بہت باریک رگیں ہیں جن کو طب کی اصطلاح میں شرائین کہتے ہیں (شرائین جمع ہے شریان کی) ان ہی باریک رگوں سے خون قلب کے طرف پہنچتا ہے۔ اور قلب کی شکل تو مٹی کی سی ہے کہ اوپر سے پتلا' بیچ میں سے موٹا' پھر نیچے سے پتلا۔

اوپر کے حصے کو کہتے ہیں بطنِ عالی اور نیچے کے حصے کو بطنِ سافل۔ ان میں باریک اور رقیق خون پہنچتا ہے اور قلب میں گرمی' جگر سے بھی زیادہ ہے اور دل پھر اس لطیف جوہر کو پکاتا ہے اور پکانے سے ایک لطیف بھاپ اُٹھتی ہے' جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی وہ بھاپ رگ وپے میں سرایت کرتی ہے اسے اطباء کہتے ہیں کہ یہ روحِ حیوانی ہے اسی روح سے آدمی میں حس ہے' احساس ہے عقل ہے زندگی ہے۔ اطباء کی اصطلاح میں اس کو روحِ حیوانی کہتے ہیں۔

اور شریعت کی اصطلاح میں اس کا نام روحِ نَسَمَہ ہے اسی کو نفس بھی کہتے ہیں۔ نفس کے معنے پھونکنے اور پھیلنے کے ہیں چونکہ یہ پورے بدن میں پھیل جاتا ہے۔ اس بناء پر اس کو نفس بھی کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل پر مدار ہے انسان کی زندگی کا' وہی روح حیوانی پیدا کرتا ہے جس سے انسان کے بدن میں حس' حرارت اور احساس وغیرہ طاقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ بدن میں قلب اصل ہے دماغ اصل نہیں ہے۔

تمام اعضاء کا تعلق قلب سے ہے دماغ سے نہیں اور زندگی کا مدار بھی دل ہی پر ہے۔ عمل کا جذبہ بھی دل ہی سے اُبھرتا ہے۔ محبت اور عداوت بھی دل ہی سے متعلق ہے۔ جس سے ہزاروں معاملات وابستہ ہیں۔

دماغ قلبؐ کے تابع ہے

تو شریعت کا منشاء یہ ہے کہ اصل چیز انسان میں قلب ہے دماغ نہیں بلکہ دماغ قلب کا تابع ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ قلب میں جو علم اور شعور ہے وہ اجمالی ہے' مختصر ہے اور مجمل ہے۔ دماغ میں جاکر اس کی تفصیل ہوتی ہے اور پھیل کر جزئیات نکلتی ہیں۔ پھر آدمی ان سے نظریات قائم کرتا ہے۔ نظریات سے پھر پروگرام بنتے ہیں ___ تو علمِ اجمالی قلب میں ہے دماغ میں آکر اس کی تفصیل ہوتی ہے اور چونکہ تفصیل ہوتی ہے اجمال کے لئے اس لئے دماغ تابع ہے قلب کے' برعکس نہیں۔ یہ شریعت کا منشاء ہے اس لئے شریعتِ اسلام

کا موضوع اور مقصد یہ ہے کہ دل کی اصلاح کی جاوے' اگر دل درست ہو گیا تو دماغ بھی درست ہے۔ ہاتھ پیر بھی درست ہیں۔ اخلاق بھی درست ہیں۔ اگر انسان کا دل بگڑ جائے تو نہ زندگی ہے اور نہ عمل ہے' نہ ہنر ہے نہ کمال ہے کسی شاعر نے کہا ہے ۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

دل زندہ ہے تو سارا انسان زندہ ہے۔ دل مُردہ ہے تو سارا انسان مُردہ ہے تو دارومدار حقیقت میں دل ہی کے اوپر ہے کیونکہ ہر چیز دل سے چلتی ہے' اس لئے شریعت نے دل کو اپنا موضوع بنالیا ہے اگر دل درست ہو گا تو اعمالِ شرعیہ بھی درست ہوں گے اور سارا بدن درست ہو جائے گا اور دماغ بھی صحیح ہو جائے گا اور اگر قلب بگڑ گیا تو دماغ بھی خراب رہے گا اور تمام اعضاء بھی خراب رہیں گے۔

مُدرکِ حقیقی قلبؔ ہے

یہ ہی وجہ ہے کہ آنکھیں دیکھتی ہیں اور کان سنتے ہیں۔ تو اطباء کہتے ہیں کہ یہ سارا دماغ سے ہوتا ہے اور میں کہتا ہوں کہ یہ بھی دل سے ہوتا ہے۔ مثلاً آپ بھرے بازار میں جائیں اور اچھی اچھی بلڈنگیں دیکھیں ' بڑے اچھے اچھے مناظر سامنے ہیں۔ جب آپ واپس آئیں گے تو آپ کا دوست کہے گا کہ بھائی! آج تو بڑی بڑی عمدہ عمدہ بلڈنگیں دیکھی ہیں۔ یہاں تو بڑے اعلیٰ اعلیٰ مناظر ہیں۔ بڑی بہترین سڑکیں ہیں' صاف ستھرا شہر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے تو کچھ نظر نہیں آیا۔ دوست کہے گا کہ خدا کے بندے آنکھیں تیری کھلی ہوئی تھیں۔ چیزیں سامنے تھیں اور تو کہتا ہے کہ نہیں دیکھیں۔ تو جواب میں کہتا ہے کہ اوفوہ میرا دھیان دوسری طرف تھا' مجھے خبر نہیں ہوئی کہ میرے سامنے کیا چیز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنکھیں نہیں دیکھتیں بلکہ دل دیکھتا ہے۔ اگر دل ہی دھیان نہ کرے تو آنکھوں کو کوئی چیز نظر نہیں آئے گی گھنٹے بج رہے ہیں آوازیں آرہی ہیں۔ لوگ سارے سُن رہے ہیں مگر آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا لوگ کہتے ہیں کہ بہت گھنٹے بجے' آوازیں آئیں' آپ کہتے ہیں کہ میں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ دوسرے کہتے ہیں کہ ہم نے تو سب کچھ سنا ہے' وہ کہتا ہے کہ اوفوہ اصل میں میرا خیال دوسری طرف متوجہ تھا' مجھے سننے کا خیال ہی نہیں آیا۔

معلوم ہوا کہ کان نہیں سنتا بلکہ دل سنتا ہے۔ دِل متوجہ ہو جائے تو ساری آوازیں کان میں آئیں گی اگر دل ہی متوجہ نہیں تو کوئی چیز بھی کان میں نہیں آئے گی ذائقہ ہے وہ بھی دل ہی کا کام ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ غذائیں کھائیں اور دِل متوجہ ہو دوسری طرف' نہ کھٹے کا پتہ چلے گا نہ میٹھے کا پتہ چلے گا۔ اگر کوئی کھٹے میٹھے کا پتہ پوچھے گا تو کہے گا کہ بھائی میرا دل تو دوسری طرف تھا مجھے کچھ خبر نہیں۔

مجھے ذائقہ پر ایک حکایت یاد آگئی کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کے ایک سالے تھے حاجی مقبول صاحب بہت نیک صالح تھے اور حضرت ہی کے یہاں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ اتفاق سے چار پانچ روز تک مسلسل چنے کی دال پکتی رہی۔ اور روزانہ تو آدمی سے پلاؤ کھانی بھی مشکل ہو جاتی ہے جب تک کہ غذا نہ بدلے۔

انہوں نے اپنی بہن سے کہا کہ کیا تمام دالیں مٹ مٹا کر ایک ہی چنے کی دال رہ گئی ہے ہفتہ بھر ہو گیا ہے بس ایک دال کو ہی کھاتے ہوئے اور جی بھی بھر گیا کبھی دوسری دال بھی پکالیا کرو۔ انہوں نے اگلے دن ماش کی

دال پکائی۔ کھانے کے بعد کہنے لگے۔ آج پھر وہی چنے کی دال پکائی۔ انہوں نے کمر پر ہاتھ مار کر کہا کہ آنکھیں ہیں کہ نہیں چنے کی دال ہے یا ماش کی؟ تو کہنے لگے کہ مجھے کچھ دھیان نہیں رہا میں سمجھا کہ وہی چنے کی دال کھا رہا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ چکھنا دل سے ہوتا ہے۔ زبان نہیں چکھتی ___ کھٹے میٹھے کا ذائقہ‘ اس کا احساس اور اس کا ادراک یہ سب دل سے متعلق ہے۔ اس لئے اصل چیز انسان کے بدن میں دل ہے اور باقی سب اعضاء اس کے تابع ہیں۔

مرکزِ اصلاح قلب ہے

دماغ بہت اعلیٰ چیز ہے مگر دماغ تفصیل کرتا ہے اس علم کی جو قلب کے اندر پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ قلب اپنے اس علمِ اجمالی کو دماغ کے سامنے پیش کرتا ہے وہ دماغ کی نالیوں میں چکّر کھاتا ہے پھر نظریہ بن جاتا ہے اور نظریہ سے پروگرام بن جاتا ہے۔ پروگرام سے اس کی اشاعت ہو کر پارٹی بن جاتی ہے۔ قلب اگر دماغ کے اندر علم نہ بھیجتا تو نہ نظریہ بنتا‘ نہ پارٹی وجود میں آتی۔

اسی لئے شریعتِ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ دل اصل ہے دماغ اس کے تابع ہے۔ ہاتھ پیر بھی اس کے تابع ہیں۔ پیٹ اور پیٹھ بھی اس کے تابع ہیں۔

اسی بنا پر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اصلاح کا مرکز دل کو بنایا ہے کہ اگر وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ نگاہ بھی ٹھیک ہو جاتی ہے کان بھی درست‘ ناک بھی درست‘ یہ غلط ہے تو ساری چیزیں غلط ہیں۔ اگر دل میں خرابی ہے اور نیت بُری ہے تو نگاہ بھی لا محالہ غلط جگہ پر پڑے گی اور دل میں تقدّس‘ تقویٰ اور طہارت ہے تو نگاہ بھی غلط جگہ نہیں جائے گی۔ اگر دل میں صلاح و تقویٰ ہے تو غلط قسم کی آوازیں باجے گاجے بھی نہ سنے گا۔ اس طرف توجہ بھی نہ کرے گا اور اگر دل میں دیانت و تقویٰ نہیں ہے تو اس کے لئے جائز و ناجائز سب برابر ہے۔ باجے گاجے بھی سنے گا‘ حرام آوازیں بھی سنے گا‘ حلال آوازیں بھی سنے گا۔ اگر دل میں دین ہے تو راستہ درست رہے گا‘ اچھی چیزوں کی طرف طبیعت جائے گی بری چیزوں سے ہٹ جائے گی۔

اِفتائے قلبؒ

چنانچہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ :

استفت قلبک فانّ القلب خیر الحفتی۔

کہ جب تمہیں کوئی معاملہ درپیش ہو تو تم اپنے دل سے فتویٰ لے لیا کرو‘ دل آدمی کا مخلص ہوتا ہے وہ بتاتا ہے کہ بات صحیح ہے کہ غلط ہے۔ آپ نے دوست کے اوپر دعویٰ کر دیا کہ یہ جائیداد میری ہے فلاں کی نہیں۔ حالانکہ دل سے جانتا ہے کہ یہ اسی کی ہے میری نہیں ہے۔ آپ نے قانونی طور پر مقدّمہ بنایا تاکہ جائیداد میرے نام پر آجائے۔ اس پر وکلاء بحث کریں گے‘ ممکن ہے آپ کامیاب بھی ہو جائیں‘ جائیداد آپ کی ہو جائے گی‘ مگر دل آپ کا ملامت کرے گا کہ کمبخت تو غیر کا حق مار رہا ہے۔ دل فتویٰ دے رہا ہے کہ زمین تیری نہیں ہے۔ اگر آدمی دل کی طرف متوجہ ہو جائے تو سارے قصے ختم ہو جائیں لیکن بات تو یہ ہے کہ لوگ مطلب کے پیچھے رہتے ہیں۔

ایک عالم نے فتویٰ دیا جو کہ مرضی کے خلاف تھا۔ اب اس سوال کا دوسرا رُخ بدل کر فتویٰ بھیج دیا۔ اب

اس فتوے کا دوسرا جواب آ گیا وہ بھی مرضی کے مطابق نہ تھا۔ اب پھر تیسرے مفتی کے پاس بھیج دیا تو جو فتویٰ مرضی کے مطابق ہوا اس پر عمل کر لیا اور جو مرضی کے مطابق نہ ہوا اس پر عمل نہ کیا۔ یہ کوئی شریعت کا حکم ہے؟ یہ کیا شریعت کا پیرو ہے؟ یہ تو اپنے نفس کا تابع ہے۔ نفس میں جو چیز آ گئی چاہتا ہے کہ اس کے مطابق فتویٰ مل جائے۔ اس لئے شریعت نے کہا کہ مفتیوں سے فتویٰ بعد میں لینا پہلے اپنے دل سے فتویٰ لے لو' دل انسان کا مخلص ہے وہ سچا مشورہ دے گا اور صحیح فتویٰ دے گا۔

ایمان کا موردِ اوّل قلب ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلام نے دل کو پکڑا ہے اور اسی کا اعتبار کیا ہے کہ انسان کے ضمیر میں جو کچھ ہوتا ہے وہ حق ہوتا ہے اور بحث سے اور نفسانی خواہشات سے جو بھی رائے قائم کرے دل اس کو جانتا ہے کہ وہ غلط ہے' ہاتھ چوری کرتا ہے مگر دل ملامت کرتا ہے کہ تجھے حق نہیں دوسرے کے مال چرانے کا' اگر دل کی بات مانے تو کبھی چوری نہ کرے۔ بہر حال دل انسان کا اصل ہے اس لئے شریعت نے دل کو تاکا ہے کہ اس کی اصلاح کر دو۔ بنیاد درست ہو جائے تو سارا انسان ہی درست ہو جاتا ہے اور بغیر اس کے انسان درست نہیں ہو سکتا۔

شریعت نے دل کی اصلاح کے لئے ایمان رکھا ہے۔ اس لحاظ سے ایمان کا محل بھی قلب انسان ہے۔ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی دل کے اندر ہوتی ہے یہی محبت آدمی سے عمل کراتی ہے۔ دل کے اندر جذبے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی جذبے کے مطابق انسان چلتا ہے۔ تو اولاً ایمان قلب انسانی پر وارد ہوتا ہے۔ وہاں سے وہ ترقی کر کے دوسرے مقامات پر پہنچتا ہے۔ اس کی تاثیر سارے بدن پر پہنچتی ہے تو پھر ہاتھ بھی مؤمن بن جاتا ہے اور کان بھی مؤمن بن جاتا ہے اور سب اعضاء میں ایمانداری پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر دل میں بے ایمانی گھسی ہوئی ہو تو ہاتھ پیر بھی بے ایمان ہوں گے اور بے ایمانی کی حرکتیں کریں گے اور دماغ بھی بے ایمان ہو جائے گا۔ سوچے گا تو بے ایمانی کی باتیں سوچے گا اس لئے کہ دل کی نیت خراب ہے۔

چنانچہ دل کو اصل قرار دے کر انبیاء اسی کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے ہیں کہ اس کے اندر نور و چمک پیدا کریں تاکہ اس کے اندر علم غیب کی چیزیں روشن ہو جائیں اور یہ اسی وقت ہو گا جب کہ قلب پر ایمان وارد ہو۔ اور قلب چونکہ پاک ظرف ہے اس لئے اس میں پاک چیز یعنی ایمان داخل ہوتا ہے اور پھر عمل بھی ویسا ہی ظاہر ہوتا ہے اگر دل میں خوشی ہے تو چہرے پر بھی خوشی کے آثار ظاہر ہوں گے چونکہ خوشی درحقیقت قلب کی صفت ہے' مگر چہرے سے نظر آتی ہے۔ دل میں اگر غم بھرا ہوا ہے تو چہرے سے معلوم ہو جاتا ہے دیکھنے والے کہتے ہیں کہ آج تم بڑے غمگین نظر آتے ہو حالانکہ غم چھپی ہوئی چیز ہے وہ آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے چونکہ دل کا اثر چہرے پر پڑتا ہے تو ہر جاننے والا جان لیتا ہے کہ یہ غم زدہ ہے اور واقعی وہ غم زدہ ہوتا ہے ___ تو غمی و خوشی' محبت و عداوت اور کرنا نہ کرنا یہ چیزیں انسان کے قلب سے متعلق ہیں۔ اگر دل درست ہے سب چیزیں درست ہیں ___ اگر دل خراب ہے تو اس کی وجہ سے سب چیزیں خراب ہیں اور اسی وجہ سے ہاتھ پیر پر اثر پڑتا ہے اور وہ اثر جو قلب پر وارد ہوتا ہے وہ متعدّی ہو کر اعضاء و جوارح پر طاری ہوتا ہے۔ اچھا ہو یا بُرا۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب کسی آدمی کے انتقال کا وقت قریب آتا ہے اور ملائکہ نزعِ روح کرتے ہیں تو ہاتھوں کو اور پیروں کو سونگھتے ہیں اور دماغ کو اور دیگر بدن کو بھی سونگھتے ہیں اور ایمان کی خوشبو سونگھنا چاہتے

ہیں۔ دل میں اگر ایمان ہے تو ہاتھ پیر میں بھی ان کے اثرات رچے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہاتھوں کو بھی سونگھ سکتے ہیں کہ ان میں بھی ایمان کی خوشبو ہے یا نہیں۔ اصل خوشبو کا مرکز تو دل ہے مگر اعضاء پر اس کے اثرات پہنچ جاتے ہیں۔ جیسے خوشبو کا مخزن تو باغ ہے اور پھول ہے مگر کپڑوں سے بھی خوشبو آنے لگتی ہے اور باغ والی خوشبو کے اثرات سے جہاں جہاں ہوا پہنچے گی وہ شے معطّر ہوتی چلی جائے گی۔

بہرحال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر دل اصل ہے اس کو درست کیا جائے اور اس کی درستگی کی پہلی بنیاد ایمان ہے۔ ایمان رہتا ہے قلب کے اندر اور اس کے اثرات ہاتھ پر عمل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

محلّ اسلام

اس سے معلوم ہوا کہ دل ' ایمان کی جگہ ہے اور ہاتھ پیر اسلام کی جگہ ہیں۔ ایمان چھپی ہوئی شئے ہے جو دل میں رہتا ہے۔ اور اسلام کھلی ہوئی شئے ہے جو ہاتھ اور پیروں پر آتا ہے۔ آپ نے نماز پڑھی ہاتھ پاؤں سے پڑھی۔ دیکھنے والے جانتے ہیں کہ آپ نے نماز پڑھی مگر اس فعل کا سرچشمہ قلب کے اندر ہے۔ اگر اس میں جذبہ عقیدت کا' محبت کا' اور اللہ کی چاہت کا پیدا نہ ہوتا تو کبھی نماز نہ پڑھتے۔ معلوم ہوا کہ اصل میں نماز پڑھنے والا دل ہے لیکن عمل کی صورت ہاتھ پیر پر ظاہر ہوتی ہے۔ ایمان کا محل دل ہے اس کے اثرات جب ہاتھ پاؤں پر آتے ہیں تو وہ اسلام بن جاتے ہیں۔

چونکہ ایمان پوشیدہ شے ہے اور اسلام ظاہر شئے ہے اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ **الایمان سر والاسلام علانیة** کہ ایمان چھپی ہوئی چیز ہے جس کو دل لئے ہوئے ہے۔ اور اسلام کھلی ہوئی شے ہے جو ہاتھ پاؤں پر ظاہر ہوتی ہے۔ تو وہی اندرونی شئے جب تک چھپی رہتی ہے اسے ہی ایمان کہتے ہیں اور وہی شئے جب ہاتھ پاؤں پر آتی ہے' اسے اسلام کہتے ہیں۔

حقیقتِ ایمانیہ

ایمان کے معنٰے کیا ہیں؟ اور کس طرح سے ہمارے اندر آتا ہے؟ اور اس کے آثار کیا ہیں؟ اور کیسے پہچانا جاتا ہے؟ تو سنئے! ایمان کی حقیقت ہے محبت اگر اللہ کی محبت کامل ہے تو کہیں گے کہ اس کا ایمان کامل ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دل میں رچ گئی ہے تو کہیں گے کہ ایمان آگیا۔ اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے :

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ

جو لوگ ایمان لائے ہیں ان میں اللہ کی محبت اور عشق سرایت کئے ہوئے ہے۔ اگر عشق و محبت نہ ہوتا تو ایمان کبھی نہ آتا۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دل کے رگ وپے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بس گئی ہے اور اللہ کی محبت جم گئی ہے۔

تو محبت درحقیقت ایمان کا دوسرا نام ہے۔ ایمان نہیں محبت نہیں۔ محبت نہیں تو ایمان نہیں۔ اصل چیز اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے۔ یہی چیز ایمان بناتی ہے یہی اعتقاد قائم کرتی ہے۔ اسی کو فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ :

لا یؤمن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من ولدہ ووالدہ والناس اجمعین۔

کوئی بھی تم میں مؤمن نہیں بنے گا جب تک قلب میں میری اتنی محبت نہ ہو کہ اس کو اتنی نہ اپنے ماں باپ کی اور نہ اولاد سے محبت ہو اور نہ کسی اور سے اتنی محبت ہو۔ بغیر حب نبی کے ایمان کامل نہیں ہوتا۔

آثارِ ایمانیہ

علامت اس کی یہ ہے کہ ایک طرف تو ہے اولاد کی محبت' ایک طرف اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت' جب ٹکرا جائیں تو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو اختیار کرے اور اولاد کی محبت چھوڑ دے' یہ علامت ہوگی کہ واقعی محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے اگر آدمی نے اولاد کی محبت کو اختیار کیا اور رسول کی محبت کو چھوڑ دیا تو کہا جائے گا کہ رسول سے محبت نہیں بلکہ اولاد سے محبت ہے تو ٹکراؤ سے پتہ چلتا ہے کہ کون سی محبت غالب ہے۔ مثلاً آپ لحاف میں آرام سے پڑے ہوئے بڑی خوشگوار نیند آرہی ہے۔ اچانک مؤذن نے آواز دی :

حیّ علی الصّلوٰۃ۔ حیّ علی الفلاح۔
"دوڑو نماز کی طرف' دوڑو کامیابی کی طرف"۔

آپ نے لبیک نہیں کہا تو کہیں گے کہ نفس کی محبت غالب ہے' اور اگر آرام چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور وضو کیا اور مسجد میں گئے نماز پڑھی تو کہیں گے کہ محبتِ خدا و رسول غالب ہے۔ تو ٹکراؤ کے وقت آدمی جدھر مائل ہوتا ہے اسی طرف کی محبت کا حکم لگا دیا جاتا ہے۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم مؤمن نہیں بن سکتے جب تک میری محبت اولاد' ماں باپ وغیرہ سب کی محبت سے غالب نہ ہو جائے کہ جب ماں باپ کی محبت میری محبت سے ٹکرائے تو مجھے اختیار کرو' ماں باپ کو چھوڑ دو' اور جب میری محبت اولاد کی محبت سے ٹکرا جائے تو مجھے اختیار کرو' اولاد کی محبت کو چھوڑ دو۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ میں محبتِ نبوی اتنی غالب تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت فرمائی تو صحابہؓ نے بھی اس محبت کی وجہ سے وطن چھوڑا۔ گھر بار چھوڑا۔ عزیز و اقارب چھوڑے' جائیدادیں چھوڑیں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو لئے مکّہ میں ساری تجارتیں ترک کیں اور مدینہ میں غربت کی زندگی اختیار کی ان کو کس چیز نے مجبور کیا؟ یہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی تو تھی۔ اس محبت کی وجہ سے عیش و آرام کا سب سامان ترک کیا' مفلس و قلّاش ہو کر رہنا گوارہ کیا مگر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑنا گوارہ نہیں کیا۔

مقامِ صدّیقیت

حدیث میں ایک واقعہ ذکر فرمایا گیا ہے کہ غزوۂ بدر میں ۳۱۳ صحابیؓ شریک تھے۔ ان میں صدّیق اکبرؓ بھی موجود تھے۔ صدّیق اکبرؓ کے چھوٹے بیٹے جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے بعد میں وہ ایمان لائے۔ وہ اس غزوہ میں کفّار کی طرف سے لڑنے کے لئے آئے تھے۔ ایمان لانے کے بعد ایک روز صدّیق اکبرؓ سے عرض کیا کہ اباجان غزوۂ بدر کے موقع پر کئی موقعے ایسے آئے کہ آپ بالکل میری تلوار کی زد پر تھے اگر میں وار کرتا تو آپ بچ نہیں سکتے تھے۔ مگر میں نے سوچا میرے باپ ہیں کس طرح ان پر حملہ کروں تو میں ایک طرف ہو گیا۔ یہ بات بیٹے نے باپ سے کہی :

"حضرت صدّیق اکبرؓ نے فرمایا کہ اچھا یہ موقعے آئے ہیں کہ میں اور تو آمنے سامنے

آ گئے تھے۔ بیٹے نے کہا ہاں۔ فرمایا کہ مجھے خبر نہ ہوئی اگر تو میری زد پر آتا تو میں سب سے پہلے تجھے قتل کرتا۔ اس واسطے کہ تو دشمن تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور رسول کی محبت کے مقابلے میں اولاد کی محبت کوئی چیز نہیں ہے۔ اس لئے اگر تو میری زد پر آتا تو میں تجھے پہلے قتل کرتا۔ وہ کفر کی بات تھی یہ ایمان کی بات ہے''۔

غلبۂ محبت

معلوم ہوا کہ ایمان جب کسی کے دل میں گھر کر جاتا ہے اور محبت غالب آجاتی ہے تو اپنے کو اس محبت کے بدلے فروخت کردیتا ہے۔ پھر محبوب کی ہر ادا سے محبت ہوجاتی ہے اس کے مقابلے میں نہ اولاد سے محبت رہتی ہے اور نہ ماں باپ کی محبت کوئی حیثیت رکھتی ہے۔ سب کی محبتیں ختم ہوجاتی ہیں اور ایک ہی محبت غالب آتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے ہجرتیں کیں۔ جائیدادیں چھوڑیں، تجارتیں ترک کیں، یہ سب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا نتیجہ تھا۔ ان چیزوں کی کوئی پرواہ نہ کی اس لئے کہ رسول کی محبت غالب تھی۔

تو پہلا حق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ محبت ہو۔ محبت نہیں تو ایمان نہیں۔ ایمان نہیں تو پھر اسلام ہی نہیں۔ تو بنیادی چیز محبت ہے۔ اسی واسطے محبت پر زور دیا گیا ہے۔ یہی صحابہؓ کا طریق تھا اور یہی بعد میں اہل اللہ کا طریق رہا ہے۔ یہ قاعدے کی بات ہے کہ جس شخص کی محبت غالب ہوتی ہے اس کی ساری ادائیں محبوب بن جاتی ہیں۔ اس کا چلنا پھرنا بھی محبوب بن جاتا ہے اور اس کا لباس بھی محبوب بن جاتا ہے اور اس کا ذکر اور چرچا بھی محبوب بن جاتا ہے۔ فقط محبوب سے ہی محبت نہیں ہوتی بلکہ اس کے نام سے جو چیز منسوب ہوجاتی ہے۔ اس سے بھی محبت ہوجاتی ہے۔

کسی نے مجنوں کو دیکھا کہ لیلیٰ کے مکان کی اینٹ اینٹ کو چومتا پھر رہا ہے کسی نے کہا۔ احمق! تو یہ کیا کررہا ہے۔ اینٹوں میں کیا رکھا ہوا ہے اور اینٹوں کو چومنے سے کیا فائدہ ہے؟ اس نے دو شعر میں جواب دیا ؎

امرّ علی الدّیار دیار لیلیٰ
اقبل ذا الجدار وذا الجدارا

کہ میں لیلیٰ کے مکان پر جب گزرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور کبھی اس اینٹ کو چومتا ہوا کبھی اس دروازے کو چومتا ہوں۔ کبھی اس دہلیز کو چومتا ہوں اور کیوں چومتا ہوں ؎

وما حبّ الدّیار شغفن قلبی
ولکنّ حب من نزل الدیارا

مجھے ان اینٹوں سے محبت نہیں ہے وہ جو ان اینٹوں میں بیٹھی ہوئی ہے اس سے محبت ہے اس کی وجہ سے ان اینٹوں سے محبت ہوگئی ہے۔ اس کے کُتّے سے محبت ہوگئی ہے۔ اس کی بلائیں لینے کو بھی تیار ہوں۔ تو جب محبت ہوتی ہے تو ایک محبوب ہی سے محبت نہیں ہوتی بلکہ جو چیز اس کے نام سے لگ جاتی ہے وہ بھی محبوب بن جاتی ہے۔

چونکہ آپ کو محبت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو گُنبدِ خضراء بھی محبوب ہوگا۔ اس کی زیارت کو آپ عبادت سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر ایک آنکھ گنبد پر پڑجائے تو دنیا و آخرت کی سعادت مل جائے۔ وہ کیوں؟ اس لئے کہ گنبدِ خضرا خود محبوب نہیں بلکہ اس میں جو آرام فرما ہیں اصل میں وہ محبوب ہیں۔ چونکہ

اس گنبد پر نام لگ گیا ہے ان کا اس لئے وہ بھی محبوب ہو گیا گنبد تو پھر قریب ہے۔ مدینہ سے محبت ہے‘ شعراء کو دیکھو تو مدینہ تو صرف ایک شہر ہے جیسے ہمارے یہاں شہر ہیں۔ یہ شہر زیادہ خوبصورت ہیں‘ وہ شہر اتنا خوبصورت بھی نہیں مگر پھر بھی محبت ہے اصل میں محبت ہے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وجہ سے گنبدِ خضراء بھی محبوب ہوا۔

اس محبت کی وجہ سے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی محبوب ہوئی اسی محبت کی وجہ سے مدینہ بھی محبوب ہوا۔ تو سلسلہ بسلسلہ ہر چیز تک محبت پہنچ جاتی ہے۔

آپ بیتُ اللہ شریف کی اینٹ اینٹ کو چُومتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ بیتُ اللہ کے مقام پر تجلّیٔ ربّانی اُتری ہوئی ہے۔ اصل میں محبت اللہ سے ہے چونکہ بیتُ اللہ‘ اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ ہے اس لئے اس سے بھی محبت ہو گئی ہے اور جب خانۂ کعبہ محبوب ہوا تو پوری مسجدِ حرام بھی محبوب ہو گئی اور اس کی محبت ظاہر ہوئی اس طرح پر کہ آپ اس کی عظمت کرتے ہیں۔ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ جب مسجدِ حرام محبوب ہوئی تو مکّہ محبوب بن گیا کہ وہ شہر پناہ ہے اس مسجدِ حرام کی‘ لہٰذا وہ شہر بھی محبوب بن گیا۔ اور چونکہ حجاز میں واقع ہے تو ہم حجاز مقدّس کہتے ہیں کیونکہ سارے حجاز سے محبت ہو گئی ہے۔ تو حجاز کے جتنے باشندے ہیں ان سب سے محبت ہو گئی۔ یہ پڑوسی ہے اس کا‘ لہٰذا یہ بھی محبوب ہے تو جب آدمی کے دل میں محبت آتی ہے تو فقط ایک محبوب ہی محبوب نہیں رہتا‘ بلکہ محبوب کی ساری ادائیں محبوب بن جاتی ہیں۔ چال ڈھال بھی محبوب‘ لباس بھی محبوب‘ کھانے کا طرز بھی محبوب‘ رہن سہن کا طرز بھی محبوب۔ وہ تمام چیزیں محبوب بن جاتی ہیں جو محبوب کی پسندیدہ اور محبوب ہیں۔

آثارِ محبت

بہر حال یہیں سے اتباعِ سنت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ یہ محبت کا اثر ہے اگر محبت ہے تو اتباعِ سنت اختیار کرے گا ورنہ نہیں۔ محبت ہی آمادہ کرتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پیروی کرنے پر کہ جس طرح آپ بیٹھ کر کھاتے تھے‘ اسی طرح بیٹھ کر کھانا کھایئے۔ جس طرح آپ آرام فرماتے تھے اسی ڈھنگ سے آرام ہو۔ جس ڈھنگ سے دشمنوں سے برتاؤ کرتے تھے وہی ڈھنگ تم بھی اختیار کرو۔ ان چیزوں سے اتباعِ سنت کا جذبہ غالب ہو جائے گا۔

اگر محبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ غالب ہے تو بدعات سے نفرت ہو جائے گی‘ سنت کی پیروی سے محبت ہو گی کیونکہ محبوب کی ذات محبوب ہے اور جب ذات محبوب ہے تو ذات کی ادائیں بھی محبوب ہوں گی۔ آپ کا طرزِ سلام و کلام بھی محبوب ہو گا۔ ہر چیز محبت کے نیچے آتی چلی جائے گی اس کا نام اتباعِ سنت ہے کہ ہر شعبہ میں پیروی ہو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کی اس میں خیر و برکت ہے حتیٰ کہ معاملات و معاشرت میں بھی جب پیروی کریں گے تو صدّیق بن جائیں گے۔

سونے کا مسنون طریق اور قوتِ ارادی

میں کہتا ہوں۔ مثال کے طور پر ہم سوتے ہیں اس میں بھی ہم آزاد نہیں ہیں۔ بندھے ہیں سنت کے کہ اس طرح سے سوئیں جس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوتے تھے۔ سونا تو ہے ہی لیکن حضور کے طریقے پر سوئیں گے تو عبادت بن جائے گا۔

اور آدمی چار طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ پر سوئے گا۔ چت لیٹ کر سوئیگا یا اوندھا لیٹ کر یا دائیں کروٹ پر' بائیں کروٹ پر سوئے گا۔ بس یہی چار طریقے سونے کے ہیں۔ کوئی اُلٹا لٹک کر تو سونے سے رہا۔ ان چار طریقوں میں ہم آزاد نہیں بنائے گئے بلکہ پابند ہیں سنت کے۔

اوندھا لیٹنے کو شریعت میں مکروہ سمجھا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ مسجد میں اوندھے لیٹے ہوئے سو رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیروں سے متنبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اے ابو ہریرہ اوندھے لیٹ کر مت سوؤ اس لئے کہ یہ دوزخیوں کی ہیئت ہے کہ ان کو اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ اس لئے مؤمن کا کام نہیں کہ وہ جہنمیوں کی ہیئت اختیار کرے اور جہنمیوں سے مشابہت اختیار کرے۔

اور پھر اوندھا لیٹنا صحت کے لئے مضر ہوتا ہے۔ اس سے انتڑیاں اُلٹ پلٹ ہو جاتی ہیں ممکن ہے کہ کسی انتڑی میں گرہ لگ جائے اور پیٹ میں درد شروع ہو جائے یا کوئی اور تکلیف ہو جائے اس لئے شریعت نے مکروہ سمجھا ہے۔ اگر سوتے سوتے اوندھا ہو جائے وہ دوسری بات ہے وہ اس کے اختیار سے باہر ہے اپنے ارادے سے آدمی اوندھا نہ لیٹے۔

اب رہ گیا چت لیٹنا تو چت لیٹ کر سونا جائز تو ہے شرعاً ممنوع نہیں ہے حرام نہیں۔ مگر شریعت کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ اس واسطے کہ چت لیٹنا بے قابو ہو جانے کی علامت ہے اور جب آدمی بے بس ہو جاتا ہے تو چت لیٹ جاتا ہے اسی واسطے اگر کوئی پہلوان کسی کو پچھاڑ دے تو کہتے ہیں کہ چاروں شانے چت گرا۔ کوئی نہیں کہتا ہے کہ چاروں شانے پٹ گرا کیونکہ جو پٹ ہوتا ہے وہ اندھا ہوتا ہے اسے کچھ قابو ہوتا ہے کہ وہ ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہو جائے۔ مگر چت لیٹنے والا بالکل بے قابو ہوتا ہے اور مسلمانوں کے لئے ضعیفوں کی ہیئت پسند نہیں کی گئی' مؤمن کا کام ہے مضبوط ہونا' مؤمن کا بیماروں کی طرح سے پڑنا نہیں ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے :

المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف

قوی مسلمان ضعیف مسلمان سے بہتر ہے۔ قوت ہوگی تو جہاد کرے گا' قوت ہوگی تو مجاہدہ کرے گا اور ضعیف بیچارہ چارپائی پر بس پڑا ہوا ہے۔ نہ جہاد کے کام کا' نہ جنگ و جدل کے کام کا' نہ مجاہدے کے کام کا' کسی کام کا نہیں' یہ شریعت نے پسند نہیں کیا ہے۔ بلکہ یہ پسند کیا ہے کہ ہر معاملہ میں بہادرانہ افعال صادر ہونے چاہئیں۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے :

آدمی مریلوں اور ضعیفوں کی چال نہ چلے بلکہ اس طرح چلے کہ دیکھنے والا دیکھے کہ اس کے بدن میں کچھ جان ہے' کچھ قوت ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے پر سوار ہوتے تھے تو رکاب میں پیر رکھ کر سوار نہیں ہوتے تھے کہ یہ بھی ایک قسم کی محتاجگی ہے کہ آدمی بغیر رکاب کے سوار نہ ہو سکے بلکہ کود کر اور اچھل کر سوار ہوتے تھے تاکہ شجاعت اور بہادری ظاہر ہو۔

بہر حال اسلام نے مؤمن کے لئے کوئی ایسی حرکت پسند نہیں کی جس سے ضعف ٹپکتا ہو۔ مجبوری ظاہر ہوتی ہو اور چونکہ چت لیٹنا بے قابو ہونے کی علامت ہے۔ ضعیفوں اور بیماروں کی علامت ہے اس لئے جائز تو ہے۔ شریعت نے اس کی ممانعت نہیں کی مگر اس کو شریعت نے پسند نہیں کیا۔

اب رہ گیا بائیں کروٹ سونا تو مخالفت تو اس کی بھی نہیں ہے' جائز ہے مگر پسندیدہ یہ بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی گئی کہ بائیں جانب قلب ہے۔ جب بائیں کروٹ پر سوئے گا تو آدمی کے قلب کو راحت زیادہ

ملے گی اور جب راحت زیادہ ملے گی تو نیند گہری آئے گی اور جب نیند گہری آئے گی تو اندیشہ ہے کہ تہجد قضا ہو جائے اور صبح کی نماز بھی قضا ہو جائے۔ اور دوسرے معمولات قضا ہو جائیں۔ اس لئے شریعت نے پسند نہیں کیا کہ آدمی اتنی زیادہ راحت کرے کہ گھوڑے بیچ کر سوجائے اور مردوں سے شرط باندھ کر سوجائے۔ آدمی کو چوکنا ہو کر سونا چاہئے تاکہ جس وقت چاہے آنکھ کھلے۔ آدمی کا قلب مضبوط ہو۔ راحت میں غرق ہو کر بے قابو نہ بنے۔

اسی واسطے عزم پیدا کیا کہ اگر آدمی سوتے وقت یہ ارادہ کر کے سوئے کہ ہماری آنکھ صبح کو چھ بجے کھلنی چاہئے تاکہ جماعت قضا نہ ہو تو ٹھیک چھ بجے آنکھ کھلے گی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ نہ کھلے۔ اُٹھنا نہ اُٹھنا تو آدمی کے نفس کی بات ہے۔ سُستی سے نہ اُٹھے مگر آنکھ ضرور کُھل جائے گی۔ تو مضبوط عزم و ارادہ ضرور کام کرتا ہے اس کے لئے شریعت نے طریقہ بھی رکھا ہے کہ سورۂ کہف کی جو آخری آیتیں ہیں وہ پڑھ کر سویا کریں اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ___ تاآخر سورۃ۔

ان آیتوں کا اثر یہ ہے کہ اگر ان آیتوں کو پڑھ کر اور ارادہ کرے کہ فلاں وقت اُٹھنا ہے تو ضرور آنکھ کھلے گی۔ مگر پہلی چیز عزم اور عزیمت ہے کہ ارادہ کر کے سوئے کہ مجھے اٹھنا ہے اور اگر ارادہ کر کے سوئے کہ مجھے تو سونا ہے چاہے اُٹھے نہ اُٹھے تو آٹھ بجے سے پہلے آنکھ نہ کھلے گی۔ انسان کے ارادے کو اللہ تعالیٰ نے بڑی قوت دی ہے۔ انسان کی عزیمت کو بڑی طاقت بخشی ہے۔ ارادے پر ان آیتوں کو بھی پڑھ لے تو اور زیادہ مدد ہو گی۔

بہر حال شریعت کا منشاء یہ ہے کہ گہری نیند مت سوؤ کہ سارے اذکار، سارے اعمال، ساری نمازیں نیند کی نذر ہو جائیں۔ اس لئے شریعت نے پسند نہیں کیا کہ انسان بائیں کروٹ پر سوئے اور گہری نیند سوئے۔

اب دائیں کروٹ رہ جاتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ میرا طریقہ ہے اور یہی سارے انبیاء علیہم السلام کا طریقہ رہا ہے۔ آپ دایاں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر سوتے تھے۔ جب آدمی دائیں کروٹ سوئے گا تو قلب معلق رہے گا اور جب دل لٹک گیا تو زیادہ راحت نہیں ملے گی قلب چوکنا رہے گا۔ ایسی نیند نہیں آئے گی کہ جس میں آدمی غرق ہو جائے اس لئے دائیں کروٹ پر لیٹنے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قرار دیا ہے اور دوسری ہیئتوں کو ممنوع تو قرار نہیں دیا مگر پسندیدہ نہیں فرمایا کیونکہ دوسری ہیئتوں میں مؤمن کا مقصدِ اصلی فوت ہو جاتا ہے۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نماز روزہ تو بجائے خود عبادت ہے مگر عام زندگی میں بھی آپ آزاد نہیں پیدا کئے گئے بلکہ قانونِ خُداوندی کے پابند بنائے گئے ہیں کہ سوؤ تو اسی ہیئت سے سوؤ جس ہیئت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سوتے تھے، کھانے بیٹھو تو اسی ہیئت سے کھاؤ جس ہیئت سے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر کھاتے تھے۔ جب آپ کوئی کام کریں تو اسی ہیئت سے کریں جس ہیئت سے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کام کو کرتے تھے۔

اِبتدا بالتیمّن

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ تھی جیسے کہ روایت میں ہے :

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يحب التيمّن۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اچھے کاموں میں ہمیشہ دائیں جانب کو پسند فرماتے تھے۔ اگر کنگھا کرتے تو پہلے دائیں جانب پھر بائیں جانب، اگر جوتا پہنتے تو پہلے دائیں پیر میں پھر بائیں پیر میں اگر کرتہ پہنتے تو پہلے آستین میں

دایاں ہاتھ ڈالتے پھر بایاں۔ دانتوں میں اگر مسواک کرتے تو پہلے دائیں جانب لے جاتے پھر بائیں جانب۔ ہر اچھی چیز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں جانب کو پہلے اختیار فرماتے تھے۔ یہی کام مومن کا ہونا چاہئے کہ ہر اچھے کام میں دائیں جانب کو پہلے اختیار کرے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں کوئی چیز آتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تقسیم فرماتے تو دائیں جانب سے شروع فرماتے۔ دائیں جانب تقسیم فرما کر پھر بائیں جانب متوجہ ہوتے ___ اور ہر بُری اور خسیس ترین شئے کی ابتدا بائیں جانب سے فرماتے، ناک صاف کرتے تو بایاں ہاتھ استعمال کرتے۔ استنجاء کرتے تو بایاں ہاتھ استعمال کرتے۔ یہ ہے سنت' اگر آپ سنت پر عمل کریں تو آپ کی ساری دنیا دین بن جائے گی۔ یہ کھانا پینا' رہنا سہنا اتباعِ سنت کی وجہ سے دین بنتا چلا جائے گا۔ اور اتباعِ سنت کب ہوتا ہے؟ یہ ہوتا ہے محبت کے غلبے کی وجہ سے اگر محبت غالب نہ ہو تو آدمی کبھی بھی اتباعِ سنت نہ کرے بس یہ سوچے گا کہ مطلب نکل جانا چاہئے۔ کہاں کی محبت اور کہاں کا اتباع۔ محبت غالب رہے گی تو قدم قدم پر خیال رہے گا۔

معیارِ عقل

حضرت تھانویؒ کے ایک خلیفہ تھے وہ سہارنپور سے سوار ہوئے۔ جانا تھا ان کو کانپور' پہلے سہارنپور کے گنے بہت مشہور تھے۔ اب وہ گنا نہیں ہوتا وہ گنے بہت ملائم۔ بہت میٹھے اور بڑے ہی عمدہ ہوتے تھے۔ تحفے کے طور پر لوگ بہت دُور دُور تک لے جاتے تھے تو انہوں نے بھی گنے خریدے کہ کانپور جا کر احباب میں تحفے کے طور پر تقسیم کردوں گا۔ مگر گنوں کا وزن چالیس سیر سے بھی زیادہ تھا اور ایک ٹکٹ سے اتنا وزن نہیں لے جاسکتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ زائد محصول دے دوں گا۔ بابو سے انہوں نے ذکر کیا تو بابو نے ایک نیک صورت دیکھ کر کہ بھولا بھالا ہے۔ بڑا مقدّس آدمی ہے۔ کہا کہ آپ لے جائیں۔ کوئی محصول وغیرہ نہیں ہے۔ گویا اس نے اپنے نزدیک بڑی عقیدت سے کام لیا کہ نیک صالح آدمی ہے کیا اس سے پیسے لئے جاویں۔ اس نے کہا کہ معاف ہے آپ لے جائیں۔

انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! آپ محصول لے لیں اگر ریل میں چیکر آگیا تو محصول بھی لے گا اور جرمانہ الگ وصول کرے گا۔ وہاں ڈبل دینا پڑے گا۔ اس نے کہا کہ ہم چیکر سے کہدیں گے وہ بھی آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! جب میں غازی آباد اسٹیشن پر دوسری گاڑی بدلوں گا تو دوسرا چیکر آئے گا وہ جرمانہ وصول کرے گا۔ مال زیادہ ہے ٹکٹ میں اتنی گنجائش نہیں۔ سفر جتنا زیادہ لمبا ہوگا اتنا ہی زیادہ جرمانہ بھی ہوگا تو وہاں مجھے چوگنا دینا پڑے گا۔ آپ مجھ سے یہیں لے لیں اس نے کہا کہ ہم چیکر سے کہدیں گے وہ اس چیکر سے کہدے گا۔ وہ آپ کو کچھ نہ کہے گا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا جب میں کانپور میں اُتروں گا اور گیٹ سے پاس ہوں گا تو وہ گیٹ بابو کہے گا کہ بلٹی (BUILETY) وہ میرے پاس ہوگی نہیں وہ مجھ سے چوگنے وصول کرے گا اتنے میری جیب میں ہوں گے بھی نہیں۔ اس بابو نے کہا کہ اس چیکر سے کہلوادیں گے وہ اس گیٹ بابو سے کہدیں گے وہ آپ کو کچھ نہیں کہیں گے۔ انہوں نے کہا کہ پھر کیا ہوگا؟ بابو نے کہا پھر تمہارا گھر آجائے گا۔ انہوں نے کہا کہ گھر تو گھر جائے گا۔

مگر خداوند عالم نے اگر یوں پوچھ لیا کہ ریلوے کی چوری کیوں کی تھی تو میں کیا جواب دوں گا۔ تو اب وہ بیچارہ خاموش ہوا اس بابو نے کہا کہ یہ بیچارہ مجنوں معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں جو اللہ تعالیٰ کا نام لیتا ہے اس کو مجنوں ہی کہتے ہیں۔

اہلِ دنیا عقلمند اس کو کہتے ہیں جو بے ایمانی زیادہ کرے' چالاکیاں زیادہ کرے' دھوکہ زیادہ دے اسے کہتے ہیں کہ بڑا بھاری دانشمند ہے۔ اور اگر بیچارہ بھولا بھالا سیدھا ایمانداری اور امانتداری سے پیش آئے اسے کہتے ہیں کہ یہ دیوانہ ہے۔ پہلے زمانہ کی روح اس میں آگئی ہے مگر حقیقت میں عقلمند وہی ہے جو اپنی آخرت کو پیش نظر رکھے۔ وہ عقلمند نہیں جو انجام کو بھلا دے اور بعد میں مصیبتیں اٹھائے جس کو مولانا رومیؒ نے کہا ہے کہ ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شُد
اوست فرزانہ کہ فرزانہ نہ شُد

دیوانہ وہی ہے جو کہ دیوانہ نہ بنا اور عقلمند' وہ ہے جو عقلمند بننا نہیں چاہتا ___ اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیوانگی ہی چاہتا ہے۔ حقیقت میں دانشمند وہی ہے جو شخص اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کا نام زیادہ لے گا وہی لقب پائے گا مجنونوں کا' خبطیوں کا۔ اور جو شخص چالاکیاں زیادہ کرے گا وہ لقب پائے گا اہلِ دنیا کے نزدیک دانشمند اور عقلمند ہونے کا۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ :

یُقال للرّجل ما اعقلہٗ وما اظرفہٗ وما اجلدہٗ ولیس فی قلبہٖ مثقال ذرّۃ من الایمان۔

"ایک آدمی کو کہا جائے گا کہ کتنا بڑا دانشمند ہے اور کتنا بڑا عقلمند ہے اور کیا وسیع الظرف ہے اور کیسا دانا ہے اور کیسا مدبّر ہے حالانکہ اس کے قلب میں ذرّہ برابر ایمان نہ ہوگا"۔

اور دنیا کہے گی کہ بڑا عقلمند ہے بڑا دانشمند ہے' مگر چونکہ اس میں ایمان کا نشان بھی نہ ہوگا جو کچھ ہوگی وہ خود غرضی ہوگی۔ دنیا داری اور دنیا سازی ہوگی اس لئے وہ عقلمند نہیں ہے ___ شریعت اسے عقلمند کہتی ہے جو اپنے انجام کو سوچے اور دنیا کے بارے میں خیال کرے کہ بھلی بُری جیسی بھی ہوگی گزر جائے گی۔ وہاں جو مصیبت ہے وہ اَبدی ہے وہ ہمیشہ جھیلنی پڑے گی جو کہ قابلِ برداشت نہیں ہے۔ یہاں کی مصیبت ایک دن ختم ہو جائے گی۔ چونکہ نہ یہاں کی مصیبت باقی رہنے والی ہے اور نہ یہاں کی نعمت باقی رہنے والی ہے۔ اس لئے جو آدمی آخرت کے مصائب کی رعایت کرکے دنیا کے مصائب کا تحمل کرے وہ عقلمند ہے۔ فرمایا گیا :

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰی۔

"آخرت کا عذاب ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اور شدید ہے"۔

اور یہاں کی مصیبت نہ شدید ہے اور نہ دیر تک باقی رہنے والی ہے۔

راستے کا رنج و راحت اور منزلِ مقصود

اکبرؒ نے کیا خوب بات کہی ہے اور بڑی عمدہ بات کہی ہے لقب ہی اس کا لسانُ العصر ہے۔ اس بنا پر ان کی بات بڑی حکمت کی بات ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ؎

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے
یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

یہ کام تمہیں بھی کرنا ہے اور مجھے بھی کرنا ہے اور سب کو کرنا ہے کیونکہ سب کو ہی جینا اور مرنا ہے۔

آگے کہتا ہے ؎

رہ گئی بحث رنج و راحت کی
وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

رنج بھی گزر جائے گا اور راحت بھی گزر جائے گی۔ بڑی ہی حکیمانہ بات کہی ہے کہ راستہ کے رنج و راحت پر نظر مت رکھو اور انجام پر نظر رکھو۔ منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ اگر منزل پر پہنچ کر مصیبت میں مبتلا رہے تو وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ تو اکبرؒ نے کہا ہے کہ راستے کا رنج و راحت فقط وقت کے گزر جانے کا نام ہے۔

یہاں میرے دل میں ایک خلجان یہ پیدا ہوتا ہے کہ بات تو بڑی حکیمانہ کہی ہے راستے کے رنج و راحت کا خیال مت کرو مگر منزلِ مقصود نہیں بتلائی کہ جانا کہاں ہے۔ اسی بنا پر دو تین شعر میں نے اس میں جوڑ دیئے ہیں اپنی طرف سے اکبر نے راستہ کا پتہ دیا ہے۔ میں منزل کا پتہ بتادیتا ہوں میں کوئی شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر کہنا میرا مشغلہ ہے۔ پھر اکبر جیسا شاعر اور اس کے شعر میں اپنا شعر ملانا ایسا ہے جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگادیں۔ بس ایک تک بندی ہے جو میں نے کردی ہے اور میں نے اکبر کے اشعار پر اضافہ کردیا ہے۔ تو دو ان میں راستے ہی کے بارے میں ہیں ان میں ایک آخری منزل کے بارے میں۔ اکبرؒ نے تو کہا ہے کہ ؎

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے
یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
رہ گئی بحث رنج و راحت کی
وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

آگے میں کہتا ہوں ؎

رہ گیا عز و جاہ کا جھگڑا
یہ تخیّل کا پیٹ بھرنا ہے

یعنی عزّت ہم کہتے ہیں یہ فقط خیالی شئے ہے اور خیال بھی دوسرے کا۔ اگر ہمارے خیال سے ہماری عزّت ہو تو چوبیس گھنٹے ہم خیال کئے بیٹھے رہیں کہ ہم سے بڑا کوئی نہیں۔ اگر خیال بدل گیا بس جب ہی ذلیل ہو گئے۔ آج خیال یہ ہے کہ فلاں آدمی بہت بڑا ہے اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیتے ہیں۔ لیڈر بن جاتے ہیں اور کل کو خیال بدل گیا تو دوسرے کے گلے میں ڈال دیا۔ پہلے کی ساری عزّت ختم ہو گئی۔ بس ذلیل ہو گیا یہ صرف خیالی عزّت ہے۔

اصل عزّت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو۔ حق تعالیٰ نے فرمایا :

وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ۔

تو اصل عزّت یہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے مہر ثبت کردی ہے۔ اس لئے میں نے کہا کہ ؎

رہ گیا عز و جاہ کا جھگڑا
یہ تخیّل کا پیٹ بھرنا ہے

اور میں آگے کہتا ہوں ؎

قابلِ ذکر ہی نہیں خورد و نوش
یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے

کھانا پینا یہ کوئی قابلِ ذکر نہیں اس لئے کہ یہ کوئی کمال کی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ چوپائے بھی کھاتے پیتے ہیں اگر آدمی نے کھالیا تو کونسا کمال کیا ہے۔ جانور کی حد سے نہیں نکلے گا۔ وہ بھی کھاتے ہیں تو کھانا کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ بہرحال تین چیزیں ہوگئیں اکبر نے کہا تھا کہ راستے کے رنج و راحت کی پرواہ مت کرو' یہ گزر جانے والی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کھانے پینے کا خیال مت کرو یہ تو جانوروں کی علامت ہے نہ عزت و ذلت کا خیال کرو کیونکہ وہ خیالی شے ہے بلکہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کا ارادہ کرو اور کوشش کرو۔ آخری شعر میں اسی کا پتہ دیا ہے ۔

مقصدِ زندگی ہے طاعتِ حق
نہ کہ فکرِ جہاں میں پڑنا ہے

مدارِ نجات

اصل مقصد اطاعتِ خداوندی ہے یہ مل گیا تو سب کچھ مل گیا۔ اگر محنت کر کے دنیا کا جغرافیہ یاد کرلیا اور اس پر عبور بھی ہوگیا کہ بنگلور میں اتنے درخت ہیں' فلاں شہر ایسا ہے' فلان ایسا ہے۔ آخرت میں ایک بھی نہ پوچھا جائے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ حضور کی کونسی سنت پر عمل کیا۔ علم دین کیا سیکھا تو آپ کہیں کہ حضور! عبادت تو نہیں کی البتہ دنیا کا جغرافیہ لے کر آیا ہوں یہ کام نہیں دے گا کیونکہ اس سے نجات نہ ہوسکے گی آپ کہیں کہ معلوم کر کے آیا ہوں کہ دنیا میں اتنے پہاڑ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم نے تمہیں دنیا میں پہاڑ گننے کے لئے بھیجا تھا بلکہ تم کو طاعت و عبادت کے لئے بھیجا تھا۔ قانونِ خداوندی کی پابندی کے لئے بھیجا گیا تھا۔ وہ بتاؤ کتنی کی ہے۔ نجات کا مدار اسی پر ہے نہ جغرافیہ پر نہ سائنس پر نہ جدید تعلیم پر اس آخری شعر میں مقصد زندگی اور منزل کا پتہ دیا گیا ہے۔

محبت کی تلخیاں

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اصل چیز محبت ہے پھر محبت سے ایمان بنتا ہے پھر اس ایمان ہی کی وجہ سے اعمال ہاتھ پیر پر آتے ہیں اور انسان کی زندگی بنتی ہے۔ محبت سے ہی سارا کام چلتا ہے۔ آدمی اس محبت میں مصائب بھی جھیلتا ہے۔ تکلیفیں بھی اٹھاتا ہے' مگر اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت غالب ہے تو پرواہ بھی نہیں ہوتی کسی چیز کی۔ اہل اللہ جیل خانے میں بھی گئے مگر انہیں پرواہ نہیں ہوئی کیونکہ تعلق مع اللہ قوی ہے۔ فقر و فاقہ آیا مگر انہیں پرواہ تک بھی نہیں اس لئے کہ دل میں تعلق موجود ہے۔ قلب مطمئن ہے اور اگر دل کا تعلق اللہ سے نہ ہو تو انسان ہمیشہ ڈانواں ڈول رہے گا۔ ہمیشہ اس پریشانی اور پراگندگی و تشتت میں ہی رہے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ زندگی کا سکون صرف اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہے۔ کسی اور چیز میں نہیں۔

کروڑوں کا مالک ہو اس کو بھی سکون نہیں ملے گا۔ بلکہ قلب بے سکون' غیر مطمئن' پریشان' پراگندہ ہی رہے گا کہ اس کی حفاظت کیسے کروں اسے ڈاکو نہ لے جائیں۔ کہیں پہریدار ہیں۔ کہیں چپراسی ہیں کہ چوروں سے حفاظت کرتے ہیں' مگر قانونی چوری بھی تو ہوتی ہے اس سے کیسے حفاظت کرے گا؟

بہت سے لوگ قانون کے دائرے میں رہ کر چوری کرتے ہیں۔ ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ مثلاً کہیں فیس کی شکل میں رقم وکلاء کے پاس جارہی ہے۔ کہیں بیرسٹروں کے پاس جارہی ہے۔ کہیں ڈاکٹروں کے پاس جارہی ہے۔ غرض روپیہ کیا ایک وبال جان بنا ہوا ہے ہروقت پریشانی ہی پریشانی ہے۔ نہ اس سے سکون ملتا ہے نہ بلڈنگ سے سکون ملتا ہے اگر سکون ملتا ہے تو صرف اللہ کے نام میں ملتا ہے۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

"اللہ ہی کے ذکر سے دل چین پاتے ہیں"۔

دنیا کے ذکر سے چین نہیں ملتا وہ تو استعمال کی چیز ہے اسے کھاؤ پیو' استعمال کرو مگر مقصود مت بناؤ۔ اس سے محبت مت کرو۔ اس میں دل مت لگاؤ' اس کو جائز طریق پر استعمال کرو۔ اچھا کھانا بھی کھاؤ۔ اچھے مکان میں بھی رہو۔ مگر مکان کو خُدا مت سمجھو۔ لباس کو کعبہ مت بناؤ' خادم سمجھو' محبت کے لئے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اختیار کرو۔ ہماری زندگی یہ ہے "کہ دل بیار و دست بکار"

ہاتھ اور پاؤں کاروبار میں لگے ہوئے ہیں اور دل لگا ہوا ہے خالق و مالک کے اندر کہ دنیا میں رہو تجارت بھی کرو' زراعت بھی کرو۔ جب تک انسان دنیا میں رہے گا سب ہی کام کرے گا اور کرنے بھی چاہئیں مگر دل کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف رہنی چاہئے اس سے تجارت بھی بابرکت بنے گی' سب چیزیں عبادت بنتی چلی جاویں گی۔

تو اصل چیز ہے قانون کی پیروی اور وہ ہو نہیں سکتی جب تک محبت نہ ہو' تو محبت اصلِ ایمان اور اصلِ اسلام ہے اور ؎

در محبت تلخہا شیریں بود

یعنی محبت میں تلخیاں بھی شیریں بن جاتی ہیں کیونکہ آدمی کا دھیان محبوب کی طرف رہتا ہے تلخیوں کی طرف نہیں رہتا۔ اس لئے وہ شیریں ہو جاتی ہیں۔ اور محبوب کی ہر ادا محبوب بن جاتی ہے۔

غلبۂ ادبؐ

ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ جو ہماری ساری جماعت دیوبند کے شیخ طریقت ہیں اکابر اولیاء میں سے ہیں سن ۱۸۵۷ء میں انہوں نے جہاد کیا ہے پھر حضرت نے مکّہ معظمہ کی طرف ہجرت فرمائی وہیں ان کی وفات ہوئی۔ مکّہ معظمہ میں پہنچ کر پوری عمر کبھی سیاہ جوتا نہیں پہنا۔ لوگوں نے شروع شروع میں تو اتفاقی بات سمجھا مگر جب لوگ کالے رنگ کا جوتہ لاتے تو ان سے فرماتے کہ دوسرے رنگ کا لاؤ یا سفید لاؤ یہ جوتا نہیں پہنوں گا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ حضرت کا طریقہ ہے تو پوچھا کہ حضرت! سیاہ جوتے میں کیا حرج ہے۔ فرمایا کہ بیتُ اللہ شریف کا غلاف سیاہ ہے ادب مانع ہوتا ہے کہ وہ رنگ میں اپنے پیروں میں استعمال کروں' حالانکہ سیاہ جوتا پہننا شرعاً جائز ہے کوئی قباحت و نقصان نہیں ہے مگر چونکہ ادب کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو آدمی بعض جائز چیزوں کو بھی ترک کر دیتا ہے کیونکہ اس جائز چیز کے استعمال کرنے میں ادب مانع ہوتا ہے۔ جیسے حضرت نے فرمایا کہ مجھے حیا آتی ہے کہ وہ رنگ جو بیتُ اللہ کے غلاف کا ہے اس کو پاؤں میں ڈالوں۔

تو ظاہر بات ہے کہ جائز و ناجائز کی بحث نہیں یہ تو محبت کا غلبہ ہے چونکہ محبتِ خداوندی اتنی غالب تھی اسی کے مطابق محبت کعبہ بھی اسی قدر غالب تھی کہ اس رنگ کو پاؤں میں لانا گوارہ نہ کیا۔ کیا ادب کی انتہاء

تھی۔

حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کلیر شریف جاتے تھے۔ حضرت صابر کلیریؒ کے مزار کی زیارت کرنے کے واسطے۔ کلیر' رڑکی سے پانچ میل دور ہے۔ نہر کی پٹڑی پٹڑی چلے جاتے تھے۔ اب تو سواری کا بھی انتظام ہے اس زمانے میں لوگ عموماً پیدل ہی جاتے تھے۔ تو حضرت جب نہر کی پٹڑی پر جاتے اور سامنے کلیر ہوتا تو جوتے اُتار کر بغل میں دبا لیتے اور ننگے پیروں جاتے۔ تو کیا جوتے پہن کر جانا ناجائز تھا ___ ؟ نہیں بلکہ محبت کا غلبہ تھا۔ حضرت صابر کلیریؒ کی محبت دل میں جاگزیں تھی۔ ادب کا غلبہ تھا۔ جب روضہ نظر آتا تھا تو جوتا پہن کر جانا پسند نہیں کرتے تھے ننگے پیروں جاتے تھے۔ چونکہ ادب کا غلبہ تھا۔ اور ادب غالب ہوتا ہے محبت کے غلبہ سے۔

جب حضرت نانوتویؒ نے حج کیا تو بڑے بڑے اکابر ساتھ تھے۔ مثلاً حضرت گنگوہیؒ حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ اور دوسرے بڑے بڑے اکابر اور بزرگوں کا ایک مجمع تھا۔ آخری منزل جس کے بعد مدینہ طیّبہ بالکل سامنے آجاتا ہے اور حرم شریف کے مینارے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس آخری منزل کا نام ہے "بیئرِ علی" یہاں ایک پہاڑی ہے جہاں اس پر چڑھے اور حرم شریف کے مینارے سامنے آجاتے ہیں۔ تو یہ قافلہ جب "بیئرِ علی" پر پہنچا اور حرم شریف کے مینارے سامنے نظر پڑے تو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ ایک دم اونٹ سے اُچھل کر زمین پر گر پڑے جوتے اُتار کر رکھے اونٹ کے کجاوے میں اور ننگے پیر چلنا شروع کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت غالب تھی اس لئے عاشقانہ اشعار پڑھتے ہوئے اور اپنے حال میں مست اور ننگے سر چلے جارہے تھے۔ عرب کی کنکریاں جو ہیں وہ نوکیلی ہیں۔ پیروں میں ایسے چبھتی ہیں جیسے کانٹے چبھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے پاؤں لہولہان ہوگئے۔ مگر حضرت محبت و عشق کی وجہ سے اپنے حال میں مست ہیں۔

دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی اونٹوں سے اُتر کر پیدل چلنا شروع کردیا تو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ یہ احمق کیوں نیچے اتر کر چلنے لگے ان پر تو محبت اور عشق کی وجہ سے حال طاری ہے۔ یہ نقالی کہاں تک کریں گے۔ اس لئے کوئی بیس قدم چل کر رک گیا۔ کوئی سو قدم چل کر رُک گیا کیونکہ ان کنکریوں پر چلنا ہی مشکل ہے مگر جو اپنے حال میں مست ہے وہ تو معذور ہے اسے تو کچھ خبر نہیں رہتی چاہے اس پر تیر پڑیں چاہے تلواریں پڑیں۔ لیکن جن کے ہوش و حواس باقی ہیں وہ اس طریقے سے چلیں وہ پورے نہیں اُتر سکتے۔ اسی لئے کوئی پچاس قدم چل کر بیٹھ گیا۔ اور کوئی سو قدم چل کر بیٹھ گیا اور حضرتؒ حرم تک پیدل چلے اور پیروں میں کنکریاں چبھ چبھ کر لہولہان اور خون خرابہ بھی ہوگئے تو ___ در محبت تلخہا شیریں بود۔ یعنی محبت کی وجہ سے تلخیاں بھی شیریں ہوجاتی ہیں اور آدمی ان کو بخوشی جھیل لیتا ہے۔

اِستغراقِ محبت

غزوۂ اُحد میں جنگ شروع ہوئی۔ اُحد پہاڑ کی ایک گھاٹی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر چالیس تیر اندازوں کو مقرّر کیا اور حکم دیا کہ وہ یہاں بیٹھے رہیں۔ فتح ہو خواہ شکست ہو۔ ہر صورت میں وہاں سے بغیر اجازت نہ ہٹیں۔ چنانچہ صحابہؓ وہاں بیٹھے رہے' جنگ شروع ہوگئی۔ ان حضرات نے سوچا کہ ہم خالی بیٹھے ہوئے ہیں کچھ کام ہی کرلیں' دوسرے حضرات نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یہ ہے کہ صرف بیٹھے رہیں۔ بعض نے کہا کہ ایسے بیٹھنے سے تو عبادت میں لگنا اچھا ہوگا۔ یہ سوچ کر نفلوں کی نیّت باندھ لی اور نفلیں پڑھنا شروع کردیں۔ ترکیب یہ کی کہ چار آدمی نفلیں پڑھیں اور باقی حفاظت کریں۔ اسی طریقے سے رات

گزاری اور نوافل پڑھتے رہے۔

مشرکین مکہ نے تاک لیا کہ یہ صحابہؓ بیٹھے ہوئے ہیں۔ کفار نے ان پر تیروں کی بارش کی۔ جو لوگ نماز میں مصروف تھے' وہ سامنے تھے۔ اسی لئے کسی کی گردن میں لگا۔ کسی کے سینے میں لگا اور کسی کی پیٹھ میں لگا۔ بدن لہولہان ہو گئے اور کپڑے خون میں رنگ گئے مگر ان کو کچھ خبر نہیں وہ اپنی نماز میں مستغرق ہیں۔ نہ تیروں کی خبر اور نہ نیزوں کی خبر۔ جب آخیر شب میں سلام پھیرا تو معلوم ہوا کہ کپڑے رنگے ہوئے ہیں۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی تیر یہاں گھسا ہوا ہے۔ کوئی تیر سینے میں۔ کوئی تیر پشت میں' پورا بدن چھلنی ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ مشرکین مکہ نے تیر مارے ہیں۔

اتنا استغراق اور غلبہ تھا محبت کا کہ نہ انہیں تیروں کا پتا چلا اور نہ انہیں نیزوں کا پتہ چلا۔ نماز کے اندر غرق ہیں اور حق تعالیٰ کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں۔ تو آدمی ساری تلخیاں جھیل جاتا ہے۔ جب محبت کا غلبہ ہوتا ہے پھر نہ زخم کی پرواہ نہ تلواروں کی نہ نیزوں کی پرواہ ہوتی ہے یہی شان اہل اللہ کی بھی ہوتی ہے کہ جب محبتِ خداوندی اور محبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم غالب آجاتی ہے تو نہ عیش کی پرواہ نہ آرام و راحت کی پرواہ ساری چیزوں کو تج دیتے ہیں۔

ظرفِ محبت

چنانچہ میں نے عرض کیا تھا کہ بنیادی چیز محبت ہے اور محبت کا ظرف دل ہے جب دل میں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت آجائے گی تو ہاتھ پاؤں پر بھی اس کے اثرات ظاہر ہوں گے اور اعمالِ صالحہ بھی صادر ہوں گے اور اگر دل میں محبت نہیں تو نہ ایمان بنے گا اور نہ اعمال بنیں گے۔ مسلم نام کے تو ہوں گے مگر کام اسلام کے نہیں ہوں گے۔ جب دل میں ایمان ہو گا جب ہی کام اسلام کا ہو گا۔ اس لئے ہمیں نام کے مسلمان نہیں ہونا چاہئے بلکہ کام کے مسلمان ہونا چاہئے' دل میں محبت رچی ہو اور ہاتھ پیر پر عمل ہو یہی عمل شہادت دے گا کہ ایمان ایک چیز ہے جو اندر چھپی ہوئی ہے۔

دعویٰ محبت کا ثبوت

جب قیامت میں آدمی اپنے مؤمن ہونے کو دعویٰ کرے گا تو اس سے دلیل طلب کی جائے گی کیونکہ کوئی دعویٰ بلا دلیل کے قابلِ سماعت ہوتا نہیں۔ اس بنائے پر اس سے پوچھا جائے گا کہ تیرے ایمان کا ثبوت کیا ہے وہ کہے گا کہ میں نے نمازیں پڑھی ہیں' روزے رکھے ہیں۔ زکوٰۃ دی ہے حج کئے ہیں۔ یہ ثبوت ہو گا ایمان کا پھر اسے نجات ہو گی۔ مگر آپ نے اپنے مؤمن ہونے کا دعویٰ کیا اور دلیل طلب کی گئی مگر وہاں نہ نماز ہے' نہ روزہ ہے' نہ زکوٰۃ ہے' نہ حج۔ تو یہ دعویٰ بغیر دلیل کے رہ جائے گا وہاں اس کی کوئی وقعت نہیں ہو گی۔ اس کی گردن ناپی جائے گی اور اس کے دعوے کی تکذیب کی جائے گی کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہارے اندر ایمان کہاں ہے۔ اگر ایمان ہوتا تو اس کے آثار ہاتھ پیر پر ظاہر ہوتے' حالانکہ کوئی اثر ظاہر نہیں اس لئے کہ اندر کچھ نہیں۔ لہٰذا انتہائی ذلیل ہو گا اور کہا جائے گا کہ اپنے کئے کو بھگتو۔ پھر وہاں کی سزائیں دی جائیں گی۔ مصیبتوں میں مبتلا کیا جائے گا۔ اس لئے جب دعویٰ ہو تو اس کی دلیل بھی مہیا ہونی چاہئے۔

طاعت' عبادت' اتباعِ سنت حضور کی پیروی ہونی چاہئے۔ آگے قبول کرنا نہ کرنا مالک کا کام ہے مگر ہمیں ثبوت مہیا کر دینا چاہئے اور اس ثبوت پر ناز نہ ہو کہ میں نے اتنی عبادت کی بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ میں نے کچھ

نہیں کیا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔

بڑوں کی بڑی بات

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمتہ اللہ علیہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے والد ماجد اولیاء کبار میں سے ہیں وہ رات دن طاعت و عبادت میں لگے رہتے ہیں لوگوں نے ان سے عرض کی کہ حضرت آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں کہ راتوں کو ذکرُاللہ دن بھر ذکرُاللہ۔ کیوں اتنی محنت کر رہے ہیں؟

جب ہم نے یہ سوال پڑھا تو ہم یہ سمجھے کہ حضرتؒ نے یہ جواب دیا ہوگا کہ اللہ کو راضی کرنے کے لئے تاکہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائیں اس لئے میں یہ عمل کر رہا ہوں مگر یہ جواب نہیں دیا بلکہ جواب اور ہے۔ یہ تو ہمارے فہم کی رسائی تھی حضرتؒ نے وہ جواب دیا جو ہماری فہم سے بالاتر ہے اور اپنے مرتبے کے مطابق جواب دیا کیونکہ بڑوں کی بات بڑی ہی ہوتی ہے۔ حضرتؒ نے ان پوچھنے والوں کو جواب دیا کہ میں رات دن اس لئے عمل کرتا ہوں کہ میں پیدا ہی کیا گیا ہوں عمل کرنے کی خاطر۔ یعنی مقصد زندگی ہی میرا یہ ہے' راضی ہونا نہ ہونا ان کا کام ہے۔

راضی ہونا یا ناراض ہونا یہ فعلِ خداوندی ہے۔ ہم کون ہیں ان کے فعل میں دخل دینے والے۔ ہمارا کام تو ہونا چاہئے جس کے لئے ہم پیدا کئے گئے ہیں اور ہم پیدا کئے گئے ہیں طاعت و عبادت کے لئے۔ بس ہم اپنا کام کئے جائیں۔ اگر وہ راضی ہوں تو ان کا فضل ہے اگر وہ ناراض ہوں تو ہمارا عمل اس قابل نہیں کہ اس سے فریادی ہوں۔ تم اللہ تعالیٰ کے کاموں میں دخل مت دو۔ صرف اپنا کام کرتے رہو ؎

ع کار خود کن کارِ بیگانہ مکن

اپنے کاموں میں لگے رہو قبول کرنا نہ کرنا اس کا کام ہے۔

محبت آمیز عمل

یحییٰ بن اکثم بہت بڑے عالم گزرے ہیں امام کے درجے کے عالم ہیں ان کی وفات ہوئی تو بعض اہل اللہ نے انہیں خواب میں دیکھا اور خواب بھی کشف جیسا تھا۔ یہ دیکھا کہ ان کی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوئی ہے۔

> "حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے یحییٰ! کیا چیز لے کر آئے ہو ہمارے لئے؟ جواب دیا کہ اے اللہ تعالیٰ میں نے پچپن ۵۵ حج کئے ہیں۔ فرمایا' ہمیں ایک بھی قبول نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اے باری تعالیٰ میں نے ایک سو باون ۱۵۲ قرآن ختم کئے ہیں۔ فرمایا کہ ہمیں ایک بھی قبول نہیں۔ انہوں نے کہا کہ یا اللہ میں نے اتنی نمازیں پڑھی ہیں۔ فرمایا کہ ہمیں ایک بھی قبول نہیں۔ پوری زندگی کے اعمال ذکر کئے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک بھی قبول نہیں کیا۔ اور بتاؤ کیا لے کر آئے ہو۔ آپ عاجز ہو گئے۔ آخر میں کہا کہ اے اللہ! بس تیری رحمت کا سہارا لے کر آیا ہوں اور کچھ لے کر نہیں آیا۔ فرمایا کہ اب بات تو نے ٹھیک کہی ہے۔ وَجَبَتْ لَکَ رَحْمَتِیْ میری رحمت تیرے لئے واجب ہو گئی ہے۔ جا تیرے لئے جنت اور مغفرت ہے"۔

تو عمل کے ساتھ ساتھ رضاءِ خداوندی اور رحمتِ خداوندی کی توقع اور امید بھی ہونی چاہئے۔ اعمال پر گھمنڈ اور ناز نہیں ہونا چاہئے۔ جس عمل میں محبت کی آمیزش اور رحمت کی امید نہ ہو وہ عمل قابل قبول نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ اصل چیز محبت ہے پھر اس کے بعد عمل کا مرتبہ ہے۔ اور اس محبت سے ہی عمل پیدا ہوتا ہے عمل ہی محبت کی علامت ہے۔ جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دل میں محبت ہے یا نہیں۔

دوامِ معیتِ نبوی کی بشارت

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے :

من احبّنی فقد اطاعنی ومن اطاعنی کان معی فی الجنۃ۔

”جو مجھ سے محبت کرے گا وہ میری اطاعت بھی کرے گا اور میر سنتوں کی پیروی بھی کرے گا اور جو میری سنتوں کی پیروی کرے گا وہ میرے ساتھ بھی جنت میں وہ میرے سے الگ نہیں رہے گا“۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنیاد قرار دیا ہے محبت کو ___ کہ مجھ سے محبت کرنا علامت ہے اس بات کی کہ وہ میری اطاعت کر رہا ہے اور میری اطاعت کرنا علامت ہے اس بات کی کہ وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل تو محبت ہے مگر محبت پہچاننے کی علامت اطاعت اور اتباعِ سنت ہے جب یہ ہوگی تو معلوم ہوگا کہ محبت میں سچا ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

لا یؤمن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من ولدہ ووالدہ والناس اجمعین۔

”تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک مؤمن کامل نہیں بن سکتا جب تک کہ میری اس آدمی کو اتنی محبت نہ ہو کہ اتنی اس کو نہ اپنے ماں باپ سے ہو، نہ اپنی اولاد سے ہو، نہ اپنے سامان سے ہو، نہ اتنی محبت اس کو اپنے عزیز و اقارب سے ہو“۔

جب دو محبتوں کا ٹکراؤ ہو تو ترجیح دے میری محبت کو، تو کہا جائے گا کہ یہ مؤمنِ کامل ہے کہ اصل شے محبت ہی ہے۔

محبت و خواہش کا ٹکراؤ!

ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :

لا یؤمن احدکم حتیٰ یکون ھواہ تبعاً لما جئتُ بہٖ۔

”کہ تم میں سے کوئی شخص مؤمن کامل نہیں بن سکتا اس وقت تک جب تک کہ اس کی خواہشات نفس میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں“۔

ایک طرف شریعت ہے اور ایک طرف خواہشِ نفس ہے۔ اگر خواہشِ نفس کو ترجیح دی تو معلوم ہوا کہ خواہش کا بندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندہ نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی مرضی کو ترجیح دی اللہ تعالیٰ کی مرضی پر اس لئے یہ خواہشاتِ نفس اور ہوائے نفس کا تابع ہے اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی کا تابع ہوتا تو اسی کو ترجیح دیتا۔ اسی لئے فرمایا کہ وہ مؤمن کامل نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کا تابع ہونا چاہئے۔ جو کچھ

کرے اتباع میں کرے۔ نماز پڑھے تو اتباع میں پڑے روزہ رکھے تو اتباع سے۔ سوئے تو اتباع سے۔ جاگے تو اتباع سے۔ کھائے پیئے تو اتباع میں۔

غرض یہ کہ پوری زندگی پر اتباع چھا جائے جب ہی اس کے ایمان میں کمال آئے گا اور اس کو مؤمن کامل کہیں گے۔

صُدورِ معصیت اور تقاضائے محبّت

اب رہی بات غلطی سے گناہ کا صادر ہونا تو بندہ بشر ہے۔ معصوم تو صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی ہے۔ ہم تو دن رات سینکڑوں گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں اور گناہ بے شک ہوتے رہتے ہیں مگر اس کا حل یہ فرمایا کہ جب گناہ ہو جائے توبہ کرلے پھر اتباع شریعت میں کوئی فرق نہیں آئے گا اتباع کررہے ہیں اور درمیان میں گناہ ہو گیا کہ یا اللہ میری توبہ پھر نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ سے عہد کیا۔ پھر اتباع میں مصروف ہو گئے۔

اتباعِ سنت کے یہ معنیٰ ہرگز نہیں کہ کبھی بھی غلطی نہ ہو اور گناہ نہ ہو۔ یہ شان تو انبیاء علیہم السلام کی ہے۔ ہم سے گناہ ہوتے بھی ہیں اور ہم گناہ کرتے بھی ہیں مگر اس کا حل یہ ہے کہ فوراً توبہ کرلے اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے :

التائب من الذنب کمن لا ذنب له

گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ توبہ کرتے ہی اس کا ریکارڈ صاف ہو گیا۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جس نے گناہ کے بعد توبہ کی وہ گناہ پر باقی نہیں رکھا جاتا ــــ اسی لئے جب بھی کوئی گناہ ہو جائے فوراً توبہ کر کے پاک ہو جائے۔ یہ مومن کی شان ہے اور یہ محبت اور ایمان کی کمال ہے۔ بس دعا کیجئے کہ اللہ ربّ العالمین اپنی رضا نصیب فرمائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت اور معیّت عطا فرمائے اور اپنے نیک بندوں میں شامل فرمائے اور ہم سب کا خاتمہ ایمانِ کامل پر فرمائے۔ آمین!

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

مقصد نعمت و مصیبت

"جب ہماری روح میں معصیتوں اور گناہوں کے پھوڑے پھنسی اور بری حرکات کے دنبل نکل آتے ہیں تو حق تعالیٰ آپریشن کرتے ہیں اور نشتر لگاتے ہیں۔ یہ مصیبتیں درحقیقت آپریشن ہیں کہ ان سے مادہ فاسدہ نکالنا ہوتا ہے ___ یہی وجہ ہے کہ جب مصیبت پڑتی ہے تو آدمی کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں۔ جب عیش و طرب کی کثرت ہوتی ہے تو آدمی میں غنا پیدا ہوتا ہے اور سرکشی بڑھ جاتی ہے"۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ ـ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ـ

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ـ

دارالامتحان

بزرگان محترم!

یہ دنیا جس سے ہم اور آپ گزر رہے ہیں یہ پوری کی پوری امتحان گاہ ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے ہماری جانچ اور آزمائش کے لئے ہمیں بھیجا ہے ___ یہاں کی آزمائش کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ حق تعالیٰ کو علم نہیں تھا کہ یہ کیسے ہیں۔ اچھے ہیں یا برے ہیں؟ قوی ہیں یا ضعیف ہیں؟ ان کو سب معلوم ہے۔ ان کا علم ازلی اور ابدی ہے۔

جانچ کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے دل میں اللہ نے جو جوہر پیدا کئے ہیں' ان کو کھول دے اور نمایاں کردے یعنی ہر چیز کی خاصیّت کو ظاہر ہونے کا موقع دے ___ اگر ایک شخص قویّ القلب ہے تو اس کو مصائب میں ڈالتے ہیں تاکہ اس کی قوتِ قلب واضح ہو جائے اور اگر ضعیفُ القلب ہے تو اسکا ضعف واضح ہو جائے تو حق تعالیٰ کے آزمانے کا مطلب استعلام یعنی علم حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ پہلے سے علم نہیں تھا۔ نہیں ہے۔ بلکے جو ان کا علم جس کے متعلق ہے' اسکو نمایاں کرنا چاہتے ہیں تاکہ پوری دنیا پر واضح ہو جائے کہ فلاں چیز میں یہ اثرات تھے اور فلاں میں یہ خاصیتیں تھیں ___ اس لئے دنیا میں جو آیا ہے وہ درحقیقت جانچ کے لئے آیا ہے۔ کہ جو بھی جوہر اس میں رکھے گئے ہیں ان کو کھولا جائے۔

مقصدِ امتحان

اور جانچ کے لئے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے دو سلسلے قائم کئے ہیں' ایک سلسلہ نعمتوں کا اور ایک سلسلہ مصیبتوں کا۔ دونوں سے مقصد انسان کی جانچ اور آزمائش ہے۔ نعتیں دے کر اس لئے آزماتے ہیں کہ آیا نعمتوں میں گھر کر یہ آدمی نعمت دینے والے کو بھی یاد رکھتا ہے یا نعمتوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ ___ اگر ایک انسان اپنی نعمتوں میں' اپنی عیش میں الجھ کر رہ جائے، اور اسے یہ یاد نہ رہے کہ یہ نعمت کس نے دی تھی تو کہا جائے گا کہ اس بندے کے قلب میں کفران نعمت کا جذبہ چھپا ہوا تھا۔ وہ کھول دیا گیا اور ظاہر ہو گیا۔ کل کو اگر اس کے لئے کوئی جزا تجویز کی جائیگی تو اس کو یہ کہنے کا موقع نہیں ہو گا کہ مجھے پہلے جانچ تو لیا ہوتا۔ آزمائش کا موقع تو دیا ہوتا۔ بلکہ خود اس پر نمایاں ہو جائے گا کہ اس جانچ میں پڑ کر میں نے اپنے بارے میں کیا ثبوت دیا ___ اس طرح سے نعمت دنیا میں خود ایک مستقل آزمائش کی چیز ہے۔ خواہ وہ دولت ہو' خواہ وہ عزّت ہو۔

امتحان بطریقِ نعمت

اس سب کا مقصد اپنا امتحان پیش کرنا ہے کہ تمہارا فرض کس درجہ پر ہے تم نعمت کو دیکھتے ہو؟ نعمت دینے والے پر نظر ہے یا خود نعمت پر نظر ہے۔ اگر دینے والے پر نظر ہے تو بے اختیار انسان کی زبان سے شکر نکلے گا اور کہے گا ___ اے نعمتوں کے دینے والے تیرا فضل ہے کہ تو نے مجھے دیا۔ نہ میں اس کا مستحق تھا نہ میں اس کا اہل تھا۔ یہ محض تیرا فضل اور انعام ہے۔ ___ تو بندے نے امتحان میں کامیابی حاصل کرلی نعمت دی گئی تھی' اس نے نعمت کا حق ادا کر دیا۔ تو نعمت کا حق فقط یہ نہیں ہے کہ آدمی نعمت کو استعمال کرے۔ بلکہ نعمت کے استعمال کے ساتھ ساتھ نعمت دینے والے کی طرف توجہ اس کی دین اور اس کے انعام کا شکر ادا کرنا یہ بھی اس کا حق ہے ___ گویا نعمت دیئے جانے کے بعد دو طرح سے آدمی آزمایا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ اس نعمت کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرے۔ دوسرے یہ کہ اس نعمت پر نعمت دینے والے کا شکر ادا کرے۔ نگاہ اس کی طرف رہے۔ کیونکہ جس کو دینا آتا ہے اس کو چھیننا بھی آتا ہے۔ جو دے سکتا ہے وہ واپس بھی لے سکتا ہے۔ غرض جانچتے ہیں کہ اگر دینے والے پر نگاہ ہے اور شکر کرو گے تو دینے والے کے خزانے لامحدود ہیں وہ نعمتوں کو بہاتا رہے گا۔ اگر کفران نعمت اختیار کیا معلوم ہوا کے نعمت کی قدر کرنی نہ آئی۔ وہ اپنی نعمت کو واپس لے لے گا۔ تو واضح ہو گیا کہ نعمتوں کا دینا درحقیقت آزمائش اور جانچ کے لئے ہے اور جوہروں کے کھول دینے کے لئے ہے۔

امتحان بطریقِ مصیبت

اسی طرح سے کبھی کبھی مصیبتوں سے بھی آزمایا جاتا ہے ___ مصیبت سے آزمائش یہ ہوتی ہے کہ مصیبت میں گھِر کر آیا آدمی مصیبت ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے' واویلا' جزع فزع اور پریشانی ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے یا اس کی نگاہ مصیبت کے بھیجنے والے پر بھی ہوتی ہے کہ اس نے میری کسی مصلحت کے سبب اسے بھیجا ہے ___ اگر مصیبت پر نگاہ ہے مصیبت بھیجنے والے پر نہیں تو اس کا ثمرہ یہ ہے کہ آدمی کا بے صبراپن ظاہر ہو گا۔ اللہ کی شکایت ظاہر ہوگی کہ میں ہی آزمائش کے لئے رہ گیا تھا، اور میں ہی مبتلا کرنے کے لئے رہ گیا تھا ___ لیکن اگر مصیبت میں گھر کر ثابت قدم ہے اور دیکھے کہ مصیبت تو بے شک سخت ہے مگر بھیجنے والا ماں باپ سے زیادہ شفیق ہے اس لئے یہ مصیبت میرے ستانے کے لئے نہیں بھیجی گئی ہے' ایمان کی جانچ کے لئے بھیجی گئی ہے۔ پھر بندہ صبر کرے گا اور صبر کے امتحان میں کامیابی حاصل کرے گا ___ تو نعمت سے آدمی کی شکر گزاری کا امتحان ہوتا ہے اور مصیبت سے آدمی کے صبر و تحمل کا امتحان ہوتا ہے کہ کون بندہ ثابت قدم ہے اور کون ضعیفُ القلب ___ جو نعمت اور مصیبت کے امتحان میں کامیاب ثابت ہوا' وہی بندہ فی الحقیقت بندہ ہے۔ اور جو کامیاب نہ ہو وہ بندہ نہیں وہ یا نعمت کا بندہ ہے یا مصیبت کا بندہ ہے جو انہی دو کی طرف جھکتا ہے۔

مقامِ آدمیّت

ہمارے آپ کے ہندوستان کے آخری بادشاہ ظفرؔ اس نے حقیقت کے ظاہر کرنے کے لئے ایک قطعہ کہا ہے۔ کچھ تو ظفر بادشاہ مزاج ہی صوفیانہ رکھتا تھا اور کچھ حالات نے اسے درویش بنا دیا تھا۔ جس کی سلطنت چھنتی ہے وہی جانتا ہے کہ اس کے قلب پر کیا گزری ہے ___ تو اس نے ایک قطعہ کہا ہے اور خوب کہا ہے کہتا ہے کہ ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا
گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم وذکا

کتنا ہی عقلمند اور ہوشیار ہو مگر آدمی نہ سمجھنا ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا
گو ہو کیسا ہی صاحبِ فہم وذکا

جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

تو دینے والے کو نہ بھولے نہ اسے عیش اللہ سے غافل کرے نہ طیش اسے اللہ سے غافل کرے، ایک حالت میں خوف ہر پیش رہے اور ایک حالت میں رجاء و امید اور شکر گزاری پیش نظر رہے۔ ___ اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے اس دنیا میں انسان کو جانچنے اور آزمائش کے دو سلسلے رکھے ہیں۔ ایک نعمتوں کا سلسلہ اور ایک مصیبتوں کا سلسلہ۔

مقدارِ امتحان

اور ساتھ ہی اس کے یہ بھی ہے کہ جتنی زیادہ نعمت دی جاتی ہے۔ اتنی ہی زیادہ جانچ کی جاتی ہے۔ جس پر زیادہ مصیبت آتی ہے' اس کے قلب کی اتنی ہی زیادہ جانچ کی جارتی ہے ___ چھوٹی موٹی مصیبت کو آدمی

جھیل جاتا ہے۔ صبر بھی کرجاتا ہے۔ جب بڑی مصیبت آئے' اس وقت ثابت قدم رہے تو کہا جائے گا کہ ایمان بھی مضبوط، قلب بھی مضبوط ___ بڑی بھاری نعمت دیدی جائے پھر ثابت قدم رہے اور نعمت دینے والے کو نہ بھولے تو کہا جائے گا کہ یہ قویّ القلب ہے اور امتحان میں کامیاب ہے۔

امتحان کی عمومی روش

پھر اسی کے ساتھ مصائب میں آدمی کی زیادہ جانچ ہوتی ہے' نعمتوں میں اتنی نہیں ہوتی۔ اللہ نے اس عالم میں مصیبتیں بے شمار رکھی ہیں۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ آدم علیہ السلام کا پتلا جب اللہ نے بنایا اور مٹی کو پانی میں بھگویا ہے تو چالیس دن اس پر پانی پڑا ہے، اور چالیس دن اس پر مینہ برسایا گیا ہے ___ تو روایات میں ہے کہ اس مٹی پر انتالیس دن غم کا مینہ برسا ہے اور ایک دن خوشی کا ___ اس لئے دنیا میں خوشی کم ہے اور مصیبت زیادہ ___ زیادہ تر انسان پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ زیادہ تر عیش اور بے فکری میں کم ہوتا ہے ___ چنانچہ فرمایا گیا لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ہم نے آدمی کو مصائب ہی کے اندر پیدا کیا ہے۔ اور اوّل سے لیکر اخیر تک مصائب کا ایک سلسلہ ہے۔ جس آن انسان پیدا ہوتا ہے پیدائش کی گھڑی مصیبت ہی کی ہوتی ہے۔ آدمی روتا ہوا آتا ہے، چلاّتا ہوا آتا ہے۔ کوئی بچہ بھی دنیا کے اندر ہنستا ہوا نہیں آتا ___ جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی غم میں مبتلا ہے۔ اس کو کوئی طلب ہے جو ملی نہیں ہے اس حیرانی اور پریشانی میں چلاّرہا ہے۔ بچے کو پیدا ہونے کے بعد اگر منہ میں دودھ دیدیا جائے چپ ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کی طلب خالی تھی تو کسی نعمت سے خالی ہونا یہی پریشانی کا باعث ہوتا ہے ___ تو دنیا میں پریشانی کی حالت میں آیا ___ پھر جوں جوں عمر بڑھتی چلی جاتی ہے، مصائب کا سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ___ انسان تمنّائیں بہت باندھتا ہے۔ سو تمنّاؤں میں سے ایک پوری ہوتی ہے ننانوے میں ناکامیاب رہتا ہے۔ یہ ننانوے میں جو ناکامیابی ہے یہی اس کے حق میں مصیبت ہے تو اس کی تمنّا اور طبیعت کے خلاف ہونا یہی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ اور یہ انسان کے لئے لازم ہے۔

مقصدِ نعمت و مُصیبت

اس دنیا کو حق تعالیٰ نے نہ فقط عیش کی جگہ بنایا نہ فقط مصیبت کی جگہ بنایا۔ عیش بھی ہے مصیبت بھی ہے۔ گو عیش کم ہے مصیبت زیادہ ہے۔ جہاں فقط عیش ہے، مصیبت کا نام نہیں' اسی عالم کو ہم جنّت کہتے ہیں اور جس جہان میں مصیبت ہی مصیبت ہے عیش کا نشان نہیں اسی کو ہم جہنم کہتے ہیں جہاں عیش کا کوئی تخیل بھی نہیں باندھ سکتا تو دونوں کی عیش اور مصیبت سے ملا کر دنیا کو بنایا جس میں عیش بھی ہے تو کچھ جنت کی نعمتوں کے نمونے ہیں اور کچھ جہنم کی مصیبتوں کے نمونے ہیں تاکہ انسان جب عالمِ آخرت میں پہنچے تو جب تک دنیا میں گزارے اسے اس عالم کا تصور ہو جہاں سے عیش آئی ہے اگر اسے عیش پسند ہے تو اس عالم کے لئے سامان کرلے اور اگر مصیبت ناپسند ہے تو ظاہر ہے کہ اس جہان کی مصیبتوں سے ڈرنے اور بچنے کا آدمی اہتمام کرے گا تو دنیا میں عیش اور مصیبت اس لئے رکھی تاکہ انجام پر نظر رہے عیش کی جگہ کی طلب میں رہے اور مصیبت کی جگہ سے بچنے کا بندوبست کرتا رہے اس لئے اللہ نے یہ دونوں سلسلے جاری کئے۔

موت و حیات کی کشمکش

مصیبتوں کی انتہا موت پر ہوتی ہے اور نعمتوں کی انتہا زندگی پر جا کر ہوتی ہے' زندگی نعمتوں کا سرچشمہ ہے اور موت مصیبتوں کا سرچشمہ ہے۔ موت کے معنی در حقیقت سلب حیات ہے۔ یعنی زندگی چھین لی جائے بس یہ موت ہے تو عیش کو چھین لیا جائے یہ عیش کی مصیبت' یہ بھی موت ہے۔ صحت کو چھین لیا جائے بیماری آجائے تو یہ صحت کی موت ہے مرض اور بیماری کی مصیبت مسلط ہو گئی تو جس طرح انسان کی ذات پر موت آتی اسی طرح سے اس کے احوال پر موت آتی ہے ایک حال آتا ہے ایک جاتا ہے۔ جو حال جاتا ہے اس کی موت واقع ہو گئی۔ جو حال آیا اس کی زندگی ہو گئی صحت گئی تو صحت کی موت آگئی عیش چلا گیا تو عیش کی موت آئی تو اس طرح ہر قدم پر انسان موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ نعمتیں آتی بھی ہیں' جاتی بھی ہیں۔

پھر ایک وقت آتا ہے کہ یہ خود ہی چلا جاتا ہے۔ اس کے احوال پر روزانہ موت طاری ہوتی رہتی تھی مگر خود اس کی ذات پر طاری نہیں ہوتی تھی۔ یہ جو آخری سانس ہے اس کی ذات کی موت ہے۔ وہ بھی بالآخر چلا جاتا ہے تو پوری دنیا موت و حیات کے درمیان کشمکش میں مبتلا ہے۔

ذرائعِ امتحان

تو اس آیت کریمہ کے اندر اس سلسلے کو بتلایا گیا ہے کہ ہم نے انسان کا مصائب سے امتحان لیا۔ اور اس کے صبر و تحمل کا ہم نے امتحان لیا تو فرمایا :

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ۔

یہاں عربیت کے قاعدہ کے مطابق سب سے پہلے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ میں واؤ لائے' جو تاکید کے لئے ہوتا ہے' لام لائے جو تاکید کے لئے ہوتا ہے' پھر نون ثقیلہ تاکید لائے جو خود تاکید کے لئے ہوتا ہے' پھر اس کو ضمیر خطاب یعنی کُم کی طرف منسوب کیا۔ تو کئی تاکیدیں لائی گئیں۔ اس کے معنی یہ نکلے کہ ہم ضرور بالضرور تمہاری جانچ کرکے رہیں گے۔ یہ خیال مت کرنا کہ نعمتیں دیکر تمہیں جانچ اور آزمائش سے چھوڑ دیں گے لازمی طور پر تمہیں آزمائیں گے۔ تاکید کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ اس لئے آدمی احتمالی بات نہ سمجھے۔ جانچ ضرور واقع ہو گی۔

پہلا ذریعہ "خوف"

کاہے سے واقع ہو گی۔ ــــ تو فرمایا بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ کبھی تو ہم دشمنوں کا خوف مسلط کریں گے' چہار طرف سے خطرہ ہے کہ ادھر نہ جان چلی جائے۔ ادھر سے نہ کوئی حملہ کر دے۔ ادھر سے کوئی غنیم نہ چڑھ آئے۔ کوئی دشمن نہ آجائے ہر وقت ایک فکر لگا رہتا ہے۔

خوف سے آزمانے کی غرض کیا ہوتی ہے۔ تاکہ انسان چوکنا رہے' وہ جو تدبیر کرنے کا مادہ ہے وہ معطل نہ ہونے پائے۔ اگر بے خوف ہو کر آدمی بیٹھا رہے گا تو وہ جو بچاؤ کی تدبیروں کے جوہر رکھے گئے ہیں وہ سب ملیامیٹ ہو جائیں گے اور سب آدمی چھپے رہ جائیں گے۔ اس لئے خوف مسلط کرتے ہیں تاکہ بیداری اور تیقظ سے آدمی کام لے اور وہ تدابیر اختیار کرے جن سے بچا جاتا ہے تاکہ دل کے جوہر کھلیں کہ یہ کتنا مدبر اور دانا تھا۔ اور کتنا اس نے بچاؤ کا ثبوت دیا

دوسرا ذریعہ "فقر"

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ ۔اور کبھی ہم ___ بھوک دیکر آزماتے ہیں ___ کبھی اس طرح سے آزمائش ہوتی ہے کہ فقر وفاقہ مسلط کردیا ۔ایمان کی جانچ کرنا منظور ہے اور قلب کی قوت کی جانچ کرنا منظور ہے۔ اس کے لئے کبھی خوف دیا کہ خوف اور گھبراہٹ میں آدمی ہمارا نام لیتا ہے یا محض پامال ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر ہمارا نام لیا تو فرماتے ہیں کہ ہم مدد کے لئے تیار ہیں ہم اس کی مدد کے لئے آئیں گے۔

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ

اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا ___ اور اللہ کی مدد کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اس کے دین کی مدد کی جائے۔ اور دین کی سب سے پہلی مدد یہ ہے کہ خود آدمی دین پر ثابت قدم رہے ___ دین کوئی تصویر یا مجسمہ تو نہیں ہے کہ اس کی مدد کی جائے۔ دین کی مدد کے یہ معنی ہیں کہ دین کو اپنے اندر سمولے ہر حالت میں دین کو پیش نظر رکھے۔ یہ دین کی مدد ہے، اور اللہ کی مدد ہے۔ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ مجھے یاد کرو گے تو تمہیں یاد رکھوں گا۔ تم مجھے بھلا دو گے تو میں بھی تمہیں بھلا دوں گا۔

بندۂ تسلیم و رضا

غرض کبھی تو آدمی خوف سے آزمایا جاتا ہے ___ اور کبھی فقر و فاقے سے آزمایا جاتا ہے کہ تنگ دستی مسلط کردی ___ لیکن تنگدستی کے باوجود تو بندہ یہ کہتا ہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے تو جس حالت میں رکھے میں تو بندہ ہوں بندگی کے معنی یہ ہیں کہ جو حال بھی آجائے آدمی شاکر اور صابر رہے تسلیم و رضا کے ساتھ گردن جھکادے ___ اگر اپنی تجویز پیش کرنے لگا کہ آپ نے میرے اوپر غم بھیج دیا۔ آپ کو تو خوشی بھیجنی چاہئے تھی۔ آپ نے میرے اوپر بھلا خوف کیوں مسلط کیا۔ میرے اوپر تو اطمینان بھیجنا چاہئے تھا۔ تو یہ تجویز ہے۔ بندہ بندگی کے لئے آیا ہے۔ بندگی کے معنی تفویض یعنی سونپ دینے کے ہیں کہ جس حالت میں آپ رکھیں میں راضی ہوں۔ اس کا پہلا قدم یہ ہے آدمی تجویز چھوڑدے خود اپنے لئے کچھ تجویز نہ کرے جو ادھر سے آجائے اس کے لئے راضی رہے تو آزماتے ہیں کہ اس میں تفویض یعنی سونپ دینے کا اس کے قلب میں مضمون ہے یا اپنی تجویز اور خود رائی کا مضمون ہے۔ خود رائی اگر ہوئی تو یہ بندگی کے خلاف ہے رائے ترک کر دیا تو یہ بندگی ہے۔ کہ جو حق تعالیٰ چاہیں میں اسی پر راضی ہوں۔ گویا اس طرح سے آدمی بن جائے جیسا کے نہلانے والے کے ہاتھ میں میت ہوتی ہے کہ جدھر کو چاہے کروٹ دیدے جدھر کو چاہے پلٹ دے۔ میت یہ نہیں کہتا کہ ادھر مجھے کیوں کروٹ دی ادھر کو کیوں نہ دی؟ بس بالکل غسال کے ہاتھ میں ہے۔ یہی شان بندے کی اپنے پروردگار کے ہاتھ میں ہونی چاہئے کہ ادھر سے جو حالت آئے اسی پر لگ جائے اور راضی ہو جائے۔ مانگتا تو رہے اطمینان، مگر پیش جو کچھ آئے اس پر رضامندی کا اظہار کردے، بندگی اسی کا نام ہے۔

کسی غلام سے کسی نے پوچھا تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا تھا جو آقا کھلا دے۔ کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنا دے۔ کام کیا کرے گا؟ جو آقا کام دے دے ___ تو اس نے کہا کہ آخر تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا اگر میری اپنی مرضی ہوتی تو میں غلام ہی کیوں ہوتا۔ میرے غلام ہونے کے معنی یہ ہیں کہ میرا ارادہ بھی غلام، میری خواہش بھی غلام، میری مرضی بھی غلام، جو کچھ مرضی ہے وہ آقا کی، جو کچھ ارادہ ہے وہ آقا کا۔ وہ آقا ہے اور میں غلام ہوں ___ تو ایک انسان جب ایک انسان کا خادم اور غلام بن جاتا ہے، حالانکہ اس آقا نے اس کو پیدا نہیں کیا۔ اس کی زندگی اور نعمت و مصیبت آقا کے ہاتھ میں نہیں۔ مگر بہرحال نام تو غلام بن گیا۔ تو آدمی اس درجہ اپنے کو جھکا دیتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ نہ میری مرضی نہ میری خواہش نہ میرا ارادہ ___ تو اللہ رب

العزّت کا بندہ جس کے ہاتھ میں جان بھی ہے اور جس کے ہاتھ میں اس کا ایمان بھی ہے۔ اور جس کے ہاتھ میں اس کی عزّت و آبرو ہے۔ اس کے سامنے کوئی تجویز رکھے اور دعویٰ کرے کہ میں بندہ ہوں تو یہ دعویٰ غلط ہوگا۔ بندگی کے معنی یہ ہیں کہ جو آپ چاہیں وہی ٹھیک ہے اسی میں میری رضا ہے۔ تو اس تسلیم و رضا کا پیدا ہو جانا اور بندۂ رضا بن جانا یہی فی الحقیقت بندگی ہے ___ تو اس غلام نے کر کے دکھلایا کہ اس سے کہا گیا کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو آقا کھلا دے۔ کہ کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنا دے۔

جوہر قلب کا امتحان

یہی حال بندے کا ہونا چاہئے کہ اگر پوچھا جائے ایک انسان سے کیا تو خدا کا بندہ ہے؟ کیا معنی ہیں تیرے بندہ ہونے کے؟ وہ یوں کہے کہ اگر وہ عیش میں رکھے تو میں اس کا بندہ اگر وہ مصیبت میں رکھے تو میں اس کا بندہ ___ اگر وہ اطمینان دے تب بھی میں اس کا بندہ اگر وہ فکر میں مبتلا کر دے تب بھی میں اس کا بندہ تب تو ہے بندگی ___ اور اگر یوں کہے کہ نعمت آئی تب تو میں خدا کا بندہ اور اگر نعمت چھین لی تو پھر میں بندہ نہیں تو پھر تو میں شکایت کروں گا۔ تو وہ خدا کا بندہ نہیں ہے وہ نعمت کا بندہ ہے۔ نعمت اس کا معبود ہے۔ اگر وہ آگیا ہے تو یہ راضی ہے نعمت چلی گئی وہ ناراض ہوگیا۔ اس دنیا میں آدمی خدا کی بندگی کرنے آیا ہے، نعمت کی بندگی کرنے نہیں آیا۔

اس لئے فرماتے ہیں کہ ہم آدمی کے اس جوہر کو جانچتے ہیں کہ یہ کس حد تک ہمارا بندہ ہے۔ مصیبت ہو یا نعمت ہو کس حد تک ہماری طرف جھکتا ہے اس لئے نعمت و مصیبت کا یہ سلسلہ قائم کر دیا۔

طہارت روح

حدیث میں ہے کہ اگر ایک انسان کے گناہ زیادہ ہوں اور حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ اس کو اعلیٰ مقام اور مقام کریم عطاء کریں۔ اس کے اعمال میں سکت نہیں۔ معاصی اور گناہوں کی کثرت ہے تو اس کو اس مقام کے لائق بنانے کے لئے ہم اس پر بیماری مسلّط کر دیتے ہیں، جوں جوں بیماری بڑھتی ہے وہ صبر و تحمّل کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اے اللہ! تو جس حالت میں رکھے میں راضی ہوں۔ اس بیماری کی مصیبت سے اس کے گناہ کا کفارہ ہو رہا ہے۔ اور مقامِ کریم کے قریب پہنچ رہا ہے ___ اگر اس کے گناہ نمٹ گئے۔ اس مقام تک پہنچ گیا تو بہتر، اور پھر بھی اگر اسکے گناہ باقی رہ گئے تو بیماری کے ساتھ میں ناداری بھی مسلّط کر دیتا ہوں۔ بیمار پہلے سے تھا مفلس اب ہوگیا۔ ہاتھ میں پیسہ نہیں کہ غذا استعمال کرے، دوا استعمال کرے۔ تو بیماری بھی ہے مگر علاج کیلئے پیسہ نہیں۔ اور فاقہ بھی ہے مگر غذا کے لئے پیسہ نہیں لیکن اس حالت میں بھی ثابت قدم ہے۔ کہتا یہی ہے کہ اے اللہ! تو جس حالت میں رکھے میں راضی ہوں ___ فرماتے ہیں کہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو رہا ہے۔ اس کے قلب میں جو گناہوں کا میل کچیل بھرا ہوا تھا وہ اب مٹ رہا ہے ___ اگر گناہ نمٹ گئے فبہا، نہ نمٹے تو فرماتے ہیں کہ اس پر موت مسلّط کر دیتا ہوں کہ اس کا کوئی عزیز میں چھین لیتا ہوں ___ بیماری پہلے سے تھی، ناداری بعد میں آئی، موت اب مسلّط ہوگئی۔ عزیز قریب چلے جا رہے ہیں ___ یہ بھی اس لئے کہ کفارہ سیّئات ہے جتنا اس پر غم پڑے گا۔ اتنا ہی اس کی گناہوں کا کفارہ ہوگا، اتنا ہی اس کو قربِ خداوندی نصیب ہوگا۔ اتنا ہی اجر ملے گا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ایک انسان کو ایک کانٹا بھی چبھ جاتا ہے اور اس سے تکلیف پہنچتی ہے تو اس

چبھن پر ایک نیکی نامۂ اعمال میں لکھ دیتے ہیں اور ایک بدی مٹا دیتے ہیں۔ اگر دس دفعہ کانٹا چبھا تو دس نیکیاں مل گئیں اور دس بدیاں مٹ گئیں ___ اور یہ ادنیٰ مصیبت پر ہے۔ اندازہ کیجیے کہ اگر بڑی مصیبت پڑے تو نیکی بھی بڑی دیجائیگی اور بڑی سے بڑی مصیبت کا کفارہ بھی کیا جائے گا۔ تو یہ مصائب کا سلسلہ کفارہ کے لئے ہے کہ مصیبتیں گھٹ جائیں اور نیکیاں بڑھ جائیں اس کے درجات بلند ہو جائیں اور اس مقام کریم کے قابل ہو جائے ___ اگر یہ بدیاں نمٹ گئیں اور روح میل کچیل سے صاف ہو گئی تو فبہا۔ اور اگر پھر بھی صاف نہ ہوئی تو حدیث میں فرمایا گیا کہ میں نزع میں شدت کر دیتا ہوں۔ جان کندنی شدید ہوتی ہے۔ یہ خود ایک مستقل مجاہدہ انسان کو ہوتا ہے ___ لیکن وہ اس میں بھی بندۂ صبر و رضا بنا ہوا ہے۔ جانتا ہے کہ میں قاہر و جابر کے ہاتھ میں ہوں۔ مجھے راضی رہنا چاہیئے وہی میرا مالک ہے ___ اس سے اگر برائیاں نمٹ گئیں اور کفّارہ ہو گیا تو فبہا ___ اور اگر نہ ہوا تو پھر قبر کی اندر کچھ ہولناک حالات پیش آتے ہیں۔ قبر کا فتنہ ہے' قبر کا دبانا ہے منکر نکیر کا آنا ہے۔ سوال و جواب ہے۔ آزمائش اور امتحان ہے۔ یہ بھی درحقیقت کفارے کے لئے ہے۔ اگر یہاں بھی گناہ نہ نمٹے تو پھر میدان محشر کے ہولناک حالات سے گزرنا پڑے گا۔ دھوپ کی تیزی ہوگی' سرگردانی ہوگی' اللہ رب العزّت کے سامنے کھڑے ہونے کا ایک دہشت ناک مقام ہو گا۔ اگر وہاں گناہ نمٹ گئے تو فبہا۔ اگر نہ نمٹے تو آگے پل صراط ہو گا' وہ ایک مصیبت ہے۔

حدیث میں ہے کہ صراط جو جہنم کے اوپر باندھا جائے گا۔ پندرہ ہزار سال کا اس کا راستہ ہو گا۔ پانچ ہزار برس چڑھائی کے' پانچ ہزار برس اترائی کے اور پانچ ہزار برس برابر چلنے کے۔ اس کے اوپر سے انسان کو گزارا جائے گا۔ یہ خود ایک مستقل مصیبت ہوگی ___ یہ دراصل کفارہ کے لئے ہو گا کہ جو کچھ روح کا میل کچیل ہے وہ نکل جائے ___ پھر بھی اگر نہ نکلا اور مصیبتیں باقی رہ گئیں تو اس پل سے کٹ کر آدمی جہنم میں جاگرے گا۔ مومن کو جہنم میں کفارہ سیئات کے لئے ڈالا جائے گا ___ کافر کو تو ایندھن کے طور پر ڈالا جائے گا۔ مومن کو صاف کرنے کے لئے ڈالا جائے گا ___ جیسا کہ

سنار بھٹی میں ___ کوئلہ بھی ڈالتا ہے اور سونا بھی ڈالتا ہے۔ کوئلہ ڈالتا ہے تاکہ آگ روشن ہو اور سونا اس لئے ڈالتا ہے کہ اس کا میل کچیل جل کر سونا کندن ہو کر نکل آئے' مومن کو اس لئے ڈالتے ہیں کہ اس کے ایمان پر جو معصیتوں کا خس و خاشاک رہ گیا تھا۔ اور اس کی روح میں میل کچیل رہ گیا تھا۔ وہ جل جلا کر روح صاف ہو جائے' اور کندن بنکر نکلے۔ اور اس مقام کریم کے لئے لائق ہو جائے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے ___ غرض اس مقام تک پہنچانے کے لئے مصیبتوں کا ایک سلسلہ ہے۔ پیدائش سے لیکر جوانی تک اور جوانی سے لیکر بڑھاپے تک اور بڑھاپے سے لیکر موت تک اور موت سے لیکر قبر تک اور قبر سے لیکر حشر تک اور حشر سے لیکر پل صراط تک ایک مصیبتوں کا سلسلہ ہے۔ سارا سلسلہ اس لئے ہے۔ کہ انسان جل جلا کر کندن ثابت ہو۔ اس کے اندر جو غل و غیظ کی کدورتیں بھری ہوئی ہیں۔ اعمال بد اور معصیتوں کی کدورتیں ہیں وہ سب جل جلا کر صاف ہو جائیں۔ اور وہ کسی اعلیٰ مقام کے لائق ہو۔

مصائب کفارۂ سیّئات ہیں

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے آپ نے ایک بہت عمدہ صاف ستھرا لباس پہن رکھا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس پر میل کچیل آنا شروع ہوا۔ ہفتہ بھر میں اتنا میلا ہو گیا کہ وہ برا معلوم ہونے لگا تو آپ اسے بیزاری کے ساتھ اتار کر غسل خانے میں پھینک دیتے ہیں۔ اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ ہاتھ بھی لگائیں بلکہ نفرت سے

دیکھتے ہیں۔ اگر مکان میں سامنے میلے کپڑے ڈالدئے جائیں۔ اگرچہ وہ آپ ہی کے ہوں۔ آپ گھر والوں سے کہیں گے کیا حماقت ہے میلی کچیلی چیزیں سامنے ڈال دیں۔ ان کو کہیں ایک طرف کونے میں ڈالو۔ تو آپ کو خود نفرت ہو جاتی ہے اس لئے کہ ان پر میل آگیا۔ کپڑا تو وہی ہے' قیمت بھی اس کی وہی ہے۔ اتنا ہی تو فرق ہوا کہ میل اس پر آگیا' بدبو اٹھنے لگی۔ آپ کو نفرت ہو گئی۔

اب دھوبی اس کپڑے کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ سب سے پہلے اسے ایک نہر یا تالاب کے کنارے ایک لکڑی کا پٹرا بچھا کر زور زور دیکر مارنا شروع کرے گا۔ اتنی اس کپڑے کو سزا مل رہی ہے کہ اسے بھگو بھگو کر مارا جا رہا ہے اگر کپڑے کے زبان ہو اور وہ دھوبی سے یوں کہے کہ ظالم میں نے تیرا کیا قصور کیا تھا؟ تو مجھے پٹخ پٹخ کر مار رہا ہے۔ تجھے ذرا ترس نہیں آتا۔ تو دھوبی کہے گا کہ احمق تیرے ہی نفع کے لئے دے دے کر مار رہا ہوں۔ تیرا میل کچیل نہیں نکل سکتا' جب تک تجھے اس طرح دے دے کر نہ مارا جائے۔ تو پٹرے پر دے دے کر اسے مارا تو پوری سزا دی۔

اسی پر بس نہیں کی' بھٹی چڑھا کر اس کے نیچے آگ جلا کر اس میں کپڑے کو ڈالدیا۔ پانی آگ کی وجہ سے سان سان کر رہا ہے۔ گویا زبان حال سے کپڑا چلا رہا ہے کہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہوا کہ اب تک تو مجھے پٹخ کر مارا گیا تھا اب مجھے بھٹی میں آگ کے اوپر رکھدیا۔ وہ جل رہا ہے۔ یہاں تک کہ اسے بھٹی میں سے نکالا گیا اور اسے نچوڑا گیا۔ اس میں سے بہت سا میل نکلا۔ پھر دھوبی اس پر قناعت نہیں کرتا۔ یہاں سے جانے کے بعد اس پر استری کرتا ہے۔ ایک لوہے یا پیتل میں آگ ڈالکر اسے تپا کر پھیرتا ہے۔ تاکہ اس کپڑے کے بل بھی نکل جائیں۔ جو رسل پڑے ہوئے تھے وہ بھی باقی نہ رہیں۔ پھر اس پر ابرک کوٹ کو جمایا گیا۔ جس سے اس میں چمک پیدا ہوئی۔ پھول سا بنا کر مالک کے پاس وہ کپڑے کو لایا۔ تو اب یہ مالک کا سلوک نہیں ہو گا کہ وہ کہے اسے پرے پھینکو۔ اب عزت کے ساتھ اگر عمامہ تو سر پر جگہ دی جائی گی' چوغہ ہے تو اسے بغل میں ڈال یا جائے گا ۔ کرتہ ہے تو اس کو گلے میں پہنیں گے۔

اور جس مجلس میں بیٹھیں گے اس کے مناقب بیان ہوں گے کہ بڑا نفیس کپڑا ہے اس کی کتنی قیمت ہے۔ لوگ پوچھیں گے کہ کہاں سے منگوایا ہے تو آپ منہ بھر کر کہیں گے کہ فلاں کارخانہ کا بنا ہوا ہے۔ اتنا بہتر ہے۔ اسکے اوصاف یہ ہیں' دھلنے' کے بعد ایسا ہوتا ہے' ایسا ہوتا ہے' تو مجلس میں اس کے مناقب بیان کئے جا رہے ہیں۔ اس کی خوبیاں بیان کی جا رہی ہیں ــــــ مالک کے سر پر جگہ ملی اور وہ تمام تر سر پر پہنچا یہ کیا سکا نتیجہ تھا کہ اس میں سے میل کچیل نکل گیا میل کچیل نکالنے کے لئے مصیبتوں کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا۔ دے دے کر الگ مارا گیا۔ بھٹی میں الگ جلایا گیا۔ استری جلتی ہوئی گرم الگ اس پر پھیری گئی۔ دھوپ میں الگ تپایا گیا۔ ان مصیبتوں سے گزرنے کے بعد اب وہ مقام عزت پر پہنچا۔ اور اس کی تعریفیں کی جانے لگیں۔

اب اگر اس کپڑے کو عقل ہو تو وہ دھوبی کا شکریہ ادا کرے گا کہ میری بڑی خیر خواہی کی کہ مجھے ان مصیبتوں سے گزارا۔ اگر میں نہ گزرتا تو یہ عزت کا مقام نہ پاتا۔

بعینہ یہی صورت انسان کی بھی ہے کہ اللہ نے اس کو صاف ستھرا کر کے دنیا میں بھیجا تھا۔ **کل مولود یولد علی الفطرۃ** ہر انسان صاف' صحیح فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے۔ گناہ گار بن کر نہیں آتا لیکن جوں جوانی چڑھتی ہے اور اسباب عیش مہیا ہوتے ہیں۔ معصیتوں میں اور نفسانی جذبات میں مبتلا ہوتا ہے۔ ان کی تکمیل میں لگا رہتا ہے۔ اس کو بھول کر یہ خیال نہیں آتا کہ یہ نعمتیں کس نے مجھے دی تھیں۔ یہ انعامات کس نے کئے؟ اگر ایک آدمی ایک سجدہ کرتا ہے۔ تو مجھ کو اللہ نے اتنی نعمتیں دی ہیں کہ مجھ کو ایک ہزار سجدے کرنے

چاہئیں۔ بس کے پاس جتنی نعمت ہو اتنا ہی اس کو شکر ادا کرنا چاہیے۔ مگر اس کو یہ خیال نہیں آتا۔ معصیتوں اور گناہوں کا میل کچیل اس کی روح میں بھرتا رہتا ہے۔

مالک الملک کی طرف سے اسے تکلیف دیجاتی ہے لیکن متنبہ نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ مصائب کے سلسلہ میں ڈالتے ہیں، جیسے دھوبی نے کپڑے کو مصیبتوں کے سلسلہ میں ڈالا تھا۔ لیکن دھوبی کا منشاء کپڑے کو ستانا نہیں تھا۔ مقام بلند تک پہنچانا تھا ___ اسی طرح سے حق تعالیٰ کا منشاء ان مصیبتوں سے بندے کو بلند مقام تک پہنچانا ہے۔ اس کو مصیبتوں کی بھٹیوں میں ڈالتے ہیں۔ کبھی ناداری مسلط کر کے، کبھی دشمنوں کا خوف مسلط کرے، کبھی فقر وفاقہ مسلط کر کے کبھی غم والم مسلط کر کے، کبھی عزیزوں کو چھین کر کے اور کبھی موت کو مسلّط کر کے۔ یہ سب چیزیں اسلئے ہیں کہ اس کے قلب میں جو میل کچیل ہے وہ نکلے اور قلب میں توجہ الی اللہ اور نورانیّت پیدا ہو۔ جب یہ پیدا ہو جائیگی تو مقام کریم پر پہنچا دیا جائے گا۔

تو حاصل یہ نکلا کہ نعمتیں ہوں یا مصیبتیں۔ دونوں سلسلے جانچ کے لئے ہیں اور جانچ اس لئے نہیں کہ حق تعالیٰ کو علم نہیں تھا (معاذ اللہ) بلکہ علم تھا۔ اس علم کو ظاہر کرنے کے لئے کہ بندہ بھی محسوس کرے کہ میں نے کیا کیا تھا اور اللہ نے میرے ساتھ کیا کیا۔ مصیبتوں کو دیکھ کر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ شاید میرے ساتھ برائی کی جارہی ہے۔ لیکن اگر اس کے دل میں فکر ہے اور دماغ کی خوبی ہے تو وہ کہے گا کہ میرے ساتھ برائی نہیں کی جارہی ہے۔ میرے ساتھ بھلائی کا سامان کیا جارہا ہے۔ حق تعالیٰ کو مجھے مقام عزّت تک پہنچانا مقصود ہے۔ اسی لئے مجھے مصیبتوں کی بھٹی میں ڈالا ہے۔

عملِ جرّاحی

بالکل اس کی مثال یہی ہے جیسا کہ کسی بچے کو کوئی پھوڑا پھنسی نکل آئے تو آپ ڈاکٹر کو بلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب علاج کیجئے۔ اگر ڈاکٹر نے مرہم لگایا تو معمولی پھوڑا پھنسی اس سے درست ہو جاتا ہے ___ لیکن اگر بڑا دُنبل نکلا ہوا ہے۔ تو ڈاکٹر کہتا ہے کہ آپریشن کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ آپ کہتے ہیں کہ آپریشن کیجئے ___ ڈاکٹر نے نشتر لگایا۔ بچہ روتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میرے باپ کو شاید میرے ساتھ دشمنی پیدا ہوگئی۔ جیتی جاگتی کھال کٹوادی اور باپ ہے کہ ڈاکٹر سے کہہ رہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب! دیکھئے ذرا گہرا نشتر لگائیے ایسا نہ ہو کہ مادہ فاسدہ باقی رہ جائے۔ پھر کل کو ابھرے۔ ایسا آپریشن کیجئے کہ صاف ہو جائے ___ اس نے چبھا چبھا کر گہرا نشتر لگایا۔ اور بچہ چلاّ رہا ہے کہ باپ تو قصائی ہو گیا۔ اس کے اندر رحم و کرم باقی نہیں رہا مگر باپ بچے کی کوئی فریاد نہیں سنتا۔

اور جب ڈاکٹر نشتر لگا کر فارغ ہو چکتا ہے تو ڈاکٹر کو فیس بھی دیتا ہے اور اس کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے ___ بچہ اور ناخوش ہوتا ہے کہ ایک تو اس نے میری کھال کاٹ دی اوپر سے اس کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔

لیکن جب زخم درست ہو جاتا ہے اور عقل درست ہوتی ہے تو اب وہ بچہ باپ کا شکر گزار ہوتا ہے۔ کہ اگر آپ نشتر نہ لگواتے تو زندگی خطرے میں رہتی اگر نشتر نہ لگتا اور مادہ فاسدہ باقی رہ جاتا تو وہ پھیل کر تمام اعضاء کو خراب کر دیتا جڑیں بڑھ جاتیں اور موت واقع ہو جاتی اس سے بچاؤ کی یہی تدبیر تھی کہ آپریشن کیا جائے۔

ٹھیک اسی طرح ___ جب ہماری روح میں مصیبتوں اور گناہوں کے پھوڑے پھنسیاں اور بُری حرکات کے دُنبل نکل آتے ہیں۔ حق تعالیٰ آپریشن کرتے ہیں اور نشتر لگاتے ہیں۔ یہ مصیبتیں درحقیقت آپریشن ہیں۔ کہ ان سے مادہ فاسدہ نکالنا ہوتا ہے۔

مصائب کے ذریعہ اصلاحِ اخلاق

یہی وجہ ہے کہ جب مصیبت پڑتی ہے تو آدمی کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں۔ جب عیش و طرب کی کثرت ہوتی ہے تو آدمی میں غنا پیدا ہوتا ہے اور سرکشی بڑھ جاتی ہے۔ حق تعالیٰ اس کا علاج کرتے ہیں کہ کچھ نعمتیں چھین کر بتاتے ہیں۔ اگر دانشمند ہو تو فوراً متوجہ ہو کر توبہ کی طرف لگ جاتا ہے۔ تو نتیجہ نکل آتا ہے کہ اسے متوجہ کیا گیا تو یہ متوجہ ہو گیا تو نعمت دوبارہ واپس کر دیتے ہیں ___ لیکن اگر نہیں مانتا تو پھر دوسرا آپریشن کرتے ہیں ___ یہ ساری مصیبتیں درحقیقت بندے کے حق میں آپریشن ہیں۔ اس لئے مصلحت ہیں اور خوبی کا ذریعہ ہیں اس کے انجام کی بھلائی پیش نظر ہوتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ شانہ 'ان مصائب کے نشتر کے ذریعہ سے جو مادۂ فاسدہ بھرا ہوا ہے اس کو خارج کرتے ہیں۔

میرا مقصد یہ ہے اگر مصیبتیں آئیں اور مصیبتوں میں سب سے بڑی مصیبت موت کی ہے۔ اگر کسی کے گھر میں آئے تو آدمی یہ نہ سمجھے کہ یہ میرے ستانے کا سامان کیا گیا ہے ___ یہ منجانب اللہ خیر و برکت کا سامان اور عبرت دلانے کا سامان ہے۔

آپ غور کر کے دیکھئے ہر شخص کو اس کا تجربہ ہو گا کہ جس گھر میں میّت ہوتی ہے' قلوب میں اس درجہ توجہ الی اللہ پیدا ہو جاتی ہے کہ دنیا کی بے ثباتی ہر شخص کے سامنے ہوتی ہے۔ اور ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہی کچھ میرے لئے بھی درپیش ہے۔ مجھے بھی اس راستہ سے جانا ہے وہ جو ایک بے فکری طغیانی اور سرکشی تھی وہ خود بخود گھٹ جاتی ہے۔ برسوں کے مجاہدے کے بعد وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی جو ایک جنازہ سامنے آنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔

حق تعالیٰ نے موت و حیات کا سلسلہ اس لئے رکھا ہے تاکہ انابت کا مضمون پیدا ہو اور قلب کی بے فکری ہٹ جائے۔

مقصدِ موت

اور اگر یہ شخص رونے دھونے میں لگ جائے اور رات دن میّت کو یاد کر کر کے روئے تو اس سے نہ میّت کو فائدہ ہو گا نہ خود اس کو' موت اس لئے بھیجی گئی تھی کہ اس کو دیکھ کر آدمی اپنی موت کو یاد کرے۔ نہ یہ کہ دوسرے کی موت میں الجھ کر رہ جائے ___ تو اصل مقصد موت کا یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے عبرت حاصل کی جائے اور اپنے اخیر وقت کو یاد کیا جائے اور ایسے سامان پیدا کئے جائیں کہ ہمارے لئے بھی نافع ہو اور میّت کے لئے بھی نافع ہو ۔

اس کے لئے مثلاً تلاوت قرآن کریم بتلائی گئی کہ ایصال ثواب کریں۔ ایصال ثواب سے اس کو بھی راحت پہنچے گی اور آپ کے قلب کو بھی تسکین ہو گی۔

اور اس کے لئے بہترین تدبیر یہ دعا ہے جو اس آیت کریمہ میں بتلائی گئی اور فرمایا گیا :

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ

"ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کبھی دشمنوں کا خوف مسلّط کر کے' کبھی بھوک اور فقر و فاقہ مسلّط کر کے' کبھی مال گھٹا کر اور خسارہ دیکر اور کبھی جانوں کو کم کر کے' یعنی موت

مسلّط کر کے، تو مختلف طریقوں سے آزمائیں گے"۔

دعاءِ تسکین

لیکن فرماتے ہیں کہ ان مصیبتوں کے بعد جو صبر کر گیا اور تحمل سے کام لیا اپنے پروردگار پر نگاہ رکھی ___ تو فرماتے ہیں :

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ

"بشارت دیدو صبر کرنے والوں کو"۔

جب ان پر مصیبت آتی ہے وہ تسکین کی یہ دعا پڑھتے ہیں۔ وہ دعا یہ ہے :

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ

ترجمہ اس کا یہ ہے کہ "ہم سب اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں"۔

تسکینِ عقل

اس میں تسلّی کس طرح سے دی گئی تو دو جملے فرمائے گئے :

ایک اِنَّا لِلّٰہِ ___ اور ایک اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْن ۔ اِنَّا لِلّٰہِ ___ کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب اللہ کی ملک ہیں ___ جب ذہن میں یہ تصوّر آگیا تو آدمی سمجھے گا کہ مالک کو اختیار ہے اپنی ملک میں جیسا چاہے تصرف کرے، مالک اگر یہ چاہے کہ میں اپنی چیز کو اوپر رکھ دوں تو حق ہے اگر یہ چاہے کہ میں اسے نیچے کے کمرے میں رکھدوں یہ بھی اس کا حق ہے اور اگر وہ یہ چاہے کہ زمین سے نیچے رکھدوں یہ بھی اس کو حق ہے۔ جب ہم اللہ کی ملک ہیں زمین کے اوپر رکھنا چاہے یہ بھی اس کو اختیار ہے زمین کے تہہ میں قبر میں پہنچانا چاہے یہ بھی اس کو اختیار ہے۔ قبر سے آگے کسی اور عالم میں بھیج دے یہ بھی اس کو اختیار ہے تو اس ___ کا مطلب اللہ کی ما لکیّت کا تصور ہے کہ وہ مالک اور ہم مملوک ہیں۔ وہ ہمارا آقا اور ہم اس کے خادم۔ اور مالک کو اپنی ملک میں تصرف کرنے کا حق حاصل ہے تو عملی طور پر انسان میں صبر آگیا۔ عقل نے سمجھا دیا کہ جب تو مِلک ہے تو تجھے واویلا کرنے سے کیا مطلب؟ حق تعالیٰ مالک ہیں۔ اور مالک کو اپنے ملک میں تصرف کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ تو عقلی طور پر صبر آگیا۔

تسکینِ طبع

لیکن طبعی طور پر ابھی غم مسلّط ہے، عقل بے شک سمجھا رہی ہے کہ مالک نے اپنی ملک میں تصرف کیا ہے۔ یہ بندہ اس کی ملکیّت تھا۔ اس نے اس کو اٹھالیا۔ بہرحال طبعی طور پر رونے کا جذبہ موجود ہے تو دوسرے جملہ میں اس کا علاج کر دیا گیا۔

وانا الیہ راجعون ہم سب کو لوٹ کر اس کی طرف جانے والے ہیں اس میں یہ بتلا دیا گیا کہ جہاں یہ گیا وہاں تم بھی پہنچو گے۔ گھبرانے کی کیا بات ہے؟ یہ تو چند دن کی جدائی ہے، اس کے بعد جہاں یہ ہو گا وہاں تم

ہی پہنچو گے۔ گھبرانے کی کیا بات ہے؟ یہ تو چند دن کی جدائی ہے' اس کے بعد جہاں یہ ہو گا وہاں تم ہو گے۔
اگر ہمارا کوئی عزیز سفر پر چلا جائے یا ملازمت پر ایک ہزار میل کے فاصلے پر چلا جائے۔ بعض دفعہ دس دس برس ملاقات نہیں ہوتی' لیکن آدمی یوں نہیں گھبراتا کہ جب موقع ہو گا تو چلا آئے گا۔ ملنے کا امکان ہے۔ تو اس امکان کی وجہ سے جدائی کا غم ہلکا ہو جاتا ہے ___ یہاں امکان نہیں بلکہ قوت یقین سے یہ چیز حاصل ہے کہ جہاں یہ گیا وہاں ہم بھی پہنچنے والے ہیں۔ امکان پر اگر صبر آجاتا تھا تو یقین سے صبر کیوں نہیں آئے گا؟

تو انا الیہ راجعون سے انسان کو طبعی طور پر بھی صبر آجاتا ہے تو انا للہ سے عقلی طور پر اور وانا الیہ راجعون سے طبعی طور پر صدمہ گھٹ جاتا ہے' طبیعت اور عقل دونوں بتلا دیتی ہیں کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے' جو واقعہ پیش آیا ہے وہ تمہارے لئے بھی پیش آنا ہے۔

تو اس آیت کریمہ اور دعا میں سبق دیا گیا۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا کہ اگر کوئی ادنیٰ بھی مصیبت آئے تو فوراً کہو

انا للہ وانا الیہ راجعون

تو صرف میّت ہی پر یہ دعا نہیں پڑھی جاتی بلکہ اگر ایک پیسہ بھی گم ہو جائے تو بھی پڑھی جائے۔ کوئی کپڑا بھی گم ہو جائے جب بھی پڑھو۔

تاثیرِ دعاءِ تسکین

اس دعاء کی برکت سے صبر بھی حاصل ہوتا ہے۔ مالک کی طرف توجہ بھی ہوتی ہے اور بدل بھی مل جاتا ہے ___ نعم البدل ہاتھ آجاتا ہے۔ یہ اس دعا کی خاصیّت ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ مصائب کے سلسلہ میں جزع فزع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ صبر ہی کرنے سے سب کچھ ملتا ہے۔ صبر و تحمل سے اپنے کو بھی ملتا ہے دوسرے کو بھی ملتا ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ انکا بیٹا آٹھ نو سال کا تھا بہت خوبصورت اور ہونہار تھا ___ اور ظاہر بات ہے کہ ماں باپ کی توقعات اولاد ہی سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اولاد ان کی زندگی کا سہارا ہوتی ہے۔ غرض ان کو بہت زیادہ محبّت تھی اور توقعات بھی تھیں اور صورت شکل سے ہونہار معلوم ہوتا تھا۔ یہ بچہ بیمار ہوا۔ اس زمانے میں جو علاج ہوتا تھا' حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ لیکن بیماری بڑھتی گئی اسی حالت میں انہیں ایک دو دن کا سفر پیش آیا اور سفر بھی کوئی ضروری تھا۔ اس لئے جانے پر مجبور ہوئے تو بیوی سے یہ فرمایا کہ بچے کی تیمارداری پوری کی جائے اور علاج معالجے میں کوئی کمی نہ کی جائے اور میں پرسوں تک آجاؤں گا ___ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روانہ ہو گئے ___ ان کی غیبت میں اُن کے آنے کا دن تھا کہ بچے کا انتقال ہو گیا۔ تو بیوی بھی صحابیہؓ تھیں۔ صاحب نسبت اولیاء میں تھیں انہوں نے بچے کی لاش کمرے میں رکھی اور چادر سے ڈھانک دی اور باہر آکر بیٹھ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ پہنچے تو عرب کے قاعدے کے مطابق بیوی نے آگے بڑھ کر خاوند کا استقبال کیا۔ مصافحہ کر کے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ چومے۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا کہ بچہ کیسا ہے؟ تو فرمایا کہ : الحمد للہ بعافیۃ وخیر۔

خدا کا شکر ہے بڑے عافیت اور خیریت میں ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں' وہ مطمئن ہو گئے۔ ان کو کھانا

کھلایا۔

کھانا کھلاتے ہوئے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے آپ سے شریعت کا ایک مسئلہ پوچھنا ہے ___ وہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہمارے پاس امانت رکھوائے' اور اس کی ایک میعاد مقرر کرے کہ برس دن کے بعد میں اپنی یہ چیز یا پیسہ واپس لے لوں گا ___ پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ ٹھیک مقررہ وقت پر ادا کر دینا چاہیے۔ تو کہا ہم دیر لگائیں اور ٹال مٹول شروع کر دیں۔

فرمایا کہ ہمیں کوئی حق نہیں ___ اگر ایسا ہو گا تو یہ خیانت ہے اور امانت داری کے خلاف ہے۔

کہا اگر ہم نے وقت پر اداء کر دیا ___ مگر دل میں گھٹن پیدا ہوئی کہ ہم نے کیوں ادا کیا رکھ ہی لیتے ___ فرمایا گھٹنے کا تمہیں کیا حق ہے۔ وہ چیز تمہاری کب ہے۔ اپنی چیز پر آدمی گھٹے۔ دوسرے کی چیز پر گھٹن لانے کا کیا حق ہے؟ بلکہ فرمایا کہ شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ ٹھیک وقت پر امانت سے ادا ہو گئے۔ کوئی خیانت نہیں ہوئی۔ جس کی چیز تھی اسے پہنچ گئی۔ کہا کہ شریعت کا مسئلہ یہی ہے ___ فرمایا ___ مسئلہ تو یہی ہے

اس کی بعد فرمایا کہ :

"وہ جو آپ کا بیٹا تھا وہ اللہ کی امانت تھی۔ اس نے ٹھیک آٹھ برس دو مہینے کے لئے ہمارے پاس بھیجا تھا۔ جب میعاد پوری ہو گئی تو قاصد آیا اور کہا کہ میری امانت میرے حوالے کرو۔ ہم نے حوالے کر دی۔ اب ہمیں بیٹھ کر گھٹنا چاہیے؟ ہمیں غم میں مبتلا ہونا چاہیے؟"۔

بیوی کے ہاتھ چومے۔ اور فرمایا کہ خدا تجھے جزائے خیر دے تو نے میرے دل کو ایسا صبر دیا کہ بجائے غم کے مجھے خوشی ہے کہ امانت' امانت داری کے ساتھ ادا کر دی گئی۔ وقت مقررہ پر ہم سبکدوش ہو گئے۔ اور امانت مالک کو پہنچا دی۔

حقیقت حال یہی ہے کہ اللہ جب کسی نفس کو واپس لیتا ہے۔ تو طبعی طور پر صدمہ اور غم ضرور ہوتا ہے ___ مگر عقل اور طبیعت دونوں بتلاتی ہیں کہ مالک کو اپنی ملک میں تصرف کا حق تھا طبیعت کہتی ہے کہ جدائی کا غم ہے یہ تو چند روزہ جدائی ہے پھر ہم وہیں جانے والے ہیں۔ اس سے آدمی کے اندر صبر اور سکون پیدا ہوتا ہے۔

اجرِ صبر

اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے لئے اجر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ تو دنیا بھی بنتی ہے آخرت بھی بنتی ہے اس لئے میت ہو جانے کے بعد گھٹن میں رہنا یا غم والم میں رہنا یا میت کا اس لئے تذکرہ کرنا کہ غم تازہ ہو۔ یہ منشاء شریعت کے خلاف ہے۔ صورت یہ ہونی چاہیے کہ جب غم تازہ ہو تو وہ افعال انجام دینے چاہئیں جس سے ہمیں نفع ہو۔ اور میت کو بھی نفع ہو۔ تو پہلی چیز یہ ہے کہ یہ دعاء پڑھے : اناللہ وانا الیہ راجعون

دوسری چیز پھر ایصال ثواب ہے۔ قرآن شریف کی تلاوت میں آدمی لگے تو قلب کو تسکین الگ ہو گی۔ میت کو ثواب پہنچے گا اور اس کے درجات الگ بلند ہونگے۔

حدیث میں ہے کہ میت عالم برزخ میں پہنچ کر ہر ہر رشتہ دار' عزیز اور پس ماندہ کی طرف متوجہ رہتا ہے کہ کون میرے لئے کیا کرتا ہے۔ اس کی مثال دی گئی کہ جیسے دریا میں کوئی ڈوبتا ہوا ایک ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتا

ہے کہ شاید میں اس کی وجہ سے ڈوبنے سے بچ جاؤں۔ میّت کی یہی کیفیت رہتی ہے۔ تو عزیز و اقارب کی طرف اس کی آس لگی رہتی ہے کہ کوئی مجھے یاد کرتا ہے یا نہیں؟ کوئی اجر پہنچاتا ہے یا نہیں؟

برزخ میں آثارِ نعمت

حدیث میں فرمایا گیا کہ مُردوں کو اجتماع کا کچھ وقت دیا جاتا ہے تو جب وہ جمع ہوتے ہیں تو اگر کسی کے پاس زیادہ ثواب پہنچتا ہے تو وہ دوسرے مُردوں کے اوپر فخر کرتا ہے کہ میرے عزیز تھے جو مجھے یاد کرتے تھے اور اگر کسی کا کوئی عزیز نہیں ہوتا تو وہ کہتا کہ میرا بھی کوئی عزیز ہوتا تو مجھے یاد کرتا تو اس کو خجالت اور ندامت ہوتی ہے۔ اور اس کا سر اونچا نہیں ہوتا ہے ___ تو جو دنیا میں کیفیت تھی کہ نعمت زیادہ ہوتی ہے تو آدمی کا سر اونچا ہوتا تھا۔ مصیبت آپڑتی تھی تو سرنگوں ہو جاتے تھے۔ یہی کیفیت برزخ میں بھی رہتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں راحت اور مصیبت کمائی نہیں جاتی۔ یہاں سے بھیجی جاتی ہے۔ یا یہاں کا کیا ہوا اس کے ساتھ رہتا ہے۔ تو اگر کوئی ثواب پہنچا دیتا ہے تو اس کا سر فخر سے اونچا ہوتا ہے اور وہ دوسروں سے کہتا ہے کہ تمہارے عزیز قریب تو کچھ نہیں بھیج رہے ہے تو یہ ہے وہ چیز جس سے اپنے قلب کو بھی تسکین ہوتی ہے اور میّت کو بھی فائدہ پہنچتا ہے ___ لیکن محض رونا یا غم میں مبتلا رہنا ہمارے لئے بھی تکلیف دہ ہے اور میّت کے لئے بھی تکلیف دہ ہے نہ اس کے لئے فائدہ نہ ہمارے لئے فائدہ۔

میّت اور پس ماندگان کا باہمی نفع

تو یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ اس گھرانے پر جو ایک سال میں دو صدمات واقع ہوئے۔ ایک باوانی صاحب مرحوم کی وفات اور ایک ان کے داماد ستار بھائی صاحب کی وفات حقیقت میں یہ دو بڑے صدمات ہیں ___ ایک سال کے اندر اتنے بڑے صدمات کا پڑنا کہ دو گھروں کے دو وارث اٹھ جائیں یہ کوئی کم صدمہ نہیں ہوتا۔ لیکن جتنا بڑا صدمہ ہوتا ہے اس سے اگر آدمی چاہے تو اتنی ہی بڑی آخرت کمائی جاسکتی جتنا دل میں غم ہو اور صدمہ ہو اتنا بڑا صبر ہوگا اور اتنا ہی بڑا اجر ہوگا۔

وقتِ صبر

اور صبر اپنے وقت پر ہوتا ہے مدت کے گزر جانے پر تو ہر ایک کو صبر آجاتا ہے۔ وہ باعثِ اجر نہیں ہوتا۔ صبر وہی باعثِ اجر ہے جو ارادہ و اختیار سے مصیبت کو دبانے کے لئے کیا جائے۔

حدیث میں ہے کہ ایک بڑھیا کا جوان بیٹا مرگیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے۔ بڑھیا واویلا فریاد اور بیان کر کر کے رو رہی تھی۔ آپے سے باہر تھی۔ آپ نے فرمایا۔ بڑی بی! صبر کرو۔ حق تعالیٰ کو یہی منظور تھا تحمل کرو۔

اس نے جذبے میں کہا کہ تمہارے اوپر گزرتی' جب میں جانتی۔ میرا تو جوان بیٹا مرگیا تم مجھے کہہ رہے ہو صبر کرو۔ اسے یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ___ غرض جواب دیدیا اور کہا کہ مجھ سے نہیں صبر ہوتا ___ فرمایا اچھا تو جان۔ تیری مرضی ___ اور آپ آگے گزر گئے۔

اسے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے ___ تو بے چاری پریشان اور نادم ہو کر نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑی اور مسجد نبوی میں جاکر عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ صبر کی تلقین فرمارہے تھے۔ اب میں صبر کرتی ہوں۔ آپ نے فرمایا :

الصبر عند الصدمۃ الاولی

”جب صدمہ پڑرہا ہو جب صبر کیا جائے وہ صبر ہے“۔

وقت گزرجانے کے بعد مجبوری کا صبر ہوتا ہے۔ اس پر اجر و ثواب مرتب نہیں ہوتا ___ جب آدمی غم میں ڈوبا ہوا ہو۔ اس وقت آدمی تحمل کرے اور اپنے پروردگار کی طرف توجہ کرے تو یہ صبر ہے تو اتنے بڑے صدموں میں یقیناً غم بھی زیادہ ہوگا اس غم میں جتنا صبر کیا جائے گا اتنا ہی اجر بھی زیادہ ملے گا۔

مشترکہ غم

اور پھر اس پر غور کیا جائے کہ کوئی بڑی شخصیت گزرتی ہے تو وہ کسی ایک گھرانے کا صدمہ نہیں ہوتا۔ وہ ہزاروں کا صدمہ ہوتا ہے ___ باوانی صاحب مرحوم' ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ بہت سے لوگوں کے وارث بنے ہوئے تھے۔ بہت سوں کے باپ بنے ہوئے تھے۔ ہزاروں کو ان سے فائدہ تھا۔

ہزاروں کو ان سے نفع ہورہا تھا ___ یہی وجہ ہے جیسا کہ سننے میں آیا جنازے میں اتنا ہجوم تھا کہ باید وشاید ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ہر شخص ان کا مرہون منّت تھا۔ کوئی اخلاق کا کوئی دولت کا کوئی انعام کا کوئی اکرام کا اپنے اپنے غم کو ہر کوئی رو رہا تھا۔ تو ایسی شخصیّت کا غم کسی ایک خاندان کا غم نہیں ہوتا۔ کسی ایک گھرانے کا غم نہیں ہوتا۔ یہ پورے ملک کا غم ہوتا ہے۔ پورے شہر کا غم ہوتا ہے۔

تو جب غم اٹھانے والے بہت سے ہوں تو دو چار گھر والوں کو ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ زیادہ غم کے اندر ڈوبیں۔ وہ تو کہیں گے ہمارا غم تو سب نے مٹادیا۔ سب کے اندر بٹ گیا ___ تو واقعہ یہ ہے کہ سب غم زدہ ہیں۔

خیر النّاس

ایسی شخصیّتوں کے گزرنے سے جو **خیر الناس من ینفع الناس** ہوں جن سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہو۔ وہ بہترین خلائق سمجھے گئے ہیں۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ :

خیر الناس من ینفع الناس۔

بہترین انسان وہ ہے جس سے دوسروں کو نفع پہنچے۔ فرمایا گیا بہترین انسان وہ ہے جو **مفتاح للخیر** ہو اور **مغلاق للشر** ہو۔ یعنی اس کے ذریعے خیر کے دروازے کھلتے ہوں اور شر کے دروازے بند ہوتے ہوں۔ دنیا کے اوپر برائیوں کے دروازے بند کرتا ہو اور بھلائیوں کے دروازے کھولتا ہو۔ وہ درحقیقت پوری دنیا کا وارث اور والی بن جاتا ہے۔ اس لئے اس کا غم بھی ساری دنیا کا غم ہوتا ہے۔

تو باوانی صاحب مرحوم یا ستار بھائی مرحوم درحقیقت ایسے لوگ تھے جو اپنی دولت سے بھی لوگوں کو نفع پہنچاتے تھے۔ اپنے دین سے بھی لوگوں کو نفع پہنچاتے تھے ___ ستار بھائی کو میں نے دیکھا کہ تبلیغی سلسلے میں رات دن منہمک کبھی ڈھاکہ جارہے ہیں۔ اور کبھی ادھر ادھر گویا دین پھیلانے کا ان کے دل کے اندر ایک

جذبہ موجود تھا۔ تو جس جس تک ان کی آواز پہنچی' انہوں نے اس کو دین کا فائدہ پہنچایا۔ تو کوئی دین کا نفع پہنچانے والا تھا۔ کوئی دنیا کا خیر الناس میں داخل تھے ___ یقیناً ایسے لوگوں کا صدمہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ مگر ایسے صدمے میں جتنا تحمّل اور صبر کیا جائے اتناہی بڑا اجر بھی ہوتا ہے کسی شاعر نے کہا ؎

یاد داری وقت زادن تو ہمہ خنداں تو گریاں

شاعر انسان کو خطاب کرکے کہتا ہے کہ تجھے یاد ہے جب تیری پیدائش کا وقت تھا کہ تو تو روتا ہوا آیا تھا اور ساری دنیا خوشی خوشی ہنس رہی تھی ؎

آنچناں زی کہ وقت مردن تو گریاں خنداں

ایسی زندگی گزار کہ تو ہنستا ہوا جائے اور دنیا تیرے لئے رورہی ہے تو نیک لوگ جب جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ تو ہنستے ہوئے جاتے ہیں رونے والے پیچھے سے روتے ہیں۔

رونے کی حقیقت

لیکن یہ رونا درحقیقت ان کی موت کا رونا نہیں ہوتا۔ اپنے نفع کے گم ہوجانے پر رونا ہوتا ہے ___ ورنہ میت تو اپنے اعلیٰ مقام پر پہنچتا ہے۔ تو اعلیٰ مقام پر پہنچنے کی وجہ سے کسی کو غم تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کا انتقال کسی مقدس زمانے میں مثلاً رمضان میں ہو تو یہ کہہ کر تسلی دیا کرتے ہیں کہ میاں! غم کرنے کی کیابات ہے خوش ہونا چاہیے کہ موت کا کتنا اچھا زمانہ ملا ___ اگر کسی کا انتقال کسی مقدس مقام پر مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ (زادھما اللّٰہ شرفاً وّ کرامۃً) میں ہوجائے لوگ وارثوں کو تسلی دیتے ہیں غم کرنے کی بات نہیں خوش ہو جاؤ کہ پاک مقام مل گیا۔ مدینہ طیبہ کی زمین نے اسے قبول کرلیا معلوم ہوا کہ موت غم کی چیز نہیں نہ کوئی موت پر غم کرتا ہے نہ روتا ہے۔ رونا اپنی جدائی کا ہوتا ہے کہ ہم سے یہ شخص چھن گیا۔ خود تو وہ بہت اچھے مقام پر پہنچ گیا کہ آج باوانی صاحب مرحوم اگر نہیں ہیں کہ موت واقع ہوگئی۔ موت تو ہمیں بھی آئے گی' جتنے ہم ہیں ہم سب کو آئے گی' اس پر کیارونا؟ ___ بلکہ اس بارے میں تو خوش ہونا چاہیے کہ ایک اعلیٰ ترین زندگی گزار کر ایک اچھے مقام پر انشاء اللہ پہنچ گئے تو ہمارے لئے خوشی کی بات ہے۔ یہ جو غم اور رونا ہے یہ ان کی جدائی پر ہے کہ ہم سے ایک ذات چھن گئی ___ حقیقت میں آدمی اپنی غرض اور اپنے منافع کو روتا ہے نہ کہ مرنے والے کو' تو مرنے والے کے انجام کو جب دیکھتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ بڑا اچھا خاتمہ ہوا۔

اچانک موت

اب جیسے باوانی صاحب مرحوم کا میں نے سنا کہ ___ اچانک موت واقع ہوئی اور ہارٹ فیل ہوا۔

حدیث میں فرمایا گیا موت الفجاءۃ الخ

اچانک کی موت کافر کے لئے عذاب ہے اور مؤمن کے لئے رحمت ہے۔ تو اللہ کی فرمائی چیز ہے تو یہ یقینی ہے کہ ان کے لئے رحمت واقع ہوئی۔ اس لئے کہ بحمد اللہ وہ مؤمن تھے اور مسلم تھے اور مسلم پر جب اچانک کی موت آتی ہے وہ رحمت بنتی ہے۔ تو موت خوشی کی چیز ثابت ہوئی کہ رحمت نے انہیں قبول کرلیا۔ آگے غم اپنا ہے کہ وہ ہم سے چھین لئے گئے۔ ہم سے وہ جدا ہوگئے تو اس جدائی ___ کی تسکین یہ ہے کہ ہم ایصال

ثواب کریں۔ ان کو یاد رکھیں تو وہ ہم سے قریب رہیں ہم ان کے قریب رہیں۔ کبھی کبھی ان کے مزار پر جا کر زیارت کرلیں۔

آدابِ زیارت

حدیث میں ہے کہ جب قبر کی زیارت کی جاتی ہے تو آدابِ زیارت میں سے فرمایا گیا کہ آدمی قبلہ کی طرف پشت اور میّت کی طرف منہ کرے' اس لئے کہ میّت اسے دیکھتا ہے اور پہچانتا ہے۔ جو پہچان دنیا میں تھی وہی برزخ میں جا کر رہتی ہے۔ پچھلا علم سلب نہیں ہوتا۔ چھن نہیں جاتا۔ جو جذبات اور جان پہچان دنیا میں تھی وہ وہاں بھی باقی رہتی ہے تو جس سے جتنا تعلق ہوتا ہے وہاں بھی قائم رہتا ہے۔ جس سے جتنی جان پہچان تھی وہ قائم رہتی ہے تو اس تعلق کو نبھانے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے مرنے والوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھا جائے اور ایصالِ ثواب کے جائز طریقے اختیار کر کے ان کو نفع پہنچایا جائے ___ اس میں مرنے والوں کا بھی نفع ہے اور پس ماندگان کے لئے بھی تسکین ہے۔

انہی چند کلمات پر تقریر ختم کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے' اور نافع فرمائے۔ (آمین)

اللهم ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذهديتنا وهب لنا من لدنك رحمة انك انت الوهاب

اللهم احسن عاقبتنا فى الامور كلها واجرنا من خزى الدنيا وعذاب الاخرة

وصلى الله تعالى على سيدنا محمد واله واصحابه اجمعين

برحمتك ياارحم الراحمين

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

آدابِ معاشرت

(بعد از خطبہ مسنونہ)

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللہ الرحمن الرحیم○
وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما. والذین یبیتون لربھم سجدا وقیاما والذین یقولون ربنا اصرف عنا عذاب جھنم ان عذابھا کان غراما انھا ساء ت مستقرا و مقاما والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکانَ بین ذالک قواما والذین لا یدعون مع اللہ الٰھا اخر ولا یقتلون النفس التی حرم اللّٰہ الا بالحق ولا یزنون ومن یفعل ذالک یلق اثاما یضٰعف لہ العذاب یوم القیٰمہ ویخلد فیہ مھانا الا من تاب واٰمن و عمل عملا صالحا فاولٰئک یبدل اللہ سیئا تھم حسنات وکان اللہ غفورا رحیما ومن تاب وعمل صالحا فانہ یتوب الی اللہ متابا○ (الفرقان)

صدق اللہ العظیم○

نجات کا تعلق عمل سے ہے، علم سے نہیں ہے

بزرگان محترم! یہ چند آیتیں قرآن کریم کی اس وقت میں نے تلاوت کیں جن کا تعلق زیادہ تر عمل سے ہے۔ اس لئے کہ علمی باتیں تو کانوں میں پڑتی ہی رہتی ہیں۔ جلسوں میں، مواعظ میں، گفتگو میں، لیکن عملی مسائل کی گفتگو کم ہوتی ہے اور کوتاہی ہم لوگوں کی جتنی ہے وہ عمل کی ہی ہے۔ علم کی نہیں، علم کے وسائل اس زمانے میں اتنے بڑھ چکے ہیں کہ ہم علم کا ارادہ بھی نہ کریں تو خواہ مخواہ علم ہمارے سامنے آتا ہے۔ کتابیں ہیں، رسائل ہیں، اخبارات ہیں تو رات دن سامنے علمی باتیں آتی رہتی ہیں۔ کوتاہی ہے درحقیقت عمل کی ہے۔ علم کی نہیں بقول مرزا غالب کے:

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی!

علم تو ہے مگر عمل کرنے کو جی نہیں چاہتا ہے۔ آمادگی نہیں ہوتی، اور نجات کا تعلق ہی عمل سے ہے علم سے نہیں۔ اس لئے میں نے ایسی چند آیتوں کا انتخاب کیا ہے اس وقت کہ جن میں زیادہ تر عملی چیزیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ عبادات کی طرف تو لوگ کافی متوجہ ہیں۔ نماز پڑھنا ذکر، تلاوت، لیکن اسلامی معاشرت کی طرف لوگ بہت کم متوجہ ہیں کہ معاشرہ ہمارا اسلامی بن جائے، اور رہن سہن اسلامی ہو، طرز کلام وسلام اسلامی ہو، اٹھنا، بیٹھنا اسلام ہو، ان آیات میں ان ہی چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

مخلوق خدا رحمت سے مربوط ہے

وعباد الرحمن رحمٰن کے بندوں کی کیا علامتیں ہیں؟ کس طرح پہچانا جائے کہ یہ رحمٰن کے بندے ہیں۔ رحمت کی صفت کو یہاں خاص کیا گیا یہ نہیں فرمایا گیا کہ عباد اللہ۔ یعنی اس ذات کی طرف نسبت نہیں کی گئی اور یہ بھی نہیں فرمایا گیا کہ عباد الجبار و عبادالقهار، عباد الرحمن کا لفظ استعمال کیا گیا۔ دو وجہوں سے، اولاً اس لئے کہ مشرکین مکہ لفظ اللہ سے تو واقف تھے۔ رحمٰن سے بالکل واقف نہ تھے حالانکہ رحمٰن کی صفت ایک درجے میں اس ذات کے قریب ہے فرمایا گیا۔

قل ادعو الله او ادعوا الرحمن ایاما تدعوا فله الاسماء الحسنى

اسے اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو۔

تو اللہ کے لفظ کے ساتھ رحمٰن کا لفظ لایا گیا۔ گویا یہ برابری کرتا ہے علم ذات کی، اور رحمٰن کی ذات کو مشرکین مکہ سمجھتے نہیں تھے۔ چنانچہ ان ہی آیتوں سے دو چار آیات پہلے فرمایا گیا کہ واذا قيل لهم اسجدوا للرحمٰن یعنی جب مشرکین مکہ سے کہا گیا کہ رحمٰن کو سجدہ کرو وقالوا وما الرحمن، انہوں نے کہا کہ رحمٰن کیا چیز ہوتا ہے، وہ اس سے واقف ہی نہیں تھے۔ انسجد لما تامرنا وزادهم نفورا تو غرض رحمٰن کے لفظ سے واقف نہیں تھے، طبیعتیں چلتی نہیں تھیں، اسی لئے رحمٰن کے لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرے اس وجہ سے اختیار فرمایا گیا کہ حق تعالیٰ کی تمام صفات کمال ہیں۔ سب سے زیادہ غالب صفت رحمت کی ہے جس کے پرتو پڑ رہے ہیں عالم پر۔ اللہ نے اپنے بندوں کے ساتھ جو تعلق قائم کیا ہے تو رحمت کی صفت کے ساتھ کیا ہے۔ قہر و غضب کے ساتھ نہیں، اگر قہر و غضب کی بنا پر تعلق قائم ہوتا تو کسی مخلوق کا پتہ بھی نہیں چلتا، سب کچھ جل کر خاکستر ہو جاتا، کون تاب لا سکتا تھا اس کے قہر کی اور اس کے جبر کی لیکن رحمت کی صفت وہ ہے کہ قدرتی طور پر آدمی رحم والے سے مربوط ہوتا ہے اسی لیے نبی کریمؐ کی شان مبارک رحمۃ للعالمین ذکر فرمائی گئی ہے کہ جہانوں کے لئے آپ مربی ہیں اور ہادی ہیں، اور ہادی کے لئے سب سے پہلی شان یہ ہے کہ رحمت اور شفقت اس میں کوٹ کر بھری ہوئی ہو اور اگر قہر اور جبر اور زیادتی ہوگی تو سب لوگ چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ کوئی مربوط نہ ہوگا، تو رحمت و شفقت وہ ہے کہ باہم مربوط کر دیتی ہے حتیٰ کہ دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں۔

صفت رحمت غالب ہے حق تعالیٰ کی تمام صفات میں

حق تعالیٰ کی صفات میں غلبہ ہے صفت رحمت کو اور حق تعالیٰ نے اس کو ایک حسی صورت دی اور ایک تکوینی صورت پیدا فرمائی، تاکہ اس کی رحمت کا غلبہ ظاہر ہو۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ شریعت اسلامی جتنی کائناتوں کا پتہ دیتی ہے سب سے اوپر عرش ہے، عرش مثل قبے کے چھایا ہوا ہے سارے جہانوں کے اوپر جیسے سرپوش ڈھانپ دیتے ہیں اور سینی میں ہزاروں چیزیں ہوتی ہیں۔ سرپوش ڈھانپ دیا تو ساری چیزیں

اس کے اندر آجاتی ہیں۔ تو عرش تک تو چلتی ہے مخلوق مگر عرش کے اوپر کسی مخلوق کا پتہ نہیں۔ وہاں اگر شریعت کسی مخلوق کا پتہ دیتی ہے، تو وہ ایک لوح اور تختی ہے جو آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے اور عرش پر رکھی ہوئی ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے کہ **ان رحمتی سبقت غضبی** میری رحمت غالب ہے میرے غضب کے اوپر، یہ گویا دستاویز کے طور پر کائناتوں کے بادشاہ نے لکھ کر رکھ دیا ہے کہ میری پالیسی اپنی مخلوق کے ساتھ رحمت و شفقت کی ہوگی تاکہ مخلوق مانوس و مربوط ہو جائے اور جو پیغام اسے دیا جائے قبول کرے، قہر و غضب سے دل کسی بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا لیکن شفقت سے اور رحمت سے آپ کچھ بھی کہیں آدمی بھائی ہو جاتا ہے اور خود حق تعالیٰ نے عرش پر جو استواء فرمایا تو وہ صفت رحمت سے فرمایا: **الرحمٰن علی العرش استوی** چھا گیا رحمٰن عرش پر، یہ نہیں فرمایا گیا کہ: **الجبار علی العرش استوی، القھار علی العرش استوی** قہر والا چھا گیا عرش پر، جبر والا چھا گیا عرش پر بلکہ رحمت والا چھا گیا عرش پر۔

تو گویا اب نتیجہ یہ نکلا کہ ساری کائنات کے اوپر چھایا ہوا ہے عرش، اور عرش پر چھائی ہوئی ہے رحمت، تو نتیجہ نکلتا ہے کہ ساری کائنات پر چھائی ہوئی ہے رحمت، تو اول تو تختی لکھ کر رکھ دی کہ ہماری پالیسی اور ہماری تقدیر عالم کے لئے رحمت کی ہوگی، پھر صفت رحمت غالب ہوئی اور استواء کیا عرش پر تو گویا یہ اعلان ہو گیا کہ اس کے نیچے جتنی مخلوق ہے وہ سب رحم و کرم کا برتاؤ کرے گی، اور عرش قائم کیا گیا پانی کے اوپر **وکان عرشہ علی الماء** اور رحمت کو اگر صورت دی جائے تو وہ پانی کی ہوگی، جیسے غصہ اور غضب کو شکل دی جائے تو وہ آگ کی شکل اختیار کرے گی یہی وجہ ہے کہ جب آدمی غضبناک ہوتا ہے اور غصے میں لال پیلا ہوتا ہے۔ تو کہا کرتے ہیں کہ فلاں آگ بگولا ہو گیا۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ پانی پانی ہو گیا، پانی پانی جب کہتے کہ جب اس کا رحم و کرم ظاہر ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ غضب کی صورت مثالی آگ کی ہے یعنی اگر غضب کو اور قہر کو مجسم بنایا جائے تو آگ کی شکل اختیار کرے گا، تو پانی پر قائم کیا عرش کو کہ وہ صورت مثالی رحمت کی اور عرش پر خود چھا گئے صفت رحمت سے تو اوپر بھی رحمت اور نیچے بھی رحمت اور حدیث میں فرمایا گیا کہ اللہ نے کائنات کو پیدا کر کے سو رحمتیں پیدا کیں، ان میں سے ایک رحمت اتاری ہے، جس کی وجہ سے ماں باپ اپنی اولاد پر رحم کھاتے ہیں، جانور اپنے بچوں پر رحم کھاتے ہیں۔ ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی پر رحم کھاتا ہے تو ایک رحمت کا اثر ہے جو پوری کائنات میں پھیلی ہوئی ہے اور ننانوے رحمتیں چھپا رکھی ہیں عرش کے نیچے کہ قیامت کے دن گنہگاروں کے لئے استعمال کی جائیں گی۔ تو جب ایک رحمت کا یہ اثر ہے کہ جب آدمی رحم و کرم پر آجاتا ہے تو کوئی دشمن باقی نہیں رہتا ہے، سارے دوست ہی دوست بن جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بہانوں سے مغفرت فرمائیں گے

حق تعالیٰ قیامت کے دن جب ان ننانوے رحمتوں کا استعمال فرمائیں گے تو کتنی عظیم مغفرت ہو گی، کتنی بخششیں ہوں گی۔ لن یھلك علی اللہ الا ھالك بس جسے ہلاک ہی ہونا ہو گا وہ تو ہلاک ہو گا۔ رحمت نہیں چاہے گی کہ کوئی ہلاک ہو۔ بلکہ یہ چاہے گی کہ یہ بخشا جائے نجات پا جائے، کامیاب ہو جائے اس کی ہزاروں مثالیں ہیں جو احادیث میں دی گئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

رحمت حق بہانہ می جوید

اللہ کی رحمت لوگوں پر بخشش کرنے کے لئے بہانے تلاش کرے گی۔ قیمت کی طلب گار نہیں ہو گی، یہ نہیں ہو گا کہ معاوضہ دو تو ہم رحمت کریں بلکہ رحمت عام ہو گی، حیلے بہانوں سے رحمت کی جائے گی، ذرا ذرا سی چیز پر مغفرت کی جائے گی۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ دو آدمی آئیں گے جن کو حکم دیا جائے گا جہنم کا، ملائکہ ان کو جہنم میں لے جائیں گے اور جہنم میں ان کو جھونک دیں گے، وہ جہنم میں پہنچ کر اتنے چلائیں گے کہ سارے جہنمیوں پر ان کی آواز غالب آ جائے گی۔ بے حد شور مچائیں گے، تصنع کے ساتھ پوری آواز سے ہائے واویلا کریں گے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ان کو نکال کر لاؤ، ملائکہ ان کو نکال کر لائیں گے۔ ان کی پیشی ہو گی، فرمائیں گے کہ تم اتنا کیوں چلا رہے ہو؟ کیا تمہارے اوپر ملائکہ نے کچھ زیادتی کی ہے، کیا مقررہ عذاب سے کچھ زیادہ عذاب دے دیا تم کو، وہ کہیں گے کہ یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں، فرمائیں گے پھر اتنا کیوں چلا رہے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اس لئے چلا رہے تھے کہ آپ ہمیں نکلوائیں۔ بس ہمارا مقصد پورا ہو گیا۔ گویا وہاں بھی وہ چار سو بیسی کریں گے۔

فرمائیں گے حق تعالیٰ کہ تم قدرت کو دھوکہ دینا چاہتے ہو، حیلے بہانے کر رہے تھے کہ تم کو نکال دیا جائے، تم جہنم کے اندر فوراً جاؤ تو ایک تو فوراً جا کر کود پڑے گا جہنم میں اور ایک وہیں ڈٹ کر کھڑا ہو جائے گا۔ اسے آرڈر دیا جا رہا ہے حکم دیا جا رہا ہے مگر جاتا نہیں وہیں کھڑا ہوا ہے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم نے حکم عدولی کیوں کی ہے، جب ہمارا حکم تھا کہ جا جہنم میں، تو نے کیوں نہیں مانا، وہ کہے گا اے اللہ! بے شک آپ کا حکم تھا اور وہ واجب التعمیل تھا مگر میرے ذہن نے یہ قبول نہیں کیا کہ آپ رحیم و کریم ہو کر عذاب سے نکال کر پھر دوبارہ عذاب میں داخل کریں، اتنا اعتماد مجھے آپ کی رحمت پر تھا کہ کسی طرح دل نہیں مانتا تھا کہ عذاب سے نکال کر دامن رحمت میں لے آئیں اور پھر عذاب میں داخل کریں یہ رحمٰن کی شان سے بعید ہے۔ اس پر بھروسہ کر کے میں ڈٹ کر کھڑا ہو گیا، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تیرا یقین صحیح تھا جا تیری نجات ہو گئی۔ وہ صرف حیلہ ہی تو تھا مغفرت کا پھر دوسرے سے پوچھیں گے جو فوراً جہنم میں کود پڑے گا کہ فوراً کیوں کود پڑا؟ وہ عرض کرے گا کہ اے اللہ! میں نے سوچا کہ یہ میرے پروردگار کا آخری حکم ہے، اس کی تو تعمیل کر لوں اس واسطے میں فوراً کود پڑا۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو نے اتنی بڑی نیکی کی کہ تیرے سارے

گناہ ختم ہو گئے، جا تیری بھی نجات ہو گئی۔

تو یہ ہے وہ کہ:

رحمت حق بہانہ می جوید

کہ اللہ کی رحمت بہانے تلاش کرے گی مغفرت کے، یعنی خود ہی ایسے سامان پیدا فرمادیں گے کہ حیلہ ہو جائے مغفرت کا۔ کرنی ہو گی مغفرت پہلے ہی سے کہ مقصود ہو گی مگر اس کے لئے ایک حیلہ بنادیں گے۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص حاضر ہو گا اور اس کا نامہ اعمال نیکیوں سے بھرپور ہو گا۔ جگمگا رہا ہو گا۔ ساری عمر میں صرف ایک ہی بدی کی ہو گی، اس کے دل میں یقین ہو گا کہ میری تو سو فیصد مغفرت ہو گی، ایک بدی سے وہ کیا پکار کرے گی، وہ بہت ناز سے آئے گا کہ ہے ہی نہیں کوئی بدی۔ لے دے کر صرف ایک بدی ہے۔ فرمائیں گے کہ تیری مغفرت اسی سے ہے کہ اس بدی کو نیک سے بدل لاؤ جب تیری نجات ہو گی ورنہ نہیں۔ اب وہ بیچارہ پریشان ہو گا، وہاں مانگتا پھرے گا کون تیار ہو گا اپنی نیکی دینے کو، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے، وہاں تو ذرا سی نیکی ہو گی لوگ سہارا دیکھیں گے، شاید اسی کی وجہ سے نجات ہو، وہاں کون یہ سخاوت کرے گا کہ بھائی نیکی تو لے جا۔ کوئی دینے کو تیار نہ ہو گا حتی کہ جو ماں باپ ہوں گے وہ بھی ہٹ جائیں گے۔ وہاں کون کسی کا پرسان حال ہو گا یوم یفر المرء من اخیہ وامہ وابیہ وصاحبتہ وبنیہ وہاں باپ اولاد سے بھاگتا پھرے گا، اولاد ماں باپ سے بھاگتی پھرے گی۔ ماں باپ چاہیں گے کہ ساری اولاد جہنم میں چلی جائے لیکن ہم کسی طرح بچ جائیں۔ اولاد چاہے گی کہ چاہے سارے ماں باپ جہنم میں چلے جائیں لیکن ہم کسی طرح سے بچ جائیں۔ تو وہاں نفسا نفسی ہو گی، اپنی نیکی دینے کو کون تیار ہو گا۔ اب بیچارہ پریشان پھر رہا ہے، کس سے نیکی مانگے کون نیکی دے گا۔ ایک شخص سامنے آئے گا جس نے ساری عمر بدیاں ہی بدیاں کی ہوں گی اس پوری عمر میں ایک ہی نیکی کی ہو گی یہ التجا کرے گا کہ بھائی ایک نیکی چاہئے۔ وہ کہے گا کہ بھائی میرے پاس تو کل ایک نیکی ہے میں تو اول بھی جہنم میں اور آخر بھی جہنم میں۔ میرے پاس تو بدیاں ہی بدیاں ہیں۔ میری نجات کہاں ہو گی، اگر تیرا کام چلے تو تو ہی لے جا اس ایک نیکی کو اور لا اپنی بدی مجھے دے دے۔ اب اس کا پورا نامہ اعمال نیکیوں سے بھرپور ہو گا۔

باری تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس شخص کو بھی آنا چاہئے تھا جس نے تجھے ایک نیک دی تھی، وہ بھی آئے گا اب اس کے پاس کچھ بھی سہارا نہیں۔ فرمائیں گے حق تعالیٰ، کہ تو نے نیکی دے کر آج اتنی بڑی نیکی کی کہ ساری بدیاں تیری ختم ہو گئیں۔ جا تیری بھی نجات ہو گئی، یہ وہ ہے کہ "رحمت حق بہانہ می جوید" اللہ کی رحمت بہانے تلاش کرتی ہے۔ تو بہر حال ایسے ہزاروں واقعات حدیث میں فرمائے گئے ہیں کہ رحم و کرم سے بندوں کی نجات کی جائے گی۔

رحمٰن کی شان

تو اللہ کی رحمت غالب ہے، اس رحمت کے غلبہ کی تکوینی صورت تو یہ ظاہر فرمائی کہ عرش پر صفت

رحمت کے ساتھ استواء فرمایا گیا اور عرش کے اوپر تختی لکھ کر رکھ دی کہ ان رحمتی سبقت غضبی کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے اور عرش کو قائم کیا پانی پر جو صورت مثالی ہے رحمت کی اس کے نیچے سو رحمتیں تھیں، ننانوے رحمتیں رکھ لیں کہ قیامت کے دن استعمال کریں گے بندوں پر اور ایک رحمت بھیج دی عالم میں جس سے بڑے اپنے چھوٹوں پر، ماں باپ اپنی اولاد پر، جانور اپنے بچوں پر رحم کھاتے ہیں تو اوپر سے لے کر نیچے تک رحمت ہی رحمت کا کارخانہ ہے۔ غضب کا نہیں، کوئی ناہنجار بدیاں کر کے اپنے لئے خواہ مخواہ غضب طلب کرے یہ اس کی ذمہ داری ہے۔ حق تعالیٰ تو رحمت ہی رحمت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم بنالیں اس رحمت کو زحمت اور ہمارا خود کا فعل ہے لن یھلك علی الله الا ھالك جو بھی ہلاک ہوگا وہ خود ہی ہلاک ہونے کا ارادہ کرے گا، تو ہلاک ہوگا۔ ورنہ اللہ نہیں چاہتے کہ کوئی ہلاک ہو۔ ذرا ذرا سے حیلوں سے مغفرت فرماتے ہیں۔ یہ ہے رحمٰن کی شان، اس لئے رحمٰن کے بندوں کی شان بھی رحم و کرم کی ہونی چاہئے۔

رحمٰن کے بندوں کی شان کیا ہونی چاہیے

وعباد الرحمن رحمٰن کے بندوں کی کیا شان ہونی چاہیے، اس میں گویا اس طرف اشارہ ہے کہ ان کی شان بھی باہم میل ملاپ میں رحمت کی ہو شفقت کی ہو، جب دو مسلمان ملیں تو شفقت سے ملیں، دو اجنبی ملیں تو ملنساری اور شفقت سے لیں، کوئی نوع ایسی باقی نہ رہے کہ جس میں شفقت و رحمت نہ ہو۔ تو رحمٰن کے بندوں کی شان کیا ہونی چاہئے؟ رحمانیت ہونی چاہئے، رحمت ہونی چاہئے اور وہ ایسی رحمت کہ ان کی چال ڈھال سے بھی ظاہر ہو، ان کے قال سے بھی ظاہر ہو، ان کے حال سے بھی ظاہر ہو، ہر چیز میں رحمت نمایاں ہو تب ہی وہ رحمت کے بندے کہلائیں گے اور اگر بندے لگیں آگ بگولا ہونے، جسے دیکھو وہ کانٹا بن کے چبھتا ہے تو وہ رحمٰن کا بندہ کیا ہوگا جیسے حضرت ابوالدرداء جلیل القدر صحابی ہیں اور دمشق کی جامع مسجد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو دیکھا آپس میں چھیڑ چھاڑ کر رہے ہیں، لڑائی بھڑائی چل رہی ہے، آوازیں سخت اور کرخت ہو گئیں۔ بہت رنج ہوا اس لئے کہ وہ تو صحابی ہیں، جلیل القدر صحابہ کا دور دیکھے ہوئے ہیں اور صحابہ کی شان یہ تھی کہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم کفر پر شدید تھے مگر آپس میں رحیم تھے وہ دور تو دیکھے ہوئے ہیں اب جو بعد کا دور دیکھا کہ لوگ لڑ رہے ہیں، جھگڑ رہے ہیں، دوسرے کی مخالف سمت میں کھڑے ہو رہے ہیں تو بڑی حیرت سے ایک جملہ فرمایا اور کتنا بلیغ جملہ تھا، فرمایا: کان الناس ورقا لا شوك فیه وصاروا شوکا لا ورق فیه کہ لوگ ہرے بھرے پتے تھے کہ جن میں کانٹا کا نشان نہیں تھا، اب ایسے کانٹے بن گئے ہیں کہ ان میں ہرے پتے کا نشان نہیں جسے دیکھوں ایک چبھتا ہے، جسے دیکھوں ایک دوسرے کو برا کہتا ہے تو لوگ کانٹے بن گئے ہرے بھرے ورق نہیں ہیں۔ اس چیز کو دفع کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے فرمایا: وعباد الرحمن کہ جب رحمت کے بندے ہو تو رحمانیت اختیار کرو اور رحم و کرم اختیار کرو۔

مومن کی رفتار

ہر قول و فعل سے تو رحمت ظاہر ہو، گھر سے باہر نکلے تو چال نظر آئے گی، تو چال میں بھی رحمت کی شان ہونی چاہئے۔ ایک تو یہ ہے کہ آدمی کھٹ کھٹ کرتا ہوا نہ چلے، جیسے کوئی جبار و قہار آ رہا ہو، فرعون آ رہا ہو، یہ نہیں بلکہ عباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھونا رحمٰن کے بندے وہ ہیں کہ زمین پر چلتے ہیں تو نرم رفتاری کے ساتھ، نہ اس میں کبر ہوتا ہے، نہ اس میں رعونت ہوتی ہے، نہ فرعونیت ہوتی ہے بلکہ تواضع للہ، خاکساری، عبدیت، بندگی یہ شان ہوتی ہے۔ جب بندگی دل میں گھر کئے ہوئے ہو تو چال میں بھی بندگی آئے گی۔ جب دل میں رچی ہوتی ہے بندگی تو قول میں بھی وہی بندگی آئے گی اور وہی تواضع اور وہی انکساری کی شان ہو گی۔ زمین پر نرم رفتاری کے ساتھ چلیں یعنی اعتدال کی چال ہو، نہ تو ہو تشدد کی چال کہ ٹھوکریں مارتے ہوئے چلیں جیسے جانور چلا کرتے ہیں۔ شیر بھیڑیئے جب چلتے ہیں تو زمین پر پیر مارتے ہوئے چلتے ہیں۔ یہ شان بندوں کی نہیں ہونی چاہئے اور نہ بالکل بیماروں کی سی چال ہو جیسے معلوم ہو کہ اب گر پڑیں گے نیچے، گردن جھکی ہوئی جیسے کوئی مریل چلا آ رہا ہو، ایسا نہیں ہونا چاہئے بلکہ واقصد فی مشیک اعتدال اور میانہ روی پیدا کرو اپنی چال میں، نہ بیماروں کی سی چال ہو، نہ متکبروں کی سی چال بلکہ نرم رفتار ہو جس میں ایک طرف تو وہ وقار ٹپکتا ہو اور ایک طرف قوت و جلالت ٹپکتی ہو، بہادری بھی رہے اس میں اور وقار بھی رہے اور تواضع بھی رہے۔ احادیث میں نبی کریم ﷺ کی چال مبارک کی تفسیر آتی ہے وہ یہ ہے کہ: کان یمشی تقلعا یعنی آپ اس طرح سے قوت سے چلتے تھے کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے زمین کھود کر نیچے اتر جائیں۔ اس قوت سے پیر پڑتا تھا اور تواضع کا یہ عالم کہ گردن نیچے ہوتی تھی، تواضع بھی حد کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ قوت و جلالت بھی حد کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ نہ ضعیفوں کی چال، نہ متکبروں کی چال بلکہ درمیانی چال جس میں تواضع بھی اور تواضع کے ساتھ وقار بھی، خودداری بھی، دونوں چیزیں ہوتی تھیں اور پسند بھی یہی کیا گیا کہ مسلمانوں کے ہر فعل میں نہ تو ضعف ہو فرمایا گیا: المومن القوی خیر من المومن الضعیف قوی مسلمان بہتر ہے ضعیف مسلمان سے، قوت ہونی چاہئے اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ اس میں کبر و رعونت ہو، اس سے بھی بچایا گیا اور ضعف سے بھی بچایا گیا، جب آپ گھوڑے پر سوار ہوتے تو آپ کی عادت یہ تھی کہ رکاب میں پیر رکھ کر سوار نہیں ہوتے تھے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی محتاجگی ہے کہ ہم چڑھ نہیں سکتے جب تک رکاب میں پیر نہ ڈالیں بلکہ اچھل کر سوار ہوتے تھے تاکہ قوت ظاہر ہو، یہ آپ کی شان تھی کہ ایک دم اوپر پہنچے اور رکاب کا سہارا نہیں لیتے تھے۔ زین نہ ہو تو ویسے جم جاتے تھے گھوڑے کے اوپر، تو آپ کی ہر چیز میں قوت بھی اور تواضع بھی، انکساری بھی، عبدیت بھی ہوتی تھی۔ فرمایا گیا کہ واقصد فی مشیک چال میں اپنی میانہ روی اختیار کرو ضعف بھی نہ ہو کہ کوئی مریل چلا آ رہا ہے، نہ کبر و رعونت ہو کوئی سمجھے کہ فرعون آ رہا ہے۔ نرم رفتاری سے چلیں گے تو دوسرے کو سلام کرنے کی بھی ہمت ہو گی کہ

کوئی انسان آرہا ہے اور کھٹاکھٹ کرتے ہوئے چلیں تو پتہ ٹ۔ جائیں گے کہ کوئی درندہ آرہا ہے جیسے سقراط کا واقعہ ہے۔

سقراط کا واقعہ

سقراط ایک بہت بڑا حکیم تھا اور گویا ایک درجہ میں طب کا موجب سمجھا جاتا ہے اور رات دن پہاڑوں میں جڑی بوٹیوں کا امتحان کرتا پھرتا تھا۔ سارا دن گھومتے گھامتے ایک دن ایک دکان پر آبیٹھا۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا اس کی آنکھ لگ گئی۔ پیر تو زمین پر رکھے ہوئے ہیں اور بیٹھا ہوا ہے دکان کے تختے پر اور نیند آگئی۔ بادشاہ وقت کی سواری نکل رہی تھی۔ نقیب و چوبدار ہٹو بچو کہتے جا رہے ہیں اور اس بیچارے کو کچھ خبر نہیں یہاں تک کہ بادشاہ کی سواری قریب آگئی تو بادشاہ کو ناگوار گزرا کہ پبلک کا ایک آدمی اور پیر پھیلائے ہوئے بیٹھا ہے۔ نہ بادشاہ کی تعظیم ہے نہ عظمت ہے، بڑا بے ادب گستاخ ہے، بادشاہ کو اتنا غصہ آیا کہ سواری سے اتر کر اس کو ایک ٹھوکر ماری زور سے، اب سقراط کی آنکھ کھلی اور آنکھ مل کر دیکھنے لگا اور بادشاہ نے کہا کہ جانتا بھی ہے کہ میں کون ہوں؟ اس نے کہا جی ہاں یہی جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کون ہیں اور اب تک اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شاید آپ جنگل کے کوئی درندے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ آپ نے ٹھوکر ماری ہے اور وہی ٹھوکر مار کر چلتے ہیں۔ بادشاہ کو اور زیادہ ناگوار گزرا اس سے کہا کہ تو جانتا نہیں کہ میں بادشاہ وقت ہوں، میرے ہاتھ میں اتنے خزانے ہیں، اتنی فوجیں ہیں، اتنے سپاہ ہیں، اتنے قلعے ہیں اور اتنے شہر ہیں میرے قابو میں، سقراط نے بڑی متانت سے کہا کہ بندہ خدا تو نے اپنی بڑائی کے لئے پیش کیا فوجوں کو ہتھیاروں کو، خزانوں کو، روپے کو، پیسے کو، ان میں سے ایک چیز بھی تیرے اندر کی تو نہیں ہے، سب باہر ہی باہر کی چیزیں ہیں۔ تیرے اندر کیا کمال ہے جس کی وجہ سے تو دعویٰ کرے کہ تو باکمال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روپے پیسے نے تجھے چھوڑ دیا بس تو ذلیل ہو گیا، اب تیری عزت ختم ہو گئی۔ تاج و تخت اتفاق سے پاس نہ ہو تو بس تو ذلیل ہو گیا، فوجیں اگر کہیں رہ جائیں تو شکار میں آگے بڑھ جائے تو ذلیل ہے اس لئے کہ فوج تو ہے ہی نہیں۔ یہ کیا عزت ہوئی کہ اندر کچھ نہیں اور بیرونی چیزوں پر مدار کار رکھے ہوئے ہے۔ تیرے اندر کیا چیز ہے۔ نہ فوجیں تیرے اندر کی ہیں نہ تاج و تخت تیرے اندر کا ہے تو اگر کمال بتلاتا ہے اور بڑائی بتلاتا ہے تو اندر کا کمال پیش کر اگر تیرے اندر واقعی کوئی کمال ہے، اب وہ بیچارہ بادشاہ بھی حیران ہوا کہ واقعی بات سچی ہے جواب نہ دے سکا، اس نے کہا کہ اگر تجھے کمال دکھلانا ہے تو ایک لنگی باندھ اور کپڑے اتار اور میں بھی لنگی باندھتا ہوں اور کپڑے اتار کر اس دریا میں کودتے ہیں اور وہاں اپنے اپنے کمالات دکھلائیں گے۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ تو باکمال ہے یا میں باکمال ہوں

تو گویا سقراط نے بتلایا کہ کمال حقیقت میں جس پر آدمی فخر کرے وہ اندرونی کمال ہے، اندر تو کمال نہ ہو اور باہر کی چیزوں پر فخر کرے، وہ ہمیشہ جدا ہونے والی چیزیں ہیں، وہ جدا ہو گئیں تو بے کمال ہو گیا، ذلیل

ہو گیا، یہ کیا کمال ہے۔

حقیقت میں کمال اپنے اندر کا ہے اور اس پر بھی فخر کی اجازت نہیں

حقیقت میں کمال وہ ہے کہ زمین کے اوپر ہو جب بھی باکمال اور زمین کے اندر نیچے دفن کر دو جب بھی باکمال رہے۔ میدان حشر میں لے جائیں جب بھی باکمال رہے اور جنتوں میں جائے جب بھی باکمال رہے۔ کمال وہ ہے جو نفس کے ساتھ قائم رہے، باہر کی چیز میں کوئی کمال نہیں، وہ جدا ہو گئیں تو بے کمال ہو گیا، تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی فخر کرے کچھ اپنے کمال پر کرے جو اندر رہے۔ اول اس پر بھی فخر کی اجازت نہیں اس لئے کہ کوئی بھی کمال ہو انسان کی ذات میں نہیں ہے، اگر ہے تو وہ اللہ کا دیا ہوا ہے، دوسرے کی دی ہوئی چیز پر کیا فخر کرے، شکر کا موقع تو ہے کہ مجھے عطا کر دی فلاں چیز لیکن فخر کرے تو اپنی ذات پر کرے، تکبر کا نعرہ بلند کرے تو کسی ذاتی کمال پر کرے اور آدمی کی غفلت میں کمال ہی کیا ہے کہ جس پر وہ فخر کرے، مادی طور پر آدمی کی ذات کو دیکھو تو وہ نجاست سے بھری ہوئی ہے کہ اس کے اندر پاخانہ، پیشاب اور دم مسفوح اور خون ہے کہ باہر نکل آئے تو کپڑا بھی ناپاک یہ تو حقیقت ہے اور اخلاقی اور جبلی طور پر دیکھو تو جہالت اور بد اخلاقی۔ یہ کیا فخر کی چیز ہے؟ کیا نجاست فخر کی چیز ہے؟ فخر ہوتا ہے کمال پر اور اس کی ذات میں ہے نہیں، اس لئے فخر کی بھی اجازت نہیں اور اگر کمال ہے تو وہ بھی اللہ کا دیا ہوا ہے۔ اس پر شکر کا موقعہ ہے لیکن بہر حال اگر کوئی فخر کرے بھی تو اپنے اندر کی چیز پر کرے۔ مثلاً علم پر، اخلاق پر، اگر اسے جھک ہی مارنا ہے تو کسی اندرونی کمال پر جھک مارے۔ اندر کچھ نہ ہو اور باہر باہر کی چیزوں پر فخر کرے تو باہر کی چیزیں اسے چھوڑ دیں گی تو بے کمال رہ جائے گا۔ تو یہ کیا کمال ہے، یہ کیا عزت ہوئی۔

تو غرض اصل چیز اندرونی کمال کو اس لئے فرمایا کہ تمہارے نفس کے اندر تواضع اور انکساری ہو اور جب تم چلو تو چال میں بھی وہی انکساری آئے، وہی بندگی آئے، اس میں نہ تکبر ہو، نہ ضعف ہو، متانت ہو، سنجیدگی ہو، وقار ہو، خودداری ہو کہ دوسرا یوں کہے کہ کوئی شائستہ انسان آرہا ہے، لفنگا آدمی نہیں ہے۔ اس کے دل میں وقعت بیٹھے۔ تو یمشون علی الارض ھونا میں ادب ہوا رفتار کا، چال ڈھال کا۔

مومن کی گفتار

قول کے بارے میں فرمایا: **واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلما** جب جاہل لوگ جہالت سے اس کے ساتھ معاملہ کریں اور باتیں کہیں اکھڑی اکھڑی بے تمیزی کی تو یہ نہیں کہ اس سے خود بھی الجھے کہ اس نے گالی دی تو تم بھی اسے گالی دینے لگو۔ اس نے اگر بد تہذیبی کی بات کی تو تم بھی بد تہذیبی کرو **واذا خاطبھم الجاھلون** جب جاہل جاہلانہ حرکتوں سے خطاب کریں تو تمہارا جواب کیا ہو **قالوا سلما** بھائی ہمارا سلام لو ہم ان باتوں کو نہیں جانتے۔ تمہیں ہی مبارک ہو یہ چیزیں، ہمیں تو اسلام نے یہ چیزیں نہیں بتلائیں کہ ہم بحث مباحثہ کریں اور گالم گلوچ اور ہم درشت کلامی سے پیش آئیں یہ تمہیں ہی مبارک ہو **قالوا سلما**

ہمارا تو سلام لو، ہم اس قماش کے آدمی نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اگر آدمی لڑے بھڑے گا اور اس نے ایک گالی دی اور آپ نے دو دیں تو گالی مٹی نہیں بلکہ تگنی ہوگئی، اس نے ایک دی تھی اور دو آپ نے دے دیں، تین گالیاں جمع ہو گئیں تو اس سے عالم میں گندگی پھیلی اور آپ نے گالی کا جواب سلام سے دیا۔ دعا سے دیا تو اس کی گالی مٹ گئی اور آپ کی دعا غالب آگئی اور عالم پاک ہو گیا جھگڑے سے، دنیا پاک نہیں ہوتی بلکہ جھگڑے کو اور برائی کو خیر سے دل دیا جائے تو دنیا پاک ہو جاتی ہے۔

غیروں کے شر کو اپنی خیر سے دفع کرو

جیسا کی قرآن کریم میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے: **ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینك و بینه عداوة کانه ولی حمیم** کہ دوسروں کے شر کو اپنی خیر سے دفع کرو گالی کا جواب گالی سے مت دو بلکہ اگر کوئی گالی دے تو تم کہو کہ بھائی صاحب آپ کیا کہہ رہے ہیں یہ مناسب نہیں جب آپ اسے بھائی صاحب کہیں گے تو خواہ مخواہ بھی شرمندہ ہوگا اور اس کی گردن جھک جائے گی کہ اگلا تو بھائی صاحب کہہ رہا ہے، میں کیسے گالیاں دوں۔ جب آپ خود ہی کہہ رہے ہیں کہ بھائی میں تو حقیر آدمی ہوں تو وہ دوسرا لڑے گا تو کس چیز پر لڑے گا اور آپ یوں کہیں کہ میں تجھ سے بڑا ہوں اور وہ کہے گا میں تجھ سے بڑا ہوں تو ضرور لاٹھی ڈنڈا چلے گا اور اگر وہ کہے کہ میں بڑا ہوں تو آپ کہیں کہ بے شک آپ بڑے ہیں، میں تو حقیر آدمی ہوں اب اس کی لڑائی کہاں چلے گی؟ کس سے لڑے گا وہ، تواضع میں لڑائی نہیں ہوتی۔ وہ بہت ہی بد طینت ہوگا جو خواہ مخواہ لڑے گا ورنہ قاعدے میں لڑائی نہیں ہوسکتی ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ **ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینك و بینه عداوة کانه ولی حمیم** کہ دوسرے کی برائی کو اپنی بھلائی سے دفع کرو، اگر دشمنی بھی ہوگی اس کے دل سے جائے گی اور دوست بن جائے گا مگر یہ بھی وضاحت فرما دی کہ "**وما یلقھا الا الذین صبروا وما یلقھا الا ذو حظ عظیم**" یہ بات وہی کر سکتا ہے جس کے اندر صبر و تحمل اور صواب و استقلال موجود ہو اور جو بڑا صاحب نصیب ہو اور جس کے قلب کے اندر قوت موجود ہو برداشت کرنے کی اور زور ذرا سی بات پر آپے سے باہر نہ نکل جائے کہ کوئی اسے گالیاں بھی دے تو سہہ جائے اور برائی بھی ہو تو سہہ جائے، کیوں سہے گا؟ اس لئے کہ اپنے کو بڑا نہیں جانتا ہے، حقیر سمجھتا ہے جب دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے تو کوئی گالیاں بھی دے، برا بھی کہے تو کوئی اثر نہیں ہوگا، تو یہ کام صاحب نصیب اور خوش نصیب کے ہیں، اس لئے فرمایا کہ جب جاہل لوگ جہالت کی گفتگو کریں، ہنسی آمیز گفتگو کریں اور سخت کلامی سے پیش آئیں تو ان سے الجھو مت بلکہ یہ کہو کہ یہ روش تمہاری ہے، ہم اس کے عادی نہیں ہیں، بس سلام کر کے وہاں سے رخصت ہو جاؤ اور ان سے ہرگز نہ الجھو۔

سلام اور اس کی قسمیں

واذا خطبھم الجاھلون قالوا سلما اس سے معلوم ہوا کہ سلام بھی کئی قسم کا ہوتا ہے۔ قرآن میں

ایک جگہ ارشادِ باری ہے: واذا حییتم بتحیة فحیوا باحسن منها او ردوها ایک سلام تو یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان ملے تو آپ کا فرض ہے کہ السلام علیکم کہیں، یہ تو سلام تحیت ہے، اور ایک سلام وداع ہے کہ جب کسی سے رخصت ہونے لگیں تو السلام علیکم کہہ کر رخصت ہوں یہ سلام تودیع اور سلام وداع اور رخصتی کا ہے، اور ایک ہے سلام امن کہ جب جاہلانہ باتیں پیش آئیں تو آپ کہیں بھائی سلام ہے، ایسی باتوں کو سلام ہے، ہم اس کے عادی نہیں ہیں، ہم تو جارہے ہیں تم لڑے جاؤ اگر تمہارا جی چاہے، یہ سلام امن ہے کہ امن پسندی کا ثبوت دے کر سلام کر کے چلے آئے تو گویا سلامتی ہے، تحیت کرو گے کسی کو سلام کے ساتھ اس کا دل پگھلے گا۔ دشمن کو بھی اگر آپ کہہ دیں گے السلام علیکم تو ایک دفعہ تو دشمنی ڈھیلی ہو جائے گی، اور اگر دوست ہو گا تو اس کا دل بڑھ ہی جائے گا۔ رخصت کے وقت سلام کر کے رخصت ہو گے تو آپ کو چھوڑ جائیں گے دلوں کے اندر اور اگر ویسے ہی منہ اٹھا کر بغیر سلام کیے چل دیئے تو لوگ کہیں گے کہ کیسا شخص ہے اسے تہذیب کا پتہ نہیں، کوئی وقار قائم نہیں رہے گا اور آنے کا سلام جو ہے اس سے محبت قائم ہوتی ہے، جانے کا سلام ہے اس سے وقعت قائم ہوتی ہے اور یہ امن پسندی کا سلام ہے اس سے لوگ سمجھتے ہیں کہ بے غرض آدمی ہے، اس کی بے غرضی کی عظمت قائم ہوتی ہے تو ہر صورت میں سلام کا نفع ہی نفع ہے اور سب سے بڑا نفع ہے اخلاقی، وہ یہ کہ اول تو یہ دعا ہے، السلام علیکم کے معنی ہیں کہ سلامتی ہو تم پر، اللہ کا نام سلام ہے، اس کے نام کی برکت تمہارے اوپر آئے۔

تو بھائی جب مسلمان دوسرے بھائی کو دعا دے گا کہ تمہیں اللہ سلامت رکھے، تجھ پر سلامتی ہو تو دوسرا پگھل جائے گا وہ جواب میں کہے گا وعلیکم السلام تم پر اللہ سلامتی نازل فرمائے۔ اب دشمنی کہاں سے ہو گی جب ایک دوسرے کو دعائیں دے رہے ہیں۔ احادیث میں فرمایا گیا ہے: البادی بالسلام بری من الکبر سلام میں جو ابتدا اور پہل کرے گا وہ تکبر سے بری ہو جائے گا، اسی واسطے شرعی مسئلہ یہی ہے کہ آپ جائیں تو ہر شخص یہی کوشش کرے کہ میں پہل کروں سلام کرنے میں، اسلئے کہ جب انتظار کرے گا کہ دوسرا سلام کرے یہ اپنی بڑائی ہے۔ گویا وہ سمجھے گا کہ میں اس درجہ کا آدمی ہوں۔ میں کیوں سلام کروں، تو بہ تو بہ اس کا فرض ہے کہ مجھے سلام کرے اس لئے شریعت نے حکم دیا کہ ہر شخص کوشش کرے کہ میں پہل کروں تاکہ وہ کبر رفع ہو جائے۔ سلام میں ابتداء کرنے والا تکبر سے بری ہو جاتا ہے، اس کے دل میں تواضع اور خاکساری پیدا ہو جاتی ہے، اسی واسطے شرعی حکم یہ ہے کہ اگر کوئی گھوڑے پر سوار ہو جائے اور دوسرے نیچے ہوں تو سوار کا فرض ہے کہ وہ سلام کرے اس لئے کہ اول تو سلام نہ کرنے میں اپنا کبر اور گھوڑے پر سوار ہے اور بھی زیادہ اس کی ناک اونچی ہو جائے گی، اس لئے اس کا فرض قرار دیا کہ وہ سلام کرے، لوگ بیٹھے ہوئے ہیں وہ سلام نہ کریں تاکہ اس کے دل میں کبر و رعونت پیدا نہ ہو۔ گویا شریعت نے ہر موقع پر توجہ دلائی ہے کہ بندگی اختیار کرو۔

مدح کرنے والے کے منہ میں مٹی ڈال دو

کوئی شخص کسی کے منہ پر تعریف کرے، شریعت نے اس سے روکا ہے، اور فرمایا ہے احثوا التراب فی وجوہ المداحین مدح کرنے والوں کے منہ پر خاک ڈال دو تاکہ ان کے دل میں کوئی تملق نہ رہے اور تمہارے دل میں کبر نہ رہے، ہاں یہ کہ مدح کرنے والا ایسا ہو کہ اس کی محبت کا صحیح اندازہ ہو چکا ہو کہ خالص مخلصانہ محبت سے کہہ رہا ہو۔ کوئی خوشامد، کوئی غرض، کوئی تعلق پیش نظر نہ ہو، جذبات محبت کے ہوں اس میں تو خیر تحمل کر لیا جائے لیکن جیسے عام طور سے مدح سرائی کرتے ہیں امیروں کے پیسے لینے کی غرض سے وہ خوشامد ہوتی ہے کوئی وقعت نہیں ہوتی، اس کا علاج یہی ہے کہ احثوا التراب فی وجوہ المداحین ان کے منہ پر خاک ڈال دو، مقصد یہ ہے کہ مدح کرنے والے کے دل میں تملق اور خوشامد نہ ہو اور اس جس کی مدح کی جارہی ہے اس کے دل میں کبر پیدا نہ ہو اگر دونوں کے قلوب بری ہیں تو گنجائش ہے کہ بھائی کر لو مدح لیکن اگر یہ نہیں ہے کہ کسی کے دل میں جھوٹ ہے تو اس کا فرض ہے کہ اس کھوٹ کو دفع کرے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ کا معمول

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ علیہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا مولانا حکیم محمد اسماعیل صاحب نے جو بمبئی میں حکیم اجمیری کے نام سے مشہور تھے۔ بہت قابل لوگوں میں تھے، اٹھانوے شعر کا برجستہ قصیدہ لکھ دیا تو جس وقت حضرت کی خدمت میں پیش کیا اور پڑھ کر سنانے کی اجازت مانگی اولا تو آپ نے اجازت نہیں دی، بہت اصرار کے بعد اجازت دی اور جب سنا کر فارغ ہوئے، انہوں نے سنا دیا حضرت نے سن لیا خاموشی سے مگر بعد میں ایک چٹکی مٹی اٹھا کر حکیم صاحب کے منہ میں ڈال دی۔ گویا حدیث کے الفاظ پر عمل کیا حالانکہ وہاں محبت کے خالص جذبات میں قصیدہ کہا اور برجستہ کہا لیکن پھر بھی حضرت نے پسند نہیں فرمایا۔ یہ ہیں صفات رحمن کے بندوں کی چال ایسی ہو۔ قول یہ ہوں، اس میں تواضع اور خاکساری ہو، کبر اور عونت نہ ہو۔

مومن کا سجود و قیام

آگے فرماتے ہیں: والذین یبیتون لربھم سجدا و قیاما اور رحمن کے بندے ایسے ہیں کہ رات بھر نماز پڑھتے پڑھتے گزار دیتے ہیں، کبھی سجدہ کرتے ہیں، کبھی قیام کرتے ہیں، پھر عبادت خداوندی میں روتے روتے پورا وقت گزار دیتے ہیں۔

دفع مضرت مقدم ہے جلب منفعت سے

یقولون ربنا اصرف عنا عذاب جھنم اے اللہ! عذاب جہنم کو ہم سے ہٹا دیجئے، ہمارے ذمہ لازم نہ ہو، یہ ہمارے سر پر نہ پڑے، گلے کا ہار نہ بن جائے۔ انھا ساءت مستقرا و مقاما یہ بدترین ٹھکانہ اور بدترین مقام ہے۔ اے اللہ! ہم کو اس سے نجات عطا فرما۔ اس میں دفع مضرت کو خصوصیت سے بیان کیا ہے، جلب منفعت یعنی نفع کمانا وہ اگلا کام ہے کہ جنت مانگو، رضا خداوندی مانگو، دیدار الٰہی طلب کرو، مگر پہلے جہنم

سے تو بچ جاؤ تو ضرر کا دفع کرنا مقدم ہے نفع کی خواہش سے، اس لئے خصوصیت سے ذکر کیا: ربنا اصرف عنا عذاب جھنم ان عذابھا کان غراما انھا ساء ت مستقرا و مقاما۔

اب گویا یہ تین حالتیں آ گئیں، ایک ملنے کی اس میں قول اور ہیئت کا ادب بتلایا ہے، چال ایسی ہو، قال ایسی ہو، اس کے بعد تنہائی میں ذکر اللہ بتایا ہے کہ توجہ الی اللہ کرتے رہو، تنہائی میں بھی فارغ مت بیٹھو۔ بیکار اپنا وقت ضائع مت کرو۔ زبان سے اللہ اللہ کہے جاؤ، سبحان اللہ کہے جاؤ، لا الہ الا اللہ کہے جاؤ۔ درود شریف پڑھتے جاؤ اور جہنم سے پناہ مانگتے رہو۔ یہ تنہائی کے کام ہیں۔ اب گویا تنہائی ختم ہوئی اب معاملات آئے، لین دین تجارت وزراعت، مالیات کا لینا دینا آگے اس کے آداب بتلاتے ہیں۔

لین دین میں اعتدال اختیار کرنا چاہئے

والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذالک قواما جب کسی کو دینے پر آؤ تو فضول خرچی مت کرو۔ اتنی سخاوت مت کرو کہ گھر کا سارا سامان ہی اٹھا کر دے دو، اور پھر کل اپنے آپ بھیک منگے بن جاؤ۔ یہ کوئی دینا نہیں، یہ تو فضول خرچی ہے اور اتنا ہاتھ بھی مت کھینچو کہ ایک پائی بھی نہ نکلے ہاتھ سے، یہ بخل ہے یہ زیبا نہیں اور فضول خرچی بھی زیبا نہیں، رحمٰن کے بندوں کو دینا بھی ہو اور روکنا بھی ہو۔ دینا ہو اعتدال کے ساتھ، روکنا ہو اعتدال کے ساتھ یعنی کسی برے مصرف میں صرف نہ ہو، حلال کی ہماری کمائی ہے اور چلی آئے حرام موقع میں کھیل تماشوں اوباشوں میں، یہ نہ ہونا چاہئے بلکہ جب کمائی اپنی نیک ہے تو نیکی کے راستے پر خرچ بھی کرو، اور اعتدال کے ساتھ کرو۔ ایسا نہیں کہ گھر بھی خالی کر دو جذبات میں آکر اور کل کو سوال کرتے پھرو۔ اسی لئے اعتدال کا راستہ بتلا دیا کہ نہ فضول خرچی اور اسراف ہو اور نہ بخل اور تقصیر ہو کہ کچھ بھی نہ نکلے بلکہ وکان بین ذالک قواما اعتدال کے ساتھ ہو۔

گویا یہ لین دین کا طریقہ اور ڈھنگ بتلایا کہ مومن کی اور رحمٰن کے بندوں کی یہ شان ہونی چاہئے کہ نہ وہ محض خراچ ہوں اور نہ محض بخیل ہوں بلکہ درمیان کا راستہ اختیار کریں کہ خرچ بھی کریں اور حسب ضرورت رکھیں بھی۔ روکیں برے مصرف سے اور خرچ کریں نیک مصرف میں۔ اس میں بھی اعتدال مد نظر رہے یہ تو ہوا بندوں کے ساتھ معاملہ، اب آگے بتلایا کہ اللہ کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہئے۔

مومن کا معاملہ خدا کے ساتھ

والذین لا یدعون مع اللہ الٰھا اٰخر رحمٰن کے بندوں کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ کے ہوتے ہوئے کسی غیر اللہ سے فریاد نہیں کرتے، نہ غیر اللہ سے بیٹا مانگتے ہیں، نہ غیر اللہ سے استغاثہ کرتے ہیں، نہ غیر اللہ کے سامنے جھکتے ہیں، نہ غیر اللہ کو حاجت روا سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام جیسی پاک مخلوق کہ ان سے زیادہ کوئی مقدس نہیں، ان سے بھی استغاثہ نہیں کرتے، ان کی عبادت بھی نہیں کرتے۔ عبادت صرف ایک ہی ذات کی کرتے ہیں۔ مانگتے ہیں تو صرف ایک ہی ذات سے، حاجت روا ایک ہی کو سمجھتے ہیں، انبیاء او

اولیاء کو حاجت روا نہیں سمجھتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جیسے ہم بندے ہیں محتاج اللہ تعالیٰ کے یہ بھی اللہ کے بندے ہیں، اللہ کے محتاج ہیں ہمیں تو وہ دے گا جو صرف اپنی ذات سے غنی ہو۔ وہ صرف اللہ کی ذات ہے تو پکارتے ہیں تو صرف اللہ کو پکارتے ہیں۔ یہ نہیں پکارنے لگے، غوث الاعظم رحمہ اللہ کو پکارنے لگے حضرت خواجہ معین الدین رحمہ اللہ اجمیری کو پکارنے لگے، حضرت صابر کلیری رحمہ اللہ کو۔ یہ ان کے راستے سے انحراف ہے کیا وہ بھی پکارتے تھے ان مشائخ کو، وہ تو اللہ کو پکارتے تھے۔ انہوں نے تو اپنے سلسلہ میں اس لئے داخل کیا تھا تم کو کہ جس طرح ہم اللہ کے سامنے جھک رہے ہیں اسی طرح تم بھی جھکو اللہ کے سامنے۔ تم نے وہ راستہ چھوڑ دیا اور ان ہی کے آگے جھکنا شروع کر دیا، انہوں نے کب کہا تھا کہ ہمارے آگے جھکو وہ تو اس سے روکتے تھے۔

انبیاء نے شرک کی تعلیم نہیں دی بلکہ توحید کی تعلیم دی ہے

قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے لئے صاف تعلیم موجود ہے، اولیاء تو ان کے بعد کے ہیں۔

وما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادالی من دون اللہ ولکن کونو ربانیین بما کنتم تعلمون الکتب وبما کنتم تدرسون.

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کسی کے لئے یہ زیبا نہیں کسی کے لئے جائز نہیں جبکہ اس بشر کو اللہ علم دے حکمت دے اور نبوت دے اور وہ یوں کہے لوگوں سے کہ کونوا عبادالی کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے پکارنے لگو، یہ کسی بشر کے لئے جائز نہیں۔ انبیاء کے لئے بھی جائز نہیں۔ انبیاء کا طبقہ سب سے زیادہ مقدس طبقہ ہے۔ جب ان کو یہ تنبیہ ہے حق تعالیٰ شانہ کی تو دوسرے کس شمار میں۔ کسی نے بھی اس قسم کی تعلیم نہیں دی کہ تم اللہ کو چھوڑ کر ہمیں پوجنے لگو، بلکہ تعلیم یہ دی کہ تم ربانی بن جاؤ اور ربانی بننے کے لئے آئے ہو۔ انسان یا آدمی کی پکار کرنے کے لئے نہیں آئے ہو، ربانی بنو۔ مگر کب بنو گے؟ جب تم کتاب اللہ کی تعلیم کرو گے، اس کے درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھو گے۔ پھر توحید معلوم ہو گی۔ پھر اللہ کے آگے جھکنے کا تمہیں علم ہو گا پھر اسی کے آگے جھکو گے کسی دوسرے کو نہیں پکارو گے۔

شرک کوئی مذہب نہیں

اگر تم نے کتاب اللہ کو چھوڑ دیا اور اس کا علم بھی حاصل نہ کیا تو جہالت کے ساتھ جس کے آگے چاہے جھک جاؤ، آگ کے آگے جھک جاؤ، نہیں جھکو گے تو خدا کے آگے نہیں جھکو گے، سب غیر کے آگے جھکیں گے یعنی شرک میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ شرک کوئی مذہب نہیں، یہ تو خدائی پھٹکار ہے اس واسطے کہ حق تعالیٰ معبود حقیقی ہیں، جب اس کے آگے نہ جھکے تو اللہ دنیا کی ہر چیز کے آگے اسے جھکواتے ہیں کہ اس کے آگے بھی ذلیل ہو، اس کے آگے بھی ذلیل ہو، اتنا ذلیل و خوار کرتے ہیں کہ آگ کے آگے وہ جھکا ہوا ہے، پانی کے آگے وہ جھکا ہوا ہے، آدمی کے آگے وہ جھکا ہوا ہے حتیٰ

کہ لوگوں نے انتہا کردی کہ شرمگاہوں کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔ سجدہ کئے ہوئے ہیں۔ تو یہ کوئی مذہب ہے؟ یہ تو پھٹکار ہے خدا کی۔

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت
بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

جب اس عزت والے کی بارگاہ کے سامنے نہ جھکے تو ایک ذرے کے آگے ناک رگڑواتے ہیں کہ اس کے آگے جھکو اس کے آگے بھی ذلیل ہو۔ کہیں تمہارے لئے عزت نہیں تو یہ شرک تو پھٹکار ہے کوئی مذہب نہیں ہے۔

اصل مذہب توحید ہے، اسی کی انبیاء نے تعلیم دی

مذہب تو توحید ہے، ایک ہی کے آگے جھکو، ایک ہی کو حاجت روا سمجھو، ایک ہی کو قاضی الحاجات سمجھو اور اس کو دافع المصیبات سمجھو، اور نیاز مانگو تو اسی سے، رزق مانگو تو اس سے، صحت مانگو تو اس سے، ایک ہی کرنے والا اس کے سوا کوئی نہیں۔ ہر ذرہ اس کے قبضہ قدرت میں ہے، اس لئے فرمایا کہ جس بشر کو ہم علم دیں اس کا یہ کام ہو کہ وہ لوگوں کو یوں کہے، کہ اللہ کو چھوڑ دو اور میرے بندے بنو، اللہ کو مت پکارو مجھے پکارا کرو، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ نہ اولیاء اللہ کا یہ کام ہے۔ انبیاء کا تو کیا ہی ہوتا۔ انبیاء اور اولیاء اس سے بری ہیں۔ یہ سب جاہلانہ حرکتیں ہیں، جب علم نہیں کہ ہمارا آقا کون ہے تو جسے چاہو آقا بنالو اور جہالت کے کرشمے ہیں کہ اس کے آگے جھک اس کے آگے جھک اس سلسلہ میں ایک شعر ہے۔ غالباً جگر مراد آبادی کا ہے اور بہت ہی اچھا شعر ہے، لفظی صنعت بھی اچھی ہے، الفاظ بھی عمدہ ہیں اور مضمون تو اچھا ہے ہی۔ شعر ہے:

سر جس پر نہ جھک جائے اسے در نہیں کہتے
اور ہر در پہ جو جھک جائے اسے سر نہیں کہتے

کیا اچھی بات کہی۔ سر وہی ہوگا جو ایک کے آگے جھکے گا اور ہر در پر جو جھکے وہ سر نہیں، وہ تو گیند ہے، ٹھوکر ماری یہاں جھک گیا ٹھوکر ماری وہاں پہنچ گیا۔ تو کیا مسلمان ٹھوکروں والی گیند بننے کے لئے آیا ہے؟ جہاں اس کو ٹھوکر دے دی وہاں جاکر گر پڑا۔ وہ تو ایک آقا کا غلام ہے اور پھر سب کے اوپر مخدوم ہے اور آقا ہے۔ ساری کائنات اس کے تحت میں ہے اور اس کے زیر حکم ہے تو بہر حال یہ ہونا چاہئے مومن کا کام کہ یبیتون لربھم سجدا وقیاما رات دن اللہ کی عبادت میں مصروف رہیں۔ اسی سے مانگنا، اسی سے فریاد کرنا۔ لا یدعون مع اللہ الٰھا اٰخر اللہ کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو معبود بنالینا، رب بنالینا یہ رحمٰن کے بندوں کا کام نہیں، یہ تو شیطان کے بندوں کا کام ہے۔ شیطان یہی کہتا ہے کہ دنیا کہ ہر چیز کے آگے جھکو اور ہر ذرے کے آگے ذلیل ہو اس لئے کہ وہ انسان کی ذلت چاہتا ہے، اللہ چاہتا ہے کہ میرے بندے عزت سے رہیں اور عزت اس میں ہے کہ مالک کے آگے جھکے۔ یہ تو تھی بحث عقائد کی، اب آگے رہے اعمال تو وہ

یہ کہ رحمٰن کے بندوں کے کام کیا ہونے چاہئیں؟

مومن کی قتل وغارت گری

فرمایا و لا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق لوگوں کے قتل وغارت سے بچتے ہیں۔ جھگڑے کرنا، گردنیں مارنا، بدامنی پیدا کرنا یہ رحمٰن کے بندوں کا کام نہیں ہے کہ بس تلوار ہاتھ میں ہے اور مارتے ہوئے چلے گئے۔ زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے۔ ذلیل کرتے ہوئے چلے گئے۔ یہ تو شیطان کے بندوں کا کام ہے۔ یہ رحمٰن کے بندوں کا کام نہیں ہے کہ قتل وغارت گری کرتے پھریں، ہاں الا بالحق خدائی حکم لے کر قتل وغارت گری کرنا، خدا کے بندوں میں ایسے نانجار پیدا ہو گئے ہیں کہ وہ اللہ کے آگے نہیں جھکتے اور جھکنے والوں کو وہ پامال کرنا چاہتے ہیں۔ اس فتنہ کو دفع کرنے کے لئے قتل کر سکتے ہیں۔ باقی انسانی، غیظ و غضب نکالنے کے لئے قتل کرنا یہ مومن کا کام نہیں، تم دنیا میں اس لئے نہیں آئے ہو کہ نفسانی غیظ کے لئے لوگوں کو قتل کرو۔ جس نفس کو اللہ نے حرام کر دیا ہے تمہیں کیا حق ہے اسے حلال کرنے کا۔

بندہ وہ ہے جو بندگی اختیار کرے

بندہ وہ ہے جو آقا کا فرمانبردار ہو اور آقا کا فرمان مانے، اگر آقا کہے کہ قتل وغارت کرو کہ بہت اچھا اور آقا کہے کہ امن سے رہو کہ بہت اچھا اگر آقا کہے کہ تخت و سلطنت پر بیٹھ کہ بہت اچھا اور اگر یوں کہے کہ غلام بن کر ٹوکرا اٹھاؤ کہ بہت اچھا۔ تو بندہ وہ ہے کہ جو آقا کا حکم ہو وہ کرے۔ ہر طرح سے اللہ کے حکم کی پابندی کرے یہی بندگی ہے، اگر وہ کہے کہ نماز پڑھو تو نماز پڑھنا بندگی ہے، وہ کہیں کہ ہرگز نماز مت پڑھو تو نماز چھوڑ دینا بندگی ہے، پھر جائز نہیں نماز پڑھنا، وہ حکم دیتے ہیں کہ پانچ وقت میں نماز پڑھو یہی عبادت ہے اور تین وقتوں میں حکم دیا گیا کہ حرام ہے نماز پڑھنا، عین طلوع کے وقت، عین غروب کے وقت، عین زوال کے وقت ان وقتوں میں پڑھو گے تو گنہگار ہو جاؤ گے۔

معلوم ہوا کہ نہ نماز کا پڑھنا عبادت ہے، نہ چھوڑنا عبادت ہے بلکہ کہنا ماننا عبادت ہے۔ ہم اگر کہیں کہ چھوڑ دو تو چھوڑنا عبادت ہے۔ رمضان آیا، حکم دیا کہ روزے رکھو، روزہ رکھنا عبادت ہے، عید کا دن آیا حکم ہوا کہ آج ہرگز روزہ مت رکھو، روزہ رکھنا بالکل جائز نہیں تو روزہ رکھنا عبادت ہے۔ معلوم ہوا کہ نہ روزہ رکھنا عبادت ہے نہ ترک روزہ عبادت ہے بلکہ کہنا ماننا عبادت ہے۔ جب ہم کہیں کہ روزہ رکھو تو روزہ رکھو اور جب ہم کہیں کہ روزہ ہرگز مت رکھو تو روزہ مت رکھو، ہم کہیں کہ لا تمش فی الارض مرحا کہ زمین پر اکڑ کر مت چلو، متکبروں کی چال مت چلو تو عبادت اور جب حکم دیں کہ خوب اکڑ کر چلو تو خوب اکڑ کر چلو جیسے طواف کے اندر جس طواف کے بعد سعی ہوتی ہے۔ ابتداء کے چار پھیروں میں احرام کی چادر نیچے ڈال کر خوب اکڑ کر چلیں، بوڑھے ہوں، بچے ہوں، جوان ہوں، خوب اینٹھ کر چلیں، مونڈھے ہلاتے ہوئے جیسے معلوم ہو کہ بڑے پہلوان ہوں جس چیز سے روکا تھا اسے وہاں واجب قرار دے دیا کہ ہمیں یہی پسند ہے

کہ خوب اکڑ کر چلو۔ جہاد کے اندر یہ حکم ہے کہ جب دشمنوں کے سامنے آؤ تو وہاں تواضع اختیار مت کرو کہ گردن جھکا کے صوفی بن کے جاؤ بلکہ خوب اینٹھ کر، اکڑ کر، آنکھیں نکال کر چلو تا کہ ان کے اوپر ہیبت پڑے وہاں وہی پسند ہے۔ تو حاصل یہ نکلا کہ آقا کی پسند پر موقوف ہے، آپ کی پسند کوئی چیز نہیں، اپنے نفسانی جذبے سے کچھ نہ کرو، وہ کہیں کہ اکڑ کر چلو تو تم کہو کہ بہت اچھا، وہ کہیں کہ جھک کر چلو تم کہو کہ بہت اچھا، تابع فرمان رہنا یہی ہے بندگی، اس لئے فرمایا کہ لا یقتلون بس وہ قتل و غارت نہیں کرتے، وہ جھگڑے نہیں اٹھاتے، وہ امن پسند ہیں الا بالحق مگر جہاں لوگ حق ہی کو پامال کرنے کے لئے کھڑے ہو جائیں پھر سر کوب بھی کیجئے پھر جوتا اٹھانا بھی شروع کیجئے اس لئے کہ بعض لوگ بات سے باز نہیں آتے ہیں بلکہ لات سے آتے ہیں۔ بات سے کتنا ہی سمجھاؤ کبھی نہیں مانیں گے جوتا اٹھاؤ تو فوراً گردن جھکا دیں گے۔

شریف الطبع آدمی اخلاق کی بات سے جھک جاتا ہے اور رذیل الطبع جب تک جوتا سر پر نہ اٹھاؤ وہ بات کو مانتا نہیں، تو پہلے شرافت سے کام لو، جب مانتا نہیں تو جوتا اٹھاؤ، اس کے سوا چارہ گاری نہیں، کیا دنیا کو بدامنی میں چھوڑ دیا جائے، بڑی اچھی بات کہی ہے کوثر نے، یہ میرٹھ کا ایک شاعر ہے اور بڑا اچھا شاعر ہے، واقعی خوب ہی بات کہی ہے:

اصحاب عمل کی دنیا میں دستور یہی ہے جینے کا
اخلاق سے جیتا کرتے ہیں احسان سے مارا کرتے ہیں

اس میں جیتنے کا دستور بتایا ہے کہ شرف آدمی وہ ہے کہ اخلاق سے دلوں کو جیت لے اور احسان کر کے دشمن کو بھی نیچا دکھا دے وہ ہے شریف الطبع اور ڈنڈے کے زور سے تو سانپ بھی رام کر لیتا ہے، جب ان کے سامنے آتا ہے تو سب کھڑے ہو جاتے ہیں تو اس کی تعظیم سے تھوڑا ہی کھڑے ہوتے ہیں بلکہ اپنی حفاظت کے لئے کھڑے ہوتے ہیں کہ کہیں کاٹ نہ لے، اگر لوگ آدمی سے بھی ایسے ہی ڈریں جیسے سانپ سے ڈرتے ہیں کہ کہیں کاٹ نہ لے، تو آدمی میں اور سانپ میں فرق ہی کیا ہے بلکہ آدمی وہ ہے شریف کہ جس کی شرافت مسلم ہو اور لوگ اس کی عصمت کی خاطر کھڑے ہوں، بھیڑیا آئے گا جب بھی آپ کھڑے ہو جائیں گے مگر اس لئے نہیں کھڑے ہوں گے کہ بھیڑیے کی تعظیم آپ کے دل میں ہے۔ نہیں بلکہ وہ موذی ہے، اس کی ایذاء سے بچنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو وہ شاعر کہتا ہے کہ اخلاق سے جیتا کرتے ہیں احسان سے مارا کرتے ہیں، اگر کسی کو مارنا ہے تو تلوار سے مارا تو کیا مارا، احسان سے مارو جو عمر بھر یاد رکھے، اور کسی کے دل کو ڈنڈے سے جیتا کہ میر ابن تو وہ کبھی بھی نہیں بنے گا۔ اخلاق سے پیش آؤ تو وہ خود ہی بندہ بن جائے گا۔ بہر حال یہ رحمٰن کے بندوں کی شان فرمائی گئی۔

نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں

اور فرمایا لا یزنون اور نہ بدکاری کرتے پھریں و من یفعل ذالک یلق اثاما اور جو یہ کام کرتے ہیں زنا،

کاری کے تو ان کا ٹھکانا اثام ہے، ایک وادی ہے جہنم کی اور اتنا شدید عذاب ہے اس میں کہ خود جہنم بھی اس عذاب سے پناہ مانگتی ہے۔ یہ ٹھکانہ ان لوگوں کا ہوگا۔ یضاعف له العذاب یوم القیمه دوگنا اور تگنا عذاب کیا جائے گا ان کا عذاب۔ ویخلد فیه مهانا اور ان کو ایک لمبی حد تک عذاب کیا جائے گا الا من تاب بچ جائے گا عذاب سے وہ جس نے توبہ کی تو یہ مایوسی سے بھی بچا دیا گیا، عمر بھر بدکاری کی مگر دل میں رجوع الی اللہ پیدا ہوا، سچے دل سے توبہ کی تو گناہ کو مٹا دیا گیا، سوائے حقوق العباد کے باقی سب چیزیں مٹا دی جائیں گے۔ جب سچی توبہ کرے آدمی تو پھر معاف کر دی جاتی ہیں اور بالفرض اگر توبہ بھی نہ کی وعمل عملا صالحا نیکی کا راستہ اختیار کیا تو فاولئك یبدل الله سیئاتهم حسنات وہ نیکیاں ہی خود ان بدیوں کو مٹا دیں گی اس لئے کہ نیکی روشنی اور نور ہے، اور بدی ظلمت ہے۔ جب چاند ہوتا ہے تو ظلمت خود ہی ختم ہو جاتی ہے۔ کسی مکان میں اندھیرا پڑا ہوا ہے چراغ جلا دو ظلمت بھاگ جائے گی۔ بھگانے کی ضرورت نہیں و کان الله غفورا رحیما اور اللہ تو غفور رحیم ہے ومن تاب و عمل صالحا فانه یتوب الی الله متابا اور جو عمل صالح اختیار کرتا ہے اللہ ہی اس کی توبہ قبول کرتا ہے، وہ تواب رحیم ہے۔ یہاں تک گویا خلوت بھی آگئی، جلوت بھی آگئی، قول بھی آگیا، عمل بھی آگیا، چال بھی آگئی، ڈھال بھی آگئی، ہر چیز میں فرمایا گیا ہے کہ رحمت اور بندگی کی شان ہونی چاہئے۔ یہ ہے رحمن کے بندوں کی علامت۔

مومن کے مقدمات وخصومات

اب آگے معاملات، مقدمات اور خصومات لڑائی جھگڑے کرنے پڑتے ہیں۔ نیک آدمی بھی اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بعض دفعہ مقدمہ بازی میں جب ایک شخص ظالمانہ طریق پر کسی کی جائداد پر قبضہ کرتا ہے تو وہ خواہ مخواہ مقدمہ لڑے گا کہ بھائی یہ میری مملوک چیز ہے، یہ خواہ مخواہ اس میں آرہا ہے استغاثہ کر کے حکومت میں جائے گا، برادری کو جمع کرے گا کہ صاحب ملک تو میری ہے اور یہ قابض ہونا چاہتا ہے تو مقدمہ بازی کی بھی نوبت آئے گی، خصومت اور جھگڑوں کی بھی نوبت آئے گی۔

اس میں فرماتے ہیں کہ دیانت کا برتاؤ کرو، جو اصلیت ہو وہ ظاہر کرو، جھوٹ مت بولو۔ جھوٹ کی اور مکر و فریب کی شہادت مت دو۔ سچی گواہی دو چاہے اس میں اپنا نقصان بھی ہو جائے۔ بعض شکلوں میں کہ صاحب یہ جو حملہ کر رہا ہے تیری جائیداد پر اتنی بات میں حق پر ہے اور اتنی بات میں غلطی پر ہے پھر اس کے دل میں بھی خیال ہوگا کہ بھائی دیانت داری سے معاملہ ہو رہا ہے تو وہ عدالت سے خود ہی ہٹ جائے گا کہ جب تم نے حق مان لیا تو جتنا مانا اتنا ہی دے دیجئے۔ تو سچے آدمی کی بات یہ ہے کہ چاہے اس میں اپنا نقصان ہو مگر جو بات حق ہے وہ کہہ دے کہ یہ میرا دشمن ہے مگر اتنی بات سچی کہہ رہا ہے اتنا واقعی اس کا حق ہے، یہ تو واجب ہے مجھ پر دینا اور میں دوں گا۔ اور باقی اتنی بات غلط ہے یہ خواہ مخواہ ہی میرے حق پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ بھی شرمندہ ہو جائے گا تو گواہی جھوٹی نہ دے۔ آدمی سچی گواہی دے۔

پر لطف واقعہ

مگر بعضی سچی گواہی بھی آدمی کو پھنسا دیتی ہے، وہ بیچارہ کوئی جامہ باف تھا، کپڑے وغیرہ بنایا کرتا تھا غریب تھا وہ متمول ہو گیا، لکھ پتی بن گیا، کپڑوں کی دکان بن گئی، اب اسے سید بننے کی سوجھی، اس نے کہا میں نیچا کیوں رہوں، سادات کے خاندان میں اس نے رشتہ بھیجا۔ اب انہوں نے تحقیق شروع کی کہ یہ ہے بھی سادات میں سے یا نہیں، اس نے کچھ فرضی گواہ جمع کر لئے کہ تمہیں ایک ہزار دوں گا، تمہیں دو ہزار دوں گا، بس گواہی دے دینا کہ میں بھی سادات میں سے ہوں۔ تو بعض لوگ جھوٹ بولنے پر تیار ہو گئے، ایک پٹھان تھا، خان صاحب۔ اس نے کہا کہ ہم دیں گے گواہی تمہارے سید ہونے کی۔ ہمیں پیسے دینے کی ضرورت نہیں، ہم گواہی دیں گے تمہاری، ان کے اوپر زیادہ اعتماد تھا اسلئے کہ وہ ڈبل آدمی تھا کہ جب یہ عدالت میں جا کر کہے گا کہ یہ سید ہے تو پھر میرے سید ہونے کو مانے گی۔ خان صاحب پر اعتماد کی وجہ سے اس نے اور گواہوں کو بھی ہٹا دیا کہ بس یہ خان صاحب ایک گواہ کافی ہے اور باقی میرے گھر والے ہیں، باقی گواہوں کو کہہ دیا کہ تمہاری ضرورت نہیں ہے خواہ مخواہ میں جھوٹی گواہی دلوا کر اتنے آدمیوں کو پھنساؤں اور ہزاروں روپیہ خرچ کروں۔ کیا ضرورت ہے۔ جب بلا خرچ دیئے سچی گواہی دینے کو تیار ہے۔ وہ عدالت میں پہنچے۔ جج نے کہا تمہارے سادات ہونے کی کیا گواہی ہے۔ اس نے کہا کہ خان صاحب گواہی دیں گے۔ خان صاحب نے کہا کہ میں گواہ ہوں اس کے سادات ہونے کا۔ جج نے کہا کہ تم کیسے گواہ ہو، خان صاحب کہنے لگے کہ یہ لوگ تو سنے سنائے کہہ رہے ہیں کہ یہ سید ہے۔ میں نے تو اسے سید بنتے ہوئے دیکھا۔ اس واسطے میری گواہی سے زیادہ کس کی گواہی معتبر ہو گی۔ یہ تھے تو اصل میں فلاں قوم کے میرے سامنے ہی تو بنے ہیں۔ میں نے تو آنکھوں سے دیکھا ہے ان کو سید بنتے ہوئے تو مجھ سے زیادہ معتبر کون گواہ ہو گا اس کے سید ہونے کے بارے میں تو اس سچی گواہی سے اس کا بیڑا غرق ہو گیا وہ سارا مقدمہ ختم ہو گیا، مزید اور مقدمہ جھوٹا قائم ہو گیا کہ خواہ مخواہ وہ سید بننے کی کوشش کر رہا ہے تو خیر گواہی تو سچی تھی مگر پھنسا دیا اس بیچارے غریب کو، کیا مصیبت پڑی تھی کہ گواہی دیں جا کر کہہ دیتے کہ میں گواہی نہیں دیتا ہوں۔

بری مجلس میں نہ بیٹھو

تو بہر حال یہ قرآن کا حکم ہے کہ شہادت زور، جھوٹی گواہی، مکر و فریب کہ یہ کام رحمٰن کے بندوں کے نہیں ہیں اور جس مجلس میں ایسی بے ہودہ گواہیاں ہوں، بے ہودہ باتیں ہوں مرّوا کراما رحمٰن کے بندوں کا کام ہے کہ وہ آنکھ نیچی کر کے گزر جائیں اس مجلس سے، وہاں کھڑے بھی نہ ہوں کہ وہاں بری باتیں ہو رہی ہیں۔ جھوٹ بکا جا رہا ہے، غیبت ہو رہی ہے، بھائی چھوڑو ان مجلسوں کو دوسری جگہ چلو، یہ شان ہونی چاہئے رحمٰن کے بندوں کی، یہ شان ہو گئی معاملات کی اب آگئے اپنی بندگی کا ثبوت ہے۔

قرآن پڑھو تدبیر کے ساتھ وہ زندگی کا دستور ہے

والذین اذا ذکروا بایات ربھم لم یخروا علیھا صما و عمیانا جب اللہ کی آیت ان کے سامنے پڑھی جائے تو غور اور تدبیر کر کے جھکے ان آیتوں کی طرف، یہ نہ سمجھے کہ بس یہ تو الفاظ ہیں ان میں معانی کچھ نہیں، زیادہ سے زیادہ بس ثواب ہی مل جائے گا۔ بھائی ثواب بھی کماؤ مگر تدبیر اور غور بھی کرو کہ میرے اللہ نے ان الفاظ میں کیا کہا ہے۔ لم یخروا علیھا صما و عمیانا اندھے اور بہرے ہو کر نہ گزرو بلکہ بینا اور شنوا ہو کر گزرو۔ حجت کے ساتھ، دلیل کے ساتھ، نورانیت کے ساتھ، معانی کو اور آیتوں کو سمجھو۔ یہ نہ ہو کہ بس الفاظ سن لے ثواب تو مل ہی گیا۔ اب اور کیا چاہئے وہ ثواب تو لفظوں کا ملا لیکن قرآن لفظ محض تو نہیں وہ تو ہدایت نامہ ہے، وہ تو زندگی کا دستور ہے۔

صرف الفاظ ہی پر قناعت نہ کرو

قرآن اس لئے نہیں آیا کہ اس کے الفاظ رٹ لیا کرو، آخر آپ کے سامنے تعزیرات ہند جب آتی ہے تو آپ یہ کہتے ہیں کہ صاحب یہ بڑی برکت کی چیز ہے۔ لہٰذا دفعہ چار پانچ کو میں نے پڑھ لیا بس کافی ہے اور مقدمہ ہاتھ میں لے لیا، نہیں بلکہ آپ بیرسٹر کی تلاش کرتے ہیں کہ اس کے معانی سمجھاؤ، کس دفعہ کے تحت میں مقدمہ لڑوں، کس دفعہ کے تحت میں استغاثہ کروں، تو قرآن میں بھی لفظوں پر قناعت نہ کرو، ثواب حاصل کر کے اس کے معانی کی طرف جاؤ کہ میرا آخرت کی نجات کا مقدمہ کون سی آیت سے حاصل ہوتا ہے، کیوں وکلاء یعنی علماء کو تلاش کرتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ سمجھائیں گے اس کا مطلب کہ اس دفعہ کا کیا مطلب ہے اور اس آیت کا کیا مطلب ہے اور یہ میرا معاملہ کون سی آیت سے متعلق ہے۔ میں اپنا معاملہ کس طرح اللہ کے سامنے رجوع کروں۔ آپ مجھے وہ حیلہ بتائیں وہ آیت بتائیں۔

علماء ربانی وکلاء دین ہیں

آپ وکلاء کو پچاس ہزار فیس دے کر لاتے ہیں تاکہ جائیداد محفوظ ہو وہ وکلاء ہیں اس تعزیرات کے جس کو تعزیرات ہند کہتے ہیں، اور علماء تعزیرات سماوی کے وکلاء ہیں۔ یہاں ایمان کی جائداد محفوظ رکھنے کے لئے ان ہی وکلاء کو تلاش کرنا پڑے گا جن کو علماء کہتے ہیں۔ یہ آسمان سے آئی ہوئی کتاب کے وکلاء ہیں، اگر آپ بیرسٹر کی عظمت کرتے ہیں، ان وکلاء دین کو بھی عظمت کرنی پڑے گی، مگر صحیح معنی میں وکلاء ربانی علماء ہیں اہل اللہ ہیں مگر آج کل بہت سے لوگ علماء کا لبادہ پہن کر آگئے ہیں۔ اندر سے جاہل ہیں اور اوپر سے لباس مولویت کا پہنے ہوئے ہیں اور جب وہ جاہلانہ باتیں کرتے ہیں تو لوگوں کے دلوں سے علماء کی عظمت نکل جاتی ہے کہ یہی ہے وہ لفنگ مولوی، دنیا بھر میں کسی کو کافر، کسی کو مشرک بتلاتا پھرتا ہے۔ بس جو زبان پر آیا کہہ دیا۔ زبان کیا قینچی ہے جو چل رہی ہے؟ اور ہدایت کے نام ایک لفظ نہیں ہے کہ کوئی تربیت کرے، کوئی ٹریننگ دے، یہ نہیں ہے، تو علماء ایسے نہیں بلکہ علماء ربانی جو علماء آخرت ہیں، اللہ سے ڈرنے والے ہیں

اور دین کی بات پہنچاتے ہیں ان کی وقعت کرنی پڑے گی اور یہ تو ہدایت سے متعلق ہے کہ خواہ مخواہ بھی وقعت کریں گے، اگر ایمان عزیز ہے تو لامحالہ وقعت کرنی پڑے گی جیسے وہاں جائداد عظیم ہے۔ اس کے بچانے کے لئے آپ وکیل کی عظمت کرتے ہیں اور فیس دیتے ہیں۔ خیر علماء تو فیس بھی نہیں مانگتے ہیں کہ جب تک فیس نہ ادا کریں کوئی مسئلہ نہیں بتائیں گے۔ ایسا نہیں بلکہ بغیر فیس کے مسائل بتانے والے ہیں، جب فیس لے کر مقدمہ لڑانے والوں کی عظمت کرتے ہیں تو جو بے فیس کے مقدمہ لڑائیں آپ ان کی عظمت کیوں نہیں کرتے۔

اولاد صالح کی دعاء، اولاد طالح سے پناہ

والذین یقولون ربنا ھب لنا الخ۔ یہاں تک معاملہ تھا ان کا جو موجود ہیں۔ لیکن شریعت نے اس بات کی بھی تعلیم دی ہے کہ آگے جو آنے والی نسل ہے اس کی ابھی سے خیر خواہی شروع کرو۔ حالانکہ وہ ابھی آئی ہی نہیں دنیا میں، مگر ابھی سے رحمت کا معاملہ کرو۔ دعائیں مانگو کہ اے اللہ! ہمیں عطا کیجئے ہماری ازواج سے وہ ذریت جو متقیوں کے لئے رہنما بنے، تقویٰ اور طہارت کو دنیا والوں کے سامنے رکھے، اے اللہ! ایسی اولاد دیجئے جو تیری رحمت کا مورد بنے اور اس کے اوپر رحمت اترے اور جب ہماری اولاد پر رحمت اترے گی تو ہمارے لئے بھی خوشی کا باعث بنے گی، تو رحمٰن کے بندوں کا فقط یہی کام نہیں ہے کہ وہ ملنے والوں پر ہی شفقت کریں بلکہ جو آئندہ آنے والے ہیں ان پر بھی ابھی سے شفقت شروع کر دیں، دعائیں مانگ کر ان کو اللہ سے طلب کریں کہ وہ ایسے نیک ہوں، ایسے صالح ہوں تاکہ وہ بھی رحمت کا محل بن جائیں۔ ان پر رحمت اترے، ہماری اولاد ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہمارے لئے وبال جان نہ ہوں۔ جیسے حدیث میں آپ نے فرمایا: اللھم انی اعوذبک من ولد یکون علی عذابا اے اللہ! ایسی اولاد سے پناہ مانگتا ہوں جو میرے اوپر عذاب بن کر مسلط ہو، جو میرے اوپر مصیبت بن جائے، نافرمان اور اوباش، گستاخ اور بیکار کہ رات دن مصیبت اٹھاؤں۔ ایسی اولاد سے میں پناہ مانگتا ہوں اس سے تو بے اولاد ہی رہے آدمی تو اچھا ہے۔ وہ مثل مشہور ہے کہ: "اولاد تو بور کے لڈو ہیں جو کھائے وہ بھی پچھتائے جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے"۔ تو بور کے لڈو وہ تو چولائی وغیرہ میں مٹھائی بھون کر دیتے ہیں تو دیکھنے میں تو وہ لڈو بہت بڑے ہوتے ہیں اور دباؤ تو وہ چھوٹے سے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان میں کچھ بھی نہیں ہوتا ہے، کھاؤ تو کچی مٹھائی کی تلخی آتی ہے، تو اسے کہا کرتے ہیں عوام کہ نافرمان اولاد بور کے لڈو ہیں دیکھنے میں اچھے معلوم ہوتے ہیں، کھانے میں کڑوے اور نہ کھائے تو آدمی پچھتاتا ہے کہ موجود ہے اور پھر بھی نہ کھایا۔ ہر صورت میں حسرت باقی رہے گی اور ایک یہ ہے کہ حقیقی شیرینی استعمال کرے گا تو مٹھاس آئے گا۔ سامنے دیکھے گا تب مٹھاس معلوم ہوگا، گو وہ ظاہر میں بری نہ معلوم ہو، اس لئے آنے والوں پر بھی رحمت اور شفقت ابھی سے مقبول ہو یہی ہوگی رحمٰن کے بندوں کی شان۔

خلاصہ کلام اور طریقہ عمل

اللہ تعالیٰ نے اس پورے رکوع میں معاشرت سکھلادی کہ تنہا ہو تو یہ کام کرو، جلوت ہو تو یہ کام کرو معاملات پڑیں تو یہ کام کرو، پورے آداب بتلائے گئے ہیں جو اصول ہیں، آدمی ان اصول پر چلے تو اس کی معاشرت ظاہر و باطن میں پاکیزہ بن جائے گی، وہی متقیوں کی زندگی ہوگی تو وہ عباد الرحمٰن ہوں گے، اس لئے میں نے یہ آیت تلاوت کی تھی کہ ترجمہ ہو جائے اور تھوڑی تھوڑی تشریح ہو جائے تاکہ عملی زندگی سامنے آئے، اتنا آپ نے سنا، اب آپ کا کام یہ ہوگا کہ جو باترجمہ قرآن شریف ہو ایک دفعہ سامنے رکھ کر ان آیات کو پھر پڑھو اور اس کا ترجمہ دیکھو اس وقت ذہن میں آوے گی جو باتیں آپ کے کان میں پڑ گئیں پھر انہیں ذہن میں جمانے کی کوشش کرو، ترجمہ پڑھو کہ کیا یہ وہی باتیں ہیں اور جب وہ جم جائیں گی تو پھر ان کو اپنی زندگی میں دستور العمل بنانے کی کوشش کرنا، جب گھر سے نکلو تو آیت سامنے ہے کہ میری چال ایسی ہو چال ایسی ہو جیسے رحمٰن کے بندوں کی ہوتی ہے، جب کسی سے بات چیت کرو تو سلام میں ابتداء کرو، جب کوئی جھگڑالو سامنے آئے تو کہو کہ سلام تو دلیع ہے کہ بھائی ہم اس کے عادی نہیں ہیں، جب خرچ کرنے پر آؤ تو اعتدال سے کرو۔ جب کوئی نفس سامنے آئے تو قتل وغارت اور زیادتی سے بچو، اور پرہیز کرو۔

اور جب سب سے نبٹ گئے تو آنے والوں کی فکر کرو جو آئندہ آرہے ہیں کہ ان پر رحم و کرم ہو، ابھی سے دعائیں مانگو ان کے لئے تو کتنی پاکیزہ زندگی ہے جو قرآن نے سکھلائی، اگر اس زندگی سے ہم محروم رہے تو کتنی بری بد قسمتی ہے، اگر آپ اس زندگی کو اختیار کرلیں اور فقط اسی ایک رکوع پر عمل کرلیں تو دنیا میں آپ کا وقار قائم ہو جائے گا۔ پوری بستی میں ایک عمل کر کے دیکھ لے، دیکھئے اس کی عزت کہاں سے کہاں تک پہنچے گی اور جب آپ اس سے ہٹ کر چلیں گے ذلت اور رسوائی کی طرف بڑھیں گے، تو سارا قرآن تو ہے ہی ہدایت، مگر میں کہتا ہوں کہ تنہا اس رکوع کو بھی آپ اپنا دستور العمل بنالیں اور اس سے جو نصیحتیں نکلتی ہیں اسے ٹانک لیں کہ ہم اور ہمارے بچے آج سے اس پر عمل کریں گے اور سارا گھر جب اس پر عامل ہو جائے گا تو دس دن کے بعد دیکھے گا کہ اس کی عزت و وقار کس درجہ پر پہنچ جائے گا۔ تو میں نے یہ چند آیتیں آپ کے سامنے تلاوت کیں اور یہ بظاہر کوئی علمی بھی مسئلہ تو تھا نہیں اور میں کہتا ہوں کہ قرآن سے جو ثابت ہو وہی علم ہے، علمی مسئلہ بھی یہی ہے، ان چیزوں پر غور کریں تو فائدہ مند ہے۔

جیسے میں نے عرض کیا کہ بات ذہن میں آگئی جو پڑھے لکھے ہیں وہ مترجم قرآن شریف سامنے رکھ کر اس رکوع کا ترجمہ پڑھیں، ہر ہر آیت کا جب ترجمہ پڑھیں گے تو وہ چیزیں ذہن میں آئیں گی جو اس وقت کان میں پڑی ہیں، وہ تازہ بتازہ ہوں گی، اب ان کو ذہن میں جمانی شروع کردیں اور جو چیزیں اس کے خلاف ہیں انہیں رفتہ رفتہ چھوڑنا شروع کردو۔ ایک دم ساری چیزیں چھوڑنا مشکل ہوتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ آدمی جب اپنی کمزوریاں محسوس کرے کہ اتنے گناہ ہیں جو میں کرتا ہوں، ان کی ایک فہرست بنا کر رکھ

لے کہ آج پہلے گناہ کو چھوڑوں گا، دس دن اس پر عمل کرے گا جب عادت پڑ گئی اور چھوٹ گیا، اب دوسرے کو لے لے دس دن اس پر چلے پھر وہ بھی چھوٹ گیا، دس دن اور چلے، دو چار مہینے میں سارے گناہ چھوٹ جائیں گے، جب آدمی کے سامنے ساری چیزیں ایک دم آتی ہیں کہ یہ بھی مت کرو، یہ بھی مت کرو، تو اس سے آدمی ڈر کر بیٹھ جاتا ہے کہ کس کس چیز کو چھوڑ دوں، میری تو ساری زندگی ملوث ہے، مایوس ہو جاتا ہے، تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ رفتہ رفتہ ایک ایک چیز کو چھوڑ دو۔ جب ایک چیز کو چھوڑ دیا اور اس پر قابو یافتہ ہو گئے اب دوسرے کو اختیار کرے، دس دن اس کی مشق میں لگاؤ اس پر بھی قابو ہو گیا تو دس دن تیسرے کی مشق پر لگاؤ، انشاء اللہ چند دن میں بہت سی برائیاں چھوٹ جائیں گی اور یہی صورت نیکیوں کی بھی ہیں۔ ایک ایک نیکی کو اپنے سامنے رکھ لو کہ آج اس پر عمل کرنا ہے اور دس دن تک برابر عمل کرو اور پھر آپ اس کے عادی ہو جائیں گے۔

چال ہی کا قصہ ہے، گھر سے نکل کر دس دن مشق کیجئے کہ یہ عمدہ چال ہے اس پر چلئے، اب یمشون علی الارض ھونا، کی مشق ہو گئی واذا خاطبھم الجاھلون کا قصہ رہ گیا، اس پر اس طرح سے عمل کیجئے کہ جہاں کہیں آوارہ گردوں کی مجلس ملے بس نگاہ نیچی کر کے وہاں سے ہٹ جاؤ، خواہ مخواہ لڑائی بھڑائی ہو تو کہو بھائی ہم اس کام کے نہیں۔ ہمارا اسلام لو، چند جگہ ہم مشق کریں گے تو دوسرے بھی سمجھ جائیں گے کہ بھائی یہ اس درجے کے نہیں ہیں۔ پھر دوسرے آپ کی عزت کریں گے، اور آپ کے سامنے برا کلمہ کہنے سے پرہیز کریں گے۔ تو اس طرح سے آپ اپنی اصلاح تو کر ہی لیں گے، مگر دوسروں کی بھی اصلاح کر دیں گے۔ تو نیکیوں میں بھی ایک ایک نیکی کو لیتے رہو اور رفتہ رفتہ اس پر چلو، اور بدیوں میں بھی ایک ایک بدی کو چھوڑتے رہو تو اس طرح سے مہینے دو مہینے میں بہت سی نیکیوں پر قابو پا جائیں گے اور بہت سی بدیاں ختم ہو جائیں گی اور زندگی پاک بن جائے گی۔

بس یہی تھا مقصد عرض کرنے کا اور فہرست شمار کرنے کا، اللہ توفیق عطا فرمائے ہمیں بھی اور آپ کو بھی کہ نیک زندگی دے جس کو قرآن کریم میں حیاتِ طیبہ کہا گیا۔ **من عمل صالحا من ذکر او انثی وھو مومن فلنحیینہ حیوۃ طیبہ** جو آدمی ایمان اور عمل صالح اختیار کرے گا ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے، جو بڑے اونچے درجے کی ہوگی دل میں لگن ہوگی، بشاش اور مطمئن رہے گا۔ دنیا بھی اور آخرت بھی اس کی بنے گی۔ دنیا میں بھی مزے اور آخرت میں بھی مزے لے گا۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین!

و اخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمینo

تصویر سازی کی مذہبی و تمدنی حیثیت

ہندوستان کے صنم پرست اور خدا کے فرضی مظاہر سے رشتہ نیاز جوڑنے والے ۳۳ کروڑ' دیوتاؤں کی رنگین تصویروں کے غلام بنے 'مغرب کے تثلیث پرست کنواری کے بت اور ابن اللہ کے مجسمے کے سامنے اوندھے ہوئے 'ایران کے مجوسی یزدان و اہرمن کے پیکروں کے سامنے رغبت و رہبت کا اظہار کرنے لگے' آتش پرستو نے آتشیں لپٹوں کے سامنے سر نیاز خم کیا ___ غرض اس راہ محسوس پسندی نے صورتوں میں الجھا کر سب ہی کو حقیقت سے بیگانہ بنا دیا۔

از حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

مہلک دستکاری

بزرگان محترم!

آج تصویر اور صورت سازی اپنے غیر معمولی شیوع کی بدولت موجودہ تمدن کا ایسا جزء لاینفک بنی ہوئی ہے کہ اس کا کوئی شعبہ اپنی رونق کو تصویر کے بغیر قائم نہیں رکھ سکتا مکان' دوکان' خطوط' کتب' رسائل' سکہ' تمغ' رقعہ' دستاویز' تلوار' ہتھیار' چھری' چمچہ' لیبل' مارکہ کوئی چیز نہ تصویر سے خالی اور نہ تصویر بغیر اس میں کوئی کشش ہی محسوس کی جاتی ہے۔ پس جاذبیت کی ساری ہی طاقتیں آج تصویر کے ایک رخ میں پنہاں ہو چکی ہیں اور تقریباً دنیا کی ہر قوم بلا استثناء اپنی پوری ہی گرویدگی و شغف کے ساتھ تصویر کی طرف پروانہ وار دوڑتی چلی جارہی ہے۔

اقوام متحدہ کے اس اجماع میں جو تصویر کے ساتھ فدائیت پر منعقد ہو چکا ہے ہم تصویر کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بلاشبہ اس اجماع کے خلاف ہم ایک ایسے نظریہ کے ماتحت تصویر کو دیکھ رہے ہیں کہ اس کے ہوتے ہوئے تصویر نہ صرف بدترین منکر ہی دکھلائی دیتی ہے جس معروف کی لائن سے کوئی مناسبت نہیں بلکہ ایسی مہلک اور مخرب دستکاری نظر آتی ہے جسے ایک مسلم کی مسلمانہ ذہنیت تبدیل کر دینے میں کافی مداخلت

حاصل ہے۔

صورت محض وسیلۂ تعارف ہے

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہر صورت اپنی حقیقت کا ظہور اور اس کے لئے تعارف کا ایک ذریعہ ہے۔ دنیائے صور و اشکال میں کوئی حقیقت بغیر صورت کے شناسا نہیں ہو سکتی۔ پس صورت ایک درمیانی خادم ہے جس کا منصبی فرض صرف حقیقت تک پہنچا دینا ہے اور بس۔

زید اور عمر کی صورتیں حیوانات اور نباتات کی ہیئتیں صرف اس قدر اہمیت رکھتی ہیں کہ دنیا کو اپنے باطنی حقائق سے شناسا بنادیں۔ جس کے صاف معنی یہ نکل آتے ہیں کہ کوئی صورت بلا حقیقت یا بلا ترجمانی، حقیقت درخور التفات ہی نہیں کہ صورت محض نہ بذاتہ مقصود ہے اور نہ مقصودیت کی شان رکھتی ہے۔

اس اصول پر یہ اندازہ لگالینا مشکل نہیں کہ مقصود واقعی صرف حقیقت ہے صورت نہیں۔ صورت وسائل تعارف میں سے ایک وسیلہ ہے' اگر بالفرض ہم بلا صورت ہی کسی حقیقت پہنچانے پر قادر ہو جائیں تو شاید پھر صورت کی طرف التفات بھی ہم پر شاق گزرنے لگے اور ہم اسے اضاعت وقت سمجھنے لگیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ صورتوں کی طرف توجہ کرنا فی الواقع حقیقت پر براہ راست قدرت نہ پاسکنے کا ثمرہ اور ہمارے قصور ادراک کا نتیجہ ہے۔ مثلاً ہم تاج محل آگرہ کا اصلی نقشہ آنکھوں میں رکھنے کے لئے اس کی تصویر سامنے رکھ لیتے ہیں لیکن اگر کسی ذریعے سے ہم خود تاج محل کو یہاں اٹھا کر لاسکتے ہیں یا ہمہ اوقات ہر جگہ سے اسے دیکھتے رہنے کی قدرت رکھتے تو شاید ہمارا دھیان اس کاغذی تاج محل کی طرف کبھی بھی منعطف نہ ہوتا۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف ہے کہ صورت وہیئت سامنے رکھنا اصل کی یاد آوری کا ایک ذریعہ اور ساتھ ہی صورت بین کے قصور ادراک کا ثمرہ ہے کہ وہ براہ راست اصل حقیقت کو نہیں دیکھ سکتا۔ پس جب کہ ایک ایسی صورت بھی جو کسی واقعی حقیقت کا عنوان یا ترجمان بھی بنی ہوئی ہے۔ واسطۂ محض سے زائد کوئی درجہ نہیں رکھتی تو وہ تصویر جو صورت ہی صورت کی ترجمانی کر رہی ہو اور حقیقت سے اسے کوئی بھی واسطہ نہ ہو یا تصویر ہی فرضی ہو جس کے نیچے کسی واقعی صورت کا بھی وجود نہ ہونا ظاہر ہے کہ بے اصل محض' بے وزن محض اور بے التفات محض ہونی چاہئے کہ وہ حقیقت کے بجائے باطل اور بے بنیاد شے یا لاشے محض کی ترجمانی کر رہی ہے۔ پھر بھی اگر ایسی بے بنیاد اور باطل صورتوں کو مرکز توجہ بنالیا جائے تو یہ مقصود سے اعتراض اور وسائل میں شغف کے سوا کونسے لفظ سے تعبیر کیا جائے گا اور کون نہیں جانتا کہ مقصود کے ہوتے ہوئے وسائل محض میں انہماک و شغف رکھنا یا بالفاظ دیگر اپنے قصور ادراک اور عجز تصور کو باوجود ازالہ کی قدرت کے پالتے رہنا دانائی کے بجائے انتہائی سادہ لوحی بلکہ اس سے بھی آگے ہی کا درجہ ہے۔

شرک فی المقصود

بس اسی قلب موضوع سے کہ وسائل مقصود کا درجہ حاصل کرلیں اور خود مقصود غیر اہم ہو جائے۔ شرک فی المقصود کی بنیاد پڑتی ہے جس کی ذمہ داری تنہا تصویر پر عائد ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب قلب جو باطن اور غیبی امور میں منہمک ہو کر ذوقی مشاہدوں کا شائق بنایا گیا ہو۔ تصویر آرائی کے ذریعے گرفتار صورت بنادیا جائے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے اور کیا نکل سکتا ہے کہ وہ اپنی جمعیت کھو کر کچھ باطن کا ہو رہے اور کچھ ظاہر کا ہو رہے۔ کچھ حقیقت کی طرف مائل ہو اور کچھ صورت کی طرف گویا اپنی اصل جبلت سے توجہات

اور حقائق کی طرف جھکے اور ان غیر جبلی قواسر سے ظاہری نمود اور صورت و اشکال کی طرف مائل ہو اور اس طرح توحید مطلب کے بجائے تعدد مطالب کا مجرم ہو جائے جو شرک کی حقیقت ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ مقصود کے مقصود باقی رہتے ہوئے شرک فی المقصود سے نہ بچنا عقل کی گمراہی اور فہم سلیم کا خون اپنی گردن پر لینا ہے۔ ہاں جس درجہ کا مقصود ہوگا اسی درجہ غیر مقصود کا اس میں ساجھا قائم کرنا خلاف فطرت اور جرم ہوگا۔

تصویر پرستی

یہاں پہنچ کر دنیا کی قوموں کے دو راستے ہو گئے۔ ایک طبقہ نے جو تلاش معبود میں سرگرداں اور تعارف غیب کا دلدادہ تھا اپنی خوگر محسوس ذہنیت سے مغلوب ہو کر تصویر کو خدائے برتر وتوانا کے تعارف کا ذریعہ قرار دیا اور معرفت رب کے لئے ابتداءً تصویر کو مرکز تصور بنایا۔ لیکن عادت جاریہ کے موافق انسان کی خوگری احساس اور مغلوبیت عقل و معرفت نے پہلے تصویر کو اس کا ساجھی بنایا اور پھر رفتہ رفتہ تصویر میں مقصودیت اور معبودیت کی شان پیدا کر دی۔ وہ تمام افعال عبودیت' رکوع و سجود' نذر و نیاز' بھینٹ اور قربانی وغیرہ جو اس بے چون و بے چگون ذات کے لئے ہوتے

اب اس کی نام زد صورتوں اور فرضی مجسموں کے لئے ہونے لگے۔ کل تک جو حظ و کیف اس کے نام اور اسی کے لطیف دھیان سے روح میں پیدا کیا جاتا تھا۔ آج اس کی فرضی صورتوں سے حاصل کیا جانے لگا۔

دنیا کی سب سے پہلی بت پرست قوم (امت نوح) جس نے پانچ مردان حق (ود۔ سوع۔ **یغوث**۔ یعوق۔ نسر) کی تصویروں کی ذریعہ خدا شناسی بنا کر اپنے معبدوں میں نصب کیا' آخر کار انہی مجسموں نے اس خوگر محسوس قوم کی ذہنیت پر فتح حاصل کر لی اور ایک لطیف و خبیر خدا کی جگہ پانچ کثیف الاجسام معبود جم گئے اور ایسے جمے کہ پھر مستقلاً انہی سے استمداد کی جانے لگی۔ وہی اولاد دہندہ شمار ہوئے' وہی ابر و باراں کے مالک ٹھہر گئے اور انہی کی سنگین صورتوں سے ہر ایک مراد مانگی جانے لگی جس کا ثمرہ یہ نکلا کہ قوم حقیقت الحقائق تک تو کیا پہنچتی' عام حقیقتوں سے بھی محروم ہو کر محض صورت پرستی کے جال میں پھنس گئی اور اس کی ذہنیت غائر ہونے کے بجائے اس درجہ سطحی ہو کر رہ گئی کہ نوح علیہ السلام کے ساڑھے نو سو سالہ وعظ و پند سے سوائے چند روزہ ظاہرداری کے کوئی ایک عبرت اور کوئی ایک انجام بینی بھی ان کے دل و دماغ تک نہ پہنچ سکی۔ پھر نہ صرف قوم نوح بلکہ ہر تصویر کی پجاری قوم جو قوم نوح کے نقش قدم پر گامزن ہوئی اسی سطح پرستی کا شکار ہوئی۔

ہندوستان کے صنم پرست اور خدا کے فرضی مظاہرے سے رشتۂ نیاز جوڑنے والے **تینتیس (۳۳)** کروڑ دیوتاؤں کی رنگین تصویروں کے غلام بنے۔ مغرب کے تثلیث پرست کنواری کے بت اور ابن اللہ کے مجسمے کے سامنے اوندھے ہوئے۔ ایران کے مجوسی یزداں واہرمن کے پیکروں کے سامنے رغبت و رہبت کا اظہار کرنے لگے۔ آتش پرستوں نے آتشی لپٹوں کے سامنے سر نیاز خم کیا۔ غرض اس راہ محسوس پسندی نے صورتوں میں الجھا کر سب ہی کو حقیقت سے بیگانہ بنا دیا اور خالص شرک کے راستہ پر لا کھڑا کیا جس سے یہ اشرف المخلوقات اپنی توحید مطلب کو یکسر فنا کر بیٹھا اور قلبی پراگندگی و تشتت کے مہلک جال میں پھنس کر اپنی طمانیت و بشاشت خاک میں ملا دی۔

تصویر بازی

دوسری قوم کو اپنی تصویر بازی اور صورت پسندی کے ذریعے خدا کی تلاش نہ تھی اور نہ انہوں نے تصاویر سے مظاہر غیب کی جستجو شروع کی۔ تاہم تمدن و معاشرت کے سلسلہ میں ساری کائنات کو اس کی تصاویر کے ذریعہ پہنچانے کے جذبہ نے ان کو بھی اصل سے ہٹا کر نقل پسندی اور پھر خالص صورت پرستی یا حقیقت سے بے تعلقی میں الجھادیا۔ یہ قوم پہلے سے بہت ادنی اور ذلیل مرتبہ پر آکر رکی۔ پہلی قوم نے اگر صورتوں اور مجسموں کو قبلۂ استقبال بنایا تو خدا شناسی کے لئے گویا حقیقت رسی کم از کم جذبات میں تو مرکوز تھی۔ گویا تلاش حقیقت ہی کے سلسلہ میں صورتوں کے ساتھ انہیں شغف پیدا ہوا۔ لیکن دوسری قوم کی تصویر بازیوں میں ابتداء ہی سے حقیقت بینی کا کوئی جذبہ بھی دستیاب نہیں۔ اس کے تصویری جذبات صرف تزئین و آرائش یا نمائش و زیباش ہی تک محدود ہیں۔ جس کا تعلق صورت در صورت ہی سے ہے اور بس___

یعنی اس قوم کے یہاں تصویروں سے کسی مستور اور غیبی حقیقت کا ظہور تو کیا مطلوب ہوتا اس مشاہد کائنات کی بھی صرف صورتوں ہی سے شناسا ہونا منتہائے مقصود ہے۔

اور ظاہر ہے کہ کائنات کی حقیقت و صورت میں صورت کا درجہ خود فانی اور عارضی تھا اور جب کہ فانی کا بھی فانی درجہ یعنی تصویر کو منتہائے مقصود بنادیا جائے تو ایسی قوم صرف واقعیت ہی سے دور نہیں ہوگی بلکہ باطل سے باطل اور بے حقیقت بنیاد پر کھڑی ہو کر اپنے وزن اور طاقت اور اپنی جڑوں کو اپنے ہی ہاتھوں سے کمزور کردینے کی مرتکب ٹھہرے گی۔

یورپ کی تمدن پرست قومیں اسی باطل سازی اور تصویر بازی کی لعنت میں سب سے زیادہ گرفتار ہوئیں۔ ان اقوام کو اس بنیاد و صورت پرستی اور نمائش پسندی نے اس درجہ سطحی اور بے بنیاد قوم بنایا کہ آج وہ کسی حقیقت تک تو کیا پہنچتی اپنی مصنوعی صورتوں کے سامنے قدرتی صورت کے ساتھ پورا شغف قائم نہ رکھ سکیں کہ ان میں کچھ نہ کچھ تو واقعیت کی شان ضرور تھی' ان کی ذہنیت اور جذبات کا بہت بڑا حصہ اپنی ہی خود ساختہ صورتوں کے ساتھ وابستہ ہوگیا۔ تصویروں کی ساخت و پرداخت اور خریداری پر لاکھوں روپیہ صرف کرنا تصویریں سامنے رکھ کر عالم خیال میں ان سے باتیں کرنا' عشق و محبت کے جذبات کاغذ کے رنگین عکوس پر نچھاور کرنا ان کا شعار ہو گیا۔

سطح پرستی کی انتہاء

آج عریاں تصویروں کو سامنے رکھ شہوانی جذبات اسی طرح مشتعل کئے جاتے ہیں جس طرح کسی اصل صورت کے سامنے ہوسکتے ہیں۔ بڑی بڑی شخصیتوں کے مجسمے صرف بازاروں ہی کے چوک میں نصب نہیں بلکہ دلوں کی گہرائیوں میں اس درجہ گھس چکے ہیں کہ ان کی کسی ادنیٰ توہین پر اسی طرح ازالہ حیثیت کے مقدمات چلائے جاتے ہیں جس طرح اصل شخصیت کے بارہ میں مقدمہ چل سکتا ہے۔

آخر لارنس کے بت کا مقدمہ دنیا کی نظروں سے او جھل نہیں ہوا ہے' وکٹوریہ کے بت کی توہین پر تحقیقاتی پولیس کا مقرر کیا جانا اس دور صورت پرستی کی تاریخ میں محفوظ ہے' حالانکہ اصل کا آج کوئی پتہ نشان بھی نہیں' یہ تمام معاملات صرف مصنوعی پیکروں کے ساتھ اسی شدومد سے کئے جارہے ہیں جس طرح قدرتی مجسموں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بعض نایاب اور پرانے تصویری شاہکاروں کی قیمتیں اس مقدار میں اٹھ جاتی ہیں کہ شاید اس مصور کو اگر نیلام کیا جاتا تو اس کے عشر عشیر بھی دام نہ اٹھ سکتے۔ حتیٰ کہ ان تصویری جذبات نے فلم سازی کا ایک مستقل فن ہی پیدا کردیا ہے جس کے لئے خزانوں کا ایک مستقل حصہ وقف ہے۔ ایک

ایک فلم پر ہزار ہا روپیہ کی لاگت ہے، فلم سازوں کی بیش قرار تنخواہیں اور سینما کی قیمتی عمارتیں، باب تمدن کا ایک نہایت ہی شاندار اور خوشگوار اضافہ سمجھی گئیں، آدمیوں سے وہ اثر نہیں لیا جاتا جو سینما کی محرک تصویروں سے لیا جا رہا ہے۔

نمائش و سطح پرستی کی یہ وہ انتہائی حد ہے کہ آج کا انسان گویا خود بھی اپنے نزدیک اس لئے باطل محض ہو گیا کہ اس کے شغل کے لئے خود اس کی قدرتی شکل بھی کافی نہ رہی جب تک کہ اس صورت کی بھی خود ساختہ صورت اس کے سامنے موجود نہ ہو۔

غرض حب و بغض، نفرت و رغبت، عشق و محبت اور خرید و فروخت کے تمام وہ معاملات جو ایک سطح پسند انسان، انسان کی اصلی اور قدرتی صورت سے قائم کرتا، آج اس سطح کی بھی نقلی اور فرضی سطح و صورت کے ساتھ جوڑتا جا رہا ہے، کیا یہ صورت پسندی کی انتہا نہیں ہے؟ اور جب ایسا ہے تو کیا یہ حقیقت سے بے خبری اور بے گانگی کی بھی انتہا نہیں ہے؟ اور پھر ایسی قوم کے حق میں جو حقائق سے بے گانہ محض بن کر محض صورتوں اور صورتوں کی بھی نقالی میں الجھ کر رہ جائے، عقل و دانش کیا فیصلہ کرے گی۔؟

صورت پسندی کی آخری منزل

بہر حال قوموں کے ان دونوں طبقات میں تصویر نے اپنی طبعی رفتار کے ماتحت اصل کو پردۂ نسیان میں چھپا کر زبردستی اس کی جگہ سنبھال لی۔ اور اس طرح دونوں جگہ اس نے توحید مطلب کی جڑیں اکھاڑ کر شرک کی بنیادوں کو مستحکم کر دیا۔ متدین اقوام میں شرک عبادت پیدا کر دیا اور متمدن اقوام میں شرک عادت۔ پھر یہ شرک بھی اس تصویر پسندی کا درجہ اول ہے۔ صورت پسندی کی آخری منزل یہ ہے کہ بلا شرکت غیرے صورتیں ہی حقائق کی جگہ سنبھال کر بالا ستقلال خود ہی مقصودیت کی شان پیدا کر لیں۔ چنانچہ مذہبی اقوام کے سامنے اصنام ہی مستقل حاجت روا بن کر قبلۂ قلوب ہو گئے اور تمدنی قوموں کے سامنے فوٹو اور تصویریں ہی مستقل محبوب و مطلوب بن گئے۔

آج کوئی ڈیزائن اور نمونہ مقبول نہیں جس میں تصویر کو دخل نہ ہو، کوئی رسالہ جاذب نظر نہیں جب تک تصاویر اور خصوصاً عریاں تصاویر سے مزین نہ ہو، گویا ادبی رسالوں کی جان اب بجائے علو مضامین کے رنگینی تصاویر قرار پا گئی ہے۔ علم میں طاقت نہیں کہ لوگوں کی جیبوں سے پیسے گھسیٹ سکے، مگر تصویر اپنی خالص محبوبیت کی بناء پر یہ جذب و کشش ضرور رکھتی ہے کہ تجارتوں کو فروغ دے سکے، دوکانوں کی رونق بڑھائے اور لوگوں کا وقت اپنے اوراق کے لئے خرید سکے۔

خزائن مخفیہ سے محرومی

خلاصہ یہ نکلا کہ تصویر بالخاصہ حق پسندی سے ہٹا کر بہ سہولت باطل پسندی کی ذہنیت پر لے آتی ہے، واقعی جذبات کو بے ثمرہ بناتے ہوئے انجام کار عاقبت کی بہرہ مندیوں کو ملیامیٹ کر دیتی ہے، پس کہاں تو انسان کہ غیب سے نکل کر عالم شہود میں اس لئے آیا تھا کہ ہر حسی شاہد سے کنارہ کش ہو کر غیب کی قلبی مشاہدوں میں مصروف ہو۔ ہر صورت سے اعراض کر کے حقیقت کی طرف جائے اور ہر باطل سے نگاہ ہٹا کر حق کی طرف دوڑے تاکہ اس کا لگاؤ فانی کے بجائے باقی سے ہو اور اس طرح وہ خود بھی باقی بن جائے اور اسے اپنی اصل سے وابستگی رہے ــــ اور کہاں ان تصاویر کی بدولت اس کج راہی میں گرفتار ہوا کہ غیب کے ہر مرتبہ سے کنارہ

ش ہو کر اس نے محسوسات ہی کو اپنا قبلۂ نظر بنالیا۔ مخفیات کے ہر خزانہ سے محروم ہو کر حسیات ہی کو منظور نظر کرلیا اور روحانیت کے تمام لذیذ مشاغل سے بے پرواہ ہو کر مادیات کی کثافتوں میں دھنستے رہنا ہی اپنا سب سے زیادہ لذیذ مشغلہ قرار دے لیا۔ یہاں تک کہ جب باقیات صالحات سے اعراض کر کے فانی چیزوں میں جا پھنسا تو اپنی اصل سے منقطع ہو کر خود بھی بے اصل بن گیا۔

شناسان حقیقت کا تصویر سے معاملہ

اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر اگر بارگاہ حق کے حقیقت شناس اور ان کے حقیقت رس قلوب صورتوں سے بے لگاؤ اور تصویروں سے متنفر ہوں تو کون سی جائے تعجب ہے؟

ملائکہ جیسے حقیقت شناسان بارگاہ حق تصویروں کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں؟

لاتدخل الملائکۃ بیتا فیہ کلب ولاتصاویر (بخاری و مسلم)

"جس گھر میں کتا اور تصاویر ہوں اس میں ملائکہ داخل نہیں ہوتے"۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جیسے حقیقت شناس بارگاہ قدس کا ان رسوم و نقوش کے ساتھ کیا برتاؤ تھا؟

ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لم یکن یترک فی بیتہ شیئا فیہ تصالیب الانقضہ ۔ (رواہ البخاری)

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کوئی ایسی شے جس میں تصویر ہو بلا توڑے نہیں چھوڑتے تھے"۔

تصویر سازی کا اخروی انجام

حق تعالیٰ شانہ تصویر سازوں کے ساتھ یوم آخر میں کیا طریق عمل اختیار فرمائیں گے؟

اشد الناس عذابا یوم القیامۃ الذین یضاھون بخلق اللّٰہ (وفی روایۃ) المصورون (بخاری و مسلم)

"یوم قیامت میں سب سے زیادہ سخت عذاب میں وہ لوگ ہوں گے جو خدا کی شان تخلیق میں اپنے کو اس جیسا بنانا چاہتے تھے (یعنی مصورین)"۔

یہ تو صورتوں کی تصویروں کے متعلق ارشادات شریعت تھے، لیکن حقائق کی تصویریں خود ہماری صورتیں ہیں، ان کے متعلق بھی منشاء حق یہ ہے کہ ہم انہیں مستقلاً مرکز التفات نہ بنادیں۔

ان اللّٰہ لاینظر الی صورکم ولکن ینظرالی قلوبکم ونیاتکم (الحدیث)

"اللہ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا، لیکن وہ تمہارے دلوں اور نیتوں کو دیکھتا ہے (جو تم میں غیب کی چیزیں ہیں)"۔

اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انسان کا بلا شرکت غیرے اصل وجود اور اپنی حسی کائنات کی اصل اصول کے فکر و دھیان میں رہنا جب ہی ممکن تھا کہ صورتوں سے اپنی حسی آنکھ بند کر کے فہم و فراست اور

قلب کی آنکھ کھولے تاکہ غیبی وجود اور مخفی اسرار اس کے مشاہدے میں آسکیں۔

حقیقت الحقائق کی جستجو

پس اسلامی تعلیمات کا خلاصہ یہ نکلا کہ صورتوں کی تصویریں تو بالکلیہ ناقابل التفات اور تشتت کی جڑیں ہیں ___ رہیں قدرتی صورتیں سو گو کچھ نہ کچھ عارضی واقعیت رکھتی ہیں لیکن پھر بھی تم کائنات کی اس حسی اور صوری خوشنمائی سے یکسو ہو کر اس کی حقیقی خوبی کو توجہات کا مرکز بناؤ۔ بلکہ پھر ان حقائق سے بھی قطع نظر کر کے اس حقیقت الحقائق تک پہنچنے کی سعی کرو جو تمام کمالات و جمالات کا سرمنشاء اور حقیقی خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے شہود سے ہٹا کر غیوب کی طرف انسان کو بڑھانا چاہا ہے' اجسام سے ہٹا کر حقائق کی طرف اور بالآخر مخلوقاتی حقائق سے بھی ہٹا کر حقائق الٰہیہ کی طرف لانا چاہا ہے۔ جن کا مشاہدہ بجز صورتوں سے قطع تعلق کئے ہوئے دشوار و ناممکن تھا۔

پس کہاں اسلام کی یہ حقیقت رسانی اور حق نمائی کہ بطون در بطون اور غیب در غیب کی طرف بڑھا کر انسان کو حقیقت سے ہم کنار کر دیا اور کہاں انسانی تخیل کی یہ کج راہی کہ نمائش و زیبائش اور نمود در نمود کی طرف دھکیل کر انسان کو حق اور حقیقت سے بعید و بے گانہ محض کر دیا' حقیقۃ الحقائق سے جدا کر کے جزوی حقائق پر اور ان سے بھی بے بہرہ بنا کر صور و اشکال پر اور پھر ان سے بھی ہٹا کر تصویری خدوخال پر لا کھڑا کیا' پس وہاں اگر اصل الاصول تک پہنچ جانے کی وجہ سے توحید در توحید حاصل ہوتی تھی تو یہاں غیر حق کی طرف بڑھتے چلے جانے سے شرک در شرک پیدا ہو گیا' اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ تصویر اشراک کی جڑ ہے اور صورت پسندیاں انسان کی توحید کو بجائے خود کبھی باقی نہیں چھوڑ سکتیں تو یہ ایک بجا اور مطابق واقعات دعویٰ ہو گا۔

توحید پسند کا تصاویر سے تنفر

اس لئے اگر توحید پسند طبقہ مطلقاً تصویر کا دشمن اور اس سے متنفر ہو تو یہ اس کا ایک قدرتی جذبہ اور فطری حق ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام جیسے کامل موحدین نے انسان کو انہماک صور و اشکال سے دور' دور رکھنا ہی اپنے مسلک کا ایک جلی اور روشن نشان قرار دیا ہے اور انہوں نے :

(۱) تصویر ذی روح کو حرام قرار دیا۔
(۲) ملائکہ کی نفرت اس سے ظاہر کی۔
(۳) خود اپنا بغض اس سے بتلایا۔
(۴) تصویر سازی اور مصور پر لعنت کی۔
(۵) تصویر بنا دیئے جانے پر اس کے مٹا دینے کی تعلیم دی۔

فاروق اعظمؓ نے شجرۃ الرضوان جیسے متبرک شجرہ کو کٹوا دیا کہ کہیں اس سے صورت پرستی کی بنیاد نہ پڑ جائے۔ مطاف مقدس میں حجر اسود کو یہ جتلا کر چوما کہ :

> ''میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جس کے قبضہ میں نہ نفع ہے نہ ضرر۔ اگر میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے چومتے ہوئے نہ دیکھتا تو تجھے ہرگز نہ چومتا''۔

تاکہ حجر پرستی کی اساس نہ قائم ہوجائے اور اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبور انبیاء کو سجدہ گاہ بنانے والوں پر لعنت کی کہ مبادا اس ذریعہ سے اس مہلک صورت پرستی یا صنم پرستی کی بنیاد نہ قائم ہوجائے اور اس طرح ایک مسلم حنیف حقیقت سے دور نہ جا پڑے۔

حقیقت پسندانہ ذہنیت

پس اسی لئے حقیقت شناسان باطن نے تصویر پسندوں اور صورت دوستوں کو ایسے مظان سے بھی بچانے کی سعی کی ہے جہاں ان کے گرفتار صورت ہوکر بعید از حقیقت ہوجانے کا ذرا سا بھی خطرہ تھا۔

سالک ابتدائے سیر الی اللہ میں جو کہ حقائق کو مختلف باطن صور واشکال کے جامہ میں مشاہدہ کرتا ہے جو خود بھی ایک حد تک غیبی ہی چیزیں ہیں اور ان کا مشاہدہ بھی غیب ہی میں ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس کا راہنما اور مربی اسے ان صورتوں سے بے التفات بنانے کی سعی کرتا ہے کہ کہیں ان نقوش کی رنگینیوں میں پھنس کر اصل حقیقت سے بے گانہ نہ رہ جائے

کہ توطفلی وخانہ رنگین است

غرض صورت پسندی، تصویر دوستی، تصویر سازی، تصویر بازی اسلامی مقاصد کے منافی اور اس کے بنیادی مقصد، رجوع الی الغیب یا سیر الی اللہ کی راہ میں ایک عظیم الشان رکاوٹ ہے۔ اس لئے کم از کم مسلم قوم کو اپنی حقیقت پسندانہ ذہنیت کو چھوڑ کر صورت پرستانہ جذبات پیدا کرلینا بلاشبہ قلب ماہیت اور قلب موضوع ہے۔

حق تعالی توفیق دے کہ ہم صحیح اسلامی جذبات کا احترام کریں اور کم سے کم ایسی پگڈنڈیوں سے کترا کر چلنے کی سعی کریں جو اسلامی شاہراہ سے دور بھٹک رہی ہوں اور منزل مقصود کو بعید سے بعید تر بنانے میں جادو کا اثر رکھتی ہوں۔

وباللہ التوفیق

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اَلْواعِظ

اگر انسان آفاق و انفس اور اس مادی عالَم پر نظر ڈالے' اس کے حوادث و واقعات کو امعان کی نظر سے دیکھے۔ عقل و بصیرت' تدبّر اور تفکّر سے کام لے تو یہ چیز اس کے لئے بڑے سے بڑے واعظ اور مقرّر کا کام دے گی اور انسان ہر وقت وعظ کہہ سکتا ہے اور اس سے پند و نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرّہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ــــــ اَمَّا بَعْدُ ــــــ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۔ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۔ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۔ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝
صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۔

فائدہ صِرف عمل سے ہوتا ہے

بزرگانِ محترم!

آج بعض ضروری کام کی وجہ سے وعظ کرنے کا ارادہ نہیں تھا مگر چونکہ مؤذّن صاحب نے اعلان کر دیا اس لئے مؤذّن صاحب کے اور دوسرے حضرات کے اس جذبہ اور شوق کے پیشِ نظر کہ آپ لوگوں کو وعظ سننے کا شوق ہے اور اس خیال سے آپ لوگ جمع ہو گئے ہیں کہ خدا کی' دین کی اور شریعت کی کوئی بات کان میں پڑ جائے۔ آج میں آپ لوگوں کو ایسی بات بتلا دوں کہ کوئی واعظ ہو یا نہ ہو۔ مقرّر ہو یا نہ ہو آپ لوگ وقت صرف کر کے کہیں جمع ہوں یا نہ ہوں جس حال میں بھی ہوں خود وعظ کہہ لیں اور خود سن لیں۔ خدا اور رسول کی بات کہہ اور سن کر اس پر عمل کر لیں کہ مقصود عمل ہے۔ فائدہ نہ صرف کہنے سے ہوتا ہے اور نہ سننے سے

لے خطبہ جمعہ جامع مسجد دیوبند۔ ۱۰ رجمادی الاولیٰ ۱۳۶۸ھ

ہوتا ہے۔ فائدہ صرف عمل سے ہوتا ہے۔ فرمایا۔

عقل، فکر و نظر کا واعظ

انسان کے لئے سب سے بڑا واعظ اس کی عقل ہے۔ اگر انسان عقل و تدبّر اور تفکّر سے کام لے، انقلاباتِ زمانہ اور لیل و نہار کی گردش پر غور کرے اور سوچے تو اس سے اس جہان کے خالق اور اس کی مخلوقات، عجیب و غریب کرشمہ سازیوں اور بوقلموں ایجادات کی طرف رہنمائی ہوگی۔ علوم و حقائق کا انکشاف ہوگا۔ رُشد و ہدایت کی راہ کُھلے گی۔ حیات، زندگی اور دنیا کی ناپائیداری اور ناثباتی کا پتہ چلے گا۔ موت اور بعد الموت پیش آنے والے واقعات کا علم الیقین حاصل ہوگا۔ خدا اور آخرت کی طرف طبیعت رُجوع کرے گی۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ

آفاق اور انفُس میں خدائے برتر و بزرگ کی ہزارہا نشانیاں اور علامات موجود ہیں اگر چشمِ بصیرت سے کام لیا جائے۔ دھیان دیا جائے۔ قلب کو متوجّہ کیا جائے۔ عالم کی ایک جزئی سے خدا کی قدرت، اس کی حکمت اور بالغ النظری نمایاں ہوگی۔ مگر شرط دھیان اور توجّہ ہے، جب تک دھیان اور توجّہ سے دیکھا نہ جائے اور غور نہ کیا جائے، اس وقت تک نہ کوئی حکمت ظاہر ہوگی اور نہ کسی مصلحت و دانائی کا پتہ چلے گا۔ دن رات کا مشاہدہ ہے۔ بازار میں، مدرسہ میں گھر میں جب تک آپ دھیان نہ دیں کسی کام یا چیز کو خیال اور توجّہ سے نہ کریں اور نہ دیکھیں۔ اس وقت تک آپ کو اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ حالانکہ وہ واقعات آپ کی نظروں کے سامنے گزر رہے ہیں۔ آپ کے کان آپ کی آنکھیں اسے سن اور دیکھ رہی ہیں۔ لیکن پوچھنے پر آپ انہیں بتلا نہیں سکتے اس واسطے کہ آپ نے اسے دھیان اور توجّہ سے نہیں دیکھا۔ قلب کو متوجّہ نہیں کیا۔ تو اصل قلب ہے

قلب اگر متوجّہ نہ ہو تو نہ کوئی دکھائی دے اور نہ کان کچھ سن سکے۔

یہ آنکھ اور کان قلب کی عینک اور چشمہ ہیں۔ انسان اگر صرف اپنے نفس اس کے عدم، پھر وجود اور پھر عدم پر غور کرے اور دیکھے کہ دن اور رات میں، صبح اور شام میں اس خاک کے پتلے پر کیسے کیسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ اور کن کن حالات سے اسے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کوئی پیدا ہوتا ہے کوئی مرتا ہے۔ کوئی امیر ہے کوئی غریب، کوئی صحت مند ہے کوئی بیمار و مریض، کسی کی زندگی عیش و عشرت سے گزر رہی ہے اور کسی کی تنگی اور عُسرت سے۔ بہرحال اگر انسان آفاق و انفُس اور اس مادی عالم پر نظر ڈالے، اس کے حوادث و واقعات کو اِمعان کی نظر سے دیکھے۔ عقل و بصیرت، تدبّر اور تفکّر سے کام لے۔ تو یہ چیز اس کے لئے بڑے سے بڑے واعظ اور مقرّر کا کام دے گی۔ اور انسان ہر وقت وعظ کہہ سکتا ہے اور اس سے پند و نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ اس عالم کو کون و فساد، اس کے حوادث، واقعات، اِنقلابات اور صبح و شام کے تغیّرات پر نظر ڈالو، غور کرو، دھیان اور توجّہ سے سوچو۔ یہ اِنقلابات تمہیں خالق کا، صانع کا اور مالک کا پتہ دیں گے، خالق کے اقرار کے بعد اس کی قدرت، حکمت، علم اور مُلوکیت کا نشان ملے گا۔ اس کے بعد اس سے محبت، عقیدت اور تعلق پیدا ہوگا۔ پھر اس کی اِطاعت و فرمانبرداری اور عبادت کی طرف میلان پیدا ہوگا۔ آخرت، دین اور خُدا اور رسول کی طرف طبیعت رُجوع کرے گی اور یہی حاصل ہے وعظ کا، نصیحت کا اور تقریر کا۔ غرض عقل اور اس عالم میں غور و فکر انسان کے لئے سب سے بڑا واعظ اور مفت کا واعظ ہے۔

موت ایک خاموش واعظ

دوسرا بڑا واعظ موت ہے۔ اگر انسان موت پر اس کے احوال پر اور یہ کہ موت کے بعد کیا پیش آنے والا ہے۔ اور یہ کہ ہمارا معاملہ اللہ کے ساتھ کیا رہا اور موت کے بعد خدا ہم سے کیا معاملہ کرے گا ان احوال پر غور کرنا خود دین اور منشاءِ شریعت ہے۔ موت کی یاد سے خدا یاد آتا ہے' آخرت کی یاد آتی ہے' دنیاوی لذات سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی حاصل ہوے وعظ کا اور نصیحت کا حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ کَفٰی بِالْمَوْتِ وَاعِظًا

انسان کے لئے بڑا واعظ موت ہے ___ دوسری حدیث میں ارشاد ہے :

اَکْثِرُوْا ذِکْرَهَا زِمِ اللَّذَّاتِ

لذّتوں کو مٹانے والی (موت) کا ذکر زیادہ کیا کرو۔ موت سے غافل نہ ہو۔ موت کا دھیان ہر وقت رکھا کرو۔ اس سے دنیا میں اس کی لذات اور آرائشوں میں انہماک کم رہے گا۔ آخرت کی توجّہ ہوگی۔ عبادت اور اطاعت میں جی لگے گا اور یہی اصل ہے وعظ کا۔ غفلت بہت بُری چیز ہے۔ غفلت سے انسان خسارہ اور نقصان میں رہتا ہے' دنیاوی معاملات میں رات دن کا مشاہدہ ہے' بارش کے وقت اگر کاشتکار آرام میں رہے۔ ٹھنڈی ہوا اور سہانے وقت کے عیش میں پڑا رہے' نہ کھیت پر جاوے اور نہ بیج ڈالے نہ نولائی کرے اور نہ کھیت کی دیکھ بھال کرے تو ظاہر ہے کہ جب دوسرے کاشت کار اپنی لہلہاتی ہوئی کھیتی دیکھ کر خوش ہوں گے اسے کاٹیں گے۔ غلہ اور اَناج گھر لائیں گے تو یہ غافل کاشت کار منہ تکے گا کفِ افسوس ملے گا اور شرمندہ ہوگا لیکن اس نے وقت کھو دیا وقت کو ضائع کر دیا۔ غفلت اور لاپرواہی برتی۔ افسوس اور پچھتانا اب کچھ کام نہیں دے گا۔ بعینہٖ یہی حال آخرت کا ہے۔ حدیث میں ہے :

اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ

"دنیا آخرت کی کھیتی ہے"۔

دنیا میں اگر انسان توجّہ سے دھیان سے کام کرتا رہے۔ غفلت نہ برتے' وقت کو ضائع نہ کرے۔ نیکی اور ایمان کا بیج ڈالے' اعمال سے اس کی آبپاشی کرے' خیر خیرات اور صدقات سے اس کی دیکھ بھال اور نولائی کرتا رہے' موت کو یاد رکھے' اعمال کا محاسبہ اور نفس کا مراقبہ کرتا رہے تو آخرت میں سرخرو ہوگا۔ کامیاب ہوگا اور فائز المرام ہوگا ورنہ نقصان میں رہے گا۔

حدیث میں فرمایا گیا :

اَلنَّاسُ نِیَامٌ اِذَا مَاتُوْا اِنْتَبِهُوْا

لوگ سو رہے ہیں۔ غفلت میں ہیں۔ جب مریں گے حساب و کتاب دیں گے۔ سوال و جواب ہوگا۔ اس وقت چونکیں گے' غفلت سے بیدار ہوں گے لیکن دُور اندیش اور عاقبت میں وہ انسان ہے جو سوال و جواب' حساب و کتاب اور محاسبہ سے پہلے ہی اپنا حساب پاک و صاف رکھے' نفس کا مراقبہ کرتا رہے۔

روز مرّہ کے واعظ

فرمایا گیا :

مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا

مرنے سے پہلے اپنے کو مرا ہوا سمجھو۔ محاسبہ سے پہلے اپنے اعمال اور احوال کا حساب کر لو' پاک و صاف ہو کر جاؤ۔ خدا کے دربار میں سرخرو پاک وصاف ہو کر حاضر ہو۔ غرض موت بھی انسان کے لئے بہت بڑا واعظ

ہے۔ موت سے پہلے مرض، بیماری، بڑھاپا، مصائب اور تکالیف بھی کم از کم مسلمان کے لئے واعظ اور مفید درجہ رکھتے ہیں۔ انسان کو غور و خوض، دھیان اور توجہ کی ضرورت ہے۔ غفلت اور سُستی چھوڑو۔ ہمت اور عزم واستقلال سے کام لو۔ تم تھوڑا کرو۔ خدا زیادہ توجہ کرے گا۔ تم خدا کی طرف ایک قدم بڑھو گے تو خدا دو قدم بڑھے گا۔

من اتٰی الیّ شبراً اتیتہٗ ذراعاً ومن اتٰی الیّ ذراعاً اتیتہٗ باعاً ومن اتٰی الیّ مشیاً اتیتہٗ ھرولۃً (الحدیث)

"جو میری طرف ایک بالشت آوے میں اس کی طرف ایک ہاتھ آتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ آوے میں اس کی طرف ایک قدم یا ایک گز آتا ہوں اور جو میری طرف متوسط رفتار سے چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں"۔

کیا ٹھکانا ہے اس کی رحیمی اور کریمی کا۔ البتہ اس کی رحمت اور کرم لینے کو لینے کی اہلیت کے ساتھ ساتھ سعی اور کوشش کو بھی دخل ہے۔ تمہاری ادنیٰ توجہ سے خدا کی زیادہ توجہ ہوگی اور تم اِنشاء اللہ کامیاب اور فائز المرام ہو کر دنیا سے جاؤ گے۔

نصیحت اور دعا پر تقریر ختم فرمائی۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

تفاسیر و علوم قرآنی اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر

دارالاشاعت کی مطبوعہ کتب ایک نظر میں

تفاسیر و علوم قرآنی

تفسیر عثمانی بعد تفسیر مع عنوانات جدید کتابت ۱ جلد ______ علامہ شبیر احمد عثمانی، اضافہ عنوانات جناب محمد علی رازی

تفسیر مظہری اردو ______ ۱۲ جلدیں ______ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی

قصص القرآن ______ ۴ حصے در ۲ جلد کامل ______ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی

تاریخ ارض القرآن ______ علامہ سید سلیمان ندوی

قرآن اور ماحولیات ______ انجینیئر شفیع حیدر دانش

قرآن سائنس اور تہذیب و تمدن ______ ڈاکٹر حقانی میاں قادری

لغات القرآن ______ ۶ جلد کامل ______ مولانا عبدالرشید نعمانی

قاموس القرآن ______ قاضی زین العابدین

قاموس الفاظ القرآن الکریم (عربی انگریزی) ______ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

سلک البیان فی مناقب القرآن (عربی انگریزی) ______ جان پینرس

اعمال قرآنی ______ مولانا اشرف علی تھانوی

قرآن کی باتیں ______ مولانا احمد سعید صاحب

حدیث

تفہیم البخاری مع ترجمہ و شرح اردو ۳ جلد ______ مولانا ظہور الباری اعظمی، فاضل دیوبند

تفہیم المسلم ۔ ۔ ۔ ۳ جلد ______ مولانا زکریا اقبال، فاضل دارالعلوم کراچی

جامع ترمذی ۔ ۔ ۔ ۲ جلد ______ مولانا فضل احمد صاحب

سنن ابو داؤد شریف ۔ ۔ ۳ جلد ______ مولانا سرور احمد صاحب، مولانا خورشید عالم قاسمی صاحب فاضل دیوبند

سنن نسائی ۔ ۔ ۳ جلد ______ مولانا فضل احمد صاحب

معارف الحدیث ترجمہ و شرح ۳ جلد ______ ۸ حصے کامل۔ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب

مشکوٰۃ شریف مترجم مع عنوانات ۳ جلد ______ مولانا عابد الرحمٰن کاندھلوی، مولانا عبداللہ جاوید

ریاض الصالحین مترجم ______ ۲ جلد ______ مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی مظاہری

الادب المفرد کامل مع ترجمہ و شرح ______ از امام بخاری

مظاہر حق جدید شرح مشکوٰۃ شریف ۵ جلد کامل اعلیٰ ______ مولانا عبداللہ جاوید غازی پوری فاضل دیوبند

تقریر بخاری شریف ______ ۳ حصص کامل ______ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب

تجرید بخاری شریف ______ ایک جلد ______ علامہ حسین بن مبارک زبیدی

تنظیم الاشتات ______ شرح مشکوٰۃ اردو ______ مولانا ابوالحسن صاحب

شرح اربعین نووی ______ ترجمہ و شرح ______ مولانا مفتی عاشق الہی البرنی

دارالاشاعت ❁ اردو بازار ایم اے جناح روڈ کراچی ۱ پاکستان ۲۱۳۱۸۹۱ ❁ مستند اسلامی و علمی کتب کا مرکز

مفتیانِ کرام، علما، اساتذہ، خطبا اور مدارس کے طلبا اور طالبات کیلئے مستند کتب

پاکستان میں پہلی بار مکمل طبع شدہ

فتاویٰ رحیمیہ اردو

خصوصیات

کامل ۱۰ حصص در ۵ جلد

از

مفتی عبدالرحیم لاجپوری

سوالات کے جوابات بمع حوالے ہی نہیں عبارات کیساتھ دیئے گئے ہیں صفحہ نمبر اور جلد نمبر بھی بتا دیا گیا ہے۔ اکثر جوابات تفصیلی ہیں جسکی وجہ سے وہ ایک رسالہ بن گیا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فتاویٰ رحیمیہ محض فتاویٰ نہیں بلکہ مجموعہ رسائل ہے۔

عمدہ کاغذ و طباعت، پائیدار خوبصورت جلدیں مناسب قیمت پر مکمل سیٹ اور رعایت عام قیمت ۱۵۰۰ روپے

سیرۃ حلبیہ اردو

سیرۃ النبی پر مشہور اور تفصیلی عربی تصنیف کا اردو ترجمہ

اُمّ السّیَر

مصنف: امام برہان الدین حلبیؒ

مترجم: مولانا محمد اسلم قاسمی مدظلہم

کمپیوٹر کتابت، اعلیٰ کاغذ و طباعت اور خوبصورت اعلیٰ جلد، بڑا اعلیٰ سائز

قیمت ۶ جلد ۱۵۰۰/=

تفسیر عثمانی

تشکیلِ جدید اور اضافہ عنوانات کے ساتھ تفسیری طرز پر

مکمل ۲ جلد

ترجمہ: شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر: شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

اضافہ عنوانات و تشکیل جدید

جناب محمد ولی رازی ولد مولانا مفتی محمد شفیعؒ

تعارف

اندر ملاحظہ فرمائیں

مستند علمی کتب، تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف سیرت و دیگر موضوعات شائع کرنے والا معتبر ادارہ

دارالاشاعت

اردو بازار، ایم اے جناح روڈ کراچی پاکستان ۲۶۳۱۸۶۱ - ۰۲۱